اردو مرثیے کا سفر
(سولھویں صدی سے بیسویں صدی تک)
اور
بیسویں صدی کے اردو مرثیہ نگار
سیّد عاشور کاظمی
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

اُردو مرثیے کا سفر

(سولھویں صدی سے بیسویں صدی تک)

اور

بیسویں صدی کے اُردو مرثیہ نگار

اُردو مرثیے کا سفر

(سولہویں صدی سے بیسویں صدی تک)

اور

بیسویں صدی کے اُردو مرثیہ نگار

سیّد عاشور کاظمی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

URDU MARSIYE KA SAFAR
AUR
BISVIN SADI KE
URDU MARSIYA NIGAR

_by_

Syed Ashoor Kazmi

First Edition 2006
ISBN 81-8223-180-9

Price Rs. 800.00
Price £ 14.00
Price $ 21.00

نام کتاب — اُردو مرثیے کا سفر اور بیسویں صدی کے اُردو مرثیہ نگار
مصنف — سیّد عاشور کاظمی
اشاعت اوّل — ۲۰۰۶ء
قیمت — ۸۰۰ روپے/ ۱۴ پاؤنڈ/ ۲۵ امریکی ڈالر
مطبع — عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی (انڈیا)

**Published by**

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 091-011-23211540
E-mail : ephdelhi@yahoo.com

انتساب

ختمی مرتبت، افضل المرسلین، رحمت اللعالمین، نبیٔ آخرالزماں کی بارگاہ میں اُن کے نواسے سید الشہداء امام حسینؑ اور اُن کے رفقاء پر مراثی کا نذرانہ۔

☆☆☆☆☆

سلام اُس پر۔ درُود اُس پر

سلام اُس پر — درود اُس پر
یہ ایسے صادق کا ذکر ہے جو صداقتوں کا امین بھی تھا
زمین کی پستیوں پہ رہ کر، فلک کا رفعت نشین بھی تھا
جو بے یقینی کی تیرگی میں، اک آفتابِ یقین بھی تھا

وہ ایسا اُمّی
جو علم و عرفان و آگہی کی کتاب لایا
شرافتوں کا نصاب لایا
نجابتوں کا حساب لایا
جو فکر کے بحرِ منجمد میں تموّج و انقلاب لایا

وہ جس نے دولت کا سحر توڑا
بلالؓ کو راہبر بنایا
حصارِ ظلم و ستم گرایا، سلامتی کا نگر بنایا

غرور ونخوت کو بے حقیقت تو عجز کو معتبر بنایا

اُسی کا صدقہ کہ سرزمینِ عرب کا صحرا ہے رشکِ گلشن
فضائیں نغمے سُنا رہی ہیں
زمین سونا اُگل رہی ہے
اسی کا صدقہ
کہ بے ضمیروں کی ایک ٹولی زر و جواہر میں پل رہی ہے
لرزتے ہاتھوں میں جام و مینا،
نجس زبانوں پہ نام اُس کا
عمل ابوجہل و ابرہا کا
نمائشی احترام اُس کا
غلیظ جسموں پہ صاف کپڑے شبیہہ اُس کے لباس کی ہیں
یہ زندہ لاشے مسرتوں کی جبیں پہ تصویر یاس کی ہیں
جو اُس کے مسلک سے منحرف ہیں
وہ پاسبانِ حرم بنے ہیں
جو ساری ملّت کے حق کے غاصب ہیں آج اہلِ کرم بنے ہیں

یہ صاحبانِ کُلاہ ونخوت
یہ دشمنانِ رہِ صداقت
کہ عصرِ حاضر کے سارے رُشدی اُنہیں کے سایے میں پل رہے ہیں

یہ سارے فرعون، سارے نمرود، سارے رُشدی
اُنہیں سے تھی جنگ کل ہماری
اُنہیں سے پھر آج معرکہ ہے
رہِ صداقت پہ چلنے والو حسینی رہبر نے سچ کہا ہے
ہمارا ہر روز، روزِ عاشور اور ہر گام کربلا ہے
سلام اُس پر —— درود اُس پر

(سیّد عاشور کاظمی)

☆☆☆☆☆

فہرست

☆ ابتدا سے پہلے — عرضِ مصنف — ۳۳
☆ اُردو مرثیے کا ارتقاء (انیسویں صدی تک کے اہم مرثیہ نگار) (حوالہ جاتی اندراج) — ۳۹
☆ زیبِ داستاں کے لئے (اُردو مرثیہ بیسویں صدی سے قبل) — ۴۱
☆ بیسویں صدی کے اُردو مرثیہ نگار — ۱۱۵

مرثیہ نگار شعراء (بہ اعتبار حروف تہجی)

الف

☆ آرزو اکبر آبادی — ۷۷۹
☆ آرزو لکھنوی — ۲۵۵
☆ آصف ردولوی — ۶۸۱
☆ آغا سکندر مہدی — ۳۸۸
☆ آغا شاعر قزلباش — ۲۱۷
☆ آلِ رضا — ۴۱۷
☆ آلِ نبی وفا — ۱۸۰
☆ ابراہیم حامی — ۹۹۷
☆ اثر ترابی — ۹۰۵
☆ اثر جلیلی — ۴۳۷
☆ اثر سلطان پوری — ۷۴۸
☆ اثر لکھنوی (جعفر علی خاں) — ۳۱۸
☆ احسن رضوی داناپوری — ۴۶۴
☆ احسن شکارپوری — ۱۰۵۹
☆ احمد نوید — ۸۷۲
☆ ادیم نقوی — ۳۷۱
☆ ارشاد (نقی احمد) — ۹۷۱
☆ اسد نقوی — ۲۱۰
☆ اسلم خیالی — ۷۰۵
☆ اسیر فیض آبادی — ۷۱۰
☆ اشرف جارچوی — ۸۶۸

☆ اصغر حسین طالب ۱۸۲
☆ اطہر جعفری پہرسری ۳۰۶
☆ اظہر (پروفیسر مرتضیٰ رضوی) ۵۸۲
☆ اعظم امروہوی ۱۳۲
☆ افسر دہلوی (مولانا) ۹۲۰
☆ اقبال کاظمی ۷۵۷
☆ اقدس امروہوی ۲۰۸
☆ اُمت الزہرا فطرت ۱۱۳۶
☆ اُمت الحمدی شہرت ۱۱۴۰
☆ امید فاضلی ۷۴۳
☆ امیر حسن امیر ۱۴۳
☆ انعام نقوی ۵۳۲
☆ اوج (مرزا لکھنوی) ۱۶۲
☆ ایلیا (شفیق حسن) ۲۷۳

ب

☆ باقر امانت خانی ۵۵۴
☆ باقر محسن رضوی ۱۰۷۵
☆ باقر زیدی ۱۰۹۲
☆ بانو سید پوری ۱۱۴۲
☆ بانو نقوی ۱۱۴۹
☆ بدر الہ آبادی ۳۹۴
☆ بدر عظیم آبادی ۴۴۴
☆ برجیس امروہوی ۱۵۰
☆ بزم آفندی ۲۶۹
☆ بشیر جعفری ۵۹۰
☆ بنیاد تیموری ۳۵۳
☆ بہار حسین آبادی ۱۸۹
☆ بھگت لچھمن داس ۱۱۸۷
☆ بیدار نجفی ۷۲۳

پ

☆ پیام اعظمی ۱۰۱۲

ت

☆ تاثیر نقوی ۵۰۷
☆ تاجدار لکھنوی ۱۱۲۶
☆ تبسم پہرسری ۲۸۹
☆ تپاں سبزواری ۵۲۹
☆ تسنیم جونپوری ۱۱۲۹
☆ تسنیم نقوی ۱۱۵۹
☆ تصویر فاطمہ ۱۱۴۶
☆ تمکین (علی) ۱۷۵

ث

☆ ثابت لکھنوی ۲۲۲
☆ ثمر لکھنوی ۳۳۹

ج

☆ جالب زبیری ۵۶۲
☆ جاوید لکھنوی ۱۶۹
☆ جدید لکھنوی ۱۳۸
☆ جرار چھولسی (مولانا) ۵۹۲

☆ جگن ناتھ آزاد ۱۲۰۶
☆ جلیل لکھنوی (فرزند حسین) ۱۷۱
☆ جمشید امروہوی ۱۰۸۳
☆ جمیل ادیب ۸۶۵
☆ جمیل مظہری (علامہ) ۴۳۷
☆ جمیل نقوی ۷۳۰
☆ جوش ملیح آبادی ۳۵۳
☆ جوہر نظامی ۶۳۲

چ

☆ چاند (مولوی مجتبیٰ حسین) ۲۱۳

ح

☆ حاجی لکھنوی ۱۱۲۷
☆ حافظ یوسف عزیز (جے پوری) ۳۸۴
☆ حافظ (سید محمد اسماعیل) ۱۳۶
☆ حبیب محمد حبیب ۹۵۰
☆ حزیں لکھنوی ۳۱۲
☆ حزیں نیوتنوی ثم لکھنوی ۱۱۲۹
☆ حسرتی (صفدر علی) ۴۰۰
☆ حسن عابدی ۱۰۴۵
☆ حسن عباس زیدی ۶۶۵
☆ حسن عسکری کاظمی ۹۳۵
☆ حسین اعظمی ۶۲۵
☆ حسین (چھنگا صاحب) ۲۱۴
☆ حیات امروہوی ۲۳۴
☆ حیدر (حیدر بخش) ۲۴۴
☆ حیدر (ظہیر الدین) ۶۱۷
☆ حیدر گردیزی ۹۱۳
☆ حیدر (یداللہ) ۸۲۶

خ

☆ خادم رزمی ۹۳۹
☆ خاکی (مسعود رضا) ۵۱۴
☆ خاور نگرامی ۷۷۲
☆ خبیر لکھنوی ۳۰۲
☆ خلاق حیدر ندیم ۱۰۴۳
☆ خلش پیرا صحابی ۸۹۹
☆ خمار فاروقی ۸۱۴
☆ خیال امروہوی ۹۲۵

د

☆ دانش (صفی حیدر) ۷۱۷
☆ دانش (غضنفر نواب عظیم آبادی) ۴۸۱
☆ دلو رام کوثری ۱۹۸
☆ دیوی روپ کماری ۱۱۳۲

ڈ

☆ ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ ۱۲۱۱
☆ ڈاکٹر دھون وحشی مظفر پوری ۱۱۸۲
☆ ڈاکٹر صفدر حسین ۴۳۲

ذ

☆ ذاکر لکھنوی ۲۰۳

☆ ذاکر نقوی ۲۸۰
☆ ذکی حسن ذکی ۲۰۹
☆ ذکی (منے میاں) ۲۲۷
☆ ذہین لکھنوی ۱۱۷۵

ر

☆ راجہ الفت رائے الفت ۱۱۷۱
☆ راجہ دھنپت رائے محب ۱۱۷۳
☆ راحت عزمی ۹۸۰
☆ راز بجنوری ۷۹۰
☆ رحمن کیانی ۵۴۱
☆ رشید (پیارے صاحب) ۱۵۹
☆ رضا امروہوی ۱۰۲۰
☆ رضا سرسوی ۱۰۵۵
☆ رضا مشہدی ۳۵۱
☆ رضا نقوی ۱۷۹
☆ رضوان سرسوی ۷۸۷
☆ رضوان عزمی ۹۰۲
☆ رضوی جارچوی ۸۳۱
☆ رضیہ بیگم ریاضت ۱۱۳۸
☆ رفیق رضوی ۷۹۳
☆ رفیع (مرزا احمد طاہر) ۲۳۹
☆ رگھبیر سرن دواکر راہی ۱۱۸۸
☆ رونق لکھنوی (شلن نواب) ۱۰۶۱
☆ رونق جہاں رونق ۱۱۵۸

☆ رئیس امروہوی ۵۱۰
☆ رئیس احمر ۹۴۶
☆ رئیس جارچوی (مولانا) ۱۰۷۷
☆ ریحان زیدی ۶۳۷

ز

☆ زار عظیم آبادی (کاظم) ۵۶۷
☆ زائر امروہوی ۷۴۲
☆ زائر زید پوری ۱۲۸
☆ زائر سیتا پوری ۳۱۴
☆ زاہد بخاری ۹۵۷
☆ زاہد جعفری ۱۰۲۵
☆ زاہد فتح پوری ۶۸۵
☆ زیبا ردولوی ۳۲۳
☆ زیبا ناروی ۴۳۰

س

☆ ساحر لکھنوی ۷۸۱
☆ سالک نقوی ۵۲۷
☆ سبطین نقوی ۱۸۳
☆ سحر انصاری ۸۰۹
☆ سرتاج (میر سعادت علی خان) ۳۶۸
☆ سردار نقوی ۶۸۶
☆ سرفراز ابد ۸۵۲
☆ سرور سنبھلی ۵۵۰
☆ سعید حیدر سعید ۷۸۵

☆ سعید جونپوری ۳۵۱
☆ سعید شہیدی ۶۷۶
☆ سلطانہ ذاکرادا ۱۱۶۰
☆ سلطان عالیہ ۱۱۲۵
☆ سلیم (اولادِ حسین) ۱۶۸
☆ سلیم رضوی ۱۰۰۶
☆ سما لکھنوی ۵۲۶
☆ سمیع نقوی ۸۵۰
☆ سہیل آفندی ۹۸۵
☆ سہیل بناری ۵۶۵
☆ سید امیر امام فخر ۱۰۸۸
☆ سید ابن الحسن کلیم امروہوی ۱۸۲
☆ سید محمد جعفری (پیہرسری) ۳۹۶
☆ سیدہ اکبری بیگم ۱۱۶۳
☆ سیف زلفی ۵۶۰

ش

☆ شاداں دہلوی ۷۶۵
☆ شاد عظیم آبادی ۱۸۳
☆ شاد گیلانی ۹۱۲
☆ شاعر زیدی ۸۹۱
☆ شاعر لکھنوی ۲۲۵
☆ شاکر علی جعفری ۶۴۳
☆ شاہد حسین نقوی ۶۹۲
☆ شاہد نقوی ۷۳۴
☆ شائق زیدی ۶۴۷
☆ شجاع (حکیم احمد) ۲۵۰
☆ شجیع (پرنس معظم جاہ) ۴۸۳
☆ شدید لکھنوی ۴۱۱
☆ شکیل مچھلی شہری ۸۰۶
☆ شمیم (جواد حسین) ۱۵۳
☆ شمیم حیدر شمیم ۱۰۲۸
☆ شمیم کرہانی ۳۶۹
☆ شوق مرزا لکھنوی ۱۰۲۲
☆ شوق نونہروی (ابن آدم) ۷۲۶
☆ شہاب کاظمی ۱۰۹۸
☆ شہرت بلگرامی ۶۹۶
☆ شہزاد معصومی ۶۲۸
☆ شہید لکھنوی ۴۱۰

ص

☆ صابر آروی ۹۹۳
☆ صابر تھاریانی ۳۵۷
☆ صادقین ۵۰۱
☆ صبا اکبرآبادی ۶۵۱
☆ صبا لکھنوی ۲۸۴
☆ صفدر ہمدانی ۱۱۱۰
☆ صفی امروہوی ۱۱۹
☆ صفی حیدرآبادی ۲۰۶
☆ صہبا اختر ۶۲۳

ض

☆ ضیاءالحسن موسوی ۴۱۴
☆ ضیاء (سید حسن) ۱۳۳
☆ ضیاء (ضیاءاللہ حیدر) ۴۷۱

ط

☆ طالب جوہری (علامہ) ۷۹۸
☆ طاہر ناصر علی ۹۶۰
☆ طوبیٰ (حافظ محمد اسرائیل) ۲۲۷
☆ طور جونپوری (سجاد حسین) ۲۷۱
☆ طوسی (مولانا غضنفر عباس) ۱۰۸۰

ظ

☆ ظریف جبلپوری ۲۹۴
☆ ظفر جونپوری ۶۷۳
☆ ظفر شارب ۶۲۰
☆ ظل صادق ۸۳۴
☆ ظہور جارچوی ۸۹۴
☆ ظہیر دہلوی ۱۴۵

ع

☆ عابد جعفری ۱۱۰۴
☆ عارف امام ۱۱۱۵
☆ عارف رئیسی اکبرآبادی ۴۹۱
☆ عارف (محمد عثمان) ۵۹۵
☆ عازم رضوی ۹۸۹
☆ عاصی کرنالی ۹۱۴
☆ عرفی (فضل حسن) ۹۶۶
☆ عروج بجنوری ۷۷۸
☆ عروج (دولہا صاحب) ۱۹۳
☆ عروج (عبدالرؤف) ۷۶۸
☆ عروج (غضنفر حسین) ۲۸۱
☆ عزت لکھنوی ۴۲۹
☆ عزم جونپوری ۳۹۷
☆ عسکری خاتون عسکری ۱۱۲۸
☆ عشرت آفرین ۱۱۱۹
☆ عشیر (امداد علی) ۱۳۹
☆ عظیم امروہوی ۱۰۳۵
☆ علی اصغر رضوی بھرتپوری ۳۰۵
☆ علی اکبر کاظمی (سید) ۲۹۰
☆ علی رضا کاظمی ۹۶۲
☆ علی سردار جعفری ۶۵۸
☆ علی ضیغم ہمدانی ۹۴۳
☆ علی کوثر زیدی ۹۵۳
☆ علی مہدی رضوی ۹۷۵
☆ عنبر نقوی ۸۱۹

ف

☆ فاخر لکھنوی ۱۴۲
☆ فاضل امروہوی ۵۴۵
☆ فائز لکھنوی (لڈن صاحب) ۲۳۱
☆ فائق لکھنوی (بابو صاحب) ۲۲۸

☆ فراست زید پوری ۲۶۳
☆ فراقی دریابادی ۱۱۷۷
☆ فرحت علی فرحت ۱۸۱
☆ فردوسی عظیم آبادی ۴۴۴
☆ فُرقتی (ابوالحسن) ۱۴۹
☆ فرید لکھنوی (سلطان صاحب) ۳۲۶
☆ فضل فتحپوری ۶۹۹
☆ فہمی (مولوی سیادت) ۱۰۳۲
☆ فہیم امروہوی ۳۲۱
☆ فیض بھرتپوری ۵۱۹
☆ فیضی (سیّد) ۶۷۰

ق

☆ قائم جعفری ۹۸۲
☆ قتیل لکھنوی ۲۳۵
☆ قدیم لکھنوی ۲۶۰
☆ قسیم امروہوی ۸۲۳
☆ قمر جلالوی ۳۲۹
☆ قمر حسنین ۸۷۸
☆ قمر زیدی ۸۴۱
☆ قمر نقوی ۸۰۴
☆ قنبر (حشمت علی) ۹۵۴
☆ قیصر امروہوی ۹۶۹
☆ قیصر بارہوی ۵۹۹

ک

☆ کاظم جرولی ۱۰۶۹
☆ کالی داس گپتا رضا ۱۲۰۳
☆ کامل جوناگڑھی ۴۰۵
☆ کامل (حسین) امروہوی ۱۲۴
☆ کامل (علی میاں) لکھنوی ۱۲۲
☆ کرار جونپوری ۴۶۱
☆ کرار حسین (پروفیسر) ۶۳۹
☆ کرار نوری ۵۳۸
☆ کمال حیدر رضوی ۸۸۸
☆ کمال (ممتاز حسن) ۲۴۲
☆ کوثر الہ آبادی ۷۶۱
☆ کوثر نقوی ۸۵۵
☆ کوکب شادانی ۵۷۴

گ

☆ گل فروا امروہوی ۱۱۵۴
☆ گوپی ناتھ امن ۱۱۹۸
☆ گوہر آرا بیگم ۱۱۳۰
☆ گوہر جارچوی ۸۷۴
☆ گویا جہاں آبادی ۳۵۶
☆ گویا (طاہر حسین) ۲۱۴

ل

☆ لالہ نانک چند کھتری ۱۱۹۱

م

☆ ماجد رضا عابدی ۸۸۴
☆ ماہر لکھنوی (مہدی حسین) ۱۲۵
☆ مجاہد حسین جوہر ۱۸۲
☆ محب حیدرآبادی ۵۴۴
☆ محب (محمد علی راجہ صاحب محمودآباد) ۱۹۴
☆ محبوب (راجا امیر محمد خان) ۳۶۱
☆ محسن اعظم گڑھی ۳۷۵
☆ محسن نقوی ۶۱۱
☆ محشر رسول نگری ۸۹۸
☆ مدینہ خاتون مدینہ ۱۱۲۷
☆ مرغوب نقوی ۳۳۶
☆ مسرور حیدرآبادی (میر محمد علی) ۲۴۶
☆ مسرور شکوہ آبادی ۸۳۷
☆ مشہود جعفری اکبرآبادی ۶۵۶
☆ مصطفیٰ زیدی ۳۴۴
☆ مضطر جعفری (خلیفہ آل نبی) ۱۵۵
☆ مظفر نقوی ۹۳۳
☆ معجز سنبھلی ۵۸۶
☆ معنی (سید عبدالباری) ۵۷۰
☆ معینی (سید عبدالمعبود) ۵۷۲
☆ مقبول حسین نیر ۷۲۰
☆ مقیم (فیض الحسن) ۲۷۱
☆ ملکہ زمانی ۱۱۲۵
☆ منظر کشمیری ۴۲۶
☆ منظر نقوی ۱۰۰۴
☆ منظور رائے پوری ۲۹۶
☆ منیب امروہوی ۴۴۹
☆ منی لال جوان ۱۱۹۵
☆ موجد سرسوی ۳۴۲
☆ مودب لکھنوی ۲۶۷
☆ مہاراجہ بلوان سنگھ راجہ ۱۱۶۸
☆ مہاراجہ کشن پرشاد شاد ۱۱۸۰
☆ مہدی نظمی ۳۸۶
☆ مہذب لکھنوی ۴۷۳
☆ میر جلیس ۱۲۹
☆ میر رضی میر ۷۳۸
☆ میر عارف لکھنوی ۱۵۶
☆ میر غیور لکھنوی ۲۴۵
☆ میر لائق لکھنوی ۴۰۸
☆ میر مانوس لکھنوی ۲۲۴
☆ میر نفیس ۱۱۶

ن

☆ ناشر نقوی ۱۰۷۴
☆ ناصر زیدپوری ۳۰۹
☆ ناصر لکھنوی ۱۰۰۸
☆ ناطق لکھنوی ۲۵۳
☆ ناظم شکارپوری ۲۴۳

☆ ناظم (ناظر حسین) ۱۶۵
☆ نجم آفندی ۳۷۸
☆ نردوش ترابی ۹۴۹
☆ نسیم امروہوی ۴۹۵
☆ نسیم بھرتپوری ۱۳۹
☆ نشاط مقبول رضوی ۱۱۵۴
☆ نشاط واسطی ۹۱۸
☆ نصرت لکھنوی (یعقوب علی خان) ۱۹۱
☆ نصیر بنارسی ۷۵۳
☆ نظر جعفری ۵۴۸
☆ نظیر باقری ۱۰۴۹
☆ نعیم (آل احمد) ۲۲۵
☆ نعیم مچھلی بندری ۵۳۶
☆ نعیم نقوی ۷۹۵
☆ نفیس فتح پوری ۴۲۳
☆ نقوش نقوی ۸۳۳
☆ نقی (شجاع الحسن) ۵۲۳
☆ نقی عابدی ۱۰۶۶
☆ نگین (سجاد حسین) ۴۴۵
☆ نواب کاظم جنگ ۳۶۶
☆ نیر اسعدی ۸۶۰
☆ نیساں اکبر آبادی ۹۰۹

و

☆ واثق (کاظم حسین) ۳۲۰
☆ وجاہت سونی پتی ۹۴۰
☆ وحید اختر (ڈاکٹر) ۶۰۷
☆ وحید الحسن ہاشمی ۹۴۹
☆ وزیر جعفری ۷۸۰
☆ وصی فیض آبادی ۳۳۳
☆ وقار سبزواری ۵۷۸

ہ

☆ ہادی سرسوی (سید محمد نقوی) ۳۵۹
☆ ہلال (انیس حسن) ۱۷۴
☆ ہلال نقوی (ڈاکٹر) ۸۴۴
☆ ہمدم فیض آبادی ۷۷۵
☆ ہوش عظیم آبادی ۴۶۸

ی

☆ یاور اعظمی ۷۱۳
☆ یاور عباس (ڈاکٹر) ۴۷۷
☆ یتیم (ناصر حسین) ۱۹۷
☆ یکتا (اتقی حسن) ۱۷۷
☆ یکتا (واحد علی) ۷۰۸

☆☆☆☆☆

مغرب میں آباد اردو مرثیہ گو شعراء

	اسم گرامی	موجودہ سکونت		ولادت	صفحہ
☆	امیر امام حر	لندن	برطانیہ	۱۹۲۸ء	۱۰۸۸
☆	باقر زیدی	میری لینڈ	امریکہ	۱۹۳۶ء	۱۰۹۲
☆	شہاب کاظمی	نیو جرسی	امریکہ	۱۹۲۳ء	۱۰۹۸
☆	عابد جعفری	ٹورنٹو	کینیڈا	۱۹۵۰ء	۱۱۰۴
☆	صفدر ہمدانی	لندن	برطانیہ	۱۹۵۰ء	۱۱۱۰
☆	عارف امام	لاس اینجلس	امریکہ	۱۹۵۶ء	۱۱۱۵

شاعرات

	اسم گرامی	موجودہ سکونت		ولادت	صفحہ
☆	عشرت آفرین	ہیوسٹن	امریکہ	۱۹۵۶ء	۱۱۱۹
☆	سلطانہ ذاکر ادا	کیلی فورنیا	امریکہ	۱۹۲۹ء	۱۱۲۰

☆☆☆☆☆

مرثیہ گو شاعرات

اسم گرامی شاعرات	ولادت	وفات	صفحہ
☆ ملکہ زمانی بیگم نصیر الدین حیدر روائی اودھ		۱۸۳۷ء	۱۱۲۵
☆ سلطان عالیہ (دختر نواب نصیر الدین حیدر)			۱۱۲۵
☆ تاجدار لکھنوی (تاجدار بہو)			۱۱۲۶
☆ حاجی لکھنوی (زیب النساء بیگم)			۱۱۲۷
☆ سیدہ مدینہ خاتون مدینہ	۱۸۶۸ء تا	۱۹۴۸ء	۱۱۲۷
☆ عسکری خاتون عسکری	۱۸۷۳ء -	۱۹۵۳ء	۱۱۲۸
☆ حزیں نیوتنوی ثم لکھنوی	۱۹۰۹ء تا	۱۹۶۹ء	۱۱۲۹
☆ تسنیم جونپوری			۱۱۲۹
☆ گوہر آرا بیگم لکھنوی	-	-	۱۱۳۰
☆ دیوی روپ کمارا کبر آبادی	-	-	۱۱۳۲
☆ اُمت الزہرا فطرت	۱۹۱۳ء -	۱۹۸۹ء	۱۱۳۶
☆ رضیہ بیگم ریاضت	۱۹۱۶ء -	۱۹۷۹ء	۱۱۳۸
☆ اُمت الحمدی شہرت	۱۹۲۲ء -	۱۹۶۰ء	۱۱۴۰
☆ بانو سید پوری			۱۱۴۲
☆ تصویر فاطمہ پہلا مرثیہ ۱۹۸۸ میں کہا			۱۱۴۶
☆ بانو نقوی	۱۹۳۳ء		۱۱۴۹
☆ نشاط مقبول رضوی	۱۹۴۰ء		۱۱۵۲
☆ گل فروا امروہوی	۱۹۷۱ء		۱۱۵۴
☆ رونق جہاں رونق	۱۹۷۰ء میں پہلا مرثیہ سامنے آیا		۱۱۵۸
☆ تسنیم نقوی	۱۹۹۰ء میں پہلا مرثیہ سامنے آیا		۱۱۵۹
☆ سلطانہ ذاکر ادا کیلی فورنیا	۱۹۲۹ء		۱۱۶۰
☆ سیدہ اکبری بیگم	۱۹۳۳ء		۱۱۶۳

☆☆☆☆☆

غیر مسلم مرثیہ نگار

	اسم گرامی شاعر	ولادت	وفات	صفحہ
☆	مہاراجہ بلوان سنگھ راجہ	۱۷۹۹ء	؟	۱۱۶۸
☆	راجہ الفت رائے الفت	۱۸۱۰ء	۱۸۳۵ء	۱۱۷۱
☆	راجہ دھنپت رائے محب (راجہ الفت رائے کے فرزند)			۱۱۷۳
☆	لالہ چھنولال دلگیر	۱۷۸۰ء	۱۸۴۷ء	۷۷
☆	ذہین لکھنوی	۱۷۹۰ء	؟	۱۱۷۵
☆	فراقی دریابادی (سدھ ناتھ بلی)	۱۸۸۲ء	-	۱۱۷۷
☆	دلو رام کوثری	۱۸۸۳ء	۱۹۳۱ء	۱۹۸
☆	مہاراجہ کشن پرشاد شاد	۱۸۶۴ء	۱۹۴۰ء	۱۱۸۰
☆	منی لال جواں	۱۸۹۰	۱۹۷۴ء	۱۱۹۵
☆	لالہ نانک چند کھتری	۱۸۹۳		۱۱۹۱
☆	نھونی لال دھون وحشی مظفر پوری	۱۹۰۴ء	۱۹۷۹ء	۱۱۸۲
☆	گوپی ناتھ امن	۱۸۹۸ء	۱۹۸۳ء	۱۱۹۸
☆	رگھبیر سرن دواکر راہی	۱۹۱۴ء	۲۰۰۱ء	۱۱۸۸
☆	بھگت لچھمن داس	۱۹۱۶ء	؟	۱۱۸۷
☆	کالی داس گپتا رضا	۱۹۲۵ء	۲۰۰۱ء	۱۲۰۳
☆	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	۱۹۱۸ء	۲۰۰۴ء	۱۲۰۶
☆	ڈاکٹر دھرمندر ناتھ	۱۹۳۴ء	(تم سلامت رہو قیامت تک)	۱۲۱۱

☆☆☆☆☆

بیسویں صدی کے اُردو مرثیہ نگار شعراء

(عرصۂ حیات کے حوالے سے)

اسم گرامی شاعر	ولادت	وفات	صفحہ
☆ میر نفیس	۱۸۲۴ء	۱۹۰۱ء	۱۱۶
☆ صفی امروہوی	۱۸۳۲ء	۱۹۰۱ء	۱۱۹
☆ علی میاں کامل لکھنوی	۱۸۳۵ء	۱۹۰۴ء	۱۲۲
☆ حسین کامل امروہوی	۱۸۵۲ء	۱۹۰۶ء	۱۲۴
☆ ماہر لکھنوی (مہدی حسین)	۱۸۴۷ء	۱۹۰۷ء	۱۲۵
☆ زائر زیدپوری	؟	۱۹۰۷ء	۱۲۸
☆ میر جلیس	۱۸۵۸ء	۱۹۰۷ء	۱۲۹
☆ اعظم امروہوی	۱۸۳۲ء	۱۹۰۷ء	۱۳۲
☆ سید حسن ضیاء	۱۸۴۰ء	۱۹۰۸ء	۱۳۳
☆ حافظ (سید محمد اسماعیل)	۱۸۳۸ء	۱۹۰۸ء	۱۳۶
☆ جدید لکھنوی	——	۱۹۰۹ء	۱۳۸
☆ امداد علی عشیر	۱۸۱۸ء	۱۹۰۹ء	۱۳۹
☆ نسیم بھرت پوری	۱۸۸۴ء	۱۹۰۹ء	۱۳۹
☆ فاخر لکھنوی	۱۸۵۱ء	۱۹۰۹ء	۱۴۲
☆ امیر حسن امیر	۱۸۳۰ء	۱۹۱۰ء	۱۴۴
☆ ظہیر دہلوی	۱۸۳۵ء	۱۹۱۱ء	۱۴۵
☆ ابوالحسن فرقتی	۱۸۲۰ء	۱۹۱۱ء	۱۴۹
☆ برجیس امروہوی	۱۸۷۷ء	۱۹۱۲ء	۱۵۰

☆ شمیم (جواد حسین) ۱۸۴۹ء ۱۹۱۳ء ۱۵۳

☆ منظر جعفری (آل نبی) ۱۸۴۹ء ۱۹۱۳ء ۱۵۵

☆ میر عارف لکھنوی ۱۸۵۹ء ۱۹۱۶ء ۱۵۶

☆ پیارے صاحب رشید ۱۸۴۶ء ۱۹۱۷ء ۱۵۹

☆ مرزا اوج لکھنوی ۱۸۵۳ء ۱۹۱۷ء ۱۶۴

☆ ناظم لاہوری (ناظر حسین) ۱۸۶۳ء ۱۹۱۸ء ۱۶۵

☆ سلیم (اولاد حسین) ۱۸۵۱ء ۱۹۱۹ء ۱۶۸

☆ جاوید لکھنوی ۱۸۶۴ء ۱۹۲۱ء ۱۶۹

☆ جلیل (فرزند حسین) ۱۸۵۸ء ۱۹۲۲ء ۱۷۱

☆ بلال (انیس حسن) ۱۸۷۷ء ۱۹۲۳ء ۱۷۳

☆ تمکین (سید علی) ۱۸۶۰ء ۱۹۲۳ء ۱۷۵

☆ یکتا (آقی حسن) ۱۸۸۰ء ۱۹۲۶ء ۱۷۷

☆ رضا نقوی ۱۸۵۱ء ۱۹۲۶ء ۱۷۹

*****

☆ آل نبی وفا ۱۹۰۱ء ۱۹۸۰ء ۱۸۰

☆ فرحت علی فرحت ۱۸۵۳ء ۱۹۳۸ء ۱۸۱

☆ مجاہد حسین جوہر ۱۸۷۴ء ۱۹۳۸ء ۱۸۲

☆ اصغر حسین طالب ۱۸۷۶ء ۱۹۴۰ء ۱۸۲

☆ ابن الحسین کلیم ۱۸۶۰ء ۱۹۳۰ء ۱۸۲

☆ سبطین نقوی ۱۸۹۴ء ؟ ۱۸۳

*****

☆ شاد عظیم آبادی ۱۸۴۶ء ۱۹۲۷ء ۱۸۳

☆ بہار حسین آبادی ۱۸۶۴ء ۱۹۲۹ء ۱۸۹

☆ نصرت لکھنوی ۱۸۳۸ء ۱۹۲۹ء ۱۹۱

نام	پیدائش	وفات	صفحہ
☆ عروج (دولہا صاحب)	۱۸۶۵ء	۱۹۳۰ء	۱۹۳
☆ محمد علی محب (مہاراجہ)	۱۸۷۸ء	۱۹۳۱ء	۱۹۴
☆ یتیم (ناصر حسین)	۱۸۶۶ء	۱۹۳۱ء	۱۹۷
☆ دلورام کوثری	۱۸۸۳ء	۱۹۳۱ء	۱۹۸
☆ ذاخر لکھنوی	۱۸۷۱ء	۱۹۳۲ء	۲۰۳
☆ صفی حیدرآبادی	۱۸۸۱ء	۱۹۳۲ء	۲۰۶
☆ اقدس امروہوی	۱۸۵۴ء	۱۹۳۴ء	۲۰۸
☆ ذکی حسن ذکی	۱۸۵۳ء	؟	۲۰۹
☆ اسد نقوی	۱۸۶۸ء	۱۹۳۷ء	۲۱۰
☆ چاند (مولوی مجتبیٰ حسین)	۱۸۷۳ء	۱۹۳۷ء	۲۱۳
☆ گویا (طاہر حسین)	۱۸۹۹ء	۱۹۳۸ء	۲۱۴
☆ حسین لکھنوی (چھنگا صاحب)	۱۸۸۰ء	۱۹۴۰ء	۲۱۴
☆ آغا شاعر قزلباش	۱۸۷۱ء	۱۹۴۰ء	۲۱۷
☆ ثابت لکھنوی	۱۸۶۱ء	۱۹۴۱ء	۲۲۲
☆ میر مانوس لکھنوی	۱۸۴۴ء	۱۹۴۱ء	۲۲۴
☆ نعیم بدایونی (آل احمد)	۱۸۶۶ء	۱۹۴۱ء	۲۲۵
☆ طوبیٰ (حافظ محمد اسرائیل)	۱۸۶۷ء	۱۹۴۲ء	۲۲۷
☆ منے صاحب ذکی	۱۸۵۸ء	۱۹۴۳ء	۲۲۷
☆ فائق لکھنوی (بابو صاحب)	۱۸۸۷ء	۱۹۴۴ء	۲۲۸
☆ فائز لکھنوی (لڈن)	۱۸۸۵ء	۱۹۴۶ء	۲۳۱
☆ حیات امروہوی	۱۹۱۴ء	۱۹۴۶ء	۲۳۴
☆ قتیل لکھنوی	۱۸۸۱ء	۱۹۴۶ء	۲۳۵
☆ رفیع (مرزا محمد طاہر)	۱۸۷۰ء	۱۹۴۷ء	۲۳۹
☆ کمال (ممتاز حسن)	۱۸۷۰ء	۱۹۴۷ء	۲۴۲

نام	پیدائش	وفات	صفحہ
☆ ناظم شکارپوری	۱۸۵۱ء	۱۹۳۸ء	۲۴۳
☆ حیدر بخش حیدر	۱۸۷۳ء	۱۹۳۸ء	۲۴۴
☆ میر غیور لکھنوی	۱۸۷۸ء	۱۹۵۰ء	۲۴۵
☆ میر مسرور (محمد علی)	۱۸۷۸ء	۱۹۵۰ء	۲۴۶
☆ ناطق لکھنوی	۱۸۸۷ء	۱۹۵۰ء	۲۵۴
☆ آرزو لکھنوی	۱۸۷۲ء	۱۹۵۱ء	۲۵۵
☆ قدیم لکھنوی	۱۸۷۵ء	۱۹۵۱ء	۲۶۰
☆ فراست زید پوری	۱۸۷۱ء	۱۹۵۲ء	۲۶۴
☆ موذب لکھنوی	۱۸۷۸ء	۱۹۵۳ء	۲۶۷
☆ بزم آفندی	۱۸۶۰ء	۱۹۵۳ء	۲۶۹
☆ مقیم (فیض الحسن)	۱۸۷۷ء	۱۹۵۶ء	۲۷۱
☆ طور جونپوری (سجاد حسین)	۱۸۹۱ء	۱۹۵۶ء	۲۷۱
☆ ایلیا (شفیق حسن)	۱۸۸۵ء	۱۹۵۶ء	۲۷۴
☆ شاعر لکھنوی (للّن صاحب)	۱۸۸۹ء	۱۹۵۷ء	۲۷۵
☆ ذاکر نقوی	۱۸۸۱ء	۱۹۵۸ء	۲۸۰
☆ غضنفر حسین عروج	۱۸۸۳ء	۱۹۵۸ء	۲۸۱
☆ صبا لکھنوی	۱۹۰۷ء	۱۹۵۹ء	۲۸۴
☆ تبسم پیہرسری	۱۹۲۰ء	۱۹۵۸ء	۲۸۹
☆ سید علی اکبر کاظمی	۱۹۰۱ء	۱۹۵۹ء	۲۹۰
☆ ظریف جبلپوری	؟	۱۹۶۴	۲۹۴
☆ منظور رائے پوری	۱۹۱۰ء	۱۹۶۵ء	۲۹۶
☆ خبیر لکھنوی	۱۸۹۷ء	۱۹۶۵ء	۳۰۲
☆ علی اصغر رضوی بھرتپوری	ــــــ	ــــــ	۳۰۵
☆ اطہر جعفری پیہرسری	۱۹۰۷ء	۱۹۶۵ء	۳۰۶

☆ ناصر زیدپوری ۱۹۱۵ء ۱۹۶۶ء ۳۰۹
☆ میر حزیں لکھنوی ۱۹۲۳ء ۱۹۶۶ء ۳۱۲
☆ زائر سیتاپوری ۱۹۱۳ء ۱۹۶۶ء ۳۱۴
☆ اثر لکھنوی (جعفر علی خاں) ۱۸۸۵ء ۱۹۶۷ء ۳۱۸
☆ واثق (کاظم حسین) ۱۹۰۰ء ۱۹۶۷ء ۳۲۰
☆ فہیم امروہوی ۱۸۸۷ء ۱۹۶۷ء ۳۲۱
☆ زیبا ردولوی ۱۹۰۷ء ۱۹۶۸ء ۳۲۳
☆ فرید (سلطان صاحب) ۱۸۸۲ء ۱۹۶۸ء ۳۲۶
☆ قمر جلالوی ۱۸۷۲ء ۱۹۶۸ء ۳۲۹
☆ وصی فیض آبادی ۱۹۱۷ء ۱۹۶۹ء ۳۳۳
☆ حکیم احمد شجاع ۱۸۹۳ء ۱۹۶۹ ۲۵۰
☆ مرغوب نقوی ؟ ۱۹۷۰ء ۳۳۶
☆ ثمر لکھنوی (بادشاہ مرزا) ۱۸۹۴ء ۱۹۷۰ء ۳۳۹
☆ موجد سرسوی ۱۸۹۰ء ۱۹۷۰ء ۳۴۲
☆ مصطفیٰ زیدی ۱۹۳۰ء ۱۹۷۰ء ۳۴۴
☆ رضا مشہدی ۱۹۰۵ء ۱۹۷۰ء ۳۵۱
☆ نیاز تیموری ۱۹۰۱ء ۱۹۷۱ء ۳۵۳
☆ گویا جہاں آبادی ۱۸۹۲ء ۱۹۷۱ء ۳۵۶
☆ صابر تھاریانی ۱۹۰۷ء ۱۹۷۲ء ۳۵۷
☆ حکیم ہادی سرسوی ۱۸۹۸ء ۱۹۷۳ء ۳۵۹
☆ محبوب (راجا امیر محمد خان) ۱۹۲۴ء ۱۹۷۳ء ۳۶۱
☆ نواب کاظم جنگ ۱۹۰۳ء ۱۹۷۳ء ۳۶۶
☆ سرتاج (میر سعادت علی خان) ۱۹۰۵ء ۱۹۷۴ء ۳۶۸
☆ شمیم کرہانی ۱۹۱۶ء ۱۹۷۵ء ۳۶۹

☆ ادیم نقوی	۱۸۸۲ء	۱۹۷۵ء	۳۷۱
☆ علامہ محسن اعظم گڑھی	۱۹۰۲ء	۱۹۷۵ء	۳۷۵
☆ نجم آفندی	۱۸۹۴ء	۱۹۷۵ء	۳۷۸
☆ حافظ یوسف عزیز جے پوری	۱۸۸۹ء	۱۹۷۵ء	۳۸۴
☆ آغا سکندر مہدی	۱۹۲۶ء	۱۹۷۶ء	۳۸۸
☆ بدر الہ آبادی	۱۹۰۹ء	۱۹۷۶ء	۳۹۴
☆ سید محمد جعفری بہبرسری	۱۹۰۵ء	۱۹۷۶ء	۳۹۶
☆ عزم جونپوری	۱۹۰۷ء	۱۹۷۶ء	۳۹۷
☆ صفدر علی حسرتی	۱۹۰۱ء	۱۹۷۶ء	۴۰۰
☆ کامل جونا گڑھی	۱۸۸۹ء	۱۹۷۷ء	۴۰۵
☆ میر لائق لکھنوی	۱۸۹۳ء	۱۹۷۷ء	۴۰۸
☆ شہید لکھنوی	؟	۱۹۷۷ء	۴۱۰
☆ شدید لکھنوی	۱۹۰۱ء	۱۹۷۸ء	۴۱۱
☆ ضیاء الحسن موسوی	۱۹۲۳ء	۱۹۷۸ء	۴۱۴
☆ سید آل رضا	۱۸۹۶ء	۱۹۷۸ء	۴۱۷
☆ نفیس فتح پوری	۱۹۱۰ء	۱۹۷۹ء	۴۲۳
☆ منظر عظیمی	۱۹۰۵ء	۱۹۷۹ء	۴۲۶
☆ عزت لکھنوی	۱۹۲۲ء	۱۹۸۰ء	۴۲۹
☆ زیبا ناروی	۱۸۹۳ء	۱۹۸۰ء	۴۳۰
☆ ڈاکٹر صفدر حسین	۱۹۱۹ء	۱۹۸۰ء	۴۳۲
☆ علامہ جمیل مظہری	۱۹۰۵ء	۱۹۸۰ء	۴۳۷
☆ بدر عظیم آبادی	۱۹۰۰ء		۴۴۳
☆ فردوسی عظیم آبادی	۱۹۳۱ء		۴۴۴
☆ سجاد حسین نگین	——	۱۹۸۱ء	۴۴۵

☆ اثر جلیلی	۱۹۲۲ء	۱۹۸۱ء	۴۴۷
☆ منیب امروہوی	۱۹۰۲	۱۹۸۱ء	۴۴۹
☆ سعید جونپوری	؟	۱۹۸۲ء	۴۵۱
☆ جوش ملیح آبادی	۱۸۹۸ء	۱۹۸۲ء	۴۵۳
☆ کرار جونپوری	۱۹۱۰ء	۱۹۸۲ء	۴۶۱
☆ احسن رضوی داناپوری	۱۹۱۱ء	۱۹۸۳ء	۴۶۴
☆ ہوش عظیم آبادی	۱۹۲۱ء	۱۹۸۳ء	۴۶۸
☆ ضیاء اللہ حیدر	۱۹۳۱ء	۱۹۸۴ء	۴۷۱
☆ مہذب لکھنوی	۱۹۰۷ء	۱۹۸۵ء	۴۷۳
☆ ڈاکٹر یاور عباس	۱۹۱۷ء	۱۹۸۵ء	۴۷۷
☆ دانش (غضنفر نواب)	۱۹۱۶ء	۱۹۸۶ء	۴۸۱
☆ پرنس معظم جاہ شجیع	۱۹۰۸ء	۱۹۸۷ء	۴۸۳
☆ مہدی نظمی لکھنوی	۱۹۲۳ء	۱۹۸۷ء	۴۸۶
☆ عارف رئیسی اکبرآبادی	۱۹۲۹ء	۱۹۸۷ء	۴۹۱
☆ نسیم امروہوی	۱۹۰۸ء	۱۹۸۷ء	۴۹۵
☆ صادقین	۱۹۳۰ء	۱۹۸۷ء	۵۰۱
☆ تاثیر نقوی	۱۹۴۰ء	۱۹۸۷ء	۵۰۷
☆ رئیس امروہوی	۱۹۱۴ء	۱۹۸۸ء	۵۱۰
☆ مسعود رضا خاکی	۱۹۲۶ء	۱۹۸۸ء	۵۱۴
☆ فیض بھرتپوری	۱۹۱۱ء	۱۹۸۹ء	۵۱۹
☆ شجاع الحسن تقی	۱۹۰۳ء	بیسویں صدی کی آخری دہائی	۵۲۳
☆ سماء لکھنوی	۱۸۹۶ء	——	۵۲۶
☆ سالک نقوی	۱۸۹۵ء		۵۲۷
☆ تپاں سبزواری	۱۹۰۵ء	——	۵۲۹

	نام	ولادت	وفات	صفحہ
☆	انعام نقوی	۱۹۱۶ء	——	۵۳۲
☆	نعیم مچھلی بندری	۱۹۰۲ء	——	۵۳۶
☆	گزار نوری	۱۹۱۶ء	——	۵۳۸
☆	رہمان کیانی	۱۹۲۳ء		۵۴۱
☆	محب حیدرآبادی	۱۹۱۳ء		۵۴۳
☆	فاضل امروہوی	۱۹۱۶ء	۱۹۸۹ء	۵۴۵
☆	نظر جعفری	۱۹۳۵ء	۱۹۸۹ء	۵۴۸
☆	سرور سنبھلی	۱۹۱۰ء	——	۵۵۰
☆	باقر امانت خانی	۱۹۰۹ء	۱۹۹۰ء	۵۵۳
☆	سیف زلفی	۱۹۳۱ء	۱۹۹۱ء	۵۶۰
☆	جالب زبیری	۱۹۳۸ء	۱۹۹۱ء	۵۶۲
☆	سہیل بنارسی	۱۸۹۸ء	۱۹۹۲ء	۵۶۵
☆	کاظم زائر عظیم آبادی	۱۹۳۷ء	۱۹۹۲ء	۵۶۷
☆	سید عبدالباری معنی	۱۹۰۱ء	۱۹۹۳ء	۵۷۰
☆	سید عبدالمعبود معنی	——	——	۵۷۲
☆	کوکب شادانی	۱۹۱۰ء	۱۹۹۴ء	۵۷۴
☆	وقار سبزواری	۱۹۳۴ء	۱۹۹۴ء	۵۷۸
☆	پروفیسر مرتضیٰ ظہیر رضوی	۱۹۳۵ء	۱۹۹۴ء	۵۸۲
☆	معجز سنبھلی	۱۹۱۰ء	۱۹۹۴ء	۵۸۶
☆	بشیر جعفری	۱۹۳۰ء	۱۹۹۵ء	۵۹۰
☆	مولانا ناصر ادچھولسی	۱۹۱۴ء	۱۹۹۵ء	۵۹۲
☆	محمد عثمان عارف	۱۹۲۳ء	۱۹۹۵ء	۵۹۵
☆	قیصر بارہوی	۱۹۲۷ء	۱۹۹۶ء	۵۹۹
☆	ڈاکٹر وحید اختر	۱۹۳۵ء	۱۹۹۶ء	۶۰۷

نام	پیدائش	وفات	صفحہ
☆ محسن نقوی	۱۹۴۷ء	۱۹۹۶ء	۶۱۱
☆ ظہیرالدین حیدر	۱۹۱۴ء	۱۹۹۷ء	۶۱۷
☆ ظفر شارب	۱۹۲۷ء	۱۹۹۷ء	۶۲۰
☆ صہبا اختر	۱۹۳۲ء	۱۹۹۷ء	۶۲۳
☆ حسین اعظمی	۱۹۲۴ء	۱۹۹۷ء	۶۲۵
☆ شہزاد معصومی	۱۹۲۹ء	۱۹۹۸ء	۶۲۸
☆ جوہر نظامی	۱۹۰۹ء	۱۹۹۸ء	۶۳۲
☆ ریحان زیدی	۱۹۲۷ء	۱۹۹۸ء	۶۳۷
☆ پروفیسر کرار حسین	۱۹۱۱ء	۱۹۹۹ء	۶۳۹
☆ شاکر علی جعفری	۱۹۱۵ء	۱۹۹۹ء	۶۴۳
☆ شائق زیدی	۱۹۱۵ء	۱۹۹۹ء	۶۴۷
☆ صبا اکبرآبادی	۱۹۰۸ء	۱۹۹۹ء	۶۵۱
☆ مشہود جعفری اکبرآبادی	۱۹۴۱ء	۱۹۹۹ء	۶۵۶
☆ علی سردار جعفری	۱۹۱۳ء	۲۰۰۰ء	۶۵۸
☆ حسن عباس زیدی	۱۹۲۲ء	۲۰۰۰ء	۶۶۵
☆ سید فیضی	[illegible]	۲۰۰۰ء	۶۷۰
☆ ظفر جونپوری	۱۹۲۷ء	۲۰۰۰ء	۶۷۳
☆ سعید شہیدی	۱۹۲۴ء	۲۰۰۰ء	۶۷۶
☆ آصف ردولوی	۱۹۰۶ء	۲۰۰۰ء	۶۸۱
☆ زاہد فتح پوری	۱۹۱۶ء	۲۰۰۱ء	۶۸۵
☆ پروفیسر سردار نقوی	۱۹۴۱ء	۲۰۰۱ء	۶۸۶
☆ شاہد حسین نقوی	——	۲۰۰۲ء	۶۹۴
☆ شہرت بلگرامی	۱۹۳۲ء	۲۰۰۲ء	۶۹۶
☆ فضل فتح پوری	۱۹۳۰ء	۲۰۰۳ء	۶۹۹

☆ اسلم خیال	۱۹۴۲ء	۲۰۰۳ء	۷۰۵
☆ واحد علی یکتا	۱۹۱۶ء	۲۰۰۴ء	۷۰۸
☆ اسیر فیض آبادی	؟	۲۰۰۴ء	۷۱۰
☆ یاور اعظمی	۱۹۱۲ء	۲۰۰۴ء	۷۱۳
☆ صفی حیدر دانش	۱۹۱۳ء		۷۱۷

دبستان کراچی۔ آئینۂ امروز۔ فہرست بحوالہ سنہ ولادت

☆ مقبول حسین نیر	۱۹۰۵ء	(کراچی)	۷۲۰
☆ بیدار نجفی	۱۹۱۱ء	(کراچی)	۷۲۳
☆ ابن آدم شوق نونہروی	۱۹۱۱ء	(کراچی)	۷۲۶
☆ جمیل نقوی	۱۹۱۲ء	(کراچی)	۷۳۰
☆ شاہد نقوی	۱۹۱۶ء	(کراچی)	۷۳۴
☆ میر رضی میر	۱۹۱۷ء	(کراچی)	۷۳۸
☆ زائر امروہوی	۱۹۲۱ء	(کراچی)	۷۴۲
☆ اُمید فاضلی	۱۹۲۳ء	(کراچی)	۷۴۴
☆ اثر سلطان پوری	۱۹۲۵ء	(کراچی)	۷۴۸
☆ نصیر بناری	۱۹۳۶ء	(کراچی)	۷۵۳
☆ اقبال کاظمی	۱۹۳۰ء	(کراچی)	۷۵۷
☆ کوثر الہ آبادی	۱۹۳۱ء	(کراچی)	۷۶۱
☆ شاداں دہلوی	۱۹۳۱ء	(کراچی)	۷۶۵
☆ عبدالرؤف عروج	۱۹۳۱ء	(کراچی)	۷۶۸
☆ خاور نگرامی	۱۹۳۱ء	(کراچی)	۷۷۲
☆ ہمدم فیض آبادی	ـ	(کراچی)	۷۷۵
☆ عروج بجنوری	ـ	(کراچی)	۷۷۸
☆ آرزو اکبر آبادی	ـ	(کراچی)	۷۷۹

نام	سال	شہر	صفحہ
☆ وزیر جعفری	ـ	(کراچی)	۷۸۰
☆ ساحر لکھنوی	۱۹۳۱ء	(کراچی)	۷۸۱
☆ سعید حیدر سعید	۱۹۳۱ء	(کراچی)	۷۸۵
☆ رضوان سرسوی	۱۹۳۳ء	(کراچی)	۷۸۷
☆ راز بجنوری	۱۹۳۴ء	(کراچی)	۷۹۰
☆ رفیق رضوی	۱۹۳۶ء	(کراچی)	۷۹۳
☆ ڈاکٹر نعیم تقوی	۱۹۳۸ء	(کراچی)	۷۹۵
☆ علامہ طالب جوہری	۱۹۳۹ء	(کراچی)	۷۹۸
☆ قمر نقوی	۱۹۴۰ء	(کراچی)	۸۰۴
☆ شکیل مچھلی شہری	۱۹۴۰ء	(کراچی)	۸۰۶
☆ پروفیسر سحر انصاری	۱۹۴۱ء	(کراچی)	۸۰۹
☆ خمار فاروقی	۱۹۴۳ء	(کراچی)	۸۱۴
☆ عنبر نقوی	۱۹۴۴ء	(کراچی)	۸۱۹
☆ قسیم امروہوی	۱۹۴۴ء	(کراچی)	۸۲۳
☆ ید اللہ حیدر	۱۹۴۵ء	(کراچی)	۸۲۶
☆ رضوی جارچوی	۱۹۴۵ء	(کراچی)	۸۳۱
☆ نقوش نقوی	۱۹۴۶ء	(کراچی)	۸۳۳
☆ ظل صادق	۱۹۴۷ء	(کراچی)	۸۳۴
☆ سرور شکوہ آبادی	۱۹۴۸ء	(کراچی)	۸۳۷
☆ قمر زیدی	۱۹۴۹ء	(کراچی)	۸۴۱
☆ ڈاکٹر ہلال نقوی	۱۹۵۰ء	(کراچی)	۸۴۴
☆ سمیع نقوی	۱۹۵۰ء	(کراچی)	۸۵۰
☆ سرفراز ابد اکبرآبادی	۱۹۵۲ء	(کراچی)	۸۵۲
☆ کوثر نقوی	۱۹۵۳ء	(کراچی)	۸۵۵

☆ نیر اسعدی ۱۹۵۴ء (کراچی) ۸۶۰

☆ جمیل ادیب ۱۹۵۴ء (کراچی) ۸۶۵

☆ اشرف جارچوی ۱۹۵۶ء (کراچی) ۸۶۸

☆ احمد نوید ۱۹۵۸ء (کراچی) ۸۷۲

☆ گوہر جارچوی ۱۹۶۲ء (کراچی) ۸۷۳

☆ قمر حسنین ۱۹۶۹ء (کراچی) ۸۷۸

☆ سید ماجد رضا عابدی ۱۹۷۲ء (کراچی) ۸۸۳

☆ سید کمال حیدر رضوی ۱۹۷۳ء (کراچی) ۸۸۸

☆ شاعر زیدی - (کراچی) ۸۹۱

دبستان پنجاب (آئینہٴ امرواز)

☆ ظہور جارچوی ۱۹۱۵ء (لاہور) ۸۹۳

☆ محشر رسول نگری ۱۹۱۶ء کوئٹہ ۸۹۸

☆ خلش پیرا صحابی ۱۹۲۱ء (بھکر ضلع میانوانی) ۸۹۹

☆ رضوان عزمی ۱۹۲۱ء (اسلام آباد) ۹۰۲

☆ اثر ترابی ۱۹۲۲ء (لاہور) ۹۰۵

☆ نیساں اکبرآبادی ۱۹۲۳ء (راولپنڈی) ۹۰۹

☆ شاد گیلانی ۱۹۲۴ء (راولپنڈی) ۹۱۲

☆ حیدر گردیزی ۱۹۲۶ء (ملتان) ۹۱۳

☆ ڈاکٹر عاصی کرنالی ۱۹۲۷ء (ملتان) ۹۱۴

☆ نشاط واسطی ۱۹۲۷ء (لاہور) ۹۱۸

☆ مولانا افسر دہلوی ۱۹۲۸ء (لاہور) ۹۲۰

☆ ڈاکٹر خیال امروہوی ۱۹۳۰ء (لیہ) ۹۲۵

☆ سید وحید الحسن ہاشمی ۱۹۳۰ء (لاہور) ۹۲۹

☆ مظفر نقوی ۱۹۳۰ء (نارووال) ۹۳۳

☆ سید حسن عسکری کاظمی	۱۹۳۱ء	(لاہور)	۹۳۵
☆ خادم رزمی	۱۹۳۲ء	(احمد پور سیال)	۹۳۹
☆ وجاہت سونی پتی	۱۹۳۶ء	(لاہور)	۹۴۰
☆ علی ضیغم ہمدانی	۱۹۳۶ء	(لاہور)	۹۴۳
☆ رئیس احمر	۱۹۳۹ء	(راولپنڈی)	۹۴۶
☆ زردوشت ترابی	۱۹۴۳ء	(ملتان)	۹۴۹
☆ حبیب محمد حبیب	؟	(ملتان)	۹۵۰
☆ علی کوثر زیدی	۱۹۵۰ء	(لاہور)	۹۵۳
☆ حشمت علی قیصر	۱۹۵۲ء	(لاہور)	۹۵۴
☆ زاہد بخاری	۱۹۵۵ء	(لاہور)	۹۵۷
☆ طاہر ناصر علی	۱۹۵۹ء	(لاہور)	۹۶۰
☆ سید علی رضا کاظمی	۱۹۶۲ء	(لاہور)	۹۶۲
☆ فضل حسن عرفی	۱۹۷۵ء	(لاہور)	۹۶۶

(دبستان ہند (آئینۂ امروز)

☆ قیصر امروہوی	۱۹۱۹ء	(امروہہ)	۹۶۹
☆ تقی احمد ارشاد	۱۹۲۰ء	(پٹنہ، بہار)	۹۷۱
☆ علی مہدی بلرام پوری	۱۹۲۳ء	(بلرام پور)	۹۷۵
☆ راحت عزمی	۱۹۲۲ء	(حیدرآباد، دکن)	۹۸۰
☆ قائم جعفری	۱۹۲۴ء	(حیدرآباد، دکن)	۹۸۲
☆ سہیل آفندی	۱۹۲۵ء	(حیدرآباد، دکن)	۹۸۵
☆ عازم رضوی	۱۹۲۵ء	(حیدرآباد، دکن)	۹۸۹
☆ صابر آروی	۱۹۲۸ء	(پٹنہ ، بہار)	۹۹۳
☆ ابراہیم حامی	۱۹۳۰ء	(حیدرآباد، دکن)	۹۹۷
☆ منظر نقوی	۱۹۳۲ء	(علی گڑھ/امروہہ)	۱۰۰۲

☆ سلیم رضوی	۱۹۳۳ء	(حیدرآباد، دکن)	۱۰۰۶
☆ ناصر لکھنوی	۱۹۳۷ء	(حیدرآباد، دکن)	۱۰۰۸
☆ پیام اعظمی	۱۹۳۸ء	(الٰہ آباد) لکھنؤ	۱۰۱۲
☆ رضا امروہی	۱۹۳۹ء	(امروہہ)	۱۰۲۰
☆ مرزا اشوق لکھنوی	۱۹۴۱ء	(لکھنؤ)	۱۰۲۲
☆ زاہد جعفری	۱۹۴۱ء	(جلال پور ضلع امبیڈکر نگر)	۱۰۲۵
☆ شمیم حیدر شمیم	۱۹۴۱ء		۱۰۲۸
☆ ڈاکٹر سیادت فہمی	۱۹۴۲ء	امروہہ	۱۰۳۲
☆ ڈاکٹر عظیم امروہوی	۱۹۴۵ء	امروہہ	۱۰۳۵
☆ خلاق حیدر ندیم	۱۹۴۷ء	امروہہ	۱۰۴۳
☆ حسن عابدی	۱۹۴۷ء	(حیدرآباد، دکن)	۱۰۴۵
☆ میر نظیر باقری	۱۹۴۸ء	(اکروٹہ سادات)	۱۰۴۹
☆ رضا سرسوی	۱۹۵۰ء	(بہری، ضلع مرادآباد)	۱۰۵۵
☆ احسن شکارپوری	۱۹۵۲ء	(دہلی)	۱۰۵۹
☆ شلن نواب روش لکھنوی	۱۹۵۲ء	(لکھنؤ)	۱۰۶۱
☆ تقی عابدی	۱۹۵۴ء	(حیدرآباد، دکن)	۱۰۶۶
☆ کاظم جرولی	۱۹۵۵ء	(لکھنؤ)	۱۰۶۹
☆ ناشر نقوی	۱۹۵۵ء	(پٹیالہ)	۱۰۷۲
☆ باقر محسن رضوی	۱۹۵۶ء	(حیدرآباد، دکن)	۱۰۷۵
☆ مولانا رئیس جارچوی	۱۹۶۵ء	(جارچہ)	۱۰۷۷
☆ مولانا غضنفر عباس طوسی	۱۹۶۶ء	(مظفرنگر)	۱۰۸۰
☆ جمشید امروہوی	۱۹۶۷ء	امروہہ	۱۰۸۳

☆☆☆☆☆

ابتدا سے پہلے

"رہے نام اللہ کا"

ابتدا اس کتاب کا موضوع ''بیسویں صدی کے اُردو مرثیہ نگار'' سوچا گیا تھا۔ اس عنوان کے تحت مرثیہ گوشعراء اور مرثیے کی تاریخ کا عمیق تنقیدی مطالعہ مقصود نہیں تھا بلکہ ''انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو'' پیشِ نظر رکھتے ہوئے اُن قارئین کے لئے جو مرثیہ گوشعراء کے مرثیوں کے تنقیدی مطالعہ یا تقابلی جائزے کے بجائے سہل اور سیدھی سچی تاریخ جاننا چاہتے ہیں ان کے لئے حتی المقدور تسلسل کے ساتھ مرثیہ گوشعراء کا ایک مختصر سا تذکرہ لکھنے کا ارادہ تھا لیکن اس اعتراف کے ساتھ کہ بشر جو چاہتا ہے اس کی تکمیل کسی اور کے قبضۂ قدرت میں ہے اور بشر بہت سے کام نہیں کر سکتا'' تا نہ بخشد خدائے بخشندہ'' لہٰذا کتاب کے موضوع میں بوجوہ ذرا سی وسعت ناگزیر ہوگئی۔

صاحبو! مرثیہ وہ صنفِ سخن ہے جو ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ اچھے بھلے مستند شعراء کرام غزل یا دوسری اصنافِ سخن میں درجۂ کمال پر فائز ہونے کے باوجود مرثیہ نہیں کہہ سکتے جبکہ کم وبیش ہر مرثیہ گوشاعر نے غزل یا دوسری اصناف سخن میں شاعری کی ہے۔ مرثیہ پر نقد ونظر کا کام بھی ہوا ہے اور ان اہل نظر کے لئے جو اُردو مرثیے کا عمیق مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ادب میں بہت مواد میسّر ہے۔ شبلی، محی الدین زور، مصحفی، شاد عظیم آبادی، ثابت لکھنوی، ڈاکٹر صفدر حسین، علی جواد زیدی، ڈاکٹر ابواللیث، ڈاکٹر اکبر حیدری، ڈاکٹر عظیم امروہوی، ڈاکٹر احسن فاروقی، پروفیسر مسعود حسن رضوی، پروفیسر رضا کاظمی، مسیح الزماں، ڈاکٹر ہلال نقوی، ڈاکٹر نیر مسعود، ضمیر اختر نقوی، ڈاکٹر تقی عابدی وغیرہم جیسے صاحبان نقد ونظر نے مرثیہ پر بہت کام کیا ہے لیکن وہ قاری کیا کرے جو ایسی کتابیں پڑھنا نہیں چاہتا جنہیں پڑھ کر عام طور پر آنکھوں پر عینک لگ جاتی ہے۔ حد بندیوں اور حلقہ بندیوں کے حوالے سے لکھی گئی کتابیں یقیناً موجود بھی ہیں اور اہم بھی ہیں، لیکن ہوا یوں ہے کہ ایک کتاب

دبستان لکھنؤ سے متعلق ہے تو دوسری کتاب دہلی کے دبستان مرثیہ گوئی پر ہے، ایک کتاب دکن کے مرثیہ گو شعراء کی تاریخ ہے تو ایک تذکرہ امروہہ کے شعراء سے متعلق ہے لیکن کوئی کتاب شاید ہی ایسی ہو جو سارے شاعروں کا تعارف کرا سکے۔ ''بیسویں صدی اور جدید مرثیہ'' (ڈاکٹر ہلال نقوی) بے شک ایک جامع کتاب ہے لیکن اس کتاب میں بھی مرثیہ گو شعراء کا تذکرہ تسلسل کے ساتھ نہیں ملتا بلکہ شعراء کی مرثیہ نگاری پر مصنف کی فکر کے تحت ٹکڑوں میں گفتگو کی گئی ہے مثلاً سید آل رضا کا ذکر کتاب کے ۱۱۲ صفحات پر بکھرا ہوا ہے یعنی یہ نہیں کہ ۱۱۲ صفحات سید آل رضا کے ذکر کے لئے مخصوص ہوں بلکہ ۱۱۲ صفحات پر ان کا ذکر حوالہ جاتی انداز میں کیا گیا ہے اور یہ ۱۱۲ صفحات مسلسل نہیں ہیں۔ گویا سید آل رضا کو پڑھنے کے لئے قاری کو کتاب میں مختلف ۱۱۲ صفحات اُلٹنے پڑتے ہیں۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ اُن کی یہ کتاب بنیادی طور پر اُن کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے۔ ہمیں اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھنا ہے کہ آج کے میکانکی اور مصروف دور کا عام قاری عمیق تحقیقی نکات میں کم ہی دلچسپی رکھتا ہے لہٰذا یہ سوچا گیا کہ مرثیہ گو شعراء کے مختصر کوائف اور ضروری معلومات پر مشتمل ایک ایسی کتاب پیش کی جائے جو مرثیے کے عام قاری کو بوجھل تحقیق سے بچائے اور مرثیہ گو شعراء کا مختصر او ستند تعارف کرا سکے۔ ایسی کتاب مختصر تبصروں پر ہی مشتمل ہو سکتی ہے لہٰذا اس کتاب میں مختلف اہم حوالوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ قاری مختلف حوالوں کا نچوڑ ایک جگہ پا سکے۔

ہر چند کہ رثائی ادب، ایک باقاعدہ اور اہم صنفِ سخن ہے لیکن ناقدین نے عام طور پر اس شاعری کو ادب کی کسوٹی پر پرکھنے کی بجائے مجالس میں گریہ وزاری کی محرّک شاعری کا درجہ دے دیا ہے۔

مرثیہ گوئی کے حوالے سے بیسویں صدی کا آغاز میر نفیس کے نام نامی سے ہوتا ہے لیکن میر نفیس نے جو کام کیا وہ انیسویں صدی میں کیا تھا بیسویں صدی میں تو وہ ایک سال سے بھی کم عرصہ زندہ رہے اور ۱۹۰۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ بس میر نفیس سے اس کتاب کا آغاز کرنے سے پہلے ایک باب ''زیبِ داستاں کے لئے'' کا اضافہ ضروری ہو گیا جس میں اُردو مرثیہ کی ابتدا سے بیسویں صدی تک ایک تسلسل برقرار رکھنے کی غرض سے کچھ اہم شعراء کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ یوں بھی انیسویں صدی مرثیے کے حوالے سے ایک اہم صدی ہے کیوں کہ اس صدی سے

پہلے ہی مرثیے کی ہیئت مقرر ہو چکی تھی اور شعراء نے مسدّس کو مرثیے کا (Frame Work) قالب یا ڈھانچہ مان لیا تھا اسی لئے بیسویں صدی میں ہیئت کے تجربے نہیں کیے گئے۔ ابتدائی صدی میں موضوعاتی تجربوں کی کوششیں ہوئیں مگر ان تجربوں کے نقوش گہرے نہ ہو سکے۔ جمیل مظہری نے مسدّس میں تیسرے مصرع کو قافیہ ردیف کی پابندی سے آزاد کیا جسے ناپسند نہیں کیا گیا مگر اس کی کچھ زیادہ پیروی بھی نہیں کی گئی۔ بیسویں صدی میں 'بحر' کے تجربوں کی بھی کوشش ہوئی۔ (مثلاً صادقین نے رباعی کی بحر میں مرثیہ کہا) نسیم امروہوی نے مثنوی کی بحر میں مرثیہ کہا بلکہ مرثیے کہے مگر وہی بات کہ ان تجربوں کی مخالفت نہیں ہوئی تو ان کی پیروی بھی نہیں کی گئی اور مرثیہ مسدّس میں ہی رہا۔

انیسویں صدی کے پہلے نصف حصے میں برصغیر میں ریشہ دوانیوں کا دور تھا، برطانوی سامراج تیزی کے ساتھ زمین کے وارثوں سے اقتدار چھین رہا تھا۔ چہروں پر نقاب تھے۔ انگریز کی حکمت عملی ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' برصغیر میں بہت کامیاب ہو رہی تھی۔ اخلاقی اقدار میں اُتھل پتھل ہو رہی تھی۔ اشراف اپنی عزت اور خاندانی اقدار کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کلاسیکی شاعری میں شعرائے کرام ''عطار کے لونڈے سے دوا لینے'' کی روش پر گامزن تھے۔ میں اس سے پہلے بھی اپنی کتاب مرثیہ نظم کی اصناف میں'' ذکر کر چکا ہوں کہ اپنے ماحول سے بے نیاز، گرد و پیش سے نا آشنا اور بدلتی اقدار کے شعور سے بے بہرہ شاعری اچھی شاعری نہیں کہلاتی سوائے اس کے کہ جب انسانیت کے سر پر جبر کی اطاعت کا بار ہو تو سعیٔ اظہار کے باوجود لفظ چپ سادھ لیتے ہیں اور جہاں لفظ بول پڑتے ہیں وہاں جنبشِ قلم پر سر قلم ہو جاتے ہیں۔ یہ جبر شہنشاہیت یا ملوکیت کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے اور غاصبانہ تصرّف کے عہد میں غاصبوں کی طرف سے بھی ممکن ہے۔ انیسویں صدی میں یہی کچھ ہوا ہے۔ دیکھنے اور سوچنے والے زبان نہیں کھول سکتے تھے۔ خصوصاً انیسویں صدی کی پانچویں دہائی سے تو لوگ خائف اور دم بخود جی رہے تھے اور وہ جنہیں کچھ کہنے کا یارا تھا، جو شعر کہتے تھے وہ قلعہ معلّی کے مشاعروں تک رسائی کو عظمت آخر سمجھتے تھے۔ اسے قربِ شاہی کی تمنا بھی کہا جا سکتا ہے لیکن اس دور کا تجزیہ کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ بیکسی کی فضا میں جہاں جہاں سوچنے سمجھنے والوں کے دم گھٹ رہے تھے قلعۂ معلّی کے مشاعروں میں غزل کی آڑ میں زبان کھولی جا سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ذہنِ انسانی میں انگڑائیاں لیتے جذبے یا شکوے محبوب سے شکایتیں بن گئے تھے۔ قلعۂ معلّی میں اسیر شہنشاہ بھی اس قابل نہیں تھے کہ لب کشائی کر سکیں۔ اس

بے یقینی، مایوسی، اور خوف لرزاں فضا میں اذہان ''رنگِ گل سے بلبل کے پر نہ باندھتے'' تو کیا کرتے۔ کلاسیکی شاعری میں یا سیت انہی حالات کی عطا ہے۔ خنجر بکف محبوب کا قدم قدم پر عشاق کے سرتن سے جدا کرنا اس جبر کی علامت تھا جہاں انسانی خوں کی ارزانی تھی۔ مرثیہ کی بنیاد ہی جبر کے خلاف مظلوم کی حمایت ہے۔ ظلم کے خلاف مظلوم کا ساتھ دینا ہے۔ اُردو مرثیہ یزیدی جبرو استبداد کے خلاف ہے اور مظلوم و صابر امام حسینؑ کے ساتھ ہے جو حق کے نمائندے ہیں۔ قدیم مرثیے میں رجز، اُن کٹی ہوئی زبانوں یا اُن سلے ہوئے ہونٹوں کی تسکین کا سبب بنتے تھے جو کچھ کہنا چاہتے تھے اور نہیں کہہ سکتے تھے۔ رزم یا جنگ کے مناظر، ان بیکس اور لاچار انسانوں کو سہارا دیتے تھے جو غاصبوں کے خلاف کچھ کرنا چاہتے تھے مگر نہیں کر سکتے تھے۔ اور مرثیہ میں ''بین'' کا حصہ اس لئے مقبول ہوا کہ بین کے سہارے کھل کر رویا جا سکتا تھا۔ گویا مرثیے نے مظلوم انسانیت کو ایک عظیم کردار کے حوالے سے بلکہ بہتر (۷۲) کرداروں کے حوالے سے ظلم و جبر سے ٹکرانے کا حوصلہ بخشا ہے اور مظلوم کی حیثیت سے ظلم برداشت کرنے کی ہمت کی طرف رہنمائی کی ہے۔

مرثیہ دکن سے دہلی آیا اور فوراً ہی اودھ والوں نے مرثیے کو اپنا لیا۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ دہلی پر ہر وقت غیروں کی یلغار رہتی تھی۔ اودھ میں مرثیے کی باقاعدہ سرپرستی ہوئی جس کے بہت سے دیگر اثرات کے علاوہ اُردو شعر و ادب پر یہ اثر پڑا کہ اُردو کی کلاسیکی شاعری میں ''مسیں بھیگنے پر'' یا محبوب کے سبزۂ خط پر جشن نہیں منائے گئے جو دہلی کی کلاسیکی شاعری میں اکثر و بیشتر نظر آتا ہے، گویا مرثیے نے اودھ کے ادب پر اخلاقی اثرات ڈالے۔ اگر دہلی میں بھی مرثیہ اودھ کی طرح دوسری اصناف شاعری پر حاوی ہوتا تو آج میرؔ و غالبؔ کی شاعری میں Gay تحریک کی تلاش کا مرحلہ نہ آتا۔ اودھ کی شاعری میں بہر حال زیورات، نقاب، ڈوپٹہ، اوڑھنی کا ذکر ملتا ہے۔ پنجاب کی شاعری میں اخترؔ شیرانی نے پہلی بار عورت کو عورت کہہ کے پکارا ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں فرزندان زمین کی ناکامی کے بعد غاصبوں کو حکومت مل گئی تو سارے مظالم کھلم کھلا ہونے لگے۔ چن چن کے اشراف کے سر قلم کئے جانے لگے۔ انگریزی استبداد نے انتقام کے جنوں میں ظلم کو روزمرہ کا معمول بنا لیا تھا۔ اس دور میں مرثیہ ہی یاس کی ماری انسانیت کا سہارا بنا۔ یہ دور انیسؔ و دبیرؔ کا دور تھا۔ اس عہد میں ''بین'' مرثیہ کا اہم حصہ ہو گئے۔ اس عہد میں مرثیے میں بین نہ ہوتے تو مخلوق کا دم گھٹ جاتا۔ مرثیہ کو امام باڑوں کی شاعری کہنے

والے دیکھیں کہ مرثیہ انسانیت کو جینے کا حوصلہ بخش رہا ہے اور ہر صنف شاعری سے زیادہ موثر کام کر رہا ہے۔ میر انیسؔ نے ۱۸۵۷ء میں "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" کہا تھا جسے پڑھیئے تو اندازہ ہوگا کہ اس میں بے چین انسانیت کے حالات کی کیسی عکاسی کی گئی ہے۔ ۱۸۵۷ء کا خونی عہد گذرنے کے بعد ناکامی کے زخموں کی تازگی کے دور میں میر انیسؔ کے ایک اور مرثیے "کیا زخم ہے وہ زخم کہ مرہم نہیں جس کا" میں درد کی وہی لہر ہے۔ انیسویں صدی نے بیسویں صدی کو ورثے میں یاسیت دی، مظلومیت دی۔ تحریک خلافت ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۱ء میں آئی۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۲۰ء تک تلاش کر کر کے مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ اس دور میں مسلمان اپنے اسلاف کا ذکر نہیں کر سکتے تھے، تنظیمیں نہیں بنا سکتے تھے، مارشل آرٹ نہیں سیکھ سکتے تھے۔ تلوار رکھنا جرم تھا، بولنا جرم تھا، سوچنا جرم تھا لیکن جہاں جہاں مرثیہ تھا وہاں وہاں ظلم کے خلاف باتیں ہوتی تھیں، مظلومیت کی حمایت ہوتی تھی اور زندگی کو درپیش مسائل پر، کربلا کے مصائب کے حوالے سے، رویا بھی جا سکتا تھا۔ گھٹن کے اس ماحول میں (خصوصاً ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کی ابتدا تک) مرثیے نے گھٹے ہوئے جذبوں کو اظہار کا راستہ دیا۔

اس کتاب کی تکمیل میں راقم الحروف نے سارے ممکنہ ذرائع استعمال کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ مرثیہ گو شعراء کا ذکر اس کتاب میں شامل ہو سکے لیکن پھر بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں سارے مرثیہ گو شعراء کا تذکرہ شامل ہے، میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ مکمل تو صرف ایک ہی کتاب ہے اور امکانِ خطا سے پاک وہ صاحبانِ کتاب ہیں جو اس کی حفاظت و وضاحت کے لئے کتاب بھیجنے والے کی طرف سے مامور ہیں۔ میں نے تو جن کتابوں سے معلومات حاصل کی ہیں ان کے حوالے دیئے ہیں۔ تاریخی حقائق میں ذاتی رائے کے اعتبار سے اجتناب کی حتی الوسع کوشش کی ہے، شعراء کرام کے بارے میں تعارفی تبصرہ میری ذاتی رائے ہے۔ یورپ میں بیٹھ کر مرثیہ اور رثائی ادب پر معلومات یا کتب کا حصول امر دشوار ہے۔ خطوط کے ذریعے معلومات کی فراہمی دشوار ترین مرحلہ ہے ٹیلیفون پر رابطوں کا جواب مثبت وعدوں کی شکل میں ملتا ہے مگر عمل کی منزل پر تعاون کم ہی نصیب ہوتا ہے — جن اکابرینِ رثائی ادب کے پاس کچھ معلومات ہیں وہ شعراء کی فہرست تک دینے سے اجتناب کرتے ہیں۔ شاید وہ اپنا علم "خرچ" کرنا نہیں چاہتے۔ جناب ثاقب لکھنوی کو شکایت تھی کہ "جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے"

ہمارا تجربہ یہ ہے کہ جن پہ تکیہ کیا انہی پتوں نے خاموشی، گھٹن اور حبس دیا تاکہ تکیہ کرنے والا دم گھٹنے سے مرجائے اور جستجو کا سفر رک جائے —— جملہ معترضہ کی معذرت اور یہ التماس کہ اسے تجربات کی وضاحت سمجھا جائے۔

جو حضرات کتاب کی افادیت کے قائل ہیں ان کا اصرار ہوا کہ تا حال جو معلومات حاصل ہوئی ہیں انہیں نقشِ اول کے طور پر شائع کردیا جائے اور جن کا ذکر اس نقشِ اول میں نہیں آسکا ہے انہیں نقشِ دوئم میں شامل کیا جائے۔ بات دل کو لگی اور یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے جن احباب نے تعاون کیا اُن کا شکریہ واجب ہے۔ بالخصوص ڈاکٹر صادق نقوی، ڈاکٹر عظیم امروہوی، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، نیّر اسعدی، کوثر الہ آبادی، اقبال کاظمی، ڈاکٹر وحید الحسن ہاشمی کے تعاون کا ممنون ہوں۔ جن دوستوں نے مایوس کیا اور مثبت وعدوں کے سبب کم و بیش ایک برس کا وقت ضائع ہوا، ان کی ذاتی مصلحتوں یا مجبوریوں کو بھی سلام۔ زندگی نے ساتھ دیا تو آئندہ جلد ہی ان مرثیہ نگاروں کے کوائف جمع کرنے کی کوشش کی جائیگی جن تک رسائی نہ ہوسکی یا جو کسی سبب تعاون نہ کرسکے۔ یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے اس کے مندرجات پسند آئیں تو میرے حق میں دعائے خیر کیجیے اور اگر کوئی بات پسند نہ آئے یا کسی تبصرے سے آپ متفق نہ ہوں تو درگذر کیجیے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں نے یہ کام عبادت کا حصہ سمجھ کر کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

اُردو مرثیے کا ارتقاء

(انیسویں صدی تک کے اہم مرثیہ نگار)

(حوالہ جاتی اندراج)

۱۔ قلی قطب شاہ　۱۵۶۵ء۔۱۶۱۲ء　۴۵

۲۔ علی عادل شاہ　۱۵۵۷ء۔۱۵۸۰ء

۳۔ عادل شاہ ثانی　۱۵۸۰ء۔۱۶۲۸ء

۴۔ ملاّ وجہی　سولھویں صدی　۴۵

۵۔ لکھنؤ کے قدیم مرثیہ گو (حوالہ جاتی ذکر) افسردہ، اعجاز، بشیر، ترقی، حامد، حیدری، خادم، رضا، میر گھاسی، مہربان، مقبل، مذنب، مرزا عالم، ناظم، ہاشم۔

۶۔ غیر مسلم شعراء : دیا کشن ریحاںؔ، راجہ الفت رائے، کنور دھنپت رائے محبؔ، رام رام پرشاد بشیرؔ، مینڈو لال زارؔ، گربخش رائے، چھنی لال جوانؔ، یوگندر پال صابرؔ،

۷۔ میر اسماعیل　۱۶۴۴ء۔۱۷۱۱ء　۱۰۶

۸۔ سعادت میر　۱۶۹۸ء۔۱۷۳۷ء　۱۰۷

۹۔ نجابت امروہوی　۱۶۹۸ء۔۱۷۳۶ء　۱۰۷

۱۰۔ سید غلام حسینی　اٹھارویں صدی کے وسط سے انیسویں صدی کی ابتدا تک　۱۰۹

۱۱۔ نجیب الدین صفدرؔ　بارہویں صدی ہجری کے آخری برسوں سے تیرھویں کی ابتدا تک　۱۱۰

۱۲۔ نواب درگاہ قلی خان　۱۷۱۰ء۔۱۷۹۶ء

۱۳۔ مصطفیٰ علی خان یک رنگؔ　شاہ مبارک آرزوؔ

۱۴۔ فضل علی فضلیؔ　(مصنف کربل کتھا ۱۷۳۲ء)

۱۵۔ میاں مسکینؔ　مرثیہ گوئی کا دور ۱۷۶۵ء۔۱۷۹۰ء　۵۴

۱۶۔ مرزا رفیع سوداؔ دہلوی　۱۷۱۳ء۔۱۷۸۰ء　۵۷

۱۷۔ میر تقی میرؔ　۱۷۱۰ء۔۱۷۲۲ء (۱۱۳۵ھ۔۱۲۲۵ھ)　۵۸

۱۸۔ حیدریؔ　(اردو کا پہلا مرثیہ گو شاعر متوفی ۱۷۵۳ء)

۱۹۔ محمد علی سکندر	۲۸/۱۷۲۷ء۔۱۸۰۰	۵۹
۲۰۔ مرزا علی گدا	۱۷۳۵ء۔۱۸۱۶ء	۶۱
۲۱۔ احسان	مرزا گدا کے ہم عصر	۶۳
۲۲۔ پناہ بیگ افسردہ	(میر ضمیر اور میر حسن سے پہلے)	۶۴
۲۳۔ میر ضاحک	۱۷۸۱ء۔——	۶۵
۲۴۔ میر حسن	۱۷۲۳ء۔۱۷۸۶ء	۶۷
۲۵۔ مصحفی	۱۷۳۵ء۔۱۸۲۴ء	۱۰۹
۲۶۔ میر خلیق	۱۷۶۶ء۔۱۸۴۴ء	۷۰
۲۷۔ مرزا جعفر فصیح (فیض آبادی) پیدائش ۱۷۸۶ء		۷۳
۲۸۔ میر ضمیر	۱۷۸۲ء۔۱۸۵۵ء	۷۴
۲۹۔ صفی بلگرامی	۱۸۳۴ء۔۱۸۹۰ء	۷۶
۳۰۔ چھنولال دلگیر	۱۸۴۶ء۔۱۷۸۳ء	۷۷
۳۱۔ میر انیس	۱۸۰۱ء۔۱۸۷۴ء	۷۹
۳۲۔ مرزا دبیر	۱۸۰۳ء۔۱۸۷۴ء	۸۲
۳۳۔ موازنۂ انیس و دبیر پر گفتگو		۸۴
۳۴۔ میر مہر علی انس	۱۸۰۷ء۔۱۸۹۳ء	۹۰
۳۵۔ میر مونس	۱۸۱۱ء۔۱۸۷۵ء	۹۴
۳۶۔ اُمید لکھنوی	۱۸۲۹ء۔۱۸۷۶ء	۹۴
۳۷۔ مرزا عشق	پیدائش ۱۸۱۷ء۔——	۹۶
۳۸۔ مرزا تعشق	۱۸۲۴ء۔۱۸۹۸ء	۹۷
۳۹۔ سلطان بہادر شاہ ظفر	——۔——	۹۹
۴۰۔ سلطان واجد علی شاہ اختر	۱۸۲۲ء۔۱۸۸۷ء	۱۰۰
۴۱۔ شیخ ابراہیم ذوق	۱۷۸۸ء۔۱۸۵۴ء	۱۰۴
۴۲۔ چند اہم شعراء امروہہ (انیسویں صدی)		

☆☆☆☆☆

زیبِ داستاں کے لئے

(اردو مرثیہ بیسویں صدی سے قبل)

جیسا کہ عرض کیا گیا، یہ گفتگو مرثیے کے حوالے سے ہے، قدیم وجدید کا تقابل مقصود نہیں۔ کسی بھی عہد میں جب گفتگو مرثیہ سے شروع کی جائے تو ایک ایسا نام سامنے آتا ہے جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مدھم پڑنے کی بجائے روشن تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ نام نامی اور اسم گرامی ہے ''میر انیسؔ''۔ یوں لگتا ہے جیسے لغاتِ الادب میں ''مرثیہ'' کے معنی ''انیسؔ'' اور ''انیسؔ'' کے معنی ''مرثیہ'' قرار پا گئے ہوں۔ میر انیسؔ کے عہد میں ایک اور ایسا ہی نام ہے جس کا ذکر انیسؔ کے ساتھ نہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی ادھوری کہانی سنا رہا ہو۔ یہ تابندہ نام ہے ''مرزا دبیرؔ'' کا۔ اس دور میں دو ہی سنہرے سکے چلتے تھے۔ ایک ''سکۂ فصاحت'' اور دوسرا ''سکۂ بلاغت''۔ پھر جب فصاحت دلوں میں اُتر گئی اور بلاغت اذہان پر چھا گئی تو شماریات کی ہوا چلی اور بندوں کو گنا گیا تو فصاحت کے مداح زیادہ نکلے۔ یہ بساطِ سیاست کا چناؤ نہیں تھا بلکہ علم و ادب کی مردم شماری تھی اسی لئے باوجودیکہ فصاحت کی مقبولیت نے میر انیسؔ کے سر پر ''خدائے سخن'' کا تاج رکھا لیکن بلاغت کا ستارہ بھی افقِ مرثیہ نگاری پر چمکتا دمکتا رہا۔ یہاں بلاغت پر نئی تنقید موضوعِ سخن نہیں ہے جس کے تحت فصاحت کو بھی بلاغت کا ہی ایک جزو قرار دیا جا رہا ہے۔

میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے مرثیے کی ابتداء تو نہیں کی لیکن مرثیے کو اس عروج تک پہنچا دیا جہاں محسوس ہونے لگا کہ اب کوئی اس سے آگے کیا جائے گا — حالانکہ یہ ایک خود ساختہ مفروضہ ہے اس لئے کہ ارتقاء کا عمل کبھی نہیں رُکتا۔ جدید مرثیے کے معاملے میں بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مرثیے نے جو رنگ اختیار کیا ہے اسے زمانے نے قبول کیا ہے لہٰذا یہ ماننے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہئے کہ مرثیہ وقت کے ساتھ ساتھ ارتقاء پذیر ہے۔ اس گذارش کا مقصد میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی عظمت سے انکار نہیں بلکہ ان اکابرین کی وسعتِ نظری اور کمالِ فن پر لگائے گئے

الزامات کو رد کرنا مقصود ہے۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے فن مرثیہ گوئی کو نقطۂ انجماد تک نہیں، روشن راہوں تک لا کر چھوڑا ہے بلکہ اس راستے پر سفر کے متمنی لوگوں کے لئے راہیں تراشی ہیں۔ ان کی عظمت فن آنے والے ادوار کے شعراء کے لئے رہنمائی کی تحریک بھی ہے اور چیلنج بھی۔

ممتاز نقاد ڈاکٹر مسیح الزماں نے ''اُردو مرثیے کا ارتقا'' کے دیباچے میں ۱۹۸۱ء میں یہ بات کہی تھی کہ نصف بیسویں صدی گزرنے تک (جبکہ راقم الحروف کے خیال میں اس کے بعد تک) اُردو مرثیے کی کوئی جامع تاریخ مرتب نہیں ہوئی تھی نہ ہی اس کی تدریجی ترقی اور عہد بہ عہد کیفیات کا خاطر خواہ جائزہ لیا گیا تھا جبکہ انیسویں صدی کے اختتام تک مرثیہ انتہائے عروج تک پہنچ چکا تھا۔ دوسری بات انہوں نے یہ لکھی تھی کہ سکندر، حیدریؔ، گداؔ، احسانؔ، افسردہ کے مراثی پر تنقیدی نظر نہیں ڈالی گئی تھی۔ یہ کمی تو ڈاکٹر مسیح الزماں کی مذکورہ بالا کتاب ''اُردو مرثیے کا ارتقا'' نے پوری کر دی ہوگی مزید برآں مرثیے کے حوالے سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جب سے دبستان کراچی قائم ہوا ہے اس وقت سے کم از کم کراچی میں مرثیہ پر تحریر و تنقید کا کام نہیں ہو رہا ہے۔ البتہ راقم الحروف ان تمام احباب کی توجہ ایک اہم صورت حال کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہے کہ مرثیے کے ساتھ دانستہ یا نادانستہ سب سے بڑی زیادتی یہ ہوئی ہے کہ اس صنف سخن کو رثائی ادب یا شاعری کے معیار پر پرکھنے کے بجائے ایک مکتبۂ فکر کے نام لکھ دیا گیا ہے۔

برصغیر میں پہلا مرثیہ گو شاعر قلی قطب شاہ کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن ''دکن میں مرثیہ اور عزاداری'' میں ڈاکٹر رشید موسوی نے برہان الدین جانمؔ کو پہلا مرثیہ گو قرار دیا۔ مولوی عبدالحق نے جانمؔ کو عادل شاہ اوّل (۹۶۵ھ تا ۹۸۸ھ) (۱۵۵۷ء۔۱۵۸۰ء) ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ھ۔۱۰۳۷ھ) مطابق (۱۵۸۰ء۔۱۶۲۷ء) عہد کا بزرگ لکھا ہے۔ قلی قطب شاہ کے دیوان میں پانچ مرثیے شامل ہیں۔ بہر حال کثرت رائے نے قلی قطب شاہ کو پہلا مرثیہ گو شاعر تسلیم کیا ہے مگر انہیں مرثیہ گو شاعر ثابت کرنے سے قبل یہ ثابت کرنے پر زور دیا گیا ہے کہ قلی قطب شاہ شیعہ تھے گویا اگر وہ شیعہ نہ ہوتے تو مرثیہ گو نہ ہوتے۔ ''تاریخ دکن''، ''تاریخ فرشتہ''، ''دی بہمنز آف دکن (شیروانی)''، ''بہمنی سلطنت (عبدالحمید صدیقی)'' غرض تمام کتب میں مرثیے کو شیعت کا جزو لازم ثابت کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ حامد حسن قادری نے بھی ''مختصر تاریخ مرثیہ گوئی'' میں یہی لکھا ہے کہ دکن میں صنفِ مرثیہ میں جو جوش و خروش تھا وہ دہلی میں نظر نہیں آیا۔ اس کا ایک

سبب یہ بھی ہے کہ گولکنڈہ اور بیجاپور کے بادشاہ شیعہ تھے اور ان میں سے بعض خود شاعر بھی تھے اور مرثیے لکھتے بھی تھے۔

شاید یہی وجہ ہو کہ اُردو شاعری کے نقاد حضرات نے مرثیہ گو شعراء کو کمتر درجے کا شاعر قرار دینے کی مسلسل کوششیں کی ہیں۔ '' بگڑا شاعر مرثیہ گو'' کی کہاوت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی معلوم ہوتی ہے۔ میں '' مرثیہ نظم کی اصناف میں'' یہ ذکر کر چکا ہوں کہ بہت سے نامور غزل گو شعرائے کرام مرثیہ نہیں کہہ سکے اور تو اور فیض احمد فیض جیسے عہد ساز اور مستند شاعر کا ایک مرثیہ کہنے میں سانس پھول گیا جبکہ مرثیہ گو شعراء نے غزلیں بھی کہی ہیں اور دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ یہاں تک کہ مرثیوں میں بھی غزل کا اسلوب اپنایا ہے اور غزل کی آب و تاب دکھائی ہے۔ میر انیسؔ کو خدائے سخن محض اس لئے نہیں کہا گیا کہ وہ مرثیہ گو شاعر تھے بلکہ اس لئے کہا گیا ہے کہ انہوں نے مرثیہ گوئی کو اپنا نصب العین بنانے کے باوجود غزلیں بھی کہی ہیں جو جداگانہ ہیں اور قصیدہ، رجز، رزم، بین اور ماتم جیسے انسانی جذبوں کی جس معیار سے عکاسی کی ہے وہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ لفظوں میں انسانی جذبات کی مصوری میں انیسؔ یگانہ ہیں۔ صنفِ شاعری میں جتنے محاسن ہیں وہ میر انیسؔ کے مرثیوں میں بدرجۂ کمال موجود ہیں۔ '' شبنم نے بھر دئے تھے کٹورے گلاب کے'' اور '' پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں'' جیسے بہت سے مصرعے، اشعار یا بند انیسؔ کی شاعری کے حوالے سے زباں زدِ عام ہیں۔

مرثیہ کسی دوست، عزیز، قومی ہیرو، مذہبی رہنما کی موت پر غم و اندوہ کے اظہار کی حزنیہ شاعری کا نام ہے۔ یہ رثائی شاعری مختلف (Forms) ہیئتوں میں مختلف ممالک اور زبانوں میں ہوتی رہی ہے۔ اس کی وضاحت اپنی کتاب '' مرثیہ نظم کی اصناف میں '' میں اور دوسری کتاب '' چھیڑ خوباں سے '' میں شامل جوش ملیح آبادی پر ایک مضمون '' چمن بولتا ہوا '' میں کر چکا ہوں کہ دنیا کے کلاسیکی ادب میں ایک خاص بحر میں، قبلِ مسیح نوحہ گری کرنے والوں میں رومی شاعر ہوریس (Horace) اور اووڈ (Ovid) کے نام ملتے ہیں۔ ان کے ساتھ آرگیو (Argive) اور ایکم بروٹس (Echembrotus) جیسے شاعر کو بھی نہیں بھلایا جا سکتا جنہوں نے چھ صدی قبل مسیح میں خاص بحور میں حزنیہ شاعری کی تھی۔ ان کے بعد پانچویں صدی قبل مسیح میں نمایاں نام یوری پیڈس (Euripidis) اور اینڈروماچے (Andromache) کے ہیں۔ یہ سارے شاعر لاطینی زبان میں

حزنیہ شاعری یا مرثیہ گوئی کر گئے ہیں اور ابھی تک ان کا انگریزی ترجمہ نہیں ملتا ہے۔ حال ہی میں پتہ چلا ہے کہ ایک فرانسیسی دانشور لاطینی زبان کی (Elegy) کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ ابتدائی یونانی مرثیے جو ساتویں اور چھٹی صدی قبل مسیح میں لکھے گئے ان میں ذاتی غم واندوہ اور تاسف کا اظہار ملتا ہے۔ اس وقت میرا موضوع دوسری زبانوں کے مرثیہ نگاروں کا تذکرہ نہیں ہے اس لئے کچھ ناموں کا حوالہ دیتے ہوئے گذر جانا چاہتا ہوں۔ ان ناموں میں انٹی ماکس آف کلوفون (Antimacus of colophon)، آرچی لوکس (Archelocus)، ممنارس (Mimnarus) کے علاوہ عہد سکندری یعنی Alexandrian Period میں فینوکلس (Phanocles) الیگزینڈر ای ٹولس (Alexander Aetolus) کے نام نمایاں نظر آتے ہیں۔ نویں صدی قبل مسیح سے ساتویں صدی قبل مسیح تک کی گئی لاطینی مرثیہ نگاری کو کیٹولس (Catulles) نے انتہائی کمال تک پہنچایا۔

انگریزی شاعری میں Elegy کہنے والے شعراء کے سامنے یونانی شاعر تھیوکریٹس (Theocritus) کی مثال رہی ہے اور ''ٹینی سن'' کی Memorium کے علاوہ ایڈمنڈ سپانسر (Edmond Spenser) (۱۵۵۲ء سے ۱۵۹۹ء) سے لے کر رابرٹ برجیز (Robert Bridges) (۱۸۴۴ء۔ ۱۹۳۰ء) تک ہر شاعر گڈریے کے روپ میں آہ وبکا کرتا نظر آتا ہے۔

اُردو شاعری میں ایک عرصے تک مختلف ہیئتوں میں کہی گئی رنج وملال کی شاعری کو مرثیہ کہا گیا[۳] آنکہ انیسویں صدی میں مرثیہ کی ہیئت (Form) مسدس قرار پائی۔ اس سے پہلے مختلف ہیئتوں میں حزنیہ شاعری مرثیہ کہلاتی تھی۔ اس لئے نصیرالدین ہاشمی نے مثنوی ''نوسرہار'' کے مصنف کو پہلا مرثیہ گو قرار دیا جسے ڈاکٹر موسوی نے رد کیا ہے۔ مسیح الزماں نے ڈاکٹر رشید موسوی کی رائے کو نقل (Reproduce) کیا ہے جس میں ''نوسرہار'' کو ایک شہادت نامہ کہا ہے۔ ڈاکٹر موسوی کی نظر میں موضوع کی یکسانیت کے باوجود مرثیہ اور شہادت نامہ دو الگ الگ اصناف ہیں۔ عام طور پر شہادت ناموں کے لئے مثنوی مخصوص ہوکر رہ گئی ہے۔ ہرچند کہ ڈاکٹر فضل امام نے ''شاعر آخرالزماں، جوش ملیح آبادی'' میں استدلال کیا ہے کہ ابتدا میں اُردو مرثیے کی کوئی ہیئت مقرر نہیں تھی اس لئے اشرف کی مثنوی ''نوسرہار'' (سنہ تصنیف ۹۰۹ھ مطابق ۱۵۰۳ء) اُردو کا پہلا مرثیہ قرار پائے گی۔ لیکن زیادہ تر اہلِ نقد ونظر ڈاکٹر موسوی کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں اس لئے

''شہادت نامہ'' اور مرثیے کی ہیئت پر اسکے بعد کوئی بحث نہیں ہوئی۔ رہا سوال مرثیہ کا تو قطب شاہی دور میں قلی قطب شاہ اور ملا وجہی (مصنف قطب مشتری) دونوں ہم عصر تھے اور دونوں مرثیہ گو تھے۔

نمونہ کلام **قلی قطب شاہ**

دو جگ اماماں دکھ تھے سب جیو کرتے زاری وائے وائے	تن زوں کی لکڑیاں جالکر کرتے ہیں خواری وائے وائے
ساتو گگن آٹھو جنت ساتو دریا ساتو دھرت	ایکس تھے آپ میں آپس دکھ کرتے کاری وائے وائے
لوح ہور قلم کرسی عرش قدسیاں ملک غلمان سب	بجلیاں بدل اڑاوتے ہیں رات ساری وائے وائے
دونو ردیدے بی بی کے آخر دیکھو کیوں ذکھ دکھے	لہو میں لڑے پیاسے بھکے دیکھو یہ خواری وائے وائے
ذکھ بات کو تو جیب جلے لکھنے قلم بی نا چلے	دل جیوں شمع جل تلملے سدھ کی ہماری وائے وائے
قطبا کہے دل کے بچن ہر دم مدد منج پنج تن	راکھے خدا مجکو جتن دشمن کو خواری وائے وائے

نمونہ کلام **ملا وجہی** مصنف ''قطب مشتری'' (۱۰۱۸ھ مطابق ۱۶۱۰ء)

حسینؑ کا غم کرو عزیزاں	انجونیں سوں جھڑو عزیزاں
بنا جو اول ہوا ہے غم کا	عرش گگن ہور دہرت ہلایا
محبت دلاں کوں اجل کا ساقی	پیالے غم کے سو بھر پلایا
حسینؑ پو یاراں درود بھیجو	کہ دین کا یو دیوا جلایا
تمارے وجہی کوں یا اماماں	نہیں تمن بن یو اس کو سایا

ڈاکٹر موسوی نے سلطان قلی قطب شاہ اور ملا وجہی کے درمیان یہ طے کرنے میں دشواری محسوس کی ہے کہ دونوں میں پہلا مرثیہ گو کون تھا مگر جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے تاریخ نے سلطان قلی قطب شاہ کو پہلا مرثیہ گو شاعر تسلیم کیا ہے۔ راج بہادر گوڑ نے ''دکن میں مراسمِ عزاداری'' میں جو بحث و تحیث کی ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مرثیہ سولھویں صدی میں پہنچا۔ ابتدا میں مرثیے مختصر اور قصیدے کے روپ میں لکھے جاتے تھے اور بین مرثیے کا جزوِ لازم تھا۔ بعد میں مرثیہ مربع، مخمس اور بالآخر مسدس میں لکھا جانے لگا۔ مرثیے کو مسدس میں لانے کا سہرا سودا کے سر باندھا گیا ہے۔ یہ ہیئت آج تک اپنائی جارہی ہے۔ شروع میں شخصی مرثیے بھی کہے جاتے تھے لیکن پھر اُردو مرثیہ کہنے والوں کو سید الشہدا امام حسینؑ اور کربلا میں خانوادۂ رسالت

کے ساتھ کئے گئے ظلم واستبداد کی ایک ایسی تاریخ مل گئی جس تاریخ کے انسانیت، اخلاقی اقدار اور دین سے اتنے گہرے رشتے ہیں کہ اُردو مرثیہ گو کو چھوٹے موٹے واقعات پر مرثیہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ زندگی کا جو پہلو دیکھنا ہو اس کی مثال کربلا میں مل جاتی ہے۔ اب رہا سوال عزاداریٔ حسینؑ کا، تو اس سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کون کسی سانحے سے کیا سبق لیتا ہے، کیسا رویہ اپناتا ہے اور اسے کتنی اہمیت دیتا ہے اس کا انحصار تعلیم، ابتدائی عمر میں گھر کی تربیت، اپنے ماضی اور اجداد کی تاریخ سے واقفیت یا عدم واقفیت پر ہوتا ہے۔ اقوام عالم کے سامنے جب امام حسینؑ کی شہادت اصولوں کے نام پر دی گئی قربانیوں کی صورت میں آتی ہے تو پوری دنیائے انسانیت، حسینؑ کے سامنے سر جھکائے نظر آتی ہے۔ حسینؑ کے کردار کو جب اس نظر سے دیکھا اور پرکھا جاتا ہے کہ ایک فرد واحد، شہنشاہیت کے سامنے اس لئے سینہ سپر ہو گیا کہ شہنشاہیت پوری ملت کا استحصال کر رہی تھی۔ شہنشاہ وقت اخلاقی اور انسانی اقدار کو پامال کر رہا تھا مگر پوری اسلامی سلطنت میں کسی کی ہمت نہیں تھی کہ لب کشائی کرے اور اتنے مصائب و آلام برداشت کرے جو حسینؑ اور اولاد و اصحاب حسینی نے برداشت کئے۔ ظلم، جبر، مطلق العنانی، بہیمیت اور درندگی کے سامنے جھکنے سے انکار کرنے پر آج انسانیت اور اقوام عالم کو پرچم انسانیت، حسینؑ کے ہاتھ میں نظر آتا ہے اور اصول پرست حیات، حسینؑ کے سامنے جبین نیاز خم کئے کھڑی نظر آتی ہے۔ حسینؑ کے کردار کو اگر انسانیت کے پیش نظر دیکھیں تو بیٹے، بھتیجے، بھانجے، بھائی اور دوستوں کی لاشوں کے درمیان تنہا کھڑا ہوا شخص کسی بات سے ہراساں نظر نہیں آتا بلکہ یہ کہتا سنائی دیتا ہے کہ جابر حاکم کے سامنے سر جھکانا ظلم ہے۔ اقتدار باطل کے سامنے سر جھکانا ظلم ہے۔ اپنی اغراض اور ذاتی لالچ کے سامنے سر جھکانا ظلم ہے۔ اے لوگو میں تمہیں خالقِ حقیقی، مالکِ حقیقی، پیدا کرنے والے معبود کی راہ دکھانا چاہتا ہوں۔ صرف ایک ذات واجب کو سجدہ کر لو پھر کسی دوسرے کے سامنے سر جھکانے کی نوبت نہیں آئے گی۔ حسینؑ کو مذہب کی آنکھ سے دیکھو تو حسینؑ مساعی انبیاء کا محافظ نظر آئے گا۔ رحمت العالمین کے احکامات کا پاسدار نظر آئے گا۔ گویا ہر زاویے سے حسینؑ عظیم نظر آتے ہیں اور عظمت سے محبت کرنا فطرتِ بشر ہے۔

اسی محبت کے زیر اثر جب وہ واقعات سامنے آتے ہیں تو آنکھوں میں آنسوؤں کا آنا عین فطرتِ انسانی ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ ان حالات اور واقعات، اور ان عظمتوں سے

کون کتنا گہرا رشتہ استوار کرتا ہے۔ کسی باپ کے مرنے کے بعد اس کے چار بچوں پر باپ کی موت کے مختلف اثرات نظر آتے ہیں۔ چار بچے ایک ہی ردِعمل کا اظہار نہیں کرتے۔ کسی ایک مکتبۂ فکر یا فرقے کو رسولِ مقبولؐ کے نواسے حسینؑ کے غم کی یاد منانے کی رسومات سے جوڑ دینا اس فرقے کے لئے تو خوش بختی اور اعزاز ہے، لیکن عزاداریٔ حسینؑ سے کلمہ گویان رسولؐ کو دور کر کے، امت رسولِ اکرم کو اولادِ رسولؐ کے غم سے لاتعلق کر کے، کسی ایک فرقے سے اس غم کو وابستہ کرنے والے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ کربلا میں ختمی مرتبت کے گھرانے کو نیست و نابود کرنے کی کوششیں کی جارہی تھیں۔ نبی زادیوں کے سروں سے چادریں چھینی جارہی تھیں۔ خانوادۂ رسالت کے بچوں کو طمانچے مارے جارہے تھے۔ کربلا میں اس رسولؐ اکرم کا گھرانا اجڑ رہا تھا۔ وہ رسولؐ اکرم جس کی پیشانی مبارک پر اگر کبھی تردد یا سوچ کی لکیریں اُبھرتی تھیں تو مسجدِ نبوی میں موجود اصحاب کرام تڑپ کر پوچھتے تھے "ہمارے ماں باپ آپ پر فدا ہوں یارسول اللہ۔ آج چہرۂ مبارک پر تردد کے آثار دکھائی دے رہے ہیں"۔

رسول اکرمؐ کی پیشانیٔ مبارک پر فکر یا تردد کے آثار دیکھ کر تڑپ اٹھنے والے مسلمانوں کی نئی نسل گلشنِ رسالت اُجڑتے دیکھ کر یا اپنے آقائے نامدار کے گھرانے کی بربادی کی داستان سن کر لاتعلق کیسے رہ سکتی ہے؟ مسلمانوں کو اپنے ہادیٔ اکرم کی تاریخ سے بے بہرہ رکھنے کی کوشش کرنے والے اور تاریخِ اسلامی کو ایسے موڑ دینے والے جہاں سے تاریخ کا دھارا کذب کی طرف مڑ جائے، میدانِ حشر میں رسول اکرمؐ کو کیا منہ دکھائیں گے؟ نمازوں میں محمدؐ و آلِ محمدؐ پر درود بھیجنے والے آلِ محمدؐ کے قتل یا اسیری پر بے حسی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔

رسولِ اکرمؐ اور خانوادۂ رسالت کے اسی غم کو تازہ رکھنے کا نام عزاداری ہے اور دردمند دل رکھنے والا کوئی مسلمان، تاریخ سے واقف کوئی مسلمان، رسولِ اکرمؐ پر جان فدا کرنے کا حوصلہ رکھنے والا کوئی مسلمان، حسینؑ کا غم منانے کا مخالف نہیں ہوسکتا۔ نہ جانے کن جذبوں کے زیرِ اثر، کن مقاصد کے پیشِ نظر، حسینؑ کی عزاداری اور حسینؑ پر کہے گئے مرثیوں کو شیعوں کی میراث بنا کر پوری ملتِ مسلمہ کو عزاداریٔ حسینؑ کی تقدیس اور اس کی اہمیت کے ادراک سے محروم کر دیا گیا ہے۔ بات شیعہ سنی کی نہیں ہے، محبتِ رسولؐ اور آلِ رسولؐ کی ہے جو مسلمان کے ایمان کا جزو ہے۔ عزاداریٔ حسینؑ کے سلسلے میں رسوماتِ عزاداری کی نہیں غمِ حسینؑ کی بات ہے۔ عزاداری کیسے ہو

اس کی مروجہ رسومات حتمی یا حرف آخر نہیں ہیں۔ نوحہ خوانی ہو یا نہ ہو، سینہ کوبی ہو یا نہ ہو، نیک نیتی سے کیا جائے تو ان رسومات میں اختلاف بھی صحت مندی کی علامت ہو سکتا ہے۔ عزاداری کی روح یہ ہے کہ ہر سال ذکر رسول، خدا کی حاکمیت کا درس دیتا ہے۔ جو قومیں اپنے ورثے کو یاد رکھتی ہیں اپنے اجداد کی تاریخ کو دوہراتی ہیں، ان قوموں کی تاریخ بھی تابندہ رہتی ہے اور ان کی نئی نسلوں کو نیا جوش اور نیا ولولہ بھی ملتا ہے۔ جو قومیں اپنی تاریخ کو نہیں دوہراتیں وہ اپنے Roots کو بھول جاتی ہیں، اپنے قومی یا خاندانی افتخار کو فراموش کر دیتی ہیں۔ ''ہیروشیما'' اور ''ناگاساکی'' پر بمباری کی انسانیت سوز تاریخ کا اہم دن کسے یاد ہے۔ لیکن کسی جاپانی سے پوچھ کر دیکھئے تو بتائے گا کہ وہ اپنے بچوں کو ان جگہوں پر لے جاتے ہیں جہاں بم گرائے گئے تھے۔ وہ اس دن کی یاد مناتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جاپان کا ہر فرد زیادہ سے زیادہ کام کرتا ہے اور آج جاپان اقتصادی اور تجارتی میدان میں اتنا آگے ہے کہ مغربی طاقتیں ہراساں ہو رہی ہیں۔ عزاداری حسین صرف شیعہ حضرات ہی نہیں، سنی حضرات بھی اسی خشوع اور خضوع کے ساتھ مناتے ہیں۔ یہ بات آج کی نہیں زمانہ قدیم میں بھی عزاداری سید الشہدا، شیعہ سنی اپنے اپنے طریقے سے مناتے چلے آئے ہیں لیکن مجالس میں مرثیہ خوانی اور تعزیہ داری، اقدار مشترک رہی ہیں۔ یہ مانا کہ آج کا لکھنؤ عزاداری کے معاملے میں ماضی کے لکھنؤ سے مختلف ہے اور مسجدوں کے انہدام کے اس دور میں کچھ کم نصیب ایسے بھی ہیں جو عزاداری امام مظلوم کو روکنا زیادہ اہم اور باعث ثواب سمجھتے ہیں چہ جائیکہ لکھنؤ میں عزاداری مختلف مکاتیب فکر کے ماننے والوں کے لئے سبب اتحاد و یک جہتی ہوا کرتی تھی۔

مرزا محمد حسین قتیل (وفات ۱۸۱۸ء) ''ہفت تماشا'' میں لکھتے ہیں کہ:

''لکھنؤ میں خدا کے فضل سے ہندو بھی تعزیہ دار، مرثیہ گو اور مرثیہ خواں ہیں''۔

اکبر حیدری کاشمیری نے ''لکھنؤ کا رثائی ادب'' میں لکھا ہے کہ:

> ''یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ شیعوں کے علاوہ سنی اور ہندو بھی ایام محرم میں اپنے گھروں میں تعزیے رکھتے ہیں۔''

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے لکھا ہے کہ:

> ''دکن میں عزاداری اور مرثیہ نگاری کو فروغ دینے میں اہل سنت والجماعت صوفیا کا بھی حصہ رہا ہے۔ شاہ ضیاء الدین بیابانی نے اہل

سنت والجماعت ہونے کے باوجود مجالس عزاء کا آغاز کیا۔ ان کے فرزند شاہ اشرف بیابانی نے شہادتِ حسینؑ پر مثنوی لکھی اور خانوادۂ میراں جی شمس العشاق کے چشم و چراغ سید شاہ برہان الدین جانمؔ بیجاپوری نے اُردو کا پہلا مکمل مرثیہ لکھا۔ (ادبی مطالعہ مطبوعہ ۱۹۸۷ء)

یہ بات قابلِ بحث سہی کہ جانم پہلے مرثیہ گو تھے کہ نہیں مگر یہ تو ثابت ہے کہ جانمؔ اور سلطان قلی قطب شاہ کے مرثیے ایک ہی عہد میں لکھے گئے۔

اس گفتگو کا لب لباب یہ ہے کہ مرثیہ شیعہ ہے نہ سنّی بلکہ ایک اہم صنفِ ادب ہے اور عزاداریٔ حسینؑ یا غمِ حسینؑ، مسلمان کا ورثہ ہے۔ شہادتِ حسینؑ عالمِ انسانیت کا سرمایہ ہے جو اسلام کے توسط سے عالمِ انسانیت کے سامنے آیا۔ مرثیے کو اگر شیعہ سنّی لباس پہنا دیا گیا تو ان بڑے لوگوں کو کہاں جگہ دیجئے گا جو سنّی ہیں نہ شیعہ، حتّٰی کہ مسلمان بھی نہیں ہیں لیکن عزائے حسینؑ کے حوالے سے بھی، اور مرثیے کے حوالے سے بھی بڑے نام ہیں۔ کیا ہم جدید مرثیہ میں دلو رام کوثری کے Contribution سے منکر ہو کر احسان فراموشی کریں گے۔؟ چھنولال دلگیر کو کیا کہیں گے؟۔ پس، عرض کرنا مقصود یہ ہے کہ مرثیہ ایک صنفِ سخن ہے۔ ہماری تہذیب اور تاریخ سے اس صنف سخن کے رشتے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ صنفِ سخن ہمارے روشن ماضی کا سرمایہ ہے۔ مغرب میں انگریزی شاعری کے مقابل اگر ہم کوئی صنفِ سخن اور کچھ شعراء کے نام لا سکتے ہیں تو وہ نام میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، جوشؔ ملیح آبادی ہیں اور صنفِ سخن مسدس ہے، مرثیہ ہے۔ عزاداریٔ حسینؑ سے مرثیوں کا رشتہ بر بنائے شیعیت نہیں ہے بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ مرثیہ وہ صنف سخن ہے جو غزل، نظم، قطعہ، رباعی، کی طرح اخباروں رسائل میں ہر روز اشاعت پذیر نہیں ہوتی اور نہ ہی مشاعروں میں پڑھی جاسکتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ غزل کے مقابلے میں مرثیہ گو شاعروں کو زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے اور زیادہ وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود اپنا کلام دوسروں کو سنانے یا دوسروں تک پہنچانے کے مواقع بہت کم ہوتے ہیں۔ مرثیہ صرف مجلسوں میں سنایا جاتا ہے۔ اس لئے جس دور میں عزاداری زیادہ ہو، زیادہ مجلسوں کا انعقاد ہو اسی دور میں مرثیہ گو شعراء کی کثرت ہوتی ہے۔

اکبر حیدری نے لکھنؤ کے جن قدیم مرثیہ گو شعراء کا ذکر کیا ہے وہ افسردہؔ، احسانؔ، اعجازؔ، بشیرؔ، ترقیؔ، حامدؔ، حیدرؔ، خادمؔ، رضاؔ، شریفؔ، عالمؔ، (مرزا عالم) مقبلؔ، مذنبؔ، مشرفؔ، میر ناظمؔ، ہوسؔ،

میر گھاسی، اور مہربان تھے۔ کہا جاتا ہے کہ راجہ صاحب محمود آباد کے ذخیرے میں ان کے مرثیے موجود ہیں۔ ۱۸۲۵ء تک جو شاعر مشہور ہو چکے تھے ان کا تذکرہ مرزا رجب علی بیگ سرور نے "فسانۂ عجائب" میں میاں دلگیر کے ضمن میں کیا ہے۔

اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کے بعد مرثیہ کا ارتقاء بھی کچھ دیر کے لئے رکا۔ لیکن سلام ہو میر انیس پر، مرزا دبیر پر، انس و مونس، عشق و تعشق اور میر نفیس پر کہ ان بزرگوں کی سرپرستی نے مرثیے کو زوال سے بچالیا۔ بہت اہم ہیں وہ ہندو شعراء بھی جنہوں نے ان بزرگوں کے پہلو بہ پہلو مرثیے میں نام پیدا کیا ان میں دیا کشن ریحان، راجہ الفت رائے الفت، کنور دھنپت رائے محب، رام پرشاد بشیر، میندولال زار، گربخش رائے، منی لال جوان اور یوگندر پال صابر وغیرہم شامل ہیں۔ آزادی سے قبل جن ہندو شعراء نے مرثیے میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ ان میں نانک لکھنوی، دلورام کوثری، دیوی روپ کماری، فرقی دریابادی شامل ہیں۔ جیسا کہ درج بالا سطور میں کہا گیا برہان الدین جانم بیجاپوری کو بھی پہلا مرثیہ گو کہا گیا اور وجہی کو بھی مگر اکاذکا اختلاف کے باوجود قلی قطب شاہ کو دکن میں پہلا مرثیہ گو شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔ قطب شاہی دور کے بعد عادل شاہی دور میں سب سے بڑا شاعر مرزا کو تسلیم کیا گیا ہے۔ مرزا کا عہد علی عادل شاہ ثانی کے عہد حکومت (۱۶۲۷ء۔ ۱۶۵۷ء) کے دوران بتایا گیا ہے جو قلی قطب شاہ سے نصف صدی بعد کا زمانہ ہے۔

۱۶۸۶ء میں بیجاپور اور ۱۶۸۷ء میں گولکنڈہ پر اورنگ زیب کا قبضہ ہو گیا۔ قطب شاہی اور عادل شاہی دور کی ساری روایات اور تقاریب بیک قلم بند تو نہیں کی گئیں لیکن شاہی سرپرستی میں ہونے والی زیادہ تر تقاریب خصوصاً عزاداری، شاہی سرپرستی سے محروم ہو گئی اسی لئے اورنگ زیب کے دور میں صرف دو چار مرثیہ گو شعراء کے نام آتے ہیں۔

اورنگ زیب کے بعد مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہوئی اور بااثر صوبے داروں نے خودمختاری اختیار کرنی شروع کر دی۔ چنانچہ دکن میں ۱۷۲۳ء میں آصف جاہی سلطنت قائم ہو گئی۔ اس عہد کے دو مرثیہ گو شعراء کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تھے ہاشم علی اور درگاہ قلی خان۔ ہاشم علی کے عہد کے بارے میں محققین میں کچھ اختلاف بھی ہے حتی کہ مولانا حامد حسن قادری نے "تاریخ مرثیہ گوئی" میں انہیں ہاشم علی گجراتی لکھا ہے اور اس پر استدلال کرتے ہوئے ہاشم علی کا ایک شعر نقل کیا ہے۔

گجرات میں پڑھے جب یہ مرثیہ گو یاراں
من کر چلے ہیں رونے دکنی دکن کو اپنے

مولانا قادری نے گجرات میں مرثیہ پڑھ کر دکن کو چلنے سے ہاشم علی کو گجرات کا شاعر ثابت کیا ہے۔ یہ استدلال بے معنی سا لگتا ہے۔ دکن کا شاعر گجرات میں پڑھنے کے بعد دکن کو جاتا ہے تو اس سے وہ گجرات کا شاعر کیسے ثابت ہو سکتا ہے۔ بہر حال یہ میرا موضوع نہیں ہے۔ میں تو اس نشاندہی کے بعد آگے بڑھ رہا ہوں کہ ہاشم علی کے مرثیے کا قلمی نسخہ ''دیوان حسینی'' ایڈنبرا یونیورسٹی میں موجود ہے۔

نمونۂ کلام **ہاشم علی** ۔ (مرثیہ ہیئت مربع میں)

جلوہ سیں اُٹھ کے رن کوں چلا تب کہی دُلہن ‏ دامن پکڑ کے لاج سوں، انجھواں بھرے نین
مت چھوڑ کر سدھارو تم اس حال میں ہمن ‏ تم بن رہے گا ہائے یہ سونا بھوَن مرا!

(۲)

کیسی یو کدخدائی و کیسی ہے یو برات ‏ آتا فراق تم سوں یہ جلوہ کی آج رات
گھر کوں نہ لے گئے ہو نہ بولے ہو ہم سوں بات ‏ دیکھا نہیں جمال کوں بھر کے نین مرا!

(۳)

اس کربلا کے بن میں اکیلی میں کیوں رہوں ‏ تجھ باج میں جہاں میں پھر اُمید کیا دھروں
جد کے مدینہ کیونکہ میں اس ٹھار سے پھروں ‏ تم اپنے ساتھ لے کے دکھاؤ وطن مرا!

(۶)

قاسم کھڑا اتھا رو تے نین سن دولہن کی بات ‏ غمناک، اپنا دیکھ کے دامن دولہن کے ہات
تب آہ دردناک سوں بولا دولہن کے سات ‏ اے بوستانِ راحت و سرو چمن مرا!

(۷)

مجھ کوں نہیں ہے تیری جدائی کا اختیار ‏ تیرے فراق سات میں جاتا ہوں اشکبار
میں کیا کروں صلاح نہیں حکم کردگار ‏ حق نے کیا ہے رن میں مقرر رہن مرا

نواب درگاہ قلی خاں کے آباء و اجداد مشہد سے آئے تھے۔ درگاہ قلی خاں کا دور ۱۷۱۰ء سے ۱۷۹۶ء تک بتایا گیا ہے۔ اُردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ مرثیہ گوئی صرف حصول ثواب

کے لئے نہیں کرتے تھے بلکہ انہوں نے مرثیوں میں اپنی میلان طبع کا زور دکھایا ہے۔ سالار جنگ کے کتب خانے میں ان کے بیس مرثیے ملتے ہیں جو ۱۷۵۳ء سے ۱۷۶۶ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔

نواب درگاہ قلی خان، جون ۱۷۳۸ء میں دہلی بھی آئے تھے اور ۲۳ جولائی ۱۷۴۱ء کو واپس دکن چلے گئے تھے۔ دہلی میں تین سال قیام کے دوران انہوں نے شاد آباد، بسی بسائی دلی دیکھی، مغلوں کے زوال کو دیکھا، نادر شاہ کے حملے کو دیکھا، اور نادر شاہ کے قتل عام کے بعد کی اجڑی دلی کو بھی دیکھا اور ''مرقع دہلی'' میں اس کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے نواب درگاہ قلی خان کی ''مرقع دہلی'' (بزبان فارسی) کو از سر نو فارسی متن معہ اردو ترجمہ و حواشی کے کیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے یہ بھی نشاندھی کی ہے کہ رضا لائبریری رامپور میں ایک کتاب ''قصۂ حقیقت برآمدن نادر شاہ بہ شاہجہاں آباد'' موجود ہے۔ کتاب کا مولف نادر شاہ کے حملے کے وقت دہلی میں موجود تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے کہ اس کتاب کے نسخے کو ''ناقص الطرفین'' بتایا ہے جس کی وجہ سے مولف کا نام نہیں پڑھا جا سکا لیکن انہوں نے اس کتاب سے ایک اقتباس اپنی شائع کی ہوئی کتاب ''مرقع دہلی'' کے دیباچے میں نقل کیا ہے:

> ''دو گھڑی دن باقی تھا۔ شہر کے لوگوں نے مشہور کر دیا کہ نادر شاہ کا انتقال ہو گیا۔ تمام غارت گر اور حرام زادے جمع ہو گئے۔ پندرہ تاریخ کو ہر طرف یورش رہی۔ بندوق اور میزائل سے تمام رات قتل و غارت گری کی۔ ایرانی نادر شاہ کے سپاہی کوچوں اور گلیوں میں مارے مارے پھرتے تھے اور امان مانگتے تھے۔ آخر الامر صبح ہوئی۔ اس خبر سے بادشاہ غصے میں دیوانہ ہو گیا۔ نادر شاہ نے بیرون شہر سے اپنی فوجیں طلب کیں اور خود قلعے سے باہر آ کر مسجد روشن الدولہ چاندنی چوک میں بیٹھ گیا۔ قتل عام اور اہل شہر کی گرفتاری کا حکم دے دیا چنانچہ قزلباشوں نے شریفوں کی حویلیوں پر یورش کر دی۔ وہاں کے رہنے والوں کو قتل کر دیا۔ چوک سعد اللہ خاں، چاندنی چوک اور نئے شاہجہاں آباد (دہلی) کو غارت اور برباد کر دیا۔ دلی دروازے سے نخاس تک برباد ہو گیا اور کوئی عمارت نظر نہیں آتی تھی''
>
> (مرقع دہلی ترجمہ ڈاکٹر خلیق انجم ص ۱۹)

نادر شاہ کے حملے اور قتل عام کے بعد عوام کی مفلسی اور بے سرو سامانی کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ شاہ ولی اللہ نے شاہی ملازمین کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''جب بادشاہ کا خزانہ نہیں رہا تو سب ملازمین تتر بتر ہو گئے اور کاسۂ گدائی ہاتھ میں لے لیا۔'' (ایضاً ص ۲۰)

نمونۂ کلام نواب ذوالفقار **درگاہ قلی خاں** ۔ (مرثیہ در ہیئت مربع)

ہوئی صبح شہادت اب بجاؤ طبل رحلت کا
اُٹھاؤ اس جنازے کوں پڑھو کلمہ شہادت کا
مدینے میں لجا جلدی کرو اب دفن میت کا
محمد سے کہو آیا جگر خاتون جنت کا

رسول اللہ کہاں ہیں کی خبر لیویں نواسے کی
جنازہ پر پڑھیں آ کر نماز اس حلق پیاسے کی
سکینہ جان دیتی ہیں کریں باتیں دلاسے کی
اُجڑتا ہیگا آ دیکھیں انوکھا گھر نبوت کا

پڑی ہے رات سے میت اُٹھانے کوں نہیں کوئی
بھری ہے خاک اور خوں میں نہلانے کوں نہیں کوئی
جنازہ ہائے بیکس کا اُٹھانے کوں نہیں کوئی
کھدانا کیا ہوا دشوار اس غربت میں تربت کا

جنازے پاس سب اہل حرم آ کر کریں گریاں
اُٹھانے کا نہیں ہے ہائے اس میت کا کچھ ساماں
نہیں پانی نہلانے کوں ہیں سب تکفین میں حیراں
غریبوں بیکسوں کوں بھیجنا سامان غربت کا

جناب شاہ سے ہے التماس بندۂ درگاہ
زیارت کی سعادت اور حصول مطلب دلخواہ
قیامت کی شفاعت اور مزید آبرو و جاہ
ہوا ہے فضل سے حضت کے اب وقت استجابت کا

اورنگ زیب کے عہد کا منظر نامہ پیش کیا جا چکا ہے کہ مرثیے کا ارتقا بوجوہ رک گیا تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مذہبی عقائد کی آزادی کی فضا پیدا ہوئی۔ مرثیہ خوانی کی محافل صاحبِ اثر امراء کے گھروں سے باہر بھی منعقد ہونے لگیں۔ اس دور کے دو اہم شعراء مصطفیٰ علی خاں یک رنگ اور شاہ مبارک آرزو کے مرثیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے امراء کے گھروں کی محفلوں میں پڑھنے کے لئے مرثیے کہے تھے اسی لئے ان کی زبان میں فارسی کے اثرات زیادہ تھے۔

چنانچہ عوامی مجلسوں اور اجتماعات میں پڑھنے کے لئے آسان اُردو زبان میں مرثیوں کی ضرورت پیش آئی۔ اس ضرورت کے تحت ''کربل کتھا'' وجود میں آئی۔ فضلی کی کربل کتھا کی تخلیق ۱۷۳۲ء میں ہوئی جس میں بارہ مجالس ہیں۔ کربل کتھا کو فارسی کی'' روضۃ الشہداء'' کا ترجمہ تو نہیں کہا جا سکتا ہے البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ کربل کتھا، روضۃ الشہداء کو سامنے رکھ کر لکھی گئی۔ فضلی نے'' روضۃ الشہداء'' کے بہت سے اشعار کا ترجمہ'' کربل کتھا'' میں شامل کیا ہے۔ اس دور کے شاعر مسکین کے مرثیوں کے کچھ اقتباسات بھی کربل کتھا میں موجود ہیں جس سے مسکین کے مرثیوں کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ درگاہ قلی خاں نے مسکین، حزیں اور غمگین تینوں بھائیوں کا ذکر کیا ہے؟

☆☆☆☆☆

میاں مسکین:-

تا حال تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ مسکین کی مرثیہ گوئی کا دور ۱۷۶۵ء سے ۱۷۹۰ء تک کا رہا ہے۔ نواب درگاہ قلی خان نے اس دور کے مرثیہ گو شعراء میں خاص طور پر مسکین، حزیں اور غمگین کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> '' شہر میں اُن کے کلام کی شہرت تھی، تینوں دردناک مرثیہ لکھتے تھے اور دردناک الفاظ استعمال کرتے تھے، مرثیہ خوان ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ لوگ مرثیہ سن کر جی کھول کر رو لیتے تھے''
>
> (مرقع دہلی۔ ترجمہ ڈاکٹر خلیق انجم۔ ص ۱۹)

ایسی تحریروں سے وہی صورتِ حال سامنے آتی ہے کہ جہاں انسان جی بھر کر رونا چاہے اور رو نہ سکتا ہو مرثیہ اور مرثیہ میں بین'' کے اشعار دلوں کے بوجھ کو آنسوؤں سے دھو دیتے ہیں نادر شاہ کے بعد لٹی پٹی دلّی میں مسکین، حزیں اور غمگین کے مرثیے آتشِ جبر سے جھلسے ہوئے دلوں سے بیکسی اور بیچارگی کے داغ دھو رہے تھے۔ ہر چند کہ نواب درگاہ قلی خان نے تینوں بھائیوں کا تذکرہ کیا ہے لیکن ان بھائیوں میں میر مسکین کو زیادہ شہرت ملی۔

'' کربل کتھا'' میں بھی مسکین کے مرثیوں کے اقتباسات شامل ہیں اور سودا کے ایک قصیدے میں بھی مسکین کا ذکر ملتا ہے۔ جان گلکرسٹ کی کتاب'' ہندوستانی زبان کے قواعد'' مطبوعہ ۱۷۹۶ء میں بھی گلکرسٹ نے مسکین کے ایک مرثیے کے ۱۸ بند نقل کئے ہیں۔ اس مرثیے

کا پہلا بند یوں ہے جو مربع میں ہے۔

یاراں عجب قوی ہے تقدیر حق تعالا
جس روز شہ نے ڈیرا کوفے طرف نکالا
اس دن جو بھر چکا تھا وہ عمر کا پیالا
مسلم کو کوفیوں نے کوفے میں مار ڈالا

یہی پورا مرثیہ عتیق صدیقی نے اپنی کتاب ''گلکرسٹ اور اس کا عہد'' میں ضمیمہ کے طور پر شامل کیا ہے۔ ان حوالوں سے مسکین کی شہرت اور مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

رام بابو سکسینہ نے میر مسکین کا نام محمد عبداللہ لکھا ہے مگر مولانا مرتضیٰ حسین فاضل نے اُن کا نام میر محمد مہدی بتایا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے میاں مسکین کو ملتانی کہا ہے (گویا پنجاب کے شعراء میں اُن کا شمار کیا ہے) (حوالہ رثائی ادب کراچی شمارہ ۱۱۔ ص ۳۱)

سید وحید الحسن ہاشمی نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

پہلے شخص جس نے میر مسکین کو ملتانی لکھا ہے کیفی جام پوری ملتانی ہیں انہوں نے اپنی کتاب ''سرائیکی شاعری'' میں مولوی لطف علی کے ''تذکرۂ گلشن ہند'' کا حوالہ دیا جو جان گلکرسٹ نے لکھوایا تھا۔ اس تذکرے کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے — شمالی ہند کے تمام تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ محمد باقر حزیں جو مسکین کے بھائی تھے۔ آگرہ کے رہنے والے تھے۔ دہلی میں روزگار تھا۔ اور عظیم آباد میں انتقال ہوا، مرزا غالب کے سسر الہی بخش، سیّد علی غمگین (میر مسکین کے دوسرے بھائی) سے اصلاح لیتے تھے۔ ان شواہد کی روشنی میں مسکین ملتانی ثابت نہیں ہوتے۔ (ہل من ناصراً۔ وحید الحسن ہاشمی۔ ج ۲۔ ص۔ ۱۶)

ابھی تک حزیں اور غمگین کے مراثی تلاش نہیں کیے جا سکے۔

مسکین کے دور میں ایک اور نام ''محبؔ'' کا ملتا ہے جن کے کچھ مراثی کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہیں۔ محبؔ کے مراثی کے بارے میں کئی جگہ لکھا گیا ہے کہ انہوں نے مسدس کی ہیئت میں مرثیے کہے۔ حال ہی میں دہلی کے ڈاکٹر طاہر حسین کاظمی نے اپنی تحقیق۔ ''معاصرین مرزا دبیر۔ تقابلی مطالعہ'' میں 'محبؔ' کے بارے میں سفارش حسین رضوی کے حوالے سے لکھا ہے۔

''اس دور کے ایک نامور مرثیہ گو شاعر محبؔ کو اس لیے بھی اہمیت

حاصل ہے کہ اس عہد میں مرثیے نے مسدس کی ہیئت اختیار کر لی تھی۔"

(معاصرین مرزا دبیر۔ تقابلی مطالعہ مطبوعہ ۱۹۹۹ء)

ڈاکٹر طاہر حسین کاظمی نے محبؔ کے مسدس مرثیے کا ایک بند بھی نقل کیا ہے۔

غمگیں ہو چڑھا بیاہنے یہ کس کا بنا ہے نوبت بجے ماتم کی یہ کیوں سہرا کھلا ہے
یہ کیسا ہے دولہا کہ کفن سر سے بندھا ہے دلہن کے چلا گھر کو یا اب گور چلا ہے
موت مشاطہ ساتھ ہے لینے والی جان
ماتم اب دن بیاہ کے چلے ہیں قبرستان

مسیح الزماں نے بھی محبؔ کے کچھ بند نقل کئے ہیں جو مسدس میں ہیں اور چار مصرع ایک بحر میں اور بیت دوسرے بحر میں ہے۔

موت نے کی عرض سرورِ ذوالجناح تیار ہے سر کٹانے اب چلو رن میں تمہاری بار ہے
تب کہا شہ نے سکینہ سوتی یا ہشیار ہے آ دل لو بیکسو اب ہے جدائی کی گھڑی
ملنا ہے یہ آخری کر لے مجھ سے بین
کل روئے گی لاڈلی کر کے ہائے حسین

باپ کی لیکر بلائیں پوچھی سکینہ آہ مار آج کیا ہے مل گلے سب کے جو ہوتے ہو سوار
نہ کوئی پیدل جلو میں نہ کوئی پیچھے سوار کہاں چلی تجھ نبی زادے کی اسواری چڑھی
آج اکیلے جاؤ مت اے رن کے مہمان
باہر ظالم ہیں کھڑے لینے تیری جان

مسدس کے چار مصرعے ایک بحر میں، اور بیت دوسری بحر میں کہنے کا رجحان اس دور کے دوسرے شعراء کے ہاں بھی ملتا ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں دہلی کے مرثیہ گو شعراء میں مصطفیٰ خان یکؔ رنگ کے علاوہ جن شعراء کے مرثیے کتب خانوں میں میسر ہیں ان میں میرؔ و سوداؔ کے علاوہ محمد تقی، مرزا ہوشدار، اور قائمؔ شامل ہیں، سوداؔ اور میر تقی میرؔ دوسری اصناف سخن میں بھی مشہور ہیں۔ ان دونوں اساتذہ نے مرثیے کو ایک نیا موڑ دیا ہے کہ مرثیے کو صرف اس لئے نہیں لکھا کہ لوگ مرثیہ سن کر گریہ وزاری کریں، اُن کے مراثی اپنے عہد کے ادب کی اقدار پر پرکھے گئے۔ اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ

مرثیہ کسی حد تک امام بارگاہوں سے باہر آیا۔ اس کام کی تکمیل بعد میں جوشؔ نے کی۔

☆☆☆☆☆

مرزا سوداؔ دھلوی:-

پیدائش ۱۱۲۵ھ مطابق ۱۷۱۳ء۔ وفات ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۰ء۔

نام مرزا محمد رفیع، تخلص سوداؔ۔ غزل، رباعی، قطعات، قصائد، ہجو اور مرثیہ، کم وبیش ہر صنف سخن میں مشق سخن کی ہے لیکن سوداؔ کی شہرت قصائد، ہجونگاری اور مرثیہ گوئی کے سبب ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد ''آب حیات'' میں ان کی ہجوگوئی کے متعلق رقم طراز ہیں

''جب کسی سے بگڑتے تو فوراً غلام کو پکارتے'' ارے غنچہ لاتو قلمدان'' میں اس کی خبر لوں۔ یہ مجھے سمجھتا کیا ہے اور پھر شرم کی آنکھیں بند کرکے اور بے حیائی کا منہ کھول کر وہ بے نقط سناتے کہ شیطان بھی اَمان مانگے'' (ماخوذ از آب حیات۔ مطبوعہ لاہور ۲۰۰۲ء ص ۱۳۱)

محمد حسین آزادؔ کے اس تبصرے کا ثبوت بالخصوص مولوی ندرتؔ کاشمیری کی بیٹی کے متعلق لکھی ہوئی سوداؔ کی ہجویہ شاعری ہے۔ ہر چند کہ ندرتؔ کاشمیری نے بھی سوداؔ کی ہجو لکھی مگر شرفاء کی نظر میں'' اپنی بیٹی ہو یا دشمن کی بیٹی، سب بیٹیاں برابر ہوتی ہیں۔ سوداؔ نے ندرت کی بیٹی پر جو کچھ لکھا ہے وہ شیوۂ اشراف نہیں ہے۔

سوداؔ نے ۲۴ مثنویاں لکھی ہیں۔ قصیدہ گوئی میں بھی اُنہوں نے راہیں تراشی ہیں آزاد نے تو انہیں خاقانیٔ ہند کہا ہے۔ مرثیے اور سلام بھی بہت کہے ہیں اس زمانے میں مسدّس کہنے کی رسم کم تھی، اکثر مرثیے چومصرع میں کہے جاتے تھے، انہوں نے بھی زیادہ تر مرثیے چومصرع (مربع) میں کہے ہیں۔ اُن کے مرثیوں کی تعداد ۷۲ ہے جن میں سے ۴۸ مرثیے مربع میں ہیں۔ مربع سے مسدّس تک کے سفر میں اُن کے مرثیے کے تیور (موضوع قاسم کی شادی) درج ذیل ہیں۔

جلوے کی رات اوروں کے گھر میں ہنس ہنس دلہن سنواریں
ناک سے نتھ، ماتھے سے بندیا، یاں رو رو کے اُتاریں
دولہا کے مکھ اوپر دیکھو سبھی لہو کی دھاریں
جوں کفنی، کر چاک گریباں، خلعت بر میں پنھائی ہے

اب تک دیکھا ہے یہ کس نے بیاہ کی شادی کا معمول
یاں جو پھل ہیں سو جمدھر کے پھول جو ہیں دولہا کے پھول
صندل کی جا، ہر سمدھن نے منہ پر اپنے ملی ہے دھول
ہاروں کے بدلے اب ہر اک زنجیر پہن کر آئی ہے

اور یہی مضمون مسدس کی ہیئت میں کچھ یوں ہے ؎

کیا کروں شادی قاسم کا میں احوال رقم واسطے دیکھنے کے آرسی مصحف جس دم
بیاہ کی رات رکھا تخت پہ نوشہ نے قدم گائے تقدیر وقضا لے یہ بدھاوے باہم
قاسما مرگ جوانانہ مبارک باشد
جلوۂ شمع بہ پروانہ مبارک باشد

شعر وسخن کے معاملات میں برتری و پائندگی کا فیصلہ وقت کرتا ہے۔ چنانچہ وقت کے فیصلہ کو ہی بار بار دھرایا جاتا ہے اور دھرایا جارہا ہے کہ مرثیہ کو مسدس کی ہیئت سوداؔ نے دی جبکہ انہوں نے ۷۲ میں سے ۶ مرثیے مسدس میں کہے۔ اسی صدی میں میاں مسکینؔ اور محبؔ نے بھی مسدس میں مرثیے کہے ہیں اور محمد علی سکندر نے بھی۔ لیکن تاریخ نے اس کا سہرا سوداؔ کے سر باندھا ہے۔

☆☆☆☆☆

میر تقی میرؔ:۔

(۱۱۳۵ھ مطابق ۱۷۲۲ء۔ ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء)۔

غزل، نظم، اور جملہ اصناف سخن میں قادر الکلام شاعر میر تقی میرؔ مرثیہ نگاری میں مقام رکھتے ہیں۔ ان کے مرثیے مختلف ہیتوں میں ہیں۔ مسدس، مربع، ترجیع بند، ترکیب بند اور منفردہ وغیرہ، لیکن مربع میں زیادہ ہیں۔ ہر چند کہ میرؔ غزل کے شاعر سمجھے جاتے ہیں لیکن اُن کی غزل میں جو دھیمی دھیمی آنچ ہے وہ ان کے مرثیوں میں شعلہ بن جاتی ہے۔ میرؔ نے اپنے مرثیوں میں عوام کو رُلانے کے لئے افسانے نہیں تراشے مگر ایسے موضوعات کا انتخاب ضرور کیا ہے جو درد و سوز سے لبریز ہوں۔ اُنہوں نے گریہ و بکا کے لئے بھی مرثیے نہیں کہے۔ مرثیہ گوئی اُن کی نظر میں حصول ثواب سے زیادہ مقصدِ قربانی حسینؑ کی نشاندہی تھی۔

سوداؔ کے باب میں ہم نے کربلا میں قاسمؑ ابن حسنؑ کی شادی کی روایت کے تحت سوداؔ

کے مرثیے کا ایک بند نقل کیا تھا۔ اسی موضوع پر میرؔ کا بھی مرثیہ ہے۔ دونوں اساتذہ کے کلام میں زبان و بیان کا وہی فرق ہے جو دونوں کی غزلوں میں ہے۔

ایک کہے تھی نوشہ قاسم کب بیاہ رچایا
کیا ساعت تھی نحس وہ جس میں بیاہنے کو تو آیا
لگ گئی چپ ہے ایکی ایکا اتنی سی کیا لایا تھا
منہ بولے ہے اب تک تیرے ہاتھ کی مہندی لگائی ہوئی

میرؔ نے اپنے مرثیوں میں رنج و مصائب کے اظہار میں امام حسینؑ کی قربانی کی مقصدیت کو پیش نظر رکھا ہے۔ ''سرداد نہ داد دست در دستِ یزید'' کا پہلو میرؔ کے سامنے بھی رہا ہے۔

تمامی جود تھا سب دست ہمت سراپا دل، ہمہ تن تھا مروت
سراسر جرأت و یک لخت غیرت دیا سر، پر نہ اس نے آشتی کی

دبستانِ لکھنؤ میں اُردو مرثیے کے پہلے دور کا آغاز حیدری متوفی ۱۷۵۳ء سے ہوا جسے اودھ کا سب سے پہلا مرثیہ گو قرار دیا گیا۔ ''گلزارِ ابراہیم'' میں علی ابراہیم خلیل نے، ''گارساں وتاسی'' نے اور طبقاتِ شعرائے ہند'' میں کریم الدین نے کسی غلط فہمی کی بناء پر حیدری کو دکن کے کھاتے میں ڈال دیا۔ اس غلط فہمی کا ازالہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیبؔ نے ''حیدری مرثیہ گو'' مطبوعہ نیا دور لکھنؤ اگست ۱۹۶۳ء میں بڑی وضاحتوں کے ساتھ کیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ حیدریؔ کے اکیس غیر مطبوعہ مرثیے ان کی ذاتی لائبریری میں موجود ہیں۔ ''طبقاتِ شعرائے ہند'' میں حیدری کا سنِ وفات ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۵۳ء لکھا ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے حیدری کے ہم عصروں میں افسردہ، مقبولؔ، گدا اور احسانؔ کے نام لکھے ہیں، تذکرہ میر حسنؔ اور اُن کے بعد کے تذکروں میں محمد علی سکندرؔ کا بھی بار بار ذکر آتا ہے۔

☆☆☆☆☆

محمد علی سکندر:-

ولادت (علی جواد زیدی نے) ۱۷۲۷/۲۸ء بتائی ہے، وحید الحسن ہاشمی نے ''۱۷۱۹ء کے لگ بھگ'' لکھی ہے۔ بہر حال محمد علی سکندرؔ جو سکندرؔ پنجابی بھی کہلائے۔ اٹھارویں صدی کی پہلی

چوتھائی میں پیدا ہوئے، اُن کا سنہ وفات ۱۸۰۰ء ہے۔ محمد علی سکندر (پنجابی) پنجاب کے رہنے والے تھے لیکن پرورش دہلی میں پائی پھر فیض آباد، لکھنؤ اور حیدرآباد دکن میں بھی رہے، اُنہوں نے مقامی بولیوں میں بھی مرثیے کہے۔ انشا نے ''دریائے لطافت'' میں ان کے ایک مارواڑی زبان کے مرثیے کا بھی ذکر کیا ہے۔ اُنہوں نے مربع، مخمس، اور دیگر ہیئتوں میں بھی مرثیے کہے اور مسدس میں بھی، شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہو کہ اُردو شاعری میں مرثیے کو ''مسدس'' کی ہیئت میں لانے کا سہرا سودا کے سر باندھا گیا ہے جب کہ ایک خیال یہ بھی ہے کہ تاریخ مرثیہ گوئی میں مرثیے میں مسدس کی ہیت کو محبّ کے بعد زیادہ باقاعدگی سے سکندر نے اپنایا۔ سکندر نے عوامی زبان میں مرثیے لکھے اسی لئے عوام میں مقبول ہوئے۔ پوربی زبان میں کہے گئے مرثیوں میں فریاد و بکا کے مناظر دلوں میں درد کا طوفان جگا دیتے تھے۔ سکندر ''تذکرۂ ہندی'' کے مطابق ''ناجی'' کے شاگرد تھے۔

عباس کی بیوہ کوک اٹھی اس پانی لاون ہارے کا
مونڈھوں سے وا کے ہاتھ کٹے اور سیس کٹا بے چارے کا
بندھوا کر کٹھری دھریوں کی تابوت اٹھا دکھیارے کا
تب اور نجف کی پیر دھروں کر دھیان علی کے پیارے کا
کاندھے پہ سوکھی مشک دھرے آنسو سے ندی بہاؤں گی
تابوت اٹھائے علم لئے میں جگ دکھلاتی جاؤں گی

عصر حاضر کے ممتاز مرثیہ گو شاعر خلش پیراصحابی نے ''سرائیکی مرثیہ کے چار سو سال'' مطبوعہ میانوالی (پنجاب) ۱۹۸۰ء، میں سرائیکی زبان میں کہے گئے ایک مرثیے کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں جنہیں محمد علی سکندر سے منسوب کیا ہے۔ سکندر کے متعلق یہ تو ذکر آیا ہے کہ ان کا تعلق پنجاب سے تھا۔ ہوسکتا ہے میانوالی اور پنجاب کے سرائیکی والے علاقے سے ان کا تعلق ہو اس لئے کہ سرائیکی زبان دور سے بیٹھ کر پڑھنے والی زبان نہیں ہے، اس میں رچ بس کر سیکھنے والی زبان ہے۔ سرائیکی زبان میں کہے گئے مرثیوں اور نوحوں کو پڑھیئے تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ زبان مرثیے اور نوحے کہنے کے لئے ہی بنائی گئی ہو۔ سرائیکی زبان میں سکندر سے منسوب اشعار اس فکر کی تائید کرتے ہیں:

بی بی صغرا پیو دے غم وچ رو رو حال ونجایا
کھڑی رہے چوکٹ تے اُتے، اندر پیر نہ آیا
گودی لے کے ام سلمیٰ اندر لابٹھایا
ہنجو پونجے چھاتی لاوے گلاں کرسمجھایا
نہ رو میڈی لاڈلی ہنجوں بھر بھر نین
جھے شام کوں آ دیسی تیرا باپ حسینؑ

اس سے اندازہ ہوا کہ سکندر نے مختلف زبانوں میں مرثیے کہے ہیں۔ ذیل میں درج ان کے ایک مرثیے کو ایک سے زیادہ تذکرہ نگاروں نے نقل کیا ہے جس کی زبان مختلف ہے۔

ہے روایت شتر اسوار کسی گا تھا رسول
اس جگہ شہر مدینہ میں ہوا اس گا نزول
جس محلے میں کہ رہتے تھے حسینؑ ابن بتول
اک لڑکی کھڑی دروازے پہ بیمار و ملول
خط لئے کہتی تھی پردے سے لگی زار و نزار
ادھر آ تجھ کو خدا کی قسم اے ناقہ سوار

علی جواد زیدی نے ''العلم'' بمبئی کے مرثیہ نمبر مطبوعہ اگست ۱۹۹۲ء میں اس مرثیے کے ۲۷ بند نقل کئے ہیں جن میں مقطع کا بند بھی ہے۔

التماس اب تو سکندر کا یہ ہے یا اللہ میرے مکتوب سے یوں طول عمل ہو کوتاہ
نہ رہے جس کی سطر میں بھی کہیں ایک گناہ واسطہ فاطمہ صغرا کا ہو بخشش کی نگاہ
ایسا رحمت سے مرے جرم کا نامہ دھو ڈال
ہووے شبیرؑ کی خاطر میرا منظور سوال

☆☆☆☆☆

مرزا گدا :-

مرزا گدا علی گدا کا زمانہ ۱۷۴۵ء سے ۱۸۱۶ء بتایا گیا ہے۔ علی جواد زیدی نے '' جدید مرثیے کے بانی ضمیر لکھنوی '' میں تاریخ وفات ۱۸۱۸ء ہے۔ گدا کی وفات اگر چہ ۱۸۱۶ء یا

۱۸۱۸ء میں یعنی انیسویں صدی میں ہوئی ہے مگر ان کا شمار اٹھارویں صدی کے مستحکم شاعروں میں کیا گیا ہے۔ ان کے مرثیوں میں بالعموم اجتماعی طور پر مصائب اہل بیت بیان کئے گئے ہیں اور کسی ایک مرثیے میں کسی ایک شہید کی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ امام حسینؑ کی شہادت تقریباً ہر مرثیے کا موضوع ہے۔

گدا کے مرثیوں کا مخصوص ڈھانچہ نہیں ہوتا تھا۔ ان کے مرثیوں میں کربلا کے واقعات میں درد انگیز پہلوؤں کا بیان ہوتا تھا۔ مرثیہ ابتدائی طور پر کسی واقعہ سے شروع ہوتا تھا جسے شہادت سے ربط دے کر گریہ وزاری تک آتے تھے۔

پھر منہ طرف مدینہ کے کر کے وہ سوگوار
کرنے لگی رسول کی خدمت میں یوں پکار
تیرا وہی حسینؑ ہے اے جدِ نامدار
آیا ہے شہر شام میں برچھی چڑھا ہوا

افسوس یہ وہ لب ہیں جو تیرے تھے بوسہ گاہ
سو آج ان لبوں کو وہ ملعون رو سیاہ
ہے چھیڑتا چھڑی تئیں یوں کہہ کے واہ واہ
کیوں تو تمام خلق کا سردار تھا ہوا

اور مسدس میں گدا کے مرثیے کا انداز دیکھئے۔

اسے میں جور کہوں آہ یا جفا بولوں
اسے ستم کہوں یا جورِ اشقیاء بولوں
اسے قدر کہوں افسوس یا قضا بولوں
میرے حواس نہیں کیا میں اے خدا بولوں
کہاں ستم، کہاں کاشانۂ رسول اللہ
کہاں وہ شامی کہاں خانۂ رسول اللہ

☆☆☆☆☆

احسانؔ:-

سکندرؔ اور گداؔ کے عہد میں احسانؔ کا نام بھی ملتا ہے۔ مرزا رجب علی بیگ سرورؔ نے فسانۂ عجائب'' کے دیباچے میں دلگیر کے ساتھ لکھنؤ کے مرثیہ گویوں میں احسانؔ کا نام بھی لکھا ہے۔ احسانؔ کا زمانہ متعین کرنے میں ان کے مرثیوں کی ساخت اور زبان سے مدد ملتی ہے۔

قاسم کی جا کے لاش اوپر پھر وہ غم زدہ
گھٹنوں کو ٹیک بیٹھ گیا کہنے یوں لگا
نوشاہ اپنے منہ سے تو سہرا ذرا ہٹا
صغرا کا نامہ آیا ہے اس میں ہے یہ لکھا
تم نے بیاہ واں جو کیا اے حسنؔ کے پوت
آؤں گی تیگ لینے میں منہ پر ملے بھبھوت

اس مرثیے سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ احسان کا مرثیہ ذرا پہلے دور کا ہے لیکن ان کے دیگر مراثی انہیں سکندرؔ اور گداؔ کے شانہ بشانہ کھڑا کر دیتے ہیں۔ مثلاً ان کے ایک مرثیے: '' بالی سکینہ جاگی ہوئی ساری رات کی'' میں باپ کے میدانِ جنگ میں جاتے وقت بچی اصرار کرتی ہے کہ وہ بھی بابا کے ساتھ جائے گی دیکھئے احسان نے اس منظر کو کیسے ابھارا ہے۔

بس بابا جان فکر نہیں ہے میری ضرور
جانا جدھر کو رکھنا مجھے اپنے ہی حضور
چھوٹے سے سن میں دل کو میرے کیجیو نہ چور
پیادہ ہی لے چلو مجھے گھوڑے سے دور دور
جی ملنے کو جو چاہے گا مجھ تشنہ کام کا
اوں گی شکار بند پکڑ خوش خرام کا
میرے تئیں سواری میں گر کوئی دیکھ کر
پوچھے گا کون پیچھے یہ آتی ہے نوحہ گر
پکڑے شکار بند جو ہے یہ بہ چشم تر
بابا نہیں بتاؤں گی بولوں گی آہ بھر

نہ ان کی بیٹی ہوں نہ میں ان کی عزیز ہوں
میں زرخرید چھوٹی سی ان کی کنیز ہوں

☆☆☆☆☆

افسردہ:-

پناہ علی بیگ افسردہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ''طبقاتِ شعرائے ہند'' اور ''یادگار شعراء'' جیسی کتابوں میں افسردہ کے ذکر سے پتہ چلتا ہے کہ افسردہ کو اپنے ہم عصروں پر سبقت حاصل تھی۔ ان کے مرثیوں میں دردانگیزی بہت تھی۔ اکثر جگہوں پر بین رقت اور گریہ کا سبب بنایا گیا ہے۔ افسردہ کے مرثیے بھی ان کے ہم عصر احسان، گدا، اور حیدری کی طرح کہیں شائع نہیں ہوئے۔ علی جواد زیدی نے لکھا ہے کہ افسردہ نے عہد غازی الدین حیدر شاہ اودھ میں مراثی کی سات جلدیں مرتب کی تھیں جو ان کے ورثاء نے بیچ دیں لیکن کہا جاتا ہے کہ سید مسعود حسن رضوی کے ذخیرۂ مراثی میں افسردہ کے ۲۲۰ مرثیے محفوظ ہیں۔

(جدید مرثیے کے بانی ضمیر لکھنوی۔ ص، ۲۳)

میر ضمیر اور میر خلیق کے دور سے پہلے افسردہ نے مرثیے کے فن کو ترقی کی منزلوں پر پہنچایا اور مرثیے میں اعلیٰ ادبی معیار کو اُجاگر کیا۔ افسردہ کا زمانہ اٹھارویں صدی کا آخری زمانہ اور انیسویں صدی کے ابتدائی حصے پر محیط ہے۔ مسیح الزماں نے کریم الدین کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> ''استادریافت ہوا کہ یہ شاعر مرثیہ گوئی میں اپنے ہم عصروں پر سبقت لے گیا تھا اس کے مرثیے میں رقت بہت اور مضامین اچھے اچھے ہیں''۔ (طبقات الشعراء)

ان کے انداز کی ایک مثال: علی اکبر میدان کو جارہے ہیں۔ بیبیوں سے رخصت ہورہے ہیں۔ سکینہ دامن پکڑ لیتی ہے:

کہا سبھوں نے سکینہ سے اے بچی ناداں
تو اپنے ہاتھ سے بھائی کا چھوڑ دے داماں
نہ روک اس کو یہ ہوتا ہے عازم میداں
دیا جواب سکینہ نے یوں بہ آہ و فغاں

کوئی نہ بولو بہن بھائی ہم سمجھ لیں گے
بہن کی بات کا بھائی جواب کچھ دیں گے

ایک اور مثال ؎

بانو کہتی تھی کہ میں گود دکھاؤں کس کو
لال زخمی ہے پڑا چھاتی لگاؤں کس کو
چھوٹے چھوٹے یہ شلوکے میں پنھاؤں کس کو
جھولنے والا سدھارا میں جھلاؤں کس کو

اتنی سے عمر میں جا تیر کی پیکاں کھائی
تیری اے لال منڈھی بیل نہ چڑھنے پائی

کتب خانہ سالار جنگ میں موجود افسردہ کے مرثیے پر سال کتابت ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۰ء ہے۔ ایک دوسرے مرثیے پر ۱۲۲۲ھ ۱۸۰۷ء کی مہر لگی ہوئی ہے۔ جس سے تصدیق ہوتی ہے کہ افسردہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں اور انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں مرثیہ گو کی حیثیت سے مقبول ہوئے تھے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا افسردہ کے مرثیے شائع نہیں ہوئے لیکن کتب خانوں میں اور نجی ذخیروں میں محفوظ ہیں۔ اب کوئی واجد علی شاہ، یا راجہ صاحب محمود آباد گھرانے سے تو ہونے سے رہا جو مدفون قومی خزانے کو ملت کے سپرد کرنے پر زر کثیر خرچ کرے۔

اردو مرثیے کے باب میں خاندانِ میر انیس کے نامور شعراء میں میر ضاحک (میر انیس کے پردادا) سے لے کر میر عارف کے چھوٹے صاحبزادے میر لائق لکھنوی تک کا جگہ جگہ تذکرہ ملتا ہے۔ اس افق کے چاند تاروں کے بغیر مرثیے پر گفتگو نامکمل سی لگتی ہے، اس لئے افسردہ کے بعد میر خلیق سے پہلے میر ضاحک اور میر حسن کا تذکرہ کئے بغیر بات آگے نہیں بڑھتی۔

☆☆☆☆☆

میر ضاحک دہلوی :-

میر ضاحک کا اسم گرامی میر غلام حسین اور تخلص میر ضاحک دہلوی تھا۔ سن ولادت کسی تذکرے میں نہیں ملتی حتیٰ کہ ان کے اپنے فرزند میر حسن (شہرۂ آفاق مثنوی سحرالبیان کے مصنف) نے تذکرہ شعرائے ہندی میں اپنے والد کی علمی صلاحیتوں کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ عربی فارسی کے

عالم تھے مگران کا سن ولادت کہیں نہیں لکھا صرف یہ ذکر کیا ہے کہ ۱۷۴۷ء میں دلی سے نواب صفدر جنگ کے عہد میں فیض آباد منتقل ہو گئے تھے۔

محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں میر ضاحک دہلوی کی بود و باش کا ذکر کیا ہے۔ میر ضاحکؔ شعر و شاعری کے علاوہ موسیقی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ہنسنے ہنسانے والے انسان تھے لیکن زندگی میں کچھ ایسی تلخیاں آ گئی تھیں کہ سب کو چھوڑ کر ہزل گوئی کو شعار بنالیا۔ میر حسنؔ نے لکھا ہے کہ ہزل اور ہجویہ شاعری میں جو زبان استعمال کی ہے وہ کسی متنفس نے نہیں کی ہوگی۔ تذکرہ ''خندہ گل'' کے مطابق میر ضاحکؔ نے مولوی ساجد اور مرزا رفیع سودا کی ایسی ہجویں لکھی ہیں کہ اہل زبان سن کر بھڑک بھڑک گئے۔ ہجویہ شاعری میں ضاحکؔ تخلص استعمال کرتے تھے جس کے معنی ہنسنے ہنسانے والا ہے۔ مرثیوں اور مذہبی شاعری میں غلام حسین یا غلام تخلص نظم کرتے تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان کے سن وفات پر بھی اتفاق نہیں ہے جو ۱۱۹۶ھ (مطابق ۱۷۸۱ء) بتایا گیا ہے۔

میر ضاحکؔ کے سلاموں کا مجموعہ دریافت ہوا ہے مگر ان کے مراثی کہیں نہیں ملتے حتی کہ مسعود حسن رضوی ادیب کی تصنیف ''اسلاف انیسؔ'' میں بھی اُن کے مراثی نہیں ملتے البتہ سید ضمیر اختر نقوی نے ایک مرثیے کے ۹ بند میر ضاحکؔ کے نام نامی سے منسوب کئے ہیں۔ مرثیے کی زبان اُس عہد کی ہے لیکن اس کے علاوہ کوئی اور قابل یقین سند سامنے نہیں آئی۔

تازی شہ مظلوم کا جب رن سے گھر آیا
تب جانا سکینہ نے کہ شاید پدر آیا
جا دیکھا تو لوہو بھرا گھوڑا نظر آیا
دوڑی کہ اماں بابا موا قہر اب آیا
یہ سنتے ہی بانو نے گریبان کو پھاڑا
تھ پھینک کے یکبار حرم کو جو پکارا
ہے بیبیو یہ گھوڑا میرے شاہ کا پیارا
زیں ڈھلکا ہے لوہو میں بھرا ڈیوڑھی پر آیا

ہو سب کے تئیں ساتھ لے وہ بیوہ بے چاری
گھوڑے کنے آ، کر نے لگی نالہ و زاری
کہہ تازی مجھے کیوں کر لگے زخم یہ کاری
اسوار تیرا کیا ہوا جو تو ادھر آیا

☆☆☆☆☆

میر حسنؔ :-

ولادت ۱۷۲۳ء۔ وفات ۱۷۸۶ء۔

نام میر غلام حسن تخلص حسنؔ۔ میر غلام حسینؔ ضاحکؔ کے فرزند، میر انیسؔ کے دادا۔ میر حسنؔ کو اللہ نے چار فرزند عطا کئے۔ میر خلقؔ، میر خلیقؔ، میر مخلوقؔ اور میر محسنؔ۔ چاروں مرثیہ گو شاعر، گویا میر حسنؔ، مرثیہ گو بزرگوں اور بچوں کے جھرمٹ میں ایک ایسا چاند جس کی روشنی اس وقت تک رہی جب تک اس خانوادے کی آخری قندیل میر عارفؔ کے چھوٹے صاحبزادے میر لائق ۸ رمئی ۱۹۷۷ء کو اس دنیا سے رخصت نہیں ہو گئے۔

کہنے کو تو میر حسنؔ نے پانچ مثنویات کہیں جن میں سحر البیان، گلزار ارم، رموز العارفین، حویلی قصر جواہر، شادی اور تہنیت شامل ہیں مگر میر حسنؔ کو مثنوی سحر البیان سے عالمگیر شہرت ملی۔ اُن کی ایک اور اہم تخلیق ''تذکرہ شعرائے ہندی'' ہے۔ میر حسنؔ نے اپنی کلیات خود ہی مرتب کی مگر وہ شائع نہ ہو سکی۔ میر حسنؔ کی مرثیہ گوئی پر کئی ناقدین نے مضامین لکھے ہیں لیکن اُن کے مراثی کہیں شائع نہیں ہوئے جس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ مرثیہ گو نہیں تھے، اُن کی شہرہ آفاق مثنوی سحر البیان، کے دیباچے میں میر شیر علی افسوسؔ نے میر حسنؔ کی مرثیہ گوئی کا ذکر کیا ہے، خود میر حسنؔ نے ''تذکرہ شعراء ہند'' میں لکھا ہے کہ ''نواب سالار جنگ کی فرمائش پر مرثیہ کہنا ہوتا ہے''۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے ''اسلاف میر انیس'' میں اُن کے تین مرثیوں کے اقتباسات شائع کئے ہیں جن کے مصرع ہائے اولیٰ حسب ذیل ہیں ۔

۱۔ جب سکینہ نے سنا گھر میں کہ وہ سرور گیا (مربع) ۳۷ بند
۲۔ سکھ حسن کو نہ ہو دنیا میں یہ دکھ پائے حسینؑ (مربع) ۴۴ بند
۳۔ جب دشت میں شبیر کا لشکر گیا مارا (مسدس) ۲۶ بند

پہلے مرثیے کے تین مختلف بند مسیح الزماں نے بھی نقل کئے ہیں ۔

جن نہالوں کے تئیں زہرا نے پالا دودھ دے
وے شجر بن پانی مرجھا کر زمیں پر گر پڑے
بیخ و بنیاد اُن کی کھودی باغیوں نے تیغ سے
موسم گلزار احمد کا سماں بندھ کر گیا

متصل مقتل کے پہنچے جس گھڑی اہل حرم
دیدہ گریاں، سینہ بریاں، خشک لب اور چشم نم
دیکھ کر بوتھوں کو سب کہنے لگے با درد و غم
ہاتھ سے اہل جفا کے کیا ستم اُن پر گیا

یک بیک عابدؑ کی اتنے میں گئی اودھر نظر
جس طرف لوتھیں پڑی تھیں خاک و خوں میں سر بسر
دیکھ اس احوال کو بولا وہ یوں اک آہ بھر
آہ میں کیدھر رہا اور قافلہ کیدھر رہا

(اُردو مرثیے کا ارتقاء۔ مسیح الزماں۔ ص۔ ۱۲۲)

''خاندان انیس کے شعراء'' میں سید ضمیر اختر نقوی رقمطراز ہیں کہ اُن کے کتب خانے میں ''کلیات میر حسنؔ'' کے دو نادر نسخے موجود ہیں جن میں سے ایک زاہد سہارنپوری (شاگردِ امیر مینائی) کا مکتوبہ ہے۔ اس نسخے میں میں تمام اصناف کے علاوہ مرثیے۔ سلام اور نوحے ہیں۔ اپنی اس کتاب میں میر حسنؔ کے باب میں اُنہوں نے میر حسنؔ کے دو مرثیے شائع کئے ہیں جو مسدس میں ہیں۔ ایک مرثیے کے مطلع کا ایک شعر نقل کیا ہے ۔

شکر ہے ناتا نہیں ہے قیصر و سلطان سے
ہے میرا رشتہ نبی اور حیدرِ یزدان سے

اور اس کے بعد اس مرثیے کے ۱۵ منتخب بند شائع کئے ہیں جن میں سے دو بند درجِ ذیل ہیں ۔

یک بیک غش ہوگئی زینبؑ یہ کہہ کر اونٹ پر
بی بیاں یہ دیکھ حالت تب اُنہیں واں پیٹ سر
اتنے میں پھر چونکی زینب سن کے یہ شور اور شر
اور بولی اس طرح سے بافغاں فریاد کر
بھائی صدقے تیرے دکھلا جلد صورت کے تئیں
تجھ بغیر اب مجھ میں صبر و ہوش ہے باقی نہیں

خواہر شبیر نے جب یہ فغاں فریاد کی
آہ بھر اور سوز دل لخت جگر سے جب اُٹھی
گھر میں اس ظالم کی جورو نے بھی تب یہ غُل سنی
گھر میں پوچھا لونڈیوں سے کیسی ہے یہ غُل مچی

تب کہا ان لونڈیوں نے کیا کریں اظہار ہم
اہل بیتِ مصطفیٰ روتے ہیں اونوں پر بہم

دوسرا مرثیہ ـ زنداں میں جب حسینؑ کی بیٹی گذر گئی ہے۔ یہ بھی مسدّس میں ہے اس کے ۲۳ بند نقل کئے گئے ہیں جن میں سے دو بند درج ذیل ہیں۔

زنداں میں جب حسینؑ کی بیٹی گذر گئی بیکس پدر کا گود میں سر لے کے مرگئی
چلاّ رہی تھی ماں میری بیٹی کدھر گئی زنداں میں ماں کو چھوڑ کے دادی کے گھر گئی
کیسی یہ بات ہوگئی خستہ جگر کے ساتھ
دادی کے پاس خلد میں پہنچی پدر کے ساتھ

ماں اب جئے گی کس کے سہارے سکینہ جاں جائی ہے کون پاس ہمارے سکینہ جاں
اکبر جواں جہاں سے سدھارے سکینہ جاں اصغر بھی تیر سے گئے مارے سکینہ جاں
تم بھی چلیں مزار میں سونے کے واسطے
اماں کو چھوڑ جاتی ہو رونے کے واسطے

سیّد ضمیر اختر نقوی نے اگرچہ یہ نہیں لکھا کہ ''زنداں میں جب حسینؑ کی بیٹی گذر گئی'' کہاں سے دستیاب ہوا۔ اس صورت حال میں یہی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ مرثیہ اُنہوں نے 'سحر البیان' کے اُس ''خصوصی نسخے'' سے لیا ہوگا جو، اُن کے کتب خانے میں موجود بتایا گیا ہے۔ ہر چند کہ سید ضمیر اختر نقوی سے پہلے کے اور ان کے ہم عصر ناقدین کی نظر میں میر حسن کے تین مرثیے (دو مربع اور ایک مسدّس) رہے ہیں پھر بھی اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ ضمیر اختر نقوی نے دو مراثی بہ ہیئت مسدّس مزید دریافت کئے ہیں، تو غور طلب پہلو یہ ہے کہ ان دو مرثیوں کی زبان۔ بالخصوص ''زنداں میں جب حسینؑ کی بیٹی گذر گئی'' کی زبان میر حسنؔ کے عہد کی زبان بھی نہیں ہے اور اُن کے ان تین مرثیوں کی زبان سے بھی مختلف ہے جن میں سے ایک مرثیے (مربع) کے تین بند درج بالا ہیں۔ بہرحال اس بحث سے درگزر، میر حسنؔ کی مرثیہ گوئی ادبی اور تاریخی طور پر مسلّم ہے۔

☆☆☆☆☆

میر خلیق :-

ولادت ۱۷۶۶ء، وفات ۱۸۴۴ء

اودھ میں بالخصوص لکھنؤ میں اُردو مرثیے کا دوسرا اور تعمیری دور انیسویں صدی میں میر خلیق سے شروع ہوتا ہے۔ مسیح الزماں نے اسے دورِ تعمیر کہا ہے۔ میر مستحسن خلیق، فرزند میر حسن اپنے والد گرامی میر حسن اور مصحفی کے شاگرد تھے۔ میر خلیق پر سید مسعود الحسن رضوی نے سیر حاصل کام کیا ہے جس میں شاید اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔ میر خلیق نے طویل عمر پائی۔ ان کے تین فرزند میر انیس، میر انس اور میر مونس افق مرثیہ گوئی پر ایسے چاند سورج بن کر طلوع ہوئے جو اس وقت تک روشنی دیتے رہیں گے جب تک روئے زمین پر ذکرِ حسین باقی ہے۔ ان کے جدِ اعلیٰ میر ضاحک دہلی سے فیض آباد آن بسے تھے لیکن میر خلیق لکھنؤ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ میر خلیق نے سولہ برس کی عمر سے شاعری شروع کی تھی۔ لکھنؤ کے مشہور مرثیہ نگاروں میں میر خلیق ہی ایسے شاعر ہیں جن کے مرثیے شائع نہیں ہوئے۔ ''موازنہ انیس و دبیر'' میں شبلی نے لکھا ہے کہ میر نواب حسن نامی ایک بزرگ نے جو میر خلیق، میر مونس اور میر انیس کے متعدد مرثیے جمع کئے تھے لیکن میر خلیق کے جو مرثیے اس مجموعے میں شامل تھے آج میر انیس کے نام سے مشہور ہیں۔ خود راقم الحروف نے آج سے کم و بیش چالیس پینتالیس برس پہلے ایک مرثیہ۔

''گھر سے جب بہرِ سفر سیدِ عالم نکلے''

میر انیس کے مرثیے کے طور پر کئی بار سنا تھا۔ میر خلیق، میر انیس کے والد گرامی بھی تھے اور اُستاد بھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ عہد انیس کے نوابین میر انیس کے مداحوں میں شامل رہے ہیں لیکن میر انیس کو کبھی خیال نہیں آیا کہ اپنے والد گرامی اور اپنے استاد میر خلیق کے مرثیوں کی کوئی جلد شائع کرادیں جبکہ اہل منصب وجاہ و اقتدار ان کے اشاروں کے منتظر رہتے تھے۔ میر خلیق کے مرثیوں میں صاف زبان اور صحت کے ساتھ محاروں کا استعمال ان کی شاعری کے نمایاں عناصر ہیں۔ رخصت کے مناظر ان مرثیوں بہت ملتے ہیں اور اکثر مرثیوں کی ابتداء براہِ راست رخصت کے مناظر سے ہوتی ہے۔ ایک طرح سے ان کی پہچان رخصت اور بین کی شاعری ہے۔

جس وقت طبلِ جنگ بجا فوجِ شام میں کوشش ہر ایک کرنے لگا ننگ و نام میں
تھا شور الوداع کا شہ کے خیام میں اکبرؔ نے کی یہ عرض جناب امام میں

حضرت بھی جلد خیمے سے رَن کو سوار ہوں
تاجان نثار آپ کے اوپر نثار ہوں

اب ہم سے دیکھی جاتی نہیں ان کی سرکشی ہوئی صدائے طبل تو حضرت نے بھی سنی
کھولے نشان، باندھے صفیں لشکر شقی پیاسوں سے مستعد ہے لڑائی پہ اس گھڑی
ان کے شریک ہیں رفقاء دُور دُور کے
مانگیں ہیں اذنِ جنگ، ملازم حضور کے

ایک اَور مرثیے کی ابتدا اس انداز سے ہوتی ہے۔

تیاری ہوئی جنگ کی جب لشکرِ کیں میں اور نکلے ہر اک صف سے کماں دار کمیں میں
کمریں لگیں بندھنے رفقائے شہِ دیں میں شبیر گئے خیمۂ بانوئے حزیں میں
فرمایا تحمل نہیں اب فوجِ ستم کو
اللہ کو سونپا تمہیں، رخصت کرو ہم کو

میر خلیق کے لکھنؤ میں سکونت پذیر ہونے سے قبل ہی (امام بخش) ناسخ سے ان کے تعلقات تھے۔ میر خلیق جب بھی لکھنؤ آتے تھے تو ناسخ سے ضرور ملتے تھے۔ ناسخ کا تعلق بھی فیض آباد سے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۲۳۲ھ میں جب انیس لکھنؤ آئے تو میر خلیق بیٹے کو ناسخ سے ملانے لے گئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ناسخ نے ہی میر ببر علی کو ''انیس'' تخلص دیا۔ آزاد نے لکھا ہے کہ ناسخ اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ زبان سیکھنی ہے تو میر خلیق کے ہاں جایا کرو۔ خلیق کی زبان دانی اور شعر گوئی کی قدرت کو ہر نقاد نے تسلیم کیا ہے۔ کسی نے ناسخ کے سامنے ایک مصرع

''لیلاف پڑھی اور اسے دودھ پلایا''

پڑھا اور کہا یہ میر خلیق کا مصرع ہے۔ ناسخ نے کہا میر خلیق کے ہاں غلطی نہیں ہوسکتی۔ میر خلیق نے یوں کہا ہوگا ؂

''پڑھ پڑھ کے لایلاف اسے دودھ پلایا''

اور میر خلیق ایسے باکمال شاعر کے متعلق دیگر شارحین اور ناقدین کی آراء پڑھنے کے بعد جب میر خلیق کا مرثیہ دراحوالِ علی اکبر سامنے آتا ہے تو خطائے اجتہادی کے معنی بھی سمجھ میں آتے ہیں۔

بانو نے سنا رن کی طرف جاتے ہیں اکبر اور مجھ سے بھی رخصت کے لئے آتے ہیں اکبر
روتے ہیں جو سرور انہیں سمجھاتے ہیں اکبر بابا کو سفارش کے لئے لاتے ہیں اکبر

کہنے لگی بانو کہ یہ ارمان نکل جائے
اللہ کرے تن سے میری جان نکل جائے

میر خلیق کے عہد میں افق ادب پر ایک کہکشاں سجی تھی۔ ناسخ، آتش، مرزا فصیح، میر ضمیر، دلگیر ایک سے ایک روشن ستارہ تھا۔ میر خلیق اور میر ضمیر کی چشمکوں کا احوال اہل لکھنؤ جانتے ہیں مگر یہ چشمکیں ادبی ہوا کرتی تھیں۔ دونوں استاد تھے، دونوں کا خاندانی پس منظر تھا۔ دونوں عالم تھے۔ دونوں اپنی اپنی جولانی طبع کے جوہر دکھاتے تھے۔ آج کی طرح نہیں کہ غلاظت کے ہر ڈھیر سے خوشبوؤں پر پتھر پھینکے جاتے ہیں۔ گم کردہ نسب لوگ، اشراف کے منہ لگتے ہیں۔ مرثیے کے حوالے سے ان کے معاصرین میں افسردہ، جرأت، گدا کے علاوہ کچھ اور بھی نام ہیں جو مرثیے کی دنیا میں اہم نام ہیں۔

میر خلیق کے شاگردوں میں سب سے اہم ان کے اپنے فرزندان میر انیس، میر انس، میر مونس، کے علاوہ رشک لکھنوی، مقرب سیتاپوری، میر علی اکبر تپاں جیسے کئی اور نام ہیں۔ غزل کی دنیا میں بھی میر خلیق استاد تھے۔ ان کی غزلیات کے کئی دیوان شائع ہوئے ہیں۔ غزلوں کا احتساب ہمارا موضوع نہیں ہے مگر ناسخ نے میر خلیق کی زبان دانی کے متعلق جو کہا ہے اس کی تصدیق کے طور پر چند اشعار نذر قارئین ہیں ۔

اشک جو چشم خوں فشاں سے گرا
تھا ستارا کہ آسماں سے گرا
شیشۂ دل تو چور ہو جاتا
کوئی پتھر نہ آسماں سے گرا
میں نے آنکھوں پہ لے لیا اس کو
پھول جو دست باغباں سے گرا

کیسی صاف ستھری گومتی میں دھلی ہوئی زبان ہے، (اہل زبان سے معذرت کہ میں غزل کی زبان کو کوثر میں دھلی ہوئی زبان نہیں کہہ سکتا)۔

پروفیسر نیر مسعود اپنے ایک مضمون "ایک نادر مجموعہ مراثی اور مرثیہ ہوتی" مطبوعہ "العلم" ممبئی جلد اوّل، شمارہ ۵ میں رقم طراز ہیں کہ کتب خانہ پروفیسر مسعود حسین ادیب میں میر خلیق کے ۲۲ مراثی کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ اُنہوں نے ان مراثی کے مصرع ہائے اولیٰ بھی درج کئے ہیں۔

☆☆☆☆☆

مرزا جعفر علی فصیح :- (فیض آبادی)

مصحفی کی "ریاض الفصحا" کے مطابق پیدائش ۱۷۷۲ء ہے۔ ان کے والد گرامی مرزا ہادی خوش نویس، نواب شجاع الدولہ کے عہد میں لکھنؤ آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ کئی بار حج وزیارات پر گئے۔ جب بھی جاتے تھے، کافی دنوں مقامات مقدسہ پر قیام کرتے تھے۔ شاید اسی لئے شاد عظیم آبادی نے لکھا کہ آخری زمانے میں مکہ معظمہ میں تھے اور وہیں پیوند خاک ہوئے جبکہ ایک رائے یہ ہے کہ آخری عمر میں لکھنؤ آئے اور "گھاس کی بغیا" میں دفن کئے گئے۔ عجیب بات ہے کہ سن وفات دونوں تذکروں میں نہیں ہے۔ شاید دو آرا بھی اسی سبب سے ہوئی ہوں کہ تاریخ وفات معلوم نہیں ہے۔

مرثیے کی علمی حیثیت دینے میں فصیح نے احادیث اور واقعات کو صحت اور ذمہ داری سے پیش کرنا شروع کیا اور شہدائے کربلا کے کرداروں میں مظلومیت کے ساتھ ساتھ ایک عارفانہ شان پیدا کی جس سے ان کے کردار، ان کی عظمت اور قربانی کو نئے تیور سے ابھارا۔ نہ جانے اہل نقد و نظر نے فصیح کی کاوشوں کو نئے مرثیے کی طرف اقدام قرار کیوں نہیں دیا۔ فصیح نے مروجہ بحور کے علاوہ دیگر بحور میں بھی مرثیے کہے ہیں۔

کہا رو کے باپ نے اے پسر جو امام زادہ ہے صبر کر
یہ مصیبتیں ہیں شرف ترا، نہ ملول ہو، نہ ہو چشم تر
اسی زندگی میں تو ہے مزا کہ جو موت سے ہے شدید تر
کہ ہے سر کٹانے میں برتری، نہیں ناگوار وہ اس قدر
ہمیں ہر نفس دم تیغ ہے، ہمیں ہر قدم پہ جہاد ہے
یہی درد اپنی پسند ہے، یہی رنج اپنی مراد ہے

پروفیسر اکبر حیدری کا ترمیم کردہ مرزا فصیح کا ۳۵ بند پر مشتمل مرثیہ حال ہی میں سامنے

آیا ہے جس کے متعلق اکبر حیدری کا دعویٰ ہے کہ اس مرثیے کی ایک نقل اُن کے پاس ہے اور دو نسخے ذخیرۂ مسعود میں موجود ہیں۔ (یہ دو نسخے کیوں اور کیسے ہیں۔ اس زمانے میں تو فوٹو کاپی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ ہوسکتا ہے قلمی نقول ہوں کہ اس وقت اور کسی دستاویز کی نقل قلمی بنائی جاتی تھی)

رن میں اصغر گلا کٹا کے پھرے   نہ پیا پانی تیر کھا کے پھرے
جیتے آئے تھے جی گنوا کے پھرے   جو شہیدوں کی سی بنا کے پھرے
چھوٹنے سے بن میں کیا سعید ہوئے
باپ کی گود میں شہید ہوئے

جب لگا تیر جانے رقت تھی   نہ کیا گریہ کیا شجاعت تھی
باپ سے کس قدر محبت تھی   آخری وقت بھی یہ صورت تھی
نہ اِدھر دیکھا، نہ اُدھر دیکھا
مسکرا کر رخِ پدر دیکھا

☆☆☆☆☆

میر ضمیر:۔

سنہ ولادت ۱۱۹۷ھ ۱۷۸۲ء کے لگ بھگ۔ وفات ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۵ء

نام سید مظفر حسین، تخلص ضمیر۔ وطن (کتاب "حیاتِ دبیر" اور کتاب "دربارِ حسین" کے مطابق) میر ضمیر کے آباؤ اجداد قصبہ پنکھور ضلع گوڑ گانواں (سابق مشرقی پنجاب) کے رہنے والے تھے اور میر ضمیر کی پیدائش یہیں ہوئی تھی—

میر ضمیر، مصحفی کے شاگرد اور مرزا دبیر کے اُستاد تھے— پہلا مرثیہ ۲۳ برس کی عمر میں (۱۲۲۰ھ) ۱۸۰۵ء میں کہا جو جناب صغرا کے حال پر تھا، پہلے ہی مرثیے نے میر ضمیر کو مرثیہ نگاروں میں شامل کرادیا، (۱۲۲۹ھ) ۱۸۱۳ء تک میر ضمیر کی مرثیہ گوئی کی شہرت ہوچکی تھی، موازنہ "انیس و دبیر" میں شبلی نے لکھا ہے:

> "سب سے پہلے جس شخص نے مرثیے کو موجودہ طرز کا خلعت پہنایا ہے وہ مرزا دبیر کے استاد ضمیر ہیں"

گویا موجودہ مرثیے کی موجودہ ہیئت کا تعین ضمیر کے عہد میں ہوا۔ شبلی کی تحریر کو شاید

میر ضمیرؔ کے اس مرثیے ''کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے'' سے تصدیق ملی ہو۔

جس سال لکھے وصف یہ ہم شکلِ نبی کے   سن بارہ سو انچاس تھے ہجری نبوی کے
آگے تو یہ انداز سنے تھے نہ کسی کے   اب سب یہ مقلد ہوئے اس طرزِ نوی کے
دس میں کہو، سو میں کہو، یہ درد ہے میرا
جو جو کہے اس طرز میں، شاگرد ہے میرا

اس بند میں ''طرزِ نوی'' سے غلط فہمی ہوتی ہے کہ شاید مرثیے کے عروج کی شکل یعنی چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت اور بین، میر ضمیرؔ کی دی ہوئی ترتیب ہے۔ شبلیؔ کا بیان میر ضمیرؔ کے دعوے کو سہارا دیتا ہے۔ اہل نقد و نظر کی بحث اپنی جگہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میر ضمیرؔ نے مرثیہ کو ایک قابل قدر روایت دی جسے آنے والوں نے اپنی اپنی صلاحیتوں سے آگے بڑھایا۔ مسیح الزماں لکھتے ہیں کہ میر ضمیرؔ کے عہد کا لکھنؤ عیش و عشرت کے لئے مشہور تھا لیکن اس کے ساتھ ہی فنونِ سپہ گری، تلوار بازی، نیزہ بازی، بنوٹ وغیرہ سے اودھ کے لوگوں کو عموماً اور لکھنؤ کے لوگوں کو خصوصاً دلچسپی تھی۔ علم و تہذیب کے گہوارے لکھنؤ میں فن سپہ گری سے دلچسپی رکھنے والوں کی کمی نہ تھی۔ عین ممکن ہے کہ میر ضمیرؔ کو مرثیے میں جنگ کے مناظر پیش کرنے کا خیال، اسی لئے آیا ہو۔ انہوں نے جنگ کے بیان میں استعاروں کی پیچیدگی کے بجائے فنِ سپہ گری اور جنگی حکمتِ عملی کو مرثیے میں پیش کیا جسے بعد کے آنے والوں نے اپنایا۔

تھی لشکرِ خدا پہ عجب طرح کی بہار   جس کی نگاہ پڑتی تھی ہوتا تھا وہ نثار
تھا بیچ میں تو راکبِ دوشِ نبی سوار   نیزے لئے جلو میں سوارانِ نیزہ دار
نیزے چمک رہے تھے جو پاس اس جناب کے
گویا کرن تھی نکلی قریب آفتاب کے

تب شاہ نے یہ حضرتِ عباسؑ سے کہا   لشکر کے تین غول کرو تم جدا جدا
طفل و جوان و پیر کھڑے ہوں ہر ایک جا   لشکر ہمارا تا نظر آوے بڑا بڑا
پھر روک لو ادھر سے درِ خیمہ گاہ کو
زینبؑ کہیں نہ دیکھ لے ان کی سپاہ کو

عباسؑ لے علم گئے اپنے پرے میں مل   تینوں صفیں کھڑی ہوئی جس وقت متصل

اس دم پہاڑ ہوگئے ان غازیوں کے دل سب باحواس و خرم و خندان و مستعل

ہر ہاشمی جواں کو شجاعت کا جوش تھا

یا مرتضیٰ علیؑ ولی کا خروش تھا

☆☆☆☆☆

صفی بلگرامی:-

ولادت ۱۸۳۳ء، وفات جون ۱۸۹۰ء۔

وطن مارہرہ ضلع ایٹہ۔ صفی بلگرامی انیسویں صدی کے اہم شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنہیں غالب سے تلمذ کا شرف حاصل رہا ہے۔ مرثیہ گوئی میں اُن کا تعلق دبستان دبیر سے تھا، پہلا مرثیہ

اے بحرِ طبع جوش میں آنے کا وقت ہے

اتنا مقبول ہوا کہ صفی بلگرامی مرثیہ گوئی کی طرف مائل ہوگئے اور بہت سے مرثیے کہے، اُن کے مرثیوں میں غالب کا رنگ بھی ہے اور مرزا دبیر کا آہنگ بھی۔ ایک مشہور مسدس "شبستان معراج" ہے۔ بقول سید طاہر حسین کاظمی اُن کا مزاج اور نظر شبستان معراج" کے پہلے بند سے واضح ہونے لگتی ہے۔

اے فکرِ ممتحن مجھے پھر امتحان دے لطفِ بیاں کو معجز عیسیٰ کی شان دے

یعنی دہانِ روحِ قدس میں زبان دے تا نطق جسم مردہ ہے، مضموں میں جان دے

پھر تیری ادعا میں نہ کچھ اشتباہ ہو

ہر مصرعہ لطیف زبانِ گواہ ہو

(حوالہ ڈاکٹر ظفر اوگانوی)

اُن کی مرثیہ گوئی میں نئے رجحانات۔ فلسفہ، منطق، شکوہِ لفظی، تشبیہات وہ ساری علامتیں پائی جاتی ہیں جو دبستانِ دبیر کا خاصہ ہیں مثلاً شب معراج کے بیان میں استعاراتی اور تشبیہاتی انداز غالب و دبیر کی طرف لے جاتا ہے۔

وہ شب تھی ایک صنع خدا کے جلیل میں سو داغ جس کے سامنے روئے جمیل میں

غل تھا قمر نہیں فلک بے عدیل میں یوسف نہار ہے ہیں کھڑے رودِ نیل میں

گردِ قمر ستارے بھی طرفہ ضیاء کے ہیں

سب پھول بوستانِ خلیلِ خدا کے ہیں

☆☆☆☆☆

چھنولال دلگیر:-

سال پیدائش ۱۱۹۸ھ مطابق ۱۷۸۳ء، وفات ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء۔

والد کا نام منشی رسوا رام۔ سکینہ کائستھ تھے۔ ۱۷ سال کی عمر میں شاعری شروع کی۔ ابتدا غزل سے ہوئی۔ غزل گوئی میں طربؔ تخلص رکھا۔ مصحفیؔ نے طربؔ کے ذیل میں ذکر کیا ہے۔

"دلگیر، چھنولال، طربؔ تخلص، ولد منشی رسوا رام، وطن بزرگانش لکھنؤ، خودش در لکھنؤ تولد شدہ ہم اینجا نشوونما یافت۔" (ریاض الفصحا)

مشفق خواجہ لکھتے ہیں کہ "شروع میں مرزا خانی نوازش کے شاگرد تھے" مرزا خانی نے سکونت خانپور اختیار کی تو (حسب الارشاد اپنے استاد) ناسخؔ سے استفادہ کیا۔" (معرکہ خوش زیبا۔ مشفق خواجہ)

۲۲ سال کی عمر میں ان کا شمار ممتاز شعرا میں ہونے لگا۔ شاعری پر قدرت ہوئی تو وہ روشنی نظر آئی جو ان منزلوں کی نشاندہی کرتی ہے جہاں اس وقت تک نہ قلم حرکت میں آتا ہے نہ زبان "تا نہ بخشد خدائے بخشندہ"۔ غزل گوئی میں شاعر کا ممدوح وہ ہوتا ہے جو کامل نہیں ہوتا اسی لئے خطائیں کرتا ہے۔ جس کا حسن زوال پذیر، جس میں اگر کوئی وصف ہے تو اکتسابی اور فانی ہوتا ہے لیکن جس شاعر کو ایسا ممدوح یا ایسے ممدوح مل جائیں جن کی ذات لافانی، جن کی صفات دائمی، جو نقائص سے مبرّا ہوں تو پھر وہ شاعرانہیں گلیوں کا ہو جاتا ہے۔ دلگیرؔ کو بھی لافانی روشنی کا راستہ مل گیا۔ شادؔ عظیم آبادی رقم طراز ہیں کہ:

"دلگیر کی دو باتیں مجھے حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔ وہ خاندانی ہندو تھے مگر مرثیوں میں "بین" اور "شہادت" کے بیان میں مسلمانوں کی رسومات، محاورے اور مستورات کی باتیں ایسے لکھتے تھے کہ تعجب ہوتا ہے"

شادؔ عظیم آبادی بے شک بہت بڑے شاعر، بہت بڑے نقاد، بہت بڑے انسان تھے۔ دلگیرؔ کے معاملے میں ان کا خیال مثبت فکر کا آئینہ دار ہے اور ان کے الفاظ دلگیرؔ کے لئے ایک نقاد کی دیانت کا تحفہ ہیں۔ لیکن حضرت شادؔ عظیم آبادی کی نظر اس طرف نہیں گئی کہ بات مذہب کی نہیں ہے بلکہ محبت و عقیدت کی روشنی کی بات ہے۔ اس کے کرم کی بات ہے جو بائے بسم اللہ میں علوم کے سمندر سما دیتا ہے۔ جو چاہے تو قطرے کو قلزم پر محیط کر دے۔ چاہے تو کنکریوں کو چٹانوں کا بھرم

توڑنے کی استطاعت بخش دے۔ وہ اگر کسی دل میں ان کی محبت وثنا کی روشنی بھر دے جو وجہ تخلیقِ بساطِ ہمہ اسباب وعلل ہیں تو الفاظ دست بستہ سامنے کھڑے رہتے ہیں اور انتظار کرتے ہیں کہ کب انہیں محبت ومودّت کی کہکشاں میں سجنے کا شرف ملتا ہے۔

چھنولال دلگیر نے مرثیے میں ماجرا، رخصت اور بین پر بہت توجہ دی ہے اور رخصت کی منظر کشی میں نئے پہلو نکالے ہیں۔ دلگیر کے مرثیے اور سلام ''مجموعہ دلگیر'' اور ''کلیاتِ مرثیۂ دلگیر'' کے ناموں سے مطبع نول کشور نے شائع کئے ہیں۔ دلگیر کے مراثی میں بسا اوقات اس حد تک میر انیسؔ کی روانی نظر آتی ہے کہ ان کے کلام پر میر انیسؔ کے کلام کا گمان ہوتا ہے۔ راقم الحروف کو یاد ہے کہ پانی پت، سونی پت سے تا بہ ساداتِ باہرہ اور مظفر نگر اور سہارنپور کی مجالس میں دلگیر کے مرثیے میر انیسؔ کے کلام کے طور پر پڑھے جاتے تھے اور بہت سے مصرعے ضرب المثل کے طور پر بولے جاتے تھے، مثلاً

گذرِ منزلِ تسلیم و رضا مشکل ہے سہل ہے عشقِ بشر، عشقِ خدا مشکل ہے
وعدہ آسان ہے، وعدے کی وفا مشکل ہے جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

یہ فقط امر ہوا فاطمہ کے جانی سے
مشکلیں جتنی پڑیں جھیلی وہ آسانی سے

اس ایک بند کے دو مصرعے آج بھی زبان زدِ عوام ہیں۔ ''جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے'' اور ''وعدہ آسان ہے، وعدے کی وفا مشکل ہے''۔ اور عام طور پر آج بھی انہیں میر انیسؔ کا کلام سمجھا جاتا ہے۔

گذشتہ نصف صدی سے ایک نوحہ ''گھبرائے گی زینب'' جسے ناصر جہاں نے پڑھا تھا، کم وبیش پوری دنیا میں مشہور ہے۔ روزِ عاشور کی مجلس کے بعد نہ صرف مجالس میں بلکہ ریڈیو اور T.V کے پروگراموں میں اس نوحے سے پروگرام کا اختتام (Wind up) نہ کیا جائے تو ایک احساس سا ہوتا ہے کہ کوئی کمی رہ گئی۔ اس نوحے کو سننے والے زیادہ تر اسے آلِ رضا کا کلام سمجھتے ہیں جبکہ یہ دلگیر کا کلام ہے اور ''مراثی دلگیر'' جلد اول، مطبوعہ نول کشور میں موجود ہے۔

چھنولال دلگیر کے مراثی کی تعداد (۱۱۰) ایک سو دس بتائی گئی ہے۔ اُن کے مرثیوں کی سات جلدیں ۱۸۹۷ء میں مطبع نول کشور نے شائع کی ہیں۔ ڈاکٹر سید منظر حسین کاظمی نے اس کی

تائید کی ہے اور شکوہ کیا ہے کہ دلگیر کو وہ مرتبہ نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"زبان اور طرز ادا میں انفرادیت کے باوجود لکھنؤ کی شاعری میں دلگیر کا تذکرہ، میر خلیق سے کم ملتا ہے جبکہ میر خلیق کا کوئی ایسا مستند اور یقینی مجموعہ مراثی شائع نہیں ہوا۔ میر خلیق کو فنی حیثیت دی جائے تو اُن کا نمبر دلگیر کے بعد آئے گا لیکن کتنے لوگ ہیں جو دلگیر کو ان کے حقیقی رنگ میں پہچانتے ہیں" (کتاب: واجد علی شاہ اور ان کے مرثیے۔ ص ۱۵۶)

اودھ میں مرثیے کے عروج کا زمانہ انیس و دبیر کا زمانہ ہے۔ میر انیس کے پردادا میر ضاحک سے لے کر ان کے فرزند میر حسن (میر انیس کے دادا) ولادت ۱۷۲۳ء اور وفات ۲۴ر اکتوبر ۱۷۸۶ء میر حسن کے چار فرزند میر خلق، میر خلیق، میر محسن، میر مخلوق اور ان کے بعد میر خلیق کے تین فرزند میر انیس، میر انس، میر مونس، اما بعد فرزندانِ میر انیس میں میر نفیس، میر سلیس اور میر رئیس اور بعد ازاں میر نفیس کے فرزند دولہا صاحب عروج، ان کے فرزند لڈن صاحب فائز ہیں۔ خانوادۂ انیس کے آخری شاعر میر عارف کے چھوٹے فرزند میر فائق کے برادر خورد میر لائق تھے۔

کب میں نے کہا کسی سے فائق ہوں میں ہاں مدحتِ شبیر کا شائق ہوں میں
مداح امام سب بہتر ہیں مجھ سے دراصل برائے نام لائق ہوں میں

☆☆☆☆☆

میر ببر علی انیس :-

میر خلیق کے فرزند۔ میر مونس کے بڑے بھائی، میر نفیس کے والد گرامی میر ببر علی انیس کی ولادت کے بارے میں مختلف آرا کی بنیاد پر اُن کا سال ولادت ۱۸۰۱ء اور ۱۸۰۳ء کے درمیان قرار دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے انیس کی سوانح میں ولادت ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء اور وفات ۱۰ر دسمبر ۱۸۷۴ء درج کی ہے۔ میر انیس کے پردادا میر ضاحک، دادا میر حسن اور پدر گرامی میر خلیق اپنے عہد کے ممتاز شعراء میں شمار ہوئے ہیں۔ میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" اُردو کی بہترین مثنوی مانی گئی ہے۔ میر خلیق نے غزل سے مرثیہ گوئی تک کا سفر طے کیا ہے، ان حوالوں سے شاعری اور مرثیہ گوئی انیس کا ورثہ تھی۔ لہٰذا اوائل عمری میں مشق سخن شروع کر دی تھی، ابتدا غزل گوئی سے ہوئی، ابتداء

میں اپنے والدِ گرامی میر خلیق سے اصلاح لی—— میر خلیق نے اکثر بیٹے کو ناسخ سے اصلاح کے لئے کہا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب وہ غزل کہا کرتے تھے اور ''حزیں'' تخلص تھا۔ ایک روز میر خلیق کی موجودگی میں ناسخ نے ''حزیں'' تخلص کو ناپسند فرمایا اور ''انیس'' تجویز کیا۔ پس اُس دن سے میر ببر علی حزیں، میر ببر علی انیس ہو گئے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے کہ:

''ایک موقع پر انیس نے کسی مشاعرے میں غزل پڑھی جس کی بہت تعریف ہوئی یہ خبر سن کر شفیق باپ کا دل باغ باغ ہو گیا اور انہوں نے بیٹے سے کہا'' بھائی اب غزل کو سلام کرو، اور اس شغل میں زورِ طبع صرف کرو جو دین و دنیا کا سرمایہ ہے''

سعادت مند بیٹے نے اسی دن غزل گوئی سے قطع نظر کی اور اس بحر میں پہلا سلام کہا۔ ایک سے زیادہ ناقدین نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ کم و بیش ۱۸۱۶ء کا ہے۔ گویا انیس ۱۳ برس کی عمر کو پہنچے تو سخن فہم اور سخن پرور باپ کو اندازہ ہو گیا کہ اب بیٹا غزل گوئی کی وادیوں سے نکل کر رثائی ادب کی کٹھن راہوں پر سفر کر سکتا ہے چنانچہ تیرہ برس کی عمر سے اُنہیں اس طرف راغب کر دیا گیا—— ڈاکٹر نیر مسعود'' سوانح انیس'' میں رقم طراز ہیں کہ انیس نے پہلا سلام ۹ برس کی عمر میں کہا، گویا غزل گوئی کی ابتدا اس سے بھی پہلے ہوئی تھی۔ میر خلیق کا سایہ سر سے اُٹھنے کے بعد میر انیس نے میر ضمیر سے بھی روشنی حاصل کی۔

مولانا محمد حسین آزاد نے میر انیس کے مرثیوں کی تعداد کے بارے میں (آبِ حیات میں) لکھا ہے کہ میر انیس نے کم از کم دس ہزار مرثیے کہے ہونگے،۔ امیر احمد علوی نے'' یادگار انیس'' میں انیس کے مراثی کی تعداد چودہ سو کے لگ بھگ بتائی ہے جو حقیقت مندانہ اندازہ معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صفدر حسین نے ان کی تعداد ۲۵۰ بتائی ہے۔ غالباً اُن کی مراد، اُن مراثی سے ہے جو شائع ہو چکے ہیں۔ میر انیس پر اہلِ نقد و نظر نے بہت کام کیا ہے، اُن پر کام ہو بھی رہا ہے اور ہوتا بھی رہے گا۔ شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہو کہ لوگ میر انیس پر لکھ کر شہرت کی بلندیوں پر پہنچ رہے ہیں لیکن آج تک ناقدین اور محققین یہ نہ بتا سکے کہ میر انیس کے باقی مراثی کہاں گئے، اُن کے بھائی میر مونس بھی اس نقصان کی ذمہ داری اہلِ خاندان پر ڈال کر خاموش ہو گئے۔ میر انیس پر جو کام ہو رہا ہے وہ جاری رہنا چاہئے کہ ابھی تک حق ادا نہیں ہوا۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں میر انیس

پر دو اہم کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ایک "سوانح انیسؔ" ہے جس میں ڈاکٹر نیر مسعود (لکھنؤ) نے قیمتی حوالوں کے ذریعے میر انیسؔ کو خراج عقیدت پیش کیا ہے اور دوسری کتاب ڈاکٹر تقی عابدی کی "تجزیہ یادگار انیس" ہے جس میں موصوف نے میر انیسؔ کے شہرہ آفاق مرثیے "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" کا تجزیہ کرتے ہوئے اس مرثیے میں ۲۸۵۶ محاسن کی نشاندہی کی ہے۔مغربی دنیا میں بیٹھ کر مشرق کے کسی سرمائے کو تلاش کرنا دشوار ترین امر ہے۔ڈاکٹر تقی عابدی کتاب پر راقم الحروف نے اپنی رائے دی ہے کہ اس کتاب نے انیسؔ پر عالمانہ تنقید کے دروازے کھول دئے ہیں اور اب امید کی جاسکتی ہے کہ انیسؔ پر آئندہ جو کام ہوگا وہ روایتی تنقید کے بجائے معنوی کام ہوگا۔راقم الحروف کی یہ رائے کتاب میں بھی شامل ہے۔

جیسا کے پیش لفظ میں عرض کیا جاچکا ہے اس کتاب میں میر انیسؔ اور انیسویں صدی کے شعراء کا تذکرہ زیب داستان کے لئے ہے اسی لئے خدائے سخن میر انیسؔ کا ذکر حوالے کے طور پر کیا جارہا ہے ان کے رتبے اور کام کے مطابق نہیں جبکہ میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، اور جوشؔ ملیح آبادی کی مرثیہ گوئی کا چند صفحات میں احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔انیسؔ کی مرثیہ گوئی اور اُن کی قادرالکلامی کے لئے بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ وہ چاہتے تھے تو قطرہ کو سمندر پر محیط کردیتے تھے، نقطے کو مضامین کی وسعت دے دیتے تھے۔اُنہوں نے غلط نہیں کہا تھا کہ اک رنگ کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں اور جب اختصار پر آتے تھے تو اُن کا ایک شعر تفسیر دِل کا نچوڑ ہوتا تھا۔مثلاً تلوار مرثیہ نگاری کی اہم حصہ رہی ہے۔میر انیسؔ نے بھی کم و بیش ہر مرثیے میں لوازم مرثیہ کی تکمیل کے لئے تلوار پر شعر کہے ہیں لیکن انیسؔ کی قدرت شعر گوئی کا ثبوت تلوار کے متعلق ایک شعر انوکھا نظر آتا ہے۔

اشراف کا بناؤ رئیسوں کی شان ہے
شاہوں کی آبرو ہے سپاہی کی جان ہے

اسی شعر کو سن کر خواجہ حیدر علی آتشؔ پکار اُٹھے تھے کہ "تم شاعر ہو اور شاعری کا مقدس تاج تمہارے سر پر زیب دیتا ہے۔" ــــــ واللہ اے انیسؔ کہ کارے کردی۔

☆☆☆☆☆

مرزا سلامت علی دبیر :-

نام مرزا سلامت علی، تخلص دبیر، ولادت ۱۸۰۳ء، بمقام دہلی، مگر زندگی بھر لکھنؤ میں رہے۔ وفات ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء۔ بارہ برس کی عمر میں میر ضمیر سے تلمذ کیا۔ تحصیل علم کے ساتھ ساتھ مشقِ سخن جاری رکھی اور دس بارہ برس میں ان کا شمار لکھنؤ کے ممتاز مرثیہ گو شعراء میں ہونے لگا۔ میر انیس اس وقت تک فیض آباد میں تھے اور لکھنؤ نہیں آئے تھے۔ مرزا دبیر نے ابتدائی مرثیے ''بین'' کے لکھے، انیس و دبیر کا دور، اودھ میں مرثیے کے عروج کا دور تھا۔ اُردو مرثیے کو منزلِ کمال تک پہنچانے میں انیس و دبیر نے برابر کا حق ادا کیا ہے شاید قدرت کو بھی یہی منظور تھا جس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ انیس اور دبیر دونوں باکمال شعراء کا سن ولادت ۱۸۰۳ء اور وفات ۱۸۷۴ء ہے۔ انیس و دبیر کا موازنہ کرنے والے اگر دونوں شعراء کی عظمتوں کا احاطہ کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا لیکن دونوں شعراء کے حاشیہ نشینوں نے بھی اس عہد کی فضا کو عصبیت آلود رکھا۔ ہم عصر شعراء میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش ایک فطری اور مستحسن جذبہ ہے۔ اس جذبے سے کلام نکھرتا ہے یہی جذبہ انیس و دبیر کے درمیان تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ حاشیہ نشینوں کی عصبیت کے برعکس، ان دونوں شعراء میں ایک دوسرے کا احترام تھا۔ مرزا دبیر نے میر انیس کی وفات پر جو قطعہ کہا وہ تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہے

در سنین عیسوی تاریخ گفتم صاف صاف
گرچہ طبعم بود محزون و مکدر بے انیس
آسماں بے ماہ کامل، سدرہ بے روح الامیں
طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس (۱۸۷۴)

انیس و دبیر کی عظمتوں کے درمیان اختلاف کی دیواریں تعمیر کرنے کی کوشش کرنے والے گہوارۂ علم و ادب شہر لکھنو کے شرفاء کاش یہ سمجھ سکتے کہ ان دونوں عظیم شعراء کے درمیان تفرقہ مرثیے کی یک جہتی کے لئے نقصان دہ تھا اور ہے۔ میر انیس کے بعد مرزا دبیر زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکے اور تین ماہ بعد ہی وفات پا گئے۔

مرزا دبیر پر مشکل الفاظ استعمال کرنے کے الزامات عائد کیے گئے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایسی سرزمین پر مرثیہ کہہ رہے تھے جہاں اُردو اور فارسی زبانوں کی عملداری تھی۔ مرزا دبیر

نے بے شک شکوہ لفظی کو اپنایا لیکن ایسی ہی شکوہ لفظی جگہ جگہ میر انیسؔ کے ہاں بھی ملتی ہے۔ لکھنؤ کے شعراء اگر ڈکشن اور الفاظ کی بناوٹ و سجاوٹ نہ کرتے تو کون کرتا۔ تعصبات زمانہ سے الگ ہٹ کر مرزا دبیرؔ کی شکوہ لفظی کو دیکھا جائے تو دل چاہتا ہے کہ ایسی ہی شکوہ لفظی ہر شاعر کرے ۔

پیدا ہوا سپیدۂ طلعت نشانِ صبح — معبود کا وہ ذکر وہ لطفِ اذانِ صبح
باندھا عمامہ نور کا پہنی کتانِ صبح — چرخ چہاری پر گیا ہر خطبہ طوانِ صبح
منہ سب کے سوئے قبلۂ اُمید ہو گئے
سرگرم سجدہ عیسیٰؑ و خورشید ہو گئے

آیا عروج پر شہِ گیتی ستانِ مہر — لی روز نے پناہ بزیرِ نشانِ مہر
پرچم کشا ہوا علمِ زرخشانِ مہر — ظاہر ہوئی زمانے پہ تاب و توانِ مہر
نیزہ کرن کا دیدۂ گردوں میں ڈال کے
مغرب میں پھینکی رات کی پتلی نکال کے

مرزا دبیرؔ نے رخصت، شہادت اور بین کو عام طور پر سادہ الفاظ میں سلاست کے ساتھ نظم کیا ہے اور شکوہ لفظی کی بجائے درد کی تاثیر کو اُجاگر کیا ہے۔ اُن کا ایک مقبول و مشہور مرثیہ ''جب حرم قلعہ شیریں کے برابر آئے'' ہے اس مرثیے میں امام حسینؑ کی لٹے پٹے قافلے کی شام میں آمد کا منظر نامہ ہے۔ اہلبیت رسول کی ماننے والی ''شیریں'' اہل حرم کے قافلے کو چشم تصور سے دیکھتی ہے اور قافلے کے استقبال کا پروگرام بناتی ہے جسے مرزا دبیرؔ نے عجب انداز سے نظم کیا ہے۔

حیدری صف میں حسینی علم آتے ہوں گے — ہاشمی دبدبہ ہاشم کا دکھاتے ہوں گے
نوبتی داخلے کا طبل بجاتے ہوں گے — خضر اس قافلے میں پانی پلاتے ہوں گے
دل کو نورِ رخِ مولا سے تسلی ہوگی
کوہ پر طور کی مانند تجلی ہوگی

مسند آراستہ کی سبطِ پیمبر کے لئے — کشتیاں لا کے رکھی عشرتِ حیدر کے لئے
جھولا دالان میں ڈالا علی اصغر کے لئے — لا کے گلدستے برابر رکھے اکبرؑ کے لئے
جام شربت کے بھرے ابنِ حسنؑ کی خاطر
گہنا پھولوں کا منگا رکھا دلہن کی خاطر

روک دی سامنے دروازے کے پردے کی قنات اور چلائی یہ ہمسایوں کو وہ خوش اوقات
صاحبو جوڑ کے ہاتھوں کو میں کہتی ہوں یہ بات جب اُترنے لگیں سادات رفیع الدرجات
پاؤں مردوں کا نہ دروازے سے بڑھنے دینا
اپنے لڑکوں کو بھی کوٹھے پہ نہ چڑھنے دینا

ایک عورت نے یہ باہر سے پکارا ناگاہ ارے شیریں تیرے ارمان ملے خاک میں آہ
گھر کا گھر ہوگیا خاتون قیامت کا تباہ وارث آلِ عبا مر گیا، اللہ اللہ
ہم زیارت کو گئے تھے سو یہ محشر دیکھا
لے تیری حضرتِ زینب کو کھلے سر دیکھا

بے تحاشا وہ یہ کہتی ہوئی دوڑی باہر خاک منہ میں تیرے کس منہ سے یہ دیتی ہے خبر
کون زینبؑ جسے دیکھ آئی ہے تو ننگے سر وہ پکاری کہ حسینؑ ابن علیؑ کی دختر
اک فقط میں تو نہیں دیکھ یہ سب آئے ہیں
رسیاں باندھ کے گردن میں عدو لائے ہیں

توقعات کے انجام اور تضاد سے غم کی جو تصویر اُبھری ہے وہی مرزا دبیرؔ کے بین کا خاصہ ہے— میر ضمیرؔ کے طرز نوی کو تابدار بنانے میں مرزا دبیر کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اُنہوں نے مرثیے میں معنی آفرینی، خیال آرائی، فصاحت و بلاغت سے خود کو منور کیا ہے— یہ مضمون مرزا دبیرؔ کی مرثیہ نگاری کا احاطہ نہیں کرتا بلکہ اُن کے نام نامی سے "زیب داستاں" ہمارا مقصود ہے۔

☆☆☆☆☆

موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ :-

میں بار بار لکھتا رہا ہوں کہ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی عظمت کے درپے ایک طرف تو وہ نادان دوست تھے جنہوں نے کہا کہ انیسؔ و دبیر پر مرثیہ گوئی ختم ہوگئی ہے اب اس سے آگے بڑھنا ممکن نہیں ہے گویا انیسؔ و دبیر نے مرثیے کو نقطۂ انجماد پر لا کر چھوڑ دیا جبکہ حقیقت یہ ہے انیسؔ و دبیر مرثیے کو ارتقاء کی روشن راہوں تک لائے ہیں۔ اُنہوں نے اس راستے پر سرگرم سفر آنے والی نسلوں کے لئے راہوں کا تعین کیا ہے اُن کی عظمت فن آنیوالے ادوار کے شعراء کے لئے رہنمائی کی تحریک بھی ہے اور چیلنج بھی۔ دوسری طرف میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی عظمت کی دانا دشمن وہ ہیں

جنہوں نے شعوری طور پر ان دو ہم عصر اساتذہ فن شعراء کے درمیان گروہ بندی اور عصبیت کی فضا پیدا کی اور دونوں کو ایک دوسرے کا دشمن ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ایسے لوگوں میں شبلؔی سرِفہرست ہیں جنہوں نے موازنۂ انیسؔ و دبیر لکھکر انیسؔ کے مقابلے میں دبیرؔ کو کم تر درجے کا شاعر ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے، یہ کوشش اگر شعوری ہے تو نہ صرف میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی عظمت کے منافی ہے بلکہ مرثیے کی ہمہ گیری اور یک جہتی کے خلاف ایک سوچی سمجھی سازش کہی جا سکتی ہے اور اگر غیر شعوری ہے تو شبلؔی کی دانشورانہ صلاحیتوں کی نفی کرتی ہے۔ شبلؔی نے فصاحت و بلاغت کو دو الگ الگ اصناف قرار دے کر فصاحت کو میر انیسؔ کے نام لکھ دیا اور بلاغت کو ادق الفاظ کی میراث کہہ کر اسے مرزا دبیرؔ کے کھاتے میں ڈال دیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ بلاغت فصاحت سے علیحدہ کوئی صنف نہیں ہے بلکہ فصاحت کے باب میں ہی آتی ہے۔

اپنی بات کو منوانے کے لئے شبلؔی نے جو استدلال کیا ہے اس کا ایک نکتہ یہ ہے کہ انیسؔ کا مصرعہ ہے ۔ "سنتے ہیں ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے" جبکہ اسی مضمون کو نظم کرتے ہوئے دبیر نے کہا ہے ۔ "زیرِ قدمِ والدہ، فردوسِ بریں ہے"، اسی طرح قاصد صغرا جب کربلا میں پہنچتا ہے اور خون میں ڈوبے ہوئے امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے تو امام کو پہچان نہیں سکتا۔ میر انیسؔ نے اس وقت امام کے ارشاد کو نظم کیا ہے اور کہا ہے ۔

یہ تو نہیں کہا کہ شہِ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسینؑ ہوں

جبکہ اسی مرحلے پر (بقول شبلؔی) مرزا دبیرؔ نے کہا۔ "فرمایا میں حسینِ علیہ السلام ہوں" گویا لکھنؤ کے باکمال شاعر مرزا دبیر کو یہ بھی سلیقہ نہیں تھا کہ امام خود کو اپنی زبان سے "علیہ السلام" کیسے کہہ سکتے تھے۔ شبلی کے پہلے الزام کا جواب یہ ہے کہ مرزا دبیر کے پورے کلام میں "زیرِ قدمِ والدہ فردوسِ بریں ہے" مصرعہ نہیں ملتا۔ بلکہ یہ مصرعہ حکیم قدیر الدولہ کے دیوان میں ملتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ مصرعہ مرزا دبیرؔ کا نہیں ہے۔ اب آپ چاہیں تو شبلؔی کی نیت کا محاسبہ کریں اور چاہیں تو اُن کے سلیقۂ علم کا تجزیہ کریں۔ اسی طرح "فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں" بھی مرزا دبیر کے کلام میں نہیں ملتا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے فروری ۲۰۰۴ء میں برطانیہ میں منعقدہ "جشنِ اردو" میں اس بات کی لفظ بہ لفظ تائید اور تصدیق کی کہ یہ مصرعے دبیرؔ کے کلام میں نہیں ہیں۔ اس کے بعد

اپنے ایک مکتوب میں انہوں نے تفصیل سے اس کی تصدیق کی ہے

''شبلی نے یہ مصرع ''زیرِ قدمِ والدہ فردوس بریں ہے'' مرزا دبیر سے منسوب کیا ہے۔ 'دفترِ ماتم' کی بیس جلدوں میں یہ مصرع نہیں ملے گا۔ یہ مصرع حکیم قدیر الدولہ کے اس مرثیہ کا مطلع ہے ''ارشاد مجھے آج ہے یہ لوح و قلم سے'' اور پورا بند یوں ہے جو 'رد الموازنہ' صفحہ ۶۳ پر نقل کیا گیا ہے۔''

اماں کی اطاعت نہ کروں میں تو خطا ہے ‏ زیرِ قدمِ والدہ فردوسِ عُلا ہے

زینبؑ کا ادب والدہ صاحب سے سوا ہے ‏ بیٹا مجھے اپنا پھوپھی اماں نے کیا ہے

تو جانتا ہے مجھ پہ جو احسان کئے ہیں

پالا بھی ہے اور بیٹے بھی قربان کئے ہیں

شبلی نے ایک اور مصرعہ ''فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں'' بھی مرزا دبیر سے منسوب کیا ہے۔ 'دفترِ ماتم' کی جلدوں میں یہ مصرع بھی نہیں ہے۔ مرزا دبیر کا ٹیپ کا ایک شعر ہے،

مجروح تیغ و خنجر و تیر و سنین ہیں

اے عاشقِ حسینؑ، ہمیں تو حسینؑ ہیں

کہتے ہیں یہ مصرع محمد تقی اختر کا ہے۔ شبلی نے مرزا دبیر کے اس شعر کو گورکھ دھندہ کہا ہے۔

انصاف کہاں سے ہو کہ دل صاف نہیں ہے

دل صاف کہاں سے ہو کہ انصاف نہیں ہے

دراصل یہ شعر صفتِ معنوی میں ہے۔ اگر یہ شعر گورکھ دھندا ہے تو ذوق کے اس شعر کے بارے میں شبلی کی کیا رائے ہوگی

بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے

بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے

شبلی نے ایک اور مصرع ''نانا ہوں میں حسینؑ علیہ السلام کا'' غلط طور پر دبیر سے منسوب کیا ہے۔ (مکتوب بنام عاشور کاظمی ۱۳ فروری ۲۰۰۵ء)

اب یہ فیصلہ قارئین پر کہ وہ مصرعے جو دبیرؔ کے نہیں ہیں انہیں دانستہ دبیرؔ کے نام منسوب کرنا اگر دبیرؔ دشمنی اور اس سے زیادہ مرثیے کی ہمہ گیری اور انیسؔ و دبیرؔ کے چاہنے والوں کو گروہ بندی میں مبتلا کرنے کی کوشش نہیں تو آپ اسے کیا نام دیں گے۔

میر انیسؔ صرف فصاحت کے شاعر نہیں ہیں بلکہ وہ خدائے سخن ہیں۔ جس کے معنی یہ ہوتے کہ وہ جملہ اصناف سخن پر دسترس رکھتے ہیں۔ ان کی عظمت فن کی ایک مثال تو ان کا ایک مرثیہ "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" ہی ہوسکتا ہے جس میں ڈاکٹر تقی عابدی نے ۲۸۵۶ محاسن دریافت کئے گئے ہیں۔ اس طرح مرزا دبیرؔ بھی صرف بلاغت تک محدود نہیں ہیں بلکہ وہ بھی جملہ محاسن پر دسترس رکھتے ہیں۔ انیسؔ و دبیرؔ کے مثبت تقابلی جائزے کی تکمیل کسی ایک مقالے یا مضمون میں نہیں ہوسکتی پھر بھی اختصار کے ساتھ اپنا موقف واضح کرتے ہوئے چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

روز عاشور کی گرمی کا بیان۔ میر انیس کے الفاظ میں۔

گرداب پر تھا شعلۂ جوّالہ کا گماں انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں تہہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ ، گرمی روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

وہ لُو، وہ آفتاب کی حدّت وہ تاب و تب کالا تھا رنگ دھوپ کا دل میں مثالِ شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب خیمے تھے جو حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اڑتی تھی خاک، خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

یہ تھی انیسؔ کی فصاحت۔ اب اس منظر نامہ کو مرزا دبیر کے الفاظ میں دیکھئے جو فصاحت کے معیار پر پورے اُترتے ہیں۔

تنہا کھڑے ہیں رن میں امامِ فلک مآب گرمی دکھا رہا ہے قیامت کی آفتاب
بے آب، مرغ قبلہ نما ہوتے ہیں کباب خطِ غبار سے ہے لِسی ابریٔ سحاب
چھالا ہے آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں
خود چھپ رہی ہے دھوپ درختوں کی چھاؤں میں

منی خراب چرخ پہ ہے برج آب کی رنگت ہے برج حوت میں ماہی کباب کی
دریا میں آنکھ بیٹھ گئی ہے حباب کی حدت ہے موج موج میں تیر شباب کی
فوارے کو نہ جوش میں گرمی سے کل پڑی
پانی کی بھی زبان، دہن سے نکل پڑی
(مرزا دبیرؔ)

فصاحت کے باب میں ایک اور مثال۔ انیسؔ کا مرثیہ ہے ۔

دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر راحت کوئی آرام جگر سے نہیں بہتر
لذت کوئی پاکیزہ ثمر سے نہیں بہتر نکہت کوئی بوئے گل تر سے نہیں بہتر
صدموں میں علاج دل مجروح یہی ہے
ریحاں ہے یہی، راح یہی، روح یہی ہے
مالک سے بھرے گھر کے اُجڑ جانے کو پوچھو گھر والوں سے اس تفرقہ پڑ جانے کو پوچھو
ماں باپ سے قسمت کے بگڑ جانے کو پوچھو یعقوبؑ سے یوسفؑ کے بچھڑ جانے کو پوچھو
اللہ دکھائے نہ الم نور نظر کا
بہہ جاتا ہے آنکھوں سے لہو قلب و جگر کا (میر انیسؔ)

اب مرزا دبیرؔ کے مرثیے "بے پردہ کوئی پردہ نشیں ہو نہ سفر میں" کی فصاحت بیانی دیکھئے ۔

بے پردہ کوئی پردہ نشیں ہو نہ سفر میں یارب نہ لگے آگ کسی پیاسے کے گھر میں
ناسور پڑے مرگ پسر سے نہ جگر میں برباد نہ ہو گھر کوئی یوں تین پہر میں
بھائی کا کٹے حلق نہ ہمشیر کے آگے
پر زور کسی کا نہیں تقدیر کے آگے
دربار میں یہ غل ہے کہ سادات کو لاؤ یہ کہتے ہیں واللہ ہمیں لے کے نہ جاؤ
چلاتے ہیں اعدا کہ ہمیں ضد نہ دلاؤ مقتل سے کسی روکنے والے کو بلاؤ
بندے ہیں خلیفہ کے نہیں خوف کسی سے
فریاد ہماری کرو اللہ و نبی سے (مرزا دبیرؔ)

جس سہل زبانی کو اساس بنا کر شبلی نے "موازنۂ انیس و دبیر" میں مخالفت کی بنیاد رکھی ہے وہ سہل بیانی، جذبات نگاری اور فصاحت دبیر کے ہاں ہے کہ نہیں؟ اسی طرح جس شکوہ لفظی کو مرزا دبیر کے نام لکھ کر میر انیس کو اس سے لاتعلق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ میر انیس کے ہاں بیساختہ پن کے ساتھ موجود ہے کہ نہیں۔ ایک اور مثال دیکھئے۔ مرزا دبیر کے مرثیہ میں ۔

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے		رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے
رستم کا بدن زیرِ کفن کانپ رہا ہے		ہر قصرِ سلاطینِ زمن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدرؑ کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو
ہر بند کھلا قبر میں رستم کے کفن کا		اور چرخ پہ ڈھلنے لگا بہرام کا ملکہ
تھا ہوش تہمتن کا نہ اپنے سر و تن کا		نام اُڑ گیا مہروں سے سلاطین زمن کا
جس شیر نے شیروں سے سدا پنجہ کیا ہے
جنگاہ میں آج اس نے قدم رنجہ کیا ہے

یہ ہیں مرزا دبیر، اب اس منظر نامے کو انیس کے الفاظ میں دیکھئے ۔

دریائے شجاعت میں تلاطم ہوا اک بار		عالم کو قیامت کے نظر آ گئے آثار
ہلنے لگے اشجار، لرزنے لگے کہسار		صحرا سے گریزاں ہوئے اژدر طرفِ غار
جن کہتے تھے خالق ہمیں اس آن بچائے
چلاتی تھیں پریاں کہ خدا جان بچائے
گرتے تھے طیوران ہوا کھولے ہوئے پر		شہباز کے بازو سے لپٹتا تھا کبوتر
بجلی نہ گرے ہم پہ پرندوں کو تھا یہ ڈر		سب جان بچانے کے لئے پھرتے تھے مضطر
نعرہ جو کیا ابنِ شہِ قلعہ شکن نے
منہ ڈال دیا شیر کے قدموں میں ہرن نے
(میر انیس)

میں میر انیس کی عظمت کا منکر نہیں ہوں، میر انیس خدائے سخن ہیں، لیکن انہیں صرف

فصاحت کے حصار میں اسیر کرنا اُن کی توہین بھی ہے اور حقیقت سے انکار بھی۔ انیسؔ و دبیرؔ دونوں باکمال شاعر ہیں، دونوں مرثیے اور رثائی ادب کا لافانی سرمایہ ہیں۔ جس طرح جان گلکرسٹ نے للو لال سے اُردو کے ایک سکرپٹ کو سنسکرت رسم الخط میں لکھوا کر ہندی کی پہلی کتاب شائع کر کے ہندو مسلم نفاق کی بنیاد رکھی تھی اور بالاخر یہ اختلاف تقسیم ملک تک پہنچا اس طرح انیسؔ و دبیرؔ کے درمیان پیدا کردہ گروہ بندی سے مرثیے کی یک جہتی کو نقصان پہنچا ہے۔

☆☆☆☆☆

میر انسؔ :-

ولادت ۱۸۰۷ء بمقام فیض آباد، وفات ۱۸۹۲ء۔

نام میر مہر علی، تخلص انسؔ۔ میر خلیقؔ کے منجھلے فرزند، میر انیسؔ کے منجھلے بھائی۔

شادؔ عظیم آبادی رقم طراز ہیں کہ میر انسؔ اپنے والد گرامی میر خلیقؔ کے ارشاد کے تحت میر انیسؔ سے اصلاح لیتے تھے۔

میر انسؔ کے مرثیے ''ریحانِ غم'' کی دو جلدوں میں شائع ہوئے ہیں، پہلی جلد میں ۹ مرثیے شریک اشاعت ہیں اور ''ریحان غم'' جلد دوئم میں پانچ مرثیے شائع ہوئے ہیں'' خاندان میر انیسؔ کے شعراء میں مولانا ضمیر اختر نقوی نے میر مونسؔ کے ۱۲ غیر مطبوعہ مراثی کی نشاندہی کی ہے اور ان مراثی کے مصرع ہائے اولیٰ درج کیے ہیں۔ ڈاکٹر صفدر حسین کا بیان ہے کہ اُنہوں نے میر انسؔ کے چالیس مراثی دیکھے ہیں جن میں سے کچھ مطبوعہ اور کچھ غیر مطبوعہ تھے۔ اس حقیقت پر ناقدین متفق ہیں کہ میر انسؔ زود گو شاعر نہیں تھے۔ اُنہوں نے زیادہ تعداد میں مرثیے نہیں کہے، اکثر یہ بھی ہوا ہے کہ اُنہوں نے مرثیہ خوانی کے لئے میر انیسؔ سے مرثیے لئے ہیں، میر مونسؔ کے متعلق تو کہا جاتا ہے کہ وہ بھائی کی خفیہ مدد کیا کرتے تھے۔

میر انسؔ معاشی پریشانیوں میں بھی مبتلا رہے، جوان بیٹے نے داغ مفارقت دیا تو میر انسؔ اندر سے ٹوٹ گئے لیکن پھر بھی اُنہوں نے جتنے مرثیے کہے وہ لاجواب ہیں۔ اُنہوں نے اجداد کی طرز نگارش کی پیروی کی بعض مراثی تو میر انیسؔ کے طرز بیان سے اتنا قریب ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا کرنا دشوار ہے، اس کا سبب میر انیسؔ کی اصلاح بھی ہو سکتا ہے۔ میر انسؔ کی جلدوں میں میر انیسؔ اور میر مونسؔ کے چند مراثی کی شمولیت سے میر انسؔ کے کلام سے متعلق کچھ غلط فہمیاں بھی

پیدا ہوئیں مگر میر انسؔ کے صاحب کلام شاعر ہونے پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ میر انیسؔ کے مقابلے میں میر انسؔ کے مرثیوں کی تعداد بہت کم ہے اس لئے بھی غلط فہمیوں کی صورت پیدا ہوئی۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا اُن کی قادر الکلامی کو کسی نے چیلنج نہیں کیا ہے۔اُن کے کلام میں فصاحت و بلاغت کا امتزاج تھا۔

اے نظمِ سخن، نظم ثریا کو خجل کر اے گوہرِ مضموں دُرِ یکتا کو خجل کر
اے نالۂ دل، بلبلِ شیدا کو خجل کر اے برقِ ولا، طورِ تجلی کو خجل کر
مداح کا دل نور کا مسکن نظر آئے
کاغذ کا ورق، وادیٔ ایمن نظر آئے

میر انسؔ کی شہرت میں کمی کا ایک سبب یہ ہے کہ کہ ناقدین نے میرزا عشقؔ اور میرزا تعشقؔ کے والد گرامی سیّد محمد میرزا متخلص اُنسؔ کے حالات اور میر مہر علی اُنسؔ کے حالات کو خلط ملط کر دیا ہے جبکہ میر انسؔ اور میرزا انسؔ دو علیحدہ علیحدہ شاعر تھے،لالہ سری رام نے میر انسؔ کے فرزندوں میں میرزا انسؔ کے فرزند مرزا تعشقؔ کا نام لکھ دیا۔ ''اُردو مرثیہ'' میں سفارش حسین نے میرزا انسؔ کے حالات میں میر انسؔ کے مرثیوں کے بند نقل کر دئے ہیں۔ میر انسؔ کی عظمت کے لئے کیا یہ کافی نہیں کہ اُنہوں نے میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے لکھنؤ میں اپنا مقام بنایا اور پورے ہندوستان میں اُنہیں مقبولیت حاصل ہوئی۔میر انسؔ کو زبان و بیان پر اپنی دسترس کا عرفان تھا اس کے باوجود وہ شاعرانہ تعلّی سے اجتناب کرتے رہے۔

ہاتھ آتی ہے مجھے وہ زبان خجستہ کام ہے جس پہ نامِ نائیٔ پیغمبرِ انام
پایا ہے وہ کلام جو ہے اشرف الکلام یعنی ثنائے آلِ رسولِ فلک مقام
لیکن نہ اہلِ کبر ہوں، نہ پرُغرور ہوں
ہر دم یہ پاس ہے کہ تعلّی سے دور ہوں

خانوادۂ انیس کے مراثی کی فصاحت میر انسؔ کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ عاشور کی صبح میدان کربلا میں علی اکبر کی اذان کی منظر کشی میر انسؔ کے مرثیے میں اپنے خانوادے کی روایات کی امین نظر آتی ہے۔

جب لشکرِ خدا میں اذانِ سحر ہوئی حاضر جماعتِ شہِ کون و مکاں ہوئی

صوت حسن بلند تہہ آسماں ہوئی پڑھ کر درود فوج ملک مدح خواں ہوئی
گل ہائے بوستاں ہمہ تن گوش ہوگئے
طائر جو چہچہاتے تھے خاموش ہوگئے

اللہ اکبر، اکبر غازی کی وہ صدا تھا جس میں لحن حضرت داؤد کا مزا
غنچے چمن میں گوش سماعت کئے تھے وا نغمے تھے محو گنگ تھے مرغانِ خوش نوا
رستوں پہ رہروں کے قدم تھے تھے ہوئے
تھے دم بخود نسیم کے جھونکے تھمے ہوئے

☆☆☆☆☆

میر مونس :-

ولادت ۲۰ جنوری ۱۸۱۱ فیض آباد، بعض تذکروں میں ۱۸۱۲ء درج ہے، وفات نومبر ۱۸۷۵ء۔ میر محمد نواب مونس، میر خلیق کے چھوٹے بیٹے، میر انیس کے سب سے چھوٹے بھائی۔۔۔زود گو شاعر تھے، میر انیس سے اصلاح لیتے تھے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے میر مونس کو اپنے والد گرامی میر خلیق کا شاگرد کہا ہے۔ دونوں روایتوں میں بظاہر کوئی ٹکراؤ معلوم نہیں ہوتا۔ قرین قیاس ہے کہ ابتدا میں والد گرامی سے اصلاح لی ہوگی اور اُن کی وفات کے بعد میر انیس کی رہنمائی لازمی تھی۔ لیکن اُن کے مرثیوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کی شاعری پر میر انیس کا رنگ گہرا تھا۔ میر مونس کے مرثیوں کی تعداد بھی میر انیس کے مراثی سے کم نہیں، میر انیس کے مراثی کی چھ جلدیں شائع ہوئی ہیں۔ میر مونس کے مراثی کی بھی چھ جلدیں شائع ہوئی ہیں۔ میر انیس نے اپنے مشہور مرثیے۔۔۔" نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری "۔۔۔میں فخر سے اپنے بھائی میر مونس کا ذکر کیا ہے۔

بھائی وہ مونس خوش لہجہ و پاکیزہ خیال جس کا سینہ ہنر علم سے ہے مالا مال
یہ فصاحت یہ بلاغت۔ یہ سلاست یہ کمال معجزہ گر نہ اسے کہیئے تو ہے سحر حلال
اپنے موقع پہ جسے دیکھئے لاثانی ہے
لطف حضرت کا یہ ہے رحمت ربّانی ہے

میر مونس بھی میر انیس سے بے پناہ محبت کرتے تھے، بھائی کے معاملے میں اُن کی

حیات حضرت عباس کی پیروی معلوم ہوتی تھی۔ میر انیسؔ سے اُن کے قرب کا یہ عالم تھا کہ بعد انیسؔ ایک برس بھی زندہ نہ رہ سکے۔ میر مونسؔ کا معرکتہ الآرا مرثیہ بھی حضرت عباسؑ کے احوال پر ہے جسے پڑھ کر بیساختہ آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔

جب ہوئے بازوئے عباسؑ قلم دریا پر گر کے ٹھنڈا ہوا حضرت کا علم دریا پر
غرق خوں ہوگیا وہ بحرِ کرم دریا پر غُل تھا زخمی ہوا سقائے حرم دریا پر
مشک کو دانتوں میں پکڑے ہوئے یوں لاتا ہے
دہنِ شیر میں جس طرح شکار آتا ہے

غش کی آمد ہے جگر سوزِ عطش سے ہے کباب ہیں جو بیدست ٹھہرتی نہیں پاؤں میں رکاب
پیاسے بچّوں کے لئے سینے میں دل ہے بیتاب غم یہی ہے کہ کہیں مشک سے ضائع نہ ہو آب
تیر پیہم جو کمانوں سے چلے آتے ہیں
یا علیؑ کہتے ہیں اور مشک پہ جھک جاتے ہیں

کر کے منھ سوئے نجف کہتے ہیں بادیدۂ تر یا علیؑ لیجیے مجھ بیکس و مضطر کی خبر
اے شہ عقدہ کشا بادشہ جن و بشر چاہتا ہوں میں کہ اس مشک کو پہنچے نہ ضرر
آپ کے بیٹے کا شیدا ہوں مدد لازم ہے
آپ کی پوتی کا سقّا ہوں مدد لازم ہے

میر انیسؔ اور میر مونسؔ کے کلام میں آہنگی اور یک رنگی بہت نمایاں ہے۔ میر مونسؔ کے مرثیے ''لاش اکبر کی جو مقتل سے اُٹھالائے حسینؑ'' میں میر انیسؔ کا رنگ اس قدر غالب ہے کہ لوگ اکثر اس مرثیے کو میر انیسؔ کا سمجھتے ہیں۔

لاش اکبر کی جو مقتل سے جو اٹھالائے حسینؑ نوجواں کو صفِ اوّل سے اُٹھالائے حسینؑ
چاند کو شام کے بادل سے اُٹھالائے حسینؑ جاں بلب شیر کو جنگل سے اُٹھالائے حسینؑ
دی صدا لاشِ پسر آن کے لے جا بانو
چھد گیا برچھی سے اکبر کا کلیجا بانو

دیکھ لے آخری دیدار پسر مرتا ہے سامنے آنکھوں کے یہ نورِ نظر مرتا ہے

اب کوئی دم میں مرا رشکِ قمر مرتا ہے منھ سے باہر ہے زباں تشنہ جگر مرتا ہے
دم ہے سینے میں رُکا زخم سے خوں جاری ہے
ارے بانو ترے گھر لٹنے کی تیاری ہے

اسی طرح حضرت حر کے احوال پر میر انیسؔ اور میر مونسؔ، دونوں بھائیوں نے مرثیے کہے ہیں۔ میر مونسؔ کے مرثیے پر میر انیسؔ کی اصلاح کے بعد اگر دونوں مرثیوں کے بند ملادیے جائیں تو یہ تمیز مشکل ہوگی کہ کونسا بند کس کا ہے۔ میر انیسؔ نے کہا ؎

بخدا فارسِ میدانِ تہوّر تھا حرؔ لاکھ دو لاکھ سواروں میں بہادر تھا حرؔ
نارِ دوزخ سے ابوذر کی طرح حر تھا حرؔ گوہرِ تاجِ سرِ عرش ہو وہ دُر تھا حرؔ
ڈھونڈلی راہِ خدا، کام بھی کیا نیک ہوا
پاک طینت تھی تو انجام بھی کیا نیک ہوا

اور میر مونسؔ اپنے مرثیے کا آغاز یوں کرتے ہیں ؎

مجلس افروز ہے مذکورِ وفاداریٔ حرؔ دل پہ ہر گل کے ہویدا ہے ہواداریٔ حرؔ
کس پہ ثابت نہیں سرداری دفاداریٔ حرؔ وجہ آزادیٔ دوزخ ہے عزاداریٔ حرؔ
قید پھر کیسی جو حامی و بہادر ہوگا
حرمتِ حرؔ کو جو سمجھے گا وہی حرؔ ہوگا

سلام نگاری اور مرثیہ نگاری میں میر انیسؔ اور میر مونسؔ، دونوں بھائی شانہ بہ شانہ ساتھ ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میر انیسؔ بھائی کے کلام کی اصلاح کرتے ہیں، اور میر مونس انہیں استاد مانتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ دونوں بھائی اُردو اور بالخصوص افقِ مرثیہ گوئی کے شمس و قمر ہیں۔

☆☆☆☆☆

اُمید لکھنوی:-

ولادت ۱۸۲۹ء۔ وفات ۱۸۷۶ء

نام نامی۔ سید محمد جعفر۔ تخلص اُمید۔ مولانا محمد باقر صاحب قبلہ کے فرزند اور حضرت غفران مآب کے پوتے تھے۔ مولانا سید محمد باقر شمس نے امید لکھنوی کی تاریخ پیدائش ۱۲۴۵ء

لکھی ہے۔ جو ۱۸۲۹ء بنتی ہے۔ اسی طرح وفات ۱۲۹۳ء ہجری مطابق ۱۸ مارچ ۱۹۴۸ء تحریر کی ہے جبکہ ۱۲۹۳ء ہجری ۱۸۷۶ء بنتا ہے۔ یہ دونوں تاریخیں حضرت ساحر لکھنوی نے ''خانوادہ اجتہاد کے مرثیہ گو، ماہر سے ساحر تک'' میں نقل کی ہیں۔ ساحر لکھنوی اور مولانا باقر شمس نے ان کی عمر ۳۵ برس لکھی ہے۔ جب کہ ۱۸۲۹ء اور ۱۸۷۶ء کا درمیانی عرصہ ۴۷ برس بنتا ہے۔

ساحر لکھنوی نے اس کتاب میں مولانا سید محمد باقر صاحب شمس کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے۔ کہ اُمید لکھنوی خاندان اجتہاد کے پہلے مرثیہ گو شاعر تھے۔ لیکن کتاب میں پہلا تذکرہ حضرت ماہر لکھنوی کا ہے اور ان کے بعد حضرت اُمید کا تذکرہ شامل کیا گیا ہے۔ بہر حال یہ بحث زیادہ اہم نہیں ہے اس لئے کہ ساحر لکھنوی اور اُمید لکھنوی بہر حال چچازاد بھائی تھے۔

حضرت اُمید لکھنوی کے مرثیوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ لکھنؤ کی شاعری مصنف مولانا شمس میں ان کے مرثیوں کی تعداد صرف (۲) لکھی گئی ہیں۔ لیکن اُن کا ایک ہی مرثیہ دستیاب ہے جو امام رضا علیہ السلام پر احوال یہ ہے ''تاریخ لکھنؤ'' میں مرثیوں کی تعداد تو نہیں تھی۔ البتہ یہ ذکر ضرور ہے کہ انہوں نے ''مرثیے بھی کہے۔'' جو مرثیہ دستیاب ہے وہ ۱۷۱ بندوں پر مشتمل ہیں مرثیہ کا چہرہ ارض مشہد مقدس سے کھلتا ہے۔

فکر ثنائے مشہدِ ذی احترام ہے وصفِ ریاضِ روضۂ رضواں قیام ہے
ہر فرد رشک گلشن دارلسلام ہے ایک ایک بیت قدر میں بیت الحرام ہے
خامہ کا رکن خانۂ کعبہ خطاب ہے
پانی نہیں، دوات میں زمزم کا آب ہے

جب کر چکے وصیتیں سلطان نامدار فرمایا یہ پسر سے کہ ہے شکر کردگار
مرضی ہو جو خدا کی نہیں اس میں اختیار آخر میں یہ کہا کہ یہ ہے وقت اختصار
حالت ہے مجھ کو یاد شہ مشرقین کی
روؤ تو یاد کر کے مصیبت حسینؑ کی

(خانوادۂ اجتہاد کے مرثیہ گو)

''تاریخ لکھنؤ مولانا مہدی کے مطابق حضرت امید کے انتقال کے وقت دو مرثیے اور غزلیات کا ایک دیوان دستیاب تھا۔ جس طمطراق اور ادب وآداب ساتھ حضرت امید لکھنوی کی

مرثیہ نگاری پر خانوادۂ اجتہاد کے اہل قلم نے لکھا ہے اتنا ان کا کلام میسر نہیں آیا۔

اودھ میں اُردو مرثیے کے عروج کا سہرا دبستان انیسؔ و دبیرؔ کے سر ہے۔ لیکن ان دبستانوں میں ایک دبستان درد بستان میر عشقؔ و تعشقؔ بھی ہے۔

☆☆☆☆☆

میرزا عشق :-

ولادت ۱۸۱۷ء

سید حسین میرزا عشقؔ، میرزا انسؔ کے بڑے فرزند تھے (یہ میرزا انس، میر انیسؔ کے بھائی میر مہر علی انس سے مختلف ہیں)۔ میر عشقؔ کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ وہ میر ضمیرؔ کے داماد تھے۔ ناسخؔ کے شاگرد تھے۔ میر عشقؔ کی مرثیہ گوئی میں غزل کا آہنگ بدرجہ اتم موجود ہے۔ مثلاً تلوار کی تعریف میں ایک بند غزل کے دلنوازی بیان کرتا نظر آتا ہے ۔

اس نے کماں کشوں کو اشارہ کیا کہ ہاں　　تیروں کا مینھ برسنے لگا رن میں ناگہاں
ابرِ کرم بڑھا تو چلی تیغ خوں فشاں　　تھرائی برق، رعد کیا را کہ الاماں
دیکھی جو اس کی باڑھ سپاہی تڑپ گئے
پیراک ڈر کے صورت ماہی تڑپ گئے

میر عشقؔ ۲۱ برس کے تھے کہ ناسخؔ کا انتقال ہوگیا۔ میر ضمیرؔ کی صاحبزادی سے شادی ہوئی تو میر ضمیرؔ سے اصلاح لینے لگے یہاں تک کہ میر ضمیرؔ کی طرز نوی کے علم کو لے کر آگے بڑھے۔

میر عشقؔ نے مرثیے کے مروجہ اجزا کو باقی رکھا اور مرثیے کی روایت کی پیروی کے ساتھ منظر کشی کا مخصوص ماحول پیدا کرنے کی طرف توجہ دی۔ جذبات و احساسات کی الفاظ سے تصویر کشی کی — زبان و بیان اُن کا ورثہ تھا ۔

جب پیرزال چرخ نے اوڑھی ردائے صبح　　پھیلے تمام خلق میں بالِ ہمائے صبح
فوجِ ضیا نے آگے بڑھایا لوائے صبح　　یہ ابتدائے صبح تھی وہ انتہائے صبح
آغاز میں بھرا تھا گلستاں رسولؐ کا
انجام میں تباہ ہوا گھر بتولؑ کا

بقول پروفیسر مسعود حسن رضوی میر عشقؔ کی بڑی کامیابی یہ تھی کہ جہاں انیسؔ و دبیرؔ کو ماننے

والی دو بڑی جماعتیں تھیں وہاں ایک چھوٹی جماعت اُن کے ماننے والوں کی بھی پیدا ہو گئی تھی۔

☆☆☆☆☆

میرزا تعشق :-

ولادت ۱۸۲۳ء۔وفات ۱۸۹۸ء

میر عشق کے بھائی، مرزا اُنس لکھنوی کے فرزند، زبان و بیان کے معاملے میں اپنے بھائی کے شانہ بشانہ نظر آئے۔جذبات نگاری میں کہیں کہیں میر عشق سے بھی آگے نظر آتے ہیں۔ تغزل، مناظر قدرت اور واقعات کی منظر نگاری میں باکمال شاعر تھے مثلاً علی اکبر کی شہادت کے بعد سیدہ زینبؑ کے جذبات کی عکاسی دیکھئے۔

تدبیر کیجئے کوئی یا شاہِ بحر و بر　　رہنے دیں سب مجھے علی اکبر کی قبر پر
ہو جائے گا لحد کی درستی میں دن بسر　　شب کو بھی پڑ رہوں گی وہیں منہ لپیٹ کر
تسکین ہوگی قلب کو مجھ بے قرار کے
بیٹھی رہا کروں گی سرہانے مزار کے

تنہا رہا نہیں ہے کبھی وہ نکو صفات　　اکبر کی قبر کو نہ میں چھوڑوں گی تا حیات
نیند آئے گی نہ شب کو جب اے شاہ نیک ذات　　باتیں کروں گی اس کی لحد سے تمام رات
سایہ نہیں ہے قبرِ غریب الدیار پر
سو جاؤں گی تو ہاتھ رہے گا مزار پر

میرزا تعشق غزل کے بھی باکمال شاعر تھے۔اُن کے پرپوتے حضرت مہذب لکھنوی نے جہاں میرزا تعشق کے مراثی کے مجموعے" افکار تعشق" جلد اول و دوم شائع کرائے ہیں وہاں ان مجموعوں سے قبل" دورِ تعشق" کے نام سے اُن کی غزلات کا دیوان بھی شائع کرایا ہے۔میر تعشق کا رنگ تغزل اُن کے مرثیوں میں بھی نمایاں رہا ہے۔مثلاً اُنہوں نے مرثیے کے چہرے میں ہجر و وصال کے مضامین بیان کئے ہیں۔اُن کے ایک مرثیے کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

سچ ہے دنیا میں شب ہجر بلا ہوتی ہے　　دم بدم آرزوئے مرگ سوا ہوتی ہے
آہ سینے کے لئے تیرِ جفا ہوتی ہے　　دل جلاتی ہے جو ٹھنڈی بھی ہوا ہوتی ہے

زندگی کہتے ہیں دنیا سے گذر جانے کو
دل تڑپتا ہے گلا گھونٹ کے مرجانے کو

کرب میں رات جدائی کی بسر ہوتی ہے مئے گلرنگ جہاں خونِ جگر ہوتی ہے
دل کو تعجیل فراقِ تن و سر ہوتی ہے عید ہوتی ہے جو ملنے میں سحر ہوتی ہے
لاکھ روکیں رہِ الفت کے بھلانے والے
جاتے ہیں کوچۂ محبوب میں جانے والے

اُنہوں نے مرثیے کے ایوانوں میں غزل کے استعاروں کے چراغ روشن کئے ہیں اور غزل کی فضاؤں کے تخیلی محوب کی تجسیم کی ہے۔ میدان جنگ میں سر قلم کرتی ہوئی تلوار کو استعارہ کر کے معشوق کی طرز ادا سے جاملایا ہے۔

وہ تیغ یوں جدا ہوئی کاٹھی سے خشمگیں جیسے بگڑ کے اُٹھتے ہیں پہلو سے نازنیں
تھا میان اس کی ہجر میں دل کی طرح حزیں روتا ہے جیسے منہ پہ کوئی لے کے استیں
ایما یہ تھا کہ رشتۂ دامن یہ ہاتھ ہے
خالی ہے جسم، جان میری تیرے ساتھ ہے

باتیں ہیں ساز باز کی ہر فتنہ ساز سے ملتی ہے ایک ایک سے کس امتیاز سے
فقرے برس رہے ہیں زبان دراز سے بیٹھی جہاں کرشمہ و انداز و ناز سے
لی جان ہاتھ گردنِ ظالم میں ڈال کے
پہلو سے لے گئی جگر و دل نکال کے

مرثیے کی روایات کی پاسداری کے ساتھ، غزل کے آہنگ کو مرثیے کے آہنگ میں سمونا میرزا تعشق کا امتیازی کمال ہے۔

انیسویں صدی کے اہم مرثیہ نگار شعرا میں کچھ ایسے نام ہیں جو مرثیہ نگاری کے حوالے سے مشہور نہیں ہیں جیسا کہ سلطان الہند، مغل سلطنت کے آخری تاجدار۔ بہادر شاہ ظفر کی شاعری پر تو لوگوں نے لکھا ہے، اُن کا دیوان بھی شائع ہوا ہے لیکن ان کے مرثیہ گوئی پر سیر حاصل تبصرہ نہیں ہوا۔ وہ سلطان جس کی اپنی پوری زندگی ایک مرثیہ ہے، جس کے احوال کو نظم کر دیا جائے تو انسانی تاریخ کا ایک عبرت ناک مرثیہ بن سکتا ہے چہ جائیکہ اُنہوں نے غم حسینؑ میں مرثیہ کہا ہے میری رائے میں

انیسویں صدی کی مرثیہ گوئی کے حوالہ جات اس وقت تک مکمل نہیں ہوئے جب تک اس فہرست میں شہنشاہ ہند، بہادر شاہ ظفرؔ، سلطان واجد علی شاہ اخترؔ اور استادِ شاہ ابراہیم ذوقؔ کے مراثی کا ذکر نہ ہو۔

"شاہی مرثیہ" **شہنشاہ معظم بہادر شاہ ظفر** کا نمونۂ کلام

اسے مجرا جو شاہ دو جہاں ہے — جھکا مجرے کو جس کے آسماں ہے
وہ سرور ہیں شاہ شہیداں دو جگ کا اجیارا — اللہ کا محبوب ہے وہ اور ہے وہ نبی کا پیارا
علی کا ہے جگر زہرا کی جاں ہے

ستم ہے ساقیٔ کوثر کا جانی — نہ پائے تین دن اک بوند پانی
پانی کی اک بوند نہیں اور سوکھی جائیں زبان — مارے پیاس کی گرمی کے ہونٹوں پہ آئی جان
لبوں پر پھیرتا سوکھی زباں ہے

موا دن بیاہ کے قاسم جو رن میں — جدائی ہوگئی دولہا دلہن میں
کیسی مہندی، عطر سہاگ اور کیسی رنگیلی رات — دولہا کے تو ہاتھ کٹیں اور دلہن ملتی ہات
غمِ قاسم ہے یہ شادی کہاں ہے

گرا اکبر تو برچھی رن میں کھا کر — موا عباسؑ بھی دریا پہ جا کر
مارے گئے سب ساتھی سنگاتی اکبر آپ نرا سے — خیمہ جلا، گھر بار لٹا اور اہل حرم سب پیاسے
جدھر دیکھو ادھر شور فغاں ہے

گئے اصغر کو شہ گودی میں لے کر — کہ پانی سے کروں اس کا گلو تر
پیاسے گلے میں اس کے اُتری ہے ہے تیر کی بوند — دیکھ کے اپنے باپ کی صورت آنکھیں لی ہیں موند
گلوئے خشک چشم خوں چکاں ہے

لہو میں دیکھ کر بھائی کو غلطاں — کہا زینبؑ نے یہ باچشم گریاں
ہے ہے جس کو پیار سے اپنے زہرا گودی پالے — اس کے تن پر گھاؤ لاگے بہتے لہو کے نالے
سراب اس کا ہے اور نوک سناں ہے

جسے زہرا نے گودی میں کھلایا — نبی نے دوش پر جس کو چڑھایا
چاروں اور سے اُس کے لاگے برچھی بھالے تیر — ماٹی او پر لوٹے رن میں، گھائل سارا شریر
لہو کے زخم سے دریا رواں ہے

ہوا زین العبا محبوس افسوس پیادہ پا چلا افسوس افسوس
جس کے پاؤں کی مانی ہو چاند سورج پر فوق اس کے ہاتھوں ہتھکڑیاں ہوں اور گلے میں طوق
سفر در پیش ہے اور ناتواں ہے

ظفر اس غم سے اک عالم ہے مغموم زمیں سے تا فلک ماتم کی ہے دھوم
نیلا تا گا آکاش نے کینو جانی اندھیری رین تارے نا ہیں آنسوؤں سے ہے بھرے زمانہ نین
جسے دیکھو غرض ماتم کناں ہے

("العلم" مرثیہ نمبر اگست ۱۹۹۲ء)

☆☆☆☆☆

سلطان واجد علی شاہ اختؔر تاجدار اودھ:-

ولادت اگر ۱۰ ذیقعد ۱۲۳۸ھ ہے تو ۱۸۲۲ء ورنہ ۱۹ جنوری ۱۸۲۳ء

وفات ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء۔

سلطانِ عزادار، شاہ اودھ۔ لکھنؤ اور اودھ کے عوام کے دلوں کی دھڑکن۔ بادشاہ جسے انگریز Immigrants (تجارت کے لئے ہندوستان میں داخل ہونے والے انگریزوں) نے عیارانہ اقدام سے تاج وتخت سے دستبرداری پر آمادہ کیا۔ پھر فورٹ ولیم میں نظر بند کیا اور بالآخر زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ اس مظلوم شاہ کی زندگی میں کچھ تاریخیں اہم ہیں جو یہ ہیں۔

ولادت	۱۹ یا ۳۰ جولائی ۱۸۲۳ء
ولی عہدی	۲۱ مئی ۱۸۴۲ء
تخت نشینی	۱۳ فروری ۱۸۴۷ء
معزولی	۴ فروری ۱۸۵۶ء
نظر بندی	۱۵ جون ۱۸۵۷ء
وفات	۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء

سلطان واجد علی شاہ اختؔر کا نسب نامہ اُن کے والد گرامی کی طرف سے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے اور والدہ گرامی کی طرف سے امام حسینؑ علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ اس طرح سلطان واجد علی شاہ اختؔر، کاظمی سید ہوئے۔

انگریزوں نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت منصف مزاج، عادل، رعایا پرور، غیر متعصب، پابند صوم وصلوٰۃ، دہندۂ خمس وزکوٰۃ سلطان کو عیاش، ظالم، لاپرواہ ثابت کرنے کے لئے ہر حربہ اختیار کیا۔ انگریز غاصبوں کے چشم و ابرو کے اشاروں پر رقص کرنے والے ضمیر فروش موز خین نے خدا ترس، رحم دل اور نیک چلن بادشاہ کے کردار کے بارے میں ایسے ایسے فسانے تراشے کہ خدا کی پناہ۔ ڈاکٹر صفدر حسین نے سلطان واجد علی شاہ اختر کے بارے میں سر جان کے (Sir John Kay) کا تبصرہ نقل کیا ہے جو انگریزوں کے رویّے اور ذہنیت کی عکاسی ہے۔

> ''ہم لوگوں میں (انگریزوں میں) یہ رسم ہے کہ پہلے کسی دیسی حکمران کی حکومت پر قبضہ کرتے ہیں اور پھر معزول فرمانروا یا اس کے جانشین کو جی کھول کر بدنام کرتے ہیں۔ چونکہ انگریزوں کے خلاف پہلی جنگ آزادی کی علمبرداری پوربی سپاہیوں نے کی تھی اور انتزاع حکومت واجد علی شاہ اختر کے عہد میں ہوا تھا اس لئے خصوصیت کے ساتھ انگریزی پروپیگنڈے کا وہی نشانہ بنے اور تمام الزامات کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے۔''
>
> (لکھنؤ کی تہذیبی میراث۔ ڈاکٹر صفدر حسینؔ۔ ص ۱۱۱)

سلطان کی تصانیف و تالیف کے بارے میں پروفیسر مسعود حسینؔ ادیب نے لکھا ہے کہ اُنہوں نے سلطان واجد علی شاہ اختر کی ستر (۷۰) کتابیں خود پڑھی ہیں، سلطان واجد علی شاہ اختر نے اپنی کتاب ''بنی'' میں ۴۶ کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ سلطان واجد علی شاہ اختر نے غزلوں کی دس دیوان چھوڑے ہیں، دس مثنویاں لکھی ہیں۔ رثائی شاعری میں سلام، رباعیات، قطعات اور نوحے بھی کہے ہیں۔ مرثیہ اُن کی شعر گوئی میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اُنہوں نے بے شمار مرثیے کہے ہیں۔ اُن کے ادبی خزانے کی لوٹ کھسوٹ کے بعد بھی، اس وقت اُن کے گیارہ مجموعوں کا ذکر ملتا ہے۔

(۱) ''توشۂ آخرت'' ۱۲۹۸ھ میں بادشاہ نے خود مرتب کیا۔ ۶۹ مرثیوں پر مشتمل ہے

(۲) ''دفترِ غم (بحرالم)'' ۲۱ مرثیے توشۂ آخرت سے لئے ہیں، ۳ نئے مرثیے ہیں۔

(۳) ''ریاض القلوب'' دفترِ غم کے مراثی کے ساتھ دو نئے مرثیوں کے اضافے کے ساتھ

(۴) ''ریاض العقبیٰ'' توشۂ آخرت سے ہر حال کا ایک مرثیہ اور ایک نیا مرثیہ کل ۲۶ مرثیے

(۵) ''دفترِ پریشاں،، تین مرثیے۔ (۶) تر مضمون (۷) مقتل معتبر، (۸) مجموعہ مراثی

حصہ اوّل، ۱۵ مرثیوں کا مجموعہ، (۹) مجموعہ مراثی حصہ دوم (۱۰) ملک اختر بارہ بندوں پر مشتمل صرف ایک مرثیہ (۱۱) سرمایہ ایماں۔

مراثی کی اس تعداد کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ سلطان واجد علی شاہ اختر نے ایک سو سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہی مرثیے کہے ہوں گے — واجد علی شاہ اختر کے مرثیوں میں لکھنؤ کی ادبی فضا سامنے آجاتی ہے۔ لفظوں کا تناسب۔ عالمانہ اندازِ بیان۔ سلامت و روانی تشبیہات اور استعارات کی سجاوٹ، سبھی کچھ تو ہے اُن کے مرثیوں میں، ان کی حزنیہ اور بیانیہ شاعری میں اُن کی قادرالکلامی واضح نظر آتی ہے۔ ہر چند کہ اُن کی مرثیہ گوئی پر تبصرے بھی ہوئے ہیں اور کتابیں بھی لکھی گئی ہیں مگر یہ بھی صداقت ہے کہ حق ادا نہیں ہوا، سید مظفر حسین کاظمی کی یہ شکایت بجا ہے کہ:

''میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے بعد آنے والے مرثیہ گویوں میں
سلطان واجد علی شاہ اخترؔ کو بحیثیت مرثیہ نگار کوئی مرتبہ نہ ملا''

(واجد علی شاہ اُن کی شاعری اور مرثیے۔ ص ۱۵۶)

نمونہ کلام: ایک مقبول مرثیے ۔ ''تاج سر خورشید کے افسر ہیں یداللہ'' کے ۵ بند،

تاجِ سرِ خورشید کے افسر ہیں یداللہ ۱ مجموعہ عالم میں گلِ تر ہیں یداللہ
دنیا میں تونگر ہے تونگر ہیں یداللہ اور زور میں شکنندۂ خیبر ہیں یداللہ
جز نانِ جویں اور نہ کچھ کھاتے تھے حضرت
طاقت میں ملائک سے بھی بڑھ جاتے تھے حضرت

آرائش گلزار نبی سرو محمدؐ ۲ گنتی نہیں اشفاق کی، اخلاق ہے بے حد
جبریل پڑھا کرتے تھے اس شان سے ابجد افزونی اسلام میں رہتی تھی انہیں کد
کیوں کر نہ فدائے سرِ مولا یہ بشر ہوں
اس راہ میں مرنے سے کسے خوف و خطر ہوں

مریم کو ہوا درد جونہی زہ کا ہویدا ۳ عیسیٰ کے تولد کا جو ساماں ہوا پیدا
پرنور تھا بے شک دلِ مریم کا سویدا فرزند وہ فرزند کہ جو حق پہ تھا شیدا
پیدائشِ عیسیٰ کا جونہی وقت وہ آیا
بھایا نہ اُنہیں خانۂ اللہ کا سایا

یہ حکم ہوا اُن کو کہ کعبے سے جدا ہو ۴ تم جا کے الگ درد میں مصروفِ دعا ہو
کعبے کا رہے پاس اگر خوفِ خدا ہو لازم ہے تمہیں حرمتِ کعبہ کو نبا ہو
پر شانِ علی دیکھئے کس کرب و بلا میں
پیدا ہوئے یہ خانۂ ربِّ دوسرا میں

زیبائشِ قصرِ نبوی رونقِ دنیا مفتاحِ خزائن ورقِ صفحۂ بطحا
آرائشِ گلزارِ جہاں، مالکِ عقبیٰ مصباحِ حریمِ شہِ دیں، شاہِ زمانا
کہتے جو علیؑ، نامِ خدا، نامِ علیؑ ہے
ہمنام خدا ، نامِ خدا ، نامِ علیؑ ہے

سلطان واجد علی شاہ اخترؔ کی قادر الکلامی کا ایک اور ثبوت ان کی ''بے نقط'' مرثیہ گوئی ہے، ان کے ایک مرثیے سے'' مطبوعہ طبع خورد و کلاں یہ کلام ہو'' میں پانچ بند بے نقط ہیں ۔

طالع ہما ہو، وہم رسا ہو، کمالِ مدح اور رسمِ کلک و سلکِ گہر ہو سوالِ مدح
مہرِ کرم ہو مطلعِ دل اور ہلالِ مدح اور دوحۂ سلام ہو لامِ وصالِ مدح
مصرع ہو عطر سرو ہو طولِ کلام کا
حاصل گلِ ارم ہو سرِ طور، کام کا

دارالسلامِ علم سما ہو سرورِ دل ہمراہ دہر مال ہمارا ہو، ہورِ دل
لا وہ ہمائے حرص و ہوا واہ مورِ دل کھل کر دکھا وہ حال رہا گر، وہ کورِ دل
وہ کام کر کہ محو ہو دل ہر کلام کا
احوال لکھ وہ عام کا ہو کام امام کا

دل کو عدم سرور ہو اس دم وہ حال کہہ حاصل صلہ ہو علم کا مدح کمال کہہ
اس طور کا دلا ارمِ ہم ملال کہہ اسدم ہو حال کام محمدؐ سوال کہہ
ہو معرکہ طلوعِ سحر کا وہ گرد ہو
گرم آہِ دل ہلا وہ سما دہر سرد ہو

مرثیے کے بیسویں بند میں مرزا دبیر کے بے نقط مرثیے کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

کہتا بہت سیاہ میں کرتا ہزار تاؤ پر کیا مزہ کہ کھو گیا گر لفظ کا بناؤ
آمد کجا، مگر ہے یہ انداز اور آؤ آتا نہیں ہے حرف، زبردستی کھینچ لاؤ

خوش فکر ہیں دبیر سلامت رہیں مدام
واللہ بس یہ کام اُنہیں پر ہے اختتام

سلطان واجد علی شاہ اختر نے کئی جگہ مرزا دبیر کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دبیر سے بہت متاثر تھے۔

☆☆☆☆☆

شیخ ابراهیم ذوق:- (دہلی)

پیدائش ۱۷۸۸ء۔ وفات ۱۵/اکتوبر ۱۸۵۴ء۔

ہوش سنبھالا تو ان کے والد گرامی شیخ محمد رمضان نے انہیں حافظ غلام رسول کے پاس پڑھنے بیٹھایا۔ حافظ غلام رسول شعر کہتے تھے لہٰذا ان کے ہاں شعروشاعری کا ماحول رہتا تھا، ذوق نے اس ماحول میں شعر کہنے شروع کر دئے، ابتدا میں اپنے استادِ مکتب حافظ غلام رسول سے اصلاح لی، شعری شعور پختہ ہوا تو شاہ نصیر سے سلسلۂ تلمذ وابستہ کرلیا۔ شاعری کی فطری صلاحیت اور استادِ وقت شاہ نصیر کی اصلاح و ترتیب شعری نے بہت جلد ذوق کو استاد بنا دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ دلی عہد سلطنت ذوق سے اصلاح لینے لگے۔ شاعری کی ابتدا حسب دستور غزل سے ہوئی۔ قرب شاہی نے قصیدہ گوئی کی طرف متوجہ کیا۔ شعر گوئی پر دسترس تھی اس لئے قصیدہ گوئی میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ اس قصیدہ گوئی نے خان بہادر بنایا اور پھر خان بہادر ابراہیم ذوق کو دربار شاہی سے خاقانی ہند کا خطاب دلا دیا اور وہ استاد شاہ، خان بہادر، خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق کہلانے لگے۔

ذوق کی غزل گوئی اور قصیدہ نگاری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ بہت کچھ لکھا جا سکتا لیکن ہمارا موضوع رثائی ادب بالخصوص مرثیہ ہے لہٰذا ذیل میں ذوق کے ایک مرثیے کا ذکر کرتے ہوئے اس مرثیے کے چند بند نقل کئے جا رہے ہیں جو استاد ذوق کو درس گاہ کربلا میں لا کھڑا کرتے ہیں۔

جب قید سکینہ ہوئی زندان ، ستم میں بیتاب تھی وہ ہجرِ شہنشاہِ امم میں
بانو سے یہ کہتی تھی نہیں دم میرے دم میں ا بابا سے میں چھٹتے ہی پھنسی رنج الم میں

کچھ روز میں دنیا سے گذر جاؤں گی اماں
اس گھر سے نہ نکلوں گی تو مر جاؤں گی اماں

اس گھر میں تو آتے ہی غم و رنج نے گھیرا وہاں لے چلو مجھ کو ہے جہاں شاہ کا ڈیرا
یہ کیسا ہے گھر جس میں ہر اک سو ہے اندھیرا گھبرا کے دم، اک دم میں نکل جائے گا میرا

ہموار نہیں ایک وجب یاں کی زمیں ہے
جس گھر میں کہ پیدا ہوئی، یہ گھر وہ نہیں ہے

اس گھر میں نہ ابّا ہیں نہ عمّو نہ برادر نے مسجد سرور ہے نہ گہوارۂ اصغر
وارث مریں۔ تاراج ہو جن لوگوں کا گھر بار سر ننگے پھرا دیں جنہیں دشمن، سر بازار

جو ظلم و ستم ان پہ ہوں، دنیا میں وہ کم ہیں
بے وارث و والی جنہیں کہتے ہیں وہ ہم ہیں

ذوقؔ کا یہ پورا مرثیہ مصائب اور بین پر مشتمل ہے۔ سکینہ کے قید میں جانے سے تڑپ تڑپ کر جان دینے تک مصائب ہی مصائب، بین ہی بین اور پھر ذوقؔ کی قادرالکلامی۔ پوری تاریخ کو صحت روایت کے ساتھ درد کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ مرثیہ چالیس بند پر مشتمل ہے اور شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہو کہ یہ مرثیہ اس حوالے سے منفرد ہے کہ پورا مرثیہ بین پر مشتمل ہے حتیٰ کہ تاریخی واقعات بھی۔

مرثیہ گوئی کی تاریخ میں دبستانِ دکن، دبستانِ دہلی اور دبستانِ اودھ کے شعراء پر ایک سے زیادہ ناقدین نے کام کیا ہے حتیٰ کہ تقسیم ہند کے بعد قائم ہونے والے دبستانِ کراچی اور دبستانِ پنجاب کے مرثیہ گو شعراء بھی افق مرثیہ گوئی کے چاند ستاروں میں شمار کیے گئے ہیں لیکن دبستانِ امروہہ کو نادانستہ ہی سہی، کسی حد تک نظر انداز کیا گیا ہے۔ تاریخ مرثیہ گوئی میں امروہہ کے صرف اُن شعراء کا ذکر کیا جاتا ہے جن کے ذکر کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اُن شعراء کرام نے خود کو منوایا ہے۔ ڈاکٹر ہلالؔ نقوی امروہوی نے بھی دبستانِ کراچی کے مرثیہ گو شعراء کے حوالے سے جو دستاویز مکمل کی ہے، اس میں امروہہ کے اُن شعراء کرام کا ذکر کیا گیا ہے جو تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے تھے۔ ان میں کراچی اور لاہور کے علاوہ پاکستان کے دوسرے شہروں میں آ کر بسنے والے امروہوی شعراء کا تذکرہ بھی خال خال موجود ہے۔ دبستانِ پنجاب کے حسب

پسند شعراء کا تذکرہ سید وحید الحسن ہاشمی نے لکھا ہے لیکن امروہہ کے چیدہ چیدہ شعراء کے علاوہ کسی نے امروہہ کے مرثیہ گو شعرا کا تفصیل اور تسلسل سے تذکرہ نہیں کیا ہے البتہ ڈاکٹر عظیم امروہوی نے سودا سے ڈیڑھ سو برس پہلے ہونے والے مرثیہ گو شاعر میر سید اسمٰعیل سے موجودہ شعراء تک ۷۵ مرثیہ گو شعراء کو مختلف تواریخ اور تذکروں سے تلاش کر کے یکجا کیا ہے اور "مرثیہ نگاران امروہہ" کے نام سے ایسی دستاویز تیار کی ہے جو رثائی ادب کے تناظر میں ایک اہم کتاب ہے۔

امروہہ کے مرثیہ گو شعراء میں جہاں مصحفی، ابوالحسن فرقتی، اور طپش جیسے جلیل قدر شاعر شامل ہیں وہاں دو گھرانے ایسے بھی ہیں جو دبستان در دبستان ہیں۔ ان میں ایک گھرانا یکتا امروہوی ان کے فرزند فرزدق ہند شمیم امروہوی، ان کے پوتے نسیم امروہوی، سیدہ مدینہ خاتون مدینہ، فہیم امروہوی اور بالواسطہ سردار نقوی جن کی والدۂ گرامی، حضرت شمیم امروہوی کی دختر نیک اختر اور مدینہ خاتون کی پوتی ہیں شامل ہیں۔ دوسرا گھرانا امیر حسن امیر اور ان کی نسل پر مشتمل ہے جس میں امیر حسن امیر کے فرزند نصیر حسن نصیر، ان کے فرزندان انیس حسن، نفیس حسن نفیس، وحید حسن گدا، (جنہیں وحید حسن وحید بھی کہا گیا ہے) اور شفیق حسن ایلیا ہیں اور شفیق حسن ایلیا کے چار فرزند سید محمد عباس، رئیس امروہوی، سید محمد تقی اور جون ایلیا شامل ہیں۔ اٹھارویں صدی میں اردو مرثیے کے حوالے سے امروہہ کے جن مرثیہ گو شعراء کا نام تاریخ کے کسی گوشے میں محفوظ رہ گیا ہے ان میں میر سید اسمٰعیل، میر سید سعادت علی، ان کے فرزند سید نجابت علی اور شاہ عالم مخزون ہیں۔

☆☆☆☆☆

میر سید اسمٰعیل:-

ولادت ۱۰۵۴ھ (۱۶۴۴ء) وفات ۱۱۲۳ھ (۱۷۱۱ء)

میر اسمٰعیل کی مرثیہ گوئی کے ثبوت میں ان کی ایک مثنوی "وفاتِ بی بی فاطمہؑ" جو شمالی ہند کی سب سے قدیم مثنوی کے طور پر سہ ماہی "اردو" کراچی شمارہ جولائی ۱۹۵۱ء میں بھی شائع ہوئی۔ اس مثنوی کے سلسلے میں استدلال یہ ہے کہ ابتدا میں اردو مرثیے کی کوئی ہیئت مقرر نہیں تھی۔ مرثیے میں مسدس کی ہیئت سودا نے متعین کی جبکہ میر اسمٰعیل کی مثنوی سودا سے ڈیڑھ صدی قبل کی مثنوی ہے اور مثنوی رثائی ادب کی بنیادی ضرورتوں کے معیار پر پوری اترتی ہے تو اسے

مرثیہ کیوں نہ کہا جائے۔ یاد رہے کہ ڈاکٹر فضل امام نے تو ''شاعر آخر الزماں جوش ملیح آبادی'' میں اسی استدلال پر ''نو سرہار'' کو مرثیہ کہا ہے جسکا ذکر اس کتاب میں آچکا ہے۔

☆☆☆☆☆

سعادت میر :-

ولادت، ۱۶۹۸ء۔ وفات ۱۷۳۷ء۔

سید سعادت علی سعادت میر کی عمر صرف ۳۹ سال ہوئی ہے۔ میر تقی میر سے ان کا قریبی تعلق تھا۔ مولوی عبدالحق کی تحقیق کی رو سے میر تقی میر بھی سعادت کے شاگرد تھے۔ میر تقی میر نے ''نکات الشعراء'' میں اُنہیں اپنا دوست کہا ہے اور 'ذکرِ میر' میں یہ وضاحت ہے کہ ''مجھے سعادت امروہوی نے غزل کی طرف متوجہ کیا'' سعادت میر کی مرثیہ نگاری کے متعلق مختلف ناقدین نے لکھا ہے لیکن اُن کے مرثیوں کا نمونہ کسی کو نہیں ملا۔۔۔ البتہ عظیم امروہوی نے سعادت میر کے دو مرثیوں کے اقتباسات درج کئے ہیں۔ پہلے مرثیے کا مصرع اوّل ۔ ''جب چلے خیمے سے رن کو پسرانِ زینب'' ۳۱ بند کے اس مرثیے کے مقطع کا مصرع ۔ ''بس ہو خاموش سعادت نہ کراب طولِ کلام'' ہے۔ دوسرے مرثیے کا آغاز ۔ ،، جب جنگ میں اکبر نے سناں ظلم کی کھائی،، سے ہوتا ہے، یہ مرثیہ ۳۸ بند کا ہے۔ سعادت میر کی ''سواری'' بہت مقبول ہوئی ہے جس کا ذکر میر حسن نے بھی کیا ہے اور نسیم امروہوی نے بھی اپنی کتاب ،، سعادت امروہوی،، میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ نظم آج بھی امروہہ میں مقبول ہے۔

☆☆☆☆☆

سیّد نجابت علی نجابت:-

ولادت، ۱۶۹۸ء۔ وفات ۱۷۳۶ء

تواریخ واسطیہ کے حوالے سے جلال الدین اکبر کے عہد میں ایک منصب دار دیوان میراں سید خضر گذرے ہیں۔ ان کے فرزند سیّد میر علی، پوتے سید سعادت علی سعادت اور پر پوتے سید نجابت علی نجابت تھے۔ نجابت کا ایک مرثیہ بھی امروہہ کے قدیم بستوں سے تلاش کیا گیا ہے۔

صغرا سے بہت رکھتا تھا الفت علی اکبر　　کرتا تھا اُسے پیار بہ کثرت علی اکبر
دیکھ اس کی کسل مند طبیعت علی اکبر　　ہوجاتا تھا بیتاب نہایت علی اکبر

کبریٰ و سکینہ پہ بھی ہر چند فدا تھا
پر فاطمہ صغرا سے اسے عشق بڑا تھا

"مرثیہ نگارانِ امروہہ" میں بھی سعادت میر اور نجابت کی ولادت و وفات کے اندراج میں غیر یقینی صورت حال ہے لیکن سید نجابت علی کے مرثیے کا بند یقیناً اٹھارویں صدی کی زبان میں ہے۔ یہی مضمون اگر انیسویں یا بیسویں صدی میں کہا جاتا تو شاید یوں ہوتا۔

صغرا سے بہت رکھتے تھے الفت علی اکبر کرتے تھے اُسے پیار بہ شدّت علی اکبر

☆☆☆☆☆

محزوںؔ:-

امروہہ کے مرثیہ نگاروں میں ایک نام محزوںؔ کا بھی ہے۔ ڈاکٹر مسیح الزماں نے بھی مراثیٔ میرؔ کے مقدمے میں محزوںؔ کا نام درج کیا ہے۔ شاہ محمد کمال کی کتاب مجمع الانتخاب کے حوالے سے محزوںؔ کا نام شاہ عالم، تخلص محزوںؔ تھا اور اُن کا تعلق امروہہ سے تھا۔ عظیم امروہوی نے محزوںؔ کا ایک مرثیہ ،،نور سے یارو، زمین کربلا معمور ہے" دریافت کیا اور اُن کا ایک بند بھی نقل کیا ہے۔

کہہ کے یہ جس دم ہوئے غالب امام ابن امام روئی اولادِ اسد اور تھے زمیندار اس مقام
جو مصیبت گذری واں سجادؔ پر در ملکِ شام کیا تمام اس کو لکھے محزوںؔ کہ ہے وہ ناتمام
آرزو ہے مجھ کو حاصل ہو زیارت شاہ کی
دیکھوں تربت جا کے میں سبطِ رسول اللہ کی

مرثیے کے ناقدین میں سے کسی نے محزوںؔ کی تاریخ ولادت یا تاریخ وفات نہیں لکھی۔ غالباً انہیں اٹھارویں صدی کا شاعر بھی اس لئے قرار دیا گیا کہ اُن کے مرثیے میں جو زبان استعمال ہوئی ہے وہ اٹھارویں صدی کی زبان معلوم ہوتی ہے۔

انیسویں صدی میں امروہہ کے مرثیہ نگار شعراء میں ایک اہم نام شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ کا ہے، اُردو شعراء کے تمام تذکروں میں مصحفیؔ کا نام ملتا ہے۔ امروہہ کے افق مرثیہ پر جو کہکشاں روشن ہے اس میں سید غلام علی حسینیؔ، شیخ غلام مصطفیٰ ہمدانی مصحفیؔ، نجیب الدین صفدرؔ، یعقوب معجزؔ، حیدر حسین یکتاؔ، سراجؔ، طپشؔ، اور ذکی حسن ذکیؔ شامل ہیں۔

☆☆☆☆☆

سید غلام علی حسینی:-

میر سید اسمٰعیل کی نسل سے تھے، عظیم امروہوی نے تلاش بسیار کے بعد اُن کے دو مرثیے دریافت کئے جن پر تحریر شدہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ حسینی کا زمانہ بارہویں صدی ہجری کے آخری حصے (اٹھارویں صدی عیسوی) اور تیرہویں صدی ہجری مطابق انیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی دنوں کا زمانہ تھا۔ جن تذکروں میں اُنہیں نامور اور استاد شاعر کہا گیا ہے۔ وہ تذکرے بھی اُن کی پیدائش اور وفات کے سلسلے میں خاموش ہیں۔ ان کا ایک مرثیہ مربع میں اور ایک مسدس میں ملا ہے۔ پہلا مرثیہ ۱۹ بند پر مشتمل ہے۔

حسینؑ چلے جب جنگ و جدل کو یارو گھوڑا منگا
بی سکینہ یوں کہے پدر کو باپ رن کو نہ جا
گر تم چلے یاں سے رن کو ظالم لوٹیں گے آہ
چھینیں گے میرے کانوں سے در کو بابا رن کو نہ جا

وہ مرثیہ جو مسدس میں ہے وہ جناب صغرا کے احوال کا مرثیہ ہے۔ دونوں مرثیوں کی زبان میں جو فرق ہے وہ ہو سکتا ہے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے درمیان زبان و بیان کے ارتقاء کی نشاندہی کرتا ہو اور دوسرا مرثیہ حسینی کے آخری دنوں میں کہا گیا ہو

کہوں گی بابا جو الفت تمہیں ذرا ہوتی　　تو صغرا کاہے کو ان قدموں سے جدا ہوتی
ہمیشہ ساتھ تمہارے ہر ایک جا ہوتی　　جو رنج آپ کو ہوتا تو میں فدا ہوتی
سو تم نے جا کے وہاں اس قدر بھلایا مجھے
کہ ایک پرچۂ قرطاس بھی نہ آیا مجھے

☆☆☆☆☆

شیخ مصحفی:-

ولادت ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۵ء وفات ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء

شیخ غلام مصطفیٰ ہمدانی مصحفی کا سب سے بڑا تعارف ''ریاض الفصحا'' ہے۔ اُردو کے ہر تذکرہ نویس، مورخ اور نقاد نے مصحفی کو ''استادِ ذوی الاحترام''۔ استاد مسلم الثبوت وغیرہ لکھا ہے۔ سودا، انشاء، جرأت کے ہم عصر تھے۔ محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں مصحفی کے مقام کو تسلیم

کیا ہے۔رام بابو سکسینہ نے ' تاریخ ادب اُردو' میں زود گو شاعر کہا ہے اور اس المیہ کا بھی ذکر کیا ہے کہ معمولی غزلیں خریدار ان کو بیچ دیتے تھے۔اُن کے فن اور اُن کے کمال کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ میر مستحسن خلیق، ضمیر، آتش جیسے باکمال شعراء مصحفی کے دامن تلمذ سے وابستہ رہے ہیں۔'' تاریخ اصغری'' میں ناسخ، آتش، اور ذکی کو بھی مصحفی کا شاگرد لکھا گیا ہے۔ مصحفی کی ہمہ جہت شاعری میں غزل، نظم، قصیدہ، رباعی اور مثنوی کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے لیکن قادرالکلامی کی اس گونج میں اُن کی مرثیہ گوئی سامنے نہ آسکی۔صرف سفارش حسین رضوی نے'' تاریخ اُردو مرثیہ'' میں اُن کی مرثیہ نگاری کا ذکر کیا ہے اور ایک مرثیے کا حوالہ دیا ہے ۔ بولو تو کوئی روح پیمبر کے واسطے۔ محمود آباد ہاؤس کی لائبریری سے یہ مرثیہ نقل کیا گیا ہے ۔

بولو تو کوئی روحِ پیمبر کے واسطے تسکین دل کرو میری حیدر کے واسطے
سر تھا بنا حسینؑ کا افسر کے واسطے یا نوک نیزہ و دمِ خنجر کے واسطے

۳۴ بند پر مشتمل یہ مرثیہ اس عہد کی تصویر ہے۔ہیت کے اعتبار سے مربع، مضامین کے حوالے سے بیانیہ، ہر بند مختلف کیفیت کا مظہر ہے۔۔۔

جاتا تھا بیکسوں کا جو کوفے کو کارواں مت پوچھو حالِ عابدِ بیمارِ ناتواں
اپنے قدم کو اس کو اُٹھانا تھا حدگراں ہر آبلہ تھا پاؤں کا لشکر کے واسطے

مضطر ہے مصحفی، غم دنیا سے دیجئے یا مرتضٰی علی میری عرضی کو لیجئے
مداحِ اہلبیت کا ایک کام کیجئے آزادی اس غلام کو قنبر کے واسطے

مصحفی لکھنؤ میں آن بسے تھے اور عمر بھر یہیں رہے اس لئے عام طور پر ان کا شمار شعرائے لکھنؤ میں ہوتا ہے ۔

☆☆☆☆☆

سیّد نجیب الدین صفدر:-

ولادت بارھویں صدی ہجری کا آخر۔وفات تیرھویں صدی ہجری کی ابتدا۔

سراج الدین سراج شاگرد میر انیس کے والد تھے۔بارہویں صدی ہجری کے آخری دور سے تیرہویں صدی کے نصف کے بعد تک حیات رہے، مسدس کی ہیت میں مرثیہ کہتے

تھے۔اُن کا ایک مرثیہ امروہہ کے کئی خاندانی بستوں میں محفوظ ہے۔

شاہ نجف کے باغ میں گلچیں قضا ہے آج　　باغ جہاں کی اور ہی آب و ہوا ہے آج
کشتِ نبی یہ بارشِ ابرِ بلا ہے آج　　بے آب غرق کشتیٔ آلِ عبا ہے آج
لاشے ہیں گُل رخوں کے برابر پڑے ہوئے
شبیر مثلِ سرو ہیں تنہا کھڑے ہوئے

مرثیے کا انداز بیانیہ ہے، مختلف مضامین پر مشتمل بند مرثیہ مکمل کرتے ہیں۔زیادہ تر شاعر ہی سوگوار مناظر کی عکاسی کرتا ہے۔کہیں کہیں کربلا میں موجود خانوادۂ رسالت کے کردار بولتے ہیں۔اسی مرثیے میں بھائی کی لاش کو ڈھونڈتے وقت بہن زینب کے جذبات کا اظہار بہن کے الفاظ میں کرایا گیا ہے۔

اے سروِ بوستانِ رسالت کہاں گرے　　اے نورِ چشمِ شاہِ ولایت کہاں گرے
اے آفتابِ برجِ امامت کہاں گرے　　اے بضعۂ نبی کی بضاعت، کہاں گرے
بیکس بہن کو بھائی تمہاری تلاش ہے
جنگل میں لاش ہے کہ ترائی میں لاش ہے

مقطع کے بند میں پھر شاعر نوحہ خواں نظر آتا ہے۔

صفدر اب آگے تاب نہیں بند کر زباں　　گذرا جو اہلِ بیت پہ کس منہ سے ہو بیاں
کافی ہے حشر تک یہی بس نالہ و فغاں　　آلِ نبی کا لُٹ گیا جنگل میں کارواں
یوں اہلبیتِ ختمِ رسل در بدر پھرے
اونٹوں پہ بیویں، نیزوں پہ مردوں کے سر پھرے

☆☆☆☆☆

یکتا امروہوی:۔

ولادت ۱۸۰۵ء وفات ۱۸۴۵ء

نام سید حیدر حسین، تخلص، یکتا۔فرزدقِ ہند حضرت شمیم امروہوی کے والد، حضرت نسیم امروہوی کے پردادا، نقوی سیّد، ۴۰ برس کی عمر پائی لیکن اس مختصر عمر میں چار صدیوں کا کام کر گئے ''رزمیہ نگاران کربلا'' میں ڈاکٹر صفدر حسین نے یکتا امروہوی کا تذکرہ کیا ہے۔اُن کے ایک

مرثیے کا ایک مصرع تو ضرب المثل بن گیا ہے۔

داتا بھی بھول جاتے ہیں تسبیح، بھوک میں

اُن کے پڑپوتے حضرت نسیم امروہوی کے پاس یکتا کے بہت سے مرثیے تھے۔ یکتا کا ایک مقبول مرثیہ ہے '' جب آئے بنی فاطمہ زندانِ بلا میں'' نہ صرف امروہہ بلکہ سادات باہرہ اور یوپی کے مرثیہ خوانوں کے پاس ہے جو اکثر مجالس میں پڑھا جاتا ہے۔ یکتا کے سلام اور بالخصوص قصائد بھی بہت مقبول ہیں۔ اُن کی باقیات میں وہ اگر ہزار مرثیے بھی چھوڑتے تو ذکرِ محمد آلِ محمد کا وہ فریضہ شاید ادا نہ ہوتا جو اُن کے وارث، اُن کے فرزند شمیم امروہوی۔ نے ادا کیا۔ شمیم امروہوی کی شکل میں یکتا ایک دبستانِ مرثیہ چھوڑ گئے جس کا سلسلہ بیسویں صدی میں حضرت نسیم امروہوی تک، اور تا حال ان کے شاگردوں تک جاری و ساری ہے۔

☆☆☆☆☆

طپش امروهوی :-

ولادت ۱۲۲۴ھ ۱۸۰۹ء وفات ۱۲۸۰ھ ۱۸۶۳ء۔

سید نذر الحسن طپش امروہوی ابتدا میں ناسخ کے شاگرد تھے۔ اُن کے بعد میر عشق سے اصلاح لی جس کی تصدیق مورخین کے علاوہ خود طپش نے کی۔

بہ فیضِ عشق و ناسخ ہو گیا تجھ کو طپش حاصل
کہ تیرے سامنے کھلتا ہے منہ کب ہر سخن گو کا

طپش نے امروہہ میں تعلیم مکمل کی اور لکھنؤ چلے گئے ۔ ۲۵ برس لکھنؤ میں قیام پذیر رہے۔ گویا شاعری کی ساری عمر لکھنؤ میں گذار دی۔ سراج کی طرح طپش کے سلسلۂ تلمذ کی ناسخ اور میر عشق سے وابستگی طپش کی مرثیہ گوئی پر دلالت کرتی ہے۔ لیکن اُن کی اُردو، فارسی شاعری اور نظم و نثر کی کتابوں کا ذکر تو '' تاریخ اصغری'' اور دیگر کتب تاریخ میں ملتا ہے مگر اُن کا کوئی مرثیہ نہیں ملتا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو اُن کے مراثی لکھنؤ میں میر انیس اور خانودہ انیس کے مراثی کی گھن گرج میں کہیں کھو گئے یا کسی ناقدر شناس کے ہاتھ لگ گئے۔

طپش کے کچھ سلام امروہہ کے سوز خوان حضرات کے بستوں میں ملتے ہیں۔ اُن کے مراثی دستیاب نہ ہونے کے سبب ہی شاید Main Stream کے ناقدین نے اُنہیں مرثیہ گو شعرا

میں شمار نہیں کیا جبکہ طپش جیسے شاعر کے ساتھ یہ رویہ استدلال کے رو سے منفی نہ سہی مگر اُن کے معیار شاعری کے حوالے سے تکلیف دہ ضرور ہے۔

☆☆☆☆☆

سیّد یعقوب علی معجز:-

ولادت ۱۲۱۰ھ مطابق ۱۷۹۵ء، وفات ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء

حضرت صفی امروہوی کے اُستاد، ملک الشعراء شیخ مہدی علی خان ذکی کے شاگرد جنہیں ملک الشعراء نے ۲۷ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ کو اپنا جانشیں مقرر کر کے اپنے تمام شاگردوں کی رہنمائی کا فریضہ سونپا تھا۔ سید رحیم بخش نے ''معجز کے بارے میں لکھا ہے کہ چند دیوان اور چند رسالے مثل افسانہ دلکشا'' اور ''چار چمن'' اور بہت سے سلام و مراثی مرتب ہوئے مگر تصانیف پریشاں ہو کر رہ گئے صرف چند مرثیے اور سلام اُن کی باقیات صالحات میں موجود ہیں۔

تواریخ امروہہ کے علاوہ انجمن ترقی اُردو کراچی کی لائبریری میں ایک تذکرہ ''النساخ والبشر'' موجود ہے اس میں بھی معجز کا ذکر ملتا ہے لیکن ہائے رے زمانے، آج معجز کے چند سلاموں کے علاوہ کہیں کوئی مرثیہ دستیاب نہیں ہے۔ معجز کے سلام امروہہ کے قدیم و جدید بستوں میں موجود ہیں لیکن کوئی مرثیہ موجود نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

سراج الدین احمد سراج:-

ولادت ۱۸۰۵ء وفات ۱۸۹۵ء

نام، سید سراج الدین، تخلص، سراجؔ۔ سیّد نجیب الدین صفدر امروہوی کے فرزند۔ میر انیس کے شاگرد۔ ڈاکٹر قمقام حسین جعفری نے اپنی کتاب ''شاگردانِ انیس'' میں سراجؔ کا ذکر کیا ہے۔ سراج امروہوی اُردو اور فارسی میں شعر کہنے کی قدرت رکھتے تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف و مولف تھے۔ بسلسلۂ ملازمت (تھانیداری اور تحصیلداری) حیدر آباد دکن میں رہے۔ بھوپال میں رہے، لکھنؤ میں رہے اس لئے اُن کا کلام امروہہ تک نہ پہنچ سکا—ڈاکٹر عظیم امروہوی نے سراجؔ کے کچھ سلام نقل کئے ہیں مگر ان کا کوئی مرثیہ نہیں مل سکا۔ ان کی مرثیہ گوئی کی تصدیق صرف اس بات سے ہوتی ہے کہ وہ میر انیس کے شاگرد تھے اور میر انیس کسی ایسے شاعر کو شاگرد نہیں بناتے تھے جو مرثیہ گو نہ ہو۔

☆☆☆☆☆

"بارگاہِ مصطفوی میں"

اے محمدؐ اے سوارِ توسنِ وقتِ رواں اے محمدؐ اے طبیبِ فطرت نباضِ جاں
اے محمدؐ اے فقیہِ نفس ونقادِ جہاں موت کو وہ تو نے بخشی آب وتاب جاوداں
زندگانی کے بچاری موت پر مرنے لگے
لوگ پیغامِ اجل کی آرزو کرنے لگے

خشک عرب کی ریت سے لہر اٹھی نیاز کی
قلزمِ حُسنِ ناز میں اُف رے تیری شناوری
چھین لیں تو نے مجلسِ شرک و خودی کی گرمیاں
ڈالدی تو نے پیکرِ لات و ہُبل میں تھرتھری
تیرے سخن سے دب گئے لات و منات کفر کے
تیرے نفس سے بجھ گئی آتشِ سحرِ سامری
چشمہ تیرے بیان کا غارِ حرا کی خامشی
نغمہ تیرے سکوت کا نعرۂ فتحِ خیبری
تیرے فقیر اور دیں کوچۂ کفر میں صدا
تیرے غلام اور کریں اہلِ جفا کی چاکری
تیری پیمبری کی یہ سب سے بڑی دلیل ہے
بخشا گدائے راہ کو تو نے شکوہِ قیصری

(جوش ملیح آبادی)

بیسویں صدی کے اُردو مرثیہ نگار

میر نفیسؔ:-

ولادت ۱۸۲۴ء۔ وفات ۱۹۰۱ء

میر خورشید علی نفیسؔ، ابن میر ببر علی انیسؔ۔

مرثیے کے ضمن میں انیسویں صدی نے بیسوی صدی کو جو صاحبانِ علم و فراست دیئے اُن میں ایک روشن نام میر نفیسؔ کا ہے۔ خدائے سخن میر انیسؔ کے فرزندار جمند میر نفیسؔ مرثیے کی دنیا میں ایسی با عظمت و باشہرت قلمرو کے وارث تھے جس میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ جب تک میر انیسؔ زندہ رہے ساری محبت میر نفیسؔ پر نچھاور کرتے رہے، کم و بیش نصف صدی میر نفیسؔ کی فکری اور ذہنی تربیت کرتے رہے یہاں تک کہ باپ اور بیٹے دونوں نے سمجھ لیا کہ اب میر نفیسؔ شہرِ علم انیسؔ کے بابِ اسلوب و ہنرمندی کی کلید رکھنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ اور پھر وہ دن آ گیا جسے بہر حال آنا تھا۔ ۱۸۷۴ء میں میر انیسؔ اس دارِ فانی سے عالم جاودانی کو سدھار گئے اور میر نفیسؔ اُس ساری مملکت مرثیہ گوئی کے وارث بنے جہاں میر انیسؔ کی عظمت کے پرچم لہرا رہے تھے ایک کہاوت ہے کہ اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔ لیکن میر نفیسؔ کے سامنے صورتِ حال قدرے دشوار تھی کہ پدر جو کچھ چھوڑ گیا تھا پسر کے لئے اُسے برقرار رکھنا ہی ایک چیلنج تھا۔ چاروں طرف میر انیسؔ کی عظمت کے نقارے بج رہے تھے۔ دلوں میں میر انیسؔ کی محبت کے چراغ روشن تھے۔ میر انیسؔ کے انتقال کے بعد جب میر نفیسؔ کو مسند وراثت ملی اس وقت میر انیسؔ جیسے ہی باکمال شاعر مرزا دبیرؔ کی عظمت کا سورج بھی چمک رہا تھا۔ ایسے میں میر انیسؔ کے فرزندار جمند میر نفیسؔ کو میراثِ پدر ملی تو انہیں علم پدر کے تحفظ کا مظاہرہ کرنا تھا۔ جب تک میر انیسؔ زندہ رہے مرزا دبیر سے شاعرانہ چشمک رہی لیکن میر نفیسؔ کے لئے مرزا دبیرؔ یقیناً ایک بھاری بھرکم شخصیت تھے۔ مرزا دبیرؔ، میر انیسؔ کے بعد زیادہ دن زندہ نہ رہ سکے مگر انیسؔ و دبیرؔ مرثیہ کو جس منزل تک پہنچا کر چھوڑ گئے تھے اُس فکر کے کارواں کو میر انیسؔ کی وفات سے طاری شدہ سکوت سے دوبارہ حرکت کی طرف لے جانا آسان نہ تھا۔ جس منبر پر انیسؔ و دبیرؔ جلوہ افروز ہوتے تھے اس پر بیٹھنا دشوار مرحلہ تھا۔ اس کے باوجود میر نفیسؔ نے اپنی ذمہ داری کو احسن طریقے سے نبھایا۔ اُنہوں نے مرثیے میں وہی تیور اور وہی معیار باقی رکھے جو میر انیسؔ نے قائم کئے تھے، بالخصوص "بین" میں مرثیے کے قاری یا سامع کو رلانے کی زیادہ کوشش کی۔ مثال کے طور پر اُن کے مرثیے "تسبیح فاطمہ کے جو

دانے بکھر گئے'' کے چند بند ملاحظہ کیجئے۔

تسبیح فاطمہ کے جو دانے بکھر گئے تنہا رہے حسینؑ نمازی گذر گئے
پیرو امامِ پاک کے سب کوچ کر گئے باہم تھا جن سے رشتۂ الفت گذر گئے
سو داغ اور ایک دلِ حق شناس تھا
کوئی نہ وقتِ ظہر نمازی کے پاس تھا

زاری وہ بیبیوں کی وہ بچوں کا شور و شین پتھر کو آب کرتے تھے سیدانیوں کے بین
گھبرا بلک رہی تھی سکینہ کو تھا نہ چین چلاّ رہی تھی بانوئے بیکس کہ یا حسینؑ
قاسم کی ماں تھی چاک گریباں کئے ہوئے
زینبؑ کھڑی تھی بال پریشاں کئے ہوئے

فرماتے تھے حسینؑ یہ آنسو بہا بہا لو الوداع اے حرمِ پاکِ مصطفیٰؐ
مشتاقِ آبِ تیغ ہے سوکھا ہوا گلا تقدیر میں فراق لکھا تھا کروں میں کیا
بیٹا نہ پاس ہے نہ برادر قریب ہے
اب وقتِ قتلِ سبطِ پیمبرؐ قریب ہے

یہ کہہ کے نکلے خیمے سے روتے ہوئے امام گردن جھکائے ڈیوڑھی پہ حاضر تھا خوشخرام
گھوڑے پہ جلوہ گر جو ہوا وہ فلک مقام ہاتف نے دی صدا کہ زہے عزّ و احترام
پیچھے نہ ہے سپاہ، نہ آگے نشان ہے
پر سب سواریٔ شہِ مرداں کی شان ہے

درج ذیل بین کا یہ انداز اور لکھنوی طرزِ فغاں یعنی

روکر امامِ دیں نے کہا اے وفا شعار ان اپنی بیبیوں سے خبردار ہوشیار
فرماتے تھے حسینؑ یہ آنسو بہا بہا یہ کہہ کے نکلے خیمے سے روتے ہوئے امام

میر انیسؔ کے ہاں بھی ہے اور میر نفیسؔ نے بھی اس طرز کو وراثت سمجھ کر اپنایا اور باقی رکھا۔ میر انیسؔ کا قول تھا کہ بھاری لفظ مرثیے میں داخل کرنے سے مرثیہ ثقیل لفظوں کا بار نہیں اٹھا سکتا۔ یہ قول فصاحت پسند لوگوں کا معیار ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بات مرزا دبیرؔ کی شکوہِ لفظی کی وقعت کو کم کرنے کے لئے کہی گئی ہو۔ بہرحال جب تک میر انیسؔ زندہ رہے میر نفیسؔ کے مراثی میں فصاحت

اور سلاست کارفرما رہی۔ لیکن میر انیسؔ کے بعد میر نفیسؔ کے کلام میں فصاحت سے زیادہ شکوہِ لفظی اور بلاغت نظر آنے لگی، اور یہ ایک فطری جھکاؤ تھا۔ غیر محسوس انداز میں مرزا دبیرؔ کا احترام تھا۔ خاندانِ انیسؔ کی تربیت کا ثمر بھی تو یہی تھا کہ بچے باپ کے ہم عصروں کا احترام کریں۔

امیر الدولہ امیر حسن خان راجہ صاحب محمود آباد میر مونسؔ کے بعد میر نفیسؔ کے شاگرد ہو گئے تھے۔ وہ خاندانِ انیسؔ کے مداح تھے۔ ایک مرثیے میں اس تلمذ پر راجہ صاحب نے فخر کیا ہے۔

ہے میری نظم میں ہر بیت کی بنیاد نفیسؔ — رکن ہر شعر کے دلچسپ ہیں افتاد نفیسؔ
رزم کا ڈھنگ نیا، بزم کی ایجاد نفیسؔ — کیوں نہ شاگرد ہوا چھا کہ ہے اُستاد نفیسؔ
فیضِ اُستاد سے گیا نام ہمارا چمکا
مہرِ خورشید سے ذرّے کا ستارا چمکا

شادؔ عظیم آبادی اور سید محمد عباس نے راجہ صاحب اور میر نفیسؔ کے تعلقات کو بہت قریبی قرار دیا ہے۔ خاندانِ میر انیسؔ میں سب سے زیادہ شاگرد میر نفیسؔ کے تھے۔ ایک سے ایک بڑا نام۔ ایک سے ایک بڑی شخصیت تسبیح کے دانوں کی طرح میر نفیسؔ کے رشتہ عقیدت میں پروئی ہوئی ہے۔ میر عارفؔ، دولہا صاحب عروجؔ، نسیمؔ بھرت پوری، برجیسؔ لکھنوی، انیسؔ فیض آبادی، منّے صاحب ذکیؔ، میر ناظم حسین، نواب مرزا امجاد لکھنوی، ناظمؔ شکارپوری، غیورؔ لکھنوی، وغیرہم۔

میر نفیسؔ کے مرثیوں کی تعداد ۸۴ بتائی گئی ہے۔ ان میں سے زیادہ تر زبان زدِ خواص ہیں۔ میر نفیسؔ نے اپنے کمالِ فن کو مدحِ پنجتن کا فیض قرار دیا ہے۔

میری زباں کو شرف مدحِ پنجتن سے ملا — سخن کا تاج جو گُل تھا وہ اس چمن سے ملا
یہ رُتبہ فاطمہؑ و حیدرؑ و حسنؑ سے ملا — یہ سب عروج ثنائے شہِ زمن سے ملا
یہ مایہ سبطِ پیمبر سے میں نے پایا ہے
یہ پایہ صاحبِ منبر سے میں نے پایا ہے
خود اپنے اوج پہ نازاں ہوں انکسار کے ساتھ — یہ بے خزاں مجھے گلشن ملا بہار کے ساتھ
جناں میں جاؤں گا محبوبِ کردار کے ساتھ — کہ عشق ہے مجھے حیدر کے گلعذار کے ساتھ

چراغ مہر سے روشن چراغ دیکھوں گا
یہ باغ دیکھ چکا اب وہ باغ دیکھوں گا

☆☆☆☆☆

صفی امروہوی:-

ولادت ۱۸۴۲ء، (۱۲۵۹ھ) وفات ۱۹۰۱ء

نام سیّد مومن حسینؒ، تخلص صفیؔ، اُن کے والد گرامی ولیؔ امروہوی (سیّد ولی حسینؒ) شاعر بھی تھے اور باکمال خطاط بھی۔ صفیؔ اُردو، فارسی اور عربی میں شعر کہتے تھے۔

تاریخ اصغری، ''تواریخ واسطیہ''۔ ''تاریخ سادات امروہہ'' ودیگر تذکروں میں صفی امروہوی کا ذکر اپنے عہد کے باکمال شاعر کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ اور انہیں اپنے والد ولیؔ امروہوی کی طرح اعلیٰ درجے کا خطاط تسلیم کیا گیا ہے۔ اُن کی کتابیں، مثنوی ''اسوۃ الصرف'' (علم صرف میں)، مثنوی ''بساطین'' (ترجمہ حدیث بہ زبان فارسی) اور مثنوی ''طوبیٰ العروض'' (علم عروض پر)۔ اُردو دیوان ''نغمۂ صوفیہ'' اس بات کا تحریری ثبوت ہیں کہ صفیؔ امروہوی علم صرف و نحو، علم عروض اور زبان فارسی پر بھی دسترس رکھتے تھے۔

''خم خانہ جاوید'' میں لالہ سری رام نے لکھا ہے کہ موصوف ذکی مرادآبادی کے شاگرد تھے لیکن صفی نے معجزؔ امروہوی سے اپنے سلسلۂ تلمذ کا ذکر کیا ہے۔ ''کیوں نہ ہو جبکہ ہوں معجز کے میں شاگردوں میں''۔ مثنوی مولانا روم مطبوعہ ۱۸۶۲ء (نول کشور) پر صفیؔ کا قطعۂ تاریخ شائع ہوا ہے جس پر لکھا ہے قطعہ تاریخ سیّد مومن حسین صفیؔ تلمیذ رشید شیخ مہدی علی ذکیؔ۔ اس طرح صفیؔ امروہوی کا ملک الشعراء شیخ مہدی علی خان ذکیؔ سے بھی سلسلہ تلمذ ثابت ہو جاتا ہے۔ معجزؔ امروہوی کے احوال میں لکھا جا چکا ہے کہ حضرت ذکیؔ مرادآبادی نے معجزؔ امروہوی کو اپنا جانشین قرار دیکر اپنے تمام شاگردوں کی رہنمائی معجزؔ کے سپرد کر دی تھی۔ اس حوالے سے صفیؔ امروہوی کا رشتہ تلمذ ذکیؔ اور معجزؔ دونوں اساتذہ سے استوار ہو جاتا ہے۔ صفیؔ امروہوی کے اخلاف میں اُن کے فرزند رضیؔ امروہوی، قویؔ امروہوی اور تحیؔ امروہوی ہوئے ہیں۔ تحیؔ امروہوی کے فرزند جری امروہوی بھی مستند شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ حضرت صفیؔ کے شاگردوں میں اُن کے اپنے اخلاف تحیؔ، قویؔ اور رضیؔ کے علاوہ کئی نام آتے ہیں۔ ''عرفان نسیم'' میں ڈاکٹر مجتبیٰ نے ثاقب لکھنوی کو بھی صفیؔ کا شاگرد لکھا ہے۔

صفیؔ امروہوی نے مختلف اصناف سخن میں شعر کہے ہیں۔ مولانا سید مرتضیٰ اور سید محمود حسین قیصر نے اُن کی شاعری پر مقالے تحریر کئے ہیں لیکن اُن کی مرثیہ نگاری پر ڈاکٹر عظیم امروہوی نے کام کیا ہے اور صفیؔ امروہوی کے دو مرثیے نقل کئے ہیں۔

جوانی پہ ہے آج تو شبدیز طبیعت کاوے پہ لگا ہے فرسِ تیز طبیعت
اب توسن بندش پہ ہے مہمیز طبیعت موآج ہے دریائے گہر ریز طبیعت
یوں قفل مضامیں کی ہے کنجی میرے کف میں
پوشیدہ ہو جیسے درِ نایاب صدف میں

اس مرثیے کے مطلع کا بند ہی صفیؔ امروہوی کی قادرالکلامی پر دلالت کرتا ہے۔ اُن کا اسلوب اور لہجہ دبستان لکھنؤ کی تاسی نہیں بلکہ اپنی انفرادیت کا حامل ہے۔

یہ نظم ہے بلکہ در شہوار طبیعت ہیں صاف عیاں جوہر افکار طبیعت
کیوں گرم نہ ان روزوں ہو بازار طبیعت خواہاں درِ مضموں کا ہے تجارِ طبیعت
مداح ہوں سبطِ رسولؐ مدنی کا
ہے جمع خزانہ یہاں شیریں سخنی کا

کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ صفیؔ امروہوی نے یہ مرثیہ کسی شاعرانہ چشمک کے جواب میں لکھا ہے اس لئے کہ اس مرثیے میں شکوہ لفظی، اضافتوں کا استعمال، شاعرانہ تعلّی کے علاوہ مبارزطلبی کا انداز ملتا ہے۔ لکھنؤ میں انیسؔ و دبیرؔ کا دور تھا۔ میر انیسؔ کے بعد میر نفیسؔ نے بجا طور پر مسندِ پدر سنبھالی تھی۔ ہو سکتا ہے میر انیسؔ کے چاہنے والوں کی طرف سے کوئی بات کہی گئی ہو لیکن صفیؔ کے مرثیے میں جو شکوہ لفظی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی چشمک تھی تو مکتبۂ دبیرؔ کی طرف سے ہوگی کیونکہ ان کے مرثیے میں شکوہ لفظی اور تعلّی میں ''دبیریت'' زیادہ نمایاں ہے۔

ہاں چہرۂ زیبائے سخن کا ہوں میں بانی بے شبہ بلاغت میں ہوں سحبان کا ثانی
الفاظ نہ بے جا ہوں، غلط ہوں نہ معانی ہاتھوں سے نہ دوں رشتۂ فرخندہ بیانی
بندش وہ رکھوں مرثیۂ شاہِ زمن کی
حاسد نہ مجال اس میں کہیں پائے سخن کی

رکھتے ہیں کہاں تاب یہ حسادِ بد آئیں میرے سخن پاک میں ہوئیں جو سخن چیں

تقریر جو ہے صاف تو شفاف مضامیں ہر ایک ثمر نخلِ طبیعت کا ہے شیریں
تقریر میں، گفتار میں، نقصان نہیں ہے
ہرگز میرے اشعار میں نقصان نہیں ہے

ہر مصرع موزوں صفتِ سرو ہے آزاد اس مرثیے میں بیت میں ایسی کروں ارشاد
بس قمریٔ دل دیکھ کے جس کو کرے فریاد بیت ابروئے معشوق کی آجائے معاً یاد
اعجاز شہ دیں کی یہاں جلوہ گری ہے
ہر بیت غمِ شاہِ شہیداں سے بھری ہے

اس کے برعکس صفؔی امروہوی کا دوسرا مرثیہ سادگی و پرکاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

رخصت شہ دیں گھر سے جب ہونے لگے رن کو زینب نے کہا دیکھ کے تب شاہِ زمن کو
ہے ہے نہ اجل آئی مجھ آوارہ وطن کو بھیّا یہ کہو، چھوڑ کے جاتے ہو بہن کو
جنگل میں ہمارا کوئی والی نہیں بھائی
عابدؔ ہے تو وہ ضعف سے خالی نہیں بھائی

کن آنکھوں سے دیکھے گی بہن، بھائی کا مرنا بیکس کا، گرفتارِ محن بھائی کا مرنا
بھولا تھا نہ مسموم حسنؔ بھائی کا مرنا در پیش ہوا تشنہ دہن بھائی کا مرنا
مرجائے یہ دُکھیا، شہ دلگیر کے آگے
بھائی کو اجل آئے نہ ہمشیر کے آگے

بھیّا، طرفِ فرقۂ گمراہ، نہ جاؤ سادات کے دشمن ہیں یہ سب، آہ نہ جاؤ
بے مہروں میں اے فاطمہؑ کے ماہ نہ جاؤ صدقے ہو بہن آپ کے للہ نہ جاؤ
دل سینے میں تشویش سے گھبراتا ہے میرا
صدقے میں، جگر منہ کو چلا آتا ہے میرا

رثائی ادب میں حضرت صفؔی امروہوی نے مراثی کے علاوہ سلام اور قصائد بھی کہے ہیں اور دیگر اصنافِ سخن سب اُردو اور فارسی زبان میں غزلیں بھی کہی ہیں۔

مجلسوں سے کچھ ملک شیشوں میں بھر کر لے گئے
لے گئے آنسو خدا جانے کہ گوہر لے گئے

ہم اسی در کے گدا ہیں، ہم اسی در کے فقیر
بھیک جس در سے فرشتے آکے اکثر لئے گئے

دیر سے پہنچے درِ شاہِ نجف پر ہم فقیر
ایک عہدہ تھا غلامی کا، وہ قنبر لے گئے

کیا کہیں ہم تو صفؔی دیتے نہ تھے اپنا کلام
پر بہت اصرار سے جبریل آکر لے گئے

اُردو غزل میں صفؔی کا ایک شعر اُن کی غزل گوئی کا نمائندہ شعر ہوسکتا ہے ۔

کرلیں آپس میں چلو طور کی بجلی تقسیم
روشنی تم میں رہے اور تڑپ ہم میں رہے

جس دور میں صفؔی امروہوی شعر کہہ رہے تھے اس دور میں صنائع بدائع پر بہت زور تھا۔ صفؔی امروہوی نے اُردو شاعری کے علاوہ فارسی شاعری میں بھی یہ جوہر دکھائے ہیں۔ ذیل کے دو اشعار میں ہر مصرع کا آخری لفظ، اس مصرع کے پہلے لفظ کا ترجمہ ہے ۔

زد مضطربی بر درِ تعظیم تو مارا　　(زد بمعنی مارا)
سیماب ضریں راہ زسر ساختہ پارا　　(سیماب: پارا)
بر خود نگر و پیش کہ نازو بہ دمِ محن
اختر چہ تصور کند آں زلف دو تارا　　(اختر: تارا)

☆☆☆☆☆

کامل لکھنوی :-　(لکھنؤ)

ولادت ۱۸۳۵ء۔ وفات ۱۹۰۴ء

نام سیّد علی میاں تخلص کامؔل (لکھنوی)۔ علی میاں کامؔل کا عہد اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب انیؔس کی مقبولیت عروج پر تھی۔ مرثیہ گوئی میں کوئی خاندانی پس منظر یا علم وادب کی وراثت نہیں تھی لہٰذا اہلِ لکھنؤ نے اُنہیں خاندانِ انیؔس یا خانوادۂ دبیؔر کی طرح قبول نہیں کیا۔ خاندانی تعلق اعظم گڑھ سے تھا۔ اہل لکھنؤ عام طور پر لکھنؤ سے باہر کے شعراء کو قبول نہیں کرتے تھے۔ علی میاں کامؔل نے ان حالات کا مقابلہ کیا اور میر نفیؔس کے مرثیوں پر مرثیے کہے۔ میر نفیؔس نے اس

شاعرانہ چشمک کا کبھی جواب نہیں دیا البتہ میر انیسؔ کے نواسے میر عارفؔ نے اپنے ایک مرثیے میں ۔ ''گردوں ہے سفینہ میرے دریائے سخن کا'' کہہ کر علی میاں کاملؔ کو جواب دیا جس کے اشعار اور بین ابھی تک اہلِ لکھنؤ کو یاد ہیں مثلاً ایک بیت یہ تھا ۔

کیوں کہتے ہیں آخر جنہیں کہنا نہیں آتا

ناطق ہیں تو خاموش بھی رہنا نہیں آتا

علی میاں کاملؔ اور میر عارفؔ کے درمیان سوال و جواب ہوتے رہے، رسالے چھپتے رہے لیکن علی میاں کاملؔ کو وہ مقام نہیں ملا جو مرزا اوجؔ اور میر نفیسؔ کو ملا حالانکہ اُن کا کلام اعلیٰ شاعری کا نمونہ تھا۔ ہوسکتا ہے میر نفیسؔ کا تدبّر اس کا سبب ہو کہ اُنہوں نے علی میاں کاملؔ کی کسی بات کا جواب نہیں دیا، یا ہوسکتا ہے اہلِ لکھنؤ کا لکھنؤ سے باہر کے شعراء سے سخت رویّہ اس کی وجہ ہو کہ ایک صدی گذرنے کے بعد بھی علی میاں کاملؔ کا کلام سامنے نہیں آیا۔ اُن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے چالیس مرثیے، ایک غزلیات کا ضخیم دیوان، علم عروض پر ایک قلمی کتاب یہ سارا ذخیرہ کراچی میں سیّد ضمیر اختر نقوی کے کتب خانے میں موجود بتایا جاتا ہے۔ پانچ مرثیے ''معیارِ کامل'' کے نام سے حضرت مہذّب لکھنوی نے ۱۹۵۰ء میں لکھنؤ سے شائع کرائے تھے۔

اپنی ولادت ۱۸۳۵ء کے حوالے سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے وقت سیّد علی میاں کامل کی عمر ۲۲ برس کی ہوگی۔ اس حوالے سے یقین آتا ہے کہ اُنہوں نے نہ صرف ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، غداروں کے سبب اس کی ناکامی اور اس کے بعد تیس چالیس برس انگریزوں کی انتقامی کارروائیوں کو دیکھا ہوگا بلکہ اودھ کی بربادی کا منظر بھی دیکھا ہوگا اور بحیثیت شاعر بلکہ مرثیہ گو شاعر اس خونیں عہد کے اشارات بھی اُن کی شاعری پر مرتب ہوئے ہوں گے۔

علی میاں کاملؔ کے نمونہ کام کے طور پر ایک مرثیے کے چند بند درج ذیل ہیں ۔

''پھیلی جو سفیدی سحر قتل کی رن میں''

پھیلی جو سفیدی، سحر قتل کی رن میں پھولا گلِ خورشید، شہادت کے چمن میں

اک عید ہوئی لشکرِ سلطانِ زمن میں کھائی جو ہوا صبح کی جاں آگئی تن میں

تابندہ رُخِ نیّرِ اعظم نظر آیا

شب ختم ہوئی اور ہی عالم نظر آیا

مرغانِ نواسنج کے نغمے تھے یہ ہر بار بیدار ہو، بیدار ہو، بیدار ہو، بیدار
آخر ہوئی شب صبح کے ظاہر ہوئے آثار ہوں محو نمازِ سحری مردمِ دیندار
در ہائے فلک باز میں قدسی نگراں ہیں
طائر چمنِ قدس کے مشتاقِ اذاں ہے

وہ حسنِ سحر وہ شرفِ خسروِ خاور وہ نور کا تڑکا وہ کمر بندیٔ لشکر
مست مئے عرفاں وہ جوانانِ دلاور تسبیح بکف سورۂ والفتح زباں ہر
تائید خدا پر نظر فوج خدا تھی
تکبیر کے نعرے تھے، تشہد کی صدا تھی

مل مل کے گلے کہتے تھے انصار و مہاجر المنت و للہ شب فرقت ہوئی آخر
دن وصل کا آیا، گئی بیتابیٔ خاطر اب آج پہنچ جائیں گے منزل یہ مسافر
جاگے ہوئے راتوں کے ہیں آرام کریں گے
اس صبح کی فردوس میں ہم شام کریں گے

والفجر سے تشبیہ ہے گویا اسی دن کی کھاتا ہے قسم خالق یکتا اسی دن کی
حسرت اسی دن کی ہے تمنا اسی دن کی لیلائے شب قدر ہے شیدا اسی دن کی
جانباز شہادت کے صلے ڈھونڈ رہے ہیں
دل نیزوں کو، تیغوں کو گلے ڈھونڈ رہے ہیں

☆☆☆☆☆

کامل امروہوی:- (امروہہ)

ولادت ۱۸۵۲ء۔ وفات ۱۹۰۶ء

نام سید حسین کامل، تخلص کامل، وطن امروہہ، والد کا اسم گرامی سید نذر حسین ــــ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کے ایک منصب دار قاضی ولی محمد سے شجرہ ملتا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ کامل امروہوی اور کامل لکھنوی (علی میاں کامل اور کامل امروہوی) دونوں الگ الگ شخصیتیں تھیں۔ علی میاں کامل کا انتقال ۱۹۰۴ء میں ہوا جبکہ کامل امروہوی نے ۱۹۰۶ء میں وفات پائی۔ سادات امروہہ کی تواریخ کے مطابق کامل امروہوی حضرت صفی امروہوی اور شمیم امروہوی کے

شاگرد تھے۔ صرف یہی بات کاآلِ امروہوی کو مرثیہ نگار ثابت کرنے کے لیئے کافی ہے۔ اُن کا کوئی مرثیہ محفوظ نہیں ہے اور اگر اُن کی اولاد میں یا اُن کے ورثاء میں سے کسی کے پاس اُن کے مراثی کا کوئی ذخیرہ ہے تو نہ جانے وہ اپنے جد پر کیوں ستم کر رہے ہیں کہ اُن کی مرثیہ نگاری کی موت کے در پے ہیں۔

☆☆☆☆☆

ماہر لکھنوی:- (لکھنؤ)

ولادت ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۷ء) وفات ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء

نام نواب مولوی سیّد مہدی حسینؒ، تخلص ماہرؔ (لکھنوی) والد گرامی کا نام زین العلماء مولوی سید علی حسینؒ تھا۔ سلسلۂ نسب غفراں مآب سے ملتا ہے۔ خانوادہء اجتہاد کے باتمکنت شاعر۔ لکھنؤ کے امیر ترین روٴسا میں ان کا شمار ہوتا تھا بے انتہا دولت کے مالک تھے——— خاندان اجتہاد کے ایک عالم دین کلب حسین صاحب قبلہ کی شادی نصیر الدین حیدر، شاہِ اودھ کی مطلقہ بیگم تاج محل سے کربلائے معلیٰ میں ہوگئی تھی، مولانا کلب حسین صاحب کو بیگم تاج محل کے بطن سے اللہ نے دو بیٹیاں دیں۔ ایک بیٹی کی شادی نر ہی کے نواب فاخر صاحب سے ہوئی اور ایک بیٹی مہدی حسین ماہر لکھنوی سے بیاہی گئی۔ اس طرح بادشاہ سے بیگم تاج محل کو جو زر و جواہر کا انبار ملا تھا اس میں سے زیادہ تر مہدی حسن ماہر کو ملا اور اُن کی دولت دوگنی ہوگئی———

اُن کے در دولت پر جو مجلس ہوا کرتی تھی اس میں بے پناہ مجمع ہوتا تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں ایک تو اس مجلس کے بہانے پورے لکھنؤ کو دعوت طعام دی جاتی تھی۔ دوسری وجہ غالباً یہ تھی کہ اُن کی مجلس کے پوسٹر چھپا کرتے تھے۔ ان پوسٹروں کا سائز غیر معمولی طور پر بڑا ہوتا تھا اور اُن پرنت نئے ڈیزائین ہوا کرتے تھے۔ ماہر لکھنوی کی پوری زندگی میں قدم قدم پر جدّت طرازی نظر آتی تھی۔ یہاں تک کہ ان کی شاعری میں بھی جدّت طرازی مبالغہ کی حدود تک پہنچ گئی تھی۔ اُنہوں نے مرثیہ گوئی میں جس مبالغہ سے کام لیا اس کے سبب اُن کی شعری حیثیت کو نقصان پہنچا۔ غزل گوئی میں اُن کا اپنا رنگ تھا، ایک دیوان شائع ہو چکا ہے۔ میر تعشقؔ سے انہیں قرب خاص تھا۔ تعشقؔ ان کی خوش گوئی کے معترف اور ہمہ وقت اُن کی توصیف میں مصروف نظر آتے تھے۔ ان کی دولت کا زیادہ تر حصّہ عزائے حسینؑ میں صرف ہوا۔ مجالسِ حسینؑ کے انعقاد کے لئے خاص طور پر

زرِ کثیر خرچ کر کے ایک عمارت خریدی تھی جو آخری دور میں فروخت ہوگئی۔ اللہ نے انہیں دو بیٹے عطا کئے، سیّد نظیر حسینؑ بڑے صاحب اور سیّد عابد حسینؑ المعروف چھوٹے صاحب۔ دو بیٹیاں تھیں ایک کی شادی مولوی لڈن صاحب خورشید سے اور دوسری بیٹی کی شادی چھنگا صاحب حسینؔ کے ساتھ ہوئی — عزائے حسینی کے جذبے میں سرشار مرثیہ گو شاعر مولوی لڈن خورشید، شاعر بھی تھے اور ماہرِ عروض کی حیثیت سے بھی اُن کا اساتذہ میں شمار ہوتا تھا۔ اُن کی تصنیف ''افادات'' ایک عدیم المثال تصنیف کی حیثیت سے مشہور ہے لیکن دستیاب نہیں۔ دوسرے داماد چھنگا صاحب حسینؔ کا شمار ماہر اور مقبول مرثیہ گو شعراء میں ہوتا ہے۔

کلامِ ماہرؔ میں جدّت طرازی کی کاوشوں کے سبب کہیں کہیں مستند روایات سے انحراف نظر آتا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے مرثیہ غیر معتبر ہورہا ہو۔ اعلیٰ درجے کی شاعری مبالغے کی حدود میں آتی ہے تو قاری مثبت اور منفی افکار میں کھو جاتا ہے۔

گردوں پہ جب کھلا علمِ زرفشانِ صبح ہونے لگے افق سے نمایاں نشانِ صبح
شاخوں پہ نغمہ سنج ہوئے طائرانِ صبح اکبرؑ نے دی سپاہِ عزا میں اذانِ صبح
آگاہ تھے جو راہِ حصولِ ثواب سے
اُٹھے سب آنکھیں ملتے ہوئے فرشِ خواب سے

خیمے کے در سے اک نے فلک پر نگاہ کی اک تشنہ لب نے سرد ہوا کھا کے واہ کی
بستر لپیٹ کر کسی جاگے نے آہ کی دیکھی کسی نے غور سے کثرت سپاہ کی
نکلے دلیر عہدِ وفا باندھتے ہوئے
ڈیوڑھی پہ آئے بندِ قبا باندھتے ہوئے

ملاحظہ کیجئے ''گردوں پہ جب کھلا علمِ زرفشانِ صبح'' کہنے والا شاعر جدت کی تلاش میں کہاں پہنچ گیا۔ ''اُٹھے سب آنکھیں ملتے ہوئے'' — کربلا کے میدان میں شبِ عاشور کے واقعات کی جو بھی Reporting ہوئی ہے اُس میں امام حسینؑ اور اُن کے رفقاء کے سونے کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا — ''بستر لپیٹ کر'' جو منظرنامہ پیش کرتا ہے وہ شاعر کے ذہن کی جدّت ہے، واقعات نہیں۔ ساری رات خاک پر اپنی پیشانیوں کو رکھ کر عبادت گذاروں کو بستر بچھا کر سونے کی فرصت نہیں تھی — یہی صورت حال ''ڈیوڑھی پہ آئے بندِ قبا باندھتے ہوئے'' — خیموں میں ڈیوڑھی کا تصور کہاں؟ —

ان جدتوں کو نظر انداز کر کے کلام ماؔہر پڑھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کو لفظوں کے برتنے کا سلیقہ بھی تھا اور الفاظ کو فصاحت کی دربانی پر متعین کرنے کا ہنر بھی — ملاحظہ کیجئے ؎

دو دن کی پیاس میں وہ زباں کی طلاقتیں فاقے میں تین دن کے وہ رُخ پر بشاشتیں
باتیں حدیث جن کی، سخن جن کے آیتیں مرغوبِ شاہ جو وہ زباں میں فصاحتیں
حسنِ بیاں کو اہلِ بلاغت سے پوچھیے
باتوں میں جو مزا تھا وہ حضرت سے پوچھیے

وہ رعب چتونوں میں، وہ ہیبت کہ الحذر آنکھیں غزال اُن کی، مگر شیر کی نظر
جنگ آزما، دلیر، اولوالعزم، پُرجگر واقف کلام حق سے حدیثوں سے باخبر
بے چین حسرتوں میں وصال و وصول کی
قرآں زباں پہ، کانوں میں باتیں رسولؐ کی

سبحان اللہ، سلام ہو حضرتِ ماؔہر پر جن کے دو بند بہت سے مراثی کی آبرو کہے جا سکتے ہیں۔ حضرت ماؔہر کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے ایک طویل مرثیہ ۶۱۰ بندوں پر مشتمل لکھا ہے جسے سلطان المراثی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ہلال نقوی نے لکھا ہے کہ یہ مرثیہ حضرت علی اکبر کے احوال کا مرثیہ ہے لیکن خانوادۂ اجتہاد کے مرثیہ گو۔ ماہر سے ساحر تک کے مصنف ساحؔر لکھنوی رقم طراز ہیں کہ یہ مرثیہ حضرت قاسمؑ کے احوال کا مرثیہ ہے۔ ساحر لکھنوی خود اس خانوادے کے مرثیہ نگاروں میں سے ایک ہیں یعنی 'گھر والے' ہیں اور اب تو ڈھیرے ڈھیرے دنیا تسلیم کر رہی ہے کے احباب کی بات میں وہ صداقت نہیں ہو سکتی جو گھر والوں کی بات میں ہوتی ہے۔ بہر حال اس سے قطع نظر، حضرت ماؔہر کا ایک مرثیہ سلطان المراثی کہلاتا ہے۔

خاندان اجتہاد کے شعراء میں میر انیؔس کی پیروی کے ساتھ ساتھ عشق و تعشق کے تغزل کا اثر بھی رہا ہے۔ حضرت قاسمؑ کی شہادت پر جناب کبریٰ بنت حسینؑ کے صبر و اضطراب کی منظر کشی ماؔہر کے ایک بند میں دیکھیے ؎

کہتی ہے شرم چہرے سے گھونگھٹ جدا نہ کر نالے یہ ملتجی ہیں کہ ہم پر جفا نہ کر
گویا تھا صبر آہ سے لب آشنا نہ کر دل کی تڑپ یہی تھی کہ رو بھی حیا نہ کر

موقع یہی ہے جان کے کھونے کے واسطے
گھونگھٹ کی آڑ خوب ہے رونے کے واسطے

ڈاکٹر صفدر حسین نے کلامِ ماہر کے متعلق امین عزیز لکھنوی کا ایک قول درج کیا ہے کہ:-

"اگر ماہر کا کلام میر انیس کے نام سے پیش کر دیا جائے تو پڑھنے والا مشکوک نہ ہوگا" (رزم نگاران کربلا)۔

☆☆☆☆☆

زائر زید پوری:- (زید پور)

مصدقہ سنہ ولادت نہ مل سکا۔ وفات ۱۹۰۷ء۔

کاملؔ امروہوی کے بعد ایک اور نام زائر زید پوری کا ہے جن کا ذکر مرثیہ نگاری کے اکثر تذکروں میں ملتا ہے مگر کلام کہیں نہیں ملتا۔۔۔۔ زید پور میں صرف زائرؔ زید پوری ہی مرثیہ نگار شاعر نہ تھے بلکہ یہاں بھی مرثیہ گوئی کا ایک دبستان قائم ہو چکا ہے۔ اس دبستان میں فراستؔ زید پوری سے محسنؔ زید پوری تک مرثیہ گو شعراء کی ایک کہکشاں سجی نظر آتی ہے۔

زائر زید پوری کا زید پور کے تعلقہ داروں کے خاندان سے تعلق تھا۔ اُن کا شمار مرزا دبیرؔ کے ممتاز شاگردوں میں ہوتا ہے۔ دبستانِ دبیر کے سارے محاسن، صنعتیں، رعایت لفظی وغیرہ زائر زید پوری کے مراثی میں نمایاں تھیں اُنہوں نے بعض قصائد اور مرثیے غیر منقوط بھی کہے ہیں۔ یہ رسم لکھنؤ سے چلی تھی۔ اہلِ نظر کے سامنے سب سے پہلے میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے غیر منقوط مرثیے آئے تھے۔ زائر زید پوری کا غیر منقوط کلام بالخصوص مرثیے اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ شاعر کو الفاظ کو برتنے کا ہنر بھی آتا تھا اور الفاظ پر اُن کی گرفت بھی مضبوط تھی، اس خوبی کا لازمی نتیجہ یا اس ہنر کی اساس ذخیرۂ الفاظ کی فراوانی ہوتی ہے مرزا دبیر کے بعد رنگ دبیر قائم رکھنا آسان نہ تھا۔ زائرؔ زید پوری نے یہ دشوار مرحلہ طے کیا مگر افسوس کہ اُن کا کلام غیر مطبوعہ رہا صرف چند مرثیے مطبع اثنا عشری لکھنؤ نے شائع کئے تھے وہ بھی تقریباً ناپید ہیں۔ جن حضرات نے ذاتی ذخیرۂ مراثی بنائے ہیں اور ایک ایک مرثیے کے حصول کے لئے خاک چھانی ہے اُن سے کوئی کیسے کہے کہ بقا صرف فنا کو حاصل ہے۔ آپ کی کاوشیں صرف اس صورت میں غیر فانی ہو سکتی ہیں جب آپ کے

سمندروں سے مرثیے پر کام کرنے والے تشنہ لبوں کو سیراب کیا جاتا ہے تاکہ تحریروں میں، تذکروں میں، تاریخ میں آپ کی تلاش، اور آپ کے ذخیرہ کا مسلسل ذکر ہوتا رہے۔

☆☆☆☆☆

میر جلیس :-

ولادت ۱۸۵۸ء، وفات ۱۹۰۷ء

اسم گرامی میر ابو محمد عرف ابو، تخلص جلیسؔ۔ میر سلیسؔ کے سب سے بڑے فرزند، میر انیسؔ کے پوتے جو میر انیسؔ کی زندگی میں تولد ہوئے — مرثیہ نگاری میں میر جلیسؔ کا سرمایہ کل آٹھ مرثیے ہیں لیکن فن شعر گوئی جمہوریت نہیں ہے کہ جہاں بندوں کو گنا جائے، تولا نہ جائے۔ فن کی دنیا میں تو فنکار کے ایک ایک عمل کا احتساب ہوتا ہے۔ لمحے لمحے پر تنقید ہوتی ہے۔ میر جلیسؔ نے اپنے دادا، خدائے سخن میر انیسؔ کا زمانہ دیکھا تھا۔ ۲۰ سال اُن کے ساتھ گذارے تھے۔ سنا ہے پارس سے جو چیز چھو جائے وہ سونا بن جاتی ہے۔ میر جلیس تو ۲۰ برس تک نہ صرف پارس کو چھوتے رہے بلکہ پارس خود اپنے اندر کی کرامات جلیس میں منتقل کرتا رہا۔ میر انیسؔ کے بعد میر نفیسؔ نے جلیسؔ کے ذہن کو روشنی کی ترسیل جاری رکھی۔ یہ سب کچھ ہونے کے بعد بھی یہ ذرّہ آفتاب نہ بنتا تو کون بنتا۔ پس میر جلیسؔ افقِ مرثیہ گوئی کے آفتاب بن کر طلوع ہوئے — پاکستان میں سیّد ضمیر اختر نقوی کا دعویٰ ہے کہ اُن کے کتب خانے میں میر جلیسؔ کے آٹھ درج ذیل مرثیے موجود ہیں۔

۱۔ اے زباں نقشۂ فردوس دِل افزا دکھلا	در حال حضرت عباس
۲۔ پھر آج بلبلِ رنگیں بیاں چہکتا ہے	// جناب فاطمہ صغرا
۳۔ رن میں ظاہر شبِ عاشور کی جب شام ہوئی	// حضرت امام حسین
۴۔ سجاد کو بلوایا دوبارہ جو شقی نے	// شام سے رہائی
۵۔ شہید رن میں جو سارے رفیق و یار ہوئے	// حضرت عون و محمد
۶۔ غُل ہے رن میں پسر شیر خدا آتا ہے	// حضرت عباس
۷۔ فصل گُل آئی ہے پھر زمزمہ پرواز ہوں میں	// امام حسینؑ
۸۔ میں وہ بلبل ہوں کہ ہوں رونقِ بستانِ انیسؔ	

ضمیر اختر نقوی خود کو انیسؔ اور خانوادۂ انیسؔ کا شیدائی کہتے ہیں۔ کوئی وجہ ضرور ہوگی کہ

انہوں نے ان مراثی کو شائع نہیں کرایا۔ وہ خود ہی الحمد وللہ صاحب ثروت ہیں اور اگر کسی نیاز مند سے کہہ دیتے تو بھی یہ دشوار کام نہیں تھا۔ بہر حال رموز مملکت خویش خسرواں دانند۔

میر جلیس نے میر انیس اور خاندان انیس کے شعراء کی شعری نزاکتوں کا خیال رکھا ہے اور اکثر ان منازل سے آگے بڑھنے کی سعی بھی جاری رکھی ہے۔ انہوں نے ساقی نامہ بھی لکھا ہے اور ساقی نامہ میں رزمیہ انداز بھی اختیار کیا ہے۔

جلد اس مئے سے میرے جام کو بھر دے ساقی　　جس کا ہر قطرہ ٹپکنے میں شرر دے ساقی
مئے عنقا کے طبیعت کو جو پر دے ساقی　　نشہ میں لائے جو عالم کی خبر دے ساقی
غیر چاہے تو نہ پینے کی اسے بار آئے
جس کی ہر موج سے تلوار کی جھنکار آئے

مرثیے میں "بین" کے سلسلے میں میر جلیس بھی اسی ڈگر پر قائم ہیں جہاں کردار بین کرتے ہیں۔ بسا اوقات مصرع کا وزن پورا کرنے کے لئے بھی "رو کر کہا"۔ "سر پیٹ کے یوں" جیسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ ایسی صورت حال کا ایک حوالہ تو میر جلیس کا وہ مرثیہ ہے کہ شام کے قید خانے سے آل رسول کی رہائی کا وقت آیا تو یزید نے سید سجادؑ اور سیدہ زینبؑ کو بلوایا۔ دربار میں جو کچھ ہوا اس میں ساری تواریخ گواہ ہیں کہ شہزادی زینب کا لہجہ کہیں عاجزانہ ہوا نہ کہیں انہوں نے سر پیٹا مگر دیکھئے میر جلیس اسلاف کی روایات کے آئینے میں کیسے دیکھتے ہیں۔

زینب نے کہا سن کے کہ او ظالم غدار　　جو کہنا ہو کہہ دے کہ میں حاضر ہوں جفا کار
وہ بولا کہ اس امر کا تم سے ہوں طلبگار　　لے جا میری سرکار سے جو ہو تجھے درکا
ماں باپ سخی تیرے تھے اور تو بھی سخی ہے
خون شہدا بخش دے یہ میری خوشی ہے

یہ سن کے نہ زینبؑ کو رہا ضبط کا یارا　　سر پیٹ کے اور رو کے گریباں کیا پارہ
پھر بولی کہ کیا بکتا ہے تو او ستم آرا　　لینا دیت خوں کروں شہ کا میں گوارا
کچھ سہل نہیں یہ شہ لولاک کا خوں ہے
گردن پہ تیری پنجتن پاک کا خوں ہے

ایسا لگتا ہے کہ کاتبوں نے میر جلیسؔ کے ساتھ بھی کم ستم نہیں کیئے۔ درج بالا دو بند توجہ چاہتے ہیں۔ پہلے بند میں ''اس امر کا ''تُم'' سے میں طلبگار'' کا تخاطب 'تم' سے ہے۔ دوسرے مصرعے میں ''لے جا'' میری سرکار سے جو ہو'' تجھے درکار''۔ تخاطب ''تُو'' سے ہوگیا۔ بیت کے پہلے مصرع میں ماں باپ تخی'' تیرے'' تھے''، ''تو'' بھی تخی ہے۔ تخاطب پھر'' تو'' سے ہے — یہ سب یقینا کتابت کی غلطی قرار دیا جاسکتا ہے۔ میر جلیسؔ جیسی شخصیت کے کلام میں فنی غلطی نہیں ہوسکتی۔ ہر چند کہ شاعر کے اس رویئے کو اُسی بے نیازی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جو بین کراتے وقت اکثر خانوادۂ رسالت کے کرداروں کی عظمت کو پیش نظر نہیں رکھا جاسکتا لیکن پھر بھی دل نہیں مانتا میری رائے میں مصرعے یوں ہونگے ؎

وہ بولا کہ اک امر کا تم سے ہوں طلبگار ''لے لو'' میری سرکار سے جو ہو'' تمہیں'' درکار
ماں باپ ''تمہارے'' تھے تخی، تم بھی تخی ہو
خونِ شہدا بخش دو تو میری خوشی ہو

درج بالا دوسرے بند میں جو مصرعے ہیں وہ اس عہد کے مروجہ بین کے ہیں۔ ؎
''سر پیٹ کے' اور رو کے گریباں کیا پارہ'' اس مصرعے میں فکر کے لئے مواد ہے لیکن زبان اور قلم کے لئے حدِ ادب۔ بات زینبؑ کے گریبان کی ہے؟

میر جلیسؔ اس دورِ ابتلا میں پیدا ہوئے جب برصغیر میں ''انگریز بہادر'' ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اہل ہندوستان کو بالخصوص اہل اودھ کو آزادی کے خواب دیکھنے کی سزا دے رہا تھا۔ یہی وہ دور تھا جب مرثیے میں ''بین'' کا حصّہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ اہل ہند کو خاص طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کو آزادی سے سانس لینا دوبھر ہوگیا تھا۔ اس خوف، گھٹن اور انتقام سے پناہ لینے کے لئے جی بھر کر رونے کا ایک ذریعہ مرثیہ ہی تھا جس میں کھُل کر بین کئے جاسکتے تھے۔

میر جلیسؔ کو وقت نے مہلت نہ دی۔ ابھی اس عمر کو پہنچے تھے جہاں تدبّر کا سورج 'برج شرف' میں پہنچتا ہے کہ مالک حقیقی نے اُنہیں واپس بلالیا۔ میر جلیسؔ نے جس دور میں مرثیے کہے اس دور میں مرثیے پر تنقید شروع ہوگئی تھی — میر جلیسؔ کا انتقال ۱۹۰۷ء میں ہوا، یہ سال اور کئی اہم واقعات کے سبب لوگوں کو یاد ہے مثلاً شبلی کی موازنۂ انیس و دبیر ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی۔ اسی سال میں ''ردّ الموازنہ'' (افضل الٰہی) شائع ہوئی۔

میر جلیسؔ کے ایک مرثیے کا اختتامی بند پیش کر کے گفتگو کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔

خاموش جلیسؔ اب نہیں گویائی کی طاقت گریہ کا ہے یہ شور کہ تھمتی نہیں رقت
ہرچند کہ یہ چند کہے بند ہے ذقت رونے کو، رُولانے کو نہیں کم کسی صورت
بس اس کا صلہ پائے گا شاہِ شہدا سے
بخشائیں گے محشر میں تجھے کہہ کے خدا سے

اُس دور کے حالات کا ردِ عمل بھی اور سوچ کی منزلِ آخر بھی یہی تھی کہ مرثیے کا مقصد ''رونا رُلانا'' تھا اور اس دور کے زیادہ تر مرثیے اس مقصد کی تکمیل کرتے نظر آتے ہیں میر جلیسؔ بھی بھرپور استحقاق کے ساتھ اس مقصد کی صفِ اوّل میں نظر آتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

اعظم امروہوی:-

ولادت ۱۸۳۲ء کے لگ بھگ۔ وفات ۱۹۰۷ء۔

سید اعظم علی اعظم۔ مولانا سید امداد علی ناطقؔ امروہوی کے فرزند۔ صاحب دیوان شاعر۔ اُن کا ایک مرثیہ بہت مشہور ہے جو آج بھی امروہہ اور مضافات کی مجالس میں ہر سال پڑھا جاتا ہے۔

حسینِ بے کس پہ کی چڑھائی عدو کے لشکر نے کربلا میں
تمام دریا کے گھاٹ روکے، ہر اک ستمگر نے کربلا میں
نہ بوند پانی کی پائی ابنِ قسیمِ کوثر نے کربلا میں
جفائیں جھیلی، ستم اُٹھائے امامِ مضطر نے کربلا میں
کہاں لعینوں سے بیکسوں نے بھلا ستانے سے فائدہ کیا
پلانا پانی مسافروں کو، نہیں ہے کوفے میں قاعدہ کیا؟

اسی مرثیہ میں امام حسین کے آخری خطبے، اتمام حجت کو اعظم امروہوی نے یوں نظم کیا ہے۔

کیا ہے تم نے جو بند پانی، یہ کیا غضب ہے کہ کیا ستم ہے
سب اہل بیت نبی ہیں پیاسے، سبھوں کے اوپر ہجومِ غم ہے
صغیر بچوں کا اے لعینوں، بغیر پانی لبوں پہ دم ہے

عجب تردّد، عجب تفکّر، عجب مصیبت، عجب علم ہے
کرو گے سیراب تم جو، ان کو تو اجر ہوگا، ثواب ہوگا
نہ دو گے پانی تو حشر کے دن، عتاب ہوگا، عذاب ہوگا

امام کی رخصت آخر کا منظر دیکھئے ۔

سکینہ گودی میں تھی جو شہ کے اسے اُتارا بہ آہ و زاری
سبھوں کو حفظِ خدا میں سونپا منگائی شہ نے جونہی سواری
چڑھالیا نعلوں میں ہاتھ دے کے بہن نے گھوڑے پہ ایک باری
حسینؑ راہی ہوئے اُدھر کو، اِدھر ہوئی خوب اشکباری

رسول زادے کا تھا جو ماتم بپا رسولِ خدا کے گھر میں
عجب طرح کی مچی قیامت شفیعِ روزِ جزا کے گھر میں

اعظمؔ امروہوی کو اُردو فارسی، دونوں زبانوں پر دسترس تھی۔ اس عہد میں نظم میں اہم واقعات کی تاریخ نکالنے کا رواج تھا۔ اعظمؔ امروہوی بھی اس فن میں ماہر تھے۔ اُنہوں نے تواریخ واسطیہ کی تاریخ کہی ہے اپنے والد گرامی امداد علماء مولوی سیّد ناطقؔ امروہوی کی وفات پر اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں تاریخ کہی ہے۔ بہت سے مرثیہ گو جلیل قدر شعراء کی طرح اعظمؔ امروہوی کے مرثیوں کا مجموعہ بھی شائع نہ ہو سکا۔ ان کی اولاد میں کسی کو شعروسخن سے دلچسپی نہ ہوئی۔ کئی نسلوں کے بعد ایک شاعر شمیم حیدر شمیمؔ عہد حاضر میں موجود ہیں۔ ہو سکتا ہے اپنے جد، اعظمؔ امروہوی کے مراثی اور سلام شمیم حیدر تلاش کر سکیں اور انہیں شائع کرا سکیں اگر ایسا ممکن ہوا تو یہ بڑا کام ہوگا۔

☆☆☆☆☆

سیدؔ حسن ضیاء :-

ولادت ۱۸۴۰ء۔ وفات ۱۹۰۸ء۔

سید حسن ضیاءؔ امروہوی، سیّد ابوالحسن فرقتیؔ کے فرزند، سلسلۂ نسب سیّد حسین شرف الدین کے حوالے سے امام علی نقی سے ملتا ہے۔ ضیاءؔ کی مرثیہ نگاری پر مفتی میر عباس نے ایک شعر پر ایک صاد اور دوسرے شعر پر دو صاد اپنے دست علم پرور سے لگائے تھے۔ مفتی میر عباس وہ عالم شخصیت

ہیں جنہوں نے 'برہان قاطع' کا جواب لکھا تھا اور غالب کو معذرت کرنی پڑی تھی۔ امروہہ کے مرثیہ نگاروں کی تاریخ میں ضیاء امروہوی کا نام ایک ایسا روشن ستارا ہے جو اس کہکشاں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ حسن ضیاء کی مرثیہ نگاری پر میر مونس نے بھی لکھا ہے جسے تواریخ واسطیہ نے محفوظ کرلیا ہے۔ ضیاء کے مراثی شائع نہیں ہونے اس کے باوجود ان کے بیس مرثیے آج بھی محفوظ ہیں۔ 'مرثیہ نگاران امروہہ' میں ان کے بیس مرثیوں کے مصرع ہائے اولیٰ، اور بندوں کی تعداد درج کی گئی ہے۔ اُن کا طویل ترین مرثیہ "مشاطۂ شفق نے سنوارا جو روئے صبح" ہے جس کے ۱۹۰ بند ہیں اور قلیل ترین مرثیہ "جب کہ خیمے شہ مظلوم کے تاراج ہوئے" ۱۱ بند پر مشتمل ہے۔ حسن ضیاء نے امام حسینؑ کی مدینے سے روانگی سے لے کر اہلبیت رسولؐ کے لٹے پٹے قافلے کی مدینہ تک واپسی کی تاریخ اپنے مراثی میں نظم کی ہے۔ اگر حسن ضیاء کے بیس مرثیے بھی شائع ہو جائیں تو یہ پوری تاریخ منظوم بہ ہیئت مسدس (مرثیہ) سامنے آسکتی ہے۔ حسن ضیاء کے مراثی پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ منظر نگاری میں ضیاء منزل کمال پر فائز تھے۔ مثلاً کربلا میں صبح عاشور امام حسینؑ اور ان کے رفقاء کی نماز کا منظر دیکھیے۔

"بعد اذان" زیب جماعت ہوئے جناب　　صف باندھ کر کھڑے ہوئے سب مقتدی شتاب
تکبیر کہہ کے شاہ نے اس دم بہ آب و تاب　　الحمد کو شروع کیا مثل ابو تراب
حضرت ثنا جو کرتے تھے خالق کی شان پر
الحمد شکر کرتی تھی شہ کی زبان پر

مرثیے کی نقل میں پہلا مصرع "کہہ کر اذاں کو زیب جماعت ہوئے جناب" درج ہے، دل نہیں مانتا کہ ضیاء جیسے عالم فاضل شاعر کو یہ علم نہ ہو کہ عاشور کی صبح کو شہزادہ علی اکبر نے اذان دی تھی۔ لہٰذا اسے کتابت کی غلطی سمجھ کر مصرع یوں درج کیا جارہا ہے۔

"بعد اذان، زیب جماعت ہوئے جناب" —— آیئے آگے بڑھتے ہیں۔

آیا زباں پہ قدر تو قدر سحر بڑھی　　سب جھومتے تھے یاد الٰہی میں مقتدی
ہاں کیوں نہ ہوتی وجد سے ہر ایک کو خوشی　　شہ کی زباں، کلام خدا، لہجۂ نبیؐ
سب دشت و کوہ سننے کو خاموش ہوگئے
طائر بھی صبح کے ہمہ تن گوش ہوگئے

صبح کی نماز کے بعد کی منظر نگاری شاعر کا بیانیہ انداز ہے مگر کیسے بھرپور مصائب ہیں اس بند میں؟

یہ وہ سحر ہے جس کو لُٹا فاطمہ کا گھر یہ وہ سحر ہے ہوگئیں زینبؑ برہنہ سر
یہ وہ سحر ہے ہوگئے سجّاد بے پدر یہ وہ سحر ہے روئے جسے سیّد البشر
ہنگامِ عصر قتل کیا تشنہ کام کو
زینبؑ کے بازو باندھے گئے جس کی شام کو

دبستان لکھنؤ نے مرثیے میں گھوڑے اور تلوار کی تعریف کا سہرا میر ضمیرؔ کے سر پر باندھا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میر ضمیرؔ اس کے مستحق بھی ہیں۔ حسن ضیاؔء نے بھی تلوار اور گھوڑے پر قلم اُٹھایا ہے اور ناقدین مرثیہ تسلیم کرتے ہیں کہ اُنہوں نے بھی حق ادا کیا ہے۔

سر پر عدو کے پھرتی تھی تقدیر کی طرح سیدھی وہ جا کے پڑتی تھی تدبیر کی طرح
تاکا جسے پہنچ گئی بس تیر کی طرح لیتی تھی جان، زہر کی تاثیر کی طرح
جاتی تھی جس طرف کو ظفر ساتھ ساتھ تھی
اس دن کی فتح تیغ دو پیکر کے ہاتھ تھی

ایک اور مرثیے میں تلوار کی تعریف دیکھئے ۔

سینوں سے جگر، قلب سے جاں، جسم سے راحت میداں سے اماں، رگ سے لہو دل سے محبت
بانہوں سے تواں، سر سے خودی، منہ سے طلاقت کس ہاتھ سے، نور آنکھ سے کانوں سے سماعت
ہر پیر سے تدبیر تو بس زور جواں سے
اس تیغ نے سب کھودئے یک لخت جہاں سے

اور گھوڑے کی تعریف انداز ملاحظہ ہو ۔

تیز دم، تیز قدم، حور لقا ، خوش کردار یال جنجال، خوش اقبال، پریوش، طرّار
پلکیں دل دوز، جگر سوز ہیں سوقلب کے پار ناپیں خوں ریز، نظر تیز، انوکھی رفتار
نہیں چلتی ہے سبک باد بہاری ایسی
غنچے سوسن کے فدا، تھوتنی پیاری ایسی

گھوڑا کس موج میں دریا کی طرف جاتا ہے لہریں آتی ہیں ہوا نہر کی جب کھاتا ہے
جھومتا مثل نسیم سحری آتا ہے دل سوئے آبِ خنک دیکھ کے للچاتا ہے

چاہ ظاہر ہوئی جاتی ہے تگ و دو ہو کر
نہر کی سمت وہ جاتا ہے سبک رو ہو کر

چہرہ، سراپا، جنگ، مصائب، شہادت ہر موضوع پر حسن ضیاءؔ نے نقطۂ کمال کو چھوا ہے، الفاظ کی فراوانی اور لفظوں کا چابکدستی سے استعمال کرنا ضیاءؔ کی قادرالکلامی کا برملا اعلان ہے۔

ہاتھ وہ ہاتھ جو کرتے ہیں شکارِ ضیغم قوتِ دست سر دست نہ ہووے گی رقم
کیا لکھوں رعب، قلم خوف سے ہوتا ہے قلم قوتِ بازوئے شبیر میں خالق کی قسم
شیر ہیں اور اسداللہ کے دلبند ہیں یہ
ہاتھ کہتے ہیں یداللہ کے فرزند ہیں یہ

یہ تھا حضرت عباس کا تعارف ـــــ اب دیکھئے امام حسین کی جنگ کا منظر ۔

تیغ چلتی تھی دمادم کہ جگر کانپتے تھے خوف سے چرخ پہ جبریل کے پر کانپتے تھے
تیر چلاتے تھے اور اہل ہنر کانپتے تھے شام میں تہلکہ تھا، کوفے کے در کانپتے تھے
ہاتھ رکھتے تھے جری خوف سے سب کانوں پر
جن یہ کہتے تھے کہ ہے آج بنی جانوں پر

مصائب کہنے میں بھی حسن ضیاءؔ کا خاص انداز تھا ۔

زینبؑ نے بڑھ کے تھامی رکابِ امامِ دیں گھوڑے پہ تب سوار ہوئے سید مبیں
تھرایا چرخ، دشت کی ہلنے لگی زمیں ایسا ستم زمانے میں ہرگز ہوا نہیں
کیوں چرخِ بے مدار یہ کیا کج ادائی ہے
زینبؑ رکاب تھامنے بھائی کی آئی ہے

رخصتِ آخر کے وقت بہن بھائیوں کی بیکسی پر نہ بھائی نے "رو کر کہا" نہ "چلائی یہ زینب" کا مرحلہ آیا۔ شاعر کے بیان نے مصائب کا اظہار کر دیا۔ یہی حسینؑ کے مرثیے کی شان ہے۔

☆☆☆☆☆

حافظ محمد اسمعیل حافظؔ:۔

ولادت ۱۸۳۸ء۔ وفات ۱۹۰۸ء

سلسلۂ نسب سید شرف الدین شاہ ولایت سے ملتا ہے۔ اسی سلسلے سے نقوی سید ہیں

امروہہ میں پیدا ہوئے، مٹیا برج کلکتہ میں واجد علی شاہ والیٔ اودھ کے ملازم رہے۔ حافظِ قرآن تھے۔ اللہ نے چار فرزند عطا کئے جن میں سے دو فرزند یعنی سید محمد اسرائیل طوبیٰ اور نیر حسن نیر شاعر ہیں۔ میر انیس کے شیدائی تھے۔ ہلال نقوی نے "مرثیہ عظیم" میں لکھا ہے کہ ایک روز میر انیس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ذوق مرثیہ خوانی کے تحت میر انیس سے مراثی مانگے، میر انیس نے انکار کر دیا۔ حافظ اُداس گھر لوٹے مگر اس ارادے کے ساتھ کہ خود مرثیہ کہیں گے۔ اور یہی ہوا۔ حافظ اسمٰعیل نے مرثیہ خوانی کے ساتھ مرثیہ کہنا بھی شروع کر دیا۔ زندگی بھر میر انیس کے دلدادہ رہے۔ بعد میں مرزا دبیر کی بلاغت کے بھی معترف ہو گئے ؎

اے کلک، لوحِ قلب پہ طغرا نویس ہو پاکیزہ حرف حرف ہو، مضموں نفیس ہو
مطلب بلیغ ہو تو عبارت سلیس ہو طرزِ دبیر، لطفِ کلامِ انیس ہو
کوشش رہے مدام اسی کارِ نیک میں
جب ہے مزا کہ لطف ہو دونوں کا ایک میں

انیس و دبیر کی محبت اور عقیدت میں حافظ کا رنگ، دبستان لکھنؤ کی مرثیہ نگاری سے ملتا ہے۔ اصغر کی شہادت پر بانو کی حوصلہ مندی کو حافظ نے لکھنوی طرز بیان میں کس قدرت سے پیش کیا ہے۔

بانو نے جب یہ دیکھا کہ والی ہے شرمسار بولی ہزار اکبر و اصغر کروں نثار
اکبر کا ہے نہ رنج، نہ اصغر کا غم مجھے
درکار ہے فقط یہی حضرت کا دم مجھے
اللہ آپ کو رکھے قائم جہان میں روشن رہے چراغ نبی کے مکان میں
ہر دم رہیں حضور خدا کی امان میں حضرت کے دم سے جان ہے، ہم سب کی جان میں
درکار ہے نہ مال، نہ اولاد چاہئے
زہراؑ کی گود دائمی آباد چاہئے

اصغر کی لاش پر مادر علی اصغر کے بین دیکھئے ؎

اصغر تمہارے واسطے جاگی تھی رات بھر جھولے میں ڈر نہ جاؤ کہیں تھا یہ مجھ کو ڈر
تاریک شب، یہ غیر جگہ، دشتِ پُرخطر اب تم کہاں، یہ ماں کہاں، ڈھونڈتی میں کدھر

سوئے گا کون لے کے اب عالی صفات کو
لوری کہے گا کون جو چونکو گے رات کو

اس مرثیے کا اختتام بہت سے شعراء کی طرح حافظؔ بھی دعا پر کرتے ہیں ۔

حافظؔ بس اب خموش، نہ طولِ کلام کر بس روک لے قلم کو مسدّس تمام کر
آئے پسند سب کو، ہے لازم وہ کام کر اللہ سے دعا یہی ہر صبح و شام کر
چشمِ کرم رہے میرے اوپر حسینؑ کی
میری بھی مغفرت ہو، میرے والدین کی

حافظؔ کے جو مراثی دستیاب ہیں اُن کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حافظؔ ہر رنگ میں مرثیہ کہتے تھے، اُن کا وسیع مطالعہ، حافظ قرآن ہونے کے سبب ہر لمحہ آیاتِ قرآنی اور اسلام و احادیث پر گہری نظر۔ ان سارے عوامل نے حافظ کو اعلیٰ درجے کا مرثیہ نگار بنا دیا تھا۔

☆☆☆☆☆

جدید لکھنوی :-

ولادت ۔؟، وفات ۱۹۰۹ء

نام سیّد مہدی مرزا۔ تخلص جدیدؔ۔ آبائی وطن لکھنؤ۔ احمد مرزا صاحب کے فرزند، حضرت رشیدؔ لکھنوی کے برادرِ خورد، میر عشقؔ اور میر تعشقؔ کے بھتیجے اور میر انیسؔ کے حقیقی نواسے تھے۔ لکھنؤ کے مشہور محلہ رکاب گنج، حال منڈی موسوم بنام باغِ میر عشقؔ میں پیدا ہوئے اور ساری زندگی وہیں سکونت رہی۔ بہت پر گو اور خوش گو شاعر تھے۔ مرثیے کے ماحول میں آنکھ کھولی، مرثیے کے ماحول میں پڑھے بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ مرثیہ کی آغوش میں تربیت پائی — غزل کے میدان میں بھی بہت خوش رنگ پھول کھلائے۔ اور صاحبِ دیوان شاعر کہلائے۔ مرثیہ کے میدان میں جو گھر میں صبح سے شام تک سنتے تھے وہ بھی لکھ دیتے تو بہتوں پہ بھاری ہوتے حضرت مہذبؔ لکھنوی نے لکھا ہے کہ جدیدؔ لکھنوی مرثیہ کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ ۱۹۰۹ء میں اپنے مسکونہ مکان میں انتقال فرمایا اور وہیں باغ میر عشقؔ میں دفن ہوئے۔

میر تعشقؔ کے انتقال پر کہا گیا جدیدؔ لکھنوی کا ایک شعر اب بھی اہل لکھنؤ کو یاد ہے ۔

کچھ نہیں ہے شعر گوئی کا مزا باقی جدیدؔ
سچ یہ ہے جب سے تعشقؔ مرگئے، دل مرگیا

نہ جانے کیوں سید ضمیر اختر نقوی کی کتاب 'خاندان انیس کے شعراء میں جدیدؔ لکھنوی کا ذکر نہیں ہے جبکہ ددھیال کی طرف سے جدیدؔ لکھنوی میر عشقؔ کے بھتیجے سہی میر انیسؔ کے نواسے بھی تو تھے اور اُن کا شمار خاندانِ انیسؔ کے شعراء میں بھی کیا جا سکتا تھا۔ بہر حال یہ ایک رائے تھی۔ فیصلہ تو ضمیر اختر نقوی صاحب کو کرنا تھا۔

☆☆☆☆☆

امداد علی عشیر:- (لکھنؤ)

ولادت ۱۸۱۸ء وفات ۱۹۰۹ء۔

نام امداد علی، تخلّص عشیرؔ۔ وطن لکھنؤ۔ عشیرؔ لکھنوی کے بڑے بھائی مشیرؔ لکھنوی کا شمار ممتاز شعراء لکھنو میں ہوتا ہے۔ عشیرؔ لکھنوی مرزا دبیرؔ کے شاگرد تھے۔ اسی لئے اُن کے مرثیوں میں دبستان دبیر اپنی پوری آب وتاب اور نزاکتوں کے ساتھ نمایاں تھا—مرثیوں میں رزم کے مضامین پر زور دیتے ہیں۔ جنگ کے مناظر کی الفاظ میں عکاسی بہت کامیابی سے کرتے ہیں۔ مرثیوں کے علاوہ اُن کی مناجاتیں بہت مقبول ہیں۔ ایک بہت مقبول مناجات جو اکثر لوگ پڑھتے ہیں لیکن نہیں جانتے کہ حضرت عشیرؔ لکھنوی کی ہے۔

ساماں شتاب کردے میرے دل کے چین کا
پروردگار واسطہ خونِ حسینؑ کا

☆☆☆☆☆

نسیم بھرت پوری:-

ولادت ۱۸۸۴ء ،وفات ۱۹۰۹ء۔

نام سید بشیر حسین جعفری۔ تخلّص نسیمؔ، وطن بھرت پور، والد کا اسم گرامی سید التماس حسینؑ جعفری۔ ابتدائی تعلیم سید محمد ساکن سونی پت کے زیر سایہ ہوئی جو امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے اولاً اُن سے اصلاح لی بعد میں حضرتِ داغؔ دہلوی کے شاگرد ہو گئے۔ نسیمؔ کے دو مجموعے "ریاض نسیم" اور "دیوان نسیم" شائع ہو چکے ہیں۔ پیشے کے حوالے سے سب انسپکٹر پولیس تھے۔

نسیم مرثیہ گوئی میں میر نفیس سے سلسلۂ تلمذ وابستہ رکھتے تھے، اس رشتے سے میر انیس ان کے فکری، اور میر نفیس ان کی شاعری بالخصوص مرثیے کے سفر میں عملی رہنما تھے اسی لئے نسیم، خدائے سخن میر انیس کی تراشیدہ راہوں پر سرگرم سفر ہے۔ نمونہ کلام کے طور پر ان کے مرثیے۔ ''گلگونۂ رخسار سخن مدح نبیؐ ہے'' کے چند بند درج ذیل ہیں۔

گلگونۂ رخسارِ سخن مدح نبیؐ ہے لفظوں کے لئے حُسنِ حسن مدح نبیؐ ہے
رضواں بھی ہے شیدا وہ چمن مدح نبیؐ ہے ۱ مقبولِ خداوندِ زمن مدحِ نبیؐ ہے
مدّاح کو بھی اوج مِلا آج اسی سے
حاصل ہے سخن کے لئے معراج اسی سے

تھی یوں کسی مرسل کو نہ اُمت سے محبت رکھتے تھے ہمیشہ نظرِ لطف و عنایت
جس شب کو مشرف ہوئے معراج سے حضرت ۲ تھی حق سے وہاں بھی طلب بخشش امت
پیارا تھا نہ بیٹا بھی نواسے سے نبیؐ کو
صدقے کیا امت پہ حسینؑ ابن علیؑ کو

تھی امت عاصی سے پیمبر کو جو اُلفت شبیر بھی رکھتے تھے اسی طرح محبت
کیا کیا شہِ مظلوم پہ گذری ہے مصیبت ۵ اب تک کبھی آیا نہ مگر حرفِ شکایت
اس صبر کا یارا نہیں دنیا میں کسی کو
اُمت پہ فدا کردیا ہم شکل نبی کو

ہاں اے دلِ آلودۂ غم مرثیہ خواں ہو اے طبعِ حزیں مائلِ فریاد فغاں ہو
اے چشم مناسب ہے کہ اب اشک فشاں ہو ۶ اے بحرِ الم ماتمِ اکبر میں رواں ہو
رخصت تن و جاں کی ہے سفر لختِ جگر کا
شبیر کو در پیش ہے غم نورِ نظر کا

اسی مرثیے میں جب علی اکبر رخصت کی اجازت طلب کرتے ہیں تو امام حسینؑ کے جذبات کی عکاسی کلاسیکی مرثیے کی بھرپور روایات کے تحت کی گئی ہے۔

فرماتے ہیں شہ اذنِ وغا دوں تمہیں کیوں کر چلتے ہیں کلیجے پہ غم و درد کے خنجر
کیا سمجھے ہو تم، باپ کا دل ہے کوئی پتھر اس درد کی کیا تم کو خبر اے میرے دلبر

میں کیا کہوں حالت ہے جو کچھ قلب و جگر کی
فرقت نہیں آسان برابر کے پسر کی

یہ فصل شباب اور یہ آغازِ جوانی اس عمر میں آفت ہے عجب تشنہ دہانی
گذرے ہیں کئی روز کہ پایا نہیں پانی کس طرح گنواؤں تجھے اے یوسف ثانی
کھو دیتا ہے آنکھوں کو، الم نور نظر کا
یعقوب سے پوچھے کوئی غم ہجر پسر کا

کس ناز سے، کس دکھ سے پھوپھی نے تمھیں پالا کہتی ہیں کہ اکبر ہے میرے گھر کا اُجالا
دیکھا نہیں ایسا تو کوئی چاہنے والا قربان ہیں یوں جیسے فدا چاند پہ ہالا
ہر دم یہ دعا حق سے ہے اس خستہ جگر کی
شادی ہو کہیں جلد میرے نور نظر کی

بین، مرثیے کا جزوِ اہم بلکہ جزوِ لازمی ہوتے ہیں۔ نسیم بھرت پوری نے بھی بین کا کلاسیکی انداز اپنایا ہے۔ اسی مرثیے میں جب علی اکبر زخمی ہو کر گھوڑے سے گرتے ہیں تو اس منظر کو نسیم برتپوری نے جو الفاظ دیے ہیں وہ یہ ہیں ۔

گرتے ہوئے گھوڑے سے پکارے علی اکبر جلد آیئے بابا کہ اجل آگئی سر پر
خادم کو ہے گھیرے ہوئے بے دینوں کا لشکر نزدیک ہے ہو جائے جدا تن سے میرا سر
ممکن نہیں دے موت جو مہلت کوئی دم کی
کرلوں میں زیارت شہ والا کے قدم کی

سن کر یہ صدا رونے لگے حضرت شبیر دنیا نظر آنے لگی ظلمات کی تصویر
بیٹے کا الم دے نہ کسی باپ کو تقدیر بسمل سے تڑپتے ہوئے دوڑے شہ دیگر
پہنچے جو وہاں قہر کا سماں نظر آیا
فرزند جواں خون میں غلطاں نظر آیا

سر پیٹ کے یوں سیّد مظلوم پکارے ہے ہے علی اکبر سوئے فردوس سدھارے
تنہا مجھے اس نرغے میں چھوڑا ہے پیارے اے راحت جاں، اے میری پیری کے سہارے

اس بیکس و مظلوم کو غم دے گئے بیٹا
ہے ہے مجھے ہمراہ نہ تم لے گئے بیٹا

اس کے بعد پندرہ بیس بند بین کے ہیں اور یہ بین امام حسینؑ اور اہلِ حرم سے کرائے گئے ہیں۔ ''تذکرۂ مرثیہ نگاران اُردو'' کے علاوہ نسیم بھرت پوری کے دس مرثیوں کا ریکارڈ مراثی فیض بھرت پوری کے حوالے سے بھی ملتا ہے۔

☆☆☆☆☆

فاخرلکھنوی:-

ولادت (جناب ساحر لکھنوی کے مطابق) ۱۸۵۱ء۔ وفات ۱۹۰۹ء

نواب سید اصغر حسین صاحب فاخر لکھنوی، کراچی کے ایک ممتاز مرثیہ گو اور مرثیوں کے مجموعے ''آیات درد'' کے مصنف، مستند مرثیہ گو شاعر حضرت ساحر لکھنوی کے دادا ہیں۔ فاخر لکھنوی غزل گوئی میں بھی جداگانہ مقام رکھتے تھے۔ ان کی غزلیات کے پانچ دیوانوں میں سے دو شائع ہو چکے ہیں۔ غزل میں منیر شکوہ آبادی کے شاگرد تھے۔

فاخر لکھنوی کے مرثیے شائع نہیں ہو سکے۔ اس لئے ہم ایسے دور افتادہ غریب الوطن لوگ ان کے مراثی پڑھنے سے قاصر ہیں۔ اُن کے ۲۱ مرثیے اُن کے پوتے ساحر لکھنوی صاحب کے پاس محفوظ ہیں۔ پانچ مرثیے سید ضمیر اختر نقوی کے کتب خانے میں موجود بتائے جاتے ہیں۔۔۔ فاخر لکھنوی ۱۹۱۰ء میں انتقال فرما گئے تھے۔۔۔ ساحر لکھنوی سے زیادہ کون اس حقیقت کو سمجھ سکتا ہے کہ مخطوطات کا تحفظ روز بروز گراں ہوتا جارہا ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ مخطوطات کی اشاعت کے مقابلے میں تحفظ کا عمل گراں پڑتا ہے۔ اس احساس کے باوجود ساحر صاحب نے اپنے دادا کے مراثی شائع کیوں نہیں کرائے ایک ایسا سوال ہے جسے صرف ساحر لکھنوی حل کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنی کتاب ''خانوادہ اجتہاد کے مرثیہ گو'' میں کچھ وضاحت بھی کی ہے۔

فاخر لکھنوی رنگِ انیس میں مرثیہ کہتے تھے جس میں بہاریہ حصہ قدرے زیادہ ہوتا تھا۔ ہمیں فاخر لکھنوی صاحب کے مرثیے کی ایک فوٹو کاپی میسر آئی ہے جو ہاتھ کی تحریر نہیں کتابت شدہ مواد کی فوٹو کاپی ہے۔

یارب بہار میں کوئی گلشن خزاں نہ ہو برسوں کا جو ریاض ہو وہ رائیگاں نہ ہو

نورِ نظر نگاہ پدر سے عیاں نہ ہو پھر موت ہے بشر کی جو آرام جاں نہ ہو

یوں ایک دن میں دولتِ اولاد لُٹ نہ جائے

جنگل میں ساتھ ایسے گلِ تر کا چُھٹ نہ جائے

اگلے چھ بند اسی فکر کی وضاحت ہیں چھٹا بند ایک مثال ۔

لکھا ہے جب جواں ہوا یوسف سا نونہال روئے تھے اُن کے ہجر میں یعقوب سات سال

گو جانتے تھے قید میں زندہ ہے میرا لال لیکن ملالِ ہجر سے تھی زندگی وبال

کہتے تھے داغ نورِ نظر دے گیا مجھے

بینائی میں ہے فرق نہیں سوجھتا مجھے

اب دیکھو صبر سبطِ رسالت مآب کا کیا ضبط ہے کہ چپ ہیں شہنشاہِ کربلا

رخصت طلب ہے باپ سے ہمشکل مصطفیٰ گو جانتے ہیں مرنے کو جاتا ہے دلربا

گردن جھکائے بیٹھے ہیں لب پر فغاں نہیں

سینے میں دل کو ضعف سے تاب و تواں نہیں

۱۵۸ بند کے اس مرثیے میں پوری روایتیں اور مرثیے کے پورے عوامل نظم کئے گئے ہیں۔ یوں تو سارا مرثیہ ہی کلاسیکی روایت کا پاسدار ہے لیکن بین کا انداز بالخصوص بالکل وہی ہے۔

ہر دم یہ رو کے کہتے تھے سلطانِ دیں پناہ ہے ہے جواں بھی ہونے نہ پایا یہ رشکِ ماہ

مرنے کا اس کے داغ نہ اُٹھے گا آہ آہ اکبر ابھی گئے نہیں اور حال ہے تباہ

کیوں کر کہوں کہ صبر میرے دل کو آئے گا

اس کا تو داغ ہم سے اُٹھایا نہ جائے گا

''بین'' کے ضمن میں بہت سے مصرعے اس انداز کے ہیں جن میں سے چند درجِ ذیل ہیں۔

۔ مادر سے رو کے اکبرِ ناشاد نے کہا

۔ روکر ابھی یہ کہتے تھے شبیرِ نامدار

۔ بانو نے رو کے زینبؑ مضطر کو دی صدا

۔ رونے لگا یہ کہہ کے جو سبطِ نبی کا ماہ

جیسا کہ عرض کیا گیا بین کا انداز کلاسیکی عہد کی روایت و امانت ہے۔ جہاں تک شعر

گوئی کا تعلق ہے، الفاظ پر دسترس اور اسلوب کا سوال ہے حضرت فاخر لکھنوی کو فاخر کہلانے کا حق تھا، ہے اور رہے گا۔

☆☆☆☆☆

امیر حسن امیرؔ:-　(امروہہ)

ولادت ۱۸۳۰ء۔ وفات ۱۹۱۰ء

نام سید امیر حسن۔ تخلص امیرؔ۔ وہ نخل شاعری جس پر نسلاً "بعد نسلاً" پھول کھلے۔ امیر امروہوی کے فرزند نصیر حسن نصیرؔ بھی شاعر تھے۔ (یاد رہے یہ وہ نصیرؔ نہیں جن کی مثنوی "حقیقت شاعری" راقم الحروف نے لندن سے شائع کی ہے۔ اُن کا نام نصیر الدین نصیرؔ تھا اور اُن کا بہار سے تعلق تھا۔) امیر حسن امیر کے فرزند نصیر حسن نصیرؔ کے چار فرزند سید نفیس حسن نفیسؔ، سید انیس حسن ہلالؔ، سید وحید حسن گدا اور سید شفیق حسن ایلیاؔ شاعر تھے۔ شفیق حسن ایلیا کے فرزندان سید محمد عباس، سید محمد تقی، سید محمد مہدی رئیس امروہوی اور جون ایلیاؔ ہیں۔ سید محمد تقی بیسویں صدی کے ممتاز دانشور، مفکّر اور صحافی کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ رئیس امروہوی ایک مفکّر، ادیب، صحافی، اور شاعر کے طور پر منفرد حیثیت کے مالک ہوئے۔ جان ایلیا بحیثیت شاعر اور دانشور جانے مانے گئے۔

ابتدا میں امیر حسن امیر کی کتاب روضۃ الشہدا (فارسی) کا اردو ترجمہ اُن کی پہچان بنی۔ اُن کے ترجمے کی خصوصیت یہ ہے کہ:

> "جس مقام پر فارسی اشعار روضۃ الشہدا میں مرقوم ہیں اسی بحر اور اسی مضمون کے اشعار اردو ترجمہ میں مذکور ہیں"　(تواریخ واسطیہ)

امیر حسن امیرؔ با کمال شاعر تھے، مرثیہ گوئی میں بھی قدرت کاملہ رکھتے تھے۔ مرثیہ کا انداز روایتی تھا— ایک مرثیے میں حضرت عباس کے رجز کا انداز یوں بیان کرتے ہیں۔ ؎

مشہورِ خلق ہم نبی ہاشم کے ماہ ہیں　نورِ خدائے پاک کے نورِ نگاہ ہیں
ہم حاملِ نشانِ شہِ کم سپاہ ہیں　ہم پاسبانِ بیشۂ شیرِ الٰہ ہیں
کس کی ہے تاب ہم سے کوئی ہم نبرد ہو
دیکھیں نگاہ قہر سے جس کو وہ سرد ہو

انکے کلام میں ''شہِ کم سپاہ'' جیسی تراکیب امیر کی قادرالکلامی کی دلیل ہیں۔اسی طرح

او غافلو، کنندۂ خیبر ہمیں تو ہیں　　او موذیو، درندۂ اژدر ہمیں تو ہیں

روح الامیں کے قاتلِ شہ پر ہمیں تو ہیں　　جن کا نہیں نظیر وہ صفدر ہمیں تو ہیں

ہم وہ ہیں جن کو چرخ سے تلوار آئی ہے

لوہا ہمارا مانتی ساری خدائی ہے

اس بند میں ''کنندۂ خیبر'' اور ''درندۂ اژدر'' کی ترکیب نیز ''کنندۂ'' اور ''درندہ'' ایسے الفاظ کا لغوی معنی میں استعمال عام شاعر کے تصرّف سے باہر کی بات ہے۔اوراب ''بین'' کا انداز دیکھئے۔حضرت عباس کی رخصت کا منظر یوں بیان ہوتا ہے ؎

بھائی عباس کرو شہ کی مصیبت پہ نگاہ　　بھانجے ہیں نہ بھتیجے ہیں، نہ باقی ہے سپاہ

ہر طرف دیکھ کے رو دیتے ہیں با نالہ و آہ　　قابلِ رحم ہے اب حالِ امامِ ذی جاہ

بھائی کی زیست کا ہوتا ہے سہارا بھائی

تم نہ ہوگے تو جئے گا نہ تمہارا بھائی

تعجب اس بات پر ہے کہ امیر حسن امیرؔ کے بیٹے بھی شاعر، پوتے بھی شاعر، شاعری اور مرثیہ گوئی کی اہمیت سے آشنا نسل نے امیر حسن امیرؔ کے مراثی کا ذخیرہ شائع کیوں نہیں کرایا حتیٰ کہ اُن کے مراثی تقریباً ناپید ہو گئے ہیں۔آخر اُن کے وارثوں نے ان کی حفاظت نہیں کی؟

☆☆☆☆☆

ظہیر دہلوی:-

ولادت ۱۸۳۵ء (دہلی)۔وفات ۱۹۱۱ء (حیدرآباد، دکن)

نام سید ظہیرالدین حسین۔عُرف نواب میرزا۔تخلص ظہیرؔ۔قلمی نام ظہیر دہلوی۔آخری تاجدار ہند بہادر شاہ ظفر سے ''راقم الدولہ'' کا خطاب ملا تھا۔والد گرامی صلاح الدولہ مرصع رقم سید جلال الدین حیدر خوش نویسی میں بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔ظہیر دہلوی رضوی سادات سے تعلق رکھتے تھے۔شجرۂ نسب حضرت شاہ نعمت اللہ ولی تک پہنچتا ہے جو امام رضا علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔

دہلی میں پیدا ہوئے۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک (جسے انگریزوں کی خوشنودی کی

خاطر غدر کہا گیا) دہلی میں رہے۔ اس وقت ان کی عمر کم و بیش بائیس برس تھی۔ اس جنگ آزادی میں حریت پسندوں کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے جو افراتفری پھیلائی اور انتقامی کاروائیاں شروع کی تو جان بچا کر رام پور آ گئے اور چار برس وہاں رہے۔ انتقام کی آگ سرد ہوئی تو واپس دہلی آئے پھر اخبار ''جلوۂ طور'' کے مدیر ہو کر بریلی چلے گئے۔ ان کی علمی ادبی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر مہاراجہ ریاست الور نے انہیں ریاست سے منسلک کر لیا۔ حالات نے کروٹ بدلی تو نواب مصطفیٰ علی خان شیفتہ کے توسل سے ریاست جے پور میں محکمۂ پولیس میں بھرتے ہو گئے۔ جے پور میں بیس برس قیام کے دوران مہاراجہ جے پور سے اتنا تقرب بڑھا کہ ان کے مصاحبین میں شمار ہونے لگے۔ یہاں حالات بدلے تو جے پور سے ملحقہ مسلمان ریاست ٹونک چلے گئے جہاں پندرہ برس رہے۔ عمر کا آخری حصہ حیدر آباد دکن میں گذرا اور وہیں انتقال کیا۔

تصانیف:

(۱) گلستانِ سخن (۲) سنبلستانِ سخن (۳) دفترِ خیال ان کے دیوان ہیں لیکن ظہیر دہلوی کی اہم ترین کتاب ''داستانِ غدر یا طرازِ ظہیری (ان کی خود نوشت سوانح حیات) ہے۔ کہا جاتا ہے کی ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی یا غدر (آپ اپنی سوچ کے تحت اس خونیں حادثہ کو جو چاہیں کہہ لیں) کے بارے میں اتنی تفصیلات کہیں نہیں ملتی جتنی ظہیر دہلوی کی ''داستانِ غدر'' میں ملتی ہیں۔ اسے اس حادثہ کا آنکھوں دیکھا حال بھی کہا جا سکتا ہے۔

ظہیر دہلوی ہمہ جہت شاعر تھے لیکن ہمارا موضوع مرثیہ ہے اس لئے ہم اُن کی مرثیہ گوئی کی حدود تک رہیں گے۔ حال ہی میں ممتاز مرثیہ نگار سید اقبال حسین کاظمی نے ظہیر دہلوی کے مراثی کا دیوان مرتب کیا ہے جسے ''اوراقِ کربلا'' کے نام سے مرثیہ فاؤنڈیشن کراچی کے زیرِ اہتمام شائع کیا ہے۔ سید اقبال حسین کاظمی راقم الدولہ ظہیر دہلوی کی چھوٹی بیٹی ولایتی بیگم کے پوتے ہیں۔ ''اوراقِ کربلا'' میں ظہیر دہلوی کے ۱۹ مراثی شامل کئے گئے ہیں۔ اس اُن کا پہلا مرثیہ ''یا رب مری زباں ہو روانی میں سلسبیل'' ہے جو ۲۴۵ بند پر مشتمل ہے۔ دوسرا مرثیہ ''دستِ خدا لقب ہے جناب امیر کا'' ۹۸ بند پر مشتمل ہے۔ تیسرا مرثیہ ''ساقی پلا دے ساغرِ صہبائے لالہ فام'' ۵۵ بند، چوتھا مرثیہ ''اے ذوالفقار دستِ یداللہ المدد'' ۸۰ بند۔ پانچواں مرثیہ ''جب دولت کونین سے دلشاد ہوا حر'' ۱۱۱ بند۔ چھٹا مرثیہ ''جب در پئے ستم ہوئے یثرب میں اہلِ شر'' ۴۲ بند۔ ساتواں

مرثیہ'' کیا اخترِ تابندہ ہیں زینبؑ کے جگر بند'' ۱۳۹ بند۔ آٹھواں مرثیہ'' ہے رن میں ہژبر اسد اللہ کی آمد'' ۹۵ بند۔ نواں مرثیہ'' گلگونۂ شفق جو ہوا رونمائے صبح'' ۹۵ بند۔ دسواں مرثیہ'' عباسِ علی بلبل بستانِ وفا ہے'' ۸۷ بند۔ تا انیسواں مرثیہ'' جب رن میں بوستانِ امامت قلم ہوا'' شریک اشاعت ہیں۔

ظہیر دہلوی رنگ قدیم کے علمبردار ہیں۔ زبان و بیان میں مستند اور رثا کے اصولوں پر کاربند مرثیہ نگار تھے۔ ممتاز محقق علی جواد زیدی نے ظہیرؔ کے دور کو دہلی میں مرثیہ گوئی کا چوتھا دور قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

> '' چوتھا دور مرثیہ گوئی کا جدید دور ہے۔ اس میں ظہیرؔ، غالبؔ، ظفرؔ جیسے شاعر موجود ہیں جو تمام رثائی اصناف کی طرف متوجہ ہیں۔ اُدھر لکھنؤ میں انیسؔ و دبیرؔ کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ یہاں ایسے شاعر نہیں ملیں گے جنہوں نے دلّی کے پہلے دور کی طرح یا ہم عصر لکھنوی مرثیہ گویوں کی طرح مرثیہ گوئی پر پوری توجہ مذکور کی ہو لیکن شرفؔ، ظہیرؔ، قادرؔ و قدیرؔ کے مرثیے لکھنوی مرثیوں کے پہلو بہ پہلو رکھے جا سکتے ہیں''

(دہلوی مرثیہ گو۔ علی جواد زیدی ص ۴۸۔ اقتباس از اوراق کربلا)

نمونۂ کلام: مرثیہ کا چہرہ

یارب مری زباں ہو روانی میں سلسبیل ۱ بحرِ سخن رواں ہو مرا مثل رود نیل
بندش کے وقت ہوں مرے مشکلکشا کفیل مضمون پست اور نہ الفاظ ہوں ثقیل

نازک خیالیوں میں بلاغت کھپاؤں میں
بحرِ زباں میں بحرِ فصاحت بہاؤں میں

قدسی پکارتے ہیں مقامِ درود ہے ۱۱ سلطان کائنات کا ہوتا ورود ہے
خود جلوہ ریزِ قدرت حق کی نمود ہے دنیائے بے نمود کی یہ اصل و بود ہے

ارض و سما سے نعرۂ صلِّ علیٰ ہے آج
میلاد پاک خواجۂ ہر دوسرا ہے آج

تقریب ہے حبیب خدا کے ظہور کی ۱۳ یہ بزم نور کی، یہ حکایت ہے نور کی

رحمت ہے نور پاش خدائے غفور کی ہر دل میں ہے امنگ نشاط و سرور کی
طوبیٰ نہال ، عرش عُلا شاد شاد ہے
وہ ذکر خیر ہے کہ خدا شاد شاد ہے

ساقی نامہ؛ مرثیہ کا ستائیسواں بند

ساقی پلا دے جام شراب طہور کا آیا زمانہ عشرت و عیش و سرور کا
پہنچا ہے وقت نور خدا کے ظہور کا مژدہ ہے میکشوں کے لئے وصل حور کا
وہ مے پلا کہ جو نہ کسی پر حرام ہو
زہاد خشک مغز کی حرمت حرام ہو

مصائب کا انداز؛

ہے راویوں نے حال غم اندوز یوں لکھا کھینچا ہے اک مرقع میدان کربلا
جب ہو چکے شہید سب انصار و اقربا تنہا رہا سپاہ میں دلبند مصطفیٰ
سٹر دو تن تھے خاک پہ بے جاں پڑے ہوئے
اور بیچ میں تھے شاہِ شہیداں کھڑے ہوئے

تھا نوحہ لب پہ ہائے مرے نوجواں پسر فرماتے تھے کبھی علی اصغر چلے کدھر
نوبت بہ نوبت آتے تھے اک اک کی لاش پر بھائی کی لاش پر گئے پکڑے ہوئے جگر
کہتے تھے بھائی جان کمر توڑ کر چلے
عباس تم بھی بھائی سے منہ موڑ کر چلے

مونس ہمارا کون ہے غمخوار کون ہے اسوقت بیکسی میں مدد گار کون ہے
سید کا اب سوائے خدا یار کون ہے ناموس مصطفیٰ کا نگہدار کون ہے
ہیں داغ کیسے کیسے دل چاک چاک پر
افسوس کیسے چاند ملائے ہیں خاک پر

امام مظلوم کی یہ گریہ وزاری رنگ قدیم کی طرز فغاں ہے اس لیے میر انیسؔ ہوں یا مرزا دبیرؔ، ظہیرؔ دہلوی ہوں یا عشقؔ و تعشقؔ جوت سے جوت جگانی پڑتی ہے۔ آواز میں آواز ملانی پڑتی ہے۔ جہاں تک ظہیرؔ دہلوی کی مرثیہ نگاری کا تعلق ہے وہ لکھنؤ میں مرثیہ نگاری کی آب و تاب کے مقابل

دہلی کے دبستان مرثیہ گوئی کی آبرو تھے۔اقبال حسین کاظمی نے اوراق کربلا شائع کر کے نہ صرف ظہیر دہلوی کی مرثیہ گوئی بلکہ اُن کی ہمہ جہت شاعری اور، نثر نگاری پر تحقیق کے دروازے کھول دئے ہیں۔اب اس نغمہ سنجِ غمِ کربلا شاعر ظہیر دہلوی کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ "اب اس کے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے"۔

☆☆☆☆☆

ابوالحسن فرقتی :-

ولادت ،۱۸۲۰ء، وفات ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۱ء۔

نام سیّد ابوالحسن، تخلص فرقتی، وطن امروہہ سادات۔صاحبِ دیوان شاعر، "ضیاء الصنائع" عقیق جگری (دیوان)، "ضیاء البدائع" تصانیف ہیں۔تقریباً تمام اصناف سخن میں شاعری کی۔ غزل، قصیدہ، سلام، قطعہ، رباعی، اُنکے دیوان "عقیق جگری" میں سب کچھ موجود ہے۔لیکن محبت محمد وآلِ محمد فرقتی کا کل اثاثہ تھی ؎

اگرچہ ہند میں ہیں فرقتی ہر ہر گھڑی دل سے
تصوّر میں طوافِ روضۂ شبیر کرتے ہیں

کیا تم کو ڈر ہے فرقتی کنجِ مزار میں
سر کو ہٹاؤ حیدرؑ کرار آئے ہیں

اے فرقتی سوچو تو بھلا ہند میں کیا ہے
تدبیر کرو جلد مدینے کے سفر کی

لحہ لحہ مدینہ و کربلا کے خواب دیکھنے والے با کمال شاعر نے کیسے کیسے مرثیے نہیں کہے ہوں گے مگر اللہ رے بے ثباتی عالم کہ آج فرقتی جیسے شاعر کے مراثی دستیاب نہیں ہیں۔خدا بھلا کرے ڈاکٹر عظیم امروہوی کا کہ اُنہوں نے "مشتِ از خروارے" کا سامان فراہم کیا اور فرقتی کے ایک مرثیہ کی نشاندہی کی ہے ؎ اے آفتابِ برجِ شرافت طلوع کر

اس مرثیے پر تاریخ تحریر ۸ ربیع الثانی ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۷ء درج ہے۔مرثیے کے ۲۰۱ بند ہیں۔سرورق پر "مرثیہ مشتمل بر احوال امام ہشتم حضرت امام علی رضا علیہ السلام درج ہے اور شاعر کا نام یکتائے زماں، مسیحائے سخن، میر سیّد ابوالحسن فرقتی رئیس امروہہ لکھا ہے۔جس سے

پتہ چلتا ہے کہ فرقتی اپنے عہد میں یکتائے زماں اور مسیحائے سخن کہلاتے تھے اور امروہہ کے رئیسوں میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔

فرقتی کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے۔ اس فہرست میں ایسے نام بھی شامل ہیں جو مستند شعراء کہلانے جاتے ہیں جیسے سید حسن ضیاء، رضا حسین رضا، سعید حسن سعید، خورشید حسن خورشید، بنیاد علی بنیاد، سبط حسن رسا، شاکر حسین شاکر وغیرہم۔ آج بھی فرقتی کے جلائے ہوئے چراغوں سے چراغ جل رہے ہیں۔ شعر و ادب اور مرثیہ گوئی کا قافلہ آگے بڑھ رہا ہے مگر افسوس کہ فرقتی کے مراثی دستیاب نہیں ہیں۔ ہمارے اس تذکرے میں فرقتی سے پہلے اُن کے فرزند سید حسن ضیاء کا ذکر آیا ہے اور اُن کے مرثیے کے بند بھی نقل کئے ہیں۔ فرزند کے ذکر کے بعد باپ کا تذکرہ دیکھ کر ذہن چونکتا ہے۔ اس کی وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ ہم اس سلسلے کو (مرحوم شعراء کرام کی حد تک) سنہ وفات کے حوالے سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ فرقتی کی وفات ۱۹۱۱ء ہے جبکہ حسن ضیا کی وفات ۱۹۰۸ء میں ہوئی۔ باپ کی موجودگی میں جوان بیٹے کی وفات۔ فرقتی کے لئے کیسا المیہ تھا؟

☆☆☆☆☆

برجیس امروہوی:-

ولادت ۱۸۷۷ء۔ وفات ۱۹۱۲ء

نام سید برجیس حسین۔ تخلص برجیس۔ وطن امروہہ۔ نقوی سادات گھرانا۔ حیدر حسین یکتا امروہوی کے پوتے، فرزدقِ ہند جواد حسین شمیم امروہوی کے فرزند۔ نسیم امروہوی کے والد۔ ۳۵ برس کی عمر میں اس دارِ فانی سے عالم جاودانی کو سدھار گئے اور خانوادۂ یکتا کی مرثیہ نگاری کی تاریخ میں باب برجیس کا اضافہ کر گئے۔ برجیس اپنے والد گرامی شمیم امروہوی کی زندگی میں انتقال کر گئے تھے۔ بوڑھے باپ نے جوان بیٹے کی موت کو دیکھا اور پکار اُٹھا۔

بس شمیم اب نہ قلم کو نہ جگر کو یارا میں بھی مضطر دل بیتاب بھی پارہ پارا
فلکِ پیر نے کیا تیر جگر پر مارا ظلمتِ قبر کی سیر اور میرا سیارا
اوج پر آکے ہی وہ آنکھوں کا تارا ڈوبا
جس کا برجیس لقب تھا وہ ستارا ڈوبا

قدیم مرثیے میں رجز، تلوار، گھوڑا، اور جنگ ایسے عناصر ہیں جن پر سارے اساتذہ

شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔ ذرا غور کیجئے تو یہ چاروں عناصر اک مرحلے کی وضاحتیں ہیں یعنی جنگ کے ذیلی اذکار میں شمار ہوتے ہیں۔ جنگ شروع ہونے سے قبل رجز، یعنی متحارب فریقین کا تعارف، جنگ کے بیان میں گھوڑا اور تلوار ناگزیر اس لئے کہ اس دور میں جنگ کے عناصر میں گھوڑے اور تلوار کو مرکزیت حاصل تھی۔ برجیسؔ نے بھی مرثیے کے اس پہلو سے انصاف کیا ہے اور یکتاؔ اور شمیمؔ کی طرح ان مناظر کو نظم کرنے میں کمال دکھایا ہے۔

مشک بھر کر جو چلا نہر سے شیدائے امام پھر پئے جنگ فراہم ہوا سب لشکر شام
پھر وغا کرنے لگا فدیۂ سلطانِ انام پھر چمکنے لگی بجلی کی طرح رن میں حسام
پھر سر نحس لعینوں کے جدا ہونے لگے
پھر شقی تیغ شرر دم سے فنا ہونے لگے

کہیں جلاّد طپاں، اور کہیں بسمل قاتل کہیں خونخوار جو بیدم، کہیں گھائل قاتل
ہر طرف غُل، اِدھر آ پیار کے قابل قاتل کہیں ہے ہے، کہیں اُف اُف، کہیں قاتل قاتل
شور تھا دل تیری فرقت میں جلے ملتی جا
ہم بھی مرتے ہیں ذرا پھر سے گلے ملتی جا

دفعتاً دھک سے جگر ہوگئے، افسر کانپے سب ترائی کے جواں خوف سے تھر تھر کانپے
طیر گو مائل پرواز ہوئے، پَر کانپے ہمہ بن کے کچھاروں میں غضنفر کانپے
غُل اُٹھا، ضیغم ضرغامِ صمد گونجتا ہے
دشت میں شیر الٰہی کا اسد گونجتا ہے

شیر چلاّیا کہ او فوج کے سردار، نہ بھاگ ہر طرف شور ہے، مالک کے نمکخوار، نہ بھاگ
حاکم شام سے خونخوار کی تلوار نہ بھاگ اب میرا وقت قریب آگیا فرار نہ بھاگ
شیر کا خون تو پانی پہ بہالے تھم جا
مشک تو چھین لے او بھاگنے والے تھم جا

جنگ کی منظر نگاری میں مکالماتی انداز کارِ دشوار ہے جسے برجیسؔ خوبی سے نبھاتے ہیں۔ تلوار کی تعریف میں بھی برجیسؔ کی قادرالکلامی نظر آتی ہے۔

وہ نازکی، وہ ادائیں، وہ بانکپن اس کا وہ شوخیاں، وہ شرارت بھرا چلن اس کا

وہ سرخ رنگ، وہ نکھرا ہوا بدن اس کا نظر جھکائے جو منہ دیکھ لے دلہن اس کا
عجیب حُسنِ حَسن کبریا نے بخشا ہے
علی نے خود اسے اپنی بغل میں رکھا ہے

کبھی کسی کے بدن میں سمائی جاں کی طرح کسی کے منہ سے وہ نکلی کبھی فغاں کی طرح
اُبھر کے چلتی تھی معشوقِ نوجواں کی طرح وہ شوخ رنگ، وہ پتلی کمر، وہ بانکی طرح
دلہن تھی یا کوئی معشوق لاجواب تھی وہ
مزا تو یہ ہے کہ گھونگٹ میں بے حجاب تھی وہ

وفاشعار بھی ہے اور باوقار بھی ہے خدا کی شان کہ طاؤس بھی ہے مار بھی ہے
یہ شعلہ بار بھی ہے، تیغ آبدار بھی ہے گلے میں ہار بھی ہے اور گلے کا ہار بھی ہے
زمیں پہ پاؤں نہیں رکھتی اور چلتی ہے
شجر نہیں ہے مگر کھیت میں ہی پھلتی ہے

قطعات، رباعیات، سوز، سلام اور نوحوں کے علاوہ برجیس کے کم وبیش پندرہ مرثیوں کا سراغ ملتا ہے۔ ''مرثیہ نگاران امروہہ'' میں ان کے دس مراثی کے حوالے دئے گئے ہیں اور ۲۵ سلام امروہہ کے مختلف بستوں سے حاصل کئے ہیں — برجیس کو مرثیہ گوئی ورثے میں بھی ملی اور اُن پر (بقول اُن کے) رحمت معبود بھی ہے جس کا اقرار اُنہوں نے اپنے ایک سلام میں کیا ہے۔

نامِ احمدؐ لے کے مانگا گرچہ کوئی مدعا رحمتِ معبود نے فوراً کہا مل جائے گا
حشر میں برجیس ذاکر کی یہی ہوگی شناخت نامۂ اعمال کی جا مرثیہ مل جائے گا

برجیس کل ۳۵ برس زندہ رہے۔ اس تھوڑی سی عمر میں اُن کا جو کلام میسّر ہے وہ اس صداقت پر دلالت کرتا ہے کہ برجیس اور زندہ رہتے تو مرثیہ گوئی کے افق پر اور روشنی پھیلتی، اور اُجالا ہوتا۔ ہر چند کے ان کے فرزند نسیم امروہوی نے مرثیے کی راہوں میں قطار اندر قطار چراغ روشن کردئے مگر برجیس بہرحال برجیس تھے۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

☆☆☆☆☆

شمیم امروہوی:-

ولادت (خمخانۂ جاوید کے حوالے سے) ۱۸۴۹ء، حضرت نسیم امروہوی کے حوالے سے ۱۸۳۹ء۔ وفات ۱۹۱۳ء

نام سیّد جواد حسینؑ، تخلص شمیم ۔ وطن امروہہ۔ حیدر حسین یکتا امروہوی کے فرزند۔ برجیس کے والد۔ نسیم امروہوی کے دادا۔

فرزدقِ ہند سیّد جواد حسین شمیم امروہوی حضرتِ داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ میر نفیس، مرزا اوج، شاد عظیم آبادی، صفی امروہوی اور فریقی کے ہم عصر تھے۔ ان چاند سورجوں کی موجودگی میں فرزدقِ ہند کا لقب شاعر کے رتبۂ شعر و سخن کی واضح دلیل ہے۔ سنہ وفات مسلمہ طور پر ۱۹۱۳ء ہے۔ بیسویں صدی کا یہ سال یعنی ۱۹۱۳ء نہ بھولنے والا سال ہے۔ اس سال ''حیات دبیر'' (ثاقب لکھنوی) طلوع ہوئی اور امروہہ سے طلوع ہونے والا سورج شمیم غروب ہوا۔

گہوارہ علم و ادب، شان اودھ شہر لکھنؤ سے ذرا ہٹ کر امروہہ کی بستی ہے جس کے افق پر کئی چاند سورج طلوع ہوئے۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ مشرق سے نکلنے والا ہر سورج سرزمین امروہہ سے طلوع ہوتا ہے۔ اس مردم خیبر سرزمین کے سپوت شمیم امروہوی ہیں جن کے مراثی کسی بھی دبستان مرثیہ کی شاعری کے مقابل رکھے جاسکتے ہیں۔ تاریخ کربلا کے علاوہ ولادتِ رسولؐ، معراجِ رسولِ اکرمؐ، حضرت علی شیر خدا کی جنگیں، سیرتِ سیّدہ فاطمہ زہراؑ، صلحِ حسنؑ اور دیگر اہم موضوعات پر اُنہوں نے مرثیے کہے ہیں۔ اُن کے کچھ قلمی مرثیے لیاقت میوزیم کراچی یں بھی محفوظ ہیں اور اُن کے پوتے حضرت نسیم امروہوی کی لائبریری میں بھی اُن کا کلام محفوظ ہے۔

شمیم امروہوی نے اپنی عمر کا زیادہ حصّہ امروہہ اور رام پور میں گذارا لیکن حیدر آباد دکن اور لکھنؤ سے بھی اُن کا رشتہ برقرار رہا۔ اُن کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے۔ اُن میں سے کچھ نمایاں نام ہز ہائی نس نواب حامد علی خان والی رامپور، برجیس امروہوی، فیض محمد فیض سارجنٹ میجر اودھے پور، قمر رام پوری، کلیم امروہوی، سعید حسن فضا، سراج الحق سراج، فدا احسن پوری، ناظر حسین ناظر، مرزا عظیم بیگ چغتائی، علی متحسن سکتہ، ناصر حسین یتیم، ڈاکٹر بانکے لال، بھوگن سرن شبنم، شیو گر سہائے ورما نسیم، حیدر بخش حیدر، نواب باقر علی خان فہیم (جانسٹھ والے) وغیرہ ہم شامل ہیں۔

شمیم امروہوی کے مراثی کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ عظیم امروہوی نے یہ تعداد ۲۵۰ مراثی سے بھی زیادہ بتائی ہے۔ اُن کے بعض نامکمل مرثیے اُن کے پوتے حضرت نسیم امروہوی نے مکمل کیئے۔ عظیم امروہوی نے ۱۰۰ سے زیادہ مرثیے امروہہ سے جمع کیئے ہیں۔ اُن کے مرثیوں پر گمان کیا گیا کہ وہ میر انیس کے مرثیے تھے۔ یار لوگوں نے اس کی تصدیق بھی کی اور جب خانوادۂ انیس نے انہیں شمیم امروہوی کے مرثیے کہا تو شمیم امروہوی کی عظمت کے سامنے سرخم ہو گئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ناقدین کی نظر میں شمیم امروہوی کا تعلق دبیر سکول سے تھا مگر اُن کی زبان اور اُن کی تراکیب اور لفظوں کو برتنے کا ہنر انیس سے قریب تھا۔ ایک طرف وہ کہتے نظر آتے ہیں ؎

خالق نے عجب خانۂ پُر ضو مجھے بخشا خورشید بھی جویا ہے وہ پرتو مجھے بخشا
مصرعٔ کوئی چاہا تو مہِ نو مجھے بخشا لو خشیٔ گردوں کا قلمرو مجھے بخشا
غل ہے کہ شمیمِ سخن آرا ہوا پیدا
ہمتائے دبیر اور ستارا ہوا پیدا

اور دوسری طرف بارگاہِ احدیت میں سر بسجود، حرف ولفظ کی حرمت کے سوالی نظر آتے ہیں۔

یارب میرے شعروں کی زمیں چرخ بریں ہو ہر شاہدِ معنی مہ کنعاں سے حسین ہو
نقطہ بھی تیرے مہر سے خورشید مبیں ہو ہر نقشِ سلیمانِ سخن زیرِ نگیں ہو
یہ نظم کی خوبی کہ قرینہ نظر آئے
ہر لفظ انگوٹھی پہ نگینہ نظر آئے

اور پھر یوں لگتا ہے جیسے اُن کی دعا قبول ہو گئی ہو۔ ان کی مدح گوئی شرف قبولیت پا گئی ہو، اس لئے کہ وہ کہتے نظر آتے ہیں ؎

جبریلِ امیں بلبلِ گلزارِ سخن ہیں عیسیٰ جو مسیحا ہیں وہ بیمارِ سخن ہیں
الفاظِ حسیں، یوسفِ بازارِ سخن ہیں اللہ و پیمبر بھی خریدارِ سخن ہیں
یہ جنس وہ ہے جس کو ہر اک شاہ خریدے
کیوں مجھ کو نہ سودا ہو جو اللہ خریدے

ایماں کی ضیاء، دین کی زینت یہ سخن ہے گلزارِ ولا، باغِ ولایت یہ سخن ہے
جنت کی جو قیمت ہے وہ دولت یہ سخن ہے حیدر کے فقیروں کی کرامت یہ سخن ہے

اس مدح کی تاثیر سے میں سیف زباں ہوں
گو بندۂ عاجز ہوں پہ اعجاز بیاں ہوں

مرثیہ گوئی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس سے فرزدق ہند شمیمؔ امروہوی نے انصاف نہ کیا ہو۔ اُن کا زورِ بیان ہر جگہ معجز نما نظر آتا ہے۔ مصور برش سے تصویریں بناتے ہیں شمیمؔ امروہوی نوکِ قلم سے یہ کام کرتے ہیں۔ زورِ بیان کی سند کے طور پر ایک بیت دیکھئے

قدرت یہ دی ہے حق نے شہ انس و جان کو
میں یا علیؑ کہوں تو اُلٹ دوں جہان کو

شمیمؔ امروہوی کا ذکر کم از کم ایک کتاب کا متقضی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ بجا ہوگا کہ ان کی ہمہ جہت شاعری کی ہر جہت پر ایک کتاب لکھی جائے تو شاید حق ادا ہو سکے۔

☆☆☆☆☆

مضطرؔ جعفری :- (امروہہ)

ولادت ۱۸۴۹ء۔ وفات ۱۹۱۴ء۔

نام خلیفہ سید آلِ نبی۔ تخلص مضطرؔ۔ جعفری سید۔ وطن امروہہ۔ مشرقی تہذیب وادب نے اُستاد کو باپ کا درجہ دیا ہے اس اعتبار سے مضطرؔ جعفری، حضرت شمیمؔ امروہوی کے شاگرد ہونے کی حیثیت میں اُن کے فرزندِ معنوی ہوئے اور اس سلسلۂ تلمذ سے مضطرؔ جعفری اس حد تک فیض یاب ہوئے کہ نہ صرف وہ خود بلکہ آنے والی نسل میں اُن کے یعنی مضطرؔ جعفری کے شاگرد رام سروپ بسملؔ امروہوی ایک مستند شاعر ہوئے ہیں۔ عمدہ شاعری کے علاوہ مضطرؔ عمدہ خوشنویسی بھی کرتے تھے۔ مضطرؔ کی اپنی اولاد میں اُن کے ایک فرزند غلام نبی اوجؔ شاعر تھے جو اپنے بھائیوں کے ہمراہ پاکستان ہجرت کر گئے۔ اس ہجرت نے مضطرؔ کے ادبی اثاثے کو منتشر کر دیا اور اُن کے مراثی ضائع ہو گئے۔ یہ بیان اُن لوگوں کے لئے ناکافی ہے جو یہ سوچتے ہیں کہ ''علم پدر کو اپنانے والا بیٹا'' ''میراث پدر'' کی حفاظت کیوں نہیں کر سکا اس لئے کہ جو لوگ مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے پاکستان گئے تھے اُن کا مسئلہ تو یہ تھا کہ وہ ساز وسامان ہمراہ نہ لے جا سکے لیکن جو لوگ امروہہ یا ہندوستان کے دوسرے حصوں سے ہجرت کر کے گئے تھے وہ تو سوچ سمجھ کر اثاثہ ساتھ لے کر گھروں سے نکلے تھے۔

مضطؔر کے ایک مرثیے کے چند بند درج ذیل ہیں جو مضطؔر جعفری کی مرثیہ نگاری کے نمائندہ بند بھی کہے جاسکتے ہیں۔ یہ بند، فرزند حسینؑ شہزادہ علی اکبر کے احوال کے ایک مرثیہ سے لئے گئے ہیں۔

یوں رقم ہوتا ہے اب اکبرِ دلگیر کا حال تھا جو ہم شکلِ نبی، حضرتِ شبیرؑ کا لال
مختوں والا پسر اور حسین نیک خصال عمر، آغاز جوانی میں تھا اٹھارواں سال
ظلم اس پر جو ہوئے کرب و بلا میں سنئے
قتل کس طرح ہوا فوجِ جفا میں سنئے

صبح عاشور ہوئی کرب وبلا میں جو عیاں باجے بجنے لگے فوجوں میں میانِ میداں
قتل سب ہو چکے انصارِ امامِ دو جہاں لے کے رخصت گئے میدان میں عباسؑ جواں
کٹ چکی ساری سپاہ جبکہ شہِ ذیشاں کی
علی اکبر کو اجازت ملی تب میداں کی

اذن جنگ مانگنے پہ رونے لگے، شاہ انام گر پڑے خاک پہ ہاتھوں سے جگر کو لیا تھام
گردِ شہ جمع ہوئیں بیبیاں آ آ کے تمام بانو سمجھی کہ چلا لڑنے کو میرا گلفام
اذن مرنے کا شبیہِ نبوی نے پایا
فرقتِ داغِ پسر حق کے ولی نے پایا

یہ جو ''اذن جنگ مانگنے پر رونے لگے شاہ انام'' والی بات ہے یہ شاعری کی بات ہے تاریخ کی نہیں اس لئے کہ تاریخ میں تو یہ بھی رقم ہے کہ اصحاب باوفا کی شہادت کے بعد امام حسینؑ نے فرزند سے کہا کہ '' بیٹا تقدم کرو'' اور اس حوالے سے خانوادۂ رسالت کے پہلے شہید علی اکبر تھے۔ ننھے علی اصغر سے لے کر اسی برس کے حبیب ابن مظاہر تک ،۷۱ افراد کے دلوں میں شہادت کی روح پھونکنے والا اجری نہ رویا۔ نہ ہی ہاتھوں سے جگر تھام کر خاک پہ گرا مگر ہائے رے مرثیوں کے بین؟

☆☆☆☆☆

میر عارف:-

ولادت ۱۸۵۹ء۔وفات ۱۹۱۶ء۔

نام سید علی محمد، تخلص عارف، میر نفیس کے نواسے، سید محمد حیدر جلیس کے فرزند، متوسل

گھرانے کے چشم و چراغ۔ سلسلۂ نسب امام زین العابدین سے ملتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دو سال بعد یعنی ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ پیدائش بھی میر انیسؔ کے گھر ہوئی اور پلے بڑھے بھی وہیں —— خانوادۂ انیسؔ کی تربیت، میر انیسؔ جیسے اُستاد کی رہنمائی اور شفقت میسّر ہو تو جوہر شاعری کیسے نہ نکھرے لہٰذا وقار انیس و نفیسؔ کے محافظ میر عارفؔ بھی پختہ گو صاحب قدرت مرثیہ گو کہلائے۔ ۱۶ مرثیوں کا مجموعہ جسے ڈاکٹر صفدر حسینؔ نے لاہور سے شائع کیا تھا اُسے میر عارفؔ کے اپنے فرزند یوسف حسین شائقؔ نے ترتیب دیا تھا۔ میر عارفؔ نے قادر الکلامی کے جوہر دکھائے اور مرثیے میں بحور کے تجربے کیے۔

میر عارفؔ نے بحرِ مجتث میں مرثیے کہے اور یہ بحر مقبول ہوئی۔ بعد ازاں مہاراجہ محمود آباد اور راجہ صاحب محمود آباد نے اس بحر میں مرثیے کہے۔ پانی کے زیرِ عنوان اُن کا مرثیہ اسی بحر میں ہے۔ امیر امام حرؔ اس بحر میں مرثیے لکھ رہے ہیں۔

میر عارفؔ نے مختلف اصنافِ سخن میں شعر کہے ہیں اور ہر میدان میں خود کو منوایا ہے اُن کی غزل کا انداز کلاسیکی غزل کا انداز ہے ؎

وہ شمع رو نہیں گر تو کچھ انجمن میں نہیں — وہ گلعذار نہیں گر تو کچھ چمن میں نہیں
تیری نگاہ سے میں گر کے خود سنبھل جاؤں — ہزار حیف کہ اتنا بھی زور تن میں نہیں

میر عارف کی غزل کا ایک شعر آج بھی اہلِ ذوق کو یاد ہے۔ بہت سے لوگ اس شعر کو میر انیسؔ کا شعر کہتے ہیں۔ لیکن یہ بات مستند ہے کہ یہ میر عارفؔ کا شعر ہے ؎

وہ جلد آئیں گے یا دیر میں، خدا جانے
میں گل بچھاؤں، کہ کلیاں بچھاؤں بستر پر

ان کے ایک مشہور سلام کے دو اشعار ہیں ؎

جہاں ذکرِ شاہ زماں ہوگیا — بہشت بریں وہ مکاں ہوگیا
بہت نظم کے پھول کم رہ گئے — اسی سے یہ سودا گراں ہوگیا

حضرت عباسِ نامدار کے حال پر اُن کا مرثیہ مقبول مراثی میں سے ہے۔ جس کے ۱۲۲ بند ہیں ؎

گردوں ہے سفینہ میرے دریائے سخن کا — سیاح ہوں مدت سے میں صحرائے سخن کا

پروانہ ہے دل شمع تجلائے سخن کا مشتاق ہوں پھر دید سراپائے سخن کا
اس بدر سے حُسنِ رُخِ مہتاب خجل ہے
اس بحر کا موجہ میری بینائی دل ہے

اللہ ری اس بحر کی تندی و روانی اونچا سر اعدا سے ہوا جاتا ہے پانی
گہ قہر کی ہے اور کبھی رحمت کی نشانی حال اس کا سنا چاہیے موجوں کی زبانی
پار اس سے سلامت کبھی اُترا نہیں کوئی
ڈوبا ہوا اس بحر کا اُبھرا نہیں کوئی

میر عارفؔ کی شاعری کی ابتدا بھی غزل گوئی سے ہوئی۔ اور بہت جلد وہ وقت آگیا کہ وہ مشاعروں کی جان بن گئے —— غزل گوئی عشق مجازی کی پہلی سیڑھی ہے۔ الفاظ پہ قدرت ہو، فکر و خیال میں ندرت ہو تو غزل مجاز کی منزلوں پر لب کشائی کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ انسان کائناتِ مجاز کو سمجھ لے تو غزل محبوب کی مدح کے ابر برسا کر تلذذ کی تشنگی دور کرتی ہے یا ہجر کی آگ میں جلتے دلوں پر زیادہ سے زیادہ ابرِ نیسانِ کرم بن کر برستی ہے لیکن اگر شاعر منزلِ مجاز سے گذر کر منزل حقیقت کی راہوں پر چل نکلے تو شاعر انیسؔ بن جاتا ہے، دبیر بن جاتا ہے، جوشؔ کہلاتا ہے۔ عشق حقیقی کی راہ میں محبوب فانی نہیں ہوتا۔ اس کی صفات بدلتی نہیں ہیں اس لئے شاعر کو لافانی محبوب کی مدح سے جو لذت ملتی ہے وہ اُسے واپس لوٹنے نہیں دیتی بلکہ آگے اور آگے بڑھاتی ہے۔

میر عارفؔ بھی غزل سے منقبت، سلام اور مرثیے کی طرف آئے تو مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا۔ اُنہیں غزل کی راہیں تاریک نظر آئیں۔ رثائی ادب کی راہوں کو کربلا والوں کا لہو روشن کر رہا تھا۔ یہ روشنی اُنہیں دربارِ رسولؐ اور درِ بتولؑ تک لے گئی۔ میر عارفؔ کو اس فن کی عظمت کا شعور اور اس جادۂ اطاعتِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کی برتری کا ادراک رہا۔

اس فن کی ہمیشہ سے مسلّم ہے شرافت کونین میں انساں کا ہے سرمایۂ عزت
کرتے ہیں آئمہ بھی ثنا خانوں کی حرمت دیتے ہیں صلے میں اُنہیں جنت کی بشارت
رتبے ہیں جو اس فن کے نگاہوں پہ چڑھے ہیں
معصوموں نے خود شعر کہے اور پڑھے ہیں

میر عارفؔ کے معاصرین میں پیارے صاحب رشیدؔ، مرزا اوجؔ، صفیؔ لکھنوی، عزیزؔ لکھنوی،

ثاقب لکھنوی، آرزو لکھنوی جیسی ہستیوں سے اُن کے تعلقات تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شبلی نعمانی جن دنوں ''موازنۂ انیس و دبیر'' لکھ رہے تھے میر عارف کے دردولت پر آئے اور مشورہ کیا۔ آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ اختر نے میر عارف کو اپنا ایک مرثیہ پیش کیا اور میر انیس کی وفات پر تعزیت کی۔ راجہ صاحب محمود آباد سر علی محمد خان ۱۹۱۰ء میں میر عارف کے شاگرد ہوئے۔ راجہ صاحب نے اس تلمذ پر فخر بھی کیا ہے ؎

اے قلم معرکۂ حیدرِ ثانی دِکھلا اے بیاں بحرِ فصاحت کی روانی دِکھلا
اے زباں زورِ طبیعت کی جوانی دِکھلا اے خرد جلوۂ اعجاز بیانی دِکھلا
نظم میں عارف مرحوم کا آہنگ ہے یہ
کہدیں حاسد بھی واللہ نیا رنگ ہے یہ

☆☆☆☆☆

پیارے صاحب رشید:-

ولادت ۱۸۴۶ء۔ وفات ۱۹۱۷ء

میر انیس کے نواسے تھے۔ والد کی طرف سے خاندانِ میر عشق سے تعلق تھا۔ میر عشق و تعشق کی شاگردی کا شرف ملا لہٰذا مرثیوں پر میر انیس کا اثر نہیں ہے عشق و تعشق کا رنگ گہرا ہے اور مرثیوں میں تغزل کی چاشنی نمایاں ہے ــــ نفسیاتی گوشے بڑی باریکی کے ساتھ مرثیوں میں اس طرح در آتے ہیں جس طرح غزل میں فکر کی مختلف جہتیں سما جاتی ہیں۔ میر عشق کا مرثیہ جو زعفر جن پر ہے نفسیات سے بھرپور مرثیہ ہے ؎

مجھ کو عروج اے میرے پروردگار دے

پیارے صاحب رشید کے مرثیوں میں اس مرثیے کی جگہ جگہ گونج سنائی دیتی ہے۔ ''ساقی نامہ'' بھی ان کے مرثیوں میں بہت نمایاں ہے۔ بہار کے بیان پر کہیں کہیں تو پچیس پچیس تیس تیس بند نظر آتے ہیں ــــ ساقی نامے کا مرکزی موضوع غدیر ہے۔ اور مرثیے میں ساقی نامہ علی علی ہے۔ ان سے پہلے حسین حسین تھا۔ جس دور میں حضرتِ محدث دہلوی کی مشہور کتاب ''تحفۂ اثنا عشریہ'' شائع ہوئی وہ پیارے صاحب رشید کی جوانی کا زمانہ تھا۔ مرزا رسوا نے اس کتاب کا جواب تیرہ جلدوں میں دیا۔ گویا غالب سے رسوا تک ساری بحث کا موضوع غدیر ہے۔

پیارے صاحب رشید نے بھی ساقی نامے کے مصرعوں سے بات اُٹھائی ہے — ان کا سن ولادت ۱۸۴۶ء ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی (جسے غدر کہا گیا) کے دوران پیارے صاحب رشید سوچنے سمجھنے کی عمر میں داخل ہو چکے تھے۔ اس جدو جہد یا جنگ میں انگریزوں کی کامیابی اور آزادی کے لئے بیدار ہونے والوں کی شکست کے بعد خواب بکھر گئے تھے اور انگریزوں کا ردِعمل شروع ہو چکا تھا۔ جن گھرانوں میں علم کی روشنی تھی وہ بہر حال دروازوں کھڑکیوں سے چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ چھن چھن کر آنے والی ان کرنوں سے راہوں میں اُجالا کرنے والے بیدار ذہن کہیں غزل کے آہنگ پر اور کہیں مرثیے میں بین کی آہ و بکا پر بات اُٹھا رہے تھے۔ پیارے صاحب رشید کی بیدار مغزی تھی کہ غزل کی لفظیات پھول، پودے، ساون، گھٹا، بجلی، بادل کو مرثیے میں داخل کیا جس سے مرثیے میں رثا کی اشک ریزی کے ساتھ علامتوں کے ذریعے غزل کی اُمید افزا فضا رچ بس گئی اور ساقی ''یا علی مدد'' کا استعارہ بن گیا۔ یہ استعارہ محبت کا استعارا بھی تھا اور بے بسی کے دور میں شجاعت اور کامرانی کا پیغام بھی تھا جو یاس کے اندھیروں میں اُمید کے اُجالے بکھیر رہا تھا۔

سیافِ طبع جوہرِ تیغِ سخن دکھا　　حاسد کٹیں وہ تیغ دکھا اور وہ رن دکھا
ذہن رسا سپاہ گری کا چلن دکھا　　فکرِ بلند آج لڑائی کا فن دکھا
ہے ذکر شیر بیشۂ دشتِ قتال کا
یہ مرثیہ ہے حیدرِ والا کے حال کا

ہاں اے زباں، بیان بزرگوں کا چھٹ نہ جائے　　ہاں اے قلم نہ میری فصاحت میں فرق آئے
اس طرح چل صبا نہ تیری شاطری کو پائے　　نکتہ ہر ایک مرثیہ مضمون کا بڑھائے
وہ چال چل، نہ صفحہ پہ گر کر سنبھل سکے
ایسا نہ ہو کہ ساتھ سیاہی نہ چل سکے

عالم کا دادرس میری آکر مدد کرے　　بیکس ہوں زورِ دستِ پیمبر مدد کرے
ہے وصفِ جنگ قاتلِ عنتر مدد کرے　　بڑھ جائے نشہ ساقیٔ کوثر مدد کرے
چھلکا دے خوب ساغرِ دل اس فقیر کا
ساقی کدھر ہے بادۂ خم غدیر کا

حلّالِ مشکلات ہیں مشکل کشا علی　　شاہِ نجف، امیرِ عرب، مرتضیٰ علی

زوجِ بتول، نائب خیرالورا علیؑ مالک ہیں سب کے بعدِ رسولِ خدا علیؑ
طفلی سے وجہِ حرمتِ بیت الحرام ہیں
یکتا نہ کس طرح ہوں کہ پہلے امام ہیں
وہ لب ہیں جن کا عیسیٰ مریم بھی دم بھرے ہے وہ زبان حکم سے جو گفتگو کرے
لاکھوں لڑائیوں میں اکیلے قدم دھرے جرأت یہ ہے، کسی سے جہاں میں نہیں ڈرے
منہ خوفِ دار و گیر سے مُڑتا نہیں کبھی
پختہ یہ رنگ سرخ ہے، اُڑتا نہیں کبھی
اب قصد ہے کہ رفعتِ حیدرؑ بیاں کروں کچھ حالِ جنگِ قاتلِ عنتر بیاں کروں
سنئے تو ایک قصۂ برتر بیاں کروں یعنی کہ فتحِ قلعۂ خیبر بیاں کروں
پیدا ہو ذوالفقار کی تیزی بیان میں
تکبیرِ مرتضیٰ کی صدا آئے کان میں

پیارے صاحب رشید نے اپنے عہد کے مرثیے کے لوازم کو باقی رکھا ہے لیکن آہنگ اُن کا وہی ہے، مثلاً گھوڑے کی تعریف کا انداز ؎

اس رخش کو عباسؑ سا اسوار سنبھالے دوڑے جو صبا ساتھ پڑیں پاؤں میں چھالے
زنغے میں جہاں پہلوؤں سے مل گئے بھالے رہوار نے گویا پَر پرواز نکالے
سب شامیوں سے بڑھ کے طرارا نکل آیا
شب ختم ہوئی صبح کا تارا نکل آیا

تلوار کی تعریف کے تیور بھی تخیل آفرینی کا اعلیٰ معیار ہیں ؎

یہ چلی جس پہ وہ جینے کی قسم کھانے لگے ابر وہ جس سے قضا ابر صفت چھانے لگے
آب ایسی ہے کہ ہر بحر میں موج آنے لگے چمک ایسی ہے کہ دل برق کا تھرانے لگے
کب کسی دل میں دمِ جلوہ گری تھمتی ہے
کہیں شیشے میں اُتر کر یہ پری پھرتی ہے

☆☆☆☆☆

مرزا اوج لکھنوی:-

ولادت ۱۸۵۳ء۔ وفات ۱۹۱۷ء

مرزا دبیرؔ کے فرزند ارجمند مرزا اوجؔ نے مرثیہ میں اصلاحات کی طرف پیش قدمی کی۔ وہ پہلے شاعر تھے جنہوں نے مرثیہ کا رُخ موڑنے کی کوشش کی اور ضعیف روایتوں کو مرثیے سے نکال کر فکری مضامین مرثیہ میں داخل کرنے کی سعی کی۔ اُنہوں نے ایک مرثیہ کی تشبیب میں فلسفۂ الہیات پر بحث بھی کی گویا جدید مرثیہ کی طرف مرزا اوجؔ نے پہلا قدم اُٹھایا۔ مجتبیٰ حسین نے ''عظمت انسان'' میں، اور ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے اپنے تحقیقی مقالے 'دبستان دبیر' مراثیٔ اوجؔ کی اسی خصوصیت کو سراہا ہے۔ پروفیسر محمد رضا کاظمی بھی مذکورہ بالا آراء سے متفق ہیں۔ راقم الحروف نے ''مرثیہ نظم کی اصناف میں'' میں اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ:

> ''اس کے باوجود جدید مرثیے کے حوالے سے ان کا نام اس حد تک سامنے نہیں آیا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس کا ایک سبب تو شاید یہ ہو کہ اُنہوں نے اصلاح سے زیادہ تنقید بلکہ تنقیص کو اپنا شعار بنایا۔ کسی مروجہ فن میں تبدیلیاں یا جدّت لانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس عہد کے فنکاروں کو ہدفِ ملامت بنایا جائے۔ اس کے برعکس ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ جن تبدیلیوں کو روبکار لانا ہو ان کی افادیت پر زور دیا جائے اور ان تبدیلیوں کو عملی صورت میں پیش کیا جائے۔ دوسرا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس عہد میں مرزا اوجؔ مرثیے میں تبدیلیاں لانی چاہتے تھے اس دور میں دبستانِ انیسؔ و دبیرؔ کی باہمی چپقلش عروج پر تھی لہٰذا مرزا اوجؔ کی تنقید و تنقیص کو دبستانِ انیسؔ کے خلاف سمجھا گیا ہو اور یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ واقعی مرزا اوجؔ کا تخاطب دبستانِ انیسؔ ہی ہو''
>
> (مرثیہ نظم کی اصناف میں۔ سید عاشور کاظمی ص ۴۴)

ہمارے ہاں بڑی دشواری ہے کہ سوائے گنے چُنے صاحبانِ نقد و نظر کے، عام طور پر اگر کسی ادیب یا شاعر کی خامیاں گنوائی جاتی ہیں تو پورا زورِ تنقید اس شاعر یا ادیب کو مکمل طور پر ناکام ثابت کرنے پر صرف کیا جاتا ہے اور اُس کی تحریروں میں کوئی خوبی نہیں ملتی اور اگر کسی کے محاسن

گنوائے جاتے ہیں تو پھر اس شاعر کو میر و غالبؔ سے کم رتبہ نہیں ملتا۔ مرثیہ ہو تو ہر مرثیہ گو کو انیسؔ و دبیرؔ کا ہم پلہ ثابت کیا جاتا ہے جبکہ یہ ماننے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہئے کہ بشر کامل ہے نہ اُس کی تحریریں۔ بے عیب تو ایک ہی کتاب ہے جو بشر کی تصنیف نہیں ہے اور بے عیب اُس کتاب والے ہیں جو اُن کی تحریر نہیں مگر وہ اُس کے بہترین شارح ہیں۔

ناقدین کا یہ رویہ اس لئے بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے قارئین بھی اپنے محبوب فنکار پر صرف مثبت تحریر دیکھنا چاہتے ہیں اور جس کے متعلق ایک بار کسی وجہ سے منفی رائے قائم ہو جائے تو پھر اُس کی کسی تحریر میں خوبی ہو بھی تو وہ جاننا نہیں چاہتے۔ ہو سکتا ہے قلم کو متاعِ تجارت بنانے میں ایسے قارئین کی سرپرستی کا عمل دخل ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے ناقدین نے قارئین کی فکر اور سوچ کو اس نہج پر لانے میں شبخون مارے ہوں۔ وجہ کچھ بھی ہو تکلیف دہ امر یہ ہے کہ نقد و نظر ہی نہیں تخلیقات بھی بے آبرو ہو گئی ہیں اور حقیقی تنقید کرنے والے ناقدین بھی اس بات سے جائز طور پر کبیدہ خاطر نظر آتے ہیں کہ اُن کی دیانتدارانہ آراء بھی کہیں دُکانوں کے Show Cases میں نہ سجا دی جائیں۔

مرزا اوجؔ کے ساتھ جو انصاف نہیں ہوا اُس کی ایک وجہ تو اُن کا اپنا رویہ کہ ہم عصر تخلیق کاروں کو ساتھ لے کر چلنے کی بجائے اُنہیں اس طرح ڈانٹنا شروع کر دیا جیسے اُن کے عہد کے نابالغ بچے چٹائیوں پر بیٹھے ماسٹر جی کی تختیاں کھاتے تھے— (معاف کیجئے روانی میں ''تختیاں کھانا'' ذہن میں آ گیا سو لکھ دیا گیا۔ نصف صدی قبل کا محاورہ ہے شاید اہل فکر کو نہ پسند آئے)۔ مرزا اوجؔ کے ساتھ جو سلوک ہوا اُس کی دوسری وجہ وہ گروہ بندی اور چپقلش کے منفی رویے ہیں جو انیسؔ و دبیرؔ کے چاہنے والے بڑے ''خلوص'' اور نیک نیتی سے ایک دوسرے کے خلاف رکھتے تھے، بغیر یہ جانے کہ ان رویوں کے سبب زبان و ادب پر کیسے اثرات پڑ رہے ہیں— آیئے میرے ساتھ ایک بار پھر ''مرثیہ نظم کی اصناف میں'' ملاحظہ کیجئے:

> ''مرزا اوجؔ، مرزا دبیرؔ کے فرزند تھے۔ پھر اُن کا لہجہ بھی درشت تھا اُنہوں نے جو فکری مواد مرثیے میں داخل کرنا چاہا وہ زندگی کی کتاب کے اوراق سے لینے کی بجائے تخلیاتی فلسفے سے لیا۔ مرزا اوجؔ اور پورا دبستانِ دبیرؔ غزل کے خلاف رہا ہے لہٰذا اُن کا ٹکراؤ غزل کی ڈکشن سے

بڑا واضح ہے (مراد فصاحت، سلاست۔ اور ہلکے پھلکے الفاظ کا استعمال ہے) اس پر اُن کے مزاج کی تلخی اور جارحانہ اسلوب کی وجہ سے اُن کی علمیت اور فلسفہ طرازی اذہان تک تو پہنچی مگر دلوں کو نہ چھو سکی۔ اور ایک منفی ردِ عمل کی صورت میں اختتام پذیر ہوئی۔ اُن کی تنقید کا ''ہجویانہ'' انداز اُن کی بات سننے سے پہلے ہی تکدّر کی فضا پیدا کر دیتا تھا۔

کوئی سنے گل و بلبل کی داستاں کب تک   محاوروں کی خوش آمد چنیں چناں کب تک
یہ سرد مہریوں کے ساتھ گرمیاں کب تک   غلط نمائی تخیل کا بیاں کب تک
ردیف قافیہ کیا شے ہے جانتے ہی نہیں
فن اُن کی طرح سے ''لا'' شے ہے مانتے ہی نہیں

لکھنؤ کے زوال پذیر معاشرے میں لفظ عزاداری حسینؑ کو ''نجات کا واحد حل'' سمجھ کر شرعی تقاضوں اور اصول و فروعِ دیں سے لاپرواہی کو مرزا اوجؔ ناپسند کرتے تھے اور ملت کے اس احساس غیر ذمہ داری کا ذمہ دار علماء کو سمجھتے تھے (یہ فکر غلط بھی نہیں تھی) لیکن علما سے اُن کے خطاب کا لہجہ دیکھئے۔

ہے جاہلوں کا تو کیا ذکر علم کے طلباء   کہ پڑھنے لکھنے کا رہتا ہے جن کو فکر سدا
نہ جانے کیسی وہاں تربیت یہ پاتے ہیں
سند وفورِ جہالت کی لے کے آتے ہیں

یا

تمام شہر میں یکتا ہیں، گھر سے فاضل ہیں
قمار بازوں کے جرگے میں فردِ کامل ہیں

(مرثیہ نظم کی اصناف میں۔ ص ۴۵۔۴۶)

مرزا اوجؔ نے عربی اور فارسی علوم کے حصول کی بھی مخالفت کی۔ ایک دانشور کی حیثیت سے اُن کے ذہن میں اس فکر کی کیا بنیاد تھی اُن کے درشت لہجے نے کسی کو سمجھنے کا موقع نہیں دیا۔

مرزا رسواؔ جیسے باکمال شاعر اوجؔ کے شاگرد تھے۔ اس عہد میں انگریزی کا جولٹریچر (ادب) ہندوستان پہنچتا تھا مرزا اوجؔ اس کا ترجمہ مرزا رسواؔ سے سنتے تھے تاکہ وہ اس سے باخبر رہیں کہ انگریزی

ادب میں کیا ہو رہا ہے۔ مرثیہ نگاروں کی تاریخ میں مرزا اوجؔ واحد مرثیہ نگار تھے جو یورپ کے ادب سے واقف رہنا چاہتے تھے۔ فکری مسائل و مضامین سے بھرپور اُن کا سب سے مشہور مرثیہ ؎

"سروشِ غیب ہے گویا زبان حمدِ خدا"

دو جگہ شائع ہوا ہے۔ بشری خوبیوں اور کمزوریوں کے درمیاں مرزا اوجؔ کی شخصیت قابل احترام، اُن کی فکر عالمانہ اور مفکرانہ، اُن کی شاعری اور مرثیہ گوئی بہرحال جدید مرثیے کی بنیاد بنی ہے اُنہوں نے مرثیے میں اصلاحات تجویز کیں اس کا اسلوب بھی دیا ہے۔

☆☆☆☆☆

ناظر حسین ناظم :- (لاہور)

ولادت ۱۸۶۳ء۔وفات ۱۹۱۸ء

یہ نام لاہور میں مرثیہ کی بنیاد رکھنے والوں میں نمایاں نام ہے۔ اُن کے مرثیے عنوانات کے تحت لکھے گئے ہیں — مرثیوں میں مروجہ اقدار سے انحراف نہیں کیا بلکہ اُن کی بھرپور پابندی نظر آتی ہے لیکن مصرعے بولتے ہیں اور طرزِ جدید کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ مرثیوں میں روانی اور مضامین میں تسلسل نظر آتا ہے اور قاری کو جھٹکے نہیں لگتے بلکہ آسودگی کا احساس رہتا ہے — یہ انداز جدید مرثیے کی طرف سلامتی کا سفر ہے۔ ناظر حسین ناظمؔ، میر خورشید علی نفیسؔ کے شاگرد تھے، کہا جاتا ہے کہ اُنہوں نے اپنی مرثیہ گوئی سے لاہور میں دھوم مچا رکھی تھی۔ ڈاکٹر بلال نقوی نے ناظر حسین ناظم کے سلسلے میں سراج نظامی کے مضمون "لاہور کا محرّم" کا حوالہ دیا ہے جو حسب ذیل ہے۔

> "لاہور کے محلّے کوٹھی دھراں میں میاں سراج الدین تاجر کتب اور رئیس اعظم کے دولت کدے پر مجلسِ عزا بپا تھی، علامہ اقبال، فقیر افتخار الدین، فقیر نجم الدین، حکیم فقیر چشتی جیسے عمائدین شریک تھے۔ میر سردار حسینؔ نے جیب میں سے ایک چھوٹی سی کاپی نکال کر سوزخوانی شروع کی۔ محفل مسحور ہو گئی۔ اُن کے بعد منشی جلال الدین 'شوناتھ' تشریف لائے اور استادی موسیقی میں پوربی مرثیہ سنانے لگے۔ اب میر ناظر حسین ناظمؔ سر پر چوگوشہ ٹوپی رکھے کرسی پر تشریف فرما ہوتے ہیں۔ گمبھیر آواز میں مرثیہ شروع کرتے ہیں ا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ

لاہور کے میر ناظر حسین ناظم اور ارشد گورگانی کے ذکر میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ اقبال نے ان دونوں اہم روایتوں سے استفادہ کیا ہے۔

لاہور میں مرثیوں کی مجالس کے علاوہ، مشاعروں میں بھی میر ناظر حسین ناظم "میر مشاعرہ" ہوا کرتے تھے۔ حکیم احمد شجاع نے اس کی تصدیق کی ہے۔ مولوی احمد دین نے لکھا ہے کہ مشتاقانِ سخن میں اقبال بھی تھے۔ پروفیسر عابد علی عابد نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ارشد گورگانی اور میر ناظر حسین ناظم کے حلقۂ سخن میں بیٹھ کر اقبال کو اس بات کا احساس ہوا کہ جو شعری تربیت انہوں نے حاصل کی تھی اس کی تکمیل ضروری تھی۔ ان اقوال کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اقبال کی شعری تربیت، ہیئت اور آہنگ کو اجالنے میں مرثیہ اور مرثیہ گو شعراء کے قرب کا خاصا عمل دخل ہے۔ اقبال نظم کے شاعر تھے اور نظم میں مرثیہ انسانی فکر و عمل اور کردار پر اثر انداز ہونے والی صنف سخن ہے۔ اقبال کا 'شکوہ' اور 'جواب شکوہ' مسدس کی ہیئت میں شاید اس لئے ہیں کہ مرثیہ مسدس کی ہیئت میں بہت مقبول صنف سخن ہے۔ شکوہ اور جواب شکوہ بیسویں صدی کی اہم نظموں میں شمار ہوتی ہیں۔ اور ان نظموں کے لئے تخلیقی فضا پیدا کرنے میں شعوری یا غیر شعوری طور پر ناظر حسین ناظم بھی کہیں نہ کہیں نظر آتے ہیں۔

لاہور میں ایک یادگار مشاعرہ ہوا کرتا تھا جس کے بانی اور میزبان حکیم امین الدین ہوا کرتے تھے۔ میر ناظر حسین ناظم اس مشاعرے میں ضرور آتے تھے اور علامہ اقبال بھی باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ فقیر وحید الدین نے میر ناظر حسین ناظم کے پڑھنے کے انداز کی بہت تعریف کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ غزل، رباعی، منقبت، سلام اور مرثیہ پڑھتے وقت ان کا لہجہ اور الفاظ کا زیر و بم مختلف صنف سخن پڑھتے وقت مختلف ہوتا تھا۔

میر ناظر حسین ناظم نے کم و بیش پچاس مرثیے کہے ہیں۔ اُن کے مرثیوں کی ایک نایاب مجموعہ جو ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا تھا، وہ پاکستان میں صرف ڈاکٹر ہلال نقوی کے کتب خانے میں ہے۔ اس کتاب کا نام "مراثی ناظم" تھا جو اب ناپید ہے۔ اس کتاب کو ۱۹۷۵ء میں ڈاکٹر صفدر حسین نے شائع کرایا تھا۔

ناظم کے مرثیوں میں کئی پرت کی شاعری ہے۔ ایک طرف تو ان کے مراثی میں اُس عہد کی بھرپور عکاسی ہے جس میں وہ مرثیے کہہ رہے تھے دوسری طرف وہ پرانی راہوں کو نئی

شاہراہوں سے جوڑ رہے تھے۔ اہلِ نقد و نظر نے جسدِ مرثیہ میں اس داخلی حرارت (Latent Heat) کو پہچان کر ہی ناظمؔ کو جدید مرثیے کے معماروں کی صف میں جگہ دی ہے ۔

اللہ رے نمازِ شہیدانِ کربلا کرتے رہے نماز قضا کرکے بھی ادا
نیت تشنبد اُن کا شہادت قیام تھا اعضا الگ تھے جیسے کہ ہوں رکعتیں جُدا
آزاد تھے رکوع سے وہ اور سلام سے
پیرو تھے اس نماز میں آگے امام سے

ہر چند کہ میر ناظمؔ کے کلام کو اس دور کا آئینہ کہا گیا ہے مگر درج بالا ایک بند میں لفظیات کو جس طرح برتا گیا ہے وہ ایک پختہ کار شاعر کی چابکدستی کا بھرپور مظاہرہ ہے۔ آخری مصرعہ میں میدانِ جنگ میں امام حسینؑ کی نماز کا پورا منظرنامہ پیش کر دیا۔

"پیرو تھے اس نماز میں آگے امام سے"

اسی مرثیہ کا ایک اور بند جو ذہن کے سارے طبق روشن کر دیتا ہے اور میر ناظمؔ کی قدرت شعرگوئی کا اعلان کرتا ہے وہ یہ ہے ۔

تھی منفرد جماعتِ سلطانِ کائنات قرآن میں ہیں جیسے حروفِ مقطعات
اجساد تھے شہیدوں کے آیاتِ بیّنات اُن سب میں تھے امام زماں مثلِ اسمِ ذات
عباسؑ اس ثبوت کا خالص ثبوت تھے
دستِ بریدہ اُن کے دعائے قنوت تھے

"ان سب میں تھے امام زماں، مثلِ اسمِ ذات" ایک مصرع ہی میر ناظمؔ کی علمی بصیرت کا شاہد ہے۔ جو ناظر حسین ناظمؔ کا ایک شعر زباں زدِ عام ہے مگر شاید چند لوگ ہی جانتے ہوں کہ کس کا شعر ہے۔

کسی کے آتے ہی ساقی کے ایسے ہوش اُڑے
شراب سیخ پہ ڈالی، کباب شیشے میں

سید وحید الحسن ہاشمی نے "ہل من ناصرا" میں ایک شاعر ناظم حسیؔن زیدی المتخلص ناظمؔ کا ذکر کیا ہے اور ناظم کی ولادت ۱۸۶۲ء میں ضلع مظفرنگر یو۔پی کی ایک بستی میں قرار دی ہے اور ناظم کا سنہ وفات ۱۹۱۷ء لکھا ہے۔ ہاشمی صاحب کی تحریر کے مطابق ناظم حسین زیدی ترک وطن کرکے لاہور آگئے تھے اور بازار حکیماں، بھاٹی گیٹ میں رہائش اختیار کر لی تھی اور ۱۹۱۷ء میں لاہور ہی میں

فوت ہوئے اور قبرستان مومن پورہ میں دفن ہوئے — سید وحید الحسن ہاشمی کی تحقیق میں شاعر کا نام ناظر حسین نہیں ناظم حسین ہے جو کتابت کی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن انہوں نے ڈاکٹر صفدر حسین کی شائع کردہ "بزمِ ناظم" کے ساتھ ہی ناظم کی تاریخ وفات سے متعلق ایک شعر کا حوالہ دیا ہے۔

شاعرِ خوش بیان تھے واللہ
ناظم لکھنوی خدا کی قسم

اس شعر کی رو سے ناظم کی ایک نئی نسبت ناظم لکھنوی کی حیثیت سے سامنے آتی ہے جو بالکل نیا رُخ ہے۔ وہ جائے پیدائش کی نسبت سے ناظم بارہوی، ناظم مظفر نگری تو ہو سکتے تھے ناظم لکھنوی نہیں۔ پس ناظر حسین ناظم یا ناظم حسین ناظم تک تو بات سمجھ میں آ سکتی ہے مگر ناظم لکھنوی کو لاہور والے ناظم سے علیحدہ کرنا پڑے گا۔

☆☆☆☆☆

اولاد حسین سلیم :- (امروہہ)

ولادت ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) وفات ۱۳۳۸ھ (۱۹۱۹ء)

نام سید اولاد حسین، تخلص سلیم۔ نقوی سید، وطن امروہہ سادات۔ مولوی سید اولاد حسین سلیم بیک وقت جید عالم دین بھی تھے اور صف اوّل کے شاعر و ادیب بھی۔ تاریخ سادات امروہہ میں اُن کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اُن کے شاگردوں میں مولوی چاند کے علاوہ رئیس امروہوی اور جون ایلیاء کے والد گرامی شفیق ایلیا جیسے نامور شاعروں کے نام آتے ہیں۔ اُن کے فرزند مولانا سید محمد عبادت صاحب قبلہ بھی شاعر ہیں اور کلیم تخلص کرتے ہیں لیکن مقامِ عبرت ہے کہ جب مولوی اولاد حسین سلیم کے مرثیوں کے متعلق اُن کے فرزند ارجمند مولانا سعادت حسین کلیم سے پوچھا گیا تو انہوں نے ڈاکٹر بلال نقوی کو صرف اتنا جواب دیا کہ

"اُن کے تمام مرثیے محلّے کے ایک بزرگ لے گئے تھے۔
پھر انہوں نے واپس نہیں کیے"

اُن کا ایک مرثیہ۔ "کیا مرتبہ ہے نامِ جنابِ امیر کا" عظیم امروہوی نے نقل کیا ہے

کیا مرتبہ ہے نام جنابِ امیر کا نامِ خدا ہے نام خدائے قدیر کا
ہے نقش مہرہ یہ دلِ شاہ و وزیر کا جوشن یہی ہے جانِ صغیر و کبیر کا

عزّت بشر کو دونوں جہاں میں یہ نام دے
مشکل پڑے تو جنگ میں سیفی کا کام دے

یہ مرثیہ حضرت علی علیہ اسلام کی شہادت کے احوال کا ہے۔

لکھا ہے مرتضٰی نے جو سجدے میں کھائی تیغ — سر پر پڑی جبینِ مبارک تک آئی تیغ
غُل پڑ گیا علی کو شقی نے لگائی تیغ — تھی زہر میں اسی لئے اس نے بجھائی تیغ
دو ٹکڑے حق کی یاد میں حیدر کا سر ہوا
''انگشتِ تیغِ ظلم'' سے ''شق القمر'' ہوا

''انگشتِ تیغِ ظلم'' اور ''شق القمر'' نے ایک معجزۂ رسالت کی طرف اشارہ کر دیا۔ شاعری میں یہ پرکاری ہی عظمت شاعری ہے۔ مولانا اولاد حسین سلیم نقوی امروہوی نے سلام بھی کہے ہیں۔ کاش مولانا سیّد محمد عبادت کلیم صاحب اپنے والد گرامی کے مراثی کی تلاش کر کے ایک ثواب جاریہ کی ابتدا کریں۔

☆☆☆☆☆

جاوید لکھنوی:- (لکھنؤ)

ولادت ۱۸۶۲ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیان۔ وفات ۱۹۲۱ء

نام سیّد محمد کاظم، تخلص جاوید، وطن لکھنو۔ والد گرامی سیّد محمد جعفر اُمید لکھنوی جو خود مرثیہ گو تھے اور جنہوں نے نواب عاشور علی خان شاگردِ حضرت ناسخ سے تلمذ حاصل کیا تھا۔ جاوید لکھنوی کے دادا مولانا سیّد محمد باقر مجتھد العصر ابن مولانا سیّد محمد رضوان مآب، ابنِ سیّد دلدار علی غفراں مآب تھے جو امجد علی شاہ سے تا آخری تاجدارِ اودھ، وزیرِ عدل رہے — جاوید لکھنوی ۱۱ برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا اور اُن کی سرپرستی اور تربیت اُن کے ماموں حضرت ماہر لکھنوی نے سنبھال لی۔ جاوید لکھنوی کی شادی چھنگا صاحب حسین کی بہن سے ہوئی، گویا جاوید لکھنوی کو مرثیہ گوئی وراثت کے طور پر بھی ملی اور شادی ہوئی تو سسرال میں یہی شمعیں روشن نظر آئیں۔

اُن کے معاصرین میں میر عارف، پیارے صاحب رشید، دولہا صاحب عروج جیسے باکمال مرثیہ نگاروں کی دھوم تھی۔ جس عہد میں ایک سے زیادہ باکمال لوگ ہوتے ہیں اس عہد میں اپنی حیثیت منوانے کے لئے بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ جاوید لکھنوی کے سامنے یہی مسئلہ تھا۔

لہٰذا انہوں نے اپنے کو پہنچوانے کے لئے اپنی علمی اور فنی استعداد کو بہت مستحکم بنایا۔

جاوید لکھنوی مرثیے میں لڈن صاحب خورشید کے شاگرد تھے۔ حضرت جاوید نے خود اپنے والد گرامی حضرت اُمید لکھنوی سے کسب فیض کو تسلیم کیا ہے۔

جاوید فیض حضرت اُمید کا ہو جب
کیونکر نہ ہر طرف کو تمہاری پکار ہو

جاوید لکھنوی خوش مزاج، خوش گفتار، خوش فکر اور خوش خرچ (جسے صحیح اُردو میں شاہ خرچ کہتے ہیں) شخصیت کے مالک تھے۔ حضرت ماہر کے انتقال کے بعد زندگی قدرے دشوار ہوئی تو لکھنؤ سے باہر بھی مرثیہ پڑھنے کے لئے جانا پڑا، دکن میں جہاں سچ پوچھئے تو اُردو مرثیہ کا آغاز ہوا، جاوید لکھنوی دو بار بلائے گئے۔ اہل دکن بھی، اپنی روایتوں پر نازاں، کم ہی کسی باکمال کو گردانتے ہیں۔ جاوید لکھنوی کو پہلی بار دعوت کی مختلف وجوہات ہو سکتی تھیں مگر دوسری بار دعوت کا مطلب واضح ہے کہ انہوں نے معرکہ سر کیا۔

جاوید لکھنوی نے اُستاد ہی نہیں شاگرد بھی اچھے پائے تھے۔ چند شاگردوں کے نام یہ ہیں۔ سرفراز علی خان شاکر، مولانا وجاہت حسین ناظم، حکیم آشفتہ، مولانا ناصح، میر کاظم محشر، سید حسین بیتاب، عابد صولت، مجاور حسین تمنا، نواب باقر علی خان راز، حکیم برق اور لڈن صاحب بہار (یقیناً لڈن صاحب خورشید نہیں) چھنگا صاحب حسین ان کے برادر نسبتی ہونے کے سبب بہر حال اس فہرست میں شامل ہوں گے۔ جاوید لکھنوی ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ ان کے پانچ دیوان شائع ہوئے اور غزلوں کا ایک دیوان اور مرثیوں کی دو قلمی جلدیں یادگار چھوڑی ہیں۔ حضرت جاوید نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی تھی اس لئے مرثیوں میں غزل کا رنگ غالب ہے — ایک مرثیے میں دنیا کی بے ثباتی اور اپنی تنہائی اور حیرانی کی تصویر کھینچی ہے جو باوجود مسدس ہونے کے غزل نظر آتی ہے۔

آبلے دیکھ کے چلنے لگے تھے میرے گناہ — نیند جن میں نہیں آتی وہی راتیں ہیں گواہ
مختصر یہ، نہ ملی نیند کو آنکھوں میں بھی راہ — تیرہ و تار مکاں وہ تھا کہ خالق کی پناہ

گرمیٔ آبلۂ دل سے میں شرماتا تھا
آگ پانی میں لگی تھی جو جلا جاتا تھا

جمع اسباب مصیبت کے تھے کاشانے میں درد کو فائدہ کیا تھا میرے تڑپانے میں
فرق ظاہر تھا نہ جینے میں نہ مرجانے میں شمع اندھوں کی طرح آتی سیہ خانے میں

داغِ دل کی بھی ضیاء سے مجھے شرم آتی ہے
خیر اس روشنی میں رات تو کٹ جاتی ہے

جاوید لکھنوی نے اچھے شاگردوں کے علاوہ جو دو قلمی دیوان چھوڑے ہیں، کاش اُن کے شاگرد یا اُن کے شاگردوں کے ورثاء، اُن کے اعزا، یا ان کے چاہنے والے ان مرثیوں کو ہی غنیمت جان کر محفوظ کرادیں جو فی الحال میسّر ہیں۔ مگر یہ کون کرے گا؟ کیا وہ بھی نہیں جو ابھی تک اُن کی امانت یعنی اُن کے دو دیوان سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

جاوید لکھنوی کے ایک مرثیے ''کون دنیا میں نہیں آج ثنا خواں میرا'' چودہ یا پندرہ بند ''عکس لطیف'' کراچی نے اپریل ۱۹۷۰ء کے شمارے میں شائع کیے تھے اور بس۔

☆☆☆☆☆

جلیل لکھنوی:- (لکھنو)

ولادت ۱۸۵۸ء۔ وفات ۱۹۲۲ء

سیّد فرزند حسن نام، جلیل تخلص۔ سیّد حسن خلیل کے فرزند۔ میر اُنس کے پوتے۔ فن مرثیہ گوئی کے وارث، قادر الکلام شاعر۔ ہر سال مرثیہ پڑھنے لاہور جایا کرتے تھے۔ اُن کی مجالس مرثیہ خوانی کا احوال مخزن لاہور کے شماروں میں محفوظ ہے — لاہور میں ایک بہت قدیم جگہ تھی جہاں دو یا تین پشتوں سے مجالس عزا برپا ہوتی تھیں۔ اس جگہ کا نام تھا مبارک حویلی۔ شہر کی تنگ گلیوں سے گذر کر جب مبارک حویلی پہنچتے تھے تو اندازہ ہوتا تھا کہ نہ جانے کتنے مکانوں کو گرا کر یہ وسیع صحن بنایا گیا ہوگا جس میں پابندی کے ساتھ عزائے حسینی ہوا کرتی تھی۔ مبارک حویلی کے مالک سر مراتب علی شاہ تھے جنھوں نے یہ بہت قیمتی زمین اور اس پر عمارت عزائے حسینی کے لئے وقف کردی تھی۔

مبارک حویلی میں ذاکرین باہر سے بلائے جاتے تھے بالخصوص سوز خواں اور مرثیہ خواں حضرات لکھنؤ سے یا دہلی سے مدعو کیے جاتے تھے۔ راقم الحروف کو (بیسویں صدی کی پانچویں دھائی میں) چھ سات سال مبارک حویلی میں سلام پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔

مبارک حویلی میں ذاکرین اور واعظین کا ریکارڈ رکھا جاتا تھا جہاں معاشرے کے ذہین، ادب نواز اور باحیثیت افراد آتے رہے ہیں۔ جس زمانے میں مبارک حویلی میں حضرت جلیلؔ کی مرثیہ خوانی کا ذکر کیا جاتا ہے اس زمانے میں علامہ اقبالؔ، تاجور نجیب آبادی، سر عبدالقادر اُن کے مرثیے سننے آتے تھے۔ سچ پوچھئے تو لاہور میں اُردو ادب کی آبیاری میں ان ذاکرین اور ان کے مرثیوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

جلیلؔ لکھنوی ۱۹۰۲ء میں لاہور گئے جس کا تذکرہ سر عبدالقادر نے رسالہ مخزن میں کیا ہے۔ جلیل کے چار مرثیے دستیاب ہیں۔ "پہلا مرثیہ" یارب کلیدِ گنجِ سخن دستیاب ہو"

یارب کلید گنج سخن دستیاب ہو مشتاق میری نظم کا ہر شیخ و شاب ہو
مداحِ حسینؑ کا حاصل ثواب ہو مل جائے وہ زباں کہ دہن کامیاب ہو

جب تک جہاں میں طائرِ روح رواں رہے
جاری لبوں پہ وصفِ امامِ زماں رہے

مثلِ خلیقؔ خلق میں پیدا کوئی نہ تھا ذاکر انیسؔ و اُنسؔ سے اعلیٰ کوئی نہ تھا
مونسؔ سے اور نفیسؔ سے اچھا کوئی نہ تھا بعد اُن کے پھر وحیدؔ سا یکتا کوئی نہ تھا

پایا بہشت، نام یہاں نیک ہوگیا
مداح اپنے وقت کا ایک ایک ہوگیا

سید ضمیر اختر نقوی نے ۲۹/ ۱۹۲۸ء میں مبارک حویلی لاہور میں جلیلؔ لکھنوی کی ایک مجلس میں شرکت کے واقعات تحریر کیے ہیں۔ مبارک حویلی کی مجالس کے بانی سر مراتب علی تھے۔ ضمیر اختر نقوی نے جلیلؔ لکھنوی کو نواب مظفر علی قزلباش کا مہمان قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ مبارک حویلی میں مرثیہ خوانی کے لئے تشریف لے گئے تھے — نواب مظفر علی قزلباش کا لاہور میں اپنا ایک امام بارہ تھا۔ اس کا امکان نہیں کہ جلیلؔ لکھنوی سر مراتب علی کی مجالس پڑھنے گئے ہوں اور نواب قزلباش کے ہاں مہمان ٹھہرے ہوں اس لئے کہ مبارک حویلی کے ذاکر، مراتب علی کے مہمان ہوتے تھے، اور سر مراتب علی دل و جان سے اُن کی تعظیم کیا کرتے تھے۔ شاید یہ اُن کی نیک نیتی کا اثر تھا کہ مولانا ظفر مہدی صاحب قبلہ جیسے عالم جب بھی لاہور آتے مبارک حویلی میں قیام فرمایا کرتے تھے۔ سر مراتب علی نے کئی بار چاہا کہ حضرت مولانا کسی کوٹھی میں قیام فرمائیں مگر مولانا

ظفر مہدی صاحب قبلہ نے مبارک حویلی کے ایک کمرے میں ہمیشہ اپنے قیام کو ترجیح دی۔

کیسے کیسے علماء تھے اس دور میں اور کیسے کیسے نیازمند اور قدردان تھے۔ مولانا ظفر مہدی صاحب قبلہ صرف ایک سالن اور ایک روٹی نوش فرمایا کرتے تھے۔ اور اگر پلیٹ میں ایک دو چمچے چاول لے لئے تو پھر کوئی اور چیز نہیں کھاتے تھے۔ اللہ کی بارگاہ میں مولانا کے سجدے اتنے قبول ہوئے کہ ایک بار کربلا معلّٰی گئے تو روضۂ امام مظلوم کے تہہ خانے میں قبرِ مبارک کی تعمیر کے وقت قبر سے اُتاری ہوئی تین اینٹیں مولانا ظفر مہدی صاحب کو امام کی طرف سے عطا کی گئیں۔ مولانا نے ایک اینٹ سرمراتب علی شاہ کو عنایت کی جسے اُنہوں نے مبارک حویلی کی ایک دیوار میں جہاں منبر تھا بڑے اہتمام اور عزت سے نصب کرا دیا۔ دو اینٹیں مولانا ظفر مہدی اپنے ساتھ رکھتے تھے جس کے لئے ہر شخص کو اُنہوں نے وصیت کی تھی کہ ایک اینٹ اُن کی قبر میں لگائی جائے۔ راقم الحروف (عاشور کاظمی مندرجہ بالا صورتحال کا عینی شاہد ہے۔) تیسری اینٹ کہاں گئی یہ شاید کوئی نہیں جانتا۔

بات فرزند حسن جلیلؔ سے شروع ہوئی اور مولانا ظفر مہدی صاحب قبلہ تک پہنچ گئی۔ بظاہر دونوں میں وقت کا فاصلہ ہے۔ جلیلؔ لکھنوی کا انتقال ۱۹۲۲ء میں ہوا، مولانا ظفر مہدی کا تذکرہ بیسوی صدی کی چھٹی دہائی کا ہے۔ لیکن دونوں شخصیتوں کا نصب العین ایک تھا۔ دونوں کے سینے امام حسین کے عزاخانے تھے۔ دونوں کی زبانوں پر ذکرِ حسینؑ تھا۔ دونوں کا شرف، عزائے حسینؑ تھا اس کا اقرار میر جلیلؔ کے ہاں بڑا واضح ہے۔

ہر چند ابتدا ہے میری یا شہِ عرب پر آپ کے کرم کا بھروسہ ہے روز و شب
در سے حضور کے کوئی خالی پھرا ہے کب حضرت کا مرثیہ گو ہوں میرا بھی ہو لقب

باغ ثنائے شہ کی ہوا سب کو بھا گئی
کرتے یہی ریاض چھٹی پشت آ گئی

فرزند حسن جلیلؔ کے سلسلے میں تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ لاولد تھے جبکہ صورت حال یہ ہے کہ وہ اولادِ نرینہ سے محروم تھے مگر اُن کی ایک بیٹی تھیں جن کا نام جعفری بیگم عرف افسر جہاں بیگم تھا اور اُن کی شادی سیّد عابد کلیم موہانی، رئیس جرول سے ہوئی تھی۔ افسر جہاں بیگم اور حضرت عابد کلیم موہانی کے فرزند ارجمند سیّد سخاوت محمد شبابؔ جرولی اور اُن کے فرزند سیّد سخاوت

انجم شباب کاظمی مرثیہ گو شاعر ہیں اور امریکہ میں اقامت پذیر ہیں جن کا تذکرہ اس کتاب میں "مغرب میں اردو مرثیہ نگار" کے باب میں موجود ہے۔

☆☆☆☆☆

انیس حسن ہلالؔ:-

ولادت ۱۲۹۴ھ ۱۸۷۷ء، وفات ۱۹۲۳ء

نام: سید انیس حسن، تخلص ہلالؔ نقوی سید، وطن امروہہ۔ شاعری اور مرثیہ گوئی وراثت میں ملی تھی۔ ان کا شجرۂ نسب کا تفصیلی حوالہ انیس حسن ہلالؔ کے دادا امیر حسن امیرؔ کے باب میں آ چکا ہے۔ یہاں صرف اتنا اضافہ کیا جا رہا ہے کہ انیس حسن ہلالؔ کے بھتیجے رئیسؔ امروہوی نے انیس حسن کا تخلص انیسؔ تحریر کیا ہے۔ جبکہ ان کے قلم سے لکھے ہوئے مراثی پر انیس حسن ہلالؔ مرقوم ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے انیسؔ بھی تخلص استعمال کیا ہے اور ہلالؔ بھی۔ سلسلۂ نسب کے حوالے سے یہ کہنا ان کے لئے بھی غلط نہ ہوگا کہ "پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مداحی میں"۔ ان کے دادا سید امیر حسن امیرؔ کے باب میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ نہ صرف انیس حسن ہلالؔ کے دادا بلکہ ہلالؔ کے والد، ہلالؔ کے تین بھائی اور ان کے بھتیجے سب شاعر، سب مرثیہ نگار تھے اور ہیں۔

انیس حسن ہلالؔ کے دو فرزند تھے، ایک سید رضا حیدر جو محکمۂ پولیس میں تھے۔ اور دوسرے فرزند مشہور فلمساز ہدایت کار سید امیر حیدر کمالؔ امروہوی تھے۔۔۔ افسوس اتنے نامور فرزندوں کی موجودگی میں انیس حسن ہلالؔ کا کلام ضائع ہوگیا۔ اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ رضا حیدر پولیس میں ہونے کے باعث ہمیشہ امروہہ سے باہر رہے اور شاید انہیں شعر و ادب سے رغبت بھی نہ رہی ہو۔ دوسرے فرزند ادیب، شاعر، فلمساز، ہدایت کار کمال امروہوی تھے وہ فلمی صنعت میں چلے گئے۔ ہر چند کہ انہوں نے بہت نام کمایا لیکن وہ بمبئی کے ہو کر رہ گئے۔ اور میراث پدر نہ پا سکے۔

"مرثیہ نگاران امروہہ" میں انیس حسن ہلالؔ کے چار مرثیوں کے حوالے ملتے ہیں اور بس۔ ان مراثی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک باکمال شاعر تھے اور رثائی ادب کی روح کو پہچانتے تھے۔ مرثیہ گوئی میں منظر نامے کے حوالے سے جذبوں کی عکاسی دشوار اور اہم ترین منزل ہوتی ہے۔ ہلالؔ نے جذبوں کی عکاسی بہت کامیابی سے کی ہے۔ اُن کا اپنا خاندان مرثیہ گوئی کا ایک دبستان تھا۔ وہ روانی اور فصاحت جسے امیر حسن امیرؔ نے اپنایا تھا ہلالؔ نے اس امانت کی حفاظت

کی۔ وہ شمع جو اُنہیں اپنے دادا اور اپنے والد سے ملی اس میں اپنی کاوشوں کے نور کا اضافہ کر کے اُنہوں نے اپنے بھائی شفیق حسن ایلیا اور اُن کی نسل تک پہنچایا۔ اُن کا ایک مرثیہ ہے ؂

"دیکھ کر چاند محرم کا نمایاں زینبؑ"

اس مرثیے میں بہن اور بھائی یعنی سیّدہ زینب اور سیّد الشہدا امام حسینؑ دونوں محرم کا چاند دیکھتے ہیں۔ دونوں کے تاثرات کو ہلالؔ نے نظم کیا ہے۔ سیّدہ زینب کا تاثر ہے ؂

میرے بھائی کو کبھی ہو نہ کوئی رنج و محن بچّے جیتے رہیں سر سبز رہے یہ گلشن
لے کے سب کنبے کو ہمراہ چلیں سوئے وطن شاد آباد ہمیشہ رہیں سلطانِ زمن
شور ہو خلق میں شبیرؑ کی یکتائی کا
نام قائم رہے دنیا میں میرے بھائی کا

دوسری طرف ہلالؔ نے بھائی کے جذبات کی عکاسی کی ہے ؂

اس طرف تو یہ دعا کرتی ہے بنتِ حیدر اس طرف دیکھتے ہیں چاند شہ جن و بشر
التجا کرتے ہیں اللہ سے یہ رو رو کر راہ میں تیری شہادت ہو میری اے داور
ماہِ زہرا کو نصیب ایسی سعادت ہووے
قتلِ شبیرؑ سے امت کی شفاعت ہووے

ہلالؔ کے کلام میں یہ پختگی خاندانی ورثہ ہے اور جذبوں کی یہ عکاسی ان کی پہچان ہے۔

☆☆☆☆☆

تمکین امروہوی:-

ولادت ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء۔ وفات ۱۳۴۲ھ مطابق ۱۹۲۳ء

نام سیّد علی تمکین، تخلص تمکیںؔ، وطن امروہہ۔ سیّد نبی بخش فلسفیؔ کے فرزند۔ اپنے والد گرامی حضرت فلسفیؔ کے شاگرد تھے۔ بعد ازاں اولاد حسین سلیمؔ سے سلسلۂ تلمذ وابستہ رہا۔ تمکیںؔ بدیہہ گو شاعر تھے۔ امروہہ کے مرثیہ نگاروں میں تمکیںؔ کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ڈاکٹر عظیم امروہوی نے تمکیںؔ کے پوتے سیّد علی یقیںؔ کا بیان نقل کیا ہے جس کی رو سے تمکیںؔ کے زیادہ تر مرثیے اُن کے فرزند (یقیںؔ کے چچا) لکھنؤ لے گئے تھے، پھر کسی کو پتہ نہ چلا کہ وہ مرثیے کہاں ہیں۔ کس حالت میں ہیں۔ یہ واقعہ سیّد علی یقیںؔ کے لئے ہی نہیں ہر اہلِ ذوق کے لئے دکھ کا سبب ہے کہ تمکیںؔ جیسے

عظیم شاعر کا سرمایۂ کلام گمنامی کے اندھیروں میں ڈوب گیا لیکن کوئی کیا کر سکتا ہے اگر میراث پدر کو اولاد ہی اس کا جائز مقام نہ دے سکے۔ سیّد علی یقین کے بیان کے مطابق تمکین کا ایک بستہ جو امروہہ میں رہ گیا تھا اس میں ۲۰ مرثیے موجود تھے۔

تمکین کی مرثیہ گوئی میں مرزا دبیرؔ کی شاعری کا رنگ اور انیسؔ کی سخنوری کی خوشبو ملتی ہے — دیکھیے مرزا دبیرؔ کی شکوہ لفظی کی جھلک پہلے مرثیے کے مطلع میں ۔

اے طبعِ عجز، حمد کا ہاں اعتراف کر کارِ بشر نہیں یہ بیاں صاف صاف کر
عاجز ہیں انبیاء و ملک بس معاف کر گوشے میں بیٹھ ذکرِ سرِ اعتکاف کر
بے مثل و بے عدیل ہے کُل کا ملیک ہے
وردِ زباں رہے کہ خدا لاشریک ہے

اور اب انیسؔ کی سخنوری کی مہک، ایک دوسرے مرثیے کے مطلع کے بند میں ۔

کعبے کو شرف کس کی ولایت سے ملا ہے مشہورِ جہاں کس کا لقب عقدہ کُشا ہے
وہ کوئی ہے جو نائب شاہِ دوسرا ہے بندہ ہے مگر نامِ خدا، شیرِ خدا ہے
ابنِ عم و دامادِ رسولِ عربی ہے
واللہ علیؑ ہے، وہ علیؑ ہے، وہ علیؑ ہے

تمکینؔ امروہوی نے مختصر مرثیے بھی کہے ہیں اور طویل بھی۔ مختصر مرثیوں میں کم از کم ۳۰ بند میں اور طویل ترین مرثیے میں ۲۰۰ بند ہیں۔ اُنہوں نے حمد، نعت، منقبت کے گلدستوں سے بھی مرثیوں کو سجایا ہے اور منظر نگاری، کردار نگاری، جذبات نگاری کو بھی منزل کمال تک پہنچایا ہے۔ اکثر مراثی میں قرآن واحادیث نبوی کی معنویت کو نظم کیا ہے۔ ایک اہم بات یہ ہے جہاں جس کردار کو پیش کیا ہے اُس کے مثبت اور منفی منصب کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ مثلاً ایک جگہ یہ منظر کشی کی ہے کہ بعد شہادت حسین، اشقیا سیّدہ زینب کے بازوؤں میں رسیاں باندھنا چاہتے ہیں تو اس منزل پر حیدر کرار کی بیٹی کے کردار کو تمکینؔ امروہوی نے پیشِ نظر رکھا ہے۔ بظاہر لا وارث زینبؑ کی طرف جب ایک نامحرم رسیاں لے کر بڑھتا ہے تو شہزادی جلال میں آکر فرماتی ہیں ۔

ذرّیت نبی سے یہ بدعت زبوں خصال بازو پہ میرے ہاتھ رکھے کیا تیری مجال
دکھلاتی اے لعیں تجھے میں حیدری جلال پر کہہ گئے ہیں صبر کو شبیر خستہ حال

اماں کا صبر بھی ہے فلک کی ستائی میں
رسّی مجھے دے باندھوں گی میں خود کلائی میں

یہ شاعر کی طہارتِ فکر کی بات ہے، آلِ رسول کی عظمت کا احساس ہے کہ بنتِ حیدر اس بے کسی کے وقت بھی اپنے وقار کے مطابق بات کرتی ہیں۔ تمکیںؔ امروہوی نے جدید مرثیے کا علم کبھی بلند نہیں کیا لیکن فکر جدید کے لیے لائسنس لینا نہیں پڑتا۔ اپنے ہم عصروں سے آگے بڑھ کر سوچنا ہی ترقی پسندی ہے، جدّت ہے۔ تمکیںؔ نے مرثیے کی مروجہ اقدار کو ملحوظ خاطر ضرور رکھا ہے مگر اُن عناصر کو مراثی میں کم کر دیا ہے جو راویتی زیادہ اور حقیقت آثار کم تھے، مثلاً تلوار، اور گھوڑے کا ذکر کیا ہے مگر ذرا کم۔ رجز اور ساقی نامے کو خدف نہیں کیا ہے مگر ان اجزائے مرثیہ کو بھی کم کیا ہے اور حمد اور واقعات نگاری پر زیادہ توجہ دی ہے۔ واقعات نگاری میں جہاں اپنے وجدان سے کام لیا ہے وہاں آل رسول کی عظمت کو پیش نظر رکھا ہے اس کے علاوہ جو واقعہ نگاری کی ہے وہ مصدقہ روایات کے تحت ہے۔۔۔ بیسویں صدی کے آخری عشرے میں مرثیہ نے جس حقیقت نگاری کی طرف سفر کیا ہے اس فضا میں سیّد علی تمکیںؔ کے سارے مراثی میسّر ہوتے تو اُن کی مرثیہ نگاری بھی اپنے محاسن کے ساتھ سامنے آتی اور نئی نسل کے مرثیہ نگاروں کو راستوں کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔

کاش سیّد علی یقین یا تمکیںؔ کے ورثا میں سے کسی کو احساس ہو جائے کہ حضرت تمکین کے باقی ماندہ مراثی بھی شائع ہو جائیں تو اُردو مرثیہ نگاری کے ریکارڈ میں بھی اضافہ ہوگا اور کائنات مرثیہ گوئی کا ایک سورج اندھیروں میں ڈوبنے سے بچ جائے گا۔

☆☆☆☆☆

اتقیٰ حسن یکتاؔ :- (امروہوی)

ولادت ۱۸۸۰ء ۔ وفات ۱۹۲۶ء

نام سیّد اتقیٰ حسن، تخلص یکتاؔ۔ وطن امروہہ۔ مولوی سیّد مصطفیٰ کے فرزند ارجمند، مولوی سیّد مجتبیٰ چاندؔ کے برادر خورد، سیّد اولاد حسینؔ سلیمؔ کے ہونہار شاگرد۔ مرثیہ، سلام، رباعی، قطعات اور غزلوں کا کافی سرمایہ محفوظ ہے۔ اُن کے ۲۰ / ۲۵ مرثیے کراچی میں سیّد علی امام نقوی کے کتب خانے میں محفوظ بتائے جاتے ہیں۔ یکتاؔ نے مراثی میں نعت نبی، منقبت آئمہ، معجزات کو رثائی ادب میں رچایا بسایا ہے۔ مرثیوں میں ساری اقدار یعنی رخصت، رجز، ساقی نامہ، بین بھی کچھ ملتا

ہے اور اس کا معیار بلند نظر آتا ہے۔ بعض مقامات پر ممدوح کی زبان سے مکالماتی انداز یا رجزیہ انداز میں مدح کراتے ہیں اور یہ مدح بھلی لگتی ہے۔ مثلاً اپنے ایک مرثیہ میں میں شیر خدا علی مرتضیٰ کی زبان فیض ترجمان سے رجزیہ انداز میں منقبت کا دلچسپ اور جداگانہ پہلو دیکھئے ۔

سب سلاطین زمانہ ہیں سلامی میرے ہیں سدا زیرِ نگیں خسروِ نامی میرے
اہل افلاک ہیں خدام دوامی میرے کیوں نہ ہوں جب شہ لولاک ہیں حامی میرے
نام سے میرے جما دینِ نبی کا سکہ
کشورِ دہر میں رائج ہے علی کا سکہ

یکتاؔ نے اپنے مرثیوں میں منظوم وقائع نگاری بھی کی ہے اور قرآن واحادیث کو بھی نظم کیا ہے جس میں وہ کامیاب ہوتے ہیں۔ اختصار کے پیش نظر ''واقعہ غدیر خم'' کو نظم کرنے کا دلنشیں انداز دیکھئے۔ مرحلہ غدیر میں نازل ہونے والی آیہ مبارکہ'' یا ایہا الرسول بلغ ما انزل علیک من ربک'' کا معنوی ترجمہ لائق تحسین ہے ۔

تاخیر اب روا نہیں، تعجیل کیجئے ''ما انزل علیک'' کی تعمیل کیجئے
ابلاغِ حق مرشد جبریل کیجئے ہاں اے رسولؐ دین کی تکمیل کیجئے
نائب کرو علیؑ کو مناسب عمل ہے یہ
ارشادِ کردگار کا بس ماحصل ہے یہ

ہوگا نہ انصرام جو اس کا ابھی ابھی تکمیل کی نہ تم نے رسالت کی یا نبی
کیا ہے اگر ہزار مخالف ہوں مدعی جس کا ہے کام، حافظ و ناصر بھی ہے وہی
دست خدائے ما، دل و جان پیمبر است
''دشمن اگر قوی است، نگہباں قوی تر است''

بلاشبہ یکتاؔ اکتسابی نہیں فطری شاعر تھے اور باکمال شاعر تھے۔ اپنے مراثی میں انہوں نے جگہ جگہ صنعت گری کی ہے جیسے مندرجہ ذیل بند میں ذوقافیتین (دوہرے قافیوں) کا استعمال بلکہ بیت میں تو تین قوافی کا استعمال کیا ہے ۔

خورشید مبیں ماہ درخشانِ رسالت تزئینِ زمیں، زینتِ ایوانِ امامت
سر دفترِ دیں مطلعِ دیوانِ امامت منہاجِ یقیں، شمعِ شبستانِ رسالت

قرآنِ مبیں صاحب تفسیر یہی ہے
خالق کا امیں کاتب تقدیر یہی ہے

☆☆☆☆☆

رضا نقوی :-

ولادت ۱۸۵۱ء۔ وفات ۱۹۲۶ء

نام سید رضا حسن، تخلص رضاؔ، وطن امروہہ۔ نقوی سید۔ ممتاز مرثیہ خواں، اس فن میں سیّد فدا علی نثر خواں لکھنوی کے شاگرد۔ لکھنؤ کے بعد یا شاید یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا لکھنؤ کی طرح امروہہ میں بھی فن مرثیہ گوئی نے عروج پایا۔ امروہہ سادات کے بیشتر مرثیہ خواں حضرات، مرثیہ پڑھتے پڑھتے شاعر بن گئے اور مرثیہ گو شعراء میں انہیں ممتاز مقام حاصل ہوا۔ سیّد رضا حسین رضا نقوی بھی ایسی ہی شخصیات میں سے ہیں جن کا مرثیے سے لگاؤ ابتداً مرثیہ خواں کی حیثیت سے ہوا اور آخر کار عمر کے آخری حصے میں اُنہوں نے کئی مرثیے کہے۔ اُن کے مراثی آج بھی امروہہ کی مجالس میں پڑھے جاتے ہیں۔ شاعری میں ابوالحسن فرقتی کے شاگرد ہوئے۔ سیّد رضا حسن رضا نقوی کے ایک مقبول مرثیے کے صرف دو بند یہاں نقل کئے جا رہے ہیں جو اُن کی پختہ کلامی اور مرثیہ گوئی کی سند ہو سکتے ہیں۔ یہ مرثیہ امام حسینؑ کی بیٹی صغرا کے احوال کا ہے۔ باپ بیٹی کے مکالمے کو رضا نے چشم تصور سے کس طرح دیکھا ہے، کیسے Visualize کیا ہے۔

بیٹی مجھے تم، یا شہ ابرار، نہ سمجھو میں لونڈی سکینہ کی ہوں دلدار نہ سمجھو
دیکھو، میں سبک ہوں گی، مجھے بار نہ سمجھو اے عیسیٰ دوراں، مجھے بیمار نہ سمجھو
سائے میں تمہارے نہ کبھی تپ سے جلوں گی
ہمراہ سواری کے پیادہ ہی چلوں گی

یہ سن کے کہا شاہ نے، مجبور ہوں صغرا کوفے کی طرف جانے کو مامور ہوں صغرا
غم کا مجھے کچھ غم نہیں، مسرور ہوں صغرا میں دل سے تو نزدیک ہوں، گو دور ہوں صغرا
تسکیں کے لئے پھر یہ کہا اشک بہا کر
لے جائیں گے ہم شکل پیمبر، تمہیں آکر

یہاں' اشک بہا کر' ضرورت شعری بھی ہے اور قدیم مرثیے کی ایک ادا یا انداز بھی لیکن

شاعر کی مہارت شعر گوئی کا مظہر اگلا بند ہے جو صغرا کے جواب کے طور پر کہا گیا ہے یہ بند خانودہ رسالت کے بچوں کی ذہانت اور دور بینی کا مظہر ہے۔

صغرا نے سنی جبکہ یہ تقریر پدر سے سمجھی کہ اُٹھا باپ کا سایہ میرے سر سے
شبیرؑ نہ پھر آئیں گے کوفے کے سفر سے یوں کہنے لگی دیکھ کے حسرت کی نظر سے
یہ کُھل گیا اب ساتھ نہ لے جاؤ گے بابا
اکبر کو نہ بھیجو گے، نہ بلواؤ گے بابا

☆☆☆☆☆

لکھنؤ کی طرح امروہہ میں بھی بہت سے شعراء کرام گذرے ہیں جنہوں نے اکاّدکاّ مرثیے کہے لیکن اُن کا کلام ضائع ہو گیا۔ ایسے شعراء میں چند نام ایسے ہیں جنہیں فراموش بھی نہیں کیا جا سکتا مگر بدقسمتی سے اُن کے مراثی میسر نہیں ہیں لہٰذا انہیں مرثیہ گو شعراء کی صف میں شمار کرنا بھی دشوار نظر آتا ہے۔ ایسے شعراء میں سید آل نبی وفاؔ، سید فرحت علی فرحتؔ، سید مجاہد حسین جوہرؔ، سید اصغر حسین طالبؔ، سید ابن الحسین کلیمؔ اور سید سبطین احمد سبطینؔ وغیرہم، پختہ گو شعراء بتائے جاتے ہیں مگر افسوس کہ آج ان کی مرثیہ گوئی کے نشان مٹ گئے ہیں اُان ناموں کا اور ایسے دگر ناموں کا اندراج اس لئے کیا جا رہا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا نام اس فہرست میں جلی ہو جہاں سے مرثیہ گوئی کا کا صلہ ملتا ہے اور ہم انہیں نظر انداز کر رہے ہوں۔ امید ہے ڈاکٹر عظیم امروہوی اس احتیاط میں میرے ہم نوا ہونگے۔ بے محل نہ ہوگا اگر ہم ان چند ناموں کا اندراج ہلالؔ، تمکینؔ، یکتاؔ اور رضاؔ (امروہوی شعراء) کے تسلسل میں کر دیں :

☆☆☆☆☆

آل نبی وفاؔ:-

(ولادت ۱۹۰۱ء وفات ۱۹۸۰ء۔)

وطن امروہہ، ملازمت کے سلسلے میں مراد آباد اور دوسری جگہوں پر رہے مگر پنشن پانے کے بعد امروہہ میں رہے اور وہیں انتقال کیا۔

شاعری کی نوک پلک سے واقف، اسرار و رموز شعر سے آگاہ، اور لفظوں کے استعمال پر قدرت رکھنے والے شاعر تھے۔ اپنی زندگی میں دو دیوان ترتیب دیئے۔ ایک دیوان غزلیات،

قطعات و رباعیات اور قصائد پر مشتمل تھا اور دوسرا اُن کے پانچ مرثیوں کا مجموعہ ''گلدستۂ وفا'' بتایا گیا ہے۔ دونوں دیوان شائع نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر عظیم امروہوی کی اطلاع کے مطابق ''گلدستۂ وفا'' کا قلمی نسخہ اُن کے فرزند کے پاس ہے۔ عظیم امروہوی نے اُن کے ایک مرثیہ کے دو بند نقل کئے ہیں ۔

لاش اکبر پہ سُن کر جو آئے صدا
رو کے کہتے تھے بیٹا یہ کیا ہو گیا
کیسا صدمہ فلک نے یہ ہمکو دیا
کیسی برباد میری یہ دولت ہوئی
کردیا رو کے بانو نے محشر بپا
اور تڑپتے تھے لاشہ پہ شاہِ ہُدا
اے وفا اب یہ طولِ سخن تا کُجا
کر فغاں تو کہ اکبر کی رحلت ہوئی

بیسویں صدی کی پانچویں چھٹی دھائی میں جو مراثی کہے جائیں وہ اگر اٹھارویں صدی کی ہیئت میں ہوں تو عجیب سا لگتا ہے۔ ایک طرف مرثیہ آگے بڑھ رہا ہے اور دوسری طرف وفا ایک صدی پہلے کی بات کرتے نظر آتے ہیں۔ بہر حال مرثیہ گوئی میں اُن کا رنگ کچھ بھی ہو اُن کے خلوص سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بس اسی حوالے سے اُن کا ذکر کیا جا رہا ہے، آخر اعمال کی کسوٹی نیت ہی تو ہے۔

☆☆☆☆☆

فرحت علی فرحت:-

(ولادت ۱۸۵۳ء، وفات ۱۹۳۸ء)

حضرت اولاد حسین سلیم امروہوی کے شاگرد تھے۔ اور یہ سلسلۂ تلمذ ہی اس بات کی دلیل ہے کہ فرحت نے جو مرثیے کہے ہوں گے وہ یقیناً معیاری ہوں گے۔ کہا جاتا ہے کہ فرحت نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا جو اُن کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ اُن کی موت کے بعد وہ قلمی نسخہ اُن کے داماد سیّد سرکار حیدر شاعر لے گئے۔ اللہ اللہ خیر صلّیٰ۔

☆☆☆☆☆

مجاہد حسین جوہرؔ:-

(ولادت ۱۸۷۴ء۔وفات ۱۹۳۸ء)

باقاعدہ شاعر تھے،مثنوی ''میوۂ عشق'' اور ''مسدس جوہر'' طبع ہو چکی ہیں،اُن کی رباعیاں آج بھی پڑھی جاتی ہیں۔انہوں نے مرثیے بھی کہے مگر لاولد تھے۔کلام کی حفاظت کرنے والا کوئی نہ تھا۔لہٰذا مراثی ضائع ہو گئے۔

☆☆☆☆☆

اصغر حسین طالبؔ:-

(ولادت ۱۸۷۶ء، وفات ۱۹۴۰ء)

ایک اور لاولد شاعر، جو حضرت صفیؔ لکھنوی کے شاگرد تھے،ملازمت کے سلسلے میں طالبؔ لکھنؤ میں رہے اور حضرت صفیؔ لکھنوی سے سلسلۂ تلمذ استوار ہوا۔انیسؔ کے مداح تھے۔ایک مرثیے میں میر انیسؔ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں ؎

تجھ پہ انیسؔ رحمتِ ذوالجلال ہے　　بس فنِ شاعری میں تجھی کو کمال ہے
آگے تیرے زبان فصیحوں کی لال ہے　　شاعر نہیں تو طوطیٔ شیریں مقال ہے
ہر ایک کی زبان پہ قصہ ہے بس تیرا
جو حسن شاعری ہے وہ حصہ ہے بس تیرا

ملازمت سے سبکدوش ہو کر طالبؔ واپس اپنے وطن امروہہ آ گئے تھے اور وہیں اُن کا انتقال ہوا لیکن کوئی نہیں جانتا کہ اُن کا غیر مطبوعہ کلام اور مراثی کہاں گئے۔

☆☆☆☆☆

سید ابن الحسن کلیمؔ:-

(۱۸۶۰ء۔۱۹۴۰ء)

شاعری میں فرزدقِ ہند حضرت شمیم امروہوی کے شاگرد تھے۔امروہہ وطن تھا لیکن ۱۹۱۰ عیسوی کے لگ بھگ حیدر آباد دکن چلے گئے تھے اور ۱۹۴۰ء میں وہیں انتقال ہوا۔وہیں اُن کا کلام ضائع ہو گیا۔امروہہ کے مرثیہ خواں حضرات کے بستوں میں کچھ مراثی ہیں جو مجالس میں پڑھے جاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

سبطین نقوی:-

(ولادت ۱۸۹۲ء)

ورثا موجود ہیں اور تاریخ یا سنہ وفات نہیں بتا سکتے۔ سید سبطین احمد سبطین نقوی، سوز خوان اور مرثیہ خوان تھے۔ نبیران سبطین، سلطان احمد اور عرفان احمد کراچی میں آن بسے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کے پاس سبطین کے چھ مرثیے موجود ہیں۔ عظیم امروہوی اُسے ملے ہیں اور مرثیوں کے مطلع نقل کیے ہیں لیکن مراثی حاصل نہ کر سکے نہ ہی یہ وجہ معلوم ہو سکی کہ اُردو اور فارسی کے پختہ گو شاعر سبطین کا کلام اس حد تک محفوظ کیوں ہے کہ گمنامی کے اندھیروں میں گم ہو جائے۔ امروہہ کے سوز خوان آج بھی سبطین کے سلام پڑھتے ہیں، لوگوں کو اُن کی رباعیات ابھی تک یاد ہیں مگر افسوس کہ اُن کے مراثی حتی کہ ان کی تاریخ وفات تک کسی کو یاد نہیں۔ شاید اُن کے بچوں کو بھی نہیں۔

☆☆☆☆☆

شاد عظیم آبادی:- (عظیم آباد)

ولادت جنوری ۱۸۴۶ء۔ وفات ۱۹۲۷ء

سیّد علی محمد شاد عظیم آبادی جنوری کی ایک صبح محلہ پورب دروازہ، عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ یہ اُن کی ننھیال تھی۔ پانچ برس کی عمر تک ننھیال میں رہے جہاں اکثر ایسے بزرگ بھی موجود تھے جو پانی پت اور دہلی کے خاص امراء اور اہل علم میں شامل تھے۔ دادھیال میں بھی امارت و خوشحالی کے ساتھ علمی چرچے رہتے تھے۔ "شاد کی کہانی، شاد کی زبانی" مرتبہ محمد مسلم عظیم آبادی سے پتہ چلتا ہے کہ شاد پیدائشی شاعر تھے۔ پانچ چھ برس کی عمر سے طبیعت رنگ دکھانے لگی تھی جس کا تذکرہ کتاب میں موجود ہے۔

جن دنوں عظیم آباد میں ناظر علی عبرتؔ، مرزا امان علی ذبیحؔ، مولانا محمد سعید حسرتؔ، مولوی محمد کاظم شفاؔ، شاہ فرحت میر۔ تصدق حسین زخمیؔ، نواب جعفر حسین فیضؔ اُس دور کے جلیل القدر شعراء کی عظیم آباد میں شعر خوانی کی محفلیں سجائی جاتی ہیں اس وقت شادؔ عظیم آبادی صرف سیّد علی محمد تھے اور اُن کی عمر آٹھ نو سال سے زیادہ نہ تھی لیکن وہ ہمہ وقت ان محافل میں برابر بیٹھے رہتے تھے۔ اُن کے بزرگوں کو اُن کا یہ شوق ناپسند تھا مگر وہ کسی نہ کسی طرح اُن محفلوں میں موجودگی کی صورت نکال لیتے تھے۔ عظیم آباد (پٹنہ) اور کلکتہ ہمیشہ سے "دو جڑواں شہروں" کی طرح رہے ہیں۔ عظیم آباد

کے ذبیح اور نواب جعفر حسین فیض کلکتہ جا کر مصحفی کے شاگرد ہو گئے تھے لہٰذا آتش و ناسخ کے معرکوں کا آنکھوں دیکھا حال سناتے تھے تو بارہ تیرہ برس کے علی محمد کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی کسی کے شاگرد بنیں اور ان محافل میں جا سکیں۔

سیّد ضمیر اختر نقوی نے لکھا ہے کہ شاد نے بچپن میں میر انیس اور مرزا دبیر کی محفلوں میں شرکت کی اور مرزا دبیر جب پٹنہ گئے تو یہ اُن کے شاگرد ہو گئے'' لیکن شاد کی سوانح حیات میں اس کے برعکس لکھا ہے کہ شاد، عظیم آباد کی ایک باکمال شخصیت سیّد الفت حسین فریاد کے شاگرد ہوئے اور محمد علی کو تخلص ''شاد'' بھی فریاد نے دیا۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں مشاعرے میں پہلی بار غزل پڑھی جس پر کسی نے خاص توجہ نہ دی۔ پندرہ دن بعد طرحی مشاعرہ تھا۔ مصرعِ طرح تھا'' بھلا کیا فائدہ سر پر جولوں احسان رضواں کے'' ـــــ شاد نے غزل پڑھی ۔

مٹے شمشیر چنگیزی نے اک عالم کے تن بے سر
ذرا جوہر تو اَب تو بھی دکھا شمشیر براں کے

تو عبرتی نے پکار کر کہا'' بھائی آپ کیا حضرت فریاد کے شاگرد ہیں'' تب اہل مشاعرہ کو معلوم ہوا۔ اس مرتبہ شاد کی غزل'' مشاقوں'' سے زیادہ چمک گئی تو لوگوں کے دلوں میں حسد پیدا ہونا شروع ہو گیا اور طرح طرح کے اعتراضات اُن کے اشعار پر ہونے لگے مگر ابھی وہ بزرگ جو فنِ شاعری کی ماہر تھے زندہ تھے اس لئے کسی کے بنائے کچھ نہ بنی۔ تب لوگوں نے شعروں میں تصرّفات کر کر کے شہرت دینی شروع کی۔ شاد نوعمر بھی تھے اور صاحب استعداد بھی۔ نوعمری کی ناتجربہ کاری کے سبب مشاقوں کی اغلاط پر ٹوک دیا کرتے تھے۔ ایسے لوگ اغلاط کو تو صحیح ثابت نہیں کر سکتے تھے البتہ عداوت پر اُتر آتے تھے۔

محرم ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) کا واقعہ ہے جب مرزا دبیر اور میر انیس دونوں عظیم آباد تشریف لائے۔ شاد کے بزرگوں سے مرزا دبیر کے ذاتی تعلقات تھے۔ شاد اپنے عم محترم سیّد محسن کے ہمراہ میرزا دبیر سے ملنے گئے۔ میرزا دبیر نے شاد کے مشاغل کے بارے میں پوچھا اور جب انہیں پتہ چلا کہ شعر بھی کہتے ہیں تو مرزا دبیر نے فرمایا'' آپ مرثیہ کہئے تو بہتر ہے۔ شاد نے گھر آ کر بیس پچیس بند مرثیے کے کہے اور چچا کو دکھائے، وہ خوش ہو کر مرزا دبیر کے پاس لے گئے اور التماس کی کہ وہ اصلاح کریں۔ مرزا دبیر نے پڑھوا کر سنے اور کہا لکھنؤ سے اصلاح کر کے بھیج دوں گا۔

عدیم الفرصتی کے سبب مرزا دبیرؔ نے دو سال کے بعد اصلاح کر کے وہ بند واپس بھیجے — غالباً اسی واقعہ سے یہ بات سامنے آئی کہ شادؔ، مرزا دبیرؔ کے شاگرد بھی تھے۔

۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) کا واقعہ ہے کہ مولوی محمد یحییٰ وکیل کے ہمراہ شاد بھی انیسؔ کا مرثیہ سننے گئے — واپس لوٹے تو مولوی محمد یحییٰ نے شادؔ سے کہا:

"ایسی عمدہ نظم اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی، اے کاش ہائے وائے بہت نہ ہوتی، سچے واقعات نظم ہوتے اور اہلبیت کا کیرکٹر عمدہ طور سے دکھایا جاتا۔"

شادؔ نے انیسؔ کی حمایت میں مولوی یحییٰ کی بات کی تردید تو کرنی چاہی مگر حقیقتاً ان کے الفاظ دل میں ایسے اُتر گئے کہ اگلے روز جا کر میر مونسؔ سے کہا:

"آپ لوگ ایسا مرثیہ کیوں نظم نہیں کرتے کہ روایاتِ صحیح کی پابندی ہو، صبر و تسلیم و رضا جو شیوہ اہلبیت تھا وہ پوری طرح دکھایا جائے"

میر مونسؔ نے کہا سب کے سب اسی طرح تو نظم کرتے آئے ہیں البتہ اگر بڑے بھائی صاحب طریقہ بدل دیں تو ہم لوگ بھی پیروی کریں (بڑے بھائی صاحب سے مراد میر انیسؔ تھے) شادؔ نے عرض کیا کہ میں اُن سے نہیں کہہ سکتا، آپ اُن سے ضرور کہیے۔

چند دنوں بعد میر مونسؔ نے جب میر انیسؔ سے کہا تو میر انیسؔ نے کبیدہ خاطر ہو کر جواب دیا اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ "اگر محض روایات صحیحہ اور تاریخی واقعات تک مرثیے کو محدود رکھا جائے تو موثر نہ ہوگا۔ جو صاحب ہم پر ایسی فرمائشیں کرتے ہیں وہ خود دس بند نظم کر کے دیکھیں تو حال معلوم ہو۔

میر مونسؔ نے شادؔ سے میر انیسؔ کا قول بیان کیا تو شادؔ نے سوچا ایک مرثیہ کہہ کر میر انیسؔ کے سامنے پیش کریں۔ شادؔ نے دیانتداری سے اقرار کیا ہے کہ اس دن سے لے کر بیس برس تک وہ روزانہ دس بیس بند کہتے تھے اور دوسرے دن دیکھتے تو ضائع کر دیتے تھے — بیس سال کے عرصے میں وہ مرثیہ نہ ہو سکا جس کا ارادہ تھا، یہاں تک کہ میر مونسؔ اور میر انیسؔ دونوں کا انتقال ہو گیا لیکن شاد اپنی دھن میں لگے رہے اور آخر کار ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۴ء) میں دو سو بند کا ایک مرثیہ حسبِ خواہش نظم ہو گیا — سیّد غیاث الدین وکیل نے نواب بہادر کے امام باڑے میں پڑھا۔

مجلس میں شائقین و عمائد جمع تھے۔ سب نے گمان کیا کہ میر انیسؔ کا مرثیہ ہے۔ معلوم ہوا کہ شادؔ کا ہے تو نواب بہادر اور عمائدین نے تعریف کی۔

۱۸۸۹ء کا واقعہ ہے۔ شادؔ میر انیسؔ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے۔ دروازے پر میر خورشید علی نفیسؔ سے ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا علی محمد شادؔ ہیں تو با اصرار اپنے گھر لے گئے۔ باتوں باتوں میں شادؔ نے میر نفیسؔ سے بھی کہا کہ اب زمانہ دوسرا ہے مرثیوں کا رنگ بدلنا ضروری ہے میر نفیسؔ نے بھی وہی جواب دیا جو میر انیسؔ نے دیا تھا۔ شادؔ نے دو تین بند مرثیے کے سنائے۔ میر نفیسؔ نے اصرار کیا اور شادؔ صاحب نے پورا مرثیہ منگوا کر سنایا۔ اس صحبت میں میر محمد علی عارفؔ (میر نفیسؔ کے نواسے) بھی تھے، اس مرثیہ کا ایک بند یہ بھی تھا۔

بچوں کو تین دن سے تھی جو انتہا کی پیاس　　بیٹھے ہوئے تھے ماؤں کے پہلو میں سب اُداس
بازار موت گرم تھا اور سب کے دل کو یاس　　لیکن یہ کیا مجال کہ ظاہر کریں ہراس
رونے کو اضطراب کو ٹالے ہوئے تھے وہ
سیدانیوں کی گود کے پالے ہوئے تھے وہ

راقم الحروف نے "مرثیہ نظم کی اصناف میں" یہی کہنے کی تو جسارت کی تھی کہ اس حقیقت اور سچائی کے باوجود کہ میر انیسؔ نہ ہوتے تو شاید آج مرثیہ ادب کی اُن رفعتوں پر متمکن نہ ہوتا جس پر آج ہے لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ میر انیسؔ کے بعد مرثیہ میں ارتقاء کی گنجائش نہیں دوسرے یہ کہ میر انیسؔ اور دبستان لکھنؤ کے کم و بیش سارے شعراء نے بین کے حصے میں یہ احتیاط نہیں کی کہ خانوادۂ رسالت کے کردار مجروح نہ ہوں یہی بات جب شادؔ عظیم آبادی کو مطالعہ کرتے وقت راقم الحروف کے سامنے آئی کہ عظیم آباد کے ایک دانشور مولوی یحیٰؔ وکیل نے بھی یہی محسوس کیا تھا کہ اہل بیت کے "کیرکٹر" (کردار) پر حرف آیا ہے۔ اور باوجودیکہ شادؔ عظیم آبادی نے ابتدا میں بر بنائے عقیدت و احترام میر انیسؔ کے دفاع کی اپنی سی کوشش کی مگر مولوی یحیٰؔ کی بات اُن کے بھی دل میں اُتر گئی تھی۔

پیغمبران سخن میں شادؔ نے کہا ہے کہ:

"جتنی قابل اعتبار تاریخیں ہیں وہ یہی بتاتی ہیں کہ مصائب کربلا میں امام حسینؑ اور اہل بیت کرام نے وہ صبر و استقلال اور خود داری کی

جس کی نظیر نہیں ملتی۔"

(پیمبران سخن، شاد عظیم آبادی، مطبوعہ لاہور۔ ص ۲۲۲)

امام کی خودداری کا یہ حال تھا کہ تادم آخر کوئی کلمہ برخلاف صبر منہ سے نہ نکالا۔ امام تو امام تھے انکی عورتوں اور بچوں کی زبان سے بھی منافیِ شانِ خاندانِ نبوّت کسی نے کوئی کلمہ نہ سنا۔

ڈاکٹر ہلال نقوی نے بھی تسلیم کیا ہے کہ

"مرثیوں میں مصائب وشہادت کا بیانیہ حصّہ ناقدوں میں سب سے زیادہ موضوع بنا۔"

(بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، ص ۱۲۷)

"سلسبیل ہدایت" میں سودا نے بھی اس پر اظہارِ رائے کیا کہ:

"انیس نے "مختصر پڑھ کے رُلا دینے کا سامان ہے جدا" کہہ کر بیانِ مصائب میں جامعیت اور اختصار کو اُجاگر کیا ہے۔ دبیر کے مرثیوں میں اس کی افراط ہے۔ شاد اس ضمن میں دبیر کے نہیں انیس کے پیروکار ہیں خصوصاً بین میں وہ محتاط رَدیہ اختیار کرتے ہیں"

ہماری اس کتاب کا موضوع یہ نہیں کہ بین میں میر انیس نے اختصار کیا ہے یا مرزا دبیر نے۔ اس بحث کے لئے علیحدہ کام کی ضرورت ہے۔ اس وقت شاد کے حوالے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ شاد، بین میں انیس کے پیروکار ہیں یا یہ کہ بین کے معاملے میں شاد کی فکر اور شاد کا انداز جداگانہ ہے۔ میر مونس سے شاد کی بے تکلفی تھی۔ اس بے تکلفی کے تحت شاد نے میر مونس کے ذریعے میر انیس تک اپنی رائے پہنچائی تھی جسے میر انیس نے رد کر دیا تھا۔ پھر فرزند انیس، میر نفیس نے بھی وہی جواب دیا۔ میر نفیس کے نواسے میر عارف نے بھی اس خیال کو ردّ کیا۔ میر مونس نے تو صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ بڑے بھائی صاحب لکھیں تو ہم پیروی کریں۔ یہ بات شاد نے مرزا دبیر سے کب کہی جسے اُنہوں نے تسلیم نہیں کیا ہے ایسی کوئی تحریر نہیں ملتی۔ پس اگر میر انیس کے ہاں بین کا حصّہ مرزا دبیر کے مقابلے میں کم ہے تو اس لئے نہیں کہ اُن کے پیش نظر وہ بات تھی جو شاد اور دیگر ناقدین نے کہی تھی۔ میر انیس کے آخری مرثیے تک بین کربلا میں موجود خانوادہ رسالت کی محترم خواتین سے کرائے گئے ہیں۔ خود امام حسینؑ بار بار روتے نظر آتے ہیں۔

شادؔ نے محمد یحیٰ وکیل کی طرف سے کیئے گئے اعتراض کو اپنا شعار بنالیا تھا کہ "بین" میں آلِ رسولؐ کے کردار مجروح نہ ہوں۔ شادؔ کا یہ انداز ہی جدید مرثیے کی ابتداء بن جاتی ہے۔

بس روک لو قدم نہ لکھو عامیانہ بین   کچھ کم ہے یہ کہ ذبح ہوئے شاہِ مشرقین
اس بین سے نہ صبر میں آجائے فرق بین   کافی ہے بس یہ بیت پئے ماتمِ حسینؑ

چوں خوں ز حلقِ تشنۂ او بر زمیں رسید
طوفاں بر آسمان زغبارش ہمیں رسید

شادؔ عظیم آبادی جدید مرثیے کے قافلہ سالاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ مرثیہ گو شاعر ہی نہیں بیک وقت مرثیہ کے نقاد اور تاریخ مرثیہ کو ترتیب دینے والے محققین میں بھی شامل ہیں۔۔۔ اتنی ساری جہتوں ہر کام کرنے والی شخصیت کے بارے میں پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی نے لکھا ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا تھا کہ سید صاحب (شادؔ) پر اُن کے گم نام پس پردہ حریف اعتراضات کی بھرمار نہ کرتے ہوں۔ منشی محمد امیر کے صاحبزادے کے مکتب پر اگر شادؔ عظیم آبادی نے ۵۸۰ شعر کہہ ڈالے تو حریفوں نے مشہور کردیا کہ شیخ امان علی سحرؔ کے قصیدے کا سرقہ ہے۔ قصیدہ منگوایا گیا تو الزام غلط نکلا۔۔۔۔۔ ایک مرتبہ شادؔ عظیم آبادی کا ایک مطلع بہت مشہور ہوا ؎

پھر گئے راستے سے وہ گرد و غبار دیکھ کر
رہ گئی میری بیکسی سوئے مزار دیکھ کر

یارانِ فتنہ ساز نے مشہور کرایا کہ یہ مطلع راسخؔ کا ہے اور دیوان میں موجود ہے۔ مولوی آلِ احمد نے راسخؔ کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دیوان کھنگال ڈالے، الزام غلط تھا۔۔۔ مختصر یہ کہ وہ لوگ جو ادب میں شادؔ عظیم آبادی کے برابر نہیں آسکتے تھے وہ اس کوشش میں لگے رہے کہ اُن کی ادبی حیثیت کو کمتر ثابت کردیں۔ مخالفین کبھی کھل کر سامنے نہ آئے بلکہ چھپ چھپ کر الزام تراشی کرتے رہے۔ بسا اوقات بزدلوں کی الزام تراشی سے شادؔ دل برداشتہ ہوجاتے تھے، خاص طور پر عمر کے آخری حصے میں، جب کثرتِ مطالعہ اور کم خوابی سے اُن کی صحت خراب ہوگئی تھی الزام تراشیوں سے شادؔ بہت نازک مزاج ہوگئے تھے لیکن علم وادب کی مملکت میں شادؔ عظیم آبادی کا نام ہی باقی ہے اعتراض کرنے والے نیست و نابود ہوگئے ہیں۔ شادؔ کی حیات اور اُن کے ادب کو پڑھنے سے عرفیؔ کا شعر سمجھ میں آجاتا ہے ؎

عرفی تو میندیش زِ غوغائے رقیباں
آوازِ سگاں کم نہ کند رزقِ گدا را

ہر دور میں سچے اور تخلیقی قلمکاروں کو آوازِ سگاں سے واسطہ پڑا ہے۔ وہ عظیم آباد میں ہو یا لندن میں، وقت کا ایک ہی فیصلہ ہے کہ شاعر یا ادیب اپنے تخلیق کیے ہوئے ادب کی بنیاد پر ہی زندہ رہ سکتا ہے کسی کی تکذیب، کسی کی کردار کشی کر کے نہیں۔ کم ظرفوں کی الزام تراشیاں یا بزدلوں کی بے نام کاوشیں خود بخود دم توڑ دیتی ہیں، آج کہاں ہیں شادؔ عظیم آبادی پر بہتان لگانے والے، پسِ پردہ رہ کر انہیں بدنام کرنے والے۔ شادؔ تو آج بھی زندہ ہیں، آج بھی باعزت ہیں، آج بھی شادؔ ہیں۔

☆☆☆☆☆

بہار حسین آبادی:- (بہار)

ولادت ۱۸۶۴ء، وفات ۱۹۲۹ء

نام شاہ محمد۔ ہاشم، تخلص بہار، وطنِ مالوف حسین آباد (بہار)۔ بیسوی صدی کے شاعر اور مرثیہ نگار جن کی شاعری دو صدیوں میں بٹی ہوئی ہے ان کی ولادت انیسویں صدی کے آخری حصے میں اور وفات بیسویں صدی کی تیسری دھائی میں ہوئی ہے۔ مرثیہ گوئی کی طرف ۱۹۲۰ء میں آئے تھے، پہلا مرثیہ ''نمودِ سخن'' ۱۹۲۰ء میں کہا تھا جو اکیاسی بند پر مشتمل ہے۔ اس مرثیے میں نواسۂ رسول سیّدنا امام حسین علیہ اسلام کی ولادت باسعادت اور رسول اکرمؐ کے ذریعے ان کا نام رکھنے کا احوال ہے۔ اس موقع سے بہارؔ کے کہے ہوئے مرثیے کا چہرہ بھی سراپا بہار ہے ۔

زمین نظم پہ کیا خوش نما ہے باغِ سخن
اسی ریاض سے سب پھول ہیں چراغِ سخن

مرثیے میں جشنِ ولادت سے شہادت تک ایک پختہ گو شاعر کی طرح لفظوں سے منظر کشی کی گئی ہے۔ حضرت بہارؔ حسین آبادی نے کل سات مرثیے کہے ہیں۔ اُن کے مراثی کا مجموعہ ''بہار حسین آبادی کے مراثی'' ۱۹۹۶ء میں بہار فاونڈیشن کے زیرِ اہتمام اُردو مرکز عظیم آباد نے شائع کیا ہے۔ اُن کا ایک مرثیہ ''قصرِ جناں'' بہت مقبول مرثیہ ہے جس کے بارے میں ممتاز دانشور جابر حسین نے لکھا ہے کہ:

''قصرِ جناں اس لحاظ سے منفرد مرثیہ ہے کہ اس میں شاعر کے

زورِ تخیل اور زورِ بیان سے روزِ عاشور، جنت کا ایک منظر ڈرامائی انداز میں
پیش کیا ہے کہ انبیاء کرام، رسول اکرمؐ اور صحابہ کرام اس روز کس طرح
جنت میں تصویرِ یاس نظر آرہے ہیں"

یہ مرثیہ ۱۵۷ بندوں پر مشتمل ہیں اور اس کا سالِ تخلیق ۱۹۲۶ء ہے۔ جوان کا آخری مرثیہ
ہے کہ اُن کی مرثیہ گوئی کا زمانہ ۱۹۲۰ء سے شروع ہو کر اُن کی عمر کی آخری دہائی میں ۱۹۲۶ء تک ہے۔

جناں میں قصرِ نبیؐ خود بخود اُداس ہے آج — سرور کا جو محل تھا، مقامِ یاس ہے آج
تمام قدسیوں کا ماتمی لباس ہے آج — جمال زرد ہے، حوروں پہ وہ لباس ہے آج
ملک خموش ہیں، چہرے کا رنگ فق فق ہے
نہ حسن ہے در و دیوار پر نہ رونق ہے

کھڑے ہیں صحنِ گلستاں میں دل گرفتہ شجر — نہ مسکراتے ہیں غنچے نہ ہنستے ہیں گل تر
نہ سبز شاخ نہ شاداب کوئی برگ و ثمر — چمن اداس، ہوا ست، دل گداز اثر
نشیمنوں سے طیور اپنے سر نکالے ہوئے
ہر اک طرف نگراں ہیں جگر سنبھالے ہوئے

بہار کے ایک مرثیے "سرمایۂ تحسین" پر جناب ش۔ اختر رقم طراز ہیں:۔

"عام طور پر مرثیوں میں مصائب کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی
ہے۔ بہار صاحب نے بھی مصائب بیان کیے لیکن چند ایسے مسائل کی
طرف بھی توجہ مبذول کی ہے جو اس سے پہلے مرثیے میں بیاں نہیں کیے
گئے۔اُن کے مراثی ڈرامائی شاعری کی بہترین مثالیں ہیں۔ قصیدوں
میں بھی اُن کا ایک منفرد رنگ ہے جو بقول جمیل مظہری ان کی شاعری کو
اوروں سے ممتاز کرتا ہے۔

مرثیہ 'سرمایۂ تحسین' ٦٦ بندوں پر مشتمل ہے۔ ابتدا آفاقی سچائی سے ہوتی ہے ۔

سچ ہے کہ مرکب ہے بشر سہو و خطا سے — آنکھیں ہیں کہ مخمور ہیں عالم کی فضا سے
تسکین نہیں سیرِ چمن ہوش رُبا سے — قابو میں دل اک آن نہیں حرص و ہوا سے

اس مخمصے میں کیا بشر آرام کرے گا
مختل ہے دماغ اس کا تو کیا کام کرے گا
دکھلاتی ہے ہر دم نئی شے قوتِ تخئیل تحصیل پہ تحصیل ہے، تحویل پہ تحویل
نہ خواب میں راحت، یہ خیالات میں تسہیل گھٹتا ہے دم اور روح ہوئی جاتی ہے تحلیل
آٹھوں پہر اوہام سے فرصت جو نہیں ہے
اور اک پسِ پردۂ دل، سوگ نشیں ہے

مصائب کا بند۔

خاتون جناں روتی ہیں یاں کھولے ہوئے بال گریاں ہیں نبی آنکھوں پہ رکھے ہوئے رومال
افراطِ بکا سے ہے علی کا بھی زبوں حال اور لاشۂ شبیر ہے بے سر مع اطفال
پامال تنِ سختِ جگر دیکھ رہے ہیں
مقتل کا سماں پیشِ نظر دیکھ رہے ہیں

بہار حسین آبادی کا ایک اور مقبول مرثیہ ''گنجِ شہیداں'' ہے جو ۱۹۲۳ء میں کہا گیا ہے یہ مرثیہ نجم آفندی کے نام معنون ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہار حسین آبادی نہ صرف صوبۂ بہار بلکہ دنیائے اردو کے بڑے شاعروں میں شمار ہوتے ہیں اور ان کے سارے مراثی بھی مقبول ہیں۔ علامہ جمیل مظہری نے ان کی مرثیہ نگاری کو سراہا ہے۔ شمیم اختر نے ان کی رثائی شاعری کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ دیگر ناقدین نے ان کے مراثی میں جدت کے پہلو تلاش کئے ہیں مگر وہ بہر حال کلاسیکی مرثیے کو آگے بڑھانے والے شعراء میں ایک معتبر نام ہیں۔

☆☆☆☆☆

نصرت لکھنوی:-

ولادت ۱۸۳۸ء۔ وفات ۱۹۲۹ء

نام یعقوب علی خان، تخلص نصرت۔ لکھنؤ کے اُن بہت سے گمنام شعراء میں ایک یعقوب علی خان نصرت بھی ہیں جن کی آواز میر انیس اور خاندان انیس اور مرزا دبیر، مرزا اوج لکھنوی اور ان کے شاگردوں کے دھوم دھڑ گے میں سنی نہ جا سکی۔ ستارے صرف رات کی تاریکی میں چمکتے ہیں چاند سورج کی روشنی ہو تو ستارے وجود کھو بیٹھتے ہیں۔ لکھنؤ میں ایک صدی سے زیادہ عرصے تک

انیسؔ و دبیرؔ اور اُن کے خانوادے کے شعراء مطلعِ علم و ادب پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکتے رہے۔ اُجالوں کی اسی فراوانی میں بہت سے چراغ اپنا نور نہ بکھیر سکے اور بجھ گئے۔ نصرتؔ کا لکھنؤ کے محلہ گولہ گنج میں قیام تھا۔ قاریٔ قرآن اور عالمِ دین تھے۔ چند مرثیے شائع ہوئے، کہا جاتا ہے کہ زیادہ تر مرثیے غیر مطبوعہ ہیں، کہاں ہیں۔ کون جانے، البتہ اُن کا ایک مرثیہ روشنی میں آ گیا ؎

"آمد ہے رن میں ضیغم شیرِ الہ کی"

اس مرثیے کے ۵۱ بند ہیں۔ نصرتؔ نے اس مرثیے میں صنعتوں کو برتنے میں مہارت دکھائی ہے۔ یہ مرثیہ ۱۸۹۰ء میں شائع ہوا تھا (مجموعہ صنائع یعقوب علی خاں نصرتؔ ۱۸۹۰ء) ڈاکٹر ہلال نقوی نے ان تمام صنعتوں کو نقل کیا ہے جن کے سبب یہ مرثیہ عروض کی کتاب معلوم ہوتا ہے۔۔۔ اُنہوں نے اس مرثیے میں جن صنعتوں کو برتنے میں اُستادی دکھائی ہے وہ یہ ہیں۔ صنعتِ مرصع، صنعتِ جمع، صنعتِ عکس، صنعتِ تقسیم، صنعتِ ردّ العجز علی الصدر، صنعتِ ذوقافیتین، صنعتِ تجنیس، صنعتِ توشیح، صنعتِ رجوع، صنعتِ لف و نشر مرتب، صنعتِ سیاق الاعداد، صنعتِ تفریق، صنعتِ مراعاۃ النظیر، صنعتِ تحت النقاط، صنعتِ فوق النقاط، صنعتِ منقوط و غیر منقوط، صنعتِ مقلوب مستوی، صنعتِ مقطع، صنعتِ طرز العکس، صنعتِ عکس۔ ان صنعتوں میں نصرتؔ کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

تیغ دو دم کو	دیکھا تو	بھاگے	وہ دس ہزار
دیکھا تو	آ رہی ہے وہ مثلِ	سیاہ	مار
بھاگے	سیاہ	کار کے لشکر کے سب	سوار
وہ دس ہزار	مار	سوار	جگر فگار

آئی تھی تیغ کو یہ صدا قتل گاہ میں سر موزیوں کے بڑھ کے کچل ڈال راہ میں

اب اگر مصرع ہائے ۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴ کو اوپر سے نیچے کی جانب پڑھا جائے تو وہی مصرع ہوگا جو دائیں سے بائیں پڑھنے پر ہوتا ہے۔

علم عروض کی یہ مہارت، اور الفاظ کی یہ بازی گری مرثیے کے ارتقاء میں کوئی کردار ادا نہ کر سکی اسی لئے نصرتؔ کی طرح کے سینکڑوں مرثیہ گو شعراء کو وقت نے فراموش کر دیا ہے۔

☆☆☆☆☆

دولہا صاحب عروج:- (لکھنؤ)

ولادت ۱۸۶۵ء وفات ۱۹۳۰ء

میر انیسؔ کے پوتے، میر نفیسؔ کے فرزند، مرثیہ نگاری کی طرف بہت دیر سے متوجہ ہوئے۔ میر نفیسؔ کی زندگی میں کوئی مرثیہ نہ کہا۔ میر نفیسؔ کے انتقال کے بعد پہلا مرثیہ کہا۔ مرثیہ پڑھنے میں بہت شہرت حاصل کی۔

مسعود حسن ادیب نے لکھا ہے کہ لکھنؤ میں اُن کی دو سالانہ مجالس قابل ذکر تھیں۔ ایک اکرام اللہ خاں کے امام باڑے میں اور دوسری قابل ذکر مجلس دلآرام کی بارہ دری میں ہوا کرتی تھی۔ یہ مجلس میر انیسؔ کے زمانے میں قائم ہوئی تھی۔ میر انیسؔ کے بعد میر نفیسؔ یہ مجلس پڑھتے رہے۔ میر نفیسؔ کے بعد دولہا صاحب عروجؔ اس مجلس میں نیا مرثیہ پڑھتے تھے۔ عروج صاحب کو لکھنؤ سے باہر بھی مرثیہ پڑھنے کے لئے بلایا جاتا تھا۔ ریاست محمود آباد، ریاست اصغر آباد، ضلع علی گڑھ، ریاست بلوہ ضلع سیتاپور اور حیدر آباد میں نواب تہوّر جنگ بہادر کے ہاں۔ ان ساری مجالس میں عروجؔ مرثیہ پڑھتے تھے۔۔۔ آخری مجلس لکھنؤ کے آصفی امام باڑے میں خان بہادر سید ابو محمد نے مارچ ۱۹۳۰ء میں کرائی تھی جس میں عروجؔ نے نیا مرثیہ پڑھا تھا۔ ہر شخص اُن کے کمال فن کا معترف تھا پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

دولہا صاحب عروجؔ نے صرف پچیس مرثیے کہے ہیں وہ ان خوش نصیب شعرا میں ہیں جن کی قدر و منزلت اُن کی زندگی میں بہت ہوئی۔ عوام و خواص کی قدردانی کے علاوہ اُن کے کلام کی سرکاری طور پر بھی قدردانی کی گئی۔ اُن کے تین مرثیوں کا ایک مجموعہ سرکاری ادبی انجمن ''ہندوستان اکیڈمی'' نے ۱۹۲۹ء میں سال کی بہترین تصنیف قرار دے کر شائع کیا۔ اس کے علاوہ دولہا صاحب عروجؔ کا جو کلام چھپا، وہ راجہ صاحب محمود آباد نے شائع کرایا۔۔۔ مرثیے میں بین کی منزل پر دولہا صاحب عروج زیادہ تر اتباعِ انیسؔ کرتے ہیں لیکن کہیں محتاط بھی نظر آتے ہیں اس کی مثال امام حسینؑ کے احوال پر ایک مرثیہ ''رنگیں ہے گلستانِ سخن کس کی ثنا سے''

فرما کے یہ گھر میں گئے سلطانِ دوعالم　　آئے طرفِ عابدِ بیمار بصد غم
غش سے انہیں چونکا کے یہ بولے شہِ اکرم　　خالق کی حفاظت میں تمہیں چھوڑتے ہیں ہم

زنداں کی صعوبت سے نہ گھبرائیو بیٹا
جو حکم خدا ہے وہ بجالائیو بیٹا

دیکھئے مصائب اور بین کے مروجہ انداز کو دولہا صاحب عروج نے نئی شکل دی ہے۔

پھر درگہ باری میں یہ کہنے لگے سرور ان پھولوں کو دیکھا نہیں جاتا ہے زمیں پر
حسرت ہے کہ اب جلد پھرے حلق پہ خنجر دے صبر کی طاقت مجھے اے داور داور
سہہ لوں بخوشی جو غم و اندوہ و بلا ہو
وہ صبر مجھے دے جو کسی کو نہ دیا ہو

پھر خوں میں ہو تر لاشۂ اکبر تو نہ روؤں پھر قتل ہوں عباسؑ دلاور تو نہ روؤں
لٹ جائے دوبارا جو بھرا گھر تو نہ روؤں ہاتھوں پہ میرے ذبح ہو اصغر تو نہ روؤں
جز شکر زباں سے کبھی فریاد نہ نکلے
بھولے رہیں سب، دل سے تیری یاد نہ نکلے

☆☆☆☆☆

مہاراجہ محمد علی محب:- (محمود آباد)

ولادت ۱۸۷۸ء۔ وفات ۱۹۳۱ء

مہاراجہ صاحب محمود آباد محمد علی محبؔ، میر عارفؔ کے شاگرد تھے اور میر انیسؔ و میر مونسؔ کے رنگ میں مرثیے کہتے تھے۔ مہاراجہ صاحب مرثیہ گو شعراء کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی میں پیش پیش رہتے تھے۔ ان کے چھوٹے فرزند مہاراج کمار نے "دارالتصنیف امیریہ" لکھنؤ سے ان کے مرثیے شائع کرائے تھے۔ مہاراجہ محمد علی محبؔ کے مراثی قدیم مرثیے کی ساری شرائط پوری کرتے تھے۔ اس لئے اُن کا نام مرثیے کی کلاسیکی روایت کو برقرار رکھنے والے مرثیہ گو شعرا میں شمار کیا جاتا ہے۔ اُن کا ایک مرثیہ ایک سے زیادہ جگہ نقل ہوا ہے۔ یہ مرثیہ 'عزاداروں سے خطاب' سے شروع ہوتا لیکن یہ خطاب جوشؔ کے 'عزادارانِ حسینؑ سے خطاب' سے بالکل مختلف ہے اور اس کے برعکس ہے۔ جوشؔ نے عزاداروں کے رویے پر تنقید کی تھی۔ مہاراجہ محمد علی محب نے عزاداروں کو خوشخبری دی ہے۔

اے محبؔ خوب ہوئی مجلسِ ماتم میں بکا مرتضیٰ روتے ہیں، گریاں ہیں رسولؐ دوسرا

جلوہ فرما ہیں پسِ پردہ جنابِ زہراؑ　　حق میں ہم سب کے بصد عجز یہ کرتی ہیں دعا[۱]

حشر تک خوش رہیں منہ اشکوں سے دھونے والے
یا الٰہی جئیں شبیرؑ کے رونے والے

یہ چمن تازہ و خرم ہے انہیں کے دم سے　　مشتہر خلق میں یہ غم ہے انہیں کے دم سے
روزِ عاشور، محرم ہے انہیں کے دم سے　　میرے مظلوم کا ماتم ہے انہیں کے دم سے[۲]

پایۂ عرش قیامت میں ہلائے گی بتولؑ
یہ نہ جائیں گے تو جنت میں نہ جائے گی بتولؑ

سن لیا اہلِ عزا آپ نے اپنا اعزاز　　آپ کو رحمت باری نے کیا سرافراز
آپ میں اُمتِ محبوب خدا میں مختار　　آپ کی ذات پہ خود حیدرؑ و زہراؑ کو ہے ناز[۳]

جان دینے کو غمِ شاہ میں تیار ہیں آپ
کیوں نہ ہو کیسے بہادر کے عزادار ہیں آپ

جن میں حیدرؑ کی ہے طاقت وہ بہادر ہیں حسینؑ　　جن سے ہے دین کی عزت وہ بہادر ہیں حسینؑ
جن کی جرأت کی ہے شہرت وہ بہادر ہیں حسینؑ　　ختم جن پر ہے شجاعت وہ بہادر ہیں حسینؑ[۴]

آپ کا رنج کسی طرح گوارا نہ کیا
حد یہ ہے آپ سے اولاد کو پیارا نہ کیا

مختصر حالِ شبِ غم کا بیاں ہوتا ہے　　گریہ و زاری کا، ماتم کا بیاں ہوتا ہے
بیکسیٔ شہِ عالم کا بیاں ہوتا ہے　　شبِ عاشورِ محرم کا بیاں ہوتا ہے

رات آتی نہیں، دنیا پہ بلا آتی ہے
دم بدم دشت سے رونے کی صدا آتی ہے

پورا مرثیہ مصائب کا بیان ہے جن میں شب عاشور ایک ایک خیمے کا احوال نظم کیا گیا ہے۔ قدیم مرثیے میں بین کو یوں بھی افضلیت حاصل ہے کہ مرثیے کا مقصد ہی گریہ و بکا ہے بین کے معاملے میں مہاراجہ محمد علی محب کے پیشِ نظر دبستانِ انیسؔ و دبیرؔ کے بین ہیں۔

بیوۂ مسلمِ مظلوم کی حالت ہے تباہ　　بین کرتی ہیں یہ سر پیٹ کے با نالۂ و آہ
کی نہ صاحب میری تنہائی و غربت پہ نگاہ[۱۴]　　چار بیٹوں میں سدھارے ہوئے ہیں دو ہمراہ

حیف تقدیر میں ان سے بھی جدا ہونا ہے
دو کو، کل شاہ کے قدموں پہ فدا ہونا ہے

شب ہفتم سے نہیں سوتی ہیں دم بھر بانو متردّد ہیں پئے عابدِ مضطر بانو
کبھی روتی ہیں برائے علی اکبر بانو ۱۵ کبھی دیکھ آتی ہیں گہوارۂ اصغر بانو
اشک بھرلاتی ہیں بے شیر کے تکنے پہ کبھی
آہیں بھرتی ہیں سکینہ کے بلکنے پہ کبھی

عرض کرتی ہے سکینہ کہ ہے چلنا دشوار تابہ در جانے کی طاقت نہیں مجھ میں زنہار
یاں یہ باتیں تھیں کہ خود آئے شہِ عرش وقار ۱۵ رو دیے دیکھ کے بیٹی کو امامِ ابرار
پھر یہ فرمایا کہ آنسو نہ بہاؤ بی بی
کس لئے روتی ہو آؤ اِدھر آؤ بی بی

عرض معصوم نے کی خشک زباں دکھلا کر قلب جلتا ہے پھُنکا جاتا ہے سینے میں جگر
میں تو میں اُن کی خبر لیجئے اب یا سرور ۱۸ پیاس کے مارے ہیں گہوارے میں بیہوش اصغر
آج اماں کو اشارے سے بلاتے بھی نہیں
مسکراتے بھی نہیں ہوش میں آتے بھی نہیں

سب تو روتے ہیں مگر بنتِ علی ہیں خاموش شکلِ تصویر ہیں سرتا بہ قدم غم کا ہے جوش
دھیان اس وقت ہے مقنع کا نہ چادر کا ہے ہوش ۲۱ فرق سے ڈھل کے ردا آگئی ہے تا سرِ دوش
بول سکتی ہے نہ کچھ اور نہ رو سکتی ہیں
یاس سے بیٹھی ہوئی بھائی کا منہ تکتی ہیں

دل میں کچھ سوچ کے زینب نے یہ فضہ سے کہا ہیں کہاں عون و محمد کو بلانا تو ذرا
حکم یہ سنتے ہی حاضر ہوئے وہ ماہ لقا ۲۶ آئے نزدیک بجالائے ادب سے مجرا
دیکھا مغموم تو وہ رشکِ قمر بیٹھ گئے
سامنے ماں کے جھکائے ہوئے سر بیٹھ گئے

روایت کا ضعیف ہونا اپنی جگہ مگر ان دو تین بندوں میں اشراف لکھنؤ کی تہذیب کا منظر نامہ دیکھئے:

جوڑ کر ہاتھوں کو کہنے لگے دونوں معصوم　　آج ہم آپ کو پاتے ہیں نہایت مغموم
وجہ کچھ اس کی غلاموں کو نہیں ہے معلوم　　کچھ تو فرمایئے از بہر خدائے قیوّم[۲۷]
سو گئے گود میں ماں کی علی اصغر کہ نہیں
خیر، ہے ہوش میں ہیں عابد مضطر کہ نہیں

بولیں زینب کوئی غم اس سے سوا کیا ہوگا　　صبح پامالِ خزاں گلشن زہراؑ ہوگا
عازمِ شر، بنِ سعد ستم آرا ہوگا　　شہ سے پھر بیعتِ فاسق کا تقاضہ ہوگا[۲۸]
صلح ہوگی کسی صورت، نہ صفائی ہوگی
کل سے مظلوم پہ اعدا کی چڑھائی ہوگی

سن کے مادر سے یہ کہنے لگے وہ نیک نہاد　　سربسر راست ہے جو کچھ کہ ہوا ہے ارشاد
ہیں عداوت پہ کمر باندھے ہوئے اہلِ عناد　　پسرِ سعد کی کوشش ہے کہ برپا ہو فساد
اس کی تردید سے ہرگز نہ ڈرے گا کوئی
کچھ ہو پر بیعتِ فاسق نہ کرے گا کوئی

مرثیہ قدیم ہو یا جدید۔ روایت ضعیف نظم کی گئی ہوں یا عین تاریخ، یہ نکتہ ہر مرثیہ نگار کے پیشِ نظر رہا ہے کہ کربلا میں ایک حسینؑ نے ۷۲ حسینؑ تیار کر دیئے تھے، سب سے کم سن حسینؑ کا نام علی اصغرؑ تھا اور سب سے بزرگ حسینؑ، حبیب ابن مظاہر تھے اور ان سب کی صدا ایک تھی:

"کچھ ہو پر بیعتِ فاسق نہ کرے گا کوئی"

اور مہاراجہ صاحب محمود آباد علی محمد محبؔ نے کربلا والوں کے اس نعرے کو نظم کا جامہ عطا کر دیا ہے۔

☆☆☆☆☆

ناصر حسین یتیمؔ :-　　(امروہہ)

ولادت ۱۸۶۶ء وفات ۱۹۳۱ء

ناصر حسینؔ یتیمؔ امروہوی، حضرت شمیمؔ امروہوی کے شاگرد تھے۔ اجداد کا سلسلہ مغلیہ دور کے منصب داروں تک پہنچتا ہے۔ حضرت نسیمؔ امروہوی نے یتیمؔ کی مرثیہ نگاری کی سند دی ہے اور کہا ہے کہ شمیمؔ امروہوی سے یتیمؔ کے سلسلۂ تلمذ کی وابستگی ہی اُن کی مرثیہ گوئی پر دلالت کرتی ہے۔ اُن کے مرثیے کے تیور بھی اُن کی پختگی کلام کی وکالت کرتے ہیں۔

پھر آج خامۂ جادو رقم اُٹھاتا ہوں جنودِ نظم کا موزوں علم اُٹھاتا ہوں
نشانِ مدحتِ شاہِ اُمم اُٹھاتا ہوں کہاں ہیں عرفیؔ و جامیؔ، قلم اُٹھاتا ہوں
کہو یہ نظم ثریا سے باج دے مجھ کو
دبیرِ چرخ کدھر ہے خراج دے مجھ کو

یتیمؔ نے مرثیے کے مروجہ اجزاء کی پاسداری کی ہے لیکن اُن کی بصیرت اور فکر میں کہیں کہیں ندرت کی کرنیں جگمگاتی نظر آتی ہیں۔ ''علم'' پر ناصر حسین یتیمؔ کی فکر اور اسلوبِ بیاں دیکھیے۔

یہ سن کے حضرت عباسؑ نے نشاں کھولا ہوا بہشت کی آئی در جناں کھولا
علم سپاہِ خدا کا بہ عزّ و نشاں کھولا دبیرِ چرخ نے دامانِ کہکشاں کھولا
ہلال جھک کے، بہ شکلِ رکاب آپہنچا
نشاں لئے علمِ آفتاب آپہنچا

یتیمؔ کے ہاں تخیل کا عمل، اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ذہنی تصاویر اور ان تصویری شبیہات کی الفاظ میں مصوری اُنہیں مستند مرثیہ گو بنا دیتی ہے۔ حضرت عباسؑ کا سراپا بیان کرتے ہوئے یتیمؔ اس منزل پر آتے ہیں تو مملکتِ شعر پر رثائی ادب کا پرچم لہراتا نظر آتا ہے۔

ملا ہے صورتِ آئینہ، جلوہ گر سینہ علیؑ کے ماہ کا ہے غیرتِ قمر، سینہ
خجل ہو آئینہ شفاف اس قدر سینہ برنگِ صبح ہے صادق، وفا کا گھر سینہ
ہزار کعبے سے عزّ و شرف میں بہتر ہے
خلیلؑ کی وہ بنا یہ بنائے حیدرؑ ہے

افسوس کہ حضرت ناصر حسین یتیمؔ کا کلام میسر نہیں آسکا۔

☆☆☆☆☆

دلورام کوثری:۔

ولادت ۱۸۸۳ء۔ وفات ۷/۳/۱۹۳۱ء

انجمن ترقی اُردو ہند کے رسالہ ''اُردو'' شمارہ اپریل ۱۹۴۷ء میں مولوی عبدالحق نے دلورام کوثریؔ کی پیدائش کا سال ۱۸۸۳ء بتایا ہے۔ خواجہ حسین نظامی کی کتاب ''بند و نعت''

مطبوعہ ۱۹۲۴ء میں دلّو رام کوثری نے خود اپنا سنہ ولادت ۱۸۸۳ لکھا ہے اُن کا سنہ وفات بھی عام طور پر ۱۹۳۱ء لکھا جاتا ہے جبکہ مولوی عبدالحق نے ۱۹۳۷ء لکھا ہے۔

انیسویں صدی میں ۱۸۵۷ء سے پہلے ہندوستان میں گنگا جمنی تہذیب پروان چڑھ چکی تھی، ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کی عمارات کی تعمیر میں حصہ لیا۔ اور مسلمان، مندروں، گوردواروں کو وظیفے دیتے تھے۔ شرفاء کا لباس بلا تخصیص مذہب تھا۔ رہن سہن کے طریقے، آداب ولباس، نشست و برخاست میں مذاہب حائل نہیں تھے۔ ہندو شعراء نعت، منقبت، اور سلام کہتے تھے اور میلاد و مجالس میں پڑھتے تھے۔ مرثیے کہتے تھے، روتے تھے اور رُلاتے تھے۔ چھنولال دلگیر جیسے شاعر تھے جن کے مرثیوں کی چھ جلدیں کراچی میوزیم میں موجود ہیں۔ ''گذر منزلِ تسلیم و رضا مشکل ہے'' ایک سوز اور ''گھبرائے گی زینب'' جیسا نوحہ جو بلا تفریق مشرق و مغرب مجالس میں پڑھے جاتے ہیں، دلگیر کے ہیں۔ ہندو شعراء میں راجہ کنور سین مضطرؔ، بلوان سنگھ راجہ، چندو لال شاداںؔ، افتخار الدولہ، مہاراجہ سیوا رام، رام پرشاد بشیرؔ شاگردِ مرزا دبیرؔ جیسے نام سامنے آتے ہیں۔

دلو رام کوثریؔ ضلع حصار کے ایک موضع نانڈری یا لانڈھیری میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں منشی شریف حسین سبزواری مدرس جمال پور ضلع حصار سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد سمانہ (ریاست پٹیالہ) میں مجتہد العصر سید عنایت علی شاہ صاحب تک رسائی پائی اور اُن کی خدمت میں دس برس کا عرصہ گذرا اور عربی، فارسی اور علم عروض پر مہارت حاصل کی۔ یہی دن تھے جب دلو رام نے گنگا سے کوثر تک کا فاصلہ طے کیا اور کوثری ہو گئے۔

> ''ہندو شعراء دربار رسول میں'' کے مصنف نے دلو رام کوثری کے متعلق لکھا ہے کہ اُن کا پورا ایک دیوان غیر منقوط نعتوں پر مشتمل ہے اور اُنہوں نے ان نعتوں میں اپنا تخلص دلو رام استعمال کیا ہے''
>
> (بیسویں صدی اور اُردو مرثیہ ص ۱۸۲)

دلو رام کوثریؔ کے ساتھ اہل نقد و نظر نے انصاف نہیں کیا۔ اُن کے حالات زندگی اُن کی شاعری کی ابتدا محرکات اور دیگر کوائف تفصیل سے دستیاب نہیں ہے۔ اس کے باوجود اُن کی رثائی شاعری لمحوں کے دوش پر سوار اہلِ ذوق تک پہنچ رہی ہے۔ — راقم الحروف کو یاد ہے

۱۹۴۵/۴/۶ موضع بر ست فرید پور ضلع کرنال (ہریانہ) کے چھوٹے امام باڑے میں ایک مجلس تھی جس میں کسی ذاکر نے ذیل کے دو اشعار پڑھے تھے جو دل میں اُتر گئے تھے۔ بزرگوں سے سنا تھا۔ پھر تجربہ بھی ہوا کہ اچھا شعر دل میں اُتر جاتا ہے اور یاد ہو جاتا ہے۔ یہ دو اشعار جو راقم الحروف نے ۱۴ برس کی عمر میں سنے تھے آج نصف صدی بعد بھی یاد ہیں ؎

کیا پہنچا مسیحا جو فلک پر پہنچا مقصود کو اپنے نہ سکندر پہنچا
اللہ و غنی کوثریؔ ایسا چالاک گنگا سے جو پھسلا لبِ کوثر پہنچا

بعد میں جب شعور اتنا پختہ ہوا کہ اشعار اور شعراء کی ذہن میں حیثیت متعین ہوئی تو پتہ چلا کہ دلو رام کوثریؔ کے اشعار ہیں۔

دلوؔرام کوثری کو رسولؐ اور آلِ رسولؐ سے بہت عقیدت تھی۔ اُن کا یہ قطعہ اُن کی عقیدت کا آئینہ ہے ؎

لے کے دلوؔ رام کو حضرت گئے محشر میں جب غل ہوا ہندو بھی محبوب خدا کے ساتھ ہے
رحمۃ اللعالمین کے حشر میں معنی کھلے خلق ساری شافعِ روز جزا کے ساتھ ہے

دلوؔرام کوثریؔ کو اُن کی جس شاعری نے امر کر دیا ہے وہ اُن کا مرثیہ ''قرآن اور حسینؑ'' ہے جو ۱۹۱۸ء سے پہلے کی تصنیف بتائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صفدر حسین نے اس مرثیہ کا سن تصنیف کوئی حتمی قرار نہیں دیا۔ جدید مرثیہ کے سفر میں یہ مرثیہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ؎

قرآن اور حسینؑ، برابر ہیں شان میں دونوں کا رتبہ ایک ہے دونوں جہان میں
کیا اُن کا وصف ہو کہ ہے لکنت زبان میں [1] پیہم ندا یہ غیب سے آتی ہے کان میں
قرآن کلام پاک ہے، شبیرؑ نُور ہے
دونوں جہاں میں دونوں کا یکساں ظہور ہے

قرآن ہے فائقِ کتب جملہ انبیاء شبیرؑ ہے تمام شہیدوں کا پیشوا
اک نور ذوالجلال ہے اک وحیٔ کبریا [5] دونوں عزیزِ خلق ہیں، یکساں ہے مرتبا
ہر دم نیا کلامِ خدا کا کلام ہے
ذکرِ غمِ حسینؑ بھی تازہ مدام ہے

قرآں اگر حسینؑ کو کہئے تو ہے بجا اصغر دلِ حسینؑ ہے یٰسینِ کبریا
یوسف کا سورہ ہے علی اکبر سا مہ لقا[۱۱] سقائے آل، سورۂ کوثر ہے واہ واہ
الکہف اگر حبیبِ امامِ غیور ہے
حرؑ دلیر سورۂ توبہ ضرور ہے

الفتح ہے حسنؑ کا پسر قاسمِ حسیں الحمد، الحدید ہوئے زین العابدیں
شہ کی سکینہ سورۂ طٰہٰ ہے بالیقیں[۱۲] زینب کی شان سورۂ مریم سے کم نہیں
بلقیس کا جو ذکر ہے قرآن پاک میں
بانو یہاں ہے خیمۂ سلطان پاک میں

توریت اور زبور اور انجیل کی قسم قرآن سے یہ تینوں ہر اک بات میں ہیں کم
موسیٰ ہو یا کہ حضرت داؤد خوش شیم[۱۳] یا ہو مسیح سب سے ہیں افضل شہِ امم
آدم سے تا بہ احمدِ مختار بالیقیں
ایسی کتاب آئی نہ ایسا شہیدِ دیں

اس مرثیے میں کوثری نے عجب انداز سے مماثلت کی ہے اور عجیب عجیب انداز سے عقیدت مندانہ اشعار کہے ہیں ؎

ان دونوں پر تمام فضائل تمام ہیں
دونوں ہی بوسہ گاہِ رسولِ انام ہیں
پر جس طرح یہ فضل و مناقب میں ایک ہیں
ویسے ہی دونوں رنج و مصائب میں ایک ہیں
قرآں تو چاک، اور سرِ شہ قلم ہوا
بعد رسول دونوں پہ یکساں ستم ہوا

کوثری نے ۷۷ بند کے اس مرثیے میں موضوع کو نبھایا ہے حتیٰ کہ مصائب میں بھی۔ الفاظ میں دربارِ یزیدی کی منظر کشی اور اس منظر میں چار سالہ بچی سکینہ بنت حسینؑ یزید کو جو جواب دیتی ہیں وہ کوثری کی شاعری کا کمال ہے۔ منظر یہ کہ یزید کی نظر پڑتی ہے کہ ایک بچی اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے ہوئے ہے۔ بدنہاد یزید معصوم سکینہ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ؎

بولا، کہ تیرا سن نہیں اب تک بڑا ہوا   کیوں رخ پہ اپنے ہاتھ ہے تو نے رکھا ہوا

کم سن ہے تو ابھی تجھے پردہ روا نہیں

بولی سکینہ تجھ کو نبیؐ سے حیا نہیں

سکینہ اہلِ بیت رسولؐ کی عظمت، قرآن کے حوالوں سے بتاتی ہیں۔ یزید گھبرا کر پوچھتا ہے۔

یہ سن کے بے حیا نے کہا سن تیرا ہے کیا   اس سن میں تو نے مصحفِ حق کس طرح پڑھا

بولی سکینہ، قولِ نبی کیا نہیں سنا   قرآن و اہلِ بیت نہ ہوں گے کبھی جدا

قرآنِ حق کا رحل، ہمارے ہی ہاتھ ہیں

قرآن ہمارے ساتھ ہے، ہم اس کے ساتھ ہیں

دلورام کوثری نے "قرآن اور حسینؑ" میں مرثیے کی روایات کی پابندی نہیں کی اور روایت کے حصار کو توڑ کر باہر نکلے ہیں۔ "قرآن اور حسینؑ" میں چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، جنگ، رجز، تلوار، گھوڑا کچھ نہیں ہے اس کے برعکس ایک جدّت ہے، نیاپن ہے، اسی لئے جدید مرثیے کے سفر میں دلورام کوثری کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

کوثری کے پانچ مرثیوں کی اشاعت کا ریکارڈ ملتا ہے۔ جن میں "قرآن اور حسینؑ" کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اُن کے بہت سے مرثیے "بشارت انجیل" کے نام سے شائع ہوئے ہیں اور ایک مرثیہ "مسدّس کوثری" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ کوثری کی ایک کتاب اسرارِ اردو بھی ہے۔ اس سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ دلورام کوثری نے غیر منقوط نعتیں بھی کہی ہیں — مرثیے کے علاوہ دلورام کوثری کی ایک مقبول اور انوکھی کتاب امام جعفر صادق علیہ السلام کے منظوم معجزوں پر مشتمل ہے، سید وحید الحسن ہاشمی نے اس کتاب کا نام "اعجازِ جعفری" لکھا ہے اور اس میں شامل منظوم معجزوں کی تعداد (۲۵) پچیس بتائی ہے

دلورام کوثری کو میر سید عنایت شاہ نے حسان الہند کا خطاب دیا۔ یہ خطاب سرکاری درباری نہیں تھا بلکہ ولائے اہلبیت کا صدقہ تھا، وہی صدقہ جس نے دلورام کوثری کو گنگا سے کوثر پہنچا دیا۔ اس بات کو بتانے کے لئے کہ دلو رام مسلمان ہو گیا تھا لوگ سند پیش کرتے ہیں، تصدیق نامے پیش کرتے ہیں حالانکہ دلورام کا اپنا ایک شعر صورت حال کے لئے کافی ہے۔

اللہ و غنی کوثرؔی اتنا چالاک
گنگا سے جو پھسلا، لبِ کوثر پہنچا

یوں بھی ہمارا موضوع مذاہب پر گفتگو نہیں مرثیہ ہے، غمِ حسینؑ ہے، عزائے حسینؑ ہے، حسینؑ کا مرثیہ ہے اور یہاں کوثرؔی کا تذکرہ بھی حسینؑ کے مرثیہ گو شاعر کی حیثیت سے ہے۔

☆☆☆☆☆

ذاخر لکھنوی :- (لکھنؤ)

ولادت ۱۸۷۱ء۔وفات ۱۹۳۲ء

اسم گرامی سید فرزند حسینؑ۔ تخلص ذاخرؔ۔ خود بھی خاندان اجتہاد کے معروف بلند پایہ شاعر تھے اور مولوی اصغر حسینؑ فاخرؔ لکھنوی کے بھانجے تھے۔ حضرت ساحرؔ لکھنوی نے فاخرؔ (سید فرزند حسینؑ) کے بچپن اور تعلیم و تربیت کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ:

> ''جس وقت ان کی والدۂ گرامی کا انتقال ہوا اس وقت فرزند حسینؑ (ذاخر) کی عمر صرف ڈیڑھ سال تھی۔ حضرت فاخرؔ نے اپنی ہمشیرہ کے انتقال کے بعد ذاخر (جو اس وقت فرزند حسینؑ تھے) کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری خود لے لی اور بہترین تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت فاخرؔ کا قیام عراق میں تھا چنانچہ فرزند حسین (ذاخرؔ) بھی ماموں کے ساتھ اٹھارہ سال کی عمر تک عراق میں رہے اور کاظمین میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔''

(خانودۂ اجتہاد کے شعراء مایر سے ساحر تک۔ ص ۳۴۲)

ڈاکٹر ہلال نقوی نے لکھا ہے کہ

> '' اپنے ایک مکتوب بنام ہلالؔ نقوی مرقومہ ۲۰/اکتوبر ۱۹۸۲ء میں خانوادہ اجتہاد کے آخری شاعر حضرت ساحرؔ لکھنوی نے خاندانِ اجتہاد کے نمایاں مرثیہ گو شعراء کی فہرست ارسال فرمائی تھی اور یہ بھی فرمایا تھا کہ'' سید فرزند حسین ذاخرؔ لکھنوی میرے دادا تھے۔ انہوں نے کم و بیش اسی مرثیے کہے جو حسینی شاعر فضل لکھنوی کے پاس

محفوظ ہوں گے۔

(بیسویں صدی اور جدید مرثیہ ص ۸۳)

ڈاکٹر ہلال نقوی نے اسی صفحہ پر یہ بھی لکھا ہے کہ:

''ذاؔخر نے امام حسینؑ کی شہادت کے بعد کے واقعات ''مختار نامۂ منظوم'' کے نام سے ۱۸۹۹ء میں نظم کرنا شروع کیے تھے اس کی پہلی جلد سولہ ہزار اشعار پر مشتمل تھی۔ اس سے پہلے مہدی حسن ماؔہر نے حضرت علی اکبر کے احوال میں ۶۱۰ بندوں پر مشتمل طویل مرثیہ لکھا جسے سلطان المراثی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ذاؔخر اور فاخر کے یہ دونوں غیر مطبوعہ نسخے میں نے (ہلال نقوی نے) جناب فضل لکھنوی کے پاس دیکھے۔''

حضرتِ ساحر لکھنوی اپنی کتاب ''خانوادۂ اجتہاد کے شعراء۔ ماؔہر سے ساحر تک'' میں ص ۳۸۷ — ۳۸۸) پر مختار نامۂ منظوم کی یوں وضاحت کرتے ہیں کہ:

''مختار نامہ کی پہلی جلد میں اشعار کی تعداد سولہ ہزار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ذاؔخر اور مولانا سبطِ حسن صاحب فاطؔر نے آپس میں مل کر مختار نامہ شروع کیا تھا، جب اس کے سات ہزار اشعار ہو گئے تو بوجوہ کام رُک گیا۔ ۱۹۵۰ء میں حضرت ذاؔخر لکھنوی کے حکم پر اُن کے فرزند لسان الشعرا حضرت شاعر لکھنوی نے اس میں گیارہ ہزار اشعار کا اضافہ کیا اور کل اشعار اٹھارہ ہزار ہو گئے۔ ساحر لکھنوی نے مزید لکھا ہے کہ ان کے (شاعر لکھنوی کے) فرزند مہدی نظمؔی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ انہوں نے اشعار کی تعداد کو چالیس ہزار تک پہنچا دیا تھا، وہ چاہتے تھے کہ شاہنامہ کی طرح اس میں بھی ساٹھ ہزار اشعار ہوں مگر عمر نے وفا نہ کی۔ مہدی نظمؔی نے 'وہ' کی وضاحت نہیں کی کہ وہ سے مراد حضرت شاعر لکھنوی تھے یا حضرت ذاؔخر لکھنوی۔ اس بحث کا ایک نتیجہ یہ ضرور نکلا ہے کہ 'مختار نامہ منظوم' ایک تاریخی اور اہم کام تھا جس کی بنیاد حضرت ذاؔخر لکھنوی نے ڈالی تھی لیکن اس کی اہمیت اس بحث کی نذر ہو گئی اور ایک عظیم کارنامہ (family contribution) خاندانی تعاون کی ایک مثال بن کر رہ گیا۔

دعبلِ ہند حضرت ذاؔخر لکھنوی کی ایک وجہ شہرت اُن کی نوحہ گوئی بھی ہے۔ انہوں نے ۵۰ یا ۵۳ مرثیوں کے علاوہ ہزار بارہ سو نوحے بھی چھوڑے ہیں۔ مرثیہ نگاری میں بھی وہ ہر قدم پر

صفِ اوّل کے مرثیہ نگار ہیں۔ حضرت ساحر لکھنوی نے "خانوادۂ اجتہاد کے مرثیہ گو" میں حضرت ذاخر کے کمالِ فن کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ کتاب ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی ہے اور خانوادۂ اجتہاد کے مرثیہ نگاروں کے حالات پر تادمِ تحریر حرفِ آخر ہے اور کیوں نہ ہو اسی خاندان کے ایک چشم و چراغ کی اطلاعات پر مبنی کتاب ہے اور ہم بار بار عرض کر چکے ہیں کہ مصدقہ معلومات اور عرفان و آگہی مطلوب ہو تو خون سے پوچھو اس لئے کہ خون بولتا ہے اور سچ بولتا ہے۔

"اپنے مرثیہ گوئی سے متعلق انہوں نے خود جو کہا ہے اسے تعلّی بھی کہا جائے تو سراپا انکسار تعلّی ہے جو اُن کے حسن اخلاق اور تہذیبی قدروں کی مظہر ہے۔ ملاحظہ ہو ۔

ہاں اے قلمِ راکبِ شبدیزِ معانی　　وعدہ جو کیا تھا وہ دکھا سحر بیانی
ہر بات نئی ہو نہ ہو کوئی بھی پرانی　　مشہور ہو ہر سمت میری زمزمہ خوانی
شاباش کہیں لوگ فسانہ مرا سُن کر
بلبل کو تحیّر ہو ترانہ مرا سُن کر

دعویٰ نہیں اسکا کہ ہوں میں شاعر کامل　　یہ بھی نہیں غرّہ ہے کہ ہوں عالم و فاضل
پر نظم کی قوت مجھے بے شبہ ہے حاصل　　ہے سہل مرے سامنے مشکل سے بھی مشکل
قوت یہ خدا داد ہے پائی ہے جو ہم نے
مشکل کے جو عقدے ہیں وہ کھولے ہیں قلم نے"

("خانوادۂ اجتہاد کے شعراء۔ ماہر سے ساحر تک" سے اقتباس)

حضرت ذاخر لکھنوی نے اجزائے مرثیہ کی مکمل پاسداری کی ہے۔ منظر نگاری کا انداز بہاریہ نہیں بلکہ انہوں نے کربلا کے میدان کی منظر نگاری کی ہے۔ مثال کے طور پر ۔

جب نگاہوں سے چھپا نیّر تابان فلک　　لیلیٰ لیل مصیبت ہوئی مہمان فلک
منتشر ہو گئے سب گوہرِ دامانِ فلک　　زاہد شب سے بڑھی رونقِ ایوان فلک
دم بدم حق کے فریضے کو ادا کرنے لگا
دانۂ نجم پہ تسبیحِ خدا کرنے لگا

ذاخر مرحوم کے مراثی میں رنگ تغزل بہت نمایاں ہے۔

جب آسماں پہ رات کے گیسو بکھر گئے　　دارِ جہاں سے دن کے مسافر گذر گئے

پُر نور ذرے گوشۂ عالم کو کر گئے　　نزدیک شام زخم چراغوں کے بھر گئے
زلفیں دھوئیں کی ظلم ہوا سے بگڑ گئیں
ناسور دل میں بتیاں شعلوں کی پڑ گئیں

کیسا تغزل ہے مصرعوں میں، کیسی منظر نگاری ہے لفظوں میں، اسی کا نام ہے قادر الکلامی اور اسی قادر الکلامی کا نام ہے دعبلِ ہند حضرت ذاکر لکھنوی۔

☆☆☆☆☆

صفی حیدر آبادی:- (حیدر آباد، دکن)

ولادت ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۱ء۔ وفات ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۲ء۔

نام مولوی مرزا بہادر علی، تخلص صفیؔ۔ وطن حیدر آباد۔ قلمی نام صفیؔ حیدر آبادی۔ حیدر آباد دکن میں جدید مرثیہ گو شعراء میں صفیؔ حیدر آبادی ایک معتبر نام ہے۔ متقی، پرہیزگار، عبادت گذار انسان، مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے والے شاعر۔ جن کی تربیت اور رہنمائی میں دکن میں مسدس کو مقبول بنانے والے کئی شاعر پیدا ہوئے۔۔۔ صفیؔ حیدر آبادی رباعی کی بحر میں مسدس مرثیہ کہنے والے غالباً پہلے شاعر تھے۔ ان کے بعد حضرت نسیم امروہوی اور صادقین نے رباعی کی بحر میں مرثیے کہے۔

صفی حیدر آبادی حیدر آباد میں دار الشفاء کی سب سے بڑی مسجد 'عبادت خانہ' میں پیش نماز تھے۔ اپنے زمانے میں عالمانہ طرز حیات کا اعلیٰ نمونہ تھے، نواب عماد الملک نے جاگیر داری کالج کے شعبۂ دینیات میں پروفیسر کے منصب کی پیش کش کی تو دینیات پڑھانے لگے اور پوری زندگی دینیات اور نماز پڑھانے میں گذار دی۔ ابتدا میں جوشؔ حیدر آبادی سے مشورہ سخن لیتے تھے۔۔۔ مرثیہ گوئی میں بھی ایک ترتیب کو اختیار کیا یعنی چہاردہ معصومین کی ولادت کے احوال پر مراثی کہنے کا ایک سلسلہ شروع کیا، ابھی گیارہ معصومین پر کہہ پائے تھے کہ انتقال ہو گیا۔ صفیؔ حیدر آبادی کے انتقال کے بعد دکن کے ممتاز مرثیہ گو شاعر اور حضرت صفیؔ کے بھانجے باقر امانت خانی نے صفیؔ حیدر آبادی کے نام سے چہاردہ معصومین کے احوال پر ایک مجموعہ ''عرفان صفی'' شائع کرایا جس میں ۱۴ چودہ مسدس ہیں۔ ڈاکٹر ہلال نقوی کے نام اپنے ایک مکتوب میں حضرت باقر امانت خانی نے لکھا ہے کہ انہوں نے تین مسدس خود کہہ کر اپنے ماموں حضرت صفیؔ

حیدرآبادی کی خواہش کو پورا کیا جسے وہ ادھوری چھوڑ گئے تھے — ہمارا اسلام، باقر امانت خانی کے نام۔ یہ تو سُنا تھا اور دیکھا بھی تھا کہ بزرگ شاعروں کے انتقال کے بعد اُن کے ورثاء نے ان کے کلام کو ضائع ہونے دیا یا اپنے نام سے شائع کرا لیا لیکن شرافت نفسی کی قابل تقلید مثال ہے کہ ماموں جس مقصد کو ادھورا چھوڑ گئے تھے، بھانجے نے اسے پورا کیا۔ کاش باقر امانت خانی اس کا ذکر بھی نہ کرتے کہ اُنہوں نے تین مسدس کہہ کر ماموں کے کلام میں شامل کئے، بات خود بخود سامنے آتی تو اور ہی بات ہوتی اس لئے کہ ایسی عظمتیں چھپتی نہیں ہیں جیسا کہ مولوی چاند کے باب میں ذکر آ ہی گیا کہ ایک شاعر مجتبیٰ امروہوی (مولوی چاند) اپنے چھوٹے بھائی یکتا کے ساتھ مل کر مرثیے کہتے رہے اور یہ سارے مرثیے اتقیٰ یکتا کے نام سے منسوب رہے جو دو بھائیوں کی محبت کا ثبوت ہے، لیکن ہوا یوں کہ چھوٹے بھائی یکتا کا پہلے انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد مولوی چاند نے جو مرثیے کہے وہ ان کے نام سے سامنے آئے لیکن تحقیق کرنے والوں نے تلاش کر لیا کہ سید اتقیٰ حسن یکتا کے مراثی میں مولوی چاند کا contribution کتنا تھا۔ جملۂ معترضہ کی معذرت، حقیقت یہ ہے کہ حضرتِ باقر امانت خانی نے بڑا کام کیا کہ اہم کلام کو ضائع ہونے سے بچا لیا اور اپنے نامۂ اعمال میں چہاردہ معصومین کی مداحی کا لامحدود اُجر لکھوا لیا۔

صفی حیدرآبادی باکمال مرثیہ گو شاعر ہونے کے علاوہ مرثیہ پڑھنے میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ علّامہ نظم طباطبائی جیسے عالم فاضل لوگ صفی حیدرآبادی کی مرثیہ خوانی کے شیدائی تھے اور منبر کے قریب بیٹھ کر حضرت صفی حیدرآبادی کو سنا کرتے تھے۔

''عرفان صفی'' میں شامل کلام کے علاوہ حضرت صفی حیدرآبادی کے زیادہ مرثیے سامنے نہیں آئے، البتہ اُن کے ایک مرثیے۔

''پرچم کشائے رنگِ وفا میری فکر ہے''

کا بار بار تذکرہ ہوا ہے۔ یہ مرثیہ مرحوم نے انتقال سے تین برس پہلے کہا تھا، اس مرثیے میں ۱۲۱ بند ہیں۔ صفی حیدرآبادی کی مرثیہ نگاری پر پروفیسر عبدالقادر سروری کا تبصرہ بھی کئی جگہ نقل ہوا ہے۔ پروفیسر سروری نے لکھا ہے:

> ''مولوی مرزا بہادر علی صفی حیدرآبادی جدید عہد کے سر برآوردہ مرثیہ نگاروں اور مسدس کہنے والوں میں تھے۔ ان کی تربیت سے کئی

اچھے نوجوان مرثیہ نگار اُٹھے۔ایک اعتبار سے صفی دکن میں ''نئے مرثیے''
کو اور مسدس کو مقبول بنانے کا باعث ہوئے''

بے شک صفی حیدرآبادی کا شمار سر برآوردہ مرثیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کے نام کے ساتھ نئے عہد کا مرثیہ نگار لکھنا صداقت بھی ہے اور بھلا بھی لگتا ہے مگر ''نیا مرثیہ'' کہنا کہاں تک مناسب ہے یہ ناقدین جانیں۔

صفی حیدرآبادی ان خوش نصیب شعراء میں تھے جن کی پذیرائی ان کی زندگی میں ہوئی۔ ایسا لگتا ہے کہ مرثیہ گوئی وہ فن ہے جس کی قبولیت اس بارگاہ میں ہوتی ہے جہاں سے عزت تقسیم ہوتی ہے اس لئے کہ کائنات سخنوری میں بڑے بڑے باکمال شعراء کرام ناقدری کا شکار ہوئے جبکہ مرثیہ گو شاعروں کو ان کی زندگی میں والہانہ پذیرائی اور بے حساب داد ملتی ہے۔

☆☆☆☆☆

اقدس امرہوی:- (امروہہ)

ولادت: بحوالۂ تاریخ اصغری (۱۲۷۱ھ) ۱۸۵۴ء کے لگ بھگ اور وفات (۱۳۵۳ھ) ۱۹۳۴ء۔

نام سید آل محمد۔ تخلص اقدس۔ وطن امروہہ۔ 'تاریخ اصغری' کے مصنف سید اصغر حسین کے فرزند۔ ابتداً ناسخ، میر عشق، اور بلیغ امروہوی سے سلسلۂ تلمذ وابستہ رہا۔ ذکی حسن ذکی کے برادر بزرگ تھے۔ عربی، فارسی، اُردو کے شاعر، مرثیہ گو، نثر نگار، تصانیف میں ایک رسالہ ''اصل الوصول'' بزبان عربی دوسرا رسالہ ''معارف تقیہ'' بہ زبان فارسی شامل ہیں۔ مرثیہ نگاری میں اُستاد تھے اور مرثیے کے سارے اصولوں کے پابند تھے۔ پہلا مرثیہ ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷ء) میں کہا جس میں مرثیہ کی کلاسیکی اقدار کی بھرپور پابندی ہے۔ حضرت علی اکبرؑ کے احوال کا یہ مرثیہ جس کے چند بند درج ذیل ہیں اقدس امروہوی کے انداز مرثیہ گوئی کی مثال ہے۔

در پر کھڑے تھے خیمے کے سلطان کربلا پہنچی پسر کی گوش مبارک میں جو صدا
حضرت نے اُس کو سن کے کہا وا مصیبتا دوڑے حسینؑ دشت کی جانب برہنہ پا
طاقت نہ تھی جو تن میں، قدم لڑکھڑاتے تھے
ہر ہر قدم پہ سبط نبیؐ بیٹھ جاتے تھے

امام حسینؑ میدان جنگ میں پہنچتے ہیں۔ سینکڑوں کلاسیکی مرثیہ نگاروں کی طرح سیدؔ اقدسؔ نے بھی اس منظر کو روایتی انداز میں Visualize کیا ہے۔ اس منظر کی ذہنی تصویر بنائی ہے کہ امام حسینؑ ننگے پاؤں گرتے پڑتے میدان میں علی اکبر کی لاش ڈھونڈھ رہے ہیں اور پکار رہے ہیں۔

قسمت میں تھا کہ ٹھوکریں جنگل کی کھاؤں میں ۔۔۔ اکبر جواب دو مجھے کس سمت آؤں میں
مجروح رُخ کو چوم کے قربان جاؤں میں ۔۔۔ پاؤں تمہیں تو لاش کو چھاتی لگاؤں میں
کس گوشے میں پڑا جسدِ پاش پاش ہے
کہدو پکار کر کہ یہاں میری لاش ہے

☆☆☆☆☆

ذکی حسن ذکی:-

ولادت : ''مرثیہ عظیم'' کے مطابق ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء)۔

اس سے پہلے باب میں عظیم امروہوی نے ذکی کے بڑے بھائی حضرت اقدسؔ کی ولادت بھی ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۴ء تحریر کی ہے۔ ذکی حسن ذکی نے ۳۶ یا ۳۸ برس عمر پائی جس کے حوالے سے ان کی وفات کا سال ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۸۸۹ء درج کیا گیا ہے جو اصلاح طلب ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، سید ذکی حسن ذکیؔ، اقدسؔ کے برادر خورد تھے۔ ''مرثیہ عظیم'' میں اندراجات کی رو سے ذکیؔ نے ۳۶ برس کی عمر پائی گویا کلاسیکی مرثیہ نگاری کی کہکشاں میں ایک ستارہ ذکیؔ امروہوی بھی طلوع ہوا اور ڈوب گیا۔ روایتی مرثیے کی روشنی میں اُجالے کا احساس تو ہوتا ہے لیکن جن کرنوں سے یہ اُجالا یا روشنی بنتی ہے اُن کرنوں کو شناخت (identify) نہیں کیا جا سکتا، اُنہیں کرن کرن کر کے پہچانا نہیں جا سکتا۔ اسی طرح دبستان حیدر آباد، دہلی، اودھ اور امروہہ کے کلاسیکی مرثیہ نگار ہیں جو اپنی اپنی جگہ بحیثیت شاعر اور مرثیہ نگار باکمال تھے۔ کئی کئی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے مگر ایک کہکشاں کا حصہ تھے۔ اودھ میں خانوادۂ انیسؔ اور خاندانِ دبیرؔ۔ امروہہ میں نسلِ امیر حسن امیر (یعنی امیر حسن امیرؔ سے رئیسؔ امروہوی تک) اور حیدر حسین یکتاؔ سے نسیمؔ اور قسیمؔ تک روشنی کے ایسے شہر ہیں جن میں چند نام تو ایسے ہیں جو ان روشنی کے شہروں کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں اور بہت سے نام ایسے جن کے حوالے سے یہ شہر روشنی کے شہر کہلائے۔

اقدسؔ اور ذکیؔ ایسے ہی روشنی کے کسی دیار سے ہوتے تو آج اُن کے مراثی یوں ضائع نہ ہوتے کہ ایک ایک دو دو مرثیوں کے علاوہ ان کا نشان ہی نہیں ملتا۔

ڈاکٹر عظیمؔ نے ذکیؔ کے دو مرثیوں کی نشاندہی کی ہے۔ایک مرثیے کے درج ذیل چند بند اس حقیقت کی گواہی دیتے نظر آتے ہیں کہ زبان و بیان پر ذکی حسن ذکیؔ کو کتنی دسترس حاصل تھی؛

جب وطن میں شہِ بیکس کی سنائی آئی　　خبر کرب و بلا یعنی زبانی آئی
ہر زباں پر وہ مصیبت کی کہانی آئی　　شور یہ تھا کہ قیامت کی نشانی آئی
پنجۂ غم سے گریبان ہر اک چاک ہوا
پھر مدینے میں غمِ صاحبِ لولاک ہوا

کوئی کہتا تھا کہ ہے آج قیامت برپا　　کوئی کہتا تھا کہ دلبندِ نبی قتل ہوا
وا دریغا کوئی کہتا تھا کوئی واویلا　　کوئی آنکھوں سے بہاتا تھا لہو کا دریا
خلق سر پیٹ کے ہر سمت جو چلاتی تھی
واحسینا کی صدا تا بہ فلک جاتی تھی

شہر میں جب ہوا مشہور یہ پُر درد سخن　　لیتے رو رو کے تھے سب نامِ شہِ تشنہ دہن
جائیں پُرسے کو کہاں سوچتے تھے اہلِ وطن　　نہ پیمبرؐ ہیں نہ زہرا نہ علیؑ ہیں نہ حسنؑ
جا کے دروازے پہ زہراؑ کے یہ چلاتے تھے
روتے پھر روضۂ احمد پہ چلے آتے تھے

یہ مرثیہ قاصد صغرا کے واپس آنے اور (ذکی کے الفاظ میں) 'سنائی' سنانے کے احوال کا مرثیہ ہے

☆☆☆☆☆

اسد نقوی :-

ولادت ۱۸۶۸ء۔وفات ۱۹۳۷ء عمر ۶۹ سال۔

نام سید اسد اللہ تخلص اسدؔ، وطن امروہہ۔نقوی سید۔مرثیہ گوئی میں کلاسیکی اقدار کے پابند تھے مگر مضامین میں نیا پن تھا اسی لئے اپنے ہم عصر مرثیہ نگاروں سے قدرے الگ نظر آتے ہیں۔شاعری میں غزل، نظم، رباعی، قطعہ، سلام، منقبت اور مرثیہ میں طبع آزمائی کی ہے مگر شاعری کو تاریخ گوئی کی نہج پر استوار کرنا اُن کی پہچان بن گیا۔

اسدؔ نے امیر مختار کے احوال پر جو مرثیہ لکھا ہے اس کے ۱۲۱ بند ہیں۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ ''مختار نامہ'' مرثیہ میں نظم کر کے اسدؔ نے مرثیہ گوئی کی تاریخ میں اضافہ کیا ہے—اپنے ایک مرثیے میں اُنہوں نے سعودی عرب میں مزارات مقدسہ کی بے حرمتی اور انہدام کو موضوع بنایا ہے اور آلِ سعود کی چیرہ دستیوں کے خلاف زبردست احتجاج کیا ہے۔ اسدؔ نے سعودی حکومت کے اس عمل کو نظم کیا ہے۔

مرقد کسی کے دہر میں ڈھائے نہیں گئے
مردے تہہِ مزار ستائے نہیں گئے

اور آلِ سعود کے اس ظلم کو کربلا میں ہونے والے ظلم سے متصل کر کے کہا ہے۔

مارا اگر یزید نے آلِ رسولؐ کو
ڈھایا بنِ سعود نے قبرِ بتولؑ کو

اسد امروہوی نے کم از کم بیس مرثیے کہے ہیں۔ ایک مخمس، ایک درجن سے زیادہ سلام اور قطعات و رباعیات ان کے علاوہ ہیں۔ اپنے پہلے مرثیے کا آغاز اسدؔ نقوی نے ذکر ولادتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا ہے

عالم میں اب ورودِ رسولِ جمیل ہے آتا ہے وہ جو وارثِ ارثِ خلیل ہے
بے مثل و بے نظیر ہے اور بے عدیل ہے خلاقِ کائنات کے گھر کا وکیل ہے
تخلیق شش جہت کا سبب اُس کی ذات ہے
روشن اُسی کے نور سے کل کائنات ہے

میلادِ افتخارِ سلیماں کی ہے جو دھوم جنّ و ملک ہیں شائقِ دیدار بالعموم
گردِ جنابِ آمنہ، حوروں کا ہے ہجوم وا حق نے کردئے ہیں درِ مخزنِ علوم
موجود انبیاء ہیں زیارت کے واسطے
حاضر ملک ہیں آپ کی خدمت کے واسطے

اسدؔ نے مسدس کے علاوہ بھی ہیئت میں تجربے کئے ہیں مثلاً ان کا ایک مخمس بہت مقبول ہے۔

چشمِ حق میں ہو عطا، اہلِ نظر ایسا تو ہو   رازِ قدرت منکشف ہوں باخبر ایسا تو ہو
تیرگی عصیاں کی مٹ جائے اثر ایسا تو ہو   حبِّ حیدر دل میں ہو قلب بشر ایسا تو ہو
نورِ حق کی روشنی ہو جس میں گھر ایسا تو ہو

اسدؔ نے مدحِ بوتراب میں ایک ''ہفت بند'' بھی کہا ہے جس کے ہر بند میں چودہ اشعار ہیں ہیئت کا یہ تجربہ بیسویں صدی کی مرثیہ گوئی میں منفرد تجربہ ہے۔

السلام اے وارثِ ارثِ محمدؐ مصطفیٰ
بابِ شہرِ علم ہو تم یا علیؑ مرتضیٰ
السلام اے خاص ہم درسِ رسولؐ ذوالجلال
درس گاہ ایزدی کے مستند اہلِ کمال
السلام اے خانہ زادِ مالکِ یومِ حساب
افتخارِ ہر دو عالم یا علیؑ یا بوتراب

اس ''ہفت بند'' میں ''وارثِ ارثِ محمدؐ مصطفیٰ''، ہم درسِ رسولِ ذوالجلال، ''درس گاہ ایزدی کے مستند اہلِ کمال'' ایسی بندشیں اسدؔ کی تاریخ دانی، زباں دانی اور لفظوں کو برتنے کی قدرت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اسدؔ نے ۱۱۵۰ اشعار پر مشتمل ایک فریاد بھی کہی ہے ۔

اے خدائے دست گیرِ بے کساں فریاد ہے
کارساز و رہنمائے دو جہاں فریاد ہے

اس رب ذوالجلال، قادرِ مطلق، رحمان و رحیم اللہ کی بارگاہ میں ہر دعا ایک فریاد ہوتی ہے۔ شعراء کرام نے ہر دور میں اُس سے دعا کی ہے، فریاد کی ہے مگر جس انداز سے فریاد کو اسد اللہ اسدؔ نے ایک صنفِ سخن بنایا ہے وہ منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ اُن کی ہمہ جہتی شاعری اور تجرباتی کاوشوں کے پیشِ نظر یہ کہنا یقیناً حقیقت کا ادراک ہے کہ

> ''اسدؔ کے ہاں مضامین کی تلاش اور نیا پن ہے۔ مدح سرائی پر انہیں قدرت حاصل ہے۔ محاکات کے وہ ماہر ہیں، تراکیب تراشنے میں اُن کی کاوشیں کامیاب ہیں، اُن کے منظر نگاری کامیاب ہے''

☆☆☆☆☆

مجتبیٰ حسین چاند:-

ولادت (۱۲۹۰ھ) ۱۸۷۳ء۔وفات ۱۹۳۷ء

نام مولوی مجتبیٰ حسین، تخلص مجتبیٰ، عرفیت مولوی چاند۔ اتقی احسن یکتا کے بڑے بھائی، سیّد اولاد حسین سلیم کے شاگرد۔

تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی مگر قصیدے اور سلام سے زیادہ لگاؤ تھا لہٰذا ان کے ۱۰۰ سلام اور ۱۰۰ قصائد کا حوالہ ملتا ہے جبکہ اُن کے نام سے وابستہ صرف پانچ مرثیے ہیں جو اُن کے چھوٹے بھائی یکتا کے انتقال کے بعد کہے گئے ہیں۔ ان کے قریبی ذرائع کا کہنا ہے کہ جب تک یکتا زندہ رہے مجتبیٰ اور یکتا اکٹھے مرثیہ کہتے تھے اور وہ یکتا کے نام سے منسوب کئے جاتے تھے۔ ناقدین نے ایسے کچھ مرثیوں کی نشاندہی بھی کی ہے جو دونوں بھائیوں نے مل کر کہے ہیں۔ مولوی چاند نے کلاسیکی انداز میں مرثیے کہے ہیں مگر کوئی بات ایسی ہے ضرور جو اُنہیں یاد رکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ ہوسکتا ہے اُن کا یہ جذبہ بھی ان عناصر میں سے ایک ہو کہ مرثیہ کہہ کر وہ اس کے متمنّی نہیں رہتے تھے کہ وہ ان کی شہرت کا سبب بنے اس لئے جب تک یکتا زندہ رہے سارے مرثیے یکتا کے نام سے منسوب ہوئے۔

مولوی چاند کے اسلوب کا انداز دیکھنے کے لئے ان کے دو چار بند ہی کافی ہیں۔ مثلاً ایک مرثیے میں دشمن کی فوجوں کی کثرت کے مقابلہ میں امام عالی مقام میدان میں آتے ہیں ۔

یاں سے حضرت جو بڑھے، زورِ تنِ شمر گھٹا ۔۔۔ تین جانب سے اُٹھی شام کی گھنگھور گھٹا
خوف سے پیچھے قدم صورت روباہ ہٹا ۔۔۔ دشت کی گرد سے منہ نیر اعظم کا اٹا
نعرہ زن فوج سیہ کار کے سب دَل اُمڈے
شور کرتے ہوئے برسات کے بادل اُمڈے

نعرہ زن شیر جو تھا گونج رہا تھا جنگل ۔۔۔ منہ کے بل گرتا تھا کوئی تو کوئی پشت کے بل
ہر طرف جاتے تھے گھبرائے جو گھوڑے کوتل ۔۔۔ منتشر فوج میں ہوجاتی تھی دُونی ہلچل
مضطرب یاں کے اُدھر، واں کے اِدھر آتے تھے
ٹھوکریں کھاتے تھے، گر پڑتے تھے، مرجاتے تھے

گر کے میداں میں ہوئے خاک پہ قاتل بسمل ۔۔۔ کہیں تنہا، کہیں بسمل کے مقابل بسمل

کوئی میداں میں، کوئی تھا لبِ ساحل بسمل ہر طرف رن میں نظر آتے تھے بسمل بسمل

تھا یہ احوال جو ارباب جفا کا رن میں

صاف نقشہ نظر آتا تھا منا کا رن میں

☆☆☆☆☆

طاہر حسین گویاؔ:- (امروہہ)

ولادت ۱۸۹۹ء۔ وفات ۱۹۳۸ء

نام سید طاہر حسین، تخلص گویاؔ، وطن امروہہ۔ بحیثیت شاعر گویا صاحب دیوان شاعر تھے۔ اُن کا دیوان ''رہنمائے تخیل'' ۱۳۴۸ھ (۱۹۲۹ء) میں شائع ہوا تھا۔ گویا کے اُستاد حضرت حاذقؔ امروہوی تھے۔ گویا نے ۱۷ مرثیے اور بہت سے سلام کہے ہیں۔ عظیم امروہوی کا کہنا ہے کہ انہوں نے کراچی میں ۱۹۸۲ء میں گویا کے فرزند سید سکندر حسین سے درخواست کی کہ وہ گویا کے کچھ مراثی کی نقول عنایت کر دیں تا کہ تاریخ مرثیہ گوئی میں گویا کا کلام شائع کیا جا سکے لیکن سکندر حسین ایسا نہ کر سکے۔ بہ الفاظِ دگر اگر رفتہ رفتہ بحیثیت مرثیہ گو طاہر حسین گویا کو فراموش کر دیا گیا تو اس کا سبب اُن کی اپنی اولاد ہو گی جنہیں اتنی بھی فرصت نہیں کہ اہم تذکرہ میں اپنے والد گرامی کے ذکر کی شمولیت کے لئے اُن کے کلام کی نقول دے سکیں اور اگر گویا کے فرزند اُن کا کلام شائع کرانا چاہتے تھے تو اس سعادت مندی کی جزا انہیں اس ذات سے ضرور ملتی جس نے اپنے ذکر کے فوراً بعد والدین کی اطاعت اور خدمت کا حکم دیا ہے۔ عظیم امروہوی اور سید سکندر حسین کے مابین یہ گفتگو کم و بیش ربع صدی پہلے کی ہے کیا اس عرصے میں گویا کا کلام سامنے آیا ہے۔ کیا ستم ہے کہ جس شاعر نے ۱۷ مرثیے کہے ہوں اس کے مراثی ڈھونڈ ھے سے نہ ملیں اور وہ بھی جب اس کی اپنی اولاد موجود ہو؟

☆☆☆☆☆

چھنگا صاحب حسین:- (لکھنؤ)

ولادت ۱۸۸۰ء۔ وفات ۱۹۴۰ء۔

سید صادق علی عرف چھنگا صاحب تخلص حسینؔ۔ سید حسن جائیسی کے فرزند، مولانا سید محمد صاحب قبلہ رضوان مآب کے نواسے، خاندانِ اجتہاد کے ممتاز مرثیہ نگار ماہر لکھنوی کے داماد،

قدرت کے منظور نظر، غیر معمولی شاعر، خُوش خُلق انسان مگر ناخواندہ تھے۔ جو کہتے تھے دوسروں سے قلمبند کراتے تھے اور منبر پر دوسرے کی مدد سے پڑھتے تھے۔

حال ہی میں خانوادۂ اجتہاد کے شاعر ساحر لکھنوی نے اپنی کتاب '' خانوادۂ اجتہاد کے شعرا'' میں چھنگا صاحب حسین کے ناخواندگی اور نابینا ہونے کے متعلق لکھا ہے کہ:

'' میرے پہلے مرثیے قلی قطب شاہ سے ساحر تک میں جن سو، سوا سو مرثیہ گویوں کا ذکر آیا ہے اُن کا تعارف لکھتے ہوئے ڈاکٹر ہلال نقوی صاحب نے حضرت حسین کے متعلق لکھا ہے کہ '' یہ پہلے شاعر ہیں جو نابینا تھے'' غالباً انہیں کی تائید میں ڈاکٹر محمد رضا کاظمی نے بھی اپنی کتاب '' جدید اردو مرثیہ'' میں یہی جملہ درج کیا ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ حضرت حسین پیدائشی نابینا ہونا تو درکار زندگی کے آخری سانس تک بصارت سے محروم نہیں ہوئے۔''

حضرت مولانا باقر شمس کا خیال ہے کہ '' بظاہر اُن کے اَن پڑھ ہونے کی بھی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ خیال ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو اَن پڑھ ظاہر کرنا اپنی ایک ادا بنائی تھی یہ بھی ممکن ہے کہ خاندان اجتہاد کی ایک اور نامور شخصیت لسان الشعرا مولانا اولاد حسین عرف للّن صاحب شاعر نے ہفت وار سحاب لکھنؤ کی ایک اشاعت میں حضرت حسین کو'شاعر اُمّی' لکھا ہے اس میں شک نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ بالکل ان پڑھ تھے۔

چھنگا صاحب حسین کو مرثیہ پڑھتے ہوئے دیکھنے والوں میں شاید اب بھی لکھنؤ میں کوئی موجود ہو۔ پڑھنے کا انداز دلنشیں، کلام معیاری، کم وبیش دس مرثیے کہے اور خوب کہے۔ کربلا کے حوالے سے صحرا، جنگل، تپش، گرمی تو اکثر مرثیوں میں نظم کی گئی ہے لیکن چھنگا صاحب حسین نے سردی اور جاڑے کو نظم کیا ہے اور جاڑے کے متعلق ایسی بلند پرواز کی ہے اور ایسے ایسے نکات پیدا کیے ہیں جس کی نظیر نہیں ملتی۔

برف اس حد کی گری ہے کہ وہ صحرا ہے سفید ۔۔۔ کوہِ اسوَد تھا جو پہلے وہی سارا ہے سفید
منزلوں دیکھیے میدان میں سبزہ ہے سفید ۔۔۔ سنگ مرمر کی طرح سامنے دریا ہے سفید
پانی جمنے سے سمندر میں کہاں جوش ہے آج
جو شجر بن میں ہے گویا وہ کفن پوش ہے آج

برف باری سے بیاباں کا ہے سبزہ پامال پالا کھانے سے ہیں ٹھٹھرے ہوئے جنگل میں نہال
اوس میں بھیگ کے شبنم کا بُرا ہے احوال پھل ہے جو باغ میں ہے اس پہ بھی ہے فالج کا خیال
گر بشر کھائیں ہوا واں کی تو ہوں تن نیلے
آج تک ہیں اس دن سے لب سوسن نیلے

اوس پڑنے سے ہے بھیگی ہوئی صحرا کی زمیں طائروں کو بھی برودت سے کہیں چین نہیں
انقلاب ایسا یہ آیا ہے تہہ چرخ بریں بلبلیں بیٹھی ہیں بلبل کی انگیٹھی کے قریں
بال و پر اوس سے بھیگے ہوں تو راحت کیسی
آتش گل میں برودت ہے حرارت کیسی

نیلے سردی سے ہوئے جاتے ہیں جو پھول ہیں لال برف باری سے ہیں سب باغ میں بیلیں پامال
ہیں سفید آج کے دن سنبلِ پیچاں کے بھی بال بس ہو تو دھوپ کی چادر میں لپٹ جائیں نہال
آہ بلبل سے کلیجے کی رگیں ٹوٹتی ہیں
کونپلیں خوف سے سردی کے نہیں پھوٹتی ہیں

آج گل کانپتے ہیں دیکھ کے جو جوئے آب دھوکا پانی کا نہیں دے کے ڈراتا ہے سراب
عقل کہتی ہے کہ سردی میں جو لاتے نہیں تاب کرۂ نار کے پاس اُٹھ کے گئے اس سے سحاب
مختصر یہ کہ برودت کی وہ ارزانی ہے
کاسۂ مہر میں بھی آگ نہیں، پانی ہے

قمریاں سرد پہ جاتی ہیں نہ بلبل سوئے گل کوئلیں جا کے چھپی ہیں تہہ زلف سنبل
کرۂ نار میں بھی آگ نہیں ہے بالکل مشعل ماہ درخشاں بھی ہوئی اس سے گل
سرد وہ دھوپ کی چادر ہے کہ جلتی ہی نہیں
آگ پتھر سے نکالو تو نکلتی ہی نہیں

کربلا کے واقعات سے سردی یا برف باری کا کوئی تعلق نہیں۔ برف باری اور وہ بھی صحرائے کربلا میں؟ لیکن چھنگا صاحب حسین کو ان اشعار کی داد شاید اس تناظر میں ملی ہو کہ ایک نابینا شخص، برف باری کی منظر کشی اس خوبصورتی سے کر رہا ہے جیسے وہ ان مناظر کو دیکھ رہا ہو۔ تاہم یہ اعتراض اپنی جگہ ہے کہ جوش کی مسدس کو مرثیہ تسلیم نہ کرنے والے سخن فہم حضرات نے کربلا

میں برف باری اور فراوانیٔ آب کو تسلیم کرلیا مگر یہ نہ سوچا کہ حسینؑ دشمن طاقتیں کسی وقت اس تصوراتی شاعری کو یزید کی حمایت میں استعمال کرسکتی ہیں — تاریخ کربلا میں سے اگر امام حسینؑ اور اطفال حسینؑ کی پیاس اور بچّوں کے خشک کوزوں کے تذکرے کو نکال دیا جائے تو کربلا کی فکر بدل جاتی ہے۔

چھنگا صاحب حسینؔ کے مراثی کو پڑھ کر یا سن کر یہ یقین کرنا دشوار ہے کہ وہ ان پڑھ تھے۔قدرت نے انہیں شعر گوئی کا ہنر ودیعت کیا تھا— زود گو تھے، فی البدیہہ شعر کہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار راجہ صاحب سلیم پور نے فرمائش کی کہ حضرت موسیٰ کا دریائے نیل عبور کرنا اور فرعون کا غرق ہونا مرثیے کے چہرے میں نظم کیا جائے۔ چھنگا صاحب حسینؔ نے فرمائش پوری کی اور ایک ایسا مرثیہ کہا جو اُن کے یادگار مرثیوں میں شمار ہوتا ہے۔'' ممتاز شاعر تاثیرؔ نقوی نے اس مرثیے کا ایک مصرع نقل کیا ہے۔

"پانی کو ناپتی تھی کرن آفتاب کی"

جو پورے مرثیے کی آب وتاب کا مظہر ہے۔

چھنگا صاحب حسینؔ کے مرثیوں میں ندرت بیانی، صنائع بدائع، استعارات اور تشبیہات کی بہتات ہے۔ دراصل برف والا مرثیہ بھی ان کی ندرت پسندی کی تخلیق ہے۔

جناب ساحرؔ لکھنوی نے حضرت مہذبؔ لکھنوی کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ چھنگا صاحب حسینؔ نے پندرہ مرثیے کہے تھے جن میں سے صرف دو مرثیے مہذبؔ لکھنوی نے شائع کئے ہیں۔ ایک مرثیہ ''اذکار سخن'' میں شامل ہے جو حضرت عباسؑ کے احوال کا مرثیہ ہے اور دوسرا مرثیہ ''اسرار محن'' میں شامل ہے جس میں برف کی منظر نگاری ہے۔ حضرت عباسؑ کے احوال کے مرثیے کے بائیس (۲۲) بند ساحرؔ لکھنوی نے نقل کئے ہیں۔

☆☆☆☆☆

آغا شاعر قزلباش :-　(دہلوی)

ولادت ۱۸۷۱ء۔ وفات ۱۹۴۰ء

نام آغا ظفر علی، تخلص شاعرؔ، داغؔ کے شاگرد۔ دلّی کے یکتاہ مرثیہ نگار۔ دہلی کا آخری دور داغؔ کا دور تھا، داغ کے شاگرد آغا شاعر قزلباش نے اُردو مرثیے کو داغ کے لطافت زبان دی۔

زباں دانی ہماری اور پھر انداز دِلّی کا
ادائے شاہدِ مضموں جدا ہے لکھنؤ بھر سے

آغا شاعر کی مرثیہ گوئی کے جلو میں اُن کی مرثیہ خوانی نظر آتی ہے — ایک طرف تو انہیں افسرالشعراء کہا گیا دوسری طرف ان کی شاعری سے زیادہ ان کی مرثیہ خوانی کو سراہا گیا — خورشید اسلام نے انہیں ''ٹھیٹھ دِلّی والے'' کہہ کر یاد کیا ہے۔ علی جواد زیدی نے ''دہلوی مرثیہ گو'' میں آغا شاعر کی قادرالکلامی کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا ہے، ڈاکٹر نظیر حسین زیدی نے لکھا ہے کہ نواب فتح علی خان قزلباش کی فرمائش پر آغا شاعر مبارک حویلی کی مجلس عزا میں آئے اور لوگوں کو اطلاع ہوئی تو ایک جمِ غفیر ٹوٹ پڑا۔ حویلی میں تل بھرنے کی جگہ نہیں تھی۔

راقم الحروف نے لاہور کی عزاداری دیکھی ہے بلکہ اس میں شرکت کی ہے۔ مبارک حویلی اندرون بھاٹی گیٹ لاہور سر مراتب علیؔ کی ملکیت تھی۔ بیسویں صدی کی پانچویں دھائی میں مبارک حویلی کی مجالس میں سوز خواں عوض علی لکھنوی کو ہندوستان سے بلایا جاتا تھا۔ راقم الحروف کو کئی برس ان مجالس میں سلام پڑھنے کی عزت حاصل ہوئی ہے۔ مصورِ جذبات علامہ نور لدھیانوی بھی ان مجالس میں اپنا کلام پڑھتے تھے اور حافظ کفایت حسینؔ مرحوم خطابت فرمایا کرتے تھے، غالباً ممتاز نقاد اور مرثیہ گو شاعر سید وحید الحسن ہاشمی بھی اُن دنوں لاہور میں تھے۔ ایک طرف مبارک حویلی کی عزاداری تھی اور دوسری طرف 'قزلباش فیملی' کا عزاخانہ اندرون لوہاری گیٹ تھا۔ دونوں عزاخانوں میں عزاداری کے سلسلے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یہ طریق ایک دوسرے عزاخانے کو نیچا دکھانے کی کوشش نہیں تھی بلکہ غمِ حسینؑ منانے میں بہتر سے بہتر ذاکرین کو بلانا، بہتر سے بہتر انداز میں مجالس کا برپا کرنا مقصود تھا، ان حالات میں جبکہ قزلباش خاندان کی اپنی عزاداری اور اپنا عزاخانہ تھا نواب فتح علی خان قزلباش نے کن حالات میں یہ چاہا ہوگا کہ آغا شاعر قزلباش مبارک حویلی میں مرثیہ پڑھیں۔ بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آغا شاعر قزلباش شعر پڑھتے تھے تو خود شعر کی تصویر بن جاتے تھے۔ جوشؔ نے اُنہیں تحت الفظ کا بادشاہ کہا ہے۔

آغا شاعر قزلباش کا معرکتہ الآرا کام قرآن حکیم کا منظوم ترجمہ ہے۔ اس ترجمے کی خوبی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ شاہد احمد دہلوی ایسے خود پسند نقاد نے تسلیم کیا ہے کہ قرآن حکیم

کے جتنے بھی منظوم ترجمے ہوئے ان میں آغا شاعر قزلباش کا ترجمہ سب پر فوقیت رکھتا ہے۔
آغا شاعر قزلباش اس دور کے شاعر ہیں جو کلاسیکی مرثیے کے انتہائی عروج کا دور تھا۔ میر انیسؔ کی وفات سے پہلے پیدا ہوئے اور جوشؔ کے ''حسینؑ اور انقلاب'' کی اشاعت سے ایک سال قبل وفات پاگئے — کلاسیکی مرثیے میں آغا شاعرؔ نے جو ندرتیں پیدا کیں، زبان کی چاشنی اور حلاوت کو جس بلندی تک لے گئے اگر وہ زرخیز ذہن رکھنے والا شاعر آج کے مرثیے کے دورِ ارتقاء میں ہوتا تو نہ جانے کہاں کہاں بجلیاں کڑکتی اور کہاں کہاں بادل برستے۔

اس استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ جس وقت لکھنؤ کے شعراء رنگ انیسؔ یا رنگ دبیرؔ میں شعر کہہ رہے تھے اس وقت دہلی میں سناٹا تھا۔ اس وقت دلّی کی خاموش فضاؤں سے جو آواز اُبھری وہ آواز آغا شاعر قزلباش کی تھی جس نے لکھنو کی طرزِ شعر گوئی سے شعوری اجتناب کیا اور مرثیے کو رنگ قدیم کی فرماں روائی کے دور میں فکر و اسلوب کی جدّت دی۔ مثال کے طور پر اُن کے ایک مرثیے کے چہرے کے دو بند سرکار ختمی مرتبت نبی کریمؐ کے حوالے سے دیکھئے تو دہلوی طرز نگارش نظر آئے گی۔

وہ حسنِ صبیحی میں ملاحت کا تلاطم وہ چشمِ سیہ، پنجۂ مژگاں، سرِ مردم
وہ لذّتِ گفتار، وہ اندازِ تکلّم وہ شانِ تقدّس، وہ حکیمانہ تبسّم
غنچوں میں وہ بے ساختگی آ ہی نہیں سکتی
ہنستی تو ہیں کلیاں، وہ ہنسی آ نہیں سکتی

ڈاکٹر صفدر حسینؔ نے اُن کے ۱۴ مرثیوں کا ایک مجموعہ ''زادِ آخرت'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ اہل نقد و نظر ہی نہیں عام قاری کے لئے بھی مرثیوں کی تعداد سے زیادہ معیار شاعری ہی شاعر کی حیات اور مابعد حیات زندگی کا فیصلہ کرتا ہے۔ مصطفیٰ زیدی اس صورت حال کی بہتر مثال ہیں۔ آغا شاعر قزلباش کے چودہ مرثیوں کے علاوہ وہ کچھ نہ کہتے تب بھی وہ مرثیہ گو شاعروں میں شمار ہوتے۔

تاریخ کربلا کی ابتدا تو حضور نبی کریم کی رحلت کے فوراً بعد ہی شروع ہوگئی تھی لیکن جس دن یزید کے حکم سے، مدینے کے گورنر ولید ابن عتبہ نے امام حسینؑ سے یزید کی بیعت طلب کی تھی اُسی دن سے تاریخ کربلا لکھی جانی شروع ہوگئی تھی، آغا شاعر قزلباش نے تاریخ کربلا کا پہلا

باب امام حسینؑ کے آغاز سفر سے پہلے نانا کی قبر پر جا کر سفر کی اجازت مانگنے سے شروع کیا ہے۔

کہتے ہیں السلام وعلیک اے رسول پاک کیا عرض میں کروں میرا قصہ ہے دردناک
ہر چند اس فراق سے ہوتا ہے قلب چاک جاتا ہوں کھینچتی ہے مجھے کربلا کی خاک
نانا یہ مرے خوں میں نہانے کا وقت ہے
اسلام ڈوبتا ہے، بچانے کا وقت ہے

ایماں کی شکل، عدل کی صورت بدل گئی پھیلا ہے کذب، دین کی حالت بدل گئی
تعظیم وہ نہیں، وہ ہدایت بدل گئی ایسا نہ ہو کہیں کہ شریعت بدل گئی
جاتا ہوں میں کہ وعدۂ طفلی وفا کروں
مجھ سے نہ دیکھا جائے گا نانا میں کیا کروں

بے روک ٹوک فتنۂ شر کا ہوا جواز فسق و فجور میں ہیں عرب والے خانہ ساز
گوشہ نشین ہو گئے جتنے تھے پاکباز حاکم شراب پی کے پڑھانے لگے نماز
مطلق نہیں تمیز حلال و حرام کی
توہین ہو رہی ہے خدا کے کلام کی

کج بحث ہیں کجی کے سوا جانتے نہیں دامن بغیر خون کے گردانتے نہیں
احکام کردگار ذرا مانتے نہیں ایمان کیا ہے، اس کو بھی پہچانتے نہیں
آئین شرع مٹ گئے، آفت برس گئی
اب بوئے سلطنت ہے دماغوں میں بس گئی

(زادِ آخرت)

تاریخ کربلا کے پہلے شہید حضرت مسلم بن عقیل ہیں جو کربلا سے پہلے کوفہ میں شہید ہوئے لیکن اُن کی شہادت اور اُن کے دو معصوم بچوں کی دربدری اور شہادت تاریخ کربلا کا ہی ایک خونیں باب ہے، آغا شاعر قزلباش نے اس باب کو بھی خون جگر کی روشنائی سے لکھا ہے یہ باب ان کا مرثیہ ۔ "روپوش ہیں زندان سے دو یوسفِ ثانی" ہے ۔

روپوش ہیں زندان سے دو یوسفِ ثانی حیدرؑ کی شجاعت ہیں محمدؐ کی نشانی
بچے ہیں ابھی صاف نہیں لفظ و معانی وہ سن ہے، سنا کرتے ہیں جس سن میں کہانی

یہ بھی نہیں معلوم کدھر جاتے ہیں دونوں
آتا ہے کوئی پاس تو ڈر جاتے ہیں دونوں

کوفے کی طرف سے جو ہوا آتی ہے اکثر ایک ایک کا منہ دیکھنے لگتا ہے لرز کر
چھوٹے سے بڑا کہتا ہے چل جلد برادر [۴] ایسا نہ ہو آجائے یہاں کوئی ستمگر
بیداد پہ حاکم ہے، خدا سے نہ ڈرے گا
بابا کی طرح ہم کو بھی وہ قتل کرے گا

لو، اُنگلی پکڑلو تو چلیں جلد یہاں سے [۱۲] ایسا نہ ہو گھِر جائیں کہیں اے میرے پیارے
ننھا سا وہ دل ہل گیا، رو کر کہا چلئے ڈرتے ہوئے آخر یہ پھر اک باغ میں پہنچے
سہمے ہوئے، آپس میں ہم آغوش ہوئے وہ
چڑھ کر شجرِ سبز پہ روپوش ہوئے وہ

ناگاہ زنِ مومنہ اِک چاہ پہ آئی سو دل سے جو تھی آلِ محمد کی فدائی
دیکھا جو اُنہیں خوش ہوئی وہ غم کی ستائی [۱۳] احوال سنا اُن کا پھر اک بات بتائی
شوہر میرا گھر میں نہیں کچھ غم نہ کرو تم
لونڈی ہوں میں چل کر میرے مہمان بنو تم

بچے اس مومنہ کے گھر آگئے، مومنہ نے انہیں کھانا کھلایا اور ایک جگہ چھپا کر سُلا دیا، بڑے بھائی نے خواب دیکھا کہ نبی کریم رحمت اللعالمین حضرت مسلمؑ سے کہہ رہے ہیں کہ بچوں کو کہاں تکالیف میں چھوڑ آئے ہو، اُنہیں اپنے پاس بلا لو۔ بچہ بیدار ہوا اور دوسرے بھائی کو بتایا کہ ہمیں بابا کے پاس جانا ہے۔ مومنہ کے شوہر حارث ملعون نے بچوں کی آواز سنی تو اُنہیں گرفتار کرلیا، اس موقع پر جو بند لکھا ہے آغا شاعر قزلباش نے وہ شاعری کی اعلیٰ اقدار پر جلوہ گر نظر آتا ہے۔

وہ بولا کہ تم کون؟ کہا آلِ پیمبرؐ بولا یہاں کیوں آئے؟ کہا موت سے ڈر کر
اس نے کہا لایا ہے کوئی؟ بولے مقدرّ چلایا کہ اب کیا ہو؟ کہا کھینچ لے خنجر
اس نے کہا کچھ مکر تراشا نہیں جاتا
یہ بولے اجل سے کہیں بھاگا نہیں جاتا

یہ مرثیہ قدم بہ قدم آگے بڑھتا ہے اور تاریخ کے پرت کھولتا چلا جاتا ہے۔ آغا شاعر

قزلباش کے جملہ مراثی میں یہی کیفیت ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اُنہوں نے کربلا کے تاریخ کے (سلسلہ دار) واقعات کو مراثی کے ذریعے نظم کرنے کی ٹھانی ہو، بالکل اس طرح جیسے اُنہوں نے قران حکیم کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔ اہل نقد ونظر نے آغا شاعر قزلباش کو جو خراج تحسین پیش کیا ہے وہ ان کے معیار کلام کی برتری کی دلالت کرتا ہے مگر سچ پوچھئے تو حرف آخر بھی یہی ہے۔

☆☆☆☆☆

ثابت لکھنوی:- (لکھنؤ)

ولادت ۱۸۶۱ء۔ وفات ۱۹۳۱ء

نام سیّد افضل حسین، تخلص ثابتؔ (لکھنوی) دبستان دبیرؔ کی اہم شخصیت۔ ثابتؔ لکھنوی کو نظم ونثر پر یکساں عبور حاصل تھا۔ ان کے مرثیوں کی دو جلدیں صبر جمیل اوّل اور صبر جمیل دوئم مکتبہ یوسفی دہلی سے شائع ہوئیں — مرزا اوجؔ کے شاگرد ہونے کے باوجود ان کے مرثیوں میں انیسؔ اور دبیرؔ دونوں اساتذہ کا رنگ نمایاں ہے اس لئے اپنا انفرادی رنگ نہ بن سکا — مرثیہ نگاری کے علاوہ راجستھان جیسے بے آب وگیاہ علاقے میں رہ کر "حیاتِ دبیر" کی دو جلدیں اور شاگردان دبیر کا تذکرہ "دربار حسین" کے نام سے تالیف کیا۔ یہ ساری کتابیں رثائی ادب میں بھی اضافہ شمار کی جاتی ہیں اور کردار نگاری اور صحت مند نقد ونظر میں بھی — مرثیہ گوئی اور شاعری سے زیادہ ان کتابوں کی وجہ سے ثابتؔ لکھنوی کو زیادہ شہرت ملی ہے" حیات دبیر" میں مرزا اوج کے متعلق ثابتؔ لکھنوی نے لکھا ہے:

> "مرزا اوجؔ نے مرثیوں میں اصل واقعات اور روایات کو نظم کیا ہے اور رعایت لفظی کی بجائے موثر الفاظ کے استعمال کو مقدم سمجھا ہے۔ اہل بیت اطہار کے درجات کا (اپنے والد مرحوم کی طرح) لحاظ رکھا ہے۔ بے جا مبالغوں سے کلام کو بچایا ہے۔"

ثابتؔ لکھنوی نے اس دعویٰ کی مثال پیش کی ہے کہ مسلم بن عقیل کے سفر کی تصویر کھینچی ہے تو وہاں بالکل عرب کا جنگل دکھایا ہے۔ جس میں کھجوروں کے جھنڈ ہوتے ہیں یہ نہیں کہ عرب کے باغ میں جوہی اور بیلے کے پھولوں کی فراوانی بتائی ہو جن پھولوں کا صحرائے عرب میں وجود نہیں ہوتا۔ گویا ثابتؔ لکھنوی یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اوجؔ حقیقت نگار شاعر تھے اور حقائق کو ہی نظم

کرتے تھے اسی لئے جدید مرثیے کے بانی کہلائے ——

ثابت لکھنوی نے بھی مرزا اوج کے اِن خواص کی پیروی کی ہے جو انہوں نے مرزا اوج میں بتائے ہیں۔ اُن کے ایک مرثیے کے چند اشعار دیکھئے جس میں انہوں نے براہ راست فضائل سے ابتدا کی ہے اور تاریخ و روایات کو تسلسل سے نظم کیا ہے۔

جس بندہ میں ہے شانِ الٰہی، وہ علیؑ ہے جس نے مدد غیر نہ چاہی، وہ علیؑ ہے
کج فہموں سے بھی جس نے نباہی وہ علیؑ ہے تھا راہِ محمد کا جو راہی وہ علیؑ ہے

واقف نہیں جو ان سے حق آگاہ نہیں ہے
رہزن ہے وہ حیدر سے جسے راہ نہیں ہے

اسی روانی سے ۲۶ بند کہنے کے بعد گریز پر آتے ہیں۔

جب وقت جہاد آتا تو بن جاتے تھے زاہد اخبار و سیَر میں ہیں بہت اس کے شواہد
ان میں سے ہے اک غزوہ احزاب بھی شاہد خندق کی لڑائی جسے کہتے ہیں مجاہد

یہ جنگ نہ سر ہوتی تو پھر کام نہ چلتا
بے ضربِ علیؑ سکۂ اسلام نہ چلتا

اس مرثیے میں جنگ خندق سے وابستہ پوری روایات کو نظم کیا گیا ہے۔ حضرت سلمانؓ کے مشورے پر خندق کھدوانا۔ عمر بن عبدوَد کا خندق کے اس پار آنا اور فوج اسلام کو للکارنا، سپاہ اسلام کا خوف کھانا، حضرت علیؑ کا بار بار اجازت طلب کرنا، اور جب لشکر اسلام میں عمر ابن عبدوَد سے لڑنے کو کوئی تیار نہ ہوا تو حضورؐ کا علی مشکل کشا کو جنگ کی اجازت دینا، حضور نبی کریم کا علیؑ کے سر پر اپنا عمامہ رکھنا اور ذوالفقار دے کر جنگ کے لئے روانہ کرنا اور یہ ارشاد کہ:

''آج کے دن علی کی ایک ضربت ثقلین کی عبادت سے افضل ہے''

یہ سارے واقعات بہت ترتیب اور تسلسل کے ساتھ بغیر کسی استعارے یا صنعتِ شعر گوئی کے نظم کئے ہیں جن کو پڑھنے یا سننے کے بعد قاری یا سامع ہمہ وقت خود کو جنگِ خندق میں تاریخ کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اشارے کنائے، استعارے قاری کے ذہن کو اِدھر اُدھر نہیں لے جاتے۔ شاید یہی ثاقب لکھنوی کی خصوصیت ہے۔ اس مرثیے کا آخری بند دعا پر ختم ہوا ہے۔

بے وجہ نہیں مجلسِ ماتم میں بکا ہے ثابت، گذر ارواحِ آئمہ کا ہوا ہے

خالق سے دعا مانگ کہ یہ وقت دعا ہے یارب تیرا بندہ درِ حیدرؑ کا گدا ہے

مایوس نہ کر حیدرِ کرار کا صدقہ

بر آئیں مقاصد شہِ ابرار کا صدقہ

اس موقع پر بیساختہ زبان سے آمین نکلتی ہے۔

☆☆☆☆☆

میر مانوس لکھنوی:-

ولادت ۱۸۴۴ء ۔وفات ۲۷/اپریل ۱۹۴۱ء

نام سید علی مانوسؔ، میر شامن علی کے فرزند۔ میر انیسؔ کے نواسے، صغیر سنی میں یتیم ہو گئے تھے۔ میر انیسؔ نے اپنے دامن شفقت میں لے لیا۔ یہاں تک کہ اپنی صاحبزادی کی شادی میر مانوسؔ سے کردی۔

میر مانوسؔ ہر محفل میں میر انیسؔ کی پیش خوانی کرتے تھے۔ شاعری میں پہلے میر انیس سے اور پھر میر نفیسؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ میر نفیسؔ کے انتقال کے بعد میر عارفؔ سے اصلاح لیتے رہے۔ میر مانوسؔ نے میر انیسؔ و نفیسؔ کی طرح کثرت سے مرثیے نہیں کہے۔ وہ جو ایک خاندانی وقار تھا شاید اُس کے زیرِ عصر چند مرثیے کہے، البتہ سلام اور رباعیات بہت کثرت سے کہیں۔ میر مانوسؔ خود مرثیے کہنے کی بجائے میر انیسؔ، میر نفیسؔ اور خاندان کے دوسرے بزرگوں کے مرثیے شوق سے جمع کر کے رکھتے تھے۔

میر مانوسؔ نے زندگی کے پچیس برس میر انیسؔ کے ساتھ گذارے، میر انیسؔ کے ساتھ سفر کئے اس لئے میر انیسؔ کے حالات اُنہیں ازبر تھے۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے حالات بھی انہیں یاد تھے مگر کسی مورخ نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا آنکھوں دیکھا حال اُن سے سن کر رقم نہیں کیا۔ جب کہ پہلے صفحات میں عرض کیا گیا ہے یہ وہ دور تھا جب جنگ آزادی کا ذکر جرم تھا جس پر سر قلم کردئے جاتے تھے۔

میر مانوسؔ نے مرثیے کم ضرور کہے مگر خوب کہے ہیں، اور کیوں نہ کہتے انہوں نے ۲۵ سال میر انیسؔ سے اصلاح لی اور ان کے شب و روز دیکھے۔ میر انیسؔ کے بعد اپنے بڑے ماموں میر نفیسؔ سے اصلاح لی۔ میر نفیسؔ کے بعد میر عارفؔ کو کلام دکھاتے رہے۔ اب بھی ان کا کلام سہ

آتش نہ ہوتا تو کس کا کلام ہوتا۔ نمونہ کلام کے طور پر اُن کے ایک مرثیے کی ابتدا کے چند بند نقل کئے جارہے ہیں۔

جب کہ دنیا میں نمایاں ہوئی ماتم کی سحر — آئی آواز کہ آج آئی ہے وہ غم کی سحر
جس کو سب کہتے ہیں عاشورِ محرم کی سحر — ہے یہی قتلِ شہنشاہِ دو عالم کی سحر
تھے جو سامان خوشی کے وہ نہاں ہونے لگے
غم کے آثار فلک سے بھی عیاں ہونے لگے

اب سحر آئی ہے یہ حکم سنانے کے لئے — آئی دنیا میں صبا خاک اُڑانے کے لئے
پھولی گردوں پہ شفق رنگ دکھانے کے لئے — سرخ ہو چشم فلک خون بہانے کے لئے
فق ہوا رنگ جہاں جبکہ یہ حالت دیکھی
سب نے آتی ہوئی دنیا میں قیامت دیکھی

یوں نمایاں ہوئی عالم میں جو صبحِ عاشور — جتنے مشتاقِ شہادت تھے ہوا ان کو سرور
ہوئے حاضر درِ خیمہ پہ جو حسبِ دستور — دل میں یہ شوق کہ اب جلد برآمد ہوں حضور
صبح کا وقت ہے اب طاعتِ داور کرلیں
پھر فدا شاہ پہ ہوں خُلد میں جا گھر کرلیں

یہ مرثیہ جناب علی اکبر کے احوال کا ہے۔ اور اس کے ۱۳۶ بند ہیں۔

☆☆☆☆☆

آل احمد نعیم:- (بدایونی)

ولادت ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۶ء ۔ وفات ۱۹۴۱ء

سید آل احمد نعیم کا تاریخی نام محمد ظریف بھی تھا مگر آل احمد نعیم سے پہچانے گئے۔ قصبہ سہسواں ضلع بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں امروہہ آئے، پیشہ کے اعتبار سے کامیاب وکیل ابن وکیل، قلم کے رشتے سے ادیب و شاعر، علم کے حوالے سے عالم و فاضل۔ رثائی ادب میں مرثیہ، سلام، قصائد کہنے والے شاعر جن کے مرثیوں سے زیادہ اُردو، فارسی میں کہے گئے سلام دستیاب ہیں۔ — نعیم کے فرزند سید عطا حسین کا انتقال ہو گیا اس لئے نعیم کے مراثی کا ذخیرہ بکھر گیا۔ سید آل احمد نعیم کلاسیکی مرثیے کی روایت کے شاعر تھے — روایت کی روشنی میں حضرت قاسم کا رجز

سید آلِ احمد نعیم کے الفاظ میں ۔

آیا جو رزم گاہ میں فرزند مجتبیٰ فرمایا شامیوں سے کہ اے قوم بے حیا
آؤ مقابلے کو میرے دیکھتے ہو کیا چکھو ہماری تیغ شرر بار کا مزا
پیاسوں سے تین دن کے یہ جنگ وجدال ہے
اے بے حمیتو! تمہیں کچھ بھی خیال ہے

قاسم کا رجز ختم ہوا، جنگ شروع ہوئی، قاسم نے دادِ شجاعت دی، فوج نے چاروں طرف سے گھیرا ۔

یہ سن کے پھر تو ٹوٹ پڑے سارے نابکار ابن حسنؑ پہ ہونے لگے ہر طرف سے وار
تا دیر واں لڑا کیا شبّر کی یادگار آخر کو زخم کھا کے گرا رن میں ایک بار
آواز دی یہ سیّد عالی کو دور سے
ہے آخری سلام ہمارا حضور سے

سن کر صدا بھتیجے کی سلطان بحر و بر "چلائے" آہ قاسم نوشہ گئے کدھر
"روتے ہوئے" سوار ہوئے ذوالجناح پر پہنچے جو قتل گاہ میں، کی ہر طرف نظر
دیکھا تڑپتے خاک پہ دولہا کی لاش کو
گھیرے ہوئے تھی فوج تنِ پاش پاش کو

آلِ احمد نعیم کے اُستاد مولوی سید اولاد حسین سلیم تھے۔ نعیم اُردو، فارسی اور عربی دسترس رکھتے تھے۔ ان کے کہے ہوئے جو بیشمار سلام اور قصائد میسّر ہیں ان میں فارسی زبان میں کہے گئے قصائد بھی ہیں ۔

از ادب پیشِ بزرگاں لب کشودن مشکلست
زشادی طائرِ فکرم بسدرہ حوصلہ دارد۔ وغیرہ وغیرہ۔

نعیم کو نظم میں تاریخ گوئی پر بھی قدرت حاصل تھی۔ ابوالحسن فرقتی کی "عقیقِ جگری" اور مولانا سید محمد صاحب قبلہ کی "مسائل شریعہ" کی منظوم تاریخ جو نعیم نے نکالی تھی آج بھی مشہور ہیں۔

(مرثیہ نگارانِ امروہہ)

☆☆☆☆☆

طوبیٰ امروہوی:-

ولادت ۱۸۶۷ء۔ وفات ۱۹۴۲ء

نام سید محمد اسرائیل، تخلص طوبیٰ۔ حافظ قرآن۔ سید محمد آسمٰعیل حافظؔ کے فرزند۔ نقوی سید۔ عربی فارسی کے علم۔ زندگی کا زیادہ حصہ رام پور میں گذارا۔ ریاست رامپور میں لائبریری کے نائب مہتمم تھے اور ہز ہائینس نواب سید رضا علی والئی رامپور کے استاد بھی تھے۔ کثیر المطالعہ علم تھے۔ بدیہہ گو شاعر تھے مگر شاعری صرف ذکر محمدؐ و آل محمدؐ تک محدود تھی۔ حافظ محمد اسرائیل طوبیٰ کے مراثی آج بھی امروہہ میں پڑھے جاتے ہیں، وہ کلاسیکی مرثیہ کی روایت کے پاسدار تھے۔

پدر کے ہجر میں صغرا جو بے قرار ہوئی نحیف و زار تو تھی اور بھی نزار ہوئی
فراق میں ہمہ تن چشم انتظار ہوئی اجل پسند ہوئی زیست نا گوار ہوئی
نہ جاگنے میں اسے چین تھا نہ سونے میں
قرار تھا دل بیتاب کو تو رونے میں

☆☆☆☆☆

منّے صاحب ذکی:- (لکھنؤ)

ولادت ۱۸۵۸ء۔ وفات ۱۹۴۳ء

میر انیسؔ کی نواسی کے فرزند۔ والد کا اسم گرامی سید محمد تقی۔ کہاوت ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ خانوادۂ انیسؔ کے ہر فرد پر یہ کہاوت صادق آتی ہے۔ منّے صاحب ذکی کو بھی مرثیہ گوئی ورثے میں ملی تھی۔ پیارے صاحب رشیدؔ کی شاگردی اختیار کی — کہا گیا ہے کہ منّے صاحب ذکی کے ۸۷ مرثیے ان کے پس ماندگان کے پاس ہیں۔ مرثیہ کہنے کے علاوہ مرثیہ پڑھنے میں بے مثل تھے۔ آج بھی لکھنؤ اور پٹنہ کے اہل ذوق کے کانوں میں ان کے مرثیہ پڑھنے کی آوازیں گونجتی ہے۔ غزل گوئی میں مہارت رکھتے تھے، اُن کی غزلیں۔ قصائد، رباعیات بکثرت ان کے ورثاء کے پاس ہیں۔ ان کے انتقال کو بھی نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہوگیا۔ نہ جانے ان وارثوں میں بھی کوئی ہوگا کہ نہیں۔ کیا یہ سمجھ لیا جائے کی ان کا کلام بھی ۔۔۔۔؟ (کہنے کو جی نہیں چاہتا کہ) ضائع ہوگیا۔

ذکی صاحب ۱۹۴۳ء میں، بعمر ۸۵ سال، اس دنیائے فانی سے چلے گئے اور مقبرۂ انیس

لکھنو میں سپردِ خاک کیے گئے۔ منے صاحب ذکی کے حالاتِ زندگی بہت مختصر سے ملتے ہیں پچاسی سال کی عمر، اور ۱۹۴۳ء میں انتقال کے حساب سے ان کا سالِ ولادت ۱۸۵۸ء بنتا ہے۔ آج ان کی یاد اور نمونے کے طور پر مرثیے کے چند بند کے علاوہ ہم تہی دستوں کے پاس اور کچھ نہیں ہے۔

ہزار حسن ہیں جس میں وہ آئینہ ہے سخن ہر ایک کو نہ بہم ہو وہ کیمیا ہے سخن
پسندِ حق کو ہے وہ دُر بے بہا ہے سخن پئے ظہورِ غمِ آلِ مصطفیٰ ہے سخن
ہر اک کا باعث و وجہِ وقار ہے تو یہ ہے
جہاں میں تاجِ سرِ اعتبار ہے تو یہ ہے

سخن وہ کون ہے تعریف جس کی ہے یہ رقم ہے صرف اس کے لئے نظمِ مدحِ شاہِ امم
یہ کوچہ وہ ہے جہاں جاکے کانپتے ہیں قدم یہی وہ راہ ہے چلتا ہے جس میں سر سے قلم
اسی سے مہر صفت دل کا داغ ہوتا ہے
اسی کلام سے عالی دماغ ہوتا ہے

("عکسِ لطیف، اپریل ۰۷ء کے حوالے سے)

☆☆☆☆☆

فائق لکھنوی :- (لکھنو)

ولادت ۱۸۸۷ء - وفات اگست ۱۹۴۴ء

نام سید ظفر حسین، عرفیت بابو صاحب، تخلص فائقؔ، میر عارفؔ کے بڑے بیٹے، میر نفیسؔ کے نواسے، میر انیسؔ کے پر پوتے۔ شعر گوئی گویا خون میں رچی بسی تھی۔ دس گیارہ برس کی عمر سے غزل کہنی شروع کی۔ اس کے بعد مرثیے کی طرف متوجہ ہوئے۔ میر فائقؔ کی عمر ۲۴ برس تھی جب اُن کے والد میر عارفؔ کا انتقال ہوا۔ میر فائقؔ کے مرثیے ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ بقول ڈاکٹر ہلال نقوی، میر فائقؔ کے فرزند اصغر حسین، حال مقیم کراچی نے سات مرثیے قیمتاً حجۃ السلام علامہ طالب جوہری کو دے دیئے۔ علامہ صاحب خود عالمِ دین ہونے کے علاوہ مستند شاعر بھی ہیں اس لئے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ میر فائقؔ کے کم از کم یہ سات مرثیے تو محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گئے۔ سید ضمیر اختر نقوی نے اس سلسلے میں انکشاف کیا ہے کہ اس سودے میں وہ خود شریک

تھے اور اصغر حسین صاحب نے بخوشی مبلغ پانچ ہزار روپے ہدیہ قبول کر کے میر فائق کے سارے مرثیے علامہ طالب جوہری کو فروخت کر دیے۔ مرثیوں کی تعداد ۱۴ تھی۔ چلئے یہ بھی درست سہی، تو گویا بابو صاحب فائق لکھنوی کے ۱۴ مرثیے تو محفوظ ہوئے۔ میر فائق کے ذخیرے میں اور کیا کچھ تھا اس کا کوئی مستند راوی نہیں ہے۔ عام طور پر تو یہی خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے مرثیوں کی کل تعداد ۱۴ ہی ہے جو وقت موجود میں علامہ طالب جوہری کے پاس ہیں۔ علامہ موصوف سے تعلقِ خاطر کی بنیاد پر دل کہتا ہے کہ وہ مراثی کی ''ذخیرہ اندوزی'' نہیں کرینگے بلکہ انہیں شائع کریں گے۔

راجہ صاحب محمود آباد خاندان انیس کے مخلصین میں تھے اور کئی پشتوں سے روایت چلی آ رہی تھی کہ راجہ صاحبان خانودہ میر انیس کے شعراء سے مشورۂ سخن کرتے تھے لیکن بدقسمتی سے راجہ صاحب اور میر فائق کے تعلقات میں کشیدگی آ گئی تھی یہاں تک کہ محمود آباد میں جو مجالس ہوتی تھیں فائق نے ان مجالس میں پڑھنا بھی چھوڑ دیا تھا اور گوشہ نشیں ہو گئے تھے۔ آخر کار ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہو گئے، منہ سے خون آنے لگا اور اسی مرض میں انتقال فرما گئے۔

مرتضٰی حسین فاضل لکھنوی نے لکھا ہے کہ بابو صاحب فائق جب مجلس پڑھتے تھے تو انہیں جتنی داد ملتی تھی دوسری مجالس میں کسی کو اتنی داد ملتی کم دیکھی ہے۔

ان کی ایک مرثیے '' آج پھر جوش پہ ہے نشۂ صہبائے سخن'' کے چند بند بطور نمونۂ کلام درج ذیل ہیں۔ یہ حضرت عباس کا احوال کا مرثیہ ہے۔

۱
آج پھر جوش پہ ہے نشۂ صہبائے سخن		موجزن صورتِ تسنیم ہے دریائے سخن
دل ہے مشتاق پئے دیدِ سراپائے سخن		مجھ کو اے طبع دکھا پھر رُخِ زیبائے سخن
وجد میں رند ہیں سب صوتِ ہزار آتی ہے
مدحتِ ساقیٔ کوثر کی بہار آتی ہے

۲
آج تو سر سے ہوا جاتا ہے اونچا پانی		مثلِ نیساں ہے زباں صرفِ گہر افشانی
دمبدم مجھ کو یہ دیتی ہے خبر طغیانی		قلزم طبع ہوا چاہتا ہے طوفانی
موجۂ بحرِ سخن ہے کہ زباں ہے میری
آج دریا کی طرح طبع رواں ہے میری

یا علیؑ شیر خدا، حیدر صفدر مددے ۱۰ نور خالق مددے، نفس پیمبر مددے
شاہِ مرداں مددے، فاتحِ خیبر مددے وقت امداد ہے یا ساقیٔ کوثر مددے
ہاں مجھے میری غلامی کا صلہ مل جائے
اور اک ساغرِ لبریزِ وِلا مل جائے

ہاں محبان علیؑ اب متوجہ ہوں ادھر ۱۱ کہ بیاں کرتا ہوں میں مدحت شاہِ خیبر
قاسم نار و جناں ساقیٔ حوضِ کوثر نورِ حق، سرورِ دیں، شافعِ روزِ محشر
اس طرح اُن کے مراتب کا خود اظہار کیا
دو جہاں کا انہیں اللہ نے مختار کیا

ہر مصیبت پہ پیمبر کے رہے سینہ سپر ۲۰ جو مہم پڑ گئی وہ ہاتھ سے انکے ہوئی سر
ان سے خائف رہے کفارِ عرب کے لشکر یہ نہ ہوتے تو کبھی فتح نہ ہوتا خیبر
کس طرح احمد مختار کی غمخواری کی
آج تک ذکر ہے جس کا وہ علمداری کی

اور اب گریز کا انداز۔ علمدار رسول حضرت علیؑ سے علمدار حسینؑ حضرت عباسؑ کی طرف :

کر چکا ذکر علمداریٔ شاہِ کونین ۲۱ اک علمدار کی خاطر ہے بس اب دل بے چین
حرزِ جانِ پسرِ فاتحِ صفین و حنین ہیں وہ عباسِ علیؑ، عاشق و شیدائے حسینؑ
تھے وہ جس طرح رسولِ عربی پر صدقے
بس اُسی طرح یہ تھے سبطِ نبی پر صدقے

مرثیہ ۵۵ بند پر مشتمل ہے، اکیسویں بند میں ذکرِ عباسؑ شروع ہو جاتا ہے، اس کے بعد تاریخ اور روایات بشمول شہادت اور حسب روایت بین۔ سب کچھ ہی تو نظم کر دیا ہے میر فائق نے۔ اس مرثیے میں ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ رنگ انیس کی پیروی کے باوجود لوازم مرثیہ کی سو فیصد پابندی نہیں کی گئی۔ مرثیے میں تلوار پر، گھوڑے پر اشعار نہیں ہیں اس کے باوجود مرثیہ اقدار مرثیہ کا ترجمان ہے۔

☆☆☆☆☆

فائز لکھنوی (لڈن صاحب)

ولادت ۱۸۸۵ء وفات ۱۹۴۶ء

نام محمد حسن، تخلّص فائزؔ، عرفیت لڈن صاحب۔ دولہا صاحب عروجؔ کے فرزند، میر انیسؔ کے پرپوتے، میر نفیسؔ کے پوتے۔ جس وقت اُن کے دادا میر نفیسؔ نے وفات پائی اس وقت لڈن صاحب ۱۶ برس کے تھے، جب اُن کے والد دولہا صاحب عروجؔ نے وفات پائی (۱۹۳۰ء میں) اس وقت لڈن صاحب فائزؔ ۴۶ برس کے تھے، گویا میر نفیسؔ اور دولہا صاحب عروجؔ سے اصلاح کا وقت ملا اور کامل شاعر بن گئے ـــ یہی وجہ تھی کہ اُن کے متعلق مشہور ہو گیا تھا کہ وہ اپنے والد سے بہتر شاعر تھے۔ میر انیسؔ، میر نفیسؔ، دولہا صاحب عروجؔ اور لڈن صاحب فائزؔ، یعنی اگر میر انیسؔ سے ابتدا کریں تو چوتھی پشت (شبیر کی مداحی میں) مرثیہ گوئی میں، اور اگر میر ضحاک یا میر خلیق سے شمار کریں تو یہ قطار اندر قطار روشنی بانٹنے والا ایک نمائندہ چراغ ہیں۔ لڈن صاحب فائزؔ کے ۱۳ مرثیے حضرت شدید لکھنوی کے پاس تھے۔ ان کے بعد ان کے بھانجے (لکھنو میں) سبط محمد نقوی کے پاس چلے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ میں میر خلیقؔ سے اور پھر انیسؔ و دبیرؔ سے جو مرثیہ کی فضا تھی اس کی ایک عطا یہ تھی کہ شعراء کرام کے مرثیوں کو ان کے پس ماندگان بہت حفاظت سے رکھتے تھے۔ لیکن یہ امر تعجب خیز ضرور ہے کہ اہل علم حضرات اس امر کو کیوں فراموش کر دیتے تھے کہ کاغذ اور اس پر قلم سے لکھی ہوئی تحریر لافانی نہیں ہوتی۔ کاغذ کی ایک عمر ہوتی ہے مرثیوں کو دل و جان سے زیادہ عزیز رکھنے والوں نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ ان مراثی کو چھپوا دیا جائے تو ان کی عمر بڑھ جائے گی۔

اگر اس کی وجہ اقتصادیات ہے تو یہ کوئی ایسی وجہ نہیں جس کا سدِّباب نہ کیا جا سکے۔ غالباً یہ عادت بزرگوں کے احترام اور ان کے ورثے سے محبت کی وجہ سے ہوگی ـــ

فائزؔ کے مرثیوں میں کوئی بات نہ ہوتے ہوئے بھی کوئی نہ کوئی بات نظر آتی ہے۔ مثلاً ایک مرثیے کی ابتدا نعتِ رسول اکرم سے ہوتی ہے۔

مدحتِ سرورِ عالم سے سرافراز ہوں میں ہوں غلام آپ کا شاہوں سے بھی ممتاز ہوں میں
کس لئے چشم جہاں میں نظرانداز ہوں میں دل سے خاکِ قدمِ صاحبِ اعجاز ہوں میں

جُبّہ سائی نے میری اور بھی عزّت دی ہے
مجھ کو خود صاحبِ معراج نے رفعت دی ہے

اور فوراً ہی نعت سے علی اکبر کی طرف گریز کا انداز دیکھئے ۔

کس زباں سے ہوں بیاں وصف رسولِؐ دوسرا بس یہ تھا مختصراً تذکرۂ مہر و ثنا
اب سنیں مدحت ہمشکلِ نبیؐ، اہلِ ولا یعنی فرزندِ حسینؑ ابنِ علیؑ، شاہِ ولا
بخدا نورِ رسولِ دوسرا کو دیکھا
دیکھا کیا آپ کو محبوب خدا کو دیکھا

فائز کے مرثیوں میں منظر کشی دیکھئے ایسا لگتا ہے الفاظ تصویروں میں ڈھل رہے ہیں ۔

ہوئی صبح، مٹی رونقِ کاشانۂ شب شمع سے دور ہوئی صحبتِ پروانۂ شب
دھو گیا نور کے دریا سے یہ خانۂ شب بادۂ صبح نے چھلکا دیا پیمانۂ شب
تارے اُکتا گئے سب رات کے نظارے سے
بجھ گئی شمع قمر نور کے فوارے سے

اور ایک مرثیے میں طلوع آفتاب کا منظر قابل توجہ ہے ۔

جب طے کئے مراحل نور آفتاب نے روکی شعاعِ مہر زمیں کے حجاب نے
روئے فلک چھپا لیا شب کی نقاب نے پائی قمر ضیاء کی رُخِ لاجواب نے
روشن ستارہ ہائے شبِ تار ہو گئے
جتنے خدا پرست تھے ہشیار ہو گئے

صاحبو، کربلا میں امام حسینؑ کے رفقاء میں گنے چنے افراد تھے لیکن ان افراد کو فرداً فرداً دیکھئے تو یوں لگتا ہے کہ شرافت و نجابت و انسانیت کے سارے پیکر ایک جگہ جمع کر لئے گئے تھے۔ امام کے ساتھیوں میں جنگ کر کے جام شہادت نوش کرنے والوں کے علاوہ ایسے کردار بھی تھے جنہوں نے تلوار سونت کر جنگ نہیں لڑی لیکن اُن کی زبانوں سے نکلے ہوئے الفاظ آج بھی تاریخ کے صفحات پر مبارز طلبی کرتے سنائی دیتے ہیں۔ کچھ ایسے کردار تھے جو بولتے نہیں تھے، بلکہ خاموشی کے ساتھ مصائب کی منزلوں سے گذر رہے تھے۔ ان کرداروں میں ایک اہم شخصیت تھی جناب فضہ کی ۔ جی ہاں حبش کی بیٹی شہزادی فضہ جس نے ازخود اپنے وطن واپس جانے کی بجائے سیدہ

فاطمہ زہراؑ اور رسول اکرمؐ کی کنیزی کو ترجیح دی تھی — اور خاتون جنت، بنتِ رسول جناب سیدہ کا فضہ کے ساتھ یہ سلوک تھا کہ ایک دن جناب فضہ چکّی پیستی تھیں تو دوسرے دن خاتون جنت یہی کام کرتی تھیں اور فضہ کو حکم تھا کہ وہ کوئی کام نہیں کریں گی یہ وہی فضہ ہیں جنہوں نے امام حسنؑ، امام حسینؑ، اور زینبؑ و کلثومؑ کو پالا تھا۔ یہ وہی فضہ ہیں کہ دربار یزیدی میں سیدہ زینب کے خطبے سے گھبرا کر یزید نے حکم دیا تھا کہ اس خاتون کا سر قلم کر دو تو فضہ تڑپ کر سیدہ زینب کے سامنے آ گئی تھیں اور کہا تھا۔

"خبردار جو کسی نے میری زندگی میں میری آقازادی کی شان میں کوئی گستاخی کی"

فضہ کی اس بات پر برہم ہو کر یزید نے حکم دیا تھا کہ پہلے اس گستاخ کنیز کا سر قلم کر دو لیکن اس سے پہلے کہ جلّاد جناب فضہ یا سیدہ زینب کی طرف بڑھتے، اس دربار میں جہاں ڈیڑھ سو یا تین سو افریقی سفیر اور سرداران قوم کرسی نشیں تھے، فضہ کی آواز بلند ہوئی

"اے میری قوم کے غیور کرسی نشینوں تمہاری غیرت کو کیا ہو گیا ہے کہ تمہاری قوم کی ایک بیٹی کو قتل کیا جا رہا ہے اور تم خاموش بیٹھے ہو۔ تف ہے تمہاری غیرت پر"

اور جناب فضہ کی آواز پر کئی سو تلواریں نیام سے نکل آئی تھیں اور یزید کو احکامات واپس لینے پڑے تھے۔ اس صاحب فضیلت کنیزِ سیدہؑ، جس پر دنیا کی عظمتیں قربان، اس کنیز سیدہ، جناب فضہ کا مقام بتانے کے لئے لڈّن صاحب فائز نے کن الفاظ اور کس لہجے کا انتخاب کیا ہے — جی ہاں لہجے کا انتخاب کیا ہے یہ بات اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ الفاظ کے معنی بھی ہوتے ہیں اور الفاظ بولتے بھی ہیں اور اُن کا لہجہ بھی ہوتا ہے، دیکھئے لڈّن صاحب فائز کے مرثیے کے دو بند جن میں آپ کو لفظوں کی آواز بھی سنائی دے گی اور اُن کا لہجہ بھی ۔

پہنچے پردے کے قریں جبکہ شہ عرش مقام   دیکھا فضہ کو کھڑی روتی ہے وہ نیک انجام
آ کے نزدیک یہ فرمانے لگے شاہِ انام   تیرا شرمندۂ احساں ہے بہت تیرا امام
کیا کہیں تجھ سے کہ کیا دل میں تھا کیا دے نہ سکے
خدمتوں کا تیری ہم کچھ بھی صلہ دے نہ سکے

گر کے قدموں پہ یہ بولی وہ غریب وناچار اپنے شہزادے کے میں صدقے گئی سینہ فگار
ہو کے بیتاب یہ کہنے لگے شاہِ ابرار مجھ کولازم ہے ادب تیرابھی اے خوش کردار
کیا کوئی سمجھے کہ کیا مرتبہ ہاتھ آیا ہے
تو نے زہراؑ کی کنیزی کا شرف پایا ہے

کیاان اشعار سے یہ ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ لذن صاحب فائز کورشتوں کے مطابق الفاظ کے انتخاب اوراُن کے برتنے میں مہارت تھی۔

☆☆☆☆☆

حیات امروہوی :-

ولادت ۱۹۱۴ء وفات ۲۰؍اکتوبر ۱۹۴۶ء

نام سید محمد جعفر تخلص حیاتؔ ،وطن امروہہ ،نقوی سید ،بڑے بھائی یوسف امروہوی شاعر تھے جن کا پاکستان میں انتقال ہوا۔حیاتؔ نے معمولات حیات کا آغاز مدرس کی حیثیت سے کیا۔اس کے بعد صحافت میں چلے گئے ،ماہنامہ'' حیات'' جاری کیا۔بعدازاں دربار'' رامپور'' سے وابستہ ہو گئے۔بیقرار دل کو وہاں بھی قرار نہ ملا اور دربار رامپور میں حاصل عزت اور منصب کو چھوڑ کر بمبئی فلمی صنعت میں چلے گئے اور کئی فلموں کے گانے لکھے ،یہ وہ دور تھا جب بمبئی میں کمالؔ امروہوی اوراُن کی اہلیہ مینا کماری کا طوطی بول رہا تھا۔

حیاتؔ ،اُردوغزل کا بھی ایک معتبر نام ہے۔غزل کے علاوہ نظم ،قطعات ،سلام ،منقبت اورمرثیے بھی لکھے—مرثیے کے سارے لوازمات پیش نظر ہونے کے باوجود حیات نے بین میں بالغ نظری کا ثبوت دیا ہے۔مدح اور بین کے تیور روایتی مرثیے سے جداگانہ ہیں ۔

جو ولیٔ حق ،امام دوسرا ہے وہ علیؑ جو ہمیشہ ساتھ میں حق کے رہا ہے وہ علیؑ
جو حبیب خاصِ محبوب خدا ہے وہ علیؑ جس کی چوکھٹ کا حیاتؔ ادنیٰ گدا ہے وہ علیؑ
زندگی جس نے منادی ملّتِ اسلام پر
اے مسلمان جان دیدے اس علیؑ کے نام پر

کہا جاتا ہے کہ امروہہ کے ممتاز سوز خواں حضرات نے حیاتؔ امروہوی سے فرمائش کی کہ وہ مصائب کے کچھ بند کہدیں ،حیاتؔ نے اس فرمائش کو پورا کیا مگراُن کی بالغ نظری ان

مصائب میں باقی رہی ۔

یہ کہہ کے روئی اور سکینہ جگر فگار سمجھاتی تھی پھوپھی کہ نہ رو، میں تیرے نثار
ہوتا ہے تیرے رونے سے دل میرا بیقرار اللہ تجھ کو صبر دے اے شہ کی یادگار

صاحب پدر کے واسطے، خاموش ہو رہو
آؤ ہماری گود میں اے جان سو رہو

القصہ روز رات کو روتی تھی غم زدی ہر طرح دل کو تھام کے سمجھاتی تھی پھوپھی
اک روز روتے روتے پدر کو جو سوگئی رویا میں اس کو باپ کی صورت نظر پڑی

رو کر پچھاڑیں خاک پر نادان کھاتی تھی
نالوں سے آسمان و زمیں کو ہلاتی تھی

حیات امروہوی کی زندگی نے وفا نہ کی، اگر انہیں کچھ وقت مل جاتا تو غزل کی دنیا میں، فلم کی دنیا میں۔ اور رثائی ادب میں کچھ حیرت انگیز اضافے ہوتے۔

☆☆☆☆☆

قتیل لکھنوی :-

ولادت ۱۸۸۱ء ۔ وفات ۶ر جولائی ۱۹۴۶ء۔

نام سید شبیر حسن، تخلص قتیلؔ ۔ سادات رضوی ۔ وطن لکھنؤ، شاعر، ادیب، صحافی، چیف جسٹس سید وزیر حسن کے بھائی، ترقی پسند تحریک کے بانی سجاد ظہیر کے چچا، تعلیم یافتہ، مہذب گھرانے کے چشم و چراغ قتیلؔ لکھنوی کی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے ہوا اور بات رثائی ادب اور مسدس و مرثیے تک پہنچی۔ قتیلؔ لکھنوی گومتی میں دھلی ہوئی زبان میں کلاسیکی غزل کہتے تھے۔ برصغیر میں ۱۹۳۶ء تک جو غزل کہی جا رہی تھی وہ کلاسیکی غزل ہی تھی۔ حیات بشر میں ہونیوالی سماجی، اقتصادی اور سیاسی اُتھل پتھل کو غزل میں سمونے کی ترغیب تو قتیلؔ لکھنوی کے اپنے بھتیجے سجاد ظہیر نے دی تھی، ترقی پسند تحریک نے دی تھی۔ اس سے پہلے تو غزل واردات قلبی کے رومانی اظہار تک محدود تھی۔ اس کا مقصد یہ بھی نہیں ہے کہ ۱۹۳۶ء سے قبل اُردو شعراء معاشرے میں ہونے والے واقعات سے بے خبر تھے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ سیاسی اور سماجی تلخیوں کو اگر اشارتاً بیان بھی کیا جاتا تھا تو ایک اشاراتی زبان اور محدود ڈکشن کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ غزل میں آنچل سے

پرچم بنانے کا جذبہ نہیں تھا۔

قتیل لکھنوی کی صاحبزادی، ممتاز شاعرہ جمیلہ بانو آج ۱۳ر دسمبر ۲۰۰۲ء کی شام کو برطانیہ کے شہر برمنگھم میں ہمارے سامنے بیٹھی پلکوں پہ آنسوؤں کے موتی سجائے اپنے بابا کا ذکر کر رہی ہیں اور برطانیہ میں لکھنؤ کی یادوں کے چراغ جلا رہی ہیں۔

''میرے بابا بہت روشن خیال تھے۔ میں نے انہیں دوسروں کے دکھوں پر تڑپتے دیکھا ہے۔ میں نے انہیں ہندوستان کی آزادی کے لئے تڑپتے دیکھا ہے۔ وہ تحریک آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں جیل بھی گئے تھے، انہوں نے جیل میں جو شاعری کی اس میں آنچل سے پرچم تو نہیں بنایا لیکن اس شاعری میں آزادی کی تڑپ ہے۔ غلامی کی گھٹن کا استعارہ ہے۔

بیٹھا تو ہوں قفس میں اور فکر آشیاں ہے
میں غم زدہ کہاں ہو، کم بخت دل کہاں ہے

''بابا جیل میں تھے، شہر کی سڑکوں سے تحریک آزادی کا جلوس گذر رہا تھا حکومت کو خطرہ تھا کہ جلوس کے شرکا، جیل توڑ کر سیاسی قیدیوں کو آزاد نہ کرالیں اس لئے سیکورٹی کے خصوصی انتظامات کئے گئے تو قیدیوں کو جلوس کی خبر ہوئی۔ بابا نے ایک شعر کہا بعد میں غزل مکمل کی۔

آواز جرس سن سن کے یہی بیساختہ کہتا جاتا ہوں
اے قافلے والو تھم کے چلو، میں آتا ہوں میں آتا ہوں

جمیلہ کا بیان بھی جاری ہے اور آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہیں۔ وہ کہہ رہی ہیں۔

''ممتاز نغمہ نگار اور مشہور شاعر حضرت شکیل بدایونی بابا کے شاگرد تھے جناب فضل لکھنوی نے بھی اپنی صحافیانہ زندگی کا آغاز بابا کے ادبی مجلہ ''جدت'' سے کیا تھا''

حضرت قتیل لکھنوی نے غزل کے علاوہ سلام، منقبت، نوحے، مخمس و مسدس میں نظمیں بھی کہی ہیں اور مرثیے بھی— جمیلہ کو ان کے ایک مرثیے کے آٹھ بند یاد ہیں جو درج ذیل ہیں یہ مرثیہ اُن کے نوحوں اور مراثی کے مجموعے ''تصویر کربلا'' میں شامل ہے جو ۱۹۳۰ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔

جمیلہ نے وعدہ کیا کہ وہ دہلی جا کر اپنے بابا کا یہ مرثیہ ارسال کریں گی لیکن دہلی پہنچتے ہی وہ ایک پیچیدہ عمل جراحی (Operation) سے دوچار ہوئیں اور ایک سال بعد تک اُن کی قوت گویائی اور سوچنے کی صلاحیتیں بحال نہیں ہوئیں — اللہ جمیلہ کو کربلا والوں کے صدقے میں صحت کاملہ عطا کرے۔

یہ کون ہے کہ جس کے غم میں خلق میں پکار ہے — جسے شہید کر دیا یہ کون بے دیار ہے
یہ کس کی لاش بے کفن پہ دشت کا غبار ہے — یہ بیکسی کی موت کس کے غم میں سوگوار ہے
بتا زمین نینوا یہ کون ذی وقار ہے

یہ عزّت وجود ہے جہاں کی زیب وزین ہے — یہ نورِ چشمِ مرتضیٰ، یہ شاہ مشرقین ہے
یہ غم نصیب بنتِ مصطفیٰ کے دل کا چین ہے — ارے یہ کشتۂ جفا، حسینؑ ہے حسینؑ ہے
یہ سرفروشِ کربلا نبی کی یادگار

وہی حسینؑ جس نے دوپہر میں گھر لٹا دیا — وہی حسینؑ جس نے راہ حق میں سر کٹا دیا
وہی حسینؑ جس نے زندگی کو راستہ دیا — وہی حسینؑ جس نے خود سری کا سر جھکا دیا
وہ جس کے نفسِ مطمئن پہ دیں کو اعتبار ہے

وہ اجنبی دیار اور وہ عرصہ گاہِ امتحاں — نئی جگہ، نئی فضا، نئے زمین و آسماں
وہ تاب و تب کہ الحذر، وہ تشنگی کہ الاماں
مگر حسینؑ طالبِ رضائے کردگار ہے

وہ صبرِ شاہ، اہل کیں کی وہ ستم شعاریاں — وہ قحطِ آب اور وہ بیبیوں کی بیقراریاں
وہ شب کا ہول اور صبحِ جنگ کی وہ زاریاں — وہ ناصرانِ سرورِ زمن کی جانثاریاں
وفا پہ جن کی آج تک وفا کو افتخار ہے

حسنؑ کا پارۂ جگر، ہوا شہید اُف نہ کی — لبِ فرات شیر نر ہوا شہید اُف نہ کی
نظر کے سامنے پسر ہوا شہید اُف نہ کی — صغیر لعل ہاتھ پر ہوا شہید اُف نہ کی
حسینؑ ہی کا دل ہے یہ حسینؑ کا وقار ہے

پسر وہ زینبِ حزیں کے ذی شعور منچلے — جو اک شجاع ماں کے پاک دودھ پر پلے بڑھے
وہ اُن کے چھوٹے چھوٹے سن مگر وہ دل کے حوصلے — کہ نصرتِ امام میں گلے پہ تیغ کیں چلے
یہ جوشِ حرب وضرب ہے کہ روح بیقرار ہے

حدیث غم، قتیلؔ دلفگار کیا بیاں کرے　　　کسی پہ بھی جہاں میں یہ ستم نہ آسماں کرے
گلے پہ تیغ ظلم بھائی کے لعیں رواں کرے　　　بہن غریب کچھ نہ کر سکے فقط فغاں کرے

وفورِ غم سے اک سناں دلِ حزیں کے پار ہے
زمینِ کربلا بتا یہ کون ذی وقار ہے

اس مخمس کے پہلے ہی بند کے بعد دو نظموں کی طرف ذہن جاتا ہے جو اسی آہنگ میں ہیں مگر قتیلؔ لکھنوی کے مرثیے کے بعد کہی گئی ہیں۔ ایک حفیظؔ جالندھری کی نظم ''شہسوار کربلا'' ہے

لباس ہے پھٹا ہوا　　　غبار میں اٹا ہوا
تمام جسم نازنیں　　　چھدا ہوا کٹا ہوا

یہ کون ذی وقار ہے، بلا کا شہ سوار ہے
کہ ہے ہزاروں قاتلوں کے سامنے ڈٹا ہوا
یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبی کا نورِعین ہے

یہ جس کی ایک ضرب سے　　　کمالِ فن حرب سے
کئی شقی گرے ہوئے　　　تڑپ رہے ہیں کرب سے

غضب ہے تیغ دوسر کہ ایک ایک وار سے
اٹھی صدائے الاماں زبانِ شرق و غرب سے
یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِعین ہے

حفیظؔ جالندھری کی یہ نظم پانچ بند پر مشتمل ہے، دوسری نظم سردارؔ جعفری کی ہے جس کا عنوان ''اے کربلا۔ اے کربلا'' ہے۔ یہ نظم اسی کتاب میں سردار جعفری کے باب میں درج ہے۔ یہ نظم بھی قتیلؔ لکھنوی کے مرثیے کے بعد کہی گئی ہے۔ اسی آہنگ میں ایک اور نظم بھی ملتی ہے یہ نظم علامہ کیفی چریاکوٹی کی ہے جو مسدس میں ہے۔ نظم کا عنوان شانِ حسینؑ ہے اور سید العلما سید علی نقی (نقن صاحب) کی کتاب ''شہیدِ انسانیت'' مطبوعہ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی ہے۔

نبی کا نور عین ہے، علیؑ کے دل کا چین ہے نگاہِ قبلہ تینؑ ہے کہ ان کے بین بین ہے
امام مشرقین ہے، سلامِ مشرقین ہے اِدھر اُدھر کوئی نہیں، حسینؑ ہی حسینؑ ہے
سمجھ سکے جو زندگی بھی اس سے کچھ مزید ہے
شہید اس کا ہے خدا، خدا کا وہ شہید ہے

زمین کربلا نہ تھی، مقام ضبط و ہوش تھا جہاں میں خروش تھا، حسینؑ ہی خموش تھا
کہ داغ کھا رہا تھا اور دستِ گل فروش تھا جھکا سجود کے لئے کہ بارِ سر بدوش تھا
اُٹھا سناں کی نوک پر کہ اس کا یہ سلام تھا
سجود ختم ہو چکے تو لازمی قیام تھا

حسینؑ کربلا وہی امین و بیقرار تھا امانت ازل کا وہ حیات زندہ دار تھا
جہاں کے اعتبار سے خود اپنا اعتبار تھا کہ دشت اختیار تھا کہ چشم انتظار تھا
طلب ہوئے تو اپنے سر کو پیش یار رکھ دیا
اُٹھا کے یعنی دوش پر وہ اپنا بار رکھ دیا

قتیلؔ کی نظم بہرحال بھاری ہے

☆☆☆☆☆

مرزا محمد طاہر رفیعؔ:- (لکھنؤ)

ولادت ۱۸۷۰ء وفات ۱۹۴۷ء

مرزا اوجؔ کے فرزند، میرزا دبیرؔ کے پوتے۔ مرزا طاہر رفیعؔ کے سامنے مرثیہ کی ایک شان شکوہ لفظی اور بلاغت تھی جسے ان کے دادا مرزا دبیرؔ نے نہ صرف قائم بلکہ مستحکم کیا تھا— اُن کے بعد مرزا رفیعؔ کے والد گرامی مرزا اوجؔ کی ساری کاوشیں تھیں جو اُنہوں نے مرثیے کو آگے بڑھانے کے سلسلے میں کیں اور جدید مرثیے کے بانی کہلائے۔ مرزا رفیعؔ کے سامنے خانوادۂ میر انیسؔ کے شعراء بھی تھے جو مرثیہ گوئی میں بہت چاق و چوبند اور ماہر تھے۔ ان حالات میں مرثیہ گوئی کے معیار کو قائم رکھنا آسان نہ تھا—

لکھنؤ مرثیے کا مرکز بن چکا تھا اور اہل لکھنؤ میر انیسؔ اور خاندان انیسؔ کے علاوہ مرثیہ میں کسی کی برتری تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے، اور سچ پوچھئے تو اہل لکھنؤ کا یہ رویہ کچھ ایسا غلط بھی نہ

تھا، اس لئے کہ انیسؔ کے بعد خاندان انیسؔ کے شعراء مرثیہ گوئی کا حق ادا کر رہے تھے۔ ادھر مرزا اوجؔ نے جو اصلاحات چاہیں اُنہیں مقبول کرنے کے لئے ہم عصر شعراء سے جو محبت اور تعاون کا جذبہ اور رویہ ضروری تھا وہ نہیں اپنایا اور تنقید و تنقیص میں سخت گیر لہجہ اختیار کیا جس سے کسی نے اُن کی بات نہیں سنی۔

مرزا رفیعؔ کٹھن دور میں سامنے آئے۔ اہل لکھنؤ آج بھی اس خیال کے حامی ہیں کہ مرزا دبیرؔ کے بعد مرزا اوجؔ نے بہر حال مرثیے کے میدان میں قدم آگے بڑھایا اور نئی راہیں تلاش کرنے میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے مگر مرزا رفیعؔ اپنے والد گرامی مرزا اوجؔ سے پیچھے چلے گئے۔ ایک طرف نئے عہد کے نئے تقاضوں کا احساس اور دوسری طرف منفی رویوں کے گرجتے برستے بادل، لہٰذا مرزا رفیعؔ آگے نہ بڑھ سکے۔ اُنہیں ناکامی کی سند دینے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ اُنہوں نے مرثیہ کی دنیا میں کافی شہرت پائی جو ایک صداقت ہے۔ ان کا معراج کے حال کا مرثیہ آج بھی ان راہوں میں ایک سنگ میل ہے۔ یہ بات بھی غلط ہے کہ ان کے مرثیوں میں کہیں کہیں ان کی ذہنی کشمکش جھلکتی نظر آتی ہے لیکن ذرا غور کیجئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ذہنی کشمکش سے زیادہ نمایاں وہ لہجہ ہے جو مرزا اوجؔ نے بھی اکثر و بیشتر اپنایا ہے۔ مرزا رفیعؔ کو یہ تلخی وراثت میں ملی تھی۔ مرزا اوجؔ کے ان رویوں کے بارے میں "مرثیہ نظم کی اصناف میں" میں بحث کر چکا ہوں۔ ہر چند کہ مرزا اوجؔ نے مرثیہ کا رخ موڑنے کے لئے بہت اہم اقدامات لئے مثلاً ضعیف روایتیں نظم کرنے پر اعتراض، مرثیے میں فکری مضامین داخل کرنے کی جدت وغیرہم لیکن بدقسمتی سے اُن کے مزاج کی تلخی اور جارحانہ اسلوب کی وجہ سے اُن کی علمیت اور فلسفہ طرازی اذہان تک تو پہنچی مگر دلوں کو نہ چھو سکی، کہنے والے بھی کہتے ہیں کہ شادؔ عظیم آبادی نے مرزا اوجؔ کی سوچ اور مرثیہ کا رخ موڑنے میں مرزا اوجؔ کے اقدامات کو سہارا نہ دیا ہوتا تو جدید مرثیے کے ضمن میں یہ بھی ممکن تھا کہ مرزا اوجؔ کا نام نہ آتا۔ مرزا اوجؔ اور مرزا رفیعؔ کی مماثلت کے نمونے کے طور پر دونوں کا لہجہ یکساں نظر آتا ہے: مرزا اوجؔ کے درج ذیل دو بند ملاحظہ ہوں۔

جو آجکل شعراء ہیں سرآمدِ آفاق — وہ کون مرثیہ گو، بذلہ سنجیوں میں ہیں طاق
ہے فرض منصبی ان کا درستیٔ اخلاق — نہ یہ کہ ہوویں مضامیں اُلٹنے میں مشاق

ہر ایک مرثیہ اپنا کلام اپنا ہے
قلم سے جب لکھا اپنے، کلام اپنا ہے
یقیں نہ آئے تو معنیٔ شعر فرما دیں ہے بحر کونسی تقطیع کر کے بتلا دیں
اب اور پوچھئے کیا وہ جواب اس کا دیں مہذبین سے تعریف اپنی سنوا دیں
غنی میں دل نہیں کچھ پیش و پس توارد کا
کہ منہ چھپانے کو پردہ ہے بس توارد کا

اوراب ملاحظہ فرمائیے حضرت مرزا محمد طاہر رفیع صاحب کے دو بند۔ یہ مرثیہ احوال عون ومحمد پر ہے اور جناب مرزا محمد صادق آلِ دبیر کا عطیہ جناب کاظم علی خان صاحب کے عنایت سے دست بدست ہم تک پہنچا ہے۔

قول اکثر کا یہ ہے، خوب کہا، خوب کہا خوب کہا بعض ارشاد یہ کرتے ہیں کہ معیوب کہا
کوئی کہتا ہے کہ مضمون تو مرغوب کہا حسنِ بندش جو نہیں ہے تو بداسلوب کہا
رنگ اچھا ہے مگر اگلے چمن سے کاٹا
جو کہا ہے وہ بزرگوں کے سخن سے کاٹا
اک نے فرمایا توارُد سے سبھی ہیں مجبور ایک بولا کہ توارُد نہیں سرقہ ہے ضرور
سب کے سب ہیں یہ بزرگوں کے مضامین مشہور اُنہیں تصویروں کے چربے یہ اُتارے ہیں حضور
سر بہ سر مرثیہ اُلٹا ہے سلام اُلٹا ہے
اپنا کچھ بھی نہیں غیروں کا کلام اُلٹا ہے
نکتہ چیں اس کو نہ سمجھیں تو ہے کیا اس کا علاج اُن کو معلوم نہیں شاہدِ مضمون کا مزاج
دائرہ بھی وہ بہت سخت ہے جس کا تھا رواج کل جو کچھ ہوگیا ایسا تھا کہ ممکن نہیں آج
حدِ ایجاد پہ مشکل ہے رسائی بیشک
انہیں تیغوں کی ہے صیقل پہ صفائی بیشک

مرزا محمد طاہر رفیع کے مرثیوں کی ایک جلد "مراثی رفیع" کے نام سے شائع ہوئی ہے لیکن زیادہ تر مرثیے غیر مطبوعہ ہیں۔

☆☆☆☆☆

ممتاز حسن کمالؔ:-

ولادت ۹ ستمبر ۱۸۷۰ء۔ وفات ۲۴ اگست ۱۹۴۷ء

نام سید ممتاز حسن۔ تخلص، کمالؔ۔ وطن امروہہ۔ ممتاز حسن کمالؔ نے ۱۸۹۶ء میں بی۔ اے کیا اور آگرہ میں تحصیلدار ہو گئے۔ اس کے بعد ملازمت کے سلسلے میں باندہ، فتح پور، الہ آباد، لکھیم پور کھیری، بدایوں اور بریلی میں رہے اور ضلع بریلی میں ہی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

کمالؔ اُن خوش قسمت شعراء میں ہیں جن کی اولاد نے میراثِ پدر کی حفاظت کی ہے۔ اُن کے قصائد، سلام، قصیدے اور مرثیوں کا کافی ذخیرہ اُن کے فرزند حاجی محمد رضا سابق آنریری مجسٹریٹ کے پاس محفوظ ہے۔ کاش حاجی محمد رضا یا اُن کی اولاد اس سرمایئے کو شائع کرا کے آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر دے۔

کمال ایک پختہ گو شاعر تھے، اُنہوں نے بعض ایسے موضوعات پر مرثیے کہے ہیں جو موضوعات عام طور پر مرثیوں کا عنوان یا مرکزی خیال نہیں بنائے گئے۔ مثلاً ان کا ایک مرثیہ سیدہ فاطمہ زہراؑ کے احوال پر ہے جس کی ابتدا سیدہ کے فضائل سے ہوتی ہے لیکن اس کے بعد اُن حالات کا ذکر ہے جو بعد وفات رسولؐ جناب سیدہ کو پیش آئے ان میں وہ ذکر بھی ہے جب رسول اکرمؐ کی یاد میں سیدہ فاطمہ زہراؑ کے رونے پر اعتراضات ہوئے تھے اور حضرت علی سے کہا گیا تھا کہ۔

فرمایئے زہراؑ سے نہ منہ اشکوں سے دھوئیں ایسا نہ ہو رو رو کے کہیں جان کو کھوئیں
آرام کریں رات کو گر، دِن کو وہ روئیں تا آپ کے ہمسائے ذرا چین سے سوئیں
فرصت اُنہیں رونے سے شب و روز نہیں ہے
وہ کونسا نوحہ ہے جو دلسوز نہیں ہے

حیدرؑ نے کیا فاطمہؑ سے ذکر جو اس کا فرمایا کہ اب رہنے کے قابل نہیں دنیا
کہہ دیجئے اُن سے نہ کریں فکر وہ اصلا کچھ روز میں سننے کے نہیں وہ میرا رونا
بے باپ کے جینا مجھے منظور نہیں ہے
پاس اُن کے پہنچ جانا کچھ اب دُور نہیں ہے

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کمالؔ قصیدہ گوئی میں باکمال تھے۔ اُنہوں نے قصیدہ گوئی میں تجربات کئے ہیں۔ اُن کا ایک قصیدہ بہت مشہور ہوا جو اُنہوں نے چار زبانوں میں کہا تھا اور وہ بھی

اس التزام کے ساتھ کے پہلا مصرع اُردو میں دوسرا فارسی میں تیسرا عربی میں اور چوتھا انگریزی میں تھا۔ اُن کے مراثی اور قصائد کو جو مقبولیت ہوئی اس کی روشنی میں یہ کہنا دشوار ہے کہ قصیدہ کے میدان میں وہ مرثیہ سے آگے تھے یا مرثیہ گوئی میں قصیدے سے بہتر تھے۔ البتہ یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ کمال رثائی ادب کے ایک باکمال مرثیہ نگار شاعر تھے۔

☆☆☆☆☆

ناظم شکارپوری:-

ولادت ۱۸۵۱ء۔ وفات ۱۹۴۸ء

نام سیّد حیدر حسن، تخلص ناظم، شکار پور ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ ۲۲ سال کی عمر میں یعنی ۱۸۷۳ء میں میر نفیسؔ کی شاگردی میں آنے کا شرف ملا۔ میر نفیسؔ کے قلم سے ناظمؔ شکارپوری کے جن مراثی پر اصلاح تھی وہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے پاکستان منتقل ہونے میں ضائع ہو گئے۔ اس حادثے کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو دہلی سے لاہور تک ۱۹۴۷ء کی قتل وغارت گری کے دوران یا اس کے تھوڑا عرصہ بعد خون کا دریا پار کر کے آئے تھے۔ انسانی درندگی کا وہ دور جب تن کا لباس لے کر آنا بھی مشکل تھا۔ اس دور میں ناظمؔ شکارپوری کے ۱۴ جلدوں پر مشتمل مسودے کی کس کو پڑی ہوگی۔ ناظم صاحب نے ۲۰۰ سے زیادہ مرثیے کہے تھے مگر مسودے (ان کی زندگی بھر کی محنت) تلف ہونے کا صدمہ اتنا گہرا تھا کہ وہ اس سے جانبر نہ ہوسکے۔

> "ناظمؔ صاحب نے ہر شہید کے احوال کا مرثیہ کہا تھا، حضرت حُر کے بارے میں ۶۰ بند کا مرثیہ صنعت غیر منقوط میں کہا تھا۔ مختار نامہ نظم کیا تھا۔ دیگر تخلیقات میں تین سو قصیدے، چھ سو سلام، دو ہزار رباعیاں دو سو نظمیں، ایک سو نوحے۔ سارا کلام قلمی نسخوں کی صورت میں ۲۴ جلدوں میں تھا۔ ہر جلد کی کم از کم ضخامت ۳۰۰ صفحات تھی۔"
>
> (بیسویں صدی اور جدید مرثیہ۔ ص ۲۷/۳۲۶)

بادی النظر میں کسی ایک شاعر کا اتنا غیر مطبوعہ کلام ہو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر ناظمؔ شکارپوری کے معاملے میں راوی ضعیف نہیں بلکہ اُن کے فرزند ارجمند تسلیم حیدر نقوی ہیں جو P.I.A (پاکستان انٹرنیشنل ایرلائن) میں اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ تسلیم حیدر صاحب نے اپنے

والدِ گرامی سید حیدر حسن ناظمؔ شکارپوری کے کلام کی درج بالا تفصیلات ڈاکٹر ہلال نقوی کو تحریری طور پر دی ہیں۔

حضرت ناظمؔ شکارپوری کی نسل سے ایک اور ممتاز شاعر حضرت سالکؔ نقوی اپنے مجموعہ کلام ''صحیفۂ سالک'' کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں۔

> ''اس صدی کے میرے ایک بزرگ سید حیدر حسن ناظمؔ (شکارپوری) مشہور مرثیہ گو گذرے ہیں۔ موصوف نے بیس جلدیں مراثی کی خوشخط لکھ کر چھوڑی ہیں جو طباعت کی سہولتیں میسّر نہ ہونے کی وجہ سے شائع نہ ہو سکیں۔ ... لیکن اب مرحوم کا کلام بحمد اللہ زیرِ طباعت ہے''
>
> (صحیفۂ سالک ص ۷)

حضرت ناظمؔ شکارپوری ۱۹۴۷ء میں پاکستان آئے، سالکؔ نقوی ۱۹۴۹ء میں کراچی پہنچے، حیرت کی بات ہے کہ اُنھیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ''اُن کے بزرگ سید حیدر حسن ناظمؔ شکارپوری'' کے مراثی کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے۔ ایسا حادثہ جس کے غم میں ناظمؔ شکارپوری انتقال فرما گئے۔

☆☆☆☆☆

حیدر بخش حیدرؔ:-

ولادت ۱۸۷۳ء۔ وفات ۱۹۴۸ء

حضرت شمیمؔ امروہوی کے شاگرد تھے۔ غزل، قصیدہ، سلام، قطعہ، رباعی اور مرثیے کہے، مگر اولادِ نرینہ سے محروم تھے شاید اس لئے اُن کا کلام ضائع ہو گیا، دبستانِ امروہہ کے مرثیہ گو شعراء پر حضرت نسیمؔ امروہوی تک مرثیے کے لوازمات میں لکھنوی مرثیے کی چھاپ رہی، نسیمؔ امروہوی نے مرثیے کا لہجہ بدلا۔ چنانچہ حیدر بخش حیدر کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ اُن کا مرثیہ گوئی کا انداز کلاسیکی تھا۔ جسے بین کے حوالے سے لکھنوی بھی کہا جا سکتا ہے۔

جب داخلِ وطن، حرمِ مصطفیٰ ہوئے زینب سے پوچھا سب نے کہ شبیر کیا ہوئے
وہ بولی کربلا میں بہن سے جدا ہوئے اُمت پہ تین روز کے پیاسے فدا ہوئے
صغرا سے شرمسار میں ہونے کو آئی ہوں
بھائی کو ماں کی قبر پہ رونے کو آئی ہوں

حیدر بخش حیدر کا کوئی مرثیہ میسر نہیں، یہ معلوم نہیں کہ انہوں نے کتنے مرثیے کہے۔ بظاہر کوئی جواز نہیں کہ اُن کا تذکرہ اس کتاب میں شامل ہو لیکن میرے دل کا وہی خوف کی اگر وہ عصمت کل شہزادی جس نے کہا کہ وہ روز محشر عباسؑ کے دست ہائے بریدہ لے کر آئیں گی اور اللہ سے فریاد کریں گی تو اگر اُسی شہزادی کی بارگاہ میں بی بی کے فرزند حسینؑ کے مرثیے لکھنے والوں کی فہرست مرتب ہو رہی ہو تو میں کون کہ میرے سامنے مرثیہ نگاری کے حوالے سے کوئی نام آئے اور میں اسے اس کتاب میں شامل نہ کروں۔ اچھے بُرے کہنے کا حق قارئین کو ہے، قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار حسینؑ کی مادر گرامی اور حسینؑ کے نانا کو ہے میں تو ایک رپورٹر ہوں جو مل رہا ہے اس کا اندراج کر رہا ہوں۔

☆☆☆☆☆

میر غیورؔ لکھنوی:-

ولادت ۱۸۷۸ء۔وفات ۱۹۵۰ء

نام سیّد محمد نواب عرف ببّن صاحب، غیورؔ تخلص، میر سلیسؔ کے منجھلے بیٹے، میر جلیسؔ کے چھوٹے بھائی۔ میر انیسؔ کی وفات کے بعد پیدا ہوئے— اُردو فارسی کی تعلیم میر نفیسؔ کے مدرسے میں حاصل کی۔ علم عروض اپنے چچا میر نفیسؔ سے حاصل کیا۔ ابتدا میں اپنے بزرگوں کے مرثیے پڑھتے تھے پھر خود بھی مشق سخن شروع کی— بڑے گھر کی اولاد تھے لیکن وقت بدل چکا تھا۔ حالات بگڑتے گئے اُسی رفتار سے صحت خراب ہوتی چلی گئی۔ حتّٰی کہ علاج معالجے کے لئے مکان فروخت کرنا پڑا— کرائے کے مکان میں آ گئے— حسّاس طبیعت یہ مشکلات نہ جھیل سکی اور ۱۹۵۰ء میں راہی ملک عدم ہوئے۔ مقبرۂ میر انیسؔ میں دفن ہوئے۔

میر غیورؔ، میر نفیسؔ کو اپنا کلام دِکھایا کرتے تھے۔ ابھی غیور کی عمر ۲۳ / ۲۲ سال کی ہوئی تھی کہ میر نفیسؔ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ غیور نے میر عارفؔ سے اصلاح لینی شروع کی۔ دس پندرہ سال بعد میر عارفؔ کا انتقال ہو گیا۔ اور غیورؔ خود کو بہت تنہا محسوس کرنے لگے۔ ان کے پہلے مرثیہ کا چہرہ اگرچہ شاعرانہ تعلّی یا رجز کا انداز ہے مگر ہر لفظ کہہ رہا ہے کہ تنہائی ہرے بھرے خاندان کو پکار رہی ہے— میر غیور کا پہلا مرثیہ یہ تھا جس کے بند درج ذیل ہیں ؎

اے طبع رسا ذہن کی جوّدت کا بیاں کر

آگاہ ہوں سب یہ وہ زباں ہے کہ نہیں ہے تقریر میں کچھ لطفِ بیاں ہے کہ نہیں ہے
اس بیت میں تسخیرِ جہاں ہے کہ نہیں ہے چہرے سے وہی شان عیاں ہے کہ نہیں ہے
تائید ہوئی جب کہ کسی بات میں کد کی
تصویرِ سراپا ہوں میں اپنے اب و جد کی

میر غیور کے مرثیوں میں خاندان انیس کی سلاست وفصاحت ہونا تعجب خیز نہیں ہے۔ رگوں میں خدائے سخن کا لہو، تربیت اور اصلاحِ سخن میر نفیس اور میر عارف کی، پھر کلام میں رنگ انیس اور سطوت خاندان انیس کیوں نہ ہوتی۔

ہر گل کی جبیں سے جو ٹپکتا ہے پسینہ ذروں میں نظر آتا ہے ہیرے کا نگینہ
آمد کا سحر کی نظر آیا ہے قرینہ سبزہ بھی اُبھرنے لگا تانے ہوئے سینہ
شبنم کے گہر خاک پہ بکھرے جو پڑے ہیں
پہرے پہ الگ خارِ مغیلاں بھی کھڑے ہیں

☆☆☆☆☆

میر محمد علی مسرورؔ:-

ولادت ۱۸۷۸ء، وفات ۱۹۵۰ء،

نام میر محمد علی، تخلص مسرور، وطن حیدرآباد دکن۔ میر مسرور نے اُردو فارسی کی تعلیم گھر پر اپنے والد گرامی سے حاصل کی۔ ادبیات، عربی، منطق اور علم حدیث، آقائے سیّد علی شوستری اور مولانا علی نقی صاحب کی شاگردی میں حاصل کیا۔ فقہ اور شرح کبیر کے درس مرزا حبیب اللہ اور سید کاظم طباطبائی سے لئے۔ پھر وکالت کی سند لی اور اس پیشے کو اختیار کیا۔ کچھ ہی دنوں میں وکالت سے اُکتا گئے اور ایک جاگیر میں منصفی کا عہدہ قبول کر لیا۔ چند ہی برسوں میں اندازہ ہو گیا کہ یہ عہدہ بھی اُن کی اصول پرست اور خود دار طبیعت کے مطابق نہیں لہٰذا ملازمت ترک کر دی اور افلاس و تنگ دستی کو ترجیح دی۔

جس دور میں اودھ میں مرثیہ نگاری اور مرثیہ خوانی انتہائی عروج پر تھی (یعنی انیس و دبیر کے عہد میں) اس دور میں بھی دکن میں مرثیہ گوئی ترک نہیں کی گئی تھی بلکہ اصغر حسین ناجی دکن میں مرثیے کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ ناجی کے شاگردوں میں ایسے ایسے روشن ستارے تھے جو مطلع

اودھ کے شمس و قمر کے اُجالے میں بھی ماند نہیں پڑتے تھے۔ ان ستاروں میں میر عابد علی غیور، میر علی جعفر، میر مہدی علی خان، مہاراجہ کرشن پرشاد شاؔد اور میر محمد علی مسرؔور جیسے نام تھے۔

میر مسرؔور نے چودہ برس کی عمر میں شاعری شروع کردی تھی۔ حصولِ تعلیم کے دوران اور بدلتے ہوئے ذرائع معاش کے نشیب و فراز کے باوجود مشقِ سخن جاری رہی۔ ڈاکٹر ہلال نقوی نے دکن کے مرثیہ نگار شاعر باؔقر امانت خوانی کے حوالے سے لکھا ہے کہ میر مسرؔور نے بیس مرثیے تصنیف کئے جواُن کے شاگرد میر سعادت علی خان سرتاؔج کے پاس محفوظ رہے، اُن کے انتقال کے بعد اب اُن کے فرزند کے پاس ہیں باؔقر امانت خوانی نے خود کو میر مسرور کا شاگرد تسلیم کیا ہے۔

میر مسرؔور کے مرثیوں میں ڈکشن قدرے جداگانہ، اور بیانیہ (narration) فنکارانہ ندرت کا حامل ہے۔ یہی انداز مصائب میں بھی ہے ۔

سینے میں دل کو چومنے خنجر پھسل گئے قلبی لدیک منہ سے کہا رنج ٹل گئے
گرزِ گراں جو فرقِ مبارک پہ چل گئے انتَ قوی زباں سے کہا اور سنبھل گئے
تیغوں کا ظلم و جور تنِ نیم جاں پہ ہے
یاارجعی الصبور کا جملہ زباں پہ ہے

وہ سر جھکائے سامنے ارواحِ انبیاء گھیرے ہوئے حسینؑ کو وہ روحِ اقربا
وہ نیم جاں وہ منتظرِ حکمِ کبریا وہ لطف بے نیاز وہ ناز آخریں صدا
میرے حبیب قصدِ خشوع و خضوع کر
اے نفسِ مطمئن میری جانب رجوع کر

میر مسرؔور کے کل مراثی تو میر سعادت علی سرتاؔج اور اُن کے فرزند علاوہ شاید ہی کسی نے دیکھے ہوں، البتہ ''حیدرآباد کے شاعر'' کے توسل سے اُن کے دو مرثیہ ہمارے سامنے ہیں— نورِ خدا تجلّی عرفاں حسینؑ ہے اور ـ ''رایتِ لشکرِ توصیف ہے خامہ میرا'' ان دونوں مرثیوں کے چار چار بند نقل کئے جارہے ہیں:۔

نورِ خدا تجلّی عرفاں حسینؑ ہے قرآں گواہ معنئ قرآں حسینؑ ہے
شاہِ اُمم خلیفۂ رحمان حسینؑ ہے ایمان ہے حسینؑ مری جاں حسینؑ ہے

اس کے قدم سے دورِ جہاں کا ثبات ہے
رُوحِ امام مرکزِ رُوحِ حیات ہے

مہر وقارِ علم رسالت حسینؑ ہے آئینہ دارِ نورِ مشیت حسینؑ ہے
خطِ سفید مطلعِ وحدت حسینؑ ہے صبحِ سعید عالمِ قدرت حسینؑ ہے
اِک جوہرِ لطیف ہے طینت حسینؑ کی
مجموعہ رموز ہے خلقت حسینؑ کی

شبیر کی ہے رُوح یہ ہے فاطمہؑ کی رُوح جو اس کی رُوحِ پاک وہی مرتضٰی کی رُوح
رُوحِ حسینؑ اصل میں ہے مصطفٰیؐ کی رُوح کلمہ ہے یہ خدا کا ہے اس میں خدا کی رُوح
انساں کی رُوح میں یہ کہاں اختصاص ہے
نسبت جو خاص مل گئی جوہر بھی خاص ہے

ہے تیری ابتدا خبرِ قدرتِ مبیں خصلت ہے تیری سیرتِ اُولیٰ کے ہم قریں
ہر فعل تیرا فعلِ الٰہی ہے بالیقیں فطرت کو تیری حاجتِ تبدیل ہی نہیں
مفروضِ جنسیات کا دخل اِک خیال ہے
ادراکِ عقل دنگ وہ تیرا کمال ہے

اور اب دوسرے مرثیے (احوالِ حضرت عباسؑ) کا چہرہ:

رایتِ لشکرِ توصیف ہے خامہ میرا روکشِ مہر ہے قرطاس مصفاّ میرا
رزم کی صف ہے ہر ایک مصرعِ زیبا میرا فیضِ مدحت سے ہوا اوج دوبالا میرا
نہیں سرور جو اس رہ میں قدم رُک جائے
ہاتھ کٹواؤں جو چلنے میں قلم رُک جائے

مستقل رہتا ہے ہر وقت ارادہ میرا ہوگا انبوہ سے نقصان بھلا کیا میرا
لشکرِ حشو سے رُکتا نہیں رستا میرا گھاٹ پر بحرِ فصاحت کے ہے قبضا میرا
توسنِ طبعِ رسا تیزیوں میں آندھی ہے
فتح ہاتھ آئی ہے جس وقت کمر باندھی ہے

دل کو مرغوب ہے دریائے ثنا کا دامن لطف ملتا ہے زبس دیکھ کے لہروں کی پھبن

میں ہوں اس کے لئے میرے لئے دریائے سخن اسی دریا کی ترائی میں بنے گا مدفن
رُوح پائے گی مزہ آبِ رواں بہنے کا
عمرِ جاوید ہے نام اس میں سدا رہنے کا
میرے قبضہ میں رہا قلزمِ مواجِ سخن میں نے حاصل کیا لڑ بھڑ کے سدا باجِ سخن
جان دیتا ہوں پئے آبروئے تاجِ سخن میرا عہدہ ہے علمدارئ افواجِ سخن
راہِ پُرخوف یمِ مدح کا فتّاح ہوں میں
کیوں نہ ہو حضرتِ عباسؑ کا مدّاح ہوں میں

اور پھر ایک باکمال شاعر "بین" کی منزل پر آتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ ۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز

میر مسرؔور کے الفاظ میں ثانئ زہراؑ سیدہ زینبؑ کے "بین" ملاحظہ کیجئے اور مظلومہ کی مظلومیت کا ماتم کیجئے۔ یہ ہیں کلاسیکی مرثیے کے بین ۔

تم پہ اماں ہوں فدا، پھر تو پکارو اماں بچو برباد ہوئے سب میرے دل کے ارماں
میرے دلدارو تمہیں پائے یہ دلگیر کہاں ہائے آخر نہ ملی موت کے پنجے سے اماں
چل بسے گلشنِ فردوس کو پیارے دونوں
مجھ کو بے آس کیا اور سدھارے دونوں
چرخ نے کوہِ الم مجھ پہ یہ کیسا ڈھایا ہائے باقی نہ رہا ایک بھی میرا جایا
گود خالی ہوئی قسمت نے یہ دن دکھلایا میں نے کوسا تھا کسے جو میرے آگے آیا
گود پھیلا کے لیا موت نے دلداروں کو
کھا گئی کس کی نظر ہائے میرے پیاروں کو
بچو یہ کیا کیا اب ہو میری کس طرح گذر جیتی میں رہ گئی دنیا سے کیا تم نے سفر
کون اب نزع کے ہنگام میری لے گا خبر کون تا گور مرے ساتھ رہے ننگے سر
پوچھ کر بھی تو نہ دیکھیں گے زمانے والے
اُٹھ گئے میرے جنازے کے اُٹھانے والے

میر مسرؔور نے قصائد اور سلام بھی کہے ہیں اور غزلیں بھی۔ اُن کے نوحوں کا ایک مجموعہ

''فغانِ زہرا'' کے نام سے شائع بھی ہوا؟ جسے کتب خانہ حیدری نے دکن سے شائع کیا ہے ''اُردو مرثیہ'' مطبوعہ مکتبۂ جامعہ دہلی میں سفارش حسین رضوی نے لکھا ہے کہ میر مسرورؔ نے قصائد، سلام، اور غزلیں کہی ضرور ہے لیکن وہ زور بیان مرثیوں میں ہے وہ کسی دوسری صنف سخن میں پیدا نہیں ہو سکا۔

میر مسرورؔ کے مراثی شائع نہیں ہو سکے ورنہ تو ممکن تھا اُن کے بعد آنیوالے ان کی طرزِ نگارش کو قابل تقلید سمجھتے ـــ اُن کے جو پانچ مرثیے اُن کے عزیز شاگرد باقرؔ امانت خوانی کے پاس تھے اُن مرثیوں کو باقرؔ امانت خوانی کے فرزندوں نے ۱۹۹۴ء میں شائع کیا ہے۔

میر مسرورؔ کی زندگی کے آخری ایام بہت دکھ میں گذرے ہیں۔ ان کے تیرہ لڑکے لڑکیوں میں کوئی زندہ نہ رہا۔ دل پر تیرہ بچوں کی موت کے داغ لئے ایک حساس شاعر نے زندگی کے آخری دن کیسے گذارے ہونگے اس کا اندازہ اہلِ درد ہی کر سکتے ہیں۔ حیدرآباد میں میر مسرورؔ کے بہت شاگرد ہیں، کیا یہ انکا فرض نہیں کہ وہ میر مسرور کا کلام شائع کر کے اُن کی روح کو مسرور کریں۔

☆☆☆☆☆

حکیم احمد شجاع :- (لاہور)

ولادت ۱۸۹۳ء۔ وفات ۱۹۶۹ء

جائے ولادت محلہ بازار حکیماں لاہور۔ حکیم شجاع الدین کے فرزند حکیم احمد شجاعؔ، عمدہ شاعر، اچھے افسانہ نگار، معروف ڈرامہ نگار ''گردِ کارواں''، ''خون بہا'' کے علاوہ کئی کتابوں کے مصنف مگر مرثیہ نگاری میں غیر مانوس نام۔ شاعری میں مرزا ارشد گورکانی (دبستان دہلی) اور میر ناظم (دبستان لکھنؤ) کی بیک وقت نیابت کرتے رہے۔

سید وحید الحسن ہاشمی نے حکیم احمد شجاع کا تعارف کراتے وقت تحریر کیا ہے:

"آپ نویں محرم کو سر مراتب علی کے یہاں مرثیہ پڑھتے تھے۔
ٹی۔ وی اور ریڈیو پر بھی مرثیہ پڑھتے تھے، آپ نے غالباً سات مرثیے کہے"
(نسل من ناصراً۔ ج ۱۔ ص ۱۵)

سر مراتب علی کے زیر انصرام مبارک حویلی لاہور میں مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں۔

۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۷ء تک راقم السطور نے بھی ہر سال عشرہ محرم کی ان مجالس میں سلام پڑھنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ لاہور میں قیام کے دوران حکیم احمد شجاع صاحب سے ملاقات کے دو تین مواقع بھی ملے ہیں۔ لیکن ۱۹۵۷ء تک کسی کو یہ علم نہیں تھا کہ حکیم احمد شجاع جو ڈرامہ نگاری میں سند تسلیم کئے جاتے تھے اُن کا مرثیہ گوئی سے بھی کوئی تعلق تھا۔ راقم الحروف کے لاہور چھوڑنے کے بعد لاہور میں ''انجمن شعراء اہلبیت'' کا قیام عمل میں آیا جس کے صدر مصور جذبات حضرت نور لدھیانوی مقرر ہوئے اور سید وحید الحسن ہاشمی کو سیکرٹری بنایا گیا۔۔۔ ۱۹۶۵ء میں حضرت نور لدھیانوی کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۶۶ء میں پروفیسر وزیر حسن عابدی کو صدر اور سید وحید الحسن ہاشمی سیکریٹری بنائے گئے۔ ۱۹۶۹ء تک جب راقم الحروف نے لاہور چھوڑا حکیم احمد شجاع نے اگر مراثی کہے تھے تو عوام تک نہیں پہنچے تھے لیکن سید وحید الحسن ہاشمی نے لکھا ہے کہ حکیم احمد شجاع نے سید مراتب علی کی مبارک حویلی میں مرثیے پڑھے میں تو یہ (شاید) ۱۹۵۸ء کے بعد ہوا ہوگا اور اگر ایسا ہوا ہے تو انہیں اس راہ پر لانے کا ثواب قیصر بارہوی، سید وحید الحسن ہاشمی اور سیف زلفی کے حساب میں جاتا ہے۔ حکیم احمد شجاع کے متعلق ہاشمی صاحب نے ایک واقعہ لکھا ہے۔

سید محمد شاہ ایڈووکیٹ کا انتقال ۱۹۶۷ء میں ہوا تو مرحوم کے فرزند سید افضل حیدر ایڈووکیٹ نے حکیم صاحب سے مجلس تعزیت میں 'مقام حسینؑ' کے عنوان سے مرثیہ پڑھنے کی درخواست کی مگر حکیم صاحب نے یہ کہہ کر کہ مقام حسینؑ خدا اور نبیؐ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، اگر میں مقام حسینؑ پر مرثیہ کہوں گا تو زندہ نہ بچوں گا، ایڈووکیٹ صاحب کی درخواست رد کر دی اور یہاں کسی دوسرے شہید کا مرثیہ پڑھ دیا۔ ۱۹۶۹ء میں سر امراتب علی نے حکیم صاحب سے مقام حسینؑ پر نہم محرم کو مرثیہ پڑھنے کی درخواست کی۔ حکیم صاحب نے ایک مختصر مرثیہ بعنوان مقام حسینؑ کہا اور محفل میں پڑھا جس کا ایک بند یہ تھا۔

اب فاطمہ کے لال کی رحلت قریب ہے ناموس سرمدی کی شہادت قریب ہے
وقت وداعِ شافعِ امت قریب ہے جنت کے بادشاہ سے جنت قریب ہے

ہے خاتمہ قریب خدا کے غریب کا
بجھنے کو ہے چراغ خدا کے حبیب کا

کہا جاتا ہے کہ اسی برس حکیم احمد شجاع کا انتقال ہو گیا اور اُن کی وہ پیشگوئی درست

ثابت ہوگئی کہ "میں مقامِ حسین پر مرثیہ کہوں گا تو زندہ نہ بچوں گا"— حیرت ہے کہ حکیم احمد شجاع جیسی باثر، صاحب ثروت اور مقبول شخصیت کے مرثیے شائع کیوں نہیں ہوئے۔ اور یہ بھی پتہ نہیں کہ کہاں سے دستیاب ہو سکتے ہیں سید وحید الحسن ہاشمی نے بھی اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا۔

☆☆☆☆☆

سراپا شہزادہ علی اکبرؑ

روشن نگاہ جیسے چراغ خدا کی لَو
روشن جبیں کہ جیسے مہ و کہکشاں کی ضَو
روشن ضمیر خُلد میں کوثر کی جیسے رَو
روشن دماغ، پر تَوِ خورشیدِ صبحِ نَو
نازک ہے جو حسینؑ کے احساس کی طرح
جرار ہے جو حضرتِ عباسؑ کی طرح

پیکر میں حُسنِ پیکرِ سلطان انبیاء
گفتار میں فصاحتِ گفتارِ مرتضیٰ
عباس کا جلال تو جعفر کا دبدبہ
تصویرِ حُسن صورتِ تصویرِ مصطفیٰ
گردوں پہ جس کے دم سے فضیلت ہے فرش کو
جس کی نگاہ چھو کے پلٹتی ہے عرش کو

(حضرت مہدی نظمی کے مرثیے سے)

ناطقؔ لکھنوی:- (چاٹگام)

ولادت لکھنؤ ۱۸۸۷ء۔ وفات چاٹگام اکتوبر ۱۹۵۰ء

نام سید ابوالعلا سعید احمد، ناطقؔ تخلص۔ جدِاعلیٰ بغداد سے دیوا شریف بارہ بنکی (بھارت) آئے— ناطقؔ کے والد سید محمد عبدالبصیر حضور زیدی نے لکھنؤ کو وطن بنایا۔ یہیں سعید احمد ناطقؔ پیدا ہوئے۔ اُن کی پوری تعلیم لکھنو میں ہوئی، انیسویں صدی کے لکھنؤ میں اشراف کے بچے صرف ونحو، منطق، ادب، فقہ، علم ہیئت، علم جفر، خوشنویسی پڑھا کرتے تھے، سعید احمد کو بھی یہ علوم پڑھائے گئے۔

امیر مینائی ان کے قریبی رشتہ دار تھے۔ نواب بہادر حسین خان انجمؔ دِمیر مونسؔ سے ان کے گہرے مراسم تھے، ان دونوں شعرا کی ترغیب پر سعید احمد، ناطقؔ بنے اور شاعری شروع کی— نواب جعفر علی خان اثرؔ نے اُن کے متعلق کہا ہے "میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ جدید اردو شاعری کا سنگِ بنیاد ناطقؔ نے رکھا ہے"۔

ناطقؔ لکھنوی کا دیوان جس میں غزلیات، قصائد، مثنوی، رُباعیات اور مرثیہ شامل ہیں، ۱۹۵۷ء میں انجمن تعمیرِ ادب چاٹگام نے شائع کیا تھا— ناطقؔ لکھنوی کی وجہ شہرت اُن کی ایک "نظم اُردو" ہے جو اُردو زبان وشاعری کی منظوم تاریخ ہے جسے معہ حواشی ناطقؔ لکھنوی نے بہت اہتمام سے ۱۹۴۰ء میں شائع کرایا تھا—

ناطقؔ لکھنوی کا ساڑھے پانچ سو بند پر مشتمل مرثیہ اس وقت ہمارے سامنے ہے جس کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

شام پر سایہ فگن جب شبِ عاشور ہوئی کربلا تیرگیٔ ظلم میں محصور ہوئی
گو شبِ ماہ تھی لیکن شبِ دیجور ہوئی چاند بے نور ہوا، چاندنی کافور ہوئی
پنجۂ مہر سے دامانِ قمر چھوٹ گیا
عہد سیاروں میں باہم جو تھا وہ ٹوٹ گیا

اس مرثیے میں ناطقؔ نے بعض ایسی ضعیف روایتوں کو بھی نظم کیا جو مقصدِ قربانی حسینؑ کے مزاج پر پوری نہیں اُترتی، اور بعض ایسے واقعات کو بھی جن کا ذکر نہ ہو تو واقعہ کربلا، اور تاریخ کربلا میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ہے— یوں لگتا ہے کہ اساتذہ کے مرثیوں سے ہٹ کر نئی راہیں نکالنے کی سعی میں وہ قافلۂ فکر کے ساتھ نہیں چل سکے اور اِدھر اُدھر کی خاک چھان کر پھر راستے پر

آئے ہیں۔— ناطقؔ لکھنوی ایک عالم فاضل شاعر تھے لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ "فلسفۂ ہمہ اوست" کے قائل تھے جس کی رُو سے خیر و شر دونوں اللہ کے حکم سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

ایک جانب ہے جو ابلیس تو اک رُخ جبریل   اور قابیل کے تھے مدِ مقابل ہابیل
قاطعِ حجتِ فرعون تھی موسیٰ کی دلیل   اک طرف آتش نمرود، ادھر باغ خلیل

شر ہو یا خیر، جلال اور جمال اس کا ہے
دونوں عالم میں بہر حال کمال اس کا ہے

کسی زمانے میں یہ بات فلسفہ کہلاتی ہوگی۔ آج تو ایک عام آدمی بھی جانتا ہے کہ دو متحارب قوتوں میں سے ایک حق پر اور ایک باطل پر ہوتی ہے۔ دو مدِ مقابل طاقتوں کو اللہ کی مرضی کے تابع کہنا اللہ کے عدل و انصاف سے انکار کے مترادف ہے، مقام حیرت ہے کہ ناطقؔ لکھنوی جیسی عالم فاضل شخصیت ابلیس اور جبرائیل، ہابیل و قابیل یعنی قاتل و مقتول، فرعون اور موسیٰ، نمرود اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ، ایک دوسرے کی ضد قوتوں کے اعمال کی ذمہ داری اللہ کے نام لکھ رہے ہیں۔ اگر "ہمہ اوست" ہی حرفِ آخر ہے تو یزید اور حسینؑ (نعوذ باللہ) دونوں کے کردار اور اعمال حسبِ منشائے خداوندی ثابت ہوئے۔ استغفر اللہ۔

ڈاکٹر ہلال نقوی نے لکھا ہے کہ منے صاحب ذکی، مرزا اوج، ادیب اور طاہر صاحب رفیع کے مرثیوں میں جو اٹھان ہے اس کی ایک نئی صورت ناطقؔ کے مرثیے میں نظر آتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ناطق مرحوم کے فرزندار جمند سیّد رشید احمد ایڈوکیٹ نے ڈاکٹر ہلال نقوی کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ ناطقؔ مرحوم میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، پیارے صاحب رشیدؔ، میر عارفؔ اور جاویدؔ لکھنوی کے قائل تھے۔ مرثیے میں تصنع اور مبالغے سے گریز کرتے تھے۔ حقیقت نگاری کو مرثیے کا جزو لاینفک سمجھتے تھے۔ حضرت امام مظلوم اور دیگر اہلبیت کے کردار اور رزم میں اُن کی شجاعت پر خصوصی توجہ تھی"

ڈاکٹر ہلال نقوی ایک نرم خو محقق ہیں۔ روشنی کو روشنی کہنے کے لئے بھی ان کا پاس کوئی حوالہ، کوئی نام اور اندھیرے کو اندھیرا کہنے کے لئے بھی ان کے پاس کسی کا خط ضرور ہوتا ہے اُنہوں نے ناطقؔ لکھنوی کے مرثیے میں (حسب دستور حوالوں کے حوالے سے) محاسن ڈھونڈ لئے ہیں۔ سیّد رشید احمد ایڈووکیٹ نے جو کچھ لکھا وہ اُن کی خاندانی شرافت و نجابت کا تقاضہ ہے۔ پریشانی تو

مجھ ایسے مرثیے کے طالب علموں کو ہوتی ہے اس لئے کہ مرثیہ ظلم کو ظلم اور مظلوم کو مظلوم تسلیم کر کے مظلوم کے حزن وملال اور دکھوں کا ساتھ دے تو مرثیہ ہے اور اگر مرثیہ نگار ظالم اور مظلوم دونوں کے اعمال کو ''من جانب اللہ'' سمجھے تو پھر وہ مظلوم کا ساتھ کیسے دے سکتا ہے؟ حضرت ناطق لکھنوی کی خاندانی نجابت کا احترام واجب اور ان کی شاعرانہ عظمت بھی مسلّم، اسی لئے ''خامہ انگشت بدنداں ہے ....'' پھر بھی بڑے ادب سے گذارش ہے کہ حضرت ناطق لکھنوی جیسے با کمال اور ''فلسفۂ ہمہ اوست'' پر یقین رکھنے والے شاعر اگر مرثیہ کی بجائے اُردو میں ''منطق الطیر'' لکھتے تو زیادہ مقبول ہوتی۔

☆☆☆☆☆

آرزو لکھنوی:-

ولادت ۱۸۷۲ء ۔وفات ۱۹۵۱ء (کراچی)

نام سید انور حسین عرفیت منجو صاحب، تخلص آرزو۔ میرذاکر حسین یاس کے منجھلے فرزند۔ سلسلۂ نسب میں جدِ اعلیٰ نواب جان علی تہور خان تھے جو اورنگ زیب کے زمانے میں ہرات سے ہندوستان آئے اور اجمیر میں آباد ہو گئے۔ نواب تہوّر خان کے پوتے نواب مرزا گل بیگ، چمن میں وفورِ گل دیکھ کر اور دامن دراز ہو گئے اور اجمیر سے لکھنؤ آئے۔ فردوسِ اودھ، بالخصوص شہر لکھنؤ نے، نوابین اہل ثروت اور اہل علم لوگوں کو ہمیشہ خوش آمدید کہا ہے۔ نواب مرزا گل بیگ کو بھی لکھنؤ کی فضا راس آئی اور اُنہوں نے شان وشوکت سے بسر کی۔ نواب مرزا گل بیگ کے پوتے میرذاکر حسین یاسؔ لکھنوی آبائی ریاست ختم ہونے کے بعد اپنی ضروریات زندگی کے صحن میں صبرو قناعت کے چراغوں کی روشنی میں زندگی گذارتے رہے۔ ان حالات میں آرزو پیدا ہوئے۔ اُن کا سلسلہ تعلیم ۵ برس کی عمر سے شروع ہوا۔ بارہ برس کی عمر میں شعر گوئی کا شوق ہوا تو اُستاد جلال لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔

آرزو ہمہ جہت قلمکار تھے۔ اُنہوں نے ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی اور کامرانی نے اُن کے قدم چومے، ان کی غزلوں کے بہت سارے مجموعے شائع ہوئے۔ اُنہوں نے مثنویاں بھی لکھی۔ صبح بنارس مقبول مثنوی ہے۔ موسیقی سے بھی تعلق تھا، کلکتہ میں ایک فلم کمپنی کے لئے گیت اور مکالے لکھے اور کئی کامیاب فلموں کے 'لکھاری' کی حیثیت سے فلمی صنعت میں آج بھی اُن کا

نام ہے۔ بمبئی گئے تو وہاں فلمی صنعت نے اُن کی پذیرائی کی۔ سچ پوچھیے تو غزل گو اور مرثیہ نگار شاعر سے زیادہ وہ ایک گیت نگار شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد آرزو بمبئی سے کراچی آ گئے، کراچی میں زیڈ۔اے، بخاری ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان اور آل رضا نے اُن کا خیال رکھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ جوش سے آرزو تک آنے والوں کی توقعات پوری نہ ہو سکیں۔ آرزو کراچی میں ۱۶، اپریل ۱۹۵۱ء کو انتقال فرما گئے اور علی باغ کے قبرستان میں دفن ہو گئے۔

آرزو کی ادبی زندگی اس بات کی متقاضی ہے کہ اُن کی شاعری اور اصناف ادب پر سیر حاصل گفتگو کی جائے مگر اس کتاب کا موضوع اردو مرثیہ ہے۔ اور سردست مرثیہ میں بھی گہری تحقیق یا Deep Study نہیں بلکہ اختصار کے ساتھ اہم نکات کا اندراج مقصود ہے۔

"آرزو کی مرثیہ نگاری پر عبدالرؤف عروج لکھتے کہ آرزو لکھنوی کے مرثیے دیکھنے کے بعد اس حقیقت میں شبہہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ آرزو اپنے انداز بیان کے اعتبار سے انیس و دبیر کے دور سے پہلے کے معلوم ہوتے ہیں"

آرزو لکھنوی کا سفر غزل سے شروع ہوا نعت، سلام، منقبت، رباعی اور قطعات کی منزلیں طے کرتا ہوا مرثیہ تک پہنچا۔

تصانیف: (۱) فغان آرزو (۲) جہانِ آرزو (۳) نشانِ آرزو (۴) زبانِ آرزو، ان کی غزلیات کے مجموعے ہیں، (۵) عدلِ محمود (۶) دردانہ (۷) صبح بنارس، اُن کی مثنویاں ہیں۔ صبح بنارس اُن کی مقبول ترین مثنوی ہے جو منظر کشی اور جذبات نگاری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اور یہی صفت اُن کے مراثی میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ آرزو کے پانچ مراثی کا مجموعہ ۱۹۴۶ء میں بمبئی سے شائع ہوا تھا۔

آرزو لکھنوی کے جو مرثیے شائع ہوئے ہیں وہ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۴۰ء کے درمیانی عرصے کے ہیں، بعد کے مرثیے جو ابھی غیر مطبوعہ ہیں وہ آخری عمر کے مرثیے ہیں۔ اُن کی شمولیت کے بغیر آرزو کے متعلق کوئی رائے حتمی نہیں ہو سکتی۔ —— آرزو لکھنوی کو اس عہد کے جلیل القدر شاعر حضرت ضامن علی جلال لکھنوی نے ۱۹۰۸ء میں ایک اجازہ دیا تھا کہ آرزو غزل اور مرثیے میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں اور اختلافی مباحث پر رائے زنی کر سکتے ہیں۔ اس وقت آرزو کی عمر ۳۴ سال تھی۔

آرزوؔ نے میر انیسؔ اور میر نفیسؔ کو سنا ہے، آرزوؔ کے والد گرامی ذاکر حسین یاسؔ، میر مونسؔ کے شاگرد تھے۔ اس قرب کے سبب آرزوؔ کے مرثیوں پر انیسؔ اور خاندان انیسؔ کا رنگ گہرا ہوتا چلا گیا۔ یوں بھی اُس دور کی اقدار یہ تھیں کہ اساتذہ اور اپنے بزرگوں کو کلام دکھائے بغیر نہ پڑھا جاتا تھا نہ شائع ہوتا تھا اور پھر اس کا اعتراف بھی بہانگ دہل کیا جاتا تھا—اس کا سبب یہ کہ اُس دور میں شاعر عالم ہوتے تھے، اُنہیں احساس کمتری نہیں ہوتا تھا۔ آرزوؔ لکھنوی نے، میر انیسؔ اور خانوادۂ انیسؔ کی برتری کا برملا اقرار کیا ہے۔

مدح خوانیٔ امامِ دو سرا مشکل ہے حق جو ہے مدح کا وہ مدح و ثنا مشکل ہے
سلسلہ صورت گیسوئے رسا مشکل ہے یدِ طولیٰ صفتِ دستِ دعا مشکل ہے
صبح اُمید کا گویا یہ سخن مطلع ہے
جادۂ منزلِ مقصود ہر ایک مصرع ہے

حبذا فکر، زہے طبعِ خوشا نظم سلیسؔ یہ فصاحت یہ بلاغت یہ مضامین نفیسؔ
کشور نظم میں گذرا ہے یہ بے مثل رئیسؔ ہاں خدا چاہے تو پیدا ہو کوئی اور انیسؔ
مرحلہ ہائے خرد سے یہ کبھی طے نہ ہوا
ناظم ایسا تو نہ ہوگا نہ کوئی ہے نہ ہوا

آرزوؔ کے مرثیوں میں انیسؔ کی تقلید تھی۔ یوں تو بعد انیسؔ اکثر شاعروں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ خواہش کی ہے کہ وہ انیسؔ کے مقام کو پہنچ سکیں لیکن، شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ، اس منزل تک رسائی آسان نہیں۔ آرزوؔ نے شعوری طور پر یہ کوشش کی ہے اور وہ اس میں خاصے کامیاب ہیں۔ اُن کے مرثیوں میں منظر کشی، رزم نگاری کا اسلوب بھی نمایاں ہے۔ عون و محمد کی جنگ کی منظر کشی آرزوؔ کے اشعار میں یوں کی گئی ہے ۔

بے نشاں کر دیا چُن چُن کے علمداروں کو سر اُٹھانے نہ دیا جنگ میں سرداروں کو
کیا مٹایا تھا صغیروں نے نموداروں کو بھاگ نکلے تھے لعیں پھینک کے تلواروں کو
غرق کشتی ہوئی خشکی میں جو ارمانوں کی
آبرو گھٹ گئی دریا کے نگہبانوں کی

منچلے جتنے تھے ہمت کو وہ سب ہارے گئے تیر کر کتنے لعین نہر کے اس پار گئے

منہ چھپانے کو تبرزن پسِ اشجار گئے بھاگ کر تیر کے چلّے پہ کماندار گئے
سرکشی بھول گئے آ جو پڑی جانوں کی
نیزہ برداروں نے لی راہ نیستانوں کی

جنگ کا ماحول، نقاروں کی آواز، تلواروں کی جھنکار، تیروں کی سنسناہٹ، گھوڑوں کی ٹاپیں سب کچھ آرزو کے مرثیوں میں ملتا ہے—

آرزو کا زیادہ تر کلام بشمول مراثی آج بھی غیر مطبوعہ ہیں— اُن کا سب سے پہلا مرثیہ (جو شائع ہو چکا ہے) ''توبہ'' ہے جو جنابِ حُر کے احوال پر ہے ۔

دردِ عصیاں کی زمانے میں دوا ہے توبہ پئے مایوسِ شفا، خاکِ شفا ہے توبہ
سرفرازندۂ اربابِ خطا ہے توبہ [۱] رونمائندۂ الطافِ خدا ہے توبہ
دافعِ درد و غم و رنج و مصیبت ہے یہی
ہم سے پوچھو تو کلیدِ درِ رحمت ہے یہی

جس کو پہنچے دُرِ مقصود وہ دانہ ہے یہی جو ہے مرغوب خدا کو وہ فسانہ ہے یہی
جس کا ناوک ہے ندامت وہ نشانہ ہے یہی [۲] جس میں اسرارِ طرب ہیں وہ ترانہ ہے یہی
دور ہے قہرِ خدا سے متمنّی اس کا
مستحقِ رحمتِ حق کا ہے متمنّی اس کا

دردِ دل کی یہی دارو ہے میانِ آفاق دور اسی نے تو کیا آدم و حوّا کا فراق
کام برلائے زلیخا کا اسی کے اشتاق کردیے جمع پریشانیٔ دل کے اوراق
بدلا پیری میں جواں کرکے مقدر کو بھی
مہرباں کردیا روٹھے ہوئے دلبر کو بھی

مرثیے کا دسواں بند گریز کا بند ہے جو روئے سخن حر کی طرف لے جاتا ہے ۔

مگر ایسی نہ کسی کی ہوئی توبہ مقبول جو شرف حرِ جری کو ہوا عالم میں حصول
ساعیٔ بخششِ عصیاں تھا جگر بندِ رسولؐ ہاتھ اُٹھے تھے دعا کو کہ کھلا بابِ قبول
نام کس پیار سے سلطانِ امانت نے لیا
بڑھ کے آغوش میں اللہ کی رحمت نے لیا

رہے برسوں ہی خجل اپنے کیئے پر آدم جب میسّر ہوئے غفّار کے الطاف و کرم
پیر جب ہوگئی سہ سہ کے جدائی کے الم[11] وصل یوسف سے ہوئی شاد زُلیخا اس دم

حرّ عجب شان سے بستانِ اماں تک پہنچا
کہ قدم رکھتے ہی جادے پہ جناں تک پہنچا

کام بگڑا ہوا عالم میں بنا کیوں کس کا اس طرح ڈوب کے کوئی نہ اُبھرتے دیکھا
ایسا بہکا نہ کوئی راہ پہ آیا ہوگا[12] حبذا بخت کہ دوزخ کے کنارے سے پھرا

سیدھا ہوجائے جو برگشتہ مقدر بھی ہو
حُر سا رہرو ہو تو شبیر سا رہبر بھی ہو

دل میں کہتا تھا ہوا آہ یہ مجھ سے کیوں کر گھیر کر سبط نبیؐ کو جو میں لے آیا ادھر
آئی ہاتف کی یہ آواز عجب اس کا نہ کر[19] ایک یہ بھی تھا نمک خواریٔ فاسق کا اثر

شاد غمخواریٔ سرور سے تیرا جی ہوگا
ترک کر صحبتِ ناری کو تو ناجی ہوگا

ہوگیا ساتویں تاریخ سے جو پانی بند متردّد ہوا کچھ اور حرِّ دانشمند
دل میں سوچا کہ نبی زادے کو پہنچی جو گزند[20] ہو نگے اُمت سے رسولؐ عربی کیا خورسند

دانہ ممکن ہے میسّر نہ اُنہیں پانی ہے
واہ کیا خوب نبی زادے کی مہمانی ہے

حرّ کے احساسِ جرم، پچھتاوے کو تفصیل کے ساتھ نظم کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے غلام اور فرزند کی ہمنوائی کے بعد حرّ یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ فوج یزید میں اپنا منصب چھوڑ کر امام مظلوم کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنے گناہ کا کفارہ دیں۔ آرزو لکھنوی کی قادر الکلامی نے لفظوں سے جا بجا احساس اور جذبوں کی مصوّری کی ہے ؎

جب سوئے فوجِ خدا رُخ حرّ غازی نے کیا عزم کعبے کا بصد شوق نمازی نے کیا
پورا راکب کا جو تھا عزم وہ تازی نے کیا[52] وا ادھر بابِ کرم شاہِ حجازی نے کیا

کی ملائک نے دعا شہ کے فدائی کے لئے
بڑھ گئی رحمتِ حق عقدہ کشائی کے لئے

حر امام مظلوم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور اقرار جرم کرتے ہیں ۔

قابل عفو نہیں گرچہ میرے جرم و گناہ آپ ہیں رحمت حق، بخشئے مجھ کو یا شاہ
اس شقاوت سے لعینوں کی نہ تھا میں آگاہ ورنہ لاتا نہ ادھر آپ کو خادم واللہ
رنگ افزوں خطِ عصیاں کی سیاہی کا ہوا
اب تو باعث میں ہی حضرت کی تباہی کا ہوا [۵۶]

رحمت اللعالمین کے نواسے۔مملکت صبر کے تاجدار، رضائے الٰہی کے وارث، سیدالشہدا امام حسینؑ نہ صرف حر کو معاف کر دیتے ہیں بلکہ اسے بھائی کے لقب سے مخاطب کرتے ہیں ۔

بھائی شرمندہ نہ ہو، تجھ کو ہے تشویش فضول تجھ سے رنجیدہ نہیں ہے بخدا ابن بتولؑ
ہے رضامند خدا، خوش ہیں علیؑ، شاد رسولؐ تیرا اے بھائی گروہ شہدا میں ہے شمول
فضلِ خالق ہوا میت جو تیری خالص تھی
بے تیرے نام کے فردِ شہدا ناقص تھی

آرزو لکھنوی کے اس مرثیے میں قدیم مرثیے کے لوازم کی پاسداری نہیں کی گئی۔نہ تلوار کی تعریف ہے، نہ گھوڑے کا ذکر۔ساقی نامہ ہے نہ بین، گویا اسے قدیم یا کلاسیکی مرثیہ نہیں کہا جاسکتا، اس نظم میں ایک خاص عنوان کے تحت کربلا کی تاریخ کا ایک باب پیش کیا گیا ہے جس میں نہ شاعر نے رونے کی کوشش کی ہے نہ رُلانے کی۔ایک زمانہ تھا جب اسی طرح خاص عنوانات وموضوعات کے تحت کہے گئے جوشؔ کے مراثی کو ''مرثیہ بدر'' کر کے مسدس کے خانے میں ڈال دیا گیا تھا— خوش نصیب ہے یہ لکھنوی شاعر جس کا نام سید انور حسین اور تخلص آرزوؔ ہے کہ اودھ کے ناقدین مرثیہ نے ان کی اس مسدس کو مرثیے کے طور پر قبول کرلیا ہے۔

☆☆☆☆☆

قدیم لکھنوی:-

ولادت ۱۸۷۵ء، وفات ۱۹۵۱ء۔

نام سید علی نواب، تخلص قدیمؔ، وطن مالوف لکھنؤ۔میر قدیمؔ لکھنوی کے تعارف کی ابتدا، ان کے اپنے الفاظ میں یوں ہوتی ہے - ۔

قدیم خادمِ اولادِ مصطفیٰ ہوں میں رموزِ مدح سرائی سے آشنا ہوں میں
نہ مبتدی ہوں نہ محتاج عصر کا ہوں میں خود اپنی جا پہ قیامت صفت بپا ہوں میں

کرو تو غور یہ ادنیٰ وقار ہے میرا
امام عصر کو بھی انتظار ہے میرا

رموزِ مدح سرائی سے آشنا، اپنی جگہ پر ''قیامت صفت بپا'' خادمِ اولادِ مصطفیٰ شخصیت کا نام سید علی نواب، تخلص قدیم تھا، میر انیس کے پوتے، میر سلیس کے فرزند جن کی مرثیہ خوانی کی اودھ میں دھوم تھی۔ مرثیہ نگاری میں بہار اور ساقی نامہ میر قدیم کی پہچان ہے۔

آنکھ جو مجھ سے ملائے وہ شرابی ہوجائے صاف پانی کو جو دیکھوں تو گلابی ہوجائے
نظر اُٹھا کے جو دیکھوں تو نشہ چھاجائے نسیم پاس سے گذرے تو لڑکھڑا جائے

قدیم، میر انیس کے بعد ۱۸۷۵ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ قدیم ابھی دو برس کے تھے کہ میر سلیس نے فیض آباد میں مکان فروخت کیا اور لکھنؤ آ گئے۔

میر قدیم نے شعر گوئی غزل سے شروع کی۔ پہلے جاوید لکھنوی سے اصلاح لی۔ غزل گوئی تک سحر تخلص تھا بعد میں قدیم اختیار کیا۔ ۱۹۱۳ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ اس وقت اُن کی عمر ۳۸ برس کی تھی۔ پہلی بار حکیم محمد نواب لکھنوی کے ہاں اُن کے والد گرامی حکیم باقر حسین مرحوم کی مجلس میں مرثیہ پڑھا جو اتنا کامیاب ہوا کہ پھر یہ سلسلہ موقوف نہ ہوا۔ لکھنؤ سے باہر بھی ان کی مرثیہ خوانی کی شہرت تھی ۲۵ ر رجب کی ایک یادگار مجلس جو میر انیس، میر نفیس، دولہا صاحب عروج ہر سال پڑھتے رہے۔ ان کے بعد لڈن صاحب فائز نے پڑھی اور اُن کے انتقال کے بعد یہ مجلس قدیم نے پڑھنی شروع کی اور ہر سال نو تصنیف مرثیہ پڑھتے رہے — اہل لکھنؤ اُن کا کلمہ پڑھتے تھے۔ قدیم جدھر رُخ پھیر لیتے تھے ایسا لگتا تھا کہ دنیا نے اُدھر رُخ پھیر لیا ہے لیکن وقت کب کسی سے منہ پھیر لے یہ کوئی نہیں جانتا۔ بہت ہر دلعزیز اور مقبول شاعر زندگی کے آخری دنوں میں جب سکتہ کے مرض میں مبتلا ہوئے تو چند مخلصین کے علاوہ جن میں حضرت مودب بھی شامل ہیں دنیا نے اس آفتاب گویائی سے منہ موڑ لیا۔ اولاد سے پہلے ہی محروم تھے۔ احباب اور چاہنے والوں نے منہ موڑا تو پرستاروں کے ہجوم میں رہنے والا تنہائی کا اسیر ہو کر رہ گیا اور اس بیکسی کے عالم میں ۲۴ ر اپریل ۱۹۵۱ء کو خاندان انیس کا یہ آخری چراغ بجھ گیا۔ میر محمد ہادی لائق حسب وصیت، میت…

میر انیس میں لانے اور دفن کیا — اولاد سے محروم قدیمؔ لکھنوی اپنے پسماندگان میں ایک سوگوار بیوہ اور اپنا ذخیرہ سارا کلام چھوڑ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ بیوگی کی زندگی گذارنے کے لئے ان کی بیوی نے تقریباً تیس (۳۰) مرثیے فروخت کردئے تھے۔ "بانے ری دنیا، وائے رے زمانے" وقت ساتھ نہ دے تو ہیرے کوڑیوں کے مول بکتے ہیں۔

کچھ یوں محسوس ہوا ہے کہ ہم اُردو والے عرب میں ہوں یا عجم میں، ہمارا یہ وطیرہ رہا ہے (بلکہ آج بھی ہے) کہ اجنبی ستارا ابھرے تو ہم اسے چاند سورج مان لیتے ہیں لیکن کوئی ہماری اپنی صفوں میں سے بلند قامت ہوجائے، اپنی محنت اور ودیعت کی گئی صلاحیتوں کی وجہ سے کوئی مقام حاصل کرے تو ہم اسے جینے نہیں دیتے۔ یگانہ ہوں یا شاد، قدیمؔ لکھنوی ہوں، یا آج کا کوئی شاعر ادیب "خوئے بد را بہانہ بسیار" ہم اُس کی تکذیب کا کوئی بہانہ تلاش کرلیتے ہیں۔ یہ قدیمؔ لکھنوی کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ ان کی شہرت، اُن کی ہر دلعزیزی اور اُن کا فن کوتاہ قدوں سے برداشت نہ ہوا اور قدیمؔ کے متعلق ان افواہوں کو خبر بنادیا کہ قدیم میں مرثیہ گوئی کی صلاحیت نہیں تھی بلکہ مولانا سبط حسن، حضرت ناظم لکھنوی اور حکیم نواب لکھنوی تینوں بزرگ میر عارفؔ کے مقابلے پر قدیمؔ کو لانے تھے —

ہم نے بلالؔ نقوی سے سنا، اُنہوں نے حسینؔ اعظمی سے سنا، اُنہوں نے کسی ابو ہویدا سے سنا، مگر روایت ہے کہ فرنگی محل کے پل پر واقع چوکی پولیس سے ملحق امام بارگاہ میں میر عارفؔ مرثیہ پڑھ رہے تھے کہ مرثیہ خوانی کے دوران، مدرسۂ ناظمیہ عربیہ کے کچھ طالب علم مرثیہ سننے کی بجائے آپس میں باتیں کررہے تھے۔ یہ بات میر عارفؔ کو ناگوار گذری اور اُنہوں نے نوجوانوں کو ٹوک دیا۔ اس وقت تو یہ نوجوان خاموش ہوگئے لیکن چند ہی دنوں بعد میر عارفؔ سے انتقام لینے کے لئے اُنہیں کے خاندان کے ایک گمنام شخص میر نواب علی قدیمؔ کو اُن کے حریف کی حیثیت سے میدان میں لائے اور اُن سے جو مرثیے پڑھوائے وہ علی میاں کاملؔ، مولانا سبط حسن صاحب اور ناظمؔ لکھنوی کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہوتے تھے — ڈاکٹر بلال نقوی نے (حسبِ دستور) اس روایت کی ذمہ داری قبول نہیں کی البتہ یہ استدلال ضرور کیا ہے کہ ان بزرگوں کے انتقال کے بعد قدیمؔ لکھنوی نے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی ترک کردی تھی — ڈاکٹر صفدر حسین نے بھی اس الزام کو دھراتے وقت یہ استدلال کیا ہے کہ میر عارفؔ کا انتقال ۱۹۱۶ء میں ہوگیا تھا۔ اُن کے بعد

میر قدیم نے ۱۹۵۱ء میں وفات پائی لیکن درمیانی عرصے میں جو ۳۵ برس پر محیط ہے میر قدیم نے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں شہرت نہیں پائی۔ مولانا ضمیر اختر نقوی اس روایت کو سراسر الزام کہتے ہیں اُن کا کہنا ہے کہ قدیم نے اپنے شاگردوں کو جو مرثیے کہہ کر دئیے وہ آج بھی محفوظ ہیں۔ ان میں ایک نواب سردار لکھنوی بھی تھے، میر قدیم نے انہیں تین مرثیے کہہ کر دئیے تھے۔ دلیل دل کو لگتی ہے۔ مولانا سبط حسن صاحب قبلہ کا ۱۹۳۵ء میں انتقال ہوا۔ اُن کے بعد قدیم ۱۶ برس زندہ رہے اور آخری وقت تک معرکتہ الآرا مرثیے کہتے بھی رہے اور پڑھتے بھی رہے۔ اس لئے ایسی کمزور روایات پر کوئی سنجیدہ محقق ادب یقین نہیں کر سکتا۔ اور پھر ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ مولانا سبط حسن صاحب قبلہ جیسے جید عالم کے متعلق یہ گمان بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ میر عارف کی تذلیل کے لئے مرثیے کہہ کر کسی دوسرے کو دیں گے۔ کسی عالم دین کو اس سطح تک گرانا کسی کو بھی زیب نہیں دیتا ـــ اہم شخصیتوں کو اُن کے مقام سے گرانے کی کوششیں کرنے والے بد باطن ہر دور میں ہوتے ہیں جو خود بلند نہ ہو سکیں تو بلندیوں پر فائز شخصیتوں میں کیڑے نکالتے ہیں۔ میر قدیم کی زندگی کے اہم واقعات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک بار قدیم، راجہ صاحب سلیم پور کے ہاں مجلس پڑھ رہے تھے، ساقی نامہ کے ایک بند کا چوتھا مصرع یہ تھا۔ ؎ ''ایک دو جام نہیں، دے مجھے چودہ ساقی'' اور جب بیت پڑھی تو چھٹے مصرع پر منبر پر کھڑے ہو گئے:

تیرا ممنون ہوں جب تک کہ جیوں گا ساقی
چودھواں [۱۴] جام کھڑے ہو کے پیوں گا ساقی

راجہ سلیم پور بھی کھڑے ہو گئے اور کہا'' یہ بیت آپ ہی کا حصہ ہے کوئی دوسرا اس دور میں ایسی بیت نہیں لگا سکتا۔۔۔۔۔۔'' حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا''

☆☆☆☆☆

فراست زید پوری:-

ولادت ۲۶ / جون ۱۸۷۱ء وفات ۱۹۵۲ء

نام سیّد فراست حسین، تخلص فراست، وطن مالوف زید پور، ضلع بارہ بنکی، (بھارت)۔ دبستان دبیر کی ایک اہم شخصیت۔

مرزا دبیر کے فرزند مرزا اوج نے یہ کوشش بھی کی تھی کہ تاریخ اسلام یا تاریخ کربلا کے

جن واقعات کو مرثیہ گو شعراء نے نظر انداز کیا ہے وہ واقعات مرثیوں میں نظم کیے جائیں تاکہ رفتہ رفتہ ایک منظوم تاریخ کربلا اور بالآخر تاریخ اسلام مکمل ہو جائے۔ چنانچہ ان کے شاگرد مرزا محمد طاہر رفیع، فراست زید پوری، نسیم جرولی، ثاقب لکھنوی اور خبیر لکھنوی جیسے جید شعرا نے اس میدان میں کارہائے نمایاں دکھائے۔ ''دبستان دبیر کے'' مولف ڈاکٹر احسن فاروقی نے لکھا ہے کہ مرزا اوج نے اپنے خیال کی ترویج کے لئے خود بھی معراج کے احوال ایک مرثیے میں قلمبند کیے اور اس تحریک سے متاثر ہو کر ان کے شاگردوں نے بھی تاریخ اسلام کے درجنوں ایسے واقعات نظم کیے جن پر قدیم مرثیہ نگاروں نے کبھی توجہ نہیں کی — کربلا کی تاریخ کے تناظر میں ایسے شہدائے کربلا کے حال جو مراثی لکھے ہیں وہ ایک جداگانہ سرمایہ ہیں۔ فراست زید پوری نے بہت تعداد میں ایسے مرثیے کہے ہیں۔ ''معراج'' کے احوال پر ایک انہوں نے ایک معرکۃ الآرا مرثیہ کہا ہے۔

حجاب شب میں جو روشن چراغ ماہ ہوا سفید مثل سحر پردۂ سیاہ ہوا
فلک کی سیر سے خوش طائر نگاہ ہوا عروج پر شب معراج کے گواہ ہوا
زمیں پہ چرخ سے تسبیح کی صدا آئی
نمازیوں کے پھرے دن وہ رات کیا آئی

حشم خدم شہ لولاک کا نرالا تھا چراغ راہ رضا روئے شاہ والا تھا
پروں سے قدسیوں کے منزلوں اُجالا تھا قمر کا مثل نہ تھا بے نظیر ہالا تھا
براق پر رُخ پُر نور ضو دکھاتا تھا
چراغ حُسن ہوا پر چمکتا جاتا تھا

براق کی تیز رفتاری کے لئے محاکاتی انداز کتنا حسین ہے

نگاہ خلق سے پنہاں رہا ہوا کی طرح ہوا سے رُک نہ سکا نالۂ رسا کی طرح
زمیں سے جانب گردوں چلا دعا کی طرح بلند ہوگیا تکبیر کی صدا کی طرح
وہ ایک زینۂ قربت تھا شاہ دیں کے لئے
نماز جیسے ہو معراج مومنیں کے لئے

فراست زید پوری کا ایک مرثیہ ''ماہ کامل'' ایک ہی بحر میں ۲۰۰۰ بند، چھ ہزار اشعار

پر مشتمل ہے۔ یہ مرثیہ بلاشبہ اہلِ بیتِ رسولؐ کی منظوم تاریخ کی طرف پہلا قدم ہے۔ اس مرثیے میں ۱۴ مکمل باب ہیں جو چہاردہ معصومین کے احوال سے متعلق ہیں۔ مرثیے کا کمال یہ ہے کہ ہر باب کو علیحدہ علیحدہ پڑھیں تو ہر باب مکمل ہے اور ہر باب کے مطلع کا بند ایک نئے مرثیے کی حیثیت رکھتا ہے لیکن تسلسل کے ساتھ پڑھا جائے تو ۲۰۰۰ بند کا ایک مسلسل مرثیہ ہے جس میں احوال چودہ معصومین کی تقسیم کچھ یوں ہے۔

۱۔ چودہ طبق میں جلوۂ نورِ الٰہ ہے۔	حمد ونعت
۲۔ جب زیرِ خاک مہرِ نبوت نہاں ہوا	ختمی مرتبت کا وصال
۳۔ زہرا کے غم میں شیرِ خدا اشکبار تھے	سیدہ فاطمہ زہراؑ کا انتقال
۴۔ جب داخلِ جناں شہِ خیبر شکن ہوئے۔	حضرت علی کی شہادت
۵۔ جب مسندِ نبیؐ سے جدا مجتبیٰؑ ہوئے	امام حسین علیہ السلام کی شہادت

اسی طرح علی الترتیب چودہ معصومین کے احوال سے یہ مرثیہ مزین ہے۔ چودھواں اور آخری حصہ امام زمانہ کی بارگاہ میں ایک عریضہ ہے۔

اے صاحب الزماں یہ زمانہ الم کا ہے

فراست زیدپوری کا ایک معروف مرثیہ ”ہے جنت البقیع میں جلوہ بہشت کا“ ہے جو اہلِ سعود کے ہاتھوں جنت البقیع کے انہدام کا مرثیہ ہے۔ اور سرفراز قومی پریس نے شائع کیا ہے۔

ہے جنت البقیع میں جلوہ بہشت کا　　کیا رنگ اس چمن میں ہے دنیائے زشت کا
ملتا ہے لطف گلشنِ عنبر سرشت کا　　عالم فروز نور ہے اک ایک خشت کا
خاتونِ جنت اس میں جو زیبِ مزار ہیں
ہر ذرے پر جناں کے جواہر نثار ہیں

محبوبِ ذوالجلال کو محبوب ہے یہ خاک　　قدسی ہیں جس سے خوش وہ خوش اسلوب ہے یہ خاک
حوریں پکارتی ہیں بہت خوب ہے یہ خاک　　غازہ بنانے کے لئے مرغوب ہے یہ خاک
صحنِ لطیف غیرتِ دامانِ طور ہے
حیراں ہے آفتاب وہ مٹی میں نور ہے

بدخواہ کیا مٹائیں گے اس باغ کی نمود　　اس کا جو باغباں ہے وہ ہے واجب الوجود
نکہت وہ ہے کہ جس سے عیاں قدرتِ ودود　　اہلِ بہشت آتے ہیں پڑھتے ہوئے درود

کیا اصل ہے کسی کے چمنستاں کے پھول کی
اس خاک سے تو آتی ہے خوشبو رسولؐ کی

فراستؔ زیدپوری کے مراثی کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''ماہ کامل''، ''ماہ تمام''، ''تصویر وفا'' لیکن ان کا غیر مطبوعہ کلام بہت زیادہ ہے۔ ''ماہ تمام'' میں چودہ معصومین کی مدح میں ۱۸ مسدس ہیں ''تصویر وفا'' میں اصحاب حسینؑ کی شہادتوں کا منظوم تذکرہ ہے — گویا ان کے تمام مراثی اس خواب کی تعبیر ہیں جو مرزا اوجؔ نے دیکھا تھا، منظوم تاریخ اسلام کا خواب — ان کے غیر مطبوعہ مرثیوں کے بارے میں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے لکھا ہے کہ ان کے غیر مطبوعہ مراثی کی تعداد دو صد سے زیادہ ہے۔ سید طاہر حسین کاظمی نے یہ تعداد ۱۵۰ بتائی ہے۔

''تقریباً پچاس مراثی طبع ہوئے اور ایک سو پچاس کے قریب اپنے برادر زادہ سید ضامر حسین ضامرؔ کو غیر مطبوعہ حالت میں پیش کئے۔ ضامر مرحوم سے راقم کو کئی بار ملاقات کا شرف ہوا اور فراستؔ حسین مرحوم کی مرثیہ نگاری کی تعداد سے متعلق گفتگو ہوئی''

(اردو مرثیہ انیس کے بعد۔ طاہر حسین کاظمی ص ۱۷۶)

فراستؔ زیدپوری کے حقیقی بھانجے اور شاگرد محسنؔ زیدپوری نے اپنے ایک مرثیے میں غیر مطبوعہ مراثی کے بارے میں دکھ کا اظہار کیا ہے۔

ہے پر اس کے لئے بے حد میرا دل رنجیدہ منظر عام پہ کچھ، باقی سخن پوشیدہ
مرثیے قید ہیں سب بستوں میں چیدہ چیدہ کیسے ہو مردہ نشینوں پہ کوئی گرویدہ
مصلحت حق کی اگر ہے تو شتاب اٹھے گی
حسن جب دیکھیں گے جب رخ سے نقاب اٹھے گی

(بیسویں صدی اور جدید مرثیہ۔ ص ۳۲۵)

فراستؔ زیدپوری عربی، فارسی، اردو کے عالم تھے۔ انہوں نے ۱۶ برس کی عمر میں پہلا مرثیہ کہا۔ مرزا اوجؔ سے تلمذ حاصل ہوا اور طائرِ فکر کی اڑان کی سمت مقرر ہوئی۔ فراستؔ زیدپوری کا نام تاریخ مرثیہ میں اس لئے بھی روشن ہے کہ ان کے سبب زیدپور کو مرثیہ گوئی کے دبستان کی حیثیت حاصل ہوئی۔ ان کی شاگردوں میں یونسؔ زیدپوری، اکملؔ زیدپوری، نفاستؔ زیدپوری، ناصرؔ زیدپوری۔ مووّتؔ زیدپوری، مبشر حسن سخنورؔ اور ان کے اپنے بھانجے اور شاگرد

محسن زیدپوری نے بیسویں صدی کی راہوں میں مرثیوں کے جو چراغ جلائے اُن کا اُجالا دور دور تک پھیلا ہوا ہے، اتنی دور تک کہ آج اکیسویں صدی کی ابتدا میں راقم السطور مغرب کے شہر لندن میں بیٹھ کر شرق کے افق سے طلوع ہونے والے ان سورجوں کا ذکر کر رہا ہے۔ فراست زیدپوری سے پہلے زائرؔ زیدپوری (متوفی ۱۹۰۷ء) اور فراستؔ کے بعد اُن کے شاگردوں کا سلسلہ، دبستان دبیر کی وسعت (Extuesion) ہے۔

☆☆☆☆☆

مؤدّب لکھنوی:-

ولادت ۱۸۷۸ء وفات ۱۹۵۳ء

نام سیّد عسکری مرزا تخلص مؤدّب۔ سیّد حیدر مرزا ادیبؔ کے فرزند، مہذّب لکھنوی کے والد، سیّد حسین مرزا عشقؔ کے پوتے، پردادا کا اسم گرامی سیّد محمد مرزا اُنسؔ — ننھیال فرنگی محل میں تھی، نانا میر مددعلی عرف داروغہ اچھے صاحب عیشؔ تھے جو مداحِ حسینؑ تھے اور شہر کے اشراف میں اُن کا شمار ہوتا تھا — پس مؤدّب لکھنوی دوطرفہ شجرہ کی رُو سے جیّد شعرا کے وارث تھے۔ آج کے فرنگی محل کا نام سن کر انسان چونکتا ہے لیکن مؤدّب کے نانا داروغہ اچھے صاحب عیشؔ والائے حسینؑ میں سرشار تھے۔ اُنہوں نے شبیہ روضۂ سیدہ زینب موسوم بہ "زینبیہ" بنوا کر وقف کی۔ یہ شبیہ آج بھی لکھنؤ میں موجود ہے۔ لکھنؤ میں تین خاندان مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں مشہور ہیں۔ خاندان انیسؔ، خاندان مرزا دبیر، اور خاندان عشقؔ و تعشقؔ — مؤدّب صاحب کا تعلق تیسرے خانوادے سے تھا۔ مرثیہ گوئی میں مؤدّب لکھنوی حضرت محمد طاہر رفیعؔ اور دولہا صاحب عروجؔ کے ہم عصر تھے — ہر چند کہ مرثیہ گو شعراء شعری زبان کو غیر مانوس الفاظ اور اختراعی تشبیہات واستعارات سے پاک رکھتے ہیں لیکن مؤدّب صاحب نے زبان کی پاکیزگی کا کچھ زیادہ ہی خیال رکھا ہے اور مرثیہ کی زبان کو آلودہ ہونے سے بچائے رکھا۔ جن شعراء کرام نے یہ احتیاط برتی ہے اُن کے مراثی کی زبان، اُردو زبان کی کسوٹی بنی رہے گی اور حضرت مؤدّب لکھنوی کا نام ایسے شعراء کرام میں سرِفہرست ہے جو زبان کے معاملے میں مستند مانے جاتے ہیں۔ ان کی خاندانی صفت یہ ہے کہ بہ حیثیت مرثیہ گو، لاجواب اور بحیثیت غزل گو مقبولِ زمانہ رہے ہیں۔ کم و بیش سب کے سب غزل گوئی میں ممتاز اور صاحب دیوان گذرے ہیں۔

حضرت مودّب نے ۱۵۴ مرثیے، ڈھائی ہزار رباعیاں، تقریباً تین سو سلام اور ایک سو قصیدے کہے ہیں جو موجود ہیں۔ یہ تعداد مودّب کے اصحاب کی بتائی ہوئی نہیں ہے بلکہ اہلِ بیتِ مؤدّب کی بتائی ہوئی ہے۔ مودّب صاحب کی زندگی میں اُن کے مرثیوں کی نو جلدیں شائع ہو چکی تھیں۔

مؤدّب صاحب کے ورثا میں ایک فرزند ارجمند حضرت مہذّب لکھنوی مولف مہذب اللغات اور چھوٹے فرزند سید عابد مرزا مکرّم اور ایک صاحبزادی ہیں۔ حضرت محمد میرزا مہذّب لکھنوی زندگی کے آخری سانسوں تک لکھنؤ میں رہے جبکہ مرزا مکرّم اور اُن کی ہمشیرہ پاکستان چلے گئے۔ صرف مرثیہ گوئی کی زبان ہی نہیں عام بول چال میں بھی مؤدّب صاحب زبان پر خاص توجہ رکھتے تھے اُردو گفتگو کے دوران اگر کوئی انگریزی لفظ استعمال کرتا تھا تو ٹوک دیا کرتے تھے۔

اُردو زبان وادب میں صرف دو شخصیتیں ایسی گذری ہیں جو سامنے والے کی حیثیت اور مرتبہ کا لحاظ کئے بغیر ٹوک دیتے تھے۔ ایک حضرت مودّب لکھنوی اور دوسرے حضرت جوش ملیح آبادی — مودّب صاحب کے ایک شاگرد نے اصلاح کے لئے تاخیر سے غزل پیش کرنے کی معذرت کرتے ہوئے کہا — میں تاخیر سے غزل پیش کرنے کی معافی چاہتا ہوں، میں ذرا Busy تھا۔ مودّب صاحب کے تیور بگڑ گئے اور غزل شاگرد کی طرف پھینکتے ہوئے فرمایا۔ میرے سامنے انگریزی لفظ بول رہے ہو۔ کیا اس لفظ کا متبادل اُردو میں نہیں ہے۔ جاؤ کسی انگریزی داں کو غزل دکھالو۔ ایسا ہی ایک واقعہ حضرت جوش کا ہے۔ پاکستان آنے کے بعد ایک دن مولانا کوثر نیازی (جو مرکزی وزیر تھے) جوش صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ گفتگو کے دوران مولانا کوثر نیازی نے پوچھا۔ جوش صاحب آپ لاہور میں رہائش پسند فرمائیں گے یا اسلام آباد میں — جوش صاحب کی پیشانی پر شکنیں اُبھر آئیں اور تلخ لہجے میں فرمایا۔ مولانا یہ رہائش کیا ہوتی ہے۔ کل آپ چاہ سے چاہش کہیں گے۔ مولانا کوثر نیازی نے فوری معذرت کی اور کہا جوش صاحب اسی لئے تو ہم چاہتے ہیں کہ آپ اسلام آباد میں ہمارے ساتھ قیام فرمائیں تاکہ ہماری زبان ٹھیک ہو جائے۔

مودّب لکھنوی جس اعلیٰ معیار کے مرثیے کہتے تھے اُس معیار پر اُن کی مرثیہ خوانی تھی۔ یدرآباد میں پیارے صاحب رشید کے بعد نواب بہرام الدولہ بہادر کی مجالس مودّب صاحب پڑھتے تھے — لکھنوی تہذیب اور روایات کی پاسداری مودّب صاحب کے بعد کوئی اس حد تک نہ کرسکا جس حد تک مودّب لکھنوی کرتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اُن کے بعد گرمیوں میں انگرکھا،

بیل دار دوپلی ٹوپی اور جاڑوں میں شال رومال اوڑھ کر نکلنے والے وضع دار اشراف کی شاید آخری شخصیت مودّب لکھنوی ہی تھے۔

☆☆☆☆☆

بزم آفندی :-

پیدائش ۱۸۶۰ء آگرہ (اکبرآباد)، وفات ۲۳ر مارچ ۱۹۵۳ء (حیدرآباد)۔

نام مرزا عاشق حسین، قلمی نام بزؔم آفندی، ممتاز شاعر، استاد سخن نجؔم آفندی کے والد۔ منیؔر شکوہ آبادی کے بھانجے جن کا سلسلہ مرزا دبیؔر سے ملتا ہے۔— گھر کا ماحول علمی ادبی تھا اس لئے کم عمری میں شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ ابتدا اپنے ماموں منیؔر شکوہ آبادی سے اصلاح لی۔ مرثیے کے علاوہ دوسری اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی لیکن زیادہ تر کلام ضائع ہوا۔ صرف تین کتابیں سامنے آئیں۔

''چراغ بزم'' مطبوعہ ۱۹۰۵ء مجموعہ غزلیات

''ایاغ بزم'' مطبوعہ ۱۹۰۶ء مجموعہ غزلیات

''مجموعہ رباعیات'' وہی کتاب جس میں ''پیری'' کے موضوع پر رباعیات ہیں۔

اُن کے فرزند ارجمند نجؔم آفندی ہجرت کر کے حیدرآباد دکن آگئے تو بزؔم آفندی بھی ۱۹۳۴ء میں حیدرآباد آگئے — مرثیہ گوئی میں مرزا دبیؔر کے زیر اثر، قدیم مرثیے کو لے کر آگے بڑھے لیکن کہیں کہیں چونکا دینے والی جدّت فکر کا اظہار بھی کیا۔ کہا جاتا ہے کہ تقریباً تین سو مرثیے یادگار چھوڑ کر گئے جن میں سے کچھ اُن کے فرزند نجم آفندی کے پاس تھے اور کچھ اُن کے قریبی عزیز سیّد علی رضا کی تحویل میں تھے۔ حضرت نجؔم آفندی بھی اللہ کو پیارے ہوگئے اور سید علی رضا بھی۔ اب کون جانے کہ بزم آفندی مرحوم کا یہ خزانہ کس کے پاس ہوگا کس حال میں ہوگا۔ ہوگا بھی کہ نہیں اب تو ضیاء الحسن موسوی بھی نہیں رہے جنہوں نے تھوڑی بہت نشاندہی کی تھی۔ حال ہی میں دکن کے ممتاز ادیب و شاعر، میرے کرم فرما ڈاکٹر صادق نقوی نے بزؔم آفندی کے پوتے سہیؔل آفندی کے حوالے سے لکھا ہے کہ بزم مرحوم نے ۴۰ مراثی کہے تھے جن میں سے کوئی محفوظ نہیں ہے۔ افسوس، صد افسوس، جس شاعر نے تین سو مرثیے کہے ہوں، جس کا فرزند نہ صرف مرثیہ گو شاعر ہو بلکہ شاعری کا نجؔم آفندی ہو اُس کے پوتے کو صرف اس کے ۴۰ مراثی کا، وہ بھی صرف تعداد کی حد تک علم ہو اور اُس کے مرثیے ڈھونڈھے سے بھی نہ ملیں۔

سہیل آفندی کو اپنے لائق افتخار دادا حضرت بزم آفندی کا جو کلام یاد ہے وہ صرف اتنا ہے ۔

پھر گلشن کلام میں آئی بہار، شکر پھر یہ چمن ہرا ہوا، پروردگار، شکر

پھر نخل طبع لانے لگا برگ و بار، شکر پھر کھلتے جاتے ہیں گل مضموں ہزار، شکر

پھولوں میں بوئے خُلد ہے اور رنگ لال ہے

گلزارِ دہر میں یہ چمن بے مثال ہے

اور دو شعر اور

باپ کے ہاتھ پہ جو کرومیں لیں

فوجیں اس خوف سے فرار ہوئیں

یا

نہیں معلوم کیا ارادہ ہے

اُٹھ نہ بیٹھے امام زادہ ہے

(مرسلہ: اکبر صادق نقوی)

یادش بخیر جب کراچی میں علامہ رشید ترابی زندہ تھے۔ زیڈ۔ اے۔ بخاری، ضیاء الحسن موسوی، اُستاد قمر جلالوی زندہ تھے تو مجھے یاد ہے کہ ایک سے زیادہ مرتبہ بزم آفندی کے کلام کا ذکر ہوا، یہ اُن دنوں کی بات ہے جب علامہ رشید ترابی نے کراچی میں سوز خوانی کا سلسلہ شروع کرایا تھا۔ ضیاء الحسن موسوی نے بتایا تھا کہ وہ حضرت بزم آفندی کا کلام حاصل کر کے محفوظ کرنا چاہتے تھے۔ اور جس حد تک ممکن ہو اسے شائع کرانا چاہتے تھے —— اس "حاصل کرنے" اور "محفوظ کرنے" پر تفصیلی گفتگو بھی مجھے یاد ہے جو یہاں دہرائی نہیں جاسکتی تا آنکہ "خدا مجھے نفس جبرئیل دے تو کہوں" اس وقت صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ تغافل کی ایک داستان ہے۔ اور پھر اچانک ضیاء الحسن موسوی کا انتقال ہو گیا اور اُن کا ارادہ تشنۂ تکمیل رہا اور پھر اس کے بعد حضرت بزم آفندی کے کلام کا پھر کہیں ذکر نہ ہوا — بزم آفندی کے پوتے سہیل آفندی خود مرثیہ گو شاعر ہیں — ہو سکتا ہے وہ "اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند" پر عمل کریں۔ مگر کیسے؟ وہ تو کہتے ہیں کہ اُن کے دادا جان کا سارا کلام تلف ہو چکا ہے۔

☆☆☆☆☆

مقیم نقوی :-

ولادت ۱۸۷۷ء وفات ۱۹۵۶ء

نام سید فیض الحسن، تخلص مقیمؔ، وطن امروہہ سادات۔ ممتاز ذاکرِ اہلبیت سیّد امیر حسن نقوی کے والد۔ مقیمؔ کے دوسرے فرزندار جمند معروف فلم پروڈیوسر ڈائرکٹر نجم نقوی تھے۔ مقیمؔ نے بہت زیادہ مرثیے نہیں کہے مگر جو کہے وہ انہیں مرثیہ گو شعراء میں شمار کرنے کے لئے کافی ہیں۔ ''مرثیہ نگاران امروہہ'' میں ان کے دو مراثی کے حوالے ملتے ہیں۔ ایک مرثیے میں ہر بند کے بعد بیت ایک ہی ردیف اور قافیے میں ہے جو اُن کے مزاج غزل گوئی کی نشاندہی کرتی ہے ۔

ہے ہر جگہ ضیائے ولادت حسینؑ کی شانِ پیمبری ہے امامت حسینؑ کی
اعجازِ انبیاء ہے کرامت، حسینؑ کی مبذول ہے جہاں پہ عنایت حسینؑ کی
منظور ہے خدا کو محبت حسینؑ کی
ہر دل میں جلوہ ریز ہے الفت حسینؑ کی

پیاسے بھی تین دن کے تھے سلطان بحر و بر مردانگی دکھانے لگے رن میں بے خطر
دم میں اُتار ڈالے لعینوں کے تن سے سر ہر اک کی تھا زبان پہ اس وقت الحذر
رن میں عجب طرح تھی شہادت حسینؑ کی
لاکھوں کے دل ہلاتی تھی طاقت حسینؑ کی

شہادت کے ذکر میں بھی مقیمؔ نے بیت کو ایک ہی ردیف قافیے کا پابند رکھا ہے

جسمِ مبارک آپ کا تیروں سے تھا چھدا کب تک کریں گے آپ ہزاروں کا سامنا
باغِ بتول، بادِ خزاں سے اُجڑ گیا تدبیر کیا کرے گی کہ تھا رنگ دوسرا
کی بیکسی نے آ کے رفاقت حسینؑ کی
تھی وقت عصر ہائے شہادت حسینؑ کی

☆☆☆☆☆

طورِ جونپوری:-

ولادت ۱۸۹۱ء، وفات ۱۹۵۶ء۔

حضرت مولانا سیّد سجاد حسین طورؔ جونپوری۔ اُن کے صاحبزادے جناب مہدی ظہیر ضو

کلیمی راوی ہیں کہ اُن کے والد طورؔ جونپوری ۶۵ سال کی عمر میں ۱۹۵۶ء میں نان پارہ ضلع بحرائچ (ہندوستان) میں انتقال کرگئے۔ تاریخ وفات اور عمر کے حساب سے سن ولادت ۱۸۹۱ء بنتا ہے۔ حضرت طورؔ لکھنوی میر انیسؔ کے ایک شاگرد حضرت محسنؔ ذوالقدر کے شاگرد تھے۔ اُن کے ۲۹ مرثیے قلمی شکل میں اُن کے برادر بزرگ مولوی سیّد ابن حسن صاحب۔ ردولی کے پاس محفوظ تھے۔ گویا اگر یہ سرمایہ اشاعت کی منزل تک نہ پہنچا یا اس کاغذ اور قلمی سیاہی کو محفوظ (Preserve) نہ کرایا جاسکا تو ہوسکتا ہے (خاکم بدہن) کلام کا ذکر باقی رہے کلام نہ رہے۔ حضرت ضوؔ کلیمی خود شاعر ہیں۔ اور یہ ۲۹ مرثیے اُن کا ورثہ ہیں خدا کرے یہ خزینہ اُنہیں مل گیا ہو یا مل جائے اور وہ اسے شائع کراسکیں۔

حضرت طورؔ جونپوری کا ایک مرثیہ ۔ ''اے قلم وسعت میدانِ فصاحت دکھلا'' اخبار نظارا کے ابوالفضل عباس نمبر میں شائع ہوا تھا جو ہمیں مل سکا ہے۔ اس مرثیہ کا مطالعہ حضرت طورؔ جونپوری کا کم از کم تعارف کرادیتا ہے۔

اے قلم وسعتِ میدانِ فصاحت دکھلا لطفِ معنی و بیاں حُسنِ بلاغت دکھلا
منبعِ فکرِ رسا ذہن کی جودت دکھلا آج پھر جوش میں ہاں زورِ طبیعت دکھلا
فہمِ مطلب میں نہ ہرگز کوئی ناکام رہے
خاص ہو طرزِ سخن لطف مگر عام رہے

ہے علمدارِ دلاور کی ثنا مدِّ نظر ساقیا بادۂ تسنیم سے بھردے ساغر
میرا ممدوح ہے فرزندِ امیرِ کوثر جس سے ہے باغِ شجاعت کا شجر بارآور
رونق افروز ہے گلزارِ شبابِ عباسؑ
زینتِ گلشنِ عالم ہیں جنابِ عباسؑ

سروِ زیبا و نہالِ چمنِ مرتضویؑ بلبلِ باغِ حسینی گُلِ گلزارِ علیؑ
خوش نوا نغمہ کشِ گلشنِ عالی نسبی ثمرِ نخلِ وفا، حضرتِ عباسؑ جری
سالک و راہروِ منزلِ عرفانِ وفا
خون سے جس کے ہوا سبز گلستانِ وفا

زینتِ باغِ جناں عاشقِ گلروئے حسینؑ ذوالکرم صاحبِ خلقِ حسنؑ وخوئے حسینؑ

زیبِ آغوشِ علی زینت پہلوئے حسینؑ جوہر دستِ خدا قوتِ بازوئے حسینؑ
صدف بحرِ کرم گے در مکنون عباسؑ
فخرِ موسیٰ جو ہیں شبیرؑ تو ہارون عباسؑ

اے زہے مرتبۂ شانِ علمدار حسینؑ فدیۂ صادق فرزند رسول الثقلین
اسداللہ کا لختِ جگر و نورالعین ہجر شبیرؑ میں جس کو نہ رہا دم بھر چین
فدیۂ حضرتِ شاہِ شہدا ہوتے ہیں

☆☆☆☆☆

سیّد شفیق حسن ایلیا:-

ولادت ۱۸۸۵ء۔ وفات ۱۹۵۶ء

امیر حسن امیرؔ کے پوتے، نصیر حسن نصیرؔ کے فرزند، انیس حسن ہلالؔ کے بھائی، سید محمد تقی، رئیسؔ امروہوی، اور جونؔ ایلیا کے والد۔ دردانہ ہاشمی کے دادا۔ اُس گھرانے کے چشم و چراغ جس کے لئے بلا مبالغہ کہا جا سکے کہ ؎ "ایں خانہ ہمہ آفتاب است"۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ عربی، فارسی کی تعلیم اپنے دادا سید امیر حسن امیرؔ سے اور اپنے والد گرامی نصیرؔ حسن نصیرؔ سے پائی مگر شعری سلسلۂ تلمذ سید اولاد حسین سلیمؔ سے جوڑا۔ اُنہیں تمام اوصاف سخن پر قدرت حاصل تھی لیکن کبھی مشاعروں یا ادبی محفلوں میں شرکت نہیں کی۔ شہرت پسند نہیں تھے۔ اُن کی تصانیف کی فہرست طویل ہے۔ ایک زمانہ تھا جب راقم الحروف کراچی میں تھا اور اکثر و بیشتر رئیسؔ امروہوی، سید محمد تقی، اور جونؔ ایلیا سے ملاقاتیں رہتی تھیں، اس وقت حضرت رئیسؔ امروہوی نے بر سبیل تذکرہ کئی بار اپنے والد گرامی کے مرثیوں کے بہت سے بند سنائے۔ راقم الحروف کی کوتاہی کہ کبھی یہ خیال نہ آیا کے لکھ لیا جائے، یہ کوتاہی اس لئے بھی ہوئی کہ رئیس امروہوی (جنہیں ہم بھائی رئیس کہا کرتے تھے) ایسے اشعار اپنی روانی گفتار کے دوران سنایا کرتے تھے اور جب رئیسؔ امروہوی بولتے تھے تو کس کی مجال کہ اُنہیں روک سکے یا ٹوک سکے اشعار نقل کرنا تو ناممکن تھا۔ مراثی کے علاوہ اُن کے شعری مجموعے "معراجِ نفسِ رسول" کا حوالہ بھی ضروری ہے جس میں حمد، نعت، منقبت، ساقی نامہ اور معراج ختمی مرتبت کا تفصیلی بیان شفیق حسن ایلیاؔ کی عظمت فکر اور شعری حکمت کی سند کہا جا سکتا ہے ؎

اوجِ بشر کی شان ہے معراجِ مصطفیٰ قدرت کا امتحان ہے، معراجِ مصطفیٰ

رحمت کا اک نشان ہے، معراج مصطفیٰ اک سیرِ لامکان ہے، معراج مصطفیٰ
درسِ عمل عروج رسولِ خدا کا ہے
انساں کے واسطے یہ سبق ارتقاء کا ہے

منقبت کا انداز ملاحظہ ہو۔

اللہ رے قدر و منزلت و شانِ مرتضیٰ رتبہ نبی کے فیض کا کیا کیا عطا ہوا
معراج شب وہاں تو یہاں دن میں ارتقاء اُن کو براق، ان کے لئے دوشِ مصطفیٰ
وہ نورِ حق رسولؐ زمین و زمن ہوئے
یہ شانِ کردگار ہوئے، بت شکن ہوئے

حیدر نہ تھے تو کوئی نہ شاہد نبی کا تھا بعثت کو انتظار شہودِ وصی کا تھا
احمد کو اشتیاق لقائے علی کا تھا اسلام خواستگار کرم، اس ولی کا تھا
قرآن منتظر تھا لسانِ الٰہ کا
کعبے کو شوقِ دید تھا شانِ الٰہ کا

ہیں مصطفیٰ جو پھول تو اس کی مہک علی وہ درِّ شاہوارِ ہدایت، جھلک علی
حضرت ہیں آفتابِ نبوت، چمک علی یہ حُسن، حسنِ شاہدِ قدرت، نمک علی
احمدؐ ہیں باکمال تو حیدرؑ کمال ہیں
وہ رُخ ہیں اور یہ خالِ رخِ بے مثال ہیں

کوثر ملا نبیؐ کو تو حیدر کو سلسبیل احمدؐ وحی سے، یہ ہوئے الہام سے جلیل
شاگرد ہیں نبیؐ کے علی، ان کے جبرئیل محبوبِ حق جو دعویٰ حق ہیں، تو یہ دلیل
ہے علمِ غیب احمدؐ مرسل کے سہم میں
یہ وارثِ رسولِ خدا، علم و فہم میں

آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی تشریح کر کے شفیق حسن ایلیا نے اس مسدس میں اپنے اشعار کو مدلل اور مستند بنایا ہے۔ معراج کا منظر نامہ اس کی دلیل ہے

سدرہ پہ جلوہ گر جو ہوئے سیدالبشر بولے زبانِ حال سے جبرئیلِ نامور
حد ہے یہی غلام کی یا شاہِ بحر و بر آگے کروں صعود تو جل جائیں بال و پر

عاجز یہاں رفاقت شہ سے غلام ہے
نفسِ نبی کی سیر کا اب یہ مقام ہے
جو حدِ کائنات ہے سدرہ وہی تو ہے ہے جس کے پاس جنت ماویٰ وہی تو ہے
کُرّ وبیاں کی منزلِ اعلیٰ وہی تو ہے کہتے ہیں جس کو مسجد اقصیٰ وہی تو ہے
روح القدس سے بھی سبقت شاہ لے گئے
سدرہ سے ہاتھوں ہاتھ یداللہ لے گئے

سیّد شفیق حسن ایلیآء کے کافی مرثیے ضائع ہوگئے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے وقت انتقال آبادی میں جہاں لاکھوں قیمتی جانیں ضائع ہوئیں وہاں علمی ادبی سرمائے کا بھی ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے لیکن شفیق حسن ایلیا نے مراثی سے زیادہ قیمتی اثاثے کے طور پر اپنے مرثیہ گو فرزندوں کو چھوڑا ہے جن کے علم و بصیرت کا اُجالا بیسویں صدی پر محیط ہے۔

☆☆☆☆☆

شاعر لکھنوی:-

دلات ۱۸۸۹ء۔ وفات ۱۹۵۷ء

مولانا سیّد اولاد حسین عرف للّن صاحب شاعر لکھنوی۔ دعبلِ ہند سیّد فرزند حسین ذاخر کے فرزند ارجمند۔ خاندانِ اجتہاد کے اور علماء کے طبقے سے مرثیہ گو شعراء میں ایک بڑا نام۔ نواب حامد علی خان مرحوم نے اُنہیں ''لسان الواعظین'' کا خطاب دیا۔ شاعر لکھنوی ۱۹۲۱ء میں دربار رامپور سے وابستہ ہوئے۔ ۲۰ سال بعد ملازمت ترک کر کے لکھنؤ چلے گئے۔

خطیب اکبر، لسان الواعظین حضرت مولانا سیّد اولاد حسین عرف للّن صاحب شاعر لکھنوی ایک عالم دین، ایک خطیب، ایک شاعر ہی نہیں تھے بلکہ تاریخ پر بھی اُن کی گہری نظر تھی۔ یہاں تک کہ اُن کے مراثی میں بھی اُن کا علم تاریخ جھلکتا تھا۔۔۔ اُنہوں نے اپنے ایک مرثیے کا عنوان ہی تاریخی مرثیہ رکھا جس میں عزاداری کی تاریخ بیان کی ہے۔۔۔۔ ایک مرثیے میں تاریخ عزاداری کے حوالے سے نور جہاں، چاند بی بی، خان خاناں، عرفی، بہرام فیض اور غفراں مآب کا ذکر کیا ہے۔
اس مرثیے کی ابتدا اس بند سے ہوتی ہے ۔

تھا وہ اک عہد کہ معروف تھے مشہور تھے ہم گوہرِ منتخب دیدۂ جمہور تھے ہم

کہیں سلطاں نہیں حاکم کہیں دستور تھے ہم اور جہاں کچھ بھی نہ تھے کام کے مزدور تھے ہم

صبح سے دھوپ میں ہنگامِ شفق آتا تھا

سائے کے نام سے ماتھے پہ عرق آتا تھا

عزاداری اور بالخصوص تعزیہ داری کی تاریخ جسے عام عزادار بھی نہیں جانتے یا بھول گئے ہیں اس تاریخ کو حضرت شاعر لکھنوی نے اس قادرالکلامی کے ساتھ دہرایا ہے کہ رثا کا بھرپور تاثر بھی رہتا ہے اور امیر تیمور کی تاریخ بھی سامنے آجاتی ہے۔

کوئی تیمور اپا کہے کوئی گدا و مزدور ہم کہیں فاتحِ چین ہو شر بائے فغفور
ایشیا کے سر اقبال کا دیہیم غرور ذرۂ خاک درِ حیدرِ صفدر، تیمور

جس نے شبیرؑ کا غم ہند میں منوایا ہے

تعزیہ، تاج کی جا، سر پہ لئے آیا ہے

انہوں نے دلی میں تعزیہ داری کو دلی میں امام حسینؑ کی آمد کہا ہے اور تاریخ نے امیر تیمور پر جو الزامات لگائے ہیں ان کا ایک مصرع میں جواب دیدیا ہے۔

ایک تربت بنی پھر خاک شفاء کی سر دست زندگی بھر رہا تیمور، مئے عشق میں مست
اپنے ہی دعوے سے ہوتی ہے مورخ کو شکست کون اس کو کہے ظالم جو ہو مظلوم پرست

چتر کا سایہ تھا، تلواروں کے یا سائے تھے

اس طرح ٹھاٹھ سے دلی میں حسینؑ آئے تھے

''کون اس کو کہے ظالم جو ہو مظلوم پرست''۔ اس ایک مصرعے نے برسوں کی لکھی تاریخ کی بساط اُلٹ دی ہے کہ نہیں؟ اسی طرح اُن کا ایک اور مرثیہ ہے جس کا عنوان ہی ''تاریخی مرثیہ'' ہے۔ اس کا ایک بند ملاحظہ کیجئے جس میں حق اور باطل کی قوتوں کا موازنہ بھی ہے اور حق کی قوت یعنی امام حسینؑ کی عظمت فکر و عمل کیسی روشن نظر آتی ہے۔

صادق القول نے بیعت سے جب انکار کیا پسرِ سعد نے افواج کو تیار کیا
شہ نے مطلق نہ غمِ قلتِ انصار کیا شاہ بیٹے کو برادر کو علمدار کیا

باجوں نے واں پسرِ سعد کی توقیر کہی

علی اکبر نے اِدھر جھوم کے تکبیر کہی

خطیب اکبر حضرت شاعرؔ لکھنوی کا زمانہ، جدید مرثیے کا زمانہ تھا۔ ہر مرثیہ گو شاعر ہر نئے مرثیے کو جدید مرثیہ کہتا تھا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ چند شعراء کے علاوہ زیادہ تر مرثیہ گو شعرا، قدیم رنگ میں مرثیے کہہ رہے تھے۔ حضرت شاعرؔ لکھنوی کی طرف سے مرثیے میں پہلی جدّت تاریخی حقائق کو مرثیے میں سمونے کی تھی اور وہ بھی اتنی احتیاط اور اتنے اعتدال کے ساتھ کہ اُن کے مرثیوں میں تاریخی تلخیاں نعرہ نہیں بنیں اور نہ ہی مصلحتوں نے ان حقائق کا گلہ دبایا — اُن کے اپنے جذبات اور عقائد کا جگہ جگہ اظہار ہے مگر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اُنہوں نے اپنے عقائد کی خاطر، سچائی یا تاریخی صداقت میں مبالغہ یا کمی کی ہو۔ یا وہ اپنے گرد قدیم روایات کا حصار کھینچ کر بیٹھ گئے ہوں — اس کے برعکس اُنہوں نے جدید مرثیے کے خاکے میں حتی المقدور جو رنگ بھرے وہ صاف نظر آتے ہیں۔ مندرجہ ذیل بند اُن کی فکر، میزانِ شاعری تلے ہوئے تاریخی واقعات اور سب سے زیادہ اہم شاعرؔ لکھنوی کے لہجے کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں ۔

شہ نے جبریل کے چہرے پہ نظر اک ڈالی — سر اُٹھا کر کہا جو تیری رضا اے والی
بلکیں بانو، ہوں مگر شاد رسولِ عالی — خلد، اُمت سے بھرے، گھر ہو ہمارا خالی
اُمت جدؐ پہ تصدق علی اصغر ہو جائیں
داغ سینے کے اکبر سے بہتر ہو جائیں

پا پیادہ ہوا راہی جو وہ خورشیدِ کرم — دل سے اصغر کو لگائے ہوئے روکے ہوئے دم
کوہ بھی بھولیں ثبات اپنا وہ مضبوط قدم — موت کہتی تھی یہ تمکین ہے! خالق کی قسم
زلزلے آئیں، ہلے عرشِ خدا ممکن ہے
دل شبیرؑ لرز جائے یہ نا ممکن ہے

میرے پیشِ نظر اس وقت صرف مرثیہ ہے، اور مظلوم امام ہیں جو اکبر لاشیں اُٹھانے کے بعد بھی خطبۂ آخر میں (بقول آغا سکندر مہدی مرحوم) فرماتے ہیں ۔

راہ پہ اب بھی جو آجاؤ بحل ہو تقصیر
درگذر خون سے ان سب کے کرے گا شبیر

مولانا شاعرؔ لکھنوی ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ اُنہوں نے بھی امام مظلوم کے سارے رفقاء کی شہادت کے بعد آخری لمحات کو نظم کیا ہے۔

تو مری آل کا ہے فخر یہ کہتے تھے خلیلؑ
اپنے ماتھے سے عرق پونچھتے تھے اسماعیلؑ
چلی آتی تھی یہ آواز خداوند جلیل
بشر ایسے بھی ہوا کرتے ہیں اے میکائیلؑ
درس ہے کرب و بلا چشم بصیرت کے لئے
کہو اب کون مناسب ہے خلافت کے لئے

دیکھئے ایک بار پھر شاعر لکھنوی ایک بیت میں کہاں سے کہاں لے گئے۔ تاریخی واقعات کو مرثیے میں سمو دینا شاعر لکھنوی کی خصوصیت ہے۔

ایک اور منظر ہے کہ امام مظلوم چھ ماہ کے بچے علی اصغر کی قربانی دے چکے ہیں اور اپنے خالق سے کہہ چکے ہیں۔

ساتھی نہیں، عزیز نہیں، میں بھی اب نہیں
بچہ میرا ہے آخری تحفہ قبول کر
(عاشور)

حسینؑ نے تو 'بدیا' "میں بھی اب نہیں"۔ حسینؑ کے چھ ماہ کے بچے کی قربانی اشقیا کی نظر میں صرف ایک اور قتل ہوسکتی ہے لیکن فرش و عرش، چرند، پرند اور ملائکہ تو اس کی عظمت کو سمجھ رہے ہیں۔ فرشتوں کے سامنے تو روز ازل جو ارشاد ربانی ہوا تھا کہ " میں زمین پر اپنا ایک خلیفہ بھیج رہا ہوں" آج امام حسینؑ کا صبر اس ارشاد ربانی کی عملی وضاحت کر رہا تھا اور کائنات کا ذرہ ذرہ دیکھ رہا تھا کہ اللہ کے خلیفہ کی منزل کتنی دشوار ہوتی ہے۔ یہاں شاعر لکھنوی کا ایک بند ملاحظہ کیجیے۔

عرش کہتا تھا بڑھا دی مری رفعت تو نے
خاک کہتی تھی کہ رکھ لی مری عزت تو نے
کعبہ کہتا تھا، مجھے دے دی شرافت تو نے
قول احمدؐ کا تھا چمکا دی رسالت تو نے
علم آدم کا کھلا، جائے مناجات رہی
حق بھی کہتا تھا فرشتوں میں مری بات رہی

حضرت شاعر لکھنوی کا ایک معرکہ آرا مرثیہ "مزدور" ہے۔ میں خود ترقی پسند ہوں، مزدوروں محنت کشوں کا ساتھی ہوں۔ ترقی پسند ادب کی شاعری میرے سامنے ہے اور میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ شاعر لکھنوی نے لفظ مزدور کو جس چابکدستی سے برتا ہے وہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ ہم ترقی پسند ادیب محنت کی عظمت کو مانتے ہیں لیکن شاعر لکھنوی نے عظمت کونین کے

ہاتھ میں تیشہ دیکر اُنہیں ایسا مزدور بنایا جس کی محنت باعث افتخار بشر ہے۔ کتاب کا اختصار پیش نظر نہ ہوتا تو میں یہ سارا مرثیہ یہاں نقل کرنا چاہتا تھا۔

فاقہ کش بھی تھے نبی، فاتح و منصور بھی تھے　　عزت خاک بھی تھے، مطلع والنور بھی تھے
ان کے گھر دولت کونین سے معمور بھی تھے　　حق کے محبوب بھی تھے خلق کے مزدور بھی تھے
ہو اشارہ تو قمر شق ہو، رسالت ایسی
سنگ خندق سے اُٹھاتے ہیں مشقت ایسی

کاٹتے جاتے ہیں خندق میں زمینوں کے طبق　　رنگ رخسار کہ کھلتے ہوئے لالے کا ورق
بے کتاب اہل عمل کے لئے محنت کا سبق　　تخم تھا عزتِ مزدور کا ماتھے پہ عرق
تھا یہ مقصد کہ عرق میں سر و سینہ بھیگے
پھر نہ مزدور کا دنیا میں سفینہ ڈوبے

سیم و زر، کان سے لایا ہوا مزدور کا ہے　　ہیرا پتھر تھا، بنایا ہوا مزدور کا ہے
نقد اقبال لُٹایا ہوا مزدور کا ہے　　تخت طاؤس بچھایا ہوا مزدور کا ہے
بادشاہ کون سا اس ذات کا محتاج نہیں
خون مزدور ہے یہ لعل سرتاج نہیں

اسی مزاج اور اسلوب کے ۱۲ اشعار کے بعد گریز کی طرف بڑھنا

گلہ بانوں کے تھے سردار، لقب جن کا خلیل　　پیشوا اہل تجارت کے، کسانوں کے کفیل
آخرت میں بھی جہاں میں بھی سرافراز و جلیل　　ان کے مہماں کبھی جبریل کبھی میکائیل
مہماں دوست بھی خوش خُلق بھی، طبّاع بھی تھے
ریگ کو آردِ گندم کیا صنّاع بھی تھے

اس مرثیہ کا سلسلہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ، حضور نبی کریمؐ، حضرت علیؑ، سیدہ فاطمہ زہرا سے کربلا تک جاتا ہے — یہ مرثیہ ۸۸ بند پر مشتمل ہے۔ رثائی ادب میں مزدور اور مزدوری کی اتنی جہتیں دریافت کرنا تخلیق کرنا شاعر لکھنوی کے کلام کو تابانی بخشتا ہے۔

ڈاکٹر ہلال نقوی راوی ہیں کہ شاعر لکھنوی کے فرزند ارجمند شمس الدین تاجؔ کے پاس شاعر صاحب کے کچھ مرثیے، خستہ حالت میں، موجود تھے۔ یہ ۱۹۸۰ء کی بات ہے اب تو نہ جانے

کیا حال ہوگا۔ کہیں سے یہ بھی نہیں سنا کہ یہ چھ مرثیے شائع ہوگئے ہیں۔ میں بار بار اس بات کو دُھرا رہا ہوں کہ ہمارے کتب خانوں میں شاید ہی مخطوطات کی حفاظت کا سائنسی انتظام ہو اسی لئے ہمارے مخطوطات یعنی ہمارا سرمایہ ضائع ہو رہا ہے۔ خدارا کوئی آگے بڑھے، میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے کو تیار ہوں۔

☆☆☆☆☆

ذاکر نقوی امروہوی:-

ولادت ۱۸۸۱ء۔ وفات مئی ۱۹۵۸ء

نام سید تبارک حسین، تخلص ذاکر، نقوی سید، وطن امروہہ سادات۔ مرثیہ نگاری کا مقصد صرف حصول ثواب تھا اس لئے کہ باقاعدہ ایک پختہ شاعر ہونے کے باوجود مدح اہلبیت کے علاوہ کسی اور صنف میں شاعری نہ کی۔ ایسا لگتا ہے کہ ذاکر اس ازلی صداقت کو پہچان گئے تھے کہ جن کی مدح کو بقا ہو اُن کی مدح کے بعد کسی فانی کی مدح کرنا خردمندی نہیں ہے۔ سید تبارک حسین ذاکر کے فرزند فاضل امروہوی نے علم پدر تو سیکھا یعنی شاعری کی مگر افسوس کہ میراث پدر کی حفاظت نہ کر سکے۔ عظیم امروہوی نے بڑے دکھ کے ساتھ لکھا ہے کہ جس وقت حضرت ذاکر امروہوی کا انتقال ہوا اس وقت فاضل امروہوی لکھنؤ میں تھے اور کوئی دوسرا اُن کا بستہ لینے والا امروہہ میں نہیں تھا لہٰذا ذاکر امروہوی کا بستہ "حسینیہ دربار شاہ ولایت" میں رکھوا دیا گیا جہاں نمی کے سبب اُن کا کلام ضائع ہو گیا۔

اللہ رے مسائل زندگی۔ لکھنؤ سے امروہہ کتنی صدیوں کا سفر تھا کہ بیٹا اپنے باپ کے اثاثے کو لانے کے لئے امروہہ نہ جا سکا اور وہ اثاثہ ضائع ہو گیا۔

"مرثیہ نگارانِ امروہہ" کی اشاعت ۱۹۷۸ء میں ہوئی۔ گویا اس وقت ذاکر نقوی کے انتقال کو کل بیس برس ہوئے تھے۔ اس عرصے میں ایک طرف تو اولاد کی توجہ باپ کے اثاثے کی طرف مبذول نہ ہوئی اور دوسری طرف "دربار شاہ ولایت" جیسے جیتے جاگتے مرکز میں جو گہوارۂ علم وادب ہے اور مرثیہ کی قدر و منزلت سے آگاہ شخصیات کے زیر انصرام ہے وہاں ایک بستہ ضائع ہو جائے یہ ایک حیرت انگیز صورت حال ہے۔

☆☆☆☆☆

مرزا عروج بھرتپوری:- (کراچی)

ولادت ۱۸۸۳ء۔ وفات ۲۶ر مارچ ۱۹۵۸ء

نام مرزا غضنفر حسین، تخلص عروؔج، وطن بھرت پور۔ تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۷ء میں کراچی آگئے۔ کراچی میں مرثیہ گوئی کے حوالے سے اُن کا پہلا تعارف اُن کا ایک مرثیہ بنا جو انہوں نے ۱۹۵۰ء میں کہا۔ اس مرثیے میں انہوں نے ان سماجی اور تہذیبی حتیٰ کہ ادب میں تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے جو بھرتپور تا سندھ وکراچی تک کے سفر میں ان کے مشاہدے میں آئیں۔ عروؔج کا یہ مرثیہ یقیناً مرثیہ کی اقدار کی پابندی کے باوجود جدید مرثیہ ہے جس میں عصرِ حاضر کا مشاہدہ اور اسلوبِ بیان نمایاں ہے۔

قوم کی فکر ہوئی ان کو مگر سب سے شتاب مل گئی بننے کی ترکیب اُنہیں یہ نایاب
ہند میں شاہ، فقیروں کا ہے مشہور خطاب سندھ میں کہتے ہیں سادات کو سب شیخ و شاب
چھوڑ کر ذات فقیری کی، بڑی بات ملی
ایک ہی لفظ میں شاہی ملی، سادات ملی

مختصر یہ کہ ہوئی ایسی ترقی اکثر شاعری کی بھی ہے تقدیر سے حالت ابتر
نام رکھتے ہیں جدید اس کا جو ہیں اہلِ ہنر بحریں دریائے جہالت میں ڈبودیں اکثر
اُلفت غیر میں، ہر سازِ معانی پھیرا
علم پر اپنے بزرگوں کے یہ پانی پھیرا

اس تنزل پہ دکھایا ہے مگر کچھ نے کمال پڑھ کے کچھ اُردو کتابیں ہوئے عالم فی الحال
علم والوں میں نہیں ملتی ہے اب ان کی مثال طرزِ غالبؔ میں دیا سیکڑوں الفاظ کو ڈھال
جودتِ طبع سے ہر بات کی آزادی ہے
نہیں شاگرد کسی کے بھی اُستادی ہے

مرثیہ ہے اسے قصے سے نہ کیجئے تعبیر نظم و افسانہ نہیں ذکرِ امام دلگیر
قاعدے اس کے مقرر ہیں برائے تحریر ضبط فرما گئے ہیں جن کو انیسؔ اور دبیرؔ
شاعری اس کی جُدا، اُس کی مضامین الگ
یہ خدائی سے جُدا، اس کے ہیں آئین الگ

نوحہ گوئی کا بھی اس دور میں بگڑا ہے نظام نام نوحہ ہے مگر اصل میں ترکیب سلام
نہ مضامین کا تسلسل ہے نہ ترتیب کلام بات رقت کی ہے کوئی نہ کوئی غم کا مقام

ایسے دیکھے نہ سُنے زار و حزیں کے نوحے
مٹ گئے اُن کی عنایت سے متیں کے نوحے

ڈاکٹر بلال نقوی نے عروجؔ کے ایک مرثیے کے سرورق کی نقل بھی شائع کی ہے جس پر درج ذیل تحریر ہے۔ ''جلوہ فگن ہوا جو رخِ زرنگارِ صبح'' بحالِ پُر ملال حضرت امام حسین علیہ السلام بتاریخ ۶ محرم الحرام ۱۳۷۲ھ مطابق ۲۸ ستمبر ۱۹۵۲ء، در گولی مار کراچی۔ مصنفہ احقر الکونین یوسف مرزا غضنفر حسین متخلص عروجؔ بھرتپوری۔

عروجؔ غزل گوئی میں شاگردِ ذوق حضرت ظہیرؔ دہلوی کے شاگرد تھے اور مرثیہ گوئی میں میر محمد علی عارفؔ لکھنوی سے سلسلۂ تلمذ وابستہ تھا۔

دبستانِ کراچی میں مرثیہ گوئی کے جو چراغ روشن ہوئے اُن کی روشنی دو حصوں میں منقسم تھی یعنی ایک طرف جدید مرثیے کا علم لے کر چلنے والے تھے تو اس کے شانہ بشانہ روایتی اور تقلیدی مرثیہ بھی پوری آن بان سے پروان چڑھ رہا تھا۔ اس روایت کی پاسداری کرنے والوں میں جہاں استاد قمرؔ جلالوی، سالکؔ نقوی، نفیسؔ فتح پوری اور میر رضی میرؔ کے نام آتے ہیں وہاں غضنفر حسین عروجؔ بھی اس کارواں میں شریک اور نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ زود گو اور پختہ کار شاعر ہیں۔ مرثیے میں بے ساختہ پن اور روانی ہے لیکن دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مرثیہ گوئی میں جس اہمیت کے وہ مستحق تھے انہیں وہ اہمیت اور پذیرائی نہیں دی گئی۔ اُن کے ایک مرثیے کے درج بالا چند بند اس بات کی واضح نشان دہی کر رہے ہیں کہ عروج صاحب کو فنِ مرثیہ گوئی پر بھی دسترس حاصل ہے اور وہ سوز و سلام کے اس فرق تک کو جانتے ہیں جو شاید عام شعرا کے علم میں نہ ہو۔

عروجؔ کے سارے مرثیے غیر مطبوعہ رہ گئے ہیں۔ ۱۸ مراثی فیض بھرتپوری کے ذخیرۂ مراثی میں موجود ہیں۔ ایک مرثیہ (اُن کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا) اور ایک خط بنام میر عارفؔ (عروج کی اپنی تحریر میں) علامہ ضمیر اختر نقوی کے ذخیرۂ مراثی میں محفوظ بتایا جاتا ہے۔ مراثی فیض بھرت پوری مطبوعہ ۱۹۷۹ء میں غضنفر حسین عروجؔ کے ۱۸ مراثی کے مصرع ہائے اولیٰ درج کیے گئے ہیں۔ سید یاد علی جعفری نے راجستھان میں اُردو مرثیہ'' مطبوعہ ۱۹۹۹ء (دہلی) میں بھی ۱۸

مرثیوں کے مصرعہ ہائے اولیٰ درج کئے ہیں مگر قطعاً یہ حوالہ نہیں دیا کہ خبر کا ماخذ کیا ہے — بہر حال عروجؔ بھرتپوری کے ۱۸ مراثی کا حوالہ درج ذیل ہے۔ اُن کے سارے مرثیے غیر مطبوعہ ہیں۔

۱۔	زمزمہ سنج ہے پھر بلبل شیدائے حسینؑ	درحال حضرات عون ومحمدؑ
۲۔	نغمہ پرداز ہے پھر بلبل بستان حسینؑ	درحال حضرات عون ومحمدؑ
۳۔	کربلا میں جو نمایاں شب عاشور ہوئی	درحال حضرات عون ومحمدؑ
۴۔	عالم افروز ہوا جب رخِ تابانِ سحر	درحال حضرت قاسمؑ
۵۔	ہے نشاں دین کا دنیا میں ثنائے عباسؑ	درحال حضرت عباسؑ
۶۔	یاد آتی ہے ضعیفی میں جوانی مجھ کو	درحال حضرت علی اکبرؑ
۷۔	سبق آموزِ زمانہ ہے وفاداریِ حرؑ	درحال حضرت حرؑ
۸۔	دن گذر کر جو نویں کا شب عاشور ہوئی	بیان شب عاشور
۹۔	مداح اہلبیت رسول خدا ہوں میں	
۱۰۔	گلگونہ بہار چمن ہے سخن مرا	
۱۱۔	سدا بہار بنا ہے مرا ریاض سخن	
۱۲۔	جلوہ فگن ہوا جو رخِ زرنگارِ صبح	درحال حضرت امام حسینؑ
۱۳۔	پایا ہے شرف ہم نے بھی قسمت سے زیادہ	درحال حضرت امام حسینؑ
۱۴۔	حسن تخلیق دو عالم ہے مشیت اس کی	درحال حضرت امام حسینؑ
۱۵۔	جب طے کیا مدار فلک ماہتاب نے	جملہ شہدائے کربلا
۱۶۔	کربلا سے جو وطن میں شہ والا پہنچے	بحال زعفر جنؑ
۱۷۔	داخل ہوئے جو اہل حرم ملکِ شام میں	
۱۸۔	لوگ کہتے ہیں ترقی کا زمانہ ہے آج	

مرزا عروج بھرت پوری کی مشہور تصنیف ''عروج المجالس'' ہے جو دس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی کچھ جلدیں علامہ طالب جوہری کے کتب خانے میں موجود بتائی جاتی ہیں۔ ایک ناول ''یوسف گم گشتہ'' بھی ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا تھا — غضنفر حسینؔ عروجؔ نے ہندی زبان میں بھی شاعری کی ہے — فیض بھرت پوری رقم طراز ہیں کہ جب ریاست بھرت پور میں عدالتی زبان اُردو کی

بجائے ہندی کو قرار دیا تو عروجؔ نے ہندی زبان میں ایک قصیدہ لکھ کر مہاراجہ بھرتیور کو اس دعوے کے ساتھ پیش کیا کہ اگر کوئی ریاست کا ہندو اس سے بہتر ہندی میں لکھ دے تو عدالتی زبان ہندی رکھو ورنہ اُردو کر دو — اور خود پاکستان چلے آئے۔

☆☆☆☆☆

صبا لکھنوی:-

ولادت ۵ رنومبر ۱۹۰۷ء ۔ وفات ۱۹۵۹ء

اسم گرامی سید حیدر حسینؑ۔ والد محترم سید باسط حسینؑ۔ سادات رضوی۔ ابتدائی تعلیم لکھنو میں ہوئی۔ کل تعلیم انٹر تک تھی۔ لکھنو کے ادبی اور شعری ماحول نے حیدر حسینؑ پر جو اثرات مرتب کئے وہ شعر گوئی کی سوجھ بوجھ تھی۔ آغاز شباب میں حضرت محشرؔ لکھنوی ہی کے شاگرد ہو گئے اور غزل، سلام، نوحہ، رباعی اور مرثیے میں طبع آزمائی کی۔

صباؔ لکھنوی کے چار مجموعے ''چمنستان صبا'' ''افکار صبا'' وغیرہ شائع ہوئے لیکن بدقسمتی سے مرثیے اور قصائد غیر مطبوعہ رہے۔ ۱۹۵۱ء میں صباؔ کراچی آ گئے۔ کراچی میں اس وقت مرثیہ کا ماحول بن چکا تھا۔ صباؔ لکھنوی بھی اس سے متاثر ہوئے اور ۱۹۵۳ء میں انہوں نے پہلا مرثیہ کہا مرثیہ ایرانیان کی محفل میں پڑھا تو بہت پذیرائی ہوئی اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ اُنہوں نے یکے بعد دیگرے سات مرثیے کہے—

صبا کا ایک مرثیہ ۔ ''اسلام کی جبیں کا ستارا حسینؑ ہے'' بہت مقبول ہوا۔ اس مرثیے کے چہرے میں امام حسینؑ کا تعارف، اس کے بعد مدینے سے کربلا تک کا سفر نظم کیا ہے چند بند ملاحظہ کیجئے۔

جس سے نمود و نام حقیقت ہے وہ حسینؑ قبضے میں جس کے جوہر فطرت ہے وہ حسینؑ
جو وجہِ اعتبارِ مشیت ہے وہ حسینؑ ہاں جو اُمید گلشنِ جنت ہے وہ حسینؑ
جس کی شہادت آج بنا آبرو کی ہے
اسلام میں بہار اُسی کے لہو کی ہے

جس نے قدم کے سامنے منزل کو رکھ دیا جس نے میانِ تیغ و سناں، دل کو رکھ دیا
حل کر کے جس نے عشق کی مشکل کو رکھ دیا وہ جس نے کاٹ کر رگِ باطل کو رکھ دیا

دنیا کا ذرہ ذرہ حق آگاہ ہوگیا
اللہ جس کی ذات سے اللہ ہوگیا

اہل نظر کے لئے تو صباؔ لکھنوی کے دو مصرعے ہی اُنہیں صف اوّل کا شاعر اور کامیاب مرثیہ گو قرار دینے کے لئے کافی ہیں ؎

جس نے قدم کے سامنے منزل کو رکھدیا
جس نے میانِ تیغ و سناں، دل کو رکھ دیا

صاحبو۔ میں خود ٹوٹے پھوٹے شعر کہتا ہوں اور میری رائے ہی نہیں میرا مشاہدہ ہے بلکہ یہ کیفیت مجھ پر کئی بار گذری ہے کہ نعت، منقبت، سلام اور مرثیہ اگر توفیق ایزدی کیساتھ کہا جائے تو کلام میں بیساختہ پن بھی ہوتا ہے اور الفاظ میں اثر بھی اور اگر آورد ہو تو ''نہر پر چل رہی ہے پن چکی'' والی بات ہوتی ہے — میں خود کئی بار توفیق ایزدی کی منزل سے گذرا ہوں اور آمد و آورد کے فرق کو سمجھتا ہوں — لندن میں دس پندرہ سال پہلے جب ہمیں ہائیڈ پارک کارنر، لندن سے امام حسینؑ کے چہلم کا جلوس نکالنے کی پہلی بار اجازت ملی تو لوگ جوش و خروش کے ساتھ جلوس میں شرکت کے لئے نہ صرف لندن بلکہ برطانیہ کے دوسرے شہروں سے بھی آئے۔ لندن کا ہائیڈ پارک کم و بیش ساری دنیا میں مشہور ہے۔ ہر وقت سیاح اس پارک میں نظر آتے ہیں — ایسی عالمی شہرت کی جگہ سے امام حسینؑ کا جلوس نکالنے کی اجازت ملنی آسان نہ تھی چنانچہ بڑے اہتمام سے علم سجائے گئے۔ وہ لمحہ میں زندگی بھر نہ بھولوں گا جب پہلا علم زمین سے بلند کیا گیا تو بیساختہ میری زبان پر ایک شعر آیا ؎

زہراؑ تیری دعا ہے، زینبؑ تیرا کرم ہے
لندن کی سرزمیں پر عباسؑ کا علم ہے

میں نے خاصی بلند آواز میں یہ شعر کچھ ایسی روانی سے پڑھا کہ کچھ لمحے تو میں بھی سوچتا رہا کہ یہ کس کا شعر ہے، اس جلوس کے منتظمین میں اظہار حیدر اور مولانا سبزداری صاحب کے ساتھ میں بھی شریک تھا۔ جونہی میری زبان سے یہ شعر نکلا، اظہار حیدر اور مولانا نے پوچھا کس کا شعر ہے یہ؟ کیسا برمحل ہے۔ میں ابھی اس شعر میں کھویا ہوا تھا۔ میں کہا شاید میرا ہی ہے۔ پھر اس کے بعد میں نے پورا نوحہ کہا۔ لندن کے علاوہ جہاں جہاں یہ نوحہ پڑھا جاتا ہے وہاں وہاں لوگوں کی فرمائش

پر میں نے خود مصرعے بدلے ہیں۔ "یورپ کی سرزمیں پر عباسؑ کا علم ہے" یا "ہر خطۂ زمیں پر عباسؑ کا علم ہے" لیکن دل آج بھی یہی کہتا ہے کہ ۔

زہراؑ تیری دعا ہے زینبؑ تیرا کرم ہے
لندن کی سرزمیں پر عباسؑ کا علم ہے

اسی طرح امام حسینؑ کے لئے کہا ہوا صبا لکھنوی کا ایک شعر میرے جسم کے روئیں روئیں میں اُتر گیا ہے ۔

جس نے قدم کے سامنے منزل کو رکھ دیا
جس نے میانِ تیغ و سناں دل کو رکھ دیا

اس کے بعد حضرت صبا لکھنوی کے لئے کچھ اور نہ بھی کہا جائے تو ان کی شہرت اور ان کی نجات کے لئے مذکورہ بالا شعر کافی ہے ——

ان کے چند اور اشعار میسّر ہوئے ہیں جن میں آپ کو شریک کرنا چاہتا ہوں۔

ایمان کو جو اصل میں ایمان کر گیا دینِ خدا پہ مٹ کے جو احسان کر گیا
جو مشکلیں رسولؐ کی آسان کر گیا اپنے لہو کو حق کا نگہبان کر گیا
تا حشر چہرہ دار حسینیؑ جلال ہے
دیکھے کوئی اُٹھا کے نظر کیا مجال ہے

جدید مرثیے کے سفر میں واقعات کربلا، اور تاریخ کو شاعرانہ مبالغہ سے بچا کر نظم کرنے کی جو کوششیں ہو رہی تھیں صبا لکھنوی کو اس صورت حال کا پورا ادراک تھا— یہی وجہ ہے کہ ان کے مرثیوں میں صورت حال کی وضاحت استدلال اور اعتدال کے ساتھ ہوتی ہے۔ مدینے سے کربلا تک کے سفر میں امام حسینؑ لوگوں کو اپنے ہمراہ آنے سے روکتے رہے اور کہتے رہے کہ وہ جنگ کے لئے نہیں شہادت کے لئے جا رہے ہیں۔ اس صورت حال پر صبا لکھنوی نے کئی بند کہے ہیں اور آخری بند میں گویا استدلال مکمل کر دیا ہے۔

انجام اس سفر کا بتاتے ہوئے چلے غیروں کو ہمرہی سے ہٹاتے ہوئے چلے
صبر و رضا کی شان دکھاتے ہوئے چلے زور اپنا ہر قدم پہ گھٹاتے ہوئے چلے

کیا تخت و تاج لینے کا عنوان ہے یہی
اے اہلِ ہوش جنگ کا سامان ہے یہی؟

واقعاتِ کربلا میں یزیدی افواج کی طرف سے شر کی ابتدا تو وہاں ہوئی تھی جہاں حُر کے لشکر نے امام حسینؑ کا راستہ روکا تھا۔ اور حسینؑ کی دریا دلی یہ تھی کہ حرؑ کے پیاس سے نڈھال لشکر کو تہہ تیغ کرنے کی بجائے اُنہیں پانی پلا کر تازہ دم کر دیا اور یہی لشکر پھر امام حسینؑ کے مختصر قافلے کو اپنے گھیرے میں لے کر کربلا تک لایا۔ عباسؑ جری دیکھ رہے ہیں اور حکمِ امام کے سامنے چُپ ہیں۔ قدم قدم پر امام حسینؑ یہی کہتے تھے عباسؑ ہمیں جنگ میں ابتدا نہیں کرنی ہے۔ اور ۲ محرم کی رات کو ایک بار پھر یزیدی لشکر نے شر کی ابتدا کی۔ واقعہ کی تفصیل ''مرثیہ نظم کی اصناف میں'' یوں درج ہے:

کربلا کا میدان، ساداتِ بنی ہاشم کا قافلہ دریائے فرات کے کنارے خیمہ زن ہے۔ حسینؑ ابن علیؑ اس قافلے کے میرِ کارواں ہیں۔ حسینؑ کے بھائی، قمر بنی ہاشم عباس ابنِ علیؑ خیموں کی نگہبانی کر رہے ہیں۔ عباس کی شجاعت پوری دنیائے عرب میں ضرب المثل تھی اور ہے۔

۲ محرم الحرام۔ خیموں کے باہر ایک شور سا بلند ہوتا ہے اور عباس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ''کس کی ماں نے اسے دودھ پلایا ہے جو میرے آقا حسینؑ کے خیمے دریا کی ترائی سے اُٹھوا سکے'' سیدہ زینبؑ نے اپنے غیور بھائی کی آواز سنی تو خادمہ کو حالات جاننے کے لئے بھیجا۔ فضہ نے آکر بتایا کہ یزید کی فوج نے سادات کے خیموں کو دریا کی ترائی سے ہٹانے کا مطالبہ کیا تھا، شہزادہ عباسؑ نے فوج کو للکارا ہے۔ بی بی کسی لحہ بھی عباس کی تلوار نیام سے باہر آسکتی ہے۔

زینبؑ گھبرا کر اپنے ماں جائے حسینؑ کے خیمے کی طرف دوڑیں۔ ''بھیا۔ آپ یہاں بیٹھے ہیں اور عباس کا ہاتھ تلوار کے قبضے تک پہنچ چکا ہے''۔۔۔۔۔ حسینؑ نے غیظ و غضب میں ڈوبے ہوئے عباسؑ کو بلایا اور وجہ دریافت کی۔

''میرے آقا، میرے جیتے جی کس کی یہ مجال کہ آپ کے خیمے

دریائی ترائی سے ہٹانے کا لفظ اپنی نجس زبان پر لائے۔ میں ان کی زباں میں قلم کردوں گا مولا"

حسینؑ نے بپھرے ہوئے شیر کو دیکھا اور بہت نرمی سے کہا۔

"خیمے ہٹالو عباسؑ۔ ہمیں لڑائی میں ابتدا نہیں کرنی ہے" اور وہ عباسؑ جس کی رگوں میں فاتح خندق و خیبر کا لہو گردش کر رہا تھا۔ وہ عباسؑ جس کی ایک گرج پر پوری فوج لرزہ براندام سوچ رہی تھی کہ اب کیا ہوگا۔ وہی عباسؑ سر جھکائے ہوئے حسینؑ کے خیمے سے باہر آئے اور فوج سے کہا۔

"میرے آقا کا حکم ہے، خیمے ہٹالیے جائیں گے۔"

(مرثیہ نظم کی اصناف میں۔ ص ۷)

اس تاریخی واقعہ کو صباؔ لکھنوی نے یوں نظم کیا ہے ۔

مجبور ہو کے حکم امام انام سے خاموش ہوگیا وہ جری دل سنبھال کے
پاس ادب سے لب بھی ہلائے نہ شیر نے عباس دیکھتے ہی رہے خیمے اُٹھ گئے
اے اہل ہوش جنگ کا انداز ہے یہی ؟
کیا تخت و تاج لینے کا آغاز ہے یہی؟

رثائی ادب کراچی کے اکیسویں شمارے میں امریکہ سے صباؔ لکھنوی کے فرزند ارجمند باقر صبا ارشد کا ایک مکتوب دیکھ کر ایک طمانیت کا احساس ہوا کہ مرحوم کے فرزند کو میراث پدر کا احساس ہے۔ اس مضمون میں اپنی یادداشتوں کے حوالے سے باقر صبا ارشد نے کچھ معلومات بہم پہنچائی ہیں جو نئی تو نہیں ہیں لیکن اُن کی تحریر کے ضابطے میں آنے کے بعد تصدیق مزید ہوگئی ہے۔ اُنہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد سفر ہجرت کے دوران موناباؤ جنکشن کھوکرا پار پر صباؔ لکھنوی کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تخلیقات سے بھرے ہوئے دو صندوق ساز و سامان سمیت لوٹ لئے گئے تھے۔ ان صندوقوں میں دو دیوانوں کے قلمی نسخے بھی تھے۔

ڈاکٹر باقر صبا ارشد نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ اپنے والد کا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام ڈھونڈ رہے ہیں اور اطلاع دی ہے کہ صباؔ لکھنوی کی دو کتابیں "باغ دلکش" اور "شہید غم" جو لکھنؤ سے شائع ہوئی تھیں وہ جناب نجم الدین نقوی مصطفیٰ آبادی کی اہلیہ شمسو بیگم صاحبہ کے "پاندان"

سے برآمد ہوئیں جو باقر صبا ارشد کو تحفے میں عنایت کردی گئی ہیں۔

باقر صبا ارشد کا یہ انہماک خوش آئند ہے۔ یقیناوہ صبا لکھنوی کے شاعری کے کچھ ایسے پہلو سامنے لائیں گے جو ابھی تک ہم ایسے غریب الوطن قارئین تک نہیں پہنچے۔ انہوں نے صبا لکھنوی کے ''تصویر سخن'' اور'' مجموعہ قصائد'' کا ذکر بھی کیا ہے یہ مجموعے ۱۹۳۸ء کے لگ بھگ لکھنؤ سے شائع ہوئے تھے۔

☆☆☆☆☆

تبسم پھرسری:-

ولادت، ۱۳/رجب ۱۳۳۹ھ(۱۹۲۰ء)وفات، ۱۲/ربیع اول ۱۳۷۸ھ(۱۹۵۸)

نام سید علی ناصر جعفری۔ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں زندگی کے کل ۳۸ سال عنایت کیئے۔ دیگر اصناف سخن سے زیادہ اُنہیں مرثیے سے لگاؤ تھا۔ ان کے دو مرثیے ''اشک تبسم'' کے نام سے کراچی میں شائع ہوئے ہیں— مکتب انیس سے تعلق رکھتے تھے۔ مرثیہ کے ارتقاء میں کوئی نمایاں کام نہ کرسکے شاید اس لئے کہ عمر نے وفانہ کی اور مرثیہ گوئی کی اس منزل تک نہ پہنچ پائے تھے جہاں شعورِ بشر حال سے مطمئن ہوکر مستقبل کا لائحہ عمل بناتا ہے اور مرثیہ آج کے دن آنیوالے کل کی کمائی ہے۔ اشعار میں روانی اس بات کی مقتضی ہے کہ وقت ملتا تو کچھ اور جوہر کھلتے۔ ایک مرثیے کے چند بند میسّر ہوئے ہیں جنہیں پڑھ کر اُن کے اُس روشن اور کامیاب مستقبل کے نشانات ملتے ہیں جو انہیں نہیں مل سکا۔ اُن کے دو مراثی کے مصرعہ ہائے اولیٰ یہ ہے۔

(۱) ہاں اے زبانِ فکر فصاحت بیاں ہو آج　　دراحول علی اکبر

(۲) کر گیا نام وفا میں حُر غازی اپنا　　دراحوال حضرت حر

اُن کے پہلے مرثیے کے تین بند درج ذیل ہیں۔

ہاں اے زبانِ فکر فصاحت بیاں ہو آج　　رازِ سخن جو دل میں نہاں ہے عیاں ہو آج
میرے چمن کا ہر گلِ تر زرفشاں ہو آج　　کاغذ بھی مثلِ تختۂ باغِ جناں ہو آج
جو گل کھلے وہ رشکِ دو بوستاں بنے
ثمرہ مرے ریاض کا باغِ جناں بنے

اہلِ سخن میں آج ہو بالا مرا سخن بندش ہو گر نئی تو مضامیں نہ ہوں کہن
طوطی مرے کلام کا بولے چمن چمن لطفِ بیاں ہو نغمۂ بلبل پہ طعنہ زن
سکّہ جمے جہان پہ نظمِ نفیس کا
حاسد کو شک بھی ہو تو کلامِ انیس کا

معنی کے نور سے ہو ہر اک حرف ضو فشاں ہر لفظ پر ہو گوہرِ شاداب کا گماں
ہو آب و تاب نظم سے ہر اک پہ یہ عیاں مصرعہ نہیں یہ چرخِ بریں پر ہے کہکشاں
جودت سے تیری ایسا طبیعت میں جوش ہو
ہر ایک بند اک سبد گل فروش ہو

☆☆☆☆☆

سیّد علی اکبر کاظمی:- (عظیم آباد)

ولادت ۱۹۰۱ء وفات ۱۹۵۹ء

وطن عظیم آباد (پٹنہ) صوبہ بہار۔ سید علی اکبر کاظمی پاکستان میں مقیم مرثیے کے ممتاز نقاد پروفیسر محمد رضا کاظمی کے حقیقی چچا تھے۔ کیمرج یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ۔ جب ریٹائر ہوئے اس وقت ہندوستان میں ڈائریکٹر محکمہ تعلیمات کے منصب پر فائز تھے۔ تحت اللفظ مرثیہ خوانی میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ ہو سکتا ہے اُن کا ذوقِ مرثیہ خوانی ہی اُن کی مرثیہ گوئی کی تحریک بنا ہو۔ اُنہوں نے صرف دو مرثیے کہے ہیں جو پروفیسر محمد رضا کاظمی کے ذخیرہ مراثی میں محفوظ ہیں۔ یہ دونوں مراثی غیر مطبوعہ ہیں ۔

(۱) آج ہر دل پہ عجب غم کی گھٹا چھائی ہے۔

(۲) وقت کٹنے لگا مشکل سے جو بیماری میں۔

(جدید اُردو مرثیہ۔ محمد رضا کاظمی۔ مکتبۂ ادب کراچی۔ ۱۹۸۱ء ص ۲۹۳)

علی اکبر کاظمی کے دوسرے مرثیے کے متعلق ہلال نقوی لکھتے ہیں کہ یہ مرثیہ اُن کے (ہلال نقوی کے) ذخیرہ مراثی میں موجود ہے جس پر ۱۶/ اکتوبر ۱۹۵۹ء کی تاریخ میں جمیل مظہری کی یہ تحریر موجود ہے:

''مرثیہ نو تصنیف دراحوال علی اکبر علیہ السلام از برادر محترم

سید علی اکبر اعلیٰ اللہ مقامہ، جسے موصوف نے اپنی وفات سے دو ہفتے پہلے بستر مرگ پر تمام کیا اور ازراہ ذرّہ نوازی مجھے ایک نظر دیکھ لینے کی غرض سے عنایت فرمایا۔ مرثیے کا نسخہ علی اکبر کاظمی کے حقیقی بھتیجے محمد رضا کاظمی کے توسط سے مجھے حاصل ہوا۔"

(بیسویں صدی اور جدید مرثیہ۔ ہلال نقوی ص ۱۸۵)

ڈاکٹر ہلال نقوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ علی اکبر کاظمی کا دوسرا مرثیہ (وقت کٹنے لگا مشکل سے جو بیماری میں) غیر مطبوعہ نہیں ہے۔ کم و بیش تیس برس قبل پٹنہ سے شائع ہو چکا ہے' اس کی وضاحت اُنہوں نے ص ۷۸۸ کے حاشیے میں ان الفاظ میں کی ہے۔

"علم عباس غازی کا" علی نگر، پالی، گیا مطبوعہ شیو پریس، رمنہ روڈ پٹنہ۔ سنہ اشاعت درج نہیں ہے مگر یہ اس وقت شائع ہوا جب سید علی اکبر کاظمی کشمیر سٹیٹ میں ڈائرکٹر تعلیمات تھے۔ اُن کا سنہ وفات ۱۹۵۹ء ہے اس کی اشاعت اگر ۵۸ یا ۵۷ء میں ہوئی ہوگی تو بھی آج ۱۹۸۶ء میں (اس وقت جب ہلال نقوی یہ لکھ رہے تھے) کم و بیش تیس برس گذر چکے ہیں۔ اس مرثیے کا موضوع پالی کا علم ہے۔ علی نگر، پالی (ضلع گیا) صوبہ بہار کی ایک بستی ہے جس کی امام بارگاہ کے صدر دروازے پر ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷ء) میں علم عباسؑ کی یاد میں علم نصب کیا گیا تھا۔ علی اکبر کاظمی کے اس مرثیے میں پالی کے علم کی پوری تاریخ نظم کی گئی ہے۔

سید علی اکبر کاظمی کے ذکر کو آگے بڑھانے کے لئے راقم الحروف نے اُن کے مراثی کی تلاش کی مگر کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اُن کے مرثیے نہ مل سکے۔ پروفیسر محمد رضا کاظمی سے بھی نہیں۔ "واں ایک خامشی میرے خط کے جواب میں" — اور پھر بہار کے مرثیہ نگاروں کی کھوج میں جب ۲۰۰۳ء میں پٹنہ جانا ہوا تو سید علی اکبر کاظمی کا ایک مرثیہ (پہلا مرثیہ " آج ہر دل پہ عجب غم کی گھٹا چھائی ہے) میسر آ گیا اور ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا یہ وہی مرثیہ ہے جس میں پالی کے علم کی پوری تاریخ نظم کی گئی ہے۔ حتٰی کہ اُن بہت سے سادات کے نام بھی نظم کئے گئے ہیں جو اس تاریخی کام میں مستعد تھے۔ جبکہ ڈاکٹر ہلال نقوی کا بیان یہ ہے کہ:

''علی اکبر کاظمی کا دوسرا مرثیہ (وقت کٹنے لگا مشکل سے جو
بیماری میں) ڈاکٹر ہلال آل نقوی کے ذخیرۂ مراثی میں موجود ہے۔ جس
پر جمیل مظہری کا نوشتہ بھی ہے اور مرثیہ پالی کے علم کے موضوع پر ہے''

ناطقہ سربہ گریباں ہے اسے کیا کہیئے۔ قرین قیاس یہی ہے، بلکہ ان کا پہلا مرثیہ پڑھنے کے بعد یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اُن کا دوسرا مرثیہ ''وقت کٹنے لگا مشکل سے جو بیماری میں'' بحوالہ نوشتہ جمیل مظہری اُن کی وفات سے دو ہفتے پہلے مکمل ہوا اور اُن کے حالات یعنی ان کی بیماری کے متعلق ہوگا جسے انہوں نے علی اکبر علیہ السلام کی شہادت پر تمام کیا۔ پہلے مرثیے میں انہوں نے پالی کی تاریخ نظم کرنے کے بعد انچاسویں (۴۹) بند میں گریز کر کے کربلا اور بالخصوص حضرت عباسؑ کے احوال نظم کئے تھے۔

یہ تو تھا اہل عزا طبع سخنور کا حال اب سنو ذکر علمدار شہ نیک خصال
فوج قہار سے جب بھر گیا میدانِ قتال ۴۹ گھر گیا نرغۂ اعدا میں محمد کا لال
بند پانی ہوا بچوں پہ مصیبت آئی
رات عاشور کی آئی کہ قیامت آئی

یہ مرثیہ ۷۰ بند پر مشتمل ہے۔ چند بند بطور نمونہ کلام درج ذیل ہیں۔

آج ہر دل پہ عجب غم کی گھٹا چھائی ہے آج مغموم ہر اک شاہ کا شیدائی ہے
صبح اوڑھے ہوئے پھر شالِ عزا آئی ہے ۱ اور گردوں سے یہ ماتم کی خبر آئی ہے
پھر اسی طرح بصد جاہ و حشم اٹھتا ہے
آج عباسؑ کا پالی میں علم اٹھتا ہے

جس طرف دیکھئے بستی میں ہے ہُو کا عالم عرش سے آکے فرشتے ہیں شریک ماتم
غول میں اہل عزا کے ہیں رسولِ اکرم فاطمہ خلد سے آئی ہیں کہ دیکھیں یہ علم
کیا تعجب ہمیں دیتی ہوں دعائیں زینبؑ
لے رہی ہوں علم شہ کی بلائیں زینبؑ

چند لفظوں میں سنو، یاں کے علم اُٹھنے کا حال یاں جو سادات تھے ان میں تھے بہت کم خوش حال
ان سبھوں کے لئے تھا ذکر علم امر محال ۵ دل میں بعضوں کے یہ آنے لگا رہ رہ کے خیال

آخرش کیوں نہ اُٹھے شہ کا علم پالی میں
کیوں نہ اس رسم کو قائم کریں ہم پالی میں

دھمکیاں سن کے ہوا اور بھی کچھ جوش سوا فیصلہ کرلیا سادات نے مل کر اک جا
سر رہے یا نہ رہے شہ کا علم اُٹھے گا [9] گھر کی ہر اینٹ بھی بک جائے تو کیا غم اس کا
دل کا ارمان رہے دل میں یہ منظور نہیں
ہم غلامانِ علیؑ ایسے بھی مجبور نہیں

ایک تاریخ تھی سادات کی وہ جدوجہد ساتھ زہراؑ کی دعائیں تھیں، علیؑ کی تھی مدد
ضامنؔ و یحییٰؔ و یعقوبؔ نے کد کی بے حد [10] سر سے باندھے تھے کفن مولوی خیرات احمد
نوجواں، گو کہ بزرگوں سے ذرا پیچھے تھے
پھر بھی سر اپنا ہتھیلی پہ لئے پھرتے تھے

متحد خدمت اسلام میں پیری و شباب [13] باقر و عسکری و سید و خورشید و نواب
اکبری اور نقی میر وحید اور تراب جوشِ ابرار و لطافت کا نہ تھا کوئی جواب
میر یعقوب کے دو بیٹوں کا آغاز شباب
مرمٹیں بہر علم کہتا تھا اندازِ شباب

سید علی اکبر کاظمی نے پالی کے علم کی تاریخ کو مرثیے کا چہرہ بنا کر نہ صرف اس تاریخ کو محفوظ کردیا بلکہ سادات کے وہ سارے نام بھی روشن تاریخ کے صفحات پر ثبت کردیے جنہوں نے ''علم عباس'' کی عظمت کے لئے سر دھڑ کی بازی لگادی تھی ——— چودھویں بند سے انیسویں بند تک اُن ناموں کا تذکرہ اور انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد علی اکبر کاظمی نے رثا کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتے ہوئے واقعہ نگاری کی ہے۔

آخرش دیدی عدالت نے اجازت اُن کو حکم سن کر ہوئی اس طرح مسرت اُن کو
جیسے حاصل ہوئی کونین کی دولت اُن کو [20] زندہ کرنی تھی شہیدوں کی روایت اُن کو
پھر بھی ممکن تھا کہ اشرار انہیں ٹوکیں گے
اپنی طاقت کے بھروسے یہ علم روکیں گے

اس کے بعد سادات کے عزائم، سرفروشی کی تمنا، علم کی تقدیس کو بچانے کے لئے ہر قسم

کی قربانی کا ارادہ، علی اکبر کاظمی کی وقائع نگاری کی بہترین مثال ۱۰ بند کے بعد علم برآمد ہوتا ہے۔
عورتیں چھپتی تھیں جن جن سے وہ باہر ٹھہرے چند مخصوص اعزا جو تھے وہ گھر میں گئے
بعد کچھ دیر کے یوں ڈیوڑھی سے باہر نکلے [۳۰] علم حضرتِ عباس کو کاندھوں پہ دھرے

اس طرح لے کے علم شاہ کے شیدا نکلے
گھر سے جیسے کسی سلطاں کا جنازہ نکلے

کچھ اس انداز سے وہ رایت مولا نکلا کہ جو انگریز تھا کپتان وہ گھبرا سا گیا
کھینچ کر میان سے تلوار کا قبضہ چوما [۴۱] اپنے ماتحتوں کو پھر حکم سلامی کا دیا

بول اُٹھا دل یہ سپاہی کا، کہ تعظیم کرو
رایتِ لشکرِ اسلام ہے تسلیم کرو

گشت کے بعد یہاں لائے علم نصب کیا نذر سے جب ہوئے فارغ تو ہوا جوش سوا
پڑھی غازی کی زیارت کہ جو تھی خود نوحہ [۳۸] مختصر لفظوں میں مفہوم زیارت کا یہ تھا

السلام اے علم شہ کے اُٹھانے والے
تجھ سے معنیٔ وفا سیکھیں زمانے والے

عباس کے علم کے حوالے سے ہی بند نمبر ۴۹ کے بعد علی اکبر کاظمی نے عباس علمدار کے احوال کا تذکرہ کر کے غازی عباس کی شہادت پر مرثیہ ختم کیا ہے۔ گریز کے بند کے بعد کل اکیس بند میں علی اکبر کاظمی نے عباس کی شجاعت، تلوار کی کاٹ، گھوڑے کی برق رفتاری عباس کی جنگ اور شہادت کے احوال رقم کئے ہیں۔ علی اکبر کاظمی کا یہ مرثیہ پالی میں حضرت عباس کا علم نصب کرنے کی تاریخ ہی نہیں کثرت کے جبر کے خلاف قلت کی حق پرستی اور بالآخر حق پرستوں کی فتح اور ظلم کے خلاف مظلومیت کی فتح کی تاریخ بھی ہے، یہ مرثیہ نگار کی قادر الکلامی ہے کہ مرثیہ جدید بھی ہے اور لوازم مرثیہ کی پاسداری بھی ہے۔

☆☆☆☆☆

ظریف جبلپوری:-

تاریخ ولادت معلوم نہ ہو سکی۔ وفات ۱۹۶۴ء (کراچی)

نام، سید حامد رضا نقوی۔ تخلص ظریف۔ آبائی وطن الور مگر ملازمت کے سلسلے میں جبل

پور میں قیام رہا، وہیں سے بحیثیت شاعر شہرت ہوئی لہٰذا ظریف جبلپوری کہلائے۔ ظریف کے والد گرامی سید مہدی حسن نقوی بھی جبل پور میں رہے۔ ۱۹۴۷ء برصغیر کی تاریخ میں بہت ہی اہم سال ہے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں برصغیر کو آزادی ملی ـــ اس آزادی کے اعلان کے بعد کئی ماہ مشرق میں وہ سورج طلوع نہیں ہوا جو روشنی دیتا ہے، حرارت دیتا ہے، نشو ونما اور روئیدگی دیتا ہے اس کے برعکس خاک دخون میں ڈوبا ہوا سورج طلوع ہوا اور کئی ماہ تک ہوتا رہا۔ اور ماحول پر بے حسی اور بربریت کے اندھیرے چھائے رہے۔ پکی سڑکیں اور کچے راستے خون کی ندیوں میں تبدیل ہو گئے۔ ارباب سیاست کو حالات کے جبر نے انتقال آبادی کے فتوے صادر کرنے پر مجبور کیا اور انہیں یہ سوچنے کا بھی وقت نہ ملا کہ ادھر سے اُدھر جانے والوں کو خون کی نہریں عبور کرنے کے لئے محفوظ کشتیوں کا انتظام بھی کر دیں۔ لیکن کسی سے کچھ نہ ہوا ـــ ہزاروں کی لاشیں ان خون کے دریاؤں سے ملیں۔ ہزاروں لاپتہ ہو گئے۔ بچے کھچے جو لوگ دوسرے کنارے تک پہنچے ان کے مصائب کو چمکتی تلواروں نے آسان کر دیا ـــ نہ جانے کیوں جہاں کہیں ۱۹۴۷ء کا ذکر آتا ہے وہاں کھلے ہوئے پھولوں کی بجائے ہر طرف خون ہی خون کیوں نظر آتا ہے۔ ظریف جبلپوری کے والد گرامی کا ۱۹۴۷ء میں انتقال ہوا۔ معلوم نہیں کیسے؟

ظریف جبلپوری مزاح گو شاعر تھے ـــ اس سے پہلے شاید کسی نقاد نے کسی مزاح گو شاعر کے لئے یہ الفاظ استعمال نہ کئے ہوں جو آج میں جسارت کر رہا ہوں کہ ظریف جبلپوری مزاح نگاری میں "صاحب طرز" شاعر تھے ـــ صاحبو مجھے معلوم ہے کہ مزاح گو ادیب یا شاعر اگر اپنی تحریر میں مزاح پیدا نہ کر سکے تو لوگ اُسے مزاح گو سے زیادہ جوکر (مسخرہ) سمجھتے ہیں اور جو لوگ مزاح گوئی کا سلسلہ رکھتے ہیں اور ایک فن کی طرح اس کی آبیاری کرتے ہیں وہ ظریف جبلپوری، سید محمد جعفری، دلاور فگار اور محمود سرحدی کہلاتے ہیں۔ مولانا ضمیر اختر نقوی نے ظریف جبلپوری کے دو مرثیوں کا ذکر کیا ہے اور پہلے مرثیے کے دو بند نقل کئے ہیں۔

عباسؑ کربلا میں علیؑ کا نشان ہے ‌ ‌ ‌ لشکر ہے جسم اور یہ لشکر کی جان ہے
فوج خدا کا کیسا سجیلا جوان ہے ‌ ‌ ‌ جعفر کا دبدبہ ہے تو حیدرؑ کی شان ہے
یہ خاتمِ وقار و رضا کا نگینہ ہے
ہاں ورثہ دارِ بازوئے شہ کا مدینہ ہے

کیا کیا ملے حسینؑ کو انصارِ خوش ادا بے عذر، بے کدورت و بے کبر و بے ریا
با حلم و بامروّت و باہوش و باصفا ذی فہم وذی فراست و ذی علم و ذی حیا
بے شک تھا نورِ شمعِ رسالت نگاہ میں
ڈوبے ہوئے تھے یوسفِ حیدر کی چاہ میں

ایک محترم نقاد کا ارشاد ہے کہ ظریف جبلپوری نے صرف دو مرثیے کہے ہیں اور میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ وہ جب کسی سمت سوچنا شروع کر دیتے تھے تو ان کے قدم ان کی فکر کے ساتھ ساتھ اسی سمت بڑھنے شروع ہو جاتے تھے۔ ظریف صاحب بیساختہ شعر کہتے تھے۔ اتنی قادرالکلامی کے باوصف وہ دو مرثیوں پر کیوں رک گئے یہ وہی جانیں جن سے مرثیہ گوئی کو نسبت ہے۔

☆☆☆☆☆

منظور رائے پوری:-

ولادت ۱۹۱۶ء۔ وفات ۱۹۶۵ء۔

سید منظور مہدی منظور رائے پوری کا شمار اُن مرثیہ گو شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے تقسیم ہند سے قبل مرثیہ گوئی کا آغاز کیا اور پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد کراچی میں جب مرثیے کے حوالے سے دبستان بن رہا تھا اُس وقت یہ پختہ کار شعراء دبستانِ کراچی کی عزت بنے منظور مہدی منظورؔ کے والد گرامی سید اولاد حسین سجادؔ بھی مرثیہ گو شاعر تھے اور جلالؔ لکھنوی اور ثاقبؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ منظورؔ کم عمر تھے کہ اُن سے سر سے والد کا سایہ اُٹھ گیا اور زندگی کی تپتی دھوپ میں کھڑے رہ گئے۔ بڑے بھائی اور نانا نے کفالت کی — شاعری کا آغاز ۱۹۳۹ء میں ایک 'سلام' سے ہوا جس پر بڑے بھائی نے اصلاح دی — ذہن میں شاعرانہ صلاحیتیں کروٹیں لے رہی تھیں، گھر میں حضرت جلالؔ لکھنوی اور ثاقبؔ لکھنوی سے عقیدت کے چراغ والد مرحوم کی زندگی میں روشن ہو گئے تھے۔ باپ کا سایہ سر سے ضرور اُٹھا مگر مرثیہ گوئی کا اُجالا ابھی باقی تھا۔ منظورؔ مہدی نے طے کیا کہ وہ کسی اور صنفِ شاعری کی توجہ نہیں دیں گے بلکہ صرف مرثیہ کہیں گے۔ اُنہوں نے خود لکھا ہے کہ "حیات دبیرؔ" اور میر انیسؔ کے مرثیوں کو پڑھنے کے بعد میں نے مرثیہ کہنے کا فیصلہ کیا جو علی المرتضیٰ سے متعلق تھا ۔

"شانِ خدا عیاں ہے علی کی جناب سے"

ابتدائی مرثیوں میں حضرت صفی حیدر دانش اور مولانا مجتبیٰ نوگانوی سے اصلاح لی۔
تقسیم ہند سے قبل منظور رائے پوری کا ایک مرثیہ ''شاہراہ بلاغت'' شائع ہوا، اس پر مصنف کا نام سید منظور مہدی، بلاسپور (سی۔پی) درج تھا۔ ناشر سید اعظم حسین (بلاسپور) تھے مدیر اخبار ''سرفراز'' لکھنؤ نے مرثیے کے پیش لفظ میں نشاندہی کی کہ منظور مہدی نے وہ تمام صنائع و بدائع جو کتب بلاغت میں مذکور ہیں اس ایک مرثیے میں استعمال کئے ہیں۔ ان میں سے بعض کا استعمال بہت مشکل ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ مرزا دبیر، شمیم امروہوی اور سادات باہرہ کے ریاض مرحوم کے علاوہ کسی اور شاعر نے ان صنائع بدائع کو نظم نہیں کیا ہے۔ پس یہ مرثیہ اس اعتبار سے عصر حاضر کے مرثیوں میں منفرد ہے۔

صناعِ دو جہاں کے صنائع رقم کروں　　صنعت گری میں صَرف، زبانِ قلم کروں
وہ صنعتیں کلام میں یک جا بہم کروں　　فنِ سخنوری کا دوبالا حشم کروں
تصویر کھینچ دوں وہ حسینؑ شہید کی
ہر صنع کبریا کو تمنا ہو دید کی

آئینہ دارِ صنعتِ داور، حسینؑ ہیں　　صدق و صفا کی راہ کے رہبر، حسینؑ ہیں
صبر و رضا کی تیغ کے جوہر، حسینؑ ہیں　　مجموعہ صفاتِ پیمبر، حسینؑ ہیں
دنیا میں حق نے تاج حقیقت عطا کیا
عقبیٰ میں اختیارِ شفاعت عطا کیا

جانِ نبی کی موت ہے ہستی میں یادگار　　جتنا گھٹایا خلق نے اتنا بڑھا وقار
ارض و سما، زمان و مکاں، دشت و رودبار　　سنگ و نبات و جوہر و بیجان و جاندار
سب اشک غم بہاتے ہیں غربت پہ شاہ کی
روئیں گے تا بہ حشر شہادت پہ شاہ کی

(ان بندوں میں تضاد رمی، صنعت جمع کے استعمال کی نشاندہی کی گئی ہے)
شاہراہ بلاغت ۱۱۷ بند پر مشتمل ہے۔ آخری بند میں صنعت تجرید، اور صنعت تاریخ استعمال کی گئی ہے یعنی مرثیہ ختم کرنے کا سنہ مصرع آخر سے نکلتا ہے۔

چرچا ہے جس کو سُن کے یہ اہلِ کمال میں
نایاب مرثیہ یہ لکھا شہ کے حال میں

۱۳۶۵ھ

۱۹۴۸ء میں منظور رائے پوری پاکستان آگئے اور حیدرآباد سندھ میں بس گئے۔ ۱۹۵۳ء میں کراچی آئے۔ کراچی آکر منظور رائے پوری ۱۹۵۳ء میں حضرت نسیم امروہوی کے شاگرد ہو گئے جبکہ پاکستان آنے سے قبل شاہراہ بلاغت مطبوعہ ۱۹۴۵ء کے سرورق پر مندرجات حسب ذیل ہیں۔ ''شاہراہ بلاغت مصنفہ مداح اہلبیت جناب ڈاکٹر سید منظور مہدی منظور (بلاسپور، سی۔ پی) تلمیذ شاعر آلِ محمد جناب نسیم امروہوی مدظلہ''۔ ہر دو صورتوں میں پتہ چلتا ہے کہ منظور رائے پوری بہرحال حضرت نسیم امروہوی کے شاگرد تھے۔ اُنہوں نے پاکستان آنے سے قبل دس مرثیے اور پاکستان آنے کے بعد دس سے زیادہ مرثیے کہے ہیں — ۱۹۶۲ء میں اُنہوں نے ایک مرثیے کے چہرے میں مرثیے کی تاریخ نظم کی ہے۔ اُن سے پہلے صرف شدید لکھنوی نے اپنے مرثیے ''تاریخ مرثیہ سُنیں اب صاحب نظر'' میں مرثیے کی تاریخ لکھی تھی۔ یہ مرثیہ ریاضِ شدید'' (جلد اوّل) مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ (۱۹۶۷ء) میں شامل ہے۔ منظور رائے پوری کی طبع مشکل پسند نے ۱۱۲ بند کے اس مرثیے ''ہے واردات قلب کی تصویر مرثیہ'' کے چہرے میں اپنے استاد نسیم امروہوی، حضرت شمیم امروہوی، موجد سرسوی، جعفر علی خان اثر، شدید لکھنوی، مہذب لکھنوی، خبیر لکھنوی کے علاوہ بہت سے مشاہیر کا تذکرہ کیا ہے نیز دبستان کراچی کے مرثیہ گو شعراء میں نجم آفندی، قمر جلالوی، زیبا ردولوی، سید آل رضا، ڈاکٹر یاور عباس، ضیاء الحسن موسوی، غرض سب ہی شعراء کا تذکرہ کیا ہے — پورا مرثیہ دلچسپ، معلوماتی اور منظور رائے پوری کی قادرالکلامی کا مظہر ہے۔ نمونہ کے طور پر چند بند نقل کئے جارہے ہیں۔

ہے واردات قلب کی تصویر مرثیہ

عالم بھی ہیں فقیہ بھی شاعر بھی یک قلم
قائم انہیں سے مرثیہ گوئی کا ہے بھرم
ہاں اور بھی ہیں ان کے سوا صاحب قلم
محدود تو نہیں مرا مولا کا کچھ کرم

ہندوستان میں چند ہیں جو بے نظیر ہیں   موجد مرسوی، جعفر علی خاں اثر، شدید
موجد اثر، شدید، مہذب خبیر ہیں   لکھنوی ، مہذب لکھنوی، خبیر لکھنوی

قطب جنوب نجم کو کہیے تو ہے بجا   (نجم آفندی)
اِک وسط ہند میں ہے قمر شمع جاں فزا   (قمر رائے پوری)
سیّد کے بھی کلام میں ہے حُسن کی ادا   (سیّد کاظم علی میرٹھی)
ہر شعر ہے لطیف لطافت کا واہ وا   (لطافت بارہوی)
اب ہند میں جمیل، بہارِ بہار ہے   (جمیل مظہری)
جس کا کلام وقت کا آئینہ دار ہے
منظر عروض و قافیہ دانی کے ہم ردیف   (منظر عظیمی)
بزمِ سخن میں ہے سخن جعفری لطیف   (سید محمد جعفری)
کرّار کی وہ شان کہ مرعوب ہیں حریف   (کرّار جونپوری)
اک مرکزِ نگاہ محافل میں ہے ظریف   (ظریف جبلپوری)
شاہد کے ذوقِ حُسنِ معانی کو دیکھیے   (شاہد نقوی)
اشعار میں رواں کے روانی کو دیکھیے   (رواں میرٹھی)

منظور رائے پوری کے بعد میر رضی میرا اور ساحر لکھنوی نے کراچی میں اس انداز کے مرثیے کہے مگر جو مقبولیت منظور رائے پوری کے مرثیے کو حاصل ہوئی وہ ان شعراء کرام کے مرثیوں کو نہ مل سکی۔ منظور رائے پوری مرثیے کی کلاسیکی اقدار کے قائل تھے، جدید مرثیے کے متعلق اُن کی رائے ''مراثی سجاد منظور رائے پوری'' مطبوعہ جاوید پریس کراچی ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی ہے جو حسبِ ذیل ہے۔

''جدید مراثی میں گھوڑے کی تعریف، تلوار کی تعریف بالکل نہیں ہوتی یا برائے نام ہوتی ہے۔ اس تجزیے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ قدیم مراثی کے تین چار ستون ڈھا کر اُنہیں ہم جدید مراثی کہنے لگے''

ایک باکمال شاعر کی روایات سے اس قدر وابستگی اور نئی اقدار حیات سے عدم دلچسپی حیرت انگیز ضرور ہے مگر اس منزل پر منظور رائے پوری تنہا نہیں، پورا ایک کارواں اُن کے ساتھ ہے

خود اُن کے استادِ گرامی حضرت نسیم امروہوی کلاسیکی اقدار کے علمبردار باکمال شاعر ہیں۔ منظور رائے پوری نے علمی بنیاد پر مرثیے کو آگے بڑھایا اور اپنے علم کو معتقدات کا پابند رکھنے کے ساتھ ساتھ منطق و استدلال کو اپنایا جسکا اظہار اُنکے مرثیے ۔'' چشم مردم کے لئے نعمت رب ہے پردہ'' میں ہوتا ہے۔ اس مرثیہ کا عنوان ہی '' پردہ'' ہے — حضرت نسیم امروہوی کے زیر اہتمام شوکت سبزواری کے پیش لفظ کے ساتھ '' ۱۹۶۲ء کے چند جدید مرثیے'' کراچی سے شائع ہوئے تھے جس میں حضرت نسیم امروہوی، ڈاکٹر یاور عباس، شاہد نقوی، اطہر جعفری اور منظور رائے پوری کا مرثیہ '' پردہ'' شامل تھے۔ ہر چند کہ مجموعے کا نام '' ۱۹۶۲ء کے جدید مرثیے'' تھا مگر مرثیہ نگاروں کی اس صف میں منظور رائے پوری جدید مرثیے کے شاعر نہیں تھے۔ حتیٰ کہ حضرت نسیم امروہوی جن کی مرثیہ گوئی پورے دبستان کراچی پر محیط ہے وہ کلاسیکی مرثیے کے محافظ اور بیسوی صدی میں کلاسیکی مرثیے کی بقا کے امین تھے لیکن انہیں بھی جدید مرثیے کا شاعر کہنا اُن کے کمال فن سے انحراف ہوگا۔ ہوسکتا ہے '' ۱۹۶۲ء کے جدید مرثیے'' میں '' جدید'' کو '' نئے '' کے معنی میں لیا گیا ہو۔

منظور رائے پوری کا '' پردہ'' سید فاطمہ زہراؑ کے احوال پر ہے۔

چشم مردم کے لئے نعمت رب ہے پردہ　　نقطۂ نور کی رویت کا سبب ہے پردہ
بزم قوسین میں حاضر بہ ادب ہے پردہ　　حق کے عرفان میں بھی غور طلب ہے پردہ
خوبیاں لاکھ ہیں بے ریب وگماں پردے میں
انتہا ہے کہ خدا بھی ہے نہاں پردے میں

بزم ہستی میں نہ مقبول ہو کیونکر پردہ　　سامعہ کے لیے کانوں میں ہے اندر پردہ
روح کی طرح ہے بینائی کا جوہر پردہ　　سات پردے تو ہر اک آنکھ میں ہیں در پردہ
روشنی دیدۂ انساں میں نہاں رہتی ہے
کوئی ڈھونڈے تو بصارت کو کہاں رہتی ہے

آنکھ میں پردہ بصارت کے لئے ہے لازم　　آنکھ کا پردہ مروت کے لئے ہے لازم
آنکھ کو پردہ ریاضت کے لئے ہے لازم　　آنکھ سے پردہ، سخاوت کے لئے ہے لازم
بات ہے خوب جو محبوب کہے پردے میں
حُسن کا حُسن ہے جب تک کہ رہے پردے میں

ذاتِ واجب کو ہے لازم کہ ہو پردہ موجود عبد، پردے کے ہو باہر پس پردہ معبود
جبکہ معراج بھی پردے کے ادھر ہے محدود کوششیں پردہ اٹھانے کی ہیں یکسر بے سود
نظم کونین بگڑ جائے مصیبت آجائے
پردہ اُٹھ جائے اگر آج قیامت آجائے

آؤ قرآں سے ذرا پوچھ لیں پردے کی یہ بات اک دلیل اس کی ہیں محکم، متشابہ آیات
حرف جتنے ہیں مقطع وہ ہیں قطعی اثبات سارے احکام کے پردے میں ہیں اسرارِ حیات
ہے ہر اک امر پہ مرضئ خدا کا پردہ
بہرِ تطہیر بھی لازم ہے کِسا کا پردہ

دیکھئے پردے کی تائید میں خالق کی کتاب صنفِ نازک پہ ہے لازم کہ رہے رخ پہ نقاب
بابِ پردہ میں ہوں مشکوک اگر کچھ احباب فاطمہؑ بیٹھ کے پردے میں انھیں دیں گی جواب
اُسوۂ ملّتِ بیضا ہے حجابِ زہرا
نورِ پیغمبرِ اسلام نقابِ زہرا

کون زہراؑ، جو دل و جان و جگر بندِ رسولؐ جن کی درگاہِ الٰہی میں دعائیں مقبول
ابدی جس کی طہارت، ازلی حسنِ قبول سایۂ پاکِ رسولِ عربی، نام بتولؑ
سایہ حضرت کا نہ ظاہر، نہ کہیں پردے میں
فاطمہؑ آپ کا سایہ تھیں رہیں پردے میں

منظور رائے پوری نے مرثیوں میں 'بین' بہت پراثر کہے ہیں اور اس بات کا خیال رکھا ہے کہ بین خانوادۂ رسالت کی کمزوری نہ دکھائیں —— مثلاً

اصغر، عدو مٹاتے ہیں زہرا کے چین کو
اک تیر اور کھا کے بچالو حسینؑ کو

اور اصغر نے تیر کھا کر نہ صرف حسینؑ بلکہ حسینیت کو بچالیا۔

منظور رائے پوری کا مجموعہ مراثی ۱۹۶۵ء میں کراچی سے شائع ہوا تھا اسی سال وہ اس دنیا کو چھوڑ گئے۔

☆☆☆☆☆

خبیر لکھنوی:-

ولادت ۱۸۹۷ء وفات ۱۹۶۵ء

نام سید سرفراز حسین۔ تخلص خبیر، دبستان دبیر کا ایک روشن چراغ۔ حضرت اوج کے شاگرد رشید، پختہ گو شاعر۔ ۱۹۲۱ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ اُن کا ایک مشہور اور مقبول مرثیہ ؎ "پھر آئی فصل بہاری کھلا ہے باب سخن" نظامی پریس لکھنوی نے شائع کیا تھا۔

اردو شاعری میں شاعرانہ تعلّی کی بہت سی مثالیں ہیں۔ یہ تعلّی ہر کس و ناکس کو زیب نہیں دیتی صرف اُنہی اساتذہ کو زیب دیتی ہیں جو ادب کے کسی مقام پر فائز ہوں۔

میر نے کہا تھا ؎

بیا ور یدگر ایں جا سخنورے باشد
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

میر انیس نے کہا تھا ؎

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

مرزا دبیر، مرزا اوج اور دیگر اساتذہ نے بھی اس انداز سے شاعرانہ تعلّی کی ہیں، حضرت خبیر لکھنوی نے بھی ایک مرثیہ میں یہی انداز اختیار کیا ہے جو اُن کے شاعرانہ منصب کی نشاندہی کرتا ہے۔

پھر آئی فصلِ مضامین کھلا ہے بابِ سخن کدھر ہیں اہلِ نظر دیکھ لیں شبابِ سخن
قلم کی طرح سے قبضے میں ہیں طنابِ سخن جڑا ہے عرشِ بلاغت پہ آفتابِ سخن
نہ کیوں ہوں قائلِ معراج رتبہ دانِ سخن
بنا ہے ذہن رسا میرا نردبانِ سخن

میں کیا کہوں وہی دیکھے نظر ہو جس کی وسیع میری بہارِ سخن پر فدا ہے فصل ربیع
میرے کلام کا پایا ہے آسماں سے رفیع وہ خوشہ چیں ہو کہ خرمن ہے جس کا نظم رفیع
مجھی کو خادم اوج و دبیر کہتے ہیں
محبّ تو مُخبرِ صادق خبیر کہتے ہیں

ہوا میں اوجؔ کے صدقے سے فارغ التحصیل   وگرنہ مجھ سا ذلیل اور یہ کلامِ جلیل
صفا میں صفحۂ قرطاس ہے پرِ جبریل   صریرِ کلک ہم آوازِ صورِ اسرافیل
دوبارہ مردہ مضامیں نے جان پائی ہے
جہانِ نظم و بیاں میں قیامت آئی ہے

جنابِ اوجؔ تھے اربابِ نظم میں احسن   وہ تھے خدائے سخن، فخرِ شاعرانہ زمن
مگر یہ فخر بجا ہے مجھے بوجہِ حسن   کہ اس خدائے سخن نے کیا بنیٔ سخن
ثنائے شاہ سے پایا عروج منبر پر
یہ ظلِ عرش ہے یا سایۂ علَم سر پر

چند بند اور اسی تیور کے ہیں۔ اس کے بعد گریز دیکھئے:

یہ خود نمائیاں زیبا نہیں یہاں پہ خبیرؔ   کسی طرح سے مناسب نہیں ہے یہ تقریر
نہیں مقامِ رجز ہے یہ مجلس شبیر   ذرا سلیقہ نہیں ہائے کیا کیا تحریر
نہ سمجھے کوئی کہ جوہر ہے کیا عرض کیا ہے
کسی کے عیب و ہنر سے تجھے غرض کیا ہے

ہیں جتنے مدح سرائے امام ہر دوسرا   وہ سب میں مدح کے قابل نہیں شک اس میں ذرا
ہے اُن سے رونقِ بزمِ عزائے شاہِ ہدا   وہ شاہ کہتے ہیں سب جن کو شاہِ کرب و بلا
وہ شاہ جن کو شہِ مشرقین کہتے ہیں
وہ شاہ جن کو دو عالم حسینؑ کہتے ہیں

خبیرؔ لکھنوی کے مرثیے سے درج بالا اقتباس بتا رہا ہے کہ خبیرؔ لکھنوی خود کو حضرت اوجؔ اور مرزا دبیرؔ سے متعلق کرنے پر نازاں ہیں اور ان سے اکتسابِ علم کو اپنے لئے شرف سمجھتے ہیں۔ مرزا اوجؔ نے مرثیے میں تبدیلیاں لانی چاہیں۔ بڑے خلوص سے مرثیے کو جدید خطوط پر ڈھالنے کی سعی خود بھی کی اور اپنے شاگردوں کے دلوں میں بھی اپنی اس روش کو بسا دیا— لہٰذا مرزا اوجؔ کے شاگردوں نے جدید مرثیے کی راہ کو اپنایا—

ڈاکٹر ہلال نقوی نے جدید مرثیے سے متعلق کچھ اکابرین ادب و مرثیہ کی آرا جمع کی ہیں۔ اُن میں سے ایک رائے حضرت خبیرؔ لکھنوی کے ایک شاگرد لائق علی ہنرؔ کی بھی ہے جو یہ کہہ

کر دامن بچا گئیے کہ اُن کی رائے وہ ہے جو حضرت مہذب لکھنوی کی رائے ہے۔ اور حضرت مہذب لکھنوی نہ جدید مرثیے کی اصطلاح سے متفق ہیں اور نہ نئے انداز کے مرثیوں سے۔ مہذب صاحب اس انداز کے مرثیوں کو مرثیہ قرار دیتے تھے جو انیس و دبیر کا انداز تھا — یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت خبیر لکھنوی کے لائق علی ہنر ایسے شاگرد بھی مرزا اوج کے نظریے سے اختلاف رکھتے تھے یعنی جدید مرثیے سے جسے مرزا اوج کے دوستوں اور دشمنوں سب نے سراہا — تو پھر بات کہاں سے بگڑی؟ غلطی کہاں ہوئی؟

خبیر لکھنوی دبستانِ دبیر کے آخری شاعر تھے۔ خبیر کے مراثی کے دو مجموعے شائع ہوئے۔ گلستانِ خبیر ۱۹۵۳ء جلد اوّل میں ۶ مرثیے اور جلد دوئم میں سات مراثی شامل ہیں — خبیر لکھنوی نے تاریخی واقعات کی صحت کا بہت خیال رکھا ہے جو دبستان دبیر کا خاصہ ہے وہ روایات کو سیدھے سچے انداز میں بیان کرتے ہیں اور کہیں اُلجھاؤ یا بے یقینی کی کیفیت پیدا ہونے نہیں دیتے۔ مکالمہ اودھ کے مرثیے کی پہچان ہے۔ یہ مکالمہ رجزیہ بھی ہوتا ہے واقعاتی بھی اور بین بھی — بہن بھائی کے مکالمے کا ایک انداز دیکھیے۔ امام حسینؑ جنگ آخر شہادت کے لئے بہن سے رخصت ہو رہے ہیں۔ زینب بھائی سے مخاطب ہیں ۔

گھر اپنا چھوڑ کے اماں کے گھر چلے بھیا بہن غریب کو بے آس کر چلے بھیا
جہاں سے پھر نہیں آنا، وہاں چلے بھیا سمجھ لو ہم بھی نہیں، تم اگر چلے بھیا
تمہاری ذات سے آباد گھر یہ سارا ہے
خدا کے بعد تمہارا فقط سہارا ہے

اور بین کے روایتی لکھنوی انداز میں سیدہ زینب کے بین کا ایک بند ۔

ڈوبا خشکی میں پیمبر کا سفینہ کیسا بن میں لوٹا گیا حیدرؑ کا خزینہ کیسا
چھوڑ کر گھر، ہے سفر کا یہ قرینہ کیسا خاک اُڑتی ہے مدینے میں مدینہ کیسا
بہنا جیتی رہے بھائی کا گلا کٹ جائے
یا الٰہی میں سما جاؤں زمین پھٹ جائے

خبیر لکھنوی نے صرف مرثیہ گوئی ہی نہیں کی بلکہ نقد و نظر کی راہوں پر بھی اُن کے نقوش کف پا ملتے ہیں۔ اُنہوں نے مرزا اوج کے ۱۴ منتخب مرثیوں پر مشتمل ایک مجموعہ "معراج الکلام"

کے نام سے ترتیب دیا۔ یہ مجموعہ اس اعتبار سے منفرد حیثیت کا حامل ہے کہ ان چودہ مرثیوں میں شاعر کی ابتدائی عمر، اوسط عمر اور آخری عمر کے مرثیوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔

نیاز فتح پوری نے خبیر لکھنوی کے متعلق لکھا تھا کہ اُن کے مرثیے پڑھ کر وہی زمانہ سامنے آجاتا ہے جب لکھنؤ کی فضا پر مرثیہ ہی مرثیہ بچھا ہوا تھا۔

("گلستان خبیر" خبیر لکھنوی تبصرہ نیاز فتح پوری مطبوعہ ۱۹۶۵ء)

خبیر لکھنوی نے تخیل آفرینی کے گلستان سجائے ہیں احدو احدیت ایسے تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک مضامین کو خبیر لکھنوی نے اپنی تخیل آفرینی کے سہارے نظم کیا ہے جس میں بصیرت کے ساتھ ساتھ مطالعہ کا عمق اور ادراک فہم شامل ہے۔

نقشِ توحید ہے لوحِ سرِ دیوانِ سخن سرخیٔ سورۂ اخلاص ہے عنوانِ سخن
حمد خلاقِ سخن سے یہ بڑھی شانِ سخن نو بہ نو، تازہ بہ تازہ ہے گلستانِ سخن
جلوہ گر جنتِ عرفاں میں ہے معراجِ خیال
جاودانی ہے بہارِ چمنستانِ خیال

خلق بے مادہ کیے اس نے یہ افلاک وزمیں نہیں محتاج عنایت کا وہ ہے کل کا معین
کیا عجب نفع وضرر کا جو اثر اس میں نہیں خود پہنچ سکتے نہیں، سود وزیاں اس کے قریں
اس سے برتر، نہ کوئی اس کا مساوی ممکن
غیر ممکن ہے کہ واجب پہ ہو حاوی ممکن

بدر کامل اوّل اور دوئم میں جو مرثیے شامل ہیں وہ مرزا اوج کے اس خیال کی عملی نشاندہی ہیں کہ ایک منظوم تاریخ اسلام اور محمد وآل محمد کا تعارف منظوم بھی ہونا چاہئے۔ خبیر کے یہ مراثی سلسلہ وار چودہ معصومین کی شان میں ہیں۔

☆☆☆☆☆

سید علی اصغر رضوی:-

سید علی اصغر رضوی بھرتپوری پسر سید سجاد حسین رضوی بھرت پور میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۷ء میں کراچی چلے آئے۔ شاعری

کا آغاز اوائل عمر میں کیا۔ کراچی میں حضرت نسیم امروہوی سے سلسلہ تلمذ وابستہ کیا۔ جب تک زندہ رہے دبستان کراچی کے مرثیہ گو کی حیثیت سے پہچانے گئے لیکن انتقال کے بعد اب کراچی کا کوئی مرثیہ گو، ناقدان مرثیہ، بانیان مجالس مرثیہ یہ بتانے کو تیار نہیں کہ اصغر رضوی کا کب انتقال ہوا۔ ان کا کوئی وارث کراچی میں ہے کہ نہیں۔ صرف مراثی فیض بھرتپوری (مطبوعہ ۱۹۷۹ ناشر سید مسعود الحسن عابدی کراچی) میں سید علی اصغر رضوی کے چار مراثی کا ذکر ملتا ہے جسے ڈاکٹر سید یاد علی جعفری نے بھی ''راجستھان میں اُردو مرثیہ'' مطبوعہ ۱۹۹۹، دہلی میں دہرایا ہے۔

(۱)	ہجرت ہر ایک قوم کی تازہ حیات ہے	مرثیہ	احوال علی اکبر
(۲)	اے طبع نور بار دکھا آب و تاب نظم	مرثیہ	احوال حضرت عباس
(۳)	بھائی کی موت دوسرے بھائی سے پوچھیے	مرثیہ	احوال حضرت عباس
(۴)	میں نخل بندِ گلشن توصیف آل ہوں	مرثیہ	احوال امام حسین

علی اصغر رضوی کے کلام کی تلاش میں مایوسی کے بعد اکثر خیال آتا ہے کہ جوشؔ، نجم آفندی، نسیمؔ امروہوی اور سید آل رضا جیسے وسیع القلب اساتذہ کے بعد کراچی کے دبستان مرثیہ گوئی پر نفسانفسی کی کیسی گھٹا چھائی کہ بہت سے روشن ستارے اندھیروں میں ڈوب گئے۔ سید علی اصغر رضوی اصغرؔ بھی ایسا ہی ایک ستارہ تھے۔

☆☆☆☆☆

اطہر جعفری بھرسری:- (کراچی)

ولادت ۱۹۰۷ء۔ وفات ۱۹۶۵ء

نام سید علی اطہر۔ جعفری سید۔ والد گرامی مقصود الحسن جعفری صبرؔ بھی مرثیہ گو شاعر تھے ''مراثی فیض'' بھرتپوری جلد دوئم کے مرتب جعفر زیدی پسر فیض بھرت پوری نے بھرتپور کے دوسرے مرثیہ گو شعراء کے ضمن میں اطہر جعفری کی جائے ولادت ''ڈیگ'' ریاست بھرت پور قرار دی ہے۔

اطہر جعفری نے پندرہ برس کی عمر میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔ نوحے منقبت اور سلام کہے، ہندوستان میں اُن کے چھ مجموعہ ہائے کلام (۱) گلزار عزا (۲) نوحہ جات اطہر (۳) نالہ و بکا (۴) نالہ شب گیر (۵) رومال زہرا (۶) حیات غم، شائع ہوئے ہیں۔ اس کلام پر اُن کے والد

گرامی نے اصلاح دی تھی۔ ۱۹۴۷ء اطہر پاکستان آ گئے۔ ۱۹۵۲ء تک سرکاری ملازمت میں رہے، ملازمت ترک کر کے صحافت کے شعبے کو اپنایا۔ کراچی آئے تو حضرت نسیم امروہوی کی شاگردی اختیار کی۔ ۱۹۶۱ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ ''میں گیسوئے عروسِ ولا کا اسیر ہوں'' یہ حضرت قاسم کے حال کا مرثیہ تھا جو گلدستہ عقیدت کے نام سے اُسی سال شائع ہو گیا— ''گلدستہ اطہر'' کے نام سے سات مرثیوں پر مشتمل مجموعہ شائع ہوا۔

اطہر جعفری کی مرثیہ نگاری پر حضرت نسیم امروہوی کے گہرے اثرات ہیں۔ وہ ایک طرف تو قدیم مرثیے کے پورے لوازمات کا بھرپور احساس رکھتے ہیں اور دوسری طرف صحیح احادیث، درست روایات اور تاریخی تناظر کو برقرار رکھتے ہیں۔ یہی امتزاج اُنہیں قدیم مرثیہ گو شعرا میں ممتاز کرتا ہے— اُنہوں نے مرثیوں میں امام حسینؑ کے کردار کو ایک جری، جانباز، سرفروش رہنما کے روپ میں پیش کیا ہے۔ گریہ وزاری میں مصروف سردار نہیں۔

وہ کون، حسینؑ ابنِ علیؑ معنیٔ قرآں قرآن کی رو سے پسر احمدِ ذی شاں
یہ عزمِ رسالت ہیں یہی عظمتِ انساں انسانیت و دین و دیانت کے نگہباں
خود دکھ میں ہیں اور درد پہ امت کے، نظر ہے
شبیر کے سینے میں محمدؐ کا جگر ہے

ذرا اس بند کے مصرع ثانی کو دیکھئے'' قرآن کی رو سے پسرِ احمدِ ذی شان'' یہ اس احتیاط کی دلیل ہے جو مرزا اوجؔ سے شروع ہوئی— دوسرا بند ملاحظہ ہو

طٰہٰ کی یہ عظمت ہیں، مدینے کی جلالت قالب میں امامت کے سراپائے رسالت
علمِ نبوی، مصلحِ ارباب جہالت شاہوں کی رعونت میں غریبوں کی وکالت
مجبور ہیں اور مالک تسلیم و رضا ہیں
سلطانِ دو عالم ہیں، غریب الغربا ہیں

کیسی حقیقت چھپی ہے مصرع ثانی اور مصرع چہارم میں۔ اور بیت میں کیا Realism ہے۔ کیسی آفاقی صداقت ہے۔

ایک اور مرثیے میں امام حسینؑ کی عظمت کا نقشہ کھینچا ہے ؛

ہاں وہ حسینؑ جس پہ مشیت کو ناز ہے جس کے جہاد نفس پہ عصمت کو ناز ہے

ایسا امام جس پہ جماعت کو ناز ہے خود جس کی پیروی پہ قیادت کو ناز ہے

اک چشم التفات میں خود بیں بنادیا

ذرّے پہ کی نگاہ تو زرّیں بنادیا

حقیقت یہی ہے کہ امام حسینؑ کی ساری قربانیوں کا نچوڑ جہادِ نفس ہے۔ اطہر جعفری نے کربلا کے واقعات کو اس طرح نہیں دیکھا جس طرح وہ وقوع پذیر ہوئے ہیں بلکہ امام مظلوم اور ان کے رفقاء کے پورے اعمال کی روح کو پہنچانا ہے اس لئے تو کہا ہے ۔

جس کے جہادِ نفس پہ عصمت کو ناز ہے

اطہر جعفری کا ایک اور مرثیہ ہے ''راہ عمل میں مشعل عرفاں ہیں پنجتن'' بڑا معرکۃ الآرا مرثیہ ہے جس میں پنجتن کی عظمت و عصمت کا استدلال ہے۔

راہ عمل میں مشعل عرفاں ہیں پنجتن سورے ہیں جن کی مدح وہ ذیشاں ہیں پنجتن

اک جسم ہے کتاب خدا، جاں ہے پنجتن گویا حواسِ خمسۂ ایماں ہیں پنجتن

قائل ہو پانچ کا تو عمل سب قبول ہیں

دین خدا کے پانچ ہی اصلِ اصول ہیں

نور خدا، جمالِ خدا، شاہِ مشرقین فردوس کی بہار تو کوثر کی زیب و زین

احمدؐ، بتولؑ، حیدر صفدر، حسنؑ حسینؑ بندوں کے اور خالق یکتا کے بین بین

آٹھوں پہر اشاعتِ وحدت میں صرف ہیں

توحید ایک لفظ ہے اور پانچ حرف ہیں

''بندوں کے اور خالق یکتا کے بین بین'' ایسا مصرعہ ہے جو عام شعراء کی فکر نہیں ہو سکتی۔ یہ اسلوب کی بات بھی نہیں۔ صداقت اور حقیقت کی آمیزش سے نتیجہ اخذ کرنے کی بات ہے۔

توحید کی طرح ہیں عدالت میں پانچ حرف اسلام کی طرح ہیں رسالت میں پانچ حرف

ایمان کی طرح ہیں امامت میں پانچ حرف کر لیجئے شمار قیامت میں پانچ حرف

پوچھے کوئی یہ رازِ خدا اہلِ ظرف سے

معبود بھی ہیں پنجتنی پانچ حرف سے

اسی مرثیے میں اطہر جعفری پھپھرسری نے حدیث کسا نظم کی ہے—یہ ایک مستحسن کاوش

ہے جس پر اطہر جعفری نے فخر کیا ہے۔

اب ہے بجا، کرے جو یہ ناچیز افتخار ۔۔۔ یہ ذکر میں نے نظم میں لکھا ہے بار بار
اوروں نے خوب مدحتِ آلِ عبا لکھی ۔۔۔ اطہر نے مرثیے میں حدیث کسا لکھی

ہر چند کہ زوّار حسین زوّار، قیس زنگی پوری، مرتضیٰ موسوی، حزیں فیض آبادی اور مولانا اختر امروہوی حدیث کسا کو نظم کر چکے تھے لیکن مرثیے کی ہیت میں اطہر جعفری پیہرسری نے پہل کی ہے۔

☆☆☆☆☆

علامہ ناصر زید پوری:- (حیدرآباد دکن)

ولادت یکم جنوری ۱۹۱۵ء۔ وفات ۱۸ر فروری ۱۹۶۶ء

نام سید غلام عباس رضوی۔ تخلص ناصرؔ۔ زید پور (بارہ بنکی) میں ولادت اور حیدرآباد دکن میں وفات پائی۔ درس گاہ ناصر الملت مولانا ناصر حسین صاحب قبلہ مجتہد سے فارغ التحصیل۔ ذریعۂ معاش ملازمتِ سرکار۔ وظیفہ ملا تو دربار معظم جاہ سے وابستہ ہو گئے۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں حیدرآباد آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے حتّی کہ دبستان دکن میں اہم مرثیہ گو شعراء میں حضرت ناصر زید پوری کا نام شامل کئے بغیر یہ فہرست مکمل نہیں ہوتی۔ مذہبی تعلیم کے علاوہ علاّمہ ناصر زید پوری کو عربی اور فارسی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ شاعری کم عمری میں شروع کی۔ ابتدا میں ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی، بالآخر تاریخ گوئی اور مرثیہ نگاری میں کمال حاصل کیا۔ اس کی ایک مثال علاّمہ ناصر زید پوری کی فارسی زبان میں وہ معرکۃ الآرا نظم جو اُنہوں نے ناصر الملت کی عراق سے واپسی پر کہی تھی۔ اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ اس کے عنوان اور ہر مصرع سے تاریخ نکلتی ہے۔ اُن کے مراثی میں شکوہ لفظی، خوبصورت تراکیب اور صحت کے ساتھ آیات قرآنی اور احادیث کو اس ہنرمندی سے نظم کیا گیا ہے کہ شکوہ لفظی کے افق پر سلاست کے چاند تارے چمکتے نظر آتے ہیں۔

علاّمہ زید پوری نے پہلا مرثیہ ۱۹۳۵ء میں کہا جب اُن کی عمر بیس برس تھی۔ اُن کا سارا کلام غیر مطبوعہ رہا اس لئے ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ اکّا دکّا کہیں کچھ بند چھپ گئے تو بس وہی محفوظ ہوئے۔ غیر مطبوعہ مراثی نہ جانے کہاں گئے۔ صرف اُن کے پانچ مرثیے اُن کے ایک شاگرد مرتضیٰ سلیم کے پاس بتائے جاتے ہیں۔ دکن کے ہفت روزہ ''انیس'' کی ۱۹۵۳ء کی ایک

اشاعت میں علاّمہ ناصرؔ زید پوری کے کچھ بند شائع ہوئے تھے جو جگہ جگہ نقل کئے گئے ہیں ۔

دیکھ لے پہلے نگاہوں سے اثر ہے کہ نہیں سوچ لے پہلے کہ سینے میں جگر ہے کہ نہیں
ہے وہ سردار جو سمجھے کہ یہ سر ہے کہ نہیں جان ہے، مال ہے، اولاد ہے، گھر ہے کہ نہیں
انقلابات کی تصویر ہو دل، سینے میں
روز منہ دیکھتا ہو موت کے آئینے میں

مرنے والے یہ سمجھتے نہیں قوت کیا ہے دل کے جذبات دبالے کوئی طاقت کیا ہے
حق پہ غالب ہو یہ باطل کی حقیقت کیا ہے زورِ شمشیر ہے کیا زورِ حکومت کیا ہے
قسمتیں جاگتی ہیں اُن جگر انگاروں کی
نیند آتی ہو جنہیں چھاؤں میں تلواروں کی

عشق کی سرحدِ آخر ہے شہادت بخدا ختم ہوتی ہے جہاں منزلِ تسلیم و رضا
ڈوب کر خون میں بڑھتا ہے جمالِ شہدا سر، جو بالائے سناں ہو تو ہے معراجِ وفا
رفعتِ قدر و شرف عرش سے ٹکراتی ہے
شان ہی اور شہیدوں کی نظر آتی ہے

ممتاز مرثیہ گو ضیاء الحسن موسوی کہا کرتے تھے کہ وہ علاّمہ ناصرؔ زید پوری کے شاگرد تھے۔ اُنہیں علاّمہ زید پوری کے مراثی کے بند کے بند یاد تھے لیکن افسوس کہ ضیاء الحسن موسوی بھی استاد کے کلام کو محفوظ نہ کر سکے جبکہ اُن کے وسائل بہت زیادہ تھے۔ ۱۹۴۷ء میں صوبہ بہار کے فرقہ وارانہ فسادات کی تباہی پر علاّمہ ناصرؔ زید پوری نے ایک مرثیے کا چہرہ لکھا تھا۔ ضیاء الحسن موسوی کو اس مرثیے کے بہت سے بند یاد تھے۔ اس مرثیے میں ناصرؔ زید پوری کی بصیرت فکر، اور حالات کے مشاہدے کی شدت بدرجہ اتم نمایاں تھی۔ لفظوں سے مظالم کی جو تصویر بنتی تھی وہ اتنی موثر ہوتی تھی کہ مرثیہ سننے یا پڑھنے والا خود کو فسادات کی زد میں سمجھنے لگتا تھا۔ یہی شاعری کا خاصہ ہے۔

علاّمہ ناصرؔ زید پوری کے کلام کی تلاش کی گئی تو بمشکل دکن کے ڈاکٹر صادق نقوی کے توسل سے ان کے مراثی کے کچھ بند مل سکے جو درج ذیل ہیں۔

سبطین وارثِ دارِ صفاتِ رسولؐ ہیں آئینۂ حقیقتِ ذاتِ رسولؐ ہیں
شرحِ سکون و عزم و ثباتِ رسولؐ ہیں سرمایۂ بہارِ حیاتِ رسولؐ ہیں

راہ عمل میں سب صفتِ بو تراب ہیں
تفسیر صلح و جنگِ رسالت مآب ہیں

سبطین نامور میں رسالت کے شاہکار یہ دو گہر ہیں، مہرِ نبوّت کے شاہکار
اپنی جگہ ہیں دونوں امامت کے شاہکار دونقش ہیں یہ خانۂ قدرت کے شاہکار
یہ ہیں شرف میں، مرتبہ میں، شان میں علیؑ
منبر پہ ہیں رسولؐ تو میدان میں علیؑ

خادم ہیں جن کی روح الامیں وہ حسنؑ حسینؑ علمِ خدا کے جو ہیں امیں وہ حسنؑ حسینؑ
ملتی ہے جن سے دولتِ دیں وہ حسنؑ حسینؑ روشن ہے جن سے شمعِ یقیں، وہ حسنؑ حسینؑ
ہیں لعلِ شب چراغ، رسالت مآب کے
یہ ہیں دل و دماغ، رسالت مآب کے

مرثیہ دراحوال سکینہ بنتِ حسینؑ ؎

عصر کے بعد ہے بدلا ہوا عنوانِ جہاد اب تو پیچھے بھی نظر آتے ہیں شایانِ جہاد
کچھ اسیری سے بڑھا اور بھی ارمانِ جہاد لے لیا سیّدِ سجّاد نے میدانِ جہاد
اب بھی تعلیمِ رسولِ عربیؐ جاری ہے
کوششِ صبرِ حسینؑ ابن علیؑ جاری ہے

اسی مقصد پہ اسیرانِ بلاکی ہے نظر وہی احساسِ محبت، وہی غم کا ہے اثر
ان کی رفتار سے ظاہر عملِ پیغمبر ان کی گفتار میں تاثیر زبانِ حیدر
فصحا و بلغا حُسنِ خطابت دیکھیں
خطبۂ حضرتِ زینبؑ کی بلاغت دیکھیں

وہ سکینہ جو فضائل کا اک آئینہ ہے وہ سکینہ جو کمالات کا گنجینہ ہے
وہ سکینہ کرمِ حق کا جو اک زینہ ہے جس کا آرام کدہ باپ کا خود سینہ ہے
سکھ یہ ہے، چین یہ ہے، روح یہ ہے، جان یہ ہے
رحل ہے سینۂ شبیر تو قرآن یہ ہے

؎ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے علاّمہ زید پوری کے مرثیوں کی تعداد ۱۰۵ لکھی ہے۔

''دبستان دبیر'' میں ڈاکٹر فاروقی نے دعویٰ کیا ہے کہ حضرت ناصر زید پوری، حضرت نجم آفندی کی تحریک اصلاح سے متاثر تھے اور مرثیوں کے ذریعے عقائد و سیرت کی تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ آل محمد کی ذوات مقدسہ کا مقصدِ حیات یہی تھا کہ کچلی ہوئی پسماندہ انسانیت کو رفعت آشنا کریں۔ یہی فکر ناصر زید پوری کے مرثیوں کا مرکزی خیال ہے اور انہیں جدید مرثیہ کا شاعر ثابت کرتی ہے۔

☆☆☆☆☆

میر حزیں لکھنوی:-

ولادت ۱۹۲۳ء، وفات ۱۹۶۶ء

نام میر ہاشم حسین، تخلص حزیںؔ۔ میر انیس کے پرپوتے میر محمد نواب غیور لکھنوی کے فرزند، شاید خاندان میر انیس کے آخری چراغ ــــ خاندان انیس کا شجرہ یہی بتاتا ہے کہ میر ہاشم حزیںؔ اس خاندان کے آخری چراغ تھے جسے بیماری نے مہلت نہ دی اور ۴۳ برس کی عمر میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ خاندان انیسؔ میں میر انیسؔ کے فرزند میر نفیسؔ کو شہرت ملی، میر نفیسؔ کے فرزند دولہا صاحب عروجؔ کو شہرت ملی۔ دولہا صاحب عروجؔ کے بیٹے لڈن صاحب فائزؔ کو بھی وہی رتبہ اور وہی شہرت ملی جو خانوادۂ انیسؔ کا حصہ تھی لیکن لڈن صاحب فائزؔ کے کوئی اولاد نرینہ نہ ہوئی۔ میر انیسؔ کے منجھلے بیٹے میر رئیسؔ کی نسل منے صاحب سلیمؔ پر ختم ہوگئی۔ میر سلیسؔ کے فرزند میر غیورؔ لکھنوی کے بعد ان کے بیٹے میر حزیں ۴۳ سال کی عمر میں لاولد انتقال کر گئے اور اس خانودے کی آخری شمع بجھا گئے۔

میر ہاشمؔ کی پیدائش تک میر غیورؔ کے پاس اجداد کی جاگیر کا بچا ہوا کچھ اثاثہ تھا۔ میر ہاشمؔ کی والدہ بڑے گھر کی بیٹی اپنے ساتھ ہیرے جواہرات لائی تھیں اس لئے کہ حزیںؔ کے نانا میر کاظمؔ حسین ہندوستان میں چوٹی کے جوہری اور جوہر شناس تھے لیکن ان کے داماد میر غیورؔ تجارت کی دنیا میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ اس دور میں ابھی تک میر انیسؔ کا سکہ چلتا تھا مگر میر غیورؔ شاعری کو منفعت کا ذریعہ بنانے پر آمادہ نہیں تھے۔ نتیجہ یہ کہ علم و ادب کے قدردان امراء یا صاحبِ ثروت اشراف میر غیورؔ کو مالی اسودگی نہ دے سکے اور غربت نے گھر میں ڈیرے ڈال دئے۔ میر غیورؔ کے انتقال کے بعد میر ہاشمؔ کی تعلیم بھی ختم ہوگئی۔ ذریعہ معاش تھا نہیں۔ کسی سے ملنا، کسی کے گھر جانا، کسی سے اپنی مفلسی کا ذکر کرنا کسرِ شان سمجھتے تھے۔ ایک جگہ ملازمت بھی کی جو چل نہ سکی۔ بچپن سے

شعر کہتے تھے مگر کسی کو سناتے نہیں تھے— نتیجہ یہ ہوا کہ رباعیات، سلام، مرثیے گمنامی کی نظر ہوتے رہے— چاروں طرف سے محرومیوں کو گلے لگانے کا نتیجہ ناسازیٔ طبع کی صورت میں نکلا۔ اب میر حزیںؔ بالکل تنہا ہو چکے تھے۔ صرف ایک میر ہادی حسین الحقؔ تھے جو خبر گیری کرتے رہے۔ میر حزیںؔ نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ بیماری بڑھی تو چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے۔ آخر کار ۲۲ر ستمبر ۱۹۶۶ء کی شام کو خاندانِ انیسؔ کا آخری چراغ بجھ گیا— اور اندھیرا چھا گیا۔ علم و ادب کے آسمان پر میر انیسؔ کے نام سے چاند تاروں کی جو کہکشاں تقریباً ڈیڑھ سو برس تک جگمگاتی رہی اُس کا آخری ستارا ۱۹۶۶ء میں خلاؤں میں ڈوب گیا۔

میر حزیںؔ کے چچازاد بھائی لڈن صاحب فائز ہر سال محمود آباد میں نوتصنیف مرثیہ پڑھا کرتے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں فائزؔ اپنے ساتھ میر حزیںؔ کو بھی لے گئے۔ فائزؔ سے پہلے میر حزیںؔ نے چند بند پڑھے تو لوگوں کو میر انیسؔ کی یاد تازہ ہوگئی۔ یہاں سے میر حزیںؔ نے مرثیہ گوئی کی طرف توجہ کی۔

لکھنؤ میں درگاہ حضرت عباسؑ میں میر قدیمؔ لکھنوی ہر سال نوتصنیف مرثیہ پڑھا کرتے تھے جو اُن کے بعد یہ مجلس ختم ہوگئی تھی۔ ۸ر ستمبر ۱۹۶۳ء میں میر حزیںؔ کے لئے یہ دوبارہ شروع کی گئی۔ میر حزیںؔ نے وہاں جو مرثیہ پڑھا اس میں اپنا شجرہ نظم کیا تھا۔

روشن ہو مثلِ مورثِ اعلیٰ میرا بھی نام — جن کو تھا صرف آلِ نبی کی ثنا سے کام
مقبولِ بارگاہِ شہنشاہِ خاص و عام — یعنی انیسؔ مرثیہ گو، عاشقِ امام
شیرینیاں علیؑ کی تھیں جس کی زبان میں
جن کا لقب خدائے سخن تھا زبان میں

باغ سخن کے جو گل تازہ تھے وہ انیسؔ — بزم ادب کی شمع یگانہ تھے وہ انیسؔ
بخشش کے مومنوں کی بہانہ تھے، وہ انیسؔ — جو میرے جدّ کے قبلہ وکعبہ تھے وہ انیسؔ
فرزند گو نفیسؔ و رئیسؔ و سلیسؔ تھے
پوتے قدیمؔ، اور غیورؔ و جلیسؔ تھے

میں ہوں اُنہیں غیورؔ کی دنیا میں یادگار — جو تھے خلف سلیسؔ کے باعزت و وقار
ثابت قدم غیور صفت ارتقا شعار — منصب تھا جن کا مدحِ شہنشاہِ نامدار

ہے اختیار جن کو حیات و ممات کا
در سے اُنہیں کے پایا ہے عہدہ نجات کا

تھا گلشن انیسؔ کا ہر گل وحید عصر ہے آلِ مصطفیٰ کی نگاہوں میں جن کی قدر
عشقیؔ کا افتخار تو دُنیا کو جائے فخر منزل میں ارتقاء کی جو کامل تھے مثل بدر
سر پر کلاہِ مدحِ علیؑ تاج ہوگئی
منبر پہ جو گیا اسے معراج ہوگئی

رکھا جو میں نے مدح کے میدان میں قدم روحِ انیسؔ نادِ علی کرنے آئی دم
آیاتِ فتح سینے پہ جدّ کر گئے رقم بخشا مجھے ''غیورؔ'' نے اعجاز کا قلم
کیوں کر نہ اب مجھے ملے منزل انیسؔ کی
ہیں پشت پر دعائیں قدیمؔ و جلیسؔ کی

روحِ حسنؔ نے، حُسنِ سخن کردیا عطا سایہ فگن خلیقؔ کی سر پر ہوئی دعا
مونسؔ میرے انیسؔ ہوئے شکرِ کبریا عارفؔ کی معرفت سے بڑھا اور مرثیہ
مقبول ان بزرگوں کی ایسی دعا ہوئی
حق نے مجھے عروج کی منزل عطا ہوئی

☆☆☆☆☆

زائر سیتا پوری:-

ولادت ۱۹۱۲ء۔ وفات ۱۹۶۶ء

نام سید محمد اطہر، تخلص زائرؔ، وطن سیتاپور۔ پہلا مرثیہ ۱۹۳۲ء میں کہا۔ زائرؔ سیتاپوری کے اپنے ایک معروف مرثیے کے ابتدائیے میں لکھا ہے کہ وہ کربلا کے عظیم واقعہ کی تاریخی حیثیت اور اہمیت کو اعتقادات پر برتری دیتے ہیں اس لئے زائرؔ کے مرثیوں میں ایک انقلابی روانی ہے اور امام حسینؑ کی ہر قربانی کے ساتھ ساتھ مقصدِ ایثارِ حسینؑ کا اظہار کیا ہے۔ اُنہوں نے مرثیہ گوئی کی ابتدا رنگِ قدیم میں کی تھی مگر بہت جلد اُنہوں نے جدید مرثیے کو فکری طور پر تسلیم کرلیا اور اس راہ پر خاصی دور تک گئے۔ پروفیسر محمد رضا کاظمی کو شکایت ہے کہ:

''زائر سیتاپوری کو اگرچہ بھلایا نہیں گیا مگر اُن کی خدمات کے

مطابق اُن کی قدر دانی بھی نہیں کی گئی "

(جدید اردو مرثیہ۔ محمد رضا کاظمی ص ۲۷۱)

محترم رضا کاظمی کی شکایت بھی بجا اور اُن کا دکھ بھی حق، مرثیے کے حوالے سے زائر سیتاپوری کا قرض ادا نہیں ہوا مگر میں برادر محترم رضا کاظمی سے عرض کرنا چاہوں گا کہ ہم پر تو اتنے قرض واجب الادا ہیں کہ شمار کریں تو بقول حضرت جوش ملیح آبادی اعداد کا سانس پھول جائے۔ کیا ہم نے جوش کا قرض ادا کیا؟۔ کیا میر و غالب کے ناموں کی تسبیح پڑھنے والوں نے میر کا قرض ادا کیا؟ غالب کا قرض ادا کیا؟۔۔۔ ذرا اور بلندی پر جا کر دیکھیے کیا ہم نے علیؑ اور اولادِ علیؑ کا قرض ادا کیا؟۔ ذرا اور اوپر چلیے... کیا ہم نے اُجرِ رسالت ادا کر دیا؟ یہ اجر تو ایمان کی شرط ہے۔۔۔ آپ تو زائر سیتاپوری کی بات کر رہے ہیں۔ ایک بندے کی بات کر رہے ہیں، ہم نے خدا کے قرض ادا نہیں کیے۔۔۔ آپ یقین رکھیے زائر کو بھی بہت کچھ ملا ہو گا مگر ہماری طرف سے نہیں بلکہ اُن کی طرف سے جن کی اُنہوں نے خدمت کی، جن سے مودّت کی۔ صاحبو! جملہ معترضہ کی معذرت، بلکہ جملہ ہائے معترضہ کی معذرت۔ بات ہو رہی تھی زائر سیتاپوری کے مرثیوں کی جو زیادہ تر غیر مطبوعہ ہیں۔۔۔ کل ۱۸ مرثیے یہاں وہاں بکھرے پڑے ہیں صرف ایک مرثیہ ایسا ہے جو بار بار شائع ہوا ہے۔

" دنیا کو ایک راہنما کی تلاش ہے۔"

اُردو ادب میں ایک تحریک ۱۹۳۵ء میں لندن سے شروع ہوئی تھی جس کا نام ترقی پسند تحریک تھا۔ ہندوستان میں ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔ اس تحریک میں شامل ادیبوں نے ادب برائے زندگی کو اپنے منشور میں رکھا اور غریبوں، بے کسوں، محنت کشوں اور کسانوں کی تکالیف کو ادب میں اُجاگر کیا۔ زائر سیتاپوری کا یہ مرثیہ ترقی پسند تحریک کا منظوم منشور لگتا ہے۔

عالم کے خشک و تر میں عجب انقلاب ہے سفاکیوں کا، ظلم و ستم کا شباب ہے
ہر زندگی جہان میں پُر اضطراب ہے امن و سکون کا لب بام آفتاب ہے
چھائی ہوئی ہے ظلمتِ غم کائنات پر
پردے پڑے ہوئے ہیں جمالِ حیات پر

دولت سے ہے تمیز شریف و رذیل کی پھر اس میں بھی حدیں ہیں کثیر و قلیل کی
انسانیت کی قدر نہ نفسِ جلیل کی [۳] بس مرکزِ خیال ہے جھولی بخیل کی
جنت ہے اک نگاہِ تمنّا کے سامنے
سجدے میں دل ہیں دولت دنیا کے سامنے

سرمایہ داریوں کے فلک بوس یہ محل عشرت کدوں کی شام و سحر یہ چہل پہل
کیا ہے فقط ہے یہ نفس پرستی کا اک عمل [۴] انسانیت کے واسطے کاشانۂ اجل
کھویا ہے دل، فریب تمدّن کی راہ میں
دم توڑتی ہے عزّت انساں گناہ میں

اُف درد سے بھری وہ کسانوں کی زندگی روتی ہے جن کے حال پہ خود ان کی بیکسی
وہ کشمکش حیات کی وہ اُن کی خامشی [۸] افلاس کی وہ اُن پہ نگاہیں جمی ہوئی
چپ ہیں، اگرچہ دل میں غمِ کائنات ہے
اک سازِ بے صدا ہے کہ اُن کی حیات ہے

ہاں پستیوں سے اوج کا ہے ایک راستہ دولت کے ہاتھ بیچئے سودا ضمیر کا
پھر دیکھئے تمام زمانے کا رنگھنا [۹] کیا دُور ہے جو آپ کو کہنے لگیں خدا
مافوق اپنے ظرف سے رتبہ بشر کا ہے
ادنیٰ سا ایک طلسم یہ اربابِ زر کا ہے

نظم و نسق میں رہبرِ اعظم بنا کوئی آزادیوں کی روحِ مجسم بنا کوئی
دنیا کو ترک کر کے مکرّم بنا کوئی [۱۱] اسرارِ کائنات کا محرم بنا کوئی
اب بھی مگر سکون کا دل پاش پاش ہے
دنیا کو ایک راہ نما کی تلاش ہے

اس رہنما میں قوتِ ایثار چاہئے سرمایہ سوز ہمتِ نادار چاہئے
پُر امن روحِ فطرتِ افکار چاہئے [۱۲] ہو صبر جس کا نام وہ تلوار چاہئے
دکھ درد سے بھرے ہوئے ہر دل کا چین ہے
وہ رہنما حسینؑ ہے، تنہا حسینؑ ہے

جو بیکسوں کے درد کا درماں ہے، وہ حسینؑ جو مفلسوں کی زیست کا ساماں ہے وہ حسینؑ
جو پیشوائے عالم امکاں ہے، وہ حسینؑ[۱۴] جو رہنمائے فطرت انساں ہے وہ حسینؑ
جس کا قدم دلیل ہے راہِ ثبات کی
جس کی اجل ہے روح، نظامِ حیات کی

اس مرثیے میں علی اکبر کی شہادت، علی اصغر کی شہادت کا احوال ہے مگر ہر بات امام حسینؑ کے حوالے سے ہے اس مرثیے کی بار بار اشاعت کا ایک ہی سبب معلوم ہوتا ہے کہ یہ عوامی مرثیہ ہے غریبوں اور مسکینوں کا احوال ہے اور حسینؑ ان مظلوموں کے رہنما ہیں—— مراثی میں غریب مجبور اور بیکسوں و ناداروں کا ذکر کوئی نہیں کرتا۔ اس مرثیے کو پڑھنے والے کو شاید اس میں اپنے دکھ درد مل جاتے ہیں۔ اس مرثیے کے علاوہ دوسرے مرثیوں میں بھی امام حسینؑ کی شخصیت، اُن کی سیرت، اُن کی قربانی، الغرض مرثیہ کا ہر بند اُن سے متعلق ہوتا ہے اور جو قربانیاں، جو رزم، یا منظر کشی ہوتی ہے اُس میں امام حسینؑ نمایاں نظر آتے ہیں۔

کہاں ہیں اہلِ نظر صاحبان ہوش تمام دکھادوں آج اُنہیں روئے شاہدِ آلام
یہاں نہیں کوئی قیدِ مذاہب و اقوام تمام اہل زمانہ کو ہے میرا پیغام
حسینؑ، فردِ مکمل بزرگ و برتر ہے
حسینؑ عالم انسانیت کا رہبر ہے

درِ حسینؑ نہیں وقفِ قید ملت و دیں تمام خلق یہاں آکے ٹیکتی ہے جبیں
وفا و ہمت و ایثار و صبر کے آئیں فقط حسینؑ نے بتلادئے ہیں یا کہ نہیں
حسینؑ شخصیت غیر اختلافی ہے
حسینؑ کافی ہے، تنہا حسینؑ کافی ہے

اک اُسوۂ حسنہ ہے حسینؑ کی سیرت ضمیر کی وہ بلندی وہ نفس کی رفعت
حدِ عروج سے آگے قدم کی ہر برکت جو ہوتی ظرف میں انسان کے ذرا وسعت
دلوں کو جلوہ گہ غیرینِ کردیتے
حسین سارے جہاں کو حسینؑ کردیتے

زائر سیتاپوری رسوماتِ عزاداری میں بھی خلوصِ نیت کے متلاشی تھے۔

رسم و رواج، سوگ قتیلِ جفا نہیں جس میں نمائشیں ہوں وہ کوئی عزا نہیں
پھر کچھ نہیں ہے درد، جو درد آشنا نہیں کیا یہ سمجھ رہے ہو یہاں کربلا نہیں
نظروں میں قتل گاہ کی ہر واردات ہے
دل کربلا ہے آنکھ ہماری فرات ہے

۹ محرم کی رات کو یزیدی فوج نے اچانک قیام حسینی پر حملہ کر دیا تھا، امام حسینؑ نے رات کے اندھیروں میں ہونے والی جنگ کو دن کے اُجالوں میں کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک رات کی مہلت طلب کی گئی — کل صبح حتمی جنگ ہونی ہے۔ کل صبح سے سروں کی فصلیں کٹنی شروع ہوں گی۔ حسینؑ اپنے چاند ستاروں کو قربان کریں گے، کربلا میں اس رات کو بہت سے شاعروں نے نظم کیا ہے جن میں انیسؔ و دبیرؔ بھی ہیں۔ لیکن زائرؔ سیتاپوری کا انداز دیکھئے۔

نویں کو بند ہوا گفتگوئے صلح کا باب نگاہِ امن و اماں جھک گئی بہ فرطِ حجاب
وہ ایک رات کا بیچ اور وہ قہر کے اسباب ہوئی جو شام تو نکلا رُندھا ہوا ماہتاب
بخار اُٹھتا تھا سینوں سے، دل تھا ہلچل میں
گھٹا ہوا تھا دھواں کربلا کے جنگل میں

''بند ہوا گفتگوئے صلح کا باب'' اور ''نگاہِ امن و اماں جھک گئی بہ فرطِ حجاب'' زائرؔ سیتاپوری کی زبان اور اُنہیں کا لہجہ ہو سکتا ہے جو تاریخِ کربلا کو شہنشاہیت کے ایماء پر لکھی گئی تاریخ کے مدمقابل کھڑا کر دے۔

☆☆☆☆☆

اثرؔ لکھنوی :-

ولادت ۱۸۸۵ء وفات ۱۹۶۷ء

اسم گرامی نواب مرزا جعفر علی خان، تخلص اثرؔ۔ مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی کے شاگرد۔ اُنہوں نے ''آئینۂ شہادت'' کے نام سے صرف ایک مرثیہ کہا۔ یہ مرثیہ ۱۹۳۴ میں شائع ہوا۔

اے خامۂ رنگیں رہِ مدحت میں رواں ہو

اثرؔ لکھنوی کو بچپن سے ہی مرثیے سے لگاؤ رہا۔ اور اُن کا شعری ذوق دیگر اصنافِ سخن سے زیادہ مرثیہ کی طرف راغب رہا۔ اُردو مرثیے کی تاریخ پر اُن کی گہری نظر تھی اور اس کی فنی

باریکیوں سے بھی خوب واقف تھے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے اپنی تنقید ''اُردو مرثیہ اور انیسؔ'' لکھی اور میر انیسؔ پر اعتراضات کئے تو اس کے جواب میں پہلی کتاب آثرؔ لکھنوی نے لکھی جس کا نام ''انیسؔ کی مرثیہ نگاری'' تھا—اپنے پرائے دوست دشمن سب نے تسلیم کیا ہے کہ ''انیس اور مرثیہ نگاری'' تنقید کی ایک جامع کتاب ہے جس میں میر انیسؔ پر اعتراضات کا بھی جواب ہے اور اُن کے محاسن پر بے لاگ مثبت تنقیدی تبصرہ بھی ہے۔

حضرت جوشؔ ملیح آبادی نے ''یادوں کی بارات'' میں آثرؔ لکھنوی کو ''علم عروض و فن شاعری کے اُستاد اور فارسی اور انگریزی ادب کے زبردست ''نباض'' لکھا ہے۔ یہ اس جوشؔ کے الفاظ ہیں جو عام طور پر کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

اُردو زبان و بیان میں حضرت آثرؔ لکھنوی گہری نظر رکھتے تھے۔ جس زمانے میں لکھنؤ میں مرثیے کو غیر مصدقہ روایات سے ہٹا کر تاریخ اور واقعات کی طرف لے جانے کی کوششیں جاری تھی اس دور میں آثرؔ لکھنوی نے نسیمؔ امروہوی کے مرثیے پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا——

''مرثیے کو اگر زندہ رکھنا ہے تو زمانے کے ساتھ اس کا رنگ بدلنا ہوگا اور واقعات سے زیادہ فلسفۂ واقعات بیان کرنے کی ضرورت روز بروز زیادہ شدت سے محسوس ہوگی''

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مرثیہ گو شاعر ہونے سے زیادہ مرثیے کے نقاد تھے۔ ان کے اپنے واحد مرثیے کے دو بند ملاحظہ ہوں۔

اللہ رے شوقِ رخِ گلفامِ شہادت ۔۔۔ پیہم لبِ جاں بخش یہ تھا نامِ شہادت
جاگے گی تیرے فیض سے تقدیرِ شہادت ۔۔۔ پھر کیوں نہ ہو اس شان سے انجامِ شہادت
قاتل کا اگر ہاتھ رُکا آنکھ بھر آئی
خنجر نے کمی کی تو رگِ جاں اُبھر آئی

اے جانِ وفا، معنی و تفسیرِ شہادت ۔۔۔ ہر قطرۂ خوں ہے تیرا تنویرِ شہادت
جاگی ہے تیرے فیض سے تقدیرِ شہادت ۔۔۔ گذری ہے سرِ عرش سے توقیرِ شہادت
مشہورِ جہاں حُسنِ گلو سوز ہے تیرا
اے شمعِ حرم شعلہ دل افروز ہے تیرا

☆☆☆☆☆

کاظم حسین واثق:-

پیدائش ۱۹۰۰ء۔ وفات ۱۲ اپریل ۱۹۶۷ء۔

نام سید کاظم حسین۔ تخلص، واثقؔ۔ حیدر آباد کے معروف جاگیردار نواب سید عبداللہ کے فرزند، جامعہ نظامیہ سے فارغ التحصیل۔ مرزا علی جعفر سے شرف تلمذ تھا جو دبستان ناتخ کے معروف اساتذہ میں شمار ہوئے ہیں—

واثقؔ مرثیے کی روایت کے حامی تھے۔ لوازم مرثیہ کے پاسدار تھے، اور مرثیہ کا مقصد کل گریہ و بکا سمجھتے تھے— اسی لئے اُن کے مراثی کم از کم ۱۵۰ بند پر مشتمل ہوتے تھے۔ واثقؔ نے ۳۰ مرثیے کہے ہیں۔ ہر سال اپنی بنا کردہ مجلس میں نوتصنیف مرثیہ پیش کرتے تھے اور یہ سلسلہ کم و بیش تیس برس جاری رہا۔ ریاست کے علماء، شعراء، امرا اور باذوق سامعین ان مجالس میں شرکت کرتے تھے۔ واثقؔ اپنے عہد کے ممتاز شاعر تھے جن کا شمار اساتذۂ وقت میں ہوتا تھا لیکن افسوس کہ ان کے مراثی کا کوئی مجموعہ شائع نہ ہوسکا۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ مرثیے اُن کے مختلف رشتہ داروں کے پاس ہیں۔ کچھ مرتضیٰ سلیم کے پاس ہیں۔ زیادہ تر ضائع ہوگئے۔ ڈاکٹر صادق نقوی نے کاظم حسین واثقؔ کے دو مراثی کے چند بند نقل کئے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

(۱) مرثیہ در احوال امام حسین علیہ السلام ؎

پھر اسی نور سے اک نور ہوا اور جدا　　نور اوّل جو ہوا عقل تو یہ نقش بنا
تیسرے نور کی خالقت ہوئی پھر تو تنہا　　گیارہ انوار ہوئے دوسرے سے پھر پیدا
اپنے افضال سے حق نے انہیں عزت بخشی
کی عطا اُن کو ولایت تو امامت بخشی

مصائب کا بیان ؎

دہم ماہِ محرم کو عجب تھا محشر　　ظہر تک ختم ہوئے شہ کے رفیق و یاور
پھر عزیزوں نے بھی کی جان فدا جا جا کر　　حد ہوئی سوگئے آغوشِ لحد میں اصغر
ہر طرف سے تھے شہ دیں کو ستمگر گھیرے
ایک پیاسے کو تھا دو لاکھ کا شکر گھیرے

آخرش حال سیہ خونخواروں نے حضرت کا کیا　　ڈگمگانے لگے گھوڑے پہ امامِ دوسرا

پاؤں بھی ہو گئے حلقوں سے رکابوں کے جدا آئی یہ پہلوئے شبیر سے زہراؑ کی صدا
خاک پر گرتا ہے گھوڑے سے سنبھالے کوئی
میرے بچّے کو اس آفت سے بچالے کوئی

(۲) مرثیہ دراحوال حضرت عباس علیہ السلام ۔

بخدا آئینہ مہر و وفا ہے عباسؑ اخترِ عشق و محبت کی ضیاء ہے عباسؑ
مسندِ عزم و مروّت کی جلا ہے عباسؑ مذہبِ عشق کا اک راز کشا ہے عباسؑ
شہ کی خدمت میں سدا عمر بسر کرتے رہے
عشقِ شبیر کا دم شام و سحر بھرتے رہے

ان کے ہاتھوں سے وفا کا ہوا شاداب چمن ان سے ہے نامِ وفا دہر میں اب تک روشن
باوفا اُن سے وفاداری کا سیکھے ہے چلن بخدا یہ میں زمانے میں وفا کے معدن
پھر وفاداری کسی سے نہ ہویدا ہوگی
یہ نہ ہوتے تو وفا گاہ نہ پیدا ہوتی

مقامِ حیرت وعبرت ہے کہ جس مرثیہ نگار کے مرثیے تمیں برس تک حیدرآباد (دکن) کی فضاؤں میں گونجتے رہے آج اسکا کلام بھی ضائع ہورہا ہے اور اس کا نام بھی بھلایا جارہا ہے اور وہ بھی سرزمینِ حیدرآباد پر جہاں محبتوں کے اشجار پر وفاؤں کے پھول کھلتے ہیں، جہاں مرنے والوں کی یاد میں اشکوں کے چراغ جلتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

فہیم امروہوی:-

ولادت ۱۸۸۷ء وفات ۱۹۶۷ء

نام سیّد خلیق حسن۔ تخلص فہیمؔ۔ وطن امروہہ۔ ان کے بھائی سیّد غلام احمد بھی شاعر تھے جنہوں نے ''دیوان ذوق'' ترتیب دیا تھا ـــــ دبستانِ لکھنؤ کے شعراء میں میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، مرزا اوجؔ، میر اُنسؔ اور ذاخر لکھنوی نے ''مختار نامہ'' نظم کیا ہے۔ دبستانِ امروہہ کے شعراء میں حضرت شمیمؔ امروہوی، سیّد اسد اللہ اسدؔ کے بعد فہیمؔ امروہوی نے بھی ''مختار نامہ'' نظم کیا ہے۔ فہیمؔ خود اس سلسلے میں کہتے ہیں ۔

مختار نامہ لکھا ہے ہر اک فہیمؔ نے
اوجؔ و دبیرؔ و انسؔ و انیسؔ و شمیمؔ نے

یہاں لفظ فہیمؔ کا استعمال اُن کی قدرت شعر گوئی پر دلالت کرتا ہے۔ فہیمؔ بیساختہ مرثیہ کہتے تھے۔ انہوں نے مرثیے کے لوازم میں گھوڑے اور تلوار کی تعریف پر توجہ نہیں دی لیکن ''ساقی نامہ'' اور ''جنگ'' کو ٹھوک بجا کر پیش کر کے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ بین کے معاملے میں کلاسیکی روایت کے پابند تھے۔

صاحب سلسلۂ صبر و رضا ہے زینبؑ زینت مسند اخلاق و وفا ہے زینبؑ
نورِ عینینِ شہ عقدہ کشا ہے زینبؑ معدنِ حسرت و اندوہ و بلا ہے زینبؑ
قرۃ العین علیؑ، فاطمہؑ کی دختر ہے
کیوں نہ مظلوم ہو، مظلوم کی یہ خواہر ہے

گھر میں حیدرؑ کے یہ دختر ہوئی جس دم پیدا سُن کے سلماںؔ سے خبر، آئے رسولِ دوسرا
اپنی آغوش میں حضرت نے نواسی کو لیا پیار کرتے رہے تا دیر اُسے شاہِ ہدا
پھر ہوئی شدّتِ غم اشکوں سے منہ دھونے لگے
چوم کر شانے رسولِ دوسرا رونے لگے

فہیمؔ نے ایک مرثیہ سیدہ فاطمہ زہراؑ کے احوال کا بھی کہا ہے جو بہت درد انگیز ہے۔ سرورِ انبیاء کے وصال کے بعد تاریخ بتا رہی ہے کہ جناب سیدہ پدرِ گرامی کی جدائی کے صدمے کو برداشت نہیں کر پا رہی تھیں۔ اس وقت کے جملہ اسباب و علل پر بحث ہمارا موضوع نہیں ہے چنانچہ اس پہ اکتفاء کہ حضرت علیؑ سے کہا گیا کہ سیدہ کی گریہ وزاری سے دوسرے لوگ پریشان ہوتے ہیں ان سے کہیئے کہ دن کو اپنے بابا کو رو لیا کریں لیکن رات کو آرام کیا کریں۔ علی مرتضیٰ نے جب یہ پیغام جنابِ سیدہ کو دیا تو جواباً (تاریخ کے اندراجات کے مطابق) جنابِ سیدہ نے جو فرمایا تھا اُسے فہیمؔ نے اپنی فکر کے تحت بڑے گداز سے نظم کیا ہے۔

بے سایہ ہو پدر سے میرا سرؔ، نہ روؤں میں دنیا سے اُٹھیں شافعِ محشر، نہ روؤں میں
جائیں جہاں سے دین کے سرور، نہ روؤں میں کوئی بتائے، باپ کو کیوں کر، نہ روؤں میں

اشکوں سے منہ کو اپنے بھگوتا نہیں ہے وہ
کیا جس کا کوئی مرتا ہے روتا نہیں ہے وہ؟

اور پھر بڑے دکھ میں سیدہ فاطمہ زہراؑ جو الفاظ منسوب ہیں انہیں فہیم نے نظم کیا ہے۔

کہیے کہ غم میں باپ گئے بے جان ہے فاطمہ
دنیا میں چند روز کی مہماں ہے فاطمہ

اور پھر ہوا بھی یہی کہ حضور نبی اکرمؐ کے بعد جناب سیدہ چند مہینے بھی نہ جی سکیں اور اپنے بابا کے پاس چلی گئیں ـــــ فہیم نے مکالمہ نگاری کی بھی اعلیٰ مثالیں چھوڑی ہیں۔ جہاں جہاں اُنھوں نے مرثیوں میں مکالمہ نگاری کی ہے، مکالمہ نگاروں کے کردار، واقعات، منصب اور تاریخ سب لوازم کا پاس کیا ہے جو شعری اوزان اور وزن بحور کی پابندیوں کے درمیان دشوار امر ہوتا ہے لیکن فہیم کی مکالمہ نگاری دیکھیے۔

حاضر ہوں خدمتِ شہ عالی جناب میں
دیکھا ہے یا علیؑ ابھی بابا کو خواب میں

☆☆☆☆☆

زیبا ردولوی :-

ولادت ۱۹۰۷ء وفات ۱۹۶۸ء (۶۱ برس)

نام سید علی حسنین، تخلص زیبا، قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی (یوپی) میں ولادت ہوئی۔ والدِ گرامی کا نام سید محمد حسنین رضوی۔ اُردو، عربی، فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر سے ملی۔ شیعہ کالج لکھنؤ سے ایف۔ اے کیا۔ یہیں سے شعر گوئی میں دلچسپی شروع ہوگئی۔ جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے اور ایم۔ اے کیا۔ پہلے ایک صوفی شاعر وحید الہ آبادی پر تحقیق کی ـــ اس دور میں اُن کا سب سے بڑا کارنامہ میر انیسؔ کے کلام کا تحقیقی مطالعہ تھا جو "مطالعہ انیس" کے نام سے حیدر آباد دکن میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ جب حیدر آباد دکن میں تھے تو حضرت نظم طباطبائی سے اصلاح لیتے تھے۔ بعد میں نجم آفندی کے شاگرد ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آئے اور کراچی میں آباد ہوگئے۔

۱۹۵۶ء میں پہلا مرثیہ ــ "حق ہے ہر شمع کو پروانہ جانباز ملا" ـــ یہ مرثیہ محفل حسینیہ ایرانیان میں پڑھا گیا اور بہت داد پائی۔ اس سے پہلے کراچی میں علامہ رشید ترابی۔ زید۔ اے۔

بخاری، آلِ رضا، ڈاکٹر یاور عباس وغیرہ کی سرپرستی میں مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی فضا بن چکی تھی۔ زیبا ردولوی کے ایک کامیاب مرثیے کے بعد لوگوں نے اُن کے راستوں میں آنکھیں بچھادی اور پھر اُنہیں ہر سال نوتصنیف مرثیہ پڑھنا ہوتا تھا۔ جب تک زندہ رہے ہر سال نوتصنیف مرثیہ پڑھتے رہے۔

زیبا ردولوی نے غزل، قصیدہ، سلام، رباعی، نظم اور مرثیہ ہر صنفِ سخن میں بھرپور شاعری کی ہے۔ مرثیے کی دنیا سے باہر کے شعراء بھی زیبا صاحب کو مستند شاعر تسلیم کرتے تھے۔ بدقسمتی سے زیبا ردولوی کا کلام غیر مطبوعہ رہ گیا — وہ تاریخی واقعات کو آیات یا احادیث کی کسوٹی پر پرکھ کر نظم کرتے تھے۔ مرثیے میں اُن کی زبان میر انیس اور مرزا تعشق کے رنگوں کا امتزاج تھی۔ اُن کا ایک مرثیہ ''اپنے ماحول کا آئینہ بشر ہوتا ہے'' ختمی مرتبت کی بارگاہ میں ایک نذرانۂ عقیدت ہے۔ اس میں نعتیہ بند ملاحظہ کیجئے ؎

قدسی الاصل تھا دراصل وہ آنے والا ہم گنہگاروں میں قرآن کو لانے والا
رشتۂ عبد و احد یاد دلانے والا پیکرِ خاک کو انسان بنانے والا
نہ ملائک، نہ کسی جان کو معراج ملی
اس کا صدقہ تھا کہ انسان کو معراج ملی

مرثیے میں زیبا ردولوی نے جہاں مصدقہ واقعات کو نظم کیا ہے وہاں کلام پاک کی آیات اور تفسیر کو بھی نظم کیا ہے — سورۂ بقر کی ۳۱ ویں آیت کو پیش نظر رکھ کر ذیل کا بند پڑھئے ؎

خالقِ لوح سے تزئین عبادت سیکھی مالکِ وحی سے تعلیمِ روایت سیکھی
اپنے معبود سے تکلیفِ عبادت سیکھی مبدءِ علم سے تعلیمِ رسالت سیکھی
عَلَّمَ آدمَ الاَسمَاء کا مقصود بنا
سر فرشتوں کے جھکے کعبۂ مسجود بنا

اسی طرح فرعون کے سامنے حضرت موسیٰ نے اللہ کی حاکمیت کا جو اعلان کیا (سورۂ الشعراء۔ آیات ۲۴۔۲۸) ان آیاتِ الٰہی کو پڑھ کر مندرجہ ذیل بند سماعت کیجئے ؎

محفلِ روزِ ازل، حسنِ تماشا اس کا روح اجسام میں ادنیٰ سا کرشمہ اس کا
سانس کی آمد و شد فیض کا دریا اس کا عقل و جذبات میں ہے ربط اشارا اس کا

سرَ نے سجدے کے لئے عقل رسا بھی پائی
دل نے سینے میں دھڑکنے کی ادا بھی پائی

حضرت ابوطالب نے حضور نبی کریمؐ کی جس طرح کفالت اور حفاظت کی اُسے تاریخ اسلام نے کہیں بھی نہیں جھٹلایا۔ جس زمانے میں کفار قریش نے شعب ابی طالب کا محاصرہ کیا اور سامان رسد تک پہنچانے پر پابندی تھی اس زمانے میں حضرت ابوطالب رات کو دو دو تین تین دفعہ نبی کریمؐ کے سونے کی جگہ تبدیل کرتے تھے اور نبی کی جگہ اپنے بیٹوں کو سلاتے تھے کہ کہیں کوئی رات کو چھپ کر حضرت محمدؐ کو قتل نہ کر دے ـــــ حضرت ابوطالب کے ایمان پر انگلیاں اُٹھانے والے بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت ابوطالب کی سرپرستی اور تحفظ نہ ہوتا تو حضور کے لئے دشواریاں شاید ناقابل برداشت ہو جاتیں۔ آخر جس سال حضرت ابوطالب اور حضرت خدیجہؑ کا انتقال ہوا حضور کو مکّہ سے مدینے ہجرت کرنی پڑی ـــــ زیبا ردولوی نے حضرت ابوطالب کی سرپرستی، محبت اور حفاظت کو کس خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔

وہ ابوطالبِ عالی، جو محمدؐ کے ولی مرتے مرتے جو رہے پشت پناہِ نبوی
سر بسر خُلق و مدارات، سراپا نیکی ظرف کو دیکھ کے اللہ نے بھی نعمت دی
اہل امانت کا جو اللہ نے پایا ان کو
سر پرست اپنے محمدؐ کا بنایا اُن کو

وہ محبت تھی محمدؐ سے، نہیں جس کی مثال ذمہ داری کا بھی احساس تھا باحدِ کمال
جاگتے سوتے محمدؐ کی حفاظت کا خیال ان کے بستر پہ لٹا دیتے تھے اپنے اطفال
شب ہجرت جو علی سوئے، نئی بات نہ تھی
ایسی راتیں بہت آئی تھیں وہی رات نہیں

اور 'امن' کے موضوع پر زیبا ردولوی کے ایک مرثیے سے اقتباس مطالعہ فرمایئے

امن ہی عین عبادت ہے، عبادت کی قسم امن ہی جان ہدایت ہے ہدایت کی قسم
امن ہی اصل ہے ایماں کی، رسالت کی قسم[14] امن ہی کار امامت ہے امامت کی قسم
اس کی ترویج کو مذہب کے اصول آئے ہیں
اس کی تبلیغ کو دنیا میں رسول آئے ہیں

امن یہ ہے شجرِ ظلم نہ پھلنے پائے آتشِ فتنہ زمانے میں نہ جلنے پائے
وار ابلیس کا، انسان پہ نہ چلنے پائے[۱۵] زندگی خیر ہے شر سے نہ بدلنے پائے
حسنِ فطرت ہو، ہوس کار نگاہیں نہ اٹھیں
قلب مجروح نہ ہو دل سے کراہیں نہ اٹھیں

امن یہ ہے کہ جو سچ بات ہو وہ سچ کہلائے سب کو محنت کا ثمر حسب ضرورت مل جائے
غیر کے منہ سے نوالا نہ کوئی چھین کے کھائے[۱۶] رنگ اور نسل کی تفریق سے کچھ فرق نہ آئے
دل پریشان نہ ہو، تحصیل فراغت کے لئے
سب کو جمعیتِ خاطر ہو عبادت کے لئے

امن یہ ہے کہ جو حقدار ہو، حق اس کو ملے چاک دل، چاک جگر، چاک گریباں بھی سلے
غنچۂ خاطرِ ناشاد کچھ اس طرح کھلے[۱۷] جو ہے بنیادِ تمدن وہ ہلائے نہ ہلے
جذبۂ خیر بھی انسان میں بڑھتا جائے
اور بشر بامِ ترقی پہ بھی چڑھتا جائے

اسی خوبو کے شرف سے ہیں نجیب اور شریف اسی پاکیزگیٔ روح سے یہ دل ہے عفیف
اسی طینت کے تاثر سے ملا دینِ حنیف[۲۰] اسی تطہیرِ صفت کا ہے یہ لطف اور لطیف
اپنی گردن میں بھی فتنوں ہی کے پھندے ہوتے
ہم اگر آلِ محمدؐ کے نہ بندے ہوتے

☆☆☆☆☆

فرید لکھنوی:-

ولادت ۱۸۸۲ء وفات ۱۹۶۸ء

نام سیّد رضی حیدر عرفیت سلطان صاحب تخلص فرید۔ میر انیس کے پرپوتے — پیارے صاحب رشید کے بھانجے تھے۔ انہیں کے کہنے پر مرثیہ گوئی شروع کی اور ابتدا میں روایتی طرز کے طویل مرثیے لکھے۔ فرید صاحب کے سارے غیر مطبوعہ مرثیے اُن کے فرزند ارجمند ڈاکٹر سید افتخار احمد کے پاس محفوظ تھے، 'سرفراز' لکھنؤ شمارہ فروری ۱۹۶۹ء میں مطبوعہ ڈاکٹر افتخار احمد کے بیان کے مطابق وہ ان مراثی کو شائع کرانے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر اس کام کی تکمیل

سنہ ۲۰۰۲ء تک نہ ہو سکی تا آنکہ سنہ ۲۰۰۳ء میں ڈاکٹر تقی عابدی نے 'اظہار حق' کے نام سے سلطان صاحب فریدؔ کا مجموعہ کلام شائع کیا جس میں پندرہ مراثی، پندرہ سلام، اور ۳۶ رباعیات شامل ہیں۔ کتاب میں ڈاکٹر افتخار احمد نے 'فرید کے حالات زندگی' کے زیر عنوان اس ساری جد و جہد کی داستان لکھی ہے جو قطرے سے گہر ہونے تک پیش آئی اور تسلیم کیا ہے کہ یہ نیک کام ڈاکٹر حسن اختر (فرید صاحب کے پوتے، ڈاکٹر اختر احمد کے فرزند) کے حوالے سے ڈاکٹر تقی عابدی نے سر انجام دیا ہے۔

سید ضمیر اختر نقوی نے (خاندانِ انیسؔ کے نامور شعراء، میں) سلطان صاحب فریدؔ کے مراثی کی تعداد ۲۳ لکھی ہے اور ان مراثی کے مصرع ہائے اولیٰ اور ہر مرثیہ کا سال تصنیف بھی درج کیا ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے کتاب کے پیش لفظ میں بڑے دکھ کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ سلطان صاحب فریدؔ ایسے عظیم الشان شاعر اور نامور فنکار پر کسی نے ڈاکٹریٹ تو ایک طرف تنقیدی مقالہ تک نہیں لکھا سوائے دو صفحات پر مشتمل ڈاکٹر فدا حسین مرحوم کے لکھے ہوئے ایک تعارفی نوٹ کے اور حضرت محدث لکھنوی کے ایک طولانی مضمون (مطبوعہ ۱۹۵۹ء) کے جسے سید ضمیر اختر نقوی نے 'خاندان انیس کے نامور شعراء' میں فرید لکھنوی پر لکھے گئے اپنے مضمون میں ضم کیا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اس مضمون کے مندرجات کو غلط قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ:

> 'اس تحریر میں مرثیوں کی تعداد غلط، مرثیوں کے سنِ تصانیف غلط، مرثیوں کے بندوں کی تعداد غلط، اور سلام اور رباعیات کے بارے میں کوئی اطلاعات درج نہیں۔' (پیش لفظ کتاب اظہار حق، ص ۳)

سلطان صاحب فریدؔ کا عالم گھرانے سے تعلق تھا اس لئے بچپن سے ہی تعلیم کو فوقیت دی گئی جو گھر سے شروع ہوئی اور کتب خانہ ناصریہ کے مہتمم مولانا حامد حسن سے فارسی، عربی کی تعلیم کے بعد مولانا سید سبط حسن اور سرکار ناصر الملت ایسے جید علماء کی زیر سرپرستی جادۂ علم پر سفر کیا تب کہیں شعر گوئی بالخصوص مرثیہ گوئی کی اجازت ملی۔ ابتدا میں ان کے ماموں اور شفیق استاد پیارے صاحب رشیدؔ نے اسلاف کے مرثیے پڑھنے کی تاکید کی۔ یہی وجہ ہے کہ سلطان فریدؔ کے کلام میں انیسؔ و خاندانِ انیسؔ کا رنگ گہرا ہے۔ انہوں نے پہلا مرثیہ ۱۹۱۶ء میں کہا۔

شگفتگی گُلِ مضموں کی ہے بہارِ سخن

سید ضمیر اختر نقوی نے مراثی کی تعداد اور سنِ تصنیف کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ یہ اُن طویل مرثیوں کی فہرست ہے جن میں ۲۰۰ سے لے کر ۲۶۵ بند ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اسے غلط قرار دیا ہے۔ اور سید ضمیر اختر نقوی کی اس بات کی بھی تردید کی ہے کہ

''۱۹۳۸ء میں فرید لکھنوی نے مختصر مرثیے کہنے شروع کیے اور اس اختصار گوئی کا پہلا مرثیہ ''اظہارِ حق عبادتِ پروردگار ہے'' تھا جس کے ۶۰ بند تھے''

ڈاکٹر تقی عابدی نے اس تردید کی تائید میں حضرت فرید لکھنوی کا مرثیہ 'اظہارِ حق، عبادتِ پروردگار ہے'' راقم الحروف کو بھی ارسال کیا ہے جو ۲۱۳ بند پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی کہتے ہیں کہ فرید لکھنوی کا شمار مرثیہ کے شہسواروں میں کیا جانا چاہئے۔ انہوں کے اس اقرار کے باوجود کہ میر انیسؔ کی شاعری کے وسیع کینوس تک پہنچنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں، میر انیس اور فرید لکھنوی کے اشعار کا تقابل کیا ہے جو بہت دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ فرید نے ساقی نامہ اور بہار کا انداز، پیارے صاحب رشیدؔ سے اور وسعتِ فکر و بیان میر انیسؔ کی پیروی سے حاصل کی ہے اور وہ اس کا برملا اقرار بھی کرتے ہیں، انہیں خانوادۂ انیسؔ سے متعلق ہونے پر فخر بھی ہے۔

میں بھی ہوں، وارثِ طرزِ سخنِ میر انیسؔ
ہوں تعشّق کے سبب، ملکِ مضامیں کا رئیسؔ
مونسِؔ خلق ہوں میں میری زباں ہے جو سلیسؔ
ایک ہی باغ کے دو پھول ہیں میں اور نفیسؔ

سلطان صاحب فرید لکھنوی کا انتقال ۲۶ دسمبر ۱۹۶۸ء کو ہوا۔ مجلسِ جہلم مولانا سید ابن حسن نونہروی نے پڑھی تھی جس میں مولانا نے فرید کی شاعری اور مرثیہ گوئی کی خوبیوں کو بیان کیا تھا۔ جو لوگ نونہروی صاحب قبلہ کی مجالس سننے کا شرف حاصل کر چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ نونہروی صاحب جو نثر بولتے تھے وہ آج کے بہت سے شاعروں کی نظم سے بہتر ہوتی تھی۔ حضرت ہنر لکھنوی اور سید محمد نقی محدث نے فرید صاحب کے قطعاتِ تاریخ لکھے تھے — امام مظلوم کا مرثیہ گو ماتم گسار، خاک کربلا کا وارث، کربلائے امداد حسین لکھنؤ میں سپرد خاک ہوا۔ جہاں سے آج بھی روشن ضمیروں کو فرید کی آواز سنائی دے رہی ہوگی۔

جو ساتھ دے حسینؑ کا جنت سے ہو قریب روِیا کرے گی بیکسی ایسے ہیں یہ غریب
قربان ہو جو راہِ خدا میں ہے خوش نصیب یہ دکھ، یہ غم، یہ رنج اُٹھانا کسے نصیب
اک دن محبّ حسینؑ کے، جاں اپنی کھوئیں گے
ہم کاش ساتھ ہوتے یہ کہہ کہہ کے روئیں گے

☆☆☆☆☆

استاد قمر جلالوی:- (کراچی)

ولادت ۱۸۷۲ء وفات ۱۹۶۸ء

نام سیّد محمد حسین ہمدانی، تخلص قمر۔ علی گڑھ کے نزدیک قصبہ جلالی میں پیدا ہوئے، اسی حوالے سے جلالوی لکھتے تھے۔ ان کے اجداد ہمدان سے ترک وطن کر کے 'جلالی' میں آباد ہو گئے تھے۔ اجداد کا پیشہ سپاہ گری تھا لیکن خدمات کے صلے میں زمین ملی تو زمیندار ہو گئے۔ قصبہ جلالی کے سکول کے علاوہ گھر میں عربی، فارسی اور اُردو کی تعلیم حاصل کی۔ صغیر سنی میں شعر کہنے شروع کر دئے۔ فن شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں تھے البتہ امیر مینائی سے بہت متاثر تھے۔ تقسیم ملک کے بعد ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور لیاقت آباد کراچی میں سکونت پذیر ہوئے۔

اُستاد قمر جلالوی کو بحیثیت غزل گو شاعر کے بہت شہرت ملی۔ درجنوں شاگرد تھے لیکن یہ اُستاد کی زندگی اور شاگردوں کی ضرورت کی بات تھی۔ اُستاد قمر جلالوی اللہ کو پیارے ہو گئے لہٰذا اب اُن سے رشتہ جوڑنے سے کیا ملے گا؟ اُس زمانے میں انکی زندگی میں تو اُٹھنی سے لے کر پانچ روپے تک میں غزلیں مل جاتی تھیں۔

اُستاد قمر جلالوی کی عمر کے آخری حصّے میں سرکار علامہ رشید ترابی، اُستاد کو اپنے گھر لے آئے تھے۔ پاکستان آنے کے بعد شاید یہی مختصر سا عرصہ اُستاد قمر جلالوی نے چین سے گذارا۔ مشاعروں کے منتظمین اُستاد کو مدعو کرنے آتے تھے تو علامہ ترابی صاحب یہ ارشاد فرما دیتے تھے کہ اُستاد کو اتنی رقم پیش کی جائے اور لوگ علامہ کی خوشنودی کے لئے وہ رقم اُستاد کو پیش کرتے تھے۔ اُستاد قمر جلالوی کو مشاعروں سے معقول آمدن شروع ہو گئی تھی۔ پھر علامہ رشد ترابی کی کوشش سے اُنہیں حکومت نے ڈیڑھ سو روپے ماہوار وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔

اُستاد باکمال شاعر تھے۔ اُن کی اتنی غزلیں گائی گئی ہیں کہ لوگوں کو بہت سی غزلیں ازبر

ہیں۔ اُستاد قمر جلالوی بہت حاضر جواب اور پُربہار شخصیت کے مالک تھے بسا اوقات جب اُستاد اکیلے ہوتے تھے تو راقم السطور اُن سے چھیڑ چھاڑ کے لئے کہا کرتا تھا۔

اُستاد یہ گل و بلبل کی باتیں کب تک رہیں گی۔ آپ قادرالکلام شاعر ہیں۔ الفاظ آپ کے منتظر رہتے ہیں کہ آپ کب کس لفظ کو استعمال کریں۔ آپ شاعری برائے زندگی کے کب قائل ہوں گے — اُستاد مسکرا کر چپ ہو جاتے تھے——

ایک دن ہمارے 'بادشاہ سلامت' فیلڈ مارشل ایوب خان نے ملک میں اخبارات پر سنسر کی پابندی لگائی۔ کچھ ایسے حالات میں یہ سنسر لگایا گیا کہ عوام میں موضوعِ بحث بن گیا۔ میں اُستاد سے ملنے علامہ رشید ترابی صاحب کے درِ دولت گیا تو اُستاد نے کہا:

''میاں ترقی پسند صاحب اجازت ہو تو ایک مطلع آپ کی خدمت میں پیش کروں''

اُستاد اکثر شعر سنایا کرتے تھے لیکن آج کے تیور کچھ اور تھے۔ میں نے عرض کیا ارشاد فرمائیے اُستاد! اُستاد نے مطلع سنایا۔

راستے بند کئے دیتے ہو دیوانوں کے
ڈھیر لگ جائیں گے بستی میں گریبانوں کے

میں ہکا بکا رہ گیا — اخبارات پر سنسر کی صورت حال میں اُستاد کا مطلع؟ اس لمحے یوں لگا جیسے دنیا میں صرف ایک ہی شاعر ہو اور اس کا نام اُستاد قمر جلالوی ہو۔ میں نے اُستاد کے گھٹنے چھوئے اور عرض کیا۔ اُستاد'' جائے اُستاد خالی است''

اُستاد نے سوز، سلام، نوحے اور مرثیے بھی کہے ہیں — مرثیوں میں غزل کا رنگ نمایاں رہا ہے — اُن کا ایک مرثیہ جو عون و محمدؑ کے حال پر ہے۔

خدا پسر دے تو دے بنتِ مرتضیٰ کی طرح

یہ مرثیہ اس وقت میرے سامنے نہیں ہے لیکن آج ۳۳۔۳۲ سال بعد مجھے اس مرثیے کے دو بند یاد ہیں۔ تناظر یہ کہ رات کو جناب زینبؑ بچوں کو آنیوالی صبح کی جنگ کے لئے ذہنی طور پر آمادہ کر رہی ہیں۔ اجداد کی شجاعت بتا رہی ہیں۔ بچے چاہتے ہیں کہ علَم اُنہیں ملے۔ ماں اس

بات کو بچّوں کے دل سے نکال رہی ہے۔ بچّے سمجھتے ہیں کہ شاید اُن کی کم سنی کی وجہ سے ماں، ماموں سے علم کی بات نہیں کرسکتی۔ اس منظرنامے میں بچّوں کی زبان سے اُستاد نے کہلوایا ہے ۔

ہمارے بازوؤں میں ہے علی کی تاب وتواں مقابل آ نہ سکے گی عدو کی فوجِ گراں
یہ شام وکوفہ کے بے آبرو رُکیں گے کہاں چمک کے نیمچے دریا کو جبلہ ہونگے رواں

کریں وہ جنگ کہ دم بھر سکوں لعین نہ لیں
حضور دودھ نہ بخشیں جو نہر چھین نہ لیں

تیس بتیس برس کی بات۔ آج بھی جہاں کہیں عونؑ ومحمدؑ کا ذکر سنتا ہوں۔ ان کے احوال کا مرثیہ سنتا ہوں تو اُستاد قمرؔ جلالوی کے یہ چند بند بالخصوص یہ بیت نہیں بھولتا۔ اسی مرثیے میں صبح عاشور کا منظر ہے۔ ماں نے بچّوں کو تیار کیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے نیمچے بچّوں کے ہاتھوں میں دئے ہیں اور بچوں کو قسم دی ہے کہ سب سے پہلے ماموں پر اپنی جانیں فدا کرنا۔ حوصلہ دے رہی ہے، قسم دے رہی ہے کہ بھر پور جنگ کرنا، زندہ واپس نہ آنا۔ اس گفتگو کو استاد قمرؔ جلالوی کی نظم میں ملاحظہ فرمائیے ۔

بلند تا بہ فلک ہوں لہو کے فوّارے وہ رن پڑے کہ نظر آئیں خون کے دھارے
تمام کوفے میں ہلچل ہو خوف کے مارے دکھائی دینے لگیں فوجِ شام کو تارے

کسی طرح کی کمی قتلِ عام میں نہ رہے
کوئی چراغ جلانے کو شام میں نہ رہے

اس کتاب کے قارئین بتائیں کہ یہ دو بند سننے کے بعد کیا اُستاد قمرؔ جلالوی کو ایک ایسا مرثیہ گو ماننے میں کوئی تامل ہوسکتا ہے جسے قبولیت کا شرف حاصل ہو۔ اُستاد قمرؔ جلالوی کی غزلوں کے دو مجموعے 'اوجِ قمر' اور 'رشکِ قمر' شائع ہوگئے ہیں اور مرثیوں کا ایک مجموعہ بھی ''غمِ جاوداں'' شائع ہوا ہے جو دس مرثیوں پر مشتمل ہے لیکن یہ سب کچھ ان کے موت کے بعد ہوا ہے۔ غمِ جاوداں میں اُستاد کے ۱۸ سلام، ۱۰ مرثیے، کچھ رباعیات وقطعات اور ایک مثنوی تاریخ امام باڑہ جلالی شامل ہیں۔ کتاب کی ترتیب وتدوین جناب مجاہدؔ لکھنوی نے کی ہے مگر اس صداقت سے انحراف نہیں کیا جاسکتا کہ حصولِ کلام سے طباعت واشاعت تک سارے انتظامات انصار حسین واسطی کے مرہونِ منت ہیں۔ استاد قمرؔ جلالوی کے مراثی میں خوب اور خوب تر کی درجہ بندی کرنی

دشوار ہے اس لئے پہلے ہی مرثیے "جب فتح ملکِ شب کو کیا آفتاب نے" کے کچھ بند درج ذیل ہیں۔ یہ مرثیہ حبیب ابنِ مظاہر کے احوال کا ہے۔ سرنامۂ مرثیہ کے طور پر ایک شعر درج ہے۔

پانی پہ فخر کرتے ہو تم بات بات میں
مطلب یہ ہے کہ آگ لگا دوں فرات میں

جب فتح ملکِ شب کو کیا آفتاب نے سکہ جمایا اپنا جلالت مآب نے
تاروں کی فوج جمنے نہ دی آب و تاب نے ۱ بدلا نظامِ چرخ کہن انقلاب نے
وہ جانور چہک اٹھے چپ تھے جو رات میں
باجے سحر کے بجنے لگے کائنات میں

جب جب عیاں ہوئی ہے سرِ کربلا سحر ۴ ہر لحہ اک پہاڑ ہے قلبِ حبیب پر
گرما رہے ہیں اپنے فرس کو اِدھر اُدھر مطلب یہ ہے کہ اذن ملے مجھ کو پیشتر
نظریں ہیں جلوہ گاہِ امامِ غیور پر
گھوڑے پہ ہیں حبیبؑ کہ موسیٰؑ ہیں طور پر

پہلو میں تیغ، ہاتھ میں نیزہ، سپر بہ دوش بگڑے ہوئے جلال میں تیور ادب کا ہوش
خیمہ کے در پہ سر کو جھکائے ہوئے خموش ۵ نظروں میں فوجِ شام لڑائی کا دل میں جوش
ایسے میں حکم ہو جو شہِ خوش کلام کا
شاید چراغ ہی نہ جلے فوجِ شام کا

اچھا سدھارو رن کو یہ جب کہہ چکے امام تن پر دوبارہ چُست کئے اسلحہ تمام
پشتِ فرس پہ بیٹھ گئے تھام کر لگام ۸ جھک جھک کے ہر جری کو کیا آخری سلام
پیری میں تن کے بن گئے نقشہ جوان کا
جیسے کوئی اُتار دے چلّہ کمان کا

لے کر چلی جو رن کی طرف حسرتِ جدال غازی کا رنگ ڈھنگ نمازی کی چال ڈھال
ناگاہ حُر کی لاش نظر آئی پائمال ۹ غصہ میں سُرخ ہوگئے بولے بصد جلال
سمجھی ہوئی ہے یہ سپہِ بدصفات کیا
میں انتقام حُر کا نہ لے لوں تو بات کیا

یہ سن اور اُس پہ زورِ شجاعت کہ الاماں چلتے ہیں تیر کی طرح قامت ہے گو کماں
بجلی کی طرح گرتے ہیں روکے کوئی کہاں [۲۱] یہ حال ہے جو دس یہاں مارے تو سو وہاں
دم بھر میں قتل سیکڑوں کفار ہو گئے
خم کیا کمر میں آ گیا تلوار ہو گئے

حالانکہ ایسی دھوپ میں ہے تشنگی کمال آتا نہیں زباں پہ مگر پیاس کا سوال
اس حال میں بھی ہے وہی خودداریوں کا حال [۲۲] کہتے ہیں پانی غیر سے مانگیں! یہ ہے محال
کیوں التجا کریں سپہِ بد صفات سے
کوثر کچھ ایسا دور نہیں ہے فرات سے

☆☆☆☆☆

وصی فیض آبادی:- (کراچی)

ولادت ۱۹۱۷ء وفات ۱۹۶۹ء

نام، مرزا وصی حیدر۔ تخلص وصیؔ، والدگرامی مرزا باسط علی حزیںؔ فیض آبادی۔ وصیؔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان آ گئے۔ کراچی میں سیّد آل رضا کی شاگردی اختیار کی۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، غزل، قصیدہ، رباعیات، سلام، نوحہ، مرثیہ لیکن زیادہ تر کلام شائع نہ ہو سکا۔ ان کے شاگردوں کی فہرست بھی خاصی طویل ہے جس میں بعض نام تو بہت نمایاں ہیں مثلاً اعجازؔ رحمانی، عزتؔ لکھنوی، ابرار عابد، ساحرؔ فیض آبادی، اسیرؔ فیض آبادی مگر ان میں سے کوئی شاگرد وصیؔ کے کلام کے اشاعت نہ کرا سکا۔ تذکرہ نگاروں نے یہ تو لکھ دیا کہ حضرت وصیؔ فیض آبادی کے بہت شاگرد تھے لیکن شاگردوں کے تذکرے سے جو سوالات اُبھرتے ہیں وہ بھی کم اہم نہیں۔ مثلاً ۱۹۵۰ء میں حضرت وصیؔ فیض آبادی نے سیّد آل رضا کی شاگردی کی۔ آل رضا صاحب کا انتقال ۱۹۷۸ء میں ہوا۔ جبکہ وصیؔ صاحب کا انتقال ۱۹۶۹ء میں ہوا یعنی اُستاد سے ۹ سال قبل — تو کیا آل رضا کی شاگردی میں رہتے ہوئے وصی صاحب نے شاگرد بنائے؟

وصی فیض آبادی نے ۱۹۵۹ء میں پہلا مرثیہ کہا یعنی آل رضا صاحب کی شاگردی کے ۹ سال بعد مرثیہ کہا اور ڈاکٹر یاور عباس کی مجلس میں پڑھا۔ سیّد آل رضا کہنہ مشق اور زود گو شاعر تھے اور اُن کے شاگردوں کے متعلق بھی یہی سنا ہے۔ وصیؔ فیض آبادی کے معاملے میں پہلا امکان یہ

کہ مرثیے کی تربیت اور وہ بھی سیّد آل رضا کے معیار کی ترتیب میں ہوسکتا ہے وصی فیض آبادی کو اس منزل تک آنے میں ۹ سال لگے ہوں کہ وہ اساتذہ کے درمیان بیٹھ کر مرثیہ پڑھتیں —— دوسرا امکان یہ بھی ہے کہ آل رضا صاحب نے ۹ سال تک وصی صاحب کو مرثیہ پڑھنے کی اجازت نہ دی ہو جبکہ وصی فیض آبادی کی شاعری اور ان کے مصرعوں میں بیساختہ پن غمازی کر رہا ہے کہ انہوں نے ۱۹۵۹ء سے بہت پہلے مرثیہ کہنا شروع کر دیا ہوگا۔ وصی کے پہلے مرثیے کا عنوان ''دوستی'' تھا جس کے چند بند پیش خدمت ہیں۔ یہ مرثیہ وصی مرحوم کے برادر خورد اسیر فیض آبادی نے ۱۹۸۰ء میں کراچی سے شائع کیا تھا۔

تخلیق کائنات کا حاصل ہے دوستی انسان کا دھڑکتا ہوا دل ہے دوستی
عظمت نشان جوہرِ کامل ہے دوستی اہل وفا کی آخری منزل ہے دوستی
ہر داستانِ عشق میں سرخی اسی کی ہے
دل طور ہے تو اس میں تجلّی اسی کی ہے

ڈوبی ہوئی تھی درد میں اسلام کی نظر جیسے کسی یتیم کی حسرت بھری نظر
اس پر گئی نظر، کبھی اس پر گئی نظر آئی امید کی نہ کوئی روشنی نظر
بے چین تھے کشاکشِ مرگ و حیات میں
ہمدرد جیسے کوئی نہ تھا کائنات میں

اسلام کی اُمید کا حاصل ہے اب حسینؑ طوفان حشر خیز میں ساحل ہے اب حسینؑ
باطل کی شورشوں کے مقابل ہے اب حسینؑ جو تیرِ ظلم روک لے وہ دل ہے اب حسینؑ
ایماں نواز اب پسرِ بوتراب ہے
شبیر کلِ کفر کا تنہا جواب ہے

حضرت وصی فیض آبادی کے مرثیے ''عظمت نسواں'' اس کے چند بند ملاحظہ ہوں:

کربلا، آئینۂ رفعتِ کردارِ بشر کربلا آئینۂ وسعتِ افکارِ بشر
کربلا، آئینۂ عظمتِ معیارِ بشر کربلا آئینۂ قسمتِ بیدارِ بشر
کربلا درسِ عمل عالمِ انساں کے لئے
کربلا فکر کی حد، طبقۂ نسواں کے لئے

عظمتوں کی کوئی حد ہی نہیں، دنیا محدود پاک و پاکیزہ وہ دامن کہ ہے سجدہ مسعود
شانِ عصمت کی گواہی کے لئے، تو مولود وہ طہارت کی ہے قرآن میں آیت موجود
منزلت ہو تو شریکِ غمِ پیغمبر ہے
عظمتیں ہوں تو زچہ خانہ خدا کا گھر ہے[۵]

ذکر عصمت کا جو ہو، مادرِ عیسیٰ ہے یہی ہاجرہ کہئے رفاقت میں تو زیبا ہے یہی
حق کی بے لوث حمایت میں خدیجہؑ ہے یہی جملہ اوصاف حمیدہ ہوں تو زہراؑ ہے یہی
جتنے رتبے ہیں سوا، اُتنا بڑا منصب ہے
منزلِ عزم و عمل ہو تو یہی زینبؑ ہے

اس مرثیے میں وحؔی فیض آبادی نے اسلام سے پہلے دنیا کے مختلف ممالک میں عورت کی جو ذلت ہو رہی تھی اس کا نقشہ کھینچا ہے۔

قبل اسلام مگر اور ہی کچھ تھا دستور چشم خود بیں میں تھا بے آب یہ دُرِ منثور
صرف مردوں کی کنیزی پہ تھی عورت مامور صنفِ نازک تھی زمانے میں کہ صنفِ مجبور
لوگ معبود کا ایک قہر سمجھتے تھے اسے
جسم انساں کے لئے زہر سمجھتے تھے اسے

اہلِ روما کے لئے گھر کے اثاثے میں تھی زن اُن کی نظروں میں تھی بے نور یہ شمع روشن
قول سقراط کا فتنہ کی بنا کہتا تھا اس کو ناکردہ گناہوں کی سزا کہتا تھا
ہند میں اور بھی مجبور تھی صنف مجبور جہاں مذہب کا اہم جز تھا ستی کا دستور
ننگِ جہل عرب اور بھی کچھ تھی محدود ان میں سب سے بڑی تذلیل تھی عورت کی نمود
اہل افرنگ اسے حیوان نجس کہتے تھے اُن کا قانون تھا انجیل سے یہ دور رہے
ناگہاں عدلِ حق افروز کے تیور بدلے رُخ ہواؤں کا بدلنا تھا کہ منظر بدلے
غنچہ و گل سے دہکتے ہوئے اخگر بدلے قلب میں آئی لچک، موم سے پتھر بدلے
دن زمانے کے پھرے، وقت نے راہیں بدلیں
فطرتِ جبر و تشدد کی نگاہیں بدلیں

کوہ فاراں سے اُٹھی جھوم کے گھنگھور گھٹا وقت کا ساز بنی موجۂ دامانِ صبا

آنکھ سبزہ کی کھلی گل کا تبسم جاگا چند چھینٹوں میں مہکنے لگا گلشن سارا
مے برسنے لگی جو طبعِ بشر ڈھلنے لگی
ناخنِ ہوش سے فطرت کی گرہ کھلنے لگی

گھر محمد کا بنا مرکزِ تعلیمِ حیات بدلے اقدار تو ہونے لگی ترمیمِ حیات
حق کا قانون تھا، آئینہ تفہیمِ حیات عین فطرت کے مطابق ہوئی تنظیمِ حیات
بشریت کی حدیں جلوہ فشاں ہونے لگیں
عظمتیں طبقۂ نسواں کی عیاں ہونے لگیں

اس بند کے بعد، حضرت خدیجہ الکبریٰ، سیدہ فاطمہ زہراؑ، سیدہ زینبؑ، جناب شہربانو، عون و محمد کی شہادت اور زینب کا صبر، علی اکبر کی شہادت۔ علی اصغر کی شہادت اور ماں کا صبر، سبھی کچھ تو کہہ دیا وصی فیض آبادی نے اس مرثیے میں —— اس کتاب کو پڑھنے والے وصی مرحوم کے اس مرثیہ کو ضرور پڑھیں اور اس وقت اس مرثیے کا آخری بند پڑھنے میں میرا ساتھ دیں ۔

تونے بانو رہِ خالق میں جو دی قربانی پیش ہوگی نہ ہوئی ایسی کبھی قربانی
ہے زمانے میں یہی سب سے بڑی قربانی کتنی وزنی ہے یہ چھوٹی سی تیری قربانی
جب تک اس خاک میں تاثیرِ نمو ہے بانو
رنگ دے گا تیرے بچے کا لہو اے بانو

وصی فیض آبادی کے برادر خورد جناب اسیر فیض آبادی نے لکھا ہے کہ وصی فیض آبادی نے ساڑھے آٹھ مرثیے کہے ہیں۔ گویا آٹھ مرثیے مکمل ہوئے اور نواں مرثیہ مکمل نہ ہوسکا کہ وہ اپنے ممدوح آقا حسینؑ کی خدمت میں چلے گئے ۔

☆☆☆☆☆

مرغوب نقوی :— (کراچی)

مصدقہ تاریخ ولادت (نہ مل سکی) تاریخ وفات (بحوالہ" دبستان دبیر") ۱۹۶۰ء
لیکن سید ضمیر اختر نقوی نے اسے ردّ کیا ہے اور لکھا ہے۔
نہ معلوم کس بنا پر مرغوب نقوی کی وفات کا سنہ ۱۹۶۰ء لکھ دیا

گیا ہے حالانکہ اُن کا انتقال ۳۰ را پریل ۱۹۷۰ء کو کراچی میں ہوا اور چہلم کی مجلس میں سید آل رضا نے مرثیہ نزول قرآن پیش کیا۔

(اُردو مرثیہ پاکستان میں۔ ص ۴۳۶)

نام سید علی اطہر، تخلص مرغوبؔ، سادات نقوی، وطن مالوف چاند پور۔ سید اطہر علی مرغوبؔ کے ایک فرزند سید حسن یاور نقوی لکھنؤ میں سکونت پذیر تھے اور دوسرے فرزند جسٹس سید نصرت علی پاکستان کی ممتاز شخصیات میں شمار کیے جاتے تھے۔ موصوف صوبہ سندھ کی عدالت عالیہ کے جسٹس اور چیف الیکشن کمشنر جیسے اہم عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ اس حوالے سے مرغوبؔ نقوی پاکستان میں بھی آتے جاتے رہے ہیں بلکہ اُن کا کراچی میں قیام رہا ہے۔ سید علی اطہر مرغوبؔ نقوی کی تصانیف میں بعض انمول کتابیں شامل ہیں۔

(۱) تنویر کعبہ — یہ کتاب حج و زیارات کے حالات کی منظوم تفصیل ہے۔

(۲) عاشورِ غم — نوحوں کا مجموعہ

(۳) حدائق مرغوب — قصائد و سلام کا مجموعہ

(۴) گلستان سجاد — امام زین العادین علیہ السلام کے دیوان کا منظوم ترجمہ

(۵) اصحاب کہف — اصحاب کہف کا واقعہ مثنوی کی ہیئت میں

(۶) جہادِ مختار — امیر مختار کے حالات مثنوی کی شکل میں نظم کیے گئے ہیں اس مثنوی کے متعلق نیاز فتح پوری نے لکھا ہے:

''واقعہ کربلا کے سلسلے میں مختار کا کردار خاص اہمیت رکھتا ہے لیکن ان کے تفصیلی حالات بہت کچھ پردہ اخفا میں تھے اب جناب مرغوب نے نہایت کوشش سے ان کو فراہم کر کے ایک نہایت طویل مسلسل و مربوط نظم میں پیش کیا ہے جس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ کیوں کر اس ہفت خواں کو طے کر سکے۔ جس حد تک نظم نگاری کا تعلق ہے نظم بہت سلیس اور شگفتہ ہے۔''

(فاتح کربلا نمبر۔ اخبار سرفراز لکھنو)

یہ مثنوی پانچ ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے۔

(۷) ''علم'' بظاہر تو ایک مرثیہ ہے مگر یہ مرثیہ علم کی منظوم تاریخ ہے۔ اس میں انبیاء کرام اور آئمہ طاہرین سے حضرت عباسؑ کے علم تک، ہر علم کا ذکر ہے اور اختتام عباسؑ کے علم پر

ہوتا ہے۔ مرثیہ پڑھ کر یہ احساس بلکہ یقین بیدار ہو جاتا ہے کہ عباس کا علم آخری علم ہے اور اب تا قیامت کسی پرچم کو علم نہیں کہا جا سکے گا۔ اس مرثیے کے متعلق سیّد ضمیر اختر نقوی کا کہنا ہے

> ''یہ مرثیہ منفرد ہے اور میرے کتب خانہ میں محفوظ تھا لیکن نسیم امروہوی صاحب نے مجھ سے مطالعہ کے لئے طلب کیا تھا پھر آج تک واپس نہ کیا جس کا مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا۔ مرغوب نقوی کے چند مرثیے میرے پاس ہیں۔ (اُردو مرثیہ پاکستان میں۔ ص ۳۳۵)

(۸) ''تحریم کعبہ و عظمت حج'' مرغوب نقوی کا وہ مرثیہ ہے جس میں خانۂ کعبہ کی مکمل تاریخ نظم کی گئی ہے۔ ربط واقعات بھی، اس مرثیے میں بہت ہنرمندی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ تاریخ میں رقم ہے کہ جب ننھے ننھے اسمٰعیل نے پیاس سے ایڑیاں رگڑیں تو چشمہ زم زم جاری ہو گیا۔ اس مرثیے میں اس واقعہ سے علی اصغر کی پیاس کو مسلسل کیا گیا ہے۔ اور آخر میں حضرت علی اکبر کی جنگ پر مرثیہ ختم ہوا ہے ؎

اب تو تلوار اسداللہ کے پوتے کی اٹھی خوں بہانے میں شغالوں کے کمی کوئی نہ کی
آستیں خون میں تر ہو گئی یوں تیغ چلی دو سوئی النار کئے دوسرے حملے میں شقی
دیکھ کر حال یہ اشرار سبھی ٹوٹ پڑے
اس اکیلے پہ جفاکار سبھی ٹوٹ پڑے

شیر بپھرا ہوا تھا اُڑ رہی تھی دشت میں گرد خاک زخموں میں بھری جب تو سوا ہو گیا درد
کس نے دیکھی تھی زمانہ میں کہیں ایسی نبرد اک دلیر اس کے مقابل تھے ہزاروں نامرد
اُن ہزاروں میں ستم سے نہ کوئی باز رہا
عاشقِ رب جو تھا خالق پہ اسے ناز رہا

زیرِ نظر مرثیے کا یہ بند حضرت علی اکبر کی مدح میں لاجواب ہے:-

وہ تیری اٹھتی جوانی وہ تیرا حُسن و جمال گیسوئے احمدِ مختار کا سایہ تیرے بال
وہی صورت وہی سیرت وہی اندازِ مقال تھی نبوت کی کمی ورنہ تھی تفریق محال
اہل شر کہتے تھے فردوس سے باہر آئے
لو نواسہ کی مدد کرنے پیمبر آئے

''آستیں خون میں تر ہوگئی یوں تیغ چلی'' یا ''تھی نبوت کی کمی ورنہ تھی تفریق محال''
جیسے مصرعے کوئی تجربہ کار اور مشاق مرثیہ گو ہی کہہ سکتا ہے۔

راقم الحروف نے ایک مرتبہ لندن میں جسٹس نصرتؔ سے کہا تھا کہ وہ مرغوب صاحب مرحوم کے مراثی شائع کرادیں تو اُن کا خزانہ محفوظ ہوجائے گا۔ اُنہوں نے برجستہ کہا، محفوظ تو اب بھی ہے۔ جہاں جہاں اُن کے مرثیے ہیں وہ محفوظ تو اتنے ہیں کہ ہم بھی نہیں دیکھ سکتے البتہ اگر اشاعت ہوجائے تو یہ خزانہ مستحق قارئین تک پہنچ جائے گا۔ اُن سے طے ہوا تھا کہ وہ پاکستان جاکر فوٹو کاپیاں حاصل کریں گے اور لندن کے آئندہ سفر میں ساتھ لائیں گے اور میرے سپرد کریں گے تاکہ ''عاشور کاظمی فاؤنڈیشن'' کی طرف سے اشاعت کا انتظام کیا جاسکے لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد اطلاع آئی کہ وہ اس سفر پر چلے گئے ہیں جہاں سے کسی کی واپسی نہیں ہوتی۔ ٹھیک ہی تو ہے ؎

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں

☆☆☆☆☆

ثمر لکھنوی :- (کراچی)

ولادت ۱۸۹۴ء (لکھنو)۔ وفات ۱۹۷۰ء (کراچی)

نام بادشاہ مرزا، تخلص ثمرؔ۔ رکاب گنج (لکھنؤ) میں پیدا ہوئے — اُن کے والد گرامی میرزا محمد اصغر بسلسلۂ ملازمت ریاست نانپارہ ضلع بہرائچ (اودھ) مقیم ہوگئے تھے۔ ثمرؔ لکھنوی نے ابتدائی تعلیم گھر میں پائی۔ جوبلی سکول لکھنؤ سے میٹرک پاس کیا۔ بچپن سے شعروشاعری کا شوق تھا۔ ابتدا میں بزرگوں سے چھپ کر دوستوں کو شعر سناتے رہے — شوق بڑھتا رہا، مشق سخن جاری رہی حوصلہ بلند ہوتا رہا اور وہ بھری محفلوں میں غزلیں سنانے لگے۔ یہ وہ دور تھا جب لکھنؤ میں گھر گھر علم وادب کا چرچا ہوتا تھا۔ پیارے صاحب رشیدؔ اس ماحول اور اس ادبی دنیا پر چھائے ہوئے تھے۔ ثمر لکھنوی نے باقاعدہ اُن کی شاگردی کی۔ ثمرؔ دوستوں میں غزلیں سنا سنا کر منجھ گئے تھے، پھر پیارے صاحب رشیدؔ ایسے اُستاد کی اصلاح — مشاعروں میں ان کا چرچا ہونے لگا — شاعری پر گرفت مضبوط ہوگئی تو لوگوں نے مرثیہ کہنے پر مجبور کیا۔ ۲۱ سال کی عمر میں ثمر لکھنوی نے پہلا مرثیہ کہا — اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ لکھنؤ کے امام باڑے مرثیہ گو شعراء کے لئے ''امتحان گاہ'' کی حیثیت رکھتے تھے۔ جو شاعر کسی امام بارگاہ میں کامیابی سے مرثیہ پڑھ گیا اُسے مقام ملتا تھا۔

ثمر لکھنوی نے ناظم صاحب کے امام باڑے سے ابتدا کی اس کے بعد قصر العزا (ڈیوڑھی چھوٹی شہزادی) ثمر لکھنوی کے تو تصنیف مرثیوں کے لئے مخصوص ہوگئی۔

ثمر لکھنوی کے مراثی میں خانوادۂ میر انیس کا روایتی انداز ملتا ہے۔ اُنہوں نے کلاسیکی مرثیے کے تمام اجزا، چہرہ، رخصت، سراپا، رجز، جنگ، گھوڑا، شہادت اور بین اپنے مرثیوں میں برقرار رکھے —— پیارے صاحب رشید کے مرثیوں میں ساقی نامہ اُن کی خصوصیت تھی جسے ثمر لکھنوی نے بھی اپنایا۔

ثمر لکھنوی ۱۹۵۰ء میں اپنی اہلیہ صاحبزادی اور دونوں نواسوں کو لے کر کراچی آ گئے۔ (ثمر کی اولادِ نرینہ نہ تھی)۔ یوں تو ثمر لکھنوی نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی مگر مرثیہ اُن کے مزاج کو بھا گیا تھا اس لئے مرثیے پر زیادہ توجہ رہی۔ سید ضمیر اختر نقوی نے اُن کے ۲۵ مراثی کے مطلع نقل کئے ہیں جن میں ۱۳ مرثیے اُس وقت کہے گئے ہیں جب وہ لکھنؤ میں قیام پذیر تھے۔ ان مرثیوں میں سو فیصدی کلاسیکی رنگ بھی ہے اور پیارے صاحب رشید کے انداز بھی —— ان مرثیوں کا سن تصنیف بھی درج کیا گیا ہے ثمر لکھنوی نے پہلا مرثیہ۔

"نکلا ہے شیرِ بیشۂ حیدر جہاد کو" کہا تھا جو شہادت امام حسین سے متعلق ہے۔

نکلا ہے شیرِ بیشۂ حیدر جہاد کو غُل ہے کہ آ رہا ہے غضنفر جہاد کو
جو کھیل جانتے تھے ستمگر جہاد کو [۱] وہ ڈر رہے ہیں آتے ہیں سرور جہاد کو
سر جھک گئے ہیں اب تہہ صمصام ہیں لعین
غالب ہے خوف، لرزہ بر انداز ہیں لعین

اس کے بعد چودہ بند گھوڑے کی تعریف میں ہیں۔ پندرھواں بند درج ذیل ہے

لشکر کے پاس جا کے کہا شاہِ دیں نے بس حضرت کے اس کلام پہ فوراً رُکا فرس
دکھا جو جو اشقیا نے لگے کرنے پیش و پس [۱۵] گھبرائے ایسے، سینوں میں رکنے لگا نفس
سردار پیچھے ہٹ گئے لشکر کو چھوڑ کے
کچھ پہلواں فرار ہوئے منہ کو موڑ کے

میداں میں جب کہ وارثِ شاہِ نجف رُکے لشکر جو بڑھ رہے تھے وہ سب صف بہ صف رُکے
باجے جو بج رہے تھے بہم ہر طرف رُکے [۱۷] شہنا رُکی، رباب رُکا، چنگ و دف رُکے

خاموش پہلوان ہوئے روم و شام کے
مشتاق سب کے سب تھے کلام امام کے

یہ روایت کہ ''مشتاق سب کے سب تھے کلامِ امام کے'' سماعت کو غیر مانوس ہی لگتی ہے۔ بہر حال سترہویں بند سے ۲۳ ویں بند تک رجز ہے، امام نے اسلاف کا ذکر کیا ہے، جو بہر حال فوج اشقیا، پر امام حسینؑ کی بلا مبالغہ برتری تھی جیسے ؎

سرداریٔ جہاں کے لقب ہم نے پائے ہیں
حُلّے ہمارے واسطے جنت سے آئے ہیں

اور پھر اچانک ۲۴ ویں بند سے رجز ایک طرح سے فریاد و بکا میں بدل جاتا ہے جو قدیم مرثیے کے لوازم کے تحت شاعر کی مجبوری تھی۔ یوں لگتا ہے جیسے وقت کا امام، ذبحِ عظیم کا وارث، سوچ سمجھ کر کربلا سجانے والا آقا، گریہ و زاری، فریاد و بکا اور واویلا پر اُتر آیا ہو ؎

اے کلمہ گویو نانا کے، للہ رحم کھاؤ حد ہوگئی ستانے کی زائد نہ اب ستاؤ
تم نامِ پنجتن کا نہ دنیا سے اب مٹاؤ شمعِ مزارِ مصطفوی کو نہ تم بجھاؤ
کل دوگے کیا جواب شہ مشرقین کو
پیاسا رُلا رُلا کے جو مارا حسینؑ کو

درج بالا بند میں جو الفاظ ہیں اور ان الفاظ کا جو لہجہ ہے۔ کیا وہ کسی عالی نسب، حق کی راہ پر چلنے والے کا لہجہ ہو سکتا ہے؟ لیکن قدیم مرثیے کو عوامل اور اسلوب کو اپنانا ہے تو یہی کچھ کرنا پڑتا ہے—— مذکورہ بالا بند میں ایک بات اور قابل توجہ ہے کہ میر انیسؔ اور سبھی مرثیہ نگاروں نے امام حسین کو شہِ مشرقین کے لقب سے پکارا ہے۔

یہ تو نہیں کہا کہ شہِ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسینؑ ہوں

لیکن بادشاہ مرزا اثر لکھنوی نے ''ختمی مرتبت، نبی کریم'' کو شہِ مشرقین کہا ہے——

اس مرثیہ میں بند ۲۵ سے بند ۳۴ تک امام کی جنگ اور ذوالفقار کی کاٹ پر بات ہوتی ہے اس کے بعد ''ساقی نامہ'' جو پیارے صاحب رشیدؔ کا خاصہ تھا اثرؔ لکھنوی نے ''سنتِ رشید'' پر عمل پیرا ہوتے ہوئے جنگ کے احوال کے بعد ساقی نامہ کہا اور خوب کہا—— ملاحظہ کیجئے ایک بند

رزمیہ دوسرا ساقی نامہ ؎

سریوں برس رہے تھے کہ ساون کی تھی بہار　　تھی مثل برق شعلہ فشاں تیغ آبدار
اس نی چمک سے جلتے تھے صحرا و کوہسار[۳۴]　　خیمے میں چھپ گیا پسرِ سعدِ نابکار
خوں میں نہا کے اپنے جو مرتے تھے نام پر
بادل تھے غم کے چھائے ہوئے فوجِ شام پر

ہاں ساقیا یہ وقت ہے جلدی شراب دے　　زائد ہو جوش تو قدحٔ آفتاب دے
تاخیر کیوں ہے بہر رسالت مآب دے[۳۵]　　وہ مے ہو جو کہ پیر کو لطفِ شباب دے
سرشار ہووے رندِ خوش انجام اس طرف
تلوار چل رہی ہو ادھر جام اس طرف

اس کے بعد جنگ، اور شہادت — الغرض قدیم مرثیے کے پیمانے پر یہ مرثیہ پورا اُترتا ہے مضامین کی صداقت کو نظم کیا ہے روایت سے بغاوت بھی نہیں کی اور اپنی Commitment کو بھی پورا کیا ہے، وہ لمحہ بہ لمحہ بدلتی صورت حال کے پیچھے پیچھے نہیں چلے بلکہ اُنہوں نے اقدار کو اپنی فکر کے پیچھے پیچھے چلنے پر مجبور کیا ہے۔ یہی اُن کے کام کی پختگی کی دلیل ہے۔

☆☆☆☆☆

موجد سرسوی :- (کراچی)

ولادت ۱۸۹۰ء وفات ۱۹۷۰ء

نام سید ناظر حسین۔ تخلص موجد۔ سرسی مخدوم پور ضلع مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد گرامی سید زائر حسین زائر بھی شاعر تھے۔ سرسی کے نقوی سادات گھرانے سے تعلق تھا۔ ناظر حسین موجد نے مراد آباد میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد عربی فارسی کا ذاتی مطالعہ کرتے رہے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد گھر میں شعر و شاعری کا ماحول دیکھا — ابتدا میں شیدا تخلص اختیار کیا۔ ابتدائی عمر میں ملازمت کی۔ پھر ملازمت چھوڑ کر تجارت شروع کی۔ ۱۹۳۴ء میں بمبئی چلے گئے۔ ۱۹۴۷ء میں بمبئی سے کراچی آگئے اور رضویہ میں ہومیو پیتھک ڈاکٹری شروع کی۔

موجد نے پہلا مرثیہ ۱۹۳۱ء میں تصنیف کیا۔ مرثیہ نگاری کے ساتھ ہی شیدا تخلص چھوڑ کر موجد اختیار کیا — بمبئی میں اُنہیں مرثیہ گو کی حیثیت سے شہرت ملی۔ پاکستان آکر اُنہوں نے آٹھ مرثیے

کہے۔ موجدؔ سرسوی کے مرثیے مطلع سے نہیں پہچانے جاتے بلکہ انہوں نے مرثیوں کے عنونات قائم کئے ہیں جیسے "ننھا مجاہد"۔ علی اکبر کا اٹھارواں سال، تبلیغ وفا، سفینۃ النجات، جہادِ اسلام وغیرہ۔

قدیم مرثیے پر ایک اعتراض عرصے سے چلا آرہا ہے کہ صحیح روایات مرثیوں میں نظم نہیں کی گئیں بلکہ جہاں جہاں شاعر کے ذہن نے پرواز کی وہی واقعہ بن گیا۔ سب سے پہلے مرزا اوجؔ نے اس پر اعتراض کیا تھا۔ پھر شادؔ عظیم آبادی اور اُن کے بعد تو معترضین کا ایک سلسلہ ہے۔ موجدؔ صاحب نے اس کا خیال رکھا ہے کہ صحیح واقعات نظم ہوں حتی کہ رجز میں بھی غلو نہ ہو— مثال علی اکبر کا میدان میں آکر رجز پڑھنا جس طرح کتابوں میں درج ہے موجد نے وہی نظم کیا ہے اور حاشیے پر اصل عربی نقل کی ہے

وہ دلربا رجز کہ ہوں دلبر حسینؑ کا　　دلبند ابن فاتحِ بدر و حُنین کا
ہوں نورِ عین، فاطمہؑ کے نورِ عین کا　　فرزندِ ارجمند شہِ مشرقین کا

پوتا ہوں اس کا جس کا ہے مشکل کشا لقب
وہ لافتی خدا نے دیا قُل کفی لقب

(اُردو مرثیہ پاکستان میں ص ۲۵۶)

رجز کا دوسرا بند دیکھئے جس میں تین روایات کا بلکہ تین صداقتوں کا حوالہ ہے کعبہ میں حضرت علی کی ولادت، دعوت ذوالعشیرہ، اور حضور نبی کریمؐ کے پیچھے سب سے پہلے نماز پڑھنے کا شرف حضرت علی کو ملا تھا اس لئے کہ نزول وحی کے بعد سب سے پہلے گھر والوں سے اس کا ذکر فطری معلوم ہوتا ہے اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نماز کا حکم ملنے کے بعد سب سے پہلے نماز بھی حضرت خدیجہؑ اور علیؑ نے پڑھی۔ تینوں روایات تاریخ طبری جلد ۳۔ ص ۲۱۱۔ ارجع المطالب ص ۵۶۴، کتابوں سے اخذ کی گئی ہیں اب ان تاریخی حقائق وخبر کی بنیاد پر رجز کا دوسرا بند ملاحظہ ہو۔

کہتے ہیں جس کو شاہِ ولایت وہی علیؑ　　کعبہ ہے جس کی جائے ولادت وہی علیؑ
کی ثبت جس نے مہرِ صداقت وہی علیؑ　　ثابت ہے جس کے دم سے رسالت وہی علیؑ

اسلام تھا عرب نہ عراق و حجاز میں
جس وقت مقتدی تھے نبی کی نماز میں

رجز کے سلسلے میں یہ احتیاط کہ ایک لفظ بھی تاریخی حوالے کے بغیر نہ لکھا جائے اور یہ پہل کہ عربی متن کو حاشیے پر تحریر کر دیا جائے حضرت موجؔد کی جدت تھی اس کے بعد کے رجز کے بند بھی اس احتیاط اور ایسے ہی حوالوں کے ساتھ کہے گئے ہیں جو شاعر کی پختہ کلامی کی دلیل ہے۔

موجؔد صاحب کی یہ احتیاط صرف رجز کی حد تک ہی نہیں تھی بلکہ موجؔد صاحب نے جہاں جہاں تبلیغی رنگ اور مناظراتی شعر کہے ہیں وہاں بھی آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے استدلال کیا ہے جو ایک سکالر کا کام ہوتا ہے شاعر کا نہیں۔ لیکن موجؔد سرسوی نے رثائی شاعری کو اور مرثیے کو ایسا موڑ دیا جو اول تو ہر شاعر کے بس کی بات نہیں اور اگر ہے بھی تو شاعر کے لئے وہ دشوار راہیں تراشی ہیں جس پر چلنے والا لہولہان ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

موجؔد سرسوی نے پہلا مرثیہ ۱۹۳۱ء میں کہا تھا۔ کے بعد دیگرے اُن کے آٹھ مرثیے علی الترتیب تبلیغی مرثیوں کے نام سے شائع ہوئے۔ اُن کے پہلے مرثیے کا پہلا بند

اے کلکِ نظم، مخزنِ سوز و گداز ہو لکھ مرثیہ وہ جس پہ طبیعت کو ناز ہو
مضمون وہ بند بند میں جدت طراز ہو بزمِ عزا میں آج تیرا امتیاز ہو
جدت بھی ہو، سخن میں بھری کوٹ کوٹ کر
رہ جائے فلسفہ نہ شہادت کا چھوٹ کر

(بیسوی اور جدید مرثیہ ص ۲۱۸)

اور یقیناً اُنہوں نے اپنے ہر مرثیے میں اس بات کا خیال رکھا کہ اُن کے کسی مرثیے میں۔

"رہ جائے فلسفہ نہ شہادت کا چھوٹ کر"

☆☆☆☆☆

مصطفی زیدی :- (کراچی)

ولادت ۱۹۳۰ء (الہ آباد) وفات ۱۹۷۰ء (کراچی)

کسی اہم شخصیت کے مستند تعارف کے لئے اس کے احباب و اصحاب سے بھی رجوع کیا جا سکتا ہے اور اُس کے اہلِ خانہ (اہلِ بیت) سے بھی۔ لیکن گھر والے جو معلومات فراہم کر سکتے ہیں وہ احباب اصحاب نہیں کر سکتے اور اگر کسی طرح اُس شخصیت کو اس کے اپنے الفظ کے آئینے میں دیکھا جا سکے تو صداقت زیادہ آسانی سے سامنے آتی

ہے۔ مصطفیٰ زیدی کو اُن کے اپنے الفاظ کے آئینے میں دیکھنے کے لئے جو الفاظ ملے ہیں وہ بعد میں آنے والے کمزور راویوں سے نہیں بلکہ ان کی تحریر سے ملے ہیں۔ ''کوہ ندا'' کے پیش لفظ میں وہ کہتے ہیں

میں شاعری اور سرکاری ملازمت، دونوں میں Misfit رہا ہوں۔ جن لوگوں سے ملنے جلنے سے شاعر، حلقۂ شعراء میں قابل قبول ہوتا ہے میں اُن سے کبھی نہیں ملا، اس طرح سول سروس آف پاکستان میں میرے دو یا تین رفیق ہیں ۔ میرے ملک کے معاشرے میں اپنے جامد نظریے کے علاوہ کسی اور نظریے کو قبول کرنا تو کیا برداشت کرنے تک کا ظرف نہیں ہے۔ جوشؔ ملیح آبادی جیسے جید عالم اور کبیر شاعر یہاں حکومت اور عوام دونوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتے رہے ہیں۔ میں اور میرے تمام ہم عصر اُن کے قدموں کی خاک بھی نہیں ہیں۔ لہٰذا جب معاشرہ ایک فرد کو قبول نہ کرے اور فرد اس معاشرے سے مصالحت پر آمادہ نہ ہو تو شعر لکھنے سے زیادہ فضول کوئی بات نہیں ہوتی۔ اور بالخصوص جب ملک کا مذہبی نظریہ کاٹ کھانے کو دوڑتا ہوا دکھائی دے تو خودکشی یا فرار کے علاوہ ایک ہی چارہ رہ جاتا ہے کہ قصائیوں کی چھریوں سے خود کو ذبح کرانے کے لئے ہر وقت تیار رہا جائے۔

۲۴ اپریل ۱۹۶۹ء کی شام کو ایک ماتحت افسر مجھے کئی ہزار روپے کی رشوت دینے آگئے، میں نے اُن کی اس جرأت کے بارے میں چیف سیکرٹری کو تحریری اطلاع دی۔ اس افسر کا تو بال بیکا نہیں ہوا لیکن میرا ایک ایک لمحہ عذاب بنا دیا گیا۔ میرا قصور اتنا تھا کہ میں نے حرام کے پیسے ٹھکرا دئے تھے''۔

یہ ہیں مصطفیٰ زیدی اور ان کی فکر۔ وہ شخص جس نے تیغؔ الہ آبادی کے تخلّص کے ساتھ شاعری کی ابتدا کی۔ تدریس کو پیشے کے طور پر اپنایا اور اسلامیہ کالج کراچی اور پشاور یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر رہے۔ مگر بیقرار روح کو کسی طور قرار نہیں تھا۔ ۱۹۵۴ء میں سول سروس کا امتحان پاس کیا اور اسسٹنٹ کمشنر پھر ڈپٹی کمشنر ہو گئے لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کوئی فرد واحد کسی پورے نظام کو بدل دے سوائے ایک ذات گرامی کے جس نے چودہ سو سال قبل اپنی بات ہی 'لا' سے شروع کی۔ اُس دور کے نظام کی نفی سے آغازِ کلام کیا تھا۔ ''نہیں ہے کوئی معبود، سوائے اللہ کے''۔

اس ذات ختمی مرتبت نے پورے نظام حیات کو بدل دیا۔ غلاموں کو آقا بنادیا۔ جہل کے اندھیروں کو علم کی روشنی میں بدل دیا۔ انا پرستی اور جھوٹے وقار کو عجز و انکسار سکھادیا۔ پُرغرور سروں کو خاک پر رکھوا کر سجدوں کی بنیاد بنادیا ۔۔۔ ہر چند کہ اس ذات والا صفات کو اپنے مشن کی تکمیل کی سند مل گئی۔ اور معبود نے عبد سے کہہ دیا کہ آج ہم نے تمہارے دین کو، تمہارے مشن کو مکمل کردیا اور تم پر نعمتیں تمام کیں مگر ابھی نصف صدی بھی نہ گذری تھی کہ اس ہادیٔ برحق کے لائے ہوئے دستورِ حیات کو نابود کرنے کی کوشش شروع ہوگئی۔ اور بوریا نشین آقا کے مسلک کو تخت و تاج کے احکامات کا دست نگر بنانے کی سعی کی گئی یہاں تک کہ اس دستورِ حیات کے وارث حسینؑ کو کربلا سجانی پڑی ۔۔۔

مصطفیٰ زیدی کربلا کا وارث شاعر تھا۔ درسگاہ کربلا نے مصطفیٰ زیدی کو دیانتِ فکری عطا کی تھی۔ رشوت کے پیسوں کو قبول کرنے سے انکار اور بددیانت افسر کے خلاف شکایت پر مصطفیٰ زیدی کی زندگی دشوار سے دشوار تر نہ ہوتی تو یہ کیسے پتہ چلتا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا۔ مصطفیٰ زیدی نے ۱۹۵۴ء میں سول سروس کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۶ء میں مزید تربیت کے لئے انگلستان گئے واپس آئے تو ڈپٹی کمشنر ہوگئے ۱۹۶۹ء میں رشوت قبول کرنے سے انکار کے جرم میں معطل ہوئے، اور ۱۹۷۰ء میں ملازمت سے برخواست کردیئے گئے۔ مصطفیٰ زیدی کی پوری شاعری ظلم کے خلاف حق کی نعرہ زنی ہے۔ اور مظلومیت کی تاریخ کا احیاء ہے۔

آج اولاد پہ ہے قحطِ ضمیر و جرأت ۔۔۔ خونِ اجداد رسد، عزتِ آبا مددے
کوئی آیا ہے مجھے آگ لگانے کے لئے ۔۔۔ صحنِ بے چارگیٔ مسجدِ اقصیٰ مددے
حلقِ اصغر کی طرف ایک کماں اور کھنچی ۔۔۔ اے ہواؤں کے رُخ اے گردشِ صحرا، مددے
اک رسن اور بڑھی سوئے سکینہ، بیدار ۔۔۔ اک صلیب اور ہوئی درپے عیسیٰ، مددے

(کوہ ندا)

علم سقراط کی آواز ہے، عیسیٰ کا لہو ۔۔۔ علم گہوارہ و سیارہ و انجام و نمو
علم عباسِ علمدار کے زخمی بازو ۔۔۔ علم بیٹے کی نئی قبر پہ ماں کے آنسو

دامنِ ابر میں قطروں کو ترس جائے گا
جو ان اشکوں پہ ہنسے گا وہ جھلس جائے گا

علم، عباسِ علمدار کے زخمی بازو، یا بیٹے کی نئی قبر پہ ماں کے آنسو، کیوں ہے؟ یہ ایک

ایسا دلچسپ اور اہم موضوع ہے جس پر پوری کتاب لکھی جائے تو وضاحت ہو سکتی ہے جو پھر کبھی سہی۔ آج تو علم، انسانی ہلاکت کے طریق سوچنے کا نام ہے۔ آج کے عہد میں تو علم، عالمی فرمان (World Order) ہے اور کلامِ حق کی تلاوت کرنے والے دہشت گرد کہلاتے ہیں۔ مصطفیٰ زیدی نے ایک مرثیہ لکھا ہے جو اُن کی ناگہانی موت کے سبب ادھورا رہ گیا۔ لیکن اس ادھورے مرثیے پر کئی مکمل مرثیے قربان کئے جا سکتے ہیں۔ اُنہوں نے مرثیے کی مروّجہ بحروں سے ہٹ کر مرثیہ کہا جو اس بات کی نشاندہی ہے کہ مصطفیٰ زیدی کو عالمی ادب کے وسیع مطالعہ نے جو روشنیِ طبع اور وسیع کینوس کا ادراک دیا ہے وہ اُن کی مرثیہ گوئی پر بھی اثر انداز ہوا۔ جس بحر میں اُنہوں نے اپنا مرثیہ ''اے کربلا، اے کربلا'' کہا ہے اُس بحر میں راجہ صاحب محمود آباد کا کہا ہوا مرثیہ بھی ہے ۔

''ملک وفا کا حکمراں کونین میں عباسؑ ہے''۔ اسی بحر میں فصیح کا ایک مرثیہ بھی ہے۔

''جب مشک بھر کر نہر سے عباسؑ غازی گھر چلے''۔ ذاکر ہلال نقوی نے ڈاکٹر محمد چراغ علی کا حوالہ دیا ہے جنہوں نے اپنی کتاب ''اُردو مرثیے کا ارتقاء بیجاپور گولکنڈہ میں'' محب اور خوشنود کے دو مرثیوں کا حوالہ دیا ہے جو اس بحر میں کہے گئے تھے۔

☆—— ''اے نورِ چشم مصطفیٰ کیوں جا بسایا کربلا'' (محبؔ)

☆—— ''ماتم محرم کا ابَر کیوں جگ سنے آیا نظر (خوشنود)

ہو سکتا ہے اس زمانے میں ابر کی ''ب'' متحرک ہوتی ہو یا نقل میں کتابت کی غلطی ہو۔

مصطفیٰ زیدی نے مرثیے کی مروّجہ طرز سے بھی انحراف کیا۔ یہ انحراف اُن کے اکلوتے مرثیے کو جن بلندیوں تک لے گیا اُس کی مثال جوشؔ کے علاوہ کہیں نظر نہیں آتی۔ مصطفیٰ زیدی کے اس ادھورے مرثیے کے ۱۸ بند میسر ہیں جن میں سے ۱۲ بند راقم الحروف نے اپنی کتاب ''مرثیہ نظم کی اصناف میں'' نقل کئے تھے۔ ذیل میں سارے کے سارے بند نقل کئے جا رہے ہیں ۔

ہر دور میں مظلومیت کی داستاں لکھی گئی تادیبِ جبر و سلطنت کے درمیاں لکھی گئی
لمحوں کی زنجیروں میں سطرِ جاوداں لکھی گئی تشریحِ بے عنواں، زبانِ بے زباں لکھی گئی

جتنا شعارِ محتسب دشوار تر ہوتا گیا
اتنا ہی ذکرِ خونِ ناحق مشتہر ہوتا گیا

اشکوں سے طغیانی اٹھی آہوں سے افسانے بنے جلتے ہوئے حرفوں کے خاکستر سے پروانے بنے

ہر خاکِ خوں آلود سے تسبیح کے دانے بنے ہر تشنگی سے ساقیٔ کوثر کے میخانے بنے
تردید کی تکرار میں حق کی صدا بڑھتی گئی
جبر و تشدّد میں نوائے بے نوا بڑھتی گئی

تیغوں کا جوہر کھل گیا، جھنکار باقی رہ گئی سیلاب کا رُخ مڑ گیا، دیوار باقی رہ گئی
شامِ وفا دارانِ طوق و دار، باقی رہ گئی صبحِ اذانِ سیّدِ ابرار، باقی رہ گئی
سقراط کے ہونٹوں کو چھو کر زہرِ قاتل، مر گیا
کیلوں کا چھوٹا پن صلیبوں کی نمایاں کر گیا

سو داستانوں کا سبب اُجڑے ہوئے لوح و قلم پتھر کی رگ رگ میں ہزاروں ناتراشیدہ صنم
اونچی فصیلیں، جست کرتے حوصلوں کے قد سے کم مجلس کے زینے پر فروزاں ماہِ تاباں کے قدم
فاتح کے چہرے پر ہزیمت کے نشاں اُترے ہوئے
مفتوح کے در پر زمین و آسماں اُترے ہوئے

خونِ شہیداں کو خراجِ اہلِ حق ملتا رہا لیکن شہادت سے تو ہے مظلومیت کی ابتدا
بعدِ امامِ لشکرِ تشنہ وہاں جو کچھ ہوا کس سے کہوں، کیسے کہوں، اے کربلا۔اے کربلا
دردِ لب و مژگاں نہیں، کربِ حریمِ دل ہے یہ
لوح و قلم کے عجز کی سب سے بڑی منزل ہے یہ

کیسے رقم ہو بیکسی، بے حرمتی کی داستاں اک کنبۂ عالی نسب کی در بدر رسوائیاں
اک مشک جس کو کر گئی سیراب تیروں کی زباں اک سبز پرچم جھک گیا جو خاک و خوں کے درمیاں
اک آہ جو سینے سے نکلی اور فضا میں کھو گئی
اک روشنی جو دن کی ڈھلتی ساعتوں میں کھو گئی

وہ اہلبیتِ ہاشمی، ہر لمحہ جن کو بار تھا وہ عترتِ اطہار جن کا ہر نفس آزار تھا
جس ہاتھ سے تھپڑ پڑے، وہ ہاتھ اک کردار تھا عارض سکینہ کے نہ تھے، تاریخ کا رخسار تھا
حرفِ تپاں اسلام کا منشور بن کے رہ گیا
جو زخم تھا تہذیب کا ناسور بن کر رہ گیا

وہ دودمانِ حیدری کی، آلِ پیغمبر کی لاش وہ آیتوں کی گود میں سوئے ہوئے اکبر کی لاش

وہ اک بریدہ بازوؤں والے علم پرور کی لاش   وہ دودھ پیتے لوریاں سنتے علی اصغر کی لاش
معصوم بچے وحشیوں کی جھڑکیاں کھاتے ہوئے
عون و محمد چھوٹے چھوٹے ہاتھ پھیلاتے ہوئے

وہ شامِ خونِ بے وطن، وہ شامِ ملبوسِ کہن   شورش، تغیر، رست خیزی، جانکنی، دیوانہ پن
تضحیک، نفرت، طنطنہ، تحریف، عیاری، چلن   اُلٹی قناتوں کا سماں، لٹتی رداؤں کا چلن
اُلٹی قناتوں میں رواں آتش یزیدی جاہ کی
لٹتی صفوں میں در بدر عترت رسول اللہ کی

وہ جرمنی کا آشوز، جاپان کا ہیروشیما   اُن کی بھیانک نزع کی آواز کو کسی نے سُنا
اُن کے تو لاکھوں دوست تھے، لیکن یہ خونیں سانحا   اُن کے لئے علمی مباحث کے سوا کچھ بھی نہ تھا
اپنی ذہانت کے علاوہ سب سے پردہ پوش تھے
سب جیسپر، سب ماکرو، سب سارتر خاموش تھے

سارے جرائم سے بڑی ہے یہ مہذب خامشی   اس کے تو آگے ہیچ ہے قاتل کی زہریلی ہنسی
اس علم کے ساغر میں شامل ہے ہلاکت علم کی   اس سے زیادہ اور کیا سنگین ہوگی دوستی
تاریخ پوچھے گی کہ جب مہمان ویرانے میں تھے
کوفے کے سارے مرد کس گھر کے نہاں خانے میں تھے

اور یاد رکھنا اے میرے ہم عصر اربابِ ذکا   ہم پر بھی گر طاری رہا عالم سنہرے خواب کا
کل ہم بھی ہوں گے روبرو، ہم سے بھی پوچھا جائیگا   سننا پڑے گا ہم سبھی کو کربلا کا فیصلا
قاتل تو شاید عفو کے قابل ہوں وہ مجبور تھے
ہم دوست ہو کر کیوں ضمیرِ ارتقاء سے دور تھے

جدّ و پدر، بھائی بھتیجے، فدیۂ راہِ خدا   تقویم بابِ ہل اتیٰ، تنظیم باغِ لافتیٰ
ہمرازِ روح العالمیں، ہمشکلِ ختمِ انبیاء   سب کا لہو تھا اور اک دامانِ ارضِ نینوا
ساری جبینیں ایک تھیں سب کی عبادت ایک تھی
جینے کے لاکھوں ڈھنگ تھے، مرنے کی صورت ایک تھی

ابرِ کرم، نیساں قدم، کہسار قامت آدمی   گلشن بکف، گوہر بلب، بارانِ رحمت آدمی

لوحِ صداقت آدمی، مہرِ نبوت آدمی دارالامارت کے ولی، درویش سیرت آدمی
وہ تشنہ لب تھے جو سمندر کا دہانہ پاٹ دیں
وہ موم جیسے دل جو تلواروں کا لوہا کاٹ دیں

اوراس کے بعد ایسی گھٹاٹوپ آندھیوں کا قافلہ تپتی ہوئی ریگِ رواں، جلتا ہوا دشتِ بلا
خونیں چٹانیں، ناچتے شعلے، گرجتا زلزلہ سفاک آنکھیں، سرخ تلواریں، کف آلودہ خلا
کالی فصیلیں آتش و آہن کا منہ کھولے ہوئے
وحشی عناصر آبنوسی برچھیاں تولے ہوئے

تیزی سے چکر کاٹتی، دہشت زدہ گونگی زمیں جیسے کسی شے میں کوئی معنی نہیں، مقصد نہیں
بے صوت لہجے بے صدا آواز بے ایقاں یقیں حفظِ مراتب بے محافظ، حرزِ ایماں بے امیں
بادِ ہوس کی زد میں شمعِ آبرو آئی ہوئی
ہر آستیں اُلٹی ہوئی، ہر آنکھ گہنائی ہوئی

سجاد سے زینبؑ کا یہ کہنا کہ مولا جاگیے غفلت سے آنکھیں کھولیے، لٹتا ہے کنبہ، جاگیے
اُٹھتے ہیں شعلے دیکھیے، جلتا ہے خیمہ جاگیے اے باقیٔ ذریّت یٰسین و طٰہٰ، جاگیے
سارے محافظ سو رہے ہیں اشقیا بیدار ہیں
طوق و سلاسل منتظر ہیں، بیڑیاں تیار ہیں

سونی ہیں ساری بارگاہیں، نوحہ خواں ہیں چوکھٹیں اُجڑے ہوئے ہیں بام و در، ویراں پڑی ہیں مسندیں
مدھم ہوئیں، پھر بجھ گئیں، سارے چراغوں کی لویں ہم پر اچانک اجنبی سی ہو گئی سب سرحدیں
ذرّوں کے دل بڑھتے گرجتے زلزلوں سے بھر گئے
چمڑے کے ٹکڑوں پر نمازیں پڑھنے والے مر گئے

مصطفیٰ زیدی کا یہ مرثیہ نامکمل ہو کر بھی مکمل ہے، ہیئت کے اعتبار سے، رثا کے حوالے سے فکر کے زاویے سے، کیا کچھ نہیں کہا مصطفیٰ زیدی نے، اور اسلوب تو اتنا جداگانہ ہے کہ ناپختہ گو شعراء کے لیے تو ایک چیلنج ہے۔

کہا جاتا ہے "رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند" — مرثیے کے حوالے سے مملکتِ نقد و نظر کی ایک اہم شخصیت سید ضمیر اختر نقوی نے مصطفیٰ زیدی کو اپنی تصنیف "اُردو مرثیہ پاکستان

میں'' کراچی کے گمنام مرثیہ گو شعراء میں شمار کیا ہے۔ اے کاش وہ گمنامی جو مصطفیٰ زیدی کو ملی ہے وہ ہمیں بھی مل جائے۔ کاش لوح و قلم کا مالک ہمیں بھی توفیق دے کہ جس تدبّر اور فراست سے مصطفیٰ زیدی نے مدحِ اہلبیت کی ہے اسی تدبّر سے ہم دو چار شعر ہی کہہ سکیں تو نجات یقینی ہو جائے۔

تسلیم کہ کسی عالمانہ فیصلے پر تنقید ہمارا منصب نہیں اسی لئے اس گزارش پر اکتفا کہ۔

''ہمارا حال تو یہ ہے کہ شرم سے چُپ ہیں
جسے زباں کا ہو دعویٰ وہ بول کر دیکھے''

☆☆☆☆☆

رضا مشہدی :-

۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء) وفات ۱۹۷۰ء

نام سیّد حسن رضا، تخلّص رضاؔ۔ ڈاکٹر عظیم امروہوی نے لکھا ہے کہ رضاؔ کے دادا سید محمد محسن کو زمانہ غدر (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء) میں ''حُسنِ خدمت'' (یعنی خدمت سرکار انگلیسیہ) کے صلے میں انگریزوں کی طرف سے 'خان' کا خطاب ملا تھا اس لئے رضاؔ بھی اپنے نام کے ساتھ 'خان' لکھتے تھے۔ حسن رضا 'خان' رضا کے دادا محمد محسن 'خان' کا ایک اعزاز یہ بھی لکھا گیا ہے کہ وہ انگریزی دورِ حکومت میں وائسرائے 'بہادر' کے درباری بھی تھے۔ انگریز وائسرائے کو 'بہادر' لکھنے پر ہو سکتا ہے نئی نسل اس کا سبب پوچھے تو اس وقت اتنا جواب کافی ہے کہ برصغیر پر ایسا وقت بھی آیا تھا جب ایک کمپنی (ایسٹ انڈیا کمپنی) بھی 'کمپنی بہادر' کہلاتی تھی۔ اس کی تفصیل کوئی 'خان بہادر' صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔ ایک اور جملۂ معترضہ کی معذرت کہ ذکر تھا حسن رضا خان رضاؔ کا جنہیں قدرت نے سید گھرانے میں پیدا کیا مگر انہوں نے انگریز کے خطابات کو اپنایا اور خود کو 'خان' لکھنے لگے۔ حسن رضا خان اپنے والد اور والدہ گرامی کی شادی کے ۲۰ برس بعد اس وقت پیدا ہوئے تھے جب وہ لوگ مشہد مقدس کی زیارت سے واپس آئے تھے اس لئے اس وقت ان کا نام سیّد حسن رضا مشہدی رکھا گیا تھا لیکن وہ (جیسا کہ عرض کیا گیا شاید) حسن رضا خان رضاؔ لکھنا پسند کرتے تھے۔ یہی ڈاکٹر عظیم امروہوی نے بھی لکھا ہے۔

حسن رضا خان نے اوائل عمری میں تحت اللفظ میں مرثیہ خوانی شروع کر دی تھی جو انہیں شعر گوئی تک لے گئی اور انہوں نے تین مرثیے کہے۔ ایک مرثیہ جس کے مطلع کا بند درج

ذیل ہے ۹۳ بند پر مشتمل بتایا گیا ہے:

اے قلم جوہر شمشیرِ زباں دکھلادے اے زباں حسنِ معانی و بیاں دکھلادے
اے بیاں ولولۂ طبع رواں دکھلادے جنگِ بازوئے امامِ دو جہاں دکھلادے
پہلواں فوج کے روباہ نظر آجائیں
رن میں لڑتے اسداللہ نظر آجائیں

دوسرے مرثیے کے مطلع اور مقطع کے بند حسب ذیل بتائے گئے ہیں

خدا کے نور کی تنویر ہے کلام مرا جہاں میں خُلد کی جاگیر ہے کلام مرا
ثنائے شاہ کی تفسیر ہے کلام مرا ضیائے مجلس شبیر ہے کلام مرا
سمائے آنکھ میں کیا اس کی، طور کا جلوہ
کہ لفظ لفظ میں ہو جس کے طور کا جلوہ

قلم کو روک رضا اب نہیں ہے تابِ رقم دعا کرو یہ خدا سے بہ دیدۂ پرنم
الٰہی تجھ کو غریبیٔ شاہِ دیں کی قسم حصول ہووے مرے دل کا مدعا اس دم
ضریحِ پاکِ شہِ مشرقین تک پہنچوں
میں زندگی میں مزارِ حسینؑ تک پہنچوں

ان کے تیسرے مرثیے میں انہوں نے مشاہیر امروہہ کا ذکر کیا ہے، نمونہ کے طور پر ایک بند نذرِ قارئین کیا جارہا ہے۔

ہیں مولوی جو محمد علی وہ دانشمند علوم مرتضوی سے ہیں خوب بہرہ مند
ستارہ عزّت و اقبال کا ہو ان کا بلند الٰہی ان کو نہ پہنچے کسی طرح کا گزند
'صفات مرتضوی' سب انہوں نے پائی ہیں
جنابِ یوسفِ ملت کے چھوٹے بھائی ہیں

رضا خان رضا نے اپنے ممدوح مولانا میں صفات مرتضوی دیکھنے کے بعد مرثیے میں اس کا ذکر نہیں کیا کہ مولانا موصوف خلق کے مشکلکشا بھی ہو گئے تھے کہ نہیں اس لئے کی صفات مرتضوی میں اہم صفت مشکلکشائی تھی۔

حسن رضا خان رضا اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ہم ایک مرثیہ گو شاعر کی حیثیت سے

ان کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں خدا کی طرف سے عطا کردہ خطاب ''سیدؔ'' پر انگریز بہادر کے عطا کردہ خطاب ''خان'' کو پسند فرمایا لہٰذا ہم انہیں حسن رضا خان رضاؔ کے نام سے یاد کریں گے۔ یاد کرنا اس لئے ضروری ہے کہ وہ مولا کے مرثیہ خواں بھی تھے اور مرثیہ گو بھی اور کم و بیش چالیس پینتالیس سال مرثیہ خوانی کرنے کے بعد وہ مرثیہ کہنے کی طرف آئے تھے چنانچہ اس وقت تک ان کے ذہن مین لوازم مرثیہ اپنی جگہ بنا چکے تھے اسی لئے ان کے مراثی میں شعور کی بالیدگی اور بیان کی پختگی ملتی ہے۔

☆☆☆☆☆

بنیاد تیموری:۔

ولادت ۱۹۰۱ء (لکھنؤ) وفات ۱۹۷۱ء (کراچی)

نام پرنس حشمت شکوہ بنیاد حسین تیموری۔ تخلص بنیاؔد۔ انشاء اللہ خان انشا کے نواسے۔ والد گرامی پرنس عظمت شکوہ بادشاہ حسین عالی گہر بھی شاعر تھے۔۔۔ بنیاؔد تیموری ابھی کم سن تھے کہ اُن کے عالی مرتبت والد گرامی پرنس عظمت شکوہ کا انتقال ہو گیا۔۔۔ والدہ گرامی دولت گنج سکول سے سلطان المدارس تک اُن کی تعلیم کے لئے کوشاں رہیں یہاں تک کہ جب اُنہیں علم ہوا کہ فرزند ارجمند شاعری کا شوق رکھتے ہیں تو وہ بیٹے کے اس مذاقِ شعر گوئی کی مخالف نہیں ہوئیں بلکہ اُنہیں میر عارفؔ کی شاگردی میں دے دیا۔۔۔ شوہر کے انتقال کے بعد بنیاؔد تیموری کی مادرِ گرامی کے سر سے وہ سائبان چھن گیا تھا جو انہیں تحفظ اور سایہ فراہم کرتا تھا لیکن زندگی کی چلچلاتی دھوپ میں تپتی خاتون نے قدم بہ قدم اپنے بچّے کے سر پر اپنے آنچل کا سایہ رکھا۔ ہر چند کہ والد کی وفات کے بعد ماں نے ہر طرح سے دلجوئی کی مگر بنیاؔد تیموری کو حالات اور ماحول بدلنے کا پورا ادراک تھا اسی لئے اُنہوں نے جلد از جلد اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے کی کوشش کی لکھنؤ میں لکھنؤ ڈرامہ سوسائٹی اور قومی کلب کی داغ بیل ڈالی۔ اس زمانے ڈرامے کی دنیا میں ایک ہی نام مشہور تھا یعنی آغا حشر کاشمیری۔ بنیاؔد تیموری کا ان سے ربط ضبط بڑھا مگر بات نہیں بنی رنگون تک گئے اور گریٹ انڈین تھیٹر میں ہدایت کار رہے۔ پھر نواب صاحب رامپور رضا علی خان کے ملازم ہو گئے یہ ملازمت بھی زیادہ دنوں نہ چلی۔۔۔ اللہ کسی کی بنا کر نہ بگاڑے۔ پرنس بنیاؔد تیموری کے عزم اور ارادے کی بات تھی کہ اُنہوں نے ساری زندگی جدوجہد کی مگر ملازمت میں رہنے کے لئے جس طرح سر جھکا کر

جینا پڑتا ہے اُس کی تربیت پرنس بنیاد تیموری کو کون دیتا ؟

بنیاد تیموری ۱۹۵۱ء میں پاکستان آگئے اور زیڈ۔اے۔بخاری کی جوہر شناس نظروں نے بنیاد تیموری کی نجابت، شرافت اور ضرورت کو پہچان لیا اور انہیں ریڈیو پاکستان سے وابستہ کرلیا۔ جس طرح بخاری صاحب نے، ان کے کھوئے ہوئے مراتب کو ہمیشہ دھیان میں رکھا اس طرح بنیاد تیموری نے بھی ذمہ داریوں کو نبھانے کی سعی جاری رکھی۔ نتیجہ فارغ البالی تو نہ ہو سکی لیکن باعزت زندگی گذارنے کا سہارا ضرور مل گیا۔

بنیاد تیموری کے مرثیوں میں خاندان انیس کا رنگ نمایاں تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا ابتدائی عمر میں میر عارف کی شاگردی نے جو روشن راستہ دکھایا وہ تو میر انیس کی طرف جاتا تھا۔

مشرق سے جب طلوع کیا آفتاب نے　　لوٹی ضیاء نجوم کی اس انقلاب نے
مغرب کی سمت کوچ کیا ماہتاب نے　　انگڑائی لی فلک پہ سحر کے شباب نے
ذرّوں میں ہے ضیاء کہ تجلی ہے طور کی
کرنیں یہ مہر کی ہیں کہ بارش ہے نور کی

تڑکا وہ نور کا وہ دلکتی ہوئی فضا　　کرنوں سے مہر کی وہ چمکتی ہوئی فضا
گلشن میں ہر طرف وہ بہکتی ہوئی فضا　　فرشِ زمرّدی پہ مہکتی ہوئی فضا
شاخیں بڑھا کے نخل گلے سے ملے ہوئے
گلزار حسن میں ہیں نئے گل کھلے ہوئے

ڈاکٹر ہلال نقوی کی تصنیف بیسویں صدی اور جدید مرثیہ میں صفحات ۳۵۲،۳۴۸، ۴۹۳، ۵۲۵ اور ۶۵۰ پر بنیاد تیموری کا اسم گرامی مرثیہ گوشعرا کی فہرستوں میں لکھا ہے اور بس! جبکہ دبستان کراچی کے تمام شعراء پر انہوں نے سیر حاصل تبصرہ کیا ہے البتہ ضمیر اختر نقوی نے اپنی کتاب ''اردو مرثیہ پاکستان میں'' میں پورا ایک باب بنیاد تیموری کے لئے رکھا ہے۔

بنیاد تیموری جتنا اچھا مرثیہ کہتے تھے اس سے کہیں زیادہ اچھا پڑھتے تھے اس کا سبب اُن کا سٹیج کے ڈراموں کی ہدایت کاری کا تجربہ تھا جو الفاظ کی نشست و برخواست اور معنی و مطالب کی وضاحت سکھاتا ہے۔

بنیاد تیموری خاندان انیس کی شاگردی پر نازاں تھے۔ بہاریہ مضامین یا ساقی نامے

میں اُنہوں نے خاندان انیسؔ کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

کچھ آج برج شرف میں ہے آفتاب سخن ہے نور بلکہ علیٰ نور آب و تاب سخن
زبان پیر بہ اعجاز ہے شباب سخن فصاحت اور بلاغت میں ہمرکاب سخن
نفاست اپنے بیاں میں نفیسؔ سے پائی
زباں سلیسؔ جناب انیسؔ سے پائی

یہ باغ وہ ہے بہارِ انیسؔ ہے جس میں یہ باغ وہ ہے فضائے نفیسؔ ہے جس میں
یہ باغ وہ ہے کہ ہر گل جلیسؔ ہے جس میں یہ باغ وہ ہے کہ بلبل سلیسؔ ہے جس میں
یہاں کے نخل گلوں کا سراج رکھتے ہیں
یہاں کے خار بھی گل کا مزاج رکھتے ہیں

بنیادؔ تیموری کے مراثی میں بھی ساقی نامہ ایک اہم جزو ہے لیکن اُن کے مرثیوں میں جہاں قاری کسی ایک مجاہد کی جنگ میں محصور ہو جاتے تھے تو بنیادؔ تیموری دوسرے مجاہد کی رزم تک لے جانے کے لئے درمیان میں ساقی نامہ کے کچھ اشعار ڈالتے تھے تاکہ ایک کیفیت میں جاتے وقت مرثیے کے قاری کو جھٹکا نہ لگے۔

ساقی کہاں ہے دور چلے آفتاب کا پیاسا ہے ہم شبیہ رسالت مآب کا
تپتی فضا میں گرم لہو ہے شباب کا ہے دھوپ میں پسر خلف بوتراب کا
ساقی تپاں ہے قلب، جگر کو قرار دے
کوثر کو کربلا کی زمین پر اُتار دے

کوشش کے باوجود یہ علم نہ ہو سکا کہ بنیادؔ تیموری نے کتنے مرثیے کہے ہیں اور کہاں ہیں جبکہ بنیاد تیموری کا استحقاق ہے کہ اُن کا کلام اہل نظر کے سامنے آتے۔

حسینؑ مطلع حق ہے حسینؑ منبع نور حسینؑ قرب الٰہی حسینؑ وجد و سرور
حسینؑ درد کا خالق حسینؑ صبر و صبور حسینؑ جان دوعالم، حسینؑ شکر و شکور
درِ حسینؑ پہ جو مانگنے کو جاتا ہے
مئے الست کا بھرپور جام پاتا ہے

حسینؑ خلق کا آغاز ہے حسینؑ انجام حسینؑ بادہ عرفان کا جھلکتا جام

حسینؑ نام خدا ہے، خدا کا اصلی نام حسینؑ قربِ الٰہی کا سب سے اونچا بام
حسینیوں کو خدا کی طلب ضرور نہیں
حسینؑ مل گیا تو پھر خدا بھی دور نہیں

آج بنیاد تیموری کے مراثی نہیں ملتے، ان کے بارے میں کوئی کچھ بتانے پر آمادہ نہیں، یہ بھی کسی کو یاد نہیں کہ وہ کل تک ہمارے ساتھ تھے۔ تو کیا اہلِ کراچی ان کا ذکر نہیں کریں گے تو ان کا نام تاریخِ مرثیہ گوئی کے صفحات سے مٹ جائے گا؟ زمانے والے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ بنیاد تیموری جن کے مداح تھے، حیات و موت، عزت و ذلت پر ان کا اختیار آج بھی ہے۔ بنیاد تیموری کا کوئی مرثیہ، کوئی شعر، کوئی مصرعہ اجرِ رسالت کے زمرے میں بھی تو شمار کیا جاسکتا ہے یا اُن کا مرثیہ سن کر کسی آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو اس مقدس رومال تک بھی تو پہنچ سکتا ہے جس میں آنسو موتی بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد کہاں ہوں گے بنیاد تیموری اور کہاں ہوں گے بنیاد تیموری کے مراثی کی عظمت کو پس پشت ڈالنے کی کوشش کرنے والے؟

☆☆☆☆☆

گویا جہاں آبادی:-

پیدائش ۱۶ر جنوری ۱۸۹۲ء وفات ۱۰ر ستمبر ۱۹۷۱ء

ایٹہ میں پیدا ہوئے اور کراچی میں وفات پائی۔ وطن جہاں آباد، ضلع پیلی بھیت۔ روہیلکھنڈ (یو۔پی) تھا لیکن بریلی میں بسلسلۂ ملازمت زیادہ قیام رہا۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی آگئے تھے۔ اُن کا شمار اساتذہ شاعروں میں ہوتا تھا۔ اُن کی مثنوی، اسرار ہستی، کی حکیم الامت علامہ اقبال نے تعریف کی تھی۔ گویا جہاں آبادی ایک مفکر، فلسفی، قادرالکلام شاعر اور ادیب تھے نظم ونثر کی بہت سی کتابوں کے مصنف تھے مگر وہ اکابرین ادب جن کی اولاد کو ادب سے لگاؤ نہ ہو موت کے بعد فراموش کردئے جاتے ہیں تاآنکہ اُن کے بعد کوئی اُن کے ادبی محاسن اور تخلیقی ادب کو زندہ رکھنے کی کوشش نہ کرے۔ گویا جہاں آبادی ایسے قادرالکلام شاعر اور ادیب کا گمنامی میں چلے جانا ایک المیہ ہے کہ اُن کا غیر مطبوعہ کلام تو درکنار، کوئی ان پر کام کرنا چاہے تو ان کا مطبوعہ کلام یا اُن کی مطبوعہ تصانیف کی نشاندہی کرنے والا بھی کوئی نہیں۔

تفو برتو اے چرخ گرداں تفو

گویا جہاں آبادی کے تین بند نمونہ کے طور پر نقل کیے جا رہے ہیں جو اُن کے شاعرانہ ادراک و اسلوب کے مظہر کہے جا سکتے ہیں۔

انساں نے آنکھ کھولی ہے بزمِ شہود میں — آدم کے قبل آیا ہے عالم وجود میں
تسخیر ہی کو ارض و سما کے حدود میں — دیرینہ ایک جنگ ہے بود و نمود میں
ظلمت خلاف نور ہے وقت دراز سے
واقف نہیں اضافی افاضی کے راز سے

لیکن کُھلا یہ بھید سرِ طور و کربلا — دید و شہود کے بھی مقامات ہیں جُدا
خود میں خدا کی دید شہادت کا اقتضا — نظارے کی طلب ہے تقاضا کلیم کا
دونوں میں راہِ اَنفُس و آفاق کا ہے فرق
عرفانِ ذوق و علم میں اشراق کا ہے فرق

چشم کلیم ادھر ہے اُدھر قلبِ مصطفیٰؐ — طالب کا وہ مقام یہ مطلوب کا پتا
ہے درمیاں میں دیدہ و دل کا معاملہ — بند آنکھیں اُس طرف ہیں ادھر سینہ ہے کھلا
''موسیٰ زہوش رفت بیک پرتوِ صفات''
آئینہ حضورؐ محلِ جمالِ ذات

☆☆☆☆☆

صابر تھاریانی:-

ولادت ۱۹۰۵ (پروفیسر رضا کاظمی نے ۱۹۰۷ء لکھی ہے)۔ وفات ۱۹۷۲ء

صابر تھاریانی بمبئی کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اُن کی مادری زبان گجراتی تھی لیکن گجراتی، اُردو اور انگریزی زبانوں پر اُنہیں اس حد تک دسترس تھی کہ ان زبانوں میں وہ شعر کہتے تھے۔ بمبئی میں تھے تو قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے گجراتی کے اخبار ''وطن'' گجراتی کی ادارت اُنہیں سونپی تھی۔ قائداعظم محمد علی جناح اپنے انتخاب میں بہت محتاط تھے۔ وہ اگر کسی شخص کو کوئی ذمہ داری سونپتے تھے تو یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس شخص میں وہ ذمہ داری پوری کرنے کی صلاحیت ہوتی تھی۔ صابر تھاریانی کو ''وطن'' گجراتی کی ادارت دینے کا مطلب یہ ہوا کہ وہ گجراتی زبان میں مہارت اور صحافیانہ صلاحیتیں رکھتے تھے۔ ''وطن'' گجراتی پہلے

بمبئی سے اور بعد میں کراچی سے شائع ہوتا رہا ہے گویا صابر تھاریانی بمبئی سے کراچی آ گئے تھے۔

کراچی آ کر انہوں نے وطن گجراتی کی ادارت کے ذریعے ذہنوں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ عمارات کی تعمیر کا پیشہ اختیار کیا یعنی وہ Architect بن گئے۔ یہ وہ دور تھا جب کراچی مچھیروں کی بستی سے ایک آزاد مملکت کا دارالخلافہ بننے جا رہا تھا۔ کراچی شہر کی بہت سے فلک بوس عمارتوں کی تعمیر صابر تھاریانی کی Planing اور منصوبہ بندی کی رہین منت ہیں۔ اور وہ ایک کامیاب صحافی کے علاوہ ایک کامیاب Architect اور Builder ثابت ہوئے۔ ان دو متضاد شعبۂ ہائے حیات کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے شاعری بھی کی ہے اور ہر صنف سخن میں شاعری کی ہے۔ اُردو زبان میں اُن کی غزلیات کا مجموعہ ''دیوان صابر'' کے نام سے اور رباعیات کا مجموعہ ''صابر کے موتی'' شائع ہوا ہے۔ کراچی میں مرثیے کی فضا بنی تو صابر تھاریانی کو یہ فضا ایسی راس آئی کہ اُنہوں نے مرثیہ گوئی کی طرف توجہ دی۔ ہر کام کو سلیقے سے کرنے والے صابر تھاریانی کی مادری زبان اُردو نہیں تھی۔ پھر بھی انہوں نے ایک مرثیہ کہا جو اُن کی حیات کے بعد ''پہلا اور آخری مرثیہ'' کے زیر عنوان شائع ہوا ہے!

قدرداں جس کے ہیں قدسی وہ سخن میرا ہے

راقم الحروف نے تھاریانی کو دیکھا ہے۔ اُن سے باتیں کی ہیں۔ سرکار علامہ رشید ترابی مرحوم ایسی شخصیت کے دردولت پر صابر تھاریانی کی بلا روک ٹوک رسائی تھی۔ ڈاکٹر یاور عباس، حضرت نسیم امروہوی، سید آل رضا کے ساتھ صابر تھاریانی مرثیوں کی محافل میں موجود ہوتے تھے۔ وہ اس ذوق وشوق سے ان محافل میں شریک ہوتے تھے جیسے اُردو ان کی پہچان ہو۔ رثائی ادب اُن کی جان ہو۔ اُن کے مرثیہ کے تین بند نمونۂ کلام کے طور پر درج کیے جا رہے ہیں۔

کیسے خوش بخت نواسے شہ صفدر کو ملے کیسے نایاب گہر دخترِ حیدر کو ملے
کیسے شہ زور جری بھانجے سرور کو ملے کیسے زیبائش پہلو علی اکبر کو ملے
سر کو ماموں پہ فدا کر کے بڑا نام کیا
سن میں چھوٹے تھے مگر مر کے بڑا کام کیا

گلشنِ حیدر و جعفر کی فضا تھے دونوں عندلیبِ چمنستانِ وفا تھے دونوں
فدیۂ بادشہِ کرب و بلا تھے دونوں رات دن دلبرِ زہرا پہ فدا تھے دونوں

خوں میں کپڑے جو رنگے، گُل سے گلستان ہوئے
ہوگئی عید کہ شبیرؑ پہ قربان ہوئے

اختر منزل تبلیغ و ہدایت تھے یہ چاند ماہتاب فلک عزّ و شرافت تھے یہ چاند
قابل رایت خورشید امامت تھے یہ چاند طالع دین نبی بخت شہادت تھے یہ چاند

جسم پامال ہوا، سر بھی کٹے گردن سے
مثل قطبین جمے اور نہ ٹلے یہ رن سے

کراچی کے افق مرثیہ گوئی پر جو کہکشاں سجی تھی اُس میں جوشؔ ملیح آبادی نجم آفندی، نسیم امروہوی، آرزو لکھنوی، سید آل رضا، فیض بھرتپوری جیسے روشن ستارے نمایاں ضرور تھے لیکن اس کہکشاں میں بہت سے ستاروں کی موجودگی نے ہی اسے کہکشاں بنایا تھا۔صابر تھاریانی بھی اس کہکشاں کا ایک روشن ستارا ہے جو بادی النظر میں دور سے چاہے نہ دکھائی دیتا ہو لیکن قریب سے دیکھنے پر اتنا روشن نظر آتا تھا جتنا ایک ستارے کو روشن ہونا چاہیے۔ان کے کلام میں ''عندلیب چمنستان وفا'' ''اخترِ منزلِ تبلیغ وہدایت''۔'' قابلِ رایتِ خورشید امامت'' جیسی تراکیب ان کی اُردو دانی اور رثائی ادب کے مطالعہ کی دلیل ہیں۔

☆☆☆☆☆

ھادی سرسوی:-

ولادت ۱۸۹۸ء (سرسی)۔وفات ۱۹۷۳ء (کراچی)

نام حکیم محمد ہادی نقوی، تخلص ہادیؔ، وطن مالوف سرسی ضلع مرادآباد۔نقوی سید۔مولانا، حکیم، شاعر، سارے کمالات ایک ذات میں۔All in one شخصیت۔لاہور سے منشی فاضل کا امتحان (فارسی) پاس کیا۔۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۷ء تک مدرسہ ناظمیہ لکھنؤ میں تحصیل علوم عربی میں صرف کیے۔مدرسہ ناظمیہ لکھنؤ اُن درسگاہوں میں سے ایک درسگاہ ہے جہاں تدریس علوم دینی و دنیاوی کے ساتھ ساتھ تربیت فکر ونظر بھی کی جاتی ہے۔لہٰذا محمد ہادی جب مدرسہ ناظمیہ سے تعلیم مکمل کر کے نکلے تو مولانا حکیم محمد ہادی نقوی تھے — مادری زبان اُردو تھی، فارسی اور عربی علوم کے حصول نے ان کے علم کو سہ آتشہ بنا دیا تھا۔بچپن سے سوز وسلام، قصائد و مراثی سنتے سنتے مزاج شعر گوئی کی طرف مائل ہو چکا تھا۔سگے ماموں سید مطلوب حسین نے کردار کی تعمیر کے ساتھ ساتھ

شاعری میں بھی اصلاح دی ابتداء غزل گوئی سے ہوئی۔ دوسری منزل قصائد، سلام، منقبت تھی۔ فکر اور بلند ہوئی۔ ہُنر نے جلا پائی تو مرثیہ کہنے لگے۔ کراچی میں جہاں جوشؔ ملیح آبادی، نجمؔ آفندی، نسیمؔ امروہوی، سید آل رضا جیسے مرثیہ نگاروں کے مرثیوں کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں حکیم محمد ہادی نقوی کے مرثیے اس دور میں بھی سنائی دیئے مگر سوچنے کی بات ہے کہ حکیم محمد ہادی کا کوئی مرثیہ کہیں دستیاب نہیں ہے۔ کراچی ہی میں ۱۹۷۳ء میں ان کا انتقال ہوا جو کل ہی کی بات ہے۔ مگر بقول استاد قمر جلالوی۔ ''ذرا سی دیر میں کیا ہو گیا زمانے کو'' سید ضمیر اختر نقوی کے علاوہ کسی تذکرہ نگار نے اُن کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس ذکر کے طفیل ان کے سات مرثیوں کی نشاندہی ہوئی ہے جو ہر مرثیے کے مطلع کے مصرعۂ اولیٰ اور احوالِ مرثیہ تک محدود ہے:

۱۔ کعبہ میں بھی اماں نہ ملی جب امام کو — درحال ''سفر امام حسینؑ مکّہ سے کربلا تک''۔
۲۔ رن میں جب سورۂ والفجر کی تفسیر ہوئی — درحال حضرت عباسؑ علیہ السلام
۳۔ عرصۂ جنگ میں بازوئے حسینؑ آتا ہے — درحال حضرت عباسؑ علیہ السلام
۴۔ جب یوسف حسینؑ کی گا ہک قضا ہوئی — درحال حضرت علیؑ اکبر علیہ السلام
۵۔ مرکز دائرۂ 'کن' بخدا احمد ہیں — درحال حضرت امام حسینؑ علیہ السلام
۶۔ بخدا دین الٰہی کے مسیحا ہیں حسینؑ — درحال حضرت امام حسینؑ علیہ السلام
۷۔ غذائے روح غم شہ کا داغ ہو یارب — درحال حضرت امام حسینؑ علیہ السلام

(اُردو مرثیہ پاکستان میں۔ص ۷۴۳۔ضمیر اختر نقوی)

کراچی میں اُن کے ورثاء ہیں کہ نہیں؟ ان کے مراثی کہاں گئے؟ ایسے بہت سے سوالات کے جوابات کراچی میں آباد صاحبان نقد و نظر نہ دے سکے تو ہم وطن سے ہزارہا میل دور، خانماں برباد لوگوں کی جستجو کیا بار آور ہو سکتی ہے۔ ہمارے لئے تو یہ دکھ کیا کم ہے کہ جب ہم نے وطن چھوڑا تھا تو وہاں ایک معاشرہ تھا۔ اس معاشرے کا انحصار افراد کی ایک دوسرے سے باخبری پر تھا، اس معاشرے میں ایک دوسرے کے دکھ بانٹے جاتے تھے لیکن آج ایسا لگتا ہے کہ خاکم بدہن وہ معاشرہ بکھر رہا ہے۔ معاشرتی اقدار انتشار کا شکار ہیں۔ خدا نہ کرے اگر یہی ماحول رہا تو آج کا ہر روشن آدمی آنے والے کل کو حکیم محمد ہادی نقوی سرسوی کی طرح فراموش کر دیا جائے گا۔

☆☆☆☆☆

راجہ صاحب محمود آباد:-

ولادت ۱۹۲۴ء وفات ۱۹۷۳ء

اسم گرامی راجہ محمد امیر احمد خان۔ تخلص ''محبوب'' غزل گوئی میں 'بحر' تخلص پسند فرمایا تھا۔ اس خانوادے کو ''راجہ'' کا خطاب انگریزوں کا حقِ نمک ادا کرنے پر نہیں ملا تھا بلکہ محمود آباد ریاست کا علاقہ راجہ صاحب کے اجداد نے تین سو برس پہلے خریدا تھا اور شاہانِ اودھ نے حب الوطنی کے صلے میں 'راجہ' کا خطاب دیا۔ اور یہ حب الوطنی اس گھرانے کے خون میں رواں دواں رہی۔ جن لوگوں نے ہندوستان کو انگریز کے تسلط سے آزاد کرانے کی کوششوں میں حصّہ لیا اُن میں راجہ صاحب محمود آباد کا نام صف اوّل میں رہا ہے۔ خاص طور پر پاکستان کے حصول میں راجہ محمود آباد کا نام سرفہرست ہے۔ راجہ صاحب امیر احمد خان آف محمود آباد کے گھرانے میں حب الوطنی کے علاوہ علم وادب کا ماحول بھی رہا ہے۔ راجہ صاحب کے دادا راجہ امیر حسن خاں بھی غزل اور مرثیہ کہتے تھے۔ مرثیے میں حبیبؔ تخلص تھا اور میر مونسؔ اور میر نفیسؔ سے شرف تلمذ تھا۔ راجہ امیر احمد خان کے والد گرامی مہاراجہ محمد علی خان کے نام کے ساتھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، امیر الدولہ اسلامیہ کالج لکھنؤ۔ مدرسۃ الواعظین لکھنؤ۔ امیر الدولہ لائبریری اور شیعہ کالج لکھنو کے نام بھی آتے ہیں جن اداروں کی بنیادوں میں مہاراجہ صاحب کی علم دوستی اور مالی معاونت کے پتھر لگے ہیں — مہاراجہ محمد علی خان مرثیے میں محبؔ تخلص استعمال کرتے تھے۔ میر عارفؔ کے شاگرد تھے۔ مرثیوں کی ایک جلد ''مراثی محبؔ'' شائع ہو چکی ہے۔ راجہ امیر احمد خان آف محمود آباد پر سید ضمیر اختر نقوی نے بھی خلوص وعقیدت سے لکھا ہے اور ضیاء الحسن موسوی نے بھی ''ایک تھا راجہ'' میں حق ادا کیا ہے۔ راقم السطور نے ''مرثیہ نظم کی اصناف میں'' میں راجہ صاحب کا حق ادا کرنے کی کوشش کی لیکن سچ پوچھیے تو راجہ صاحب کے کسی ایک عمل کا حق بھی ادا نہیں ہوتا۔ اقتباس درج ذیل ہے۔

> ''وہ شخص جس نے ایک آزاد مملکت پاکستان کو پانے کے لئے تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا ہو اس کے احسانات کا کیا صلہ ہو سکتا ہے — ہندوستان میں تحریک آزادی زوروں پر تھی، راجہ امیر احمد خان آف محمود آباد لکھیم پور کھیری میں ایک جلسہ عام سے خطاب کر رہے تھے۔ ایک شخص نے سوال کیا۔
>
> راجہ صاحب آپ جس پاکستان کی بات کر رہے ہیں اگر وہ بن

بھی گیا تو آپ کی ریاست تو اس میں شامل نہ ہوگی۔ آپ کیا کریں گے۔

راجہ صاحب نے برجستہ جواب دیا۔ میں اپنی ریاست کو قربان کردوں گا اور اپنے لئے چائے کی دکان کھول لوں گا لیکن پاکستان ضرور بنے گا۔

—اور پاکستان تو بن گیا لیکن پاکستان میں اقتدار جن لوگوں کے ہاتھ میں آیا اُنہوں نے تو کبھی یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی کہ راجہ صاحب کی مراد چائے کی دکان کھولنے سے کیا تھی۔ ٹوانوں اور دولتانوں کی حکومت میں راجہ صاحب تو رہ بھی نہیں سکتے تھے اس لئے کہ راجہ صاحب کی موجودگی اُن لوگوں کو اپنی کم قامتی کا احساس دلاتی رہتی۔

آج ہم راجہ صاحب کے مرثیہ نگاری پر بات کرنا چاہتے ہیں—راجہ صاحب نے ۸ مرثیے کہے ہیں۔ راجہ صاحب غزل کے شاعر تھے بعد میں مرثیے کی طرف آئے اسی لئے ان کے مرثیوں میں غزل کی روانی اور تغزل کی چاشنی نمایاں ہے۔

فلک پہ مہر خدا کی دلیل روشن ہے جہاں پہ چادر نور اس کی سایہ افگن ہے
ضیاء سے اس کی منوّر قمر کا دامن ہے اس ایک نور سے رنگین صبح گلشن ہے
وفور شوق سے گردوں کا داغ جلتا ہے
خدا کی شان کہ دن کو چراغ جلتا ہے

وہ برق تاب کہ آنکھیں، کوئی ملا نہ سکے وہ تیز گام کہ رفتارِ عقل پا نہ سکے
وہ وسعتیں کرۂ ارض میں سما نہ سکے وہ فیض بخش کہ دامن کوئی بچا نہ سکے
ہے کوئی نور سمٰوات و ارض کہتا ہے
ہزار شعلوں میں پانی کی طرح بہتا ہے

راجہ صاحب کے ایک مرثیے کا عنوان 'پانی' ہے۔ اس موضوع پر راجہ صاحب سے پہلے کوئی مرثیہ نہیں ملتا۔ اُن کے بعد ۱۹۶۹ء میں فیضؔ بھرتپوری نے، ۱۹۷۱ء میں جوشؔ ملیح آبادی نے اور ۱۹۷۲ء میں نسیم امروہوی نے اس عنوان کے تحت مرثیے کہے—راجہ صاحب کے اس مرثیے کا تقابل نہ جوشؔ کے مرثیے سے ہے اور نہ ہی نسیم امروہوی کے مرثیے سے—البتہ یہ بات پیشِ نظر رہنی ضروری ہے کہ پانی، بادل، خشک صحرا، رواں دواں نہر، زندگی کی تب وتاب اور پانی ساری علامتوں کے استعمال میں پہل راجہ صاحب نے کی ہے۔

جہاں کے واسطے ہے وجہِ زندگی پانی ہے چشمِ عالمِ ایجاد کی تری پانی
اسی سے مشکلِ اہلِ زمیں ہوئی پانی رگوں میں دہر کے دوڑا کیا یہی پانی
بڑھے ہوئے ہیں اسی سے تپاک کے دامن
اسی نے رنگ دیئے صحنِ خاک کے دامن

اسی سے پائی ہے روحِ حیات ہستی نے چھلک پڑے ہیں اسی سے زمیں کے گنجینے
اسی کے دم سے کشادہ بحار کے سینے اسی نے نصب کیے ہیں جہاں میں آئینے
زمانے بھر کے لئے وجہِ زندگانی ہے
فلک کی آنکھ کا تارا زمیں کا پانی ہے

خزاں کے زور اسی کی نمود سے ٹوٹے مزے اسی سے چمن نے بہار کے لوٹے
اسی نے دامنِ گل پر سجائے گل بوٹے اسی کی چوٹ سے گلشن میں آبلے پھوٹے
اسی کی آگ نے گوہر کو کردیا پانی
اسی نے گل کے کٹوروں میں بھردیا پانی

اسی کے جود سے پُر ہیں بحار کے آغوش اندھیری رات میں ہے حکمراں اسی کا خروش
زبانیں موجوں کی چلنے لگی ہیں دوش بدوش یہ سو زبانوں سے گویا ہے اور پھر خاموش
یہی وہ ہے اگر اونچا ہوا کہیں سر سے
تو اس کے فیض سے کشتِ عمل میں بُن برسے

جہاں کے واسطے سقا بنیں یہی نہریں چلیں جبال کی چوٹی سے مچلی نہریں
کریں فریضۂ واجب میں کیوں کمی نہریں زمیں پہ پھیل گئیں دوڑتی ہوئی نہریں
خود اپنی موجوں سے ہونے لگیں لجام بکف
کوئی ہے مشک بدوش اور کوئی ہے جام بکف

سنبھل نہ سکتے تھے جم کر برسنے والے ابر ہوا کے دوش پہ لیتے رہے سنبھالے ابر
زمیں پہ پھینکتے تھے موتیوں کے جھالے ابر وہ نیلی نیلی گھٹائیں وہ کالے کالے ابر
فلک کے ابروؤں کی طرح چڑھ گئے دریا
گھٹا کا زور گھٹا جب تو بڑھ گئے دریا

اس مرثیے میں راجہ صاحب نے ضعیف وتوانا، کمزور اور طاقتور کی کشمکش کو ظاہر کرنے کے لئے خوبصورت انداز اختیار کیا ہے۔ اُنہوں نے قوتِ نمو کو طاقت کے خلاف ایک عمل قرار دیتے ہوئے استعاراتی طور پر کہا ہے کہ کمزور کے ساتھ خدائی طاقت ہوتی ہے یا یہ کہ سنت الٰہی کمزور کی مدد کرتا ہے۔

سحابِ فیض جو برسا تو بھر دیئے جل تھل　　یہ انقلاب، یہ تعمیر اور یہ ردّو بدل
یہ ناتوانوں کی قوت ہے، دیکھ زورِ عمل　　طبق زمین کے اور توڑ دے ہری کونپل
کوئی قوی ہے ضعیفوں کے ساتھ ساتھ ضرور
نمو کے پردے میں پنہاں ہے کوئی ہاتھ ضرور

"سید علی عباس حسینی نے کہا ہے کہ مرثیے سے الگ کر کے یہ شاعری بطور ایک حسین نظم اس موضوع پر تسلیم کی جا سکتی ہے"

(اردو مرثیہ۔ ص ۱۸۳)

موضوع کے ربط کے ساتھ راجہ صاحب نے واقعہ کربلا کی طرف مہارت کے ساتھ گریز کیا ہے اور گریز کی اسی چابکدستی نے اسے مرثیہ بنا دیا ہے۔

ہزار بار بنا وجہ امتحاں پانی　　کبھی زمانہ تھا خاک اور کبھی جہاں پانی
وہ دن بھی آیا کہ روکے تھے پاسباں پانی　　سنا ہے مانگتا تھا ایک میہماں، پانی
جہاں سے تشنہ دہن شاہ مشرقین اُٹھے
فرات شرم سے پانی ہوئی حسینؑ اُٹھے

راجہ صاحب کو قدرت نے مسندِ فرماں روائی عطا کی تھی لیکن محبتِ محمدؐ وآلِ محمدؐ نے اُنہیں قلندری کی حقیقتوں سے آشنا کر دیا اور اُن کے مزاج میں درویشی آ گئی۔ یہ درویشی بناوٹی نہیں تھی، مصلحت کے تحت نہیں تھی بلکہ اُن کے خون میں رچ بس گئی تھی جو اُن کی زندگی کے ہر عمل سے ظاہر ہوتی تھی، حتیٰ کہ شاعری سے بھی۔ اسی لئے اُنہوں نے وہ کام کیا جو دشوار تھا۔

"کربلا کے بہت سے شہداء ایسے ہیں جن پر انفرادی طور پر مرثیے نہ لکھے جا سکے۔ اور سچ پوچھئے تو یہ کام ذرا دشوار تھا۔ ان بہتر شہداء میں ایک نام جون، غلام ابوذر غفاری کا بھی ہے راجہ صاحب نے جون

کے حال پر ایک پورا مرثیہ لکھا ہے۔

راجہ صاحب کے اس مرثیے میں سرمایہ داری کی مذمت کے ساتھ ساتھ تمیزِ بندہ و آقا کو مٹانے کے لئے اسلام کے اصولوں کا تذکرہ بھی ہے۔ جونؔ کی زبان سے جو رجز نظم کیا گیا ہے اس میں جونؔ نے اپنے آقا ابوذر غفاری کے کردار و سیرت پر بات کی ہے۔''

جونؔ ہے نام، غلامِ شہِ خیبر ہوں میں اس بڑھاپے میں جوانوں کے برابر ہوں میں
تین دن کی ہے عطش، طالبِ کوثر ہوں میں خواہشِ زر نہیں گو عبد ابوذر ہوں میں

وہ ابوذرؓ تھا جنہیں نفس پر اپنے قابو رگ و پے میں تھا رواں جن کے شریعت کا لہو
مسجد زہد میں محراب تھے جن کے ابرو صادق اللہجہ، جری، عالم و دانا خوشخو
خود مٹے دینِ پیمبر کی نگہبانی کی
فقر نے جن کے زمانے میں سلیمانی کی

''مقام افسوس ہے کہ ابھی تک راجہ صاحب کے مرثیے شائع نہیں ہوئے تاریخ کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ سیاست دانوں نے انہیں نظرانداز کیا۔ اہل ادب نے انہیں نظرانداز کیا۔ اور سب سے بڑا ظلم یہ کہ ان کی اپنی قوم نے انہیں نظرانداز کیا۔ جن حضرات نے راجہ صاحب کے سارے مرثیوں کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہے کہ ان کے مراثی، مرثیوں کی تاریخ میں بھی ایک خوشگوار اضافہ کرتے ہیں اور اُردو ادب کی کائنات میں بھی۔ پاکستان میں اُردو مرثیہ کا ایک ماحول بن چکا ہے۔ کیا کوئی اور اہل فکر و نظر اس طرف متوجہ ہوگا۔

ضمیر اختر نقوی نے راجہ صاحب کو جو خراج عقیدت پیش کیا ہے، وہ میری ہی نہیں ہر دردمند دل کی آواز ہے لیکن جب جدید مرثیے کے معماروں کی بات آتی ہے تو بات عدل وانصاف کی سرحدوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے ضمیر اختر صاحب بھی اس سے اتفاق کریں گے کہ عدل و انصاف میں عقیدت، محبت یا نفرت کا گذر ممکن نہیں۔ اور کسی کو از روئے احتیاط یا محبت وعقیدت اس کے اپنے مقام سے بڑھانا فضیلت

نہیں بلکہ کبھی شبیہ فضیلت کے زمرے میں آتا ہے اور کبھی ظلم کے دائرے میں۔ ہم چودہ سال سے اسی بات پر لڑ رہے ہیں کہ فضیلتیں عقیدت کے ہاتھوں نہیں، انصاف کے ہاتھوں دی جاتی ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ مسلّم کہ راجہ صاحب کے مرثیوں کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی قدرتِ کلام، سلاست، روانی، استعارات، کا استعمال، جدید علوم کی چاشنی، فکر کی ضیا پاشی سب کچھ ناقابلِ تردید ہے مگر یہ بھی غلط نہیں کہ ان کا میدان سیاست تھا، شاعری نہیں۔ شاید یہی سبب تھا کہ انہوں نے اپنی حیات میں کبھی اپنے مراثی شائع کرانے کی طرف توجہ نہیں دی، ورنہ تو یہ امر اُن کی زندگی میں محال نہیں تھا۔''

(مرثیہ نظم کی اصناف میں ص ۵۹ تا ۶۲)

☆☆☆☆☆

نواب کاظم جنگ:- (حیدرآباد۔ دکن)

ولادت ۱۹۰۴ء۔ وفات ۱۹۷۳ء

نام کاظم علی خان۔ خطاب کاظم جنگ۔ تخلص کاظم۔ وطن حیدرآباد، دکن۔ تعلیم بی۔اے (عثمانیہ یونیورسٹی)۔ حیدرآباد کے معزز جاگیردار نواب شوکت جنگ کے سب سے بڑے فرزند۔ بچپن سے گھر میں علماء کرام اور رثائی ادب کا ماحول دیکھا۔ نواب شوکت جنگ نے اپنی حویلی کے بڑے حصے میں عاشور خانہ بنا رکھا تھا جس میں باقاعدہ عزاداری ہوتی تھی۔ پیارے صاحب رشید اور دولہا صاحب عروج جیسی باکمال شخصیات مرثیہ خوانی کے لئے آتی تھیں۔ جس عمر میں بچے کھلونوں سے کھیلتے ہیں اس دور میں کاظم جنگ کے کانوں میں علی اصغر کی تیغ تبسم اور عون و محمد کے ظلم شکن تیغوں کی فتوحات کے ذکر کی آوازیں پڑتی تھیں۔ سونے پر سہاگہ صاحبانِ کمال کے مرثیے اور مجلس عزائے حسینؑ کی تہذیب کا اثر کہ کاظم جنگ نے بارہ برس کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا اور علم میں جوانی میں مرثیہ کی عظمتوں تک پہنچ گئے۔ اپنے والد گرامی نواب شوکت جنگ کی جاری کردہ رسومات عزاداری و مرثیہ خوانی کو کاظم جنگ نے قائم رکھا۔ وہ ہر سال اپنی مجلس میں نو تصنیف مرثیہ پڑھتے تھے۔ انہوں نے ۲۲ مرثیے کہے ہیں لیکن مقام حیرت ہے کہ صرف ایک مرثیہ 'تصویر درد' ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ باقی مرثیوں کا کیا ہوا اس کی کوئی وضاحت نہیں ملتی ہے۔ مرثیہ کی تاریخ میں ایسے بہت سے نام ہیں جن کے مراثی کسی مجبوری (عام طور پر وسائل کی کمی)

کے سبب شائع نہ ہو سکے لیکن کاظم جنگ کے مراثی کی اشاعت نہ ہونے کا سبب تو وسائل کی کمی نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی کوئی مجبوری ہو سکتی ہے اسی لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ ؎

''اس گھر کو آگ لگ گئی کس کے چراغ سے''

تصویر درد کے علاوہ اُن کا ایک اور مرثیہ ہماری نظر سے گذرا۔ مرثیہ کا عنوان ''مرثیۂ نور'' ہے۔ اس مرثیے کے پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ کاظم جنگ کے مراثی پر دبستانِ انیسؔ کا نمایاں اثر ہے جسے از روئے احتیاط یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اُن کے مراثی پر اودھ کا رنگ غالب ہے۔ وہی ارکانِ مرثیہ کی علی الترتیب پاسداری، وہی درد و سوز و گداز کے پیمانے، وہی رونے رلانے پر زور، البتہ انہوں نے ہر مرثیے کی تشبیب کے لئے علیحدہ علیحدہ عنوانات منتخب کر کے اپنے عہد کے تقاضوں کی مرثیہ میں عکاسی ضرور کی ہے جو انہیں روایتی رویوں کی حمایت و پاسداری کے باوجود جدّت کی طرف لاتی ہے۔ یہ جدّت طرزِ نو نہ سہی حصار سے باہر نکلنے کی سعی ضرور ہے۔ مرثیۂ نور کے چند بند ملاحظہ کیجئے ؎

وہ نور جوہرِ قدرت کی اوّلیں تحریر　　وہ نور جس سے عیاں حُسنِ خاص کی تصویر
وہ نُور چودہ شبیہوں کی ایک ہی تصویر　　وہ نور خواب خدیجہ کی جاگتی تصویر
مقام عجز میں تاجِ سرِ نیاز کیا
وہ نُور خلق جسے کر کے حق نے ناز کیا

وہ نور جس سے نظر آج تک ملا نہ سکا　　کلیم جس کے نظارے کی تاب لا نہ سکا
امین وہ کہ امانت پہ فرق آ نہ سکا　　وہاں گیا کہ جہاں اور کوئی جا نہ سکا
رموزِ پردہ سے واقف رہا علیم ایسا
کلام حق سے کیا عرش پہ کلیم ایسا

امام حسینؑ، سیدِ سجاد کو تلقینِ صبر کرتے ہیں۔ نواب کاظم جنگ نے اس منظر کو یوں سوچا ہے ؎

تم شیرِ کردگار کے پوتے ہو میری جاں　　دے عمر حق کہ نام خدا ہو گئے جواں
ایسا نہ ہو کہ کھینچ لو تلوار ناگہاں　　صبر و رضا سے کام رہے وقتِ امتحاں
غیظ و غضب کو راہ نہ دو حق کی راہ میں
بندھوا دو ہاتھ شوق سے راہِ الٰہ میں

پہنانے آئیں طوق جو اعدا تو سر جھکاؤ خاروں پہ تا بہ شام یونہی پا برہنہ جاؤ
دربار میں یزید کے ماں بہنوں کو جو پاؤ جز شکرِ رب کچھ اور نہ اپنی زباں پہ لاؤ
آنا نہ غیظ میں، ہے وصیت حسینؑ کی
بیٹا! نہ رائگاں ہو یہ محنت حسینؑ کی

(آندھرا پردیش میں مرثیے کا ارتقاء۔ ڈاکٹر صادق نقوی)

☆☆☆☆☆

میر سعادت علی خان سرتاج:-

ولادت ۱۸ر اپریل ۱۹۰۵ء۔ وفات ۲۳ر ستمبر ۱۹۷۴ء

نام نواب میر سعادت علی خان۔ رضوی سید۔ تخلّص سرتاجؔ (کچھ دنوں صادقؔ رہے) تعلیم ایم، اے (عثمانیہ یونیورسٹی) کسبِ معاش، منصب داری، جاگیرداری جو اس گھرانے میں آصف جاہ اوّل کے دور سے چلی آرہی ہے۔ فارغ البالی کے اُجالے کے ساتھ ساتھ گھر میں علم و دین کی روشنی بھی تھی۔ میر سعادت نے طالب علمی کے دور میں اپنی ادبی اور شعری صلاحیتوں کو منوا لیا تھا۔ کالج میں تھے تو 'مجلّہ عثمانیہ' کے پہلے مدیر منتخب ہوئے۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد کسی نوابی یا جاگیردارانہ شوق کو نہیں اپنایا بلکہ علم و ادب کو ہمہ وقتی مصروفیت بنالیا۔ شاعری کے علاوہ نثر میں قابلِ ستائش کام کیا۔ اُن کی دو نثری تخلیقات "طوطی نامہ" اور "کلام الملوک" اُن کی نثر نگاری کے سرنامے ہیں۔ شعر گوئی میں مدحِ اہلِ بیت اور مرثیوں تک خود کو محدود رکھا۔ حضرت محمد علی مسرورؔ سے شرفِ تلمذ رہا۔ بیشمار رباعیات، قطعات، کہے۔ مرثیے بھی خاصی تعداد میں کہے مگر چار مرثیوں پر مشتمل ایک مجموعہ مراثی شائع ہوا اور بس۔

مرثیے پر اُن کی تحقیق "عادل شاہی مرثیے" ایک اہم کتاب ہے جسے ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے ۱۹۵۹ء میں شائع کیا۔ اپنے مرثیوں میں انہوں نے مصائب کو اہمیت دی ہے۔ گویا اُن کے مراثی مدح اور مصائب کا بیان ہیں۔ سیدھی سادہ زبان میں قدیم مرثیے کی نہج پر مرثیہ کہتے ہیں۔ نمونہ کلام کے طور پر امام زین العابدین کے احوال کے مرثیے سے چند بند نذرِ قارئین ہیں۔

کس کو کہتا ہے جہاں سروِ گلستانِ حسینؑ رونقِ دیں ہیں، شمعِ شبستانِ حسینؑ

حاملِ شرعِ الہ، یوسفِ کنعانِ حسینؑ آدمِ آلِ عبا، مطلعِ دیوانِ حسینؑ
جانشینِ شہِ مظلوم کسے کہتے ہیں
عابد و زاہد و معصوم کسے کہتے ہیں

شاہِ والا نے شہادت کو سر انجام کیا سر کٹانا ظلم سہے، حق کا مگر کام کیا
صبر نے عابدِ بیمار کا اتمام کیا باپ اور بیٹے نے اسلام کو اسلام کیا
وعدۂ طفلی جو شبیر وفا کرتے ہیں
حق یہ فرزندیٔ سرور کا ادا کرتے ہیں

باپ کی لاش پہ وہ ظلم ہوا کچھ نہ کہا تازیانوں کی سہی سخت جفا، کچھ نہ کہا
بازو ناموس کا رسّی میں بندھا، کچھ نہ کہا چھن گئی ثانیٔ زہرا کی ردا کچھ نہ کہا
غم سے مادر کا جگر سینے میں پھٹتے دیکھا
علی اصغر کا گلا قبر میں کٹتے دیکھا

میر سعادت علی خان کا ایک اور مرثیہ '' دراحوال داخلہ بازار شام '' ہے جس کی زبان اور لب ولہجہ رثائی تاریخ کا بیانیہ ہے۔

☆☆☆☆☆

شمیم کرھانی:- (دہلی)

ولادت ۱۹۱۶ء وفات ۱۹۷۵ء دہلی

نام سید شمس الدین حیدر، تخلص شمیم۔ جائے پیدائش موضع کرہان ضلع اعظم گڑھ۔ پچیس برس دلی کالج میں اُردو فارسی کے معلم رہے۔ ترقی پسند تحریک میں اُبھر کر سامنے آئے۔ دو مجموعے '' برق وباراں '' اور '' روشن اندھیرا '' اس دور میں شائع ہوئے، پھر ۱۹۶۴ء میں '' عکس گل '' اور ۱۹۷۲ء میں '' عکس نیم شب '' غزلوں نظموں کے مجموعے شائع ہوئے۔ اُردو ادب میں دو اہم حوالے ایک یہ کہ علی عباس حسینی کے بھانجے، دوسرے پروفیسر احتشام حسین کے ہم زلف تھے۔ شمیم کرہانی اس دور میں اُبھرے جس دور میں فیضؔ، سردار جعفری اور مجازؔ کے نام آتے ہیں۔ علی جواد زیدی رقم طراز ہیں کہ شمیم کرہانی کے بھائی سید اعظم حسین بہت خوش گلو تھے اور کرہان میں اپنے گھر میں سوز خوانی کیا کرتے تھے لہٰذا بچپن ہی سے رثائی ادب سے شناسا تھے۔ لیکن ترقی پسند تحریک کے زیر اثر انقلابی

شاعری اُن کی پہچان تھی۔ شمیم کرہانی کے ایک ہی مرثیہ ''ذوالفقار'' کا بار بار ذکر آتا ہے جو پروفیسر احتشام حسین کے مقدمے کے ساتھ ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ اس مرثیے کی بابت پروفیسر احتشام حسین نے لکھا ہے کہ مشکل ہی سے کوئی بند ایسا ہوگا جس میں کسی اہم تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ موجود نہ ہو اور بصیرت افروز انداز میں اس کی آفاقیت اور اہمیت کو بے نقاب نہ کیا گیا ہو۔

ہمارے قدیم مرثیہ نگاروں نے جس طرح تلوار کی تعریف کی تھی اس کے سحر میں گرفتار ہوئے بغیر شمیم کرہانی نے ایک نیا پیرایۂ اظہار اختیار کیا جو وقت کے تقاضوں کا ہم مذاق ہے۔

باطل شکن، مجاہد ایماں تھی ذوالفقار   تدبیر چارہ سازئ انساں تھی، ذوالفقار
شیرِ خدا کی جنبشِ مژگاں تھی ذوالفقار   آئینۂ جلالتِ یزداں تھی، ذوالفقار [۱]

روشن ہے کائنات پہ، قیمت میں قدر میں
اُتری تھی آسمان سے چمکی تھی بدر میں

لطفِ رسولِ رحمت باری تھی ذوالفقار   صحرا میں بوئے جوئے بہاری تھی ذوالفقار
سارے عرب میں جاری و ساری تھی، ذوالفقار   ذہنِ ستم پہ ضربت کاری تھی، ذوالفقار [۱۰]

محوِ دعا تھی، مائلِ پیکار تو نہ تھی
کفّار کا علاج تھی، تلوار تو نہ تھی

قہرِ خدا تھی، مہر مجسم تھی ذوالفقار   رعدِ غضب تھی، رحمتِ عالم تھی ذوالفقار
دشمن کا زخم، دوست کا مرہم تھی ذوالفقار   آئینہ دارِ شعلہ و شبنم تھی ذوالفقار [۱۱]

قتالِ اہلِ شر تھی، رفیقِ رسول تھی
کانٹا بھی دشمنی میں محبت کا پھول تھی

حق نے جسے زمیں پہ اُتارا، وہ ذوالفقار   برقِ غضب تھا جس کا اشارا وہ ذوالفقار
تھی قہرِ ذوالجلال کا دھارا وہ ذوالفقار   اُترا تھا جس کے گھر میں ستارا، وہ ذوالفقار [۱۲]

رن کی فضا میں دائرۂ نور بن گئی
چمکی تو برقِ خرمنِ صد طور بن گئی

میرے علم میں تھا کہ یہ مرثیہ ۶۹ بندوں پر مشتمل ہے۔ میرے پاس جو نقل ہے اس میں ۶۹ بند ہیں لیکن ڈاکٹر ہلال نقوی نے لکھا ہے کہ مرثیے میں ۷۶ بند ہیں۔ اُنھوں نے دو بند وہ

لکھے ہیں جو میرے پاس نہیں لہٰذا یہ دو خوبصورت بند ڈاکٹر بلال نقوی کی محبت کے حوالے سے۔

قنبر نواز، حامیٔ آزادیٔ غلام اسمِ شہنشہی کی عدو، مخلصِ عوام
دنیا کو دے رہی تھی نیا مجلسی نظام پہنچا رہی تھی دہر میں توحید کا پیام
تبلیغِ حق میں مائلِ صد انہماک تھی
تیغِ علیؑ مفسّرِ قرآن پاک تھی

سلطانِ دہر ہوں کہ فقیرانِ فاقہ مست تھے عدل کی نگاہ میں یکساں بلند و پست
کرتی تھی انقلابِ تمدّن کا بندوبست رجعت پسند ذہن کو دیتی تھی وہ شکست
جمہور کی رفیق، عدو سامراج کی
ناظمِ معاشرت کی، مدبّر سماج کی

شمیم کرہانی نے شخصی مرثیے زیادہ کہے ہیں جن میں گاندھی، جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، میر تقی میر اور پروفیسر احتشام حسین نے لئے کہے گئے مرثیے شامل ہیں۔ احتشام حسین پر کہا گیا مرثیہ ''جان برادر'' ۱۹۷۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ 'ذوالفقار' جیسا مرثیہ کہنے والے شاعر نے شخصی مرثیے کس موڈ میں اور کن حالات میں کہے اس کی کہیں وضاحت نہیں ملتی۔ یہ سوال بھی اس لئے سامنے آیا کہ ترقی پسند تحریک نے ابتدائی دور میں تو ہر تخلیق میں اصولوں کو عنوان بنایا تھا افراد کو نہیں۔

☆☆☆☆☆

ادیم نقوی :- (کراچی)

ولادت ۱۸۸۲ء وفات ۱۹۷۵ء

نام سید شفا احمد، تخلص ادیمؔ۔ نقوی سادات، امروہہ سے تعلق۔ دو قلمی ناموں سے لکھتے تھے ادیم نقوی اور ابوالفاروق واسطی۔ کہا جاتا ہے اُن کی ۱۲ تصانیف شائع ہو چکی ہیں — ادیم ۱۹۴۹ء میں ہجرت کر کے کراچی آ گئے تھے۔ کراچی میں ادیم صاحب اٹک آئل کمپنی میں انجینئر ہو گئے تھے لیکن افسرانہ طمطراق سے بہت دور، فقیرانہ زندگی گذاری، اُنکے معتقدین کا کہنا ہے کہ وہ عارف کامل تھے۔ کون اندر سے کیا تھا یہ تو وہی جانے جو خبیر و بصیر ہے البتہ ایک بات بہت اہم ہے کہ ادیمؔ نقوی کی وصیت کے مطابق، بابا صدا حسین نے ان کی میت کو شاہدرہ کی درگاہ میں دفن کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بابا صدا حسین ایک ملنگ اور فقیر ہیں وہ دنیاداروں سے ایسے رشتے استوار نہیں

کرتے جو رشتہ اُن کا اوؔیم نقوی سے ثابت ہوا — (اللہ بہتر جانتا ہے)۔

اوؔیم نقوی کے مرثیوں کے دو مجموعے 'خونِ ناحق' اور 'محسنِ عالم' شائع ہوئے۔ اوؔیم نقوی مغربی علوم سے بھی آگاہ تھے اسی لئے اُن کے مرثیوں میں انگریزی الفاظ اور جملے نظم کئے گئے ہیں۔

تمام مغربی دنیا یہی تو ہے کہتی   کہ زندگی کا ہے مقصد تلاش فرحت کی
اُنہیں کا قول ہے ''بی میری اینڈ بی ہیپی''   مگر کہیں پہ کسی کو یہ چیز مل بھی سکی
ملے کہاں سے وہ اک عالم خیال میں ہیں
خود اپنے آپ پھنسے خواہشوں کے جال میں ہیں

Be Marry & Be Happy پورا جملہ تیسرے مصرعے میں نظم کیا گیا ہے۔ عزیز دہلوی کے بعد یہ دوسرے مرثیہ نگار ہیں جنہوں نے انگریزی الفاظ اور جملے مرثیوں میں داخل کئے ہیں۔ ایک جگہ نفس اور روح کے مسئلے پر جے۔ آرتھر کے مقالے In the invisible World کا حوالہ دیتے ہوئے مرثیے میں کہتے ہیں ۔

مقالہ خوب ہی اک جے۔ کے آرتھر نے لکھا   اور 'ان دی ان وزیبل ورلڈ' اس کا نام رکھا
قوائے باطن نفسی کا اس میں ذکر کیا   وہ کہتا ہے نہیں ممکن کچھ ان کا اندازہ
وہ قوتیں کہ ہیں ذہنوں میں کون جانے گا
سنائی جائیں تو ہرگز نہ کوئی مانے گا

اوؔیم نے ۱۹۴۲ء میں ایک مرثیہ ''مشعلِ نور'' لکھا۔ اس مرثیے میں عقل اور فلسفے سے بکا علی الحسین (امام حسینؑ کے مصائب پر گریہ) جنت کا حقدار بناتا ہے۔ اُنہوں نے کم وبیش ۱۸ مرثیے کہے اور ان مرثیوں میں نفسِ امّارہ پر نفسِ قدسیہ کی برتری۔ نکاتِ توحید، اور روحانی مدارج سے گذرتے ہوئے تلاش نور کی تڑپ نمایاں ہے۔ ''یقینِ غیب ہو جب دل میں نور بھر جائے''

اوؔیم کے مرثیوں میں بار بار ایک سوال اُٹھایا گیا ہے کہ دین کیا ہے، اس کے خدوخال کیا ہیں، اور انہیں کون واضح کرے۔ ظاہر ہے دین سے اُن کی مراد دینِ اسلام ہے۔ بس یہاں سے اُن کے مرثیوں میں معرفتِ اہلبیت کا دروازہ کھلتا ہے اور افکار و مباحث کا نقطۂ کمال شہادت امام حسینؑ ہے۔ اوؔیم امروہوی کے نزدیک مرثیہ گوئی کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہر بشر پر مقصد شہادت حسینؑ واضح ہونا چاہئے۔ اُن کے خیال میں بیسویں صدی دہریت کے منظم پروپیگنڈے کی صدی

تھی۔ اپنی کتاب ''محسن عالم'' میں اُنہوں نے لکھا ہے ــــــ

''اس صدی میں (یعنی بیسویں صدی میں) دہریت کا منظم پروپیگنڈا ہو رہا ہے جس کے باعث ہر نوجوان چوں و چرا کے بغیر کچھ سننے کے لئے تیار نہیں لہٰذا اب اس کی اشد ضرورت ہے کہ مقصدِ شہادتِ حسینؑ واضح طور پر بیان کیا جائے''

ادیم امروہوی نے بیسوی صدی کو اخلاقی اور مذہبی اقدار کے حوالے سے بڑی صدی کہا۔ دہریت کی صدی کہا اور اس کا علاج، اس کا توڑ شہادت حسینؑ سے آگہی قرار دیا تھا ــــ تعصبات سے بلند اسلامی شعور بھی صدیوں سے یہی سوچ رہا ہے کہ شہادت حسینؑ کی مقصدیت پر یقین ہو جائے تو انسان خدا تک پہنچ سکتا ہے۔ امام حسینؑ نے جو قربانیاں پیش کیں وہ کسی دنیاوی طمع و لالچ کے لئے نہیں دی جا سکتیں سوائے اس کے کہ قربانیاں پیش کرنے والا کسی عظیم مقصد کے تحت ایسا کر رہا ہے۔ اور وہ عظیم مقصد رب العالمین کی حاکیت کا اقرار اور اعلان ہے۔ راقم الحروف نے ''صراط منزل'' میں اسی فکر کو پیش کیا تھا۔

''میں نے خدا کو نہیں دیکھا۔ میں عرفان خداوندی کا بھی دعویدار نہیں لیکن میں خدا کو مانتا ہوں۔ میرے پاس اس کے وجود کی ایک دلیل ہے یعنی نواسہ رسول حسینؑ، انسان مکمل حسینؑ سرچشمہ شعور و اجتہاد حسینؑ۔ جس نے ظلم کو تسلیم نہیں کیا۔ استحصال کو تسلیم نہیں کیا۔ حسینؑ نے کہا یزید ایک فرد نہیں ملوکیت کا نام ہے، ظلم و استبداد کا نام ہے۔ انسانی اقدار کی پامالی کا نام ہے ــــ حسینؑ نے اس ظلم کے پہاڑ سے ٹکر لی اور اسے ریزہ ریزہ کر دیا۔ اور میری سمجھ میں آ گیا کہ انسان حق پر ہو تو ظلم کے پہاڑوں سے ٹکرا سکتا ہے۔ حسینؑ نہ ہوتے تو عرفان رسولؐ ہوتا نہ اقرار وجودِ خدا۔ اس ساری عمارت کی بنیاد حسینؑ ہیں ــــ میرا یقین بلندی سے پستی کی طرف نہیں۔ پستی سے بلندی کی طرف سفر کرتا ہے میرا سفر منزل سے راہ گذر کی طرف نہیں راہگذر سے منزل کی طرف جاری ہے۔

(صراط منزل ۔ عاشور کاظمی، ص ۲۲۔۲۳)

اکیسویں صدی سائنس کی صدی ہے، کمپیوٹر کی صدی ہے، خلائی وسعتوں کے ادراک کی صدی ہے۔ سائنس انسان کو یقین سکھاتا ہے لیکن عالم انسانیت کی بد قسمتی ہے کہ اکیسویں صدی ایک طاقت کے عالمی اقتدار۔ اور عالمی فرمان کی برتری سے شروع ہوئی اور فطرت انسانی یہ ہے کہ اقتدار اور طاقت ظرف انسانی سے بڑھ جائے تو فرعونیت جنم لیتی ہے۔ دنیا ماضی کے جس دور کو دور جاہلیت کہتی ہے اُس جاہلیت کے دور میں یہی تو ہوتا تھا کہ طاقت کو حق، ظلم کو کلید کامیابی، استحصال کو فرعونیت کا استحقاق سمجھا جاتا تھا —— آج کی مہذّب دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟

ہمیں یقین ہے ادیؔم امروہوی ہوتے تو اکیسویں صدی کو ظلم و جور کی راہوں پر چلنے سے بچانے کے لئے وہی نسخہ تجویز کرتے یعنی مقصد شہادت حسینؑ کو انسان کا مقصد حیات بنانا۔ اور اگر ادیؔم امروہوی کی بات حق ہے تو پھر کیا ہم سب کا فرض نہیں ہے کہ اکیسویں صدی میں موجود بنی نوع انسان اور آنے والے برسوں میں پیدا ہونے والے انسانوں کی بھلائی کے لئے امام حسینؑ کی پیش کردہ قربانیوں کو نوع انسانی کے لئے مشعل راہ بنانے کی کوشش کریں جن کی قربانیوں کو ماضی کی چودہ صدیوں سے خراج تحسین پیش کیا جا رہا ہے۔ ادیؔم تو اپنا فرض پورا کر گئے، ہم سب پر اُن کا اعلان حق ابھی قرض ہے جو ہمیں ادا کرنا ہے۔

ادیؔم کے مرثیوں کا آغاز حمد الٰہی سے کرتے تھے لیکن وہ روایتی حمد نہیں ہوتی تھی بلکہ عام طور پر وہ قرآنی حوالوں سے حمد کے تسلسل میں حسینیت کی روح تلاش کرتے تھے اور اسے پیغام بنا کر عالم انسانیت کو یہ درس دیتے تھے۔ اُن کے مرثیے کا ایک بند جس میں حضرت نسیؔم امروہوی کے ایک بیت سے استفادہ کیا ہے اس درس کا ایک باب ہے ۔

ہر ایک شخص پہ یکساں ہے اس کا فیضِ عمیم کچھ امتیاز نہیں کوئی عبدِ ربِّ رحیم
جب اس کی یاد کرے غم سے اس کا دل ہو دو نیم ہے اس مقام پہ موزوں بہت یہ بیتِ نسیؔم

''نبی کے لاڈلے، محسن جو دینِ ربّ کے ہیں
نہیں کسی کے وہ مخصوص، بلکہ سب کے ہیں''

مجھے حضرت ادیؔم نقوی کے نظریات سے بڑی تقویت ملی۔ میں نے جو کچھ صراط منزل میں لکھا تھا وہ بڑے یقین سے لکھا تھا لیکن ایک عالم دین، مفکر اور عظیم شاعر سے فکری ہم آہنگی کا شرف ملنے کے بعد اب معترضین کے جوابات کے لئے میرے پاس ایک سند ہے، شفا احمد ادیؔم

نقوی کے ارشادات ونظریات کی سند۔

☆☆☆☆☆

علامہ محسن اعظم گڑھی:-

ولادت ۱۹۰۲ء وفات ۱۹۷۵ء

نام سید محمد محسن تخلص محسن۔ رضوی سادات۔ پیدائش موضع داری تحصیل پھول پور۔ ضلع اعظم گڑھ۔ زمیندار گھرانے کے فرزند—والد کا نام سید احمد حسین۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ دس برس کی عمر میں سلطان المدارس بھیج دئے گئے جہاں منطق، فلسفہ، ادب، ہیئت، فقہ کی تکمیل کے بعد صدر الافاضل کی سند حاصل کی۔ علم طب میں حکیم عبدالحلیم لکھنوی کی شاگردی کی۔ طالب علمی کے زمانے سے شعروادب سے دلچسپ تھی۔ مشق سخن کی ابتدا کے بعد حضرت عزیز لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ فن شعر گوئی میں شہرت ہوئی تو ''وفورِ گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا'' کے مصداق دہلی گئے جہاں انجمن ترقی اُردو ہند کے شعبۂ تصنیف وتالیف سے منسلک ہو گئے لیکن صرف دو برس ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء میں دلی رہ سکے اور والد گرامی کے انتقال کے سبب واپس آنا پڑا۔

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۲ء میں کراچی آ گئے۔ ہندوستان میں تھے تو دو شعری مجموعے ''پیامِ محسن'' اور ''محسن العزا'' شائع ہوئے۔ کراچی میں بھی دو مجموعے ''آئینۂ فکر'' اور ''اجمالِ فکر'' شائع ہوئے۔ محسن اعظم گڑھی نے غزل، نظم، رباعیات، سلام قصائد، قومی نظمیں اور مرثیہ، ہر صنف میں شعر کہے ہیں۔ اُن کے مراثی میں غزل کا بہاؤ نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر ہلال نقوی نے ''بیسویں صدی اور جدید مرثیہ'' میں سات مقامات پر محسن اعظم گڑھی کا حوالہ جاتی ذکر کیا ہے لیکن صرف اس حد تک کہ مرثیہ نگاروں کی فہرست میں اُن کا نام شامل کیا ہے۔ منظور رائے پوری نے مرثیہ گو شعرا کا جو منظوم تعارف کرایا تھا اس مرثیے میں محسن اعظم گڑھی کے لئے کہا تھا ''محسن کے مرثیے بھی تخیل میں لاجواب''—ہلال نقوی نے تقسیم کے بعد پاکستان میں متعارف ہونے والے مستند اور بزرگ (جسے اُنہوں نے Senior شعرا کہا ہے) میں بھی محسن اعظم گڑھی کا اسم گرامی شامل کیا ہے سید ضمیر اختر نقوی نے ''اُردو مرثیہ پاکستان میں'' محسن اعظم گڑھی پر ایک باب (Chapter) لکھا ہے۔

کراچی میں شائع ہونے والے مجموعے 'آئینۂ فکر' میں محسن اعظم گڑھی کے دو مرثیے

شامل ہیں۔ایک مرثیہ۔ "لکھ دے قلم بہ شوق سراپائے زندگی" اور دوسرا ۔ اے کلکِ وفا قوتِ اعجاز دکھادے ـــــ مرزا اوجؔ سے لے کرتادم تحریر بذا جدید مرثیے کی جو حدود متعین ہوئی ہیں ان حدود میں محسن اعظم گڑھی کے مرثیے نہیں آتے اور شاید اسی لئے ہلال نقوی نے اُن کا تفصیلی ذکر نہیں کیا ہے۔لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ "آئینہ فکر" میں شامل دو مرثیوں میں جدید وقدیم کا امتزاج ملتا ہے اور اگر قدیم مرثیے کے لوازم یعنی تلوار کی تعریف، گھوڑے کی تعریف اور ساقی نامہ ان مرثیوں میں نہ ہوتا تو شاید کچھ فراخ دل ناقدین محسن کے مرثیوں کو جدید مرثیے کی طرف سفر قرار دیدیتے ـــــ ملاحظہ کیجئے۔ "لکھ اے قلم بہ شوق سراپائے زندگی" کے کچھ بند ۔

لکھ اے قلم بہ شوق سراپائے زندگی کر اے وفا شناس تمنائے زندگی
بیکار ہے، عبث ہے، مداوائے زندگی [1] مائل بہ اعتدال ہے سودائے زندگی
رازِ حیات بن کے جو ذہنوں پہ چھا گیا
اے اہلِ فکر سامنے دیکھو وہ آگیا

جانِ بتولؑ، روحِ محمدؐ فلک وقار بازوئے مجتبیٰ پسرِ شیرِ کردگار
صدقے ہو جس پہ گلشنِ فردوس کی بہار [۲] یعنی حسینؑ کشورِ ایماں کا تاجدار
نکلا وطن سے سطوتِ شاہی لئے ہوئے
ہر سانس میں رضائے الٰہی لئے ہوئے

ہستی کو لاجواب بناتا ہوا چلا باطل کو بے نقاب بناتا ہوا چلا
ایماں کو کامیاب بناتا ہوا چلا [۵] تاروں کو آفتاب بناتا ہوا چلا
صبحِ وفا کے رُخ سے ہٹایا نقاب کو
مرکز سے روشناس کیا آفتاب کو

غنچوں سے کہہ دو بادِ بہاری قریب ہے دو گام اور رحمت باری قریب ہے
خوش ہوں کہ وقتِ شکر گذاری قریب ہے [۱۱] سرکارِ کربلا کی سواری قریب ہے
اہلِ چمن میں شور ہے تعظیم کو اُٹھو
زہراؑ کا لال آتا ہے تعظیم کو اُٹھو

غنچے بڑھے زیارتِ اصغر کے واسطے بے چین بو ہے زینبِؑ مضطر کے واسطے

گل مضطرب ہیں صورتِ اکبرؑ کے واسطے[12] شبنم ہے اشکبار بہترؑ کے واسطے
جس شے کو دیکھتا ہوں وہی اشکبار ہے
گلشن غمِ حسینؑ کا آئینہ دار ہے

محو نماز مہرِ درخشاں ہے دیکھئے طاعت گذار نیرِ تاباں ہے دیکھئے
ہر شے یہاں کی مائلِ ایماں ہے دیکھئے کتنا حسین عالمِ امکاں ہے دیکھئے
محویّتِ عبادتِ سرورؑ نہ پوچھئے
شانِ نمازِ سبطِ پیمبرؐ نہ پوچھئے

جو سخت منزلوں سے گذرتی ہے وہ نماز جودل کے آئینے میں سنورتی ہے وہ نماز
جو ساغرِ یقین کو بھرتی ہے وہ نماز اللہ سے قریب جو کرتی ہے وہ نماز
جو کربلا کے دشت میں صبر آزما ہوئی
ہاں وہ نماز جو تہہ خنجر ادا ہوئی

علامہ محسن اعظم گڑھی کلاسیکی مرثیے کے سفر میں کل اقدار کی حفاظت کرتے نظر آتے ہیں رخصت کا منظر ہے

سمجھا کے بیبیوں کو چلے شاہِ بحر و بر خیمے کی سمت یاس سے مڑمڑ کے کی نظر
زینبؑ تھی بیقرار، سکینہ تھی نوحہ گر شبیرؑ مضطرب تھے کہ جلدی کٹائیں سر
پشتِ فرس پہ شاہ بمشکل ہوئے سوار
آنکھوں میں اشک بھر کے چلے سوئے کارزار

''یاس سے مڑمڑ کے دیکھنا'' اور آنکھوں میں ''اشک بھر کے سوئے کارزار دیکھنا'' قدیم کلاسیکی مرثیے کا انداز ہے۔اسی طرح گھوڑے کا بیان ملاحظہ ہو؛

چنچل، سبک خرام بشکلِ نظر چلا چاکِ دلِ عدو کے لئے بچتہ گر چلا
نازک مزاج مثلِ نسیمِ سحر، چلا چلنے سے اس کو کام تھا، المختصر چلا
دیکھا جو اشقیا نے، بڑا حال ہوگیا
آیا جو زیرِ اسپ وہ پامال ہوگیا

تلوار کی تعریف:

آسائشِ حیات کو دشوار کردیا　اچھے بھلے کو صاحبِ آزار کردیا
جس سے نگہ ملی اسے بیکار کردیا　جو زد پہ آگیا اسے فی النار کردیا
برقِ عدو نواز کا انداز دیکھئے
شبیرؑ کی حسام کا اعجاز دیکھئے

مصائب کے بیان میں بھی علامہ محسن اعظم گڑھی کا انداز کلاسیکی اور اودھ کے بین کی پیروی ہے البتہ اس کے پراثر اور پُر سوز ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور پھر اُن کے بین میں بھی جدید وقدیم کا امتزاج ملتا ہے، مثلاً ''اے کلکِ وفا قوت اعجاز دکھادے'' سے بین کے دو بند نقل کئے جارہے ہیں۔ پہلا بند جدید مرثیے کا انداز ہے جہاں شاعر بین کرتا ہے۔

یہ فرزندِ بے دین، یہ معصوم جوانی　یہ تشنہ لبی اور یہ دریا کی روانی
یہ پیاس کی شدت، یہ چھلکتا ہوا پانی　یہ دستِ نسیم اور یہ محمدؐ کی نشانی
اُف عالمِ غربت میں یہ دم توڑ رہا ہے
شبیرؑ کو رونے کے لئے چھوڑ رہا ہے

اور قدیم مرثیہ کا انداز۔ جہاں شہادت اور قربانی کا شعوری فیصلہ کرنے والے کردار بین کرتے ہیں۔

ہر گام پہ تھے محوِ فغاں سیدِ عالم　دل تھام کے کرتے رہے فرزند کا ماتم
گہہ ضعف کی شدت تھی، کبھی گریۂ پیہم　جز یاس کوئی راہ میں مونس تھا نہ ہمدم
کہتے تھے کہ تسکینِ دہ قلب و جگر ہو
لیکن یہ بتاؤ میرے فرزند کدھر ہو

قدیم اور جدید کے اسی سنگم کا نام علامہ محسن اعظم گڑھی ہے جو ۱۱؍دسمبر ۱۹۷۵ء کو فرش سے عرش کی طرف چلے گئے۔ دل کہتا ہے کہ ساکنانِ عرش بریں نے کہا ہوگا:

؎ فرزندِ فاطمہ کا عزادار آگیا۔

☆☆☆☆☆

نجم آفندی:-

ولادت ۱۸۹۳ء۔ وفات ۱۹۷۵ء

نام مرزا تجمل حسین، تخلص نجم، خطاب شاعرِ اہلبیت۔ جائے پیدائش آگرہ۔ والدِ گرامی

حضرت بزمؔ اکبر آبادی اپنے دور کے ممتاز شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ نجمؔ کے پردادا کے بھائی مرزا فصیحؔ کو مکہ معظمہ میں حجاج کی خدمت کرنے کے عوض سلطنت عثمانیہ (ترکی) نے آفندی کا خطاب دیا جو خاندان میں چل رہا ہے — حیدر آباد دکن کے شہزادے معظم جاہ، نجمؔ صاحب کے کلام کے اتنے گرویدہ ہوئے کہ اُنہوں نے نجمؔ صاحب کو دکن میں قیام پر مجبور کیا لہٰذا ۱۹۲۵ء سے ۱۹۷۱ء تک وہ حیدر آباد میں رہے۔ اپریل ۱۹۷۱ء میں کراچی آ گئے۔ نجمؔ آفندی کے شاگردوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جس میں بہت سے نامی گرامی شعراء بھی شامل ہیں۔ شاگردوں میں رزمؔ ردولوی، معظم جاہ شجیعؔ، زیبا ردولوی، بیدار نجفی، خلشؔ پیر اصحابی نمایاں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نجمؔ آفندی شاعر اہلبیت تھے لیکن ذرا سا غور کیجیے تو آپ اس بات سے بھی متفق ہوں گے کہ نجمؔ، شاعرِ انقلاب بھی تھے۔ کربلا میں آلِ محمدؐ کے سر تو قلم ہو گئے۔ ناموسِ رسول کو ننگے سر تو کر دیا گیا۔ نواسہ رسولؐ بلکہ فرزند رسولؐ کے بیمار بیٹے کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں تو پہنا دی گئیں مگر سادات کا خون جو انقلاب لایا وہ چمکتی ہوئی تلواریں نہیں لا سکتی تھیں۔ ناموسِ رسولؐ کے سروں کی بے ردائی نے ناموسِ انسانیت کو برہنگی سے بچا لیا۔ سید سجاد امام زین العابدین کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنانے کا ذکر آیا تو نجمؔ آفندی نے تڑپ کر کہا ؎

سجادؑ اسیرِ جور ہوئے، صد حیف کسی نے یہ نہ کہا
یہ پاؤں ستونِ کعبہ ہیں زنجیر کسے پہناتا ہے

نجم آفندی کی ۳۸ تصانیف نظم و نثر شائع ہو چکی ہیں۔ جس وقت جوشؔ اور جمیل مظہری ملت کو جدید مرثیہ کی سمت لے جا رہے تھے اُس وقت بلکہ اس سے بہت پہلے سے نجمؔ آفندی اپنے سلام اور نوحوں کے ذریعے وہی خدمت انجام دے رہے تھے۔ اُن کے نوحوں میں غم و الم کے ساتھ انقلاب کی گونج واضح تھی۔

یہ خون بھرے چہرے، یہ کفر شکن نظریں حیدرؑ کا گھرانا بھی شیروں کا گھرانا ہے
کوثر کے یہ مالک ہیں پانی کی طلب کیسی سوئی ہوئی ملت کی غیرت کو جگاتا ہے
لفظوں سے حکومت کی بنیاد ہلاتی ہے سجادؑ کو ظالم کے دربار میں جانا ہے

نجم آفندی جب مرثیہ گوئی کی طرف آئے تو اپنے نوحوں کا آہنگ۔ ماتم کی نغمگی اور مائل بہ انقلاب جذبے لے کر آئے۔ پہلا مرثیہ ''فتح مبین'' ۱۹۴۳ء میں کہا جس میں مرثیہ کی

ابتدا ہی شہادتِ حسینؑ کو فتحِ حسینؑ قرار دے کر کی گئی ہے ؎

جب لے لیا حسینؑ نے میدانِ کربلا بدلا لہو سے رنگِ گلستانِ کربلا
تھا وقت عصر اور یہی عنوان کربلا سوتا تھا فرش خاک پہ مہمانِ کربلا
بے سر تھا فرش خاک پہ لاشا پڑا ہوا
بالیں پہ فتحِ حق کا تھا جھنڈا گڑا ہوا

ریتی کی سجدہ گاہ پہ خونِ پیمبری ڈوبی ہوئی لہو میں قبائے غضنفری
کون و مکاں میں رعبِ شہادت سے تھرتھری ایسی سکندری تھی کسی کی نہ قیصری
اس دن سے آج تک یہ حکومت کا زور ہے
ہر سمت یاحسینؑ کا دنیا میں شور ہے

مرثیے کے متعلق نجم آفندی نے اپنے خیالات کا اظہار اپنے ایک شاگرد حضرت مضطر حیدری کے نام ۸ر دسمبر ۱۹۴۰ کے مکتوب میں کیے ہیں

"دورِ گذشتہ میں مرثیہ گو حضرت نے سید الشہدا، انصار اور اہلبیت کے اسوۂ حسنہ کو صحت کے ساتھ پیش نہیں کیا اور تاریخ کے واقعات کو بالکل نظر انداز کر دیا اور صبر و تحمل اور شجاعت وہ ایثار کے مجسموں کو جزع وفزع سے نسبت دیکر رونے رلانے کا سامان مہیا کیا۔ ممکن ہے اس وقت کے لئے یہ طریقہ مفید رہا ہو لیکن اب زمانہ دوسرا ہے اب ضرورت ہے کہ اہلبیت کی صحیح کیریکٹر (کردار) دنیا کے سامنے پیش کئے جائیں اور قوم کو صحیح معنی میں قوم بنایا جائے۔"

"فتحِ مبین" میں نجم آفندی نے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ اپنی رائے پر خود بھی مستحکم ہیں۔ یہ مرثیہ نجم آفندی کے سفر کی تکمیل ہے:

وہ شاندار موت، وہ بنیاد انقلاب بیعت کا وہ سوال، وہ دنداں شکن جواب
مجبوریٔ حیات سے کونین کو حجاب نیزے پہ سر حسینؑ کا، مغرب میں آفتاب
صدقے ضیائے مہر و قمر آن بان پر
تارے درود پڑھتے ہوئے آسمان پر

وہ خون میں رنگے ہوئے گیوئے تابدار وہ خاک میں اٹا ہوا زہرا کا گلعذار
دونوں طرف حقیقت اسلام استوار قرآن اس کے سینے میں، پہلو میں ذوالفقار
حدّ ادب پہ صبحِ قیامت رُکی ہوئی
قدموں پہ عرش و فرش کی گردن جھکی ہوئی

نظمِ جہاں بدلنے کا عنوان، مرحبا اسلام کی نجات کا سامان، مرحبا
حق کی صداقتوں کا نگہبان، مرحبا بندہ خدا کی راہ میں بے جان، مرحبا
اپنا اصول چھوڑ گیا غور کے لئے
اس کا پیام اِک ہے ہر دور کے لئے

اس کے پیام، اس کی امانت کو آفریں سوکھے لبوں پہ حرف حقیقت کو آفریں
اس دل کو، دل میں صبر کی قدرت کو آفریں چشم بشر میں روحِ شرافت کو آفریں
اس پر سلام پیاس کے صدمے جو سہہ گیا
کہنے کی بات، حلقِ بریدہ سے کہہ گیا

سید ضمیر اختر نقوی نے ''پاکستان میں اردو مرثیہ'' میں جدید مرثیے کے معماروں میں پانچ نام منتخب کیے ہیں۔

۱۔ جوش ملیح آبادی پہلا مرثیہ ۱۹۱۸ء
۲۔ نسیم امروہوی پہلا مرثیہ ۱۹۲۳
۳۔ راجہ صاحب محمود آباد پہلا مرثیہ ۱۹۳۲ء
۴۔ سید آل رضا پہلا مرثیہ ۱۹۳۹
۵۔ نجم آفندی پہلا مرثیہ ۱۹۴۳ء

ڈاکٹر ہلال نقوی نے جدید مرثیے کے عناصرِ اربعہ میں جوش۔ علامہ جمیل مظہری، نسیم امروہوی اور سید آل رضا کو شامل کیا ہے۔ راقم الحروف عاشور کاظمی نے ''مرثیہ نظم کی اصناف میں'' عرض کیا ہے کہ اگر یہ عناصر چار ہی ہو سکتے ہیں اور یہ تعداد حرف آخر ہے تو پھر جوش ملیح آبادی علامہ جمیل مظہری، نجم آفندی اور آغا سکندر مہدی ہوں گے۔ حضرت نسیم امروہوی اپنے سارے کمالات کے باوجود جدید مرثیہ کے علمبردار نہیں ہو سکتے۔ اُن کے ہاں قوس وقزح کے رنگ تھے لیکن اگر ذرا

وسعت قلب سے بات کی جائے اور فکر دفن کے قافلے کو کربلائے محدود نظری میں گھیر کر تہہ تیغ نہ کیا جائے تو جدید مرثیہ کے نمائندہ پانچ اراکین سامنے آتے ہیں۔

جوشؔ، جمیلؔ مظہری، نجم آفندی، آلِ رضا، آغا سکندر مہدی۔

یہ بات اپنی جگہ ہے کہ سید آل رضا کا نام نامی اس فہرست میں شامل کرتے وقت تذبذب کے جو ہلکے ہلکے سائے اُبھر رہے ہیں وہ سکندر مہدی کا نام لکھتے وقت ذہن میں نہیں اُبھرتے۔

(مرثیہ نظم کی اصناف میں۔ص ۸۲)

بہر حال یہ مجھ ناچیز کی رائے ہے جس سے اختلاف بھی لیا جا سکتا ہے۔

ان حوالوں کو یہاں نقل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ نجم آفندی بہر حال جدید مرثیے کے نقیب رہے ہیں۔ اُنہوں نے مرثیے میں اہلبیت اور آل رسول کے کرداروں کے تحفظ کے علاوہ مظلومیت کو ظلم کا فاتح قرار دیا ہے اور مرثیے کو فکری رُخ دیا ہے۔ اُن کے دوسرے مرثیے ''معراج فکر'' میں امام حسینؑ کے کردار کو دیکھئے۔

خود دار زندگی کا جو حامی ہے وہ حسینؑ عزت کی موت کا جو پیامی ہے وہ حسینؑ
جو خالقِ شعور عوامی ہے وہ حسینؑ ہر قوم کی نظر میں گرامی ہے وہ حسینؑ
واقف نہیں بشر جو پیمبر کے نام سے
مانوس ہیں حسینؑ علیہ السلام سے

'خالقِ شعورِ عوامی'۔ 'عزت کی موت کا پیامی' وہ صفات ہیں جو عرفان حسینؑ دیتی ہیں۔

جس نے امور خیر کو بخشی حیات نو جس کی نوائے درد میں ہے زندگی کی رو
صدیوں سے جسکے نقش قدم دے رہے ہیں ضو جو سو گیا بڑھا کے چراغ وفا کی لو
بدلی عمل کی شکل، ارادے بدل دیئے
جس نے مطالبات کے جادے بدل دیئے

کچھ حسن کی نمود تھی کچھ عشق کا مزاج آیا نظر جو صبر و شجاعت کا امتزاج
حق نے رکھا شہادت عظمیٰ کا سر پہ تاج ملتا ہے آنسوؤں کا جسے مستقل خراج
مٹھی میں تھا لئے ہوئے موت و حیات کو
کس دبدبے سے فتح کیا کائنات کو

تجمل آفندی نے کربلا میں ہونے والے ایک ایک واقعہ کو مختلف زاویوں سے دیکھا اور سوچا ہے۔ عام طور پر مرثیہ گو حسینؑ اور بنی ہاشم کی شہادت بیان کرتے ہیں۔ تجمل آفندی نے اصحاب حسینؑ کی شہادتوں پر بھی سوچا ہے حتی کہ تقدیم وتاخیر تک کی وجوہات پر غور کیا ہے اور مرثیوں میں نظم کیا ہے۔ حسینؑ کے چھ مہینے کے بچے علی اصغر کی شہادت تاریخ انسانیت کا ایسا المیہ ہے جس پر دنیا کے بڑے بڑے مفکرین نے سوچا اور لکھا ہے۔ تجمل آفندی کی نظر میں معصوم علی اصغر کی شہادت سے مقصد شہادت حسینؑ اتنا اُجاگر ہو جاتا ہے کہ اُسے تا دیلوں سے چھپایا نہیں جا سکتا۔

جھولے سے گر کے جس کو یہ حاصل ہوا مقام　　لکھا ہے کربلا کی بلندی پہ جس کا نام
جس کے زباں دکھانے پہ حجت ہوئی تمام　　بچہ کہ جس کو حجتِ آخر کریں سلام
وا جس کے اشتیاق میں ہر ماں کی گود ہے
گہوارہ جس کا آج مسلماں کی گود ہے

تاریخ جس کے قتل کی لائی نہیں مثال　　پانی کے مانگنے پہ ہو کُرتہ لہو میں لال
اس زخمِ دل کا بھی کہیں ممکن ہے اندمال　　وہ درد ناک موت کہ تفصیل ہے محال
سجادؑ جس کے صبر کی کچھ انتہا نہیں
پوچھیں گے کہ شیر خوار کا قاتل ملا نہیں

تجمل آفندی نے ہمیشہ اپنے عہد کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ ''موجد فکر'' اُن کا شاہکار مرثیہ ہے یہ اُن دنوں لکھا گیا تھا جب روسی راکٹ چاند کی طرف بڑھ رہے تھے اور امریکہ چاند پر روس سے قبل اترنے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔ دنیا ایک نئے دور میں داخل ہو رہی تھی۔ خلاء کی تسخیر کی خواہش اُمید وبیم کا شکار تھی۔ ایسے عالم میں تجمل آفندی کی فکر اور جذبہ دیکھئے اور اس جذبے کو سلام کیجئے ۔

اہل زمیں کی آج ستاروں پہ ہے نظر　　ممکن ہے کامیاب رہے چاند کا سفر
ہیں اپنی اپنی فکر میں ہر قوم کے بشر　　مردان حق پرست کا جانا ہوا اگر
عباسؑ نامور کا علم لے کے جائیں گے
ہم چاند پر حسینؑ کا غم لے کے جائیں گے

☆☆☆☆☆

حافظ یوسف عزیز جے پوری:-

ولادت ۱۸۸۹ء وفات ۱۹۷۵ء کے لگ بھگ

نام حافظ محمد یوسف علی خان تخلّص عزیز جعفری چشتی سلیمانی ذوق کے شاگرد ظہیر دہلوی کے برادر نسبتی تھے۔نواب روشن الدولہ کے پوتے سید احمد خان مرزا خان آگاہ سے تلمذ کیا جو مرزا غالب کے شاگرد تھے۔

غالب سے سلسلہ ہے علی کا غلام ہوں

مولانا محمد علی جوہر حکیم اجمل خاں کے ساتھ تحریک آزادی میں حصہ لیا — یادگار حسینی کی تحریک میں بھی یوسف عزیز بہت فعال تھے۔ شہید انسانیت والے مولانا علی نقی صاحب قبلہ نقن صاحب کے بلانے پر راجستھان کے سنّی حضرات کے نمائندہ کی حیثیت سے لکھنؤ گئے۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد کراچی چلے گئے۔

حافظ یوسف عزیز کی ''ادب عزیز'' ۱۹۶۶ میں شائع ہوئی۔ قرآن ناطق معہ لوالحمد ۱۹۶۷ء میں چھپی۔ اُن کا مرثیہ روح شہادت (۱۹۴۲ء) جدید مرثیوں شمار ہوا — مرثیہ گوئی میں اُن کا رویہ بالکل منفرد اور جداگانہ رہا ہے۔ جو مرثیہ گو شعراء میر انیس یا خاندان میر انیس۔ خانودۂ میرزا دبیر یا میر عشق و تعشق سے براہ راست سلسلۂ تلمذ وابستہ نہیں رکھتے تھے وہ بھی دبستانِ انیس دبستان دبیر یا خاندان میر عشق و تعشق سے وابستگی کو شرف سمجھتے تھے لیکن حافظ یوسف عزیز وہ مرثیہ گو شاعر میں جو سب سے اجتناب یا لاتعلقی کا برملا اعلان کرتے ہیں۔

نہ ضمیری، نہ دبیری، نہ انیسی ہوں میں
اپنے مضموں کو جلا دینے کو عیسی ہوں میں

جوش ملیح آبادی، جمیل مظہری، نجم آفندی، سید آل رضا، سکندر آغا کے مراثی کو دیکھنے کے ساتھ جب یوسف عزیز کا کہا ہوا مرثیہ ''روح شہادت'' سامنے آتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ''روح شہادت'' ایک نئی طرز کا مرثیہ ہے جس کا موضوع بالکل جداگانہ ہے۔ ''دنیائے آب و گل میں جو کھولی بشر نے آنکھ''۔ ۱۶۵ بند کے اس مرثیے میں کئی مرثیوں کا مواد رثا کے رشتے میں پرویا ہوا ہے مثلاً خاک، آتش، سنگ، آب، اور باد کی خصوصیات مختلف انداز سے بیان کی گئی ہیں۔ مرثیے میں موضوعات اور ان کی ترتیب بصارت اور بصیرت کو بیک وقت جھنجوڑتی ہے۔ عناصر میں انسانی

تصرّف، اس تصرّف کی روحِ رواں، عناصر کی جبلّت۔ بشر کے مادّی وروحانی خصائل، محمدؐ وآلِ محمدؐ کے صدقے میں روحانیت کی روشنی وغیرہ۔ مرثیہ میں گریز کے بعد عقدِ علیؑ و فاطمہؑ، تفسیر آیات سورۃ رحمٰن، ولادتِ امام حسینؑ، ذاتِ محمدیؐ سے حسینؑ کی خصوصی نسبت، حالات کربلا، امام حسینؑ کا خطبۂ آخر، رجز، جہاد، شہادت، بین، نتیجہ شہادت —— حافظ یوسف عزیز نے سب کچھ کہا ہے اس مرثیے میں۔ مزید برآں مرثیے میں وجود باری تعالیٰ پر استدلال کیا ہے۔ آگ پانی اور ہوا کے ذکر پر بھاپ، برف، آبدوز جیسے عنوانات بھی مرثیے میں درآئے ہیں۔ یہ گفتگو ادب میں سائنسی اقدار کی درآمد اور شاعر کی گہری بصیرت کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ مرثیے کا آغاز اسی نکتے سے ہوتا ہے۔

دنیائے آب وگل میں جو کھولی بشر نے آنکھ　　دے دی اک اور دیدہ و رخیر و شر نے آنکھ
روشن جو کی تجلّی شمس و قمر نے آنکھ　　پائی ہر ایک آنکھ نے اور ہر نظر نے آنکھ

آئینہ دار عالم ایجاد ہو گیا
ہر منظرِ جہاں نظر آباد ہو گیا

اس سے بڑھا تو اور کرشمہ دکھا دیا　　لوہے کو آگ پانی کا پردہ بنا دیا
پیدا ہوئی جو بھاپ تو انجن چلا دیا　　یوں ساری کائنات کو نیچا جھنکا دیا

برپا ہے آج شورِ قیامت زمین پر
انسان کُل دبائے کھڑا ہے مشین پر

راجستھان کے علاقے ریاست ٹونک میں پیدا ہونے والا ایک شاعر جب اپنے مصرعے میں ''جھنکا دیا'' لکھتا ہے تو اُس کی زبان دانی کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اس ایک لفظ کے استعمال سے اہل نظر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حافظ یوسف عزیز کو زبان پر کتنی دسترس تھی——

یہ برق خانہ ساز تو ہے کس قطار میں　　ہے برق آسماں بھی اسی کے شمار میں
تانبے کے اور جست کے پتلے سے تار میں　　باندھا ہے اُس کو، اس کو رکھا حالِ زار میں

اک تار میں وہ برقِ دل افروز قید ہے
اک تار میں یہ برقِ جہاں سوز قید ہے

پھر آگ اور تیل لڑا کر، بنا کے گیس　　خانہ بخانہ سب کو دکھائی چھپا کے گیس
دن کر دیا ہے رات کو شب بھر جلا کے گیس　　یوں چھا گیا فضا پہ برابر اُڑا کے گیس

موٹر سے اُڑ چلا ہے ہوائی جہاز پر
یکساں ہے اقتدار، نشیب و فراز پر

اس مرثیے میں ندرت یہ ہے کہ کہ مختلف مضامین کو ایک ایسے شعری رشتے میں پرو دیا ہے کہ ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف گریز کا پتہ نہیں چلتا اور منظر نامہ بدل جاتا ہے۔ مثلاً سائنسی ترقیوں کا ذکر کرتے کرتے اس بات پر آئے کہ جو کچھ سائنس بتا رہی ہے یا دریافت کر رہی ہے اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ یہ سب کچھ پہلے بھی تھا ۔

تاریخ دے رہی ہے شہادت کھلی کھلی روحانیت ذریعوں کی محتاج ہی نہ تھی
اس کی توجہ روح رواں بات بات کی اس میں کوئی نبی ہو کہ اس میں کوئی ولی
پوچھا ذرا بساطِ سلیماں نواز سے
پہلے نہ تھے یوان ہوائی جہاز سے

''روحِ شہادت'' میں مادے کے مقابل روحانیت کی برتری کی بات کی گئی ہے اور کارِ انبیا کو عقلی اور سائنسی نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے جو اُردو شعر میں شاید پہلی بار ہوا ہو ۔

اعلان حج کیا جو خدا کے خلیل نے وہ سن لیا جہانِ عریض و طویل نے
روحانیت کے پردۂ سمع جمیل نے دنیائے مادہ کے بھی گوشِ ثقیل نے
جب تک یہ نشرِ صوت کا آلہ لگا نہ تھا
کعبہ بنا تھا پہلے پہل وہ زمانہ تھا

سائنس نے اب کہا ہے کہ آج تک جو کچھ بولا گیا ہے وہ فضاؤں میں محفوظ ہے اور ایک دن سائنس دان ایسا آلہ ضرور بنالیں گے کہ وہ سب کچھ سنا جا سکے جو فضاؤں میں موجود ہے۔ اسلام چودہ سو برس پہلے یہ بتا چکا تھا جو اس وقت کے انسان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ یوسف عزیز نے اس صورت حال کو نظم کیا ہے ۔

یہ بھی نبی نے وحی الٰہی سے دی خبر جب جب کبھی زبان سے کہتا ہے کچھ بشر
محفوظ ہے وہ بھیج چکا ہے جو پیشتر اس کا اثر جہاں ہے وہیں آئے گا نظر
اس وقت ریڈیو کا کہیں کچھ وجود تھا
اک نور تھا کہ باعثِ بود و نمود تھا

جو مشترک مقام سمجھتے ہیں اس کو ہاں   وہ آئیں دیکھیں رجعتِ خورشید آسماں
تارِ نظر سے کھینچ لیا نورِ زر فشاں   شق القمر کا معجزہ کس پر نہیں عیاں
قربان جانِ روح بھی حق کے نشان پر
انگلی زمین پر ہے اثر آسمان پر

ور امام حسین کے خطبے کے جواب میں شمر لعین نے توحید سے انکار کیا تو امام کی شرعی ذمہ داری ہوگئی کہ وہ اس کا جواب دیں۔ اس جواب کو یوسف عزیز نے نظم کیا ہے ؎

وہ بولا واہمہ ہے خدا چیز ہی ہے کیا   اللہ والے ہو تو بتادو ہمیں ذرا
ہم بھی تو دیکھ لیں نظر آئے کہیں خدا   فرمایا ''توبہ، توبہ ذرا چپ ہو بے حیا''
لے سُن، بقدرِ فہم تجھے ہم بتاتے ہیں
اس پر ہر اک وجود کو شاہد بناتے ہیں
سوچے بشر تو بات نکلتی ہے بات میں   دیکھے تو رات دن سے ہے اور دن ہے رات میں
ہے واجب الوجود دلیل حیات میں   تن میں ہے جیسے روح، خدا کائنات میں
نادیدہ روح جیسے مدبّر بدن میں ہے
یوں ذات بھی نسیمِ بقا اس چمن میں ہے
رگ رگ میں ہے یہ جان مگر کیجئے جو دھیان   ممتاز ہے تعلقِ وابستگی کی آن
اعضا کی اور جان، جوارح کی اور جان   قلب و دماغ و معدہ میں ہے اس کی اور شان
مسلوب زندگی نہ ہو، قطعِ کثیف سے
کھنچتی ہے جان، کاوشِ عضوِ ضعیف سے
بس یونہی ذرے ذرے پہ چھائی ہوئی ہے رات   مملو ہے فیضِ عام سے دامانِ کائنات
ثابت وہی تفاوتِ موضع سے ہیں صفات   ہر گھر کی اور بات ہے کعبے کی اور بات
توہینِ کعبہ، غصۂ رب کی دلیل ہے
قرآں میں آیا سورۂ اصحابِ فیل ہے
گفت و شنید دعوتِ حق کا یہ ہے شمار   سنتے ہیں دل کے کان سے سب روح کی پکار
ادراکِ موعظت بھی اسی کا ہے پردہ دار   اس سے ہوا یہ مسئلہ اب عالم آشکار

آواز و لب کی ہے نہ یہاں قید و بند ہے
ادراکِ مادّی سے یہ عالم بلند ہے

مادی اور روحانی اقدار، اس ذاتِ لامکاں کے وجود پر منطقی استدلال، مادہ اور روح کے باہمی رشتے کی گفتگو، یوسف عزیز کو اصل مقصد سے دور نہیں لے جاتی۔ نہ ہی وہ موضوعات بحث و تمحیث کو ترک کرتے ہیں۔ مرثیہ اختتام کی منزل پر پہنچتا ہے تو مرثیے کے ساتوں رنگ نمایاں نظر آتے ہیں

کر کے تیمم آپ تو پڑھنے لگے نماز سجدے میں سر رکھا تو ملا قربِ بے نیاز
شہ رگ تک آئی تیغ تو بس کھل گیا یہ راز ہے ترکِ مادہ میں ہی تو اُس جاں سے ساز باز
انسانِ بے نیاز کی عزت اسی سے ہے
بندے میں اس خدائی کی طاقت اسی سے ہے

''روح شہادت'' جس تمکنت کا مرثیہ ہے۔ چند بند پیش کر کے مرثیہ کا پورا تاثر اور پورا ماحول نہیں بنایا جا سکتا لیکن یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ مرثیہ اُن چند مرثیوں میں سے ایک جو اپنے موضوعات کے اعتبار سے جداگانہ اور ترقی پسند مرثیے کی آن بان ہیں۔

''تذکرہ شعرائے اُردو جے پور'' مرتبہ مولوی شاغل میں ان کا تخلص عزیز آگاہی لکھا ہے۔

☆☆☆☆☆

آغا سکندر مھدی:-

ولادت ۱۹۲۶ء رائے بریلی وفات ۱۹۷۶ء

رائے بریلی یو پی میں پیدا ہوئے۔ لکھنو یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری لی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے B.T کی سند حاصل کی اور پاکستان آگئے۔ یہاں آکر ایم۔ اے پنجاب یونیورسٹی سے کیا اور محکمہ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔ تذکروں میں آغا سکندر مہدی کا ذکر بہاولپور کے مرثیہ گو شاعر یا زیادہ سے زیادہ بہاولپور میں مقیم مرثیہ گو کی حیثیت سے آیا ہے جو مرثیہ گوئی میں آغا سکندر مہدی کا صحیح مقام کا تعین نہیں کرتا ——

میں آغا سکندر مہدی کے فن اور شخصیت پر میں ایک کتاب ''مرثیہ نظم کی اصناف میں''

پیش کر چکا ہوں جس میں اُن کے مرثیے بھی شامل ہیں، یہ کتاب ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ کتاب کا نام میں نے" آغا سکندر مہدی۔فن اور شخصیت" اس لئے نہیں رکھا تھا کہ میری نظر میں یہ الفاظ اب کلیشے بن گئے ہیں۔کسی کے پاس فن ہو نہ ہو۔اس کی شخصیت میں جہتیں ہوں نہ ہوں جدھر دیکھئے کوئی نہ کوئی کتاب اس عنوان کی مل جائے گی۔میں نے کتاب کا نام سکندر مہدی کے ایک شعر سے لیا تھا۔

مثنوی ہو کہ رباعی کہ قصیدہ کہ غزل
''مرثیہ نظم کی اصناف میں" سب سے اوّل

حضرت تجمّم آفندی کے تذکرے میں عرض کر چکا ہوں کہ جدید مرثیہ کو آگے بڑھانے والوں میں آغا سکندر مہدی کا نام بہر حال اس فہرست میں شامل رہے گا—

قدیم مرثیے کے لوازم میں چہرہ، ماجرا، سراپا، رخصت، آمد، جنگ، شہادت، بین شامل ہیں۔کچھ مرثیہ گو اساتذہ نے ساقی نامہ، تلوار کی تعریف، گھوڑے کی تعریف کو بھی ان لوازم میں شامل کیا۔مرزا اوجؔ، شادؔ عظیم آبادی، دلوّرام کوثری جیسے اساتذہ نے جدید مرثیے کی بنیاد اُٹھائی مگر چند اہم تبدیلیوں کی باوجود مرثیہ ان لوازم کے حصار سے باہر نہ جا سکا۔جوشؔ نے روایت سے بغاوت بھی نہیں کی اور روایت کے سامنے سر بھی نہیں جھکایا مگر جوشؔ کے مراثی کو ایک عرصے تک مسدّس کہہ کر مرثیے کی حدود سے باہر رکھنے کی کوششیں ہوتی رہیں لیکن جمیلؔ مظہری، نسیمؔ امروہوی، تجمّم آفندی اور آلِ رضاؔ جیسے صاف ستھرے لوگ مرثیہ میں آئے تو جدید و قدیم مرثیے پر کُھل کر گفتگو کا ماحول بنا اور مرزا اوجؔ سے سکندر مہدی تک جدید مرثیے کے معماروں کا شمار ممکن ہوا۔آغا سکندر مہدی نے مرثیے کے لوازم میں تبدیلی کرنے کی براہ راست جسارت کی اور مرثیے کے عناصر توحید، عدل، نبوّت، امامت، اور قیامت مقرر کئے اور ان عناصر کو مرثیوں میں اس خوبصورتی سے نبھایا کہ کسی کو اس جدّت فکر پر اعتراض نہ ہوا— اُنہوں نے آٹھ سال میں سولہ مرثیے کہے۔ایک مرثیے کے چہرے میں اُنہوں نے اُردو مرثیے کی عظمت کو موضوعِ سخن بنایا —

یوں تو اُردو میں ہے موجود ہر اک صنفِ سخن چار اطراف میں نکھرا ہے رباعی کا چمن
گل و بلبل سے ہے بھرپور غزل کا دامن زینتِ دامنِ اُردو ہے قصیدے کی پھبن

مثنوی قوتِ تخیل کا ہے حسن عمل
ہاں مگر مرثیہ تخلیق کا ہے تاج محل

سکندر مہدی نے مرثیہ میں ضعیف روایتوں سے بچنے کیلئے واقعات اور قرآن وحدیث کے اجزا مرثیوں میں نظم کئے — حضرت جوشؔ نے سکندر مہدی کو ان الفاظ میں خراج محبت پیش کیا ہے۔

"فخر دارا و سکندر، آغا سکندر مہدی ہر چند کہ دھان پان سے ناتواں انسان ہیں مگر جب اُن کے کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے رائی پر بت کو اپنے دوش پہ اُٹھائے ہوئے ہے۔ آغا سکندر مہدی سکندر سے زیادہ عظیم ہیں کہ اس نے پتھر تراش کر آئینہ بنایا اور یہ ہیرا تاش کر الماس بنا رہے ہیں۔ میں ان کو اور ان کی کاوشوں کو سلام کرتا ہوں۔

(جوش ملیح آبادی ۲۳/اپریل ۱۹۷۳ء)

اور شاید کہنا غلط نہ ہوگا کہ جس شخص کی کاوشوں کو جوشؔ سلام کریں اُسے دنیائے شعر و سخن سلام کرتی ہے۔ سکندر مہدی کی نظر عصر جدید پر بھی تھی اور اس عہد میں ہونے والی تبدیلیوں پر بھی۔ اُنہیں سیاسی اور سماجی اقدار کا ادراک بھی تھا اور سائنسی معلومات وایجادات پر بھی اُن کی نظر تھی۔ اُن کا ایک مرثیہ ہے "مجلس میں ذکر عظمت نوع بشر ہے آج" کے چند بند اس فکر کی وضاحت ہیں ۔

مجلس میں ذکر عظمتِ نوعِ بشر ہے آج پیشِ نگاہ حُسنِ طلوعِ سحر ہے آج
انساں کی زد میں گردشِ شمس وقمر ہے آج [۱] تسخیرِ کائنات پہ سب کی نظر ہے آج
انسان پہنچ گیا ہے جو ماہِ مبیں پر
رکھتا نہیں ہے فخر سے پاؤں زمیں پر

اس کے نگار خانے کی زینت گلوں کے ہار گلدستہ اس کے ہاتھ میں سرمایۂ بہار
خونِ جگر سے کردیا صحرا کو لالہ زار [۳] جکڑے ہوئے ہے پنجۂ آہن میں کوہسار
سنگِ گراں تراش کے ہیرا بنا دیا
اس نے جواہرات کا سُرمہ بنا دیا

پتھر کو آب دے کے اسے لال کردیا سونے کو آنچ دے کے زر و مال کردیا

لوہا گلا کے آتشِ سیّال کر دیا تقسیم وقت کر کے مہ و سال کر دیا[۵]
واقف ہے مہر و مہ کے عروج و زوال کا
رکھتا ہے یہ حساب ستاروں کی چال کا

واقف ہوا جہاں کے نشیب و فراز سے نغمے سمیٹتا ہے لبِ نَے نواز سے
فردوسِ گوش پا گیا تاروں کے ساز سے مسحور غزنوی ہے زبانِ ایاز سے[۹]
نغمے اُبل رہے ہیں چمکتے نشان سے
گھر بیٹھے آرہی ہے صدا آسمان سے

شاہد ہیں اس کے جہدِ مسلسل کے مہر و ماہ دستِ عمل سے اس کے برابر ہیں کوہ و کاہ
پُر ہے نوادرات سے اس کی تجربہ گاہ ہاتھوں میں ہے کلیدِ درِ جنتِ نگاہ[۱۰]
جنبش جو دی تو برق سی پردے پہ چھا گئی
بلقیسِ وقت قصرِ سلیماں میں آ گئی

دوشِ ہوا پر صوت کی موجوں کو جا لیا چشمِ زدن میں عکس کی لہروں کو پا لیا
دستِ عمل سے تختِ سلیمان بنا لیا اوجِ فضا پہ جا بجا قبضہ جما لیا[۱۱]
حیراں مَلک ہیں آدمِ خاکی کی شان پر
اس کے چراغ جلنے لگے آسماں پر

اور گریز کی منزل پر سکندر مہدی نے جو روشنی کی لکیر کھینچ دی ہے

انساں کو لے گیا ہے کہاں ذوقِ جستجو مجنوں صفت بنائے ہے لیلیٰ آرزو
نوکِ زباں ہے اور سنورنے کی گفتگو پھرتا ہے دشتِ زیست میں آوارہ چار سو[۱۴]
لیکن حقیقتوں کو ابھی جانتا نہیں
اِک اور زندگی ہے اسے مانتا نہیں

وہ زندگی جو اصل میں ہے اصل زندگی قائم ہے جس کے دم سے محبت کی روشنی
جس کے چراغِ راہ ہیں ایمان و آگہی وہ زندگی کہ جو ہے حقیقی و دائمی[۱۵]
پاکیزگی کی، زُہد کی، تقویٰ کی زندگی
خوفِ خدا، تصوّرِ عقبیٰ کی زندگی

اسلام اِن صفات کا حامل ہے آج بھی اقدار زندگی میں یہ کامل ہے آج بھی
جو کل تھا حُسنِ زیست وہ شامل ہے آج بھی مخلص گروہ، دین پہ عامل ہے آج بھی
سرشار ہے جو عشقِ رسالت مآب سے
وابستہ آج تک ہے درِ بوتراب سے

اور یہ مرثیہ نعت رسول، منقبت علی مرتضیٰ، عظمت حسین علیہ السلام بیان کرتا ہوا شہادت حسینؑ اور بعد شہادتِ حسینؑ، سیدہ زینبؑ کے صبر وعزم کے منظرنامے پر مشتمل ہے۔ سکندر مہدی نے مرثیے میں مصائب اور بین کے انداز کو بھی نیا رُخ دیا ہے۔ ''مرثیہ نظم کی اصناف میں' بین کے حوالے سے میں نے قدیم وجدید مراثی کا تقابل کیا تھا اور یہ وضاحت کی تھی کہ سکندر مہدی کے بین میں کہیں ناموسِ مصطفیٰ کے کردار مجروح نہیں ہوتے۔ سکندر مہدی نے حسینؑ کی مظلومیت کو بے بسی اور بے کسی کے اطلاق سے بچایا اور اُن کے صبر اور مقصد کو اُجاگر کیا ہے۔

دشمن کی کڑی ضرب تھی پیغامِ نبیؐ پر دنیا کی نگاہیں تھی حسینؑ ابنِ علی پر

وہ شخص جس کے عمل پر دنیا کی نگاہیں مرکوز ہوں وہ جب رخصت آخر کو خیام میں آتا ہے تو قدیم مرثیوں کے بین کے مطابق، روتا پیٹتا نظر آتا ہے، مثلاً

جب خیمے میں رخصت کو شہ بحروبر آئے چلائی سکینہ میرے ''بے بس' پدر آئے
حضرت کو جو ناموسِ پیمبرؐ نظر آئے ''روکر'' کہا ہم قبر میں اصغر کو دھر آئے
لو بیبیو شبیر جہاں سے سفری ہے
اب فاطمہؑ کا لال چراغ سحری ہے
کہہ کر یہ سخن ''رونے لگے'' سید اکرم ناموس محمد میں بپا ہوگیا ماتم
'سر پیٹ کے' زینب نے کہا سید عالم کس سے سخن یاس یہ فرماتے ہو اس دم
کچھ میری بھی ہے فکر جو سر دیتے ہو بھائی
ہے ہے مجھے مرنے کی خبر دیتے ہو بھائی
ایک طرف امام حسینؑ کا رونا پیٹنا، دوسری طرف شریکۃ الحسین زینب کا مقصدِ حسینؑ

سے اتنا ناواقف ہوتا کہ گویا شہادت کی خبر بھی زینب کے لئے ایک نئی اطلاع نہیں تھی۔ اب اسی مرثیے منظرنامے میں سکندر مہدی کا اندازِ بیاں دیکھئے۔

ہنگام عصر سرخ تھا میدانِ کربلا		گھوڑوں کی زد میں راکبِ دوشِ رسولؐ تھا
انسانیت کی لاش کچلتے تھے اشقیاء		زینب نے بڑھ کے پرچمِ دیں کو اُٹھالیا
مثلِ حسینؑ آہنی دیوار بن گئی
بیٹی علیؑ کی قافلہ سالار بن گئی

گو ظالموں نے چادرِ زہرا اُتار لی		زینبؑ نے زلفِ دینِ پیمبرؐ سنوار لی
ڈوبی ہوئی تھی دین کی کشتی اُبھار لی		ہاتھوں میں اپنے گردشِ لیل و نہار لی
بھائی نے سرکٹا کے جو عزمِ سفر کیا
زینبؑ نے ملکِ شامِ غریباں کو سر کیا

بھرپور بین کی منزل پر بھی آغا سکندر مہدی کا اسلوب اور سیدہ زینبؑ کے بین قابل توجہ ہیں۔ ممتا کے تقاضوں اور اہلِ بیت کے منصب کے امتزاج کی لاثانی مثال۔ عون ومحمد کے لاشے خیامِ حسینی میں آنے پر زینبؑ کے بین (سکندر مہدی کے الفاظ میں)۔

مولا گئے تو کہنے لگی سوگوار ماں		اے بیبیو بتاؤ میرے لال ہیں کہاں
لاشیں دکھاؤ تاکہ تصدق ہو نیم جاں		چھایا ہوا ہے آنکھوں کے آگے میری دھواں
سورج تو اتنی جلدی کبھی ڈوبتا نہیں
کیا رات ہوگئی ہے، مجھے سوجھتا نہیں

بتلاؤ بیبیو مرے خورشید ہیں کہاں		مجھ کو بٹھادو دونوں کے لاشوں کے درمیاں
امّاں سے سرخرو کیا قربان جائے ماں		ان پر زمیں بھی روئے گی روئے گا آسماں
میدانِ کار زار میں کیا نام کر گئے
میں جیسا چاہتی تھی وہی کام کر گئے

فضہ ہمارے شمس و قمر ہیں کہاں بتاؤ		اے اُمّ لیلیٰ لختِ جگر ہے کہاں بتاؤ
اے شہر بانو، نورِ نظر ہیں کہاں بتاؤ		مجھ غم زدہ کے دیدۂ تر ہیں کہاں بتاؤ

منت بڑھاؤں بیٹوں کی زلفیں سنوار لوں
دولہا بنے ہیں لاؤ میں صدقہ اُتار لوں

سلام ہو سکندر مہدی اور ان شاعروں پر جنہوں نے محمدؐ و آلِ و آلِ محمدؐ کی عظمت کو ہر کیفیت میں پیشِ نظر رکھا۔

☆☆☆☆☆

بدرالہ آبادی:-

ولادت ۱۹۰۹ء۔ وفات ۱۹۷۶ء

نام ظلِ حسنین۔ تخلص بدر۔ الہ آباد کے زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والدِ گرامی کا نام محمد کاظم تھا۔ بدر نے الہ آباد سے میٹرک پاس کیا۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں شاعری شروع کی۔ ۱۹۲۸ء میں بدر نے الہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو ڈاکٹر ضامن علی صدر شعبۂ فارسی جیسے اُستاد ملے۔ علی عباس حسینی اور احتشام حسین جیسے ہم جماعت ملے۔ بعدازاں فراق گورکھپوری اور ڈاکٹر اعجاز حسین ایسے مفکران ادب کے قرب نے طبع رواں کو تازگی دی۔ ابتداً بدر غزلیں کہتے تھے جو اتنی مقبول ہوئیں کہ ڈاکٹر ضامن علی نے بدرالہ آبادی کے کلام کا انتخاب دسویں جماعت کے کورس میں شامل کیا۔ آج کا یادگار حسین کالج الہ آباد، ماضی میں یادگار حسینی سکول تھا جس کی بنیاد بدرآلہ آادی اور اُن کے رفقاء نے رکھی تھی۔

قیامِ پاکستان کے بعد بدرالہ آبادی معہ اہل وعیال پاکستان آگئے اور کراچی میں بس گئے۔ ۱۹۶۲ء میں بدرالہ آبادی نے پہلا مرثیہ کہا ۔

زبان تیغ کا جوہر ثنائے باری ہے

یہ مرثیہ علی اصغر کے حال کا ہے اور اس میں ۶۱ بند ہیں۔ مرثیے میں وہ حضرت نسیم امروہوی کے شاگرد تھے۔ بدر نے غزل، نظم، قصیدہ، سلام، رباعی اور مرثیہ ساری اصناف سخن میں شاعری کی ہے۔ بدرالہ آبادی نے سات مرثیے کہے ہیں جن میں سے پانچ مرثیے ''بدر کامل'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کا مختصر ترین مرثیہ ۔ ''سامرا والے مسیحا تیرا بیمار ہوں میں'' ہے جس کے ۴۵ بند ہیں۔

سامرا والے مسیحا تیرا بیمار ہوں میں   جو احاطے میں خزاں کے ہے وہ گلزار ہوں میں
جس کو بازار نے لوٹا وہ خریدار ہوں میں[1]   فخرِ موسیٰ زماں، طالب دیدار ہوں میں

طور سے بڑھ کے ہمہ گیر اک افسانہ بنے
میں بھی دیوانہ بنوں، غیر بھی دیوانہ بنے

کوئی ہمدم، نہ کوئی راہ بتانے والا   بے نگاہوں سے نہاں دل میں سمانے والا
کس سہارے پہ جئے ناز اُٹھانے والا[3]   جب خبر تک نہیں کب آئے گا آنے والا

ایک دم جاتا ہے، اور ایک نفس آتا ہے
قافلہ زیست کا خاموش چلا جاتا ہے

عشق رہبر ہے تو ہردم تجھے ہم دیکھتے ہیں   صفحہ دل پہ تیری یاد رقم دیکھتے ہیں
رات دن جلوہٗ گلزارِ ارم دیکھتے ہیں[۱۴]   منزلِ روح میں اک نقشِ قدم دیکھتے ہیں

پڑھ کے قرآن طبیعت جو مچل جاتی ہے
دم بدم مصحفِ ناطق کی صدا آتی ہے

یاد ہے وادیٔ ایمن کا فسانہ ساقی   دل کو بھی طور سمجھتا ہے زمانہ ساقی
''اِرنی'' کا میرے لب پر ہے ترانہ ساقی   جلد کیسے میں پڑھا آکے دُگانہ ساقی

سجدۂ شکر کریں، جامِ ضیا بار پئیں
ہم بھی آنکھوں سے تیرا شربتِ دیدار پئیں

اس کے بعد ساقی نامے کے بند ہیں۔ ساقی نامے سے تلوار کی تعریف اور شہادتِ حسینؑ تک بات پہنچی ہے۔

اُردو شاعری میں عشق کی اہمیت بہت ہے۔ تصوف میں 'عشقِ حقیقی' کی جلوہ فرمائی ہے۔ علامہ اقبال بھی عشق حقیقی کو معراجِ بشر قرار دیتے ہیں۔ اُن کے ہاں حضرت علیؑ سرمایۂ عشق حقیقی ہیں اور عشق الٰہی انسان کا نجات دہندہ ہے۔ اقبال سے پہلے شاؔد عظیم آبادی نے مرثیے میں عشق کو موضوع بنایا ہے۔ بدؔر الہ آبادی نے بھی فلسفۂ عشق کو مراثی میں پیش کیا ہے۔

وہ عشق جو کہ ہے تکمیل ابدیت کی سند   وہ عشق جس کا تصرف ازل سے تا بہ ابد
وہ عشق جو نہ کبھی ہو اسیرِ دامِ خرد   وہ عشق واجب و ممکن ہے ارتباط کی حد

وہ عشق 'کن فیکون' کا مآل جل اللہ
وہ عشق معرفت ذوالجلال جل اللہ

بدرؔ الہ آبادی نے قدیم مرثیے کے لوازم کی پاسداری کی ہے۔ساقی نامہ،صبح کا منظر گھوڑے اور تلوار کی تعریف وغیرہ میں دبیر کا رنگ نمایاں ہے۔

☆☆☆☆☆

سید محمد جعفری:-

ولادت ۲۷ر دسمبر ۱۹۰۵ـ وفات ۶رجنوری ۱۹۷۶ء

جائے پیدائش اور وطن موضع پہر سر ریاست بھرت پور۔ ابتدائی تعلیم اُن کے دادا سید مرتضٰی علی بیدارؔ کی نگرانی میں ہوئی— سید محمد جعفری کے والد سید محمد علی جعفری ریاست بھرت پور کے گورنمنٹ سکول میں صدر مدرس تھے۔ بعد میں اسلامیہ کالج لاہور پرنسپل ہوئے—— سید محمد جعفری نے لاہور میں فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی اور حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات سے وابستہ ہوکر دہلی چلے گئے۔

تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۷ء میں پھر پاکستان آگئے اور افسر اطلاعات حکومت پاکستان کی حیثیت سے کراچی میں تعینات کئے گئے— کچھ دنوں بعد ملازمت سے سبکدوش ہوکر ایران میں پاکستانی سفارت خانے کے پریس اتاشی کی حیثیت سے کام کیا۔

سید محمد جعفری نے شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا۔حضرت شاداںؔ بلگرامی کی شاگردی کی۔سید محمد جعفری مزاحیہ رنگ میں اشعار کہنے لگے تھے اور اُن کی مزاحیہ شاعری اتنی مقبول ہوئی کہ اُن کی دیگر اصناف سخن ماند پڑ گئیں۔سید محمد جعفری کا نام سلجھی ہوئی صاف ستھری مزاحیہ شاعری کی علامت بن گیا تھا۔آج بھی مزاحیہ شاعری کرنے والے مقبول شاعر سید محمد جعفری کو عوام جانتے ہیں اور مرثیہ گو سید محمد جعفری کو خواص بھی کم جانتے ہیں۔انہوں نے میر انیسؔ اور میرزا دبیرؔ کا اتنا عمیق مطالعہ کیا تھا کہ وہ میر انیسؔ کے صنائع و بدائع پر ایک کتاب لکھ رہے تھے جو پوری نہ ہوسکی۔

سید محمد جعفری نے صرف ایک مرثیہ کہا ہے، جس کے چند بند سید ضمیر اختر نقوی نے ''اُردو مرثیہ پاکستان میں'' نقل کئے ہیں۔

سلام اس پر کہ جس کی صبح زندہ شام زندہ ہے جہاں میں باوجود گردشِ ایام زندہ ہے

وہ جس کا شیوۂ صبر و رضا سے نام زندہ ہے وہ جنت میں ہے دنیا میں مگر پیغام زندہ ہے
لگی ہے صفحۂ ہستی پہ مہرِ زندہ باد اس کی
دلوں سے تا قیامت مٹ نہیں سکتی ہے یاد اسکی

سلام اس پر کہ دنیا لا نہیں سکتی مثال اس کی شجاعت بے مثال اس کی تو ہمت لازوال اسکی
وہ ہے شاہ شہیداں یہ ہے معراجِ کمال اس کی شہادت معتبر ہے پیشِ ربّ ذوالجلال اس کی
ملی سجدوں سے اس کے نوع انساں کو درخشانی
فرشتوں کی جھکادی پیشِ آدم اس نے پیشانی

سلام اس پر کہ جس کا صبر ہے توقیرِ انسانی نبی کا وہ نواسہ فاطمہ زہرا کا وہ جانی
وہ جس پر ساتویں سے بند کروایا گیا پانی وہ جس نے بھوک میں اور پیاس میں دی اپنی قربانی
یزید اب جا چکا ہے اس کی مینا ہے نہ ساقی ہے
حسینؑ ابنِ علیؑ پر ظلم کی ہر یاد باقی ہے

☆☆☆☆☆

عزم جونپوری:-

ولادت ۱۹۰۷ء۔وفات ۱۹۷۶ء

نام سید مہدی حسن، تخلص عزؔم۔ضلع جونپور کے موضع رائی مئو میں پیدا ہوئے۔ان کے والد سید احمد حسن، جونپور کے تعلقہ دار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔مہدی حسن عزؔم نے لکھنو یونیورسٹی سے ایم۔اے۔ایل ایل بی کیا۔۱۹۳۵ء میں جونپور سے وکالت کا آغاز کیا۔۱۹۵۱ء میں ہجرت کر کے کراچی آن بسے اور وکالت کے پیشہ کو برقرار رکھا۔شعر و ادب سے دلچسپی طالب علمی کے زمانے سے تھی۔۱۹۳۰ء سے باقاعدہ شاعری شروع کی۔غزل پر کم توجہ تھی اس لئے کہ رجحان مذہبی شاعری کی طرف تھا۔نوحے، رباعیاں، سلام، قصیدے مرثیے خاصی تعداد میں کہے مگر سارا کلام تقریباً غیر مطبوعہ ہے۔

قیام لکھنو کے دور میں حضرت صفی لکھنوی سے اصلاح لیتے رہے۔کراچی میں ۱۹۵۹ء میں پہلا مرثیہ کہا ۔ ''غم حسین میں کھلتا ہے کیا ہے قربانی'' سید آل رضا کی شاگردی اختیار کی۔ ـ

غم حسینؑ میں کھلتا ہے کیا ہے قربانی جو دل ہے آئینہ، دل کی جلا ہے قربانی
رہِ حیات میں بانگِ درا ہے قربانی زمانہ ساز مرض کی دوا ہے قربانی
اسی سے نوعِ بشر کا رہا بھرم باقی
اسی کے دم سے ہے انسانیت میں دم باقی

نہ شام جس کی ہو، ایسی سحر ہے قربانی خلافِ ظلم، نویدِ ظفر ہے قربانی
کمالِ وسعتِ فکر و نظر ہے قربانی جمالِ رفعتِ سعیٔ بشر ہے قربانی
سنوارتی ہے یہ انسان کی شرافت کو
اسی سے ملتی ہے معراج آدمیت کو

عزمؔ جونپوری کے مراثی میں وفا، تقویٰ، سچائی جیسے عنوانات پر مرثیے موجود ہیں۔ سید سجادؑ کی عظمت کردار، عزم جونپوری کے فکر و شعور کی راہنما تھی۔ بیمار کربلا سید سجادؑ پر بہت کچھ لکھا گیا۔ یادگار مرثیوں میں میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، نسیمؔ امروہوی، نے سید سجاد کے احوال پر مرثیے لکھے ہیں ان سارے مرثیوں میں طوق و زنجیر پہنے ایک مظلوم انسان، ایک اسیر، ایک قیدی کے حالات نظم کئے گئے ہیں۔ میر انیسؔ کا اس سلسلے میں ناقابل فراموش بند یہ ہے۔

تلواریں لئے چاروں طرف ظلم کے بانی حلقے میں دل آزاروں کے وہ یوسفِ ثانی
غربت، الم و بے پدری، تشنہ دہانی وہ طوق، وہ لنگر، وہ سلاسل کی گرانی
مڑ کر کبھی زینبؑ کے رخِ پاک کو دیکھا
بیڑی کبھی دیکھی، کبھی افلاک کو دیکھا

قدیم مرثیہ نگاروں کے بعد نجم آفندی جیسے انقلابی شاعر نے سید سجاد کی اسیری کو کس نظر سے دیکھا۔ پہلے بھی نقل کر چکا ہوں۔

سجاد اسیر جور ہوئے صد حیف کسی نے یہ نہ کہا
یہ پاؤں ستونِ کعبہ ہیں زنجیر کسے پہناتا ہے

یہی نجم آفندی مزید کہتے ہیں۔

یہ کس کے قدم کی آہٹ سے ہنگامۂ عشرت کانپ اُٹھا
زنجیر میں جکڑا کون گیا یہ محلوں میں درباروں میں

عزمؔ جونپوری نے اس صاحب عظمت قیدی کو کس نظر سے دیکھا ہے وہ بھی قابل توجہ ہے۔

ایک قیدی نے بدل ڈالا سیاست کا نظام کام کچھ کر نہ سکا ظلم و شقاوت کا نظام
عزم تھا رو بہ عمل کثرت و طاقت کا نظام پھر بھی قلت کو مٹا پایا نہ کثرت کا نظام
پیس کر رکھ دیا بیمار نے طاقت کا غرور
قید میں رہ کے کچل ڈالا حکومت کا غرور

ضمیر اختر نقوی نے عزم جونپوری کے ۱۴ مرثیوں کی فہرست نقل کی ہے جس میں گیارھویں مرثیے کا یہ مصرع اولیٰ درج ہے۔ ''ہمت طلب ہے ضیغم داورا کا تذکرہ'' اور چودھواں مرثیہ ہے۔ ''کرتا ہوں آج ثانیٔ زہرا کا تذکرہ''۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اس مرثیے کے ۹۶ بند ہیں لیکن میرے پاس عزم جونپوری کا ایک مرثیہ۔ ''ہے فخر نطق ثانیٔ زہرا کا مرثیہ'' ہے۔ ان دونوں میں مماثلت بھی ہے اور تفاوت بھی۔ ایک تو مصرع اولیٰ میں ''کرتا ہوں آج'' کی جگہ ''ہے فخر نطق'' ہے۔ دوسرے یہ کہ مرثیہ سیدہ زینب کے احوال کا مرثیہ ہے لیکن یہ مرثیہ جو میرے پاس ہے وہ مسدس میں نہیں ہے۔

ہے فخرِ نطق ثانیٔ زہراؑ کا تذکرہ
رنگ حیاتِ زینبِ عُلیا کا تذکرہ
جو ورثہ دارِ فاتح بدر و حُنین ہے

یہ تذکرہ ہے گلشن عظمت کے پھول کا
فخرِ وجود دخترِ بنت رسول کا
یہ ذکر جزوِ نورِ رسولِ انامؐ کا

اصلاح نفس کا ہے یہ اک بے مثال ساز
یہ تذکرہ بھی فرض ہے یوں جس طرح نماز
اپنی جگہ ہے خود بھی عبادت کا تذکرہ

اس تذکرے نے ظلم کو شرمندہ کردیا
حقانیت کا رنگ درخشندہ کردیا
اس تذکرے کے فیض سے اسلام بچ گیا

بنت علی ہے جانِ علی جانِ اہلبیت
تاریخ کی زبان میں عنوانِ اہلبیت
فکر و نظر میں، ذہن میں، ایک ایک بات میں

یہ ۱۷۴ بند کا مرثیہ ہے جسے پڑھ کر یا سُن کر رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے اور دل سے دعا نکلتی ہے کہ اے قادر مطلق۔ اے محمد و آل محمد کو تطہیر کا اعزاز عطا کرنے والے معبود اس کلام کو شرف قبولیت عطا فرما۔ اور اس کلام کے خالق کو محمد و آل محمد کے محبوں میں شمار فرما۔

راقم الحروف نے یورپ آنے سے قبل عزم مرحوم کو سنا ہے، ان کے مسدس میں مرثیے بھی سنے ہیں مگر ہائے رے زمانے آج ان کا کوئی مرثیہ میسر نہیں کہ کچھ بند نقل کیے جا سکیں۔

☆☆☆☆☆

صفدر علی حسرتی:-

ولادت ۱۹۰۱ء بمقام بہرائچ شریف　دفات ۱۹۷۶ء

صفدر علی حسرتی کے فرزند ڈاکٹر ظفر علی نے اپنے بیان مطبوعہ رثائی ادب کراچی میں لکھا ہے کہ:

"مرثیہ کسی ایک فرقے کی میراث نہیں ہے اور یہ خیال بھی قطعی غلط ہے کہ مرثیہ صرف شیعہ شاعر ہی کہہ سکتے ہیں۔ اہلبیت سے محبت سب مسلمانوں کے لئے اُن کے ایمان کا لازمی حصّہ ہے، میرے والد نے بھی اس جذبے سے سرشار ہو کر مرثیہ لکھا تھا۔ میرا یہ شعر میرے خاندان کا صحیح اور جامع تعارف ہے۔

ہم ازل سے ہیں غلامانِ حسینؑ　میں، میری اولاد، میرے والدین

یہ شعر ہمارے خاندان کے جذبات محبت کا صحیح عکاس ہے"

(رثائی ادب پہلا شمارہ ۱۹۹۹ء)

صفدر علی حسرتی کے فرزند ڈاکٹر ظفر ہاشمی کی عمر بھی درس و تدریس میں گذری، ۱۹۹۵ء میں سینٹ پیٹر کالج کراچی سے ریٹائر ہوئے۔ شعر و ادب۔ تصنیف و تالیف میں اُن کے کئی مجموعے ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں اُنہوں نے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی زیر نگرانی "اُردو شاعری میں حریت فکر"

کے عنوان پر کراچی یونیورسٹی سے مقالہ مکمل کیا۔ صفدر علی حسرتی کے درجِ ذیل مرثیے کا نسخہ انہیں کے پاس محفوظ تھا۔ ڈاکٹر ظفر ہاشمی کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق اُن کے مورثِ اعلیٰ سالار بادشاہ محمود غزنوی کے بھانجے سید سالار مسعود غازی کے ہمراہ جہاد و تبلیغ اسلام میں سرگرم رہے۔ اُن کے اجداد اور بزرگ میر حسن علی اور میر ببر علی نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں براہ راست حصہ لیا اور اُن میں سے ایک کو شہادت کا درجہ ملا۔ حسرتیؔ، حضرت جگرؔ مراد آبادی کے ہم عصر تھے، اُنہوں نے غزل کے علاوہ حمد، نعت، منقبت اور رثائی کلام بھی کہا، اُنہوں نے ۱۹۶۰ء میں یہ غیر منقوط مرثیہ لکھا۔ ''اللہ لا الہ ہے، واللہ ہے احد''

اُردو مرثیے کی تاریخ میں یعقوب علی نصرتؔ، منظور مہدی منظورؔ اور چند ہی ایسے شاعر ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے مرثیوں میں کچھ بند غیر منقوط کہے ہیں یعنی ان بندوں میں ایسے حروف و الفاظ استعمال کئے ہیں جن میں کہیں نقطہ نہ ہو، البتہ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے پورے پورے مرثیے غیر منقوط کہے ہیں، یا پھر صفدر علی حسرتیؔ کا یہ مرثیہ غیر منقوط ہے، حسرتیؔ کے غیر منقوط مرثیے کے ذکر کے ساتھ انیسؔ و دبیرؔ کے غیر منقوط مراثی کا ذکر میر انیسؔ، مرزا دبیر اور حسرتیؔ کا موازنہ کرنے کی غرض سے نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ ان شعراء کی عظمت کا اعتراف مقصود ہے اور اپنی اس گذارش کا اعادہ مطلوب ہے کہ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی بے مثال عظمتوں کے باوجود مرثیے کا سفر رک نہیں گیا ہے بلکہ جاری ہے۔ ذیل میں حسرتیؔ کے غیر منقوط مرثیے کے چند بند درج کرنے سے پہلے احتراماً میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے غیر منقوط مراثی کے مطلع اور مقطع کے بند نقل کئے جا رہے ہیں۔

(میر انیس کا مرثیہ)

مدّاح ہوا کلکِ امامِ دوسرا کا　　مسرور ہو دل، لکھ کلمہ صلِّ علا کا

مطلع ہو کہ عالم ہو مہ و مہر و سما کا[1]　　مدّاح ہو مورد کرم و مہر و عطا کا

سردار دوعالم کا اگر رحم و کرم ہو

اس مدح کا واللہ صلہ حور و ارم ہو

مہر و اسد اللہ، کرم و مہر و عطا ہو　　للہ کرو رحم، امامِ دوسرا ہو

لو واسطہ معصوم کا، مسموع دعا ہو　　مادح کو عطا حور و ارم اس کا صلہ ہو

حلال مہم راہ ہر اہل حسد ہو
سردار امم آؤ، مددگار مدد ہو

میر انیس کا یہ مرثیہ ۵۰ بند پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ بھی میر انیس کے غیر منقوط کلام ملتا ہے مثلاً ان کے مقبول مرثیے ۔ "جب حضرت زینب کے پسر مرگئے دونوں" میں کئی بند غیر منقوط ہیں۔ آئیے اب کلام دبیر کی طرف۔

ہم طالع ہما مرا وہم رسا ہوا طاؤس کلکِ مدح اُڑا اور ہما ہوا
مطلع ہمارا مطلعِ مہر سما ہوا[۱] اور دودۂ کلام، سراسر ہرا ہوا
مصرع ہوا کہ سرو وہ دارالسلام کا
عطرِ گلِ ارم ہوا حاصل کلام کا

ہوگا عطارد اسم معرّا ہمارا کس کس کا اس طرح کا مسلّم ہوا کلام
روک آہ کلک کو کہ ہوا اہل دل کا کام[۱۰۱] اس دم محل دعا کا ہوا کہہ کے اے امام
ہم کو صلہ کلام کا اس دم عطا کرو
للہ کام دل کا ہمارا روا کرو

مرزا دبیر نے غیر منقوط مراثی میں عطارد تخلص نظم کیا ہے۔ یہ مرثیہ ۱۰۱ بند پر مشتمل ہے، ان کا ایک اور غیر منقوط مرثیہ ۔ "مہر علم سرور اکرم ہوا طالع" ہے۔

مہر علم سرور اکرم ہوا طالع ہر ماہِ مرادِ دلِ عالم ہوا طالع
ہر گام علمدار کا ہمدم ہوا طالع اور حاسد کم حوصلہ کا کم ہوا طالع
عکس علم و عالم معمور کا عالم
گہہ ماہ کا، گہہ مہر کا، گہہ طور کا عالم

یہ مرثیہ ۹۶ بند پر مشتمل ہے۔

ان معتبر، معزز اور مستند حوالوں کے بعد صفدر علی حسرتی کا غیر منقوط مرثیہ ملاحظہ ہو۔ جسے پڑھ کر حسرتی کا مقام متعین کرنے میں قطعاً کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

اللہ لا الہ ہے، واللہ ہے احد اللہ کا کلام ہے اللہ الصمد
کس کا درِ کرم سے ہوا ہے سوال رد[۱] اے داد اس دعائے دلی ہے کہ المدد

مداح مدعی ہو ادائے کلام کا
لالہ کرے گماں گلِ دارالسلام کا

ہر دل اسی کا گھر ہے مگر وہ ہے لامکاں
اک وہم ہے کہ کر سکے ادراک کام واں
وہ اور ہو رسائی ادراک الاماں
ہمدم احاطہ اس کے سراسر ہے اک گماں [۳]
واں عالم ہراس ہے، ہر سو ہراس ہے
اک سعیٔ لاحصول عدوئے حواس ہے

اللہ کا رسول ہے گھر علم کا اگر
حکم رسولؐ ہے کہ علیؑ اس مکاں کا در
احساس علم کی ہے کمی کا کہ ہے کسر
دل ہے مصر کہ آلِ محمد کی مدح کر [۹]
مداح ملک آلِ رسولؐ کرام ہے
اس دور کے امام سے روئے کلام ہے

ہو گرم معرکہ ہوسِ ملک کے لئے
آل رسول اس کو گوارا کہاں کرے
سرگردگیٔ ملک کو ٹھوکر سے مار کے
کس حوصلے سے سارے مراحل وہ طے کئے [۱۳]
ہے سالمیٔ ملک کی روح رواں، امام
دراصل ہے مدرس صلح و اماں امام

اُٹھا وہی سوال کہ ہر اک سے عہد لو
حل مدعائے دل کے لئے ہر عمل کرو
ردِ اصول امر ہو، کوئی وہ امر ہو
ہوگا وہ کس طرح سے گوارا امام کو [۲۶]
روداد ہے گواہ کہ اصل الاصول سے
ہٹ کر عمل ہوا ہے صراطِ رسولؐ سے

گائے گئے ہوس کی وہ لے سے ملا کے راگ
ہے حاصل عمل کہ لگائی گئی وہ آگ
اہل حرم کا اور لٹے اس طرح سہاگ
صدآہ ہو گئی ہے اساسی مدام لاگ [۲۹]
حاصل مآلِ کار ہے ردِ اصول کا
گھر کس طرح سے وائے لٹا ہے رسولؐ کا

حکم امام سے وہ ہوا کارواں رواں
آگے ملا عدو کا وہ سالار حُر وہاں
روکا، کہا کہ عہد کرو اور لے اماں
ہوگا عدول حکم کا حاصل صلہ گراں [۳۷]

اور سدِّ راہ، معرکہ آرا عدو ہو، آہ
آلِ رسولؐ اور وہ سوکھا گلو ہو آہ

اس مرثیے میں حمد باری تعالیٰ، نعت رسولؐ، منقبت علیؑ، یزید کی تخت نشینی کے بعد اسلامی دنیا کے حالات، حسینؑ کا سفر، حر کا راستہ روکنا، حضرت مسلم کی کوفے میں شہادت، امام کا کربلا میں وارد ہونا، حضرت عباسؑ کا میدان میں جانا، شہادت حسینؑ، اور تاریخ شہادت کو غیر منقوط الفاظ میں نظم کیا گیا ہے۔

لو سوئے معرکہ وہ علمدار ہے رواں ۔۔۔ سہما ہوا عدو ہے دگرگوں ہے واں سماں
وہ دل کے حوصلے وہ رہے ولولے کہاں[41] ۔۔۔ روئے گروہِ اعدا سے ہے اُڑ رہا دھواں
سہما ہر اک عدو ہے کہ اس طرح وار سے
سہمی ہوئی ہے مرگ دلاور کے وار سے

سر گرداں ہر عدو ہے کہ عالم ہوا دگر ۔۔۔ سہما ہوا ہے معرکہ ہو کس طرح سے سر
رائے عدو کی واں ہوئی اس طرح سے اگر[42] ۔۔۔ کر لو حصار گرد دلاور اِدھر اُدھر
الحاصل کلام کہ دلدار لاالہ
اللہ سے ملا وہ علمدار لاالہ

روداد ہے گواہ کوئی اس کے ماسوا ۔۔۔ عالم ہو سوگوار کوئی اس طرح مٹا
مرگ امام درس ہے اک لاالہ کا[44] ۔۔۔ سر دے کے اس طرح سے وہ اللہ سے ملا
مرگ رہِ الہ کی عمر دوام ہے
اکسٹھواں سال، سالِ وصالِ امام ہے

اے اہل دل سوال ہے اک دل کا واسطہ ۔۔۔ مہماں سے اسطرح کوئی دکھلائے جبہہ
اہل حرم سے اور ہو معصوم سے گلہ[45] ۔۔۔ لے اوراس طرح عدم عہد کا صلہ
اک کارواں کرے گا ارادہ لڑائی کا
ہے مدعا عدو کا اعادہ لڑائی کا

اعداد واں گروہ عدو طالع ورم ۔۔۔ دو صدد ہم ملا کے وہ اٹھارہ صد دہم
ہمراہ واں امام کے ہردم مع حرم[46] ۔۔۔ اٹھارہ دس ملا کے کرو اس کو سو سے کم

وہم و گماں سے دور ہے آلِ رسول کا
ہوگا گماں لڑائی کا اس دل ملول کا
آلودہ آہ گرد سے مسلم کا ہو لہو مسلم کی ہو حسام مسلماں کا ہو لہو
مسرور، آہ دل کو کرے اس طرح عدو[۴۷] معصوم کا لہو ہو روا، حاصلِ علو
دربِ سرِامام ہے دعوائے لاالہ
سر ہے وہی کہ ہو سر سودائے لاالہ

حسرتی کے اس مرثیے کی یافت پر ڈاکٹر ظفر ہاشمی شکریے کے مستحق ہیں۔

☆☆☆☆☆

کامل جوناگڑھی:-

ولادت ۱۸۸۹ء وفات ۱۹۷۷ء

نام غلام علی خان۔ تخلص کامل۔ جائے ولادت جونا گڑھ۔ والد گرامی کا نام غلام حسین خان، شجرۂ نسب حضرت محمد حنفیہ ابن علیؑ سے ملتا ہے۔ (بہ ایں سبب نام کے ساتھ علوی ہونا چاہئے تھا۔ ہوسکتا ہے اجداد میں کسی کو خان یا خان بہادر کا خطاب ملا ہو—(یہ قیاس ہے تاریخ نہیں)۔ عمر سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ ابتدا میں سید کاتب علی کاتب مدراسی سے کلام پر اصلاح لیتے رہے۔ (کاتب مدراسی میر انیس کے شاگرد کہلاتے تھے) کاتب مدراسی کے بعد طالب دہلوی کی باقاعدہ شاگردی کی، طالب دہلوی سرکاری طبیب اور درباری شاعر تھے اور غزل میں ذوق کے اور مرثیے میں انیس کے شاگرد تھے۔ اس قسم کے حقائق یہ ثابت کرتے ہیں کہ" بگڑا شاعر مرثیہ گو" مفلوج اذہان کی اختراع ہے جبکہ صداقت یہ ہے کہ اُستادِ شاہ ذوق جیسے باکمال شاعر بھی مرثیہ نگار ہونے کے باوجود، مرثیہ کے شاعر نہیں کہلائے اور غزل اور قصیدے کے شاعر رہے —

ایک وقائع نگار نے کامل جونا گڑھی کے استاد طالب دہلوی کے لئے" درباری شاعر" کے الفاظ استعمال کئے ہیں جبکہ دلی دربار تو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں فرزندان زمین کی ناکامی کے بعد غاصبوں نے اُجاڑ دیا تھا لہٰذا یہاں دربار سے مراد نواب جونا گڑھ کا دربار ہوگا —

صاحبو! میں اپنی اس کمزوری کو تسلیم کرتا ہوں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جسے غدر کہا گیا۔ اس جنگ آزادی کی تفصیلات اس وقت نظر سے گذریں جب میں اپنی کتاب" اس گھر کو

آگ لگ گئی" کی تکمیل کر رہا تھا۔ اس وقت سے لفظ دربار سنتے ہی یا تو اس اُجڑے دربار کا تصور ذہن میں آتا ہے جو ۱۸۵۷ء میں اُجڑا، یا پھر وہ دربار ذہن میں آتا ہے جہاں شراب کے نشے میں ڈوبا ہوا۔ اقتدار کی رعونت دماغ میں بسائے ایک جابر بادشاہ تخت پر بیٹھا تھا اور آلِ رسولؐ رسن بستہ اس مردود کے دربار میں اسیروں کی حیثیت سے کھڑی تھی اور بادشاہ کہہ رہا تھا۔

"آج میرے وہ اجداد جنہیں علیؑ نے بدر و احد میں قتل کیا تھا
زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ میں نے آلِ رسولؐ اور اولادِ علیؑ سے کیسا بدلہ
لیا ہے"

جملہ ہائے معترضہ کی معذت، بات تھی طالبؔ دہلوی کی جو نواب صاحب جوناگڑھ کے درباری شاعر تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد کاملؔ جوناگڑھی کو درباری شاعر مقرر کیا گیا — ریاست جوناگڑھ کے زوال کے بعد ولی عہد محمد، ہابت خان ثالث نے کاملؔ جوناگڑھی کو جو اجمیر چلے گئے تھے پھر جوناگڑھ بلایا اور اُن کے شاگرد ہوئے۔

کامل صاحب کی جو تصانیف شائع ہو چکی ہیں وہ یہ ہیں:—

دیوان کامل نعتیہ، ماہ کامل غیر منقوط کلام، دیوان غزلیات، ریاض دار السلام اور رحیق غم (دونوں سلاموں کے مجموعے ہیں)۔ دو مجموعے رباعیوں کے "عطیہ پیغمبر" اور "پیغام رسول" ہیں۔ چار مثنویاں مظہر علم دین، بادشاہ دو عالم، حقیقت اخلاق، ملبوس سخا، شائع ہو چکی ہیں۔ نعرۂ حق، مسدسِ کامل۔ مثنوی طالع الانوار۔ اور علم موسیقی و شاعری پر بھی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ "غم معصومین" میں مرزا اوجؔ کے سلام پر تضمین ہے جس میں ایک سو انتیس (۱۲۹) اشعار پر مصرعے لگائے ہیں۔ رباعیات کامل میں ۱۲۷ رباعیات شامل ہیں۔

مرثیوں کی دو جلدیں "سرمایہ غم" اور کارنامہ غم ہیں۔ سرمایہ غم میں ۱۳۵ بند کا ایک غیر منقوط مرثیہ بھی شامل ہیں یہ ساری کتابیں ایک حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ حضرت کاملؔ جوناگڑھی ایک قادر الکلام شاعر تھے۔

یہ جان کر دکھ بھی ہوتا ہے اور حیرت بھی کہ ایک اُستاد شاعر نے جسے کلام پر بھی قدرت ہے اور الفاظ پر بھی اور جو جملہ اصناف سخن میں اپنا لوہا منوا چکا ہو وہ کراچی آنے کے بعد گوشہ نشینی کی زندگی گذاردے جبکہ کراچی میں ہر اُس صنف سخن کی پذیرائی ہوتی تھی جس میں کاملؔ جوناگڑھی کامل

تھے۔ مرثیے کا جو ماحول دبستان کراچی میں قام ہوا وہ یقیناً اُنہیں جوناگڑھ میں نہیں ملا ہوگا۔ یہ سوال یا تو کراچی میں مرثیے کے ناقدین کے ذہن میں نہیں آیا یا ضابطۂ تحریر میں نہیں آسکا۔ لندن میں رہنے والا مجھ ایسا ناتواں انسان تو کبھی بھی اس سوال کا جواب نہیں ڈھونڈ سکے گا۔

حضرت کامل کے دو مرثیے کراچی سے بھی شائع ہوئے ہیں۔ کامل صاحب ایک طرف تو مرزا اوجؔ کے کلام پر نظمیں لکھتے نظر آتے ہیں گویا وہ مرزا دبیر، اور مرزا اوج کے مکتبۂ فکر سے متعلق تھے جو مرثیے کو جدید راہوں پر رواں دواں دیکھنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف حضرت کامل جوناگڑھی کے مرثیوں میں قدیم مرثیوں کے سارے لوازم موجود ہیں البتہ تاریخی روایات صحت کے ساتھ نظم کی گئی ہیں ـــ مثلاً امام حسین مکّہ آئے ہیں لیکن حج کو عمرہ سے بدل کر سفر کا ارادہ کرتے ہیں۔

حسینؑ ابن علیؑ آئے ہیں مدینے سے — علیؑ کے ہاتھ کا قرآں لگائے سینے سے
طواف کعبہ بجالائے ہیں قرینے سے — خدا کے گھر میں ہیں مہمان دو مہینے سے
مدینہ چھوڑا جو اشرار کی شرارت سے
مشرّف اہل حرم کو کیا زیارت سے

اہل مکّہ آپ کو سفر ملتوی کرنے کو کہتے ہیں۔ امام وجہ سفر بتاتے ہیں۔

شریرِ حج کے بہانے سے ہیں کچھ آئے ہوئے — پیام بیعتِ میخوار بھی ہیں لائے ہوئے
ہیں اہل بیت کی جو منزلت بھلائے ہوئے — خدا کے گھر میں بھی ہیں ابرِ ظلم چھائے ہوئے
ہمیں منانے کی کد کر رہے ہیں کعبے میں
شقی بتوں کی طرح بھر رہے ہیں کعبے میں

مکہ معظمہ سے امام حسین کی روانگی کا منظر کچھ اس طرح لکھتے ہیں ـ

حسینؑ جاتے ہیں کعبہ سے کربلا کی طرف — خدا کے گھر سے چلے ہیں مگر خدا کی طرف
بڑھے ہیں رکھ کے ہتھیلی پہ سر قضا کی طرف — قدم ہے حج سے بھی آگے رہِ رضا کی طرف
خوشی اب اہل حرم کے نہیں کسی گھر میں
سیاہ پوش ہے کعبہ فراق سرور میں
وہ راہ لی کہ جسے پائے خضر پا نہ سکے — لیا وہ بار، جسے آسماں اُٹھا نہ سکے

وہاں گئے کہ جہاں تک مسیح جا نہ سکے وہ اوج پائے کہ موسیٰ کے ہاتھ آ نہ سکے
مصیبتوں کی خموشی سے ختم راتیں کیں
دمِ وغا سرِ میداں خدا سے باتیں کیں

غم حسین، عزائے حسینی اور کربلا سے عقیدت پر کسی نے اعتراض کیا تو کاملؔ اپنا موقف بتاتے ہیں۔

جو ہوش میں ہیں، مجھے بیخودی میں رہنے دیں جو کچھ کہوں میں خدا کے لئے وہ کہنے دیں
غم حسین سے خوش ہوں تو غم یہ سہنے دیں وہ آبدیدہ نہ ہوں اشک میرے بہنے دیں
نہال کریں جو ہنسی آئے میرے رونے پر
رلائے گی یہ ہنسی درد دل میں ہونے پر

☆☆☆☆☆

میر لائق لکھنوی:-

ولادت ۱۸۹۴ء ۔وفات ۱۹۷۷ء

نام سید محمد ہادی ۔تخلص لائقؔ ۔میر انیسؔ کے نواسے۔ میر عارفؔ کے فرزند۔ خاندان انیسؔ کے آخری مرثیہ گو شاعر تھے۔اپنی دادی یعنی میر نفیسؔ کی دختر کی آغوش میں تربیت پائی۔ والد گرامی میر عارفؔ اور خاندان کے دیگر بزرگوں کی شفقت اور رہنمائی میں پروان چڑھے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ علویہ لکھنؤ میں ہوئی۔انگریزی تعلیم کے لئے کوئنس اینگلو کالج میں داخل ہوئے۔ وہاں سے مہاراجہ محمود آباد سر علی محمد خان اپنے کالج میں تعلیم دلانے کے لئے لے گئے لیکن لائق کو اپنے گھر میں علم و ادب کے روشن چراغوں کی روشنی کے مقابلے میں مہاراجہ صاحب کی مہربانی اور شفقت دل کو نہ بھائی اور واپس لکھنؤ چلے آئے۔لائقؔ جس خانوادے کے چشم و چراغ تھے اُس کے با کمال بزرگوں کو دس پشتوں سے مداحیٔ شبیر کا شرف حاصل تھا۔صبح سے شام تک جس گھرانے میں نواسۂ رسولؐ، امام حسینؑ کے ذکر کا اُجالا رہتا ہو، جہاں مرثیہ زندگی کے لوازم کا ایک جز و لازمی ہو، شعر و شاعری کی باتیں ہوتی ہوں، اس گھر میں رہنے والا ہر بچہ مرثیہ گوئی کی طرف راغب نہ ہو تو پھر کون ہوگا۔میر لائقؔ بھی خاندانی روایت کے تحت مرثیہ گوئی کی طرف اوائل عمر میں راغب ہو گئے۔ابتدا مرثیہ خوانی سے کی۔یہ فن اپنے والد گرامی میر عارفؔ سے سیکھا اور اُن کی پیش خوانی

میں لکھنؤ اور قرب وجوار میں پڑھنے لگے۔ ۱۹۱۶ء میں جب میر لائق کی عمر ۲۲ برس کی تھی تو میر عارف کا انتقال ہوگیا۔ میر لائق اپنے بڑے بھائی بابو فائق کے ساتھ اور پھر تنہا ذاکری کرتے رہے۔ میر لائق نے مرثیوں کے علاوہ سلام بھی کہے اور رباعیات بھی — اُنہیں اپنے اسلاف پر بجا طور پر ناز تھا۔ ایک رباعی میں اس کا اظہار ملتا ہے۔

تیری فکر رسا پر سو برس سے فکر جاری ہے
یہ کہتا ہے کہ ہم سمجھے، وہ کہتا ہے کہ ہم سمجھے
انیسِ خوش بیاں تیرے لئے یہ قول لائق ہے
بہت سمجھا ہے تجھ کو سب نے لیکن پھر بھی کم سمجھے

میر لائق کے سامنے اُن کے اپنے اسلاف روشنیوں کے شہروں کی طرح تھے اور میر لائق ایک ایک شہر پر فخر کرتے تھے ۔

کب میں نے کہا کس سے فائق ہوں میں ہاں مدحتِ شبیر کا شائق ہوں میں
مداحِ امام سب ہیں بہتر مجھ سے دراصل برائے نام لائق ہوں میں

میر لائق مرثیہ خوانی اور مرثیہ گوئی میں خود کو اسلاف کے سامنے ہیچ سمجھتے تھے اور بڑی انکساری سے کہا کرتے تھے ”میں کیا اور میرا پڑھنا کیا“ اور یہ کہہ کر اکثر اپنا کلام سنانے کی بجائے خاندان کے بزرگ شعراء کا کلام سناتے۔ اور بزرگوں کی مرثیہ خوانی کے ڈھنگ الگ الگ طریقوں سے پڑھ کر بتاتے تھے —— یہ فطری بات ہے کہ اُن کے مراثی میں کہیں انیس کا رنگ ہے تو کہیں خلیق کا، کہیں عارف جھلکتے ہیں تو کہیں فائق نظر آتے ہیں — اس طرح وہ انیسی مرثیے کے حصار میں ہی رہے۔ اُن کے ایک مرثیے کے چند بند ملاحظہ ہوں ۔

فزوں ہے دفترِ شرح و بیاں سے شانِ علیؑ حبیبِ ایزدِ اکبر ہے مدح خوانِ علیؑ
خدا رسول ہیں واللہ قدر دانِ علیؑ رسولِ حق کی ہے گویاں زباں، زبانِ علیؑ
کلام حق ہے، خدا کی قسم کلام اُن کا
عصائے پیر ہے، تیغِ جواں ہے نام اُن کا

علیؑ کے نام میں نام خدا یہ ہے تاثیر کہ گرتے گرتے سنبھل جاتے ہیں صغیر و کبیر
علیؑ کو رکھتا ہے محبوب آپ ربِ قدیر خدا کے عاشقِ بے مثل ہیں جنابِ امیر

خدا کے نام پہ یہ جان و دل سے قرباں ہیں
تمام خلقِ خدا پر علیؑ کے احساں ہیں
قسم خدا کی یہ بیت خدا کے ہیں مولود علیؑ ہیں قبلۂ ایمان و کعبۂ مقصود
اُنہیں نے روز تولد کئے خدا کو سجود جھکایا سر نہیں آگے کسی کے جز معبود
علیؑ نے جلوہ توحید جب دکھایا تھا
بتوں نے سجدۂ خالق میں سر جھکایا ہے
کروں سخا و عطا کا میں ان کے کیا مذکور ہے اُن کا جود و سخا دو جہان میں مشہور
کہ راہ حق میں دیا مال و جان حد مقدور حسنؑ حسینؑ سے فرزند تھے جو آنکھوں کا نور
خدا کی راہ میں دونوں کو جب نثار کیا
گناہگار کو دوزخ سے رستگار کیا
خدا کی راہ میں جو کچھ تھا کردیا وہ نثار ملاحظہ نہ کیا اپنی جان کا زنہار
نبی کے فرش پہ سوئے جو حیدر کرار تھا آپ کرتا مباہات ایزدِ غفار
ملائک اُن کے مناقب بیان کرتے تھے
گُلِ مراد سے دامن کو اپنے بھرتے ہیں
☆☆☆☆☆

شہید لکھنوی:-

ولادت (مصدقہ تاریخ نہیں مل سکی)۔ وفات ۱۹۷۷ء

نام مرزا صادق حسین۔ تخلص شہید۔ حضرت شدید لکھنوی کے شاگرد تھے۔ ایک عرصہ قدیم مرثیے کی ڈگر پر قائم رہے، لیکن ۱۹۶۶ء میں اُن کے مرثیے میں کہیں کہیں نئی راہیں نظر آئیں۔ اُن کے ایک مرثیے ''دعوت عمل'' میں جوشؔ اور نجم آفندی کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔

کچھ خبر ہے اے غلامانِ امام مشرقین کج روی سے ہے تمہاری انبیاء میں شور شین
شرم سے سر خم کئے ہیں فاتح بدر و حنین مضطرب ہے قلب احمدؐ نوحہ خواں صبر حسینؑ
جو ہجوم غم میں بھی رویا نہ اپنے لال پر
آج وہ آنسو بہاتا ہے تمہارے حال پر

یہ کہنا کہ حضرت شہید لکھنوی کے اس بند پر جوشؔ و نجمؔ کے اثرات نمایاں ہیں اس کے معنی یہ نہیں کہ حضرت شہید لکھنوی نے جوشؔ اور نجمؔ کی نقل کی بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جوشؔ اور نجمؔ نے عزاداران حسینؑ یا مسلک حسینؑ پر گامزن لوگوں کو جھنجھوڑا ہے حضرت شہید بھی اس بانگ درا کے قائل ہیں اور جو آواز جوشؔ اور نجمؔ نے بلند کی تھی شہید لکھنوی نے حق کی ان آوازوں میں اپنی آواز ملائی ہے۔ یہ ۔ ''لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا'' والی صورت حال ہے جس کے لئے جدید مرثیہ حضرت شہید لکھنوی کو بھی سلام کرے گا — البتہ اس بند کا تیسرا مصرع ذہن کو جھٹکا دیتا ہے ۔ ''شرم سے سرخم کئے ہیں فاتح بدر وحُنین'' اساتذہ اس پر توجہ فرمائیں۔ مولا کو ہماری بداعمالیوں سے یقیناً دکھ ہوگا۔ قلق ہوگا مگر جن کے عمل اور کردار کو تحفظِ الٰہی میسّر ہو اُن کے لئے ''شرمندگی'' کا لفظ کہیں (خاکم بدہن) توہین کے زمرے میں تو نہیں آجائے گا؟

ہر چند کہ حضرت شہید لکھنوی، لکھنو میں قیام پذیر تھے مگر اُن کے مرثیے اور اُن کی مصروفیات کی اطلاع مرثیہ کی دنیا والوں کو ہوتی رہتی تھیں — مثلاً لکھنؤ میں منعقد ہونے والی مجالس اپریل ۱۹۷۵ء میں مرثیہ خوانی کا پروگرام، جس میں حضرت شہید لکھنوی کا اسم گرامی مرثیہ خوانوں اور مرثیہ نگاروں کی فہرست میں درج ہے، کراچی اور کراچی سے لندن اور لندن سے امریکہ تک پہنچا، اسی طرح ۔ ''بہارِ خلد شہادت ہیں شاہ کے انصار'' مرثیہ ۱۹۶۳ء میں کہا۔ اور ۔ ''صحن عالم میں بہر رنگ عیاں ہوتی ہے رات'' ۱۹۶۴ء میں کہا۔ ۔ میں بلبل ریاضِ ثنائے رسول ہوں ۱۹۶۷ء میں کہا۔ یہ سارا ریکارڈ محفوظ ہوگیا ہے لیکن شہید لکھنوی نے کل کتنے مرثیے کہے؟ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مرثیے کہاں اور کس حد تک محفوظ ہیں؟ ایسے سوالات ہیں جن پر ناقدین رثائی ادب کو کام کرنا ہوگا۔

☆☆☆☆☆

شدید لکھنوی:-

ولادت ۱۹۰۱ء۔ وفات ۱۹۷۸ء

نام سید سجاد حسین۔ تخلص شدیدؔ۔ وطن لکھنؤ۔ دبستان عشقؔ کے شاعر، پیارے صاحب رشیدؔ کے نواسے — گویا شمس و قمر دونوں سے اکتسابِ نور کیا۔

پیارے صاحب رشیدؔ اور خاندان انیسؔ سے تعلق مرثیے کی دنیا میں شمس و قمر مثال ہونے

والی بات ہے۔ دوسری اہم پہچان یہ کہ حضرت نسیم امروہوی کے ایک ہونہار شاگرد منظور رائے پوری نے ۱۹۶۲ء میں کہے ہوئے مرثیے میں، مرثیے کی منظوم تاریخ لکھی تھی۔ منظور رائے پوری کے بعد میر رضی میرؔ اور ساحر لکھنوی نے بھی کراچی میں اسی انداز کے مرثیے کہے۔ منظور رائے پوری کا مرثیہ ''واردات قلب کی تصویر مرثیہ'' ۱۱۲ بندوں پر مشتمل ہے۔ اس مرثیے میں برصغیر کے مشہور اور اہم شعرا کا ذکر ہے۔ ان سب سے پہلے حضرت شدید لکھنوی نے اس نہج کے منظوم مرثیے کی ابتدا کی تھی جسے منظورؔ رائے پوری کے مرثیے کے تذکرے میں تسلیم کیا گیا ہے۔ شدید لکھنوی نے جو پہل کی تھی وہ اپنی نسبتوں پر تفاخر کا اعلان بھی تھا۔

میں سالکِ مسالکِ عشقؔ و انیسؔ ہوں میں پیروِ تعشقؔ و اُنسؔ و نفیسؔ ہوں
میں ورثہ دارِ خاص رشیدؔ و رئیسؔ ہوں میں منزلِ عروجؔ زبانِ سلیسؔ ہوں
روشن میرے کلام میں دونوں کی شان ہے
میرا ہے یہ بھی، وہ بھی میرا خاندان ہے

گر عشقؔ سے ہے مجھ کو تعشقؔ تو ہے بجا اُنسؔ و انیسؔ سے ہے تو رشتے کا مقتضا
مجھ سے زیادہ کون ہے عارف نفیسؔ کا کیونکر نہ ہو ادیب، ادب پر جو ہو فدا
مدحت سرائے آل، بہ طرزِ جدیدؔ ہوں
نخلِ وحیدؔ باغِ جنابِ رشیدؔ ہوں

فائزؔ ہوں مدحِ آلِ رسالت مآب سے فائقؔ ہوں اُن گھروں کی طرف انتساب سے
صابرؔ ہوں خوف کھاتا نہیں انقلاب سے ہوں ہم جلیسِ صبر بڑی آب و تاب سے
کیونکر قسیمؔ ہوں نہ مذاقِ سلیمؔ کا
اک کوہ باوقار ہوں رنگِ قدیمؔ کا

مانوسؔ میں ازل سے ہوں ذکرِ حسینؑ سے زائد ہوا طفیلِ شہِ مشرقین سے
واصف کیا خدا نے مجھے زیب وزین سے واقف ہوں رتبۂ شہِ بدر و حنین سے
مجھ ہی پہ خاتمہ ہے زبانِ سلیسؔ کا
مجلس بڑھی تو مرتبہ پایا جلیسؔ کا

میں بچپنے سے عاشقِ ربِّ مجیدؔ ہوں اللہ ہے علیمؔ ذکیؔ و سعیدؔ ہوں

حق کا ثنا گسار نہ کیوں ہوں، حمیدؔ ہوں مونسؔ ہوں خاندان میں سب کا فریدؔ ہوں
ہوگی شکست، پہلے ہی سے دل میں جان لے
دم جس کسی میں ہو وہ میرا امتحان لے

شاگرد تھے انیسؔ سخنور کے میرے جَد عمو نے بھی نفیسؔ سے کاملؔ سے لی مدد
والد، کہ عشق آلِ محمد کی تھی نہ حد مسند ملی رشیدؔ کی کیوں ہو نہ مستند
اَب ہے مجھی کو زیب، وراثت رئیسؔ کی
نانا نواسے، نانی تھیں پھوپھی انیسؔ کی

اب اہلِ بزم ہو کے مؤدّبؔ سُنیں ذرا مقصود آج بعض بزرگوں کی ہے ثنا
رتبہ بہت بلند ہے آلِ رسول کا مدحت سرائیوں سے بڑھا اور مرتبا
پایا یہ فیض مدح سخنور بھی ہوگئے
مقبولِ بارگاہِ پیمبرؐ بھی ہوگئے

ہشیار اے شدیدؔ، مہذّبؔ کلام ہو طے باصد احترام ادب کا مقام ہو
طورِ حسنؔ کے منزلِ احسنؔ تمام ہو ظاہر ہر اک پہ فرقِ غلام و امام ہو
چھٹنے نہ پائے تجھ سے کبھی راہ خیر کی
یوں کر ثنا کہ مدح نہ ثابت ہو غیر کی

اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں کہ شدیدؔ لکھنوی رنگِ انیس کے شعوری طور پر مقلّد تھے۔ لیکن وہ بھی جدّتیں کرتے رہے ہیں اور اس خیال کے ساتھ جدّتیں کرتے رہے ہیں کہ بزرگوں کے اشعار کی تاسّی بھی ضروری ہے اور اُنہوں نے خود کو رنگ جدید کا شاعر بھی کہنا چاہا ہے جس کی تصدیق نہ اُن کا کلام کرتا ہے اور نہ ہی کسی اہلِ نظر نے اُن کی تائید کی ہے۔ ؎

دیکھو رہے خیال شریعت بدل نہ جائے گو جدّتیں ہوں شعر کی صورت بدل نہ جائے
دنیا کو موہ لو یہ حقیقت بدل نہ جائے پیغمبران شعر کی سیرت بدل نہ جائے

گویا شدیدؔ لکھنوی کی نظر میں اجداد کی شاعری، شریعت کی طرح نا قابلِ ترمیم ہے اور اُن کے اجداد جو پیغمبرانِ شعر تھے اُن کے اشعار اُن پیغمبرانِ شعر کی سیرت تھے جسے تبدیل کرنا بعد

کے آنے والوں کی دسترس میں نہ تھا۔اسی جوش اور روانی میں وہ خود کو جدید بھی کہتے ہیں ۔

کب شاعری گناہ ہے رنگ جدید کی
گر ہو سکے کسی سے تلافی شدید کی

یوں کر شنا کہ مان لیں ہم تجھ کو بے گماں ہوں جدتیں، نہ چھوٹے مگر رنگ خانداں
مثلِ رشید صاف سلاست میں ہوں زباں چن لے انیس و عشق و تعشق کی خوبیاں
رنگ زمانہ کو بھی ذرا دیکھ بھال لے
ان عطروں کا جو ہو سکے جوہر نکال لے

اس بند کا تیسرا مصرع بتا رہا ہے کہ شدید لکھنوی کے پیش نظر اسلاف کی زبان دانی ہے اور مرثیے میں جدت سے وہ یہ مراد لیتے ہیں کہ زبان بدلے گی ،مرثیے کے مواد پر اُن کی نظر نہیں ہے—اس کے باوجود وہ خود بھی باکمال تھے، باکمال شاعروں کے وارث تھے اور باکمال ذخیرۂ شعر کے محافظ تھے جس کا وہ قدم قدم پر احساس کرتے ہیں۔شدید لکھنوی کے مراثی کے دو مجموعے ریاض شدید حصہ اوّل اور ریاض شدید حصہ دوئم ۱۹۶۴ء میں سرفراز پریس لکھنو نے شائع کیے ہیں۔

☆☆☆☆☆

ضیاء الحسن موسوی:- (کراچی)

ولادت ۱۹۲۴ء۔وفات ۱۹۷۸ء

نام ضیاء الحسن، تخلص حسن، نصیر منزل، نخاس، لکھنؤ پیدا ہوئے۔تاریخی نام ذوالفقار حیدر ہے جس کے اعداد ۱۳۴۰ء بنتے ہیں۔نصف صدی پہلے اشراف تاریخی نام ضرور رکھتے تھے۔آج کسی کو پرواہ نہیں ہے— موسوی (نسلِ امام موسیٰ کاظم) یعنی سادات کاظمی گھرانے سے تعلق تھا۔اُن کے والد گرامی سید نجم الحسن موسوی کا پدری سلسلہ علامہ غلام حسین کنتوری تک پہنچتا ہے۔ مادری سلسلے میں سرکار ناصر الملت مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ (صاحب عبقات) کے نواسے اور سعید الملت مولانا سید محمد سعید عبقاتی کے بھانجے تھے۔اس گھرانے کی پہچان ہی علم و ادب ہے۔ضیاء الحسن موسوی کی تعلیم و تربیت خالص علمی ماحول میں ہوئی۔ درس نظامی کی تکمیل کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضل ادب کا امتحان پاس کیا ادب عربی کی تعلیم ڈاکٹر وحید مرزا صدر شعبہ

عربی، لکھنؤ یونیورسٹی اور سرکار نصیر الملت سے حاصل کی۔

حیدر آباد دکن میں مہتمم اوقات، وزارت آبادکاری، اور آخری دنوں میں سیلف گورنمنٹ میں اسسٹنٹ سیکٹری رہے۔ پولیس ایکشن کے بعد حیدر آباد سے کراچی آگئے۔ کچھ دنوں ''زمانہ'' کے ایڈیٹر اور ''المنتظر'' کے نیوز ایڈیٹر رہے۔ بعد میں وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خان نے انہیں بطور خاص وزارت اطلاعات میں انفارمیشن آفیسر مقرر کردیا۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۷ء دو سال سعودی عرب میں پریس اتاشی رہے۔ آخری دنوں میں ''پاکستان المصر ۃ'' کے ایڈیٹر اور شعبہ عربی کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر رہے۔

علم و ادب سے روشن گھرانے میں ولادت اور تعلیم و تربیت پانے والے ادب کے دروازے پر بچپن میں ہی دستک دیا کرتے ہیں۔ ضیاء الحسن موسوی بھی ایسے ہی اشراف گھرانے کے نوجوان تھے۔ پندرہ سال کی عمر میں شاعری شروع کردی۔ پہلی غزل کا ایک شعر ؎

کیوں مجھ کو جلاتے ہیں یہ جلتے ہوئے آنسو
پانی سے کہیں آگ لگائی نہیں جاتی

ضیاء الحسن موسوی کے ماموں حکیم ساجد حسین ساجدؔ، (پیارے صاحب رشیدؔ کے شاگرد) اور چچا ضامنؔ کنتوری کا شمار ممتاز شاعروں میں ہوتا ہے۔ اُنہیں کے فیضِ سخن سے ضیاء الحسن کو ذوق مرثیہ ہوا۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۰ء تک ناصرؔ زید پوری سے فنِ شعر گوئی کی تعلیم حاصل کی۔ ضیاء الحسن موسوی کو نظم و نثر دونوں پر قدرت حاصل تھی۔ نثر میں عربی کے منتخب افسانوں کا ترجمہ 'لال کتاب' کے نام سے ۱۹۵۳ء میں طبع ہوا۔ ''واقعہ کربلا کا معاشی پس منظر''— ''حیات سید سجادؔ'' اور ''علی ابن الحسین'' اُن کی مشہور کتابیں ہیں۔ نظم و نثر کی تقریباً ۱۶ کتابوں کے مصنف ہیں۔

ضیاء الحسن موسوی کا پہلا مرثیہ ''خطبۂ شقشقیہ'' کے عنوان سے تھا۔ مرثیے کا عنوان ہی چونکا دینے والا ہے۔ نہج البلاغہ میں حضرت علی کا ایک خطبہ اسی عنوان سے ہے۔ کراچی میں برسوں ضیاء الحسن موسوی کا ساتھ رہا مگر اتفاق کہ میری نظر سے یہ مرثیہ نہیں گذرا لیکن ضیاء الحسن موسوی کے مزاج شعر گوئی جاننے کی بنیاد پر اندازہ ہے اس مرثیے میں ضیاء الحسن موسوی نے روشنی دین سے لی ہوگی۔

ان کا دوسرا مرثیہ ''غیبتِ امام عصر'' ایک بار پھر چونکا دینے والا عنوان ہے۔ ضیاء الحسن

موسوی عنوانات اور موضوعات مرثیہ سے اپنے اسلوب اور اپنی جداگانہ فکر کو جلا دیتے ہیں اور قاری یا سامع اُن کی انفرادیت کو تسلیم کرنے میں دشواری محسوس نہیں کرتا۔ عربی زبان پر عبور ہونے کے باوجود اور عربی ادب میں مرثیے کی صنف ہونے کے باوجود ضیاء الحسن موسوی اُردو مرثیے میں عربی کے اجنبی یا دشوار الفاظ شامل نہیں کرتے۔ یہی ایک شاعر کی ہنرمندی ہوتی ہے کہ وہ رواں دواں لفظوں کو اسلوب کے تختِ سلیمان پر بٹھا کر بلقیس معنی کے حسن کی آب و تاب سے قاری پر ساحرانہ وجد طاری کر دے۔ ضیاء الحسن موسوی اس جلوہ گری کے ماہر تھے۔

وہ تیغ ہے جو خاصہ داور کا معجزہ بخشش خدا کی، ساقیٔ کوثر کا معجزہ
قرآن جس طرح ہے پیمبر کا معجزہ ہے ذوالفقار حیدرِ صفدر کا معجزہ
تحفے کو دیکھئے کبھی حُسنِ قبول کو
تلوار دی امام کو، قرآں رسول کو

وہ تیغ کبریا کی امانت کہیں جسے وہ تیغ اک ثبوتِ نیابت کہیں جسے
وہ تیغ، جلوہ گاہِ عدالت کہیں جسے وہ تیغ اک گواہِ امامت کہیں جسے
غیروں کے ہاتھ میں جسے جانا حرام ہے
قبضے میں جس جری کے یہ ہو، وہ امام ہے

قدیم مرثیے میں تلوار کی تعریف کم و بیش سب نے کی ہے۔ تلوار کے لئے استعارے استعمال ہوئے ہیں، تشبیہات دی گئی ہیں جو بے مثل و بے نظیر ہیں لیکن ذوالفقار کے لئے "بخشش خدا کی، ساقیٔ کوثر کا معجزہ" جیسے سادہ سے الفاظ اور مطالب میں لاانتہا وسعتیں کم ہی نظر آئی ہیں — تلوار کو کبریا کی امانت، ثبوتِ نیابت، جلوہ گاہِ عدالت اور گواہِ امامت کہہ کر پھول کی پتی سے ہیرے کے جگر کاٹنے والی بات ہے — سادہ سادہ لفظوں کو کیسے کیسے معنی دیدئے ضیاء الحسن موسوی نے — سبحان اللہ!

غیروں کے ہاتھ میں جسے جانا حرام ہے
قبضے میں جس جری کے یہ ہو، وہ امام ہے

مرحبا، صد مرحبا — آفرین، صد آفرین۔ ضیاء الحسن موسوی کا تشخص اُن کے مراثی میں جگہ جگہ نظر آتا ہے —

"امام اور امامت" پر سلیقۂ اظہار دیکھئے ۔

تابع امام ہوتا ہے امرِ الٰہ کا ہے صلح و جنگ اس کے لئے مرضیٔ خدا
آجائے فیض میں جو دوعالم کا مقتدا اس وقت کوئی کر نہیں سکتا مقابلہ
چاہے اگر الٹ دے ورق سطحِ آب کا
ابرو کے بل سے پھیر دے رخ آفتاب کا

لڑنے کی مصلحت نہ ہو گر ہے یہ اور بات طوفانِ انقلاب میں ہو کشتیٔ نجات
ہو جامِ زہر ہی میں اگر قوم کی نجات گر ظاہری شکست سے ہو فتح کائنات
ہر شے پہ اختیار ہو پھر بھی رہے خموش
قبضے میں ذوالفقار ہو پھر بھی رہے خموش

☆☆☆☆☆

سیّد آل رضا:- (کراچی)

ولادت ۱۸۹۶ء وفات ۱۹۷۸ء

نام سید آلِ رضا۔ تخلّص رضا۔ قصبہ نیوتنی ضلع اناؤ یوپی میں ولادت ہوئی۔ آباؤ اجداد کا پیشہ سپاہ گری تھا۔ اُن کے بزرگوں میں سید محمود رضوی، شہنشاہ ہمایوں کے ساتھ نیشاپور سے ہندوستان آئے۔ اُن کی اولاد میں (سید آلِ رضا کے دادا) سید سرفراز علی نے سپہ گری کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کی اُس پلٹن میں شامل تھے جس نے چنہٹ کے مقام پر انگریزی فوجوں کو ۳۰رجون ۱۸۵۷ء کو شکست دی تھی لیکن جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے کمانڈر ان چیف سر کولن کیمبل نے ایک لاکھ سپاہیوں کو لے کر اودھ پر چڑھائی کی تو شاہ اودھ کی گھنگھور، اختری، اور نادری تین پلٹنوں میں پندرہ ہزار سپاہی انگریزوں کی یلغار کا مقابلہ نہ کر سکے۔ انگیزوں نے سید سرفراز علی کی زمینیں ضبط کر لیں اور ایسے ہی حرّیت پرستوں کی زمینیں اُن لوگوں میں تقسیم کر دیں جنھوں نے شاہ اودھ کے خلاف جنگ آزادی میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ اودھ کے اکثر زمیندار اسی طرح تعلقہ دار بنے تھے۔ ن بہت سے لوگوں کو ایسی ہی خدمات کے صلے میں "خان صاحب" اور "خان بہادر" بنایا گیا تھا۔

سید آل رضا کا گھرانا تعلیم یافتہ گھرانا تھا۔ اُن کے والد گرامی جسٹس سید محمد رضا مرحوم

۱۹۲۸ء میں اودھ چیف کورٹ کے اولین پانچ ججوں میں شامل ہوئے اور ۱۹۳۴ء میں سینئر جج کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تو وائسرائے نے انہیں کاؤنسل آف سٹیٹ کا ممبر نامزد کیا۔ سید آل رضا نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ اُن کے دو بھائی سید کاظم رضا اور سید ہاشم رضا پاکستان آ چکے تھے اور بہت اہمیت کے سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔

دونوں بھائیوں کے اصرار پر سید آل رضا بھی پاکستان آ گئے اور کراچی میں آباد ہو گئے اُن کی شاعری کا آغاز پرتاب گڑھ سے ہوا۔ آرزو لکھنوی سے بذریعہ خط و کتابت تلمذ حاصل کیا۔ غزل سے ابتدا کی — اور جب وکالت کے سلسلے میں لکھنؤ آ گئے تو اہل لکھنؤ نے بھی اُن کی شاعری کو تسلیم کیا۔ سید آل رضا کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۲۹ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔ غزلوں کا دوسرا مجموعہ ''غزل معلیٰ'' کے نام سے افکار کراچی نے شائع کیا۔ سید آل رضا کی غزلیں کلاسیکی غزل کی روشنی کا مرکز ہیں لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ اُن کے بعض مصرعوں سے رثائی ادب کی مہک آتی ہے ؎

زباں صرفِ دعا سجدے میں سر اور خاک پر سجدہ
ہوئے ہوں گے کم اتنے خیر مقدم تیغِ قاتل کے

شہیدِ ناز تیری بے گناہی کی شہادت ہے
ہمیشہ کو زمانے بھر کا ماتم دار ہو جانا

اپنی مرثیہ گوئی کے آغاز کا ذکر خود آل رضا صاحب کے اپنے الفاظ میں یوں ہے کہ محرم سے ایک یا دو دن پہلے آل رضا لکھیم پور سے لکھنؤ پہنچے تو لوگوں سے دریافت کیا حسین آباد کی ضریح اُٹھی یا نہیں؟ یہ ضریح ہمیشہ محرم کا چاند ہونے پر اُٹھتی تھی۔ لوگوں نے کہا چاند کا فیصلہ نہیں ہو سکا اس لئے کہ فضا میں بہت گرد و غبار تھا اور اس عالم میں شدید بارش بھی ہوئی۔ آل رضا صاحب کا کہنا ہے کہ اُن کی زبان پر بیساختہ ایک شعر آیا ؎

کتنا پانی ہے جو بے وقت برس جاتا ہے
اور کبھی قافلہ پیاسوں کا ترس جاتا ہے

اور یہیں سے آل رضا کی مرثیہ گوئی شروع ہو گئی۔ سید آل رضا نے پہلا باقاعدہ مرثیہ ۱۹۳۹ء میں کہا ؎

کلمۂ حق کی ہے تحریر دلِ فطرت میں حق پرستی کی ہے تعمیر دلِ فطرت میں

حق نمائی کی ہے تنویر دلِ فطرت میں　　خون ناحق کی ہے تصویر دلِ فطرت میں

کوئی بھی دور زمانے کا جب آجاتا ہے
اک نہ اک رُخ اسی تصویر کا دکھلاتا ہے

بیسویں صدی کے ابتدائی ۳۰/۲۵ سال تک خاندان انیسؔ اور خاندان دبیرؔ کے شاگرد مرثیہ نگار لکھنؤ کی ادبی فضا پر چھائے ہوئے تھے۔ میر انیسؔ کے پوتے دولہا صاحب عروجؔ اور مرزا دبیرؔ کے پوتے طاہر صاحب رفیعؔ جیسے اساتذہ کے علاوہ موذب لکھنوی، مہذب لکھنوی، فائقؔ اور خبیر لکھنوی جیسے شعرا کے پرچم لہرا رہے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں جوشؔ کا مجموعہ ''شعلہ و شبنم'' شائع ہو چکا تھا جس میں سوگوارانِ حسینؑ سے خطاب، ذاکر سے خطاب جیسی نظموں کے جگہ جگہ چرچے تھے۔ آل رضا کے سامنے یہ سارا ماحول تھا، نجمؔ آفندی کی نوحوں کی کتاب ''اشارات غم''، لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی جس کے متعلق آل رضا نے خود اقرار کیا ہے کہ نجمؔ آفندی کے نوحوں نے آل رضا کو مرثیہ گوئی کی فضا دی — نجمؔ کے ایک نوحے کے شعر نے آل رضا کی کایا پلٹ دی اور انہیں روشنی کے ایسے راستے تک پہنچا گیا جو سیدھا مرثیہ کی طرف جاتا تھا، شعر دیکھئے ؎

شمع لے کر رُوئے اکبر دیکھنے بیٹھی تھی ماں
صبح محشر تک ٹھہرنا تھا شب عاشور کو

سید آل رضا نے اپنا پہلا مرثیہ ۳/اپریل ۱۹۳۹ء کو لکھنؤ میں ناظم صاحب کے امام باڑے میں پڑھا اور مسدّس کہہ کر پڑھا۔ یہ وہ وقت تھا جب اکثر و بیشتر اہل زبان حضرات جوشؔ کے کلام کو مسدّس کہہ کر انہیں مرثیہ کی کائنات سے باہر رکھنا چاہ رہے تھے۔ ڈاکٹر ہلال نقوی نے سید آل رضا کے ابتدائی دور کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ

> ''حضرت آل رضا لکھنؤ کی ایک مجلس میں مرثیہ پڑھ کر منبر سے اُترے۔ حضرت قدیمؔ لکھنوی (ابن میر سلیسؔ) مجلس میں تشریف فرما تھے۔ آل رضا صاحب نے اُن سے کہا، آپ کا ارشاد سند ہے۔ کچھ آپ بھی ارشاد فرمائیے۔ حضرت قدیمؔ کا جواب جو ریکارڈ پر ہے وہ یہ تھا ''سبحان اللہ کیا خوب واسوخت پڑھی ہے۔ گویا جوشِ ملیح سے کام لیا''

یہ تھا اُس دور کا لکھنؤ جہاں خود کو منوانا پڑتا تھا اور گہوارۂ علم و ادب لکھنؤ میں یہ مرحلہ

آسان نہ تھا۔ اُن کا پہلا ہی مرثیہ اس قدر کامیاب ہوا کہ دھوم مچ گئی۔ اُن کا دوسرا مرثیہ بعنوان ''شہادت سے پہلے شہادت کے بعد'' ۱۹۴۲ء میں کہا گیا۔ آل رضا اس اعتبار سے پاکستان کے پہلے مرثیہ گو اور مرثیہ خوان ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے بعد کراچی میں عشرہ محرم کے دوران سب سے پہلا مرثیہ سید آل رضا نے پڑھا تھا۔ اس صورت حال پر اُن کی ایک رباعی شاہد ہے ۔

تسکیں دہِ اندوہِ نہاں مجلس ہے غم اپنا بہلتا ہے جہاں مجلس ہے
اللہ رے غریب الوطنی کا عالم ہم پوچھتے پھرتے ہیں کہاں مجلس ہے

معاصرانہ چشمکیں دوسری زبانوں کے اہلِ قلم کے درمیان بھی ہوتی رہی ہیں لیکن ایک دوسرے پر تنقید ہمیشہ تخلیقات یا فن کے حوالے سے ہوئی ہے۔ ذاتیات پر کیچڑ نہیں اُچھالا گیا سوائے سودا کے جنھوں نے ندرت کاشمیری کی بیٹی کے کردار پر کیچڑ اُچھالا تھا۔

ہم اُردو والوں کا ایک زمانے میں یہی مزاج تھا۔ انیس و دبیر کی مثال سامنے ہے۔ ایک دوسرے پر مرثیوں میں شعر کے ذریعے چٹکیاں بھی لی جاتی تھیں اور ایک دوسرے کا احترام ایسا کہ جیسے ایک گھر کے فرد ہوں ـــ ایسی معاصرانہ چشمکوں سے ادب کا بھی معیار بلند ہوتا ہے اور ادیب کا بھی۔ لیکن کوتاہ قامت لوگ اپنے عہد کے اُن لوگوں پر پتھر پھینکتے ہیں جو اپنی تخلیقات اور فن کے حوالے سے بلندیوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ یگانہ کے ساتھ یہی ہوا۔ شاد کے ساتھ یہی ہوا۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اشراف پر انگلیاں اُٹھانے والوں کے نام شاذ و نادر ہی تاریخ میں محفوظ رہتے ہیں ـــ سید آل رضا پر بھی ایک حلقے نے کچھ اعتراضات کیے۔ آل رضا نے اپنے مرثیے ''انیس اہلِ ادب ہے وقارِ منبر کا'' میں کچھ بند کہہ کر معترضین کو خاموش کیا ۔

یہ اعتراض میرے مرثیوں پہ ہے بیکار نہیں ہیں ان میں کہیں شاعری کے نقش و نگار
خدا کا شکر کہ ہے میری کوششوں کا وقار وہ ذکر و فکر، عقیدہ کا جس پہ دار و مدار
سخنوری کا نہ دعویٰ، نہ زعمِ جدت ہے
جو پیش کرتا ہوں نذرانۂ عقیدت ہے

وہ اس زمانے کی قدریں وہ اپنے سحر نگار بسی ہوئی ہے ریاضِ سخن میں تازہ بہار
لگے ہوئے تھے مضامینِ نو کے جب انبار اسی زمانے میں تھی اس طرح کی بھی للکار

"میں آسمان سے لایا ہوں ان زمینوں کو
خبر کرو میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو"

نہ ہوتا آج میرے مرثیے میں یہ مذکور مگر بشر ہوں دُکھے دل نے کردیا مجبور
نہ کیوں یہ سوچ کے بڑھ جائے درگذر کا شعور جفا شعار زمانے کا ہے یہی دستور
وفا کے عرش پہ اہلِ وفا کی بات کرو
براہِ راست رضاؔ کربلا کی بات کرو

کسی بھی تحریک کے دو جزو ہوتے ہیں "تھیوری اور پریکٹس" یعنی پہلا جز و اصول، مسائل کی فرضیاتی تشریح۔ اور دوسرا جزو عمل — مرثیے کے سفر کو آگے بڑھانے کے لئے مرزا اوجؔ، شادؔ، جمیلؔ مظہری، نجم آفندیؔ، دلو ارام کوثری، نے اپنا اپنا حصہ ادا کیا۔ سید آل رضاؔ زرخیز ذہن اور عمیق فکر کے شاعر تھے۔ اُنہوں نے جدید مرثیے کی تھیوری کو نہ صرف سمجھا بلکہ اس کی وکالت بھی کی لیکن عمل میں قدیم مرثیے کے لوازم سے رشتہ نہیں توڑا۔

ہے اس جگہ کا تقاضا، بیان درد بھی ہو جہاں سے نعرہ جُرأت فغانِ درد بھی ہو
جہاں میں فخر کی باتیں، زبانِ درد بھی ہو جو ہے حدیث وفا، داستانِ درد بھی ہو
بیان یوں تو مسدّس میں کیا نہیں ہوتا
جہاں پہ درد نہ ہو، مرثیہ نہیں ہوتا

میرے سر آنکھوں پہ سرداریٔ انیسؔ و دبیرؔ مگر یہ کیا کہ رہوں بس لکیر ہی کا فقیر
نہیں لحاظِ روایت، کسی ہوئی زنجیر مذاقِ اہلِ زمانہ ہے انقلاب پذیر
نئی زمین جو ہوگی، نیا فلک ہوگا
یہ ذکر اپنے طریقے پہ حشر تک ہوگا

قدیم مرثیہ گویوں کا بے مثال کلام سپہرِ مرثیہ گوئی پہ جیسے ماہِ تمام
بہ رنگ روئے زمانہ تھا جس کا خاص مقام نہ ہے، نہ ہوگا کبھی جس کی خوبیوں میں کلام
غلط کہ قابلِ وقعت نہیں سمجھتا ہوں
بس اس کو مالِ غنیمت نہیں سمجھتا ہوں

سکھا گئے ہیں وہ تنظیمِ مرثیہ کا شعور نہ یہ کہ کر گئے ہر جوڑ بند پر مجبور

چلا کرے گا کہاں تک یہ محترم دستور   وہی کہو جو وہ کہتے تھے، ورنہ بزم سے دور
یہ مجلسوں کا تبرک ہے بے شمار بٹے
جو ایک بار بنا ہے وہ بار بار بٹے

''لحاظِ روایت'' لکھنؤ کے اشراف کی پہچان تھی، یہی ''لحاظِ روایت'' سید آل رضا کی زندگی میں بھی نمایاں نظر آیا اور ان کے اس کلام میں بھی جسے بعض ناقدین نے جدید مرثیے میں شامل کرنا چاہا۔ اسی لحاظِ روایت کے سبب یہ جانتے ہوئے بھی کہ ''مذاقِ اہلِ زمانہ ہے انقلاب پذیر'' وہ یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ ''جو ایک بار بنا ہے وہ بار بار بٹے'' — یہ کہنے میں کوئی تصنع یا بناوٹ نہیں تھی، یہ سید آل رضا کے دل کی بات تھی، یہی ان کا مزاج تھا۔ یہی محاظِ روایت ہونا اُن کا ورثہ تھا لیکن جہاں ذہن و فکر کی بات آئی، بیداریٔ شعور کی منزل آئی تو وہ جدید مرثیے کی وکالت کرتے نظر آئے ۔

ہر اک زمانے میں اجزائے مرثیہ بدلے   تھے ایک دور میں ہی مرثیوں کے رنگ نئے
کہو ضرور کہو جو بزرگ کہتے تھے   مگر کچھ اپنی طرف سے بھی خاص بات رہے

اس بند کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے سید آل رضا مرثیے کے چہرے سے گریز کی طرف آ رہے ہوں، اس لئے کہ ایک طرف تو ''وہی کہو جو وہ کہتے تھے ورنہ بزم سے دور'' اور دوسری طرف یہ بیت ۔

کلام غیر کو اپنا لیا تو کیا حاصل
ادل بدل کے وہی رکھ دیا تو کیا حاصل

یہی منزل ہے وسعتِ فکر کی، بیداریٔ شعور کی جہاں ذیل کا بند قدیم و جدید کے درمیان ایک پُل کا کام کرتا ہے ۔

ہمیں ہو اپنے ہی مجلس فروز کام سے کام   نصیب فکر رہے ذکر عصر ساز امام
کھلیں شریعت و انسانیت کے وہ اقدام   لکھا ہو جن پہ مکرر ''حسینؑ اور اسلام''
نئے طریقوں سے تشریح واقعات کریں
جو اب زمانہ سمجھتا ہے ہم وہ بات کریں

اہلِ نظر نے ہمیشہ سید آل رضا کی عظمتِ فکر، شعورِ شعر گوئی۔ ندرتِ خیال، اور قبیلۂ

حرف ولفظ کی سرداری پر اُنہیں سلام کیا ہے۔ اور جوں جوں شعورِ مرثیہ بڑھتا رہے گا سید آل رضا کی عظمت فن سے لوگ آگاہ ہوتے رہیں گے لیکن ان صداقتوں کے باوجود عدل یہی ہوگا کہ اُنہیں جدید مرثیے کا مخلص وکیل کہا جائے، سردار نہیں۔

☆☆☆☆☆

نفیس فتح پوری :- (کراچی)

ولادت ۱۹۱۰ء۔ وفات ۱۹۷۹ء

نام سید انصار حسین، تخلص نفیسؔ، ۔ وطن قصبہ ایرایاں سادات، ضلع فتح پور ہسوہ۔ فتح پور کی مناسبت سے فتح پوری لکھتے تھے۔ تعلیم کے سلسلے میں بڑے بھائی سید ولی حیدر کے ساتھ ریاست جے پور کے شہر گنگاپور گئے، ہربرٹ کالج بوندی (ریاست کوٹا) سے بی۔اے کیا۔۔۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آگئے ہندوستان میں ۱۹۲۹ء میں تعلیم مکمل کر کے ریلوے میں ملازم ہو گئے تھے، پاکستان آئے تو اسی محکمے میں ملازمت مل گئی۔ ۱۹۷۰ء میں ریٹائر ہو گئے۔ کراچی میں آباد ہونے کو پسند کیا۔

شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ ابتدا میں ناشادؔ تخلص رکھا۔ بعد میں نفیسؔ ہو گئے۔۔۔ ۱۹۷۰ء میں پہلا مرثیہ کہا، اس سے قبل غزل کے علاوہ قصیدہ، سلام، نوحہ، ہر صنف سخن میں شعر کہے۔۔۔ پہلا مرثیہ حضرت امام حسین کے احوال پر تھا۔

راہ سخن میں گردِ پسِ کارواں ہوں میں

مرثیہ گوئی میں مرثیے کی قدیم انداز، اور مروجہ لوازم کی پابندی کے ساتھ مرثیہ کہتے تھے۔ قدیم مرثیہ گو اساتذہ کی طرح مرثیے کا عنوان قائم نہیں کرتے تھے بلکہ روایتی انداز میں مرثیہ، چہرے سے شروع کرتے تھے اور پھر قدم بہ قدم اُنہیں راہوں پر آگے بڑھتے تھے جن پر انیسؔ و دبیرؔ کے جلائے ہوئے چراغ روشن تھے، روشن ہیں اور روشن رہیں گے۔

اچھا شاعر اپنے گرد وپیش کے حالات اور عصری تقاضوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس سے متاثر ہو کر اُن مشاہدات کی روح کشید کرتا ہے۔ اسلوب کا سلیقہ ہو تو یہی شاعری نئی شاعری کہلاتی ہے۔ نفیسؔ فتح پوری مشاہدہ بھی کرتے تھے۔ شاید اس مشاہدہ کا عرق بھی نچوڑتے ہوں گے مگر قدیم اور کلاسیکی مرثیے کی راہوں پر آتے ہی اُن کے جدید مشاہدات کی روشنی روایت کے اُجالوں میں

کھو جاتی تھی۔ اُردو مرثیے کے ایک محترم نقاد نے نفیسؔ فتح پوری کے درج ذیل بند کو قدیم و جدید کا امتزاج قرار دیا ہے جبکہ نفیسؔ فتح پوری نے تلوار کی تعریف میں روایت کا چراغ جلایا ہے۔ تلوار کی تعریف میں یہ بند دیکھئے ۔

سبطِ نبیؐ کے قبضے میں کتنی حسیں تھی تیغ　　حقانیت پناہ کی چینِ جبیں تھی تیغ
انسانیت کے حق کی معین و امیں تھی تیغ　　اک برقِ بے پناہ سرِ اہلِ کیں تھی تیغ
کیسے نہ ہو، عطیۂ پروردگار ہے
ہر وار کہہ رہا ہے کہ یہ ذوالفقار ہے

اسی طرح گھوڑے کی تعریف میں ایک بند ہے جو سراسر قدیم مزاج کی عکاسی ہے۔

شبدیز باد پا کو اشارے کی دیر تھی　　ایسے اڑا کہ رُک کے ہوا دیکھنے لگی
ہیبت میں شیر بر تھا اور حُسن میں پری　　سُم کے نشاں سے رن کی زمین کہکشاں بنی
مرکب تھا یا کرشمۂ پروردگار تھا
کیسے نہ ہو "حسینؑ" کا یہ رہوار تھا

البتہ صبح کے منظر کی عکاسی میں اُن کی شاعرانہ مہارت اور کلام کی پختگی کا اعلان ضرور ہے۔ یہ بند پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کو لفظ برتنے کا کتنا سلیقہ ہے۔ صبح کے منظر کو نفیسؔ فتح پوری یوں بیان کرتے ہیں ۔

لیلائے شب نے کی جو مرتب کتابِ صبح　　عالم میں ہر طرف ہوا جاری نصابِ صبح
چھیڑا طیور نغمہ سرانے ربابِ صبح　　ہر ذی حیات ہونے لگا فیضیابِ صبح
ہے شش جہت میں نور شہِ مشرقین کا
میدانِ کربلا میں ہے جلوہ حسینؑ کا

نفیسؔ فتح پوری کو عصری فکر و آگہی سے بالکل علیحدہ بھی نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ مرثیے کے چہرے میں وہ کہیں کہیں ماضی کے چراغوں کی ضیاء میں عصری آگہی کے فانوس روشن کرتے بھی نظر آتے ہیں مگر یہ اُجالا دیرپا نہیں رہتا۔ لوازم مرثیہ کی پابندیاں اس فضا کو کلاسکیت کی طرف لے جاتی ہیں۔ عصری آگہی کے سلسلے میں اُن کا بدلتا لہجہ دیکھئے ۔

کیا معرکے ہوئے حق و باطل کے درمیاں　　انسانیت کے خون کے دریا ہوئے رواں

ہر سمت ظلم و جور کا اِک بحرِ بیکراں جائے پناہ اور نہ کہیں گوشۂ اماں
خوددار تھے جو وقفِ ستم کردیئے گئے
جو سر نہ جھک سکے وہ قلم کردیئے گئے

یہی لہجہ درج ذیل میں بھی سنائی دیتا ہے ۔

کانٹا بھی گل بھی شعلہ وشبنم بھی آدمی شیطاں صفت بھی نازشِ آدم بھی آدمی
ناسورِ جسمِ زیست بھی مرہم بھی آدمی قہر و غضب بھی، خلقِ مجسّم بھی آدمی
کیا طرفہ خوف و زِشت کا یہ امتزاج ہے
کوئی ہے اہرمن کوئی یزداں مزاج ہے

ایک دوسرے مرثیے میں نفیس فتح پوری اور نمایاں نظر آتے ہیں

حریمِ فکر و نظر مجلسِ عزائے حسینؑ چراغِ راہِ عمل ذکرِ پُر ضیائے حسینؑ
نماز و روزہ و سجدہ کی جاں ولائے حسینؑ رہِ نجات کے رہبر نقوشِ پائے حسینؑ
یقیں کروگے اگر کربلا نگاہ میں ہے
کہ ان کے خوں کی کشش ہے جو لاالٰہ میں ہے

ہر اہلِ عقل کے دل میں سما رہے ہیں حسینؑ ہر انجمن کی فضا جگمگا رہے ہیں حسینؑ
جہانِ خفتہ کو پیہم جگا رہے ہیں حسینؑ سرور و کیف کے دریا بہا رہے ہیں حسینؑ
نشاط اشک میں، تسکین قلب آہ میں ہے
ہر ایک غم کا مداوا عزائے شاہ میں ہے

نفیس فتح پوری نے نعت کے اشعار یا نعتیہ بند جہاں جہاں کہے ہیں، مدینے کی گلیوں تک محدود نہیں رہے بلکہ شعور فکر ونظر کی بات کی ہے۔ رسول مقبولؐ کو انسان کامل کے روپ میں دیکھا ہے، آپ کی تشریف آوری کے بعد نظام کائنات میں مستحسن تبدیلیوں کو بتایا ہے ۔

آپ آئے تو جہالت کی گھٹا دور ہوئی کفر کی تیرہ شبی دہر سے کافور ہوئی
خاکِ پا ان کی دوائے دلِ رنجور ہوئی زندگی آپ کے انوار سے معمور ہوئی
قصرِ کردار کی تعمیر کو معمار ملا
ذہن کو راہ ملی، عقل کو معیار ملا

آدمیت کو ملا آپ سے انساں کا جمال رہبرِ ہوش و خرد آپ کے زرّیں اقوال
ذہنِ انسان کو ملی قوت پروازِ خیال آپ سے مسلکِ توحید نے پایا ہے کمال
قُل ھُو اللہ احد کا ہمیں عنوان ملا
حق شناسی کے لئے آپ سے عرفان ملا

نفیسؔ فتح پوری کا پہلا مجموعہ کلام ''افکارِ نفیس'' ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا جس میں سوز و سلام، منقبت اور قصیدوں کے علاوہ اُن کے چار مرثیے بھی شامل ہیں۔

۱۔ راہِ سخن میں گردِ پسِ کارواں ہوں میں (درحالِ امام حسینؑ) ۱۹۷۰ء
۲۔ گلزارِ زیست میں کہیں امن و اماں نہیں (درحالِ امام حسینؑ) ۱۹۷۱ء
۳۔ بزمِ ہستی ہے یہ فیضانِ رسولِ عربی (حضرت علی اکبرؑ) ۱۹۷۲ء
۴۔ حریمِ فکر و نظر مجلس عزائے حسینؑ (حضرت عباسؑ) ۱۹۷۳ء

یہ مجموعہ نفیسؔ فتح پوری نے خود ترتیب دیا تھا جو اُن کی حیات میں شائع ہوا تھا۔

☆☆☆☆☆

منظر عظیمی :- (کراچی)

ولادت ۱۹۰۵ء (حسین گنج، ضلع چھپرہ، بہار)۔ وفات ۱۹۷۹ء (کراچی)

نام منظر عباس، تخلص منظرؔ۔ والد کا اسم گرامی عنایت حسین۔ منظرؔ کے پردادا فقیر حسین عظیمؔ حضرت مرزا دبیرؔ کے شاگرد تھے۔ اسی مناسبت سے منظرؔ نے خود کو عظیمی لکھنا شروع کیا۔۔۔ مکتبی تدریس کے حوالے سے پٹنہ کالج سے انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ تقسیم ملک کے بعد ہجرت کر کے کراچی آگئے، عربی، فارسی اور اُردو کی ابتدائی تعلیم گھر سے حاصل کر کے نکلے تے۔ بخت نے ساتھ دیا اور کراچی میں حضرت مولانا مصطفیٰ جوہر صاحب قبلہ نے گاہے گاہے علم معانی اور بیان سکھایا۔ شاعری میراث میں ملی تھی، پردادا، مرزا دبیرؔ کے شاگرد تھے ہی۔ منظر عظیمی مرزا دبیرؔ کے پوتے مرزا محمد رفیع طاہرؔ کی شاگردی میں آگئے۔۔۔ چراغ فکر تو روشن تھا ہی۔ عظمتوں کا نور ملا تو ذہن میں اُجالا ہو گیا اور ۱۹۲۲ء میں (بعمر ۱۶ سال) پہلا مرثیہ کہا۔

اے بحرِ فکر سیلِ معانی دکھا مجھے

یہ مرثیہ حضرت نوحؑ کے احوال کا ہے، ظاہر ہے کہ گریز کے بعد کربلا پر آئے، جہاں

ماضی میں حضرت نوح کی کشتی گرداب میں پھنس گئی تھی اور پھر خاندان نبوت کا سفینہ ظلم و جور کے گرداب میں پھنس گیا تھا۔

منظر عظمی نے ۱۹۲۲ء سے ۱۹۴۷ء تک بیس مرثیے کہے اور ۱۹۴۷ء میں پاکستان آنے کے بعد تقریباً دو درجن سے زائد مرثیے کہے۔ اُنہوں نے رفقائے حسینؑ پر مرثیے کہے ہیں جو دبستان دبیر کا امتیاز رہا ہے۔ حضرت حبیب ابن مظاہر، زُہیر قین حضرت حرؑ، فرزند حرؑ، جون غلام ابوذر، وہب کلبی، حضرت عابس، نافع ابن ہلال پر علیحدہ علیحدہ مرثیے کہے ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت امام موسیٰ کاظمؑ، امام محمد باقرؑ۔ امام علی تقیؑ، امام حسن عسکری، حضرت ابوطالب، سیدہ فاطمہ زہراؑ، حضرت عباس پر بھی مرثیے کہے ہیں، مولانا ضمیر اختر نقوی نے منظر عظمی کے کلام پر تحقیق کی ہے اور بڑی کاوش سے اُن کے چالیس مراثی اکٹھے کئے ہیں جن میں سے بیس مراثی وہ ہیں جو اُنہوں نے کراچی آنے سے قبل کہے تھے اور بیس مرثیے وہ ہیں جو منظر عظمی نے پاکستان میں کہے ہیں۔

مرزا دبیرؔ کے بعد مرزا اوجؔ اور دبستان دبیرؔ کے شاعروں۔ نے کربلا کے مستند واقعات کو نظم کرنے کی جو روایت ڈالی تھی اُسی پر منظر عظمی بھی کاربند نظر آتے ہیں۔ اُن کے مرثیوں میں جو واقعات نظم کئے گئے ہیں وہ مستند حوالوں کے ساتھ ہیں یہاں تک کہ بسا اوقات اُن کا استدلال اور حوالوں پر انحصار شعری حسن سے زیادہ خطیبانہ آہنگ اختیار کر لیتا ہے۔ ذیل میں منظر عظمی کے ایک مرثیے کے کچھ بند نقل کئے جا رہے ہیں۔ اس مرثیے میں منظر عظمی۔ نے ''کوفہ اور ابن زیاد'' کے موضوع پر تبصرہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ وہی کوفی جنہوں نے ایک وقت امام حسینؑ کو ہزاروں کی تعداد میں خط لکھے تھے کہ امام کوفے تشریف لائیں اور اہل کوفہ کی ہدایت فرمائیں لیکن جونہی یزید نے ابن زیاد کو کوفہ کا گورنر بنا کر بھیجا اور ابن زیاد اہل کوفہ سے سختی اور بے رحمی سے پیش آیا تو کوفیوں کا قبلہ بدل گیا حتیٰ کہ امام حسینؑ کے فرستادہ نمائندے حضرت مسلم بن عقیل اور اُن کے بچوں کو کوفہ میں کوئی پناہ دینے والا نہیں تھا اور مسلم بھی قتل کر دئے گئے اور اُن کے بچے بھی — اور پھر انہی کوفیوں کو ابن زیاد نے فوج میں بھرتی کر کے کربلا میں امام حسین کو قتل کرنے کے احکامات لے کر جانے والی فوج کے ساتھ بھیجا — منظر عظمی نے یہ ساری باتیں حوالوں کے ساتھ لکھی ہیں ؎

وہ شہر جس کی امارت پہ تھا شقی مامور وہاں تھے تین گروہوں میں منقسم جمہور

شعار ایک کا تھا پیروئ فسق و فجور تعلقِ اُمراء دوسرے کا تھا دستور
گروہ تیسرا اُن صاحبانِ دل کا تھا
حسینؑ سے جنھیں قلب و نظر کا رشتہ تھا

قلیل گرچہ تھے پہلے گروہ کے افراد مگر شرارت و فتنہ گری کے تھے اُستاد
اُن اہل جاہ و تجمل کی ناخلف اولاد ہوئے حجاز سے کوفہ میں آکے جو آباد
اجارہ داریٔ زر پر نظر جمائے ہوئے
ادائے اجرِ رسالت سے ہاتھ اٹھائے ہوئے

ادھر یہ لوگ تھے جم غفیر اُن کا اُدھر جنھیں نہ راہنما کی نہ راستے کی خبر
یہ تھے بقولِ فرزدق وہ کم سواد بشر بھٹک رہی تھی دوراہے پہ جن کی فکر و نظر
دل اُن کا معترف آقائے خاص و عام کا تھا
اور اُن کی تیغ پہ قبضہ امیر شام کا تھا

غلط ہے ان کا اُن ارباب باصفا پہ قیاس جو اصطفا کو سمجھتے تھے رہبری کی اساس
وہ حق شناس کہ جن کو تھی اُس سے خیر کی آس وجود جس کا تھا حق میں بشر کے خیرالناس
اسیر وہم و گرفتارِ فکرِ خام نہ تھے
خدا کے فضل سے وہ لوگ بے امام نہ تھے

وہ ابن وال و سلیماں رفاعہ، ابراہیم وہ ابنِ نجبہ و مختار سے ذکی و فہیم
ہزار جاں سے جو تھے عاشقِ امامِ کریم ہوئے اسیر و گرفتار صدمہ ہائے عظیم
اسیر ہو کے بھی تھی عظمتِ خیال وہی
رہا انھیں رہِ عرفاں سے اتصال وہی

انھی کی طرح ہوئے چار پانسو افراد مقیدِ غل و زنجیر، صیدِ استبداد
نہ جانے کتنے ہی گھر تھے کہ ہوگئے برباد مگر وہ رہبرِ تقویٰ کہ بندۂ آزاد
نہ ہاتھ لگ سکے جو دشمنانِ داور کے
بچے بہ فیضِ تقیہ خدا خدا کر کے

زہے نصیب اُن افراد کے ہوئے جو رحیل بسوئے ہادیٔ کون و مکاں بصد تعجیل

خوشا وہ لوگ اور اُن کے نقوشِ پائے جلیل نشاں رہی ہے مودت کے حق میں سنگِ میل
صعوبتوں کو بہر گام ٹالنے والے
پہاڑ کاٹ کے رستہ نکالنے والے

اگر یہ نہ بھی بتایا جائے کہ منظر عظیمی کس دبستان مرثیہ سے تعلق رکھتے ہیں تب بھی اُن کا کلام، ذخیرہ الفاظ، بندشیں دبستان دبیر کا پتہ دے رہی ہیں — منظر عظیمی علم عروض کے بھی ماہر تھے۔ منظور رائے پوری نے جو مرثیہ لکھا تھا جس میں اپنے عہد کے تمام شعراء کے نام اُن کی شاعری کے انداز کے حوالے سے نظم کئے تھے۔ منظر عظیمی کے لئے اُنہوں نے کہا تھا ۔

''منظر عروض وقافیہ دانی کے ہم ردیف''

ڈاکٹر صفدر حسین نے (مارچ ۱۹۷۹ء میں) کراچی کے جن مرثیہ نگاروں کو سراہا ہے اُن میں منظر عظیمی کا نام نمایاں ہے — بہر حال منظر عظیمی ایک پختہ گو شاعر — اچھے مرثیہ نگار اور دبستان دبیر کے نمائندے ہیں۔ اُن کا بھی افق مرثیہ کے ایک سورج سے رشتہ ہے۔

☆☆☆☆☆
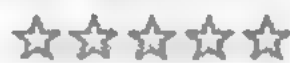
عزّت لکھنوی :- (کراچی)

ولادت ۱۹۲۲ء۔ وفات ۱۹۸۰ء

نام مرزا آغا عزت الزماں، تخلص عزت، جائے ولادت لکھنؤ

ان کے بزرگ اورنگ زیب کی دعوت پر اصفہان سے آکر مغلیہ دربار سے منسلک ہوگئے۔ شاہان اودھ نے ان کی اولاد کو لکھنؤ بلا کر ''داروغہ مصوران شاہی'' کا منصب دیا اور خطابات سے نوازا۔ عزت کی تعلیم وتربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ ۱۹۵۳ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی اور وکالت شروع کردی۔ ۱۹۵۸ء میں کراچی آگئے۔ شاعری گویا ورثے میں ملی تھی۔ حضرت شدید لکھنوی نے طرحی غزلیں کہلوا کر شعر گوئی کی مشق کرائی۔ وحشی فیض آبادی نے مشق سخن کو سنوارا۔ شاہد نقوی نے جلا بخشی۔ اتنے نامی گرامی شعراء کی تربیت کے بعد عزت لکھنوی کو سہ آتشہ ہونا چاہئے تھا جو وہ ہوگئے۔ کراچی میں مختصر مرثیے کہنے کا رواج ہوا تو سب سے پہلے عزت لکھنوی نے یہ عزت پائی۔ اُن کا مرثیہ ''لوگ جب تذکرۂ اہلِ وفا کرتے ہیں'' تھا ۔

لوگ جب تذکرۂ اہلِ وفا کرتے ہیں کربلا دیکھتی رہتی ہے کہ کیا کرتے ہیں

دل میں جذبات کے طوفان اٹھا کرتے ہیں ہم تو عباسؑ ہی عباسؑ کہا کرتے ہیں
نامِ عباسؑ سے جینے کا قرینہ آیا
دل تڑپنے لگا جب نامِ سکینہ آیا

غلبہ پیاس کا جب بالی سکینہ پہ ہوا آئی دروازے پہ خیمے کے یہ دی رو کے صدا
لب پہ جاں آئی ہے پانی مجھے لادیجئے چچاؑ جا چکے نہر پہ عباس تو خوش ہو کے کہا
دھوپ میں مشک و علم لے کے نکلنا دیکھو
ضد میری بن گئی پیاسوں کا سہارا دیکھو

یہ دو بند عزت لکھنوی کی مرثیہ گوئی کا تعارف نہیں ہو سکتے شاید اس کا سبب یہ ہو کہ اشعار سے زیادہ ''مختصر مرثیہ'' اُن کے ذہن پر طاری رہا ہو اس لئے اُنہوں نے Short Hand میں لکھنا شروع کر دیا اور دو بندوں میں چہرہ اور رخصت دو اجزاء نمٹا دیئے۔ میری نظر سے عزت کا کوئی مرثیہ نہیں گذرا حالانکہ اُن کی شاعری کا زیادہ تر حصہ میں اُن سے سن چکا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں بنک میں چیف ایڈمنسٹریو آفیسر تھا۔ عزت لکھنوی کو میں ایک شاعر کی حیثیت سے جانتا تھا۔ ایک دن کسی کام سے یونائیٹڈ بینک گیا تو دیکھا عزت لکھنوی تمام تر لکھنوی آب و تاب کے ساتھ تشریف فرما ہیں۔ پتہ چلا وہ یونائیٹڈ بنک میں افسر ہیں — بس وہیں یہ طے ہو گیا کہ عزت صاحب یونائیٹڈ بنک چھوڑ کر ہمارے بنک میں آجائیں گے اور یہی ہوا کہ اگلے ہفتے وہ میرے ساتھ آ گئے — پھر یوں ہونے لگا کہ جب بھی مجھے فرصت ملتی میں اُنہیں اپنے کمرے میں بلا لیا کرتا تھا اور اُن سے شعر سنا کرتا تھا۔ اسی لئے اگر ان کا ایسا کلام سامنے آئے جو میری نظر سے نہ گذرا ہو یا میں نے نہ سنا ہو تو مجھے عجیب سا لگتا ہے۔ عزت لکھنوی کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ ۴۸ برس کی عمر میں ہمیں چھوڑ گئے۔

☆☆☆☆☆

زیبا ناروی :- (لاہور)

ولادت ۱۸۹۴ء (قصبہ نارہ ضلع مراد آباد)۔ وفات ۱۹۸۰ء

نام سید صغیر حسن عرف محمد اطہر، تخلص زیبا۔ نوح ناروی کے شاگرد تھے اس لئے نام کے ساتھ ناروی لگا۔ اُن کے والد امیر حسن امیر کو بھی شاعری میں دخل تھا۔ پہلی غزل ۱۹۱۳ء میں

کہی اور حضرت نوحؔ ناروی سے اصلاح لی۔ ۱۹۲۹ء تک نوحؔ ناروی سے سلسلہ تلمذ وابستہ رہا۔ ۱۹۲۳ء میں دہلی چلے گئے اور حضرت نوحؔ ناروی کی حیات میں ہی زیبا ناروی اُستاد شاعر بن چکے تھے جس میں نوحؔ ناروی کی شفقت شامل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ نوحؔ ناروی کے انتقال کے بعد زیباؔ کو اُن کا جانشین چنا گیا۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان آ گئے، کرشن نگر لاہور میں قیام کیا۔ پیشے کے حوالے سے طبیب، فکر کے حوالے سے شاعر، مزاجاً دوست نواز، طبعاً حلیم و وضع دار، اس لئے شرفاء ہمیشہ ان کے گرد جمع رہے۔ ۱۹۴۷ء میں دہلی میں اپنا مجموعہ کلام ترتیب دے رہے تھے کہ فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑک اُٹھی۔ حکیم زیبا ناروی تو کسی طرح اس آگ کے شعلوں سے دامن بچا کر لاہور آ گئے مگر اُن کا دیوان، ان کا سارا کلام، اُن کا کل اثاثہ تعصبات کی آندھیاں اُڑا لے گئیں، فسادات کے شعلوں نے جلا دیا۔ لاہور آئے تو از سرِ نو زندگی اور فکر و نظر کا آغاز کیا۔ بے شمار غزلیات کہیں۔ ہزاروں قصائد، منقبتیں اور سلام کہے، پہلا مرثیہ ۱۹۷۶ء میں کہا۔

"تو سن طبع رسا عرصۂ تحریر میں ہے"

میر انیسؔ کے شیدائی ہونے کے باعث اُن کی مرثیہ نگاری میں میر انیسؔ کا رنگ چھلکتا ہے۔ ہیئت کے حوالے سے بھی قدیم مرثیے کے قائل تھے اور اپنے مرثیوں میں قدیم مرثیے کے سارے لوازم کو ملحوظ خاطر رکھتے تھے — اُنہوں نے اور امام حسینؑ کے کردار کی عظمت کو اپنے مرثیے میں یوں بیان کیا ہے۔

وہ حسینؑ ابن علیؑ، دختِ نبیؐ کے پیارے وہ حسینؑ ابن علیؑ جن سے مصائب ہارے
وہ حسینؑ ابن علیؑ جن پہ نچھاور تارے وہ حسینؑ ابن علیؑ جن پہ تصدق سارے
لال زہراؑ کے، پسر حیدرِ کرّار کے ہیں
مرحلے سہل جنہیں خلق میں ایثار کے ہیں

دین و دنیا میں لیا جن کا سہارا سب نے جن کے دروازے پہ دامن کو پسارا سب نے
بحرِ ذخّار کا سمجھا ہے کنارا سب نے راکبِ دوشِ نبیؐ کہہ کہ پکارا سب نے
شمعِ دیں جس نے لہو دے کے فروزاں کر دی
بوترابی کی حقیقت بھی نمایاں کر دی

راہِ تسلیم میں انداز اہم رکھا ہے　　سر بلند اپنی روایت کا علم رکھا ہے
حق نمائی کو جہاں بڑھ کے قدم رکھا ہے　　آلِ عمراں نے حقیقت کا بھرم رکھا ہے

یہ وہ ہستی ہے کہ تنقید نہیں ہو سکتی
یہ وہ ہستی ہے کہ تردید نہیں ہو سکتی

امام حسینؑ کی جنگ کا بیان اس طرح نظم کرتے ہیں ۔

جنگ میں کام نہ کچھ تیز نگاہی آئی　　سامنے دیدۂ دشمن کے سیاہی آئی
تیغ شبیرؑ کو جب ایک جماہی آئی　　ہر طرف لشکر اعدا میں تباہی آئی

سر پہ سر کٹنے لگے ہوگئے بے سر لاکھوں
دیکھ کر شانِ دغا کھا گئے چکّر لاکھوں

رن پڑا ایسا کہ دنیائے حسین کانپ گئی　　آسمان کانپ اٹھا اور زمیں کانپ گئی
پہنچی فریاد سر عرش بریں کانپ گئی　　طور یہ دیکھ کے فطرت کی جبیں کانپ گئی

غیب سے آئی ندا، صبر و رضا پر ہو نظر
ہاتھ رک جائیں لڑائی سے خدا پر ہو نظر

زیبا ناروی کی شاعری پر ایک طرف میر انیسؔ کی فصاحت وسلاست کا اثر ہے تو دوسری طرف زبان کے معاملے میں وہ داغؔ دہلوی سے متاثر نظر آتے ہیں اس لئے اُن کے مراثی میں رنگِ تغزل جھانکتا رہتا ہے۔ ”رن پڑا ایسا کہ دنیائے حسین کانپ گئی“ یا ”طور یہ دیکھ کے فطرت کی جبیں کانپ گئی“ جیسے مصرعوں میں تغزل ہی تغزل تو ہے، اور یہی زبان زیبا ناروی کی پہچان ہے۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر صفدر حسین:۔ (لاہور)

پیدائش مئی ۱۹۱۹ء، وفات ۱۹۸۰ء

والد کا اسم گرامی سید ابرار حسین۔ جائے ولادت (تہ سادات باہرہ ضلع مظفر نگر) دادا، سید حسن رضا حسن مرثیہ گو شاعر تھے۔ ابتدائی تعلیم مظفر نگر میں پائی ایم، اے اردو اور ایل۔ ایل۔ بی علی گڑھ یونیورسٹی سے کیا اور ایم۔ اے (فارسی) آگرہ یونیورسٹی سے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ زندگی کی جدوجہد میں پیشہ ورانہ جہد اسلامیہ کالج جالندھر میں

لیکچرار کی ملازمت کے حصول سے کی۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آ گئے اور گورنمنٹ کالج راولپنڈی۔ گورنمنٹ کالج لائل پور، گورنمنٹ کالج جہلم، گورنمنٹ ڈگری کالج دادو (سندھ)، گورنمنٹ کالج لاہور میں تدریسی فرائض کی انجام دہی کے بعد ڈائرکٹر بورڈ آف ایجوکیشن کے منصب تک پہنچے۔

ڈاکٹر صفدر حسین غزل اور مرثیے کے شاعر بھی اور ادیب و نقاد کی حیثیت سے بھی اُن کا ایک مقام ہے۔ اُردو مرثیے پر ان کی تنقید سند کے زمرے میں آتی ہے۔

مرثیہ گوئی میں ڈاکٹر صفدر حسین کسی اُستاد کے باقاعدہ شاگرد نہیں ہوئے۔ فیضی بھرتپوری اور حضرت نسیم امروہوی کے فرزند قسیم امروہوی کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر صفدر حسین نے چھ مرثیوں پر حضرت نسیم امروہوی سے اصلاح لی۔ راحت حسین ناصری نے مجلّہ بیادِ آل رضا مطبوعہ کراچی ۱۹۸۷ء میں آل رضا سے اصلاح لینے کا تذکرہ کیا ہے لیکن اس کی تردید ایک کتاب سے ہوتی ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر صفدر حسین کی زندگی کے حالات، اور ادبی خدمات پر ان کی اہلیہ جمیلہ خاتون کی مرتب کردہ (نقشِ قدم مطبوعہ ۱۹۶۶ء لاہور) ہے جس میں آل رضا کے مرثیے کے دو بند نقل کئے گئے ہیں جن میں ہم عصر مرثیہ نگاروں پر طعن و تشنیع کی گئی ہے۔ جمیلہ خاتون نے ان بندوں کا ہدف ڈاکٹر صفدر حسین کو قرار دیا ہے۔ اس کتاب کے بعد یہ سوچنے یا کہنے کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ ڈاکٹر صفدر حسین نے سید آل رضا سے اصلاح لی ہوگی۔ بسا اوقات اکا دکا مشوروں کو بھی لوگ مستقل سلسلہ تلمذ کی وابستگی کا نام دے دیتے ہیں۔

ڈاکٹر صفدر حسین نے علامہ جمیل مظہری کے دو دیوان مرتب کر کے شائع کرائے۔ یہ دیوان ''عرفانِ جمیل'' (چھ مرثیے اور ایک رثائی نظم عرفانِ جمیل) مطبوعہ لاہور ۱۹۶۹ء اور ''وجدانِ جمیل'' (تین مرثیے) مطبوعہ لاہور ۱۹۸۷ء ہیں۔ اس عقیدت پر یہ بھی کہا گیا کہ ڈاکٹر صفدر حسین جمیل مظہری سے اصلاح لیتے رہے ہیں۔ جمیل مظہری جیسے باکمال اساتذہ سے سلسلہ تلمذ کی وابستگی ایک اعزاز ہے لیکن اگر کسی کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا تو اُسے اس سے وابستہ کرنا بھی خلافِ حقیقت ہے۔

مرثیہ پر نقد و نظر کے معاملے میں ڈاکٹر صفدر حسین کی تصانیف ''رزم نگارانِ کربلا'' اور ''مرثیہ بعد انیس'' سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بحیثیت مرثیہ گو وہ اُن شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں جنہوں نے مرثیے کے روایتی مزاج کی پاسداری کی مگر جدید خیالات و رجحانات کا احاطہ

کرنے کی کوشش بھی کی — اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شاعر تھے اور عصری تقاضوں پر بھی اُن کی نظر تھی۔ اپنی کتاب "مرثیہ بعد انیس" میں وہ لکھتے ہیں۔

'مرثیہ نگار، امام حسینؑ کی شخصیت کو جس انداز سے پیش کرتے تھے اب وہ بہت کچھ بدل چکا ہے۔ حسینی شہادت اسلامی تاریخ کا سب سے زیادہ انقلاب انگیز واقعہ ہے۔ اس واقعہ کے تمام انقلابی ممکنات کو پیش نظر رکھ کر ہر عہد میں نئی خیال آرائیاں ہوتی رہیں گی۔ آج حسینؑ صرف مسلمانوں کی ملکیت نہیں ہیں بلکہ وہ ایک بین الاقوامی ہیرو سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے حسینؑ اور عظمتِ حسینؑ پر محدود مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ تاریخی، سیاسی اور تمدّنی روشنی میں غور کرنا ضروری ہے۔"

ڈاکٹر صفدر حسین نے موضوعاتی مرثیوں میں اس انقلاب کو آگے بڑھایا ہے جس کی بنیاد جوشؔ اور جمیل مظہری نے رکھی تھیں۔ "آئین وفا"، "جلوہ تہذیب"، "چراغ مصطفوی"، "مقام شبیری" وغیرہم اُن کے اس رویے پر استدلال ہیں۔ اُن کے مرثیے "جلوہ تہذیب" ہر چند کہ حضرت علی اکبر کے احوال کا مرثیہ ہے مگر اس میں قدیم و جدید کا خوبصورت امتزاج ہے۔ اس مرثیے کے بارے میں ڈاکٹر حسین فاروقی لکھتے ہیں کہ اس مرثیے میں:

"—— گریز بھی بڑے قیامت کا ہے جس سے کربلا اور حضرت علی اکبر تہذیب کے اشارے بن کر آتے ہیں اور جدید فلسفیانہ شاعری، روایاتِ مرثیہ نگاری سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے اس کے بعد پرانے مرثیہ نگاروں کی طرح حضرت علی اکبر کی مدح ہوتی ہے۔"

مرثیہ نگار کے لئے ایک مشکل مرحلہ مرثیے کا چہرہ ہے جس میں قدیم و جدید افکار نظم ہوتے ہیں۔ ان اذکار سے گریز کر کے رثائی بیان اور کسی ایک شخصیت کی شہادت کے ذکر تک آنا "کارے دارد" والی بات ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صفدر حسین جیسے شاعروں کے لئے یہ امر اس لئے اور دشوار ہوتا ہے کہ اُنھیں جدید افکار سے مرثیے کے اسلوب قدیم کی طرف آنا ہوتا تھا لیکن صفدر حسین ایسے ہر مرحلے پر خوبی سے گذر رہے ہیں جسے ڈاکٹر فاروقی نے سراہا ہے، اُن کے مرثیے "جلوہ تہذیب" میں تہذیب کے منازل سے گذر کر وہ کس خوبی سے رثا پر آئے ہیں۔

نازِ تخلیق یہی، رازِ تجلی بھی یہی جلوۂ طور یہی، آتشِ سینا بھی یہی
سینۂ گوتم و زرتشت کا شعلہ بھی یہی حُسنِ یوسف بھی یہی ہے یدِ بیضا بھی یہی
یہی ناگاہ دلِ کوہِ صفا سے نکلا
مشعلِ نور لئے غارِ حرا سے نکلا

یہی سرمایۂ انوارِ علوم کونین تھا سلونی یہ لبِ فاتحِ صفّین و حنین
یہی اسرارِ تجلّی یہ حدیثِ ثقلین اِنہیں اسرارِ تجلّی کا امیں قلبِ حسینؑ
ظلم ترسیدہ و لرزیدہ سیاہی جن سے
کربلا مہبطِ انوارِ الٰہی جن سے

کربلا کیا؟ انہیں آیاتِ درخشاں کی دلیل ایک صدیوں کی روایات کی صحیح تکمیل
جس پہ برپا ہوئی قربانی موعودِ خلیلؑ علی اکبرؑ تھے یہاں اور وہاں اسمٰعیلؑ
خونِ کم مایہ اُدھر خونِ نبیؐ کے بدلے
لاکھ تلواریں اِدھر ایک چھری کے بدلے

کس قدر مرحلۂ صبر و تحمل ہے اَدق ہاجرہ تک پئے فرزند رہیں محوِ قلق
لیکن ایثار کی تاریخ نے اُلٹا جو ورق اُمِ لیلیٰ کی جبیں پر نہ شکن تھی نہ عرق
کرلیا حق کے لئے خنجر گوارا اُس نے
موت کو سونپ دیا آنکھ کا تارا اُس نے

حبّذا عارضِ شمشادِ گلستانِ بتول دیدۂ بلبلِ سدرہ ہو خنک جس سے وہ پھول
زلفیں وہ جن پہ تصدق شبِ معراج کا طول جن کی خوش بُو سے مدینے کو ملی بوئے رسولؐ
آنکھیں اصحاب کی روشن ہوئیں جلوہ دیکھا
اپنے محبوب پیمبرؐ کا سراپا دیکھا

رُخ روشن وہی، پیشانی انور بھی وہی چشم و ابرو وہی، لہجہ وہی، تیور بھی وہی
دوش تک آئی ہوئی زلفِ معنبر بھی وہی رخ پہ بل کھائے ہوئے بالوں کے گھونگر بھی وہی
جب چلے شیوۂ رفتارِ نبیؐ دِکھلا کر
چونک اُٹھیں شہر کی گلیاں وہی آہٹ پا کر

ڈاکٹر صفدر حسین کی کتاب "رزم نگاران کربلا" میں جوش ملیح آبادی، جمیل مظہری، سید آل رضا، نسیم امروہوی کی مرثیہ گوئی پر توصیف و تنقید ہے۔ اس کتاب میں اُنہوں نے کہا ہے کہ کربلا میں رزم یعنی جنگ اور تلوار کے ذکر کو یہ کہہ کر مرثیوں سے خارج کیا جارہا ہے کہ آج تلوار کا زمانہ نہیں اور نہ ہی اس طرح کی جنگ کا زمانہ ہے جو اس دور میں ہوتی تھی۔ ڈاکٹر صفدر حسین نے اس فکر کی نفی کی ہے اور اس امر پر استدلال کیا ہے کہ:

"بیسویں صدی میں بیشتر شعراء کرام کسی صنف سخن یا ادب کی خدمت سے زیادہ اپنا ادبی قد بڑھانے میں کوشاں رہے ہیں، اس کی مثالیں مرثیہ گوئی میں کم اور شاعری کی دیگر اصناف میں شعر کہنے والوں میں زیادہ ہیں۔" ڈاکٹر صفدر حسین نے رثائی ادب اور مرثیے پر نقد و نظر کی ترقی کے لئے کام کیا ہے۔ اُنہوں نے "وجدان جمیل" اور "عرفان جمیل" کے علاوہ ناظر حسین ناظم کا مجموعہ "بزم ناظم" مرتب کیا ہے۔ میر علی محمد عارف کا مجموعہ "معارف سخن" مرزا یوسف حسین شائق کے اشتراک سے مرتب کیا ہے۔ آغا شاعر قزلباش کے 'زادِ آخرت' کا پس منظر لکھا ہے۔ مراثی نسیم امروہوی جلد اوّل کا تعارف لکھا ہے۔ مختصر یہ کہ مرثیہ اور مرثیے پر تنقید میں ڈاکٹر صفدر حسین نے بہت کام کیا ہے۔

بعض مراثی میں اُنہوں نے ایسے مصائب بھی نظم کئے ہیں جن پر مرثیہ گو شعراء کی نظر کم ہی گئی ہے۔ اُن کے مرثیے "آئین وفا" میں شب عاشور کے مصائب میں اُنہوں نے جناب اُم کلثوم کی کیفیات کو پیش کیا ہے ۔

روکے کہتی تھیں کہ اے قادر و حیّ القیوم رو بہ قبلہ تھیں مصلّے پہ جناب کلثوم
مصلحت تیری کہ اولاد سے میں ہوں محروم گھر گئے ہیں عجب آفت میں امام مظلوم
کیا کروں نذر کہ ہدیہ نہیں رکھتی کوئی
دل ہے مجبور کہ فدیہ نہیں رکھتی کوئی

کل ثمر لائے گا گلزار رضا و تسلیم کل بپا ہوگا یہاں معرکۂ ذبح عظیم
دل مرا خنجر احساس سے ہوتا ہے دونیم کیا کہوں تجھ سے کہ تو خود ہے بصیر اور علیم
جس طرف دیکھتی ہوں موت کی تیاری ہے
میرے احساس پہ یہ رات بہت بھاری ہے

ڈاکٹر صفدر حسین نے مرثیہ گوئی میں کردار نگاری میں بھی ایک جدّت کی ہے اور وہ یہ کہ

واقعات کا بیان اس انداز سے کیا ہے جس میں کردار اپنی عظمتوں کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ مثلاً ایک واقعہ ہے کہ منزل زبالہ پر امام حسینؑ کی آنکھ ذرا لگ گئی پھر آپ بیدار ہوئے اور فرمایا:

"انا للہ و انا الیہ راجعون و الحمدللہ رب العالمین" حضرت علی اکبر نے پوچھا، بابا! آپ نے یہ کیوں فرمایا۔ امام نے بتایا کہ ہمیں خواب میں موت کی اطلاع دی گئی ہے۔ علی اکبر نے پوچھا بابا، ہم حق پر ہیں نا؟ امام نے کہا "بے شک ہم حق پر ہیں"

ڈاکٹر صفدر حسین نے علی اکبر کی کیفیت کو بیان کیا ہے ؎

سُن کے مژدہ رُخِ اکبر پہ بحالی آئی — جاگ اُٹھے جلوۂ رخسار وہ سُرخی چھائی
پُھوٹی چہرے سے کرن جوش میں لی انگڑائی — کہا حضرت سے کہ یا سیدی و مولائی
حق پہ جب ہم ہیں تو پھر موت کی پروا کیا ہے
عزمِ راسخ کے لئے آگ کا دریا کیا ہے

یہی ندرتیں، اور اسی جدید سے جدید تر کی تلاش کا نام ڈاکٹر صفدر حسین ہے۔ جو قدیم و جدید کا سنگم بن کر سامنے آئے اور اپنے کارناموں کی ایک روشن فہرست ہمارے پاس چھوڑ کر چلے گئے۔

☆☆☆☆☆

علامہ جمیل مظہری:۔

ولادت ۱۹۰۵ء۔ وفات ۱۹۸۰ء

نام سید کاظم علی کاظمی، والد گرامی مولوی خورشید حسین، جدِ امجد مولانا مظہر حسن شاگردِ دبیر جائے ولادت پٹنہ (عظیم آباد) تعلیم ایم۔اے فارسی (کلکتہ یونیورسٹی) تلمذ خان بہادر رضا علی وحشت۔

مشاغل و مصروفیات:

☆ مدیر روزنامہ ہند کلکتہ ۱۹۳۱ء، ☆ صحافی اور کالم نگار روزنامہ عصرِ جدید، کلکتہ ۱۹۳۷۔ ۱۹۴۳ء ☆ پبلیسٹی آفیسر حکومت بہار۔ ۱۹۳۷ء۔ ۱۹۴۲ء ☆ فلمی صنعت سے وابستگی ۱۹۴۳ء۔ ۱۹۴۵ء ☆ ڈپٹی ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات حکومت بہار۔ ۱۹۴۶ء۔ ۱۹۵۰ء ☆ پروفیسر پٹنہ کالج ۱۹۵۰ء۔ ۱۹۶۰ء ☆ پروفیسر پٹنہ یونیورسٹی ۱۹۶۰ء۔ ۱۹۶۵ء۔

تصانیف:

۱۔ شکست و فتح	طویل افسانہ	اشاعت کلکتہ	۱۹۵۰ء
۲۔ نقشِ جمیل	(نظمیں)	مطبوعہ پٹنہ	۱۹۵۳ء
۱۔ فکرِ جمیل	(غزلیات، نغمات، رباعیات)	پٹنہ ۱۹۵۸ء کراچی	۱۹۸۵ء
۴۔ مثنوی آب و سراب۔		کلکتہ ۱۹۷۰ء۔ کراچی	۱۹۸۹ء
۵۔ آثارِ جمیل	(غزلیات)	پٹنہ	۱۹۸۸ء
٦۔ فریاد جواب فریاد	(طویل نظمیں)	مطبوعہ کراچی	۱۹۸۹ء
۷۔ منثوراتِ جمیل مظہری	(افسانے اور تنقید)	دو جلدیں پٹنہ	۱۹۹۱ء
۸۔ عرفانِ جمیل	(مرثیے اور قصائد)	لاہور ۱۹٦۹ء، الہ آباد	۱۹۷۹ء
۹۔ وجدانِ جمیل	(مرثیے اور ملی نظمیں)	مطبوعہ لاہور	۱۹۷۸ء
۱۰۔ جمیل مظہری کے مرثیے		کراچی	۱۹۸۸ء

علامہ جمیل مظہری کی ہشت پہلو شخصیت اور مختلف الجہات تخلیقات پر کہاں سے بات شروع کی جائے —— آیئے اُن کی زبانِ فصاحت بیان سے اُن کی ایک نظم ''فسانۂ آدم'' کے چند اشعار سنتے ہیں۔

میں تھا ضمیر مشیت میں ایک عزم جلیل
ہنوز شوق کی کروٹ بھی لی نہ تھی میں نے

وہ صبحِ عالمِ حیرت، وہ جلوہ زارِ بہشت
ہوا چمن کی لگی آنکھ کھول دی میں نے

ہوا حدودِ نظر سے نکل کے آوارہ
ہوائے شوق میں جنت بھی چھوڑ دی میں نے

نمو کے جوش میں سودائے رنگ و بو نکلا
زمیں کے دل کی تمنا نکال دی میں

بہک بہک کے بکھیرے یہاں وہاں سجدے
بھٹک بھٹک کے حقیقت تلاش کی میں

لیا شہنشہِ خاور سے روشنی کا خراج
کیا اسیر طبیعت کو برق کی ''میں'' نے

ان اشعار میں لفظ ''میں'' ذات کا استعارہ بھی ہے اور تاریخ کا اشارہ بھی۔ اور یہی صفت جمیل مظہری کی شاعری میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ کبھی ذات سے ازل تک، کہیں ذات سے ابد تک، اُن کی شاعری میں ذات کی وسعت دراصل اُن کے فکر کی وسعت ہے۔ آل احمد سرور نے مندرجہ بالا اشعار کو عنوان بنا کر جمیل مظہری کی نقشِ جمیل پر گفتگو کی ہے۔ اُردو شعر و ادب کے مستند ناقدین میں سے شاید ہی کوئی ہو جس نے علامہ جمیل مظہری کی کسی کتاب کے حوالے سے یا اُن علمی ادبی حیثیت کے بارے میں نہ لکھا ہو، جمیل مظہری کئی اصناف سخن میں اہمیت کے حامل ہیں لیکن آج ہم اُن کی مرثیہ گوئی پر بات کر رہے ہیں۔

علامہ جمیل مظہری پہلا مرثیہ ''عرفان عشق'' ۱۹۳۰ء میں کہا تھا۔ اور دوسرا مرثیہ ''پیمانِ وفا'' ۱۹۳۵ء میں کہا گیا۔ جمیل مظہری کے مرثیوں کی تعداد دس ہے۔

''عرفان عشق کے بارے میں پروفیسر محمد رضا کاظمی نے ماہنامہ ''سہیل'' گیا، جمیل مظہری نمبر صفحہ ۱۸ کے حوال سے لکھا ہے کہ

''۱۹۳۰ء ترقی پسند تحریک اور مولانا آزاد کی تقاریر سے متاثر ہو کر یہ مرثیہ کہا گیا تھا''

یہ حوالہ صحت کے معیار پر پورا نہیں اُترتا اس لئے کہ ترقی پسند تحریک کی بنیاد لندن میں رکھی گئی اور یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ ہندوستان میں ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ پس اس غلطی کو کاتب کے نامۂ اعمال میں لکھ کر آگے بڑھتے ہیں۔ ۱۹۳۰ء جمیل مظہری کا (تخلیق کے حوالے سے) بہترین سال تھا۔ اسی سال جمیل مظہری نے غالب کے قصیدے کی تضمین لکھی تھی ـ ''دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں'' حضرت علی ابن ابی طالب کی مدح میں کہا ہوا قصیدہ۔ اور غالب کے مزاج، اسلوب اور بلاغت فکر کے آس پاس پہنچ کر ایسے مصرعے کہے جو اصل کلام کے جوہر میں کمی نہ کریں بلکہ اصل اشعار میں فکر کی وضاحت کریں آسان کام نہیں تھا۔

۲۵ برس کی عمر میں غالب کے کلام پر تضمین لکھنے والے شاعر اور غالب کے آہنگ کو پوری طرح برتنے والے شاعر جمیل مظہری کے ایک ہات میں اقبال کی فکر کے ماہتاب اور دوسرے

ہاتھ میں غالب کے آہنگ کا آفتاب نظر آتا ہے، اہل نقد ونظر نے اُجالے کی اس فراوانی کو لفظوں کی میزان پر تولا ہے جمیل مظہری کے ''عرفان عشق'' کی ابتدا غالب کی یاد دلاتی ہے۔

عشق کیا ہے غم ہستی سے رہا ہو جانا اور رہا ہو کے گرفتار بلا ہو جانا
بے پئے مست مئے جام فنا ہو جانا بس کے دشوار ہے پابند وفا ہو جانا
قید یہ اس میں بڑی ہے کہ دل آزاد رہے
فکر انجام نہ ہو کوششِ برباد رہے
آدمی زاد کب انساں ہے بقول غالبؔ استواری میں ہی ایماں ہے بقول غالبؔ
سوز دل راز چراغاں ہے بقول غالبؔ درد خود معنی عرفاں ہے بقول غالبؔ
''عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا''

مرزا اوجؔ کی شروعات کے بعد، علامہ جمیل مظہری کے اس جدید مرثیے سے پہلے دلو رام کوثری کا ''قرآن اور حسین'' (۱۹۱۵ء) جوش کا آوازۂ حق (۱۹۲۰ء) اور نسیم امروہوی کا گل خوش رنگ (۱۹۲۳ء) کل تین مرثیے، جدید مرثیے کے خزانے میں موجود تھے۔ حضرت نسیم امروہوی کے مرثیے کے ابتدائی کچھ بندوں میں سیاسی اور قومی جذبات کی لہر تھی لیکن باقی کا مرثیہ، روایات قدیم کی پیروی تھا۔ دلو رام کوثری نے مرثیے کے لوازم کی پابندی نہیں کی تھی۔ جوش کا تیکھا پن اور روایات سے بغاوت تو ایسی بات نہیں جو ڈھکی چھپی ہو البتہ جمیل مظہری نے ''عرفان عشق'' میں جو اُٹھان چہرے سے شروع کی وہ شہادت حسین کے ساتھ ساتھ مقصد شہادت حسین اُجاگر کرتی چلی گئی۔

''پیمانِ وفا'' جمیل مظہری نے ۱۹۳۵ء میں کہا۔ اس مرثیے میں عرفان عشق والی فکر کی بجائے سیاسی بصیرت اور شعور آگہی زیادہ نمایاں ہے — پروفیسر رضا کاظمی نے ''پیمان وفا'' پر عجیب وغریب تبصرہ کیا ہے۔ صرف ایک فقرے میں گویا داستان سمودی ہے — لکھتے ہیں

''پیمان وفا۔ غالباً پہلا مرثیہ ہے جس میں کسی خیر کی بجائے کسی شر کی تشریح کی گئی ہے۔''

''کچھ لکھ کر قلم توڑ دینا'' والی کہاوت اس مختصر جملے پر صادق آتی ہے حقیقت یہی ہے کہ اس مرثیے میں جمیل مظہری نے جبر کی تاریخ پیش کی ہے۔ اور سیاق وسباق اس کا یہ ہے کہ ۱۹۳۵ء میں جارج پنجم کی جوبلی کے موقعہ پر انگریز حاکموں نے ماہِ عزا کی پرواہ کئے بغیر امام باڑوں میں چراغاں کا حکم دے دیا تھا۔ جب اس حکم کی تعمیل بے چون وچرا ہوگئی تو اس تساہل کو بہت سے شعراء نے ہدف بنایا حضرت مسلم بن عقیل سے غداری کرنے والوں کے احوال سے گریز کرتے ہوئے بیک جنبشِ قلم جمیل مظہری جوبلی پر امام باڑوں میں چراغاں کے دکھ پر آگئے۔ دیکھئے کیسے؟

ابن زیاد گورنر کوفہ کے حکم پر کثیر ابن شہاب، حامیانِ حسین کو ڈراتا دھمکاتا ہے۔ جمیل مظہری ان دو مواقع کو کیسے یکجا کرتے ہیں — کوفہ کی حالت ؎

کہیں زنجیروں کی دھمکی تھی کہیں بارشِ زر کام کرنے لگا ہر سمت حکومت کا اثر
سن کے یہ غُل کہ چلا آتا ہے شاہی لشکر عورتیں لے گئیں مردوں کو قسم دے دے کر
یونہی ایماں کی طرف خوف مکیں ہوتا ہے
دل میں راسخ ہو غلامی تو یونہیں ہوتا ہے

اور اب گریز دیکھئے ؎

آج بھی جبکہ ہے ماضی سے کہیں بہتر حال حاکمِ شہر کے بگڑے ہوئے تیور کا خیال
کتنے ایمانوں کو کر سکتا ہے دم بھر میں نڈھال جوبلی ماہ عزا میں ہوئی خود اس کی مثال
کیوں؟ جہاں ہو علم شاہِ شہیداں اے قوم
جوبلی میں اسی پھاٹک پہ چراغاں، اے قوم

جمیل مظہری جیسے حساس شاعر کے لئے کربِ غلامی کیا کم تھا کہ امام بارگاہ کے دروازے پر ایام عزا میں چراغاں جمیل مظہری کو مجبور، غلام، کمزور اور بے حس قوم کا رقص نظر آیا چنانچہ یہ مرثیہ ؎

حیف وہ قوم جو ہو ملت شاہ شہدا وہ حکومت کی کنیزی میں ہو حیرت کی ہے جا
جس طرف دیکھئے ہے موت کا اک سناٹا نہ کوئی پیر تدبّر نہ جوانِ غوغا
جسم ہیں مدفن دل، مجلسیں گورستاں ہیں
بستیاں روح کی اک وادیٔ خاموشاں ہیں

۱۹۳۵ء میں روح کی بستیوں کو وادیٔ خاموشاں کہنے والا شاعر کسی وقتی جذبے کے تحت یہ سب کچھ نہیں کہہ رہا تھا بلکہ یہ اس کا مزاج تھا۔ ۱۹۴۲ء میں "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کے زیر اثر اس راسخ عقائد رکھنے والے شاعر اور مفکر نے حکومت بہار کی ملازمت چھوڑ دی تھی اور استعفے پر اپنے خون سے دستخط کئے تھے۔

جمیل مظہری نے اوجؔ اور انیسؔ سے استفادہ کیا ہے — اور اس کا برملا اعلان کیا ہے

تخئیل اوجؔ کی ہو، بلاغت نفیسؔ کی
تلچھٹ مجھے بھی چاہئے جام انیسؔ کی

اوجؔ، نفیسؔ اور انیسؔ سے عقیدت کے باوجود جب کسی ایک ہی موضوع پر میر انیس اور جمیل مظہری قلم اُٹھاتے ہیں تو قدیم و جدید مرثیے الگ الگ نظر آتے ہیں — مثلاً میر انیسؔ کا معرکۃ الآرا مرثیہ ۔ "یارب کسی کا باغ تمنا خزاں نہ ہو"

اس مرثیہ میں ایک موقعہ پر امام مظلوم رخصتِ آخر سے قبل بہن زینب سے ملنے آتے ہیں جو مصروفِ بکا ہیں، امام، بہن کو اجداد کی مثالیں دیکر صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ میر انیسؔ کے الفاظ میں سیّدانی کے کردار کو دیکھئے ۔

زینب نے عرض کی کہ بجا ہے یہ سب کلام　　پر کیونکر اپنے دل کو میں سمجھاؤں یا امام
انصاف کیجئے یہ بُکا کا نہیں مقام　　کس گھر پہ ایک دن میں ہوا ہے یہ قتل عام
آنکھوں سے جوئے اشک نہ کیونکر رواں رہے
بچے رہے، نہ پیر رہے نہ جواں رہے

بابا نے، ماں نے، بھائی نے ہنگام احتضار　　حضرت سے یہ کہا تھا کہ زینب سے ہوشیار
شبیر ہے تمہاری حوالے یہ سوگوار　　اب مجھ کو سونپتے ہیں کسے شاہ نامدار
اماں جو کہہ گئی ہیں اسے یاد کیجئے
کچھ تو بہن کے باب میں ارشاد کیجئے

بیٹھوں کہاں جو فوجِ ستم لوٹنے کو آئے　　اتنا تو ہو کوئی کہ یہ کہنہ ردا بچائے
اُٹھے میرے نصیب بڑھاپے میں ہائے ہائے　　اماں کو آج ڈھونڈ کے زینب کہاں سے لائے

چادر اُڑھائے کون جو عُریان سر پھروں
قسمت میں یہ لکھا ہے کہ میں در بدر پھروں

اور اب دیکھیئے جمیل مظہری کا مرثیہ ۔ "کھولا عروس شب نے جو زلفِ دراز کو"۔ اس مرثیے میں بھی کم وبیش وہی منظر نامہ ہے۔ امام مظلوم بہن سے رخصت ہونے آتے ہیں اور جانے سے پہلے جنگ کے اندیشوں کا پھر ذکر کرتے ہیں۔ جمیل مظہری کے الفاظ میں کردارِ زینب کو دیکھیے ۔

زینب کے دل کی تھاہ امام زماں نہ لیں
میں آپ کی بہن ہوں، میرا امتحاں نہ لیں

میں گود میں پلی ہوں شہ قلعہ گیر کی ہوں حصّہ دار خونِ جنابِ امیر کی
طاقت ہے میرے دل میں بھی نانِ شعیر کی گرمی رگوں میں فاطمہ زہرا کے شیر کی

یہ چاہتی ہوں حق کا علم سرنگوں نہ ہو
بھائی کا خون ہو پہ صداقت کا خوں نہ ہو

پیغام صلح ہو چکا، حجت ہوئی تمام میری یہ آرزو ہے کہ اب کھینچئے حسام
تیغ دوسر کا دیکھ لے لوہا سپاہِ شام اُموی غرور ہاشموں کو کرے سلام

چرچا ثبات و عزم کا نزدیک و دور ہو
ہے فیصلہ میرا کہ لڑائی ضرور ہو

ہر دل ہے آج اپنی تمنا لئے ہوئے قربان گاہ فرض پہ تحفہ لئے ہوئے
مائیں کھڑی ہیں گود میں تحفہ لئے ہوئے بندے ہیں پیشکش کو سکینہ لئے ہوئے

حاضر رسن کے واسطے میرا گلا بھی ہے
پرچم کا کام دے تو یہ کہنہ ردا بھی ہے

"اتنا تو ہو کوئی کہ یہ کہنہ ردا بچائے" اور "پرچم کا کام دے تو یہ کہنہ ردا بھی ہے" میں جو فرق ہے وہی فرق وقت کی تیز رفتاری کے سبب ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں ہے۔ ایک دور سے دوسرے دور میں ہے، قدیم اور جدید مرثیے میں ہے۔

☆☆☆☆☆

بدرعظیم آبادی :-

پیدائش ۱۹۰۰ء بمقام صدر گلی، پٹنہ

نام سید بدرالدین، تخلص بدر، قلمی نام بدر عظیم آبادی، موصوف بہار اسمبلی کے ممبر بھی رہے۔ پختہ گو شاعر، قادر الکلام مرثیہ نگار۔ کامیاب سیاستدان، ہردلعزیز شخصیت تھے۔ "حقیقت بھی کہانی بھی" کے نام سے عظیم آباد کی تہذیبی تاریخ بھی لکھی۔

بدر عظیم آبادی کے متعلق اختر اورینوی نے لکھا ہے کہ "بدر عظیم آبادی کے مرثیوں کا چہرہ جدید مطالعہ ملی کو پورا کرتا ہے" جدید مطالعہ ملی کی تفسیر انہوں نے یہ دی ہے کہ "ان میں حضرت علامہ اقبال کی شاعری کا رنگ، شاعری کی عرفانی اور اخلاقی فضا، اور انیس کی فصاحت وسلاست وبلاغت ہے"۔ (بہار میں اردو زبان کا ارتقاء)

سید سفارش حسین رضوی نے بدر عظیم آبادی ان کے مرثیے کے دو بند نقل کئے ہیں۔ جناب زینب بارگاہ خداوندی میں فریاد کررہی ہیں۔ اس فریاد میں عجز وانکسار کے ساتھ ساتھ خانوادۂ رسالت کی گفتار کا لہجہ برقرار ہے ۔

یہ محمد ہے، یہ اکبر ہے، یہ عون ذی جاہ سب میری گود کے پالے ہوئے انا للہ
خاک اور خون میں لاشے ہیں مگر تو ہے گواہ میری آنکھوں میں نہ آنسو ہیں نہ ہونٹوں پہ ہے آہ
ہمہ تن شکر، بہ مرضیٔ مشیت ہم ہیں
روئیں کیونکر تیرے محبوب کی عزت ہم ہیں

شرم آتی ہے ہمیں تجھ سے صلہ کیا مانگیں یہ تو اک شکر کا موقع ہے، دعا کیا مانگیں
جو تیری راہ میں دیدی وہ ردا کیا مانگیں نعمتیں خاص برائے شہدا کیا مانگیں
ہاں مگر یہ کہ انہیں قبر عطا ہو یارب
اور ہمیں حوصلۂ صبر عطا ہو یارب

☆☆☆☆☆

فردوسی عظیم آبادی:-

ولادت ۳۱ر جنوری ۱۹۴۱ء بمقام پٹنہ۔

دانش عظیم آبادی نے ۱۹۳۷ء لکھی ہے۔ نام سید تراب حسین، تخلص فردوسی، مسکن عظیم آباد۔

سید کاظم حسین زآر کے فرزند، زار کے فرزند کو کیا ضرورت تھی کہ کسی غیر سے سلسلہ تلمذ وابستہ کرے لہٰذا اپنے والد گرامی سے اصلاح لیتے تھے۔ بہار کے اساتذہ شعرا نے فردوسؔی کو خوشگوار شاعر کہا ہے لیکن سید احمد اللہ ندوی نے ''مسلم شعراء بہار'' میں فردوسی کی مرثیہ گوئی پر کچھ نہیں لکھا۔ ہو سکتا ہے اس کا یہ سبب ہو کہ جب ندوی صاحب یہ کتاب لکھ رہے تھے اس وقت فردوسؔی اس منزل پر نہ پہنچے ہوں۔

ڈاکٹر ہلال نقوی لکھتے ہیں کہ فردوسی کا ایک مرثیہ اُن کے ذاتی ذخیرہ مراثی میں موجود ہے جو رباعی کی بحر میں ہے۔

اے ذہن رسا زور جوانی دکھلا اے نوک قلم سیف زبانی دکھلا
اے طبع رواں سیل معانی دکھلا اے ذوق سخن، نغز بیانی دکھلا

اے فکرِ بلند، فرش احساس پہ آ
اے جذبۂ دل نکل کے قرطاس پہ آ

(بیسویں صدی اور جدید مرثیہ۔ ہلال نقوی)

اس ایک بند کو پڑھ کر کوئی کہہ کر دیکھے کہ ''دکھلا'' متروک ہے یا فرش احساس اردو زبان میں نئی ترکیب نہیں ہے۔ فردوسی کا یہ مرثیہ ایسی ہی اصطلاحات سے مزین ہے۔

☆☆☆☆☆

سجاد حسین نگین :- (حیدرآباد)

تاریخ ولادت معلوم نہ ہو سکی، وفات ۱۹۸۱ء۔

نام سید سجاد حسین، تخلص نگین، محکمہ پولیس میں سب انسپکٹر تھے مگر زندگی مذہبی اور شعری ماحول میں گذاری، رثائی ادب کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ نوحے، مرثیے، قصیدے، سلام خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ مرثیوں کا مجموعہ ''توفیق فاطمہ'' ۶۵ مرثیوں پر مشتمل ہے۔ رسول اکرمؐ کی وفات سے امام عسکری علیہ السلام تک ہر معصوم کے احوال کا مرثیہ ''توفیق فاطمہ'' میں شامل ہے۔

نگین مرثیے کی قدیم روایات سے منحرف نہیں تھے لیکن اپنے مرثیوں میں اُنہوں نے گریہ وبکا پر آغاز وانجام کیا۔ وہ مرثیے کو مجلس میں رونے کے لئے مخصوص کلام سمجھتے تھے اس لئے اس دور کی تحریکوں میں رثائی ادب کے رجحانات اور حوالوں کے مخالف تھے — یہی وجہ ہے کہ ۶۵ مرثیوں کے مصنف شاعر کا مطبوعہ کلام نہ عوام تک پہنچ سکا نہ ذاکرین نے کوئی توجہ دی۔

نمونہ کلام: حضرت عباس کے احوال کے مرثیے سے ۔

دیکھا جو ہائے بیٹھ گئے شاہ خاک پر سلطان کائنات سر راہ خاک پر
بھائی کا غم، وہ سید ذی جاہ خاک پر راکب نبی کے دوش کا وہ آہ خاک پر
اطراف سب ملائکہ پروانہ وار تھے
اور بیچ میں حسینؑ بہت بیقرار تھے

بھائی دھڑک رہا ہے کلیجہ اُٹھو اُٹھو کیوں کر سہوں جدائی کا صدمہ اُٹھو اُٹھو
قلب حزیں پہ چلتا ہے آرا اُٹھو اُٹھو مقتل میں آنہ جائے سکینہ اُٹھو اُٹھو
اس کو سناؤں کیا میں خدارا جواب دو
اب کون ہے ہمارا سہارا جواب دو

☆— علی اکبر کے احوال کے مرثیے سے ۔

مولا وہ گفتگو علی اکبر کی اور آپ سینے میں بیکلی دل مضطر کی اور آپ
حالت ہے غیر شکل پیمبر کی اور آپ پیری میں لاش سامنے دلبر کی اور آپ
وہ چاک چاک دل شہ بے پر کا ہائے ہائے
دم توڑتا وہ سامنے اکبر کا ہائے ہائے

☆ امام حسن عسکری کے احوال کے مرثیے میں بین کا انداز مرثیے کی مروجہ روایات کے عین مطابق ہے ۔

ہائے اماں مجھے کیوں آئی نہ پہلے ہی قضا سامنے آنکھوں کے شوہر کا پڑا ہے لاشا
کیا کروں، کیا نہ کروں کہئے جناب زہرا لے چلو مجھ کو بھی دنیا سے پئے شیر خدا
میرا سرتاج گیا، خاک ہے جینا اماں
ہائے کیا راج گیا، خاک ہے جینا اماں

متعدد مرثیہ گو شعراء نے مرثیے کو بین تک محدود رکھا ہے یا بین کو فوقیت دی ہے۔ وہ سب سجاد حسین نگین کی طرح فراموش نہیں کردئے گئے۔ آخر نگین کے ساتھ یہ سلوک کیوں ہوا۔

☆☆☆☆☆

اثر جلیلی:-

ولادت ۱۹۲۲ء بمقام ٹونک، وفات ۱۹۸۱ء

آبائی وطن اجمیر شریف ۔ جائے ولادت راجپوتانہ کی ایک ریاست ٹونک جہاں اثر کے والد گرامی، بسلسلۂ ملازمت نواب ابراہیم علی خان والی ٹونک سے وابستہ تھے۔ پھر وہ جونا گڑھ منتقل ہو گئے ۔ یہاں اثر جلیلی کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ شاعری کا شوق پیدا ہوا تو جلیل مانک پوری کے شاگرد ہو گئے — ابتدا میں غزل، سلام، نعت اور نظمیں کہتے رہے — اثر جلیلی جونا گڑھ سے کوئٹہ کیسے پہنچے اس کا ذکر نہیں ملتا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ علم و ادب کا یہ سورج ایک شام جونا گڑھ میں غروب ہوا تو اگلے دن کوئٹہ بلوچستان سے طلوع ہوتا نظر آیا— کوئٹہ بلوچستان میں جب بھی اُردو مرثیے کا ذکر آتا ہے اثر جلیلی کا نام بھی سامنے آتا ہے اثر جلیلی کے مرثیوں میں قدیم اور جدید فکر کا امتزاج نظر آتا ہے۔ موضوعاتی مرثیہ کہنے والوں کی پہلی فہرست میں اُن کا نام شمار کیا جاتا ہے۔ کوئٹہ میں مرثیے کے حوالے سے سردار نقوی کا نام بھی اہم ہے۔ اور محشر رسول نگری اور اثر جلیلی بھی کوئٹہ کے نمایاں شاعر سمجھے جاتے ہیں۔

اثر جلیلی نے پہلا مرثیہ ۱۹۵۰ء میں کہا۔ ''ذوق نظر بھی ناز شعور بشر بھی ہے''۔ دوسرا مرثیہ ڈاکٹر یاور عباس کی فرمائش پر کہا۔ اس کے بعد تو کراچی کا دبستان مرثیہ ایسا بھایا کہ ہر سال نوتصنیف مرثیہ کراچی کی مجالس میں کوئٹہ سے آکر سنایا کرتے تھے ۔ اثر جلیلی کے دس مرثیوں کی فہرست اور سنِ تصنیف ریکارڈ پر ہے۔ ''عکس کربلا'' اُن کا نواں مرثیہ ہے۔ ۔ زندگی رنج بھی ہے راحت و آرام بھی ہے۔

زندگی رنج بھی ہے راحت و آرام بھی ہے درد دل بھی ہے یہ پہلوئے دل آرام بھی ہے
سعئی مشکور بھی ہے کوششِ ناکام بھی ہے ساغرِ مے بھی ہے یہ زہر بھرا جام بھی ہے
یہ شب غم ہے کبھی صبح طربناک بھی ہے
پستیٔ فرش کبھی رفعتِ افلاک بھی ہے

اس کے بعد گیارہ بند زندگی کے مختلف پہلوؤں پر کہے گئے اور بارہویں بند میں فضا کو ذرا سا ہموار کر کے تیرہویں بند میں گریز کا انداز دیدنی ہے ۔

کب یہاں اہل خرد معرکہ آرا نہ ہوئے کب یہاں فلسفی زحمت کش بے جانہ ہوئے

کب یہاں کشتۂ آزار مسیحا نہ ہوئے [۱۲] ناخنِ فہم سے عقدے یہ مگر وا نہ ہوئے
قفلِ ابجد کی طرح زندگی اِک راز رہی
یہ کبھی سوز رہی اور کبھی ساز رہی

یک بیک جوش میں پھر رحمت باری آئی باغ امکاں کی طرف باد بہاری آئی
دہر میں سرور عالم کی سواری آئی [۱۳] زندگی ساتھ لیے باجگذاری آئی
ساحلِ شوق پہ ہستی کا سفینہ آیا
سفرِ زیست کا انساں کو قرینہ آیا

سنگ کو اُس نے عطا قوت گویائی کی دشت کو بخشی دی جراُت چمن آرائی کی
فقر کو اس نے عطا عظمت دارائی کی [۲۰] اُس نے مجبور کو تلقین شکیبائی کی
جہد ہستی کے لئے صبر کی طاقت بخشی
اُس نے انسان کو کھوئی ہوئی عظمت بخشی

صبر ہی مرحلۂ امر و نہی کی تکمیل صبر ہے تکملۂ بندگیٔ ربِ جلیل
یہ رسولانِ اولوالعزم کی عظمت کی دلیل [۲۶] صبر بندوں کے لئے قرب الٰہی کی سبیل
صبر منجملۂ اوصاف رسالت ٹھہرا
صبر کا وصف بھی ایماں کی ضرورت ٹھہرا

سر طائف کرم و جود و عنایت بھی ہے صبر فتح مکہ ہو تو پروانۂ رحمت بھی ہے صبر
شب ہجرت ہو تو عنوان عزیمت بھی ہے صبر [۲۹] کربلا ہو تو تمنائے شہادت بھی ہے صبر
صبر یثرب میں رسولؐ عربی کا شیوہ
کربلا ہو تو یہی سبطِ نبی کا شیوہ

کربلا، ظلم سے جو آج بھی لیتی ہے خراج کربلا، جور کو رکھتی ہے جو آشفتہ مزاج
کربلا، صبر کی تھی صبح ازل سے محتاج [۳۰] کربلا، صبرِ رسولِ عربی کی معراج
صبر کو معرکہ اک اور یہ سر کرنا تھا
صبر کے نقش میں خونِ رگ جاں بھرنا تھا

اور اس صبر اور خون رگِ جاں سے بات آگے بڑھی تو فضائلِ حسینؑ کی روشن راہوں

سے گذرتے ہوئے سمند فکر، رزم، قتال، تلوار کے تذکروں کی منزلوں سے گذر کر شہادت حسین تک پہنچا ـــــ

اثر جلیلی کا یہ مرثیہ ۶۳ بندوں پر مشتمل ہے ـــــ پہلے بند سے تیسویں بند تک جو تسلسل فکر و نظم ہے اُسے میں نے مختصر کرنے کے لئے صرف سات بند نقل کئے ہیں اور کوشش کی ہے کہ جہاں جہاں گریز ہو رہا ہے اور نیا منظر نامہ سامنے آ رہا ہے وہاں ربط نہ ٹوٹے، اس کے بعد کے ۳۳ بندوں میں نفس مضمون اور منظر کشی بہت ہے جو لفظوں پہ اثر جلیلی کی گرفت کا اظہار ہے اور قدیم و جدید کے سنگم کی کیفیت طاری کرتی ہے۔

☆☆☆☆☆

منیب امروہوی :- (کراچی)

ولادت ۱۹۰۲ء وفات ۱۹۸۱ء

نام سید منیب حسن، تخلص عظیم امروہوی نے حسن لکھا ہے۔ ہلال نقوی نے منیب لکھا ہے۔ نقوی سید وطن امروہہ۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے، کراچی میں سکونت اختیار کی ـــــ امروہہ میں تعلیم پائی۔ زندگی کی جدوجہد کا آغاز محکمہ جنگلات کی ملازمت سے کیا۔ بعد ازاں فوج میں بھرتی ہو گئے، فوج کی ملازمت کے دوران ایران و عراق کے مقامات مقدسہ کی زیارت کا شرف ملا۔

کراچی میں جن دنوں مرثیے کی فضا بن رہی تھی اُن دنوں منیب امروہوی کراچی آئے ہجرت اور فرقہ وارانہ فسادات میں خون کی ہولی کھیلی گئی، منیب امروہوی نے اسے اپنے مراثی میں نظم کیا ہے ۔

انساں کا مقدر ہوئے صدمات پہ صدمات لائے ہیں نئے زخم بدلتے ہوئے حالات
یہ خون کی ہولی، یہ ہلاکت یہ فسادات بکرتا ہی نہیں آج محبت کی کوئی بات
رُخ عالم ہستی کا مروّت سے پھرا ہے
انسان عداوت کے اندھیروں میں گھرا ہے

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ منیب امروہوی مرثیے کی روایات میں محدود شاعر نہیں تھے بلکہ روایت کی خاطر خواہ پاسداری کے ساتھ اُنہوں نے محسوسات اور مشاہدے کو بھی

مرثیے میں نظم کیا ہے — روایت کی پاسداری میں حضرت قاسم ابن حسنؑ کا رجز منیب امروہوی نے کچھ اس طرح نظم کیا ہے۔

کم بخت جان لے کہ حسنؑ کا میں لعل ہوں بہر نبرد آیا ہوں گو خوردِ سال ہوں
قہر خدا ہوں اور غضب ذوالجلال ہوں فن جنگ کے دکھانے میں بھی باکمال ہوں
ہاں اولین تیغ کوئی کھینچ کر تو دیکھ
نامی جو پہلواں ہو اسے بھیج کر تو دیکھ

سید منیب حسن امروہوی کے ۱۰ مراثی ریکارڈ پر موجود ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اے خدا مجھ کو سخن ساز تخیل ہو عطا ۱۹۶۷ء
۲۔ کاتب تقدیر نے قسمت میں لکھا غم میری ۱۹۶۷ء
۳۔ گہوارۂ اصغر کی کہانی لکھوں ۱۹۶۸ء
۴۔ خلق خدا پہ ظلم روا کس طرح ہوا ۱۹۷۱ء
۵۔ ٹاپ سے گونج گیا دشت دغا ۱۹۷۲ء
۶۔ کربلا فکر کی تجلی ہے ۱۹۷۶ء
۷۔ انسان آدمیت و طاعت کا نام ہے ۱۹۸۱ء

جن مرثیوں کے متعلق تصدیق نہیں ہو سکی کہ کس سنہ میں کہے گئے ہیں۔

۔ یارب یہاں خوشی کا تصور محال ہے ۵۳ بند پر مشتمل
۔ دولت دین و خرد ذات رسالت مآب ۲۰ بند
۔ عمل کی اک کتاب ہے حسین کی بصیرتیں ۳۹ بند

جن حالات سے گذر کر وہ کراچی پہنچے تھے اُن کے پیش نظر امکان ہے کہ پاکستان میں اُن کا پہلا مرثیہ۔ ''یارب یہاں خوشی کا تصور محال ہے'' ہو۔ اور ایک مرثیہ ۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۶ء کے درمیان اور ایک ۱۹۷۶ء اور ۱۹۸۱ء کے درمیانی وقفہ میں کہا گیا ہو۔ مراثی میں بین کے حصے میں منیب روایتی مصائب کے قائل نظر آتے ہیں۔

بھائی کی یاد آئی تو روئے امام پاک چلّائے بھائی بھائی بہ آوازِ درد ناک
دیکھو تو بھائی میرا کلیجہ ہے چاک چاک بھائی بغیر بھائی کی اس زندگی پہ خاک

عالم تھا بے کسی کا بھتیجہ تھا سامنے
اور تھے امام وقت، نتیجہ تھا سامنے

امام حسینؑ کا یہ آوازِ دردناک چلاّنا یا عالم بیکسی سے دوچار ہونا کلاسیکی بین کا رائج کردہ ہے۔ جدید مرثیے میں تو اے لاشوں کے درمیان کھڑے ہوئے حسینؑ اپنے آخری خطبے میں یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ اب بھی راہِ راست پر آجاؤ تو سارے خون معاف کئے جاسکتے ہیں۔

منیب امروہوی صرف مرثیہ نگار شاعر ہی نہیں اپنی ذات میں ایک انجمن شاعر تھے۔ اُنہوں نے شاعری کے علاوہ مرثیے پر کام بھی کیا ہے اور ایک ذاتی ذخیرۂ مراثی بھی قائم کیا تھا جس کا ثبوت ہلال نقوی کا یہ اقرار ہے کہ حضرت رئیس امروہوی کے والد گرامی شفیق حسن ابلیاء کا ایک مرثیہ منیب امروہوی کے قلمی ذخیرے سے ملا ہے۔

(بیسویں صدی اور جدید مرثیہ۔ ص ۸٦٧)

فرزندان منیبؔ امروہوی پاکستان میں ہیں اور بحمد اللہ خوش حال ہیں یقیناً اُنہوں نے میراث پدر کو سینے سے لگا رکھا ہوگا۔ کیا اچھا ہو کہ وہ حضرت منیب امروہوی کے مراثی شائع کرا دیں تا کہ یہ امانت محفوظ ہو جائے۔

☆☆☆☆☆

سعید جونپوری :- (کراچی)

ولادت؟۔ وفات ۱۹۸۲ء

نام سید سعید حسن۔ تخلص سعید۔ جونپور کے بڑے علمی خانوادے سے تعلق تھا۔ اُن کے والد گرامی سید حبیب حسن اپنے زمانے کے جانے پہچانے صحافی تھے اور سید جالب دہلوی کے شاگرد تھے۔ سعید جونپوری کو گھر میں علمی ادبی ماحول ملا۔ شاعرے کی ابتدا قصیدہ گوئی سے کی۔ کسی کے باقاعدہ شاگرد نہیں تھے۔ ان کا ذوق سلیم اور اس ہنر کی ودیعت فطری عطا تھی۔ مشاعروں کے مقبول شاعر تھے۔ بدیہہ گو تھے۔ غزلیں، نظمیں، سلام، منقبت، نوحے، حتیٰ کہ مراثی بھی خوب کہے ہیں۔

سعید جونپوری ۱۹۵۴ء میں پاکستان آئے۔ ستائیس برس ہاؤس بلڈنگ فائینینس کارپوریشن میں ملازمت کی۔ یہ ادارہ مکانات کی تعمیر کے لئے قرضے دیتا ہے۔ اس کے ملازمین نے

قرض لے کر بڑے بڑے بنگلے بنائے ہیں لیکن سعید جونپوری کی دیانت اور قناعت نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ اپنی پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر قرض لیں اور بنگلہ بنائیں۔ انہوں نے کم وسائل والے افراد کی بستی کورنگی کے کوارٹر میں رہنے کو ترجیح دی۔ اُن کے فرزند مسعود حسن نے اپنے والد پر ایک مضمون میں انکشاف کیا کہ دوران ملازمت انہیں ایک بڑے کام کے عوض پینتیس لاکھ روپے کی رشوت کی پیشکش کی گئی تھی جو انہوں نے ٹھکرا دی تھی۔ ان کے مزاج میں یہ قناعت درسگاہ کربلا کی تعلیم کا فیض تھا۔

سعید جونپوری پر بحیثیت شاعر بہت سے اکابرین اردو نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ہماری اس کتاب کا موضوع مرثیہ ہے پس ہم اس کی مرثیہ نگاری کا ذکر کر رہے ہیں۔ اس کے دو مراثی ''لب شہادت'' کی زیرعنوان حلقۂ مصنفین پاکستان کراچی نے حلقۂ شعرائے اہل بیت لاہور کے تعاون سے ۱۹۸۴ء میں (ان کی وفات کے دو برس بعد) شائع کیے ہیں۔ پہلا مرثیہ ''حصار ذہن میں ہے دور ابتدائے وفا''

حصارِ ذہن میں ہے دور ابتدائے وفا ۔۔۔ پھر اس کے بعد بتدریج ارتقائے وفا
ہے کربلائے معلّیٰ وہ منتہائے وفا ۔۔۔ عروج پہ ہے جہاں مہر مدعائے وفا
وفا علامت احساس ہوشمندی ہے
اسی کے فیض سے کردار کی بلندی ہے

وفا کی وجہ سے عباسؑ ہو گئے عباسؑ ۔۔۔ وفا کی وجہ سے عباسؑ ہیں حسینؑ شناس
علیؑ کی ذات تھی جس طرح سے رسولؐ کے پاس ۔۔۔ اسی طرح سے ہیں عباسؑ بھی حسینؑ کی آس
کوئی بتائے یہ رتبہ کسی نے پایا ہے
بتول پاک نے اپنا پسر بنایا ہے

یہ مرثیہ ۶۶ بند پر مشتمل ہے۔ دوسرا مرثیہ ''حق نے بخشا ہے مجھے مرثیہ گوئی کا شرف'' ہے جو (۵۱) اکاون بند پر مشتمل ہے۔

حق نے بخشا ہے مجھے مرثیہ گوئی کا شرف ۔۔۔ ہیں دعا گو مرے ارواحِ بزرگانِ سلف
آب دیتا ہے گہر کو در مولا کا خذف ۔۔۔ میں بھی ہوں نام خدا بندۂ درگاہ نجف
شاہ کے فیض سے منبر پہ قدم آئے ہیں
اُن کا صدقہ ہے جو یہ جاہ و حشم پائے ہیں

نا خدا دین کی کشتی کے ہیں میرے مولا اب نہ ہوگا کسی طوفان کا کوئی خدشہ
حشر تک دین محمد کا بجے گا ڈنکا دین کے سر پہ ہے زینب کی ردا کا

خون سے شاہ نے سینچا ہے گلستانِ نبی
لہلہاتا ہی رہے گا چمنستانِ نبی

مرثیہ حضرت حُر کے احوال کا مرثیہ ہے۔ بین کا انداز دیکھئے :

شور برپا تھا کہ دنیا سے کیا حُر نے سفر اُس کی فرقت سے تھے بیتاب شہِ جن و بشر
ہوا اس طرح سے شبیر کے نالوں کا اثر موم کی طرح پگھلنے لگا پتھر کا جگر

شہ کو محسوس ہوا جب سے فدائی چھوٹا
جیسے دنیا میں کسی بھائی سے بھائی چھوٹا

ہائے سادات پہ آئی یہ مصیبت کیسی گھر سے نکلے تھے کہ اُفتاد پہ افتاد پڑی
ہونے پائے نہ غمِ حُر میں کبھی کوئی کمی اس کے حق میں یہ وصیت ہے شہ والا کی

حُر پہ روئیں گے تو زہرا سے صلہ پائیں گے
آپ خود اپنے دلوں میں بھی جلا پائیں گے

سعید جونپوری بہرحال ایک پختہ گو مرثیہ نگار تھے۔

☆☆☆☆☆

جوش ملیح آبادی:-

ولادت ۵؍دسمبر ۱۸۹۸ء۔ وفات ۲۲؍فروری ۱۹۸۲ء

جائے ولادت بمقام ملیح آباد (بھارت) جائے وفات اسلام آباد (پاکستان) نام شبیر حسن خان، تخلص جوشؔ (ابتدائی دور میں شبیرؔ)۔ آفریدی پٹھان۔ والد کا اسمِ گرامی نواب بشیر احمد خان بشیرؔ۔ دادا، نواب محمد احمد خان احمدؔ۔ پردادا، حسام الدولہ، تہور جنگ نواب فقیر محمد خان گویاؔ۔

جوشؔ نے سیتاپور، لکھنؤ، علی گڑھ آگرہ اور سینئر کیمرج میں تعلیمی مدارج طے کیے۔ دارالترجمہ حیدرآباد دکن سے وابستگی (۱۹۲۵ء) کے سبب حیدرآباد میں رہے، بحیثیت مدیر آجکل دہلی، (۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۵ء تک) اور مدیر ماہنامہ کلیم، دہلی (۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۹ء) دہلی میں رہے۔ ماہنامہ نیا ادب اور ماہنامہ کلیم لکھنؤ (۱۹۴۰ء) لکھنؤ میں رہے، پاکستان آئے تو دربدری کا شکار

ہوئے اور کراچی اور اسلام آباد میں روز و شب گذارے۔ ان حالات میں یہ مرحلہ درپیش ہے کہ اُن کے نام کے ساتھ کونسا شہر وابستہ کیا جائے، زندگی کے آخری لمحے اسلام آباد میں گذارے لیکن کیا اسلام آباد کو اُن کا مسکن کہا جا سکتا ہے۔ مسکن تو وہ جگہ ہوتی ہے جہاں انسان کو سکون ملتا ہو۔

جوشؔ نے جاگیردارانہ نظام میں آنکھیں کھولی۔ نواب ابن نواب ابن نواب کی حیثیت سے اُن کی زندگی کو جس نہج پر گذرنا چاہئے تھا جوشؔ نے وہ زندگی نہیں گذرای — جاگیردارانہ نظام میں خود پسندی، مطلق انسانی، دوسروں کی حق تلفی، طاقت کو حق سمجھنا، کمزوروں کو روندنا، کسی جاگیردار کے محاسن شمار ہوتے ہیں۔ جوشؔ اس کے برعکس تھے، اُنہیں آزادی عزیز تھی، غلامی سے نفرت تھی، مظلوم کی حمایت اور ظلم و ظالم سے نفرت جوش کا کردار تھا اور یہ عظمتیں اُنہیں محمدؐ و آلِ محمدؐ کے در سے ملی تھیں۔ حسینؑ سے ملی تھیں۔ درس گاہ کربلا سے ملی تھیں۔

جوشؔ نظم کے شاعر تھے، اُن کی بہت سی بے مثال نظمیں ''فتنہ خانقاہ'' ''کہستان دکن کی عورتیں'' — 'نقاذ'، سہاگن بیوہ، جنگل کی شہزادی، ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب، شکست زندہ کا خواب، کسان، وغیرہم اُردو ادب کا سرمایہ ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ وہ مرثیے کے شاعر تھے، اس لئے کہ اُن کا پہلا مجموعۂ نظم ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا جبکہ اُن کا پہلا جدید مرثیہ ''آوازِ حق'' ۱۹۱۸ء میں سامنے آ چکا تھا۔ مرثیہ کی عنان اقتدار جن کے ہاتھ میں تھی اُنہوں نے اسے مسدس کہہ کر نظرانداز کر دیا لیکن جمیل مظہری ایسے صاحبان فکر نے اسے 'بانگ درا' سمجھا۔ جدید مرثیے کا سفر جو مرزا اوجؔ نے شروع کیا تھا، جوشؔ کا آوازۂ حق، اس سفر کا پہلا سنگِ میل بنا۔ دوسرا قدم علامہ جمیل مظہری کا ''عرفان عشق'' اور تیسرا قدم جوش کا ''حسینؑ و انقلاب'' (۱۹۴۱ء) تھا'' آوازۂ حق'' کا آغاز 'خدائے دو جہاں' کے شکر سے ہوا اور اختتام پر ذکر شہادت حسینؑ کے بعد ملت کے دلوں میں مقصدِ شہادت حسینؑ کو اجاگر کیا گیا تھا، یہ پکار، یہ للکار، یہ احساس فرض مرثیے میں ایک نئی جہت تھی۔ ایک نیا موڑ تھا۔

مرثیے کی ابتدا ۔

کیوں کر نہ کروں شکر خدائے دو جہاں کا
بخشا ہے میرے دل کو مزا سوز نہاں کا

مرثیے کا اختتام:

رُک رُک کے جو تلوار چلی خشک گلے پر زہرا کی صدا آئی کہ آہستہ ستم گر
حیدر نے بڑے پیار سے زانو پہ لیا سر گردوں کی طرف دیکھ کے بولے یہ پیمبر[۸۲]
شکوہ نہیں نکلا میرے پیاسے کے لبوں سے
نکلی ہے میری روح نواسے کے لبوں سے

ناشاد تیری بیکسی و یاس کے قرباں نازک یہ تیرا جسم، یہ تپتا ہوا میداں
ٹکڑے یہ بدن کے ہیں تیرے خون میں غلطاں ذرّوں پہ ہیں قرآن کے اوراق پریشاں[۸۳]
بے کس تیرے اکبر کی جوانی کے تصدق
مظلوم تیری تشنہ دہانی کے تصدق

اور اب جوش کا انداز۔ جوش کا پیغام مقطع کے بند نذر قارئین ہیں ۔

اے جوشؔ یہ اب تک ہے اسی خون کی تاثیر ہوتی ہے بالاعلان بڑی شان سے تکبیر
اب بھی جنہیں ملتی ہے رہِ عشق میں تعزیر صد شکر کہ خوش ہو کے پہن لیتے ہیں زنجیر[۸۸]
ڈرتے ہی نہیں دیکھ کے جلاّد کی صورت
زنداں میں چلے جاتے ہیں سجاّد کی صورت

بے درد کی حسرت کو نکلتے نہیں دیکھا کاغذ کی کبھی ناؤ کو چلتے نہیں دیکھا
ظالم کو کبھی پھولتے پھلتے نہیں دیکھا ٹھوکر ہے یہ وہ جس سے سنبھلتے نہیں دیکھا[۹۰]
وہ تخت ہے کس قبر میں، وہ تاج کہاں ہے
اے وقت بتا، زورِ یزید آج کہاں ہے

اے قوم وہی پھر ہے تباہی کا زمانہ اسلام ہے پھر تیر حوادث کا نشانہ
کیوں چپ ہے اسی شان سے پھر چھیڑ ترانہ تاریخ میں رہ جائے گا مردوں کا زمانہ
مٹتے ہوئے اسلام کا پھر نام جلی ہو
لازم ہے کہ ہر فرد حسینؑ ابنِ علیؑ ہو

مرثیے کے نام پر، ذکرِ حسین کے نام پر، عزائے سید الشہدا کے نام پر جوشؔ نے ۱۹۱۸ء میں جو پیغام دیا تھا وہ آج اکیسویں صدی کا پیغام بھی ہے۔ سچ ہی تو ہے غمِ حسینؑ، ذکرِ حسینؑ، مودّتِ حسین اور ان احساسات سے منسلک جذبات کو دوام حاصل ہے۔

اپنے دوسرے مرثیے ''حسینؑ اور انقلاب'' میں جوشؔ نے امام حسینؑ کو انسانیت کا آئیڈیل کہا ہے۔ ''آوازۂ حق'' کا اختتام ہوا تھا اس پیغام پر کہ ''لازم ہے کہ ہر فرد حسین ابن علی ہو'' اور ''حسین اور انقلاب'' میں حسینؑ کاروان عزم کے رہبر، فن جدید کے بانی اور انقلاب فکر و نظر کے داعی اور جبر کے خلاف صبر کی ناقابل تسخیر طاقت نظر آتے ہیں ۔

تاریخ دے رہی ہے یہ آواز دم بدم دشتِ ثبات و عزم ہے، دشتِ بلا و غم
صبر مسیح و جرأت سقراط کی قسم[۲۷] اس راہ میں ہے صرف اک انسان کا قدم
جس کی رگوں میں آتش بدر و حُنین ہے
اس سورما کا اسم گرامی حسینؑ ہے

جو کاروانِ عزم کا رہبر تھا وہ حسینؑ خود اپنے خون کا جو شناور تھا وہ حسینؑ
اک دین تازہ کا جو پیمبر تھا وہ حسینؑ[۳۱] جو کربلا کا داور محشر تھا وہ حسینؑ
جس کی نظر پہ شیوۂ حق کا مدار تھا
جو روح انقلاب کا پروردگار تھا

یہ صبح انقلاب کی جو آج کل ہے ضو یہ جو مچل رہی ہے صبا، پھٹ رہی ہے پو
یہ جو چراغ ظلم کی تھرا رہی ہے لو در پردہ یہ حسینؑ کے انفاس کی ہے رَو
حق کے چھڑے ہوئے ہیں جو یہ ساز دوستو
یہ بھی اُسی جری کی ہے آواز دوستو

اور پھر وہی جوشؔ کے کلام کی تازگی۔ درد و فکر کی آفاقیت، ۱۹۴۱ء میں کہی ہوئی بات جو اکیسویں صدی میں بھی تر و تازہ ہے —

پھر حق ہے آفتاب لب بام اے حسینؑ پھر بزم آب و گل میں ہے کہرام اے حسینؑ
پھر زندگی ہے ست و سبک گام اے حسینؑ[۵۷] پھر حریت ہے موردِ الزام، اے حسینؑ
ذوق فساد و ولولۂ شر لئے ہوئے
پھر عصر نو کے شمر ہیں خنجر لئے ہوئے

ہاں خاتم حیات ابد کا نگیں ہے تو گردونِ دارو گیر کا مہر مبیں ہے تُو
اک زندہ حدِّ فاصل دنیا و دیں ہے تُو کونین کا تخیل عہد آفریں ہے تو

پھر دشتِ جنگ کو ہے تیرا انتظار، اُٹھ
اُٹھ روز گار تازہ کے پروردگار، اُٹھ

اور پھر وہی پکار جو جوش کا مزاج ہے ؎

اے دوستو فرات کے پانی کا واسطہ آلِ نبی کی تشنہ دہانی کا واسطہ
شبیر کے لہو کی روانی کا واسطہ[۶۲] اکبر کی ناتمام جوانی کا واسطہ
بڑھتی ہوئی جوان اُمنگوں سے کام لو
ہاں تھام لو، حسین کے دامن کو تھام لو

تیسرا مرثیہ موجد و فکر (۱۹۵۶ء) ؎ ''مسکرا کر جب ہوئی طالع تمدن کی سحر'' تخلیق کائنات سے شروع ہو کر ارتقائے بشر، ایجادات، اور کردار بشر معیار عظمت بشر کی منزل تک:

سونپتا ہے جو قلندر کو کلاہ قیصری جو بناتا ہے زمیں کو آسماں کا مشتری
چاکری کے سر پہ رکھتا ہے جو تاجِ سروری[۴۴] بندگی کو بخشتا ہے جو مزاجِ داوری
کھولتا ہے بابِ خودیابی جو یوں انسان پر
ابن آدم جھومنے لگتا ہے اپنی شان پر

شام بدنظمی کو دیتا ہے جو صبح انتظام باغِ دل میں نصب کرتا ہے جو دانش کے خیام
ڈالتا ہے دشتِ فطرت میں جو طرح سقف و بام[۴۶] بخشتا ہے جسم حکمت کو جو اعصابی قوام
فکر و قول و فعل پر رہتا ہے جو چھایا ہوا
جگمگا اُٹھتا ہے جس سے قلب گہنایا ہوا

اور پھر وہی دردمندانہ پکار ؎

کچھ خبر بھی ہے محبانِ حسینؑ دوربیں موت ہے شبیریت کے دائرے میں انگبیں
اتباعِ مرشدِ حق پرور عہد آفریں[۸۵] کاروبارِ مرگ ہے بازیچۂ طفلاں نہیں
زہر سے لبریز ہے جام حسین ابن علیؑ
جان دنیا ہو تو لو نام حسین ابن علیؑ

رعب سلطانی کو ٹھکراؤ تو لو نام حسینؑ بولتے رن میں نہ گھبراؤ تو لو نام حسینؑ
دشمنوں کی پیاس بجھواؤ تو لو نام حسینؑ موت کی چھاتی پہ چڑھ جاؤ تو لو نام حسینؑ

حلق سے تیغوں کا منہ موڑ دو تو لو نام حسینؑ
برگ سے فولاد کو توڑ دو تو لو نام حسینؑ

عزت دستور پہ جو سر کٹا سکتا نہیں جو خود اپنے ہی چراغوں کو بجھا سکتا نہیں
تان کر سینے کو جو میدان میں آسکتا نہیں [۹۰] موت کو جو اپنے کاندھے پر اُٹھا سکتا نہیں
ہاں خود اپنے خون میں کشتی جو کھے سکتا نہیں
وہ حسینؑ ابن علیؑ کا نام لے سکتا نہیں

پھر حیات نوع انسانی ہے کجلائی ہوئی گل پڑے ہیں ولولے، جرأت ہے مرجھائی ہوئی
پھر زمین و آسماں پر موت ہے چھائی ہوئی [۱۱۰] موت بھی کیسی، خود اپنے ہاتھ سے لائی ہوئی
چہرۂ اُمید کو رخشندگی دے، یا حسینؑ
زندگی دے، زندگی دے، زندگی دے یا حسینؑ

ہونکتا پھرتا ہے پھر سرمایہ داری کا وقار اُٹھ چکا ہے پھر عوامی برتری کا اعتبار
پھر خزاں کی آستاں بوسی پہ نازاں ہے بہار پھر خدا کا ذوق تخلیق بشر ہے شرمسار
پھر زبوں ہے نفس انسان کی حالت، یا حسینؑ
آ کہ پھر دنیا کو ہے تیری ضرورت یا حسینؑ

جوشؔ کا چوتھا مرثیہ ''وحدتِ انسانی'' ہے۔ ''اے دوست دل میں گرد کدورت نہ چاہیے'' ہے۔ اس مرثیہ میں باہمی محبت اور عظمت انسانی کی تبلیغ میں جوشؔ اس منزل تک آتے ہیں۔

قاتل بھی ہو رہا ہو اگر پیاس سے نڈھال پانی اسے پلا کہ یہی ہے وہ کمال
دشمن بھی گر رہا ہو تو ہاں دوڑ کر سنبھال [۳۲] تھوکے بھی کوئی منہ پہ تو ماتھے پہ بل نہ ڈال
دل کی سپر پہ غیظ کا ہر وار روک لے
تار نگاہ لطف پہ تلوار روک لے

قاتل کو پانی پلانا'' حضرت علی کا ابن ملجم کو پانی پلانا اور کربلا کے سفر کے دوران حرؑ کے پیاسے لشکر کو پانی پلا کر موت سے بچانے کے حوالے ہیں'' منہ پر تھوکنا بھی میدان جنگ میں علی کی قوت برداشت کا حوالہ ہے۔ انسانیت اور اسلام دونوں عفو اور درگذر کے ذریعے اتمام حجت کا حکم دیتے ہیں لیکن جب پانی سر سے گذر جائے تو۔

یعنی زمیں پہ فتنہ ہو جس وقت بارور انسانیت کے صحن میں اڑنے لگے غبار
آئینِ اجتماع میں پیدا ہو انتشار[۴۵] ساکن معاشرے میں تزلزل ہو آشکار
اور یہ نظر پڑے کہ زمیں داد خواہ ہے
اس وقت خوئے مہر و محبت گناہ ہے

اور پھر ایسے ہی ایک دور میں جب ۔

صحرا کو تھی حکومت بستاں کی آرزو دیو سیاہ کو، تختِ سلیماں کی آرزو
بد رُو کو، حسنِ یوسفِ کنعاں کی آرزو ابلیس کو جلالتِ یزداں کی آرزو
پھر تاج گر رہا تھا سر مشرقین کا
منہ تک رہی تھی گردش دوراں حسینؑ کا

ایسے میں اک غبار اُٹھا زر نگار سا کانپا، پھٹا، فضا پہ ہوا چاک، چھٹ گیا
خوشبوئے مصطفیٰ سے مہکنے لگی فضا دیکھا کہ آرہا ہے خداوندِ کربلا
دشت خزاں میں رنگ بہاراں لئے ہوئے
زہرا کے مہ وشوں کا گلستاں لئے ہوئے

اب جوش کی نگاہ میں کربلا ایک بے آب و گیاہ، تپتا ہوا میدان نہیں بلکہ ایک ایسی اہم جگہ جس کا مالک خوشبوئے مصطفیٰ کا وارث حسینؑ ہے۔ کربلا کو جوش نے ایک درسگاہ کی حیثیت میں بھی پیش کیا ہے اور اس کی تجسیم کر کے کربلا کو ظلم و جور سلطنت و حکمرانی کے خلاف ایک فعال قوت بنا دیا۔ جوش کے پانچویں مرثیے "طلوع فکر" ۱۹۵۷ء چھٹے مرثیے "عظمت انسان" (جس کا ایک نام "قلم" بھی ہے) میں جوش نے کربلا کا تعارف کرایا ہے

کربلا ہے ایک تزلزل ہے محیط دوراں کربلا خرمن سرمایہ پہ ہے برقِ تپاں
کربلا طبل پہ ہے ضربتِ آوازِ اذاں[۸۵] کربلا جرأت انکار ہے پیشِ سلطاں
فکرِ حق سوز یہاں کاشت نہیں کر سکتی
کربلا تاج کو برداشت نہیں کر سکتی

جب تک اس خاک پہ باقی ہے وجود اشرار دوشِ انساں پہ ہے جب تک حشم تخت کا بار
جب تک اقدار سے اغراض ہیں گرم پیکار[۸۶] کربلا ہاتھ سے پھینکے گی نہ ہرگز تلوار

کوئی کہہ دے یہ حکومت کے نگہبانوں سے
کربلا اک ابدی جنگ ہے سلطانوں سے

اور کربلا کا یہ پیغام، کربلا کا یہ درس مسلسل ہے۔

کربلا اب بھی حکومت کو نگل سکتی ہے   کربلا تخت کو تلوں سے مسل سکتی ہے
کربلا خار تو کیا، آگ پہ چل سکتی ہے   کربلا وقت کے دھارے کو بدل سکتی ہے
کربلا قلعۂ فولاد ہے جرّاروں کا
کربلا نام ہے چلتی ہوئی تلواروں کا

جوشؔ نے مرثیے کو نیا آہنگ دیا ہے۔ جوش نے مظلومیت اور صبر کو رونے رلانے اور گریہ وزاری کی علامت کے برعکس انسانیت، باعزت زندگی، اصول پرستی، حریت اور انقلاب فکر ونظر کی رہنما طاقت بنایا ہے۔ جوش مرثیے کو امام بارگاہ سے باہر لائے ہیں اور عالمی تناظر میں حسینؑ اور رفقائے حسینؑ کے کرداروں کو نمائندہ زندگی، قابلِ تقلید زندگی کی علامتیں بنایا ہے — اُن کے ہر مرثیے کا عنوان جدا ہے لیکن پیغام ایک ہی ہے۔ جوش کے دس مرثیے مطبوعہ ہیں۔ جوش کا یہ دعویٰ غلط نہیں ہے کہ

قطرے کو فشاروں تو قلزم برسے
تلوار کو دھاروں تو شبنم برسے
الفاظ نے بخشا ہے وہ اعجاز مجھے
شعلے کو نچوڑ دوں تو شبنم برسے

جوشؔ نے مرثیے میں بھی اس کا مظاہرہ کیا ہے، یعنی پانی کو آگ اور آگ کو پانی بنایا ہے۔ لیکن مرکزی خیال وہی ہے، عظمت حسینؑ اور پیغامِ حسینؑ جو آج بھی وہی ہے جو اُس وقت تھا۔

پھر تمدن کی طرف پھنکار کر جھپٹے ہیں ناگ   جل رہا ہے پھر عروس زندگانی کا سہاگ
کانپتی راتیں صدائیں دے رہی ہیں، آگ، آگ،   جاگ اے ابن علی کے نوحہ خوان خفتہ، جاگ
اُٹھ بھڑکتی آگ کو پانی بنانے کے لئے
کربلا آئی ہے بالیں پہ جگانے کے لئے

☆☆☆☆☆

کرّار جونپوری:- (کراچی)

ولادت ۱۹۱۰ء وفات ۱۹۸۲ء

اسم گرامی سید کرّار حیدر، تخلّص کرّار، وطن جونپور۔ والد کا اسم گرامی سید محمد جعفر، زیدی سادات۔ تعلیم علی گڑھ سے انٹر پاس کرنے کے بعد کراچی آ گئے، کراچی میں سول انجینئرنگ کا امتحان پاس کیا میں انجینئر ہو گئے۔

شاعری کی ابتدا عمر ۱۲ سال ہوئی۔ مزاج میں شروع سے مزاح رچا بسا ہوا تھا اس لئے شاعری کی ابتدا بھی مزاح نگاری سے ہوئی۔ بزرگوں کو اس طرزِ سخن کی اطلاع ملی تو شاعری پر پابندی لگا دی۔ کرّار صاحب نے مذہبی شاعری شروع کر دی۔ بزرگوں نے شاعری پر سے پابندیاں اُٹھا لیں۔ کرّار جونپوری نے با قاعدہ ''ہزل'' اور ''مرثیہ'' کہنا شروع کر دیا اور اس صنفِ سخن میں جدّتیں شروع کیں لیکن خیالات اور شاعری کے مواد کی اساس تاریخ پر رکھی۔ اُن کے مشہور ''مرثیے'' ''ولادت نامے''، ''شکوہ جواب شکوہ'' اور ''محمود احمد عباسی کی وفات پر مرثیہ'' ہیں۔ یہ مرثیے اُردو ادب میں بہترین اضافہ ہیں۔ یاد رہے کہ محمود احمد عباسی کراچی میں رہتے تھے اور اُنہوں نے ایک کتاب لکھی تھی جس میں ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ امام حسینؑ کربلا میں کبھی آئے ہی نہ تھے اور کربلا میں امام حسینؑ کی شہادت، ناموسِ رسالت کی بے پردگی، خاندانِ رسالت کے ۱۸ شہدا کی روایت اور انصارِ حسینی کی شہادت سرے سے ہوئی ہی نہیں۔ یہ شیعوں کی تراشیدہ داستان ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کتاب پر مولوی عبدالحق نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں پیش لفظ لکھا تھا اور محمود احمد عباسی کی اس ہرزہ سرائی کو اہم تحقیق کا درجہ دیا تھا۔ کرّار جونپوری نے محمود احمد عباسی کے مرنے پر جو مرثیہ لکھا تھا اُس میں اس فن کو درجہ کمال تک پہنچا دیا تھا اور انوکھے انداز سے صاحب کتاب اور دیباچہ نگار کا احتساب کیا تھا۔

کرّار جونپوری کا پہلا ہی مرثیہ ''دورِ ہستی میں حریفِ غمِ ایّام ہے نیند'' معرکۃ الآرا مرثیہ ہے۔ اس مرثیے میں نیند کے ایک ایک پہلو کو نظم کیا گیا ہے — شورشِ دہر میں نیند کو وقفۂ آرام کہا۔ قلب کے لئے تسکین کا پیغام نیند۔ روح بالیدہ سحر جس کی، وہ شام نیند۔ قرآن میں اصحابِ کہف کی نیند کی تفصیلی ذکر ہے، کرّار جونپوری نے اس نیند کو نظم کیا ہے۔ سرکارِ ختمی مرتبت کی نیند سے متعلق جو حکایت مشہور ہے جس کے بعد سورج پلٹا تھا۔ کرّار نے اُن نیند کو عظمت کو سلام کیا

ہے۔ شب ہجرت بستر نبوی پر علی مشکلکشا کی نیند جو حضور کی حفاظت کے پیش نظر تھی اس نیند کا ذکر بہت عقیدت سے کہا ہے۔

نیند کا ربط بظاہر تو عبادت سے نہیں غلل آتا ہے نمازوں میں اگر ہو یہ قریں
اس کا مقصد جو پیمبر کی حفاظت ہو کہیں پھر یہی نازش تقویٰ ہے یہ فتوائے یقیں
گُلِ ایماں سے جو حاصل اسے نسبت ہو جائے
نیند منجملۂ ارکان عبادت ہو جائے

مرثیے کے آخر تک کرّار جونپوری نے حق ادا کیا ہے اور مرثیے کے لوازم کا بھی خیال رکھا ہے — رخصت کے حوالے سے امام حسین کا سکینہ سے ارشاد، کرار جونپوری کی پرواز فکر کا ایک انداز ہے۔

صبحدم مجھ سے ہے رخصت تجھے ہونا بیٹی بے سبب میرے لئے جان نہ کھونا بیٹی
چند دن کی یہ جدائی ہے نہ رونا بیٹی حشر تک پھر میری آغوش میں سونا بیٹی
اور کچھ دن میری فرقت تجھے تڑپائے گی
وادیٔ شام میں پھر چین سے نیند آئے گی

ایک بند میں بار بار یہ دُھرا کر کہ ''چند دن کی یہ جدائی ہے'' ''پھر میری آغوش میں سونا'' ''اور کچھ دن میری فرقت'' ''پھر چین سے نیند آئے گی'' — یہ اشارے جو بیٹی کو صبر کی تلقین کر رہے ہیں وہی اشارے قاری کے ذہن کو شام غریباں سے قید خانہ شام تک کا سفر کرا رہے ہیں اور قید خانۂ شام میں سکینہ کی ابدی نیند یاد دلا رہے ہیں۔ مرثیہ کا اختتام بھی نینداور بیداری پر ختم ہوتا ہے۔

کربلا ختم ہوئی، زندہ ہیں لیکن اذکار جہدِ سرور ہے دل اہل عزا میں بیدار
کیسے آرام سے سوتے ہیں شہدا کرّار خواب پر اُن کے ہے بیداریٔ کونین نثار
روح تکمیل فرائض سے سکوں پاتی ہے
مطمئن دل ہو تو کیا چین سے نیند آتی ہے

ایک مزاح گو شاعر کے مرثیوں میں اتنا ربط اتنا تسلسل اور تمام اصولوں کی پابندی حیرت انگیز بات ہے جس پر تبصرہ کرتا ہو تو صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ ''جسے وہ توفیق دے......''۔

کرّار جونپوری کا ایک اور مرثیہ'' گلزار منیت'' یعنی سرکار ختمی کے ارشاد گرامی ''الحسین

وَمِنّی وانا من الحسین“ کے حوالے سے ہے۔

گلزار مِنّیت کا گلِ تر حسینؑ ہے چرخِ شرف کا خسرو خاور حسینؑ ہے
مرکز نبی ہیں، دین کا محور حسینؑ ہے ایماں کا تابناک مقدر حسینؑ ہے
پائندہ اس سے دین کے پانچوں اصول ہیں
یہ ہے رسول پاک سے اس سے رسولؐ ہیں

ہر چند مِنّیت کی روایت ہے معتبر یہ بھی ہے آج صیدِ تنگ ظرفیٔ بشر
کچھ لوگ جانتے ہیں غلط اس کو سر بسر بہتان اسے بتاتے ہیں ختمی مآب پر
کہتا ہے اک خطیب بلاغت نظام کا
یہ قول ہی نہیں ہے، رسولؐ انام کا

بالفرض اگر یہ قولِ شہ مرسلیں نہیں شبیر ہیں رسول سے اس کا تو ہے یقیں
یہ بھی ہے سچ یزید جو بنتا امینِ دیں کلمہ نبی کا آج نہ پڑھتا کوئی کہیں
پائندہ نام بانیٔ دیں ہے حسینؑ سے
کہئے رسول ہے کہ نہیں ہے حسینؑ سے

حاصل ہے جس سے دیں کو متاع تونگری اک سجدۂ حسینؑ ہے اک ضربِ حیدری
شاہی کا نصب عین تھی اُمت کی برتری کام آگئی حسینؑ کی اسلام پروری
رکھتا نہ یہ بچا کے جو اس بد دماغ سے
لگ جاتی گھر کو آگ یزیدی چراغ سے

اس مرثیے میں پھر بڑے تسلسل کے ساتھ یزید اور حسینؑ، یزیدیت اور حسینیت کا تقابل کیا گیا ہے— تاریخ جدھر جدھر مڑتی رہی کرار جونپوری اسے قلمبند کرتے رہے۔

ہر وصف جو بشر کے لئے وجہِ زین ہے
ان سب صفاتِ خیر کا مظہر حسینؑ ہے

اس کے برعکس؛

بیداد ہے، عناد ہے، بغضِ شدید ہے
ان سب خباثتوں کا خلاصہ یزید ہے

یزید کا تخت حکومت پر بیٹھنا۔اپنی خباثتوں کے لئے دین کی تائید حاصل کرنا یزید کا پہلا مقصد تھا چنانچہ امام حسین سے سوال بیعت ہوا۔امام کا انکار، وطن چھوڑنا، راستے میں حُر کے دستہ کا امام کو روکنا، امام کا عمل، کربلا پہنچنا، یزیدی فوجوں کی تعداد حُر کا پچھتاوا، نصرت امام کے لئے جان دینا۔غرض پوری تاریخ کو کرار جونپوری نے نظم کیا ہے۔اُن کے دوسرے مراثی میں بھی یہی التزام ہے—ایک مزاح نگار شاعر سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ تاریخ کے ابواب کو اس تزک واحتشام سے نظم کرسکتا ہے۔جس طرح کرار جونپوری نے کیا ہے۔

ایں سعادت بہ زور بازو نیست۔

☆☆☆☆☆

احسن رضوی داناپوری:- (بمبئی)

ولادت ۱۵ر دسمبر ۱۹۱۱ء، وفات ۱۹۸۳ء

نام سیّد احسن رضوی قلمی نام احسن رضوی داناپوری وطن داناپور (پھلواری) بہار۔

احسن رضوی کی جنم بھومی، جدی سادات کی بستی محلہ شاہ ہے جسے کبھی پھلواری بھی کہا جاتا تھا۔اس بستی میں صدیوں پرانی خانقاہ ہے۔احسن رضوی کا گھرانا چشتیہ نظامیہ صوفیوں کا گھرانا ہے جو اس خانقاہ کی سجادہ نشینی کا حق رکھتا ہے۔احسن کے والد گرامی سید بدرالدین دو برس کی عمر میں یتیم ہو گئے تھے لہٰذا خانقاہ کی سجادہ نشینی حسن رضوی کے چچا اور پھر اُن کی اولاد کی طرف منتقل ہوگئی۔احسن کی والدہ کا انتقال ہونے کے بعد ماں کی ممتا سے محرومی، شاہ ٹولی میں خانقاہی سیاست اور عزیزوں کے رویّوں کا تکدر، آبائی مکان میں چچا اور اُن کی اولاد کی سکونت، سوتیلی ماں چاہے فرشتہ خصلت ہو اس کا سوتیلا ہونا ہی ناپختہ ذہنوں کے لئے اجنبیت کی علامت ہوتا ہے۔ان سارے عوامل نے احسن رضوی کا دل "شاہ ٹولی" سے بیزار کر دیا اور وہ ایک دن اسکول سے گھر آنے کی بجائے کلکتہ کو روانہ ہو گئے۔کلکتہ میں ماموں نے اُن کا خیر مقدم نہ کیا تو وہ رنگون چلے گئے اُن کی کتاب "مطلع حیات" میں اُن کے عزیز ترین دوست محمود سروش نے اُن کی زندگی کے حالات لکھے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ احسن رضوی کلکتہ سے رنگون، رنگون سے لاہور، پھر کراچی، پھر بمبئی بہ سلسلہ تلاش معاش گھومتے رہے اور اٹھارہ سال گھر والوں سے دور رہے۔جس میں سے چودہ برس تو گھر والوں کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ احسن کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں

جب اُن کا نام بمبئی کی فلمی صنعت میں مکالمہ نگار کی حیثیت سے چمکا تو اُن کے بھائی نے اُن سے رابطہ کیا۔

احسنؔ رضوی داناپوری اس وقت پریشان حال رہے جب تک انہیں فلمی صنعت میں کام نہیں ملا لیکن عجیب بات ہے کہ اُنہیں اس شعبۂ حیات میں آسودگی نہ ملی، اور وہ کبھی یہ پسند نہ کرتے تھے کہ اُن کی زندگی سے فلمی صنعت یا اُن کی مکالمہ نگاری کو جوڑا جائے۔

گھر سے بے گھر اور دربدری کے سبب احسن کسی اعلیٰ درسگاہ سے تعلیم حاصل نہ کر سکے البتہ اُنہوں نے گھر میں اُردو میں انتہائی، فارسی میں اعلیٰ اور عربی میں متوسط درجے کی تعلیم حاصل کی۔ چودہ پندرہ برس کی عمر میں شاعری شروع کی۔ احسن رضوی کے چچیرے بھائی طلحہ رضوی برقؔ کا کہنا ہے کہ احسن نے اپنے والد گرامی حکیم بدرالدین سے اصلاح لی لیکن محمود سروشؔ لکھتے ہیں کہ جو جذباتی دوری تھی اس کی موجودگی میں یہ ممکن نہ تھا البتہ ہندوستان میں بحیثیت شاعر نام پیدا کرنے کے بعد احسن نے علامہ آرزوؔ لکھنوی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔

احسن نے بچپن سے علمی ادبی ماحول پایا تھا۔ گھر سے نکلے تو درس گاہ حیات نے جو ناکامیاں دکھائیں احسن کے لئے مہمیز ثابت ہوئیں۔ اُنہوں نے ابتدا میں غزلیں کہیں۔ نظمیں کہیں اور بعض بہت اچھی نظمیں کہیں مگر اُن کا وسیلہ اظہار غزل رہا لیکن یہ اُن دلوں کی بات ہے جب غزل میں لب و رخسار کی علامتوں کی جگہ آنچل سے پرچم بنانے کی باتیں ہونے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے صنف نظم شاعری پر چھا گئی تھی کہ غزل نے بھی اس لفظیات اور اس اسلوب کو اپنا لیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ احسن رضوی جیسے نہ جانے کتنے شاعروں کو نشر و اشاعت کے وسائل نہ مل سکے اور پھر احسن رضوی کا رجحان طبع رثائی ادب کی طرف ہوا۔ صوفیائے خاندان سے تھے۔ اور سلسلۂ تصوف کو حضرت علیؑ سے ایک خاص نسبت ہے چنانچہ تفضیلیت احسن رضوی نے ورثے میں پائی تھی۔ عقیدہ، منقبت، سلام اور نوحوں کی طرف توجہ ہوئی تو چشمے اُبلنے لگے۔

تصانیف:

(۱)　قصائد کا مجموعہ　"نسیم کوثر"

(۲)　منقبت و سلام کا مجموعہ　"جوش فرات"

(۳)　نوحہ و سلام کا مجموعہ　"پیاسوں کی یاد"

(۴) مقتولین معاویہ ایک تحقیقی نثری کتاب

(۵) غزلوں کا مجموعہ "نشانِ منزل"

(۶) نوحوں کا مجموعہ "لہولہو"

(۷) مجموعہ مراثی "مطلع حیات"

مطلع حیات میں احسن رضوی داناپوری کے چودہ (۱۴) مرثیے شامل ہیں۔ پہلا مرثیہ۔ "خاموش ہے چراغ تمنائے کائنات" حضرت علی مرتضیٰ کی شہادت کے احوال کا مرثیہ ہے، مطلع کے بند سے ۴۳ بند تک احسن رضوی نے فضا تیار کی ہے۔ اور حضرت علی کا تعارف کرایا ہے۔

خاموش ہے چراغ تمنائے کائنات بے نور ہے نگاہِ تماشائے کائنات
شالِ عزا میں لپٹی ہے لیلائے کائنات [۱] طاری فضا پہ ہے غمِ مولائے کائنات
کھولی ہے شب نے زلف جو اس واردات پر
لہرا رہا ہے درد کا سایہ حیات پر

تارے بجھے بجھے ہیں فضا ہے اُداس اُداس پھیکی پڑی ہیں شمعیں، ضیاء ہے اُداس اُداس
بے نور آئینے کی جلا ہے اُداس اُداس [۴۳] ہر سوگوار دل کی صدا ہے اُداس اُداس
چھائی ہوئی ہے غیرتِ غم کائنات پر
بیٹھا ہوا ہے پہرہ اجل کا حیات پر

چوالیسویں بند سے مرثیہ شہادت کی طرف بڑھا ہے۔

مسجد کی سمت قصد ہوا ہے جناب کا دامن پکڑ رہی ہیں بطیں بوتراب کا
دل جیسے ڈوبنے ہی کو ہے ماہتاب کا [۴۴] نقشہ بدل رہا ہے جہانِ خراب کا
تارے فلک پہ درد میں اب ڈوبے جاتے ہیں
مولا نماز کے لئے تشریف لاتے ہیں

ہوتی ہے صبح اور اطاعت کا وقت ہے اک خاص امتحانِ مودّت کا وقت ہے
اللہ کی نماز ہے، حضرت کا وقت ہے [۴۵] سجدے میں سر ہے اور شہادت کا وقت ہے
دل میں چھپائے کینے کو دشمن ہے گھات میں
ہے محو ذاتِ مرتضوی، حق کی ذات میں

اس کے بعد دس بندوں میں شہادت اور کائنات پر اس شہادت کو نظم کیا گیا ہے۔

دوسرا مرثیہ ۔ ''زندگی راز بھی ہے، پردہ در راز بھی ہے'' جس کا چہرہ زندگی کی مختلف جہتوں اور مختلف رنگوں کی عکاسی کرتا ہے اور گریز حضرت علیؑ کی زندگی کی طرف لے جاتا ہے۔۔

اُن کو معلوم ہے ہستی کا تقاضا کیا ہے اصل کیا جلوے کی ہے، جلوے کا پردہ کیا ہے
زندگی چیز ہے کیا اس کی تمنا کیا ہے[16] دام تو ہم بھی لگا لیتے ہیں سودا کیا ہے
راز جو حق کے ہیں وہ حق کے ولی سے پوچھو
کس طرح جیتے ہیں دنیا میں علی سے پوچھو

یہ مرثیہ بھی حضرت علیؑ کی شہادت کے احوال کا ہے مگر اس میں بین کا انداز مختلف ہے۔

شب غربت کے بعد جب وقت آخر آیا اور مولا کی نظر زینب پر پڑی تو مولا کو سیدہ فاطمہ زہرا یاد آئیں۔ سیدہ کے صبر سے کربلا میں آل سیدہ کے صبر تک کا سارا نقشہ مولا کی چشم تصور کے سامنے آ گیا۔ مولا نے بچوں کو جو وصیت کی وہ احکام بھی ہیں اور وصیت بھی اور دل دردمند کے لئے بین بھی۔ عباس کا ہاتھ حسینؑ کے ہاتھ میں دیکر جو ارشاد فرمایا تھا احسن رضوی نے اسے خوبی سے نظم کیا ہے۔

بھائی کا بھائی بھی ہے اور فدا کار بھی ہے قوت لشکر دیں بھی ہے علمدار بھی ہے
یہ بہشتی بھی تمہارا ہے، طلب گار بھی ہے ہاتھ کٹ جائیں تو پھر جعفر طیارؔ بھی ہے
وقت پڑنے پہ تمہارے یہی کام آئے گا
بڑھ کے خود ڈھال بلاؤں میں یہ بن جائے گا

تیسرا مرثیہ ۔ ''فروغِ مطلعِ انوار بائے بسم اللہ'' ایک بار پھر حضرت علیؑ کی منقبت سے شروع ہوتا ہے۔

فروغ مطلع انوار بائے بسم اللہ کفیل مقصد اطہار، بائے بسم اللہ
کلید مخزن اسرار بائے بسم اللہ سرِ بلندیٔ افکار بائے بسم اللہ
سند کی مہر ہے توثیق عہد نامہ ہے
یہ نقطہ وہ ہے کہ سجدہ گذار خامہ ہے

احسن رضوی داناپوری کے مراثی میں حضرت علیؑ کی منقبت کے مختلف انداز اس بات پر

دلالت کرتے ہیں کہ یہ مدح سرائی، یہ منقبت صرف عقیدہ کے سبب ہی نہیں ہے بلکہ ایسا لگتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی زندگی احسن رضوی کا آئیڈیل تھی۔

تاریخ اور بین کو نظم کرنے میں احسنؔ رضوی نے بہت احتیاط سے کام لیا ہے اور تاریخی معاملات میں صحت اور بین میں خانوادۂ رسالت کی عصمت اور مظلومیت کا لحاظ رکھا ہے۔ یہی محاسن مرثیے کو جدید مرثیے کی صف میں جگہ دلاتے ہیں اور احسنؔ کے تمام مرثیے جدید مرثیے کی معیار پر پورے اُترتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

ہوش عظیم آبادی:-

ولادت جنوری ۱۹۲۱ء۔ وفات ۱۹۸۴

نام سید ارتضیٰ حسین، تخلص ہوش، جائے ولادت و وفات متین گھاٹ عظیم آباد (پٹنہ)۔ ننہال خاندانی رؤسا کا گھرانا۔ والد کا اسم گرامی نواب سید وارث حسین۔ پیدائش کے بعد بیس برس تک ننہال میں رہے اس کے بعد اپنی دادھیال واقع دولی گھاٹ پٹنہ آگئے ۸ رمئی ۱۹۴۷ء کو حکومت بہار کے محکمہ اطلاعات ونشریات میں اُردو مترجم کی جگہ پر بحال ہوئے اور ترقی کر کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہو گئے۔ اگست ۱۹۸۴ء میں انتقال ہوا اور فصل پورہ قبرستان میں دفن ہوئے۔

(مقالہ ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، مطبوعہ آواز دہلی یکم نومبر ۱۹۸۵ء)

ہوشؔ عظیم آبادی نے مرثیہ نگاری کا آغاز ۱۹۵۵ء میں کیا۔ حضرت زار عظیم آبادی سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ ۱۹۵۵ء میں ہی ۱۹ر صفر کو اسماعیل منزل پٹنہ کے عزاخانے میں پہلی بار مرثیہ پڑھا۔ اس کے بعد دو درجن کے لگ بھگ مرثیے کہے۔

> ''ہوش کے مراثی میں چہرہ فلسفیانہ ہوتا ہے اور مضامین کا تنوع چہروں میں نمایاں ہوتا ہے، مثال کے طور پر غزل و وجدان کے عنوان سے ۸۰ بندوں کے مرثیے میں پیاس کو موضوع سخن بناتے ہوئے اسے کربلا میں پیاس کی شدت سے ہم آہنگ کیا گیا ہے—ایک اور مرثیے میں اُنہوں نے عظیم آباد کی ادبی تاریخ کو چہرے میں بیان کرنے کے بعد ''گریز'' شروع کیا اور اس دبستان ادب کی بربادی کے مناظر

اُبھارنے کے بعد کربلا میں خانوادۂ رسالت کی بربادی کی طرف خیالات
کو بڑے فنکارانہ انداز میں موڑا ہے۔"

(ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کا تبصرہ)

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد نے جس مرثیے کا حوالہ دیا ہے اس میں بہار کے ادبی نقصانات میں
ہوش عظیم آبادی نے اپنے استاد حضرت زار عظیم آبادی کی وفات حسرت آیات کو بھی یاد کیا ہے ۔

کل کی ہے بات کہ تھے زار سخنور ہم میں	بحر ذخار معانی کے سمندر ہم میں
اللہ اللہ یہ قد و قامت کہتر ہم میں	وزن میں تھے جو ہمالہ کے برابر ہم میں
کیا گرانی تھی یہ میزان سخن سے پوچھو
قیمت و قدر کو ان کے دل فن سے پوچھو

بقول ڈاکٹر ارشد۔ ہوش کے مراثی کے چہروں میں مضامین کا تنوع ملتا ہے، ظاہر ہے
کہ تنوع کی تلاش میں وہ کون و مکاں کی نیرنگیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو علم و معرفت کے طلسم کدے
اُن کی نگاہوں کے سامنے حیرت کدہ بن کر اُبھرتے ہیں اور جب عقل و ہوش کی ہم آہنگی اور جذبہ و
احساسات کی ہم آمیزی کے ساتھ ذہن و دل کی کلید سے ان طلسم زاروں کے رازہائے سربستہ تک پہنچتے
ہیں تو اُن کے مراثی کے چہرے بن جاتے ہیں۔ ان منازل پر ہوش فنی اعتبار سے اپنے اُستاد حضرت
زار عظیم آبادی سے استفادہ کرتے ہیں تو فکری سطح پر جمیل مظہری کا تتبع کرتے دکھائی دیتے ہیں ۔

ہم پہ روشن ہے کہ قانون مشیت کیا ہے	منزل دہر میں انساں کی ضرورت کیا ہے
عشق کیا چیز ہے اخلاص کی قیمت کیا ہے	جس کو کہتے ہیں محبت، وہ محبت کیا ہے
کس طرح شوق سے طے راہ رضا کرتے ہیں
کیوں کہ ارباب وفا، عہد وفا کرتے ہیں

قابل دید ہے، ہر شام و سحر کا عالم	ذوق نظارا ہے اور جذب اثر کا عالم
اُف یہ حیرت کدۂ فکر و نظر کا عالم	کہ میری بے خبری میں ہے خبر کا عالم
ذہن ہر حال میں آزاد خیالوں کے لئے
عقل ہر گام پہ مجبور سوالوں کے لئے

کون بتلائے کہ جذبوں کا یہ انداز ہے کیا	ہر نفس ذوق نظر کی یہ تگ و تاز ہے کیا

جب عیاں اصل حقیقت ہے تو پھر راز ہے کیا اب ہر اک موج تفکر پہ یہ آواز ہے کیا

تشنگی میرے تحیّر کی بجھادے کوئی
کاش جو کچھ پس منظر ہے دکھا دے کوئی

یہی تلاش، یہی جستجو ہوشؔ عظیم آبادی کو صداقتوں کے نگر تک لے گئی اور اُن کی پہچان بن گئی۔ مقصد ذبح عظیم کیا تھا؟ یہ سوال جوشؔ نے بھی اُٹھایا ہے اور جمیل مظہری نے بھی۔ زار عظیم آبادی نے بھی اس موضوع پر نظم کہی ہے۔ ہوشؔ نے ذبح عظیم (واقعات کربلا اور شہادت حسین کو) انسانیت کی عظیم ترین فتح قرار دیتے ہوئے تعمیری مقاصد کی نشاندہی کی ہے۔ اُن کے مراثی میں الم انگیز فضا پیدا کرنے سے زیادہ مقاصد کی تعمیر اور عظمت خانوادۂ رسالت کا اظہار ہے۔ اُنہوں نے مراثی میں کرداروں کی منظر کشی اور اُن کا لب ولہجہ حفظ مراتب کے لحاظ سے رکھا ہے مثلاً سیدہ زینب کے بچے عون ومحمد۔ اپنی خوردسالی کے باوجود کربلا کو سمجھ رہے ہیں اور خود کو قربانی کے لئے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن تہذیب خانوادۂ رسالت کا تقاضہ ہے کہ ماں سے اجازت لیں۔ اجازت طلبی کا جو انداز ہوشؔ عظیم آبادی نے پیش کیا ہے وہ اس خانوادے کی عظمت، تہذیب اور حالات کے پیش نظر کتنا حقیقی ہے۔

ماں سے کی عرض یہ بچوں نے بصد حسن طلب دیں اجازت تو کہیں آپ سے اپنا مطلب
پیار سے بولیں کہ ہاں ہاں کہو، مانع ہوں میں کب جوڑ کر ہاتھوں کو دونوں ہوئے گویا بہ ادب

حسرتیں آپ جو چاہیں تو برآئیں اماں
ہم بھی مانند علیؑ جنگ پہ جائیں اماں

ہوشؔ کی شاعرانہ مہارت کو پرکھنے کے لئے اُن کا ایک شعر شہزادہ علی اکبر کے لئے اور دوسرا خاک کربلا کی عظمت کے باب میں، ذہن کے در، وا کردیتے ہیں۔ علی اکبر کو ہم شکل نبی بتایا گیا ہے۔ عادات واطوار کی مماثلت پر بھی بہت شعر کہے گئے ہیں۔ مگر ہوش عظیم آبادی یہ کہ کر قلم توڑ دیتے ہیں۔

اگر نہ بند نبوت کا باب ہو جاتا
تو یہ جواں بھی رسالتمآب ہو جاتا

اس طرح ارض کربلا۔ اور خاک کربلا کی عظمت کو ایک شعر میں بیان کرتے ہیں۔

یہیں سے ارض و سما فیضیاب ہوتے ہیں
حیات دیتی ہے پہرہ حسینؑ سوتے ہیں

☆☆☆☆☆

ضیاء اللہ حیدر ضیاء:- (لاہور)

پیدائش ۱۹۳۱ء وفات ۱۹۸۴ء

نام ضیاء اللہ حیدر۔ تخلص ضیاء۔ والد گرامی کا نام شیخ عطاء اللہ۔ ضیاء نے ۱۹۴۷ء میں لاہور سے میٹرک کا امتحان پاس کیا بیس برس کی عمر سے شاعری کا شوق ہوا۔ شرقی بن شائق کے شاگرد بنے۔ شرقی بن شائق اپنے والد ماجد حضرت شائق سے اصلاح لیتے تھے، شائق صاحب حضرت امیر مینائی کے شاگرد تھے) ضیاء کا کلام (غزلیات) بیسویں صدی کی پانچویں چھٹی دھائیوں میں اس وقت کے ممتاز اخبار و جرائد، یعنی روزنامہ ''نوائے وقت'' ہفت روزہ ''قندیل'' اور ماہنامہ ادب لطیف وغیرہ میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ۱۹۷۶ء سے ضیاؔء کی شاعری کا رخ بدلا اور اُنہوں نے نعت، منقبت، سلام، قصیدہ، مثنوی اور قطعات کی طرف توجہ دی۔ اور جب قلب و ذہن میں فکر و ذکر کی روشنی پھیل گئی تو ۱۹۷۷ء میں پہلا مرثیہ کہا جس کا مصرع اولیٰ تھا۔ ''قرطاس عزا سوز مسلسل کا نشاں ہے''۔ اُنہوں نے مرثیے کا عنوان ''قرطاس عزا'' رکھا۔ مرثیہ سیدہ زینب کے حال پر تھا۔ ۔

قرطاسِ عزا سوزِ مسلسل کا نشاں ہے قرطاسِ عزا اک غم پیہم کا جہاں ہے
قرطاس عزا دشتِ پُر آشوبِ فغاں ہے اس دشت میں پھیلا ہوا سو صدمۂ جاں ہے
پنہا یاں اس دشت کی ماتم کے لئے ہیں
آہوں کے الاؤ یہاں ماتم کے دیئے ہیں

تاریخ میں ہیں تذکرے اربابِ وفا کے وہ پھول جو مُرجھا نہ سکے اُن کی حیاء کے
وہ چاند جو سنولا نہ سکے اُن کی ضیا کے وہ مہر جو کجلا نہ سکے ان کی جلا کے
یہ چشمے وہ ہیں جن کا سدا فیض ہے جاری
عنقا ہیں مگر مثلِ ہما فیض ہے جاری

ضیاء کے تعلیمی اور لسانی پس منظر کے پیش نظر اُن کی شاعری، ذخیرہ الفاظ، لفظوں کو

برتنے کا ہنر دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

چاند کا سنولانا، مہر کا کجلانا، یا ''آہوں کے الاؤ یہاں ماتم کے دیئے ہیں'' پنجاب میں پلے بڑھے ایک ۲۸ / ۲۷ سال کے نوجوان قلم سے بکھرتے موتی کسی اہلِ زبان کے معدنی درِشاہوار معلوم ہوتے ہیں۔ سیدہ زینبؑ کے متعلق ایک بند دیکھیے ؎

زینب کا تھا دل یا کوئی مجروح کلی تھی لرزیدہ ہر ایک اشک میں پارے کی ڈلی تھی
ہر سانس غم انگیختہ آہوں میں ڈھلی تھی بچپن ہی سے زینب تو مصائب میں پلی تھی
ہر داغ جگر اشکوں سے دھوتی رہی زینبؑ
روتی رہی روتی رہی روتی رہی زینبؑ

حضرت عباسؑ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:۔

سقائے حرم حضرتِ عباسؑ علمدار توحید کا یم حضرتِ عباسؑ علمدار
اس دل سے بہم حضرتِ عباسؑ علمدار ہو جس پہ رقم حضرتِ عباسؑ علمدار
کیا شان ہے اُن کی کہ وہ خود نادِ علیؑ ہیں
شبیرؑ کے ناصر ہیں ولی ابنِ ولی ہیں

پنجاب میں آ کر بسنے والے بہت سے شعراء نے پنجاب کو، بالخصوص لاہور کو اپنا وطن سمجھا اور اُن کی شاعری لاہور کے حوالے سے سامنے آئی۔ ان میں کچھ وہ ہیں جو شعور کی پختگی اور شاعری میں قدرتِ سخن گوئی حاصل کرنے کے بعد پنجاب میں آ کر آباد ہوئے اور پنجاب نے اُنہیں اور اُنہوں نے پنجاب کو اپنا لیا لیکن ضیاء اللہ حیدر ضیاء نے پنجاب کی مٹی سے جنم لیا۔ بچپن پنجاب کی ہواؤں میں گذرا ۔۔ بے فکری کے ماحول میں پروردہ کوئی شاعر جب شعر میں زبان و بیان کی باریکیوں پر نظر رکھتا ہے تو اس قسم کے اشعار کہتا ہے ؎

تابش نگارِ فکر ہے تنویرِ آگہی اوجِ خرد مقام ہے توقیرِ آگہی
ہے قاطعِ ستم دمِ شمشیرِ آگہی پاکیزہ ہے شعور بہ تطہیرِ آگہی

مرکز ہوا جو آگہیٔ خوشخصال کا
جلوے سے جگمگا اٹھا مطلع خیال کا

تو اس کی بلائیں لینے کو دل چاہتا ہے۔ اور دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ توقیر آگہی کی یہ وضاحت، تطہیر آگہی سے شعور کی پاکیزگی جیسی اصطلاحوں کا حامل یہ ایک بند اگر سید ضمیر اختر نقوی اپنی کتاب ''اُردو مرثیہ پاکستان میں'' کے صفحات پر ضیاء کے نام سے نقل نہ کرتے تو یقین محال تھا کہ ایک نوجوان یہ کہہ سکتا ہے — ضیاء کی شاعری کو پڑھ کر اہل لاہور کا ایک محاورہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ ''لاہور، لاہور ہے''— کاش کوئی ضیاء کے مراثی شائع کرادے — ضیاء ۴۳ کی عمر میں اس دار فانی سے چلے گئے۔ جو فرض وہ ادا کرنے آئے تھے شاید بھیجنے والے نے اس ذمہ داری کو پورا کرنے کی تکمیل کی سند دیکر اُنہیں واپس بلالیا ہے۔

☆☆☆☆☆

مہذّب لکھنوی:-

ولادت ۱۹۰۷ء وفات ۱۹۸۵ء

نام سید محمد میرزا تخلص مہذّب سلسلہ نسب امام رضا علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ مہذّب لکھنوی کے والد گرامی سید عسکری مرزا مؤدب لکھنوی اور اُن کے والد یعنی مہذّب لکھنوی کے دادا سید حسین مرزا عشق تھے۔ مہذب لکھنوی کے نانا سید محمد ہادی زارؔ تھے۔ گویا ماں اور باپ دونوں طرف سے ادب و شعر ورثے میں ملے تھے۔

گیارہ برس کی عمر میں طبیعت شعر گوئی کی طرف راغب ہوگئی تھی۔ تقریباً پندرہ سال کی عمر میں والد گرامی حضرت مؤدب لکھنوی نے ایک مصرع طرح دیا کہ اس میں سلام کہو۔ مصرع تھا۔ ''کہا حُر نے سپاہِ اشقیا سے''— مہذب صاحب نے اس طرح میں کچھ اشعار کہے۔

''عداوت ہے عبث شاہ ہدا سے کہا حُر نے سپاہ اشقیاء سے''

سلام کے آخری شعر کو مؤدب صاحب نے پسند فرمایا اور ہمت افزائی کی۔

ہوئے یاں دفن، واں کی سیر کرلی کہ جنت متصل ہے کربلا سے

مہذّب لکھنوی نے رباعی، منقبت، سلام اور مرثیہ سے پہلے غزل گوئی میں بھی طبع آزمائی کی۔ اُن کی غزلیں اگر یک جا ہوتیں تو ہزاروں کی تعداد میں ہوتیں۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ اُن

کی اپنی تحریر سے نقل کیا گیا ہے— غزل کے اشعار دیکھئے ۔

ذبح کے بعد جو دیکھا کیا قاتل مجھ کو روح ٹھہری رہی، مرنا ہوا مشکل مجھ کو

دل کو نکال کے آنکھوں کی راہ لے گئے دزدیدہ اک نظر میرے چہرے پہ ڈال کے

دیکھ بھال کے گلشن میں بجلیاں بھی گریں دو چار ہم غریبوں کے بس آشیاں جلائے

حضرت مہذّب لکھنوی کے مرثیوں کی تعداد ۸۵ کے لگ بھگ ہے۔رباعیات، قصائد اور سلاموں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچی ہے، مہذّب لکھنوی زود گو شاعر تھے— مرثیہ گوئی کے علاوہ مرثیہ خوانی میں بھی حضرت مہذّب لکھنوی مقبول رہے ہیں۔حیدر آباد دکن میں تو پیارے صاحب رشید کے بعد مہذّب لکھنوی کے علاوہ کوئی جم نہیں سکا۔حیدر آباد میں ابتدا اپنے والد گرامی موذب لکھنوی کی پیش خوانی میں پڑھتے تھے۔پھر ان کی زندگی میں ہی وہاں مجالس پڑھنی شروع کر دیں۔حضرت مہذّب لکھنوی کا ایک اور کارنامہ ''مہذّب اللغات'' ہے جس کے لئے اکابرین کی متفقہ رائے ہے کہ دنیا کے لغات میں اُردو زبان کا اتنا جامع اور مستند لغات ابھی تک عالم وجود میں نہیں آیا۔یہ لغات چودہ جلدوں پر مشتمل ہے، جس کی تکمیل میں کم و بیش چالیس برس لگے ہیں۔

اس کے علاوہ مہذّب لکھنوی ۲۸ دوسری کتابوں کے مصنف اور مولف ہیں جس میں بہت سے اساتذہ کے غیر مطبوعہ مراثی و غزلیات کی اشاعت شامل ہے—ایک کتاب اُردو شاعری کے نام سے لکھی ہے جو دو حصوں میں طبع ہوئی۔ کتاب کا موضوع علم عروض ہے۔مگر علم عروض کی وضاحتیں جداگانہ انداز میں کی گئی ہیں— دو فرضی شاگرد مولانا صاحب اور نواب صاحب اپنی اپنی غزلیں (فرضی) اُستاد کو اصلاح کے لئے پیش کرتے ہیں، اُستاد غزلوں کی اصلاح کے وقت شاگردوں کو عروض اور شعر گوئی کے مجالس و عیوب بتاتے ہیں اور اس طرح ایک جامع کتاب تیار ہو جاتی ہے جو قاری کے ذہن میں نقش ہو جاتی ہے۔علم عروض کو اس سے قبل مکالماتی انداز میں نہیں بڑھایا گیا ہے۔حضرت مہذب لکھنوی کی جدّت پسندی اور تلاش و جستجو آشنا مزاج نے عروض کو جتنا سہل بنا دیا اُس کی مثال شاید ابھی تک اُردو زبان میں نہیں ہے۔

حضرت مہذّب لکھنوی مرثیے کی جس تاریخ سے جڑے ہوئے تھے۔اُنہوں نے جس ماحول میں پرورش اور تربیت پائی وہ روح عصر اُن کے مراثی میں موجود ہے، اُنہوں نے مرثیہ کی روایت سے بغاوت بھی نہیں کی۔اُن کے مرثیے اُس ساری فضا کا مظہر ہیں لیکن وہ لکیر کے فقیر

نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اُن کا ایک مرثیہ۔ ''حسینؑ ابن علی کربلا میں تنہا ہیں'' کربلا کے فاتح شیر خوار علیؑ اصغر کے احوال کا مرثیہ ہے، جس کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

حسینؑ ابن علی کربلا میں تنہا ہیں　　عزیز مرگئے دشتِ بلا میں تنہا ہیں
تھے ابتدا میں بھی، انتہا میں تنہا ہیں　　امام، لشکر اہل جفا میں تنہا ہیں
نہ آرزو ہے نہ لطف حیات باقی ہے
بس اب فقط علی اصغر کی بات باقی ہے

تمام ہوگئے سب ناصرانِ سبطِ رسول　　تھے جن میں روح روانِ علی وجان بتول
دعا ہے جن کے وسیلے سے حشر میں بھی قبول　　سعادت ابدی کی رضائے شہ سے قبول

پھر اس کے بعد دو بند حضرت حُر کے لئے، ایک بند میں حبیب ابن مظاہر کا ذکر، دو بند حضرت جون، ایک بند زبیر قین، ایک بند سعید، پانچ بند عون ومحمد کے لئے، ایک بند حضرت قاسم، اور پھر شیر نیستانِ حیدر حضرت عباس کے ذکر کے چھ بند۔

نظر سے خلق خدا کے گرا دیا پانی　　وفا نے دیکھنے والوں کا دل کیا پانی
جری نے چلّو میں جھک کر اُٹھا لیا پانی　　اُٹھا کے پھینک دیا اور نہیں پیا پانی
جہاد نفس تھا جذبات سے لڑے عباسؑ
نگاہ بھر کے نہ دیکھا پلٹ پڑے عباسؑ

جہاد کے لئے بیتاب ہیں علیؑ اکبر　　کمال فرقت عباسؑ کا ہے دل پہ اثر
کبھی حسینؑ پہ ہے، گہ نظر ہے لشکر پر　　اس امتحاں کی ہیں منزل میں شاہ جن وبشر
جس امتحاں میں خلیل خدا ٹھہر نہ سکے
جہاں حسینؑ ہیں اس راہ سے گذر نہ سکے

اس کے بعد دس بند حضرت علی اکبرؑ کے میدان کو روانگی، شہادت، امام مظلوم کا لاش پر جانا حضرت مہذب لکھنوی کا ایک ایک مصرع موتیوں میں تولنے کے لائق ہے باپ کا بیٹے کی لاش پر آنے کا منظر (حضرت مہذب کے الفاظ میں):

سرہانے بیٹھ گئے بادشاہ تشنہ کام　　گڑی تھی قلب میں برچھی تڑپتا تھا گل فام
لیا حسینؑ نے دو مرتبہ علیؑ کا نام　　کہا کہ شکر خدا، کام پا گیا انجام

دل پسر سے جو برچھی کا پھل نکال لیا
امام کا یدِ قدرت نے دل سنبھال لیا

تھا امتحان کی منزل میں حق کا شیدائی وہ مرگِ عہد جوانی وہ خود کی تنہائی
وہ زخم سینۂ اکبر وہ اس کی گہرائی کلائی تھام کے اکبر نے لی جو انگڑائی
نظر جو گھاؤ پہ پہنچی تو غم سے ہٹ نہ سکی
گئی جو روشنئ چشم شہ، پلٹ نہ سکی

صدائے غیب یہ آئی کہ مرے تشنہ کام جو تیرا کام تھا تو نے وہ دیدیا انجام
نجات پاگئی اب اُمتِ رسولِ انام کریں ہم اکبر غازی پہ امتحاں تمام
جو ہو خوشی تو ابھی روک دے یہاں مالک
صدا حسین نے گھبرا کے دی ''نہیں مالک''

وہ آخری ابھی باقی ہے ہدیۂ اصغر جو بارگاہ میں کرتا ہے پیش اے داور
جو امتحاں کا ہے جزو، اور مبتدا کی خبر جسے بنایا ہے میں نے تتمۂ محضر
نظر کرم کی برائے رسول کرلینا
میں لے کے آتا ہوں مالک قبول کرلینا

اس کے بعد امام خیمے میں تشریف لے گئے، علی اصغر کے کان میں کچھ کہا پیاس سے نڈھال چھ ماہ کا شیر خوار ہمک کے امام حسین کی گود میں آگیا۔

کہا جو سبط پیمبر نے کچھ اشارے سے
ہمک کے آگئے ہاتھوں پہ گاہوارے سے

علی اصغر میدان میں مسکرا کر اشقیا کی صفوں میں انتشار پیدا کردیئے ہیں مہذب لکھنوی نے شہادت علی اصغر کے اُن سارے لمحوں کو بیان کیا ہے جو تکلیف اور رنج اور ایثار و صبر کی صدیوں پر محیط ہیں۔ پہلے بند سے بہترویں بند تک ذکر فضائل بھی ہے ذکر مصائب بھی، بہت سے ایسے مصرع ہیں جنہیں پڑھ کر دل لرز اُٹھتا ہے اور آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب رواں ہوتا ہے مگر کہیں بھی کسی بھی بند میں مہذب لکھنوی نے ناموس رسول سے ''بین'' نہیں کرائے ہیں — حُر سے لے کر حضرت علی اصغر تک قربانیوں اور شہادتوں کے اس سارے سلسلے میں نہ کہیں زینب نے رو کر

کچھ کہا، نہ اُم رباب چلاّئی۔ نہ بیبیوں نے سر پیٹا، نہ ناموس محمد میں سے کسی نے گریبان چاک کیا لیکن مرثیہ پڑھتے چلے جایئے آنسو نہیں رُکیں گے۔ اللہ مہذّب صاحب مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، کیسے کیسے مصرعے سجائے ہیں اس مرثیے ہیں — علی اصغر میدان میں ہیں اسے ایک شعر میں منظوم دیکھئے۔

دل عدو پہ نظر بن کے تیر پڑنے لگی سپاہِ شر سے نگاہ صغیر لڑنے لگی

میں نے ''مرثیہ نظم کی اصناف میں'' یہی تو عرض کیا تھا کہ خانوادۂ نبوت کے کرداروں سے بین کرا کے اُن کی عظمت، اُن کے صبر کو داؤ پر لگانے کی بجائے شاعر بھی بین کرسکتا ہے اگر مرثیہ کی ساری عظمتیں رُلانے پر ختم ہو جاتی ہیں تو مرثیہ نگار بین کرے۔ مہذّب لکھنوی نے وہ فرض ادا کر دیا جو عزاداریٔ مظلوم نے ہمیں دیا ہے اور ہم جس کی ایک پائی بھی نہیں چکا سکے۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر یاور عباس :- (کراچی)

ولادت دہلی ۱۹۱۷ء۔ وفات کراچی ۱۹۸۵ء

اسم گرامی یاور عباس۔ تخلص یاؔور، پیشہ ڈاکٹر ایم بی بی ایس۔ والد گرامی ڈاکٹر سید ناصر عباس معہ اہل وعیال ۱۹۴۷ء مین ہجرت کر کے کراچی آ گئے۔

ڈاکٹر یاور عباس نے پاکستان آنے سے قبل ۱۹۴۳ء میں شاعری کا آغاز کیا — آغا شاعر قزلباش کی شاگردی کا شرف پایا — ۱۹۵۰ء میں حضرت شفق اکبر آبادی کی ترغیب پر پہلا جدید مرثیہ کہا۔ اس سے قبل اپنے زمانہ طالب علمی میں ایک مختصر مرثیہ کہا تھا جس کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ لیکن ۱۹۵۰ء کے بعد یہ سلسلہ جاری رہا اور ہر سال نو تصنیف مرثیہ اپنے گھر میں مجلس میں پڑھتے تھے۔

کراچی میں مرثیوں کی مجالس کے انعقاد میں ڈاکٹر یاور عباس نے بہت اہم کردار ادا کیا — ایک مجلس سالانہ اُن کے در دولت پر ہوتی تھی۔ اسکے علاوہ با قاعدہ مجالس کا سلسلہ رضویہ سوسائٹی میں قائم کیا — ان مجالس میں برصغیر کے ممتاز مرثیہ نگار اپنے مرثیے پیش کرتے تھے۔ کراچی میں جن شعراء نے مرثیہ گوئی شروع کی اُنہیں بھی ان با قاعدہ مجالس کے انعقاد نے ترغیب دی۔ آج جو کراچی میں مرثیے کا ایک دبستان قائم ہے اس کی بنیادوں میں ڈاکٹر یاور عباس کی لگن،

ان کی مسلسل محنت اور نیک نیتی نہ ہوتی تو شاید یہ عمارت اتنی عظیم نہ ہوتی — ناقدین کا خیال ہے کہ ڈاکٹر یاور عباس کو فروغ مرثیہ میں جو شہرت اور اہمیت حاصل ہے وہ مرثیہ گو شاعر کی حیثیت سے انہیں نہیں مل سکی — یہ فیصلہ کسی حد تک درست ہے مگر اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ ڈاکٹر یاور عباس کی شعر گوئی کمزور تھی۔ بلکہ ایک میڈیکل ڈاکٹر کی زندگی میں فاضل وقت نہیں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر یاور عباس اپنے پیشے کے اعتبار سے معروف ڈاکٹروں میں شمار ہوتے تھے۔ اس کے بعد جو وقت بچتا تھا یا وہ وقت جو وہ اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داروں کی تکمیل سے بچا لیتے تے اس وقت میں فروغ مرثیہ کا کام کرتے تھے۔ راقم الحروف کو ڈاکٹر یاور عباس سے ذاتی تعلقات کا موقعہ ملا ہے اس لئے بہت سی باتیں ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر لکھی جارہی ہیں اکثر یاور بھائی کے پاس شعر کہنے کا وقت نہیں ہوتا تھا — انہیں جب یاد دلایا جاتا کہ مجلس قریب ہے تو یاور بھائی عجلت میں مرثیہ کہتے تھے۔ اُن کے مراثی میں قدیم اور جدید کا امتزاج ملتا ہے — اُن کا ایک مرثیہ "معرکۂ حق و باطل" جدید مرثیوں میں شامل کیا جاسکتا ہے جس میں سیرتِ امام حسینؑ پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس مرثیے میں بہت سے مصرعے ایسے ہیں جو ضرب المثل بن سکتے ہیں۔ مثلاً۔ "نام حسین صبر کی طاقت کا نام" یا۔ "میدان کربلا ہے کسوٹی اصول کی" —— مرثیے میں الفاظ کا چناؤ بہت احتیاط سے کیا گیا ہے۔

آئے حسین عزم کی دنیا لئے ہوئے　　باہوش و باوقار ارادہ لئے ہوئے
ابرو کے خم میں عصمتِ کعبہ لئے ہوئے　　فکر خلیل و ناز مسیحا لئے ہوئے
گل پارہ ہائے دل سرمژگاں لئے ہوئے
ہر درد لاعلاج کا درماں لئے ہوئے

توقیر انبیا کی شہادت لئے ہوئے　　قرآن کی زباں میں حلاوت لئے ہوئے
شیر خدا کی شانِ جلالت لئے ہوئے　　ماتھے پہ مہر شغلِ عبادت لئے ہوئے
آنکھوں میں اپنے گھر کی مروت رچی ہوئی
ہاتھوں میں بوئے زلفِ محمد بسی ہوئی

ڈاکٹر یاور عباس ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھے، اُن کے ایک مرثیے میں لفظیات اور تراکیب کا ڈھنگ دیکھئے۔

اچھا یہی ہے مرض تو اب اس کا کچھ علاج بامثل، یا کہ ضد پہ ہو، جیسی ہو احتیاج
نسخہ ہو کارگر جو سمجھ لے کوئی مزاج چارہ گرو خدا کے لئے فیصلہ کچھ آج
ڈوبی ہوئی ہے نبض. کوئی کارگر دوا
کچھ تیز، تند، تلخ مگر پُر اثر دوا

لیکن معالجین نیا تجربہ نہ ہو ایسا کوئی علاج جو ہرگز خطا نہ ہو
وہ بھی ہے کیا دوا کہ مکمل شفاء نہ ہو تریاق لایئے جو شفاء کا بہانہ ہو
ہے قیمتی یہ وقت اسے یوں نہ ٹالئے
تاریخ کی بیاض سے نسخہ نکالئے

ڈاکٹر یاور عباس نے موضوعاتی مرثیے بھی لکھے ہیں، ان مرثیوں میں فکری موضوعات سے زیادہ وہ موضوعات جو جذبات سے عبارت ہوتے ہیں یاور عباس نے ہنرمندی سے نبھائے ہیں۔ جذباتی موضوعات میں یاور عباس کی شعر گوئی میں پختگی نمایاں نظر آتی ہے۔ اُن کا ایک مرثیہ ''آنسو'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

عالم جذب میں اک بے خبری اور آنسو عشق کی منزل صاحب نظری اور آنسو
فکر کا سلسلۂ چارہ گری، اور آنسو نعرۂ ہوش اور آشفتہ سری اور آنسو
ڈھونڈتے اُن کو کہاں اہل نظر پھرتے ہیں
ہم تو پلکوں پہ سجائے یہ گہر پھرتے ہیں

پیش معبود دعائے سحری اور آنسو عشق کی حدِّ سکوں ذکر نبی اور آنسو
علم کی دیدہ وری حُبِّ علی اور آنسو دیدنی ہیں یہ تماشے کہ خوشی اور آنسو
سامنے فطرت آدم کے یہ پہلو آئے
جب خوشی حد سے بڑھی آنکھ میں آنسو آئے

اشک گو رنج سے منسوب ہیں لیکن پھر بھی صرف احساس کی شدت ہے حقیقت ان کی
کچھ نئی بات نہیں، ایسی بھی دیکھی ہے ہنسی ہنسنے والوں کی بھی آنکھوں میں نظر آئی تھی
کچھ عجب کیف کی صورت یہ بہم ہوتی ہے
چہرے ہنستے ہیں مگر آنکھ بھی نم ہوتی ہے

اس کی تعریف جو ہر آنکھ کو نم دیتا ہے لفظ کو وزن، تکلم کو بھرم دیتا ہے
اپنی مخلوق کے ہاتھوں میں قلم دیتا ہے جس کو دل کہتے ہیں وہ ساغر جم دیتا ہے
ورنہ اک کارگہہ شیشہ گری تھی دنیا
دیدہ و دل جو نہ ہوتے نظری تھی دنیا

یاؔور اب شکر کرو بزم عزا تک پہنچے آج پھر بارگہ آل عبا تک پہنچے
دل سنبھالے ہوئے ارباب وفا تک پہنچے اے خوشا، منبر محبوب خدا تک پہنچے
پھر سعادت ملی، پھر آج کہانی کہہ دو
اور ممکن ہو تو اشکوں کی زبانی کہہ دو

ڈاکٹر یاور عباس کی ایک رباعی بہت مقبول ہوئی ہے۔

قسمت میں میری چین سے جینا لکھ دے
ڈوبے نہ کبھی میرا سفینہ لکھ دے
جنت بھی گوارا ہے مگر میرے لئے
اے کاتب تقدیر مدینہ لکھ دے

زندگی میں ڈاکٹر یاور عباس نے مدینے کی گلیوں کو جنت پر ترجیح دی تھی۔ اس کا سبب محمد وآلِ محمد سے اُن کی محبت تھی — اور جس کے دل میں محمد وآل محمد کی محبت ہو وہ مرتا نہیں بلکہ شہید ہوتا ہے، زندہ جاوید ہوتا ہے، جنت اس کی جاگیر اور نزول رحمت اس کا مقدر ہوتا ہے۔ خدائے سخن میر انیس نے کہا تھا

کوثر و خلد تو شہ دیں گے بکا کے بدلے
دیکھیں اللہ نے کیا اس کا صلہ رکھا ہے

ڈاکٹر یاورؔ عباس شاعر اہلبیت تھے — نوا سۓ رسول اور آلِ رسول کے مرثیہ خواں تھے، عزادار سید الشہدا تھے۔ بحیثیت معالج خدمت خلق اُن کا پیشہ تھا۔ کوثر اور جنت تو انہیں بقول میر انیس مولا نے عطا کی ہوگی — ہم تو اکثر یہ سوچتے ہیں کہ اللہ نے اُنہیں عزاداریٔ مظلوم کا اور

کیا صلہ دیا ہوگا تاکہ جنت کے لالچ میں اور دوزخ کے خوف سے عبادت کرنے والی قوم کو یہ بتایا جاسکتا کہ ؎

"غم حسین منانا بھی اک عبادت ہے"

☆☆☆☆☆

دانش عظیم آبادی:- (دبئی)

ولادت ۱۰ر دسمبر ۱۹۱۶ء۔ وفات ۱۹۸۶

نام سید غضنفر نواب، تخلص دانش، جائے ولادت محلہ حمام، عظیم آباد (پٹنہ) وفات ۱۹۸۶ء دبئی (مشرق وسطیٰ) والد کا اسم گرامی نواب سید یاور حسین، سکونت بادشاہ منزل محلہ گذری، پٹنہ۔ دو ماہ کی عمر میں والد کا انتقال ہوگیا—

نواب دانش نے پہلی غزل ۱۹۳۱ء میں کہی۔ اس کے بعد قصیدہ، سلام، رباعی، نظم حتیٰ کہ مرثیے کی صنف میں طبع آزمائی کی۔ مرثیہ گوئی کا آغاز ۱۹۷۳ء میں ہوا۔

تصانیف:

(۱) "پرواز" مطبوعہ ۱۹۴۵ء

(۲) "سازوآواز" مطبوعہ ۱۹۷۵ء

(۳) "مثنوی اشک غم" مطبوعہ ۱۹۷۹ء جس میں عظیم آباد کی منظوم ادبی تاریخ ہے— اس کے علاوہ مضامین نثر بھی لکھے ہیں۔

(۴) "عقد پروین" سب سے پہلی کتاب ۱۹۴۰ء میں دوستوں کے کلام پر مشتمل مجموعہ جس میں دانش عظیم آبادی کا اپنا بھی کلام تھا۔

حکیم سید احمد اللہ ندوی نے "مسلم شعرائے بہار" کی چھ جلدوں میں بہار کے مرثیہ گو شعراء کا تذکرہ لکھا ہے۔ دانش عظیم آبادی نے نظم میں شعرائے بہار کو خراج محبت و عقیدت پیش کیا ہے ؎

کاظمؔ و بدرؔ کہ فردوسؔ و شہزاد و عقیلؔ شاعر آل عبا ہوشؔ، سریع التکمیل

افتخار الشعراء حضرت علامہ جمیلؔ مرثیہ شاعری میں جن کا زمانے میں جلیل

نا خدائے سخن و ماہر فنکار کی بات

جن کے شاگرد بھی استاد، وہ تھی زارؔ کی بات

دانش عظیم آبادی بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ پہلا مرثیہ ۵۷ برس کی عمر میں (۱۹۷۳ء) میں کہا اور نہ صرف خوب کہا بلکہ مرثیہ گوئی کا سلسلہ اُنہیں ۱۲ مراثی تک لے گیا۔ اُن کے کلام میں کلاسیکی رنگ غالب ہے۔ وضع داری، خاندانی شرافت اور انکسار کے ساتھ خودداری کے جوہر کلام اور شخصیت دونوں میں نمایاں تھے۔ اُن کے انکسار کی ایک مثال، اُن کے اپنے الفاظ ہیں۔

آپ اسے مرثیہ کہہ لیں کہ مسدس، یہ مگر　　مرثیہ کہتے ہیں جس کو وہ ہے اک صنف دگر
انکساری یہ نہیں واقعہ ہے اہل نظر　　مرثیہ گوئی کا مجھ کو نہ سلیقہ نہ ہنر
دسترس ہو مجھے اس فن پہ یہ ممکن ہی نہیں
سیکھنے کے لئے ہے دن بھی نہیں، سن بھی نہیں

یہ تو دانش کا انکسار تھا جس کا منہ بولتا ثبوت اُن کے مراثی کا ذخیرہ ہے جو خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ اپنے پہلے مرثیہ کے محرکات سے متعلق اُنہوں نے خود وضاحت کی ہے کہ۔

استادوں نے اس صنف میں کیا ہے چھوڑا　　یاروں نے مگر میرا نہ پیچھا چھوڑا
علامہ کے حکم، ضد نے فردوسی کی　　دانش سے بھی اک مرثیہ کہلا چھوڑا

اس منکسر المزاج شاعر نے جس فراخدلی سے دوسرے شاعروں کا ذکر کیا ہے وہ نہ صرف اُن کی وسیع القلبی اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے بلکہ اُن کی خوداعتمادی اور قادرالکلامی پر دلالت کرتا ہے اس لئے کہ دوسروں کو وہی متعارف کرا سکتا ہے جو خوداعتمادی کا جوہر رکھتا ہو۔

غضنفر نواب دانش عظیم آبادی مرثیے کی دنیا میں جس دروازے سے داخل ہوئے وہ مرثیے کی شاندار روایت کا باب تھا اسی لئے اُنہوں نے روایت کی پاسداری برقرار رکھی۔ اُنہوں نے مرثیے کو رثا کے حوالے سے گریہ وبکا کا ذریعہ سمجھا اور اسی انداز سے چند بند نمونۂ کلام کے طور پر نذر قارئین کئے جا رہے ہیں۔

کیا زمانے میں بھلا مجھ کو ہے یارائے سخن　　میری جھولی کو میسر کہاں گل ہائے سخن
سچ تو یہ ہے نہیں ہے میرے لئے جائے سخن　　آج ہے اور نہ کل تھا مجھے دعوائے سخن
خوشہ چین پیشتروں کا ہوں میں اُستاد نہیں
یعنی اقبالؔ نہیں، جوشؔ نہیں، شادؔ نہیں

رخصت کا منظر:

کر چکے دفن علی اصغر معصوم کو جب پئے رخصت شہ دیں خیمے کی سمت آئے تب
اور فرمایا کہ ہم جاتے ہیں مرنے کو اب آل اطہار کا اللہ نگہباں، زینب
ماجرا سارا بعد آہ و بکا کہہ دینا
جب وطن جانا تو صغرا کو دعا کہہ دینا

بین:

سن کے یہ اہل حرم کرنے لگے آہ و بکا خیمۂ شہ میں ہوا نالہ و شیون برپا
اُم کلثوم نے یہ بانوئے مضطر سے کہا اپنا سر دینے کو بھیا بھی چلے ......
جھولا بے شیر کا اب چھوڑ کے اُٹھو بھابی
شاہ کا آخری دیدار تو کرلو بھابی

دانش عظیم آبادی زندگی کے آخری دنوں میں بادشاہ منزل میں نہ رہ سکے اس لئے کہ بیسویں صدی میں تجارت انسانی جذبات پر حاوی ہوگئی تھی اور بادشاہ منزل کو منہدم کر کے مارکیٹ تعمیر کردی گئی تھی۔۔۔ ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کا کہنا ہے کہ وہ اپنے بھانجے اور داماد سید غالب امام کے پاس منتقل ہوگئے تھے اور آخری دن اُنہوں نے دبئی میں (اپنے داماد کے ساتھ) گذارے جہاں ۱۹۸۶ء وہ اللہ کو پیارے ہوگئے لیکن ڈاکٹر بلال نقوی نے لکھا ہے کہ وہ ۱۹۸۲ء میں بہار سے ہجرت کر کے کراچی آگئے تھے۔۔۔ دو مختلف آرا سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ انتقال کے وقت وہ اپنی بادشاہ منزل میں نہیں تھے۔

☆☆☆☆☆

پرنس معظم جاہ شجیع (حیدرآباد)

ولادت ۱۹۰۸ء حیدرآباد، وفات ۱۳ر ستمبر ۱۹۸۷ء

نام میر شجاعت علی خان، ادبی نام معظم جاہ شجیع۔ اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ شجیع کی تعلیم و تربیت پر اعلیٰ حضرت نظام نے بڑی توجہ فرمائی اور اس دور کے معروف علماء کو پرنس معظم جاہ کی تعلیم و تربیت کے لئے مقرر کیا جن میں حضرت نظم طباطبائی ایسے باکمال شامل تھے۔۔۔ موزوں طبع اساتذہ کی سرپرستی اور تربیت خاص

نے پرنس کے دل میں موجود کرنوں کو شعاعِ نور بنادیا اور پرنس معظم جاہ شعر کہنے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر روز رات کو پرنس معظم جاہ شجیع کے محل میں محفل شعر وسخن آراستہ ہوتی جس میں شہر کے چیدہ علماء و شعراء شرکت فرماتے، ان شرکاء بزمِ شجیع میں فانیؔ، نجم آفندی، جوشؔ، ماہر القادری، ناصر زیدپوری اور شاہد صدیقی جیسے اساتذۂ فن کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ پرنس شجیع نے حضرت نجم آفندی کو اپنا استاد تسلیم کیا اور ان سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے رہے۔ دکن کے ممتاز شاعر اور نقاد ڈاکٹر صادق نقوی نے لکھا ہے کہ پرنس شجیع ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء تک حضرت نجم آفندی سے اصلاح لیتے رہے، پرنس نے ہر سخن میں طبع آزمائی کی۔ غزل مزاج شاہانہ کی پسند ہو سکتی تھی لہٰذا انہوں نے بیشمار غزلیں کہی۔ زود گوئی کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ ہر رات میں کئی کئی غزلیں کہہ لیتے تھے۔

اچھا استاد وہی ہوتا ہے جو سرکش سے سرکش شاگرد کو اُس راہ پر موڑ دے جو اُستاد کی نظر میں شاگرد کے لئے مفید ہو۔ نجم آفندی ایک انقلابی شاعر تھے۔ الفاظ پر انہیں قدرت تھی۔ اپنا نقطہ نظر واضح کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اُنہوں نے ناز ونعم میں پلے ہوئے شہزادے کے دل میں کربلا کی غربت کا چراغ روشن کر دیا۔ حسینؑ مظلوم کی شہادت کے معنی سمجھادئے۔

جس وقت امام حسینؑ کا سر تن سے جدا ہوا اس وقت نجم آفندی نے حسینؑ کو فاتح قرار دیا تھا اور کہا۔ ''جب لے لیا حسینؑ نے میدانِ کربلا''۔ پرنس شجیع کو ولائے رسولؐ وآلِ رسولؐ ورثے میں ملی تھی۔ نجم آفندی کا نعرۂ انقلاب اور جوشؔ کا ''حسینؑ اور انقلاب'' اُن کے سامنے تھے، انیسؔ ودبیرؔ کے مرثیوں کی گونج ذہن میں بسی ہوئی تھی۔ اُستاد کامل نجم آفندی نے شاگرد کو جس منزل کا پتہ سمجھایا اس کے حصول کے لئے کربلا سے گذر کر جانا پڑتا تھا۔ پس پرنس معظم جاہ شجیع کربلا اور مقصد کربلا سے سرشار ہو گئے۔ اُنہوں نے منقبت، سلام، اور مرثیے کہنے شروع کر دئے۔ اُنہوں اپنے مراثی میں راویت کی پابندی کی ہے لیکن نجم آفندی کی محنت رائیگاں نہیں جاسکتی تھی۔ پرنس کے مرثیوں میں روایت ولوازم مرثیہ کی پابندی کے ساتھ عصری حسیت کا شعور بھی جھلکنے لگا۔ امام حسینؑ معرکہ کربلا۔ اور کربلا والے شجیع کا آئیڈیل بن گئے اور وہ پکار اُٹھے ؎

جس نے تقسیم کیا درد کا جوہر وہ حسینؑ آج تک جس کی حکومت ہے دلوں پر وہ حسینؑ

چُن کے لایا تھا مجاہد جو بہتر وہ حسینؑ سرخرو جس سے ہوا دینِ پیمبر وہ حسینؑ
ابر باطل کا ہٹا، حق کا ستارہ چمکا
چھپ گیا تھا جو نگاہوں سے دوبارہ چمکا
دل مومن کی صداقت ہے نشانی جس کی حق کے دو حرف کی ترتیب کہانی جس کی
بن گئی امرِ اہم تشنہ دہانی جس کی پھر پلٹ آئی ضعیفی میں جوانی جس کی
خلد کا سیّد و سردار خطاب آہی گیا
ملت احمد مرسل پہ شباب آہی گیا

ایک ایک مصرعے پر اصلاح کی چھاپ ہے — ''جس نے تقسیم کیا درد کا جوہر، وہ حسین'' یا ''حق کے دو حرف کی ترتیب کہانی جسکی'' جیسے مصرعے کہنے والا پرنس، فکرِ شبیری کے سانچے میں ڈھلا ہوا نظر آتا ہے —— حسینؑ کی عظمت کو ایک شاہزادے کا سلام۔ اس کے بعد درد کی منزل آتی ہے۔ امام حسین کی جنگ کا منظر و پس منظر سامنے آیا تو پرنس معظم جاہ شجیع اس منزل پر بھی عظمت حسینؑ کا اعلان کرتے ہیں ۔

قابل دید تھی دو روز کے پیاسے کی جدال حشر انگیز تھا مظلوم کے چہرے کا جلال
رعب و ہیبت کا یہ عالم تھا کہ دنیا تھی نڈھال تن تنہا نے کیا بڑھ کے ہزاروں کا یہ حال
خوں کی بارش میں نہ ٹھہرا گیا غدّاروں سے
جا ملی فوج ستم کوفہ کی دیواروں سے

''مظلوم کے چہرے کا جلال'' اور لشکر شام کو ''غداروں'' کہنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ نجم آفندی نے اپنی روح پرنس کے احساس کی دنیا میں اُتار دی تھی — مظلوم کے چہرے پر جلال کے معنی ہیں مظلوم فاتح ہے۔ اور جن لوگوں کی زبانوں پر رسول اکرم کا کلمہ تھا اور ہاتھوں میں نواسۂ رسول کو قتل کرنے کے لئے تلواریں تھیں وہ غدّار ہی تو تھے۔ رسولؐ کے غدّار، دین کے غدّار، خدا کے غدّار اور حسینؑ کے غدّار — حضرت عباس علیہ السلام کے احول کے مرثیے میں پرنس شجیع کا انداز بھی دیکھئے ۔

ہاتھ شانوں سے کٹے، چھٹ گئی شمشیر دو دم ساتھ ہی ساتھ گرا خاک پہ تھرا کے علم
ان سے تھا دور بہت خیمۂ سلطان اُمم ایک لمحے کو بھی لیکن نہ رُکے اس کے قدم

ہمت و عزم کا وہ دریا تھا کہ چڑھتا ہی گیا
مشک دانتوں میں دبائے ہوئے بڑھتا ہی گیا
مشک پر تیر لگا جب تو جری رہ نہ سکا سینکڑوں وار سہے، ایک بھی سہ نہ سکا
خوں بہا تن سے کہ پانی بھی تو یوں بہ نہ سکا حسرت زیست تھی کیوں موت سے کچھ کہہ سکا
دو گھڑی کے لئے قبضے سے ترائی نہ گئی
لاش اس شیر کی دریا سے اُٹھائی نہ گئی

شجیح نے چار مرثیے کہے ہیں۔ قصائد، سلام اور منقبت اس کے علاوہ ہیں اُن کا ایک مرثیہ ''دستور شہادت'' اُن کی حیات میں شائع ہوا۔ باقی تین مرثیے مخطوطات کی شکل میں محفوظ ہیں۔

☆☆☆☆☆

مہدی نظمی لکھنوی:- (غازی آباد)

ولادت ۲۳ راپریل ۱۹۲۳ء (لکھنؤ) وفات ۳۰ رمئی ۱۹۸۷ء (غازی آباد)

نام سید ابن الحسین، قلمی نام مہدی نظمیؔ، وطن لکھنؤ (اودھ) مہدی نظمی کا تعلق خاندان اجتہاد سے تھا۔ دادا سید فرزند حسین فاخر لکھنوی، والد گرامی لسان الواعظین مولانا سید اولاد حسین شاعر لکھنوی (عرف للّن صاحب) برادر بزرگ شمس الدین تاجؔ ہمہ صفت شاعر تھے۔

ابتدائی تعلیم رامپور میں ہوئی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی۔ اے کیا اور اس کے بعد شب و روز کے مطالعہ سے جو پڑھا وہ کتابوں سے نہیں ملتا۔ مہدی نظمی نے پہلا مرثیہ ۱۹۶۹ء میں بعمر ۴۶ برس کہا۔ لکھنوی تہذیب اور علم و ادب کی آغوش میں پروان چڑھنے والے مہدی نظمی کو مرثیہ گوئی ورثے میں ملی تھی پھر بھی اُنھوں نے ۴۶ برس کی عمر تک مرثیہ نہیں کہا شاید اس لئے کہ ابتدائی عمر میں صحافت کی طرف مائل رہے۔ سلام، منقبت اور دیگر اصناف سخن کی طرف متوجہ رہے۔

مہدی نظمی اپنے مراثی میں مرثیے کے لوازم اور لکھنوی طرز نگارش کا پورا پورا خیال رکھتے تھے جو شعرائے لکھنؤ کا مزاج بھی ہے اور پہچان بھی۔ اُنھوں نے ۱۹۷۱ء میں ایک مرثیہ ''اصغر بھی حرب و ضرب میں حیدر کا لال ہے'' کہا اس مرثیے میں علی اصغر کے تبسم کی جتنی جہتیں

دکھائی گئی ہیں وہ سب فن حرب وضرب کی وضاحتیں ہیں۔ تاریخ کربلا میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ علی اصغر کی مسکراہٹ نے سنگدل فوج شام پر جو کاری ضرب لگائی وہ تلواروں کے زخموں سے زیادہ گہری تھی۔

سیدہ زینبؑ کے چھوٹے بچوں کی جنگ، امام حسنؑ کے فرزند قاسم کی جنگ، علی اکبر کی جنگ، حتیٰ کہ اصحاب حسینی کی جنگ کے نتیجے میں ٹڈی دل لشکر میں الامان کی صدائیں تو کئی بار بلند ہوئیں لیکن علی اصغر کی مسکراہٹ نے جو وار کیا اس کے نتیجے میں پتھر بھی پگھل گئے۔ شقی منہ پھیر پھیر کر رونے لگے۔ یہ منظر تاریخ انسانیت میں واحد منظر ہے جہاں ایک معصوم بچّے کی مسکراہٹ تیس ہزار کے لشکر کو شکست دیدے۔ مہدی نظمی نے علی اصغر کی جنگ کے اس منظر نامے کو نظم کیا ہے۔

مہدی نظمی جدید دور کے مرثیہ نگار ہیں۔ قدیم مرثیے کے لوازم کی پابندی کے ساتھ اُن کے مراثی میں جدید لہجہ اور آہنگ بھی ملتا ہے۔ وہ آج کے تناظر سے چشم پوشی نہیں کرتے بلکہ آج کے مسائل پر سوچتے ہیں۔

اشتراکی اور جمہوری نظاموں کا فساد   آدمی کے خون میں ڈوبے پیاموں کا فساد
راتوں سے پہلے شفق آلود شاموں کا فساد   برتری کی پیاس میں دو تشنہ کاموں کا فساد
بلبلیں ہیں، بے کلی ہے، خوف ہے ہیجان ہے
موت کی برسات میں سہما ہوا انسان ہے

وہ ہواؤ حرص کے میداں میں زرداروں کی دوڑ   وہ فلک پر جوہری طاقت کے طیاروں کی دوڑ
وہ ستم ایجاد دانائی وہ ہتھیاروں کی دوڑ   وہ خلا کی کھوج کرنے والے سیاروں کی دوڑ
مٹ نہ جائے خاک سے نام و نشان زندگی
رہگذار مرگ میں ہے کاروان زندگی

قدیم اور جدید مرثیے کی بحث میں اُن کا رویہ غیر مبہم ہے۔ وہ اجزائے مرثیہ کو جوں کا توں رکھتے ہوئے ان اجزا میں ایک اور جز یعنی سوچ کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ فکر جدید کی آمیزش چاہتے ہیں۔ اُن کے اپنے الفاظ میں اس کی وضاحت حسب ذیل ہے۔

”کربلا میرے نزدیک ایسی تاریخ ہے جس پر تقریباً چودہ

صدیاں گذر چکی ہیں۔اس تعریف کی بنیاد پر کہے جانے والے مرثیے کس قدر جدید ہو سکتے ہیں؟ جہاں تک نئے زمانے کے ماحول اور گرد و پیش کے تذکرے کا تعلق ہے اور قدیم روایات کا حوالہ دے کر اخلاقی اوصاف کو جگانے کی کوشش کا تعلق ہے اس میں جدّت پیدا کی جاسکتی ہے۔مثال کے طور پر میں نے حُر کے حال کا مرثیہ کہتے وقت محنت اور دولت کی کش مکش کا چہرہ بنایا ہے"

(بیسویں صدی اور جدید مرثیہ۔)

مہدی نظمی نے ۱۹۸۰ء میں ایک مرثیہ کہا تھا ''مقتل شہ سے ہوا خون بداماں آئی'' اس مرثیے میں شام غریباں سے کوفہ وشام کے بازاروں درباروں تک کے واقعات ہیں۔اس میں سیّدہ زینب کے عزم وہمت کے علاوہ ایک بہت ہی نمایاں پہلو سیّدہ زینب کی Committment ہے،اُن کا ڈیکلیریشن (اعلامیہ) ہے۔بعدِ شہادت حسینؑ، دختر فاطمہ کے عزائم کا اعلان ہے جو زینب نے بھائی کی لاشے سے رخصت ہوتے ہوئے کہا ہے ۔

مقتل شہ سے ہوا خون بد اماں آئی بیکسی خاک بسر چاک گریباں آئی
ہر مصیبت کی گھڑی، بال پریشاں آئی [۱] پرسا دینے کے لئے شام غریباں آئی
قتل شبیر ہوئے، خون کی برسات ہوئی
رن میں عاشور کا دن ختم ہوا، رات ہوئی

دیکھ کہ دور یہ کچھ مشعلیں لانے والے سوچا زینب نے کہ یہ کون ہیں آنے والے
کیا نیا فتنہ ستمگر ہیں اُٹھانے والے [۱۲] آرہے ہیں ہمیں کیا زندہ جلانے والے
عزم عباس علیؑ دل میں جگا کر اُٹھیں
خاک سے اُٹھیں تو تلوار اُٹھا کر اُٹھیں

آگے بڑھ کر یہ پکاریں کہ خبردار رہو اب ادھر خواہر عباس ہے، ہشیار رہو
تیغ رکھتے ہو تو آمادۂ پیکار رہو [۱۳] جنگ درکار ہے گر، جنگ کو تیار رہو
یہ شریعت کا تقاضہ ہے، مناسب ہے جہاد
ایسے ہنگام میں عورت پہ بھی واجب ہے جہاد

یہ نہ سمجھو کہ جہاں میں شہ مظلوم نہیں ظلم باقی ہے اگر، صبر بھی معدوم نہیں
سب مشیّت پہ ہیں راضی کوئی مغموم نہیں میں بھی بیٹی ہوں علی کی، تمہیں معلوم نہیں [۱۴]

سارے جنگل میں لہو برسے گا، آفت ہوگی
میں نے تلوار چلائی تو قیامت ہوگی

بعد شہادت حسین بیکسی کی شب گذر گئی۔ اگلی صبح فوجوں میں کوچ کا نقارہ بجا، سیدہ زینب بھائی کی لاش پر آئیں اس منزل پر مہدی نظمی نے جو مکالمے تراشے ہیں وہ سیدہ زینب کا Declaration ہیں، زینب کے عزائم ہیں، زینب کے حوصلوں کا اعلان ہیں — مہدی نظمی کے الفاظ میں ''بھائی کی لاش پر روتی ہوئی خواہر آئی'' اور

بولی بے بس ہوں کہ بس میں دلِ مضطر بھی نہیں
اے مرے بھائی کفن دینے کو چادر بھی نہیں

ظلم ہے جور ہے، جلاّد ہیں، تعزیریں ہیں پائے سجاد میں جکڑی ہوئی زنجیریں ہیں
تازیانے ہیں چمکتی ہوئی شمشیریں ہیں نام اسلام مٹا دینے کی تدبیریں ہیں [۳۰]

میرا اعلان ہے یہ نام رہے گا باقی
قید خانوں میں بھی اسلام رہے گا باقی

ظلم کی ہوگی رسن، میری کلائی ہوگی غم سے چھوٹوں گی نہ آفت سے رہائی ہوگی
پھر بھی باطل نے شکست ایسی نہ کھائی ہوگی ان بندھے ہاتھوں سے کوفے میں لڑائی ہوگی [۳۲]

چشمِ غم ناک سے یوں صبر کا مینہ برسے گا
عمر بھر شمر بھی پانی کے لئے ترسے گا

یہ نظارا نہ بن سعد نے دیکھا ہوگا صبر کی آگ میں جلتا ہوا کوفہ ہوگا
میری آنکھوں میں میرے بھائی کا چہرہ ہوگا جو بھی عباس کا قاتل ہے وہ پیاسا ہوگا [۳۳]

صبر کی، ظلم سے پیکار چلے گی بھائی
اب میرے ہاتھ کی تلوار چلے گی بھائی

میں بھی ٹھانے ہوں کہ یہ جنگ ابھی اور چلے آپ کے بعد لڑائی کا نیا دور چلے
شر کی ہر رسم اُٹھے، خیر کا ہر طور چلے دہر میں اب نہ کہیں قافلۂ جور چلے [۳۴]

صبر کی تیغ اُٹھاتی ہوں، جری ہوں میں بھی
سایۂ حیدر صفدر میں پلی ہوں میں بھی

آئی ہوں شہر جفا کار میں جانے کے لئے والیٔ شام کے دربار میں جانے کے لئے
چھالے لے کر رہِ پُرخار میں جانے کے لئے بے ردا کوچہ و بازار میں جانے کے لئے[۳۵]
بھائی کے سر کی قسم، صبر میں ناکام نہیں
تخت شاہی نہ اُلٹ دوں تو میرا نام نہیں

اور مرثیے کے آخری حصے میں زینب کے خطبات کو مہدی نظمی نے جو لفظ دیئے ہیں وہ کردار سیدزینب کے ترجمان ہیں۔ جیسے ؎

نصرت دین پیمبر میں ہم چلتے ہیں
موت تھک جاتی ہے جس راہ پہ ہم چلتے ہیں

مرثیہ گوئی میں فکر کی دار پر پہنچ کر مہدی نظمی نے کچھ فیصلے کیے ہیں اور اُن فیصلوں کو استدلال شعری کے ذریعے قابل قبول اور جاذب فکر بنایا ہے—

ہے کشش کی کتنی قوت شاہ کے کردار میں کھینچ لیتی ہے جو حُر کو حلقۂ دیندار میں
طالب بیعت کی رسوائی ہوئی پیکار میں ہیں بہتر کے بہتر ہم زباں انکار میں
فرد واحد کے عمل کو ضد کہو تو ٹھیک ہے
جب بہتر ایک ہوجائیں تو پھر تحریک ہے

مہدی نظمی نے اُردو شاعری کو بیشمار نئے لفظ اور حسین تراکیب دی ہیں—مرثیے کے اسلوب میں ایسے اضافے کئے ہیں جو مرثیے کو ایک ممتاز صنف ادب یا صنف شاعری منوانے پر دلالت کرتے ہیں ؎

جنگ کیا ہے صاحبان حق کے مال وزر کی لوٹ جنگ کیا ہے "یثرب آداب" کے گھر گھر کی لوٹ
جنگ کیا ہے "بانوئے اخلاق" کے زیور کی لوٹ جنگ کیا ہے "زینب تہذیب" کی چادر کی لوٹ
جنگ کیا ہے شمر وابن سعد اپنے روپ میں
اے ضمیر کربلا پھر دے اذاں اس دھوپ میں

یثرب آداب کا گھر۔ بانوئے اخلاق کا زیور۔ زینب تہذیب کی چادر۔ یہ مرثیے کی

terminology ہے۔ رثائی ادب کی لفظیات میں جو صنف شعر گوئی ہیں بلا شبہ ایک اضافہ ہیں۔ مہدی نظمی کی شاعری میں ایسے بہت سے قیمتی اضافے ہیں جو اہل نقد و نظر سے پوچھ رہے ہیں کہ وہ صنف سخن جس میں یہ ندرتیں آئے دن شامل ہوتی رہتی ہیں اُسے آپ عقیدے کی شاعری کہیں گے یا عظمت ادب کی علمبردار شاعری ؟

مہدی نظمی کے قصائد کا مجموعہ ''صحیفۂ عقیدت'' نوحوں کا مجموعہ ''نقش فریادی'' شائع ہو چکے ہیں۔ اُنہوں نے مسدس اور مرثیے بھی خاصی تعداد میں لکھے ہیں جو ابھی شائع نہیں ہوئے ـــ ممتاز مرثیہ نگار صحافی ناشر نقوی نے مہدی نظمی ''فن اور شخصیت'' میں اُن کی ادبی قامت اور جملہ اصناف نظم و نثر پر اُن کے اسلوب و بیان کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، ہمارا موضوع تو مرثیہ ہے اس لئے ہم نے مہدی نظمی کی مرثیہ گوئی کو دیکھا ہے اور بیسویں صدی کے شاعر مہدی نظمی کا اکیسویں صدی کے نام پیغام پڑھا ہے جو یہ ہے کہ

کربلا سے درس علم و آگہی انسان لے ‏ قیصر جمہور کے بازو کی قوت مان لے
یہ نئی دنیا حسینؑ ابن علیؑ کو جان لے ‏ انقلاب فکر کی تحریک کو پہچان لے
موج دریا پھوٹ نکلے تشنگی کے ساز سے
جنگ کا نعرہ دبا دو امن کی آواز سے

اور یہ ایک آفاقی سچائی ہے کہ دنیا میں جب تک حسینؑ کو نہیں مانے گی، کربلا کو نہیں پہچانے گی انسانی تہذیب افغانستان اور عراق بنتی رہے گی۔

☆☆☆☆☆

عارف رئیسی اکبر آبادی:-

ولادت ۲۱/ اکتوبر ۱۹۲۹ء۔ وفات ۷/ اگست ۱۹۸۷ء (حیدر آباد سندھ)

نام محمد یوسف خان۔ تخلص عارفؔ۔ قلمی نام عارف رئیسی اکبر آبادی۔ وطن مالوف تحصیل جلیس ضلع ایٹہ (ہندوستان) بعد ازاں اُن کا خاندان آگرہ منتقل ہو گیا تھا اسی نسبت سے عارفؔ خود کو اکبر آبادی لکھتے تھے۔ عارفؔ رئیسی اکبر آبادی کے شاگرد جناب منظرؔ عارفی کا تحریر کردہ، عارفؔ اکبر آبادی کا مطبوعہ خاکہ اُن کے متعلق معلومات کا ذریعہ ہے۔ اُن کے گھرانے کے متعلق منظرؔ عارفی لکھتے ہیں:

"اُن کا گھرانا ایک انتہائی راسخ العقیدہ سُنّی گھرانا تھا۔ علم وعمل کے زیور سے مرصع خاندان کے ہر فرد کو بلا تخصیص شعروشاعری سے شغف تھا جو آپ کو (عارفؔ اکبرآبادی کو) ورثے میں ملا"

عارفؔ اکبرآبادی ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے کہ اُن پر چیچک کا حملہ ہوا جس کے سبب بینائی سے مرحوم ہو گئے۔ تین برس تک ذہنی توازن غیر استوار رہا۔ جب حواس درست ہوئے تو حصول علم کی پیاس شدید ہوئی چنانچہ آگرہ کے معروف عالم مولوی محمد نعمان کا دامن تھام لیا اور اُن کی نوازشات اور رہنمائی کے زیرسایہ عربی اور فارسی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کو حفظ کرنے کا شرف حاصل کیا۔ علم حدیث وفقہ اور علم الحکمت بھی پڑھا۔ ایک نابینا شخص کے لئے ان علوم کا حصول سوائے اس کے کب ممکن تھا کہ یہ علم بصارت سے نہیں بصیرت سے حاصل کیا گیا۔ جہاں تک ذہن انسانی اور حافظہ ساتھ دے سکتا تھا عارف اکبرآبادی نے حصول علم کیا۔ اس کے بعد علم وادب سے وابستگی شعروسخن کے ذریعے ہی ہو سکتی تھی۔ عارفؔ نے یہی کیا اور شاعری پہ توجہ کی اور سید سخاوت علی جعفری (شوخؔ اکبرآبادی) سے سلسلہ تلمذ وابستہ کیا۔ (شوخؔ اکبرآبادی حضرت رئیسؔ اکبرآبادی کے جانشین تھے)

نابینا ہونے کے باوجود حافظ عارفؔ اکبرآبادی نے کسی کا دست نگر ہونا پسند نہیں کیا۔ آگرے میں تھے تو موم بتی بنانے کا کارخانہ کھولا جو اُن کا ذریعہ معاش تھا۔ پاکستان آ گئے تو ایک آنکھوں والے شخص کے ساتھ مل کر ہاتھی دانت کی تجارت شروع کی لیکن کچھ دنوں بعد ثابت ہوا کہ جسے آنکھوں والا سمجھ کر شریک کار کیا تھا وہ دولت کی ریل پیل دیکھ کر اندھا ہو گیا اور بغیر یہ سوچے کہ ایک معذور مگر سربلند انسان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے والے بصارت اور بصیرت سے محروم ہو کر اندھیروں میں بھٹکتے ہیں یہ شخص عارفؔ اکبرآبادی کے کاروبار کی رقم لے کر بھاگ گیا۔ عارفؔ اکبرآبادی نے پھر بھی زندگی سے ہار نہیں مانی اور شاہ فیصل کالونی کراچی میں ایک پرچون کی دکان کھول لی۔ اُن کے ساتھ اُن کے بھائی حافظ محمد ادریس المتخلص آصفؔ اکبرآبادی ہر دکھ درد میں عارفؔ کے ساتھ رہے۔ پرچون کی دکان میں کام بڑھا تو دونوں بھائیوں کے قویٰ جواب دینے لگے لہٰذا پرچون کی دکان کو بند کر کے عطار خانہ کھول لیا۔ آج عارفؔ اکبرآبادی اس دنیا میں نہیں ہیں مگر وہ آصفؔ اکبرآبادی آج بھی اس عطار خانہ کو قائم رکھے ہوئے ہیں بانی کی نشانی اور اپنا

ذریعہ معاش سمجھ کر — عارف اکبرآبادی کی وفات کے بعد آصف کی زبان سے یہ راز کھلا کہ آصف اکبرآبادی، عارف اکبرآبادی کے سگے بھائی نہیں تھے بلکہ دوست تھے اور کیوں کہ آصف کے والد عارف کو بہت چاہتے تھے اور اُنہوں نے ایک دن روانی میں کہہ دیا تھا کہ آصف تم ہمیشہ عارف کا اپنے بڑے بھائی کی طرح خیال رکھنا پس اس دن سے عارف کی وفات تک آصف نے چھوٹے بھائی کی طرح عارف کی خدمت اور نگہداشت کی اور عارف کی مرنے کے بعد آج بھی عارف کی یاد کے چراغ روشن کیے ہوئے ہیں۔

عارف اکبرآبادی قادرالکلام، بدیہہ گو شاعر تھے۔ اُن کے بچاس سے زیادہ شاگرد ہیں جو اپنی اپنی جگہ کراچی، حیدرآباد سندھ، کوئٹہ، لاہور، پشاور، اسلام آباد اور سیالکوٹ میں آباد ہیں اور مستند شعراء تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ہمارا موضوع عارف کا دیگر کلام نہیں اس نے اُن کے مرثیے کے چند بند نمونہ کلام کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں۔ اُن کا یہ مرثیہ حضرت قاسم کے احوال کا مرثیہ ہے۔ مرثیہ کا عنوان "مرحلے" ہے۔ ماں سے رضا ملتے ہی قاسم میدان جنگ کی طرف جاتے ہیں ؎

ماں سے رضا ملی تو چلا سوئے فوج شام طوفان غم میں ڈوب گئے شہ کے سب خیام
چہرہ تھا اس کا فرط خوشی سے مہ تمام تکنے لگا فلک سے فرشتوں کا اژدہام
گھوڑا مثال برق اُڑاتا ہوا چلا
خوابیدہ زلزلوں کو جگاتا ہوا چلا

قاسم میدان میں آتے ہیں۔ ارزق شامی کے چار بیٹوں کو قتل کرتے ہیں۔ ارزق شامی غیض میں ڈوبا ہوا قاسم کی طرف بڑھتا ہے ؎

نیزے پہ بند باندھ کے کہنے لگا شقی دیکھا نہیں کوئی جو کرے مجھ سے ہمسری
پانی ہے میری تیغ کا یا سحر سامری چودہ برس کی عمر میں میری برابری
ہو فائدہ تو نام شہ ذوالفقار لے
نزدیک ہو کوئی تو مدد کو پکار لے

بولا حسنؑ کا لال کہ دیکھے ہیں تجھ سے بل دوزخ میں لے کے جائے گی تجھ کو ابھی اجل
چاروں پسر بھی تھے تیرے بے مثل و بے بدل اک وار میں نکال دیئے اُن کے سارے بل

بچّہ ہوں پھر بھی واقف جنگ و جدال ہوں
قاسمؑ ہے میرا نام علیؑ کا جلال ہوں

قاسم کی سمت سے جو ملے طنز کے یہ تیر جوشِ غضب میں تیغ اُٹھا کر بڑھا شریر
کہنے لگا کہ اے بن شبرؑ بدہ بگیر دولہا کمال حرب میں تھا مطمئن ضمیر
جنگِ علیؑ کی رن میں نہ کوئی کمی رہی
حالانکہ لب پہ پیاس کی شدت جمی رہی

تا دیر حرب و ضرب کی ردّ و بدل ہوئی تیغوں کی آنچ گرمیٔ جنگ و جدل ہوئی
ظاہر کی ہر اُمید سفیرِ اجل ہوئی گردن سے مڑ کے تیغ جو زیرِ بغل ہوئی
ٹھہرا گیا نہ دشمن دیں سے جو زین پر
دو ٹکڑے ہو کے گر پڑا ناری زمین پر

آئے سمت سمت کے سب اعدائے دین حق ہونے لگا زمیں کا جگر فرطِ غم میں شق
قاسم کی تھی کتاب جوانی ورق ورق لیکن ابھی حیات کی باقی تھی کچھ رمق
نیزے کبھی چلے کبھی تیغ و تبر چلے
قاسمؑ نقوشِ غم میں لہو اپنا بھر چلے

ایک بار پھر حافظ محمد یوسف خان عارف اکبرآبادی کے مراثی کی طرف ان ناقدین و معترضین کی توجہ مبذول کراتے ہوئے جو مرثیے کو کسی ایک مکتبہ فکر سے وابستہ کرتے ہیں اور شعوری طور پر رثائی ادب کو شیعان حیدر کرار کے کھاتے ہیں ڈال کر مرثیہ کی ادبی حقیقت کو ختم کرنا چاہتے ہیں یہ گذارش کی جاتی ہے کہ وہ حافظ محمد یوسف خان کے گھرانے کو دیکھیں۔ اُن کے عقائد کو پرکھیں۔ اُن کے کام کو نقد ونظر کے پیمانوں پر جانچیں اور فیصلہ کریں کہ مرثیہ شیعہ سنّی ہے یا ادب کی ایک صف ہے۔ آخر میں حضرت قاسم کی شہادت پر عارف اکبرآبادی کا ایک شعر پیش کر کے گفتگو تمام کی جارہی ہے۔

بجھتے ہوئے چراغ کو رکھ کر ہواؤں میں
پھیلادئے وفا کے اُجالے فضاؤں میں

☆☆☆☆☆

نسیم امروھوی:- (کراچی)

ولادت ۱۹۰۸ء (امروہہ) وفات ۱۹۸۷ء (کراچی)

نام سید قائم رضا، تخلّص نسیم، والد گرامی سید برجیس حسین برجیس، دادا فرزدق ہند سید جواد حسین شمیم امروہوی، پردادا سید حیدر حسین یکتا امروہوی گویا شبیر کی مداحی میں چوتھی پشت۔۔۔ چار برس کی عمر تھی کہ والد گرامی برجیس امروہوی انتقال کر گئے اور قائم رضا اپنے دادا حضرت شمیم امروہوی کی سرپرستی میں آ گئے ایک برس بعد دادا بھی ملک عدم کو سدھار گئے اور قائم رضا کے لئے صرف ایک سائبان رہ گیا، وہ تھا ماں کا آنچل۔۔۔ ماں نے خاندانی روایت کے مطابق بچّے کو تعلیم دلائی۔ عربی، فارسی، منطق، فلسفہ، فقہ، تفسیر، حدیث، ادبیات سارے جواہر بیٹے کے دامن میں بھر دیئے۔۔۔ ۱۹۲۹ء میں یہ لائق فرزند لکھنؤ چلا گیا۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۴۷ء تک لکھنؤ میں تعلیمی مدارج طے کئے۔۔۔ ۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم کے ساتھ ساتھ دلوں کی تقسیم ہوئی۔ دلوں کا خون تہذیب و شرافت کی گلیوں میں بہنے لگا۔ قائم رضا نے اپنے اجداد کی دی ہوئی وراثت یعنی شاعری کا آغاز ۱۱ برس کی عمر میں کر چکے تھے اور قائم رضا سے نسیم بن چکے تھے۔ ۱۹۲۳ء میں اُنہوں نے پہلا مرثیہ ''تجھ میں اے باغ وطن اب گل خوش رنگ نہیں'' کہا تھا۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۴۷ء تک لکھنؤ میں قیام نے شراب عشق کو دو آتشہ کر دیا تقسیم ہند کے وقت گلی کوچوں میں خون کی ندیاں بہتی دیکھیں۔ شاہراہوں پر درندگی کا رقص دیکھا تو نسیم کی روح بے چین ہو گئی۔ لکھنؤ میں قرار نہ ملا۔ رامپور چلے گئے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک رامپور رہے مگر چین نہ ملا۔ ۱۹۵۰ء میں ''تجھ میں اے باغ وطن اب گل خوش رنگ نہیں'' گنگناتے پاکستان آ گئے اور حکومت پاکستان کے ''ترقّی اُردو بورڈ'' میں اُردو لغت کے مدیر کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔۔۔

نسیم امروہوی ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ اُنہوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، رباعی، نظم حتّٰی کہ گیت تک اُنہوں نے سب کچھ لکھا ہے مگر اُن کا اصل میدانِ شاعری ''مرثیہ'' ہے۔۔۔ مرثیے میں اُنہوں نے روایت کی بھرپور پابندی کی ہے وہ ہمارے عہد کی کلاسیکی روایت کے آخری شاعر ہیں'' لیکن مرثیے کے مضامین میں اُنہوں نے نئی راہیں تلاش کی ہیں جس کی بنیاد اور سبب اُن کا علمی تبحر ہے مثلاً اُنہوں نے مرثیے میں آیات قرآنی اور مصدقہ احادیث نبوی کو نظم کیا ہے۔ اس کی ایک مثال اُن کا حضرت علیؑ کے احوال کا ایک مرثیہ ہے۔

مالک مسندِ و تطہیر و امامت ہیں علیؑ نور خالق ہیں علیؑ چشم رسالت ہیں علیؑ
جسم اعجاز علیؑ روح کرامت ہیں علیؑ مادّی شکل میں اللہ کی طاقت ہیں علیؑ
اس سے کیا بحث نصیری اُنہیں کیا کہتے ہیں
ایسے کچھ ہیں کہ نبی شیر خدا کہتے ہیں

منزلِ سورۂ "والنجم اذا بدر منیر" امرِ حق، آمر و مامور، اولی الامر، امیر
طینت پاک میں اسرار کتاب و تفسیر تن وفا، نفس رضا، روح عمل، صدقِ ضمیر
شان تخلیق میں خلقت سے جدا ہیں، بخدا
نہ جدا ہیں یہ خدا سے، نہ خدا ہیں بخدا

اس مرثیے میں سورۂ "والنجم" کی پوری تفسیر کو نظم کیا گیا ہے۔ یہ نسیمؔ امروہوی کی شعر گوئی کی عظمت ہے کہ اس کلام میں بھی شگفتگی اور روانی بدرجہ اتم موجود ہے۔

حضرت نسیمؔ امروہوی سے پہلے بھی موضوعاتی مرثیے کہنے کی روایت تھی، اُنہوں نے اس روایت کی روشنی میں اپنی ذہانت، علم اور قادر الکلامی کا نور شامل کیا ہے۔ اقبالؔ سے لے کر نسیمؔ تک عقل و عشق پر گفتگو ہوتی رہی ہے۔ اس مکالے میں نسیم امروہوی بھی حصّہ لیتے نظر آتے ہیں۔

آدمی وہ نہیں دراصل جو ہو آدم زاد عقل اور عشق ہیں انساں کی اساس و بنیاد
عقل ہے پائے بشر، معرفت حق کی مراد عشق ہے ذوق عبادت، خلشِ حقِ عباد
عقل سے فرقِ حقیقی و مجازی سیکھے
عشق سے بندگی و بندہ نوازی سیکھے

عقل کے پاؤں سے طے کر کے دو عالم کے سبق عشق کے ہاتھ سے تحریر کرے دل کا ورق
عقل کی آنکھ سے کرتا ہوا نظارۂ حق عشق کے کان سے رہ رہ کے سنے غم کا سبق
عقل سے ملکِ طلب فتح کرے، مرد بنے
عشق کے فیض سے فیّاض ہو، ہمدرد بنے

پروفیسر سید محمد رضا کاظمی نے لکھا ہے کہ:

"جناب نسیم امروہوی کو جدید مرثیہ کا بانی کہا جاتا ہے حالانکہ

یہ اُن کے منصب اور نصب العین، دونوں کے ساتھ ایک ناانصافی ہے"

(جدید اُردو مرثیہ۔ مضمون بہارِ نسیم)

پروفیسر محمد رضا کاظمی صاحب الرائے نقاد ہیں۔ اور اختلاف صرف صاحب الرائے لوگوں کی رائے سے ہی کیا جاسکتا۔ اُن کی رائے میں نسیم امروہوی کو جدید مرثیے کا بانی کہنا" اُن کے منصب اور نسب العین" سے ناانصافی ہے جبکہ راقم الحروف کی رائے میں اُنہیں جدید مرثیے کا بانی کہنا" جدید مرثیے کے ساتھ" ناانصافی ہے اس لئے کہ قدیم اسلوب میں جدید مضامین در آنے کو جدید مرثیہ کہیں گے تو نسیم امروہوی جدید مرثیہ نگاروں کی صف میں آتے ہیں لیکن جدید مرثیہ اس وقت تک جدید مرثیہ نہیں جب تک فکر، مواد، ہیئت اور اسلوب جدید نہ ہو۔

حضرت نسیم امروہوی نے دبستان دبیر کی معنوی پیروی بھی کی ہے اور مرزا دبیر کے اسلوب و آہنگ کو بھی اپنایا ہے۔ مرزا دبیر کی طرح استاد فن ہیں یعنی شاعرانہ تیکنیک پر دسترس رکھتے ہیں۔ دوسری صفت زبان و بیان کا آہنگ اور عالمانہ تدبر و تمکنت ہیں۔ ہر چند کہ یہ عالمانہ تدبیر اور اس عالمانہ عظمت کی منتخب کردہ بعض روایتوں پر دبیر کے اپنے حلقے کے ناقدین پریشان نظر آتے ہیں، اس کی ایک مثال کے طور دبیر کے شاگرد شاد عظیم آبادی کی " فکر بلیغ" (جلد دوم) کو پیش کیا جاسکتا ہے جس میں اسوۂ حسینی کے خلاف روایات کو پیش کیا گیا ہے جیسے (نعوذ باللہ) امام حسینؑ کی بدحواسی پر جناب زینب کا یہ اندیشہ کہ امام عالی مقام زندہ بھی گرفتار ہو سکتے تھے۔ یقیناً ایسی روایتوں کا انتخاب (خاکم بدہن) شاعر کی کم علمی نہیں بلکہ اسے گریہ و بکا کے گوشے تلاش کرنے کی سعی میں بشر کی سہو سے تعبیر کہا جاسکتا ہے۔ جملہ معترضہ کی معذرت بات ہو رہی تھی کہ نسیم امروہوی کے ہاں مرزا دبیر کا آہنگ اور شعری تمکنت موجود ہے۔

اُن کی تیسری صفت اور مماثلت انتخاب مضامین ہے۔ نسیم امروہوی نے ایک طرف آیات الٰہی اور احادیث نبوی کو موضوع سخن بنایا ہے تو دوسری طرف شہدائے کربلا کے موضوعات کے علاوہ چہاردہ معصومین اور اسلاف دین کے موضوعات پر بھی مرثیے لکھے ہیں۔ نسیم امروہوی نے موضوعات کی تلاش میں فنکارانہ اضافے کئے ہیں۔ مثلاً سیاست علوی، وجود غیبت امام، اصلاح رسوم فی زمانہ، احیائے روحِ اسلامی، فلسفۂ مسرت و غم، جائزۂ نفس، علم، شاعر اور شاعری، قلم اور عورت ایسے عنوانات مرثیہ میں شامل کئے ہیں۔ اُن کے آہنگ اور شعری مہارت کی مثال

درج ذیل بند سے ملتی ہے۔

ایما الف کا ہے کہ امامِ اُمم کہو ایمانِ اہلبیت و امیر و اِرم کہو
"ب" کا بیان ہے کہ بقا کا بھرم کہو یا باعث برات و برائت بھم کہو
"ت" سے نبی کی تیغ بھی، تاب و توان بھی
تطہیر کی تمیز بھی ہیں ترجمان بھی

"ث" سے ثبات حق میں ثبوت ثواب ہیں کہتا ہے "ج" جامع قران جناب ہیں
"ح" سے کھلا کہ حامئ روزِ حساب ہیں حق اور حق نما ہیں، حقیقت مآب ہیں
"خ" سے خود آشنا بھی، خدا کی دلیل بھی
خیر العمل بھی، خادم حق بھی، خلیل بھی

اس طرح الف سے "ے" تک حروف سے لفظ بلفظوں سے صفات، صفات سے معنی تلاش کرنے کی جانشانی ان کی مہارت فن کا اظہار ہے۔ یہی مشاقی دبستان دبیر سے اُن کی وابستگی پر دلالت کرتی ہے۔

نسیم امروہوی نے کسی حد تک ترقی پسند تحریک کا ساتھ دینا چاہا اور مرثیے کو بقول پروفیسر رضا کاظمی ایک ادبی تحریک کی حیثیت سے منوانے کی کوشش کی لیکن اُن کا سابقہ اہل لکھنؤ سے تھا اس لئے اُنہوں نے جدت پسندی کو Balance کرنے کے لئے یا (اعتدال پسندی پر قائم رہنے کے لئے) اپنے جدید جذبوں کے اظہار کے لئے قدیم طرز بیان اور مرثیہ کی کلاسیکی روایت کو اپنایا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کلاسیکیت نے جدید رنگ قبول کرنے سے انکار کیا اور نسیم امروہوی ندرت خیال وفکر سے مالا مال ہونے کے باوجود لکھنوی مرثیے کے دائرے سے باہر نہ آسکے، یہاں تک کہ نسیم امروہوی کا مرثیہ "پیغام انقلاب" اہل لکھنؤ اور مرثیے کی لکھنوی روایت نے سُن بھی لیا اور کسی حد تک اس کا چرچا بھی ہوا مگر اس کا سارا پرتو روایت اور کلاسیکیت کے درمیان رہا، ذہن جدید کو کشمکش اور نئے راستوں کی نشاندہی نہ دے سکا جبکہ مرثیہ انقلاب انقلاب پکارتا رہا۔

اے انقلاب مژدۂ علم و عمل ہے تو رنگینئ حیات کے گلشن کا پھل ہے تو
تعمیر کائنات نہ صرف آج کل ہے تو آدم کو باغ خلد کا نعم البدل ہے تو

گردش بتا رہی ہے یہ لیل و نہار کی
تو ہے دلیل ہستیٔ پروردگار کی

قائم ہے بندوبست جہاں انقلاب سے ہنگامۂ بہار و خزاں انقلاب سے
روحِ عمل رگوں میں رواں انقلاب سے ہر دم ہے چرخِ پیر جواں انقلاب سے
محروم انقلاب جو دورِ حیات ہو
دنیائے آب و گل میں نہ دن ہو، نہ رات ہو

عالم جو انقلاب کی تہ میں ہیں نو بہ نو یہ منزلِ بقا کا مسافر ہے تیز رو
باطل کی رات میں سحرِ معرفت کی ضَو ابرو بہار و قلزم و نشو و نما کی رو
پیدا جو انقلاب سے جوشِ نمو، نہ ہو
سبزی میں آب و رنگ تو پھولوں میں بُو نہ ہو

لیکن یہ انقلاب ''حسینؑ اور انقلاب'' سے پہلے نہ آیا——

نسیم امروہوی نے عصری تقاضوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے اور ایک باشعور کی طرح اپنے عہد کا ادراک کر کے شعر کہے ہیں اس ادراک اور شعور نے اصل مقصد یعنی درسگاہ کربلا اور معلم انسانیت حسینؑ سے قدم قدم رشتہ استوار کیا ہے۔ اس کی مثال اُن کا وہ مرثیہ ہے جو انہوں نے ۱۹۶۵ء میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہونے والی جنگ کے موقع پر لکھا تھا۔ اس مرثیے میں کمال یہ ہے کہ آج کی بات کو کربلا کے واقعات کا اشاریہ بنایا ہے اور کربلا کو آج کے واقعات کے آئینے میں دیکھا ہے۔

جانتے ہیں یہ ہمیشہ سے زمانے والے ہم ہیں قلت میں بھی کثرت کو دبانے والے
سر سے میداں میں کفن باندھ کے آنے والے بڑھ کے چولیں درِ خیبر کی ہلانے والے
ہم نے قرآن پڑھا، جھوم کے بُت خانوں میں
ہم نے تکبیر کہی، ڈوب کے طوفانوں میں

ان گنت فوج کہ ہو جذبۂ حق سے خالی خاک پائے گی زمانے میں مقامِ عالی
اور تھوڑی سی جماعت ہے جو جرأت والی اس کی ٹھوکر سے اُبھرتی ہے بلند اقبالی

اکثریت سے کہیں دل کی گرہ کُھلتی ہے
عزم و ہمت کے ترازو میں ظفر تُلتی ہے

حضرت نسیم امروہوی نے امام حسینؑ کو انقلاب اور شعور ارتقاء کے نمائندہ کی حیثیت سے بھی دیکھا ہے ۔

شعورِ معرکۂ جہد و ارتقاء ہے حسینؑ نشانِ عظمتِ حق، مثلِ مصطفیٰ ہے حسینؑ
بشر کے بھیس میں قرآنِ کبریا ہے حسینؑ قسم خدا کی عجب بندۂ خدا ہے حسینؑ
عمل سے جہت لیا، عزم کی لڑائی کو
سر بریدہ سے سر کرلیا خدائی کو

زہے یہ جذبۂ ہمت، یہ ذوقِ بیداری نہ ہونے دی بشریت کی ذلت و خواری
چلا جو رن کو سجا کر سلاحِ خود داری سپاہ ظلم کی تیغوں کو کردیا عاری
جتا دیا کہ اجل حریت کا زیور ہے
دکھا دیا کہ غلامی سے موت بہتر ہے

نسیم امروہوی کی شاعری میں اور بالخصوص رثائی شاعری میں اُنہوں نے جتنی جہتیں اختیار کی ہیں اُن میں سے ایک ایک جہت ایک ایک Shade پر ایک ایک کتاب بھی شاید اس شعری مہارت اور حسن کو بیان نہ کر پائے چہ جائیکہ چند صفحات میں نسیم امروہوی کا مکمل تعارف کرانے کی کوشش کی جائے۔

قدیم اور جدید مرثیے کے درمیان ایک 'دیوار برلن' ''بین'' کا مسئلہ ہے۔ قدیم مرثیے میں بین قلمبند کرتے وقت اس امر پر توجہ نہیں کی گئی کہ رونے رُلانے کے لئے شاعر جو زبان استعمال کر رہا ہے یا کربلا میں موجود امام حسینؑ اور اُن کے اعزا سے جو بین منسوب کئے گئے ہیں وہ خانوادہ رسالت کے افراد کے کرداروں کو مجروح تو نہیں کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں راقم الحروف نے اپنی کتاب ''مرثیہ نظم کی اصناف میں'' میں تفصیلی بحث کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

''قدیم مرثیوں میں حسینؑ مجبور، لاچار اور بے بس نظر آتے ہیں
بات پر روتے نظر آتے ہیں، یوں معلوم ہوتا ہے کہ حسینؑ اور اُن کے رفقاء

روتے پیٹتے بہ حالت مجبوری کربلا کی جنگ میں جھونک دئے گئے تھے۔"

(مرثیہ نظم کی اصناف میں۔ص ۳۶)

حضرت نسیم امروہوی نے بین کے اس حصار سے باہر نکلنے کی کوشش کی ہے۔ اُنہوں نے بین کا ایک انداز تو یہ رکھا ہے کہ مصائب سے عظمت اہل بین کا پہلو نکالیں۔

تحریک غم، گلدستہ خنجر حسینؑ کا پیغامِ آہ، خاک کا بستر حسینؑ کا
تصویرِ درد، لاشۂ بے سر حسینؑ کا اشک آفریں سکوت کا نشتر حسینؑ کا
بچے کا خون منہ پہ شفاعت کے واسطے
ضرب شدید ہے دلِ مضطر کے واسطے

اور بین کا دوسرا انداز یہ اختیار کیا ہے کہ بین مرثیہ گو نے کیے ہیں۔ آل رسول کے کرداروں نے نہیں۔

مقتل میں گرچہ روح پیمبر تھی نوحہ گر چشم حسینؑ اشک سے لیکن ہوئی نہ تر
باندھی جواں کی لاش اُٹھانے کو خود کمر انصار کو مگر نہ بلایا پکار کر
اتنا کہا کہ جانِ برادر کدھر گئے
عباسؑ کچھ سُنا، علی اکبر بھی مر گئے

نسیم امروہوی کا بہت سا کلام شائع ہو چکا ہے مگر ابھی بہت سا غیر مطبوعہ ہے۔ نسیم امروہوی اپنی ذات میں ایک انجمن اور بحیثیت مرثیہ گو ایک دبستان تھے۔ اُنہوں نے نہ صرف خود مرثیے کے قافلے کی رہنمائی کی بلکہ اپنے بعد اپنے ہوشیار شاگردوں کو مرثیہ گوئی کی ایسی تربیت دیکر چھوڑ گئے کہ فضائیں مرثیوں کی صداؤں سے گونج اُٹھیں۔ اُن کے روشن کیے ہوئے چراغ مرثیہ کی راہوں میں اُجالا بکھیر رہے ہیں اور ان چراغوں سے اور چراغ بھی جل رہے ہیں ان کے شاگردوں میں بیسوی صدی میں مرثیہ کی اہم شخصیات شامل ہیں۔

☆☆☆☆☆

صادقین :- (کراچی)

ولادت ۲۵ رجون ۱۹۳۰ء (امروہہ)۔ وفات ۱۰ رفروری ۱۹۸۷ء (کراچی)۔
نام سید صادقین احمد نقوی۔ تخلص صادقین، وطن امروہہ۔ تعلیم امام المدارس انٹر کالج

امروہہ سے ۱۹۴۴ء میں میٹرک پاس کیا۔ آگرہ یونیورسٹی سے ۱۹۴۸ء میں بی۔اے کی سند حاصل کی۔ پہلی ملازمت۔ آل انڈیا ریڈیو میں سٹاف آرٹسٹ کی حیثیت سے ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۶ء تک کی۔ ۱۹۴۶ء میں امام المدارس امروہہ میں آرٹ منیجر ہو گئے۔

تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۱ء تک ایگریکلچرل کالج، سکرنڈ (سندھ) میں آرٹسٹ کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۵۱ء میں ریڈیو پاکستان میں پروگرام اسسٹنٹ ہو گئے لیکن ''تیز ترک گامزن'' کے مصداق یہ فنکار ایک برس سے زیادہ ریڈیو کی ملازمت میں لمحے لمحے کا حساب نہ دے سکا اور ''منزل ما دور نیست'' کہہ کر ریڈیو چھوڑ دیا اور ایک آزاد فنکار کی حیثیت سے جینا شروع کیا۔ اور سچ پوچھئے تو یہاں سے فنکار صادقین پیدا ہوا یا سید صادقین احمد نے اپنے اندر معروف و ہر دلعزیز مصوّر صادقین کو تلاش کیا اور آخر کار صادقین تین حیثیتوں میں جانے پہچانے گئے۔ وہ دنیا کے عظیم مصوّروں میں شمار ہوتے ہیں بلکہ اُنہیں 'مشرق کا پیکاسو' کہا جائے تو شاید اُن کی عظمت میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔ وہ بیسویں صدی کے منفرد خطاط ہیں اور اُن کی تیسری فضیلت با مقصد فنکارانہ شاعری ہے۔

فنکار کی حیثیت سے انہیں ۱۹۶۲ء میں حکومت پاکستان کی طرف سے ایک بڑا انعام ''پرائڈ آف پرفارمنس'' Pride of Performance (جو اُس وقت تک واقعی ایک بڑا انعام تھا) دیا گیا۔ ممتاز مفکرین نے اُنہیں پوری دنیا میں پاکستان کے سفیر کا درجہ دیا ہے کہ جہاں جہاں صادقین گئے یا اُن کی Painting پہنچی وہاں وہاں اس مرد قلندر کے رنگوں اور Brush نے پاکستان کی عظمت کا وہ سکہ بٹھایا جو اُن ملکوں میں پاکستان کے سفیر نہ کر سکے۔ جولائی ۱۹۶۳ء میں ''واشنگٹن پوسٹ'' نے اُن کی Paintings اور اُن کے فن کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا۔ ۱۹۶۴ میں ایسوسی ایٹیڈ پریس Associated Press of America نے صادقین کے قدموں میں عقیدت کے پھول نذر کئے۔ فرانسیسی ناقد بارنیت کولان، برطانوی ناقد ایرچ نیوٹن، امریکی ناقد ٹامس ڈاؤسنگ نے صادقین کے فن کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ امریکہ، برطانیہ، آسٹریلیا، فرانس، رومانیہ، سویت یونین، ایران، عراق، سعودی عرب جیسے ممالک کی حکومتوں نے صادقین کو انعامات سے نوازا ہے۔ پوری دنیا کے میڈیا نے صادقین پر اتنا لکھا ہے جتنا کسی دوسرے مشرقی فنکار پر نہیں لکھا گیا۔ آج دنیا بھر جہاں کہیں بڑے مصوروں کا ذکر آتا ہے وہاں صادقین کا نام سامنے آتا ہے۔

بحیثیت خطاط، صادقین نے اپنے فن کی عظمت کو منوالیا ہے، دیر سے حرم تک صادقین کی خطاطی کے طلبگاروں اور قدر دانوں کی کمی نہیں ہے۔ آیات کلام الٰہی کی جو خطاطی صادقین نے کی ہے وہ منفرد ہے اس کا سبب ایک تو صادقین کی تخلیقی صلاحیت اور دوسرے شاید یہ کہ وہ خطاط (Caligrapher) ہونے کی رو سے قلم کے استعمال پر ہی قادر نہیں برش کا استعمال بھی کرتے ہیں اور اُن کا Vision انہیں مصوری، صورت گری اور خطاطی کے امتزاج کا جوہر عطا کرتا ہے۔

صادقین کی تیسری حیثیت ایک شاعر کی ہے۔ اُنہوں نے نظمیں بھی کہی ہیں مثنوی اور مرثیہ بھی لیکن اُن کا مزاج ''رباعی'' ہے یہاں تک کہ اُنہوں نے جو مرثیہ کہا وہ بھی رباعی کی بحر میں ہے۔ صادقین سے پہلے بہت سے نامور مرثیہ نگار شعراء کرام گذرے ہیں لیکن رباعی کی بحر میں مرثیہ صادقین سے پہلے صرف صفی حیدرآبادی اور نسیم امروہوی نے مرثیے کہے ہیں۔ صادقین اس وادیٔ دشوار میں قدم رکھنے والے تیسرے شاعر ہیں۔

عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ باہر سے اُجلے اور روشن لوگوں کے اندر اندھیرا ہوتا ہے لیکن صادقین مختلف تھے۔ جس طرح مصوری، خطاطی اور شاعری میں مختلف تھے اس طرح زندگی طرز زندگی اور کردار میں بھی عام لوگوں سے مختلف تھے اُنہوں نے مذہب کا لبادہ کبھی نہیں اوڑھا، وہ شریعت وطریقت کا پرچم اُٹھائے کبھی نہیں پھرے، دیکھنے میں ایک فنکار نظر آتے تھے۔ یعنی جو تھے وہ نظر آتے تھے۔ اور فنکار جن لوازمات میں اُلجھے ہوتے ہیں وہ ان سارے مسائل وخواص سے دوچار تھے لیکن ان کے اندر بڑا اُجالا تھا۔ اُن کا باطن بہت روشن تھا۔ اس کا ثبوت اُن کی خطاطی اور شاعری ہے۔ اُن کا فن ہے، اُن کے کلام میں ایسی رباعیاں نظر آتی ہیں ۔

میں عقل کے انکار کو ٹھکراتا ہوں اور قلب کا اقرار بجالاتا ہوں
اے ابن علیؑ ، تیری بدولت واللہ اللہ پہ ایمان لئے آتا ہوں

اُن کے عقیدت کے رخ بہت واضح اور منوّر ہیں ۔

وہ اسم گرامی جو لکھا کاغذ پر رنگوں میں اُتر آئی وفا کاغذ پر
جب بھی یہ قلم نادِ علیؑ لکھتا ہے پھر حرف جو لکھتا ہے جلی لکھتا ہے
میری مدد ہوجاتی ہے مِن جانب غیب
صدقے میں حسینؑ ابن علیؑ کے لاریب

یہ سب میرے مولا کی عنایت ہی تو ہے میں کیا، میری شہرت، میری خطاطی کیا

صادقین نے جب وطن چھوڑا تو وہ رنگوں کی دنیا میں نو وارد تھے۔ لیکن ۳۲ برس بعد جب واپس وطن گئے تو عظمتیں ان کے نام لکھی جا چکی تھیں۔ پوری دنیا میں اُن کا نام تھا لیکن جونہی امروہہ پہنچے اُنہیں وطن کی مٹی کی مہک نے یادوں کے چمن زار میں پہنچا دیا۔ امروہہ کی سرزمین منقبت، سلام، نوحے اور مرثیے کی سرزمین ہے۔ وہاں کی فضاؤں میں مرثیے سنائی دیتے ہیں، ۳۲ برس بعد ایک فنکار، ایک شاعر، ایک خطاط، ایک فقیر منش انسان وطن پہنچا تو اس نے ساری آوازوں کو دل میں اُتار لیا۔ اس فضا میں صادقین نے مرثیے کا آغاز کیا اور پھر اس سچائی کے ساتھ جس سچائی سے وہ رنگوں کو برتنے کے عادی تھے۔ اس صداقت سے جس سے وہ ذہن میں اُبھرتے فنکارانہ خطوط کو خطاطی میں بدل دیتے تھے اُس جذبے سے اُنہوں نے جو محسوس کیا اُسے مرثیے میں قلم بند کر دیا، امروہہ اور امروہہ آنے کے بعد اپنے جذبات کو مرثیے کا چہرہ بنا دیا۔ اور مرثیہ ہے بھی جذبات و احساسات کی صداقت کو قلم بند کرنے کا نام — ایک فنکار کے سچے جذبوں کو دیکھیے۔

لاریب کہ اللہ تعالیٰ تو نے بندے کو بڑے عیش سے پالا تُو نے
لغزش ہوئی جب بھی تو سنبھالا تُو نے میرا ہر اک ارمان نکالا تُو نے
امروہہ کے پھر جلوے کیے ہیں میں نے
اِک پھیرے میں دو عشرے کیے ہیں میں نے

ہاں شکرِ خدائے دو جہاں ہے لاریب اُس ذات سے جو ذات ہے قطعاً بے عیب
میری مدد ہو جاتی ہے مِن جانبِ غیب صدقے حسینؑ ابنِ علیؑ کے لاریب
یاروں سے ملا دیا ہے مالک تُو نے
امروہہ دکھا دیا ہے مالک تُو نے

ہر ساز اور سامان میں تبدیلی ہے پالش میں اور دالان میں تبدیلی ہے
کب لوگوں کے ایمان میں تبدیلی ہے مولا کی کہاں شان میں تبدیلی ہے
'بنگلوں' کا عزا خانہ ہے بالکل ویسا
بتّیس برس پہلے تھا چھوڑا جیسا

'بنگلوں' ہی کا کیا سب ہی ہیں بالکل ویسے بستی میں عزا خانے ہیں کیسے کیسے

فانوس بھرے ہوئے ولا کی مے سے مولا کے بھی اعجاز ہیں کیسے کیسے
علموں کے جلوس کا تجمل ہے وُہی
مجلس کے خلوص کا تجمل ہے وُہی

دونوں کا وہی نظام اللہ اللہ آرائش کا اہتمام اللہ اللہ
دُلدُل کا وہ احترام اللہ اللہ مولا پہ پھر وہ سلام اللہ اللہ
حق لکھتے ہیں جو ایسے قلم آتے ہیں
'لکڑوں' میں 'بذریعۂ' سے علم آتے ہیں

دکھلاؤں تو علموں کے کنارے یارو مجلس کے، جلوس کے نظارو یارو
میں شہر میں آیا ہوں تمہارے یارو پیارے یارو! مرے پیارے یارو
طفلی میں علم بھی میں بناتا تھا یہاں
ٹامل کے قلم بھی میں بناتا تھا میاں

پھر نام ولی ابنِ ولی لکھتا تھا کاغذ پہ حسینؑ ابنِ علی لکھتا تھا
یہ نام میں پڑھ پڑھ کے جلی لکھتا تھا مُنہ میں لئے مصری کی ڈلی لکھتا تھا
اس نام کو کب خانۂ یاقوت میں آج
لکھتا ہوں نہاں خانہ لاہوت میں آج

مابعد طبیعات کو لکھنے کا یہ شوق ولیل کا لفظ رات کو لکھنے کا یہ شوق
سچائی کی ہر بات کو لکھنے کا یہ شوق قرآن کی آیات کو لکھنے یہ شوق
اللہ کے اُس ولی سے ورثے میں ملا
مجھ کو حضرت علیؑ سے ورثے میں ملا

کھِل جاتی ہے جب مَن کی کلی لکھتا ہوں یہ وہ ہے قلم جس سے علی لکھتا ہوں
اور اُن کو محمدؐ ولی لکھتا ہوں قرآن کی آیات جلی لکھتا ہوں
کس کے ہیں یہ سب طور مرے پردے میں
لکھتا ہے کوئی اور مرے پردے میں

ہر چیز کا مُو قلم سے نقشہ کھینچا اس کا اگر چہرہ تو کسی کا مکھڑا

کاغذ پہ تو ہوں نام کبھی کے لکھتا پر خونِ جگر سے لوحِ دل پر کس کا؟
میں نام حُسینؑ ابنِ علیؑ لکھتا ہوں
لکھتا ہوں نہایت ہی جلی لکھتا ہوں

پیاسے ہیں مگر مالکِ زمزم ہیں حسینؑ لاریب بہ فیہ فخرِ دوعالم ہیں حسینؑ
نازِ خدا و نازشِ آدم ہیں حسینؑ ہیں نورِ خدا خیرِ مجسم ہیں حسینؑ
ہے ظلمتِ کفر و شر کا پُتلا ہے یزید
ہر صورتِ باطل کا چہیتا ہے یزید

ہے ظلم بھی اور ظلم کی شدّت منظور مقصود تباہی ہے ہلاکت منظور
مطلوب اسیری سے شہادت منظور منظور ہے سب پر نہیں بیعت منظور
کافر کا کبھی ساتھ نہیں دے سکتے
کٹوائیں گے سر ہاتھ نہیں دے سکتے

تم لوگ رہِ گناہ پہ چلنے والے لے لے کے بہت سیاہ چلنے والے
ہم صبر و رضا کی راہ چلنے والے ساتھ اپنے ہیں مہر و ماہ چلنے والے
تم کون ہو، فرعون ہو، موسیٰ ہم ہیں
تم تحت الثریٰ، عرشِ معلیٰ ہم ہیں

وہ خون تھا روشنائی، تختی مقتل مقتل کی وہ گرم ریت کیا تھی، بھوبل
اس پر وہ رواں ہوا بناتا ہوا نبل خطاطِ ازل کا ہاتھ بالکل اوجھل
بہتان تھا تو بن جاتا ایمان کا لفظ
انسان کا عرفان کا، قرآن کا لفظ

مجھے صادقین سے ملنے کا شرف حاصل ہے۔ اُن سے بحث وتمحیث کا شرف حاصل ہے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب صادقین سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ امروہہ کی روایتوں کے حوالے سے بھائی صادقین تھے۔ وہ فقیر کوئے محمد وآل محمد اپنے عجز کے علمبردار تھے۔ سیانوں نے کہا ہے'' بڑا آدمی وہ ہوتا ہے جس سے ملنے والا ہر آدمی خود کو بڑا سمجھنے لگے'' ــــ صادقین ایسے ہی بڑے آدمی تھے کہ ہر آنے جانے والے کو احساس کا یہ تحفہ دے کر بھیجتے تھے کہ وہ بڑا آدمی ہے، اس

کی اہمیت ہے۔ آج صادقین ہم میں نہیں ہیں لیکن کبھی کبھی بڑی شدت سے صادقین کی آواز میرے گنبد سماعت میں گونجتی ہے۔

''بھائی عاشور! آجاؤ کسی دن فقیروں کے ڈیرے۔ یہ لفظ عاشور میری کمزوری ہے۔ میں اس نام کو اتنے رنگوں میں لکھوں گا کہ رنگ ختم ہو جائیں۔ بس آجاؤ کسی دن فقیر کے ڈیرے پر''

اور میری بدنصیبی کہ وہ دن کبھی نہیں آیا۔ یہ اندازہ ہی نہ ہوا کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ گدائے کوئے بنی ہاشم، صادقین کیا عطا کرنا چاہ رہے ہے۔ آج اپنی کوتاہیوں کا احساس رُلاتا ہے۔ زندگی کے آخری حصے میں وہ سب فروگذاشتیں یاد آرہی ہیں۔ جن لوگوں کو کھودینے کا احساس جاگ رہا ہے ان عظیم لوگوں میں ایک صادقین تھے۔ آج جو مرثیے کے حوالے سے یاد آرہے ہیں۔ ممتاز مرثیہ گو عنبر نقوی نے صادقین کی تاریخِ رحلت لکھی ہے ۔

صادقینی ساز کی لے ہے خموش
گوش عنبر میں ہے آوازِ سروش
کر رقم تاریخِ رحلت یہ کہ ہے
خود مصوّر آج اک تصویر دوش

۱۹۸۷ء

☆☆☆☆☆

تاثیر نقوی:- (کراچی)

ولادت ۱۹۲۰ء۔ وفات ۱۹۸۷ھ

نام مظفر حسین۔ تخلص تاثیر۔ نقوی سیدؔ۔ وطن لکھنؤ۔ والد گرامی حکیم سید احمد ابن علاّمہ ہندی مولانا سید احمد مجتہد ابن مولانا سید ابراہیم فردوس صاحب مرحوم ومغفور۔ اس طرح تاثیر نقوی خاندان اجتہاد کے چشم و چراغ تھے۔ اردو فاسی عربی کی تعلیم سلطان المدارس لکھنؤ اور ناظمیہ عربک کالج لکھنؤ میں ہوئی۔ صحافت کو ذریعۂ معاش بنایا۔ ہندوستان میں تھے تو بمبئی سے ہفت روزہ حسینی پیغام نکالا اور کئی دیگر جریدوں کی ادارت کی جب میں 'ستارہ'، منزل اور آئینہ تھے۔ ۱۹۴۷ء مین پاکستان آگئے اور شمع لاہور، قومی آواز لاہور نظام جدید، تحریک اور روزنامہ نوائے ملتان کے مدیر رہے۔

شاعری کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ ان کے والد گرامی بلند پایہ شاعر تھے۔ جاوید لکھنوی کے شاگرد تھے۔ تاثیر کے نانا مولانا رضی لکھنوی لکھنؤ کے ممتاز شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ تاثیر نقوی کی شادی حضرت آرزو لکھنوی کی صاحبزادی نوروزی سے ہوئی۔ گویا اُن کے چاروں طرف شاعری کے چشمے اُبل رہے تھے۔ مظفر حسن ایسے میں تاثیر نہ بنتے تو کیا بنتے۔ دراصل آرزو لکھنوی نے ہی انہیں مظفر حسن سے تاثیر بنایا، اُن کے کلام کی اصلاح کی، شاگردی کا شرف عطا کیا اور اس طرح یہ قطرہ قلزم بن گیا۔ پہلا مرثیہ ۱۹۶۸ء میں کہا۔

حمد و ثنائے خالقِ کون و مکاں کروں　　جی چاہتا ہے حُسن نہاں کو عیاں کروں
افشا جہاں پہ رازِ زمین و زماں کروں　　دل کا لہو پلا کے قلم کو رواں کروں
معبود کائنات مرے دل کو نور دے
یارب مجھے زبان و بیاں پر عبور دے

تاثیر نقوی کے مراثی میں سیرت و کردار حسینی پر تبصرہ روایتی حوالوں سے نہیں بلکہ فکری رجحانات میں ملتا ہے۔ حسینؑ نواسۂ رسولؐ تھے۔ فرزند علیؑ و بتولؑ تھے۔ حسینؑ سردار جوانان جنت تھے۔ یہ ساری عظمتیں مسلم مگر یہ ساری عظمتیں عطائی ہیں۔ کچھ اللہ کی طرف سے، کچھ نسب کے حوالے سے۔ تاثیر نقوی اُن فکر کرنے والوں میں شامل ہیں جو حسینؑ کو فکر کی عظمتوں پر دیکھتے ہیں۔ اپنے مرثیے "روحِ انقلاب" میں تاثیر کی نظر میں حسینؑ عالی مقام کو دیکھیے۔

اے روحِ انقلاب حسینؑ فلک مقام　　ذہنوں کا بادشاہ خیالوں کا تُو امام
یوں ہے جبینِ وقت پہ تحریر تیرا نام　　جیسے دلِ رسولؐ پہ اللہ کا کلام
تُو کعبۂ عقیدتِ عقلِ سلیم ہے
پہلے بھی تُو عظیم تھا اب بھی عظیم ہے

تو ہے جہانِ عزم و عمل کا اک آفتاب　　ہر عصرِ نو ہے تیری تجلّی سے فیضیاب
تُو گو کہ کربلا میں ہے مدّت سے محوِ خواب　　بیداریوں کے کھولے ہیں تو نے ہزار باب
اس درجہ نور پاش ترے در کی خاک ہے
ہر حریت پسند جبیں تابناک ہے

اور یہ چراغ جوشؔ کے فکری چراغ سے روشن ہوا ہے۔ یہ نہج جوشؔ، جمیل۔ نجم کی قائم

کردہ ہے اور یہی جدید مرثیہ ہے۔

تاثیر نقوی کا ایک شاہکار مرثیہ ''لب جبرئیل'' ہے کو انہوں نے ۱۹۷۷ء میں کہا تھا۔ یہ مرثیہ قرآنی مشن کراچی نے شائع کیا تھا۔ اس مرثیے میں جدید مرثیے کی ساری گھن گرج موجود ہے۔

ہر انقلاب خیر کے بانی حسینؑ ہیں کردار میں رسول کے ثانی حسینؑ ہیں
مجموعۂ ازل کی جوانی حسینؑ ہیں زندہ ہے جس سے حق وہ کہانی حسینؑ ہیں
مشکل پسندیاں کوئی آسان تو نہیں
کیسے رہیں خموش یہ قرآن تو نہیں

رضواں نے اُن کے دامن جاں پر کھلائے باغ مہکا لباس زیست معطر ہوئے دماغ
صہبائے غم سے آنکھوں کے پُر ہو گئے ایاغ پلکوں پہ آنسوؤں نے جلائے نئے چراغ
دانشوروں کی فکر کا عنواں بدل گیا
انسان انقلاب کے سانچے میں ڈھل گیا

دنیا ملوکیت کو سمجھنے لگی تھی حق تاریکیوں میں نور کی باقی نہ تھی رمق
پیہم فصیل علم و عمل ہو رہی تھی شق رنگیں تھے خون فکر سے قرآن کے ورق
تھا ختم فاصلہ حق و باطل کے درمیاں
آئے حسینؑ جادہ و منزل کے درمیاں

سر پر کلاہ تاج رسولانِ ذی وقار بر میں قبائے معرفت ذات کردگار
چہرہ بھی پُر شکوہ کمر میں بھی ذوالفقار مقتل کا خوف اور نہ تمنائے اقتدار
کاندھوں پہ یہ لئے ہوئے بارِ پیمبری
رکھ لیں گے جان دے کے وقار پیمبری

اور میدان کربلا میں وقت آخر سید الشہدا امام حسینؑ کے رجز کا انداز فکری سطح پر کتنا بلند نظر آتا ہے۔

بیڑا ملوکیت کا ڈبو دوں لب فرات ہر دور کے یزید کی لُٹ جائے کائنات
مظلومیت کو دے کے عوامی حیاتِ ذات کر دوں رگِ گلو سے قلم تیغ زن کے ہاتھ

مرنے کو زندگی کے لئے بیقرار ہوں
اس وقت میں مشیت پروردگار ہوں

دنیا سے مختلف ہے مری تین دن کی پیاس　　لب خشک ہیں مگر میرے دلکو نہیں ہراس
واللہ جانتے ہیں حقیقت یہ حق شناس　　قدرت کی دی ہوئی ہے یہ قدرت بھی میرے پاس
کھینچوں نشاں زمیں پہ تو چشمے نکل پڑیں
ٹھوکر جو مار دوں تو سمندر اُبل پڑیں

تاثیر نقوی کا قول ہے کہ قدیم مرثیے کے اجزاء کو قائم رکھ کر بھی جدید مرثیہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ بات عمل کی منزل پر اس لئے مشکل ہے کہ کلاسیکی مرثیے کے لوازم کی پاسداری کرتے کرتے ذہن فکر کے نئے دریچے کھولنے کی بجائے روایت کی راہوں میں بھٹکتا رہتا ہے لیکن تاثیر نقوی اس کٹھن منزل سے کامیاب گذرے ہیں اس لئے تو بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ:

فردوس تو بہار بہارِ سخن میں ہے

☆☆☆☆☆

رئیس امروھوی:-

ولادت ۱۲ رستمبر ۱۹۱۴ء وفات ۲۲ رستمبر ۱۹۸۸ء

نام سید محمد مہدی تخلص رئیس وطن امروہہ۔ والد گرامی علامہ سید شفیق حسن ایلیا۔ رئیس امروہوی نے علمی ادبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ اُن کے والد گرامی علامہ سید شفیق حسن ایلیا امروہوی ایک باکمال شاعر، عالم دین اور محقق تھے۔ اُن کی ایک صد سے زیادہ تحقیقی کتابیں تھیں۔ ڈاکٹر ہلال نقوی نے لکھا ہے کہ علامہ صاحب نے قرآن و سائنس کے موضوع پر ۱۲۸ کتابیں لکھی ہیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر لکھنا اور اس لکھے ہوئے کی تشہیر کرنا ہر صاحب فکر پر لازم ہے۔ علامہ شفیق حسن کی اولاد میں سب نے ادب میں ایک جداگانہ مقام حاصل کیا ہے سید محمد تقی، رئیس امروہوی اور جون ایلیا اُردو علم و ادب میں پہچانے گئے نام ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ اُن کے والد گرامی نے اتنا بڑا کام کیا اور اُن کے تینوں فرزند جو ادب اور میڈیا سے متعلق رہے سائنس اور قرآن کے موضوع پر انمول کتابوں کی تشہیر نہ کر سکے۔

رئیس امروہوی ۱۹۴۷ء میں پاکستان آئے۔ بدیہہ گو شاعر تھے ابتدا روزنامہ جنگ

میں ہر روز ایک قطعہ لکھنے سے کی اور بہت جلد وہ مقام حاصل کرلیا کہ اُن کا قطعہ پڑھ کر اُس دن کے سیاسی حالات اور اہم واقعات کا انداز ہو جاتا تھا۔

نوائے سندھ و کراچی کہ آج ہے ویراں یہیں بہشت کی رنگینیاں سجادیں گے
اب یہ ہ د ر نہ کر، لکھنؤ کا نام نہ لے اسی دیار کو ہم لکھنؤ بنادیں گے

اور ایسا ہی ہوا۔ اودھ سے جو شعراء کراچی آئے تھے وہ اور ہندوستان کے مختلف حصوں سے ہجرت کر کے کراچی آنے والے شعراء کو ۱۹۵۰ء سے خطیب آل محمد علامہ رشید ترابی، ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل زیڈ۔ اے بخاری، منور عباس ایڈووکیٹ، سید آل رضا کی سرپرستی ملی اور کراچی میں مرثیہ گوئی کی بنیاد رکھی گئی۔ جن شعراء نے کراچی میں ۵۱/۱۹۵۰ء کے لگ بھگ مرثیہ گوئی کا آغاز کیا اُن کے ہراول دستے میں سید آل رضا، رئیس امروہوی، غضنفر حسین عروج بھرتپوری اور ڈاکٹر یاور عباس تھے۔ رئیس امروہوی نے پہلا مرثیہ ۱۹۵۱ء میں کہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کراچی شہر مرثیے کا دبستان بن گیا۔ پہلی کھیپ میں رئیس امروہوی کا مرثیہ ۔

''پُر گو بھی، زود گو بھی ہیں اس دور میں رئیس''

ایک صداقت تھا۔ رئیس امروہوی منظوم گفتگو کیا کرتے تھے۔ راقم السطور خود عینی شاہد ہے کہ چھ سات شاگرد سامنے بیٹھے ہیں۔ ایک غزل پر اصلاح لے رہا ہے، دوسرا نظم سنا رہا ہے، کوئی منقبت کی بات کر رہا ہے۔ کوئی سلام لکھ کر لایا ہے اور رئیس امروہوی بیک وقت سب کو اصلاح دے رہے ہیں۔

رئیس امروہوی کا رجحان فلسفے کی طرف ہوگیا تھا اسی سبب وہ شاعری تو ہر لمحہ کرتے رہے لیکن مرثیہ کی طرف اُن کی توجہ نہ رہ سکی۔ اُنہوں نے کُل دو مرثیے کہے حالانکہ جس تیزی سے وہ شعر کہتے تھے اگر تاریخ کربلا پڑھتے رہتے یا کسی ذاکر سے شہادت حسین سنتے وقت ساتھ ساتھ شعر کہتے رہتے تو نہ جانے کتنے مرثیے کہہ لئے ہوتے مگر ہائے رے زمانے تو نے کیسے کیسے چاند سورجوں کی شعاعوں کا رخ موڑ دیا مثال کے طور پر سید آل رضا کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ دن کی مجلس میں ذاکر جو پڑھتے تھے شام کی مجلس میں آل رضا اسی احوال کا مرثیہ مجلس میں پڑھا کرتے تھے۔

رئیس امروہوی کے دونوں مراثی شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کا پہلا مرثیہ ''حسین اور حسینیت'' ۸۴ بند پر مشتمل ہے اور ۱۹۷۲ء میں سپر آرٹ پریس کراچی نے شائع کیا ہے۔ اس مرثیے میں اُن

کے فلسفیانہ رجحانات کا اثر بھی ہے اور کسی کیفیت یا واردات قلبی کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کی عادت کا ہر تو بھی۔ شعراء کرام نے غم دل کو غم جاناں بنایا ہے، ترقی پسند شاعروں نے غم جاناں (دوسروں کے غم) کو اپنا غم بنایا ہے۔ رئیس امروہوی نے غم کو فنا سے بقا تک دیکھا ہے برتا ہے اور غم کی بقا پر انحصار کیا ہے۔

اے خوشا دل کہ ازل سے ہو جراحت خوردہ　　جوششِ اشک سے اک قطرۂ دریا بُردہ
اے خوشا دل کہ مسرت سے رہے آزردہ　　دل افسردہ، عجب شے ہے دلِ افسردہ
کیا کہیں دل کو جو انعام ملا ہے غم ہے
دل سے انساں کی جلاً، دل کی جلاً ہے غم سے

غم بھی دنیا میں بہت ہیں، غم جاناں، غم جاں　　کوئی غم دیں کے لئے کوئی برائے دوراں
فکر کے روپ بہت، فکرِ چنیں، فکر چناں　　درد کے رنگ کئی، دردِ بشر، دردِ جہاں
درد دل ایک ہی ہے، دردِ جگر ایک ہی ہے
غم ہزاروں، غم جاوید مگر ایک ہی ہے

غم کو بخشی نئی صورت، نئی سیرت جس نے　　کی عطا آنکھ کو اشکوں کی بصیرت جس نے
ڈھال دی درد کے قالب میں مسرت جس نے　　عظمت غم کو عطا کی ابدیت جس نے
دل مُردہ کو دیا حکم، بہر طور تڑپ
روح انساں کو سکھایا کہ تڑپ اور تڑپ

غم شبیر نے ہر عہد کو بخشا ہے شعور　　جس کے آگے کبھی چلتا نہیں باطل کا غرور
چشم بینا سے ہیں ہے یہ حقیقت مستور　　خود ہے تاریخ کو اس غم کی اشاعت منظور
جب بھی رنگ ستم و جور بکھر جاتا ہے
ایسے عالم میں یہ غم اور نکھر جاتا ہے

عدل کو جور نے ٹوکا سرِ میداں جب بھی　　ظلم و انصاف ہوئے دست و گریباں جب بھی
نوعِ آدم میں بڑھی جرأتِ عیاں جب بھی　　اپنے مرکز سے ہٹی فطرت انساں جب بھی
ستم و جور کے سیلاب کو ٹوکا اس نے
بڑھ کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکا اس نے

رئیس امروہوی کا دوسرا مرثیہ "اَنَا مِنَ الحسین" کے نام سے رئیس اکیڈمی نے شائع کیا تھا:

سجدہ گاہِ دردِ مندانِ جہاں ہے کربلا عشق کو منزل گہِ تسلیم جاں ہے کربلا
غازۂ خونِ شہیداں سے جواں ہے کربلا[۱] جاودانی ہے محبت، جاوداں ہے کربلا

شمع غم بجھتی نہیں، سوزِ دروں مٹتا نہیں
خون سے جو نقش بنتا ہے کبھی مٹتا نہیں

قبلۂ اربابِ تسلیم و رضا ہے کربلا کعبۂ لبیک گویانِ وفا ہے کربلا
آزمائش گاہِ مردانِ خدا ہے کربلا شوقِ بے پرواہ سنبھل، یہ کربلا ہے کربلا

جذبۂ آشفتہ سر نے خود سنورا ہے اسے
عشق نے اپنا لہو دے کر نکھارا ہے اسے

کربلا ارضِ تمنا ہے، تمنا ہے حسینؑ کربلا طورِ حقیقت ہے تجلی ہے حسینؑ
کربلا دینِ وفا، عظمت کی دنیا ہے حسینؑ[۱۶] اے زمینِ کربلا، بتلا ہمیں کیا ہے حسینؑ

یہ جو جذبہ جاودانی تیرے افسانے میں ہے
کیا یہ کوئی رازِ قدرت کے نہاں خانے میں ہے

انقلاب فکر کا جو رہنما ہے وہ حسینؑ جو شعور افروزِ تسلیم و رضا ہے وہ حسینؑ
جو حدودِ ابتلا سے ماورا ہے وہ حسینؑ جو خود اپنی ذات میں اِک کربلا ہے وہ حسینؑ

دل کے ہر گوشے میں شمع آرزو جلتی رہی
ذہن میں جس کے ہمیشہ کربلا پلتی رہی

بھر گیا جب بھی سرِ باطل میں سودائے فساد ہوگیا جب بھی شقاوت پر کمربستہ فساد
جب بھی کودا جنگ میں کوئی یزید بدنہاد[۲۷] جب بھی اُبھرا ظلم کی تہہ سے کوئی ابن زیاد

ظلمتِ تاریخ میں تنہا سفر کرتی رہی
کربلا ہر معرکے میں رفعِ شر کرتی رہی

ضربت اعدا سے گو تیرا بند ہے خونچکاں تیرے لب پر فتح مندانہ تبسم ضو فشاں
اے بظاہر زخم خوردہ اے بباطن کامراں[۲۸] تو شکست فتح کی ہے اک انوکھی داستاں

منفعل وہ ہیں جو داغِ فتح سے بدنام ہیں
فتح اُن کی ہے جو ظاہر میں شکست انجام ہیں

راقم السطور (عاشور کاظمی) نے اپنی کتاب "بیسویں صدی کے نثر نگار۔ مغربی دنیا میں" میں رئیس امروہوی کی بیٹی ذُروانہ کا ایک بیان قلمبند کیا ہے جو درد کی داستان ہے:

میرے والد رئیس امروہوی دادا کی دی ہوئی روشنی پھیلانے پر مامور ہوگئے۔ اُنہوں نے قرطاس وقلم سنبھال لیا۔ ہم نے ہوش سنبھالا تو دیکھا وہ علم بانٹ رہے ہیں۔ محبتیں تقسیم کر رہے ہیں۔ لوگوں کو آوازیں دے دے کر بُلا رہے ہیں— ہم دیکھتے تھے کہ ایک ہجوم جمع ہے۔ لوگ اپنی اپنی کہانیاں سنانے آتے ہیں اور خوشگوار انجام کا یقین لے کر جاتے ہیں۔ ...... اور پھر یزید نے اس گھر کو تاکا، وہ گھر جو جنت کا گہوارہ تھا، اُسے خون میں نہلا دیا۔ رئیس امروہوی جنہیں سندھی، پنجابی، بنگالی، پٹھانی سب عزیز تھے۔ سنّی بھی اُن کے تھے۔ شیعہ بھی اُن کے تھے، وہ مذہب، ملت، زبان، علاقے سے بلند تھے۔ وہ تو انسان اور انسانیت کی پوجا کرتے تھے۔ جانے کیوں میرے عالم فاضل انسان دوست باپ کو اُن کے اپنے خون میں نہلا دیا گیا۔ آخر ایسا کیوں ہے کہ جب بھی کسی نے بلند ہونے کی کوشش کی اُسے زیر کرنے کی کوشش کی گئی۔ کبھی اسے آگ میں پھینک دیا گیا۔ کبھی مصلوب کر دیا گیا، کبھی کربلا برپا کر کے بچوں تک کو تیروں کا نشانہ بنایا گیا۔ سچائی کو مٹانے کے لئے آخر کب تک یزید آتے رہیں گے"

اقتباس ختم اور سلسلۂ تحریر بھی ختم کہ ذُروانہ کے آنسوؤں کے سیلاب کے سامنے ٹھہرنا محال ہے۔

☆☆☆☆☆

مسعود رضا خاکی:- (لاہور)

پیدائش، ۵ رجنوری ۱۹۲۶ء۔ وفات ۱۹۸۸ء

جائے ولادت میرٹھ (یو۔ پی) جبکہ سید وحید الحسن ہاشمی نے "ریاست جاورہ" تحریر کی ہے۔ ڈاکٹر مسعود رضا خاکی کے والد گرامی آغا محمود رضا محکمہ پولیس کے افسر تھے۔ ہو سکتا ہے جب

مسعود رضا خاکی پیدا ہوئے ہوں اُس وقت آغا محمود رضا ریاست جاورہ میں تعینات ہوں — اُن کی تعلیم کے سلسلے میں سب متفق ہیں کہ اُن کی ابتدائی تعلیم اُن کے ماموں مظفر عباس زائر کی زیر نگرانی ''ریاست جاورہ'' میں ہوئی۔ مسعود رضا خاکی کی والدۂ گرامی کا تعلق ریاست جاورہ سے ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ریاست جاورہ کو اُن کی جائے پیدائش قرار دینے کی ایک وجہ سامنے آتی ہے۔ بہر حال اہل نقد و نظر اس بات پر متفق ہیں کہ مسعود رضا خاکی دہلی کے ایک ممتاز قزلباش خاندان کے چشم و چراغ تھے، اور اُن کی ابتدائی تعلیم جاورہ میں ہوئی، ہو ۱۹۴۷ء میں پاکستان آگئے اُنہوں نے گارڈن کالج راولپنڈی سے ایم۔اے کی سند حاصل کی'' شرر اور اُن کے تاریخی ناول'' پر مقالہ تحریر کیا۔ اُردو افسانے کے ارتقاء مقالہ لکھ کر پنجاب یونیورسٹی سے ڈائرکٹریٹ کی سند لی۔ اور شعبۂ درس و تدریس سے متعلق ہو گئے۔

شاعری کی ابتدا ۱۲ برس کی عمر سے ہوئی۔ اور کیوں نہ ہوتی، مظفر عباس زائر جیسے شاعر کی تدریس و تربیت کو بہر حال مسعود رضا پر اثر انداز ہونا تھا۔ مسعود رضا خاکی ابتدا زائر صاحب سے اصلاح لیتے رہے۔ بعد ازاں سیماب اکبر آبادی کے شاگرد ہو گئے۔ پہلا مرثیہ ؎ ''جذبۂ عشق نے جب شوق کو مہمیز کیا'' کہا۔ جس کا سن تصنیف ۱۹۷۲ء ہے۔ اس سے پہلے ۱۹۴۷ء میں ''کربلا روتی رہی'' کے زیر عنوان مسدس کی ہیئت میں کچھ بند کہے تھے جسے باقاعدہ مرثیہ نہیں کہا جا سکتا۔ ۱۹۷۲ء میں ہی ایک اور مرثیہ ''حمد معبود سے ہوتا ہے جب آغاز سخن'' کہا

مسعود رضا خاکی کے مرثیے انشائیہ کے انداز میں کہے ہیں جو مرثیہ گوئی میں ایک کامیاب تجربہ ہے۔ جدید مرثیے کے متعلق اُن کی رائے بھی یہی ہے کہ'' جدید مرثیہ منظوم انشائیہ ہے جس میں کربلا کے ساتھ ربط قائم رکھتے ہوئے گفتگو ہوتی ہے''۔ اس رائے کا عملی مظاہرہ اُن کے موضوعاتی مرثیوں میں ہوتا ہے۔ ان مرثیوں میں وقت کے تقاضوں کا آہنگ بھی سنائی دیتا ہے اور تاریخ کا منظر نامہ بھی۔ ان موضوعاتی مرثیوں میں ''حسینؑ'' اور عصری تقاضے''، ''حقوق والدین''، ''اسلام اور حسینؑ''، ''ماں کی محبت'' جیسے مرثیے شامل ہیں۔ اُن کے مراثی اپنے عہد کے مختصر مرثیوں میں شمار کئے جاتے ہیں لیکن اُن کے اختصار میں اتاریخی وسعتیں سمٹی نظر آتی ہیں۔ مثلاً امام حسنؑ کے احوال کے مرثیے۔ ''زبان پہ حمد خدا ہے پئے ثنائے حسنؑ'' میں امام حسنؑ کی حیات، شجرہ نسب، صفات، نگاہ رسالت میں حسنؑ و حسینؑ کا مرثیہ۔ بعد شہادت علی

حالات ۔کوفہ وشام کی بساط سیاست، امام حسین کی شادیاں، صلح حسن امام حسن کو زہر دے کر شہید کرنا سارے واقعات تاریخی اور منطقی استدلال کے ساتھ ۴۵ بندوں میں نظم کردئے ہیں۔ اس کے اقتباسات درج ذیل ہیں۔

زباں پہ حمد خدا ہے پئے ثنائے حسنؑ یہ ذکر کرتے ہوئے اس جہاں میں آئے حسنؑ
نبی سے ذکر خدا سن کے مسکرائے حسنؑ [۱] خدا نے کون ومکاں دیدئے برائے حسنؑ
حسنؑ سے پہلے بھلا ایسی ماں ملی کس کو
سلام کرتے ہیں شفقت سے خود نبی جس کو

ہے، کس کا نانا محمدؐ سا معتبر کہئے ہے کس کے باپ کا مولد خدا کا گھر کہئے
ہیں مہرِ مادری میں کس کی بحر و بر کہئے [۵] ہوا ہے کوئی کہاں ایسا مفتخر کہئے
کسی نبی و ولی کا بھی یہ مقام نہ تھا
حسنؑ سے پہلے حسنؑ بھی کسی کا نام نہ تھا

خدا کے حکم سے رکھا گیا ہے نام حسنؑ خدا کے دین کی بنیاد ہیں امام حسنؑ
بتا دیا ہے پیمبرؐ نے خود مقام حسنؑ نماز بھی ہو تو واجب ہے احترام حسنؑ
حسنؑ بھی حجتِ حق ہیں یہ اعتماد رہے
حسینؑ چھوٹے حسنؑ ہیں یہ بات یاد رہے

وہ دور جس میں زمانے سے جاچکے تھے رسولؐ بڑے بڑوں کا تھا اس دور میں یہی معمول
جہاں بھی مسئلہ علمیہ نے کھینچا طول [۱۶] ہر اک نگاہ اُٹھی سوئے آستانِ بتولؑ
سنا ہے اذنِ بیاں بوتراب دینے لگے
ہر اک سوال کا بچے جواب دینے لگے

علی کا عہد جونہی سازشوں میں ختم ہوا کبھی جمل، کبھی صفین کا محاذ کھلا
عجیب صورت حالات تھی قسم بخدا [۲۰] نبی کا حکم تھا، نفس نبی نے صبر کیا
علی کے بعد حسنؑ جب امام وقت ہوئے
منافقانہ تھپیڑے کچھ اور سخت ہوئے

یہ سرد جنگ تھی جو خیر وشر میں جاری تھی امام وقت نے اپنالیا تھا وصف نبی

وہی نمونۂ اخلاق و مشفقانہ روی [۲۱] عمل کی شکل وہی، قول کا شعار وہی
بتادیا کہ عمل کس طرح سنورتے ہیں
جہاد صلح کے انداز میں بھی کرتے ہیں

منافقین تھے قرآن در بغل جب سے عرب کو دور لئے جارہے تھے مذہب سے
حسن نے دین کی تبلیغ کی نئے ڈھب سے [۳۰] برائے صلح اُتر آئے پشتِ مرکب سے
امامِ وقت نے یہ رخ جو اختیار کیا
منافقین نے پردے میں چھپ کے وار کیا

نگاہ فکر نے ڈھونڈا وسیلۂ ازواج بنایا سوچ کے منصوبہ حسب رسم و رواج
حسن کے گھر میں بھی موجود تھیں نفاق مزاج [۳۱] اُنہیں کے ہاتھ سے چاہا کہ دین ہو تاراج
بنے امام جو نذرانہ قاب میں بھیجا
کبھی رطب میں، کبھی زہر آب میں بھیجا

ہر انکشاف پہ مولا نے احتیاج بھی کی خدا کے حکم سے ازواج کو طلاق بھی دی
منافقین نے پھر شاعرانہ چال چلی [۳۲] طلاق وعقد کی کثرت کا راز بھی ہے یہی
جو آزمودہ تھا نسخہ وہ آزمایا گیا
حسن کو زہر کھلانا تھا تو کھلایا گیا

اس کے بعد صرف ۱۳ بندوں میں شہادت حسن۔ کربلا، کربلا میں شہادت قاسم کا حوالہ سب کچھ اختیار سے نظم کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے اختصار کے ساتھ طویل مضامین کو نظم کرنا شاعر کی مہارت شعر گوئی پر دلالت کرتا ہے، مسعود رضا خاکی اس مہارت شعر گوئی کے معیار پر پورے اُترتے ہیں۔

مسعود رضا خاکی نرے مرثیہ گو ہی نہیں ہیں بلکہ اُنہیں نقد ونظر میں بھی دسترس حاصل ہے۔ مرثیہ ''معراج البشر'' (قیصر بارہوی) مطبوعہ امداد اکیڈمی کرشن نگر ۱۹۷۵ء لاہور پر مسعود رضا خاکی کا مقدمہ اُن کی ناقدانہ صلاحیتوں کا مرقع ہے — اس طرح سہیل بناری کے مجموعہ کلام ''مرثیے'' ناشر ضیغم اسلام اکادمی لاہور ۱۹۷۵ء میں مسعود رضا خاکی نے مرثیہ نگاری کا تجزیہ اور سہیل بناری کی مرثیہ نگاری پر ناقدانہ تبصرہ کیا ہے اُسے اہل نظر نے مرثیہ اور صنعت مرثیہ پر اُن کی

مہارت تسلیم کیا ہے‘‘۔اُن کی مرثیہ نگاری میں صفت تاریخ نویسی کے علاوہ فکری اور شعوری استدلال کے علاوہ دل کو چھونے والے محاکات بھی نمایاں ہیں۔اُن کا ایک مرثیہ’ماں‘اس کمال کا مظہر ہے۔

ماں زندگی کا مرکز صبر و قرار ہے ماں اک چمن ہے جس میں مسلسل بہار ہے
ماں لطف ہے سکون ہے شفقت ہے پیار ہے ماں اک عظیم نعمت پروردگار ہے
ماں ایک درسگاہ ہے عقل و شعور کی
ماں ایک کہکشاں ہے محبت کے نور کی

اس مرثیے میں اُن کا قول، عمل بن کر نمایاں ہوتا ہے جس میں اُنہوں نے مرثیے کو منظوم انشائیہ کہتے ہوئے خیال ظاہر کیا ہے کہ منظوم انشائیے کا کربلا کے واقعات سے رابطہ کر کے گفتگو کی جاتی ہے۔اُن کے مرثیے ’’ماں‘‘ میں ماں کی عظمت کا اظہار کر کے تیرھویں بند میں گریز کرتے ہوئے مرثیے کو امام حسینؑ کے احوال سے اس طرح ربط دیتے ہیں۔

بعد رسولؐ جب ہوا زہراؑ کا انتقال اُس وقت تھے حسینؑ و حسنؑ دونوں خورد سال
ماں سے بچھڑ کے زینبؑ و کلثوم تھے نڈھال چالیس سال تک نہ ہوا غم کا اندمال
ہر روز ماں کی قبر پہ جاتے رہے حسینؑ
ہر شب کو اک چراغ جلاتے رہے حسینؑ

یہی انداز اور یہی تیور اُن کے ایک اور مرثیے ’’حقوق والدین‘‘ میں ملتے ہیں—

مرثیے کا آغاز اس بند سے ہوتا ہے۔

حق یہ ہے کہ ماں باپ کا حق سب سے سوا ہے ماں باپ کو دکھ دینا روا تھا نہ روا ہے
کہتے ہیں کہ یہ قولِ رسولؐ دوسرا ہے ناراض ہیں ماں باپ تو ناراض خدا ہے
ماں باپ کی صورت میں اک آیت ہے خدا کی
ماں باپ کی تعظیم عبادت ہے خدا کی

اور پھر گریز کا انداز، واقعات کربلا سے تعلق:

یہ حُسنِ عمل آلِ نبیؐ نے بھی دکھایا ہر بات کو قرآن کی آیت سے سجایا
ہر لمحہ عباداتِ الٰہی میں بتایا ماں باپ کی خدمت میں کبھی فرق نہ آیا

عاشور کو جب پھول شہادت کے کھلے تھے
اولاد کی طاعت کے نمونے بھی ملے تھے

مسعود رضا خاکی کے مرثیوں میں اصلاحی پہلو بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ گریہ و بکا سے ہر مقام حسین، تاریخ کربلا اور مقصد کربلا پر زور دیتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

فیض بھرتپوری:۔

ولادت بھرت پور نومبر ۱۹۱۱ء۔ وفات ۲۵ رمئی ۱۹۸۹ء

نام سید فرزند حسن تخلص فیض۔، زیدی سید، اُن کے والد گرامی سید اکرام حسین کلیم گویا شاعر، مرثیہ نگار۔ اس حوالے سے فیض بھرت پوری بھی یہ کہتے تو بے جا نہ ہوتا کہ۔ "دوسری پشت ہے شبیر کی مداحی میں"۔ فیض بھرتپوری کی خوش قسمتی تھی کہ اُنہیں جو مدرس ملے وہ مرثیہ گو شاعر غضنفر حسین عروج بھرتپوری تھے جنہوں نے نہ صرف فیض کی تعلیمی بنیادوں کو مضبوط کیا بلکہ اُن کی تربیت بھی کی۔ فیض بھرتپوری کراچی آگئے تو حضرت نسیم امروہوی سے اُن کا سلسلہ تلمذ وابستہ ہوگیا۔ غضنفر حسین عروج بھی پاکستان آگئے مگر فیض بھرتپوری، حضرت نسیم کے شاگرد رہے۔ کراچی میں جو مرثیہ گوئی کی فضا قائم ہوگئی تھی اس نے بہت سے شعراء کو مرثیے کی طرف راغب کیا۔ مرثیہ گوئی فیض بھرتپوری کو ورثے میں ملی تھی مگر مرثیے کے حوالے سے یہ مٹی ۱۹۶۳ء میں نم ہوئی اور اپنی زرخیزی کے ثبوت کے طور پر ۶۳ بند کا ایک مرثیہ کہا۔

اے شوق نظم جرأت و ہمت سے کام لے

(یہ مرثیہ اس یادگاری مجلّے میں شامل ہے جو اُن کی وفات کے بعد جولائی ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا)

فیض بھرتپوری کے شوق نظم و ذوق شاعری نے ہمت کی۔ حضرت نسیم امروہوی جیسے باکمال شاعر نے سہارا دیا ہے راستہ دکھایا اور فیض بھرتپوری کا شمار ممتاز مرثیہ گو شعرا میں ہونے لگا ـــ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۷ء تک پندرہ سال کے عرصے میں اُنہوں نے پندرہ مرثیے کہے۔ گویا سال میں ایک مرثیہ کہا۔ اس کے بعد ۱۹۸۹ء تک یعنی بارہ برس کے عرصے میں اُن کے کسی مرثیے کا ذکر نہیں ملتا ـــ یہ بھی نہیں کہ من کے اُستاد حضرت نسیم امروہوی نے ساتھ چھوڑ دیا ہو۔ جو حضرات

حضرت نسیم امروہوی سے مل چکے ہیں یا اُنہیں جانتے ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ نسیم امروہوی اپنے شاگردوں کے لئے ایک (Devoted) پرخلوص اور منہمک اُستاد تھے، نسیم امروہوی ۱۹۸۷ء تک حیات تھے — خود فیض بھرتپوری قادرالکلامی کی منزلوں سے آشنا تھے پھر یہ سکوت، یہ بارہ برس کا بن باس کیوں تھا؟ ہوسکتا ہے مرثیے کے محقق یہ وجہ دریافت کرسکیں۔

فیض بھرتپوری نے مرثیے کہے اور خوب کہے۔ وہ اپنے حوالوں پہ نازاں تھے؛

ایک تو خود برکت مرثیہ گوئی کی قدیم — دوسرے پھر میرے استاد کا فیض تعلیم
کیوں رہوں چپ رہ حق میں کہ ہوں فرزند کلیم — چمن فیض ہے پروردۂ الطاف نسیم
پھول چنتا میں گذر جاتا ہوں گلزاروں سے
میں نہ اُلجھا ہوں، نہ الجھوں گا کبھی خاروں سے

مولانا نقن صاحب کی ''شہید انسانیت'' میں پانی کی موجودگی کے ذکر کے خلاف جہاں ناطق، نسیم امروہوی، نجم آفندی جیسے برگزیدہ شعراء نظر آتے ہیں وہاں ایک نام فیض بھرتپوری کا بھی ہے جنہوں نے پانی کو مرثیے کا موضوع بنایا۔ راجہ صاحب کا مرثیہ پانی بھی اس سلسلے کی کڑی ہے، نجم آفندی کا ایک شعر تو ایک زمانے میں زبان زد عوام تھا ۔

کچھ اور بڑھ گئی تیری مظلومیت کی حد
اب تشنگی کی بحث ہے ملت کے درمیان

موضوعاتی مرثیے کہنے والے دبستان کراچی کے شعراء میں فیض بھرتپوری نمایاں رہے ہیں۔ راجہ محمود آباد اور جوش کے علاوہ ''پانی'' کے موضوع پر قابل ذکر مرثیوں میں فیض بھرتپوری کا مرثیہ بھی شمار میں آتا ہے۔ تاریخ مرثیہ گوئی میں اوّل و آخر کی شماریات میں تو یہ کہنا پڑے گا کہ فیض بھرتپوری نے 'پانی' کے زیر عنوان جوش اور نسیم امروہوی سے پہلے مرثیہ کہا تھا۔ اسی مرثیے کے چند بند فیض بھرتپوری کے نمونہ کلام کے طور پر درج ذیل ہیں ۔

باعث رونق گلزار جہاں ہے پانی — عنصرِ زندگیٔ کون و مکاں ہے پانی
گھر ہے آنکھوں میں اور آنکھوں سے نہاں ہے پانی — روح بن کر تنِ گیتی میں رواں ہے پانی
پھر نباتات، نہ حیوان، نہ انساں ہوتے
یہ نہ ہوتا تو چمن دشت بداماں ہوتے

سب کو ہے فیض رساں بارش رحمت اس کی		کل زمانے پہ عیاں اصل حقیقت اس کی
دولتِ ہستیٔ کونین بدولت اس کی		۲ دوست دشمن پہ برابر ہے عنایت اس کی
مہرباں سب پہ ہے چاہے کوئی بدکیش سہی
شاہ و درویش ہیں محتاج کم و بیش سہی

سرد ہو جاتی ہے سب کی تپشِ دل اس سے		اک سکوں پاتا ہے ہر سینۂ بسمل اس سے
آس رکھتا ہے ہر اک طالب منزل اس سے		۹ سہل ہو جاتی ہے ہر وادیٔ مشکل اس سے
گاڑتا رہتا ہے تاثیر کا جھنڈا، پانی
آتش غیظ کو کر دیتا ہے ٹھنڈا پانی

پاک ہے، صاف ہے، از روئے اصالت پانی		دور کرتا ہے بہر طور کثافت پانی
دل کی تسکین ہے اور روح کی راحت پانی		۱۲ جب وضو کیجیے تو ہے جز و طہارت پانی
مہر زہراؑ میں یہ ارشاد نبیؐ ہے پانی
یہ سبب ہے کہ نجاست سے بری ہے پانی

مختلف نام ہیں پانی کے، سبھی حسبِ محل		یہ فضاؤں میں ہے شبنم تو فلک پر بادل
خاک پر ہو تو ہے زم زم کہ نہیں جس کا بدل		۱۵ چرخ پر ہو تو ہے کوثر کہ جو صدر رشکِ عسل
ایک وہ آب ہے رحمت کی جو بوچھار میں ہے
ایک وہ ہے جو یداللہ کی تلوار میں ہے

نعمتیں جتنی ہیں خالق کی میانِ عالم		ان میں پانی ہے وہ نعمت کہ جو سب سے ہے اہم
خدمت عامہ کے کتنے ہیں رُخ اس میں باہم		۲۲ قدر میں سب سے گراں، سب سے مگر قیمت کم
وہ بھی اس دور میں قیمت سے ملا ہے پانی
ورنہ اللہ نے تو مفت دیا ہے پانی

بحر اور بر کی ہے یہ قسمتِ طبعی کا حساب		خشک اک حصہ ہے دنیا میں، سہ چند اس سے ہے آب
خاک پر آب، فلک سے بھی برستا ہے سحاب		۳۲ اب نہ اس بات سے کیوں کر ہو میرا دل بیتاب
اتنی افراط سے دنیا میں، ہے آیا پانی
پھر بھی احمد کے نواسے نے نہ پایا پانی

اس حقیقت سے ہیں ارباب حقیقت آگاہ پیاس میں پیاسے کو پانی کی فقط ہوتی ہے چاہ
کتنے خود دار تھے مظلوم کے ساتھی واللہ[۳۳] تشنگی میں بھی نہ ڈالی رُخِ باطل پہ نگاہ
ہے یہ فطرت کہ طلب کرتا ہے پیاسا، پانی
شہ کے بچوں نے تو غیروں سے نہ مانگا پانی

ہاں نظر آتا ہے تاریخ میں صرف ایک مقام لب پہ بے شیر کے آیا تھا سوالِ ناکام
طلب آب سے حجت کو کیا جس نے تمام[۳۴] مانگنا فرض بھی تھا کیونکہ یہ تھا حکمِ امام
کچھ جواب اس کا بجز تشنہ دہانی نہ ملا
تیر گردن پہ لگا پیاس میں پانی نہ ملا

سُورۂ واقعہ سے صاف یہ چلتا ہے پتہ شہ جو پیاسے تھے، کچھ اس میں نہیں پانی کی خطا
اس طرح فوج گراں روکے ہوئے تھی دریا[۳۵] چند پیاسے تھے اِدھر صبر تھا جن کا شیوا
جائزہ لیں اگر اس پیاس کا اور پانی کا
غرق بیڑا ہو، ابھی غیرت انسانی کا

خشک ہوتی نہیں اس کی کبھی چشمِ پرنم روز و شب ہے غمِ شبیرؑ میں وقفِ ماتم
طلب عفو کا شہ سے جو ہے عزمِ محکم[۳۶] اضطراب دلِ رنجور سے یہ ہے عالم
خاک پر لوٹتا ہے، صدمہ و غم سہتا ہے
اب بھی گھبرایا ہوا چار طرف بہتا ہے

مرثیہ گریز کے بعد شہادت حضرت عباسؑ کا احوال بیان کرتا ہے۔ لفظ 'پانی' کا استعمال معنی بدل بدل کے ہوا ہے۔ مثلاً

دبدبہ شیر کا تھا قہر الٰہی سے نہ کم چند لمحوں میں ہوئیں ساری سپاہیں برہم
آگیا نہر پہ بازوئے شہنشاہِ اُمم[۵۸] جھوم کر گاڑ دیا شیر نے ساحل پہ علم
طالب آب جو سقائے سکینہ آیا
پانی پانی ہوا پانی کو پسینہ آیا

سینۂ آب پہ چلاّئے اُبھر کر یہ حباب وارث فاتحِ خیبر کا نہیں آج جواب
دل پہ دریا کے یہ بیٹھا ہوا تھا رعب وداب دم بخود خوف سے موجیں تھیں تو ساکت گرداب

لینے آیا جو یداللہ کا جانی پانی
گھاٹ کا غم سے کلیجہ ہوا پانی پانی

یہ مرثیہ پچھتر بند پر مشتمل ہے۔ مطبوعہ مراثیٔ فیض جلد دوم جس میں فیض بھرتپوری کے ۱۲ مراثی شامل ہیں۔ یہ مجموعہ اُن کے فرزند جعفر زیدی نے ترتیب دیا جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ اس میں وہ پانچ مرثیے بھی شامل ہیں جو ''مراثیٔ فیض'' جلد اول مطبوعہ ۱۹۷۱ء میں شامل تھے۔ بقیہ تین مرثیوں کے بارے میں جعفر زیدی نے لکھا ہے کہ وہ بھی بعد میں شائع کئے جائیں گے۔

☆☆☆☆☆

شجاع الحسن نقی:-

پیدائش ۱۹۰۳ء وفات بیسویں صدی کی آخری دہائی۔

اسداللہ اسدؔ کے فرزند، افسرؔ امروہوی کے شاگرد۔ غزل، نظم، قصیدہ، سلام، قطعہ، رباعی، مرثیہ غرض ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ مرثیہ کی تاریخ میں نقیؔ کے چھ مرثیوں کا ذکر ملتا ہے جن میں پہلا مرثیہ حضرت علی مرتضٰی کی شہادت کے احوال پر ہے۔ سید شجاع الحسن نقی امروہوی نے ماہ رمضان کو ماہ محرم کی ابتدا کہا ہے اور اس دعوی کی دلیل حضرت علیؑ کی شہادت کو قرار دیا ہے۔

ماہِ رمضاں سے ہے شروعات محرّم آفت ہے یہ منجملۂ آفاتِ محرّم
جتنی انہیں پر تو ہیں روایات محرّم تعبیر ہیں اس خواب کی حالات محرّم
اس ماہ میں تلوار چلی سر پہ علیؑ کے
اور آگ بھی اس میں ہی لگی گھر کو نبی کے

دوسرا مرثیہ علی اصغر کے احوال پر ہے۔

تیرِ ستم جو حلق پہ اصغر کے چل گیا بچّے کا مسکراتے ہوئے دم نکل گیا
سکتے میں شاہ رہ گئے اور دل دہل گیا منہ پر ملا جو خون تو نقشہ بدل گیا
کیا کرتے فوق و تحت نہ جب اس کو جا ملی
کی اپنی راہ جو لبِ کوثر سے جا ملی

نقیؔ امروہوی کے چار مرثیے ذاتی ہیں۔ تیسرا مرثیہ بہت طویل ہے اس کے چہرے

میں بے ثباتی عالم کا ذکر، مشاہیر امروہہ کا ذکر، امروہہ کے ایک نامور طبیب حکیم اچھو کے حالات اور اُن کی وفات کا ذکر اور آخر میں مرثیہ کا رخ کربلا کی طرف موڑ دیا گیا ہے اسی طرح چوتھا، پانچواں اور چھٹا مرثیہ بھی شخصی ہے۔ اس چھان پھٹک کے بعد سید نقی امروہوی کا اثاثہ دو مرثیے رہ جاتے ہیں۔

شخصی مراثی میں نقی امروہوی نے شعر گوئی کے حوالے سے اپنی قادر الکلامی کا لوہا منوالیا ہے۔ مثلاً اسلاف کا ذکر یوں کرتے ہیں ۔

آہ وہ سید حسین شرفِ دیں ذی احتشام صاحب کشف وکرامت مرجع ہر خاص وعام
زندۂ جاوید اربابِ صفا کے پیش امام خلق کے حاجت روا والا گہر عالی مقام
نیش فن عقرب تقاضائے طبیعت کے خلاف
کر رہا ہے کس رضا جوئی سے روضے کا طواف

وہ علی احمد کہ فرزندِ بزرگ و ہوشیار فیض احمد وہ کہ اسمِ بامسمّٰی نام دار
وہ ولی احمد کہ خوش خلقی میں بس یاروں کے یار سید اسرار احمد وہ قوی و شہسوار
سب کے سب شائستگی کی بولتی تصویر تھے
ذی حشم والا مرتب صاحب جاگیر تھے

اپنے اسلاف کے بعد امروہہ کے مشاہیر کا ذکر کرتے ہیں ۔

وہ کہ جوادِ شمیم بوستانِ شاعری زلف مشکیں سے تھی جن کی شاعری کی دوستی
کوئی یکتا تھا تو اپنے وقت کا کوئی قوی کوئی تھا میر سعادت درس آموز نقی
تہہ تھے اپنے سامنے دنیا کے زانوئے ادب
یاد ایا تے کہ ہم اک روز کیا تھے کیا ہیں اب

ہر چند کہ حضرت نقی امروہوی نے شخصی مرثیوں پر زیادہ توجہ دی لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان مراثی میں بھی وہ ادب کے رثائی تقاضوں سے یا وہ غم حسینؑ اور مصائب کربلا سے بے خبر یا لاتعلق رہے۔ اُن کے ہر شخصی مرثیے کا رخ کربلا کے مصائب کی طرف موڑا گیا۔ اُن کے مراثی کو پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ نقی امروہوی جذبوں کے عکاس شاعر تھے۔ کسی عزیز دوست یا کسی اہم شخصیت کی موت پر جو درد کی لہر اُٹھتی تھی وہ انہیں کربلا تک لے جاتی تھی۔ محبان حسینؑ اور عزادار

ان حسینی کا زندگی کے ساتھ یہی رویہ تو ہے کہ اپنے ہر غم کو، کربلا کے مصائب کی میزان پر تول کر دیکھتے ہیں اور اس تقابل میں اپنے غموں کو حقیر جان کر انہیں پس پشت ڈال کر کربلا کے مصائب پر آنسو بہاتے ہیں۔ غالباً یہی جذبہ نقی امروہوی کے شخصی مراثی کی بنیاد بنا۔

شہدائے کربلا کا تذکرہ سید نقی نے اُسی آن بان اور شان سے کیا ہے جس شان کا یہ ذکر مقتضی ہے ۔

ہائے اے وہ وقت جب تھے یک و تنہا حسینؑ رہ گیا تھا اک خدا کا نام باقی یا حسینؑ
بے کسی تو ہی بتا آخر کرے اب کیا حسینؑ مر نہ جائے تو رہے کس کے لئے زندہ حسینؑ
مرگ کرنا ہے تجھے اب غرق بیڑا موت کا
ہے پیامِ زندگی پیغام تیرا موت کا

حضرت عباس علمدار کے احوال کا ایک بند یوں ہے ۔

جب چلے عباس لے کر مشک پانی کیلئے اہل بیت شاہ کی تشنہ دہانی کے لئے
یوں تو ہیں سب کی دعائیں کامرانی کے لئے پر سکینہ وقف ہے اس مہربانی کے لئے

اس بند کا بیت زبان دانی اور قادر الکلامی کی خوبصورت مثال ہے۔

وہ نہیں عباسؑ خالی پھر کے آئیں نہر سے
ہاتھ کٹوادیں اگر پانی نہ لائیں نہر سے

شہزادہ علی اکبر کی رخصت اور شہادت کا احوال ایک ہی بند میں اختصار کی بہتر مثال ہے۔

مرنے جب اللہ اکبر، اکبرؑ مہ رُو چلا باپ نے دے دی اجازت کچھ نہ جب قابو چلا
بولے شہ مرنے کو سوئے دشمنِ بد خُو چلا آہ میرے لال میں بیٹھا رہا اور تو چلا
پشت پر رکھ کر پسر کی لاش لاتے ہیں حسینؑ
غم سے ٹوٹی ہے کمر ٹانکا لگاتے ہیں حسینؑ

(مرثیہ نگاران امروہہ سے)

☆☆☆☆☆

سما لکھنوی :- (کراچی)

۱۸۹۶ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے،

نام شیخ غلام مصطفیٰ انصاری، آرزو لکھنوی سے سلسلۂ تلمذ وابستہ کیا۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی آ گئے تھے، حضرت آرزو بھی کراچی آ گئے تھے۔ شاعری کا آغاز لکھنؤ میں ہوا تھا، کراچی آ کر بھی مشق سخن جاری رہی۔

کراچی کی رثائی فضا میں لکھنوی ذوق شعر گوئی کو آسودگی ملی اور سما لکھنوی مرثیہ نگاری میں آ گئے، کراچی کی مرثیے کی مجالس میں اُنہوں نے مرثیے پیش کیے لیکن ان کے انتقال کے بعد وہی ہوا جو عام طور پر اہل قلم یا فنکاروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اُن کا کلام وقت کی گرد میں دب گیا۔ ورثا کی لاپرواہی کے اندھیروں میں کھو گیا۔ صرف علامہ سید ضمیر اختر نقوی کی لائبریری میں اُن کا ایک مرثیہ محفوظ ہے مرثیہ میں ابتداً عظمت علیؑ بیان کی گئی ہے اور پھر مرثیے کے مزاج کے مطابق علی الترتیب امام حسنؑ اور امام حسینؑ علیہ السلام کی مدح پر آتے ہیں۔

فرزند، اُن کے قوتِ ایماں حسنؑ حسینؑ آفت زدوں کی آس اسیروں کے دل کا چین
دینِ خدا کی جان محمدؐ کے نورِ عین عقبیٰ کی روشنی تو زمانے کی زیب و زین
آئے تھے خُلق و صبر سکھانے کے واسطے
ایثار کا سبق تھے زمانے کے واسطے

خلق و مروّت حسنی کی نہیں مثال دشمن کی بھی زبان تھی ان کی ثنا میں لال
بدعہدیٔ حریف کا بھی کب کیا خیال کوشش یہ تھی کسی سے بھی پیدا نہ ہو ملال
ان پر جو تھا، ادا سو کیا حق کی دین کو
باقی رہا جو کام وہ سونپا حسینؑ کو

شبیرؑ نے وہ کام اس اسلوب سے کیا اپنی مثال آپ زمانے میں بن گیا
قربان حق پہ کر دیئے فرزند و اقربا یعنی ادائے فرض میں سب گھر لٹا دیا
ظالم کو جو دیا نہیں حد اس جواب کی
وہ زندگی بنا ہے ہر اک انقلاب کی

سما لکھنوی کے مرثیے میں قدیم طرز کی جھلک کے ساتھ ساتھ دورِ جدید کا رنگ بھی کہیں کہیں جھلکتا نظر آتا ہے۔

☆☆☆☆☆

سالک نقوی:- (کراچی)

ولادت ۱۸۹۵ء

نام سید علی حسین، تخلص سالک، نقوی البخاری سید۔ آبائی وطن قصبہ شکار پور ضلع بلند شہر (یو۔ پی)۔ تعلیم اُردو، ہندی، ریاضی، تاریخ جغرافیہ سرکاری مدارس میں ہوئی۔ دینیات، فارسی، عربی گھر پر اتالیق خصوصی سید محمد حسین سے پڑھی۔ ۱۹۱۹ء میں شکار پور چھوڑا اور لکھنؤ و الہ آباد میں انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۶ء میں سول انجینئرنگ میں ڈپلوما حاصل کیا اور سرکاری ملازمت میں آگئے۔

سید علی حسن سالک نقوی (آل مخدوم جہانیاں جہاں گشت) کا شجرہ نسب امام علی نقی علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ اُن کے بزرگوں میں حضرت ناظم شکار پوری ممتاز مرثیہ نگار گذرے ہیں جو میر نفیس کے شاگرد تھے۔ موصوف نے مراثی کی بیس جلدیں خوشخط لکھ کر چھوڑی ہیں۔ سالک نقوی کے چچا سید محبت حسین بھی مرثیہ گو اور مرثیہ خواں تھے۔

شعر و سخن کے ورثہ دار سالک نقوی نے لکھنؤ میں طالب علمی کے زمانے ہی سے غزل گوئی کی کوشش کی۔ ابتداً عزیز لکھنوی کی خدمت میں حاضر ہوئے بعد ازاں حضرت عزیز لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ یہ دور مولانا ناصر حسین صاحب قبلہ، مفتی احمد علی، حکیم فدا احمد دانش، مولانا صفی، نیاز فتحپوری وصل بلگرامی، نواب جعفر علی خان اثر جیسے اساتذہ کا دور تھا۔ سالک نقوی نے ان چراغوں کی روشنی میں بیٹھ کر مشق سخن کی۔ ۱۹۲۸ء میں حیدر آباد گئے تو ضامن کنتوری، جوش ملیح آبادی، فانی بدایونی، نظم طباطبائی۔ اختر مینائی وہاں موجود تھے۔ سالک نقوی کو ان اساتذہ کی موجودگی میں مشاعروں میں شرکت کا شرف حاصل ہوا۔ ۱۹۴۹ء میں حیدر آباد کو خیر باد کہا اور کراچی آگئے۔

سالک لکھنوی نے جن اصناف سخن میں شاعری کی ہے اُن میں غزل سلام، منقبت قصائد، رباعی ارر مرثیہ شامل ہیں۔ اُن کے تین مجموعہ کلام شائع ہو چکے ہیں۔

(۱) ''یادِ حرمین'' (مجموعہ نعت)

(۲) ''بہتر چراغ'' (سلام اور نوحے) ۱۹۷۲ء

(۳) ''صحیفۂ سالک'' قصائد و مناقب

سالک نقوی نے دو مرثیے کہے ہیں۔ پہلا مرثیہ حضرت نسیم امروہوی کے ارشاد کی تعمیل میں ۱۹۷۲ء میں کہا۔ ''مدح سقائے سکینہ میں گہربار ہوں میں''۔ اس مرثیے کے دو بند نمونۂ کلام کے طور پر ''اُردو مرثیہ پاکستان میں'' کے حوالے سے درج ذیل ہیں۔

روضہ حضرتِ عباسؑ علمدار یہ ہے استراحت کدۂ ضیغم و جرار یہ ہے
خواب گاہِ اسد حیدرِ کرار یہ ہے مشہد عاشق شاہنشہ ابرار یہ ہے
رنگ بنیاد عمل خونِ وفا ہے اس کا
سنگِ بنیاد سرِ خاکِ شفا ہے اس کا

حضرت علی کی تعریف میں ایک بند:

دم بدم سبز پھریرے کی پرافشاں وہ شمیم سطحِ دریا پہ خراماں وہ ہوائے تسنیم
شان پنجے کی سرِ خضر پہ جیسے دیہیم جس پہ کرنوں نے کیا انا فتحنا ترقیم
جب ہوا رایت عباسؑ سے ٹکراتی ہے
صاف والفتح کی پرچم سے صدا آتی ہے

یہ مرثیہ ۱۶۰ بند پر مشتمل ہے، سالک نقوی مرثیے کی روایتی اقدار کے پاسبان تھے اجزائے مرثیہ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اُن کا دوسرا مرثیہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے احوال پر ہے۔

آئینہ جمالِ محمدؐ حسینؑ ہیں

کوشش کے باوجود ہمیں سالک نقوی کا مرثیہ نہیں مل سکا۔ کراچی میں مرثیے کے ناقدین موجود ہیں لیکن افسوس سالک نقوی کی تاریخ وفات بھی کسی نے نہیں بتائی۔ سالک نقوی کے دو مراثی کا ذکر تو اکثر آیا ہے لیکن اُن کا پہلا مرثیہ ''سقائے سکینہ'' ''مدح سقائے سکینہ میں گہربار ہوں میں'' ہی ہر جگہ نقل ہوا ہے۔

☆☆☆☆☆

تپاں سبزواری :- (چھولس)

ولادت ۱۹۰۵ء۔ وفات؟

نام سید غلام السبطین رضوی خلف سید محمد حسنین رضوی سبزواری۔ وطن مالوف۔ چھولس محلہ گڑھی ضلع بلند شہر (موجودہ جی۔ بی نگر یعنی گوتم بدھ نگر) چھولس، جار چہ، نور پور اور گڑھی ایک ہی بستی کے ایسے چار حصے جن کے الگ الگ نام ہیں مگر ان کیبا سی ایک مورث اعلیٰ کی اولاد ہیں۔ حضرت تپاںؔ کے مورث اعلیٰ، سبزوار (خراسان) ایران سے آئے تھے — غلام السبطین تپاںؔ اور اُن کے تین بھائی غلام حسنین، غلام ثقلین اور غلام کونین علی گڑھ کالج کے گریجویٹ تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب علی گڑھ محض کالج تھا یونیورسٹی نہیں ہوا تھا — اور یہ وہ دور تھا جب مسلمانوں کے بچے اگر میٹرک پاس کر لیتے تھے تو پڑھے لکھے شمار کئے جاتے تھے۔ اس حوالے سے حضرت تپاںؔ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ تپاںؔ سبزواری کو اللہ نے چار بیٹوں کی دولت عطا کی تھی جن میں سے اُن کے ایک فرزند ڈاکٹر سید نسیم السبطین رضوی سڈنی آسٹریلیا میں بس گئے ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے آرکیٹیکٹ اور مزاجاً دوست نواز اور غریب پرور ہونے کے سبب ہمہ گیر شہرت رکھتے ہیں۔ تپاں مرحوم کے دوسرے فرزند حجت الاسلام مولانا سید شمیم السبطین رضوی عالم دین ہیں، لندن میں مقیم ہیں اور ربع صدی سے زیادہ عرصے سے علم و آگہی کی روشنی تقسیم کر رہے ہیں۔

حضرت تپاںؔ اکتسابی شاعر نہیں تھے بلکہ (Born Poet) تھے۔ شاعری اُنہیں ودیعت کی گئی تھی اسی لئے بہت کم عمری سے شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ اُنہوں نے کم و بیش تمام اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔ بدیہہ گو شاعر تھے اس لئے بسا اوقات برمحل ایسے شعر کہہ دیتے تھے جو جار چہ چھولس کی علمی ادبی فضا میں زباں زدِ عوام ہو جاتے تھے۔ بالخصوص ان کی مزاحیہ شاعری افراد اور جماعت کے مضحکہ خیز اطوار کی گرفت کرتی تھی لیکن وہ بذلہ سنج اور ابتذال کے فرق کو جانتے تھے اس لئے اُن کی شاعرانہ پھبتی، ابتذال سے محفوظ رہتی تھی۔

رثائی ادب میں تپاں قلب و روح کی صداقت کے ساتھ منہمک تھے۔ قطعہ، رباعی، نعت، سلام، منقبت، سے مرثیے تک تپاںؔ نے فکر کو روحانیت کی راہوں پر سرگرم سفر رکھا۔ ان راہوں میں اُنہیں تائید غیبی بھی ملی جس کا اُنہوں نے ذکر بھی کیا اور اعتراف بھی جہاں کہیں اُنہیں راہیں مسدود نظر آتی تھیں وہاں اُنہیں رہنمائی ملتی تھی۔ مثلاً اُن کے مجموعہ کلام ''کلام تپاںؔ'' کے

پیش لفظ میں تپاں سبزواری کا بتایا ہوا ایک واقعہ مرقوم ہے کہ ایک دفعہ تپاںؔ کے ذہن میں ایک مصرع آیا ۔

بتلا گئے حسینؑ یہ معنی ہیں آل کے

اس کے بعد اُنہیں یوں محسوس ہوا جیسے اس کے بعد فکر کو راستہ نہ مل رہا ہو۔۔۔رات کا کافی حصہ گذر گیا مگر اُن کے ذہن میں دوسرا مصرع نہ آیا۔ اسی دوران اُن پر غنودگی طاری ہوئی اور اسی نورانی شخصیت نے جس نے ہمیشہ اُنہیں راستہ دکھایا تپاںؔ سے پوچھا۔ سبطین کس سوچ میں ہو؟ تپاںؔ نے مصرع اولیٰ پڑھا تو بزرگ شخصیت نے فرمایا۔ لکھدو

نانا کی کشتی لائے نواسہ نکال کے

تپاں کی آنکھ کھل گئی اور اُنہوں نے مکمل شعر قلمبند کرلیا ۔

بتلا گئے حسینؑ یہ معنی ہیں آل کے
نانا کی کشتی لائے نواسہ نکال کے

کلام تپاںؔ، کے مطبوعہ نسخے میں قطعات، سلام، قصائد کے علاوہ ۸ مختصر مرثیے بھی شامل ہیں۔ اُن کے فرزندار جمند مولانا شمیم السبطین رضوی کے پاس تپاں کا کچھ اور کلام بھی ہے جس کی اشاعت کے لئے انتظامات کئے جارہے ہیں۔ مولانا شمیم السبطین یہ نہ بتا سکے کہ اُن کے والد گرامی نے مرثیہ گوئی کا آغاز کب کیا۔۔۔

تپاںؔ مرحوم تقسیم ہند کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے تھے اور داتا کی نگری لاہور یں قیام پذیر ہوئے۔۔۔ شعر گوئی کے آغاز کا ایک تحریری ثبوت تو ملتا ہے کہ چودہ برس کی عمر میں بستی کے کسی بزرگ کی شادی پر چند منچلوں نے اُن سے بڑے میاں کی شادی پر شعر کہنے کی فرمائش کی جسے تپاں نے پورا کیا۔

جارچہ اور چھولس کی فضاؤں میں انیسؔ و دبیرؔ کے مراثی گونجتے تھے اور ہوا کے جھونکوں میں ماتم حسینؑ کی دستک سنائی دیتی تھی اس لئے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے جس سن میں اُنہوں نے دوسری اصناف میں شعر کہے اس سن میں منقبت، سلام، رباعیات اور قطعات بھی کہے ہوں گے۔ البتہ مرثیہ نگاری یقیناً اُنہوں نے لاہور (پاکستان) آنے کے بعد شروع کی ہوگی اس لئے کہ راقم الحروف نے ۱۹۵۸ء میں لاہور چھوڑا تھا اس وقت تک تپاںؔ لاہور میں بحیثیت شاعر

متعارف نہیں ہوئے تھے۔ اس رائے کی ایک بنیاد یہ بھی ہے کہ مولانا تپاںؔ سبزواری نے مختصر مرثیے کہے ہیں اور پاکستان میں مختصر مرثیہ گوئی دبستان پنجاب سے شروع ہوئی ہے۔

''کلام تپاں'' میں جو آٹھ مرثیے شامل ہیں وہ مختصر اور موضوعاتی مرثیے ہیں۔ مرثیہ امیر المومنین، مرثیہ قاسم بن حسنؑ، مرثیہ حضرت عباسؑ علمدار، دو مرثیے احوال امام حسینؑ، مرثیہ احوال ثانیٔ زہراؑ، مرثیہ حضرت سکینہ، مرثیہ احوال حُر۔ نمونہ کلام کے طور پر حضرت حُر کے احوال کے مرثیے کے کچھ بند درج ذیل ہیں۔

سُوئے امام یوں حُر غازی ہوا رواں سن سے نکل کے چلتا ہے جوں تیر از کماں
اُنڈی سی اک گھٹا تھی، تعاقب میں تھا جہاں [17] کچھ فاصلے سے حُر نے کہا ٹھہریئے یہاں
آواز دی کہ سید کونین آیئے
نرغے میں اک غلام ہے مولا بچایئے

مشکل کا وقت ہے میری، جلد آیئے امام بڑھنے میں شرم آتی ہے پیچھے ہے فوج شام
آنے میں دیر کی تو یہ خادم ہوا تمام [18] زحمت کوئی حضور کو دے گا نہ یہ غلام
دل زندگی سے تنگ ہے جینے سے سیر ہے
بخشیں خطا حضور، فقط اتنی دیر ہے

سننا تھا اس صدا کا کہ شاہ امم بڑھے عباسؑ لے کے ہاتھ میں تیغ دو دم بڑھے
نعرہ کیا، نہ ڈر حُرِ غازی کہ ہم بڑھے آواز دی کہ اب نہ کوئی اک قدم بڑھے
اب اک قدم اگر کوئی آگے بڑھائے گا
وہ تیغ بے دریغ سے بچ کر نہ جائے گا

شیروں کے گونجنے سے ہٹی فوج اشقیا دَل بادلوں کے دور ہوئے، چھٹ گئی گھٹا
مطلع جو صاف ہوگیا اک چاند رہ گیا [20] شیروں نے دوڑ کہ اسے ہالہ میں لے لیا
یوں پیشوائی کی شہ عالی مقام نے
حُر کو گلے لگا لیا بڑھ کر امام نے

حُر نے جو دیکھی شاہ کی یہ بخشش و عطا قدموں پہ گر کے شاہ کے بولا بصد بکا
مولا گناہگار ہوں سنگین ہے خطا قدموں سے سر اُٹھا کے یہ مولا نے تب کہا

تیرا گناہ دفترِ عصیاں سے دھل گیا
جس وقت تو ہماری اعانت پہ تل گیا

مہماں کو اپنے لے کے چلے شاہ کربلا آگے امام پشت پہ زینب کے دلربا
اور دائیں بائیں اکبر و عباس باوفا آئی ندا کہ دیکھئے کوئی حر کا مرتبہ

اس شان سے جو لے گئے مہماں کو تا خیام
کہلا کے بھیجا حضرت زینب نے خود سلام

غیرت سے پانی پانی ہوا تھا حر غیور پر دل میں یہ اُمنگ کہ بخشا گیا قصور
کہتا تھا دل کہ رن کی اجازت جو دیں حضور دنیا میں پھر زیادہ ٹھہرنا ہی کیا ضرور

دار فنا میں دین کا کچھ کام کیجئے
باقی جو حشر تک رہے وہ کام کیجئے

سید غلام السبطین تپاں رضوی سبزواری کی قبر پر جو کتبہ ہے اس پر حضرت تپاںؔ کا ایک شعر کندہ ہے جو اُن کے ایمان و عمل کا اعلان ہے۔

پرسش اعمال پر سبطین دے دے گا جواب
ہم غم شہ میں سدا روتے رلاتے ہی رہے

☆☆☆☆☆

سید انعام نقوی :- (حیدرآباد سندھ)

ولادت ۷ رمئی ۱۹۱۶ء

نام سید انعام حسین، تخلص انعام وطن امروہہ۔ نقوی سید۔ گورنمنٹ انٹر کالج امروہہ سے میٹرک پاس کیا۔ مزید تعلیم کے لئے مرادآباد گئے لیکن والد کی اچانک وفات سے خواب بکھر گئے اور انعام کو ملازمت کرنی پڑی۔

تقسیم ہند کے بعد ۱۹۵۰ء میں ہندوستان میں سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں اُردو کو بیک قلم منسوخ کر کے ہندی رائج کردی گئی لہذا وہ لوگ جن کی تعلیم کی بنیاد اُردو تھی اُن کی راہیں مسدود ہو گئیں۔ انعام نقوی پر بھی عرصہ حیات تنگ ہو گیا اور آخر کار وہ ۱۹۵۵ء کے لگ بھگ پاکستان آئے اور حیدرآباد سندھ میں محکمہ ٹاؤن پلاننگ میں ملازمت کرلی۔ ۱۹۷۴ء تک سینئر

سپرنٹنڈنٹ کے منصب پر پہنچ کر ریٹائر ہو گئے۔

انعام نقوی کی شاعری کی ابتدا ہجوگوئی سے ہوئی، امروہہ کے مردم خیز اور ادب پرور خطۂ ارض پر انعام امروہوی نے شاعری کی ابتدا کی۔ وہ سرزمین جہاں چپہ چپہ پر شعروادب کے چراغ روشن تھے۔ شاعری کا سکّہ چل رہا تھا۔ ادب کے پرچم لہرا رہے تھے اس ماحول میں انعام امروہوی کی ہجوگوئی ایک جداگانہ انداز کے سبب بہت مقبول تھی۔ اُن کے اشعار سنجیدہ چہروں پر تبسّم کے اُجالے بکھیر دیا کرتے تھے لیکن انعام جب حیدرآباد سندھ پہنچے تو اُن کی فکر بدلی۔ شاید اس لئے کہ نئے وطن کی بہاریں جنم بھومی کی فضاؤں سے مختلف تھیں۔ ارضِ سندھ اور ارضِ امروہہ کی مٹی کے رنگ میں فرق تھا۔ بے سروسامانی سے بسی بسائی زندگی کی طرف آنے میں جو دشواریاں ہوتی ہیں وہ انسان کو سنجیدہ بنا دیتی ہیں۔ ہو سکتا یہی سنجیدگی انعام امروہوی کا مقدر بنی ہو یا پھر یہ صداقت اور یہ آفاقی سچائی کہ وہ بے نیاز جب چاہے جسے چاہے نواز دے۔ اس کلیہ کے تحت بارانِ رحمت کا کوئی چھینٹا انعام امروہوی کے دامنِ فکر کو نم کر گیا ہو۔ سب کچھ بھی ہو مگر ہوا یوں کہ انہوں نے ۱۹۶۵ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ اس مرثیے کو نہ صرف علمی ادبی حلقوں میں قبولیت ملی بلکہ یہ مرثیہ ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے نشر ہوا اور عوام تک پہنچا۔ مرثیے کے مطلع میں انعام علوی کا ذہنی پس منظر اور سوز دروہ نمایاں نظر آتا ہے ۔

مومن وہ ہے جو اجر رسالت ادا کرے ڈرتا نہ ہو کسی سے پہ خوفِ خدا کرے
سب جانتا ہو، کیا نہ کرے اور کیا کرے بوجہل سے گریز نبیؐ سے وفا کرے
عالم نہ ہو، پہ علم ہے کیا جانتا تو ہو
وہ بابِ شہرِ علم کو پہچانتا تو ہو

اس مرثیے کے ۵۳ بند میں مرثیہ کا ایک موضوع نہیں ہے بلکہ رنگِ قدیم میں حضرت، امام حسین، حضرت عباس کے فضائل اور مصائب کا ذکر کیا گیا ہے۔ خصوصاً حضرت عباس کی شجاعت پر انعام امروہوی نے توجہ دی ہے ۔

عباس جس کو شیر خدا نے کہا ہے شیر چالاک باز صف شکن وہ جیالا نڈر دلیر
دشمن کو زیر کرنے میں جس کو لگے نہ دیر ایسا زبر کہ لاکھ عدو کر سکیں نہ زیر

مردِ شجاع ہے ابو طالب صفات ہے
بیٹا علیؑ کا فاتحِ نہرِ فرات ہے

تیار ہو کے جعفرِ طیار کی طرح نکلے نیامِ فوج سے تلوار کی طرح
بولے عدو جری ہیں یہ عمار کی طرح جم کر لڑیں گے حیدرِ کرار کی طرح
ہاں کیا عجب، چڑھا کے ابھی آستین کو
یہ آسماں جناب اُلٹ دیں زمین کو

ہاں چوم اے زمیں قدمِ ابنِ بوتراب اے چرخِ پیر اُن کی سلامی کو جھک شتاب
اے ماہتاب گرد پھر ان کے کہ یہ جناب ہیں کعبۂ جلالتِ حیدرؑ وفا مآب
کیا ذکرِ جاہ صاحبِ صد افتخار ہیں
حیدرؑ مزاج ہیں ابوطالب شعار ہیں

ہجو گوئی کا مزاج رکھنے والا شاعر جب مدح کی وادی میں آتا ہے تو اس کا لہجہ بھی بدل جاتا ہے اور اسلوب بھی۔ ''کعبۂ جلالت حیدرؑ''۔ ''وفا مآب'' ''حیدر مزاج'' ''ابوطالب شعار'' یہ ترکیب اگر عطائے خداوندی نہیں تو اور کیا ہے؟ انعام نقوی پر ربِّ ذوالجلال کا کرم ہوا کہ قدرت نے مداحیِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کا تاج انعام علوی کے سر پر سجا دیا اور انھیں توفیق بھی دی کہ وہ اس شرف کی بنا اہل بیت کی غلامی کو سمجھیں اس عجز اور انکسار سے اُن کا ایک دوسرا مرثیہ شروع ہوتا ہے۔

مجھ سا عاصی سرِ منبر یہ جسارت دیکھیں میری کم علمی کے باوصف یہ جرأت دیکھیں
دعویٔ زورِ بیاں بھی ہے یہ ہمت دیکھیں ذکرِ حق وردِ زباں ہے مری قسمت دیکھیں
یہ حقیقت ہے تعلّی نہیں کچھ وہم نہیں
اک سخن ور تو کجا میں تو سخن فہم نہیں

لاکھ بے زر سہی لیکن ہوں ابوذر کا غلام در بدر ہوں، مگر حسنینؑ کے ہوں در کا غلام
حیدری ہوں، بخدا حیدرِ صفدر کا غلام ایک ہاں ایک اکیلا ہوں بہتر کا غلام
اس غلامی کے تصدق سے عطا کر مولا
جرأتِ مدحتِ اولادِ پیمبرؐ مولا

انعام کی شاعری میں قدیم و جدید مرثیہ نگاری کی حسین آمیزش نظر آتی ہے رنگِ قدیم

کی پیروی یہ کہ مرثیہ کسی موضوع کے تحت نہیں ہوتا اور رنگ جدید سے قبولیت اثر کا یہ پہلو مطلع اور گریز کے درمیان جو بات چھیڑی اس کی پوری وضاحت کرتے ہیں، اس انداز فکر کے تحت اُن کے ایک مرثیے میں ''قلم'' کا تعارف، اس تعارف سے شخصیات، شخصیات سے فضائل اور آخری بات مصائب پر اختتام ہے۔

قلم وہ ہے جو خدا کا کلام لکھتا ہے　　خدا کے بعد محمدؐ کا نام لکھتا ہے
نبیؐ کے ساتھ علیؑ کو امام لکھتا ہے　　بغیر فصل کے قائم مقام لکھتا ہے
قلم، کہ حق ہے جسے حق کی ترجمانی کا
جواب ہے وہی باطل کی لن ترانی کا

قلم کے ذکر پہ یاد آ گئے انیسؔ و دبیرؔ　　کہ جن کے فن سے رسائی ادب ہے باتوقیر
حروف زر سے یہ باب سخن پہ ہے تحریر　　انیسؔ نیر تاباں، دبیرؔ ماہِ منیر
کلام سب کا ہے اچھا کوئی کلام نہیں
جو ان کا ہے وہ کسی اور کا مقام نہیں

محافظ رسولؐ، حضرت ابوطالب کی مدح کا انداز بھی حسین ہے۔

وہ لطف و مہر کہ قدرت بھی مہربان ہوئی　　وفا وہ کی کہ وفا رسم خاندان ہوئی
نگاہ وہ جو نبوت کی نگہبان ہوئی　　انہیں کی گود میں پیغمبری جوان ہوئی
وہ تربیت کہ نبیؐ اور کوئی امام بنا
جسے نواز دیا قبلۂ انام بنا

شہِ زمن کے مربیؑ ہیں ان کو شاہ کہو　　رسولؐ حق کے محافظ ہیں حق پناہ کہو
علی کے والدِ ماجد ہیں قبلہ گاہ کہو　　ثنا میں پڑھتا ہوں اک بیت واہ واہ کہو
جو ایک پہلو میں اپنے لئے نبوت ہیں
تو دوسرے سے سنبھالے ہوئے امامت ہیں

ابوطالب کو انعام امروہوی نے حق پرست ہی نہیں، حق پرستی کا معیار پیش کرنے والی شخصیت قرار دیا ہے۔ اور حضور نبی کریمؐ کی سرپرستی کو بجا طور پر ابوطالب کے لئے معارج قرار دیا ہے۔

کرے جو پیش یہ معیار حق پرستی کا
اسی کو حق ہے محمدؐ کی سرپرستی کا

اُن کا ایک مرثیہ ''کہتا ہوں سچ کی جھوٹ کی عادت نہیں مجھے'' ہے جس میں اُنہوں نے جو سچ بولا ہے وہ بہت باطل شکن ہے۔ اسی طرح ''مجرئی شہ کے غلاموں کا غلام آیا ہے'' میں اُنہوں نے قدیم و جدید کا امتزاج پیش کیا ہے۔

بین کے معاملے میں انعام نقوی نے اگرچہ طرزِ قدیم کو اپنایا ہے مگر اس احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھا ہے کہ شدت مصائب میں خانوادۂ رسالت کی قوت صبر مجروح نہ ہو۔

یہ سن کے ٹھوکریں کھاتے چلے صدا کی طرف لگے تھے کان بس آوازِ دل رُبا کی طرف
بڑھے چلے گئے میدان کربلا کی طرف امید و بیم کی حالت میں اشقیا کی طرف
صفوں کو چیر کے آئے تو ہائے کیا دیکھا
جوان بیٹے کے سینے میں دم رُکا دیکھا

اپنے کلام کی روشنی میں بہ حیثیت مجموعی انعام نقوی پختہ گو شاعر اور قادر الکلام مرثیہ نگار ثابت ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

نعیم مچھلی بندری:-

ولادت ۱۹۰۲ء بمقام مچھلی بندر۔

نام فتح علی خان، تخلص نعیم، وطن مچھلی بندر (آندھرا پردیس کا ساحلی علاقہ) اس حوالے سے اُن کا قلمی نام نعیم مچھلی بندری ہوا۔ مچلی بندر اندھرا پردیش کا ساحلی مقام ہے جو ایک عرصہ تک نظام حیدر آباد کی عملداری میں رہا ہے اس لئے حیدر آباد (دکن) سے کافی فاصلہ ہونے کے باوجود یہاں کی علمی ادبی روشنی مچھلی بندر تک پہنچتی رہی ہے۔ فتح علی خاں جب پیدا ہوئے تو اُن کی جنم بھومی پر آفتاب نظام اُجالے بکھیر رہا تھا۔

نعیم نے اپنی شاعری کی ابتدا انیس (۱۹) برس کی عمر سے کی ابتدا میں مچھلی بندر کے ایک استاد شاعر حضرت فائز سے سلسلہ تلمذ وابستہ کیا۔ پھر دبیر کے مراثی نے مقرر کی شاعری کی صلاحیت تھی۔ نعیم نے مرزا دبیر کا انداز گوئی اپنایا اور خود کو مرزا دبیر کا شاگرد کہنے لگے۔

نعیم ۱۹۴۷ء میں حیدر آباد آ گئے اور حضور نظام سے دربار سے وابستہ ہو گئے جہاں اُنہیں ایک معقول وظیفہ ملنے لگا۔

نعیم نے اپنے مراثی میں مصائب اور بین پر خاص توجہ دی ہے۔ شاید یہی وہ انداز ہے جو اُنہوں نے مرزا دبیر کے مراثی سے لیا ہے جبکہ اُن کے مراثی میں دبیر کی شکوہ لفظی سے زیادہ انیس کی فصاحت و سلاست ملتی ہے نعیم نے دس مرثیے کہے ہیں لیکن اُن کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا اور اہل حیدر آباد نے اُن کے مراثی کی وہ پذیرائی بھی نہیں کی جو کسی بھی پختہ گو شاعر کے مراثی کو ملنی چاہیے۔ اُن کے مراثی حیدر آباد کے مرثیہ خوان حضرات کے بستوں میں بھی نہیں ملتے۔ صرف اُن کے فرزند کے پاس اُن کے مرثیوں کے مخطوطات ہیں لیکن (شاید) حالات نے اتنا شدید بنا دیا ہے کہ وہ کسی طرح اُن مراثی کی نقل نہیں دینا چاہتے۔ میراث پدر کی حفاظت اولاد کا فریضہ ہوتا ہے لیکن یہ میراث ایسی ہے جس کی ترویج و اشاعت اس کی حفاظت کہلا سکتی ہے اسے قدردانوں سے دور رکھنا یا ماضی کے کسی سلوک کی وجہ سے ہی سہی اُن لوگوں تک نہ پہنچایا جو اس کی ترویج میں مدد کر سکتے ہیں نعیم مرحوم کے حق میں بہتر سلوک نہیں ہے۔

''باب العلم'' حیدر آباد اور ڈاکٹر صادق نقوی کے توسل سے نعیم مرحوم کے ایک مرثیے کے دو بند حاصل کر سکے ہیں جو اُنہیں باقاعدہ مرثیہ گو تسلیم کرانے کے لئے کافی ہیں ۔

جائے کدھر یہ بیکس و مضطرب جواب دو　　اے جان فاطمہ و پیمبر جواب دو
اے یادگار ساقئ کوثر، جواب دو　　بھائی! پکارتی ہے یہ خواہر جواب دو
پہلے جہاں میں کیوں نہ یہ بیکس گذر گئی
بھیّا! میں بدلے آپ کے ہے ہے نہ مر گئی

اے میرے تشنہ لب، میرے صابر تیرے نثار　　مظلوم و بے کفن میرے شاکر تیرے نثار
بیکس میرے غریب مسافر تیرے نثار　　یاور تھا تیرا کوئی نہ ناصر، تیرے نثار
کچھ رحم ہائے تجھ پہ نہ کھایا، ہزار حیف
بے جرم و بے خطا تجھے مارا، ہزار حیف

اس نمونہ کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ نعیم کلاسیکی روایت کے مرثیہ نگار تھے۔

☆☆☆☆☆

کرّار نوری (کراچی)

پیدائش ۳رجون ۱۹۱۶ء۔ وفات؟

نام سید کرّار مرزا، تخلص کرّار، کس نسبت سے نوری لکھتے تھے اس کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ وطن" دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب" اور" جس کو تعصبات نے پامال کر دیا"

کرّار نوری کو دیکھ کر، اُن سے مل کر، اُنہیں سُن کر یہ یقین ہو جاتا تھا کہ وہ پیدائشی شاعر ہیں۔ شاعری کی ابتدا اوائل عمر سے کر دی تھی، خوش نصیبی سے حیدر دہلوی کی شاگردی کا شرف ملا۔ جنہوں نے دو آتشہ کو سہ آتشہ کر دیا بلکہ شاید یہ کہنا بھی غیر مناسب نہ ہو کہ چنگاری کو شعلہ بنا دیا۔ ایسا شعلہ جس کی تپش اور حرارت کرّار نوری کو متحرک رکھتی تھی۔ اُن کی ذات میں جمود پیدا ہونے نہیں دیتی تھی۔ راقم السطور کو کرّار نوری سے دوستی کا شرف حاصل ہے۔ وہ ریڈیو پاکستان سے وابستہ تھے، ریڈیو پر اور ریڈیو سے باہر مشاعروں میں کرّار نوری کی بیقرار روح، کچھ تلاش کرنے میں مصروف آنکھیں اور چاق و چوبند شخصیت کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کے مواقع ملے ہیں۔۔۔ ایک شخص میں کتنے طوفان کروٹیں لے رہے تھے، ایک ذات میں کتنے سمندر موجزن تھے، مشاعرے میں غزل سنانے کا مرحلہ ہے تو کرّار نوری غزل سرا ہیں مجلس میں منقبت، سوز و سلام کا وقت تو کرّار نوری نمایاں ہیں۔ ذکر و فکر کی محفل ہے تو کرّار نوری جانِ محفل ہیں۔۔۔۔ یہ تو اس وقت کا اندازہ ہوا جب مادّی فاصلے بڑھ گئے، کرّار نوری سے دوری ہوئی تو کھلا کہ یہ شخص ہر کام کو جلدی کیوں کرنا چاہتا تھا۔

کرّار نوری کی پوری شاعری میں فکر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ جدّت اُن کا مزاج تھی:

یہ غلط ہے شراب کی تعریف
اس کا ذہنوں پہ راج ہوتا ہے
صرف حدّت شراب دیتی ہے
باقی اپنا مزاج ہوتا ہے

سلام، قصائد، رباعیات تو کرّار نوری نہ جانے کب سے کہہ رہے تھے، یوں لگتا تھا جیسے ہوش سنبھالتے ہی اس وادی میں پہنچ گئے تھے مگر مرثیہ گوئی کے میدان میں ذرا دیر سے آئے اور اس طرح آئے جیسے یہ بھی کوئی فریضہ ہو جسے ادا کرنا ہے۔ اُن کا پہلا مرثیہ ۱۹۵۷ء میں سامنے

آیا۔ ''انساں نے جب سے شرطِ شہادت قبول کی'' اور پھر یوں محسوس ہوا کہ مرثیے سے متعلق انسانی کردار کے سارے پہلو اُن کے سامنے آتے گئے اور وہ اُنہیں نظم کرتے رہے۔

انساں نے زندگی کا علم جب کیا بلند	۱۹۵۸ء
انساں نے جب شفاعتِ آدم پہ کی نگاہ	۱۹۵۹ء
انساں نے جب اذان دی محرابِ شوق میں	۱۹۶۰ء
انساں نے جبکہ اپنی خودی پر کیا غرور	۱۹۶۱ء
انساں کو جب حیات نے نوشہ بنادیا	۱۹۶۲ء

یہ تسلسل مرثیوں کا تسلسل ہی نہیں کرّار نوری کا فکری تسلسل بھی ہے۔ ۱۹۷۸ء میں اُنہوں نے ایک مرثیہ کہا۔ ''آدمی سوچ سمجھ کر سرِ منبر آئے''۔ اس میں کیا راز تھا، یہ عقدہ کب کھلا اور کیسے کھلا؟ بیس بائیس برس تک سرِ منبر منقبت اور سلام پڑھنے والے شاعر نے کیا محسوس کیا؟ اُسے کس بات کا عرفان ہوا کہ بیساختہ پکار اُٹھا۔ ''آدمی سوچ سمجھ کر سرِ منبر آئے''—اور اس کے بعد مرثیہ گوئی تعطّل کا شکار ہوگئی جیسے وہ کام پورا ہوگیا ہو جسے کرنے کا ارادہ تھا یا کسی کی طرف سے جو کام سپرد کیا گیا تھا اس کی تکمیل کردی گئی ہو۔ کرّار نوری نے مرثیہ کہا تو بھرپور کہا۔ قدیم و جدید کی بحث اُن کا راستہ نہ روک سکی۔ وہ کہا کرتے تھے۔

> ''عاشور! چودہ صدیوں پہلے گذرے واقعات کو تو نہیں بدلا جاسکتا۔ یہ درد اُسی وقت تک درد ہے جب تک ایک اٹل حقیقت ہے، ایک نہ بدلنے والی سچائی ہے۔ مرثیہ اسی سچائی، اسی درد کی داستان ہے۔ البتہ فکر کے جو دریچے کھل رہے ہیں اور ان سے جو روشنی اندر آرہی ہے اس کے توسل سے ان واقعات کی اہمیت اور اثرات میں اضافہ ہورہا ہے۔ شعر گوئی میں جو اسلوب ارتقاء کی منازل طے کررہا ہے اس اسلوب میں اس روشنی کا ذکر کرو یہی جدید مرثیہ ہے''۔

کرّار نوری نے اسلوب کے اس نئے پن اور فکر کے دریچوں سے ذہن میں اُتر آنے والی روشنی کے زیرِ اثر مرثیوں میں تغزل کے رنگ بھی بکھیرے ہیں اور رثا کو بھی اُجال کر رکھ دیا ہے۔ ایک مرثیے میں: جب امام حسینؑ میدانِ کربلا میں تنہا رہ گئے اور خطبہ آخر دیا تو اشقیاء نے

توجہ نہ دی۔ امام کے پاس اس کے علاوہ چارہ نہ تھا کہ بیکسی کی موت مر جائیں یا شجاعت کے جوہر دکھا کر رضائے الٰہی کی تعمیل میں سر کٹا کر صبر کی منزلوں کی نشاندہی کریں۔ امام اتمامِ حجت اور خطبہ آخر کے بعد فوج پر حملہ کرتے ہیں۔ اس کی منظر نگاری میں کرار نوری کا اسلوب نمایاں ہے۔

دنیا نے دیکھا باگ کو پھیرا حسینؑ نے تاریکیوں میں بھیجا سویرا حسینؑ نے
کافور کر دیا ہر اندھیرا حسینؑ نے ہر دشمنِ حیات کو گھیرا حسینؑ نے
اک عزم مستقل تھا کہ بڑھتا چلا گیا
مفہوم مرگ و زیست بدلتا چلا گیا

حملہ ہوا تو ایسے میں اپنا کیا بچاؤ حملہ کیا جو حملوں کا بڑھنے لگا دباؤ
پھر اس کے ساتھ ساتھ رعایت کا رکھ رکھاؤ بڑھتا ہی جا رہا تھا رواداریوں کا بھاؤ
حملوں میں زندگی کا تجمل تو دیکھیے
کیا شے ہیں مرگ و زیست تجمل تو دیکھیے

آخر جلال آ ہی گیا دلفگار کو للکار کے سنبھالا وہیں ذوالفقار کو
سو سو سروں نے روکا ہے ایک ایک وار کو کیا سمجھے تھے یہ لوگ غریب الدیار کو
خونخوار بھیڑیوں کے مقابل دلیر ہے
ابن علی ہے، بیشۂ یزداں کا شیر ہے

اس زخم خوردہ شیر نے دیکھا اِدھر اُدھر غصے میں چہرہ سرخ ہے بیتاب ہے نظر
غائب سپر کسی کی تو غائب کسی کا سر ہر سمت ڈھونڈتا ہے ملے کوئی اہلِ شر
اب بھیڑیے پکار رہے ہیں فرار کو
اور شیر ہے کہ ڈھونڈ رہا ہے شکار کو

بھاگے جو اک ہجوم کی صورت بڑے بڑے وہ زور لگ رہا ہے کہ آپس میں بھی لڑے
اک دوسرے کو روک رہا ہے کھڑے کھڑے بھگدڑ وہ مچ رہی ہے کہ بھاگے نہ بن پڑے
میدان میں حسینؑ ہے اور بے درنگ ہے
اور کیوں نہ ہو کہ یہ حق و باطل کی جنگ ہے

آج جب میں برطانیہ میں بیٹھ کر یہ سطور لکھ رہا ہوں تو کرار نوری اور میرے درمیان

جو فاصلہ ہے اس کا حساب بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ اس امر پر شرمندگی ہے کہ جس آدمی کو جاننے کا دعویٰ تھا اُس کے متعلق لکھنے بیٹھا تو اندازہ ہوا میرے پاس تو لکھنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ تو چاند کی طرح طلوع ہوا تھا۔ سورج کی طرح روشنی بکھرتا تھا — میں اس روشنی کو محفوظ کر سکتا تو آج کچھ لکھ سکتا۔ لیکن آج تہی دامنی کا احساس شدید ہے۔ وہ اہل نقد و نظر جنہوں نے کرارؔ نوری کو مرثیہ کی میزان پر تولا، ہو سکتا ہے انہوں نے کرارؔ نوری پر اتنا لکھا ہو جتنا کرارؔ نوری کا حق تھا۔ جو ناقدین اُنہیں غزل کے میدان کا شہسوار جانتے تھے اُنہیں اس شہسواری کو پرکھا ہو گا مگر میرا قلم ساکت کیوں ہے؟ میں نے تو کرارؔ نوری کو مختلف الجہات شاعر کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ اللہ رے عالم غربت جہاں نہ کتابیں ہیں، نہ حوالے ہیں، نہ تذکرے ہیں، صرف یادیں ہی یادیں ہیں۔

☆☆☆☆☆

رحمن کیانی (آخرش کراچی)

ولادت ۳۰ اگست ۱۹۲۴ء۔ وفات؟

نام عبدالرحمٰن، تخلص وقلمی نام رحمٰنؔ کیانی، لکھنؤ کے نواحی علاقے میں موضع منڈیاؤں تھا جو شاید اب لکھنؤ میں شامل ہو گیا ہو۔ ''منڈیاؤں'' رحمٰن کیانی کی جائے پیدائش ہے۔ اُن کے والد گرامی مولوی حافظ عبدالحق نے مدرسہ فرنگی محل سے علوم دین اور ندوۃ العلماء سے مشرقی علوم حاصل کئے — رحمانؔ کیانی نے امیر الدولہ اسلامیہ کالج لکھنؤ سے میٹرک پاس کیا۔ فارسی، ابتدائی عربی، قرآن، سیرت اور تاریخ اسلام اپنے والد سے پڑھے۔

پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز ۱۹۴۳ء میں رائل انڈین ایرفورس میں بھرتی ہو کر کیا۔ عالمی جنگ کے بعد وطن واپس آئے اور سیتاپور پلائی وڈ فیکٹری میں کام شروع کر دیا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا تو کمپنی نے رحمٰن کیانی کو لاہور کے دفتر میں بھیج دیا اور اس کے بعد رحمٰن کیانی کبھی لکھنؤ نہ جا سکے۔

راقم الحروف نے رحمانؔ کیانی کو اس وقت سے جانا جب وہ وڈ فیکٹری میں کام چھوڑ کر پاکستان ایرفورس میں شامل ہو چکے تھے۔ ادبی محفلوں میں کبھی کبھار ایک چاق و چوبند شاعر سے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ کبھی وہ باقاعدگی سے نظر آتا اور کبھی اچانک کہیں گم ہو جاتا۔ اور پھر ایک رات کو مشاعرے کے اختتام پر اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں نے گھر چھوڑنے کی پیشکش کی وہ

راضی ہو گئے۔ پتہ چلا موصوف ایرفورس میں ہیں — جس قسم کی نظمیں رحمان کیانی سناتا تھا، جس طرح کی باتیں وہ کرتا تھا، وہ آدمی ایرفورس میں کیسے تھا؟ پاکستان میں ۱۹۵۴ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی لگ چکی تھی۔ زبان کا کام ویران نگاہوں سے اور قلم کا کام اشاروں سے لیا جانے لگا تھا۔ ایسے میں خوبصورت اور بیباک نظم کہنے والے شاعر کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ ایرفورس میں تھا، کچھ دنوں احتیاط درمیان میں رہی۔ پھر دلوں کے پھپھولے پھوٹے تو پتہ چلا موصوف گذشتہ بیس برس سے ترقی پسند تحریک کے ساتھ تھے۔

۱۹۵۸ء میں پاکستان میں پہلا مارشل لا لگا۔ حالات بدل گئے۔ مجھے لاہور چھوڑنا پڑا — پھر تقریباً دس برس رحمٰن کیانی سے ملاقات نہ ہوئی۔ ۱۹۶۵ء میں ہند و پاک جنگ، ۱۹۷۱ء میں دوسری جنگ اور پھر ۱۹۷۱ء ہی میں سقوط پاکستان پر رحمٰن کیانی کی نظمیں پڑھیں تو ماضی کی یادیں، دل کی دھڑکنیں بن گئیں —— اور پھر ایک دن رحمٰن کیانی سے ملاقات ہوگئی۔ وہی رنگ، وہی تیور، وہی لہجہ، تبدیلی یہ تھی کہ نظموں کے عنوانات بدل گئے تھے۔ شاید یہ احساس ہو گیا تھا کہ جبر کے دور میں حق بات کہنے کے لئے کربلا کو استعارہ بنالیا جائے تو بات کہنی آسان ہو جاتی ہے۔ ظلم کے خلاف نعرہ زن ہونے کے لئے حسینؑ کو راہبر مان لیا جائے تو استغاثہ اتنا پرزور ہو جاتا ہے کہ زندہ لوگ تو کیا لاشوں میں حرکت ہو جاتی ہے اور جو زندہ بدن اثر قبول نہیں کرتے وہ انسان نہیں زندہ لاشے ہوتے ہیں۔ رحمٰن کیانی نے ''ہمارے ہیں حسینؑ'' عنوان کے تحت ایک مسدس لکھی تو پورے ملک میں مشہور ہوگئی، رحمٰن کیانی کے دل کا بوجھ کم ہوا — راستہ مل گیا، روشنی نظر آ گئی ایک اور نظم ''حی علی خیر العمل'' لکھی۔ اب کے تیور اور تھے، چاندنی ذہن کے افق پر پھیل چکی تھی۔ حق بات کہنے کے جذبوں سے حسینؑ تک، حسینؑ سے علی مرتضٰی تک علیؑ سے نبیؐ تک اس سفر میں اُجالا ہی اُجالا تھا۔ مہک ہی مہک تھی۔

رحمٰن کیانی نے ۱۹۷۲ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ عنوان تھا ''محرم کا چاند'' اس مرثیے میں سوز تھا۔ درد تھا، جدید فکر تھی، نیا اسلوب تھا، نظم کا آہنگ تھا اور رثا کی پاسداری تھی۔ پہلا مرثیہ، اہم موضوع، تاریخی پس منظر، درد کی لہریں۔ سبھی کچھ تو تھا اس مرثیے میں۔ چند بند نمونہ کے طور پر درج ذیل ہیں عنوان پیش نظر رکھیے، محرم کا چاند ۔

قصرِ شہی میں بندۂ مزدور کی طرح قیدِ قفس میں طائرِ مجبور کی طرح

بالائے دار حضرتِ منصور کی طرح نقد و متاعِ دیدۂ رنجور کی طرح
حزن و ملال و یاس کا مظہر کہیں جسے
یک قطرہ آبِ تلخ سمندر کہیں جسے

اس چاند کی مثال کروں اور کیا رقم بس دیکھنے کو جس کے اٹھائی تھی چشمِ نم
اک تیرِ غم لگا کہ چلا خنجرِ الم دل سے کہا نگاہ نے اللہ کی قسم
برچھا پڑا ہے یہ کسی نو عمر شیر کا
چھوٹا سا نیمچہ کسی ننھے دلیر کا

یہ چاند اس شہید کی ہے تیغ آبدار مقتل میں جس نے جا کے کہا تھا کہ زینہار
دیں سے جُدا نہیں ہے سیاست کا کاروبار اور اس نظامِ خیر میں حقدارِ اقتدار
زاہد ہیں متقی ہیں کوئی دوسرا نہیں
اسلام میں حکومتِ فاسق روا نہیں

اور وہ جو رحمٰن کیانی کے دل میں ایک درد تھا۔ وہ درد جس پر رحمٰن کیانی میرے ساتھ ملکر آنسو بہایا کرتا تھا — وہ درد تھا آج کے انسان کی کمزوری، آج کے معاشرے کی بے راہ روی، جبر کی اطاعت، اور جب اس درد کا مداوا حسینیت میں ملا تو رحمٰن کیانی نے پیغامِ حسینؑ کو مکالمہ بنا کر آج کے معاشرتی دکھوں سے جوڑ دیا۔ امام حسینؑ کے خطبہ آخر کو آج کے عہد کے بیگانۂ حسینؑ و حسینیت لوگوں سے کس مہارت کے ساتھ مکالمہ بنا دیا ہے رحمٰن کیانی نے۔

میں ہوں حسینؑ ابنِ علیؑ جانتے ہو تم جانِ بتولؑ و سبطِ نبیؐ جانتے ہو تم
اور کون ہے یزیدِ شقی جانتے ہو تم نیکی کدھر، کدھر ہے بدی جانتے ہو تم
مومن اگر ہو آؤ مری پیروی کرو
ورنہ مردوں میں جو ہے سمائی وہی کرو

نوکر ہو مانتا ہوں مگر نوکری میں بھی اچھے بُرے کا فرق اصولاً ہے لازمی
روٹی پہ روٹی رکھ کے وہی کھائے آدمی نیکی کا حوصلہ ہو کمائی حلال کی
جس نوکری کا ظلم و ستم پر قیام ہے
وہ نوکری غلط ہے وہ روزی حرام ہے

لوگو! یزید ہو کہ کوئی اورخیرہ سر ظلم وستم فریب سے جو بن کے مقتدر
اور چھین کر خزانۂ ملی کا مال و زر کرتا ہے خرچ بدعت وفسق و فجور پر
جس کو زنا کا شوق ہو رغبت شراب سے
خارج ہے اس کا نام ہماری کتاب سے

رحمن کیانی نے صرف دو مرثیے کہے ہیں۔ بعض نقاد کہتے ہیں کہ ایک ایک دو دو مرثیے کہنے والوں کو مرثیہ گوشعراء کی فہرست میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ اہل نقد ونظر کا فیصلہ بجا سہی لیکن وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ فیض اور مصطفیٰ زیدی کے ایک ایک نامکمل مرثیوں پر انہیں مرثیہ گوشعراء میں شامل کیا گیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ رحمن کیانی کو لوگوں نے پہچانا نہیں۔ اس کے اندر جو آگ روشن تھی۔ اس کے اندر جو تڑپ تھی، اس کے اندر جو ظلم سے نفرت تھی، وہ سب کچھ حسینیت کی عطا تھی، اور ایسی روشنی کی ایک کرن آفتابوں پر بھاری ہوتی ہے۔ کاش رحمن کیانی کو لوگ اتنے قریب سے دیکھ لیتے یا وہ لوگوں کو اتنا قریب آنے دیتا جتنا اس نے مجھے حق دیا تھا۔

☆☆☆☆☆

محب حیدرآبادی (کراچی)

ولادت ۱۹۱۴ء۔ وفات؟

نام ڈاکٹر مرزا شجاعت علی بیگ، تخلص محب، وطن حیدرآباد، عمر کے آخری حصے میں کراچی آگئے تھے اور کراچی میں ہی منزل آخرت کو سدھارے۔ حیدرآباد دکن میں تھے تو اُن کے سلام، قصائد، رباعیات اور منظومات کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا۔ کراچی میں بھی ۱۹۶۶ء میں ''کلید معرفت'' کے نام سے مجموعۂ کلام شائع ہوا، اس مجموعے میں ایک مسدس بھی شامل ہے جس میں حضرت علیؑ کے اوصاف وکردار کا تذکرہ ہے۔

ایسی سادہ زندگی کس نے بسر کی جُز علیؑ ہر قدم پر جس نے کی اپنے نبیؐ کی پیروی
وہ جو زہد و ورع میں تھا ہو بہ ہو مثلِ نبیؐ جس نے وہ لذات سے کھائی نہ ہو روٹی کبھی
خشک نانِ جَو نہ ہوتی جس سے بھوسی تک جُدا
چند لقمے اس کے کھالیتے نمک سے مرتضیٰ
فقر کو جس نے عطا کی کج کلاہی وہ علیؑ زندگی بھر جو رہا بن کر سپاہی وہ علیؑ

جس کے تابع وحش و طیر و مور و ماہی وہ علیؑ		بُجز پیمبر، ماسوا پر جس کی شاہی وہ علیؑ

خانہ کعبہ میں دیکھو اُس کی شانِ ارتقا

بن گیا دوشِ نبوّت نردبانِ ارتقا

محبؔ حیدرآبادی قادرالکلام شاعر تھے۔ ہمیں تلاش کے باوجود حیدرآباد دکن میں شائع ہونے والا اُن کا مجموعہ کلام تو در کنار، ''کلید معرفت'' بھی دستیاب نہ ہو سکی۔ منظور رائے پوری نے ان کے متعلق کہا تھا ''نظمیں محبؔ کی جامِ شرابِ طہور ہیں''۔ محبؔ حیدرآبادی کے ایک مرثیے کا تذکرہ ڈاکٹر محمد چراغ نے اپنی کتاب ''اُردو مرثیے کا ارتقاء بیجاپور اور گولکنڈہ میں مطبوعہ ۱۹۷۳ء'' دکن میں کیا ہے۔ محبؔ کا یہ مرثیہ جس بحر میں ہے اس بحر میں کل پانچ مرثیے کہے گئے ہیں۔

محبؔ حیدرآبادی	۔	اے نورِ چشمِ مصطفیٰؐ، کیوں جا بسایا کربلا

خوشنود	۔	ماتم محرم کا ابر کیوں جگ سنے آیا عجب

فصیح	۔	جب مشک بھر کر نہر سے عباس غازی گھر چلے

راجہ صاحب محمود آباد	۔	ملکِ وفا کر حکمراں کونین میں عباس ہے

مصطفیٰ زیدی	۔	ہر دور میں مظلومیت کی داستاں لکھی گئی

☆☆☆☆☆

فاضل امروہوی

ولادت ۱۹۱۶ء وفات ۲۷ رجون ۱۹۸۹ء

نام سید تصدق حسین، تخلص فاضلؔ، دبیر کامل، منشی کامل کے امتحانات سے سرخرو گذرے، ہر سند جُد اجد اور سگاہوں سے حاصل کی جو امروہہ سے لکھنؤ تک ہیں۔ ۱۴ برس کی عمر سے شاعری کی ابتدا کی۔ غزل سے آغاز کیا اور نظم، قطعات، رباعیات سلام، قصائد، نعت، منقبت اور نوحوں کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مرثیے کی منزل فضیلت تک پہنچے اور ۱۹۴۸ء میں پہلا مرثیہ کہا۔

قادرالکلام اور زود گو شاعر تھے۔ رنگِ قدیم کے ماننے والے تھے اور مرثیے کی روایت میں کوئی تبدیلی گوارا نہیں کرتے تھے خواہ وہ بہتری کی طرف لے جائے، اُن کی نظر میں بہتری اور فلاح اجداد کی قائم کردہ روایات کی پاسداری میں ہے۔ مرثیے میں ساقی نامہ پر زور دیتے تھے۔ جنگ اور تلوار پر گھن گرج سے بند کہتے ہیں۔

ساقی کہاں ہے بادۂ و ساغر شتاب لا پلٹا کے آج میرے لئے آفتاب لا
لے آگئی نوید مسرت شراب لا گن گن کے اب تو جام نہ دے بے حساب لا
برباد کر نہ وقت حساب و کتاب میں
جو جی میں آئے لکھ لے وہ میرے حساب میں

خوشیوں کے دن ہیں پینے کے اب تو زمانے ہیں مستی میں سب یہ آپسی جھگڑے مٹانے ہیں
گھبرا نہ ساتھیوں سے مرے سب یگانے ہیں میخوار یہ نئے نہیں ساقی پرانے ہیں
ہیں الجھنوں میں پر تری الفت میں مست ہیں
واللہ سب یہ عاشقِ روزِ الست ہیں

ساقی مرے یہ وقت نہیں قلیل و قال کا ماضی کے غم میں ضائع نہ کر لطف حال کا
جھگڑا ہے مجھ سے کیوں یہ حرام و حلال کا حلقہ بگوش ہوں یہ قسم تیری آل کا
اس کے نشے بغیر تو جینا حرام ہے
البتہ بے خلوص کے پینا حرام ہے

ایک بند حضرت عباس علمدار کی جنگ کے حوالے سے کہا ہے ۔

راستہ روکنے جب فوج ستم گار بڑھی دست عباسؑ میں چلنے لگی تلوار علیؑ
پہلواں بھاگتے تھے پھینک کے سر سے پگڑی رن پڑا ایسا لبِ نہر بہی خوں کی ندی
جتنا دریا پہ تھا لشکر وہ سوئے نار چلا
خون میں تیر کے عباسؑ کا رہوار چلا

فاضل امروہوی نے ایک مرثیہ میں تلوار (ذوالفقار) کو تجسیم کیا (Personify) کیا ہے یعنی ذوالفقار اور امام حسینؑ کے درمیان مفروضہ مکالمے نظم کئے ہیں۔ اگر چہ شعراء کرام نے اکّا دکّا مکالمے ان سے پہلے بھی نظم کئے ہیں لیکن فاضل نے ان مکالموں کو خاصا طول دیا ہے اور ان مکالموں سے تاریخ بیان کرنے کا کام لیا ہے — تاریخ کا وہ منظر جہاں امام حسینؑ قتال میں مصروف ہیں۔ فوج اشقیا سے الامان الامان کی فریاد بلند ہو رہی ہے کہ اچانک امام حسینؑ کو نانا کی آواز سنائی دیتی ہے۔ بس کرو حسینؑ، اتمام حجت ہو چکی، ہم تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ حسینؑ کا جلال ختم ہو جاتا ہے۔ وعدہ طفلی یاد آجاتا ہے، ذوالفقار کو روک لیتے ہیں۔ اس مقام پر فاضل نے

ذوالفقار کو زبان دی ہے ۔

چلائی ذوالفقار کہ آقا نہ روکیے روکر پکاری ایسے میں شاہا نہ روکیے
بولی لپٹ کے ہاتھ سے مولا نہ روکیے تھوڑی سی دیر اور خدا را نہ روکیے
ان سب کو دم کے دم میں ٹھکانے لگاؤں گی
سر لے کے ابنِ زیاد کا کوفہ سے آؤں گی

بولے حسینؑ تیغِ شرر بار صبر کر حیدر کی جاں، حسنؑ کی وفادار صبر کر
اے دینِ مصطفیٰ کی مدد گار صبر کر مجھ بے کس و غریب کی غم خوار صبر کر

ذوالفقار جواب دیتی ہے کہ ۔

عباسؑ کے قلم ہوئے شانے کیا ہے صبر قاسمؑ کی لاش ہوگئی ٹکرے کیا ہے صبر
اکبرؑ ہوئے شہید سناں سے کیا ہے صبر اصغرؑ نے تیر کھایا گلے پہ کیا ہے صبر
حیدر کا گھر لٹے میرے ہوتے، میں چپ رہوں
اس ظلم کی مثال جو دیجئے میں چپ رہوں

رو کر یہ ذوالفقار سے شبیرؑ نے کہا اب دیتے ہیں لعین، محمدؐ کا واسطہ
نانا کا نام سُن کے مرا ہاتھ رُک گیا لے الوداع! وعدۂ طفلی کروں وفا
بولی یہ رو کے آج سے خود کو چھپاؤں گی
تا حشرت اب کسی کو نہ صورت دکھاؤں گی

اب یہ جو ''روکر'' یہ ذوالفقار سے شبیر نے کہا'' والی بات ہے یہ مرثیے کے رنگ قدیم کی زبان ہے۔ کلاسیکی مرثیے میں بین کا انداز ہے ورنہ تو فاضل امروہوی خود'' نانا کا نام سن کے میرا ہاتھ رک گیا'' یا'' اب دیتے ہیں لعین محمد کا واسطہ'' جیسے مصرعے دے کر یہ بتا رہے ہیں کہ حسینؑ کا یہاں رونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ صبر کا مظاہر ثابت ہوتا ہے۔ وعدہ طفلی کے ایفاء کے پیشِ نظر جلال کو روکنا ثابت ہوتا ہے بہر حال یہ روایت کی حفاظت ہے اور روایت کی حفاظت پر تنقید مستحسن نہیں سمجھی جاتی۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ فاضل امروہوی مرثیے کی روح کو پہچانتے تھے اور رثا کے معنی اور مقصدیت سے کماحقہ آگاہ شاعر تھے ــــ فاضل امروہوی نے پچاس کے لگ بھگ مرثیے کہے ہیں۔

☆☆☆☆☆

نظر جعفری:- (کراچی)

پیدائش ۱۹۳۵ء، وفات ۳۰ر جولائی ۱۹۸۹ء

وطن میمن ضلع بجنور (یوپی)، والد گرامی سید ضیغم حسین بسلسلۂ ملازمت ریاست رامپور میں تھے لہٰذا نظر جعفری کی جائے ولادت رامپور ہوئی۔ ابتدائی تعلیم رامپور میں ہوئی۔ آگرہ یونیورسٹی سے بی۔اے۔ کیا۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی آ گئے۔

نظر جعفری کی بنیادی پہچان غزل کی شاعری ہے — راقم الحروف نے نظر جعفری کو کراچی کے مشاعروں میں غزل پڑھتے سنا ہے بلکہ ان کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کی ہے۔ نہ جانے کس غیرت ناہید کے متعلق کہا گیا ہے کہ "اکی ہر تان ہے دیپک" — ہم نے تو دیکھا بھی ہے اور سنا بھی کہ نظر جعفری کے دیپک مثال ترنم میں غزل کا مصرعِ اولیٰ پڑھا گیا تو ایسا لگا جیسے سامعین پر ایک سحر کی کیفیت طاری ہو گئی ہو۔ ہم نے کسی اور غیرت ناہید کی تان پر شعلے نکلتے نہیں دیکھتے البتہ نظر جعفری کی غزل سرائی کے دوران بجھے بجھے چہروں پر روشنی بکھرتی دیکھی ہے۔ غمزدہ پیشانیوں پر چراغ جلتے دیکھے ہیں — اور پھر ۱۹۷۴ء میں لوگوں کو خوشیوں کا اُجالا بانٹنے والے ہر دل عزیز اور مقبول شاعر کے اندر ولائے اہل بیت جو کرنیں سلام و قصائد کے روپ میں پھوٹی تھیں وہ سورج بن گئیں۔ اس سورج کی روشنی میں نظر جعفری کو نوائے کربلا سنائی دی اور کربلا کا راستہ نظر آیا۔ انہوں نے ۱۹۷۴ء میں پہلا مرثیہ کہا۔

اے خدا قوت گفتار عطا کر مجھ کو

نہ جانے نظر جعفری کی نظر کن عوامل پر گئی کہ انہوں نے پہلا مرثیہ حضرت حر کے احوال پر کہا۔ حر جو پہلے یزیدی لشکر میں تھا۔ ابتداء میں امام حسینؑ کو گھیر کر کربلا تک لایا تھا لیکن نویں محرم کی رات کو یزید کی غلامی کی زنجیریں ٹوٹ گئیں۔ گمراہی کے اندھیرے چھٹ گئے عاشور کی صبح حر کے لئے حریت کی نوید لیکر نمودار ہوتی ہے۔ باطل سے حق کی طرف، ناقص سے کامل کی طرف — حر کی مراجعت نظر جعفری کے مرثیے کا موضوع بن گئی۔

اے خدا قوت گفتار عطا کر مجھ کو ندرت و جدّتِ اظہار عطا کر مجھ کو
جس میں رفعت ہو وہ معیار عطا کر مجھ کو حر کی حریّتِ افکار عطا کر مجھ کو

مرثیے کا مرے حرؔ آج جو عنواں ہو جائے
بانیٔ کفر بھی سن لے تو مسلماں ہو جائے

نظرؔ جعفری نے مرثیے کے ابتدائی حصے میں "حریّت" کو موضوعِ سخن بنایا ہے:-

حریّت سے ہی فروزاں ہے شبستانِ حیات حریّت ہی سے مزیّن ہوا ایوانِ حیات
حریّت ہی سے معطّرِ چمنستانِ حیات حریّت روحِ عمل جذب دروں جانِ حیات
جب زمانے کی نظر سے نظر انداز ہوئی
حریّت حرؔ کی غلامی سے سر فراز ہوئی

حریّت خندق و صفین و حنین و خیبر حریّت جذبۂ عباسؑ و جلالِ حیدرؑ
حریّت نور کے تڑکے میں اذانِ اکبرؑ حریّت عصر کے ہنگام سجودِ سرورؑ
کبھی خطبے کی جلالت ہے یہ بازاروں میں
کبھی زنجیر کی جھنکار ہے درباروں میں

حریّت حرمتِ کعبہ ہے شکوہِ بطحا حریّت خاکِ دبستانِ نجف کا ذرّا
حریت معنیٔ علمِ حسنؑ سبز قبا اور کہیں کرب و بلا کرب و بلا کرب و بلا
حریت روح کو پیغام ہے بیداری کا
حریت نام ہے شبیرؑ کی خودداری کا

ڈاکٹر ہلال نقوی کی رائے ہے کہ "جن شعراء نے ایک یا دو مرثیے کہے ہیں اور جن کی شناخت بحیثیت مرثیہ نگار قائم نہیں ہوئی ان کی فہرست طویل ہے۔ رئیسؔ امروہوی، رعناؔ اکبر آبادی، تابشؔ دہلوی، راغبؔ مراد آبادی۔ صابر تھاریانی، صہبا اختر، عابد حشری، رحمٰنؔ کیانی۔ نظرؔ جعفری، عروجؔ بجنوری، عزتؔ لکھنوی، خاورؔ نگرامی اور سرورؔ سنبھلی اس سلسلہ کے نام ہیں۔"

(بیسویں صدی اور جدید مرثیہ۔ ڈاکٹر ہلال نقوی۔ ص۔ ۷۵۷)

راقم الحروف کی رائے اس سے مختلف ہے اس لئے کہ مذکورہ بالا فہرست میں چند نام تو یقیناً ایسے ہیں جنھوں نے کسی وقتی تاثر کے تحت ایک یا دو مرثیے کہے مگر مسلسل اس فن کی آبیاری نہ کر سکے۔ لیکن بعض نام ایسے بھی ہیں جن پہ گفتگو ہو سکتی ہے ۔ ایسے ناموں میں ایک نام نظرؔ جعفری کا ہے جس کے متعلق مکالمہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ایک تو نظر جعفری ان شعراء میں نہیں ہیں جنھوں

نے ایک یا دو مرثیے کہے ہوں۔ نظر جعفری کے فرزند ارجمند علی جعفری نے جناب نیر اسعدی کے توسل سے ہمیں اطلاع دی ہے کہ نظر جعفری نے چھ مرثیے کہے ہیں۔

(۱) اے خدا قوتِ گفتار عطا کر مجھ کو

(۲) مطلعِ فاطمہ زہراؑ کے قمر ہیں اکبرؑ

(۳) خدائے پاک مجھے نور کی بشارت دے

(۴) یارب مرے قلم کو ملے اقتدارِ فن

(۵) یارب مری زباں کو وہ طرزِ بیان دے

(۶) مہرِ انور ہیں علی، ماہِ منور عباسؑ

اور دوسری بات یہ کہ "نظر جعفری کی شناخت "مرثیہ نہیں" کا سبب شاید یہ ہو کہ عام طور پر جن غزل گو شعراء نے مرثیے کی وادی میں قدم رکھا وہ پھر اس کے ہو گئے۔ یعنی ہمہ وقتی مرثیہ گو شاعر بن گئے جبکہ نظر جعفری نے غزل سے رشتہ نہیں توڑا یا غزل کی دنیا میں ان کی مقبولیت نے اُنہیں نہیں چھوڑا لہٰذا وہ جز وقتی مرثیہ گو کہلائے اور مرثیہ ان کی شناخت نہ بن سکا۔ لیکن وہ بہر حال مرثیہ گو شاعروں میں شمار کئے جانے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ یوں بھی نعت، منقبت، سلام، اور قصیدہ یا مرثیہ گو شعراء کا مقام ہم طے نہیں کرتے۔ کہیں اور سے احکامات جاری ہوتے ہیں۔ کون جانے کب کوئی ایک قصیدہ یا مرثیہ کہکر فرزدق بن جائے۔

☆☆☆☆☆

سرور سنبھلی (کراچی)

ولادت ۱۹۱۰ء۔ سنہ وفات کی تصدیق نہ ہو سکی

جائے ولادت بمقام قصبہ سنبھل ضلع مراد آباد (یو۔ پی)۔ ابتدائی تعلیم سنبھل اور قصبہ کانٹھ ضلع مراد آباد میں پائی۔ اس کے بعد لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔۔۔ سرور سنبھلی کے بزرگوں کا وطن مالوف میرٹھ تھا مگر سرور سنبھلی کی ولادت سنبھل میں ہوئی اسی حوالے سے وہ خود کو سنبھلی لکھتے تھے۔

سرور سنبھلی کا تعارف، اُن کا اپنا تحریر کردہ، اُن کی کتاب کے پیش لفظ کے طور پر شائع شدہ، میسر آیا تو ادھوری سی معلومات حاصل ہوئیں جو یہ ہیں۔

''ملازمت کا آغاز دہلی میں مطبع مجتبائی سے ہوا، بعدۂ ''تیج'' اخبار میں۔ پھر کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ ملازمت ترک کرنی پڑی۔ بڑے بھائی سید صفدر حسین میرٹھ میں پولیس سب انسپکٹر تھے۔ اُنہوں نے پولیس میں بھرتی کرادیا۔

سرور سنبھلی نے لکھا ہے کہ پولیس کی ملازمت انہیں پسند نہ تھی مگر کوئی متبادل ملازمت نہیں تھی اس لئے یہ ملازمت کرنی پڑی۔ بچپن سے طبیعت شعروادب کی طرف مائل تھی۔ لکھنؤ میں حصول تعلیم کے لئے قیام سونے پر سہاگہ ثابت ہوا۔ میرٹھ واپس آئے تو حضرت عیاںؔ میرٹھی سے سلسلہ تلمذ وابستہ کیا۔ حضرت عیاںؔ کی وفات کے بعد جناب شاہدؔ نقوی فیض آباد سے تبدیل ہوکر میرٹھ آگئے جوان دنوں ملٹری اکاؤنٹ میں ملازم تھے۔ شاہدؔ نقوی سے قرب بڑھا تو ایک ادبی انجمن ''کہکشاں'' بنائی گئی جس کے صدر حضرت شاہدؔ نقوی اور سیکرٹری سرور سنبھلی بنائے گئے۔ اس انجمن کی نشستوں میں ادبی تنقید ہوا کرتی تھی۔ اور پھر ملک تقسیم ہوگیا۔ بزم کے زیادہ تر ارکان پاکستان چلے آئے حتّی کہ سرور سنبھلی بھی پاکستان آگئے اور انہیں ایک بار پھر پولیس کے محکمہ سے وابستہ ہونا پڑا — اپنی ذات کے تعارف میں وہ لکھتے ہیں۔

> میں بہت زیادہ حساس ہوں، میں نے ہمیشہ دوسروں کے غم کو اپنا غم، دوسروں کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھا۔ بے جا خوشامد کو گناہ سمجھتا ہوں۔ سچ بولنے کی پوری پوری کوشش کرتا ہوں۔ غم جاناں اور غم زمانہ دونوں کو دل کے ساتھ لگائے ہوئے ہوں۔ میری عوام میں پسندیدگی کے اسباب یہی اوصاف حمیدہ ہیں خوشامد پسند لوگ انہی وجوہات کی بنا پر مجھ سے نالاں ہیں۔

سرور سنبھلی کا یہ تعارف ۵ رفروری ۱۹۸۱ء کو شائع ہوا ہے۔ وہ ان دنوں میں کراچی کی شعراء برادری کے باہمی رویے سے شاکی تھے۔ اس سلسلے میں اُنہوں نے لکھا ہے۔

> ''کراچی کی شعراء برادری میں ایک عرصے سے گروہ بندی کی لعنت دیکھ رہا ہوں جو ترویجِ علم وادب کے لئے سخت مضر رساں ہے۔ اس گروہ بندی کا اثر اُن ادباء وشعراء کی تخلیقی صلاحیت پر پڑا ہے جو گروہ بندی کی لعنت سے دور ہیں — اس مجموعے کی اشاعت اس وقت عمل میں

آرہی ہے جب میری آنکھوں میں روشنی کم ہورہی ہے جس کی وجہ سے
مجھے قباحتوں کا سامنا کرنا پڑا۔۔ اُمید کرتا ہوں "رنگ شفق" اور "قلزم نور"
کی طرح یہ مجموعہ بھی عوام میں مقبول ہوگا"

اس تحریر سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ کراچی میں ۱۹۸۱ء میں کچھ ایسے شعراء بھی موجود تھے جو گروہ بندی سے دور تھے۔ اے کاش کراچی یہ سہانا منظر پھر دیکھے۔ آج تو نفسانفسی کا یہ عالم ہے کہ حضرت رسوا میرٹھی کے ورثا اُن کا کلام یا اُن کے حالات زندگی تذکروں میں شائع کرنے کے لئے بھی دینے پر آمادہ نہیں ہیں۔۔۔ حضرت سرور سنبھلی کی اس تحریر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اُن کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے تھے۔

سرور سنبھلی کراچی میں رہے۔ شاہد نقوی اُن کے پرانے دوست تھے۔ کراچی کے مرثیہ گو حضرات سے سرور صاحب کا ربط ضبط تھا لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ یہ نام کراچی کے مرثیہ گو شعراء کرام کے لئے نیا ہے ماسوائے رثائی ادب" کراچی کے ایک شمارے میں کوثر آلہ آبادی کی ایک تحریر کے جس میں اُنہوں نے اُن سب مرثیہ گو شعراء کو خراج عقیدت پیش کیا ہے جنہوں نے انجمن سفینۂ ادب کی محفلوں میں مرثیے پڑھے ہیں۔ اُن میں ایک نمایاں نام سرور سنبھلی کا بھی ہے۔

ہمیں تلاش کے باوجود سرور سنبھلی کے مراثی کی تعداد معلوم ہو سکی نہ کراچی میں اُن کی وفات کا سنہ یا تاریخ۔ صرف اُن کا ایک مرثیہ حضرت حُر کے احوال کا میسر آیا ہے جس کے کچھ بند نمونہ کلام اور سرور سنبھلی کو خراج عقیدت کے طور پر درج ذیل ہیں۔ اس طویل مرثیے میں حر کی ذہنی کیفیت بیان کی گئی ہے جو رات بھر حُر پر طاری رہی۔ صبح دم لشکر یزید کا ایک کمانڈر ابن سعد، حضرت حر کی کیفیت کو بھانپ کر امام حسینؑ سے یزیدی لشکر کی جنگ کو ناگزیر قرار دیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ حُر کے ذہن سے امام مظلوم کی ہمدردی کا تاثر نکل جائے۔ اس منزل پر سرور سنبھلی نے جناب حر کے جذبات کو نظم کیا ہے۔

باتیں سنی جب اس کی تو حُر چپ نہ رہ سکا　　بولا یہ ابنِ سعدِ شقی سے کہ بے حیا
سمجھا ہے تو حیات کا منشا نہ جانے کیا[۴۹]　　یہ زیست چند روز کی ہے یاد کر ذرا
حُسنِ عمل یہ زیست کا دار و مدار ہے
حُسنِ عمل حیات کا آئینہ دار ہے

پیاسے ہیں تین دن سے جو صحرا میں، اُن سے جنگ غرقاب جو ہیں ضعف کے دریا میں اُن سے جنگ
محصور ہیں جو حلقۂ بے جا میں، اُن سے جنگ ۵۰ خاصانِ کبریا ہیں جو دنیا میں، اُن سے جنگ
سینے میں میرے دل ہے کوئی سنگ تو نہیں
اک ظلمِ بے پناہ ہے، یہ جنگ تو نہیں

یہ کہہ کے حُر نے اسپِ سبک رو کو ایڑ دی اور خیمہ گاہ آلِ محمدؐ کی راہ لی
خضرِ رہِ طلب تھی محبت حسینؑ کی ۱ پھر کیوں نہ منزل اس کے قدم بڑھ کے چومتی
پہنچا جو حُر قریب شہِ تشنہ کام کے
بعد از سلام چوم لیے ہاتھ امام کے

کی عرض اس نے سر کو جھکا کر بصد ادب شرمندہ ہوں میں اپنی خطا پر شہِ عرب
روکا تھا میں نے آپ کو واللہ بے سبب ۵۲ پانی پیوں میں اور رہیں آپ تشنہ لب
پیاسا تھا میں تو آپ نے پانی پلا دیا
اور میں نے اُس کا آپ کو الٹا صلہ دیا

میں تو جبھی سے دامِ خجالت میں ہوں اسیر کرتا ہے مجھ کو زور ملامت میرا ضمیر
سبطِ رسول آپ ہیں عالم کے دستگیر ۵۳ کیجئے میری مدد بھی شہِ آسماں سریر
آیا ہوں اس خطا کی معافی کے واسطے
لایا ہوں نذرِ جاں میں تلافی کے واسطے

خوشنودیِ خدا و نبی چاہتا ہوں میں حق کی نظر سے داد رسی چاہتا ہوں میں
اہلِ رضا کی ہم سفری چاہتا ہوں میں ۵۴ مولا سزائے بے ادبی چاہتا ہوں میں
کفارۂ عمل کی اجازت ملے مجھے
میں جی اُٹھوں جو مرنے کی رخصت ملے مجھے

فرمایا سن کے شاہ نے حُرِ جری کا حال تو صاحبِ نصیب ہے اے مردِ خوش خصال
حق نے تیرے شعور کو بخشا ہے وہ کمال ۵۵ تاریخ میں ملے گی نہ جس کی کوئی مثال
جس سمت شر سے تو سوئے خیر العمل گیا
کفارۂ سزا کی حدوں سے نکل گیا

حرُ اصرار کرتا ہے کہ اُسے مرنے کی اجازت ملے تو وہ امام پر جانثار کر کے اپنی خطا کا کفارہ ادا کرے۔ امام فرماتے ہیں کہ تو ہمارا مہمان ہے۔ حرُ کا اصرار، امام کا انکار، حُر جری کا حال ابتر ہوتا ہے۔

دیکھا جو شاہ دیں نے بہت غیر حُر کا حال چہرے سے آشکار تھا رنج و غم و ملال
رن کی رضا نہ ملنے کے صدمے سے تھا نڈھال [61] محسوس ہو رہی تھی اسے زندگی وبال
آنکھوں میں اشک بھر کے شہ مشرقین نے
بخشی جہادِ حق کی اجازت حسینؑ نے

پائی جہادِ حق کی جو شبیرؑ سے رضا اک روح تازہ مل گئی، حُر مسکرا دیا
کام آ گئی محبتِ فرزندِ مصطفیٰ [62] دوزخ کے رُخ سے جانبِ خلدِ بریں ہوا
حرُ نے سلام کر کے شہِ تشنہ کام کو
بجلی بنا دیا فرسِ خوش خرام کو

شہ سے وداع ہو کے وہ شیر جری چلا الزام جور و جبر سے ہو کر بری، چلا
قومِ عدو کی سمت بپے صفدری چلا کوفے کے مرحبوں کی طرف حیدری چلا
یہ راہ رو کہاں سے کہاں تک چلا گیا
دشتِ بلا سے باغِ جناں تک چلا گیا

سرورؔ سنبھلی نے کئی مرثیے کہے ہیں۔ جو اُن شعراء و ناقدین کو یاد نہیں جنہوں نے سرور سنبھلی کی زبان سے بار بار یہ مراثی سنے ہیں لیکن ہمیں یقین کامل ہے کہ یہ مراثی اُنہیں ضرور یاد ہوں گے جو حسینؑ کے عزاداروں اور دربار اہلبیت کے شاعروں کو صلے عطا کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

باقر امانت خانی (دکن)

ولادت ۱۹ر مارچ ۱۹۰۹ء۔ وفات ۱۷ر فروری ۱۹۹۰ء

وطن حیدرآباد دکن۔ رضوی سادات۔ والدِ گرامی، میر زین العابدین جو شاعر بھی تھے اور آرٹ سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ اجداد میں ایک بزرگ میر محمی رضوی، امام رضا علیہ السلام کی کلید برداری کا شرف رکھتے تھے۔ اپنے ایک معرکتہ الآرام مرثیے ''سفیر شجاعت'' میں باقر امانت خانی نے اس شرف پر ناز کیا ہے۔

فخر کیوں کر نہ کروں، زمرۂ سادات سے ہوں لطفِ شبیرؑ سے ممتازِ کمالات سے ہوں
وضعداری میں بھی وابستہ روایات سے ہوں [۱] حاملِ حبِّ علیؑ حق کی عنایات سے ہوں
ہے گواہی، میں حسب میں نسبی سیّد ہوں
جدِّ اعلیٰ ہیں رضاؑ، میں رضوی سیّد ہوں

ملک فارس میں ہماری کئی پشتیں گزریں ہم عرب تھے پہ وطن بن گئی ایراں کی زمیں
جھکتی تھی جان کے ایمان، بہ اخلاص و یقیں [۲] روضۂ شاہِ خراساں پہ عقیدت کی جبیں
ہم تو دنیا ہی میں جنت میں بسا کرتے تھے
تھے "خوافی" در مشہد پہ رہا کرتے تھے

"خوافی" کی وضاحت خود امانت خانی نے کی ہے کہ خوافی سے مراد شہرِ خواف کے رہنے والے تھے۔

نیتیں پاک تھیں، تھے حاملِ اوصافِ حمید مظہرِ حسنِ عمل، اپنے زمانے کے سعید
ہوتے تھے شاہِ خراساں کے نسب میں جو وحید [۳] ملتی ایسوں ہی کو تھی روضۂ حضرت کی کلید
یہ شرف وہ تھا جسے کہتے تھے زیبا منصب
سمجھا جاتا تھا یہ ایران میں اعلیٰ منصب

گذرے دنیا میں میرے چودھویں جدِّ اعلیٰ نام تھا "میرمحی" جن کا، جو تھے اہلِ ولا
یہ تھے از روئے نسب، اشرفِ سلکِ شرفا [۴] نسبتاً رکھتے تھے یہ قربتِ موسیٰ رضا
خدمتِ اشرفِ اعمالِ سعید ان کو ملی
روضۂ شاہِ خراساں کی کلید ان کو ملی

حاملِ جوہرِ اوصاف تھے خود میرمحی وارد ہند ہوئے عہد میں اکبر کے یہی
مغلیہ دور میں اوصاف سے وقعت جو بڑھی [۶] اُن کی اولاد نے یاں آ کے وزارت پائی
نسل میں اُن کی ہیں دیوان، دیانت خاں بھی
سلسلے میں تو اُنھی کے ہیں امانت خاں بھی

سلسلہ ہے میرا تاریخِ دکن میں ممتاز میرے اجداد میں میدانِ وفا کے جانباز
میرے اسلاف نے پائے ہیں خطاب و اعزاز [۸] خضرِ اعزاز کی ہوتی ہی رہی عمر دراز

مجھ سے پہلے نظر آتا ہے مقامِ ہشتم
مجھ سے انتیسویں[۲۹] حد پہ ہیں امامِ ہشتم

اپنے تعارف میں باقر امانت خانی نے اپنے جدِ اعلیٰ امیر امانت خان کا ذکر کیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ باقر امانت خانی کے اجداد میں دو بزرگ میرک حسین اور میرک معین گذرے ہیں جنہیں اورنگ زیب نے امانت خان اوّل اور امانت خان دوئم کے خطابات دیئے تھے۔ اسی نسبت سے باقر خود کو امانت خانی لکھتے ہیں۔

باقر امانت خانی، حیدرآباد دکن کے ممتاز شاعر سرؔور حیدرآبادی کے شاگرد تھے۔ شعر گوئی کا آغاز بچپن میں کیا۔ پہلے سلام، منقبت کہتے تھے اور محفلوں میں شرکت تھے۔ پہلا مرثیہ ۱۹۵۵ء میں کہا۔ ۱۹۸۲ء میں کراچی سے ایک مجموعہ 'امانت غم' شائع ہوا۔ ''امانت غم'' سے پہلے باقر امانت خانی کے پانچ مرثیوں کا مجموعہ ''امانت سخن'' کے نام سے ۱۹۷۷ء میں اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش نے شائع کیا تھا۔ ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۴ء میں امام حسین ایسوی ایشن کنیڈا نے اُن کے دو مجموعے ''ادبی امانت'' اور ''نشانات'' شائع کیے۔

باقر امانت خانی جدید مرثیے کا نعرہ بلند کرتے ہیں لیکن وہ مرثیے کے روایتی خاکے میں کسی تبدیلی کو قبول نہیں کرتے۔

اسلوب قدامت سے مجھے جنگ نہیں ہے انداز بدلنا تو کوئی ننگ نہیں ہے
میدانِ مضامین تو ابھی تنگ نہیں ہے وہ ایک صدی قبل کا اب رنگ نہیں ہے
ہے شرط کہ آداب سخن مٹ نہ گئے ہوں
تصویر پرانی ہو مگر رنگ نئے ہوں

اور ''تصویر پرانی ہو'' سے اُن کی مراد یہ ہے کہ اجزائے مرثیہ یعنی چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، گھوڑا، تلوار وغیرہم کے بیان میں تبدیلی نہیں ہو سکتی مگر اس ترتیب اجزائے مرثیہ کے ساتھ خیالات میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ گویا اُنہوں نے مرثیہ کو پرانے ذہن سے قبول کیا تھا یہی وجہ ہے کہ اُن کے مراثی میں جسے لوگ اخلاقاً جدید مرثیہ بھی کہہ دیتے ہیں ساقی نامے کے علاوہ کوئی ندرت نہیں ہوتی، اور ساقی نامہ اس حد تک ہوتا ہے کہ ۲۶ مرثیوں میں سے ۲۱ مرثیوں میں اُنہوں نے یہ رنگ بھرا ہے۔۔۔ رہا سوال ''لوگ اخلاقاً جدید مرثیہ کہہ دیتے ہیں'' والی بات کا تو دو

معتبر حوالے اس اجمال کی تفصیل میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔ پہلا حوالہ حضرت فضل لکھنوی جنھوں نے باقر امانت خانی کے مراثی کو بلکہ پہلے ہی مرثیے کو ہندوستان میں مرثیہ گوئی کی نئی زندگی قرار دیا اور دوسرا حوالہ پروفیسر عالم خوندمیری ہیں جنھوں نے لکھا کہ:

"باقر امانت خانی حیدرآباد کے "جدید" شعراء میں اس لحاظ سے بھی منفرد مقام رکھتے ہیں کہ.................. الخ"

باقر امانت خانی ہی کیا، عصر حاضر کے بہت سے باکمال شعراء مرثیے کی اقدار کی پابندی کے ساتھ مرثیہ کہہ رہے ہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ اُن کی سینوں پر "جدید مرثیہ گوئی" کے تمغے (Tags) لگائے جائیں، کلاسیکی ادب، اور کلاسیکی اقدار کی حفاظت اپنی جگہ اہم کام ہے۔ اس شمع کو گُل ہونے سے بچانے کے لئے چراغ سے چراغ جلانے کا عمل جاری رہنا چاہئے۔ سوالات وہاں اُبھرتے ہیں جہاں آج کے دور کے کپڑے میں "خم پیچ کا انگرکھا" سلوا کر اسے "تھری پیس سوٹ" کہا جائے، یہی کیا کم ہے کہ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں مرثیے کو آگے بڑھانے میں صرف دو نام سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید اختر اور باقر امانت خانی اور ان کی اس عظمت کو سب نے تسلیم کیا ہے مرثیہ گوئی میں باقر امانت خانی کو کمال حاصل تھا۔ اُنھوں نے اپنے مرثیوں میں بعض نئے مضامین بھی شامل کئے۔ مثلاً اسی مرثیے "سفیر شجاعت" میں اُنھوں نے نئے مضامین کا اضافہ کیا۔ ان مضامین میں اپنے تعارف کے بعد اُنھوں نے اہم اور رجحان ساز (Trend Setter) مرثیہ گویوں کا ذکر کیا ہے اور مرثیے کو فطرت انسانی قرار دیا ہے۔

میرا اہم پیشہ اس آفاق میں گذرا ہے کمیت　　بہ طفیل شہ دیں رتبے میں اعلیٰ ہیں کمیت
بزم میں حضرت باقر کی جو آیا ہے کمیت[10]　　مرثیہ حضرت شبیر کا پڑھتا ہے کُمیت

باطنی حال میں تو عرش پہ بیٹھے ہیں امام
حد یہ منبر پہ ہے اور فرش پہ بیٹھے ہیں امام

مرثیے کی نہ ہو کیوں طینت انساں میں بنا　　مرثیہ درد کی تاثیر کا دیتا ہے پتا
دستِ ہابیل سے قابیل کا جب قتل ہوا[12]　　مرثیہ حضرت آدم نے کہا بیٹے کا

جوش اظہار ہوا، جذبۂ پنہانی میں
مرثیہ تھا یہی پہلا جو تھا سُریانی میں

قتلِ طالوت پہ داؤد نے لکھے اشعار   مرثیہ لکھتے ہیں بوطالب فرخندہ وقار
مرثیہ کہتی ہیں خود بنتِ نبیٔ مختار [۱۴]   مرثیے میں کیا حیدر نے الم کا اظہار
یہ بھی ہے ایک سبب اس کے لئے شہرت کا
مرثیہ لکھا ہے حسّان نے آنحضرت کا

جو کہ مشہور زمانہ ہے کمیت اسعدی   پہلا اس نے ہی کہا مرثیۂ سبطِ نبی
حمیریؔ، محتشمؔ و مقبلِؔ مداحِ علی   ہیں ستارے فلکِ مرثیہ گوئی کے سبھی
یاد رہ جائے نہ کس طرح سے نام ہشتم
مرثیہ سنتے ہیں دعبلؔ کا امامِ ہشتم

مرثیہ گوہر پُر آب ہے غوّاصیؔ کا   مرثیہ گوئی میں وجہیؔ کا ہے رتبہ اعلیٰ
مرثیہ کہنے میں سکینؔ بھی مشہور ہوا [۱۵]   اور سوداؔ نے بھی جنت کا کیا ہے سودا
تین جیتوں کی جو ڈالی ہے بنا سوداؔ نے
مرثیہ شکل مسدس میں کہا سوداؔ نے

اثر انداز ہے ہر ایک پہ حالِ شبیرؔ   شاہِ مظلوم کی روداد رقم کرتے ہیں میرؔ
رونقِ بزمِ فصاحت تھے فصیحؔ و دلگیرؔ [۱۶]   مرثیے کہہ گئے سرور کے خلیقؔ اور ضمیرؔ
بعد ان کے سخنستاں کے رئیسؔ آئے ہیں
مجلسِ غم میں دبیرؔ اور انیسؔ آئے ہیں

مرثیہ کہنے کا اس دور میں کم ہے دستور   مرثیہ گوئی میں تھے فرد جناب مسرورؔ
سعی کی میں نے بھی اس صنف میں حتی المقدور [۱۸]   ہے جنہیں کہنے کی قدرت وہ کریں فکر ضرور
بے رخی اُن سے نہ ہو قوم نہ پچھتائے کہیں
رغبتِ مرثیہ رخصت ہی نہ ہو جائے کہیں

اسی مرثیے میں جب باقر امانت خانی دو اصناف سخن یعنی مرثیہ اور غزل کا تقابل کرتے ہیں تو سخنوری کی منزل کمال پر نظر آتے ہیں ۔

مرثیے کا تو کوئی مدمقابل ہی نہیں   اور اصناف سخن اس کے مماثل ہی نہیں
صنف ایسی ہے یہ اس سے کوئی مشکل ہی نہیں [۱۹]   سینۂ فکر میں یہ ہو نہ اگر، دل ہی نہیں

باغِ اصنافِ سخن میں ہے عجب گل اس کا
دیکھیے رنگِ تغزل سے تقابل اس کا

اُس میں ہونٹوں پہ ہنسی، دیدۂ گریاں اس میں دامنِ عیش وہاں، چاکِ گریباں اس میں
رنگ مہندی کا وہاں، خونِ شہیداں اس میں [۲۱] ہے وہاں عذر گنا، اشکِ پشیماں اس میں
اُس میں تشویش ہے، توفیق کا منظر اس میں
بختِ مجنوں ہے وہاں، حُر کا مقدر اس میں

واں جو گیسو کا گرفتار نظر آتا ہے اس طرف قید میں بیمار نظر آتا ہے
جادۂ عشق وہاں، نار نظر آتا ہے یاں، براہیم کا گلزار نظر آتا ہے
برق گرتی ہے وہاں، شورِ فغاں اُٹھتا ہے
اس میں جلتے ہوئے خیموں سے دھواں اُٹھتا ہے

اُس طرف ہجر میں اشکوں کا نہیں کوئی حساب یاں نہیں ہے علی اصغر کی تبسم کا جواب
اس طرف فخر کے عالم میں جوانی کا ہے خواب [۲۵] ہے یہاں دین پہ قرباں علی اکبر کا شباب
بے وفائی جو وہاں چال نئی چلتی ہے
یہاں عباسؑ کے دامن میں وفا پلتی ہے

دامنِ قیس میں واں شمعِ محبت مستور ہے یہاں اوّل تخلیق کے اوصاف کا نور
اُس طرف عشقِ مجازی کے چراغاں کا ظہور [۲۷] جنبشِ کلکِ حقیقت میں یہاں شعلۂ طور
چشمِ وحشت میں وہاں گل کی ہنسی، نار بنی
اور یہاں آتشِ نمرود بھی، گلزار بنی

حسن کا بندہ ہے، بے دام ہے عاشق جو وہاں حسنِ یوسف ہوا، یاں حُسنِ نبی پر قرباں
وہاں شاہوں کی محبت کا ہے معیار گراں لاشۂ جونؔ پہ آتے ہیں یہاں شاہ زماں
واں فقط حسنِ دو روزہ ہے، دوامی شاہی
ہے یہاں حضرت قنبرؔ کی غلامی، شاہی

یار دلدار ہے واں، ہو متبسم جو کلی ہے یاں گل کی ہنسی شانِ خدائے ازلی
اُس طرف مدحِ رخِ زُلف، بعنوانِ جلی [۳۳] ہے یہاں حمدِ خدا، نعتِ نبیؐ، مدحِ علیؑ

تیغ ابرو سے وہاں شہ رگِ جان کٹتی ہے
اور یہاں دار پہ میثم کی زباں کٹتی ہے

یہ تقابل ۳۶ بند پر مشتمل ہے۔ جی چاہتا تھا کہ سارے بند یہاں نقل کئے جائیں لیکن ''ہزاروں خواہشیں ایسی'' والا مسئلہ ہے۔ ہر چند کہ ''ہم سخن فہم ہیں باقر کے طرفدار نہیں'' مگر طے شدہ لائحہ عمل کے تحت ہماری اس کتاب میں انیس و دبیر اور خلیق و ضمیر کا ذکر مختصر کیا گیا ہے اس لئے کسی شیدائے انیس کے لئے بہت زیادہ صفحات مہیا کرنا مناسب نہیں لگتا پھر بھی اُردو شاعری کے قارئین کے لئے یہ نشاندہی ضروری ہے کہ اللہ توفیق دے تو باقر امانت خانی کے اس مرثیے کو ضرور پڑھیں اگر آپ مرثیے پر ایمان نہ لے آئیں تو ہمارا ذمہ۔ ویسے تو باقر امانت خانی نے ۳۶ سے زیادہ مرثیے کہے ہیں اور ان سب کے پڑھنے سے ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ پڑھ کر دیکھیے ''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے''۔

☆☆☆☆☆

سیف زلفی:- (لاہور)

ولادت ۱۹۳۱ء وفات ۱۹۹۱ء

دبستان لاہور کے مرثیہ گو۔ نام سید ذوالفقار حسین رضوی، تخلص سیف۔ والد گرامی کا نام سید مقبول حسین رضوی۔ تقسیم ہند کے بعد سیف زلفی لاہور آگئے تھے۔ پاکستان کے شہر لاہور میں جن شعراء نے مرثیہ گوئی کو فروغ دیا اُن میں سیف زلفی کا نام شامل ہے۔ بیسویں صدی کی پانچویں چھٹی دھائیوں میں پنجاب میں شعراء کی جو نئی نسل اُبھر رہی تھی سیف زلفی اُس میں شامل تھے۔ شہزاد احمد، کلیم عثمانی، حبیب جالب، شکیب جلالی (ابتدا راولپنڈی میں تھے) ماجد الباقری (گوجرانوالہ) آتش لدھیانوی راقم السطور (عاشور کاظمی) وغیرہم۔ اس نسل سے ایک قدم پہلے مگر اس نسل کے ساتھ ساتھ قدیم سے قدم ملا کر چلنے والوں میں قتیل شفائی، سیف الدین سیف، ظہیر کاشمیری، منیر نیازی کے نام آتے ہیں۔ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں سیف زلفی نے خود کو غزل کے شاعر کی حیثیت سے منوالیا تھا۔ لیکن کسی کو یہ اندازنہیں تھا کہ سیف زلفی کسی وقت مرثیے کی طرف بھی جاسکتے ہیں۔ اس ساری کھیپ میں صرف راقم السطور کا رجحان منقبت، سلام اور رثائی شاعری کی طرف تھا اور ۱۹۵۵ء میں میری کتاب ''چراغ منزل'' شائع ہو چکی تھی۔

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی (۱۹۵۸ء) میں پاکستان میں پہلی بار مارشل لاء لگا اور

مجھے خانماں برباد ہو کر لاہور چھوڑنا پڑا۔ میرے لاہور چھوڑنے کے کچھ عرصہ بعد سیفؔ زلفی رثائی ادب کی طرف مائل ہوئے اور ابتدا سلام لکھنے سے ہوئی۔ اسی دور میں محسنؔ نقوی بھی سامنے آئے۔ سیفؔ زلفی نے پہلا مرثیہ ۱۹۷۱ء میں کہا۔ ڈاکٹر ہلال نقوی نے سیفؔ زلفی کے پہلے مرثیے کو ۱۹۷۵ء سے منسوب کیا ہے جسے درست ماننا پڑے گا مگر قیصر بارہوی نے ظہیر الدین حیدؔر کی ''آیات وفا'' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

> ۱۹۷۰ء کے وسط میں شعراء لاہور کو جمع کیا اور مرثیے کی بقا پر گفتگو کی ــــــ میری آواز پر جن حضرات نے لبیک کہا اُن میں جناب سیفؔ زلفی، جناب وحید الحسن ہاشمیؔ، جناب ظہورؔ جارچوی، جناب شائقؔ زیدی، جناب افسرؔ زیدی، وجاہتؔ سونی پتی اور آثرؔ ترابی جیسے صاحبانِ شعور شامل ہیں ــــــ

اس تحریر سے انداز ہوتا ہے کہ سیفؔ زلفی جیسے زود گو شاعر نے پہلا مرثیہ ۱۹۷۱ء میں ہی کہا ہوگا۔ ڈاکٹر ہلال نقوی نے ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۵ء تک کہے گئے مرثیوں کی فہرست میں سیفؔ زلفی یا اُن کے کسی مرثیے کا ذکر نہیں کیا ــــ اُنھوں نے ۱۹۷۱ء میں پہلا مرثیہ کہا یا ۱۹۷۵ء میں بہر حال اُنھوں نے مرثیے کہے ہیں۔ سید وحید الحسن ہاشمی نے سیفؔ زلفی کے پانچ مرثیوں کی تصدیق کی ہے۔ ہاشمی صاحب نے لکھا ہے کہ سیفؔ زلفی کے مرثیوں میں جوشؔ اور آل رضا کا رنگ پایا جاتا ہے۔ لیکن راقم الحروف سیفؔ زلفی سے ذاتی تعلقات کی بنا پر بھی اور اُن کے کلام کے حوالے سے بھی اس رائے پر کاربند ہے کہ سیفؔ زلفی کا آئیڈیل مصطفیٰ زیدی تھے۔ وہ آخری بار جب کراچی آئے اور اُنھوں نے نشتر پارک کے اجتماع میں جہاں علامہ رشید ترابی اعلی اللہ ومقامہ تقریر فرمایا کرتے تھے، سلام پڑھا تو مجلس کے بعد اُن سے آخری ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں غیر محسوس انداز میں اُنھوں نے مصطفیٰ زیدی کے دس بارہ اشعار پڑھے ــــ دیکھئے سیفؔ زلفی اور مصطفیٰ زیدی میں فکر کی ہم آہنگی ــ

لیننؔ کے اشتراک پہ کچھ لوگ ہیں نثار		اور قافلے پہ مارکسؔ کے مرتے ہیں بے شمار
سقراطؔ کے پیالے پہ غلطاں ہیں دس ہزار		زرتشتؔ کے الاؤ میں جلتے ہیں چند یار
کچھ طالبان امن کو گوتمؔ سے چین ہے
لیکن میری نظر کا اُجالا حسینؑ ہے

اس بین الاقوامی ادب کے حوالے مصطفٰی زیدی کی رثائی شاعری میں دیکھئے ۔

وہ جرمنی کا آشوز، جاپان کا ہیروشما اُن کی بھیانک نزع کی آواز کو کس نے سنا
اُن کے تو لاکھوں دوست تھے، لیکن یہ خونی سانحا اُن کے لئے علمی مباحث کے سوا کچھ بھی نہ تھا

اپنی ذہانت کے علاوہ سب سے پردہ پوش تھے
سب جیسپر، سب مارکو، سب سارتر خاموش تھے

سارے جرائم سے بڑی ہے یہ مہذب خامشی اس سے تو آگے ہیچ ہے قاتل کی زہریلی ہنسی
اس علم کے ساغر میں شامل ہے ہلاکت علم کی اس سے زیادہ اور کیا سنگین ہوگی دوستی

تاریخ پوچھے گی کہ جب مہمان ویرانے میں تھے
کوفے کے سارے مرد کس گھر کے نہاں خانے میں تھے

مغربی ادب یا ادیبوں کے حوالے دینا اور بات ہے اور کسی دوسری زبان کے ادب کی روح کو سمجھ کر اس پر بات کرنا اور ہے۔ سیف زلفی نے انگریزی ادب کا مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے جہاں جس انگریزی کے شاعر، مفکر یا دانشور کا حوالہ دیا وہ علمی حوالہ تھا۔ اس نکتے پر سیف زلفی اور مصطفٰی زیدی باہم نظر آتے ہیں۔

سیف زلفی کے رثائی کلام کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

(۱) ہمارے ہیں حسینؑ (۲) کربلا کے دو امیر
(۳) تا بہ خاکِ کربلا (۴) نور (۵) روشنی

ان کتابوں کے نام گواہ ہیں کہ سیف زلفی حسینؑ مظلوم کے صدقے میں روشنی تک پہنچے۔ ایسی روشنی جسے زوال نہیں۔

☆☆☆☆☆

جالبؔ زبیری:- (امروہہ)

ولادت جنوری ۱۹۳۸ء ۔ وفات یکم جولائی ۱۹۹۱ء

نام جالب حسین، تخلص جالبؔ، امروہہ کے زُبیری خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اُن کے والدِ گرامی مولوی ثاقب حسین ''امام المدارس انٹر کالج'' امروہہ میں اُردو، فارسی کے لیکچرر رہ چکے ہیں۔۔۔ موصوف کا شمار امروہہ کے اچھے شعراء میں ہوتا ہے۔

جالب زیدی نے امام المدارس انٹر کالج سے ۱۹۵۴ء میں میٹرکولیشن اور ۱۹۵۷ء میں الیف۔ اے کیا۔ اس کے بعد کاروبار میں دلچسپی کے سبب تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور تجارت کی دنیا میں آ گئے۔ جالب زیدی کو شاعری ورثے میں ملی تھی، اس پر امروہہ کا ادبی ماحول، ادب پرور لوگوں کا فیض صحبت جن میں جون ایلیا بھی شامل تھے (جو اس وقت تک پاکستان نہیں گئے تھے)۔ ان سب عوامل نے جالب حسین کو شاعر بنا دیا۔ جون ایلیا کی سرپرستی اور رہنمائی نے دوآتشہ کر دیا۔ جالب نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی مگر قرار ملا تو محمد و آل محمد کی مدح میں۔ سر تمیں ملیں تو غم حسین میں۔

جالب نئی نسل کے شاعر ہیں، ایٹمی دور کے شاعر ہیں، تیز رفتار زندگی کے شاعر ہیں جہاں طویل گفتگو ممکن نہیں، طویل نظمیں اپنی مقبولیت کم کر چکی ہیں۔ جالب نے مرثیے میں اختصار کو اپنایا، مدحت آل محمدؐ میں ڈوب کر بند پہ بند کہنے والا شاعر پچاس پچپن بند سے زیادہ کا مرثیہ نہیں کہتا تھا۔ الفاظ سمجھ میں آئیں اور بقول جوش الفاظ سے دوستی ہو تو الفاظ معانی کا سمندر موجزن کر دیتے ہیں۔ جالب نے پچاس بندوں میں جی کھول کر مدح اور مرثیے کا پورا خاکہ معہ مصائب کہنے کا ڈھنگ سیکھ لیا تھا۔ ان کی مدح کا انداز جذباتی نہیں حقائق اساس ہوتا تھا وہ اپنی اس مدح کو اپنا شرف سمجھتے رہے اور اس پر تفاخر کرتے رہے ہیں۔ اُن کے ایک مرثیے کی ابتدا ہی اس تفاخر سے ہوتی ہے۔ ''بے خطر منقبت آل عبا کرتا ہوں''

اسی منقبت اور مدح کے تیور کس استدلال کے ساتھ اُن کے ایک اور مرثیے میں نمایاں نظر آتے ہیں جب وہ ثانی زہرا سیدہ زینبؑ کی منقبت کرتے ہیں۔

زینبؑ، معینِ سبطِ پیمبرؐ کہیں جسے زینبؑ، سکونِ عابدؑ مضطر کہیں جسے
زینبؑ، کمالِ حمزہ و جعفر کہیں جسے زینبؑ، جلالِ فاتحِ خیبر کہیں جسے
جرأت میں بڑھ کے حیدرِ کرارؑ ہوگئی
زینبؑ، امامِ وقت کی تلوار ہوگئی

جالب کا پہلا مرثیہ ''آمد ہے کربلا میں امام غیور کی'' ہے، اس مرثیے کے چہرے میں جالب کی چشم تصور نے عجیب عجیب پھول کھلائے ہیں۔ امام حسین علیہ السلام کی محبت اور عقیدت میں اُنہیں ہریالی ہی ہریالی نظر آتی ہے۔ کربلا میں جب امام حسینؑ پہونچتے ہیں تو اس موقع پر جالب کہتے ہیں۔

اللہ رے وہ سبزۂ صحرا کی آب و تاب ہر نخل پر نکھار تھا ہر پھول پر شباب
دریا میں بے قرار زیارت کو ہر حباب اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا تھا جمال ابو تراب
تاروں کے درمیان میں اک آفتاب تھا
نورِ حسینؑ، نورِ رسالت مآب تھا

بشر کا ضمیر زندہ ہو تو حواس خمسہ بھی بیدار رہتے ہیں اور مسرت والم، فخر ومباہات اور ندامت وشرمندگی سارے جذبے کروٹیں لیتے ہیں۔ کربلا میں حُر کا کردار ایک زندہ ضمیر انسان کا کردار تھا، اس زندہ ضمیری کو اساس بنا کر جالب نے جب حضرت حُر کی کیفیت بیان کی ہے تو ذہنی کشمکش کی داستان سنا دی ہے۔

دل میں آتے رہے حُر کے یہی رہ رہ کے خیال پسرِ مصحف ناطق کو دیا میں نے ملال
مجرم ایسا ہوں کہ جس کی نہیں دنیا میں مثال دیکھیے کیا مری تقصیر کا اب ہوگا مآل
بے خطا دلبرِ زہراؑ کو ستایا میں نے
لا کے سیدؑ کو لعینوں میں پھنسایا میں نے

مرثیہ گوئی میں نازک مرحلہ ''بین'' کا ہے، جالب بین کے معاملے میں رنگ قدیم کو اپناتے ہیں۔ لہٰذا زینب کو ''جلال فاتح خیبر'' کہنے والا شاعر جالب حسین جالب، اور

جرأت میں بڑھ کے حیدر کرار ہوگئی
زینب امام وقت کی تلوار ہوگئی

ایسا عظیم بیت کہنے والا شاعر جالب جب بین کی منزل پر آتا ہے تو رنگ قدیم کے زیر اثر زینب کو آہ و بکا میں مبتلا کر دیتا ہے۔

اماں میں رو رہی ہوں برادر کے واسطے لیلیٰ تڑپتی ہے علی اکبر کے واسطے
دُکھیا رباب روتی ہے اصغر کے واسطے برپا ہے حشر ثانیؑ حیدرؑ کے واسطے
ڈھارس تھی دل کو جس سے وہ جرار مر گیا
اماں مری سکینہؑ کا غم خوار مر گیا

جالب حسین جالب امروہوی نے بہت سے مرثیے کہے ہیں، اُن کے سفر میں کہاں

کہاں موڑ آئے، کہاں کہاں نشیب و فراز آئے ان ادوار کے لئے ڈاکٹر عظیم امروہوی سے کمک مانگی تو پتہ چلا کہ جالب ۵۳ برس کی عمر میں دنیائے فانی سے عالم بقا کی طرف سدھار گئے لیکن مدح امام مظلوم، اور ذکر محسن انسانیت کے جو چراغ وہ جلا گئے ہیں اُن سے روشنی پھیل رہی ہے اور تا قیامت پھیلتی رہے گی۔

☆☆☆☆☆

سہیل بنارسی (لاہور)

پیدائش ۱۸۹۸ء (بنارس)۔ وفات ۱۹۹۲ء (لاہور)۔

نام سید سرفراز احمد، تخلص، سہیل۔ ان کے دادا مولوی سید عنایت حسین ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل جونپور میں جج کے منصب پر فائز تھے۔ سہیل کے والد گرامی سید سبط احمد بھی بنارس کے رؤسا میں شمار ہوتے تھے۔ سہیل بنارسی کی ابتدائی تعلیم، اُردو، فارسی، صرف ونحو مقامی طور پر ہوئی، انگریزی تعلیم کے لیے علی گڑھ گئے۔ وکالت پاس کی اور وکیل بن گئے۔ ۱۹۴۹ء میں پاکستان آگئے۔

ہر صنف سخن میں شاعری کی۔ نقوش عرفاں، شہود عرفاں، عروج عرفاں، شعور عرفاں، چاروں مجموعے قصائد پر مشتمل ہیں۔ غزلیات کے مجموعے کا نام "زنجیر جمال" ہے۔ مرثیوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلے مجموعہ پر ڈاکٹر مسعود رضا خاکی کا پیش لفظ ہے۔

پہلا مجموعہ "پانچ مختصر مرثیے" مطبوعہ ضیغم اسلام اکادمی لاہور (۱۹۷۱ء) ہے اس مجموعے میں پانچ مندرجہ ذیل مرثیے ہیں۔

(۱)	"اسلام کا مزاج ہے اک خم کی دوپہر"	عنوان	"دوپہر"
(۲)	"انداز آفریں ہیں انداز سب وفا کے"	عنوان	"افکار وفا"
(۳)	"انساں کی زندگی غم، غم کا مزاج انساں"	عنوان	"شعور غم"
(۴)	"پھر آرہی ہے قلب کو اس نوجواں کی یاد"	عنوان	"یادگار حسن"
(۵)	"تقدیر کائنات ہے میدان کربلا"	عنوان	"شباب کربلا"

سہیل بنارسی نے پہلا مرثیہ ۱۹۷۰ء میں کہا اور پھر اسی سال میں چار مرثیے اور کہے، ہر مرثیہ ۳۶ بند پر مشتمل ہے جو مرثیے میں اختصار نویسی کی سوچ کا عملی مظاہرہ ہے دوسرا مجموعہ

''تین مختصر مرثیے'' کے نام سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔

سہیلؔ بنارسی نے اختصار نویسی کو برقرار رکھا۔ اُن کے مراثی عام طور پر ۳۶ یا زیادہ سے زیادہ ۴۰ بندوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اور لطف یہ کہ ان مرثیوں میں کلاسیکی مرثیے کے سارے اجزا چہرہ، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت اور بین برقرار رہتے ہیں۔ اس فریم ورک میں کبھی کبھی اُنہوں نے عصری تقاضوں کی تصویر بھی لگانی چاہی ہے اور مفکرانہ اسلوب کا اظہار بھی اختصار سے کیا ہے۔ مثلاً مرثیہ ''شعورِ غم'' میں ایک مفکرانہ اسلوب نظر آتا ہے۔

انساں کی زندگی غم، غم کا مزاج انساں ٹھہرا نہ کوئی جس جا اس جا ہے آج انساں
چاہے اگر ملک سے لے لے خراج انساں غم آشنا ہے، بخشے غم کو رواج انساں
زندہ ہو آدمیت غم کا شعور لیکر
ظلمت ورق اُلٹ دے داغوں کا نُور لیکر

سہیلؔ بنارسی نے دردانگیزی اور گریہ، یعنی کلاسکی مرثیے کے ضروری اجزا کو بھی فراموش نہیں کیا ہے اور اختصار نگاری میں بھی اندوہ نگاری کو باقی رکھا ہے، اپنے مرثیے ''یادگارِ حسنؑ'' میں وہ منظر پیش کیا ہے جب امام حسینؑ حضرت قاسمؑ کی لاش پر پہنچتے ہیں۔ اس ذکر میں سارے رقت انگیز اشارے موجود ہیں۔

پہونچے حسینؑ لاش پہ قاسمؑ کے بیقرار پہلو میں ساتھ ساتھ تھے عباسؑ اشکبار
دیکھا جو حال ہوگیا اک تیر دل کے پار فرمایا تو گواہ ہے اے میرے کردگار
یہ باعثِ قرارِ دلِ بے قرار تھا
شبرؑ کا یادگار چمن کی بہار تھا

لاشے کے پاس بیٹھ گئے شاہِ کربلا کیا ضبط تھا بچھادی زمیں پر وہیں ردا
جلتے ہوئے زمانے کا دم غم سے رُک گیا دُنیا کی ضد پہ صبر کا دامن نہ چُھٹ سکا
خیمے میں لے کے آئے بھتیجے کی لاش کو
لائے حسینؑ کیسے تنِ پاش پاش کو

بے تاب بیبیاں تھیں تو بچے شکستہ حال ماں مطمئن ضرور تھی لیکن ذرا نڈھال
زینبؑ نے آکے لاش پہ فرمایا میرے لال اُمت نے تیرے جد کی کیا تجھ کو پائمال

رسوا نبیؐ کے دین کو یوں برملا کیا
دنیا نے اس یتیم کے حق میں یہ کیا کیا

☆☆☆☆☆

کاظم زار عظیم آبادی:-

ولادت ۱۹۳۷ء۔ وفات ۱۹۹۲ء

بہار کے سبھی شاعروں نے حضرت کاظم زار عظیم آبادی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے اور اُن کے علم و فن اور شعر گوئی کی مہارت کو تسلیم کیا ہے۔

دانش عظیم آبادی نے زار عظیم آبادی کے سلسلے میں ایک دل سوز واقعہ لکھا ہے۔

''حضرت زار، بہار کے مشہور قصبے کھجوا (سیوان) ضلع سارن میں مرثیے کا عشرہ پڑھنے جایا کرتے تھے۔ نہ جانے کس بات پر کبیدہ خاطر ہوئے کہ وہاں سے واپسی میں (اپنے کل سلام اور مراثی جو بیس پچیس سے کم نہ تھے) بیچ دریائے گنگا میں یہ کہہ کر پورا بستہ پھینک دیا کہ آج سے نہ مرثیے کہیں گے نہ پڑھیں گے۔ اٹھارہ بیس سال تک مطلق ایک بند نہ کہا''

احباب کے مسلسل اصرار پر زندگی کے آخری دنوں میں زار عظیم آبادی نے دو چار مرثیے کہے مگر افسوس یہ اُن کی حیات کے آخری دنوں کی بات ہے۔

حضرت زار عظیم آبادی کے فرزند ارجمند سید تراب حسین فردوسی (ولادت ۱۹۳۷ء) کے متعلق کچھ دوستوں نے بتایا کہ فن شعر گوئی میں مہارت رکھتے ہیں۔ تو پھر اُنہوں نے اپنے والد گرامی کی آخری عمر میں کہے ہوئے دو چار مرثیوں کو محفوظ کیوں نہیں کیا۔ زار مرحوم کے شاگردوں میں بھی ہوش عظیم آبادی، اصغر امام فلسفی، قاسم صبا جمیلی، صابر آروی جیسے مرثیہ گو، نامور شعرا رہے ہیں پھر اُستاد کے کلام سے لاپرواہی حیرت انگیز صورت حال ہے۔ سلام ہو ڈاکٹر اعجاز علی ارشد پر کہ اُنہوں نے زار عظیم آبادی کا مجموعہ کلام ''نشاط غم'' مرتب کیا۔

زار عظیم آبادی ۱۹۳۰ء سے ۱۹٦۰ء کے درمیان تیس برس تک نہ صرف بہار میں بلکہ بہار سے باہر بھی ادبی اور شعری محفلوں پر چھائے رہے۔ اُنہوں نے غزلیں کہیں جن پر ترقی پسند تحریک

کا اثر تھا۔ موضوعاتی نظمیں کہیں جو اس تحریک کے منتخب موضوعات تھے، اہلبیت کی شان میں قصائد کہے جن میں تشبیہات و استعارات کی ندرت ...... ہے، رباعیات اور قطعات کہے جن میں جدّت مضامین اور فنی پختگی ہے۔ حتیٰ کہ مرثیے کہے تو مرثیوں کی روایتی اور بوجھل فضا میں اپنے اسلوب سے شعری کیفیات پیدا کی۔ اُن کی مرثیہ گوئی کے بارے میں پروفیسر محمد ذکی الحق لکھتے ہیں :۔

> "سید کاظم حسین زار، عظیم آبادی ایک کہنہ مشق اور پُر گو شاعر ہیں۔ ...میرزا ذکی نبیرہ انیس کے تلامذہ میں سے تھے۔۔۔۔۔۔آپ کے ایک دو مرثیے اور مسدس میری نظر سے گذرے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے روایتی ہیں۔ اُن کا اصل مقصد واقعات کربلا کی اس طرح یاد تازہ کرنا ہے کہ سامعین پر سوز و گداز کی کیفیت پیدا ہو جائے۔"

زار ۹ برس کی عمر میں یتیم ہو گئے تھے۔ اس کے بعد زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے مگر علم کی پیاس اُنہیں اس منزل تک لے گئی کہ ذاتی مطالعہ کے ذریعے اُنہوں نے اُردو اور فارسی کا علم حاصل کیا۔

زار عظیم آبادی کی ایک مسدس کو تاریخی قبولیت ملی۔ یہ مسدس اُنہوں نے ۱۹۳۵ء میں آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے اجلاس منعقدہ رائے بریلی میں پڑھی تھی اور اس کو سن کر حضرت صفی لکھنوی نے تعریف کرنے کے بعد اپنی نظم پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ اجلاس یتیم بچّوں کی تعلیم کے سلسلے میں منعقد ہوا تھا حضرتِ زار کی نظم کا ایک بند یہ تھا۔

(پہلا بند)

زار ہم بھی تھے کبھی دردِ یتیمی میں تپاں پھر گیا آنکھوں میں طفلی کی مصیبت کا سماں
مقتضائے سن ہنسا دیتا تو یہ کہتی تھی ماں خانۂ غم میں خوشی معیوب ہے اے میری جاں
پوچھتے تھے ہم کہ پھر دل کس طرح بہلائیں گے
یہ تو بتلا دیجیے ہنسنے کے دن کب آئیں گے

یہ مسدس جو اُنہوں نے ۱۹۴۰ء میں جوشؔ کی پیش خوانی کے طور پر باڈلی ہال پٹنہ میں پڑھی تھی وہ فکری اور فنی اعتبار سے پسند کی گئی۔

(پہلا بند)

مقصدِ کن فیکن، رازِ مشیت کیا ہے فی الحقیقت غرض و غایتِ خلقت کیا ہے

یا الٰہی یہ گراں قدر امانت کیا ہے معرفت کیا ہے، وفا کیا ہے، محبت کیا ہے
کیا فقط آئینہ صدق و صفا ہوجانا
خلقتاً پیکر تسلیم و رضا ہوجانا

(دوسرا بند)

یہی کافی ہو تو معیار شرافت کیا ہے زندگی کیا ہے، فنا کیا ہے، قیامت کیا ہے
سب تو سب غلغلۂ دوزخ و جنت کیا ہے آخر انسان کو مذہب کی ضرورت کیا ہے
شور و ہنگامۂ انعام و سزا کیا معنی
روز و شب دغدغۂ یوم جزا کیا معنی

(درمیان سے)

اک تماشا ہے کہ مجموعہ اضداد بھی ہے گل بھی ہے،آب بھی ہے،خاک بھی ہے باد بھی ہے
کشت سرسبز بھی ہے، محنت برباد بھی ہے ابر رحمت بھی ہے، برق ستم ایجاد بھی ہے
ہے کوئی ایسا جو بندہ بھی ہو، آزاد بھی ہو
ایک ہی وقت میں مغموم بھی ہو شاد بھی ہو

(درمیان سے)

ایک جانب تبر و نیزہ و شمشیر و سناں دوسری سمت کئی روز کے پیاسے مہماں
اک طرف طبل و غا، بانگ دہل تیر وکماں دوسری سمت اذاں، سعیٔ نماز، امن و اماں
پسر فاطمہ، فرزند نبی کیا کہنا
بارک اللہ حسینؑ ابن علیؑ کیا کہنا

اب یہ تو دانشمندان نقد ونظر بتائیں کہ یہ مسدس رثا کے تقاضوں پر پوری اُترتی ہے یا نہیں ہم تو یہ جانتے ہیں کہ جوشؔ جیسی علم وآ گہی کی چٹان کو اس نظم نے موم کردیا تھا—

حضرت زار عظیم آبادی کا مرثیہ ـ ”برہم نظام ہستیٔ ناپائیدار ہے“ شہزادہ علی اکبر کے احوال کا مرثیہ ہے۔اس مرثیے کے چند بند درج ذیل ہیں ـ

(پہلا بند)

برہم نظام ہستیٔ ناپائیدار ہے جو رنگ دیکھتا ہوں وہ بے اعتبار ہے

شاداں تھا جو ابھی، وہ ابھی بیقرار ہے خوفِ خزاں بھی ہمرہِ شوقِ بہار ہے
آساں نہیں ہے عشق گل و بار و برگ کا
کھٹکا ہر آن رہتا ہے صیاد مرگ کا

(گریز)

مشہور پند ہے کسی ذی عقل و ہوش کا غم ہو تو کوئی یاد کرے اس کے ماسوا
بیکار کیوں تلاش کروں حال دوسرا پیش نظر ہے واقعۂ دشتِ کربلا
کیا کیا ہے نہ رنج شہ مشرقین نے
تھی کونسی گھڑی نہ جو جھیلی حسینؑ نے

(جنگ کا ایک بند)

بے ساختہ ہنسا شہِ عالم کا گلعذار پھر کی بلند ہاتھ میں شمشیر آبدار
تکبیر کہہ کے سر پہ کیا بے حیا کے وار اک ضرب میں کیا اسے مرکب سمیت چار
نصرت نے چومے ہاتھ دلِ بوتراب کے
فتح و ظفر نے لے لئے بوسے رکاب کے

(آخری بند)

کیا بات ہوگئی مجھے کھلتا نہیں سبب بھیا کو دیکھ دیکھ کے کیوں رو رہے ہیں سب
بولیں یہ تب بھتیجی سے بنتِ شہِ عرب بی بی ملیں گے بھائی تمہارے جناں میں اب
برچھی جگر پہ کھا کے جہاں سے گذر گئے
چونکاتی ہو کسے، علی اکبر تو مر گئے

☆☆☆☆☆

سید عبدالباری معنیؔ:- (اجمیر شریف)

نام سید عبدالباری، تخلص معنیؔ۔ والد کا اسم گرامی محمد حنیف۔ دارالعلوم عثمانیہ اجمیر شریف میں ابتداء تعلیم پائی۔ فارسی اور عربی کی تعلیم کے لئے لکھنو گئے حصول تعلیم کے بعد اجمیر واپس آئے، اور علمی ادب کاموں میں معروف ہوگئے۔ پریس قائم کیا، اخبار 'آستانہ' نکالا۔

تصانیف:

(۱) تذکرۂ شعرائے اجمیر

(۲) آثار الصنادید

(۳) بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ

خرابی صحت کی بنا پر کچھ دنوں کے لئے تبدیلی آب وہوا اور علاج کی غرض سے حیدرآباد دکن گئے وہاں محکمہ امور مذہبی سے وابستہ ہو گئے۔ بالآخر دارالعلوم عثمانیہ اجمیر شریف کے مہتمم بن کر اجمیر واپس آ گئے۔

مولانا عبدالباری معنیؔ اجمیری کا کلام زیادہ تر حمد و نعت، منقبت، سلام اور مراثی پر مشتمل ہے۔ ایک سے زیادہ مرثیے کہے ہیں اور مختلف بحور میں کہے ہیں ڈاکٹر سید ہادی علی جعفری نے ''راجستھان میں مرثیہ گوئی'' کے حوالے سے اُن کے مختلف مراثی کے کچھ بند نقل کئے ہیں لیکن پورے مراثی کہیں سے دستیاب نہیں ہو سکے۔ جتنے بند میسر ہوئے اُن سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا معنیؔ ایک پختہ گو شاعر تھے ۔

دیباچۂ صحیفۂ عظمت حسینؑ ہے　　سرنامۂ کتاب فضیلت حسینؑ ہے
سرچشمۂ عزیمت و سطوت حسینؑ ہے　　نقشِ جبینِ دفتر عزّت حسینؑ ہے
اللہ رے مرثیہ شہ عالی مقام کا
کونین میں ہے سکّہ رواں ان کے نام کا

ناقدین مرثیہ نے میر انیسؔ کو اقلیم سلامت و فصاحت کا تاجدار تسلیم کیا ہے تو مرزا دبیر کو فرمانروائے مملکت بلاغت و شکوہ لفظی مانا ہے جبکہ سچ پوچھیے تو فصاحت و سلاست دبیر کے کلام میں بھی ملتی ہے اور شکوہ لفظی اور بلاغت میر انیسؔ کے کلام میں بھی فراوانی کے ساتھ نظر آتی ہے۔ مولانا سید عبدالباری معنیؔ اجمیری نے ان دونوں چراغوں سے روشنی پائی تھی۔ بلاغت کی منزل پر اُن کے ایک مرثیے کے دو بند نذر قارئین ہیں ۔

دیکھا خواہر کو جب فتادہ بہ خاک　　شاہ بولے بدیدۂ نم ناک
ہے رسول خدا کی عزّتِ پاک　　ہذا قلبی علیک روحی فداک
اے بہن یہ رضا کی منزل ہے
جنگ مابین حق و باطل ہے

اور بہن کا جواب تھا۔

اے چراغ حریم مصطفوی عظمت خانوادۂ نبوی
سید دو دمان مرتضوی خاصۂ بارگاہ ربِّ قوی
اے جگر گوشہ رسول و بتول
آپ ہیں زندہ یارگار رسولؐ

اور جب مولانا معنیؔ اجمیری سلاست کی طرف آتے ہیں تو کہتے نظر آتے ہیں۔

شہیدوں کے مقتل میں لاشے پڑے ہیں کہ فرشِ زمیں پہ نگینے جڑے ہیں
یہ وہ ہیں جو راہ حق میں لڑے ہیں خدا کے یہاں اُن کے رتبے بڑے ہیں
ملا ہے بڑا مرتبہ آج ان کو
کہ نیزوں پہ حاصل ہے معراج ان کو

☆☆☆☆☆

سید عبدالمعبود معینی :-(اجمیر شریف)

مولانا سید عبدالباری معنیؔ کے ساتھ اجمیر شریف کے ایک اور ممتاز مرثیہ گو شاعر کا تذکرہ "موجودہ اور نمائندہ شعرائے اجمیر" مرثیہ فضل متین میں ملتا ہے لیکن معینیؔ کی تاریخ ولادت و تاریخ وفات نہیں ملتی۔ اندازہ ہے کہ وہ مولانا معنیؔ کے ہم عصر بھی ہو سکتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ عبدالمعبود معینیؔ قدر الکلام شاعر تھے، تاریخ گوئی پر ملکہ رکھتے تھے مرثیہ گوئی میں اُن کے مراثی کے جو بند میسّر ہیں اُن کے حوالے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مولانا عبدالباری معنیؔ سے بڑے مرثیہ گو تھے — سید یادعلی جعفری نے "راجستھان میں اُردو مرثیہ" میں عون و محمدؑ کے احوال کے ایک مرثیہ کے چند بند نقل کئے ہیں۔

یہ کہہ کے مدح آل رسول الہ کی اور پھر مذمت سپہ کینہ خواہ کی
تقریر سن کے عون حقیقت پناہ کی غیرت سے زرد پڑگئی رنگ سیاہ کی
حق بات سن کے ان سے جو عالی جناب تھے
جل کر حسد کی آگ میں شامی کباب تھے

اسی مرثیے میں عون و محمدؑ کے رجز کا ایک بند ہے ۔

ایماں سے انحراف اماموں کے سامنے یہ سرکشی بلند مقاموں کے سامنے
منہ زوریاں، خدا کی حساموں کے سامنے نامرد! آتوشہ کے غلاموں کے سامنے
لوہا نہ مان جائے تو سیّد نہ مانیو
کلمہ پڑھا نہ لوں تو محمد نہ جانیو

تلوار کی تعریف میں ایک بند کلاسیکی مرثیے کی نمائندگی کرتا ہے ۔

اب تیغ کی جو آمد و شر کی گھڑی لگی جوشن پہ پڑگئی تو نہ رکھی کڑی لگی
آڑی لگی کسی پہ کسی پر کھڑی لگی ساون کے ماہ میں بھی نہ ایسی جھڑی لگی
رُک رُک کے خون پیتی تھی سر کاٹ کاٹ کر
یہ چاٹ پڑگئی تھی لہو چاٹ چاٹ کر

معینی کی تاریخ ولادت و وفات نہ معلوم ہونے کے باوجود اُن کے نمونہ کلام کو پڑھ یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ وہ بیسویں صدی کے مرثیہ گو اور قدر الکلام شاعر تھے— کلاسیکی مرثیے کے لوازم میں تلوار بھی ایک موضوع تھی، معینی نے بھی 'تلوار' پر طرح طرح سے شعر کہے ہیں، وہ تلوار کی تجسیم کر کے اسے زبان دیتے ہیں اور اس زبان سے کلمات کی ادائیگی کو منظوم کرتے ہیں ۔

میرے جوہر نے نہ چار آئینہ کی بانی ایک میرے پانی نے نہ چھوڑی رگ پنہانی ایک
آب اور خون کی ہے جسم میں جولانی ایک ہے یہ وہ گھاٹ جو کرتا ہے لہو پانی ایک
سینے پھٹکتے ہیں میری آب سے ہر کاٹ میں دیکھ
آگ پانی میں نہ دیکھی ہو تو اس گھاٹ میں دیکھ

امام حسینؑ کے والد گرامی علی مرتضیٰ نے فرمایا تھا

''میری نظر میں تمہاری یہ دنیا ریزش زُکام گو سفند سے بھی کم تر ہے''

حسینؑ اور خانوادہ حسینؑ کی حیات و موت اس قول کی مظہر ہیں۔ بعد شہادت حسینؑ جب اشقیا خیام حسینی کو لُوٹنے آئے تو اس منظر نامہ کو معینی نے مرثیے کے ایک بند میں نظم کیا ہے جو اہلبیت اظہار آل علی کا تعارف نامہ بھی ہے ۔

رہزن سمجھ رہے تھے کہ لوٹیں گے سیم و زر بیت اشرف میں پائیں گے الماس اور گہر
دوڑیں قیام شاہ میں نظریں اِدھر اُدھر بے دین دنگ رہ گئے منظر وہ دیکھ کر
ہیرے پڑے ہوئے تھے نہ موتی جڑے ہوئے
مصحف کھلے ہوئے تھے، مصلے بچھے ہوئے

بین کے معاملے میں بھی معینؔی نے حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ امام حسین کی بیٹی سکینہ جن کی عمر چار برس ہے اپنی پھوپھی سے مکالمہ کرتی ہیں جو دردانگیز اور پُر اثر ہے۔

بابا کا راہوار ہے آوارہ کس لئے جاری ہے تن سے خون کا فوارہ کس لئے
بیتاب ہے میرا دل صد پارہ کس لئے خالی پڑا ہے دیر سے گہوارہ کس لئے
کہتی ہیں آپ نہر پہ سارے جواں گئے
اچھا مجھے بتاؤ کہ اصغر کہاں گئے

☆☆☆☆☆

کوکب شادانی (کراچی)

ولادت ۱۱ر مارچ ۱۹۱۰ء۔ وفات ۱۹۹۴ء

نام سید محمد ایوب علی۔ تخلص کوکب، حضرت شاداںؔ بلگرامی کی شاگردی کے ناطے سے شادانی۔ جائے ولادت نگینہ سادات ضلع بجنور یو۔پی۔ والد گرامی کا نام سید محمد اسماعیل، والد کا سلسلۂ نسب سادات باہرہ سے اور مادر گرامی کا نسبی سلسلہ ساداتِ لکھنؤ سے تھا۔ کوکبؔ شادانی کو ننھیال کی طرف سے شاعری ورثے میں ملی تھی۔ اُن کے نانا اور نانی دونوں صاحبِ دیوان شاعر تھے"۔ کسی ایک گھر میں شوہر اور بیوی دونوں کا صاحبِ دیوان شاعر ہونا جتنی غیر معمولی اور توجہ طلب بات ہے اس طرح ان دونوں بزرگوں کے نام کا تذکرہ نہ ہونا بھی توجہ طلب ہے۔

تعلیم : اورینٹل کالج لاہور سے ۱۹۲۹ء میں ایم۔اے (فارسی)
آگرہ یونیورسٹی سے ۱۹۳۲ء میں ایم۔اے (انگریزی)
ناگپور یونیورسٹی سے ۱۹۳۳ء میں ایم۔اے (تاریخ اسلام)

برصغیر کے اُردو شعراء میں دو نام ایسے ہیں جو زمانی اور مکانی فاصلوں کے باوجود ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں ڈاکٹر عندلیب شادانی کا نام لیتے ہی کوکبؔ شادانی یاد آتے ہیں اور کوکبؔ شادانی

کاذکرعندلیبِ شادانی کی یادوں کو تازہ کرتا ہے۔ یہ شاید وابستگی کا سلسلہ ہے، دامن تھامنے کا مرحلہ ہے، محبت کا انعام ہے۔ صاحبانِ صدق وکمال کی محبت ہو تو موت کو شہادت کا درجہ مل جاتا ہے۔ فنا کو بقا کا رتبہ مل جاتا ہے۔

کوکب شادانی اُردو، انگریزی اور فارسی زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ انگریزی زبان میں ان کی دو کتابیں بے نظیر ہیں۔ خلافت راشدہ کے دور میں حضرت علیؑ نے جو فیصلے کیے وہ نہ صرف اسلام کی تاریخ میں بلکہ انسانی تاریخ میں عدل وانصاف کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ کوکب شادانی نے ان فیصلوں پر انگریزی میں کتاب لکھ کر انگیریزوں اور مغربی اقوام کو جو عدل وانصاف کے گیت گاتی ہیں، آئینہ دکھایا ہے اور ثابت کیا ہے کہ خانوادۂ رسالت سے بہتر انسانی حقوق کی پاسداری اور عدل وانصاف کوئی اور نہیں کرسکتا۔ دوسری کتاب امام حسینؑ پر ہے جس میں فرزند رسول کو وارث نبی ہونے کے علاوہ انسانیت کی کسوٹی پر پرکھ کر ثابت کیا ہے کہ حسینؑ کے مدمقابل جو بھی ہو وہ انسانیت کے دائرے میں نہیں رہتا۔

شاعری میں بھی کوکب شادانی نے بھرپور شاعری کی ہے۔ ۱۹۲۴ء میں اُنہوں نے (بعمر ۱۴ سال) پہلا مرثیہ ''لو وہ تپتے ہوئے صحرا میں گلاب آ پہنچا'' کہا، اُنہوں نے نظم کی دوسری اصناف میں جو شاعری کی وہ طبع ہو چکی ہے یہ شاعری درج ذیل مجموعوں پر مشتمل ہے۔

(۱) نوائے وقت (۲) جہانِ آرزو (۳) آوازِ شعور

(۴) آہنگِ خرد (۵) ردِ عمل۔

ہر چند کہ ہر کتاب میں ان نظموں کی 'زمرہ بندی' کی گئی ہے لیکن صنف شاعری کے اعتبار سے ہم انہیں نظمیں یا منظومات ہی کہیں گے۔ کوکب شادانی کی فارسی زبان میں تخلیقات میں 'مجلس اقبال' اہم کتاب ہے۔ نثر نگاری میں ایک ناول ''گل بانو بیگم'' ہے۔ تعجب اس بات پر ہوتا ہے جس صنف سخن میں اُنہوں نے ابتدا کی اور انتہا کی یعنی ''مرثیہ'' وہی صنف سخن اُن کی پہچان ہونے کے باوجود غیر مطبوعہ ہے۔ یعنی اُن کے مرثیے غیر مطبوعہ ہیں۔

ناقدین نے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۵ء ربع صدی میں مرثیہ گوئی کو آگے بڑھانے والے شعراء میں کوکب شادانی کو شمار کیا ہے۔ موضوعاتی مرثیے کہنے والے شعرا کی تعداد مرثیہ گو شعراء میں زیادہ نہیں ہے۔ ان گنے چنے ناموں میں بھی کوکب شادانی کا نام نمایاں ہے۔ ''نور وظلمت''، خونِ

شہادت، احسان، کمالِ بشریت، پیکرِ نور، حیات، پیغامِ حسینؑ اُن کے مقبول موضوعاتی مرثیے ہیں“

سید الشہدا امام حسینؑ کی قربانی ایک طرف انسانی اقدار کی سربلندی اور حقوق انسانی کا اعلان ہے تو دوسری طرف اللہ کی حاکمیت کا بالعمل اقرار ہے۔ حسینؑ کا غم عرفانِ خداوندی دیتا ہے اس حوالے سے کوکبؔ شادانی بھی اللہ کی حاکیت کے سامنے سربسجود اور اُس کی قدرت کاملہ کے دل سے قائل تھے جس کا اظہار اُن کے مراثی میں نمایاں ہے لیکن وہ وحدت الوجود کو ماننے کے باوجود 'ہمہ اوست' کے قائل نہیں تھے اور اللہ نے بشر کو جو خود مختاری دی ہے اس کے علمبردار تھے۔

بشر جو چاہے تو عالم میں انتخاب بنے یہ اپنی ذات میں دریا بنے، سراب بنے
بنے گناہ کہ سر تا بپا ثواب بنے اُٹھے تو جانِ حقیقت، گرے تو خواب بنے
یہ اختیار خدا نے اسی کو بخشا ہے
یہ امتیاز فقط آدمی کو بخشا ہے

کوکبؔ شادانی نے اس انسانی اختیار کو مطلق العنانی کی بجائے تابع رضائے الٰہی قرار دیا ہے اور بشریت کو یاد دلایا ہے کہ اختیار کے باوجود بشر کی کچھ حدود ہیں اور ان حدود کو قائم کرنے والی طاقت، خدا کی طاقت ہے۔

ہر اک لکیر مگر کہکشاں نہیں بنتی جہاں میں گرد کہیں کارواں نہیں بنتی
خزاں بہار، زمیں آسماں نہیں بنتی تڑپ نہ ہو تو جبیں آستاں نہیں بنتی
یہاں بنائے ترقی و ناشناسی ہے
عروجِ نفس کا باعث خدا شناسی ہے

ادیان عالم نے بھی یہی بتایا ہے اور تاریخ انسانی نے بھی شہادت دی ہے کہ ازل سے ہی دو قوتیں تخلیق کی گئی ہیں۔ ایک کا نام حق اور دوسری کا نام باطل ہے۔ یہ قوتیں بشر کو عظمت و ذلت کی طرف لے جاتی ہیں۔ حق کا ساتھ دینے والے کامیاب اور باطل کے پرستار ناکام ہوتے ہیں۔ ابراہیمؑ اور نمرود، موسیٰؑ اور فرعون، حسینؑ اور یزید اس کی روشن مثالیں ہیں۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اس صداقت ابدی کا اظہار ایک بیت میں کیا ہے۔

موسیٰ و فرعون، شبیر و یزید
ایں دو قوت از حیات آمد پدید

کوکبؔ شادانی نے اس کی وضاحت میں حروف آخر نوع انسانی کے سامنے رکھ دیے :

حسینؑ عہد پہ قائم، یزید عہد شکن　یزید صید زمانہ، حسینؑ صید افگن
حسینؑ جان تجمل، یزید روحِ فتن　حسینؑ روحِ دو عالم، یزید ننگِ زمن
یزید حرص کا بندہ، حسینؑ بندۂ حق
یزید محفلِ ظلمت، حسینؑ بزمِ شفق

سید ضمیر اختر نقوی رقم طراز ہیں کہ کوکب شادانی نے ۱۹۵۰ء میں پہلا مرثیہ کہا اور کراچی کے حسینیہ ایرانیاں میں پڑھا۔　(اردو مرثیہ پاکستان میں)

لیکن ڈاکٹر ہلال نقوی کی تحقیق کے مختلف ابواب سے راقم الحروف نے جو فہرست مرتب کی اُس کے مطابق کوکب شادانی نے ۱۹۲۴ء سے ۱۹۴۶ء کے عرصے میں مندرجہ ذیل مرثیے کہے ہیں ۔

لو وہ تپتے ہوئے صحرا میں گلاب آ پہنچا	۱۹۲۴ء
مدینے والے ہوئے جب سے کربلا والے	۱۹۳۲ء
اب بھی خورشید درخشاں ہے زمین کربلا	۱۹۳۵ء
حمد اس خدا کی جس نے بشر کو زبان دی	۱۹۴۲ء
ختم تفسیر شہادت، کربلا میں ہوگئی	۱۹۴۵ء
کعبے میں پھر چراغ جلایا حسینؑ نے	۱۹۴۵ء
عجیب وقت تھا جب کربلا میں شام ہوئی	۱۹۴۶ء

اس فہرست کے مطابق ۱۹۴۶ء کے بعد سے ۱۹۵۴ء تک اُن کا کوئی مرثیہ درج نہیں ہے۔ ۱۹۴۶ء کے بعد کا سال ۱۹۴۷ء تو ایک قیامت صغرا کا سال تھا۔ اس سال جشن آزادی کے چراغ انسانی لہو سے جلائے گئے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں کوکبؔ شادانی ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ کراچی میں ہجرت کر کے آنے والوں کے لئے مشکلات ہی مشکلات تھیں۔ دو تین سال کا عرصہ کسی شاعر کا مرثیہ نہ کہنا قرین قیاس ہے (حالانکہ مرثیہ ابتلا و مصائب کا بیان ہی ہوتا ہے) مگر پھر بھی یہ گنجائش ضرور ہے کہ شاعر حالات کے کرب میں گرفتار رہا ہو۔ اس گنجائش کے تحت یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان آ کر کوکب شادانی نے ۱۹۵۰ء میں پہلا مرثیہ کہا ہو— لیکن اس مرثیے کی نشاندہی نہیں کی ہے کہ کونسا مرثیہ تھا۔ البتہ ہلال نقوی کے مطابق کوکب شادانی کا پاکستان میں

پہلا مرثیہ ؎

نقشِ کہن، نقش وجوبی بھی ہے امکانی بھی (۱۹۵۴ء)

وہ بھی اک وقت تھا، جب وقت کی تفہیم نہ تھی (۱۹۵۷ء)

خدا کو جب ہوئی تخلیق دو جہاں منظور (۱۹۵۷ء)

یوں تو رہِ آساں، رہِ دشوار نہیں ہے (۱۹۵۸ء)

جو شہیدرہِ تسلیم و رضا ہوتے ہیں (۱۹۵۸ء)

ملا ہے یوں تو زمانے کو ارمغانِ حیات (۱۹۵۹ء)

۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۳ء تک پھر کسی نقاد نے کوکب شادانی کے کسی مرثیہ کا ذکر نہیں کیا۔ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۶ء تک تین مرثیوں کا ذکر آتا ہے اور پھر مکمل خاموشی — جبکہ اُن کا انتقال ۱۹۹۴ء میں ہوا ہے۔ کیسی بدنصیبی ہے کہ ایک روشن چراغ بجھنے سے پہلے ہی لاعلمی کے اندھیروں نے آگہی کی رو کا راستہ روک لیا تھا۔

☆☆☆☆☆

وقار سبزواری (کراچی)

پیدائش ۱۹۳۴ء (بنارس)۔ وفات ۲۴ مارچ ۱۹۹۴ء (کراچی)

نام سید بشیر الدین حیدر، قلمی نام وقاؔر سبزواری۔ والد کا اسم گرامی سید فخر الدین حیدر۔ وقار سبزواری نے ۱۹۵۱ء میں ہریش چندرا انٹر کالج بنارس سے میٹرک پاس کیا — ہندوستان میں زمینداری کے خاتمے کے بعد وقار اپنے بڑے بھائی نصیؔر بنارسی اور اہل خانہ کے ساتھ کراچی آگئے، کراچی بورڈ آف ایجوکیشن سے ایف۔ اے اور کراچی یونیورسٹی سے بی۔ اے، اور ایم۔ اے (اسلامک سٹڈیز) پاس کیا۔ پہلی ملازمت نیشنل بینک آف پاکستان میں اور بعدہٗ آر۔ سی۔ ڈی بال بیرنگ لمٹیڈ کراچی میں منیجر ہو گئے۔

شاعری کا آغاز طالب علمی کے دور میں جب بنارس میں تھے اسی وقت ہو گیا تھا — اُن کے برادر بزرگ حضرت نصیؔر بنارسی کا کہنا ہے کہ:

> "وقاؔر اچھے ذاکر اور خوش فکر شاعر تھے۔ مرثیہ، سلام، منقبت، قصیدہ، قطعات، غزل سب ہی میں طبع آزمائی کی زود گو تھے اور اپنے کلام

کو محفوظ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ منکسر المزاج تھے اور بغیر کسی حرص و تحریص کے محفلیں اور مجالس پڑھ دیا کرتے تھے۔ کسی کی فرمائش کو رد نہیں کرتے تھے۔ (مکتوب بنام عاشور کاظمی بتوسل کوثر الہ آبادی)

وقار سبزواری نے چار مرثیے کہے اُن میں سے ایک مرثیہ ''شریکۃ الحسین''، فضل فتحپوری کی تالیف ''فکر و فغاں'' ناشر انجمن سفینۂ ادب کراچی (مطبوعہ ۱۹۷۵ء) کے حوالے سے سامنے آیا۔ اس مرثیے میں سیدہ زینبؑ کا منظوم تعارف، ارشادات محمدؐ و آل محمدؐ اور تاریخ کربلا کے حوالے سے کرایا گیا ہے۔ بعض بند تو لاریب ایسے ہیں کہ جن پر بہت سے مراثی قربان کئے جاسکتے ہیں۔ مرثیے میں تیسرے ہی بند سے شہزادی کا ذکر شروع ہو جاتا ہے ۔

ساز عالم پہ جو اک نغمۂ آزادی ہے
حرّیت جس کی قلمرو ہے وہ شہزادی ہے

بعد شبیر، شہ کرب و بلا ہے زینبؑ قافلے والوں کی اب راہنما ہے زینبؑ
راہ معبود میں راضی برضا ہے زینبؑ [۳] اہل عالم کو بتایا ہے کہ کیا ہے زینبؑ
اس کے اظہار میں واللہ تردّد کب ہے
گر نہیں شبرؑ و شبیرؑ تو اب زینبؑ ہے

ظلمتِ کفر میں اک نور سحر ہے زینبؑ حق یہ ہے قبلۂ ارباب نظر ہے زینبؑ
گلشنِ فاطمہ زہراؑ کا ثمر ہے زینبؑ [۱۲] کفر کے واسطے شعلہ ہے، شرر ہے زینبؑ
دینِ احمد ہے اگر پھول تو یہ شبنم ہے
غیض میں آئے تو ضیغم کی طرح برہم ہے

آسماں دین ہے تو کاہکشاں ہے زینبؑ کاروانِ حرمِ پاک کی جاں ہے زینبؑ
دینِ اسلام کی اک روحِ رواں ہے زینبؑ [۱۴] دیں کی پیشانی پہ سجدے کا نشاں ہے زینبؑ
جب بھی مجلس میں کبھی ذکرِ امام آتا ہے
لب پہ بیساختہ زینبؑ تیرا نام آتا ہے

صبر کی راہ میں اللہ رے تیرا استقلال جرأتوں پر تیری ہے آج بھی اک استدلال
خوں محمدؐ کا رگوں میں ہے خوشا یہ اقبال [۱۵] دخترِ حیدرِ کرار ہے، زہراؑ کی مثال

دیکھا پیدا جو ہوئیں احمد مختار کے گھر
بیاہ کے بعد ملا جعفر طیار کا گھر

عالم ایسی کہ درِ علم کو خود نازرہا اُن کو شبیرؔ نے زہراؑ کی جگہ پر سمجھا
عابدہ ایسی کہ خود فخر عبادت کو ہوا ساجدہ ایسی کہ سجادؔ نے خود فخر کیا
دینِ احمد کی ہراک حال میں طاعت کی ہے
قیدخانے میں بھی اللہ کی عبادت کی ہے

آئی دربار میں گویا ہوئی زہراؑ کی طرح اہل دربار کو چپ کردیا موسیٰ کی طرح
دین کے جسم میں جاں ڈالدی عیسیٰؑ کی طرح ۱۹ کفر والحاد کے بُت توڑے ہیں بابا کی طرح
شعلے لپکیں چمنِ دینِ محمدؐ پہ اگر
آئیں میداں میں براہیمؑ کی وارث بن کر

کاروانِ حرمِ تشنہ لباں لے کے چلی ہر جگہ نامِ امامِ دوجہاں لے کے چلی
لشکرِ صبر و شجاعت کا نشاں لے کے چلی ۲۴ اک ضعیفہ تھی مگرعزمِ جواں لے کے چلی
جادۂ حق میں نہ ایسا کبھی راہی دیکھا!
اے فلک تونے بھی کب ایسا سپاہی دیکھا

جسکے قدموں کے نشاں ملتے ہیں سیاروں میں سر برہنہ اُسے لایا گیا بازاروں میں
کوفہ و شام کے لائی گئی درباروں میں ۲۵ کوئی ہمدرد نہ تھا اِتنے ستمگاروں میں
ایسی ہستی کو زمانے نے کھلے سر دیکھا
اے فلک تو نے یہ منظر بھلا کیونکر دیکھا

قیدیوں کا بازارِ شام میں جانا۔ زینبؑ کے خطبات۔ اہل کوفہ وشام کی بے خبری، سیدہ زینب کے خطبوں کا اثر، وقار سبزواری نے سارے تاریخی واقعات کو نظم کیا ہے، مرثیے کے آخری حصے میں زینب کے جلال کا منظر پیش کیا ہے ۔

طوق و زنجیر ہے کیا ہم کو ہو کیوں اس کا غم
کاٹ دیتے ہیں اسے صبر کی تلوار سے ہم

بد دُعا میں جو کروں نوح کا طوفان اُمڈے میں جو فریاد کروں عرشِ خدا کانپ اُٹھے
حرمِ دُنیا کے ہیں آنکھوں پہ تمہاری پردے ۳۱ بنتِ حیدرؑ نہیں مجبور کسی بندش سے

مرضیٔ شہ کی ہوں پابند زباں دیتی ہوں!
مثلِ عباسؑ ہوں چُپ ، جاؤ اَماں دیتی ہوں

دور ناقے سے ہر اک دشمنِ داور بھاگا پھینک کر تیر و تبر کوئی بداختر بھاگا
پاؤں رکھ کر کوئی بیساختہ سر پر بھاگا[۳۲] جیسے خیبر میں دَمِ معرکہ لشکر بھاگا
بولے سب آج پھر ہنگامِ جدال آیا ہے
یہ تو زینبؑ نہیں حیدرؑ کو جلال آیا ہے

بڑھ کے اَب کوئی بھی گفتار کرے تو جانیں کوئی زینبؑ سے نظر چار کرے تو جانیں
اِس گھڑی اب کوئی تکرار کرے تو جانیں[۳۳] اپنے اِلحاد کا اقرار کرے تو جانیں
جیسے بھری ہوئی دربار میں زہرا آئیں
ایسے تیور سے یہاں زینبؑ کبریٰ آئیں

ناقدین نے وقارؔ سبزواری پر زیادہ نہیں لکھا۔ اُن کے چار مراثی میں سے ''شریکتہ الحسین'' کے علاوہ ایک اور مرثیہ ''رنگ شفق'' سامنے آیا ہے یہ مرثیہ بھی انجمن ''سفینۂ ادب'' نے ہی ۱۹۹۳ء میں شائع کیا ہے — دل کہتا ہے کہ جس جس شاعر نے سیدہ زینب کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے اور اپنے الفاظ میں شہزادی کا تعارف کرایا ہے یقیناً علی کی بیٹی اُن شاعروں کا تعارف کرائیں گی۔ وقارؔ سبزواری اور ان کا یہ مرثیہ اس فہرست میں شامل ضرور ہوگا (انشاءاللہ)۔

وقار سبزواری ۲۲ر مارچ ۱۹۹۴ء کو اس جہان فانی کو چھوڑ کر اپنے ممدوح مولا حسین کی بارگاہ میں چلے گئے۔ اُن کی لوح مزار پر کوثر الہ آبادی کا یہ قطعہ ان کا سنہ وفات بتا رہا ہے۔

حوریں جنت کو سجاتے ہوئے یہ کہتی ہیں
تھا جو اس عہد میں بے مثل و نظیر آپہنچا
اور ہے مابینِ فلک ہاتفِ غیبی کی ندا
نوحہ خوانِ شہ ابرار ، بشیر آپہنچا
۱۹۹۴ء

☆☆☆☆☆

مرتضیٰ اظہر رضوی

دربھنگہ (بہار)

ولادت ۵ ۱۹۳ء۔ ۱۹ر جولائی ۱۹۹۴ء

ولادت صوبۂ بہار کے ایک مردم خیز خطہ (دھیاواں) ضلع چھپرہ میں ہوئی) اور گورکھپور میں (برادر نسبتی کے گھر) انتقال ہوا۔ پروفیسر اجتبیٰ کے اکلوتے فرزند تھے۔ پروفیسر اجتبیٰ رضوی مرحوم علامہ جمیل مظہری اور حضرت پرویز شاہدی کے ہم عصر تھے۔ اجتبیٰ رضوی شاعر تھے مگر انہوں نے مرثیے نہیں کہے۔ یہ شرف پروفیسر مرتضیٰ اظہر رضوی کو حاصل ہوا ـــ

مرتضیٰ اظہر رضوی ملت کالج دربھنگہ میں فلسفہ کے اُستاد تھے۔ اُن کے دادا کا اسم گرامی اظہر حسین تھا۔ اسی نسبت سے انہوں نے اپنا تخلص اظہر رکھا۔ پروفیسر مرتضیٰ اظہر رضوی نے سات مرثیے کہے ہیں۔ ساتواں مرثیہ اُنہوں نے اپنے انتقال سے گیارہ دن قبل کہا ـــ انتقال سے چند ماہ قبل اُن کی قوت گویائی سلب ہوگئی تھی اور لکھ کر اظہار مدعا کیا کرتے تھے ـــ آخری مرثیے میں اس کرب کی پکار سنائی دیتی ہے جس سے وہ دوچار ہوئے تھے۔

ہاں اے زباں خموش ہوئی ہے تو غم نہ کر کیا حال دل کا ہے کبھی اس کا الم نہ کر
آنکھوں کو اپنی، اپنی مصیبت پہ نم نہ کر آلودہ آب شور سے یہ جامِ جم نہ کر
جو تیرے سامعین تھے مجلس سے اُٹھ گئے
وہ لوگ جو ذہین تھے مجلس سے اُٹھ گئے

علامہ اجتبیٰ سا مقرر کہاں گیا شبیر سا فقیہہ و مفکر کہاں گیا
مہدی سا منطقی و مفکر کہاں گیا بزمِ نگاہ و دل کا جواہر کہاں گیا
صوفی بھی تھے، حکیم بھی تھے، فلسفی بھی تھے
مومن بھی تھے، فقیہہ بھی تھے، متقی بھی تھے

پروفیسر مرتضیٰ اظہر رضوی کے ساتوں مرثیے اُردو کی نامور شخصیت جابر حسین (اُردو مرکز۔ پٹنہ) نے شائع کیے ہیں۔ مرتضیٰ اظہر رضوی کی قوت گویائی ختم ہونے پر جابر حسین نے جن جذبات کا اظہار کیا وہ مرتضیٰ اظہر رضوی کے مجموعہ مراثی "نوائے سکوت" کے پیش لفظ میں شامل ہیں۔ یہ جذبات جابر حسین کی دردمندی اور مرتضیٰ اظہر رضوی کی شخصیت کے محاسن کا دیباچہ ہیں۔

"مجھے جب مرتضیٰ اظہر رضوی کی قوت گویائی سلب ہوجانے کی افسوسناک خبر ملی اور

اُن کی بے چینیوں کا علم ہوا تو پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے خود میں نے اپنی گویائی کھودی ہو۔ ایک ایسی شخصیت جس کی گفتگو میں فکر و فلسفہ کے پیچیدہ مسائل بھی سہل ہو جایا کرتے ہوں، جو مختلف موضوعات پر اپنی بے پناہ فطری تخلیقیت کی بنا پر بے لاگ تبصرے کا فن جانتی ہو۔ ایسی شخصیت کے اچانک خاموش ہونے پر کسے کرب کا احساس نہیں ہوگا۔ ایسی شخصیت کے اچانک خاموش ہو جانے سے اپنی قوت گویائی پر فخر کرنے کا جو غرور ہم میں سے چند لوگوں نے پال رکھا ہے اس پر حرف آتا ہے۔" (جابر حسین)

میری طرح جابر حسین بھی بعض ناقدین کے اس خیال سے متفق نہیں ہیں کہ مرثیے کو میرانیس نے جس بلندی تک پہنچا دیا ہے اس سے آگے کا سفر آج تک طے نہیں ہو سکا۔ یعنی مرثیے کا ارتقا رک گیا ہے — جابر حسین نے اپنی اس رائے کا اظہار پروفیسر مرتضٰی اظہر رضوی کے مجموعہ مراثی 'نوائے سکوت' کے دیباچے میں کیا ہے۔ اُنہوں نے لکھا ہے کہ:

> "یہ الزام ناقدین کی ذہنی مفلسی اور مطالعہ کی کمی کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کو نجم آفندی، شاد عظیم آبادی، بہار حسین آبادی، علامہ جمیل مظہری اور مرتضٰی اظہر رضوی کے مراثی دعوت مطالعہ دیتے ہیں.................الخ"

مرتضٰی اظہر رضوی نے پہلے مرثیے سے ساتویں مرثیے تک کے سفر میں کربلا کی زندگی کو سبق آموزی کے لئے نمونے کے طور پر پیش کیا ہے۔ اُن کے مرثیوں میں پہلے مرثیے سے ساتویں مرثیہ تک فکر کی ارتقاء کی پوری آئینہ داری نظر آتی ہے۔ اُن کا پہلا مرثیہ ہی اُن کی وسعتِ نظر اور ترقی پسند و ترقی پذیر مزاج کا نمائندہ ہے جس کے چہرے سے سراپا تک کے کچھ بند درج ذیل ہیں ۔

جب آدمی کو قوتِ تسخیر دی گئی ذرّے کو مہر و ماہ کی تنویر دی گئی
آنکھوں کو خواب، خواب کو تعبیر دی گئی لب کو دعا، دعاؤں کو تاثیر دی گئی
دل کو ملا سکون بھی اور انتشار بھی
کچھ جبر بھی عطا ہوا، کچھ اختیار بھی
پوشیدہ تھے مزاجِ عناصر میں ظلم و جور سطحِ جسد پہ اُن کا تقاضہ ہی تھا کچھ اور

پیدا ہوئی جدال کی خو، سرکشی کا طور [۵] اس واسطے شروع ہوا ابتلا کا دور
اس ابتلا میں دولت سمع و بصر ملی
یعنی اسے ہدایتِ قلب و نظر ملی

جو لوگ کامیاب ہوئے امتحان میں لاریب اہل شکر ہوئے اس جہان میں
آزاد ہیں قیودِ زمان و مکان میں [۸] سورہ کلام پاک میں ہے اُن کی شان میں
خاکی جسد میں رکھتے ہیں وہ نور کا مزاج
ملتا ہے اُن کے جام سے کافور کا مزاج

ساقی اُٹھا کے لا تو ولائے علیؑ کا جام دے تیرگی کی بزم میں اک روشنی کا جام
ہر لحہ مرگِ وقت ہے، دے زندگی کا جام [۱۳] پھر تیرے میکدے میں چلے آگہی کا جام
دل میں پڑی ہوئی ہیں جو گرہیں وہ کھول دے
یعنی جنوں کی ہوش میں میزاں کو تول دے

وہ بادہ جس کا کیف ہے بے مثل و بے عدیل جس میں سرورِ کوثر و تسنیم و سلسبیل
جو تازگیٔ فکر و عمل کی بنے دلیل [۱۷] وہ بادہ جو مزاج میں کافور و زنجبیل
ہو جس پہ مہر سبطِ پیمبر کے نام کی
عباسؑ ابنِ ساقیٔ کوثر کے نام کی

مرتضیٰ اظہر رضوی کا دوسرا مرثیہ حضرت قاسم کی شہادت کے احوال پر ہے۔ اس مرثیے کے چند بند نقل کیے جا رہے ہیں جو رجز، جنگ اور شہادت کا منظر نامہ ہیں لیکن شاعر نے یہ احتیاط برتی ہے کہ خانوادۂ رسالت کی بیبیوں کے لبوں پر بین نہیں آئے۔ درد و کرب کا اظہار شاعر کی طرف سے ہوا ہے۔

جب اذن لے کر جنگ کا قاسم سوئے لشکر چلے شبرؑ چلے، حیدرؑ چلے، ہمراہ پیغمبر چلے
میداں کا نقشہ دیکھیے، حمزہ چلے، جعفر چلے [۱۵] کالے علم کھوئے ہوئے اعدائے بداختر چلے
شامی جو تھے نامی وہاں، نکلے وہ نعرہ مار کر
جرار پہنچا شیر سا، میدان میں للکار کر

کمسن ہے لیکن خوف کی ایک کیفیت لشکر میں ہے شوقِ عروسِ مرگ ہے، کرتا گلابی بر میں ہے

ہے نصرت حق کی خوشی مرنے کا سودا سر میں ہے عزم نبیؐ، زورِ علیؑ، جرّار کے پیکر میں ہے [۱۸]
ذرّے ستارے بن گئے میدان میں تنویر سے
کسبِ تجلّی بجلیاں کرنے لگی شمشیر سے

فوج گرانِ شام میں ارزق کے بیٹے چار تھے سرکش تھے دل آزار تھے، سرشور تھے، مکّار تھے
بدطینت و بدکار تھے، بد اصل و بدکردار تھے فوج ضلالت کیش کے چاروں پہ سالار تھے [۱۹]
نکلے صفوں کو چیر کر واں سے وہ دعویدار فن
تیغ دودم تولے ہوئے یاں سے بڑھے ابن حسنؑ

شہزادہ قاسمؑ، یکے بعد دیگرے ارزق شامی کے چاروں بیٹوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ اختصار کے پیشِ نظر وہ سارے بند حذف کیے جا رہے ہیں۔ اور ارزق سے جنگ کے بند نقل کیے جا رہے ہیں۔

بیٹوں حالت دیکھ کر واں سے بڑھا ارزق لعیں دل میں لئے چاروں کا غم، کف در دہاں، چیں بر جبیں
مانند خوں کچھ غیض سے کچھ غم سے آنکھیں سرخ تھیں ہر ہر قدم پر بار سے ظالم کے دھنستی تھی زمیں [۲۸]
ہاتھوں میں گرز گیو، تیغ خونچکاں تھی میان میں
فیل شریر و مست تھا ارزق نہ تھا میدان میں

اس سمت سے قاسم چلے، اس سمت سے ارزق بڑھا پہنچی جو ٹاپوں کی دھمک قلب زمیں ہلنے لگا
نیزہ ہلا کر قاسم ذی جاہ نے دی یہ صدا گھوڑا بڑھا، میداں میں آ، تلوار لے، جوہر دکھا
شیر خدا کے شیر میں لڑنے سے پہلے جان لے
تڑپتے ہوئے میدان میں لاشے ذرا پہچان لے

سن کر سخن ارزق نے لی غصہ میں کاندھے سے کماں چلّے سے جوڑا تیر وہ جو توڑ دے سنگ گراں
ڈوبا ہوا پھل زہر میں مانگے اجل جس سے اماں ناوک کے پر میں وہ فسوں گویا اُڑا لے جائیں جاں [۳۱]
وہ کھینچنے پایا نہ تھا چلّے میں رکھ کر تیر کو
یاں قاسم ذی جاہ نے چمکا دیا شمشیر کو

چلّہ کٹا تو ہاتھ میں گرز گراں لے کر چلا بھیگی پسینے سے جبیں، خفت سے رنگ رُخ اُڑا
گرز گراں کو تول کر مردود نے حملہ کیا یاں قاسم ذی جاہ نے رہوار کو کاوہ دیا [۳۲]

ارزق کے بار جسم سے رہوار کائی کھا گیا
دشمن گرا تو شیر کے لب پر تبسم آگیا

چمکا کے تیغ تیز واں ارزق نے اک نعرہ دیا جرار نے تلوار پر تلوار کو یاں لے لیا
بجلی کی صورت رخش کو میدان میں کاوا دیا[۳۴] اس زور کا حملہ کیا، ارزق لعیں گھبرا گیا
مارا کمر کا ہاتھ اک دو ہو کے ظالم گر گیا
ارزق ادھر مارا گیا، فوجوں کا منہ واں پھر گیا

مصائب کا انداز بیاں ۔

قاسم کی میت دیکھ کر، دل شاہ کا بے حال تھا ہر ذرہ ریگِ گرم کا خونِ جگر سے لال تھا
تیغوں سے ٹکڑے تھا بدن، نیزوں سے تن غربال تھا گھوڑوں کی ٹاپوں سے جری سر تا قدم پامال تھا
ٹکڑے ردا میں لاش کے میداں سے سرور لے چلے
بے ہات میت کے قدم صحرا پہ خط دیتے چلے

خیمے میں میت لا کے جب زیرِ علم رکھی گئی بہنوں کے دل میں درد اُٹھا، پھپھیوں کے لب پر آہ تھی
ماں لاشۂ فرزند پر شکر خدا کرنے لگی سینے میں دل سے تا جگر غم کی مگر اُتری چھری
ضبط الم میں امِ فردا کا جگر تھرا گیا
شکر خدا کے بعد آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا

☆☆☆☆☆

معجز سنبھلی :- سنبھل (مراد آباد)

ولادت ۱۸/اپریل ۱۹۱۰ء وفات ۱۹۹۴ء

نام سید معجز حسین، تخلص معجز، وطن سنبھل ضلع مراد آباد۔ (یو۔پی) بھارت۔ اوائل عمری میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تھا لہٰذا تربیت کے سارے فرائض مادر گرامی نے ادا کیے۔ ماموں کے زیر اثر جو خود بھی شاعر تھے اسکول کی زندگی کے دوران شعر گوئی کی طرف توجہ مبذول ہو گئی۔ ۱۱ برس کی عمر میں پہلی بار ایک نظم کہی۔ جوں جوں تعلیمی مدارج طے ہوتے رہے شاعری میں پختگی آتی گئی۔ ابتدا حضرت باغ سنبھلی سے شرف تلمذ پایا بعد میں حضرت متقی سرسوی کی نگاہ جوہر شناس میں آگئے تو شاعری پر نکھار آیا۔۔ اُردو کے ساتھ عربی اور فارسی زبان کی تعلیم و سند بھی حاصل کیں۔

غزل، نظم، قصائد، حمد و نعت، ترانے، سہرے، کم و بیش ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی، قومی اور سیاسی منظومات میں شہرت پائی۔

تصانیف:

(۱) افکار معجز (غزلیات) (۲) جذبات معجز (غزلیات) (۳) تحفۂ آخرت (حمد و نعت)

(۴) تحفۂ ربیع الاول (نعتیں) (۵) سفینۂ آخرت (نعتیہ کلام اور قطعات)

رثائی ادب میں (۶) غمِ عام (۷) صبح کربلا (۸) مصورِ کربلا (۹) معجز نما (۱۰) رہنمائے معجز۔ نوحہ سلام، قصائد، اور مسدس پر مشتمل ہیں۔

معجز سنبھلی نے مرثیے گوئی کی وادی میں قدم رکھا تو کلاسیکی روایات کی سختی سے پابندی کی۔ وہ مرثیہ کو مرثیہ رکھنے کے قائل ہیں اور عناصر مرثیہ کی سو فیصدی پاسداری کو اہم سمجھتے ہیں اسی لئے اُن کے مراثی میں جدید افکار نہیں ملتے جبکہ اپنی قومی اور سیاسی نظموں میں اُنہوں نے سیاسی، سائنسی اور سماجی مسائل کو بیان کیا ہے۔ اُنہوں نے چھ مرثیے کہے ہیں جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ اُن کا پہلا مرثیہ ۔ ''طلوع آج فلک پہ ہو آفتاب سخن'' ہے جو حضرت عباس کے احوال کا مرثیہ ہے۔ مرثیے کا آغاز دعائیہ ہے ۔

طلوع آج فلک پر ہو آفتابِ سخن الٹ دے چہرۂ پُر نور سے نقابِ سخن
دکھا دے جلوہ کہ اب ہو چکا حجابِ سخن نگاہ والے ذرا دیکھ لیں شبابِ سخن
لئے دلوں میں یہ ذوقِ جمال بیٹھے ہیں
کریں گے قدر کہ اہلِ کمال بیٹھے ہیں

نہیں شک اس میں کہ بالکل نئی ہے مشقِ سخن نہ ورثہ مرثیہ گوئی ہے میرا اور نہ فن
رہی جو رحمت رب الانام سایہ فگن ابھی تو نظم کا پھولے پھلے گا اور چمن
ہر اک شجر پہ نئے برگ و بار آئیں گے
ہر ایک شاخ پہ گُل بے شمار آئیں گے

مرثیے کے عناصر میں گھوڑے کی تعریف۔ تلوار کا ذکر، رخصت، رجز، جنگ، اور شہادت معجز سنبھلی کے مرثیوں میں علی الترتیب سب کچھ ہوتا ہے۔ رخصت کا بیان ملاحظہ ہو۔

غرض کہ لے کے رضائے امام عرش مقام سوار اسپ فلک سیر پر ہوا ضرغام

جب آئی دستِ زبردست میں فرس کی لجام مچل کے ہوگیا بے چین، رخشِ برق خرام
اُٹھا کے سینے کو مثلِ اسد روانہ ہوا
علم کے سائے کو سمجھا کہ تازیانہ ہوا

گھوڑے کی تعریف:

فرس، سوار کی شوکت سے شان سے واقف سوار، اسپ کی ہر آن بان سے واقف
یہ اس کے جسم سے، وہ اس کی جان سے واقف یہ اصل ونسل سے، وہ خاندان سے واقف
ہو بے نظیر نہ کیوں یہ فرس زمانے میں
کہ ہوش اس نے سنبھالا اسی گھرانے میں

تلوار کی تعریف:۔

یہ سیف وہ ہے اشاروں پہ جو خدا کے چلی نبی کے حکم میں، کہنے میں مرتضٰی کے چلی
چلی جہاں بھی یہ قصدِ امام پا کے چلی مٹا کے کفر کو اسلام کو بچا کے چلی
فرشتہ عرش سے لاسیف لے کے آیا ہے
علیؑ کے ساتھ یہ اس نے خطاب پایا ہے

عباسؑ کی جنگ کے تفصیلی بیان کے بعد آخری منظر:

جب آتا دیکھتے تھے مشک کی طرف کوئی تیر وہ روک لیتے تھے سینے پہ ابن خیبر گیر
یہ ایک بیکس و تنہا، ہزارہا وہ شریر اکیلا فوج کے نرغے میں گھر گیا دلگیر
اُدھر یہ مشک و علم پر نثار ہوتے تھے
عقب سے وار ادھر بے شمار ہوتے تھے
علم کے گرنے کا عباس کو ابھی تھا الم لگایا مشک پہ اک بے حیا نے تیر ستم
کچھ ایسا پانی کے بہنے سے ہوگئے پُر غم اک آہ کر کے ہوئے پشت راہوار پہ خم
گرے یہ کہہ کے شہ حق شناس کے صدقے
سکینہ تیرا چچا تیری پیاس کے صدقے

معجز سنبھلی کا دوسرا مرثیہ جناب علی اکبر کے احوال کا مرثیہ ہے۔ ''اے قلم آج ہو پھر سیر گلستان سخن'' معرکہ کربلا میں زیادہ روایات یہ ہیں کہ علی اکبر حضرت عباس کے بعد شہید ہوئے

اور کچھ روایات ایسی ہیں کہ بنی ہاشم میں علی اکبر نے شہادت کے لئے پہل کی تھی۔ معجز نے اسی روایت کو بنیاد بنایا ہے ۔

صبح عاشور کا راوی نے بیاں ہے یہ لکھا　طاعت حق میں تھے مصروف امامِ دوسرا
ناگہاں فوج عدو میں طبل جنگ بجا　آئی میداں سے مبارز طلبی کی جو صدا
ناصرانِ شہ ابرار جدا ہونے لگے
شاہ پر شاہ کے انصار فدا ہونے لگے

باپ کو رخصت آخر کا بجا لا کے سلام　یاعلیؑ کہہ کے چڑھا گھوڑے پہ فرزندِ امام
یوں روانہ ہوا غازی طرف لشکر شام　جس طرح صید پہ بپھرا ہوا جائے ضرغام
طاہر وہم و گماں سے بھی عقاب آگے تھا
راہ بتلانے کو اکبرؑ کا شباب آگے تھا

معجز سنبھلی کا تیسرا مرثیہ ۔ ''سرمایہ حیات ولائے حسینؑ ہے'' رفیقان حسین علیہ السلام کے احوال کا مرثیہ ہے جو روایتی مرثیہ ہے اور شاعرانہ اسلوب سے مالا مال ہے ۔

سرمایہ حیات ولائے حسینؑ ہے　سرنامۂ صلوٰۃ ولائے حسینؑ ہے
عقبیٰ کی کائنات ولائے حسین ہے　بخشندۂ نجات، ولائے حسینؑ ہے
جس کا عمل مطابق حکم امام ہے
واللہ اس پہ آتش دوزخ حرام ہے

ان کا چوتھا مرثیہ ۔ ''افسانہ حیات کا عنوان ہے وفا'' جناب حُر کے احوال کا مرثیہ ہے تقریباً سبھی مرثیہ گو شعراء نے ''وفا'' کو حضرت عباسؑ سے منسوب کیا ہے اور عباسؑ کو وفا کی منزل آخر قرار دیا ہے۔ لیکن معجز سنبھلی نے اپنے اس مرثیے میں حر کی وفاداری کی منظر کشی کی ہے اور اُنہیں تمغۂ وفاداری دیا ہے۔ حضرت حُر کا جذبہ انمول ہے۔ اس پر یہ کرم کہ امام عالی مقام نے حر کی خطا کو معاف کیا اور اُنہیں جنت کی بشارت دی لیکن حر کا رتبہ اور اُن کی بڑائی ان کا پچھتاوا ہے۔ ندامت ہے اور جاہ و حشم کو چھوڑ کر امام مظلوم کی خدمت میں حاضر ہو کر جام شہادت پینا ہے۔ پچھتاوے کو بہر حال وفا نہیں کہا جا سکتا۔ نادم ہونے کو بھی وفا نہیں کہا جا سکتا۔۔۔ عباس کی وفاداری کے مقابل دنیا میں وفاداری اور وفا شناسی کی مثال نہیں ہو سکتی۔ غالباً ندرت کی تلاش میں معجز سنبھلی

نے کربلا میں وفا کو حضرت حرؑ کے نام لکھدیا۔ بہر حال اُن کے مرثیے کا آغاز وفا سے ہوتا ہے ۔

افسانہ، حیات کا عنوان ہے وفا اہلِ وفا کی زیست کا سامان ہے وفا
الفت اگر ہے دین تو ایمان ہے وفا کہتے ہیں سچ کہ دوست کی پہچان ہے وفا
دامن وفا کا اہل ہم چھوڑتے نہیں
سر بھی کٹے تو اُن کے قدم چھوڑتے نہیں

بابِ کتابِ عشق کی ہے ابتداء، وفا تاریخِ ضبط و صبر کی ہے انتہا وفا
روحِ روانِ خُلق تو جانِ حیا وفا انساں کے کام آتی ہے بعدِ فنا وفا
حُر کے لئے نجات کا پروانہ بن گئی
ایسی وفا کہ سرخیٔ افسانہ بن گئی

معجز سنبھلی کا پانچواں مرثیہ ''قرآن اور حسینؑ'' ہے، ۔ قرآن اور حسین دل وجاں ہیں دوستو'' قرآن اور حسینؑ'' یا'' حسینؑ اور قرآن'' کے موضوع پر دلورام کوثری کا مرثیہ بھی ہے اور ڈاکٹر عظیم امروہوی نے بھی'' قرآن اور حسینؑ'' کے زیرِ عنوان مرثیہ کہا ہے۔ یہ دونوں مرثیے، مرثیہ گوئی کی تاریخ کے سنگ میل ہیں۔ معجز سنبھلی کا مرثیہ بھی اسی سمت سفر کی کہانی ہے ۔

قرآں کلام حق ہے تو حق کی صدا حسینؑ قرآن اک سفینہ ہے اور ناخدا حسینؑ
قرآن دین، دین نبی کی بقا حسینؑ قرآن معجزہ ہے تو معجز نما حسینؑ
قرآن گر بقا ہے نبی کے اصول کی
ہے زندگی حسینؑ سے دینِ رسولؐ کی

معجز سنبھلی کا چھٹا مرثیہ '' کربلا اک حسیں کردار کا آئینہ ہے'' ہے۔

معجز سنبھلی کلاسیکی مرثیے کی عظمت کے نگہبان ہیں اور اُن کا شمار مرثیے کے نمائندہ شعراء میں ہوتا ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔

☆☆☆☆☆

بشیر جعفری:- (کراچی)

پیدائش ۱۹۳۰ء (جالندھر)۔ وفات ۱۹۹۵ء (کراچی)

نام بشیر حسین جعفری، تخلص بشیر، وطن جالندھر مشرقی پنجاب۔، والد کا اسم گرامی غلام

عباس۔ تعلیمی اعتبار سے میٹرک پاس تھے۔ بشیر جعفری کے سوانحی حالات اُن کے فرزند مظہر جعفری ساکن کراچی نے ارسال کئے ہیں۔ مظہر جعفری خود بھی شاعر ہیں۔ اُنہوں نے لکھا ہے کہ اُن کے دادا غلام عباس تقسیم ہند سے قبل ہندوستان میں پٹواری تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا تو اُن کے والد بشیر حسین جعفری کی عمر ۱۷ برس کی تھی کہ یہ گھرانا پاکستان آ گیا۔ کچھ دنوں لاہور اور فیصل آباد میں گذارنے کے بعد بشیر جعفری ۱۹۶۰ء کے عشرے میں کراچی آ گئے۔

مظہر جعفری نے لکھا ہے کہ اُن کے بابا بشیر جعفری نے پنجاب میں قیام کے دوران ہی شاعری، سوزخوانی، نوحہ خوانی کے ساتھ ساتھ پنجابی زبان میں ذاکری شروع کردی تھی۔ کراچی آئے تو رثائی فضا ملی اور اُن کی مصروفیت اور بڑھ گئیں وہ مجلس و ماتم کے ہر پروگرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔۔۔ بحیثیت شاعر اُنہوں نے نوحہ، سلام، منقبت کے ساتھ ساتھ مرثیہ نگاری بھی کی ہے۔۔۔ مظہر جعفری نے بشیر جعفری مرحوم کے ایک مرثیے کے چند بند نمونہ کلام کے طور پر ارسال کئے ہیں مگر یہ نہیں لکھا کہ اُنہوں نے کل کتنے مرثیے کہے ہیں۔

یارب عطا ہو دولت شعر و سخن مجھے
اہلِ قلم پکار اُٹھیں اہلِ فن مجھے
وہ نطق ہو عطا، وہ عطا ہو دہن مجھے
یارب بنادے شاعرِ شاہ زمن مجھے
لے کر علی کا نام، قلم کو رواں کروں
رشتے جو خاک دخوں میں ہیں باہم بیاں کروں

اہل زباں نہیں ہوں مجھے اس کا غم نہیں
گوشہ نشیں ہوں صاحب جاہ و حشم نہیں
اس کا کرم ہے ورنہ کوئی مجھ میں دم نہیں
منبر کا اوج تختِ سلیماں سے کم نہیں
مقبولِ بارگاہِ رسالت مآب ہوں
اک ذرۂ حقیرِ درِ بوتراب ہوں

دعائیہ بندوں سے کی گئی ابتدا کے بعد چہرے کے بند انسان اور انسانیت کے موضوع پر ہیں۔

انساں، حکمتوں کا خزینہ کہیں جسے
دریائے زندگی میں سفینہ کہیں جسے
انساں، دو جہاں کا قرینہ کہیں جسے
انگشتری جہاں ہے، نگینہ کہیں جسے
انساں، جو بحر ظلم سے کشتی نکال دے
آئی ہوئی بلا کو جو سر دیکے ٹال دے

انسان، حرف مہر و محبت کا نام ہے انسان حرف حق کی صداقت کا نام ہے
انسان روشنی کی علامت کا نام ہے انسان زندگی کی حرارت کا نام ہے

شام و سحر گذارے جو عجز و نیاز میں
انساں جو اپنا سر بھی کٹادے نماز میں

مظہر جعفری نے مرثیے کے جو بند ارسال کئے ہیں وہ مرثیے کی تعریف پر پورے نہیں اُترتے جب تک وہ بند سامنے نہ ہوں جو رثا کا حصّہ ہوں۔

اس منزل پر مولائے کائنات کا ارشادِ گرامی یاد آتا ہے کہ "یہ نہ دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے بلکہ یہ سنو کہ کیا کہہ رہا ہے" لیکن بشیر جعفری کے حوالے سے ہم اس جگہ کھڑے ہیں جہاں ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ کون کہہ رہا ہے کہ بشیر جعفری مرثیہ گو شاعر تھے؟ اور یہاں یہ بات کہنے والا ایک مستند مرثیہ گو شاعر ہے جس کا نام نامی کوثر آلہ آبادی ہے جن کے توسل سے ہمیں مظہر جعفری کا ارسال کردہ بشیر جعفری کا کلام ملا ہے۔ یوں بھی دبستان کراچی کے حوالے سے بشیر جعفری کا نام ایک مرثیہ گو کی حیثیت سے جانا گیا ہے۔

☆☆☆☆☆

مولانا جرار چھولسی :- (چھولس)

تاریخ پیدائش ۱۹۱۴ء۔ وفات ۱۹۹۵ء

نام سید جرار حسین۔ تخلص جرار۔ وطن مالوف چھولس ضلع سابق بلند شہر، موجودہ غازی آباد۔ رضوی سید، سلسلہ نسب امام رضا علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ تعلیم منشی کامل، مولوی اور عالم کے امتحانات منصبہ عربی کالج میرٹھ سے پاس کئے۔ مولانا جرار چھولسی کے ماموں حضرت قیصر چھولسی جانے مانے شاعر تھے۔ جرار چھولسی نے شاعری شروع کی تو اپنے ماموں سے اصلاح سخن کا شرف پایا۔ طبعاً حلیم، مزاجاً غیور اور حساس، عادتاً قناعت و نجابت پسند تھے۔ اُن کا ایک شعر اُن کے مزاج، اُن کی فکر اور اُن کی ذات کا آئینہ دار ہے ۔

ہم کو جرار ہی سے جانتے ہیں اہلِ سخن
ہم کو احسانِ تخلص بھی گوارا نہ ہوا

جو شخص اپنے نام سے ہٹ کر تخلص اپنانے کو بھی "احسانِ تخلص" سمجھتا ہو اس کے حصار

ذات میں کون جھانک سکتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جرار چھولسی جیسے زود گو اور جملہ اصناف سخن پر حاوی شاعر پر اتنا کچھ نہیں لکھا گیا جس کے وہ مستحق تھے۔

اُن کی غزلیات کا ایک مجموعہ "عکس حیات" شائع ہو چکا ہے۔ "غم جاوداں اوّل" اور "غم جاوداں دوئم" نوحوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ غیر مطبوعہ مجموعے ہیں جن کی تعداد دس کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ حضرت جرار چھولسی نے کم و بیش ایک ہزار رباعیاں کہی ہیں۔ سلام، منقبت، قصائد ان کے علاوہ ہیں۔ قدیم مرثیے کے روایات کے حامی تھے۔

اُن کا پہلا مرثیہ ـــــ کشور نظم کا یارب مجھے سلطاں کر دے ۶۴ بند پر مشتمل ہے اور آخری مرثیہ ـــ "اے دیدۂ تر عیش و مسرت کو ہوا کیا" شخصی مرثیہ ہے جو ۲۴ بند پر مشتمل ہے جو اُنہوں نے اپنے بھائی کی موت پر کہا ہے ـــ پہلے مرثیے میں اُنہوں نے اپنے رجحان اور اپنی نسبتوں کو واضح کیا ہے۔

کشور نظم کا یارب مجھے سلطاں کر دے　　بخش غنچے کو نمو، رشکِ گلستاں کر دے
حسن جگنو کا بڑھا کر مہ تاباں کر دے　　ذرۂ خاک کو خورشید درخشاں کر دے
ناتواں مور بھی ہمدوشِ سلیماں ہو جائے
تو اگر چاہے تو قطرہ در غلطاں ہو جائے

رہنا ہو قلزمِ امواج فصاحت میں انیس　　معتقد ہوں میرے اس بزم عقیدت کے جلیس
چست ہو بندش الفاظ، معنی ہوں نفیس　　دیکھنے والے پکار اُٹھیں مضامیں ہیں سلیس
تو جو مونس ہو تو آساں ہر اک مشکل ہو
مرثیہ گوئی کا عاصی کو شرف حاصل ہو

ہر چند کہ اس بند میں جرار چھولسی نے انیس، جلیس، نفیس، سلیس، اور مونس کو لفظی معنی کی رعایت سے نظم کیا ہے لیکن اُن کے اس معراج اسلوب سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے فکر کی رواہوں میں کون کون سے چراغ اُنہیں راہ دکھا رہے ہیں اور وہ شعوری اور لاشعوری طور پر اُن کی پیروی کر رہے ہیں۔

مولانا جرار چھولسی بلاشبہ قدیم مرثیے کے شاعر ہیں لیکن کہیں کہیں اُنہوں نے کیفیات کی جو تجسیم کی ہے وہ نہ صرف دلنشیں بلکہ فکر جدید کی ریاضت کرتی نظر آتی ہے۔ مثلاً غم کو اُنہوں

نے جس جس ڈھنگ سے برتا ہے اور جو عظمت اس جذبہ میں دکھائی ہے وہ صاحبان نظر کے لئے منزل فکر ہے۔

انگلیاں غم نے رکھی ہیں سرِ مضرابِ حیات — کھولتا ہے یہ زمانے پہ رخِ بابِ حیات
غم کے دامن میں ہی چھنتی ہے مئے نابِ حیات — صاحبِ ظرف کو مل جائے، تو غم آبِ حیات
اہلِ غم نے اسے سمجھا، اسے پہچانا ہے
غم کا معیار ہے، میزان ہے، پیمانہ ہے

غم جہاں میں سبب نشو و نما ہوتا ہے — بوترابی کے لئے خاک شفا ہوتا ہے
ہر کسی کے مرضِ دل کی دوا ہوتا ہے — بخدا مژدۂ انعام بقا ہوتا ہے
زندگی بخش ہے غم، لوگ سمجھ لیتے ہیں
بچہ روتا ہوا آتا ہے تو ہنس دیتے ہیں

اہلِ غم صاحبِ تقدیر ہوا کرتا ہے — غم کہیں ہر کس و ناکس کو ملا کرتا ہے
اس کو ملتا ہے خدا جس کو عطا کرتا ہے — دیکھ کر شکل، یہ حصہ تو بٹا کرتا ہے
جتنی انسان میں برداشت کی قوت دیکھی
اس کے دامن میں بس اتنی ہی یہ دولت دیکھی

بحر میں ڈوبتے ہی شورشِ طوفاں بن جائے — کہیں تڑپے تو زمیں زلزلہ ساماں بن جائے
خود کو پھیلائے تو یہ عالمِ امکاں بن جائے — یہ سمٹ جائے جہاں بھی، دلِ انساں بن جائے
ضبطِ سجادؑ کا، زینبؑ کا تکلم بن جائے
غم مچل جائے تو اصغر کا تبسم بن جائے

قدر افزائی غم ہوتی رہی ہے کیا کیا — شیر خواروں میں بھی اس گھر کے رہا یہ جذبہ
تھے تو اصغر، مگر اصغر نے بہت کام کیا — تیر جب آیا ہمک کر اسے گردن پہ لیا
پیاس کی کوئی علامت نہ رہی ہونٹوں پر
لذتِ غم جو ملی، آئی ہنسی ہونٹوں پر

حرمتِ غم کے نگہبان رہے اہلِ حرم — بال بکھرائے، پریشان رہے اہلِ حرم
رات دن موت کے مہمان رہے اہلِ حرم — غم پہ سو جان سے قربان رہے اہلِ حرم

عظمتِ غم کا یہ احساس گرفتاروں میں
ننگے سر خطبے دیئے شام کے بازاروں میں
غم کہیں دامنِ یوسفؑ، کہیں زہراؑ کی ردا کہیں اصغرؑ کا شلوکہ کہیں خالی جھولا
دوش پر مرسلِ اعظمؐ کے یہ بوسیدہ قبا مسجدِ کوفہ میں، عمامۂ ضرغامِ خدا
صبحِ عاشور، علمِ دیں کا پھریرا ہے غم
شامِ عاشور کو شبیرؑ کا خیمہ ہے غم

(مرثیہ ۔ آج تو یار مجھے قلزمِ غم کرنا ہے)

مولانا جرار چھولسی میں روایت نگاری کے ساتھ ساتھ جدید فکر اور طرزِ تخاطب کا سرمایہ بھی ہے اور وسعتِ فکر و نظر بھی۔۔۔ گویا وہ اگر خود کو اپنی ذات، اپنی سوچ، اپنے اصول اور اپنے فیصلوں کے حصار سے باہر نکالتے اور جدید عصری تقاضوں سے مناسبت کرتے تو اُن جیسا زود گو، قادرالکلام شاعر جدید مرثیے کے کارواں میں اس سے بھی زیادہ نمایاں اور اہم ہوتا جتنے وہ کلاسیکی مرثیے میں نمایاں ہیں۔

مولانا جرار چھولسی کے کئی دیوان ترتیب دیئے جا چکے ہیں مگر ابھی اشاعت پذیر نہیں ہوئے۔ ان میں مرثیے بھی ہیں اور نثری ادب بھی۔۔۔ نثری ادب میں ''بکھری ہوئی یادیں'' ادبی واقعات اور فی البدیہہ اشعار کے پس منظر پر مشتمل ہے اور ''سوانح عمری قیصر چھولسی'' ان کی زندگی کی وہ داستان ہے جو ابھی تک کسی نے نہیں پڑھی۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کتاب میں انہوں نے ذات سے باہر نکل کر باتیں کی ہیں۔ مولانا جرار چھولسی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اُن کے شاگردوں میں کیا اُن کا کوئی شاگرد یا اُن کا کوئی مداح اُن کے کتابی خزانے کو ضائع ہونے سے نہیں بچائے گا۔

☆☆☆☆☆

محمد عثمان عارف:- (بیکانیر)

پیدائش ۱۵ اپریل ۱۹۲۳ء ۔ وفات ۲۱ اگست ۱۹۹۵ء۔

نام محمد عثمان، تخلص عارف، وطن بیکانیر (راجستھان)۔ عارف کے والد گرامی حاجی محمد عبداللہ بیدل شاعر تھے اور علامہ بیخود دہلوی کے شاگرد تھے۔ عارف کے بڑے بھائی محمد یوسف راسخ بھی شاعر تھے۔ لہٰذا عارف کو بچپن ہی سے علمی ادبی ماحول ملا تھا۔ گھر پر آئے دن ادبی محفلیں

منعقد ہوتی رہتی تھیں اسی لئے عارفؔ کا شعر گوئی کی طرف راغب ہونا کوئی انہونی بات نہیں تھی البتہ ایک بات بہت اہم تھی کہ وہ تغزل کی راہوں پر چل کر شراب وشباب کی جنت کے طلبگار نہیں ہوئے بلکہ تصوف، انسان دوستی، اور یگانگت کو نصب العین بنالیا۔ شاید خدمت بشر کا یہی جذبہ اُنہیں سیاست کی طرف لے گیا۔ عارفؔ سیاست کے میدان میں بھی اپنے اصولوں سے نہیں ہٹے اور نتیجتاً ۱۹۸۵ء میں ہندوستان کے صوبہ اُتر پردیش کے گورنر بنادیئے گئے۔ وہ اس منصب پر پانچ سال تک فائز رہے۔ —اس سیاسی مرتبے کے ساتھ ساتھ عارفؔ کو ایک اور شرف بھی ملا اور وہ تھا مداحِ رسولؐ کا رتبہ۔ حبِ آلِ رسولؐ کا شرف، مداحِ علیؑ و اولادِ علیؑ کا مرتبہ۔ جو اُس وقت تک حاصل نہیں ہوتا۔ ''تانہ بخشد خدائے بخشندہ''

''اک نوائے زندگی تھی کربلا، اک تختِ شام

ہم فقیروں نے نوائے کربلا کو چُن لیا (عاشور)

بیسویں صدی کے عثمان عارفؔ نے بھی نوائے کربلا چن لیا تھا اور یہ ایک آفاقی سچائی ہے کہ جس نے درگاہ کربلا کو چن لیا وہ حسینؑ تک پہنچا، اور جو حسینؑ تک پہنچا، وہ علیؑ آشنا ہوا۔ اہلبیت رسول کے در تک اس کی رسائی ہوئی اا اور جو اہلبیت کے در تک پہنچا وہ رحمت اللعالمین کی رحمت کے سائے میں آگیا اور جو اس بیت الشرف تک پہنچا اسے خدا مل گیا، عارفؔ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا اُنہیں عرفان کربلا ہوا تو درسِ شہادت کے زیرِ عنوان حسینؑ حسینؑ پکار اُٹھے ؎

خالق پہ جان و مال سے قرباں حسینؑ ہے رودادِ صبر و ضبط کا عنواں حسینؑ ہے
انسانیت کے درد کا درماں حسینؑ ہے قائم ہے جس سے عظمت انساں، حسینؑ ہے

دنیا کو دیدیا ہے وہ آئینِ زندگی
ملتی رہے گی موت میں تسکینِ زندگی

اللہ رے یہ شانِ عبادت حسینؑ کی بنیادِ دینِ حق ہے امامت حسینؑ کی
آنے گی یاد تابہ قیامت، حسینؑ کی کیا درس دے رہی ہے شہادت حسینؑ کی

باطل کے ظلم و جور کی دنیا خراب ہے
غافل جو حق سے ہوگیا، خانہ خراب ہے

(ماہنامہ الجواد۔ مئی ۱۹۹۸ء سے)

سید یاد علی جعفری نے ''راجستھان اور اُردو مرثیہ'' میں عارف کی ایک تضمین کے چند بند نقل کئے ہیں جو اس فکر کے آئینہ دار ہے کہ درسگاہ کربلا کا طالب علم، محمد عثمان عارف، عظمت حسینؑ کا بھی عارف ہے اور احکام نبوی سے بھی آگاہ ہے۔

لوگوں نے یہ سرکار کا ارشاد سنا ہے
یہ مجھ سے ہے، میں اس سے، رہا فرق ہی کیا ہے
یہ مرثیہ اوروں کو ملے گا نہ ملا ہے
دربار رسالت میں یہ اعلان ہوا ہے
کونین کا مختار امامِ دوسرا ہے

ایمان کی کہتا ہوں، یہ ایمان مرا ہے
دیکھا ہے، سنا ہے، یہ حقیقت ہے، بجا ہے
مشکل میں جہاں یاد کیا، دُور بلا ہے
کیا نام حسینؑ ابن علی، نامِ خدا ہے
ہر درد کا درمان ہے ہر دکھ کی دوا ہے

یہ نازش قدرت ہے، یہ ہے حق کی صداقت
یہ فخر امامت ہے، یہی جانِ خلافت
کم ہوگی قیامت سے نہ کچھ اس کی شہادت
ظالم تجھے معلوم ہے شبیر کی عظمت
یہ اس کا نواسہ ہے جو محبوبِ خدا ہے

ایسا لگتا ہے جیسے عثمان عارف نے ذبحِ عظیم کے معنی بھی سمجھ لئے ہوں جبھی تو رثا کی منزل پر حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو پکارتے ہیں۔

چہرہ بھی ہے مغموم تو آنکھیں بھی ہیں پُر نم
ہر سانس کی آواز میں ہے نالۂ پیہم
عارف سے چھپاؤ گے کہاں تک الم و غم

سر دھنتے ہو بیٹھے ہوئے کیسا ہے یہ عالم
کیوں غم کی چڑھائی ہے خلیلؔ آج یہ کیا ہے

محبانِ محمدؐ و آلِ محمد کو فرقوں میں تقسیم کرنے والے بالخصوص علی مرتضیٰ کو ایک مکتبہ فکر سے وابستہ کرنے والوں کے لئے محمد عثمان عارفؔ اجمیری کا ولائے مرتضوی پر مشتمل کلام ایک درس عبرت ہے ۔

عارف لبِ ولا سے کرو مرتضیٰ کی بات نفسِ الہ و نفسِ رسولِ خدا کی بات
خیبر شکن کی بات، شہ لافتیٰ کی بات حیدر کی بات بات میں ہے، مصطفیٰ کی بات
فانوسِ کردگار کی تنویر دیکھئے
دو آئینوں میں ایک ہی تصویر دیکھئے

گفتار میں رسولؐ کی گفتار کی جھلک افکار میں رسولؐ کے افکار کی جھلک
رفتار میں رسولؐ کی رفتار کی جھلک کردار میں رسولؐ کے کردار کی جھلک
حسنِ شبیہِ احمدِ مختار ہوگیا
سائے کا نام حیدرِ کرار ہوگیا

ایماں شعار حق کی گواہی، علیؑ علیؑ ہر معرکہ میں دین پناہی، علیؑ علیؑ
نقشِ جلالِ شیرِ الٰہی، علیؑ علیؑ ہر جنگ میں نبی کا سپاہی ، علیؑ علیؑ
اس کا نہیں جواب کہ وہ لاجواب ہے
اسلام کے افق پہ علیؑ آفتاب ہے

اسلام کی سپر اسد اللہ کی حسام حیدر ہے زور بازوئے پیغمبری کا نام
بابِ دیارِ علمِ نبی ہے وہ لاکلام منبر پہ وہ خطیب ہے ، محراب میں امام
کیا رتبۂ فضیلت و علم و ادب ملا
مولا کہا نبیؐ نے علیؑ کو لقب ملا

عالمی منشور نے روٹی، کپڑا، اور مکان کو انسان کی بنیادی ضرورتیں قرار دیا ہے۔ محمد عثمان عارفؔ نے خلافتِ علیؑ کے دور کو ان ضرورتوں کی تکمیل کا اور آزادیٔ ضمیر اور جمہوریت کا دور قرار دیا ہے۔

آزادیٔ ضمیر کے منشور کا وقار ایماں کی شان دین کے دستور کا وقار

وہ شوکت عوام وہ جمہور کا وقار محنت کشوں کا دبدبہ، مزدور کا وقار
حاکم تھا وہ تو چین بھی تھا، علم و فن بھی تھا
روزی بھی تھی، مکان بھا تھا، پیراہن بھی تھا

ضربت جبیں پہ مسجد کوفہ میں جب لگی خم تھی جبیں نماز کی حالت میں تھے علی
سر سے لہو رواں ہوا، قندیل حق بجھی خونخوار کس قدر تھی ستمگر کی دشمنی
تھا منفرد ستم میں، یگانہ تھا قہر میں
قاتل بجھا کے لایا تھا شمشیر زہر میں

آخری بند میں مجلسِ ذکرِ شہادتِ علیؑ میں شرکت کی دعوت کے ساتھ ساتھ عارفؔ کے موقف کی وضاحت بھی ہے۔

مجلس بپا ہے ذکر شہادت میں آیئے یہ جلوہ زارِ شاہِ ولایت ہے، آیئے
یہ بزم، بزمِ اہلِ محبت ہے آیئے یہ موسمِ بہارِ عقیدت ہے آیئے
عارفؔ کو مرتضٰی سے مسائل کا حل ملا
مولا علیؑ کے ذکر سے درسِ عمل ملا

کاش ہم سب عارفؔ کی طرح ذکرِ علی کو درسِ عمل سمجھ کر علی مرتضٰی سے مسائل و مشکلات کا حل معلوم کرنے پر توجہ دیں۔

☆☆☆☆☆

قیصر بارھوی:- (لاہور)

ولادت ۱۹۲۷ء۔ وفات ۱۹۹۶ء۔

نام قیصر عباس، تخلص قیصرؔ، زیدی سیدّ۔ ہندوستان کے ایک صوبے کو برطانوی دور سے (U.P) یو۔ پی کہا جاتا ہے۔ جب انگریز ہندوستان کے حاکم تھے اس وقت یو۔ پی کے معنی یونائیٹڈ پراونس (United Province) تھے اب یو۔ پی کا ترجمہ اُتر پردیش ہے۔ اس اتر پردیش میں چند موضع جات پر مشتمل ایک چھوٹا سا علاقہ ہے جسے بارہہ کہتے ہیں۔ یہ سرزمین سادات کی سرزمین ہے۔ اسی سرزمین کی ایک بستی کھتورا میں ۱۶ر جنوری ۱۹۲۸ء کو اس بستی کے ایک دیندار گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام قیصر عباس رکھا گیا۔ قیصر عباس کے والد گرامی کا نام سید

وزارت حسین زیدی تھا۔ اس بچّے کو گیارہ برس کی عمر میں حصول تعلیم کے لئے لکھنؤ بھیج دیا گیا۔ اس طرح قیصر ۱۹۳۹ء سے ۱۹۵۰ء تک یعنی بائیس برس کی عمر تک لکھنؤ میں رہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اودھ کی تہذیب کو مٹانے کی کوششوں کے باوجود لکھنؤ گہوارہ علم وادب تھا۔ قیصر عباس کا اس علمی اور تہذیبی فضا سے متاثر ہونا لازمی تھا، سو ہوا۔ لکھنؤ آنے سے پہلے ہی یعنی ۱۹۳۸ء میں گھر کی ادبی فضا نے طبیعت مشق سخن کی طرف راغب کردی تھی لکھنؤ نے اس جذبے کو جلا دی اور قیصر عباس شعر گوئی کے حوالے سے قیصر بارہوی بن گئے۔ سب سے پہلا تاثر نجم آفندی سے قبول کیا۔ ۱۹۳۹ء میں نجم آفندی کے نوحوں کا مجموعہ شائع ہوا تھا۔ قیصر عباس نئے نئے لکھنؤ پہنچے تھے۔ ذہنی تعمیر کا دور تھا۔ اس تعمیر میں نجم آفندی کی آواز شامل ہوگئی۔ سوچنے کا رخ متعین ہوگیا۔ سفر کا راستہ نظر آ گیا۔ منزل کا سراغ مل گیا۔ سفر شروع ہوگیا۔ دوسری آواز جو سنائی دی وہ میر انیس کی آواز تھی۔ جو حواس پر چھا گئی، میر انیس کا شہر لکھنؤ، رثائی ادب کا شہر لکھنؤ، تہذیب سیادت کا شہر لکھنؤ، وہ شہر جو دماغ وضع کرتا تھا۔ وہ شہر جو پتھروں کو دل بنا دیتا تھا۔ اس شہر لکھنؤ میں ایک گیارہ برس کا بچہ آیا تھا جس نے مزید گیارہ برس اس شہر میں قیام کیا اور ۱۹۵۰ء میں پاکستان آیا تو حق و باطل کا فرق اس کے ذہن میں نمایاں تھا۔ ۲۲ برس کی عمر میں وہ ایک زود گو شاعر بن چکا تھا۔۔۔ لکھنؤ نے سلام، نوحے، رباعیات کہنے کا سلیقہ سکھا دیا تھا۔ مشاعروں میں شرکت نے بیباک بنا دیا تھا۔ قیصر بارہوی مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے رہے آخر کار ۱۹۵۲ء میں پہلا مرثیہ کہا۔

پہلے سات مرثیوں کا مجموعہ ''شباب فطرت'' کے نام سے شائع ہوا۔

ایک مرثیہ ''معراج بشر'' شائع ہوا، بارہ مرثیوں کا مجموعہ ''عظیم مرثیے'' کے نام سے ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ دیگر مجموعوں میں ''منفرد مرثیے''، ''منتخب مرثیے''، معتبر مرثیے'' اور ''بارگاہ'' (مجموعہ میں قصائد شامل ہیں) ایک غزلوں کا دیوان ''امتزاج'' بھی شائع ہوا ہے۔ قیصر بارہوی نے لگ بھگ ۸۶ / ۸۵ مرثیے کہے ہیں۔ وہ جب پاکستان آئے تو ملازمت کے سلسلے میں پنجاب کے مختلف شہروں میں رہے۔ آخر کار ۱۹۶۹ء میں لاہور میں بس گئے اور اسی وقت سے لاہور میں مرثیوں کی فضا کا آغاز ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں ''انجمن شعراء اہلبیت'' کا نام تبدیل کر کے ''حلقہ شعرائے اہلبیت'' کر دیا گیا اور سیف زلفی اس کے سیکریٹری اور قیصر بارہوی اس کے صدر مقرر ہوئے۔ سرپرستوں میں جوش ملیح آبادی، احمد ندیم قاسمی، احسان دانش، نجم آفندی، نسیم

امروہوی اور آلِ رضا کو لیا گیا۔ مسعود خاکی، وحید الحسن ہاشمی اور ظفر شارب مجلس عاملہ کے اراکین میں شامل تھے۔

ظہیر الدین حیدر کی ''آیات وفا'' کے دیباچے میں قیصر بارہوی نے یہ ماجرا لکھا ہے لاہور پاکستان میں رثائی ادب کی ابتدا کے متعلق ہلال نقوی نے جو تاریخ بیان کی ہے اس میں ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہے ڈاکٹر ہلال نقوی رقم طراز ہیں:

> ''لاہور میں سلام اور نوحوں کو کتابی شکل دے کر محفوظ کرنے کی پہلی شعوری کاوش نور لدھیانوی کے ذہن میں پیدا ہوئی۔ نور لدھیانوی کی خواہش یہ تھی کہ عزائیہ ادب خواہ کسی صورت اور ہیت میں ہو اور اس کی کوئی بھی صنف ہو اسے محفوظ ہونا چاہئے''
>
> (بیسوی صدی اور جدید مریہ۔ ص ۳۸۵)

یہاں تک ہلال نقوی کی بات (Half truth کی حیثیت میں) سولہ آنے کھری بھی کہی جا سکتی ہے۔ لیکن اس سے آگے وہ لکھتے ہیں۔

> ''اس بات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اُن کی نگاہِ انتخاب وحید الحسن ہاشمی پر گئی۔ اُنہوں نے ہاشمی صاحب سے کہا'' چہاردہ معصومین کے حال میں کسی شاعر کا چاہے ایک ہی شعر مل جائے اس کی مختصر سی سوانح لکھ کر ایک مجموعہ ترتیب دیجئے۔ وحید الحسن ہاشمی نے اس کام کو آگے بڑھانے کے لئے پاکستان کے تمام شہروں اور بستیوں کے شعراء کو خطوط لکھے، جن شعراء نے کلام بھیجے اُن کی تعداد ۱۰۳ تھی'' سلام وفا'' مارچ ۱۹۶۹ء اس سلسلے کی کڑی ہے۔ (ایضاً، ص ۳۵۸)

اسی صفحہ کے ذیلی حاشیے میں ڈاکٹر ہلال نقوی نے لکھا ہے کہ یہ معلومات وحید الحسن ہاشمی نے اُنہیں ۱۳ ر جولائی ۱۹۸۰ کو قیصر بارہوی کی موجودگی میں اپنے مکان رحمان پورہ میں ایک ملاقات کے دوران دیں — اس ذیلی تحریر (Foot Note) کے بعد ڈاکٹر ہلال نقوی حسب دستور، تحریر کی صحت کی ذمہ داری سے نکل گئے اور بار ثبوت وحید الحسن ہاشمی پر آگیا۔

اس بیان میں جس اہم بات کا ذکر نہیں بلکہ ایک حقیقت کا انکار ہو رہا ہے اور وہ یہ کہ

۱۹۵۳ء میں مکتبہ شاہوار نے مصورِ جذبات علامہ نورؔ لدھیانوی کا رثائی کلام دو جلدوں میں شائع کیا تھا۔ کتابوں کے نام'' قندیلِ نور'' اور'' حدیثِ نور'' تھے۔ اس کے بعد ۱۹۵۵ء میں راقم السطور (سید عاشور کاظمی) کی کتاب'' چراغ منزل' لاہور سے مکتبہ شاہوار نے شائع کی تھی۔ چراغ منزل منقبت، سلام، سوز، قطعات، ور باعیات پر مشتمل تھی اور اہم ترین بات یہ ہے کہ علامہ نورؔ لدھیانوی کی سرپرستی میں یہ کتاب شائع ہوئی تھی۔ کتاب میں موصوف کا دیباچہ'' شاعری جزویست از پیغمبری'' بھی شامل تھا جس میں موصوف نے مصنف کا تعارف کرایا تھا۔ حضرت نورؔ لدھیانوی کی دونوں کتابیں ۳۲-۱۹۳۰ء میں شائع ہو چکی ہیں۔ لاہور سے اُنہیں دوبارہ شائع یا گیا تھا۔'' چراغ منزل'' کو علامہ نور لدھیانوی ہمیشہ لاہور سے شائع ہونے والی اہلبیت علیہ السلام سے متعلق شاعری کی پہلی کتاب قرار دیا کرتے تھے۔ سید عاشور کاظمی سے اُن کا جو رشتہ تھا وہ ان کی ایک کتاب کے انتساب سے ظاہر تھا۔ جو یوں تھا۔

اپنے منہ بولے فرزند سید عاشور کاظمی کے نام

'' میری یہ کوشش کہ تیرے نقش قدم پہ منزل بھی گامزن ہو
تجھے تلاشِ خضر ہے اب تک، یہی تو احساس کمتری ہے''

(علامہ نورؔ لدھیانوی)

'' مکتبہ شاہوار' لاہور نے ۱۹۵۸ء تک دس بارہ کتابیں شائع کی تھیں اور باقاعدگی سے ماہنامہ'' شاہوار'' بھی شائع ہوتا تھا جس کی ادارت راقم الحروف سید عاشور کاظمی کے سپرد تھی۔ سید وحید الحسن ہاشمی اس کے عینی شاہد بھی ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں راقم الحروف نے لاہور چھوڑ دیا اور کراچی میں سکونت اختیار کری اور مکتبہ شاہوار'' اور ماہنامہ شاہوار'' بند کر دیئے گئے، اس کے بعد ہی حضرت نور لدھیانوی نے محترم وحید الحسن ہاشمی سے عزائیہ ادب'' کے مخطوط کرنے کی بات کی ہوگی۔ ۱۹۶۵ء میں حضرت نور لدھیانوی کا انتقال ہو گیا۔'' سلام وفا'' کی اشاعت ۱۹۶۹ء میں ہوئی۔ ۱۹۶۳ء تک عاشور کاظمی اور حضرت نور لدھیانوی میں رابطہ رہا۔ راقم الحروف کو اس امکان سے انکار نہیں کہ وحید الحسن ہاشمی صاحب کو علامہ نور لدھیانوی نے ترغیب دی اور'' سلام وفا'' معرض وجود میں آئی۔ بلکہ کہنا یہ ہے کہ عزائیہ ادب، رثائی ادب یا چہاردہ معصومین سے متعلق لاہور سے شائع ہونے والی پہلی کتاب' سلام وفا' نہیں' بلکہ عاشور کاظمی کی' چراغ منزل' کا پہلا اڈیشن

اور حضرت نورؔ لدھیانوی کی 'حدیثِ نور' اور 'قندیلِ نور' کے ثانوی ایڈیشن ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ 'سلام وفا' کو پہلی کتاب کہنے والے محترم وحید الحسن ہاشمی ذاتی طور پر درج بالا حقائق سے حقیقت سے آگاہ بھی تھے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ جب 'سلامِ وفا' ترتیب دی جارہی تھی اس وقت 'چراغ منزل' کے شاعر کو، کن مصلحتوں کے تحت نظر انداز کر دیا گیا جو علامہ نور لدھیانوی کا منہ بولا بیٹا اور ادبی وارث بھی تھا۔

اس بحث سے قطع نظر قیصر بارہوی نے مرثیہ خوانی اور ترویج مرثیہ میں وہ کار ہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں جو، ابدی نہیں تو 'ابدنما' ضرور ہیں۔ اُنہوں نے مرثیے میں ایک ایسا لحن اختیار کیا ہے جو قدیم و جدید کے درمیان ایک پل کی طرح ہے۔ جدید دور کے مرثیہ نگار ہوتے ہوئے انہوں نے قدیم اسلوب کو ترک نہیں کیا۔ میر انیس اُن کی روح میں سما گئے تھے۔ خود کہتے ہیں۔

شہرہ ہے آج، آپ کی طبعِ نفیس کا
یا مل رہا ہے فکر کو صدقہ انیس کا

اُنہوں نے بعض ایسے موضوعات کو مرثیے کے قالب میں ڈھالا ہے جو روایاتِ رائج سے باہر کی باتیں ہیں۔ مثلاً اُن کا ایک معرکۃ الآرا مرثیہ "آیئے خانۂ معبود کی تحریر پڑھیں" — ایک نرالا مرثیہ ہے۔ چہرے کے ۲۷ بند خانہ کعبہ میں حضرت علی کی ولادت اور منقبت کے بند ہیں۔ گریز میں فضائل، منکران فضائل، دشمنانِ عظمت علی کا ذکر اور یہ حوالہ کہ یہ دشمنی یہاں تک پہنچی کہ فرزند علی کو کربلا سجانی پڑی۔ دوستی اور دشمنی کا تقابل قیصر بارہوی کی پختہ گوئی کا منہ بولتا شاہکار ہے۔

آیئے خانۂ معبود کی تحریر پڑھیں جس سے روشن رخِ اسلام وہ تنویر پڑھیں
ابوطالب کی دعا کہتی ہے تاثیر پڑھیں ا ایک دیوار پہ لکھی ہوئی تقریر پڑھیں
زندگی روشنی فکر و عمل پائے گی
دل ہے مومن تو عبارت نظر آجائے گی

یہ وہ تحریر ہے تخلیقِ دوعالم کی قسم جس کے سائے میں بڑھا قافلۂ لوح و قلم
کیا بھلائے گا کوئی قصۂ دیوارِ حرم ۳ دست قدرت میں ہے مولودِ حرم کا پرچم
لبِ وحدت نے زمانے کو یہ سمجھایا ہے
منفرد شان سے کعبے میں کوئی آیا ہے

آمدِ بنتِ اسد، خانۂ یزداں کی طرف اک مسافر کی مسافت ہے نگہباں کی طرف
''اُمِ ایماں'' کے قدم جنتِ ایماں کی طرف ۱۰ جیسے خوشبو کا سفر، اپنے گلستاں کی طرف
بیتِ شوہر سے جو معبود کے گھر آتی ہیں
یہ بلائی ہوئی مہمان نظر آتی ہیں

شاخِ تخلیق پہ چمکا ابوطالب کا گلاب وقت نے پائی وہ خوشبو کہ نہیں جس کا جواب
شل ہوئے پیکرِ الحاد کے سارے اعصاب ۱۶ دینِ فطرت نے کہا مل گیا دُرِ نایاب
ہر پیمبر کی دعاء آج اثر لائی ہے
روشنی صورتِ انساں میں نظر آئی ہے

آگئے سید عالم تو نظارہ تھا عجیب کیفِ نظارہ میں قدرت کا اشارہ تھا عجیب
لیتی وحدت کے ادارے کا شمارہ تھا عجیب ۱۹ دستِ رحمت پہ محبت کا ستارہ تھا عجیب
جس پہ قربان ہو کونین وہ صورت دیکھی
آنکھ مولود نے کھولی تو رسالت دیکھی

اس قصیدے کو جو کعبے کی زمیں پر دیکھا سینۂ کفر میں اک بغض کا شعلہ بھڑکا
وقت نے بدر و احد، خندق و خیبر میں کہا کون حیدرؑ کے سوا اشجعِ تاریخ ہوا
سیرتِ نفسِ پیمبر ہے نصابِ اسلام
اب تو حیدر کی جوانی ہے شبابِ اسلام

شام سے کہہ کے اُٹھی شام کی منحوس ہوا اب نہ کعبے کا قصیدہ نہ جدارِ کعبہ
ختم ہوجائے گی عمران کی تاثیرِ دعا اب نہ دنیا میں کوئی واقفِ حیدر ہوگا
نورِ کعبہ کا حوالہ بھی نہ دے گا کوئی
آلِ عمران کا اب نام نہ لے گا کوئی

حرم و دَیر میں اب رنگِ تصادم اُبھرا جو پسِ لفظ چھپا تھا وہ تکلم اُبھرا
گیت رقصاں ہوئے قرآں کا تبسم اُبھرا کسی طوفان کی آمد کا تلاطم اُبھرا
اک براہیم نظر سے کسی نمرود کی جنگ
یا کسی عبد سے اک بندۂ معبود کی جنگ

خواہش خیر زمانے میں کہیں جنگ نہ ہو کسی انسان پہ دامانِ زمیں تنگ نہ ہو
آب نفرت سے سدا شیشۂ دل زنگ نہ ہو ۴۱ زندگی نور کا آئینہ رہے سنگ نہ ہو
جو بھی صحرا میں ہے گلزار نشیں ہو جائے
پانچ دریاؤں سے شاداب زمیں ہو جائے

سینۂ شر میں یہ ارمان اُجڑ جائے چمن موت کی سیج پہ سو جائیں شریفانِ وطن
اب نہ پیمانۂ انصاف بنے صلحِ حسنؑ ۴۲ سر اُٹھا کر نہ چلے کوئی حقیقت بہ دہن
ہر طرف عیش ہو، دولت کی فراوانی ہو
خطۂ ارض پہ میخوار کی من مانی ہو

خیر کا عزم ہر آبادیٔ شر ہو برباد کسی بستی کا مقدر نہ بنے شورِ فساد
قہقہوں میں نہ دبے غم نفسوں کی فریاد ہو نہ حاکم کسی کوفے میں کوئی ابنِ زیاد
نہ لگے آگ کہیں کوئی نہ دُرّے کھائے
کوئی بچّی سر مقتل نہ طمانچے کھائے

شر کی آنکھوں میں تڑپتے ہوئے پیاسے بچّے ننھے ہاتھوں میں اُٹھائے ہوئے خالی کوزے
کوئی ایسا نہیں کس سے کوئی پانی مانگے ۴۴ صرف اک بات لبِ نہر کسی لاشے سے
آپ کے بعد ستم ہوں گے یہ معلوم نہ تھا
شمر کے سامنے ہم ہوں گے یہ معلوم نہ تھا

خیر و شر جمع ہوئے فیصلہ کن منزل پر کربلا بن گئی میداں میں رُکے دو لشکر
اک طرف کفر کی اُلفت کے ہزاروں پیکر ۴۸ اک طرف حاصلِ اسلام بہتر صفدر
اک طرف خواہشِ زر سینوں میں بھرنے والے
اک طرف مصطفوی بات پہ مرنے والے

اور اس مرثیے کا ۷۱ واں بند اُن ساری منازل کی نشاندہی کر دیتا ہے جن سے گذر کر یہ مرثیہ اس منزل پر پہنچا ہے ۔

کیا عجب پوتے کی میت پہ یہ کہتے ہوں علیؑ میرے اصغر میری طاقت ہے تیری تشنہ لبی
نسلِ آدم پہ تیری جنگ نہ بھولے گی کبھی ۷۱ جنبشِ لب میں عجب قوتِ لشکر بھر دی

آج سے تا بہ ابد فکر کا یہ محور ہے
عزّتِ نامِ علیؑ، نام علی اصغر ہے

یوں تو قیصر بارہوی کا ہر مرثیہ اُن کی قادرالکلامی کا آئینہ دار ہے مگر اُن کا مرثیہ جو جنابِ سیدہ کی کنیز فضہ سے متعلق ہے وہ بھی ایک شاہکار مرثیہ ہے۔

فضہ کو شہرِ علم کی آب و ہوا نصیب چومے فرازِ عرش وہ ذہنِ رسا نصیب
تائیدِ پنجتن کرمِ کبریا نصیب لاریب اس نصیب کو کہیے بقا نصیب
دامن میں بارگاہِ امامت کی بھیک ہے
فضہ کی پرورش میں نبوت شریک ہے

تاریخ کے افق پہ وہ ماضی ہے جلوہ گر غالب ہیں جس کی سرخیاں اخبارِ حال پر
وہ منزلِ شرف، وہ صداقت کا مستقر صحنِ بتول میں وہ مساوات کی سحر
غم فاطمہؑ کے ساتھ، خوشی فاطمہؑ کے ساتھ
فضہ بہن کی طرح رہی فاطمہؑ کے ساتھ

خاتونِ کائنات کا وہ آخری سفر بے چینیوں کی دھوپ محمدؐ کے باغ پر
فضہ نے کی وصیت زہراؑ پہ جب نظر بولی جبینِ زینب و کلثوم چوم کر
جب تک بھی سانس لوں گی، اطاعت کرونگی میں
شہزادیو! کنیز ہوں خدمت کرونگی میں

اس منزلِ وقار پہ قربان ہر وقار فضہ نے پرورش کیے وحدت کے شاہکار
اُم البنین کے باغ میں جب آگئی بہار زانو پہ کھیلنے لگے عباسِ نامدار
انگلی پکڑ کے ساتھ جو زین العبا چلے
فضہ کے اختیار میں ارض و سما چلے

قاسم پہ دھوپ آتی تو چادر تھی سائباں آنچل کا فرش عون و محمد کی کہکشاں
باقرؑ کے ساتھ غزوۂ خیبر کی داستاں مادر کی طرح گیسوئے اکبر میں انگلیاں
اصغر کو لوریوں سے مجاہد بنادیا
فضہ نے شیر خوار کو ہنسنا سکھا دیا

قیصر بارہوی، اہلبیت کا ثنا خواں، حسینؑ اور اصحاب حسینؑ کا مرثیہ خواں شاعر ۱۹۹۶ء میں اس حیات فانی سے کنارہ کش ہو گیا اور حیات ابدی کے دامن کی پناہ میں چلا گیا۔ صادق القول کا قول '' کہ جو آلِ محمد کی محبت میں مرا وہ شہید ہوا'' اس بات کی ضمانت ہے کہ قیصر بارہوی مر نہیں سکتے ـــــ اور وہ جس کے دل میں آلِ محمدؐ کی محبت کا اُجالا ہو اور ہونٹوں پر ذکر آل محمد کا نور ہو اُسے کونسا مقام ملے گا؟ یقیناً وہ مقام اتنا بلند ہوگا جس کا اندازہ بشر کا محدود ذہن نہیں کر سکتا۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر وحید اختر۔ (علیگڑھ)

ولادت ۱۹۳۵ء۔ وفات ۱۹۹۶ء

نام سید وحید اختر۔ تخلص وحید۔ والد گرامی کا نام سید نذر عباس۔ تعلیم ایم۔اے پی۔ایچ ڈی عثمانیہ یونیورسٹی۔ پہلا دیوان '' پتھروں کا مغنّی '' ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا جس میں ایک مرثیے کے کچھ بند شامل ہے۔ اس کتاب پر غالب ایوارڈ ۱۹۶۷ء ملا۔ ڈاکٹر وحید اختر مفکر، دانشور، نقاد، ادیب اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ مرثیہ گو بھی تھے اس لئے مرثیہ کے ضمن میں اُن کی آراء اور تبصروں کو میں نے '' مرثیہ نظم کی اصناف میں '' میں شامل کیا تھا۔ میری یہ کتاب اُن کی زندگی میں شائع ہوئی تھی۔

ڈاکٹر وحید اختر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبہ فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ خاندان اجتہاد سے تعلق تھا گویا علم وادب گھٹی میں پڑا تھا لہٰذا دس برس کی عمر میں سلام اور نوحے کہنے لگے تھے۔ پہلا مرثیہ ۱۹۴۰ء میں کہا جو حضرت علی اصغر کے احوال پر تھا، اُنہوں نے ۳۶ مراثی کہے ہیں ـــ اُن کا شمار نہ صرف حیدر آباد دکن بلکہ ہندوستان کے ترقی پسند شاعروں میں ہوتا تھا۔

ڈاکٹر وحید اختر کا ایک مرثیہ ۔ '' رات یہ حق کے چراغوں پہ بہت بھاری ہے '' ۱۸۸ بند کا مرثیہ ہے جو ۱۹۶۷ء میں کہا گیا ـــــ '' پتھروں کا مغنّی '' شائع ہونے کے ایک سال بعد ـــ یہ مرثیہ ثانیٔ زہرا سیدہ زینبؑ کی حیات وکردار سے متعلق ہے۔ سیّدہ زینبؑ کے خطبے کے حوالے سے ڈاکٹر حید اختر جو بند لکھے ہیں اُن میں سے صرف تین بند نذر قارئین کئے جارہے ہیں ۔

قدرت الفاظ پہ ایسی، شعراء بھی حیراں ندرت الفاظ میں وہ، گوش بر آواز جہاں

وہ روانی کہ دعا دیتی ہے احمدؐ کی زباں وہ صفائی ہے کہ پڑھتا ہے قصیدہ قرآں
لیتے ہیں روحِ امیں درسِ سخن زائی کا
سیکھ لے طرز مسیحا بھی مسیحائی کا

یہ زباں تیر بھی، نشتر بھی ہے، شمشیر بھی ہے خنجر و نیزہ بھی ہے طوق گلوگیر بھی ہے
تشنگی کہتی ہے لب تشنۂ تقریر بھی ہے تیغ عباسؑ بھی، مظلومیٔ شبیرؑ بھی ہے
آب میں اس کی لبِ تشنگیٔ اصغر بھی
کاٹ میں اس کی ہے شامل نگہ سرور بھی

اس کی خوشبو میں شہیدوں کی مہک ملتی ہے درد میں عونؑ و محمدؑ کی جھلک ملتی ہے
کرب میں زعم عزیزاں کی لپک ملتی ہے غیض میں گھر کے اُجڑنے کی کسک ملتی ہے
گھٹتی آواز میں تنگیٔ رسن کا ہے نشاں
کانپتے ہاتھوں میں بازو کی چبھن کا ہے نشاں

ڈاکٹر وحید اختر کی اہمیت مرثیہ گو شاعر سے زیادہ مرثیے پر نقد و نظر کے حوالے سے ہے۔ اپنی پہلی ہی کتاب جس میں ایک مرثیے کے چند بند تھے اُنہوں نے دیباچے میں اپنے تنقیدی شعور کا مظاہرہ کر دیا تھا، جسے ''مرثیہ نظم کی اصناف میں'' میں نقل کیا گیا ہے۔

> ''جس طرح ہر شاعر کا تجربہ کسی خاص روش یا سانچے کا پابند نہیں ہوتا اسی طرح اس کا اظہار بھی بندھے ٹکے ضابطوں میں محصور و محدود نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مرثیے کو جدید شاعری سے الگ سمجھنا یا مسدس کے فارم Form کو فرسودہ کہنا کسی بھی شعری شریعت کے مطابق جائز نہیں۔''
>
> (پتھروں کا مغنی۔ ص۔۱۶)

ڈاکٹر وحید اختر کی یہ رائے مرثیے کے حوالے سے ہی نہیں بلکہ پوری شاعری کا احاطہ کرتی ہے۔ رثائی ادب کے سلسلے میں اُن کی ایک اور ''کتاب کربلا تا کربلا'' ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں اُنہوں نے سید آل رضا اور حضرت نسیم امروہوی کے متعلق جو عجیب رائے دی وہ درج ذیل ہے۔

> ''نسیم امروہوی کے مرثیے اپنے نئے پن کے ساتھ مرثیے کی

لکھنوی روایت سے زیادہ قریب رہے۔آل رضا کے دو مرثیے ''کربلا سے پہلے'' اور ''کربلا کے بعد'' اُردو مرثیے کی جامع تعریف پر پورے نہیں اُترتے''

(کربلا تا کربلا، ڈاکٹر وحید اختر۔ص ۱۷)

یہی نہیں بلکہ اُنہوں نے جوشؔ ملیح آبادی اور نجم آفندی کی مرثیہ گوئی پر بھی رائے دی ہے۔

''مرثیہ اگر اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے رثا کا مقصد پورا نہیں کرتا اور محض چند واقعات کے بیان یا انقلابی نعرے تک محدود رہتا ہے تو اسے مشکل سے مرثیہ کہا جا سکتا ہے۔اس لحاظ سے میں جوشؔ یا نجم کے مرثیوں کو مرثیہ نہیں کہتا''

(کربلا تا کربلا۔ایضاً)

ڈاکٹر وحید اختر اب ہم میں نہیں ہیں۔''مرثیہ نظم کی اصناف میں'' کی اشاعت اُن کی زندگی میں ہوئی تھی جس میں اس بندۂ عاجز نے ڈاکٹر وحید اختر کی آراء سے اختلاف کیا تھا اور کتاب کے اس حصے پر نشان لگا کر اُن کی خدمت میں بھیجا تھا۔مجھے جواب ملا تھا کہ اُنہیں کتاب اور خط مل گیا ہے اور وہ جلد جواب سے نوازیں گے مگر زندگی نے اُنہیں مہلت نہ دی۔

اُن کی کتاب ''کربلا تا کربلا'' ایک ایسی کتاب ہے جس پر میں کتاب لکھنا چاہتا ہوں۔ اس کتاب میں آٹھ مرثیوں کے علاوہ اُنہوں نے پیش لفظ میں کچھ وضاحتیں کی ہیں جو اہم ہیں۔ جدید مرثیے کے ضمن میں مختلف اوقات میں جو مختلف سوالات سامنے آئے ہیں اُن میں سے کچھ اہم سوالات کو ڈاکٹر وحید اختر نے نقل کیا ہے۔اس کا ذکر بھی ''مرثیہ نظم کی اصناف میں'' میں کر چکا ہوں، یہاں صرف دو سوال دھرا رہا ہوں۔

سوال تھا'' جدید دور میں اُردو مرثیہ ایسی روایتی صنف کی کیا ضرورت ہے۔ایسا تاریخی واقعہ جو چودہ سو سال قبل رونما ہوا کس حد تک ہماری حسیّت اور شعور کے لئے معنویت رکھتا ہے'' اور ڈاکٹر عمیق حنفی کے حوالے سے ایک سوال تھا کہ'' جدید شاعری میں نام پیدا کرنے کے بعد وحید اختر کلاسیکی شاعری یعنی مرثیہ کی طرف کیوں رجوع ہوئے''

۔ان سوالات کے جواب میں وحید اختر نے ایک ہی مرثیے کے چند بند نقل کئے ہیں۔

(مرثیہ نظم کی اصناف میں۔ص ۷۶/۷۷)

خامہ میرا حکم قلم حق سے جواں ہے فیضِ نبی و ساقیٔ کوثر سے عیاں ہے
ہے اک اسی نسبت سے قلم میرا سرفراز اظہار غم ذات ہے آفاق کی پرواز
اسلوب کی جدت میں کلاسیک کا یہ اعجاز ہے مرثیے میں آج کی سی نظموں کا انداز
ابلاغ کی ہر سطح پہ ترسیل ہے ممکن
اعجاز و علائم میں بھی تفصیل ہے ممکن

ہر تجربۂ زیست ہے بے ہیئت و اسلوب احساس کی ہر طرح کے الفاظ ہیں مطلوب
مخصوص کوئی طرز نہیں فکر کو مرغوب کیوں صنفِ سخن ہے کوئی خوب اور کوئی ناخوب
ہو پھوٹنا چشمے کو تو پتھر بھی نہیں سخت
پھر شعر پہ کیوں قافیے ہوں تنگ زمیں سخت

قادر ہو قلم تو نہیں رکتا ہے کہیں بھی یاقوت اُگل دیتی ہے سنگلاخ میں بھی
دے اٹھتی ہے لو کھردرے لفظوں کی جبیں بھی بن جاتی ہے صواف بدآہنگ زمیں بھی
لفظوں کی چٹانوں سے اُبلتے ہیں معانی
اک بات کے سورج سے نکلتے ہیں معانی

ہے نثر کم آہنگ پہ جب شعر کا الزام کیوں مرثیہ و مثنوی و ہجو سے ابرام
نا شاعروں کے تجربوں کا شعر نہیں نام تیشہ ہو تو ہر سنگ میں بے تاب ہیں اجسام
کہدے جو قلم 'کُن' تو ہو عالم نیا پیدا
مٹی سے بھی کرلیتا ہے فن دیوتا پیدا

نہ جانے کیوں ڈاکٹر وحید اختر کے صرف ۸ مرثیے ''کربلا تا کربلا'' میں شائع ہوئے ہیں۔ اس کتاب کا سن اشاعت ۱۹۹۱ء ہے اور ڈاکٹر وحید اختر بقلم خود تحریر کر چکے ہیں کہ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۸۰ء تک وہ ۱۳ مرثیے کہہ چکے تھے۔ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۶ء تک اگر انہوں نے کوئی مرثیہ نہیں کہا تھا تو بھی ۱۳ مرثیوں کی تصدیق تو ہو چکی ہے۔ پھر وہ مرثیے کہاں گئے؟— ہو سکتا ہے مرثیہ کے ناقدین کے پاس اُن کا حساب ہو۔

☆☆☆☆☆

سید محسن نقوی (لاہور)

ولادت ۴ر مئی ۷ ۱۹۴ء (محلہ سادات بلاک ۴۵، ڈیرہ غازی خاں)۔ تاریخ شہادت ۱۵ر جنوری ۱۹۹۶ء، اقبال ٹاؤن لاہور کے بھرے بازار میں گولیوں کی بارش کر کے شہید کردیا گیا۔ اسلامی مملکت خداداد پاکستان کے صدر اور وزیر اعظم نے پسماندگان سے تعزیت کی۔ شہریوں کی جان و مال کی حفاظت کے ذمہ دار اداروں نے تفتیش کی، ملک کے اخبارات نے سیاہ حاشیوں میں شہید محسن نقوی کی شہادت کی خبر شائع کی اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ قاتلوں کو گرفتار کیا جائے۔ لیکن قاتلوں کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ کوئی گرفتاری عمل میں نہ آئی— کوئی فریاد کارگر نہ ہوئی۔ عوام قاتلوں کو پہچانتے ہیں مگر قانون نافذ کرنے والے ادارے انہیں تلاش نہ کر سکے۔

محسن نقوی کا نام غلام عباس، تخلص محسن، نقوی سید، شجرہ امام علی تقی علیہ السلام تک پہنچتا ہے، جدّ امجد علی راجن کا مزار 'لیہ' میں ہے۔ وطن ڈیرہ غازی خان، مسکن ہر حریت پسند کا دل تعلیم: گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 1۔ ڈیرہ غازی خان سے میٹریکولیشن کیا۔ گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازی خان سے بی۔ اے اور گورنمنٹ کالج ملتان سے ایم۔ اے کیا—

شاعری کا آغاز اس وقت سے ہوا جب محسن نقوی آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے پہلے پانچ برس کے دوران کہے گئے کلام کو خود ضائع کر دیا کہ (بقول اُن کے اپنے) ''ناگفتنی'' تھا۔ گورنمنٹ کالج ملتان میں ایم۔ اے کے طالب علم تھے کہ ۱۹۷۰ء میں پہلا مجموعہ کلام ''بند قبا'' شائع ہوا۔

تصانیف:

(۱) بند قبا (۲) برگ صحرا (۳) موجِ ادراک
(۴) ردائے خواب (۵) ریزۂ حرف (۶) عذابِ دید
(۷) طلوعِ اشک (۸) رختِ شب (۹) خیمۂ جاں
(۱۰) فراتِ فکر

غزل سے سلام اور قصائد و منقبت تک محسن نقوی کی شاعری میں فکر کی روشنی اور درد کی تڑپ نمایاں ہے۔ سرائیکی بولنے والے علاقے میں پیدا ہونے والے شاعر سید محسن نقوی نے اُردو زبان کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اُنہوں نے سرائیکی میں شاعری بھی کی۔ اُن کی سرائیکی غزلیں ریڈیو پاکستان ملتان کے مشاعروں سے لیکر ٹیلی وژن پر سرائیکی پروگرام ''رت رنگیلی'' تک گائی

گئیں ۔ لیکن ارتقا پسند اور ارتقاء پذیر فکر، علاقائی حدود کی پابند نہ رہ سکی اور فکرِ آزاد نے نعرۂ مستانہ لگایا۔ '' کچھ اور چاہئے وسعت میرے بیاں کے لئے'' یہ وسعت اُنھیں اپنی قومی زبان اُردو میں ملی ۔ جس کا اُنہوں نے خود اقرار کیا ہے کہ تقریر، تحریر، شاعری، گفتگو، کمپیئرنگ، خطوط، کالم، قطعہ، وہ سب کچھ اُردو میں کرتے تھے ۔ اس طرح چوبیس گھنٹوں میں سے بیس گھنٹے اُن کا اُردو سے واسطہ رہتا تھا۔

(انٹرویو پندرہ روزہ دستک ۔ لاہور ستمبر ۱۹۹۱ء)

محسن نقوی بیک وقت ذاکر و خطیب، شاعر، صحافی، براڈ کاسٹر بھی تھے اور سیاست کے میدان میں بھی اُن کے نقشِ کفِ پا ملتے ہیں ۔ پاکستان میں ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں بے نظیر بھٹو کی حمایت میں اُن کی نظم 'یا اللہ یا رسول، بے نظیر بے قصور' بے حد مقبول ہوئی ۔ اُنہوں نے اپنی شاعری کو خود ایک عنوان دیا تھا جو یہ ہے ۔

جن کے سجدوں سے منور ہے جبینِ آفتاب
میرے حرفوں کی عبارت ان خدا والوں کے نام
میری شہ رگ کا لہو، نذرِ شہیدانِ وفا
میرے جذبوں کی عقیدت کربلا والوں کے نام

اور یہی عنوان شاعری اُن کا مقصدِ حیات بھی تھا اور اسی کا عملی مظاہرہ بھی ہوا کہ اُن کا خون نذرِ شہیدانِ وفا ہوا اور اُن کی شہادت کربلا والوں کے نام پر ہوئی اس لئے کہ محسن نقوی جیسے باغ و بہار، ہمدرد، انسان دوست شاعر سے کسی کی کیا دشمنی ہو سکتی تھی سوائے اس کے کہ اُس کی فکر، اس کے ذکر، اُس کی ہر سانس میں کربلا والوں کا تذکرہ بسا ہوا تھا اور وہ یہی کہتا تھا کہ ۔

ہم چھپا کر اسے رکھتے ہیں کفن میں محسن
خونِ شبیر کی جس خاک سے خوشبو آئے

خونِ شبیرؑ کی مہک میں بسا ہوا انسان دوست انسان، شہیدِ انسانیت کا ماتم دار، نواسۂ رسولؐ اکرم کا عزادار، ذاکرِ مسافرِ شام، خطیب و نوحہ خوانِ زندانِ شام، حمادِ اہلبیت محسن نقوی تو بند دروازوں پر دستک دے دے کر غمِ حسینؑ اور محبت اہلبیت رسولؐ کی خوشبو بانٹتا پھرتا تھا ۔ اسے کون

گولیوں کا نشانہ نہ بنا سکتا تھا۔؟ ہماری زبانیں تو گنگ ہوگئی ہیں کہ اس 'کون' کو پہچاننے کے باوجود ہم اس کی نشاندہی نہیں کر سکتے لیکن تاریخ اپنے آپ کو ضرور دھراتی ہے، تاریخ اپنے آپ کو ضرور دھرائے گی۔ محسن کے ممدوح کے قتل کو ۶۰۰ برس تک حکومت کرنے والے حکمران نہ چھپا سکے تو محسن کا خون بھی ضرور رنگ لائے گا۔ وقت بدلہ ضرور لے گا۔

میرے لئے یہ اعزاز و شرف کی بات ہے کہ محسن میرا دوست تھا۔ ۱۹۹۲ء کا واقعہ ہے جب میں بیس برس بعد دو دن کے لئے لاہور گیا۔ میرے پاس وقت کم تھا اور میں دوستوں سے ملنا چاہتا تھا لہٰذا اے۔جی جوش نے ایک شاندار ہوٹل میں میرے نام پر ایک عصرانہ ترتیب دیا۔ نہ صرف لاہور بلکہ دوسرے شہروں سے بھی اہل قلم ساتھی زحمتیں اُٹھا کر مجھے ملنے آئے۔ لاہور شہر کی خاک کے ذرّوں میں میری جوانی کے خواب بسے ہوئے تھے۔ پرانے دوست ملے، نئے اہل قلم ملے، اپنے ملے، غیر ملے، نہیں ملا تو محسن نقوی، جلسہ ختم ہوا تو جعفر میر نمودار ہوئے، گلے ملتے وقت میرے کان میں کہنے لگے کل شام میں تمہیں لینے آؤں گا۔ محسن نقوی تم سے ملنا چاہتا ہے اس نے آج نہ آنے کی معذرت کی ہے۔ میں ابھی صورت حال کا جائزہ بھی نہ لے سکا تھا کہ جعفر میر چلے گئے۔ دوسرے دن رات کو مجھے کراچی جانا تھا۔ سرِ شام جعفر میر مجھے اپنے گھر اندرون بھاٹی گیٹ لاہور لے گئے جہاں پتلی پتلی گلیوں میں پیدل جانا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد ایک بچہ کاغذ کا ایک پرزہ ہاتھ میں لئے نمودار ہوا، پرچے پر لکھا تھا۔ عاشور سے کہنا میں ابھی آرہا ہوں۔ پھر ہم اس کے ساتھ ایر پورٹ بھی چلیں گے۔ آدھ گھنٹہ اور گذرا کہ ایک اور لڑکا ایک کاغذ کا ایک اور پرزہ لئے آیا۔ پرچے پر لکھا تھا" عاشور کو لے کر فوراً نکل جاؤ، میرا مطلب ہے فوراً"— اور جعفر میر نے میرا ہاتھ پکڑا اور دروازہ کھلا چھوڑ کے مجھے لے کر نکل پڑے، ہمیں کافی دور گلیوں میں سے پیدل گذرنا تھا۔ اس دوران جعفر میر خاموش تھے۔ اُن کے چہرے پر تردّد کی لکیریں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ بھاٹی دروازے تک لا کر اُنہوں نے مجھے ٹیکسی میں سوار کراتے وقت صرف اتنا کہا" یار معاف کرنا" "تم نہیں جانتے ہم کس طرح جی رہے ہیں۔ جاؤ سدھارو۔ مولا وارث۔ مولا عباسؑ کی ضمانت میں دیا تمہیں اور میں سوچتا رہ گیا کہ محسن نقوی کو ایسی کیا ایمرجنسی درپیش آگئی تھی کہ وہ نہ آسکے۔ مجھے عجلت میں اس گھر سے کیوں روانہ کیا؟ میرے ذہن میں جو بہت سے سوالیہ نشان اُبھرے اُن کا جواب مجھے جنوری ۱۹۹۶ء میں ملا اور میں نے ماتم کی

صداؤں میں وہ پیغام بھی سن لیا جو محسن مجھے دینا چاہتے تھے اور یہ بھی سمجھ میں آ گیا کی اُس دن محسن نے عجلت میں مجھے جعفر میر کے گھر سے نکل جانے کا پیغام کیوں بھیجا تھا۔ وہ مجھے بچانا چاہتا تھا۔ کاش اس نے ایسا نہ کیا ہوتا مگر مجھ گناہگار کے مقدر میں شہادت کہاں؟

ہمارا آج کا موضوع مرثیہ ہے۔ محسن کی شاعری پر لکھنا ہو تو جب تک قلم میں روانی اور ہاتھ میں سکت رہے انسان اُن پر لکھتا رہے اس لئے کہ اُن کی شاعری کا موضوع وسیع تر ہے۔ اُن کی شاعری نے غزل کے محدود صفات اور فانی محبوب سے لامحدود صفات اور لافانی ممدوح کی ثنا تک کا سفر طے کیا ہے۔ لیکن آج مرثیے کے حوالے سے بالخصوص محسن کی مرثیہ نگاری کے حوالے سے بات کرنی ہے۔ محسن نقوی مرثیے کی ساری روایات کو مانتے تھے۔ عبادت کی حد تک انیس و دبیر کا احترام کرتے تھے لیکن میری طرح مرثیے کے جمود کی بجائے ارتقاء کے قائل تھے۔ عصری حسیت اور وقت کی ضرورت کے ادراک پر زور دیتے تھے۔ اُنہوں نے لوازم مرثیہ سے انکار نہیں کیا مگر اپنے مرثیوں میں ان لوازم کے استعمال کو ضروری بھی نہیں سمجھا۔ وہ مرثیے میں "بین" سے زیادہ مقصدِ ذبحِ عظیم کو اہم سمجھتے تھے۔ ذیل میں اُن کے ایک مرثیے "فراتِ فکر" کے چند بند نقل کئے جا رہے ہیں جس سے اُن کی مرثیہ گوئی کے رجحانات کی نشاندہی ہوتی ہے۔

قریہ جاں میں اُبھرنے لگا پھر گریۂ شب پھر ملا اذنِ تکلم پئے یک جنبشِ لب
پھر بڑھی تشنہ لبی، حدّتِ خواہش کے سبب ۱ دیدۂ و دل کو ہے پھر چشمۂ کوثر کی طلب
آگہی غازۂ رخسارِ سحر مانگتی ہے
زندگی وقت سے جبریل کا پر مانگتی ہے

شہر در شہر مچی قہر سلاطین کی دھوم صحنِ گلشن میں مسلط ہوئی خود بادِ سموم
ظلمت جہل کی ہیبت سے پڑے زرد علوم لشکرِ جبر نے پامال کیا، حسنِ نجوم
جبر کا شور بڑھا، جب حدِ رسوائی سے
کھل گئی گرہِ جنوں صبر کی انگڑائی سے

صبر، سرمایۂ دل، صبر مناجاتِ ضمیر صبر خوشبو کی طرح، پھول کے سینے میں اسیر
صبر، صحرا سے گذرتے ہوئے بادل کا سفیر ۶ صبر، سقراط کے ہونٹوں پہ تبسم کی لکیر

صبر ایوانِ سلاطیں میں کہاں ملتا ہے
صبر کا پھول سرِ نوکِ سناں کھلتا ہے

صبر، غربت میں سدا دولت ثقلین اساس ۔ صبر، فرمانِ یقیں، صبر نگہدارِ قیاس
صبر قرآن بلب، صبر ہے تفسیر شناس ۷ صبر نبیوں کی قبا، صبر امامت کا لباس
صبر صدیوں کی ریاضت کا ثمر بنتا ہے
صبر بے چین دعاؤں کا اثر بنتا ہے

صبر آدم کا مقدر، کبھی ہابیل مزاج ۔ صبر، انساں کی مشقت کو فرشتوں کا خراج
صبر اوہام کا قیدی ہے نہ پابندِ رواج ۱۰ صبر کلیوں کا تبسم، کبھی خوشبو کا دماغ
صبر ہر جور و ستم خود سے بھلا دیتا ہے
صبر دشمن کو بھی جینے کی دعا دیتا ہے

جذبۂ نوح کبھی عزمِ براہیم ہے صبر ۔ وحدتِ فکر کے احساس کی تعظیم ہے صبر
عظمت ارض و سماوات کی تجسیم ہے صبر ۱۲ چشمۂ کوثر و خُم خانۂ تسنیم ہے صبر
صبر کے عزمِ مسلسل سے جو ٹکراتے ہیں
مطلق الحکم شہنشاہ بھی مٹ جاتے ہیں

صبر کونین کے چہرے کے لئے زینت و زین ۔ صبر معیارِ نظر دولتِ جاں، راحتِ عین
صبر خیبر کا جری، فاتح صد بدر و حنین ۱۳ صبر کردارِ نبی، صبر علمدارِ حسینؑ
صحن تاریخ میں جب خاک بکھر جاتی ہے
کربلا صبر کی معراج نظر آتی ہے

کربلا سجدہ گذاروں کے تقدس کی زمیں ۔ کربلا حسنِ رُخِ عرش معلیٰ کی امیں
کربلا، حق کا بدن، نقشۂ فردوس بریں ۱۴ کربلا عدل کا دستور، مودت کی جبیں
کربلا اب بھی وراءِ دسترسِ جبر سے ہے
کربلا روکشِ خورشید سدا صبر سے ہے

اور اب گریز کا ماہرانہ انداز ؂

جب بڑھا سوئے گریبان بشر ظلم کا ہاتھ ۔ زلزلانے لگا جب قصرِ شریعت کا ثبات

کھول اس بھید کو اے غربتِ عاشور کی رات ۱۵ بول رے دینِ پیمبر کی ابدرنگ حیات

تیرے جلتے ہوئے ہونٹوں پہ کوئی نام آیا؟

جز حسینؑ ابنِ علیؑ کون تیرے کام آیا

وہ حسینؑ ابنِ علیؑ، وقت کی تہذیب کا ناز جس نے افشا کیا انسان کی توقیر کا راز

جس کا ہر زخم ہے سرمایۂ تقدیرِ حجاز ۱۷ جس نے تیروں کے مصلّے پہ ادا کی ہے نماز

گرم جھونکوں سے جو احوالِ صبا پوچھتا ہے

زیرِ خنجر بھی جو خالق کی رضا پوچھتا ہے

ایک شاعر کی قدرتِ سخن گوئی یہ ہوتی ہے کہ موضوعاتی شاعری میں ماہرانہ گریز کے بعد دوسرے موضوع پر چلا جائے لیکن نظم کا اختتام پھر اصل موضوع پر واپس آ کر کرے۔ مرثیہ میں عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ 'چہرہ' کسی ایک موضوع پر ہوتا ہے۔ پھر گریز اندر گریز نظم کے پہلو بدلتے رہتے ہیں اور مرثیہ مصائب و بین پر ختم ہوتا ہے۔ اختتام مرثیہ کے بند، آغاز مرثیہ سے مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن محسن نقوی کے اس مرثیے میں مصائب کے اختتامی بند بھی آغاز اور عنوان سے مسلسل ہیں ۔

ایک اک کر کے بچھڑتے تھے جب انصارِ حسینؑ آسرا کوئی ضعیفی کا کوئی روح کا چین

یہ جواں لاش، وہ کم سن تو ادھر راحتِ عین ۲۶ ہچکیاں وہ کسی بچی کی کسی ماں کے وہ بین

زندگی درد سے بس دیدۂ تر جیسی تھی

عصرِ عاشور قیامت کی سحر جیسی تھی

مقتلِ شہ کی زمیں خون سے تر ہو کے رہی زندگی اپنے ہی سینے کی سپر ہو کے رہی

نوکِ نیزہ کی بلندی تھی کہ سر ہو کے رہی ظلم کے ابر چھٹے، دیں کی سحر ہو کے رہی

جبر کا نام و نشاں بھولا ہوا خواب ہوا

صبر، شبیرؑ کے سجدے سے ظفریاب ہوا

صبر شبیرؑ کے سجدے سے صبر ظفریاب ہوا، غمِ حسینؑ کی تابندگی اور ذکرِ حسینؑ کی سعادت سے محسن نقوی بھی ظفریاب ہوا اور بشریت کی اعلیٰ ترین منزل، شہادت پر فائز ہوا۔ یزید کو وہاں بھی

شکست ہوئی تھی اور یہاں بھی یزیدی ایک خونِ ناحق کے مرتکب ہوئے۔ ظلم وہاں بھی رسوا ہوا تھا اور یہاں بھی۔ جس جس دل میں غمِ حسینؑ کا اُجالا ہے اس دل میں محسنؔ نقوی نے بھی جگہ بنالی ہے۔ جس طرح وہ غم پائیدار ہے اسی طرح محسنؔ کا نام بھی فنا سے گذر کر بقا پا گیا۔

☆☆☆☆☆

ظہیرالدین حیدرؔ:- (جھنگ)

ولادت ، یکم ستمبر ۱۹۱۴ء (جگراؤں ضلع لدھیانہ) ۔وفات ۱۹۹۷ء

نام ظہیرالدین، تخلص حیدر۔ اُن کے دادا جوادؔ العلماء سید شریف حسن اور نانا شریف العلماء سید شریف حسین تھے جو میر انیس کے شاگرد تھے۔ ظہیر الدین حیدرؔ کے والد گرامی پروفیسر شریف علی وکٹوریہ کالج گوالیار میں فارسی کے پروفیسر تھے اور عالم وفاضل شخصیت تھے۔ یہاں تک ظہیر الدین حیدر کا حسب ونسب باعث افتخار ہے لیکن سید وحید الحسن ہاشمی ''صل من ناصرا'' میں اشارتاً اور سید ضمیر اختر نقوی نے (اور مرثیہ پاکستان میں) بصد ادب واحترام ایک نسل اور پیچھے کی طرف لوٹے ہیں جہاں اندھیرا زیادہ ہے۔ جس نام کو ان بزرگوں نے وجہ امتیاز بنایا ہے وہ ''اس گھر کو آگ لگ گئی'' مطبوعہ انجمن ترقی اُردو دہلی۔ مرتب عاشور کاظمی وسلیم قریشی اور دوسری کتاب ''غداروں کے خطوط'' مطبوعہ پاکستان میں جلی حروف میں لکھا ہے۔ ایک سوانح عمری ''تاریخ چشتیہ باغیچہ'' رجب علی مطبوعہ لاہور ۱۹۶۴ء بھی اس پر شاہد ہے۔

ظہیر الدین حیدرؔ خود اُردو، فارسی، عربی، انگریزی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد ظہیر الدین حیدر جھنگ آ گئے ـــ اُنہوں نے ملازمت کبھی نہیں کی۔ صاحب جائیداد تھے، شاعری اور باغبانی محبوب مشغلے تھے۔

شاعری کی ابتدا سولہ (۱۶) برس کی عمر سے کی۔ ابتدا غزل سے ہوئی۔ کسی شاعر سے مستقلاً سلسلہ تلمذ وابستہ نہیں کیا ـــ سلام، قصائد اور منقبت بھی کہتے تھے اور مرثیہ بھی۔ پہلا مرثیہ ۱۹۴۲ء میں کہا ـ ''کربلا والے بھی کیا اہلِ وفا گذرے ہیں''۔ اس کے بعد ۱۹۸۵ تک کوئی مرثیہ نہیں کہا۔ پنجاب میں قیصرؔ بارہوی وحید الحسن ہاشمی اور دیگر اہم مرثیہ نگاروں نے مرثیہ گوئی کی جو فضا قائم کی اس نے ظہیر الدین حیدرؔ کو از سرِ نو مرثیہ گوئی پر مائل کیا اور اُنہوں نے ۱۹۷۴ء میں

دوسرا مرثیہ ''آبروئے وفا'' کہا۔ یہ اس مرثیے میں حضرت عباس کی توصیف میں ظہیرالدین حیدر نے جو مصرعے دئے ہیں وہ ایمان افروز ہیں۔ یہ مرثیہ اگرچہ حضرت عباس علیہ السلام کے احوال پر ہے لیکن ابتدا ''الفت'' سے کی گئی ہے اور مرثیے کے چوتھے ہی بند میں گریز کر کے حضرت عباس کی منقبت شروع ہو جاتی ہے۔ چند بند نمونہ کلام کے طور پر درج ذیل ہیں۔

رشتۂ جاں سے فروزاں ہے چراغِ الفت	خونِ عاشق سے ہے رنگینی باغِ الفت
سایۂ تیغ میں ملتا ہے سراغِ الفت	۱	یعنی دامانِ فنا میں ہے فراغِ الفت
منزلِ عشق کی اس راہ سے حد ملتی ہے
جو بھی مرتا ہے اسے عمرِ ابد ملتی ہے

زخم الفت کے نہیں وقت سے بھرنے والے	جادۂ شوق سے گذریں گے گذرنے والے
نابلد راہ سے ہیں عشق نہ کرنے والے	۲	موت سے ڈرتے نہیں موت پہ مرنے والے
نذرِ جاں پر ہے محبت متقاضی دیکھو
شاہدِ حال ہے آئینۂ ماضی دیکھو

کربلا کا وہ مرقع، وہ بہتر کی شبیہ	کوئی حمزہؓ کی مثال اور کوئی جعفرؓ کی شبیہ
اس طرف خلد نظر قاسمؑ و اکبرؑ کی شبیہ	۳	اس طرف جلوہ فگن ثانیٔ حیدر کی شبیہ
صورتِ ماہ جو تنویر نظر آتی ہے
حسنِ عباسؑ کی تصویر نظر آتی ہے

لوحِ محفوظ پہ تحریر ہے عباسؑ کا نام	زیبِ نطقِ لبِ معصوم ہے عباسؑ کا نام
ایک گنجینۂ مقصود ہے عباسؑ کا نام	اہلِ حاجات کو معلوم ہے عباسؑ کا نام
کوکبِ نحس کی تاثیر بدل جاتی ہے
نامِ عباسؑ سے تقدیر بدل جاتی ہے

قبضہ دریا پہ کیا دیکھیے جرأت اُن کی	لشکرِ شام سے پوچھے کوئی سطوت اُن کی
اب بھی روضے پہ نظر آتی ہے ہیبت اُن کی	نام سے اُن کے برستی ہے جلالت اُن کی
رعب تھا زور و شجاعت کا جو جراروں پر
نام لکھا گیا عباسؑ کا تلواروں پر

اس مرثیے کے متعلق اُن کا اپنا بیان ہے کہ میر انیس کے ایک مشہور مرثیے ۔

''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' کا مطالعہ کرر ہے تھے کہ حضرت عباسؑ پر کہے گئے میر انیسؔ کے بند پڑھ کر ظہیر الدین حیدر پر ایک کیفیت طاری ہوگئی اور اُنہوں نے مرثیہ کہہ دیا۔ یقیناً ایسا ہوا ہوگا لیکن اس میں مرثیے کی اس فضا کا یقیناً عمل دخل ضرور ہے جو اُن دنوں لاہور اور پنجاب میں پیدا ہو رہی تھی۔

ظہیر الدین حیدر کا تیسرا مرثیہ ''اعزازِ نفس'' ہے جو فضائل سید الشہداؑ پر مشتمل ہے۔

مثلِ رسولؐ فخرِ مشیت حسینؑ ہے مثلِ بتولؑ فائزِ عصمت حسینؑ ہے
مثلِ علیؑ شریکِ رسالت حسینؑ ہے مثلِ حسنؑ وقارِ امامت حسینؑ ہے
چاروں کی خوبیاں ہیں شہِ خوش صفات میں
مثلِ حسینؑ کوئی نہیں کائنات میں

ظہیر الدین حیدر کا ایک اور مرثیہ ''رضائے اکبر'' ہے اس مرثیے کے ابتدائے میں اُنہوں نے وضاحت کی ہے کہ اُنہوں نے عام روایت کے برعکس حضرت علی اکبر کی شہادت کو شہادت اوّل قرار دے کر مرثیہ کہا ہے۔ اور اس کی دلیل کے طور پر اُنہوں نے زیارت امام کا ایک جملہ ''اے ابراہیم خلیل اللہ کی نسل کے شہیدِ اوّل'' کو بنیاد بنایا ہے۔ — حضرت علی اکبرؑ کو کربلا میں خانوادۂ رسالت کا شہیدِ اوّل کہنا ظہیر الدین حیدر کی طرف سے کوئی نئی روایت نہیں ہے۔ اس روایت کو اکثر ذاکرین نے پڑھا ہے۔ حضرت علی اکبر کو حسین مظلوم کے عزیزوں میں پہلا شہید اس بنیاد پر کہا ہے کہ اگر علی اکبر، رفقائے حسین کی موجودگی میں جام شہادت نوش کرتے ہیں تو یہ رفقائے حسینی کی جانثاری کے خلاف ہوتا۔ لیکن عزیزوں میں حسینؑ جیسے غیور با اصول، فطرتِ انسانی کے ماہر امامِ وقت سے یہ توقع بعید از قیاس نہیں کہ اُنہوں نے سب سے پہلے اپنے کڑیل جوان بیٹے کی قربانی دی ہو — شعراء کی حد تک بھی ظہیر الدین حیدر نے اس روایت کو نظم کرنے میں پہل نہیں کی ہے اس سے پہلے مرزا دبیرؔ اس روایت کو نظم کر چکے ہیں — بہر حال ظہیر الدین حیدر کا یہ مرثیہ ''رضائے اکبر'' اُن کا شہکار مرثیہ ہے۔

فرزندِ پیمبر کے پسر تھے علیؑ اکبرؑ لیلیٰ کے چمن کے گلِ تر تھے علیؑ اکبرؑ
یوسف کی طرح رشکِ قمر تھے علیؑ اکبرؑ آفت میں امامت کی سپر تھے علیؑ اکبرؑ

دیکھی نہ سُنی ایسی قرینے کی تمنّا
آغازِ جوانی میں نہ جینے کی تمنّا

ظہیرالدین حیدرؔ مرثیے کے معاملے میں قدیم و جدید کی بحث میں نہیں پڑتے، صرف زبان و بیان کی ندرت اور اسلوب پر نظر رکھتے ہیں، مرثیوں کی جو نہج قائم ہو چکی ہے اس سے ہٹ کر تجربات کرنے کے قائل بھی نہیں ہیں۔ میر انیسؔ، میر نفیسؔ کے بعد سید آل رضا اُن کے پسندیدہ مرثیہ نگار شاعر ہیں۔ اُن کا پہلا مجموعہ مراثی ''آیاتِ وفا'' ہے جس پر قیصر بارہوی کا پیش لفظ ہے۔ آخری سطور لکھنے تک دوسرے مجموعے کی اشاعت کی اطلاع نہیں مل سکی۔ سید وحید الحسن ہاشمی بھی کوئی اطلاع نہیں دے سکے۔

☆☆☆☆☆

ظفر شارب:- (لاہور)

ولادت ۱۹۲۷ء (موضع محمد پور، ضلع کانپور)۔ وفات ۱۹۹۷ء۔

نام سید ظفر الحسن، تخلص شاربؔ، قلمی نام ظفر شارب۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی۔ ۱۹۴۶ء میں کانپور سے میٹرک کیا۔ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کی اور لاہور آ گئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاضل کی سند حاصل کی۔

شاعری کی ابتدا لکھنؤ سے ہوئی تھی۔ تعلیمی دور کی ابتدا میں شعر کہنے شروع کر دیئے تھے۔ سب سے پہلے ایک نوحہ کہا۔ پھر غزلوں کی طرف رجحان ہوا۔ کانپور میں تھے تو نواب مرزا محمد اقبال ماچسؔ لکھنوی سے اصلاح لیتے رہے۔ پاکستان آئے تو حضرت قیصرؔ بارہوی کے شاگرد ہوئے اور سلام، قصائد، رباعی کی دنیا میں آ گئے مگر غزل گوئی بھی کرتے رہے۔ ۱۹۷۵ء میں پہلا مرثیہ کہا اور پھر ۱۹۹۷ء میں وفات کے وقت تک اسی کشتِ سخن کی آبیاری کرتے رہے۔

مرثیے کی ساری اقدار کی پابندی کے باوجود ظفر شاربؔ کے مرثیوں میں جدت کا عنصر بھی نمایاں رہا ہے اور فکر کا اُجالا بھی۔ بین کے موضوع پر بھی شارب جداگانہ رویہ رکھتے ہیں۔ ظفر شارب نے موضوعاتی مرثیے کہے ہیں مگر ہر موضوع کے تحت غور و فکر کے سمندر موجزن نظر آتے ہیں۔ اُردو شاعری میں عقل و عشق کا تقابل شعراء کا موضوعِ سخن رہا ہے۔ عام طور پر عقل کو عشق کے مقابل کم تر ثابت کیا گیا ہے جیسے

"عقل کی آرزو ہے اور، عشق کا مدعا دگر
عشق ہے منزلِ یقیں، عقل چراغِ رہگذر"

لیکن ظفر شارب نے عقل کو عشق پر ترجیح دی ہے اور مرثیے میں اس پر استدلال کیا ہے۔ اُن کے مرثیے "عقل کے جواہر" میں وہ عقل کی برتری ثابت کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

عشق سفاک تھا ہر گام جو حق کا دشمن   عقل کے خون سے چمکائے جنوں کے مدفن
تن کی زینت کے لئے بِک گئے مَن مل گئے دھن   لاشِ غیرت پہ ہنسا عشق کا عفریت کہن
یہ وہ منزل تھی کوئی عاقل و جرّار اُٹھے
وقت کہتا تھا کہ اب وقت کی تلوار اُٹھے

آئی آواز کہ ہاں ہاں وہ یہی ہے پیغام   عشق کے فسق کو ہونا ہے جہاں طشت از بام
یہی آواز تھی وہ امرِ خدا جس کا ہے نام   اسی آواز کو کہتے ہیں بقا کا پیغام
کربلا وقت کا آئینۂ پیکار ہوئی
عقلِ شبیرؑ کے پیکر میں نمودار ہوئی

پیکرِ عقل اُٹھا، عشق کے چھکّے چھوٹے   شامِ ظلمات کے گھر صبحِ عمل نے لوٹے
شیشۂ کبر گرا، ظرفِ ریاست ٹوٹے   فصلِ ایثار اُگی، کھلنے لگے گُل بوٹے
ڈوب کر وقت کی موجوں میں سفینہ اُبھرا
یوں سمجھ لیجئے مقتل سے مدینہ اُبھرا

دیکھئے عقل کی آنکھوں سے وہ مقتل وہ لہو   وہ لہو جس میں نبوتؐ کے گلوں کی خوشبو
چشمِ تاریخ میں بے وجہ نہیں ہیں آنسو   یاد کر لیجئے وہ بے شیر، وہ پیاسا لبِ جو
واقعہ کیسے کہوں منہ کو جگر آتا ہے
دستِ مظلوم پہ اک پھول نظر آتا ہے

ظفر شارب حضرت جوشؔ ملیح آبادی سے متاثر تھے۔ بین کے انداز میں ظفر شارب کے مرثیوں میں جوشؔ کی طرح عظمتِ کردار نمایاں رہتی تھی۔ اسی مرثیے "عقل کے جواہر" میں ظفر شارب نے حزن و ملال کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ بین کا انداز بھی اختیار کیا ہے مگر یہ عمل بھی عظمت کردار کو برقرار رکھتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ بین میں بھی مرثیے کا موضوع پیشِ نظر رہتا ہے یعنی "عقل"۔

دیدۂ فکر یہ منظر، یہ تلاطم دیکھے عقل اور عشق کا بھرپور تصادم دیکھے
لبِ ایثار کا خاموش تکلّم دیکھے تیر کے سامنے بچّے کا تبسّم دیکھے
اس تبسّم کو حیاتِ اَبدی کہتے ہیں
اس جگہ ہم علی اصغر کو علیؑ کہتے ہیں

سنگ دل رونے لگے سر کو جھکا کر ایک بار پوری تاریخ دکھائے کوئی ایسا ہتھیار
دل ہلے، مان گئے فوجِ شقی کے سالار علی اصغر کا تبسّم ہے علیؑ کی تلوار
لوگ بچّے کو شجاعِ ازلی کہتے ہیں
ہم اسے عقل حسینؑ ابن علیؑ کہتے ہیں

نکتۂ عقل اس انداز سے سمجھائے کوئی سنگ دل کہتے ہیں جن کو اُنھیں تڑپائے کوئی
اس طرح جنگ کے میداں میں ذرا آئے کوئی طفلِ بے شیر کو تیروں میں اُٹھا لائے کوئی
فیصلہ ہوگا حسینؑ ابن علیؑ زندہ باد
جس نے رُلوادیے پتھر وہ ہنسی زندہ باد

ورقِ درسِ شہادت ہے وہ بچّے کا گلا جس کی تحریر سے مظلوم کے مقصد کی بقا
حکمراں تیز کریں شوق سے رفتارِ جفا پھر بھی عاشور کے ہونٹوں سے یہ آئیگی صدا
صبرِ شبیرؑ سے انسان کی بنیائی ہے
علی اصغرؑ کا لہو، عقل کی بینائی ہے

آب پائے گا نہ اب اس طرح آئینۂ گل یوں نہ مقتل میں شہادت کی سجے گی محفل
ایسا ناوک نظر آئے گا نہ ایسا بسمل اب نہ پائے گا یہ معراج کسی باپ کا دل
دیکھ کر خونِ پسر شکر بجالائے گی
اب زمانے میں نہ ایسی کوئی ماں آئے گی

صبر شبیر کی معراج ہے خونِ اصغر عقل کی فتح اسے کہتے ہیں اربابِ نظر
یہ وہ منزل ہے کہ پھٹ جاتا ہے انسان کا جگر کیا عجب کوکھ جلی ماں نے کہا ہو رو کر
شیرِ زہراؑ کی صداقت پہ شہادت دیدی
آج اصغرؑ نے میرے خون کی قیمت دیدی

فاطمہ گود میں جب ننھی سی میت کو لئے آئیں گی اشک فشاں عرشِ الٰہی کے تلے
خاک چہرے پہ ملے، بال بھی بکھرائے ہوئے زخمِ پہلو، غمِ محسنؑ کے بھلا کر شکوے
رو کے فریاد کریں گی کہ دہائی یارب
تجھ سے ہے داد طلب غم کی ستائی یارب
میرے سب مارے گئے ماہ لقا، صبر کیا خون عباسؑ کا دریا پہ بہا، صبر کیا
تیر اکبرؑ کے کلیجہ میں گڑا، صبر کیا کٹ گیا پیارے مسافر کا گلا، صبر کیا
خون بہا اُن کا ہے کیا، کون حقیقت جانے
اس کو تو جانے اور اب تیری عدالت جانے
میں تو بے شیر کو لائی ہوں دکھانے کو گلا دشمنِ عقل شقی جس نے اسے قتل کیا
مدعی تھا وہ تیرے عشق کا اب تو ہی بتا خوں بہا کیا میرے بچے کا ملے گا مولا
سن کے بی بی کی یہ فریاد فلک روئیں گے
عرش تھرآئے گا سب جن و ملک روئیں گے

ظفر شارؔب کے پُر درد لہجے میں انقلابی رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ علی اصغر کی شہادت پر ایک اور مرثیے کا بند ہے ۔

ہر عہد کے جوان کہیں گے یہ داستاں اکبر کے خون سے ہے شرافت کی کہکشاں
آواز دیں گی پھول کی معصوم پتیاں پیدا نہ ہوگا اب علی اصغر سا بے زباں
ہنگام عصر صبر کا نظارہ بن گئی
ننھی سی قبر دین کا گہوارا بن گئی

بس یہی فکر کا نور، عقل کی شمع، درد کے لہجے میں انقلاب کا آہنگ ظفر شارؔب ہیں۔

☆☆☆☆☆

صہبا اختر:- (کراچی)

پیدائش ۱۹۳۲ء (بمقام جموں کشمیر) ۔وفات ۱۹۹۷ء (کراچی)

علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ تقسیم ہند کے بعد صہبؔا اختر پاکستان آگئے اور کراچی کو مسکن بنالیا۔ صہبا اختر کا شمار ملک کے نامور شاعروں میں ہوتا ہے۔ تمام اصناف سخن

میں شعر کہے مگر اُن کی پہچان ''نظم'' ہے۔ نظم کہتے بھی خوب تھے اور پڑھتے بھی خوب تھے۔ مرثیے کے حوالے سے اُن کا نام اکّادکّا مرثیہ کہنے والوں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اُن کے سلام اور قصائد بہت مقبول ہوئے ہیں۔ امام حسینؑ کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت کے طور پر اُن کی بہت سی نظمیں مقبول ہوئیں۔ بہت سی نظمیں مسدّس کی ہیئت میں بھی ہیں جنہیں مرثیہ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک مسدّس میں سید آلِ رضا کو بحیثیت شاعرِ اہلبیت خراجِ عقیدت بھی پیش کیا ہے۔ یہ مسدّس بھی قصیدے کا طمطراق لئے ہوئے ہے۔ سید ضمیر اختر نقوی نے اُن کے تین بند نقل کئے ہیں اور یہ بند مرثیے کے بند قرار دیئے ہیں۔

آخرش راہِ وفا میں وہ مقام آ ہی گیا   اِک نمازِ خاص میں وقتِ قیام آ ہی گیا
اک فنا کے دشت میں نقشِ دوام آ ہی گیا   آسمانوں سے شہیدوں پر سلام آ ہی گیا
آمدِ شبیرؑ سے جاگے نصیبِ کربلا
کربلا کو مِل گیا آخر حبیبِ کربلا

شر کے آگے ہوگئی جب خیر کی حجت تمام   آگئے کوفے کے لشکر، چھا گئیں افواجِ شام
شمر و ابنِ سعد جیسے سب جہنّم کے غلام   جب ہوئے آمادۂ پیکار تو میرا امام
کفر کی تاریکیوں میں باتجلّیٔ فراغ
آگیا میدان میں لے کر محمدؐ کا چراغ

بر قبائے خوں چکیدہ، بن گئی صبحِ امید   اِک شہِ مظلوم کی ہر ضرب تھی اتنی شدید
پھر کبھی ابھرا نہیں اس خاک پر تاجِ یزید   بن گیا قرآں کی عظمت، کربلا کا ہر شہید
از سرِ نو، دینِ حق کا نام زندہ ہوگیا
مرگئے مظلوم پر اسلام زندہ ہوگیا

بشریت کا یہ تقاضہ ہے کہ صہبا اختر کے مرثیوں کو مسدّس کے خانے رکھا جائے، لیکن فکر کے پیشِ نظر یہ مرحلہ ہے کہ مرثیہ، منقبت، حمد و نعت، سلام، اور مرثیہ وہ شاعری ہے جس کا معیار تو ایک طرح سے زمانہ مقرر کرتا ہے لیکن اس کا صلہ اور قبولیت کا تعلق ممدوح سے بھی ہوتا ہے۔ اور ہم نہیں جانتے ممدوح نے اُن کے کلام کو کیا رتبہ دیا ہے۔

☆☆☆☆☆

حسین اعظمی :- (کراچی)

ولادت ۳/ستمبر ۱۹۲۴ء بروز عاشور (لکھنؤ)۔وفات ۱۹۹۷ء

والد گرامی، مرزا مولوی محمد عابد۔ تعلیم سلطان المدارس لکھنؤ اور الہ آباد یونیورسٹی۔ ۱۹۳۸ء میں مولوی ہوئے۔اسی یونیورسٹی سے ۱۹۳۹ء میں "عالم" بنے، ۱۹۴۵ء میں ہی لکھنؤ یونیورسٹی سے دبیرِ کامل کی سند لی اور آخر کار ۱۹۴۷ء میں پاکستان آگئے، پنجاب یونیورسٹی میں ایم۔اے میں داخلہ لیا، سال اوّل (اُردو) پاس کیا اور شعبۂ صحافت سے منسلک ہو گئے۔

صحافیانہ سرگرمیاں:

— روزنامہ 'حیات' کراچی (۱۹۴۷ء) بحیثیت سب ایڈیٹر

— روزنامہ 'غازی' لاہور (۱۹۴۸ء) ......ایڈیٹر

— نوائے وقت لاہور، امروز لاہور۔ روزنامہ انجام کراچی، روزنامہ جنگ میں خدمات سرانجام دیں۔

شاعری کا آغاز ۹ برس کی عمر میں ہوا۔ ابتدا میں نیرؔ تخلص پسند تھا۔ پھر اعظمیؔ اچھا لگا۔ غزلیں زیادہ تیرؔ، نیرؔ نے کہی ہیں۔ قصائد، سلام اور رثائی یا عزائی ادب میں اعظمیؔ تخلص رہا۔

پاکستان بننے کے بعد یعنی بیسویں صدی کی پانچویں دھائی کے بعد جن شعراء کرام نے مرثیہ گوئی کی، کم وبیش اُن سب کو جدید مرثیہ گو کہہ دیا جاتا ہے جبکہ وہ سب دورِ جدید کے مرثیہ گو ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ جدید مرثیہ کے شاعر بھی ہوں۔ حسین اعظمیؔ بلاشبہ زود گو، پختہ گو اور مستند مرثیہ گو شاعر ہیں لیکن اُنہوں نے مرثیے کی روایت کو اپنایا اور آگے بڑھایا ہے۔اُن کے ہاں انقلاب کی مشعل بھی روشن نظر آتی ہے لیکن سارا تلازمہ کلاسکی ہے۔مرثیوں کے موضوعات میں کردارِ حسینی کو مشعل راہ بنایا ہے اور حسینؑ کو کردار کے معیار پر عالم انسانیت کا رہنما کہا ہے—اس کردار حسینی کی جھلک کربلا کے سارے شہیدوں میں تلاش کی ہے۔اُن کا ایک مشہور مرثیہ "کشورِ قلم" ہے ۔

یارب میں تجھ سے شمس و قمر مانگتا نہیں یا تاج و تخت و لعل و گہر مانگتا نہیں
بے زر ہوں پھر بھی کیسۂ زر مانگتا نہیں نادار ہوں پہ لقمۂ تر مانگتا نہیں

نورِ یقین و سوزِ جگر مانگتا ہوں میں
پاکیزگیٔ فکر و نظر مانگتا ہوں میں

لکھنا ہے مجھ کو حق و ہدایت کی داستاں صبر و ثبات و عزم و شجاعت کی داستاں
بنت علیؑ کے زورِ خطابت کی داستاں ۳ مردانِ حق کے جوشِ شہادت کی داستاں

یارب مجھے بھی جذبۂ بدر و حُنین دے
میرے قلم کو جوہرِ تیغ حسینؑ دے

اور واقعی جب حسین اعظمی کا قلم بنتِ علی سیدہ زینبؑ کے زورِ خطابت کو لکھنے کی منزل پر آیا تو سچ مچ ایسا ہی لگا کہ تیغِ حسینؑ مصروفِ قتال ہے۔

یہ جنگ سب سے پہلے نبی سے لڑی گئی بعد از نبیؐ، نبیؐ کے وصی سے لڑی گئی
پھر کربلا میں آلِ علیؑ سے لڑی گئی ۵۷ ہر دور میں یہ حق کے ولی سے لڑی گئی

پھیلی ہوئی ہیں اس کی جڑیں دور دور تک
جاری رہے گی حجتِ حق کے ظہور تک

میدان کربلا کی لڑائی کا سلسلہ بازار کوفہ ہوتا ہوا شام تک گیا
دشوار اور فیصلہ کن تھا یہ مرحلہ ۵۹ بنت علیؑ نے تیغِ خطابت سے سر کیا

اقدام کربلا کی وضاحت کا وقت تھا
تلوار کا نہیں، یہ خطابت کا وقت تھا

فرمایا حمد و شکر ہے رب قدیر کا جس کے سوا نہیں ہے کوئی دوسرا خدا
جس کی نہ ابتدا ہے کوئی اور نہ انتہا ۶۲ جس کی تجلیات سے معمور ہے فضا

جس کا کرم ہے جلوہ نما شش جہات میں
جس کا کوئی شریک نہیں کائنات میں

جس نے ہمارے جدؐ کو کیا فخرِ انبیاء جس نے ہمیں کیا ہے عطا تاج ہل اتیٰ
جس نے ہمیں حفاظتِ دیں کے لئے چنا ۶۳ بخشا ہے جس نے ہم کو شہادت کا حوصلہ

محبوب کہہ کے جدؐ کو ہمارے پکارا ہے
قرآن جس نے گھر میں ہمارے اُتارا ہے

ہم وجہ کائنات ہیں، ہم نازشِ وجود در پر ہمارے رہتا تھا جبریل کا درود
ہم سے اگر ہو بغض تو بے سود ہیں سجود ۶۴ ہم اہلبیتِ پاک ہیں، ہم پر پڑھو درود

سب اہل حق خراج ہمیں دل سے دیتے ہیں
ہم وہ ہیں جن کا نام وضو کر کے لیتے ہیں

عالم میں اور کس کا ہے ایسا حسب نسب زیرِ فلک ملا ہے کسی کو شرف یہ کب
ماں، باپ، بھائی، نانا ہیں معصوم سب کے سب ۶۵ ایسی کوئی مثال نہ پہلے تھی اور نہ اب
میں بنتِ فاطمہؑ ہوں، نواسی نبیؑ کی ہوں
حسنین میرے بھائی ہیں، بیٹی علیؑ کی ہوں

ننگِ بشر یزید، ستم پیشہ، فتنہ گر باطل پرست، دشمنِ اسلام، خیرہ سر
بے دین و بدشعار و بد انجام و بد گہر ۶۶ تو تختِ زر پہ، طشت میں سبطِ نبی کا سر
ہے کون سا وہ ظلم جو ہم پر روا نہیں
ظالم سمجھ رہا ہے کہ روزِ جزا نہیں

تیری کنیزیں پردے میں شام و سحر رہیں اور بیٹیاں رسولؐ کی یوں ننگے سر رہیں
معصوم بچے ظالموں کی جھڑکیاں سہیں ۶۷ یہ انقلاب ۔ تجھ سے کلام اور ہم کریں
مجھ سے زباں درازیاں تو روبرو کرے
اللہ تجھ کو حشر میں بے آبرو کرے

سکتے میں خود یزید تھا اوروں کا ذکر کیا سر کو جھکائے سنتا رہا بانیٔ جفا
کہتا تھا دل میں، سوچا تھا کیا اور کیا ہوا یہ جشنِ فتح آنکھ کا ناسور بن گیا
تحریفِ دیں کی کوششیں بے سود ہوگئیں
سب سازشیں بزرگوں کی مردود ہوگئیں

زینبؑ نے انقلاب کی ہموار راہ کی ذہنوں میں حق شناسی کی ضو پھوٹنے لگی
گو انقلاب کی ابھی رفتار سست تھی ۶۸ چھائی ہوئی دلوں پہ تھی باطل کی تیرگی
اس شان سے جو شام میں اعلانِ حق ہوا
باطل کی تیرگی کا کلیجہ بھی شق ہوا

کردارِ حسینی کو مشعلِ راہ بنانے والے شاعر حسین اعظمی جہاں کردار میں کمزوری دیکھتے ہیں برداشت نہیں کر سکتے ۔ عصرِ حاضر میں مسلمانوں کی بے راہ روی اُنہیں بہت دکھی کرتی ہے اور

اُن کا کرب اشعار میں یوں ڈھل جاتا ہے ؎

کوئی منصب کا ہے بندہ، کوئی طاقت کا غلام ہے سگِ نفس ان اغراض پرستوں کا امام
ان کو قرآں سے غرض اور نہ اسلام سے کام ہر طرف مکر و شقاوت کے ہیں پھیلے ہوئے دام
آج بھی سلسلۂ جور و جفا جاری ہے
دوستو معرکۂ کربلا و بلا جاری ہے

اس بند کے چار مصرعوں میں مرزا اوؔج کے تخاطب کی گھن گرج سنائی دیتی ہے اور لہجہ بھی وہی ہے جو مرزا اوج نے طلباء (وہ علماء جو حصولِ علم کر رہے تھے) سے تخاطب کے وقت اپنایا تھا۔ اور بیت میں حسین اعظمی کی عظمتِ فن نظر آرہی ہے— کیسی سچی بات کہی ہے شاعر اہلبیت جناب حسین انجم نے۔ ؎

"آج بھی معرکۂ کرب و بلا جاری ہے"

☆☆☆☆☆

شہزاد معصومی :- پالی (بہار)

تاریخ پیدائش ۲۵ رجنوری ۱۹۲۹ء۔ وفات ۲۳ راگست ۱۹۹۸ء۔

نام سید شہزاد حسن معصومی، تخلص شہزاؔد۔ والد کا اسم گرامی سید آل حسن معصومی۔ وطن موضع علی نگر پالی، ضلع جہاں آباد (بہار)

تصانیف: (۱) "شعلۂ تشنگی" ۱۹۸۰ء (غزلیات و منظومات)
(۲) "تیغ و گلو" ۱۹۹۷ء (مجموعہ مراثی)

"تیغ و گلو" کے پیش لفظ میں شہزاد معصومی اپنی مرثیہ نگاری کا خود تعارف کراتے ہیں:

"میرے وطن علی نگر پالی میں محرّم کی مجلسوں کی قدیم ترین روایت مرثیہ خوانی رہی ہے، بچے پیش خوانی کرتے تھے اور اچھے مرثیہ خوان بن جاتے تھے۔ میں بھی پیش خوانی کرتے کرتے مرثیہ خوان بن گیا اور ذوقِ مرثیہ خوانی نے مجھ میں رباعی، قطعات، سلام، مرثیہ اور دیگر اصناف سخن مثلاً غزل عقیدہ مثنوی وغیرہ کو سمجھنے اور جاننے کا شوق بھی پیدا کیا"

("تیغ و گلو"— ص ۵)

شہزاد معصومی کالج تک پہنچنے سے پہلے ہی اشعار موزوں کرنے لگے تھے، اُن کے والد گرامی سیّد آلِ حسن معصومی نے (جو خود اعلیٰ درجے کے شاعر تھے) اصلاح دی، کالج کے ادبی ماحول میں اُن دنوں ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی پر بحثیں جاری تھیں، شہزاد معصومی کی حساس طبیعت نے ادب برائے زندگی کے رویّے کو پسند کیا اور ترقی پسند تحریک کے ساتھ ہو گئے۔ اور جب اُنہوں نے انسانی دکھ درد سے رشتے استوار کئے تو جستجو اُنہیں تاریخ انسانی کے اُن کرداروں تک لے گئی جنہوں نے وقارِ آدمیت کے لئے مصائب کو گلے لگایا۔ جن کی مظلومیت نے ظلم کو پاش پاش کر دیا۔ اس منزل پر میر انیسؔ، شادؔ عظیم آبادی اور جمیلؔ مظہری کا کلام شہزاد معصومی کے لئے راہ نما ٹھہرا اور وہ ایسی منزل فکر پر پہنچے جہاں بہت سی صداقتیں اُن پر آشکار ہو گئیں، گویا اقتدار سے اجتناب اور ظلم کے مقابل مظلومیت کی حمایت کا جذبہ اُن کا شعارِ حیات بن گیا۔

''تیغ وگلو'' میں شہزاد معصومی کے بارہ (۱۲) مراثی شامل ہیں۔ وہ اپنے مرثیوں میں روایت سے مسلسل اور لوازم مرثیہ کے حتی الوسع پابند رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وقت کی بدلتی قدروں کے ادراک نے اُنہیں یہ بھی سوچنے پر مجبور کیا کہ زندگی میں بڑھتی ہوئی مصروفیات کے پیش نظر افکار میں شدّت اور اظہار میں طوالت کو کم کرنا ضروری ہے۔ اختصار کے اس رجحان کے باوجود اُنہوں نے مصائب کے بیان میں کوتاہی نہیں کی۔۔۔ ''تیغ وگلو'' کا پہلا مرثیہ ''حُرِ حق بین وحق تلاش'' شہزاد معصومی کی پروازِ فکر کی سمت اور وسعت متعین کرتا ہے۔ درجِ ذیل بند میں روایتی انداز میں'' ساقی'' سے تخاطب ہے، لیکن سارے لوازم اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

ساقی عطا ہو فکر کو وہ جامِ بیخودی خود میکدہ بدوش ہو طبعِ رواں میری
ہے شادؔ اور انیسؔ کی منظور پیروی ا جن کی زباں ہے معجزۂ فن و شاعری
پتھر بھی موم، سحر بیانی سے جس کی ہو
دریا بھی آب آب روانی سے جس کی ہو

بر وقت و برمحل کہ جو کام آئے وہ زباں ہنگام کارزار ہو تیغ شرر فشاں
برسائے شہد و شیر سرِ بزمِ دوستاں ۲ کہلاؤں جس کے فیض سے میں ماہر اللساں
سر بستہ رازِ فطرتِ کبریٰ کو کھول دے
لفظوں میں روحِ حافظ و خیام گھول دے

ساقی نامہ کو چار بند میں سمیٹ کر گریز کی طرف ۔

ہاں اے زبان خامہ بہکنا نہ چاہئے تحریر میں تضاد جھلکنا نہ چاہئے
منزل کڑی ہے راہ میں تھکنا نہ چاہئے ۵ رستے کے پیچ و خم میں بھٹکنا نہ چاہئے
وہ دیکھ سامنے ہے شبستانِ کربلا
بیٹھا ہے جانماز پہ مہمانِ کربلا

مہمانِ کربلا، پسرِ شاہِ مشرقین حیدرؑ کا لال، فاطمہ زہراؑ کے دل کا چین
اسلام کا ضمیر، محمدؐ کا نورعین ۶ یعنی شہید معرکۂ کربلا، حسینؑ
انسانیت کو ناز ہے جس کے اصول پر
جس کے عمل کی مہر ہے دینِ رسولؐ پر

اللہ رے حسینؑ کا وہ سجدۂ نیاز اللہ رے معرفت میں وہ ڈوبی ہوئی نماز
اللہ رے وہ زبان پر آیاتِ دلگداز ۸ اللہ رے وہ خلوص و محبت کا سوز و ساز
اس بندگی پہ روحِ عبادت کو ناز ہے
اس شانِ عبدیت پہ مشیت کو ناز ہے

(مرثیہ، حرحق بین وحق تلاش)

شہزاد معصومی نے حسینؑ کا تعارف کربلا کی نماز سے کیا۔ پھر امام حسینؑ کو معرکہ حق و باطل میں حق کی نشانی کے طور پر متعارف کرایا۔

ہے منفرد زمانے میں یہ خیر و شر کی جنگ وہ کربلا کے دشت میں فکر و نظر کی جنگ
باطل سے یوں ہوئی نہ حقوقِ بشر کی جنگ ۶ اللہ رے حسینؑ کی وہ دوپہر کی جنگ
تا حشر حق کو مطلعِ خورشید کردیا
انسانیت کو زندۂ جاوید کردیا

شعلوں سے جس کے دیو خباثت کا جل گیا لوہا مزاجِ جبر و تشدد کا گل گیا
انساں صفا و صدق کے سانچے میں ڈھل گیا ۷ نفسانیت کی قید سے آگے نکل گیا
نیک اور بد کے فرق سے آگاہ ہوگیا
ذہنِ بشر چراغِ سرِ راہ ہوگیا

(مرثیہ مردِ فقیہہ حبیب ابن مظاہر)

روایت کی پاسداری کے حوالے سے اُن کے مرثیے میں تلوار کی تعریف کا انداز۔

تھی جو پیاسی تو لعینوں کا لہو چاٹ گئی آئی اس گھاٹ کبھی اور کبھی اُس گھاٹ گئی
تھا جو افواج کا جنگل یہ اسے کاٹ گئی ۴۰ لاش پر لاش گری رن کی زمیں پاٹ گئی
سر بہ سر گیند کی مانند اُڑائے اس نے
پھول زخموں کے ہر اک سمت کھلائے اس نے

گھوڑے کی تعریف

روکتے گر نہ فرس کو پسرِ سرورِ دیں جاتا اُڑ کر سرِ افلاک سبھوں کو تھا یقیں
اور پھر آتا وہاں سے جو سوئے فرشِ زمیں ۳۸ نہ رسالہ کوئی بچتا نہ کوئی لشکرِ کیں
پاس گر ہوتا محمدؐ کی نہ اُمت کا وہاں
حشر سے پہلے نظر آتا قیامت کا سماں

(مرثیہ: سر کے اسلام کو اکبر نے جوانی دیدی)

لیکن روایت کی اس پاسداری کے ساتھ شہزاد معصومی جدید افکار و خیالات اور عصر حاضر میں انسان کے کرب سے بھی آگاہ ہیں ۔

دیکھیے اس دور میں قوموں کا مقدر کوئی خالی از تشنۂ تخریب نہیں سر کوئی
عافیت گھر میں بھی جب ہو نہ میسّر کوئی ۱ کیا کرے فکرِ سخن، آج سخنور کوئی
ایک انجانی سی دہشت میں گرفتار ہے زیست
اپنے ہی سر پہ لٹکتی ہوئی تلوار ہے زیست

صلح جوئی کے عوض لوگ ہیں مائل بہ فساد دوست کے بھیس میں ہے جال بچھائے صیاد
قول اور فعل میں افراد کے ہے بُعد و تضاد ۳ آج ہر فرد کے ہے پیشِ نظر اپنا مفاد
ایک چہرے میں نہاں ہوتے ہیں کتنے چہرے
سیرتاً فتنہ و شر، صورتاً اُجلے چہرے

(مرثیہ خُردلاور)

بیسویں صدی کا ایک المیہ، ترقی پذیر قوموں کو ترقی یافتہ قوموں کی امداد (Aid) ہے

جس پر پوری تیسری دنیا پل رہی ہے، شہزاد معصومی میدان سیاست کے شہسوار نہیں ہیں لیکن بحیثیت ایک قلم کار کے وہ اس ''عذاب امداد'' سے قوموں کو آگاہ کرتے ہیں ۔

اپنی چادر سے سوا پیر جو پھیلاتے ہیں غیر کے خوانِ عنایت پہ جو اتراتے ہیں
جھوٹی شہرت کی ہوس میں جو مرے جاتے ہیں اُن چراغوں کی طرح بزم میں کملاتے ہیں
جن چراغوں کے کف دست میں روغن ہی نہ ہو
لاکھ کوشش پہ بھی گوشہ کوئی روشن ہی نہ ہو

بھیک کو زیست کا اپنی جو سہارا سمجھیں بند پانی کو وہ سیلاب کا دھارا سمجھیں
وہ ذرا وقت کے تیور کا اشارا سمجھیں کل نہ سمجھے تھے مگر آج خدارا سمجھیں
غیر کی بخشش بیہم کا بھروسہ کیا ہو
کھینچ لے ہاتھ جو منعم تو نتیجہ کیا ہو

(مرثیہ: بے زبانی کہ چلی ایسی نہ شمشیر کوئی)

یہ سارے اقتباسات اس حقیقت پر دلالت کرتے ہیں کہ شہزاد معصومی ایک پختہ گو مرثیہ نگار ہیں اور اُنہوں نے بڑی خوبصورتی سے روایت کے خاکے میں عصر حاضر کی تلخ حقیقتوں کے رنگ بھرے ہیں۔ ہیئت میں روایت کی پابندی کے باوجود ان کی ترقی پسند فکر ان کے مراثی میں نمایاں رہی ہے۔

☆☆☆☆☆

جوھر نظامی :- (سرگودہا)

ولادت ۱۹۰۹ء۔ وفات ۱۹۹۸ء

والد کا اسم گرامی غلام حسن۔ راجپوت خاندان کے فرد تھے۔ وطن مالوف قصبہ شاہ پور، ضلع سرگودہا (پاکستان)۔ سرگودہا ہائی سکول سے ۱۹۲۶ء میں میٹرک پاس کیا۔ زندگی کے پچاس برس سرگودہا میں گذارے، بعد میں تھل ڈیولپمنٹ اتھارٹی کی ملازمت کے سبب جوہرآباد اور لاہور گئے۔ شاعری کا آغاز سرگودہا میں ہوا۔ باقاعدہ کسی کے شاگرد نہیں تھے۔ غزل میں فانی بدایونی کو اپنا معنوی استاد مانتے تھے اور مرثیہ نگاری میں میر انیس کے اس حد تک مقلد تھے کہ جدید مرثیے کو قبول نہ کیا۔ اسی حوالے سے اُن کا یہ قول بھی ملتا ہے۔

"میرے نزدیک تجدّد کو نہ غزل میں کامیابی ہوئی اور نہ ہی مرثیہ نگاری میں — یہ ایک اچھی نظم برنگ مسدّس ہوتی ہے مگر ہم اسے مرثیہ نہیں کہہ سکتے۔ مرثیے کے لئے جو تکنیک میر انیسؔ نے یا اُن کے ہم عصر مرثیہ گو شعراء نے اختیار کی تھی میرے نزدیک وہی درست ہے"

(اُردو مرثیہ پاکستان میں — ص ۵۱۱)

اللہ اللہ، خیر صلّا — مرثیے کا ارتقا بھی ختم، اور شاعری میں نئے تجربات کا بھی کریا کرم۔

جوہر نظامی مرثیے کے علاوہ غزل کی دنیا میں بھی جانے پہچانے شاعر ہیں لیکن اُن کا شمار اُن شعراء کرام میں ہوتا ہے جنہوں نے بدلتی قدروں سے سمجھوتہ نہیں کیا بلکہ غزل کی کلاسیکی روایات کا پرچم بلند رکھا۔ غزل کی دنیا میں بہت سے شعراء کرام ترقی پسند فکر کو عملی طور پر اپناتے ہیں، کبھی کبھار اسی نہج پر شعر بھی کہہ ڈالتے ہیں مگر ترقی پسند فکر کو تسلیم کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ ہر چند کہ جوہرؔ نظامی اسی صف کے بزرگ شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں مگر اُن کی غزلوں میں ترقی پسند فکر کے شعلے بھی ہیں اور مرثیے کا درد و گداز بھی۔

آئے گی، اک چمکتی ہوئی صبح آئے گی
اتنا شبِ سیاہ سے میں بدگماں نہیں

لازم ہے زندگی کی طہارت کے واسطے　　ہو کچھ نہ کچھ لگاؤ طبیعت کو غم کے ساتھ
کس کی تعظیم کو صحرا کے بگولے اُٹھے　　کون تھا خلوتیٔ دشتِ بلا میرے بعد

"یہ خلوتی دشتِ بلا" کا تصور کربلا کے علاوہ کہاں سے مل سکتا ہے۔ غزلوں میں رثائی ادب کی تہذیب آخر اُنہیں مرثیہ نگاری کی طرف لے گئی جس کا احوال وہ خود لکھتے ہیں:

"مذہب کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ میر انیسؔ اور مرزا دبیر کے مرثیے زیرِ مطالعہ رہے اور حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب سے والہانہ عقیدت ہوگئی، پہلے پہلے میں مجالس میں میر صاحب کا مرثیہ پڑھا کرتا تھا۔ بعد میں جناب قیصر بارہوی کی مجالس سنیں اور یہ حقیقت ہے کہ مجھے مرثیہ نگاری کی طرف ان کی مجالس نے رغبت دلائی، بعد میں جب ڈاکٹر

صفدر حسین صاحب گورنمنٹ کالج جوہر آباد میں پرنسپل ہو کر آئے تو ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ طویل تر ہو گیا اور حق یہ ہے کہ ان کے مرثیے نے کچھ ایسا متاثر کیا کہ میں نے از خود قلم سنبھال لیا۔"

(جوہر نظامی کے ایک خط (مرقومہ ۷ ر نومبر ۱۹۷۷ء) سے اقتباس)

جوہر نظامی نے پہلا مرثیہ ۱۹۷۳ء میں کہا اور جس مجلس میں یہ مرثیہ پیش کیا اس میں نجم آفندی موجود تھے۔ نجم آفندی نے اس مرثیے پر داد دی۔ اس مرثیے کا عنوان "بعد شہادتِ حسینؑ" ہے۔ "اے آبروئے حمزہؑ وحیدرؑ، سلام لے" یہ مرثیہ دردانگیز کیفیات سے شروع ہوتا ہے۔ مصرع اولیٰ ہی بتا رہا ہے کہ نوک نیزہ پر سر بلند سر دیکھ کر دل کی دھڑکنیں پکار رہی ہیں کہ ۔

"اے آبروئے حمزہؑ و حیدرؑ، سلام لے"

حضرت جوہر نظامی کے پانچ مرثیے اُن کے فرزندِ ارجمند فرخ راجہ، اسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو، گورنمنٹ کامرس کالج راولپنڈی نے "برجِ نور" کے نام سے شائع کئے ہیں ــ کتاب میں مراثی کی ترتیب اشاعت وہی ہے جس ترتیب سے مرثیے کہے گئے ہیں، لہٰذا اُن کا

دوسرا مرثیہ	۔	بخدا پنجۂ شہبازِ قضا ہے عباسؑ
تیسرا مرثیہ	۔	ہاں اے قلم کمالِ رموزِ سخن دکھا
چوتھا مرثیہ	۔	افسانۂ حیات کا عنواں حسینؑ ہے
پانچواں مرثیہ	۔	کون ہے زخم پر زخم کھائے ہوئے

حضرت جوہر نظامی کے مراثی میں وہی قادر الکلامی نظر آتی ہے جو دنیائے شعر و سخن میں اُن کی پہچان تھی، اُن کے پہلے مرثیے میں تین جہتیں ہیں، ابتدا سلام عجز اور دعائے انکسار سے ہوتی ہے ۔

اے آرزوئے حمزہؑ و حیدرؑ سلام لے اے مظہر جلالِ پیمبرؐ سلام لے
نورِ نگاہِ فاتحِ خیبر، سلام لے ا عرفانِ حق کی تیغ دو پیکر، سلام لے
سوزِ حکایتِ غمِ پنہاں لئے ہوئے
آیا ہوں چاک چاک گریباں لئے ہوئے

عرفان و آگہی کی بصیرت کی بھیک دے سوزِ درون و جذب محبت کی بھیک دے
عاصی ہوں مجھ کو اپنی شفاعت کی بھیک دے ۳ فطرس کو جو ملی، اسی دولت کی بھیک دے
ہوں زخم زخم، تن مرا غربال سا ہوا
میرا بھی حال اس کے پر و بال سا ہوا

جس دل نے تیرے غم کو خوشی سے کیا قبول اس کے لئے ہے سایۂ پیراہن رسول
اس کو ملے گی نعمتِ خوشنودیٔ بتولؑ ۵ جو اس سے پھر گیا وہ ہوا ظالم و جہول
گریہ سے جوہرِ دلِ احساس زندہ ہے
ماتم سے کار نامۂ عباسؑ زندہ ہے

گریہ جلائے روح کا ساماں ہے یا امام گریہ صفائے قلب کا عنواں ہے یا امام
گریہ بصیرتوں کا گلستاں ہے یا امام ۶ گریہ ترانۂ غمِ پنہاں ہے یا امام
"رونے سے اور عشق میں بیباک ہوگئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہوگئے"

ماتم سے تیرے دین کی شہرت ہے یا امام ماتم سے منکشف تیری عظمت ہے یا امام
ماتم تیرا نشانِ صداقت ہے یا امام ۷ ماتم بنائے عزم شہادت ہے یا امام
ہر سمت آنسوؤں کے سمندر اُبلتے ہیں
مومن دہکتی آگ پہ بے خوف چلتے ہیں

اس مرثیے کی دوسری جہت، ساتویں بند کے بعد "مطلع ثانی" ہے جو قاری کو شہادت حسینؑ تک لے جاتا ہے مرثیے کا مطلع ثانی اور آٹھواں بند یوں ہے۔

جب کربلا میں لٹ گئی عزت رسولؐ کی ترکہ نبیؐ پاک کا، دولت رسولؐ کی
قرآن و آل تھے وہ امانت رسولؐ کی ۸ جن کو ملی تھی حق سے نیابت رسولؐ کی
قرآن کے ساتھ آل بھی تاراج ہوگئی
دونوں کو نوکِ نیزہ پہ معراج ہوگئی

آٹھویں بند سے اکیسویں بند تک شہادت حسینؑ، اہل حرم کی اسیری اور قافلے کی سوئے شام روانگی کا احوال ہے۔ بائیسواں بند "مطلع ثالث" ہے جو سیدؑ سجاد کی اسیری سے تاریخ رقم کرتا ہے۔

عابد اسیر طوقِ گرانبار جب ہوئے سب افسرانِ فوج ستمگر طلب ہوئے
دشمن علی کے مائل قہر و غضب ہوئے ۲۲ اہل حرم نشانۂ رنج و تعب ہوئے
تختی کشانِ دینِ محمدؐ نکل پڑے
تھامے مہار عابدؑ بیمار چل پڑے

مرثیہ ۳۵ بند پر مشتمل ہے اور مقطع کے بند سے پہلے مقصد حسینؑ کی تکرار پر ختم ہوتا ہے۔

اے مبتلائے رنج و محن، اے اسیرِ غم باقی رہے گا تیرے سبب دین کا بھرم
ہوں گے رہِ حیات میں کتنے ہی پیچ و خم اونچا رہے گا پھر بھی تیرے صدق کا علم
مومن کو عزم صبر و رضا یاد آئے گا
زینبؑ کا امتحان وفا یاد آئے گا

حضرت جوہر نظامی کے مراثی میں ڈرامہ نگاری کے عناصر بھی ملتے ہیں۔ بالکل اس طرح جیسے ڈرامے میں جب منظر بدلتا ہے تو پردہ گرتا ہے اور جب پردہ دوبارہ اُٹھتا ہے تو نیا منظر پیش کرتا ہے اس طرح جوہر نظامی کے مراثی میں مطلع اول، مطلع دوئم مطلع ثالث سے (مرثیے کے تسلسل کو باقی رکھتے ہوئے) منظر بدلتے ہیں۔ دوسرے مرثیے کا آغاز حضرت عباسؑ کے تعارف سے ہوتا ہے۔

بخدا پنجۂ شہبازِ قضا ہے عباسؑ جوہر آئینہ مہر و وفا ہے عباسؑ
قوت بازوئے شاہِ شہدا ہے عباسؑ یعنی شیرِ پسرِ شیرِ خدا ہے عباسؑ
پرتوِ نور ہے یہ غالبِ ہر غالب کا
نقش ثانی ہے علی ابن ابی طالب کا

اور مطلع ثانی کے بعد منظر بدلتا ہے تو حضرت عباسؑ رجز خواں نظر آتے ہیں۔

یوں رجز خواں ہوا، حیدرؑ کا جگر بند ہوں میں یعنی جبریل کے استاد کا فرزند ہوں میں
غضبِ شیر خدا قہرِ خداوند ہوں میں اپنے آقا کی غلامی پر رضامند ہوں میں
روشنی جس سے فروزاں ہے وہ مینار ہوں میں
حق کا پیغام ہوں اللہ کی تلوار ہوں میں

خیبرِ کفر اُدھر، حیدرؑ کرار اِدھر ظلمتِ شام اُدھر صبح کے آثار اِدھر
ہے اُدھر شمر تو عباسؑ وفادار اِدھر دشمنِ دین اُدھر دین کا غم خوار اِدھر
آئے اور ذائقۂ زورِ جوانی چکھے
جس کو چکھنا ہو مری تیغ کا پانی چکھے

''برج نور'' کے حرف آغاز میں فرخ راجا'' آغاز'' کے زیرِ عنوان رقم طراز ہیں کہ:

''والد محترم جناب جوہر نظامی کی وفات کے چار سال بعد اس کتاب کی اشاعت نے بہت سے احباب کو انتظار کی زحمت سے دو چار کیا جس کے لئے معذرت خواہ ہوں'' (برج نور۔ص ۱۰)

فرخ راجا کی معذرت اور اُن کے جذبے کو سلام کہ اُنہوں نے باپ کی محنت کو ضائع ہونے سے بچالیا اور اُن کے مراثی شائع کرائے جبکہ اس کتاب میں کئی جگہ اس بات کی شکایت کی گئی ہے کہ ممتاز مرثیہ گو شاعروں کے مرثیے اُن کی اولاد کی لاپرواہی سے ضائع ہو گئے —— مرحبا فرخ راجا۔

☆☆☆☆☆

ریحان زیدی :- میرٹھ (یو۔پی)

ولادت ۷رجنوری ۱۹۲۷ء بمقام امروہہ۔ وفات ۱۶رفروری ۱۹۹۸ء۔

نام سید محمد ریحان۔ تخلص ریحانؔ۔ سادات زیدی، وطن امروہہ۔ تعلیم منشی کامل، مولوی، عالم، فاضل کی سندات حاصل کی۔ درس و تدریس کے شعبے کو اپنالیا اور عربی کالج میرٹھ سے وابستہ ہو گئے۔ درس و تدریس اُن کا ذریعہ معاش نہیں مزاج تھا عربی، فارسی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ اُن کا ہر شاگرد عالم فاضل ہو۔ اسی لئے اپنے شاگردوں پر توجہ دیتے تھے۔

شاعری ۹ برس کی عمر سے شروع ہوئی اور کیوں نہ ہوتی۔ امروہہ کی زرخیز مٹی کا خمیر تھا۔ والد گرامی سید برار حسین قبلہ تھے، گھر کا ماحول علمی ادبی تھا۔ ایسے ماحول میں پیدا ہونے والا بچہ جتنی جلدی بولنے لگے کم ہے۔ علم کی مٹھی میں آکر تو کنکریاں بولنے لگتی ہیں، عالمِ مطلق چاہے تو بچہ ماں کی گود میں بول اُٹھے۔ یوں بھی مرثیہ گوئی کی صلاحیت تو عطائے خداوندی ہوتی ہے، جس عمر میں اور جس وقت وہ چاہے عطا کردے۔

ریحان زیدی نے ابتداً غزل، نظم، قطعات، سلام، نوحے، ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی مگر کہتے ہیں کہ اُن کی شاعری کا باقاعدہ آغاز نوحے سے ہوا۔ ریحان زیدی کا سلسلۂ تلمذ حضرت منتظر امروہوی سے وابستہ تھا۔ اُن کے انتقال کے بعد سید احمد سید میرٹھی نے رہنمائی کی۔

مرثیہ نگاری کی ابتدا کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ ایک دن خواب میں اُنہیں حکم ملا کہ مرثیہ کہو، اور اُنہوں نے مرثیے کہنے شروع کر دیئے، پہلا مرثیہ 'معراج زندگی کی نشانی ہے کربلا' ۱۹۶۸ء میں کہا تھا۔ اُن کی مرثیہ گوئی، کلاسیکی مرثیے کی اقدار کی پیروی تھی۔ اُنہوں نے قدیم مرثیے کے لوازم کو برقرار رکھا۔ ساقی نامہ، رخصت، رجز، تلوار، گھوڑا، سراپا اور شہادت اُن کے مراثی کے لوازم تھے۔ لیکن اُن کے مرثیے کے چہرے میں ایسی جذبات نگاری ہوتی ہے کہ رگوں میں بہتا لہو سمندر کی موجوں کی طرح اُچھلتا محسوس ہونے لگتا ہے۔

معراج زندگی کی نشانی ہے کربلا حق جس میں ہے جواں وہ جوانی ہے کربلا
دریائے فیضِ شاہ کا پانی ہے کربلا اب بھی بہارِ نور فشانی ہے کربلا
سو عظمتوں کا فخرِ اسلام کربلا
اسلام کے وطن کا ہے اک نام کربلا

اُن کا ایک مرثیہ ''تخبرِ ذبحِ عظیم۔ اے ماہِ پُرغم کے ہلال'' ہے جس کا ایک بند درج ذیل ہے۔

اے مہِ غم، اے شہید کربلا کے سوگوار اے مفکر کی طرح کاہیدہ و غمگین و زار
بادِ گردوں پر تجھے میں نے جو دیکھا جلوہ بار یاد آئی مجھ کو اطفالِ حسینی کی قطار
غنچۂ زخمِ دلِ بیتاب اک دم کھل گیا
کوزۂ دستِ سکینہ کی طرح دل مل گیا

مرثیے کی کلاسیکی اقدار کے محافظ اور پیروکار ریحان زیدی کے پاس جدید مرثیے کا پیغام پہنچ گیا تھا اور وہ اس کا اظہار بھی کرتے تھے لیکن وہ مرثیے کی ہیئت میں تبدیلی کے حق میں نہیں تھے اور سچ پوچھیے تو مرثیے کو جدید بنانے کے لئے ہیئت میں تجربات کی اتنی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اصل ضرورت فکر اور مشاہدے کی ہے اور عصر حاضر کے فکری اور مشاہداتی امور کو مرثیے میں ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ کروٹیں بدلتی زندگی کے نئے رخ پیش کرنے کی ضرورت ہے اور ریحان زیدی

اس سے اختلاف نہیں کرتے تھے۔ حسینؑ اُن کی نظر میں عظمتِ پیغمبر کے محافظ، باطل کو شکست دینے والے جری اور انقلابِ فکر کے علمدار ہیں

خون جس کا بن گیا بنیاد دیں، وہ ہے حسینؑ
آسماں ہے جس کے مقتل کی زمیں وہ ہے حسینؑ

جس نے ڈالا فوج باطل میں خلل وہ ہے حسینؑ
کر گیا جو کفر کے ہاتھوں کو شل وہ ہے حسینؑ

اسی عظمت حسینی کے نمائندے اُن کے مراثی ہیں مثلاً ۔

''احساس کے فلک کا ستارا حسینؑ ہے'' — یا ''زینب فضیلتوں کے سمندر کا نام ہے''

جیسے مصرعوں سے اُن کے مراثی کی ابتدا ہوتی ہے۔ وہ اپنے مراثی میں مقصدِ حسینؑ کی وکالت کرتے ہیں۔ ۔

مائلِ ذوقِ جہانگیری اگر ہوتے حسینؑ ہر جگہ پر اپنے ہی مقصد نگر ہوتے حسینؑ
پیاسے اعدا پر، نہ مثلِ ابرِ تر ہوتے حسینؑ مہرباں ہرگز نہ حُر کی فوج پر ہوتے حسینؑ

راہ میں ہی حُر کے لشکر کو پلاتے آبِ تیغ
سجدہ کرتا ہر سپاہی دیکھ کر محرابِ تیغ

ریحانؔ زیدی کے داماد نگارؔ امروہوی دہلی میں رہتے ہیں، حال ہی میں ڈاکٹر عظیم امروہوی کے توسل سے اُن سے رابطہ کیا گیا تو اُنہوں نے ریحان زیدی کے انتقال کی تصدیق کی اور بتایا کہ اُنہوں نے عمر کے بالکل آخری حصے میں سیدہ زینبؑ کے احوال کا ایک مرثیہ کہا تھا۔ ریحان زیدی مرحوم کے سامان میں کہیں ہوگا۔ قصہ مختصر وہ مرثیہ تا حال نہیں مل سکا۔

☆☆☆☆☆

پروفیسر کرّار حسین: - (کراچی)

ولادت ۸ رستمبر ۱۹۱۱ء (کوٹہ، راجستھان)۔ وفات ۷ رنومبر ۱۹۹۹ء (کراچی)

پروفیسر کرار حسین ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جو شاعروں کی صف میں شاعر، ادیبوں میں مسند نشین، تاریخ و ثقافت کے میدان میں رہنما، زندگی کی مختلف جہتوں کے عقدہ کشا تھے۔ اُنہوں نے یکے بعد دیگرے کئی نسلوں کی پرورش کی ہے، تربیت کی ہے۔ پروفیسر کی حیثیت سے

اُستاد مگر ایسے استاد نہیں جو کتابیں پڑھ کر لیکچر دے کر یہ سمجھیں کہ اُن کی ذمہ داری پوری ہوگئی۔ وہ اپنے شاگردوں کا محاسبہ کرتے تھے، اُن کی رہنمائی کرتے تھے اور ایک باپ بن کر اُن کی تربیت کرتے تھے۔ بلوچستان یونیورسٹی میں وائس چانسلر ہوئے تو ایسا لگا بلوچستان کے ہر لکھے پڑھے آدمی کی تربیت اُن کے ذمّے ہے۔

رثائی ادب سے اُن کا گہرا تعلق تھا۔ وہ پیشہ ور نقادوں کی طرح نقاد نہیں تھے مگر مرثیہ اور رثائی ادب کے سلسلے میں اُن کی تنقید میں وزن ہے آج بھی۔ 'مستند ہے اُن کا فرمایا ہوا'۔ وہ کان پر قلم رکھ کر گھر سے نکلنے والے شعراء میں شامل نہیں تھے مگر اُنہوں نے نعتیہ اشعار بھی کہے ہیں، سلام و منقبت بھی اور مرثیہ بھی۔

احمد اگر درود ہیں، حیدر سلام ہیں
یہ فرق کیسا فرق ہے جو ہے، مگر نہیں

عام طور پر کہا جاتا ہے فلاں مرثیہ گو کے ہاں رنگِ تغزل نمایاں ہے۔ فلاں مرثیہ گو شاعر اپنے مرثیوں میں غزل کی ''ڈکشن'' استعمال کرتا ہے۔ پروفیسر کرار حسین کے مزاج میں رثائی ادب اتنا رچا بسا تھا کہ اکاّ دکاّ غزل کے جو اشعار کہے ہیں وہ بھی رثائی شاعری معلوم ہوتی ہے ؎

ایک سایہ سا جو ہے جشنِ جرعاں پہ محیط
کوئی عیسیٰ تو اندھیرے میں سر دار نہیں

پروفیسر کرار حسین نے بھرپور شاعری کی ہے۔ اور تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ اور یہ مضامین سرسری تنقید نہیں بلکہ بھرپور مطالعہ کے غماز ہیں اور فکر و تعقل کی دعوت دیتے ہیں۔ مثلاً اُن کا ایک مضمون ''مرزا دبیر۔ از سرِ نو مطالعہ کی ضرورت'' عنوان کے حوالے سے ہی دعوتِ فکر ہے۔ پروفیسر کرار حسین نے ۸۸ برس کی عمر میں کم از کم ستر ۷۰ برس اُردو اور اُردو والوں کی خدمت کی، علم کے پیاسوں کو سیراب کیا، فکر کی سوغات بانٹی، دوستوں کی مدد کی، دشمنوں کو سمجھایا لیکن اُن کی وفات کے بعد اُن کی یاد میں وہ کچھ نہیں ہوا جس کا وہ استحقاق رکھتے تھے۔ چند چھوٹے چھوٹے مضامین، کچھ تعزیتی جلسے اور بس! اور ہم آپ سب جانتے ہیں کہ تعزیتی جلسوں میں مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرنے سے زیادہ، مرحوم کے کارہائے نمایاں کے ذکر سے زیادہ مرنے والے کے ساتھ اپنی بے تکلفی، قریبی مراسم اور بسا اوقات قرابت داری کا ذکر زیادہ ہوتا ہے۔ البتہ ہادی

عسکری اور ڈاکٹر ہلال نقوی نے کسی حد تک شرافت نفسی کا ثبوت دیا اور ''رثائی ادب'' کا ایک شمارہ پروفیسر کرار حسین کے نام کیا۔ اس شمارے میں اُن کے لکھے ہوئے مضامین، اُن کی شاعری، اور اُن سے متعلق یادداشتوں کو شائع کیا۔

مرثیہ گوئی میں پروفیسر کرار حسین کے مراثی کی تعداد کے حوالے سے انہیں یاد نہیں کیا جاتا بلکہ اُن کا مزاج مرثیہ نگاری اُن کی یاد کا سبب ہے۔ اُن کا ایک مرثیہ جو عام مرثیوں کی روش سے الگ نظر آتا ہے ''کربلا۔ کربلا'' ہے ''اسی عنوان کے تحت یعنی'' اے کربلا، اے کربلا'' کے زیرِعنوان ایک مرثیہ مصطفیٰ زیدی کا ہے اور ایک نظم سردار جعفری کی ہے۔ دونوں ایک بحر میں ہیں لیکن پروفیسر کرار حسین کا مرثیہ بحرِ طویل میں ہے مرثیے کے دو جزو ہیں۔

''جزو اوّل''

کربلا! کربلا! ارضِ کرب و بلا، مہرِ صدق و صفا کے سپہرِ بریں
راز ہائے فنا و بقا کی امیں، خاتمِ موت پر زندگی کا نگیں
باادب، باادب، میرے دل کی تڑپ، دیکھ، پھر دیکھ، اے میری چشم یقیں
حق آیات بکھری ہوئی ہیں یہاں، عرشِ اعظم کے تارے ہیں ذرے نہیں
مہبطِ انبیاء، قبلۂ اولیا، سجدہ گاہِ ملائک ہے یہ سر زمیں

(۲)

مل گئے آکے، باہم ازل اور ابد، وقت اک لمحۂ جاوداں ہوگیا
راز قرآنِ ہستی میں جو تھا نہاں، نقطۂ آتشیں میں عیاں ہوگیا
ساری دنیا کی امیدیں مٹنے گئیں، ایک دل کا یقیں کامراں ہوگیا
اللہ! اللہ! اک گوشۂ بے نشاں، شرق اور غرب سے لامکاں ہوگیا
حرفِ حق، امرِ 'کن' کی چمک بن گیا، پیکرِ آدمیت کی جاں ہوگیا

(۱۱)

تھرتھراتا ہے خورشید خوں میں افق، پیچ و بل کھاکے بہتی ہے موجِ فرات
برق پنہاں ہے ہر ذرہ کائنات، تیغ عریاں ہے آئینۂ شش جہات

ارضِ موعود پر یومِ میقات کی، آج تیاریاں کر رہی ہے حیات
ایک ذبحِ عظیم، ایک بیت الحرم، ایک معراج، اک لمعۂ بیّنات
شرکِ فرعونیت کے شبستان پر، محشرِ صبح ڈھائے گی بانگِ صلات

(۲۴)

ابنِ آدم کو سانپ نہ ڈس لیں کہیں، ہے عَلَم جوہرِ آدمیت پناہ
وقت کے تند و تاریک طوفان میں، یہ عَلَم ہے چراغِ ہدایت پناہ
ضامنِ خندہ طفل و ناموسِ زن، ہے بہارِ چمن حُسن و عصمت پناہ
ظالمو! یہ عَلَم ہے عدالت پناہ، منکرو! یہ عَلَم ہے قیامت پناہ
مانگتے ہیں ابوالفضل عباسؑ سے، آج بھی اہلِ خبث و شقاوت" پناہ

(۲۵)

خندہ طفلِ معصوم کی اک کرن، زندگی کے شبستاں میں صبحِ امید
اپنے خالق کے لطف و یقیں کی نمود، جس میں عیسیٰؑ نے جنت کی پائی نوید
ظالمو! یہ زمیں ہے خدا کا چمن، اور بہارِ چمن ہے محبت کی عید
بستیاں ہیں کہ صحرا میں سانپوں کے بھٹ، کھیلتا ہے مگر اب بھی طفلِ رشید
انتہا پر ہے طوفانِ ظلمِ یزید، جیسے تارا چمکتا ہے اصغرؑ شہید

''جزو ثانی'' میں مرثیے کا پہلا بند'' جزو اوّل'' سے دہرایا گیا ہے۔ اسے بندوں میں شمار نہیں کیا گیا۔ صرف ربطِ مضمون کے لئے درج کیا گیا ہے۔

کربلا، کربلا، ارضِ کرب و بلا، مہرِ صدق و صفا کے سپہرِ بریں
رازہائے فنا و بقا کی امیں، خاتمِ موت پر زندگی کا نگیں
باادب! باادب! میرے دل کی تڑپ، دیکھ پھر دیکھ اے میری چشمِ یقیں
حق کی آیات بکھری ہوئی ہیں یہاں، عرشِ اعظم کے تارے ہیں ذرّے نہیں
مہبطِ انبیاء قبلۂ اولیا، سجدہ گاہِ ملائک ہے یہ سر زمیں

(۶۲)

عشق جب منزلِ امر میں آگیا، زندگی بن گئی راہِ حق میں جہاد

ہر نفس اک شہادت کا رنگیں چمن، ہر قدم اک چراغِ سبیل رشاد
ہر بیاں روحِ اخلاص و صدق و صفا، ہر عمل جانِ ایثار، عصمت نہاد
دور ہیں خواہش و خشم و نام و نمود، رجسِ شیطان یعنی خودی کا فساد
تیرا ساتھی خدا، تیری منزل خدا، مرحبا شاہِ دنیا و دیں زندہ باد

(۶۶)

وارثِ انبیاء، سرور اولیاء، عشق خالق کا محراب و منبر حسینؑ
قاطعِ ظلم، معصومِ موسیٰ صفت، قم باذنی کا جاں بخش پیکر حسینؑ
اللہ اللہ دلوں پر تصرف ترا، نفسِ رحمٰن، روحِ پیمبرؐ حسینؑ
رات تک سجدۂ راہِ معبود میں، اک جماعت تھی اور اس کے رہبر حسینؑ
صبحِ عاشور پڑھ کر نمازِ سحر، رن میں اترے تو دیکھا بہتر حسینؑ

(۶۷)

اب وہ بازارِ کوفہ نہ دربارِ شام، مرگ بے حشر ہے ظالموں کا مقام
زندگی نے لئے کربلا کے قدم، کربلا کلمۂ حق کی شانِ دوام
کل ''حرا'' پر سنا ''لا الہ الاھو'' یوم اللہ کا افتتاحِ پیام
کرب و عزمِ حسینی سے روشن ہے آج حق کا نام اور انسان کا احترام
یومِ اللہ کے آخری جشن پر، ہوں محمدؐ پہ لاکھوں درود و سلام

☆☆☆☆☆

شاکر علی جعفری :- (کراچی)

پیدائش ۱۹۱۵ء۔ وفات ۲۷ مارچ ۱۹۹۹ء

جائے ولادت اٹاوہ (یو۔پی) ہندوستان۔ یہی اُن کا وطن تھا۔ تعلیم: بی۔اے (۱۹۳۵ء) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ بی۔ٹی۔(۱۹۴۰ء) اور ایم۔اے انگریزی (۱۹۴۶ء) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

تقسیم ہند کے بعد ۱۹۵۰ء میں پاکستان چلے آئے۔ ہندوستان میں تھے تو ضلع راجور (سی۔پی) کے سکولوں میں استاد رہے، پاکستان آئے تو شعبۂ درس و تدریس کو برقرار رکھا اور رہ

ماسٹر کے منصب تک پہنچے۔ ۱۹۷۲ء میں رٹائر ہوئے اور کراچی کی ایک بستی شاہ فیصل کالونی میں ایک انگلش پرائمری سکول قائم کیا جسے آج بھی اُن کی سب سے چھوٹی بیٹی چلا رہی ہیں۔ اللہ نے اُنھیں آٹھ بیٹیاں عطا کیں مگر اولادِ نرینہ سے محروم رہے۔

شاکر علی جعفری انگریزی ادب کے آدمی تھے۔ انگریزی زبان میں اُن کی تصانیف حسبِ ذیل ہیں۔

(1)Poems in Praise of the Holy Prophet (انگریزی میں نعتیں)

(2) Rulogie and Elegies مناقب و مرثیہ (انگریزی میں)

(3) Versified English translation of Farazdaq. s qasida

فرزدق کے قصائد کا منظوم ترجمہ (انگریزی میں)

(4) In the Realm of Rhyme(rhymed transtlation From Arabic, Persions, Hindi and Urdu Poetry.

عربی، فارسی، ہندی اور اُردو منظومات کا منظوم انگریزی ترجمہ

(5) جام بجام (انگریز شاعروں کے کلام کا منظوم اُردو ترجمہ)

(6) لندن کی سیر منظوم

(7) (چاسر سے ایلیٹ تک) انگریزی شاعری کی ایک جھلک

سید شاکر علی جعفری کا پہلا مرثیہ ''قربتہ الی اللہ'' ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔ پیش لفظ کے طور پر ''عرضِ حال'' کے زیرِ عنوان اُنہوں نے اپنی مرثیہ گوئی کے بارے میں خود لکھا ہے۔

''گذشتہ سال بعض احباب نے نو تصنیف مراثی کے سلسلے کی ایک مجلس میں مرثیہ گوئی پر اصرار کیا۔ میں نے معذرت کی۔ اثنائے گفتگو میں ایک صاحب نے فرمایا کہ آپ مرثیہ شروع کر کے دیکھئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ مولا کس طرح اپنا مرثیہ کہلواتے ہیں۔ میں نے وعدہ کر لیا اور جب میں مرثیہ کہنے بیٹھا تو پہلے دو رباعیاں اور اس کے بعد مرثیے کے بند یوں لگتا تھا جیسے خود بخود موزوں ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ میں اسے اپنے مولا کا اعجاز سمجھتا ہوں''

(مرثیہ قربت الی اللہ مطبوعہ فروری ۱۹۷۹ء)

"قربتہ الی اللہ" میں بھی شاکر علی جعفری نے اس کا اعتراف کیا ہے اور نصرت مولا مانگی ہے مرثیہ کے مطلع کے بند کا مصرعہ اولیٰ" ہے اعتراف کہ شاعر نہیں ہے یہ احقر" ہے۔ پہلا اور دوسرا بند اظہار عجز ہے۔ تیسرے بند میں نصرت کے لئے دعا ہے۔

نظر ہے آپ کی جانب کہ کچھ عطا ہو جائے یہ بے ہنر سرِ منبر سخن سرا ہو جائے
کیا ہے وعدہ، مکمل یہ مرثیہ ہو جائے ۳ وسیلہ کاش یہ میری نجات کا ہو جائے
کرم سے اپنے سلیماں، گدا کو کر دیجئے
دُرِ مراد سے دامن کو میرے بھر دیجئے

اور تیسرے ہی بند سے مرثیہ کی اٹھان شروع اور ابتدا عصر حاضر کے مرثیے سے ہوتی ہے۔

کروں شروع کہاں سے عجب ہے پیش و پس بدلتی قدریں، بدلتے ہوئے نفوس و نفس
وہ تیز وقت کے دھارے میں بہتے خار و خس ۴ ہر ایک سمت وہ بڑھتی ہوئی ہوا و ہوس
یہ دورِ مادّی اور مادّی خدا لاکھوں
قدم قدم پہ کھڑے نصب دیوتا لاکھوں

زر و زمین و زن و زور، زعم نام و نمود مقام و منصب و میزان و موقع و مقصود
وہ ایک عہد اور اس کے وہ ان گنت معبود ۵ کہیں یہ سعی و طواف اور کہیں رکوع و سجود
وہی رسوم پرستش بدل گئے انداز
کہیں ہے پیش حقیقت، کہیں ہے پیش مجاز

مشین عہد کا انسان بن گیا ہے مشین فقط تعلق دنیا ہے، بے تعلق دین
جدید تر سے تن آسانیاں جدید ترین ۶ سکون قلب کو لیکن نہ روح کو تسکین
سلگ رہے ہیں وہ مجرم جو آگ میں اپنی
جو سن سکو تو سنو، کاش سسکیاں اُن کی

اُدھر لگا رہی لادینیت ہے یہ نعرہ خدا وُدا نہیں کوئی، نہ کوئی روزِ جزا
کرو جو چاہے نہیں کوئی پوچھنے والا ۷ پر اک سوال ہے "لیکن اگر نکل آیا"
خدا اگرچہ نہیں، اے معلمِ ملکوت
ثبوت پیش کر اس کا، ہے تجھ پہ بارِ ثبوت

حیاتیات سے پوچھو کہ کیا ہے رمزِ حیات خود اپنی ذات سے پوچھو کہ کیا ہوں میں بالذات
تو پھر وجودِ خدا میں یہ کس لئے شبہات ۸ ہے لاالہ کی جو منقبت میں بھی اثبات
دکھائی دیتا ہے جو صاف چشمِ بینا کو
کہ جس پہ رشک و تعجب ہے طورِ سینا کو

خدا نہ فہم میں آئے تو فہم کا ہے فتور بغیر نورِ خدا زندگی ہے یہ بے نور
رہے نہ خوف کوئی اور نہ نیک و بد کا شعور ۱۳ خدا ہی روح کی راحت ہے اور ہے دل کا سرور
وہی تو ٹوٹے دلوں کا بس اک سہارا ہے
وہی تو ہر تیری بیچارگی کا چارا ہے

ادا وہ کونسی ہے خیر میں جو شر میں نہیں ہے کیا وہ فقر میں دولت جو مال و زر میں نہیں
وہ رعب حق کہ جو باطل کے کرّ و فر میں نہیں ۱۵ ہے کیوں حقیقی خوشی قدرتِ بشر میں نہیں
نشانیاں ہیں یہ اس فہمِ ناتواں کے لئے
'صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے'

اس مرثیے کے درج بالا چہرے کے ۱۵ بند شاکر علی جعفری کی وسعتِ مطالعہ، علوم دنیاوی پر دسترس کے ساتھ مذہبی معلومات کا ثبوت ہیں۔ آٹھویں بند میں۔ ''حیاتیات سے پوچھو کہ کیا ہے رمزِ حیات'' اس امر کی نشاندہی ہے کہ شاکر علی جعفری انگریزی کے علاوہ سائنس سے بھی شغف رکھتے ہیں علم حیاتیات (Biology) دو صدیوں کی تحقیق کے بعد بھی رمزِ حیات (secret of life) سے بے بہرہ ہے اور اس علم کے عالموں کے پاس اس بات کا جواب نہیں کہ حیات کیا ہے؟ لیکن اسی بند کا چوتھا مصرعہ اس گتھی کو سلجھا رہا ہے کہ چشمِ بینا ہو تو رمزِ حیات سے بھی آگہی ہوتی ہے۔ عصرِ حاضر کی منفی سوچ اور محرومیوں سے گریز پر آنے کا انداز بھی شاکر علی جعفری کی قدرتِ شعرگوئی کی غماز ہے۔

یقین نہ آئے تو میدان کربلا دیکھو فرات پر حق و باطل کا معرکہ دیکھو
وہ حق کا عزم شہیدوں کا حوصلہ دیکھو ۱۶ جو اس پہ دیتی ہے تاریخ فیصلہ دیکھو
ملوکیت کی جہاں پر ہے ساری رفعت پست
کہ اک طلسم کی صورت ہے جس کی فتح و شکست

وہ شب ہے کہتا زمانہ جسے شب عاشور وہ شب، سیاہ ہیں دفتر الم کے وہ مذکور
وہ شب کہ نوحہ کناں جس پہ ہیں سنین وشعور ١٩ وہ شب کہ سینۂ لیل و نہار کا ناسور
گھرا تھا نرغۂ عدا میں دینِ حق کا نصیب
ہر اک تردد باطل سے دور حق کے قریب
ادھر وہ کثرت اعدا وہ لشکر خناس ادھر ہیں صاف بہتر نفوس نیک احساس
ہے تین روز کی جن پر وہ بھوک اور پیاس ٢٠ بجا رہیں نہ بشر کے جہاں پہ ہوش وحواس
ہے ساتھ بچوں کا، سیدائیاں بھی ہیں ہمراہ
اور اپنی بے سرو سامانیاں بھی پیشِ نگاہ
اُدھر نظر میں تھی دنیا، تو اس طرف عقبیٰ اُدھر تھی شوکتِ شاہی تو اس طرف تقویٰ
کہ جن کی ذات نمونہ تھی بہرِ خلقِ خدا ٢١ فقط دکھانے جو آئے تھے راستہ سیدھا
کہ کیسے جیتے ہیں کیوں کر ہیں اہل حق مرتے
مگر حمایت باطل کبھی نہیں کرتے

پہلے مرثیے میں شاکر علی جعفری نے جس ادراک وآگہی کا مظاہرہ کیا ہے اس کے پیش نظر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اُنہوں نے ١٩٧٩ء سے ١٩٩٩ء تک بیس برس کے عرصے میں جو مرثیے کہے ہوں گے وہ ”نقاش نقش ثانی بہتر کشد اوّل“ کے مصداق ہوں گے۔

☆☆☆☆☆

شائق زیدی:- (لاہور)

ولادت ١٩١٥ء—وفات ١٩٩٩ء۔

نام سید آقا حسین، تخلص شائق، سادات زیدی۔ وطن میمن، ضلع بجنور (بھارت) تعلیم بی۔اے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ—سلسلۂ نسب روشن، والدگرامی سید مبارک حسین زیدی، تایا سید ضمیر حسین شوق شاعر تھے اور میر تعشق کے شاگرد تھے۔ والدۂ ماجدہ کے حقیقی ماموں یعنی شائق کے نانا سید محمد حسنین رقیم باکمال شاعر تھے اور مرزا دبیر کے شاگرد تھے۔ رقیم نے مرثیے بھی کہے ہیں، اگر مرثیہ گو نہ ہوتے تو مرزا دبیر کے شاگرد نہ ہوتے۔ ان حوالوں سے شائق زیدی کو جس طرح نجیب الطرفین سید کہا جاسکتا ہے اس طرح نجیب الطرفین شاعر بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

شاعری کی ابتدا زمانۂ طالب علمی میں (۱۹۳۰ء) میں ہوئی۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں احسن مارہروی اور رشید احمد صدیقی ایسے روشن بیان اساتذہ کے قرب نے فکر کو جلا دی۔ روایت شعرگوئی کے مطابق غزل سے ابتدا ہوئی۔

شائق زیدی ہندوستان میں تھے تو ریلوے کے محکمے سے وابستہ تھے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آئے تو ملازمت کے مختلف ادوار سے گذرتے ہوئے ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے ریڈیو اور براڈ کاسٹ کی دنیا میں آئے تو صحافت کے دروازے کھلے اور کم و بیش دس بارہ برس تک ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء تک بلکہ اس کے بھی بعد تک روزنامہ ''امروز'' لاہور میں روزانہ ایک قطعہ لکھتے رہے، دس برس میں ان قطعات کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔

شائق زیدی نے پہلا مرثیہ ۱۹۳۶ء میں یادگار حسینی کے تیرہ سو سالہ جشن کے موقع پر کہا۔ ''حریت جس کی فروزاں ہے وہ محرور ہے حُر'' جو اس بات کی نشاندہی ہے کہ تاریخ کربلا کو شائق زیدی نے علی الترتیب واقعات دیکھا ہے — شہدائے کربلا کی فہرست میں سب سے پہلے حُر نے ہی تو اپنا نام رقم کیا تھا۔

لاہور میں جب رثائی ادب کی شیرازہ بندی شروع ہوئی تو قیصر بارہوی، وحید الحسن ہاشمی اور سیف زلفی شائق زیدی اس ہراول دستے میں شامل تھے۔ ۱۹۳۶ء کے بعد ۱۹۷۲ء میں شائق زیدی نے دوسرا مرثیہ کہا۔

''جب لاالٰہ کہہ کے اُٹھا کفر، شام سے''

اعداد شمار کے حوالے سے یہ شائق زیدی کا دوسرا مرثیہ تھا مگر مرثیہ گوئی کے تسلسل کے حساب سے اس مرثیے کے بعد شائق زیدی باقاعدہ مرثیہ کہنے والوں میں شمار ہونے لگے۔ ملٹن نے کم و بیش پندرہ برس کی خاموشی کے بعد Lycides لکھی تھی۔ آغا سکندر مہدی نے بھی اتنی ہی مدت شاعری نہیں کی تھی لیکن جب شروع کی تو مرثیہ گوئی سے کی۔ شائق زیدی نے ۳۶ برس کے درمیانی وقفے میں غزلیں، نظمیں اور بالخصوص ''امروز'' لاہور میں روزانہ ایک قطعہ لکھا جو اُن کی مسلسل شعرگوئی کی سند ہیں —

شائق زیدی کا تیسرا مرثیہ حضرت علی اکبر کے احوال پر ہے جو ۱۹۷۳ء میں کہا گیا۔ چوتھا مرثیہ ''سخن طراز زمینوں کا آسماں ہے انیس'' ۱۹۷۴ء میں کہا گیا جس کی ابتدا میر انیس کو

خراج عقیدت سے ہوتی ہے مگر کربلا کی سمت فکر کا سفر شروع ہوتا ہے تو حضرت حُر کے احوال رقم ہوتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ حُرؔ کے کردار کی عظمت سے شائقؔ زیدی بہت متاثر ہیں۔

شائقؔ زیدی نے شاعری میں یا مرثیہ گوئی میں باقاعدہ کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی وہ بھی راقم الحروف کی طرح اُن شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جنہیں انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیوں نے شعورِ شاعری دیا۔ مرثیہ گوئی کے متعلق شائقؔ زیدی کا کہنا ہے کہ:

> بچپن سے انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیے سنے، ان کی مہکار سے دل و دماغ بسے ہوئے ہیں۔ ان دور اُفتادہ قدیم چراغوں کی روشنی میں نئی منزل ادب قطع کر رہا ہوں۔ آگے بڑھ رہا ہوں مگر پیچھے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتا ہوں۔ قدیم اور جدید رنگہائے مرثیہ گوئی سے دھنک بنانا میرا مسلک ہے''
>
> (اُردو مرثیہ پاکستان میں — ص ۴۸۳)

شائقؔ زیدی کے اس بیان کی وضاحت شائقؔ زیدی کے دو مرثیے میں جن میں سے ایک میں میر انیسؔ کو اور دوسرے میں مرزا دبیرؔ کی مرثیہ گوئی کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ یہ مرثیے ۔ ''سخن طراز زمینوں کا آسماں ہے انیسؔ'' اور ۔ ''دبیرؔ آلِ محمد کا ہے دبیرِ سخن'' ہیں

ایک معتبر نقاد نے شائق زیدی کا شمار اُن مرثیہ گو شعراء میں کیا ہے جنہوں نے موضوعات قائم نہ کرکے، غیر موضوعاتی مرثیے کہے ہیں۔ ایسے شعراء میں زیبا ردولوی، اُستاد قمر جلالوی، محسنؔ اعظم گڑھی، منظرؔ عظمی، آغا سکندرؔ مہدی اور شائقؔ زیدی کو شمار کیا گیا ہے۔ اس تذکرہ میں دیگر شعراء کے متعلق یہ عرض کرنا برمحل ہوگا کہ اُنہوں نے موضوعات قائم کرکے موضوعات کے دائرے میں پابند ہوئے بغیر بھی مرثیے کہے ہیں۔ بہ الفاظ دگر اپنے مرثیوں میں موضوعاتِ مرثیہ کو عنوان نہیں دیا ہے اور ایسے مرثیے بھی کہے ہیں جن کے عنوانات دئے ہیں۔ مثلاً ان کا ایک مرثیہ ''علم'' جس کا موضوع حضرت امام موسیٰ کاظمؑ ہیں اور عنوان علم ہے۔

بخدا آئینۂ عالمِ اسرار ہے علم جوہر امر ہے تخلیق کا شہکار ہے علم
کاشف پردۂ ''کُن'' مظہرِ ستار ہے علم نقطۂ کون و مکاں مرکزِ ادوار ہے علم
ہے یہ اک سلسلۂ حمد و ثنائے واجب
علم ہے محفلِ امکاں میں صدائے واجب

مطلعِ نظمِ جہاں مقطعِ حالات ہے علم مرکزِ منزلِ کل ارض و سماوات ہے علم
ہاں رجالات و کمالات کی بارات ہے علم آگئی جو لبِ قدرت پہ وہی بات ہے علم
علم سے رابطۂ لوح و قلم ہے گویا
علم تادیبِ دبستانِ قدم ہے گویا

علم معلوم ازل سے ہے تعارف کا سبب علم بالذات ہے ذاتِ احدی کا منصب
بس وہی علم کا مطلوب ہے طلاب ہیں سب سرنگوں علم کے آگے ہیں فرشتے بہ ادب
ہے یہ اللہ کا عارف دلِ انساں اس کا
آیت علم الاسماء ہے عنواں اس کا

علم کی آب سے آہن ہوا پانی پانی تارِ فولاد کھنچے جیسے نقوشِ مانی
سنگِ سیال ہوئے حسبِ گہر افشانی شرع کی حد میں ترنم نے قبا گردانی
سمع کے دائروں پر لحن کے خط گھوم گئے
بہ ادب حلقہ بگوشانِ سخن جھوم گئے

علم کی ضو سے ہوا باز دبستانِ فلق خطِ ابیض پہ کھلی مشرقِ وسطیٰ میں شفق
اس نے باندھی وہ ہوا اور بڑھا آگے سبق لوٹے انساں نے پریزاد صحیفوں کے ورق
چھاؤں میں سارے پرندوں کی وہ یک لخت اُڑا
بچھ گئے جن و ملک آدمی کا تخت اُڑا

علم کے موضوع پر جو گفتگو، جو اظہارِ خیال مرثیہ گو شاعروں نے کیا ہے وہ ادب کی دوسری اصناف میں نہیں ملتا— "بگڑا شاعر مرثیہ نویس" کہنے، سننے والے احساس کمتری کی رِدا سے باہر آ کر دیکھیں مرثیہ گو شاعر کیا کہہ رہے ہیں۔ فکر کی کس بلندی اور ذکر کی کس عظمت سے بات کر رہے ہیں۔

ہمارا مقصد مرثیہ اور دیگر اصناف شاعری کا تقابل نہیں ہے بلکہ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ مرثیے کے دامن میں ہی وہ وسعت ہے جو کسی مضمون، بلکہ مختلف مضامین پر سایہ فگن ہو سکتی ہے۔ اور شائق زیدی سائنسی تحقیقات، شاعرانہ استعارے، عقیدت کی نواؤں کو مرثیے کی زبان دینے پر قدرت رکھتے تھے، اُن کی فکر کا کینوس وسیع اور اظہار کا اسلوب سلجھا ہوا تھا۔

☆☆☆☆☆

صبا اکبر آبادی:- (کراچی)

ولادت ۱۴ راگست ۱۹۰۸ء۔وفات ۱۹۹۹ء۔

نام خواجہ محمد امیر۔ تخلص صبا۔ وطن اکبر آباد (آگرہ)۔ وطن ہی کی نسبت سے اکبر آبادی لکھتے تھے۔ خواجہ علی محمد صاحب کے فرزند۔ تاجدار عادل کے پدر گرامی۔ ۱۹۴۷ء میں کراچی آن بسے۔ پاکستان میں ذریعہ معاش تجارت رہا۔ شاعری کی ابتدا ۱۹۲۰ء (بعمر ۱۲ برس) ہوئی جس کی محرک غالباً تحریک خلافت تھی جس کا اُن دنوں ہندوستان میں زور تھا۔ صبا اکبر آبادی نے حضرت خادم علی خان اختر اکبر آبادی کا شاگردی اختیار کی بیک وقت غزل، نظم، قصیدہ، سلام، مرثیہ غرض ہر صنف سخن میں شاعری کی جس میں ابتدائی دور کی انقلابی نظمیں بھی شامل ہیں۔

تصانیف:

(۱) ذکر وفکر (۱۹۳۸ء) (۲) زمزمۂ پاکستان (۱۹۴۶ء) (۳) اوراق گل (۱۹۷۱ء) (۴) سر بکف (۱۹۸۰ء) (۵) شہادت (۱۹۸۱ء) (۶) چراغ بہار (۱۹۸۳ء) (۷) دست زرفشاں (۱۹۸۵ء) (۸) حرز جاں (۹) سخن ناشنیدہ

صبا اکبر آبادی نے ہر صنف سخن میں نمایاں حیثیت حاصل کی ہے۔ ''اوراق گل'' اور ''سخن ناشنیدہ'' میں شامل غزلیں اُن کی غزل گوئی کے اعلیٰ معیار کی مظہر ہیں، ''زمزمۂ پاکستان'' میں قومی نظمیں اپنا لوہا منواتی ہیں۔ ''دست زرفشاں'' عمر خیام کی رباعیات کا منظوم ترجمہ ہے جس کے لئے ڈاکٹر سید عبد اللہ نے صبا اکبر آبادی کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے:

> ''میں اس مجموعہ رباعیات کو ''رباعیات خیام'' نہیں'' رباعیات صبا'' کہتا ہوں۔ رباعیات خیام کے ترجمے تو بہت ہوئے ہیں مگر جو بات صبا نے پیدا کی ہے اس کا جواب نہیں''

''دست زرفشاں'' میں ہر صفحے پر عمر خیام کی اصل رباعی بزبان فارسی، صبا اکبر آبادی کی اُردو میں رباعی (عمر خیام کی رباعی کا منظوم ترجمہ) معہ فٹز جیرالڈ (FITZ GERALD) کا انگریزی ترجمہ شائع کیا گیا ہے لیکن ان تمام شاعرانہ کمالات کے باوجود ایسا لگتا ہے جیسے صبا اکبر آبادی کی شاعری کی ابتدا تحریک خلافت اور انتہا ''کربلا'' ہے۔ تحریک خلافت میں۔

'' کچھ دنوں میں ڈوبتی ہے آبرو سرکار کی'' کہنے والا شاعر مرثیہ کی منزل پر یہ کہتا نظر آتا ہے ۔

جب اہلِ ظلم ، ظلم پہ مغرور ہوگئے
شبیرؑ بھی دفاع پہ مجبور ہوگئے

صبا اکبرآبادی عصر حاضر کے تقاضوں سے آشنا شاعر تھے مگر انہوں نے اپنے فکری شعور کو مرثیے کی کلاسیکی اقدار کو برقرار رکھنے میں صرف کیا اور جو کچھ کہا مرثیے کی قائم شدہ حدود کے اندر رہتے ہوئے کہا۔ اُنہوں نے موضوعاتی مرثیوں میں بھی حمد، نعت، منقبت کو علی الترتیب اختیار کیا اس کی ایک مثال اُن کا مرثیہ "شباب" ہے جس میں مطلع کا بند دعا ہے۔ اس کے بعد دس بند شباب پر اور پھر حمد، نعت اور منقبت ہے۔

اے ربِ ذوالجلال قلم کو جمال دے تحریر کو حسین بنا، خدّ و خال دے
نقطوں کو حُسن، اور کشش کو کمال دے ۱ ایک ایک حرف نور کے سانچے میں ڈھال دے
تحریرِ حمد کو تیری تائید چاہیے
ہر دائرے کو مرکزِ توحید چاہیے

مقصود ہے جو مدحتِ شاہنشہِ اممؐ زمزم میں دھو کے آج اُٹھاتا ہوں پھر قلم
یارب میرے بیاں میں نہ ہو کوئی پیچ و خم ۱۱ سیدھا ہو راستہ میرا، منبر سے تا حرم
جو لفظ بھی ملے وہ نگینہ ملے مجھے
توفیقِ مدحِ شاہِ مدینہ ملے مجھے

آیا زمینِ مکہ پہ وہ آخری نبی تھا جو ازل سے حاصلِ منشائے ایزدی
درِّ یتیم، گوہرِ گنجینۂ خفی ۲۷ نوعِ بشر کے واسطے ظلمت میں روشنی
ایسا رسولؐ طاہر و اطہر کہیں جسے
پاکیزگی کا مہرِ منوّر کہیں جسے

جس کی دعا خلیل نے مانگی وہی رسولؐ بالائے طور جس کی تجلّی وہی رسولؐ
عیسیٰ نے جس کی دی ہے گواہی وہی رسولؐ ۳۲ حق کی بہار جس کی جوانی وہی رسولؐ
گونجی فضائے دہر درود و سلام سے
ہے دیں کا شباب، محمدؐ کے نام سے

غارِ حرا میں محوِ تفکر اُدھر رسولؐ اور اس طرف کھلا ابوطالب کے دل کا پھول

قلبِ محمدی کی تمنا ہوئی قبول۳۶ کعبے میں پہلی آیۂ حق کا ہوا نزول
کعبے کے پتھروں کو صبا چومنے لگی
پیدا ہوئے علیؑ تو فضا جھومنے لگی

صدیوں سے جو غلام تھے آزاد ہوگئے صحرا نشیں علوم کے استاد ہوگئے
انسانیت کے سارے سبق یاد ہوگئے۴۰ حکمت کے جو کھنڈر تھے وہ آباد ہوگئے
ایک ایک دل میں عشق رسالت مآب کا
ایک ایک لمحہ دینِ خدا کے شباب کا

اس کے بعد ولادت حسینؑ اور پھر وہ حالات جن کے تحت حسینؑ کو کربلا جانی پڑی۔

ہونے لگی جو ظلم کی یلغار دین پر شیطانیت کی فوج اُتر آئی زمین پر
پڑتی تھی گرد ، مصحفِ دینِ مبین پر۴۸ لہرائے شک و وہم کے سایے زمین پر
جب اہلِ ظلم، ظلم پہ مغرور ہوگئے
شبیرؑ بھی دفاع پہ مجبور ہوگئے

یہ مرثیہ شباب کے حوالے سے شبابِ علی اکبر اور شہادت علی اکبر پر اختتام پذیر ہوا۔ صباؔ اکبر آبادی کی شاعری پر قدرت کا یہ عالم ہے کہ پورے مرثیے میں حمد سے لے کر شہادت تک شباب کا حوالہ آتا رہا ہے۔ ''بھرپور جب شباب پہ آیا ستم کا دور''— ''ایمان کا شباب، مسلماں کی آبرو'' ایسے مصرعوں کا تسلسل باقی رہا ہے۔ صباؔ اکبر آبادی کے مراثی میں رثائی ادب کے رچاؤ بساؤ کے ساتھ اخلاقیات، واقعات نگاری، پیغام کربلا، حالات کربلا، وجہ کربلا بہت کچھ ہوتا ہے صباؔ اکبر آبادی کا ایک مختصر مگر معرکہ آرا مرثیہ ''شکستِ یزید'' ہے جو ۲۷ بند پر مشتمل ہے۔ یہ مرثیہ اُن کے پہلے مجموعے ''ذکر و فکر'' (مطبوعہ ۱۹۳۸، آگرہ) میں شامل ہے۔ اس مجموعے کے دیباچے میں مفتی انتظام اللہ الشہابیؔ اکبر آبادی نے صباؔ اکبر آبادی اس کے تعارف میں لکھا ہے کہ ''جس زمانے میں حضرت نجم آفندی کا سلام ۔ ''وفا پر کربلا میں ہوگئے صدقے وفا والے'' مقبول ترین سلام تھا حتی کہ تعزیے کے جلوسوں میں پڑھا جاتا تھا اسی زمانے میں صباؔ اکبر آبادی کا ایک خمسہ ۔ ''ہے سلامی غم شبیرؑ عزاداروں میں'' اور رعناؔ اکبر آبادی کا خمسہ ۔ چاند زہرا کا ہوا ذبح مسلمانوں میں'' دونوں خمسے محرم کے جلوس عزا میں پڑھے جاتے تھے تو جس تعزیے پر یہ خمسے

پڑھے جاتے وہاں دس پندرہ ہزار سامعین جمع ہو جاتے تھے۔ الشہابیؔ اکبرآبادی نے لکھا ہے کہ ان خمسوں کے بعد آگرہ کی عزاداری اور شاعری کا رنگ بدل گیا اور رعناؔ اکبرآبادی اور صباؔ اکبرآبادی کو انقلابی شعراء تسلیم کرلیا گیا۔ (بیسویں صدی اور جدید مرثیہ)

''شکستِ یزید'' کے ۷۲ بندوں میں سے چند بند درج ذیل ہیں۔

مامور تھے ہر شہر پہ بیدرد ستم گار　اظہارِ حقیقت کا عوض تھا رسن و دار
لب ہلنے کا انجام ہوا کرتی تھی تلوار　قانون تھا حاکم کے اشاروں میں گرفتار
انسان کا معیار جگر ٹوٹ رہا تھا
اُس عہد میں اسلام کا دل ٹوٹ رہا تھا

اس عہد میں اِک مردِ جری صاحبِ ہمّت　قرآن کا آئینہ نگہبانِ شریعت
خود دار خوش اخلاق سخی نیک طبیعت　اک گوشۂ عزلت میں تھا مصروف عبادت
مستغنی و آسودۂ دنیائے دنی تھا
حالانکہ مجاہد تھا شجاعت کا دھنی تھا

ہر سانس میں تھا اس کی رواں چشمۂ اسرار　ہر بات میں شائستگیٔ احمدِ مختارؐ
ہر فعل میں قرآن کے احکام نمودار　ہر گام پہ تقلیدِ نبیؐ اس کا تھا معیار
ٹھہرا ہوا مذہب تھا اشارے پہ اُسی کے
اسلام تھا دُنیا میں سہارے پہ اُسی کے

اُٹھا وہ جری گوشۂ تنہائی کو چھوڑا　جو مُہرِ خموشی تھی لبوں پر اُسے توڑا
خوابیدگیٔ ملتِ بیضا کو جھنجھوڑا　گلخانۂ اسلام سے پھر عطر نچوڑا
ایمان کا اِک لشکرِ جرار بنایا
عباسؑ کو لشکر کا علمدار بنایا

اس مرثیے میں انصارِ حسینی اور افرادِ خاندان کی نام بنام شہادت کا تذکرہ ہے اور نتیجہ یہ اخذ کیا گیا ہے کہ یہ سارے مصائب امام حسینؑ کو شکست نہ دے سکے جبکہ اُن کے صبر نے یزید کو شکستِ فاش دیدی۔

صباؔ اکبرآبادی کے بارے میں حال ہی میں (اکیسویں صدی کی ابتدا میں) عصرِ حاضر

کے دانشور، شاعر، خطیبِ عالمِ اسلام علامہ طالب جوہری کی رائے سامنے آئی ہے۔ اس اقرار کے ساتھ کہ علامہ کی رائے سند کی حیثیت رکھتی ہے ان کی گرانقدر رائے کا اقتباس درج ذیل ہے:

"صبا صاحب کے ہاں جدید محاسن و مزاج کی پیوستگی بہت خوش سلیقگی سے کی گئی ہے، صبا صاحب کے مراثی کے چہروں میں 'جدیدیت' کی ایک آمیزش نظر آتی ہے جو روحِ عصر کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہے۔ شہادت کے مناظر میں بھی صبا صاحب نے اپنے مفکرانہ رنگ کو ملحوظ رکھا ہے اور شجاعت اور صبر دونوں جذبات کو متوازن رکھ کر رزمیہ گوشوں کو پُر کیا ہے۔ یہ بیت ملاحظہ ہو۔" بے شیر کا مزار نہیں حدِ صبر ہے"
"تلوار سے کھدی ہے سپاہی کی قبر ہے"

(علامہ طالب جوہری)

'جدیدیت' اردو ادب میں ایک تحریک تھی جس کا مقصد جدید رجحانات سے وابستگی سے زیادہ 'ارتقائے فکر اور ترقی پسند تحریک کی مخالفت تھی۔ یہ تحریک جلد ہی دم توڑ گئی حتیٰ کہ کارپردازانِ جدیدیت بھی اب "مابعد جدیدیت" کا پرچم اُٹھائے ہوئے ہیں۔ اگر جدیدیت فعال ہوتی تو "مابعد جدیدیت" کا نعرہ بلند نہ ہوتا۔ علامہ طالب جوہری علمی ادبی اقدار کی رواں دواں صورت حال سے بہت باضبر رہتے ہیں اس لئے امکان یہ ہے کہ صبا اکبر آبادی کے مراثی کے چہروں میں "جدیدیت" کی آمیزش سے علامہ موصوف کی مراد "ارتقائے فکر اور ترقی پسند رجحانات" سے ہوگی "سابق تحریکِ جدیدیت" نہیں۔ اس امکان کو یقین بنانے میں صبا صاحب کے مرثیوں کے چہرے گواہ ہیں کی صبا اکبر آبای کے کلام میں جدیدیت والا ابہام نہیں بلکہ ارتقائے فکری ہے اور تسلسل ہے۔ صبا اکبر آبادی مراثی میں بھی زندگی کی مختلف جہات پر بات کرتے نظر آتے ہیں، یہی جدید مرثیہ ہے اور یہی ارتقائے فکر و بصیرت ہے۔

صبا اکبر آبادی کے بھرپور تعارف کے لئے یہ محدود صفحات ناکافی ہیں۔ اپنی کم مائگی کا احساس رکھتے ہوئے اس پر گفتگو ختم کی جارہی ہے کہ صبا اکبر آبادی اُستاد شاعر ہیں اور مرثیہ اُن کا مزاج تھا۔ اُن کی سیادت تھی اور اُن کی روح میں سمایا ہوا تھا۔

☆☆☆☆☆

مشہود جعفری اکبر آبادی:-

ولادت نومبر ۱۹۴۱ء ۔وفات ۲۵ رجون ۱۹۹۹ء

نام سیدؔ مشہود رضا جعفری۔ تخلص مشہود۔ قلمی نام مشہود جعفری اکبر آبادی۔ والد کا اسم گرامی سید شاہد رضا جعفری۔ وطن (اکبر آباد (آگرہ)۔ تعلیم بی،اے۔ تلمذ امیر حسن جعفری۔ ابتدائی تعلیم آگرہ میں اور اعلیٰ تعلیم کراچی میں حاصل کی۔ غزل، نظم، قطعات، رباعیات، نظمیں، سیاسی نظمیں غرض ہر صنف سخن مین طبع آزمائی کی۔ رثائی ادب کی طرف آئے تو منقبت، سلام، نوحہ اور مرثیہ تک پہنچے۔ اُن کے مراثی کی تعداد ایک سو (۱۰۰) کے لگ بھگ ہے۔ بدیہہ گو شاعر تھے۔

اُن کے قریبی دوست جناب نیر اسعدی کا کہنا ہے کہ ایک بار یوں ہوا کہ محفل ایرانیاں میں نو تصنیف مراثی کا عشرہ تھا۔ کسی وجہ سے مرثیہ گو شعراء نے ان مجالس میں شرکت سے انکار کر دیا، مشہود جعفری نے ہر مجلس کے لئے نو تصنیف مرثیہ کہا اور آٹھ مجالس میں نو تصنیف مرثیے پڑھے۔ مشہود جعفری نے لا تعداد محافل اور مشاعروں مین شرکت کی۔ اکثر محافل مین نظامت کرتے تھے۔ مطالعہ کا شوق تھا۔ اُن کے پاس کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا جو اب ان کے منجھلے بیٹے کی تحویل میں ہے۔ مشہود پانچ بہنوں کے بھائی تھے اور بہنوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بہنوں نے پیر کالونی کراچی کے گھر میں اپنا اپنا حصہ مانگا۔ باغیرت بھائی نے اونے پانے مکان بیچ دیا اور بہنوں کا مطالبہ پورا کر دیا۔ لیکن بے گھری نے اُنہیں اندر سے کھوکھلا کر دیا۔ شوگر (ذیابیطس) کے مریض ہو گئے اور اسی موذی مرض کی وجہ سے ان کے دونوں پاؤں کاٹ دیئے گئے اور آخر کار وہ اپنے مولا کی خدمت میں چلے گئے۔ انا للہ و انا علیہ راجعون

مشہود جعفری اکبر آبادی کے ورثا (ان کے فرزند) نے ہمیں اُن کا ایک مرثیہ عنایت کیا ہے جس کے چند بند نذر قارئین کئے جا رہے ہیں۔ مرثیہ کا عنوان 'سجدہ' ہے۔

سجدہ بشر کے ذوق عبادت کا نام ہے ۱ سجدہ ہی لم یزل کی اطاعت کا نام ہے
سجدہ یقین، عشق، صداقت کا نام ہے بندوں کے واسطے یہ ہدایت کا نام ہے
سجدہ حیات عقل ہے انسان کے لئے
میزانِ نور ہے یہی انسان کے لئے

سجدہ خدا کا شکر، یہ انداز زندگی ۱۱ سجدہ حیاتِ دین ہے، ایماں کی روشنی

سجدہ ہے خیر، خیر کے جادے کی آگہی سجدہ سے کیف پاتا ہے حد درجہ آدمی
یہ بارگاہِ صدق میں طاعت کا نام ہے
سجدہ عمل کا اور صداقت کا نام ہے

سجدہ شعور، سجدہ یقیں، سجدہ نور ہے ۲۰ سجدہ ہی ارتباطِ غیاب و حضور ہے
سجدہ گذار شر سے ہمیشہ ہی دُور ہے سجدہ ہی ساجدین کے دل کا سرور ہے
سجدہ صداقتوں کا امیں کائنات میں
سجدہ ہے ابدیت کا یقیں کائنات میں

مرثیے کی بیس بند سجدے کی وضاحت اور پھر گریز سجدہ گذاروں کے سجدوں کی طرف۔

سجدہ علیؑ کا کوفے کی مسجد کو یاد ہے ۲۱ صفّین میں یہ حیدری سجدہ جہاد ہے
اور ہو جمل تو سجدہ ہی ردِ فساد ہے سجدہ بتا رہا ہے یہ دنیا تضاد ہے
سجدہ علیؑ کا بوذرؓ و سلمانؓ سے پوچھیے
سجدہ ہے کیا یہ پوچھیے، قرآں سے پوچھیے

اک سجدہ یادگار ہے حق کے رسولؐ کا وہ سجدہ خود امین ہے حق کے اصول کا
ہے پشت پر رسول کے دلبر رسولؐ کا ۲۲ ہے وقت جبرئیل امیں کے نزول کا
یہ منزلِ حسنینؑ بتا کر گئے رسولؐ
سجدے کے کچھ اصول بتا کر گئے رسولؐ

سجدہ ہے اہلِ کذب سے حق کا مقابلہ ۲۳ وہ سجدہ ہے پانچ وقت دلوں کا محاسبہ
گر ساجدین ہوں تو یہ سجدہ، مباہلہ سجدہ ہے کذب وصدق میں تا حشر فاصلہ
سجدہ عظیم تر ہے وہ زہرا کے چین کا
یعنی دلِ رسولؐ، شہِ مشرقین کا

وہ وقت عصر اور وہ ظلمت کی آندھیاں ۲۴ عباس تھے نہ عون و محمد سے حق بیاں
سینے پہ نیزہ کھا کے گرے اکبر جواں اصغر بھی شہ کے ہاتھوں میں پہنچے سوئے جناں
تنہا رہے حسینؑ فقط ریگزار میں
چہرہ اَٹا تھا خون میں، گرد و غبار میں

ایسے میں بھی ادا کیا سجدہ حسینؑ نے کب دوستو قضا کیا سجدہ حسینؑ نے
یارو دمِ دغا کیا سجدہ حسینؑ نے [۴۴] حق رہ گیا، وفا کیا سجدہ حسینؑ نے
سجدے میں اپنے سر کو کٹایا حسینؑ نے
سجدے کی آبرو کو بچایا حسینؑ نے

اب مرثیے کا رخ واقعات کربلا کی طرف مُڑ جاتا ہے۔ حسینؑ کی شہادت سجدے میں، نیزے پر حسینؑ کا سر بقائے سجدہ، خیموں میں آگ لگی، سروں سے ردائیں چھنیں، سیدّالساجدین مصروف سجدہ، مرثیے کا عنوان سجدہ تھا اور سجدہ ہے۔ مشہود جعفری مصائب کے بیان میں بھی سجدے کے ساتھ ساتھ ہیں۔ شامِ غریباں کی بیکسی ہے، زینب سکینہ کو ڈھونڈ رہی ہیں، سکینہ کے دامن کو آگ لگ چکی ہے۔ چار برس کی بچی مقتل کی طرف بھاگ رہی ہے۔ بابا کی لاش پر پہنچتی ہے، بابا سے شکایت کرتی ہے، بابا کی آواز آتی ہے، مرثیہ کا آخری بند، پھر ذکرِ سجدہ۔

آئی صدا کی بچی ابھی شام جاؤ گی سجدے کی آبرو کو تمہیں تو بچاؤ گی
اور داستانِ کرب و بلا بھی سناؤ گی زندانِ شام سے مجھے ملنے کو آؤ گی

مرثیہ تمام ہوا، آخری بیت، شاعر کی بے بسی، شاعر کا عجز، شاعر کا سجدۂ ذکر و فکر؟
زندانِ شام درد و الم کی کتاب ہے
مجبور ہوں سُنانے کی کب مجھ میں تاب ہے

مرحبا مشہود جعفری اکبر آبادی۔

☆☆☆☆☆

علی سردار جعفری:- (ممبئی)

پیدائش ۲۹ رنومبر ۱۹۱۳ء (بلرام پور، بھارت)۔ وفات یکم اگست ۲۰۰۰ء ممبئی۔

اودھ کی تہذیب میں بالخصوص اور اُردو زبان وادب کے علاقوں میں بالعموم نام کے ساتھ عرفیت بھی ہوتی تھی۔ جیسے سجاد ظہیر عرف بنے بھائی، سید صادق علی عرف چھنگا صاحب حسین، سید ظفر حسین عرف منو صاحب آرزو لکھنوی، مولانا سید اولاد حسین عرف للّن صاحب شاعر لکھنوی، وغیرہم۔ سید علی سردار جعفری کی عرفیت انجمن ترقی پسند مصنفین تھی اور اُن کی پہچان بھی

کچھ اسی طرح ہے کہ علی سردار جعفری عرف ترقی پسند تحریک یا علی سردار جعفری عرف انجمن ترقی پسند مصنفین ۔ اس عرفیت کے رشتے سے سردار جعفری راقم الحروف کے قائد بھی تھے اور رہنما دوست بھی۔ سردار جعفری کی شخصیت اور اُن کے فن میں بیشمار جہتیں ہیں جن پر صف اوّل کے ادیبوں نے لکھا ہے، لکھ رہے ہیں اور لکھتے رہیں گے۔ اس وقت اُن کی مرثیہ گوئی پر گفتگو مقصود ہے۔

بچوں کی نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ پانچ برس سے ۹ برس کی عمر کے دوران بچہ جو پڑھتا ہے۔ جو سنتا ہے وہ اُس کے ذہن پر نہ مٹنے والے نقوش بنا دیتا ہے۔ اس نفسیاتی کلیّہ کی رُو سے سردار جعفری کے ذہن میں سوچ اور فکر کا سورج طلوع ہونے سے پہلے مرثیے نقش ہو چکے تھے۔ اپنی خودنوشت سوانح یا سرگذشت میں وہ خود لکھتے ہیں۔

''اپنے انتقال سے پہلے میرے والد بستر سے اُٹھنے کے قابل نہیں تھے تو اُن کی چارپائی محرّم کی مجلسوں کے لئے عزاخانے میں لا کر رکھ دی جاتی تھی اور وہ لیٹے لیٹے مجلس سنتے تھے — چاندرات کو عورتیں چوڑیاں توڑ دیتی تھیں اور سب لوگ کالے کپڑے پہن لیتے تھے۔ دس دن مجلسیں ہوتی تھیں جن کی بدولت میں نے اس عہد کے سارے بڑے ذاکروں کو سنا ہے۔ دولہا صاحب عروؔج کو میں نے اس عالم میں دیکھا ہے کہ وہ منبر کے نیچے تقریباً دوہرے ہو کر بیٹھے تھے۔ دو آدمیوں نے سہارا دے کر منبر پر بٹھایا، مرثیہ اُنہوں نے ہاتھ میں لیا، ایک بار سنبھلے اور پڑھنا شروع کیا تو دوسری ہی چیز ہو گئے ۔

نام مردوں کا رقم باڑھ پہ تلوار کی ہے

اس کے علاوہ میر انیؔس کے مرثیوں کا چرچا بھی تھا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ کلمہ اور تکبیر کے بعد شاید میرے کانوں نے پہلی آواز انیؔس کی سنی ہے میں شاید پانچ چھ برس کی عمر سے منبر پر بیٹھ کر سلام اور مرثیے پڑھنے لگا تھا۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ میں نے پندرہ برس کی عمر میں خود مرثیے کہنے شروع کر دئے، ان کی زبان، بیان، تشبیہ، استعارے ہر چیز انیؔس کی تھی۔ میرا اپنا کچھ نہیں تھا، میں ساتھ ساتھ ستر ستر بند لکھ جاتا تھا لیکن مرثیہ

ختم نہیں ہو پاتا تھا۔

(نیا سفر۔شمارہ ۱۶۔جولائی ۲۰۰۰ء۔ادارت عاشور کاظمی،علی احمد فاطمی)

مجلس اور عزائے حسینی کا ماحول، دولہا صاحب عروج اور میر انیس کے مرثیوں کی گونج، والدین کی تربیت، اور خود علی سردار جعفری کو اللہ کی عطا کردہ نعمت یعنی ذہنِ بیدار۔ تقدیس کی یہ فضا، درد کی یہ نوا، اور کرم ربِّ علی ہو تو مٹھی میں کنکریاں بول اُٹھتی ہیں سردار جعفری تو ایک تعلیم یافتہ مہذب گھرانے کے فرزند تھے۔ پندرہ برس کی عمر میں اُن کا مرثیہ کہنا تعجب خیز امر نہیں ہے، وہ مرثیہ نہ کہتے تو تعجب کی بات ضرور ہوتی ——

سردار جعفری کا پہلا مرثیہ ۔

آتا ہے کون شمعِ امامت لئے ہوئے　　اپنے جلو میں فوجِ صداقت لئے ہوئے
ہاتھوں میں جامِ سرخِ شہادت لئے ہوئے　　لب پر دعائے بخششِ اُمت لئے ہوئے
اللہ رے حُسن فاطمہؑ کے ماہتاب کا
ذرّوں میں چھپتا پھرتا ہے نور آفتاب کا

زہرا بھی ساتھ ہیں حسنِ مجتبیٰ بھی ساتھ　　جعفر بھی ساتھ ساتھ ہیں، مشکل کشا بھی ساتھ
حمزہ بھی ہیں جنابِ رسولِ خدا بھی ساتھ　　تنہا نہیں حسینؑ کہ ہیں انبیاء بھی ساتھ
شورِ درود اُٹھتا ہے سارے جہاں سے
برسا رہے ہیں پھول ملک آسمان سے

اکبر ہیں اک شبیہ رسالت مآب کی　　ہیں روشنی نگاہِ بنِ بوتراب کی
شرمندہ نورِ رُخ سے کرن آفتاب کی　　چہرے سے ٹپکی پڑتی ہے سرخی شباب کی
عارض کے گرد، سبزۂ خط کی بہار ہے
روشن چراغِ عابدِ شب زندہ دار ہے

مرثیے جیسی دشوار صنفِ سخن میں سردار جعفری کا یہ مرثیہ قاری کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ اُنھوں نے خود لکھا ہے کہ پندرہ سولہ برس کی عمر میں اُنھوں نے منبر پر بیٹھ کر یہ مرثیہ پڑھا تو والد اور چچا نے گلے لگایا۔ ماں نے دعائیں دیں، اُن کے والد گرامی اور چچا اس مرثیے کا ایک بیت بار بار پڑھتے تھے اور روتے تھے۔

اکبر کو اپنے پہلوئے غم میں سُلاؤں گی
اصغر کو اپنی گود میں جھولا جھلاؤں گی

اس ہمت افزائی نے سردار جعفری کے جذبوں کو مہمیز کیا اور پندرہ بیس دن کے اندر اندر اُنہوں نے دوسرا مرثیہ کہا ۔ ''آتا ہے ابن فاتح خیبر جلال میں''

آتا ہے ابنِ فاتحِ خیبر جلال میں ہلچل ہے شرق و غرب و جنوب و شمال میں
اک تہلکہ ہے وادیٔ دشت و جبال میں بھاگا ہے آفتاب بھی برجِ زوال میں
کروٹ بدل رہی ہے زمیں درد و کرب سے
ہلتا ہے دشت گھوڑے کی ٹاپوں کی ضرب سے

اور لیجئے صاحب سردار جعفری پر الزام لگ گیا کہ وہ خود مرثیہ نہیں کہتے بلکہ کسی سے کہلوا کر پڑھتے ہیں، الزام غیر متوقع نہیں تھا اس لئے کہ ۱۶ برس کی عمر کے ایک نوجوان نے جو مرثیے کہے تھے وہ کہنہ مشقی اور پختگی کلام پر دلالت کرتے تھے۔ دوسرے مرثیے میں ''گھوڑے کی ٹاپوں کی ضرب'' ایک اچھا قافیہ اور نیا استعارہ تھا— سردار جعفری اس الزام پر دل شکستہ نہیں ہوئے بلکہ ناگواری نے اُنہیں نیا حوصلہ دیا اور اُنہوں نے ایک اور مرثیہ کہا۔

اے بلبلِ ریاضِ بیاں، نغمہ بار ہو اے نو عروسِ طبع جواں ہم کنار ہو
اے خامۂ شگفتہ زباں لالہ کار ہو اے حاسدِ دریدہ دہاں، شرمسار ہو
کیا اس میں مجھ سے ہیچمداں کا قصور ہے
یہ تو عطائے رحمتِ ربِّ غفور ہے

بھلا اس شاعری پر کون غیر یقینی کا شکار نہ ہوتا، سولہ سال کا نوجوان اپنی کم عمری کا اقرار ''نوعروس طبع جواں'' کہہ کر کر رہا ہے لیکن اس اقرار میں کیسی خوداعتمادی ہے۔ بندش و تراکیب میں انیس کی پیروی ہے، سردار جعفری نے ٹھیک ہی تو لکھا تھا کہ ''ہر چیز انیس کی تھی'' یہ انکسار بجا مگر پندرہ سولہ برس کی عمر میں خدائے سخن میر انیس کو سمجھنا اور اس حد تک سمجھنا کہ منہ کھلے تو زبان پر ''عطائے رحمت ربّ غفور'' کی جولانی ہو۔ قلم چلے تو ''ہلچل ہو شرق و غرب و جنوب و شمال میں'' لکھے۔ علی سردار جعفری نے جگہ جگہ اور بار بار میر انیس سے اپنی عقیدت اور انیس کے فیض کا ذکر کیا ہے:

"انیسؔ کے مرثیے محرم میں پڑھے جاتے تھے، بچپن کے کھیلوں
میں بیت بازی بھی شامل تھی اور اکیس اساتذہ کے علاوہ انیسؔ کے مرثیوں
کیا اشعار بھی ہوتے تھے۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں پہلا شعر کہا۔

"عرش تک اوس کے قطروں کی چمک جانے لگی
جب چلی ٹھنڈی ہوا تاروں کو نیند آنے لگی"

یہ شعر معنوی عتبار سے میرے ذاتی مشاہدے کا نتیجہ تھا مگر فنی
اعتبار سے انیسؔ کا فیض تھا اس لئے کہ مرثیے سے نظم نگاری تک ہر سفر میں
انیس کی شاعری نے میری رہنمائی کی ہے"　(سہ ماہی 'نیا سفر' ایضاً)

عام طور پر شاعروں کا سفر غزل و نظم سے مرثیہ کی طرف ہوتا ہے حتیٰ کہ میر انیسؔ جیسے مرثیے کے پروردگار شاعر کے شعری سفر کی ابتدا بھی غزل سے ہوئی تھی لیکن سردار جعفری وہ شاعر ہیں کہ اُن کے سفر کا آغاز مرثیے سے ہوا اور نظم کی دوسری جہتوں تک پہنچا —— اُن کا پہلا مرثیہ ۔ "آتا ہے کون شمع امامت لئے ہوئے" اردو شاعری میں صنف نظم کا شاہکار ہے لیکن مصطفیٰ زیدی کے اکلوتے نامکمل مرثیے 'اے کربلا، اے کربلا' کو اساس بنا کر سردار جعفری نے جو نظم کہی ہے اُسے مرثیہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہے اور یہی مرثیہ صنف نظم کی سربلندی و سرفرازی کی دلیل ہے۔ اس نظم کو نقل کرتے ہوئے راقم الحروف کو الہ آباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی ١٩٨٦ء میں اپنا بیان یاد آ رہا ہے جس میں راقم الحروف نے کہا تھا کہ:

"دنیا کی پہلی ترقی پسند شخصیت وہ ذات گرامی تھی جس نے کہا تھا" غلاموں کو آزاد کرو۔ لڑکیوں کو زندہ دفن نہ کرو، انہیں اُن کے حقوق دو، انسانوں میں تفریق نہ کرو، اس ذات گرامی کا نام نامی اور اسم گرامی محمد مصطفیٰؐ تھا۔ دوسرا ترقی پسند انسان وہ تھا جس نے خلافت اور حکمرانی کے دور میں بھی خشک نانِ جویں کھا کر زندگی گذار دی اور غالب علیٰ کلِّ غالب رہا۔ اور دنیا کی تیسری ترقی پسند شخصیت وہ تھی جس نے ملوکیت کے جبر کو قبول نہیں کیا، شہنشاہیت کے اقتدار مطلق کو نہیں مانا، آدمیت اور انسانیت کا پرچم بلند کیا، وہ جو باطل کی طاغوتی طاقت سے ٹکرا گیا لیکن اللہ کی حاکمیت اور عظمت انسانیت کا پرچم سرنگوں نہ ہونے دیا — آج دنیا اس کے گیت گاتی ہے"

سردار جعفری کی نظم اے کربلا اے کربلا بھی اُسی عظمت کا قصیدہ ہے جو ظلم کے خلاف نعرۂ حق ہے۔ کربلا کی تاریخ کو کسی ایک مکتبۂ فکر کی سوچ قرار دے کر اس سے انحراف کرنے والوں کے لئے مصطفیٰ زیدی کی اے کربلا۔ اے کربلا، بالخصوص علی سردار جعفری کی کربلا۔ اے کربلا آگہی اور فکر کا ایک ایک باب ہیں۔ ڈاکٹر ہلال نقوی نے بھی علی سردار جعفری کی نظم ''اے کربلا، اے کربلا'' کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور لکھا ہے۔

> ''مرثیے کے ارتقائی سفر میں مسدس سے ہٹ کر بھی جن شعراء کی تخلیقات قابلِ ذکر ہیں اُن میں علی سردار جعفری، فارغ بخاری، عارف عبدالمتین، عبدالرؤف عروج اور عاشور کاظمی کے علاوہ رضی ترمذی، باقر مہدی، جمیل نقوی، رئیس امروہوی اور خلش پیر اصحابی کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ اُن شعراء میں مرکزی نام علی سردار جعفری کا ہے جنہوں نے مصطفیٰ زیدی کے مرثیے ''اے کربلا، اے کربلا'' کی بحر میں اس ٹکڑے کو اپنے خیال کا اساس بنا کر رجزیہ لحن میں یہ طرز اختیار کی''

(بیسویں صدی اور جدید مرثیہ ــــ ڈاکٹر ہلال نقوی ــــ ص ۸۲۱)

پھر العطش کی ہے صدا جیسے رجز کا زمزمہ
پھر ریگِ صحرا پر رواں ہے اہلِ دل کا کارواں
نہرِ فرات آتش بجاں راوی و گنگا خوں چکاں
کوئی یزیدِ وقت ہو یا شمر ہو یا حُر ملا
اس کو خبر ہو یا نہ ہو نزدیک ہے روزِ جزا
اے کربلا، اے کربلا

گونگی نہیں ہے یہ زمیں گونگا نہیں ہے آسماں
گونگی اگر ہے مصلحت گونگے نہیں حرف و بیاں
وہ خوں جو رزقِ خاک تھا تابندہ ہے تابندہ ہے
صدیوں کی سفاکی سہی انسان اب بھی زندہ ہے
زندہ ہے اعجازِ فغاں خیموں کو ملتی ہے زباں

ہر ذرۂ پامال میں دل کے دھڑکنے کی صدا

اے کربلا، اے کربلا

علی سردار جعفری یکم اگست ۲۰۰۰ء کو ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں، لب ہائے صداقت سے کہا گیا ہے کہ جو آلِ محمد کی محبت میں مرتا ہے وہ شہید ہوتا ہے، اور شہید مردہ نہیں ہوتا، زندہ ہوتا ہے، شاید سردار جعفری کو اپنے دل میں موجزن، محبت اہلبیتِ رسول کے بیکراں سمندر کا اندازہ تھا اور یقین تھا کہ اُنہیں موت نہیں آئے گی اسی لئے کہہ گئے ہیں۔

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا

بچوں کے دہن سے بولوں گا

چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا

اور سارا زمانہ دیکھے گا

سردار جعفری نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ ہم نے اُن کے لفظ لفظ کا اعتبار کیا ہے۔ ہماری پوری نسل نے اُن کا اعتبار کیا ہے اور بدلتے موسم بتا رہے ہیں کہ ہماری آنے والی نسلیں ہم سے زیادہ علی سردار جعفری کی باتوں پر یقین کریں گی اس لئے کہ اُنہوں نے جو کہا وہ کیا۔ جو لکھا وہ ہوا۔ اُنہوں نے بیسویں صدی میں ہندوستان اور جنوبی ایشیا کو آزادی دلانے کے لئے نعرہ لگایا تھا۔ بدیسی حاکموں کو للکارا تھا ؎

ایشیا سے بھاگ جاؤ

تیوریاں بدلے ہوئے ہیں اب زمین و آسماں

بجلیاں لے کر اُٹھا ہے دل کی آہوں کا دھواں

آنکھ سے آنسو کے بدلے ڈھل رہی ہیں گولیاں

بن گئے ہیں رائفل کی آنکھ اب سینے کے گاؤ

ایشیا سے بھاگ جاؤ

سردار بھائی آج ہمیں بہت یاد آ رہے ہیں۔

سردار بھائی۔ اکیسویں صدی کے لئے ہم نے آپ نے جو خواب دیکھے تھے وہ بکھر گئے ہیں۔ اکیسویں صدی کا ایشیا ایک بار پھر پکار رہا ہے ؎

بجلیاں لے کر اُٹھا پھر دل کی آہوں کا دھواں
تیوریاں بدلے ہوئے ہیں پھر زمین و آسماں
آنکھ سے آنسو کے بدلے ڈھل رہی ہیں گولیاں
بن رہے ہیں رائفل کی آنکھ اب سینے کے گھاؤ
ایشیا سے بھاگ جاؤ

(سردار بھائی! تحریف کی معذرت کہ میں نے گزری ہوئی 'کل' کو 'آج' کے آئینے میں دیکھا ہے جب کہ آپ نے تو ہمیں آنے والی 'کل' کو بدلنے کی کوششوں کا سبق سکھایا تھا۔ اکیسویں صدی میں تو بے یقینی کا یہ عالم ہے کہ نجانے کل ہوگی بھی کہ نہیں)

☆☆☆☆☆

حسن عباس زیدی:- (لاہور)

ولادت ۱۹۲۲ء۔ وفات ۱۷؍ جولائی ۲۰۰۰ء

''پانی پت کے میدان'' کے اِس کنارے شہر پانی پت آباد ہے اور دوسرے کنارے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر سادات کی دو بستیاں آباد تھیں (اب بھی آباد ہیں) مگر وہاں سادات آباد نہیں۔ ان دونوں بستیوں میں سے ایک کا نام ''برست'' اور دوسری کا نام ''فرید پور'' تھا اور ہے۔ دونوں بستیوں کے درمیان شاید دو فرلانگ سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ تقسیم ہند سے پہلے ان بستیوں کا ایک ہی نام ''برست فرید پور'' تھا۔ ان بستیوں میں آباد سادات میں بھی کوئی فاصلہ نہیں تھا۔ دونوں بستیوں میں ''سادات باہرہ'' آباد تھے۔

راقم الحروف کی جائے پیدائش ''فرید پور'' ہے، سید حسن عباس زیدی ''برست'' میں پیدا ہوئے تھے۔ دونوں بستیوں میں جو تہذیب کارفرما تھی۔ جو رسم و رواج تھے اس کے تحت ہمیں تو بچپن میں یہی بتایا گیا تھا کہ ''برست فرید پور'' میں اپنی عمر سے بڑا ہر شخص ہمارا بڑا بھائی یا چچا ہوتا تھا۔ حسن عباس زیدی اسی رشتے سے میرے چچا ہوئے۔ آج میں چچا سید حسن عباس زیدی کا تعارف لکھ رہا ہوں۔

چچا حسن عباس زیدی کی ابتدائی تعلیم کرنال میں ہوئی، اس کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی سے بی۔ اے ایل بی کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عام آدمی اپنے بچوں کو علی گڑھ نہیں بھیج سکتا تھا۔ علی گڑھ

سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد شیعہ کالج لکھنؤ میں انگریزی کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ لکھنؤ میں قیام کے دوران شعروادب کے چاند ستاروں سے روشنی ملی اور شعر کہنے لگے۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان آگئے اور ابتداً خوشاب بعد ازاں سرگودہا میں (جسے میں نے ہمیشہ وزیر آغا کا شہر سرگودہا لکھا ہے) ایک ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ اپنے مجموعہ کلام "خلش دل" کے دیباچے میں سرگودہا کے متعلق وہ خود تحریر کرتے ہیں کہ:

> میں جن لوگوں کے کلام سے متاثر ہوا ہوں اُن میں وزیر آغا، قیصر بارہوی، رشک ترابی، سیف زبیری (شاگرد جگر مرادآبادی) اور اخگر سرحدی شامل ہیں۔

تصانیف:

(۱)	خلش دل	غزلیات، نظمیں، نعت، رباعی، قصائد	مطبوعہ ۱۹۸۶ء
(۲)	ندائے کربلا	سلام، رباعیات، مسدّس، مرثیہ	مطبوعہ ۱۹۹۲ء
(۳)	تجلیاتِ حسنؑ	نعت، رباعیات، قصائد، منقبت	مطبوعہ ۱۹۹۷ء
(۴)	عزمِ حسینؑ	مرثیہ جو مرثیہ نگاران پنجاب کی طرف سے اُن کی وفات کے بعد شائع ہو۔	

سید حسن عباس زیدی جنوری ۱۹۸۴ء میں ملازمت سے ریٹائر ہو کر لاہور منتقل ہو گئے تھے۔ ان کی تصانیف پر ممتاز ناقدین نے تبصرے کئے ہیں۔ سید وحید الحسن ہاشمی نے لکھا ہے۔

> ان کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ محرّک اور رواں دواں ہے وہ ہے بدی کے خلاف جذبۂ جہاد۔ انہوں نے کثرت سے ایسے اشعار کہے ہیں جن میں بدی اور بدکاروں کے خلاف بری شدّومدّ کے ساتھ جنگ کا اعلان ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ ایک مومن جہاں اپنی صفوں میں اتحاد قائم کرتا ہے وہیں دشمنانِ ایمان کے خلاف نبرد آزمائی کا اعلان بھی کرتا ہے۔ حسن عباس زیدی نے امام حسینؑ کی حمایت میں اس لئے اشعار کہے ہیں کہ موصوف کو امام حسینؑ سے بے پناہ عقیدت ومحبت ہے اور وہ انہیں پرہیزگاری، نیکی اور بردباری کا نمائندہ سمجھتے ہیں۔ اور

یزید کی مخالفت اس لئے کی کیونکہ وہ ظلم و ستم کا نمائندہ ہے۔ اور وہ اس دور کے مسلمانوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر ظلم و ستم اور غیض و غضب برسرِ اقتدار آجائیں تو گلا کٹانے سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیے۔ دنیا میں حق و باطل کی جنگ ازل سے چلی آرہی ہے۔ نیک، متقی اور پختہ عقیدہ کے لوگ ہی اس سے ہمیشہ سے نبرد آزما رہے ہیں۔ (سید وحید الحسن ہاشمی)

سید حسن عباس زیدی کے بارے میں پروفیسر حسن عسکری کاظمی لکھتے ہیں:

'زینبؑ اور حرمتِ دین'، 'زینبؑ اور اہل دین' زینبؑ اور حق و صداقت' زینبؑ اور متاعِ صبر و اقامت، ایک ایسی حقیقت کا نام ہے کہ اہل اسلام کا سر عقیدت سے اس نام کے آگے جھک جانے پر مجبور ہے۔

زینبؑ بہارِ گلشنِ وحدت کا نام ہے زینبؑ جمالِ نظمِ امامت کا نام ہے
زینبؑ دراصل دین کی عزّت کا نام ہے زینبؑ کمالِ حق و صداقت کا نام ہے
زینب متاعِ صبر و اقامت کا نام ہے

سید حسن عباس زیدی نے مخمس کی ہیئت میں یہ نظم ترتیب دیکر ندائے کربلا میں ایک خوبصورت نظم کا اضافہ کیا ہے۔ قاری اِس نظم سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اِن کی اِس تخلیق کے تیور ہی اور ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ موصوف کے اندر چھپا ہوا فنکار، ردائے عقیدت اوڑھے اِن کے ہاتھ سے قلم لے کر چُپ چاپ ایسی نظم تخلیق کرنے کا عزم کر چکا ہے کہ ندائے کربلا کا شاعر بھی اِس معیار کی کوئی اور نظم تخلیق نہ کر سکے۔ پروفیسر آغا سہیل (ایف سی کالج۔ لاہور) رقم طراز ہیں:

اُستاذی جناب حسن عباس زیدی صاحب کے عقائد و مُسلمات قارئین اُردو ادب پر بخوبی ظاہر ہیں۔ انہیں شعری سانچہ میں ڈھالنا ایک ایسے شخص کے لئے جسے مذاقِ سلیم ودیعت ہوا ہو مشکل نہیں۔ سیدھی سادی، رواں اور عام فہم بحروں میں آسان زبان اور روزمرّہ کے ساتھ استعمال کرنے کا سلیقہ جسے قدرت کی طرف سے ملا ہو اس کے لئے یہ امر نہایت آسان ہے۔ قوافی

اور ردیف سے مرتب اور منضبط صورت میں شعری سانچے میں ڈھالنا کونسا مشکل کام ہے۔ چنانچہ میری ناچیز رائے میں استاد موصوف کی شاعری میں متخیلہ کے تنوع کے ساتھ ساتھ قوت نظم گوئی ان کے شعری وجدان اور مذاق سلیم کی منت پذیر ہے۔ جس میں غنائیت اور نغمگی کے ساتھ ساتھ ماہرانہ چابکدستی بھی موجود ہے۔ اللہم زد فزد—

پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی کی شفقت بھری رائے بھی سید حسن عباس زیدی کی شاعری کے لئے ایک سند ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ان کے اشعار میں نہ غلو ہے نہ مبالغہ، شاید انہیں علم ہے کہ اس مادّی دَور میں لوگ نہ معجزات، نہ کرامات کے قائل ہیں، بلکہ وہ اس افسانی زندگی کی تلاش میں ہیں جس کا ذکر حجتہ الوداع میں پیغمبرؐ اسلام نے کیا تھا۔ زیدی صاحب کی شعری طہارت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے ہر مقطع میں پاک نفوس کے روضۂ اطہر کی زیارت کرنا بڑی سعادت سمجھتے ہیں۔ اور ہمیں علم ہے کہ پاک ہستیوں کے روضوں پر حاضری دینے والا خود پاک جسم اور پاک رُوح کا مالک ہوتا ہے۔

پروفیسر مشکور حسین یاد اور اس عظمت فکر ونظر پر فائز دیگر ناقدین نے بھی سید حسن عباس زیدی کو خوش نوا اسلوب کا شاعر تسلیم کیا ہے۔ اُن کا مرثیہ عزم حسینؑ جو اُن کی وفات کے بعد شائع ہوا اس پر وحید الحسن ہاشمی کی تقریظ ہے۔ نمونہ کلام کے طور پر مرثیے کے چند بند درج ذیل ہیں ۔

وہ عزم جس پہ ہمت کونین ہے نثار — وہ عزم جس پہ ناز کرے شیرِ کردگار
وہ عزم جو ہے گلشنِ اسلام کی بہار — اہلِ وفا کے قلب و جگر کی ہے جو پکار
وہ عزم کائنات کی طاقت لئے ہوئے
رعب و جلال و ہمت و شوکت لئے ہوئے

وہ عزم جس کے سامنے دنیا جھکی ہوئی — ہر ذی نفس کی سانس قیامت بنی ہوئی
ہر دل میں جس آگ برابر لگی ہوئی — زنجیرِ شیطنت کے قدم میں پڑی ہوئی

وہ عزم جو ارادۂ قدرت لئے ہوئے
موسیٰؑ کا زہد ہاشمی صولت لئے ہوئے

بھائی کی لاش خیمے میں لائے نہ آہ کی اکبرؑ لہو میں اپنے نہائے نہ آہ کی
اصغرؑ بھی جا کے رن سے نہ آئے، نہ آہ کی قاسمؑ نے وار جسم پہ کھائے نہ آہ کی
اسلام تیرے نام سے چھائے گا اے حسینؑ
تجھ سا جہاں میں کوئی نہ آئے گا اے حسینؑ

جو واقفِ طریق ہدایت تھا وہ حسینؑ جو آشنائے رمزِ امامت تھا وہ حسینؑ
سالار کاروانِ ہدایت تھا وہ حسینؑ عالم میں رازدار حقیقت تھا وہ حسینؑ
وہ جس کے پختہ عزم نے باطل کو مات دی
جس نے اجل سے چھین کے ہم کو حیات دی

اور حسین مظلوم کی عظمت کا اقرار اور مقصد حسینؑ سے آشنا ہونے کے بعد سید الشہدا کے پیام کو حسن عباس زیدی نے نعرہ بنا دیا۔ راہ ہدایت پر بلانے کے لئے نعرہ۔

ہاں وہ حسینؑ جس سے منوّر ہے یہ زمیں کہتے ہیں جس کو اہلِ وفا عشق کا نگیں
تعریف دشمنوں نے بھی کی جسکی بالیقیں بیشک وہی امام وہی ہے ستونِ دیں
ہاں اب بھی اس کی راہ ہدایت پہ چل پڑو
ایمان تازہ لے کے گھروں سے نکل پڑو

اُٹھو عنانِ سطوتِ شاہی کو توڑ دو اُٹھو یزیدیت کی کلائی مروڑ دو
عزمِ وفا سے دست شقاوت کو توڑ دو اُٹھو خُدا سے رشتۂ اُمید جوڑ دو
تم سے بہت امید ہے ارباب صبر کو
اٹھو مٹا دو صفحۂ ہستی سے جبر کو

وہ انقلاب لاؤ کہ مسرور ہوں عوام ایسی فضا بناؤ کہ فطرت ہو شاد کام
قبضے میں ہو تمہارے اخوت کی صبح و شام گونجے تمام دہر میں ابنِ علیؑ کا نام
اپناؤ یوں حسین علیہ السلام کو
لگ جائے گھن جہاں میں یزیدی نظام کو

اور مرثیے کے آخری بندوں میں وہ اپنا پیغام چھوڑ کر اس دنیا سے اپنے مولا حسینؑ کی بارگاہ میں چلے گئے۔ کتنے سرخرو ہو کر گئے ہیں وہ؟ کیا با معنی پیغام چھوڑ گئے ہیں جو قیامت تک اُن کی لحد پر پھول برسانے کا جواز بنا رہے گا۔

عاشور کو وہ سجدۂ آخر حسینؑ کا ہر دور کی نماز کا معیار بن گیا
راضی نبی کی روح ہوئی خوش ہوا خدا عزمِ حسینؑ نے کہا بڑھ کر کہ مرحبا
تمہید سرگزشت عبادت ہے حسینؑ
اب جو پڑھے نماز سے پہلے کہے حسینؑ

☆☆☆☆☆

سید فیضی:- (راولپنڈی)

ولادت ۲ رجنوری ۱۹۱۶ء۔ وفات ۲۰۰۰ء

نام سید فیض الحسن۔ تخلص فیضی۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ سیّد فیض الحسن فیضی کا آبائی وطن جالندھر (مشرقی پنجاب) تھا لیکن فیضی موضع کوٹلی لوہراں، ضلع سیالکوٹ (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ اُن کے مورث اعلیٰ سید احمد توختہ کا مزار "چہل بیبیاں" موچی گیٹ لاہور میں ہے۔ فیضی کے والد سید عبدالرزاق ایک عرصے تک بسلسلۂ ملازمتِ سرکار، بریلی میں رہے۔

سید فیضی نے گورنمنٹ، کالج لاہور سے بی۔اے (آنرز) کیا۔ گھر میں فارسی بولی جاتی تھی۔ ۱۹۳۹ء میں ایم۔اے (فارسی) کیا۔ ۱۹۴۰ء میں اسلامیہ کالج جالندھر میں لیکچرر مقرر ہو گئے۔ تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۷ء میں پاکستان آ گئے۔ فیضی شاعر، نثر نگار، مترجم، نقاد اور محقق کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔

شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب چھٹی جماعت کے طالب علم تھے۔ شاعری کی ابتدا فارسی زبان میں کی — تذکروں میں لکھا ہے کہ اُن کی پہلی رباعی حسب ذیل تھی۔

رازے کہ بدل ہست، عیاں خواہد شد
طفلے کہ بمہد است، جواں خواہد شد
خوش دار کہ در عالم الفت، فیضی
ہر آنچہ کہ نمی خواہی، بجاں خواہد شد

یہ رباعی اس علمی اور ادبی پس منظر کی تصویر نظر آ رہی ہے جس میں سید فیضیؔ نے تربیت پائی اور اس فراست و ذہانت کی پیش گوئی ہے جو سید فیضیؔ کو عطا ہوئی۔ فیضیؔ نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہے اور ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اُردو شاعری میں حضرت سیمابؔ اکبرآبادی سے سلسلہ تلمذ وابستہ کیا۔ برصغیر کے ممتاز رسائل میں سید فیضی ایک ممتاز اور معتبر شاعر کی حیثیت سے شائع ہوتے رہے ہیں — سید فیضیؔ کثیر المطالعہ شاعر ہیں۔ فارسی میں حافظؔ، نظیریؔ، شیخ سعدیؔ اُن کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ اُردو میں میر انیسؔ، داغؔ، اقبالؔ اور جوشؔ کو جی کھول کر پڑھا ہے اور ان سے اثرات قبول کیے ہیں۔

سید فیضیؔ نے پہلا مرثیہ ۱۹۶۸ء میں کہا جو حضرت قاسم کے احوال پر ہے۔ ''آنسو نہ کیوں عزیز ہوں مجھ غم شعار کو'' اس کے بعد ۲۰۰۰ء تک اُنہوں نے پانچ مرثیے کہے ہیں۔ اُن کے مراثی میں فارسی کی تراکیب نظر آتی ہیں شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہو کہ فارسی زبان میں اُن کی مہارت غیر شعوری طور پر ان کے مراثی میں در آئی ہے — یوں تو اُن کی مرثیہ گوئی جدید و قدیم کا ایک امتزاج ہے لیکن جدید مرثیے کے متعلق اُن کی رائے اعتدال کی حامل ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

> ''جدید مرثیہ میری نظر میں وہ ہے جو حالات اور وقت کے تقاضوں کو پورا کرے''

اس کی تشریح صرف یہ ہو سکتی ہے کہ جہاں تک حالات کا تعلق ہے اور جو حالات مرثیے میں قلمبند کیے جاتے ہیں اُن حالات اور اُس تاریخ کو تو نہیں بدلا جا سکتا۔ لہٰذا وقت کے تقاضوں، اور مروجہ زبان و بیان میں ارتقاء کو ملحوظ خاطر رکھ کر مرثیہ کہا جائے تو اسے جدید مرثیہ کہا جا سکتا ہے۔

سید فیضی کا ایک مرثیہ ''عظمت حسینؑ'' ہے جو ناقدین کی نظر میں آیا ہے ؎

جب بھی آثار تباہی کی خبر لاتے ہیں

جب بھی آثار تباہی کی خبر لاتے ہیں نوعِ انساں کے مقدر کو زوال آتے ہیں
آسماں روتے ہیں کہسار بھی تھراتے ہیں لمحے گردش کی طنابوں میں سمٹ جاتے ہیں
کائنات اپنی حقیقت کو بُھلا دیتی ہے
صبح کو چادرِ ظلمت میں چھپا دیتی ہے

۶۲ بند کے اس مرثیے کی ابتدا میں عظمتِ نفس اور عظمتِ نفس کے حوالے سے عظمت

انسان پر بحث کی گئی ہے اور گریز کے بند مرثیے کو امام حسینؑ کو عظمت انسان کا نمائندہ قرار دیتے ہیں۔ گویا عظمت نفس سے عظمت انسان تک۔ اور عظمت انسان سے حسین علیہ السلام تک ارتقا کا سفر تکمیل کی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

عظمتِ نفس کے پیغام سے واقف تھے حسینؑ صدق گوئی کے ہر انعام سے واقف تھے حسینؑ
اپنے آغاز سے انجام سے واقف تھے حسینؑ کربلا کی سحر و شام سے واقف تھے حسینؑ
پھر بھی یوں دشتِ مصائب میں قدم گاڑ دیئے
ہر طرف عظمتِ انساں کے علَم گاڑ دیئے

اور یہ عظمت انسانی حسین علیہ السلام کی ذات گرامی تک محدود نہ تھی بلکہ یہی عظمت انسانی خانوادہ رسالت کے ہر فرد کو عطا کی گئی تھی ۔

یہ محمدؐ کا گھرانا تھا وہ منزل گہہ نور سرنگوں تھا جہاں باطل کا ہر اندازِ شعور
جمع تھے کرب و بلا میں وہ بصد ذوقِ حضور صبر و تسلیم و رضا جن کی جبینوں کا غرور
ایک ہی غم کی کہانی تھی، کئی عنوان تھے
اس گھرانے کے سب افراد عظیم انساں تھے

آیات قرآنی کی منظوم ترجمے بھی ہوئے، آیات الٰہی کو اشعار میں استعاراتی اور حوالہ جاتی طور پر بھی استعمال کیا گیا۔ بالخصوص مرثیہ میں آیات قرآنی سے بہت استفادہ کیا گیا ہے۔ سید فیضی نے بھی یہ روش اختیار کی مگر اپنے مرثیوں میں بالعموم اور اس مرثیے میں بالخصوص اُنہوں نے آیات قرآنی کو جدید اسلوب کے مصرعوں میں اس طرح نظم کیا ہے کہ مرثیہ گوئی میں ایک نیا اضافہ بھی معلوم ہوتا ہے اور اشعار میں شعری حسن بھی باقی رہتا ہے۔ یہ انداز اُن کی قادر الکلامی پر دلالت کرتا ہے — چند اشعار درج ذیل ہیں۔

آیۂ اَنْتُمُ الاَعْلَوْنَ کی یہ دعوت ہے
دل میں ایمان کا ہونا بھی بڑی عظمت ہے

وسوسے دل میں نہ انداز نظر پر ہیں قیود
لب پہ کچھ ہے تو ھُوَ اللّٰہُ اَحَد وقتِ سجود

آج بھی جاری و ساری ہے یہ عظمت کا سفر
شرط ہے اس کے لئے عزم حسینی کی مگر

ہاتھ آتا ہے فقط اس کو یہ عزت کا گہر
زندگی جس کی ہو ایمان و عمل کا پیکر

پھر ابوذر کی طرح اس کا مقدر ہوگا
اور وہ سلطان کی مانند دلاور ہوگا

سید فیضی کا پہلا مرثیہ اگر ۱۹۶۸ء میں شمار کیا جائے تو بیسویں صدی کے اختتام تک ۳۲ برس کے عرصے میں سیّد فیضی جیسے صاحب فکر واسلوب شاعر سے دو چار پانچ مرثیوں کی توقع نہیں تھی۔ پھر ایسا کیوں ہوا؟ یہ زود گو شاعر کم گو کیسے ہو گیا؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

ظفر جونپوری:- (کراچی)

پیدائش ۱۶ راگست ۱۹۲۷ء بمقام جونپور۔ وفات ۲۰۰۰ء

نام سید مظفر حسین۔ تخلص ظفرؔ، والد کا اسم گرامی مولانا سید شبیر حسن صاحب مجتھد العصر جو عربی زبان کے شاعر بھی تھے۔

ابتدائی تعلیم، فیض آباد، میٹرک اور الیف۔اے (جونپور) بی۔اے (الہ آباد یونیورسٹی) دبیر کامل (لکھنؤ یونیورسٹی) علوم مشرقیہ کے اعلیٰ امتحانات بھی پاس کیئے۔ ۱۹۵۱ء میں پاکستان آگئے کراچی میں قیام کیا۔ شعبہ درس وتدریس سے وابستہ ہو گئے، ابتدا ماڈل سکول کراچی اور گورنمنٹ سکول کراچی میں اُستاد رہے۔ بعدازاں ۱۹۶۴ء میں کراچی یونیورسٹی میں شعبہ اسلامیات سے منسلک ہو گئے اور کراچی یونیورسٹی سے تاریخ اسلام اور ایم۔اے کی سندات بھی حاصل کیں۔ اور شعبہ اسلامیات میں لیکچرر ہو گئے۔

ہندوستان میں تھے تو شمیم کرہانی، الہ آباد یونیورسٹی میں علی جوادؔ زیدی، مصطفیٰ زیدی، احسن واسطی کا قرب رہا۔ ضیاء الحسن موسوی سے تعلق رہا۔ خمارؔ بارہ بنکوی سے دوستی رہی، ادب کے ان چاند ستاروں سے جو روشنی ملی اس نے ظفرؔ جونپوری کی کائنات فکر میں چراغاں کر دیا۔ شعر

گوئی کی ابتدا غزل سے ہوئی۔ پھر قصیدہ رباعی، نظم، نعت، منقبت اور سلام تک بات پہنچی۔ کراچی میں ایرانیان کی مجالس میں شریک ہوئے اور ہم عصروں کو مرثیہ گوئی کی طرف راغب پایا تو چراغ سے چراغ روشن ہوئے۔ ۱۹۶۱ء میں (بعمر ۳۴ برس) پہلا مرثیہ کہا۔ جس کا عنوان ''آئینہ صفات'' رکھا۔ ''خدا گواہ صفت آبروئے انساں ہے''۔ اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا، ہر سال کم از کم ایک مرثیہ ضرور کہنے لگے۔ دوسرا مرثیہ ۱۹۶۳ء میں کہا جس کا عنوان ''جلوۂ توحید'' تھا۔ ''بشر کے واسطے توحید ہے بڑی نعمت''۔

ظفر جونپوری خاصے طویل مرثیے کہتے تھے۔ اُن کا پہلا مرثیہ ۱۰۵ بند پر مشتمل تھا۔ دوسرا مرثیہ بھی ۱۰۵ بند پر مشتمل تھا۔ تیسرا مرثیہ جو ۱۹۶۴ء میں کہا گیا اس کا عنوان ''تہذیب وفا'' مصرعِ اولیٰ ''لاریب کہ انسان کی قیمت ہے وفا سے''۔ تھا۔ اس مرثیے کے ۱۳۰ بند تھے۔

ظفر جونپوری باقاعدہ کسی کے شاگرد نہیں ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ صرف ایک مرثیے پر آلِ رضا سے اصلاح لی تھی۔ میر انیس کو اُستادِ معنوی سمجھتے تھے۔ مرثیے میں مرثیے کے لوازم کی پاسداری کے قائل تھے۔ جدید مرثیے کے لئے اس حد تک رعایت دینے کے قائل تھے کہ بقول اُن کے اپنے:

''مرثیے کی ہیئت میں تبدیلی نہیں ہونی چاہیئے، البتہ
مضامین کے اعتبار سے جدید ہونا ضروری ہے''

اُن کے نزدیک مرثیہ بغیر رثا مرثیہ نہیں کہلایا جا سکتا (ہے بھی ایسا ہی)۔ اُنہوں نے اپنے مراثی میں رثا کو جزو لازمی سمجھا ہے اسی لئے اُن کے مرثیوں میں غم انگیزی اور درد کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں — لیکن کہیں کہیں بین میں کرداروں کی عظمت کو پیشِ نظر رکھتے ہیں جیسے ایک مرثیے میں علی اکبر کی شہادت کا منظر نامہ نظم کرتے ہوئے کڑیل جوان بیٹے کی لاش پر ایک باپ کا دکھ بیان تو کیا مگر مرحلۂ صبرِ حسینی بھی پیشِ نظر رکھا۔

دوڑے حسینؑ رن کی طرف ہو کے بے قرار غمگیں، ملول، درد رسیدہ، جگر فگار
گرنا وہ بار بار سنبھلنا وہ بار بار اکبرؑ کے پاس آ کے وہ احساس کی پکار
بیٹا ترے بغیر مرا قلب چاک ہے
دنیا یہ، زندگانیِ دنیا پہ خاک ہے

اس بند کے چوتھے مصرع میں ''احساس کی پکار'' کہہ کر بیٹے کی لاش پر باپ کا نوحہ بھی سنا دیا اور صبر حسینی کی تصویر بھی کھینچ دی — اسی طرح دوسرے بند میں زینبؑ کی کیفیت کے اظہار کے ساتھ امام حسینؑ کی برداشت کو بھی نمایاں کر دیا۔

آواز سُن کے خیمے سے خواہر نکل پڑی مقتل میں پہونچی، سینہ و سر پیٹتی ہوئی
دیکھا حسینؑ نے جو یہ انداز اس گھڑی بیٹے کی لاش چھوڑ کے زینبؑ کی فکر کی
خیمے میں لے کے آئے انھیں قتل گاہ سے
بھولے پسر کا غم کرم لا الٰہ سے

یہ ''سینہ و سر پیٹنا'' قدیم مرثیے کی روایت ہے۔ دبستان انیسؔ و دبیرؔ نے اس کی پرورش کی، ظفر جونپوری نے ''بیٹے کی لاش چھوڑ کے زینب کی فکر کی'' کہہ کر اپنے قول کو نبھایا کہ مرثیے کے لوازم باقی رہنے ضروری ہیں لیکن مضامین میں جدت بھی ضروری ہے۔ ایک مرثیے میں اُن لمحوں کی منظر کشی کی ہے جب حضرت عباس نے فرات کو فتح کر لیا اور گھوڑا دریا میں اُتار کر مشک سکینہ کو دریا میں ڈال دیا۔

کہتا ہے یہ سُوکھے ہوئے ہونٹوں کی زبانی شبیرؑ ہیں پیاسے مری کیا تشنہ دہانی
بیکار ہے میرے لئے موجوں کی روانی خیمے میں پہنچ جائے تو ہے کام کا پانی
یوں جذبۂ نصرت مرا اعجاز دکھا جائے
کل نہر اسی مشکِ سکینہؑ میں سما جائے

ظفرؔ جونپوری کی قادر الکلامی مسلّم ہے اس لئے وہ عنوان سے بھی انصاف کرتے ہیں اور مرثیے کے موضوع سے بھی جس کا اندازہ مصرع اولیٰ سے ہی ہو جاتا ہے۔ مثلاً ''شباب کربلا'' کے زیر عنوان مرثیہ کا موضوع علی اکبر ہیں لیکن مصرع اولیٰ ہی موضوع کا اعلان کر دیتا ہے۔ ''انعام زندگی ہے زمانہ شباب کا'' — یا ایک مرثیہ جس کا عنوان ''کردار حسینؑ'' ہے وہ اس مصرع سے شروع ہوتا ہے۔ ''زینتِ پیشانیٔ تہذیب ہے نامِ حسینؑ''۔ اُن کا ایک مرثیہ ''کربلا'' اُن کے کلام بالخصوص اُن کی مرثیہ نگاری کی روح ہے۔

مذہب اسلام کی سینہ سپر ہے کربلا عالمِ امکاں میں، دنیائے دگر ہے کربلا
کیف ہے، کم ہے، تاثر ہے، نظر ہے کربلا مبتدائے نوعِ انساں کی خبر ہے کربلا

کس قدر محدود ہوکر، کتنی لامحدود ہے
دل یہ کہتا ہے کہ ہر دھڑکن میں یہ موجود ہے

اس سے فطرت، اور یہ فطرت سے ہم آہنگ ہے زیست اس کی آب ہے، ایمان اس کا رنگ ہے
فکر انسان کا ہراک میدان اس پر تنگ ہے ختم حجت کے لئے اک عدل پرور جنگ ہے
سایہ انگیز امن کا پرچم ہے اس کے دوش پر
یہ ہے اِک تاریخ کا احسان عقل و ہوش پر

ہے بہت مضبوط رشتہ اس کا احساسات سے ڈوب کر جذبات میں، پھر دور ہے جذبات سے
اس کو ناپا جا نہیں سکتا کبھی دن رات سے آفتوں میں پڑ کے، یہ محفوظ ہے آفات سے
اس کے سر پر حق پرستاری کا روشن تاج ہے
مسکرا کر سر فدا کرنے کی یہ معراج ہے

زندگی کا سوز بھی شامل ہے اس میں ساز بھی نزع کی ہچکی بھی ہے یہ، زیست کی آواز بھی
پائمالِ ظلم ہو کر مائلِ پرواز بھی بے نیازی بھی ہے، اندازِ نیاز و ناز بھی
اُس کے ہر رُخ سے نمایاں، حوصلہ جینے کا ہے
مرضیٔ معبود، جوہر اس کے آئینے کا ہے

سید ضمیر اختر نقوی کی رائے میں ظفر جونپوری کے مراثی میں سید آل رضا کا رنگ ملتا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ فیصلہ اس خبر کی بنا پر ہو کہ اُنہوں نے ایک مرثیے پر سید آل رضا سے اصلاح لی تھی جبکہ ظفر جونپوری نے موضوعاتی مرثیے کہے ہیں اور سید آل رضا نے مرثیوں کے موضوع یا عنوانات کو بنیاد نہیں بنایا۔ نہ ہی وہ موضوع قائم کر کے مرثیہ لکھتے تھے — بہرحال کسی مرثیہ گو کا سیّد آل رضا سے تعلق ہو تو یہ اس کی فضیلت ہی شمار ہوگی کمی نہیں۔

☆☆☆☆☆

سعید شہیدی:- (حیدرآباد دکن)

ولادت، ۱۴ر جولائی ۱۹۲۴ء۔ وفات ۱۵ر مئی ۲۰۰۰ء

نام سید عابد علی، تخلّص سعید۔ قلمی نام سعید شہیدی، وطن حیدرآباد دکن۔ سعید شہیدی کی خاندانی نجابت اور اُن کے فقر کے حوالے سے اُن پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

''سعید شہیدی اعلیٰ حضرت نواب شہید یار جنگ کے فرزند ارجمند اور وارث حقیقی ہیں، ایک بڑے گھرانے کی آسائشوں کے عادی و سعید شہیدی نے محلوں کے حصار سے نکل کر اپنی زندگی عام انسانوں کی طرح بسر کی ہے۔ زندگی کی آسائشوں سے محرومی کی صورت میں انسان پر دو ہی ردِ عمل ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان مایوسیوں کی گہرائیوں میں گر کر ختم ہو جائے اور دوسرے یہ کہ انسانی اقدار کو چھوڑ کر موقعہ پرست، مفاد پرست، مردم آزار یا بے حس بن کر زندگی سے انتقام لے۔ زندہ رہنے والوں سے انتقام لے۔ سعید شہیدی ان دونوں صورتوں سے دامن بچا کر گذر گئے''

(کتاب ''چہیتر خوباں سے'' مصنف۔ عاشور کاظمی۔ ص ۲۲۲)

سعید شہیدی نے ہائی سکول تک مدرسہ عالیہ میں تعلیم حاصل کی، جامعہ عثمانیہ سے ایف۔ اے کیا اور عیش و عشرت کی منجمد زندگی گذارنے کی بجائے محکمہ آبکاری میں اوسط درجے کی ملازمت کر لی۔ اس ذمہ داری سے وظیفے پر سبکدوشی حاصل کرنے کے بعد نظام ٹرسٹ میں ایک اہم عہدہ پر فائزہ ہوئے۔

شاعری کی ابتدا طالب علمی کے زمانے میں ہوئی۔ ابتدا میں حضرت مسرورؔ سے سلسلۂ تلمذ وابستہ رہا۔ رثائی ادب میں حضرت نجم آفندی سے استفادہ کیا — غزل کے حوالے سے سعید شہیدی کا شمار اساتذہ شعراء میں ہوتا ہے۔ کلاسیکی غزل کے نمائندہ شاعر ہونے کے باوجود اُن کی غزل میں جذبوں کی تازہ روش کا سراغ ملتا ہے۔ یہ بیداری، یہ تازگی یہ برملا اظہار کا اسلوب غالباً اُنہیں کربلا سے ملا ہے جو اُن کی رثائی شاعری کے علاوہ اُن کی غزل کی روح بھی ہے۔ اُن کا ایک ضرب المثل شعر اس فکر کی اساس ہے۔

اُس کی ساری خطائیں کر کے معاف
مطمئن ہیں اس انتقام سے ہم

خطاؤں کو معاف کرنے کا سب سے بڑا اعلان کربلا میں ہوا تھا جہاں ۷۱ لاشوں کے درمیان کھڑے ہوئے عالم انسانیت کے ایک رہبر سیدنا امام حسینؑ نے فوج اشقیا سے کہا تھا۔

راہ پر اب بھی جو آجاؤ بہل ہو تقصیر
درگذر خون سے ان سب کے کرے گا شبیرؑ

(آغا سکندر مہدی)

غزل، سلام، نوحہ، مرثیہ ہر صنف سخن میں سعید شہیدی ''متاعِ حُبِّ شہیدانِ کربلا'' سے مالا مال نظر آتے ہیں۔ یہی روشنی اُنہوں نے اپنے وارث اور فرزند رشید شہیدی میں منتقل کی ہے جو رشید شہیدی کے ایک سلام کے مطلع سے نمایاں ہے۔

فرازِ دار پہ میثمؑ بیان دیتے ہیں
رہے گا ذکرِ علیؑ، ہم زبان دیتے ہیں

تصانیف:

(غزلیات کے مجموعے)(۱) برق وآشیاں (۲) شفق (دو ایڈیشن شائع ہوئے)
(۳) آفتابِ غزل (۴) کفِ گل فروش

رثائی ادب: (۱) خاکِ شفاء (۲) غمِ مقتل (۳) عرفانِ وفا (۴) دُرِ نجف (۵) کوثر و تسنیم

مرثیہ گوئی میں سعید الشعراء سعید شہیدی نے مروجہ بحور سے ہٹ کر ایک تجربہ کیا ہے۔ وہ آج کی زندگی میں بشر کی مادی مصروفیات کے پیشِ نظر مرثیوں میں اختصار کے قائل تھے۔ اُنہوں نے اجزائے مرثیہ کے پابندی نہ کرتے ہوئے بھی جو کچھ اختصار کے ساتھ کہا ہے وہ دل کو غم آشنا اور آنکھوں کو اشکبار کرتا ہے۔ ان کا مرثیہ ''جب ہوئی قید سے رہا زینبؑ'' اُن کے اس اسلوب کی دلیل ہے جس میں بہن یزید کی قید سے آزاد ہو کر بھائی کی قبر پر آ کر اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہے۔ مرثیہ پڑھتی ہے۔ سعید شہیدی نے ۱۶ بندوں میں پورا ماجرہ بیان کر دیا ہے ۔

جب ہوئی قید سے رہا زینبؑ اے سعید آئی کربلا زینبؑ
پہنچی جب غم کی مبتلا زینبؑ [۱] رو کے دیتی تھی یہ صدا زینبؑ
قید سے چھٹ کے آئی ہوں بھائی
شام میں لُٹ کے آئی ہوں بھائی

کیا کہوں میں نے کیا اٹھائے محن بازوؤں میں مرے بندھی تھی رسن
تھے تماشائی سارے مرد و زن [۲] لُٹ گئی لٹ گئی میں شاہِ زمن

پھری بازارِ شام میں زینبؑ
گئی دربارِ عام میں زینبؑ

مجھ سے برگشتہ تھی مری تقدیر خوب کی مری عزت و توقیر
سر سے چادر چھنی، ہوئی تشہیر[۳] پھری بازار میں بھی ہو کے اسیر
اور بھی کچھ سناؤں کیا بھائی
اپنے بازو دکھاؤں کیا بھائی

تیرا فرزند عابدِ بیمار تھا جو رانڈوں کا قافلہ سالار
دو قدم بھی تھا جس کو چلنا بار[۴] اس سے کھنچواتے تھے شتر کی مہار
ظلم پر ظلم ڈھائے اعدا نے
اس کو کوڑے لگائے اعدا نے

جب کیا ہم کو داخلِ زنداں نام کو بھی نہ روشنی تھی وہاں
رو کے کہتی تھی یہ سکینہ جاں[۵] کہیں یاں سے چلو پھپھی اماں
مجھ سے برداشت ہو نہیں سکتی
میں اندھیرے میں سو نہیں سکتی

مارتے تھے طمانچے بانیٔ شر کان سے اس کے چھین کر گوہر
ہوگیا تھا لہو میں کرتا تر[۶] کیا کہوں اب کہ پھٹ رہا ہے جگر
شمر کے کھا کے سیلیاں بھائی
مرگئی تیری نیم جاں بھائی

خیر قسمت میں جو بھی تھا وہ ہوا اب یہ بتلاؤ کیا کروں میں بھلا
ختم چہلم بھی ہوچکا بھیا[۷] بس یہ ہے عین مدعا میرا
منہ کو اشکوں سے مجھ کو دھونے دو
خوب جی بھر کے مجھ کو رونے دو

دی یہ شہ نے صدا وطن جاؤ خواہرِ باوفا وطن جاؤ
بنتِ مشکل کشا وطن جاؤ[۱۱] جاؤ بہرِ خدا وطن جاؤ

اور بھی تم کو غم اٹھانا ہے
پھر تمہیں قید ہو کے آنا ہے

بولی یہ رو کے زینبؑ نالاں — یہ بہن تو ہے تابعِ فرماں
جاؤں گی میں وطن کو بھائی جاں ۱۲ میں کہاں اس کے بعد آپ کہاں
غم کا اک اژدہام ہے بھائی
آخری یہ سلام ہے بھائی

چھوڑ کر تجھ کو اے شہِ بے سر — جا رہی ہے وطن کو یہ مضطر
یہ تو بتلا بھلا وہاں جا کر ۱۳ حال نانا سے سب کہے خواہر
تیرا کُرتا بتاؤں نانا کو
اپنے بازو دکھاؤں نانا کو

جاؤں گی جب وطن شہِ ذیشاں — پوچھے صغرا جو مجھ سے رو کے وہاں
پھپھی اماں کہاں ہیں بابا جاں ۱۴ کہوں گی اس سے میں بہ آہ و فغاں
بی بی جنگل میں لٹ گئی زینبؑ
بھائی سے اپنے چھٹ گئی زینبؑ

اٹھو اے سبطِ مصطفےٰؐ اٹھو — اٹھو دل بندِ مرتضیٰؑ اٹھو
اٹھو اے میرے مہ لقا اٹھو ۱۵ لو بہن ہوتی ہے جُدا اٹھو
کب سے کہتی ہوں میں اٹھو بھائی
جاتی ہوں میں گلے ملو بھائی

اے شہِ بے کساں خدا حافظ — اے امامِ زماں خدا حافظ
اے بڑے بھائی جاں خدا حافظ ۱۶ لو چلا کارواں خدا حافظ
بھائی شبیر فی امان اللہ
چلی ہمشیر فی امان اللہ

☆☆☆☆☆

آصف ردولوی:- (بارہ بنکی)

پیدائش ۱۹۰۶ء ۔وفات ۸؍جنوری ۲۰۰۰ء

نام سید عزیز حسن، تخلص آصفؔ، وطن ردولی ضلع بارہ بنکی، اس حوالے سے قلمی نام آصف ردولوی رکھا۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔اے کی سند حاصل کی۔ردولی کے مردم خیز خطے سے تعلق تھا جہاں اُردو، فارسی اور مذہبی علوم کی تعلیم ضروری سمجھی جاتی ہے آصف ردولوی نے ۶۴ برس کی عمر میں شعر گوئی کی ابتدا کی—اس سلسلے میں وہ اپنے مجموعہ کام کے پیش لفظ میں رقمطراز ہیں۔

''یہ ۱۹۷۰ء کی بات ہے جبکہ دوران قیام کراچی مجلس عزا کا ٹیپ سن رہا تھا۔بطور پیش خوانی سلام پڑھا جا رہا تھا۔سلام کا مصرعہ تھا ۔ ''نام شبیر سے اسلام جواں آج بھی ہے''مصرع پسند آ گیا اور پہلی بار اس پر تظمین کا مصرعہ ہوا ۔

اور مذہب ہوئے بدنام بغیر فدیہ

نام شبیر سے اسلام جواں آج بھی ہے

واپس وطن آ کر میں نے قصبہ کے بزرگ کہنہ مشق شاعر جناب حکیم محمد مرزا واصفؔ ردولوی کو سنایا۔آپ نے پسند فرمایا اور کہا۔'' آہٹ تو ہے اور شعر کہو'' میں نے پندرہ شعر کا سلام کہہ کر بغرض اصلاح پیش کیا اور میں نے واصفؔ صاحب کی شاگردی قبول کی نیز واصف کی مناسبت سے آصف تخلص رکھا'' (''آئینۂ عقیدت''—ص۔۷)

''آئینۂ عقیدت'' آصف ردولوی کا مجموعہ کلام ہے۔جو ۱۹۹۶ء میں دہلی سے شائع ہوا ہے۔اس مجموعہ میں قطعات، رباعیات، نعت، منقبت، سلام کے علاوہ ایک مرثیہ شامل ہے۔ آئینۂ عقیدت میں شامل کلام کو پڑھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور یہ یقین بھی پختہ تر ہو جاتا ہے کہ حمد و نعت و منقبت کی راہ میں سب کچھ عطا ہوتا ہے۔آصف ردولوی نے اصول دین، فروع دین کو سلسلہ وار قطعات میں نظم کیا ہے۔مثلاً

''توحید''

وحدت فکر و عمل ہے لازمہ توحید کا اتحاد قوم و ملت فلسفہ توحید کا

اختلاف باہمی کا کیوں نہ ہوتا سدّباب گر بنالیتا بشر اک ضابطہ توحید کا

"عدل"

صفت عدل ہے ممدوح قرین عاقل ظلم اور جور ہے لاریب شعار جاہل
جس میں ہو نقص خدا ہو نہیں سکتا ہرگز شرط انصاف ہے اللہ کا ہونا عادل

اسی طرح نبوت، امامت، اور قیامت کے موضوعات پر قطعات کہے ہیں۔ فروعِ دین کے اصولوں کو بھی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اور جہاد کے موضوعات پر بھی قطعات کہے ہیں۔

"آئینۂ عقیدت" میں شامل آصف ردولوی کے مرثیہ کا عنوان "شہادت عظمیٰ" ہے۔ ابتدا حمد باری سے ہوتی ہے۔

واجب ہے پہلے حمد و ثنائے خدا کروں پھر فکر نعت حضرت خیرالوریٰ کروں
جوش ولا میں منقبتِ مرتضیٰ کروں ا توصیف اہلبیت کے ابواب وا کروں
مدحت سرائی ان کی عبارت کی جان ہے
عاشق جو ان کا ہے وہی جنت مکان ہے

حمد باری، نعت رسول، منقبت علی، جناب سیدہ، امام حسنؑ کے بعد بات امام حسین تک آتی ہے۔

صبر و رضا و عزم میں نامی حسینؑ ہے واللہ دین حق کا پیامی حسینؑ ہے
آزادیٔ ضمیر کا حامی حسینؑ ہے ۷ اسلام تیرا اسم گرامی حسینؑ ہے
پہچانتا کوئی نہ خدا اور رسولؐ کو
شبیر چھوڑ دیتے جو اپنے اصول کو

اس کے بعد بنی ہاشم سے بنی اُمیہ کی دشمنی، یزید کی تخت نشینی، حاکم مدینہ کو امام حسینؑ سے بیعت طلبی کا حکم، امام کا انکار، مدینہ سے ہجرت کا فیصلہ، قبر رسول پر حاضری، مدینے سے روانگی، صغرا کی محرومی، راستے میں کوفے سے مسلم کی شہادت کی خبر، امام حسین کی کعبہ تشریف آوری، سے لے کر منزل بہ منزل امام مظلوم کی شہادت تک کا احوال اس مرثیے میں نظم کیا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے تاریخ کو واقعات کی ترتیب کے ساتھ نظم کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔

ہاشم کے خاندان کا دشمن یزید تھا سفاک، مے گسار، نہایت پلید تھا
وہ منکرِ رسولؐ و کلامِ مجید تھا ۹ شبیرؑ گوشہ گیر سے کینہ شدید تھا

ایذا رساں امام کا وہ بے سبب ہوا
بے دین، خود حسینؑ سے بیعت طلب ہوا

شبیر کو یقیں ہوا ممکن نہیں مفر　　اب چھوڑ کر وطن ہمیں جانا ہے در بدر
مایوس و دلفگار پریشان، نوحہ گر ۱۳　　بہر سلام پہنچے مزارِ رسولؐ پر
لپٹے ہوئے مزار سے روتے رہے حسینؑ
رخسار آنسوؤں سے بھگوتے رہے حسینؑ

یثرب سے چل کے کعبے میں آئے امامِ دیں　　حلقوں میں حاجیوں کے نہاں تھے منافقیں
شہ بولے میرے قتل کے درپے ہیں یہ لعیں ۲۹　　میرے لہو سے لال نہ کر دیں یہ سرزمیں
مجبوریوں میں حج کو قضا کرتے ہیں حسینؑ
عمرہ بجائے حج کے ادا کرتے ہیں حسینؑ

امام حسین کربلا پہنچ گئے۔ دریا کی ترائی سے خیمے ہٹا لئے گئے۔ یزیدی لشکر میں اضافہ ہونے لگا۔ نہم کو شمر کربلا پہنچا۔ فوجوں نے قیامِ امام پر حملہ کیا۔ ابھی عباس زندہ ہیں۔ عباس کو غیض آ گیا۔ بڑھتی فوجیں رک گئیں۔ امام مظلوم نے رات کی مہلت چاہی۔

عاشور کی وہ رات قیامت کی رات تھی　　دلبند مصطفیٰ کی شہادت کی رات تھی
احباب و اقربا سے یہ فرقت کی رات تھی ۵۳　　تاراجیٔ خیامِ امامت کی رات تھی
ظالم کریں گے قتل شبیہ رسول کو
بے جاں کریں گے پیاس میں جانِ بتول کو

عاشور کی صبح علی اکبر نے اذان دی اصحاب حسینؑ نے نماز ادا کی طبل جنگ بجا، شہادت کا بازار گرم ہوا۔ آصفؔ ردولوی نے سب کچھ نظم کیا ہے۔

جب ہو چکے شہید رفیقانِ باصفا　　بڑھ کر کیا عزیزوں نے پھر اپنا حق ادا
ایک ایک کر کے ہو گئے شبیر پر فدا ۱۷　　ہنگامِ عصر رہ گئے بس شاہِ کربلا
اکبر سا ہم شبیہ پیمبر فدا ہوا
اصغر سا شیر خوار بھی شہ سے جُدا ہوا

میدانِ کارزار میں پہنچے امامِ دیں　　دیکھا بپے قتال ہیں آمادہ سب لعیں

کہنے لگے لگا پکار کے سردار اہلِ کیں ۸۳ کیا اب جہاد کے لئے باقی کوئی نہیں
ممکن نہیں ہے جنگ تو بیعت کریں قبول
منظور یہ نہیں تو شہادت کریں قبول

امام حسینؑ انکارِ بیعت کرتے ہیں۔ اے لاشوں کے درمیان کھڑے ہوئے حسینؑ ایک بار پھر لشکر یزید کو سمجھاتے ہیں۔ حجت تمام کرتے ہیں۔ ابن سعد سننے سے انکار کرتا ہے۔ حسینؑ ذوالفقار کھینچتے ہیں۔

چلنے لگی حسینؑ کی تیغ شرر فشاں لشکر میں شامیوں کے ہوا شور الاماں
گرد زمیں سے چھپ گیا نظروں سے آسماں میدان کربلا میں کھنچا حشر کا سماں
سکّانِ عرش کہتے تھے پیاسے کی جنگ ہے
محشر ہے یا نبی کے نواسے کی جنگ ہے

آواز آئی غیب سے اب روک لو حسام لاریب ہے تمہیں پہ شجاعت کا اختتام
ایفائے عہد اب کرو اے شاہ تشنہ کام برباد ہو نہ اُمتِ پیغمبر انام
صبر جمیل ہی سے تمہیں کام چاہئے
اُمت کی مغفرت کا سر انجام چاہئے

''رُکتے ہی تیغ شاہ بڑھا لشکرِ جفا''— اور امام حسینؑ کو شہید کر دیا گیا۔

آصف ؔ رودلوی کے مرثیے یں لوازم مرثیہ کی پاسداری نہیں ہے مگر جس صحت اور اسلوب کے ساتھ اُنہوں نے حالات کو رقم کیا ہے وہ قابل قدر ہے، جو ہو سکتا ہے جوشؔ کے ''حسینؑ اور انقلاب'' کو مسدس قرار دینے والے آصفؔ رودلوی کے اس رثیے کو بھی مرثیہ تسلیم نہ کریں لیکن جسے یقین ہے کہ آج نہیں تو کل، بلکہ کل بھی کیوں، آج بھی یہ مرثیہ آصفؔ رودلوی کے خلوصِ عزا، محنت اور لگن کا آئینہ دار ہے۔

راقم الحروف نے آصفؔ رودلوی کے فرزندارجمند سے (دہلی میں) رابطہ کر کے درخواست کی کہ وہ کچھ کوائف اور اگر اُنہوں نے کچھ اور مراثی کہے ہوں تو اُن کے بارے میں اطلاعات فراہم کریں مگر شاید اُنکی دنیاوی مصروفیات نے انہیں فرصت نہ دی کہ وہ اس کارِ خیر کے لئے وقت نکال سکیں۔

☆☆☆☆☆

زاہد فتح پوری:- (کراچی)

ولادت ۱۹۱۶ء بمقام فتح پور (بھارت) وفات ۱۹ر نومبر ۲۰۰۱ء۔

نام سید کرار حسین زیدی، تخلص زاہدؔ، والد کا اسم گرامی سید مظہر حسین جن کی زیرِ نگرانی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۴ء میں میٹرک پاس کیا۔ شاعری کی ابتدا اس وقت سے ہوئی جب وہ میٹرک کے طالب علم تھے۔ محکمہ تعلیم میں ملازمت سے زندگی کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اسی ملازمت کے سلسلے میں گونڈہ گئے تو حضرت جگر مرادآبادی سے ملاقات ہوئی، جگر صاحب نے زاہدؔ فتح پوری کی شعر گوئی کو سہارا دیا—

زاہد فتح پوری ۱۹۵۳ء میں وطن سے ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔ زاہدؔ فتح پوری کراچی آنے سے پہلے بحیثیت شاعر متعارف ہو چکے تھے اُن کی غزلیں۔ سلام اور قصائد شائع ہونے لگے تھے۔ کراچی میں آئے تو کراچی میں رثائی ادب کے ماحول نے اُن کی شاعری کو بڑھاوا دیا۔ زاہد فتح پوری نے جو پہلا مرثیہ کہا اس کا آغاز صبح عاشور کی منظر نگاری سے ہوتا ہے۔ یہ مرثیہ ۱۹۸۰ء میں کہا گیا جو ۶۱ بند پر مشتمل ہے۔

جب آفتاب روزِ شہادت عیاں ہوا فارغ نمازِ صبح سے پیر و جواں ہوا
اِک شورِ طبلِ جنگ اُدھر ناگہاں ہوا ہر ناصرِ حسینؑ اِدھر شادماں ہوا
پیشِ نظر تحفظ دینِ رسولؐ ہے
اس راہ میں ہر ایک مصیبت قبول ہے

اس مرثیے میں حضرت عباس کے میدان جنگ میں آنے کا منظر یوں نظم کیا گیا ہے۔

للکار کے جری نے پکارا یہ ایک بار اے بزدلو میں آتا ہوں دریا سے ہوشیار
فوج یزید میں ہوا یہ سُن کے انتشار کھینچی جو باگ برق کی صورت تھا راہوار
وہ چال تھی کہ فوج کے نقشے بدل گئے
ٹاپوں سے جانے کتنے پیادے کُچل گئے

زاہدؔ فتح پوری کا دوسرا مرثیہ ہے ''رخصت ہوئے جو دہر سے اللہ کے نبیؐ'' ۱۹۸۴ء میں کہا جس کے ۷۰ بند ہیں۔

اس کے بعد کوئی اطلاع نہیں ملی— لیکن یہ دو مراثی اُن کے شعور شعر گوئی کی دلیل ہیں۔

ناقدین ادب اُنہیں باقاعدہ مرثیہ گو شعراء کی خدمت میں شمار کرتے ہیں یا نہیں یہ وہ جانیں۔ ہم تو صرف یہ مانتے ہیں کہ زاہد فتح پوری نام کا ایک چراغ جلا تو کچھ روشنی بھی ضرور پھیلی، اور جس راہرو نے اس راہ میں اُجالا کرنے کی کاوش کی وہ ربّ کعبہ کی قسم کامیاب ہوا۔

زاہد فتح پوری کے فرزند ارجمند سید ابرار حسین ایک پیشہ ور نعت خواں کی حیثیت سے ہر سال امریکہ اور کینیڈا جاتے ہیں۔ ۲۰۰۲ء میں وہ برطانیہ بھی آئے۔ ہمیں بھی ان کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ اُن سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے وَالد گرامی کے دونوں مرثیوں میں سے کسی ایک مرثیے کے یا دونوں مرثیوں کے کم از کم دس دس بند، بھجوادیں تو اُن کا کرم ہوگا۔۔۔ ہم مغرب میں آباد اُردو والے اس بات کے عادی ہیں کہ برصغیر سے آئے ہوئے مہمانوں کی پذیرائی کریں اور وہ واپس وطن جاکر یاد بھی نہ کریں تا آنکہ وہ دوبارہ برطانیہ تشریف نہ لارہے ہوں لیکن ہمیں سید ابرار حسین کی وعدہ فراموشی کا افسوس اس لئے ہے کہ نعت خوانی اور منقبت پڑھنے والا کوئی بیٹا اپنے والد گرامی کی یاد کو باقی رکھنے کے لئے اتنا بھی نہ کرسکا جو حضرت زاہد فتحپوری کے سلسلے میں اُن سے درخواست کی گئی تھی۔ ؎

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

☆☆☆☆☆

پروفیسر سردار نقوی :- (کراچی)

ولادت ۲۱ مارچ ۱۹۴۱ء امروہہ، وفات ۵ فروری ۲۰۰۱ء۔

نام سید سردار محمد، تخلص سردار، امروہہ سادات کے نقوی سادات گھرانے کے فرد والد کا اسم گرامی، سید انوار محمد نقوی۔ والدہ گرامی، فرزدق ہند شمیم امروہوی کی دختر مدینہ خاتون کی پوتی ہیں۔۔۔ تعلیم بی ایس، سی آنرز۔ ایم ایس، سی جیالوجی (کراچی یونیورسٹی) تقسیم ملک کے بعد کم عمری میں کراچی آگئے۔ بی۔ ایس۔ سی آنرز (کراچی یونیورسٹی)، ایم ایس سی (ریاض) کی سندات حاصل کیں۔ ابتدائی ملازمت جیالوجیکل سروے میں کی۔ بعد ازاں شعبۂ تدریس میں آگئے اور پروفیسر کے منصب تک پہنچے۔

شاعری کی ابتدا، ۱۹۵۷ء (بعمر ۱۶ برس) ہوئی، ابتدا میں ہی ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوئے اور انسانی دکھ و آلام سے رشتے استوار ہوگئے، کہتے ہیں عشق حقیقی تک پہنچنے کے لئے

عشق مجازی کی خاردار وادی سے گذرنا پڑتا ہے، شاید یہی تصوری لذتِ الم حاصل کرنے کی بھی ہے کہ غم جاوداں سے رشتے استوار کرنے کے لئے عام دکھوں کو محسوس کرنا پڑتا ہے، ترقی پسند تحریک انسانی دکھوں سے رشتہ استوار کردیتی ہے، دل روشن اور آنکھ بینا ہو تو انسان دکھوں کی کربلا تک پہنچ جاتا ہے۔ سردار نقوی عشق کی اس پرخار وادی سے گذر کر عشق حقیقی تک پہنچے، فنا نصیب ممدوح سے بقا نصیب فنا تک رسائی ہوئی تو کہہ اُٹھے ''عقل مسلم ہو تو ہادی کی ثنا کرتی ہے''۔

سردار نقوی ڈی۔ جے۔ کالج کراچی میں لیکچرار، ہونے سے قبل گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں تھے لہٰذا پاکستان میں اُردو مرثیہ کی ترویج و ارتقاء کو جب بھی شمار کیا گیا کوئٹہ میں فروغ مرثیہ کا سہرا اثر جلیلی اور سردار نقوی کے سر باندھا گیا۔ اس کے بعد اُن کا نام کراچی سے وابستہ ہو۔ کراچی ۱۹۷۱ء میں اُنہوں نے ایک مرثیہ کہا جو بہت مقبول ہوا (یہ اُن کا کہا ہوا تیسرا مرثیہ تھا)

؎ بخشی گئی ہے چشم حقیقت نگر مجھے۔ اُن کا ایک اور مرثیہ جو ۱۹۷۵ء میں کہا جب سجدۂ یقیں تہہ خنجر ادا ہوا'' کلاسیکی روایت اور جدید فکر کے امتزاج کا نمائندہ مرثیہ ہے۔ سردار نقوی اگرچہ مرثیے کی کلاسیکی روایات کے پاسدار تھے مگر ترقی پسند سوچ نے اُنہیں ایک سلیقہ اور ہنرمندی سکھائی کہ کلاسیکی ''فریم ورک'' میں نئی فکر اور نئی سوچ کو کیسے پیش کیا جاسکتا ہے، یہ امتزاج رنگ و نکہت سردار نقوی کی پہچان بنا البتہ بین نگاری کے معاملے میں اُنہوں نے طرز قدیم کو اپنایا۔ حضور نبی کریم کی ولادت سے پہلے اور حضور کی ولادت کے بعد کے ماحول کی عکاسی سردار نقوی نے دو بند میں کی ہے۔

حد سے فزوں جو ظلمت نفس بشر ہوئی پہلوئے آمنہ سے سحر جلوہ گر ہوئی
اب جس کی کوئی شام نہیں، وہ سحر ہوئی خوش کیوں نہ ہوں خلیلؑ دعا بارور ہوئی
اُبھرا جو آفتاب اندھیرے ہوا ہوئے
ابلیس سے خود اس کے پجاری خفا ہوئے

بدلا مزاج زیست، بدلنے لگی فضا روشن ہوئے چراغ اندھیروں کا دم گھٹا
باغ عمل میں چلنے لگی عدل کی ہوا منزل کی سمت راہ نے عزمِ سفر کیا
کانٹے ہٹائے، راہ کو ہموار کردیا
فتنوں کی آگ کو گل و گلزار کردیا

سردار نقوی کا ایک اور مرثیہ ؎ ذکر شبیر ہے آ۔ ان، یہی مشکل ہے

ذکرِ شبیرؑ ہے آسان یہی مشکل ہے کیسے لکھے کوئی قرآن بڑی مشکل ہے
فکرِ شبیرؑ کا عرفان ابھی مشکل ہے ا سوچے جس رخ سے بھی انسان نئی مشکل ہے
سرحدِ ذکر جو عرفان کی سرحد ٹھہرے
ذکرِ فرزندِ علیؑ ذکرِ محمدؐ ٹھہرے

مبتدا عظمتِ انساں ہے خبر ہے شبیرؑ نور ہے یعنی محمدؐ سا بشر ہے شبیرؑ
سورۂ فجر کی میزانِ سحر ہے شبیرؑ ذہنِ انساں میں اجالوں کا سفر ہے شبیرؑ
کاروانِ بشریت کی یہی منزل ہے
کربلا آج بھی ماضی نہیں مستقبل ہے

جب ہوئی سید لولاک سے خالی دنیا بن گئی دین سے دنیا کی سوالی دنیا
جہل نے ظلم کے سانچوں میں جو ڈھالی دنیا ۱۷ بیت حیدر میں سمٹ آئی مثالی دنیا
یہ وہ دنیا تھی جو ہر ظلم سہے جاتی تھی
کشتی نوح تھی طوفاں میں بہے جاتی تھی

جرم کے بوجھ تلے دب کے حکومت کا ضمیر تھا مُصر عدل بنے، ظلم کی طاقت کا اسیر
مجمع ظلم کے مرکز یہ تھا انبوہِ کثیر ۲۸ مرکز عدل یہ شبیر تھے، تنہا شبیرؑ
مرکز عدل سے بیعت پہ جو اصرار رہا
جیسا اصرار رہا، ویسا ہی انکار رہا

بابِ اصرار کھلا تھا کہ کھلا بابِ عمل دل میں انگڑائیاں لینے لگا ارمانِ اجل
دیکھ کر سبطِ پیمبر کے ارادے کو اٹل ۲۹ شام کو بڑھ کر مدینے نے صدا دی کہ سنبھل
خیر اور شر میں تعاون کا کوئی طور نہیں
یہ حسینؑ ابن علیؑ ہے یہ کوئی اور نہیں

طاقتِ شر کا وہ اصرار، وہ انکار کی شان وہ مدینے سے سفر اور وہ سفر کا سامان
تربتِ جد پہ نواسے کا صریحی اعلان ۳۰ اب اگر زندگیٔ حق کا یہی ہے عنوان
رنگِ تصویرِ شہادت میں لہو سے بھر دو
آؤ تلوارو میرے جسم کے ٹکڑے کر دو

اور پھر یہی ہوا کہ نیزے نے حسینؑ کے جوان بیٹے کا کلیجہ نکال لیا۔ تیر نے چھ ماں کے بچے کا حلق چھید دیا۔ تیغوں نے حسینؑ کے بڑے بھائی حسنؑ کے بیٹے قاسم کا گلا کاٹ دیا۔ برچھیوں نے زینب کے معصوم بچوں کو شہید کر دیا اور تلواروں نے حسینؑ کے جسم کے ٹکڑے کر دیے مگر ؎

ظلم خود ہار گیا اپنی لڑائی آخر
ہوگئی حق کے سر و تن میں جدائی آخر

سردار نقوی کے اس مرثیے میں نبی کریم کے وصال کے بعد سے لے کر خلافت جناب امیرؑ۔ عالم اسلام کے بدلے ہوئے تیور، حسینؑ کا ان حالات کو دیکھنا۔ یزید کی طرف سے بیعت کا اصرار، حسینؑ کا انکار۔ کربلا کا سفر، کربلا کی جنگ، شہادت بعد شہادت اور انجام کار حسینؑ کی شہادت تک تاریخ کا سفر، حالات کے وقوع پذیر ہونے کے مطابق نظم کیا گیا ہے جسے ان واقعات کی منظوم اور مسلسل تاریخ بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ احتیاط کہ تاریخ کی کوئی کڑی کم نہ ہو جائے، یا مفروضہ واقعات نظم کے قالب میں آکر تاریخ نہ بن جائیں سردار نقوی کی مرثیہ گوئی کا خاصہ ہے۔ سردار نقوی کی مرثیہ گوئی میں زینبؑ کے کردار کی جگہ جگہ وضاحت کی گئی ہے۔ اُن کے مراثی میں "زینب شریکتہ الحسین" کی وضاحت بدرجہ اتم موجود ہے۔ ؎

رخصت آخرِ فرزند نبی کا ہنگام اپنی ہمشیر کو وہ صبر امامت کا سلام
منتقل ہوتا ہوا دیں کی قیادت کا نظام سوئے زینب نگراں، سبط نبی اور اسلام
بھائی کو دیکھ کے اسلام کی جانب دیکھا
رخ سوئے کوفہ کیا، شام کی جانب دیکھا

کہاں تو کلاسیکی مرثیے کا یہ مزاج کہ وقت رخصت آخر بہن بھائی کو گریہ وزاری کرتے دکھایا جاتا تھا اور کہاں یہ تیور کہ ہمشیر کو "صبر امامت کا سلام" اور "سوئے زینب نگراں سبط نبی اور اسلام"۔ اس جدت فکر، عظمت فکر، طہارت فکر کے پیش نظر سردار نقوی کے لئے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ سردار نقوی کلاسکیت کے طاق میں روشن جدت فکر و اسلوب کا چراغ تھے۔ اُن کی مطبوعہ تصانیف کی تفصیل کچھ یوں ہے جس سے اُن کی ہمہ جہت فکر کی نشاندہی ہوتی ہے۔

☆— گریۂ فرات (شاعری) ☆۔ کربلا شناسی ☆۔ مستقبل کی نسلوں کے لئے پیغام علی
☆— ڈاکٹر علی شریعتی کے بعض اہم مقالات کے تراجم ☆۔ پروفیسر کرار حسین نے مختلف

سورہ ہائے قرآنی کی جو تفسیر کی ان کی تلخیص و تدوین ☆۔ تہذیبوں کا تصادم۔

پروفیسر سردار نقوی کی وفات حسرت آیات کے بعد اُن کے فرزند سید سہیل مہدی کو ان کے شعری ذخیرے سے قلمی نسخوں کی تلاش و ترتیب کے نتیجے میں اُن کے ۳۶ غیر مطبوعہ مراثی دستیاب ہوئے ہیں۔ ۱۳ مطبوعہ مرثیے ان کے علاوہ ہیں اور مرثیے پر تنقیدی مضامین اور دیگر علمی ادبی تحریریں بھی ملی ہیں۔ خدا کرے یہ انمول ذخیرہ طباعت و اشاعت کے مراحل سے گذر کر مرثیے کی تاریخ کا حصہ بن سکے۔

'رثائی ادب' کراچی نے مرثیہ نگاری پر سردار نقوی کے کئی اہم تنقیدی مضامین شائع کئے ہیں جو اسی خزانے سے حاصل کئے گئے ہیں۔ اور اُن کے پانچ غیر مطبوعہ مراثی شائع کیے ہیں۔ جن میں ان کا پہلا مرثیہ ؎ "ہر چند خضر راہ ہے انسان کا شعور" ہے جس کا سنہ تصنیف ۱۹۶۹ء ہے۔

ہر چند خضر راہ ہے انسان کا شعور نمرودِ جہل سے ہے نبرد آزما شعور
فرعون ظلم کے ہے مقابل عصا شعور لیکن ہے صید ناوکِ بیم و رجاء شعور
قبلہ نما ہے قبلۂ اہل نظر نہیں
ہے ہم سفر ضرور مگر راہبر نہیں

سردار نقوی اس مرثیے میں جوشؔ کے ہم نوا نظر آتے ہیں۔ جوشؔ نے کہا تھا ؎

تاریخ دے رہی ہے یہ آواز دمبدم دشت ثبات و عزم ہے دشت بلا و غم
صبر مسیح و جرأت سقراط کی قسم اس راہ میں ہے صرف اک انسان کا قدم
جس کی رگوں میں آتش بدر و حنین ہے
اس سورما کا اسم گرامی حسینؑ ہے

اسی آواز کو جب سردار نقوی نے سنا تو پکار اُٹھے ؎

آتی ہے کربلا سے یہ آواز دم بدم تغییر عہد و گردش ادوار کی قسم
تاریخ ہے صدائے حسینی کا زیر و بم انساں سے آج بھی ہے مخاطب وہ باکرم
ترویج ہو رہی ہے پیام حسینؑ کی
آواز آ رہی ہے امام حسینؑ کی

یہ حوالہ جوشؔ اور سردار نقوی کی تقابل کے لئے نہیں بلکہ انگریزی مقولے Great

people think alike (بڑے لوگ ایک ہی طرح سوچتے ہیں) کی تفسیر ہے۔

'رثائی ادب' کے اس خصوصی شمارے میں شائع ہونے والا پروفیسر سردار نقوی مرحوم کا

دوسرا غیر مطبوعہ مرثیہ ۔ قراں کی رمز حجت داور سے پوچھئے

تیسرا غیر مطبوعہ مرثیہ ۔ ذکر شبیر سے تہذیب نمو پاتی ہے

چوتھا غیر مطبوعہ مرثیہ ۔ تاریخ میں بشر کی کہانی فساد ہے

پانچواں غیر مطبوعہ مرثیہ ۔ آئینہ دار تضادِ بشری ہے تاریخ'' جسے مرحوم کا آخری مرثیہ لکھا گیا ہے لیکن اس شمارے میں پروفیسر سردار نقوی مرحوم کے فرزند سید سہیل مہدی کی ترتیب دی ہوئی سردار نقوی مرحوم کے ۴۹ مراثی کی ایک فہرست بھی شائع ہوئی ہے جس میں اُن کا پہلا مرثیہ ۔ ''ہر چند خضر راہ ہے انسان کا شعور'' سنہ تصنیف ۱۹۶۹ء درج ہے لیکن آخری مرثیہ ۔ '' تاریخ میں بشر کی کہانی فساد ہے'' سنہ تصنیف ۲۰۰۰ء مرقوم ہے، اُن کا مرثیہ ۔ '' آئینہ دار تضادِ بشری ہے تاریخ'' اُن کا چالیسواں مرثیہ ہے جس سنہ تصنیف ۱۹۹۳ء بتایا گیا ہے۔

رثائی ادب کے اس شمارے میں سب سے زیادہ دردناک اُن کی اہلیہ نرجس نقوی کے تاثرات ہیں جو اُنہوں نے ''اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے'' کے زیر عنوان تحریر کئے ہیں۔ یہ چھوٹا سا نثر پارہ سچ پوچھئے تو سردار نقوی کا نثری مرثیہ ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''بائیس برس کا عرصہ پلک جھپکتے گذر گیا۔ مگر اب لمحات پہاڑ بن کر گذر رہے ہیں۔ لگتا ہے گھڑی ایک جگہ رُک گئی ہے۔ صبح پانچ بجکر ۳۵ منٹ سے آگے نہیں چلتی ـــــ کوئی یوں زندگی سے نکل جائے۔ چپکے سے، بغیر کراہے، بغیر آپ کو مطلع کئے تو برسوں صبر نہیں آتا۔ لگتا ہے ایک خزانہ تھا جو رات کے اندھیرے میں کوئی لوٹ کر لے گیا اور جاتے وقت تہی دست کر گیا۔ ہاتھوں سے پانی نکل گیا اور کچھ چھوڑ کر نہیں گیا سوائے یادوں کے''

لیکن میں نرجس سردار نقوی کے اس نثری مرثیے کا اندراج سردار نقوی مرحوم کے منظوم مراثی میں کیوں کر رہا ہوں؟ کوئی پوچھے تو میرا جواب ہوگا۔

شاید اس لئے کہ نرجس کی طرح میں بھی اور سردار نقوی کے ہزاروں لاکھوں مداح بھی یہی محسوس کر رہے ہیں کہ:

''ایک خزانہ تھا جورات کے اندھیرے میں کوئی لوٹ کر لے

گیا اور جاتے وقت تہی دست کر گیا''

☆☆☆☆☆

شاهد حسین نقوی:-(ایڈووکیٹ) (لاہور)

لاہور کے مرثیہ نگاروں پر سید وحید الحسن ہاشمی نے ''ھل من ناصرا'' میں اختصار کے ساتھ لکھا ہے۔ان شعراء میں اٹھارویں صدی کے سکندر پنجابی۔انیسویں صدی کے ناظر حسین ناظم جسے انہوں نے ناظم حسین زیدی لکھا ہے اور جن کا مشہور شعر ہے۔

کسی کے آتے ہی ساقی کے ایسے ہوش اُڑے

شراب سیخ پہ ڈالی کباب شیشے میں

زباں زد عام ہے، بیسویں صدی کے دلورام کوثری، سہیل بناری، جوہر نظامی، جعفی حیدر دانش، ظہیر الدین حیدر (جگراؤں والے) سید ظہور حیدر جارچوی، سید فیض الحسن فیضی جالندھری۔ بھگت لچھمن درس (مظفر گڑھی) ڈاکٹر صفدر حسین، شائق زیدی (بارہوی) خلش پیر اصحابی، شاد گیلانی، حسن عباس زیدی (برست فرید پور) مسعود رضا خاکی (ریاست جاورہ) آغا سکندر مہدی (رائے بریلی) حیدر گردیزی، نشاط واسطی (ساڈھورہ) قیصر بارہوی، مومن گردیزی، سیف زلفی، خادم رزمی، سرووش ترابی، علی کوثر زیدی، حشمت علی قنبر، زاہد نجاری شامل ہیں، لیکن تعجب کی بات ہے کہ ان شعراء میں شاہد حسین نقوی (لاہور والے) کا ذکر نہیں ہے۔

مولانا ضمیر اختر نقوی نے بھی ''اُردو مرثیہ پاکستان میں'' نامی کتاب میں شاہد نقوی کے ایک مرثیے '' آفتاب عصر'' کا عنوان لکھ کر، اس مرثیے کا سن اشاعت، مرثیے کے مطلع کا بند، اور مولانا مرتضی حسین فاضل کے تبصرے کی تین سطور لکھ کر شاہد نقوی کے ذکر کو ختم کر دیا ہے۔

ڈاکٹر بلال نقوی نے جدید مرثیے کے ذکر میں کراچی کے بعد لاہور کے جن شعراء کے نام لکھے ہیں اُن میں شاہد نقوی کا نام اور اُن کے مرثیے '' آفتاب عصر'' کا سن تصنیف بھی لکھا ہے۔ اللہ اللہ خیر سلاّ۔

شاہد نقوی نے اگر صرف ایک مرثیہ '' آفتاب عصر'' اے سرزمین یثرب و بطحا تجھے سلام'' بھی کہا ہے تب بھی اس مرثیے کے معیار کو پرکھنے کے بعد شاہد نقوی کا استحقاق ہے کہ مرثیہ

نگاروں میں اُن کا ذکر کیا جائے۔ ایک ایک مرثیہ کہنے والے کتنے مرثیہ گو ہیں جن کے کوائف بار بار دھرائے جا رہے ہیں۔

مرثیہ ''آفتاب عصر'' ''اے سرزمین یثرب و بطحا تجھے سلام'' سے شروع ہوتا ہے پھر ولادت رسول، عظمت رسول، ولادتِ علی، فضائلِ علی، ولادت حسینؑ، وہ حالات کہ حسین کو عظیم قربانی پیش کرنی پڑی، کربلا، کربلا کی جنگ، عباس کی شہادت، علی اکبر کی شہادت، علی اصغر کی شہادت، بعد شہادت حسین اثرات شہادت حسین، پیغام حسین تک سارے مضامین ایک مرثیے میں نظم کئے گئے ہیں — مرثیہ براہ راست مقصدیت سے شروع ہوتا ہے اور مقصدیت پر ختم ہوتا ہے۔ ایک مضمون سے دوسرے موضوع پر جانے کے لئے گریز کے اشعار یا بند نہیں کہے گئے بلکہ ایک بند سے دوسرے بند تک موضوع کلام بدل جاتا ہے اور قاری کو محسوس نہیں ہوتا، عنوان بعد عنوان اشعار قاری کو منازل طے کرا رہے ہیں —

اے سرزمین یثرب و بطحا تجھے سلام حق نے کیا ہے خاک کو تیری فلک مقام
کرتی ہے کہکشاں تیرے ذروں کا احترام ۱ پڑتا ہے تجھ سے آج بھی ارض و سما کو کام
تجھ پر نزولِ رحمت ربّ ودود ہے
تیرے سبب زمین و زماں کا وجود ہے

ظلمت کدے میں دہر کے روشن ہوئے چراغ منزل کا مل گیا تیرے انوار سے سراغ
ساقی نے میکشوں کے لئے بھر دئے ایاغ ۲ تشنہ لبی سے پا گئی خلق خدا فراغ
گلرنگیٔ حیات کا ماتھا چمک اُٹھا
بعثت ہوئی حضور کی عالم مہک اُٹھا

تیسرا، چوتھا اور پانچواں بند شان رسالت کے باب میں ہے۔ چھٹا بند رسالت سے امامت کی طرف لے آیا ہے۔

چھٹنے لگے حیات سے تیرہ شبی کے دَل تھرا گئے جہان کے لات و ودو دبل
فرعونیت زمین سے ٹکرائی سر کے بل ۶ شداد وقت کو نظر آنے لگی اجل
تنہا نہ اب تھا ختم نبوت کا تاجدار
ہمراہ تھا وصی بھی لئے دیں کی ذوالفقار

بند نمبر ۷، شانِ ولادت، اور بند نمبر ۸ علی کا مرثیہ بعد رسالت ۔

وہ ختمِ انبیاء تھے یہ اوّل امام تھے وہ فخرِ عالمیں تھے، یہ شاہ نام تھے
وہ مہرِ نیم روز، یہ ماہ تمام تھے ۸ ایماں کا وہ قیام، یہ دیں کا قیام تھے
وہ مرتبے میں بعد خدائے رحیم تھے
یہ منزلت میں بعد نبیؐ کریم تھے

اے خونِ ہاشمی تیری خدمات کے نثار اے آمنہ کے لال تیری ذات کے نثار
تیرے فیوض و رحمت و برکات کے نثار ۹ غیروں سے بھی عظیم مداوات کے نثار
تھا خوں یہی رگوں میں امام حسینؑ کی
ان میں بھی شان تھی شہ بدر و حنین کی

عظمت کی وادیوں سے اُٹھی نور کی گھٹا نغموں کے رس میں ڈوب کے چلنے لگی صبا
تکبیر کی صداؤں میں رقصاں ہوئی فضا ۱۱ بنت نبی کی گود میں اک چاند آگیا
آواز دی نبی نے حسینؑ اس کا نام ہے
جس کا رسولؐ میں ہوں، یہ اس کا امام ہے

تین بند حسینؑ کی ولادت پر آل رسول اور کائنات کے ذرے ذرے کی مسرتوں کا بیان، پھر نیا مضمون۔

ایماں کا آفتاب امام حسینؑ ہے قدرت کا انتخاب امام حسینؑ ہے
دستورِ انقلاب امام حسینؑ ہے ۱۶ فرزند بوتراب امام حسینؑ ہے
اے کربلا کی خاک سمٹ کر ادھر تو آ
پابوسیٔ حسینؑ کو اپنی جبیں جھکا

اس کے بعد دو بند منقبت حسینؑ پر، تیسرے بند کے بعد اس دور کے مسلمانوں کی حالات زار۔

تو ذات کردگار کی تخلیق لازوال تیری رضا سے مرضیٔ خلاّق ذوالجلال
عکس شکوہ مصطفوی تیرا ہر کمال ۱۸ کردار میں عمل میں تو حیدر کی ہے مثال
صبر و رضا کا پیکر ایماں ہے تیری ذات
دار فنا میں دیں کی نگہباں ہے تیری ذات

جب زیرِ دست پر تھا زبردست کا ستم ۱۹ کشکول بے حسی میں بھرے تھے غم و الم
اُمت کا سر تھا سطوت شاہی کے آگے خم گوشہ نشیں تھا جبکہ ہر اک صاحب حشم تھا
رقص و سرود و جام و صراحی کا دور تھا
عہدِ یزید میں یہ مسلماں کا طور تھا

بدمست کائنات تھی چنگ و رباب سے انصاف سو رہا تھا گرانیٔ خواب سے
دربار جھومتا تھا خمارِ شراب سے ۲۱ مسند کو تھا نہ خوف خدائی عتاب سے
اس دور میں لئے ہوئے تو پرچم حیات
اُٹھا جگانے سوئی ہوئی ساری کائنات

جبروت کی جبیں شکن آلود ہوگئی بیعت علی کے لال سے مقصود ہوگئی
تیغ ستم کچھ اور سم آلود ہوگئی حق گو یہ کائنات بھی محدود ہو گئی
چرچے ہوئے کہ قتل کریں گے حسینؑ کو
زہرا کے لاڈلے کو محمدؐ کے چین کو

ہاتھوں میں لے کے حق کے علم کو نکل پڑا رگ رگ میں خون، شیر خدا کا اُبل پڑا
یثرب سے کربلا کے سفر کو وہ چل پڑا۲۶ اک شیر خوار گود میں ماں کی مچل پڑا
آتے ہیں کربلا کی طرف سرورِ اُمم
عباس آگے آئے ہیں کھولے ہوئے علم

خیمے وہ نصب ہوگئے نہرِ فرات پر مومن وہ گامزن ہوئے راہ نجات پر
مہتاب صبر چھا گیا، ظلمت کی رات پر۲۸ قرباں تھے اہلِ شر اموی سومنات پر
دشمن نے آب و دانے پہ پہرے بٹھادئے
دریا سے اہلبیت کے خیمے اُٹھا دئے

اس طرح گریز بعد گریز، واقعہ بعد واقعہ شاہد نقوی نے کربلا کی تاریخ نظم کردی ہے۔ دریا سے قیام اُٹھانا، فوجوں کا آنا، شب عاشور، عطش، روز عاشور، اصحاب کی شہادت، اعزا کی شہادت، عباس کی شہادت، علی اکبر و اصغر کی شہادت اور مرثیے کا اختتام پیغام حسینؑ سے ہوتا ہے۔

تاریخ کربلا ہے کہ تحریک ارتقاء تصویر بیکسی کہ عزائم کی ہے صدا

نام حسینؑ ہے کہ چراغ رہِ وفا بخشے گا تا بہ حشر اندھیروں کو یہ ضیاء

امن و سلامتی کی علامت حسینؑ ہے

ہر معرکے میں حق کی شہادت حسینؑ ہے

اب اہل فکر ونظر سوچیں کہ کیا ایسا ایک ہی مرثیہ شاعر کی حیات کے لئے کافی نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

شہرت بلگرامی:- (کراچی)

تاریخ ولادت۔ ۱۵/اکتوبر ۱۹۳۲ء۔ وفات ۱۰/اکتوبر ۲۰۰۲ء

(تاریخ ولادت ان کے آئیڈنٹی کارڈ سے لی گئی ہے اور تاریخ وفات ''گرہ کشا'' سے) ولادت وفات دونوں کا مہینہ اکتوبر قدرے چونکاتا ہے اس لئے ماخذ درج ہیں۔

نام سید ابوذر۔ تخلص شہرت۔ وطن مالوف بلگرام، والد کا اسم گرامی سید حسن بلگرامی۔ اپنی کتاب ''گرہ کشا'' کے پیش لفظ میں شہرت بلگرامی رقم الطراز ہیں کہ:

''احقر خانوادۂ سید اولاد حیدر فوق بلگرامی سے ہے۔ میرے اجداد صرف اُمراء دولت ہی نہیں علم میں بھی جلیل تھے۔ میرے خاندان نے بلگرام سے بڑھ کر صوبہ بہار میں گاؤں کے گاؤں خریدے اس طرح راقم الحروف (شہرت بلگرامی) کا خاندان صوبہ بہار کے تین قصبوں یعنی قصبہ کوآنھ (جسے بہار کا بلگرام کہا جاتا ہے) ضلع شاہ آباد (آرہ) خرم آباد ضلع شاہ آباد اور قصبہ حسین آباد ضلع پلاموں میں آباد ہو گیا ہے۔''

اس حوالے سے شہرت بلگرامی کی تعلق بہار سے ہوا۔ شاعری کا آغاز ''نوحہ'' سے ہوا۔ ابتدا حضرت وفا حسین آبادی سے اصلاح لی۔ بعد میں سید غضنفر نواب دانش سے سلسلہ تلمذ وابستہ کیا۔ شہرت بلگرامی نے تسلیم کیا ہے کہ وہ جوش ملیح آبادی اور علامہ جمیل مظہری سے دیوانگی کی حد تک متاثر تھے۔ ان دو اساتذہ کے شعری اور نثری مجموعوں کا مطالعہ شہرت بلگرامی کی عادت بن گئی تھی۔ چنانچہ حضرت غضنفر نواب دانش پٹنہ منتقل ہو گئے تو علامہ جمیل مظہری سے رجوع کیا۔

مرثیہ گوئی کی طرف رغبت بھی جوش اور مظہری کے مطالعہ سے ہوئی۔ شہرت بلگرامی کا مجموعہ مراثی ''گرہ کشا'' کے نام سے ۱۹۸۷ء میں کراچی سے شائع ہوا ہے۔ جس میں سات

موضوعاتی مرثیے شامل ہیں۔

(۱) "اللہ تا پنجتن" ۔ پہلے حمد سے مرثیے کی ابتدا کروں

(۲) "عقل و جہل" ۔ میرے اللہ میری فکر کو بینائی دے

(۳) "حقیقت" ۔ وہ رسم ذات لائق حمد و جود ہے

(۴) "علیؑ" ۔ میرے مولا مجھے بہلول کی دانائی دے

(۵) "قلم گوید" ۔ بے زبانی کی زبانی سے وہ قلم گویا ہے

(۶) "کردار" ۔ اے قلم پھول کھلا پھول کھلا پھول کھلا

(۷) "کل وفا" ۔ ساقیؑ سلسبیل مئے ہوش و فہم دے

اس کے علاوہ ان کے بیس مرثیے اور بتائے گئے ہیں۔ جو طبع نہیں ہو سکے۔ مطبوعہ کتب میں ہدیہ دل" منقبت العین، اور" ہر حرف آئینہ" شامل ہیں انہوں نے ۲۵۰ سے زیادہ نوحے اور سلام کہے ہیں۔ منقبت 'نعت' قطعات کا بڑا ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں۔ "گرہ کشا" پر علامہ طالب جوہری اور ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے تقاریظ لکھی ہیں۔ شہرتؔ بلگرامی بلاشبہ استاد شاعر تھے۔ انہوں نے کلاسیکی مرثیے کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ہر چند کہ لوازم مرثیہ کی سو فیصدی پابندی نہیں کی یعنی تلوار گھوڑے کی تعریف وغیرہ کی پابندی نہیں کی مگر ان کے مراثی بہرحال کلاسیکی مرثیے ہیں۔ بالخصوص مصائب اور بین میں انہوں نے میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی پیروی کی ہے۔ جوشؔ اور جمیل مظہری سے ان کی عقیدت مسلّم ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے خود اس کا اقرار کیا ہے مگر ان کے جتنے مراثی میری نظر سے گزرے ہیں ان میں جوشؔ یا جمیل مظہری کا رنگ نظر نہیں آتا — ذیل میں ان کے مرثیے "اللہ تا پنجتن" کے چند بند درج کئے جا رہے ہیں ۔

پہلے حمد سے مرثیے کی ابتدا کروں پھر نعت مصطفیٰ سے حصولِ رضا کروں
مدحِ علیؑ سے اجرِ رسالت ادا کروں ۱ پیشِ حضورؐ منقبتِ فاطمہؑ کروں
حسنین کا ہو ذکر تو افضل ہو مرثیہ
دعویٰ کی ہو دلیل، مکمل ہو مرثیہ

وہ حمد لوحِ عرش کی تحریر کی طرح تحریر وہ رسول کی، تقریر کی طرح
تقریر وہ کتاب کی تفسیر کی طرح ۲ تفسیر، کوہِ طور کی تنویر کی طرح

تنویر وہ جو غیب کے پردے اٹھا سکے
آنکھوں کو حق کے جلوے کے قابل بنا سکے

وہ حکمت وصفات کا خالق ہے بے گماں جو کچھ بھی عرش وفرش پہ ہے، اس کی خوبیاں
ماہ و نجوم و مہر و فلک، برق و آسماں ۵ یہ ابر و باد اور سمندر رواں دواں
یہ دہر میں جبل کی قطاریں کھڑی ہوئی
گویا ہوں نرم خاک میں میخیں گڑی ہوئی

ہم اتنا جانتے ہوئے دل سے ہیں مانگتے ایماں کے بھی مطیع ہیں، حکم رسولؐ سے
اس نے کہا الہ ہے سجدے میں ہم جھکے ۸ یوں مصطفیٰ کو پا کے ہم اللہ سے ملے
خالق کا وصف احمد ذیجاہ کا نور ہے
ناپید جس کو کہئے وہ اللہ کا نور ہے

اللہ اپنے آپ تو ظاہر نہیں ہوا اللہ کا ظہور ہے تبلیغ مصطفیٰ
قرآن اور رسول سے اسلام بھی ملا ۱۸ تقسیم کو وہ اپنی مشیت کی جانے کیا
بندہ ہر ایک صاحبِ ادراک سے ملا
اللہ بھی تو پنجتن پاک سے ملا

سرنامۂ کتاب الٰہی علیؑ کی ذات شاہ تنفرقو کی تباہی علیؑ کی ذات
افواجِ فتح ساز و سپاہی علیؑ کی ذات ۲۲ کونین کے دلوں پہ ہے شاہی علیؑ کی ذات
جنت علیؑ سے قربِ شعوری کا نام ہے
دوزخ، علیؑ کی ذات سے دُوری کا نام ہے

حملہ ہو سچ پہ جھوٹ کا تو لو علیؑ کا نام خطرہ ہو ٹوٹ پھوٹ کا تو لو علیؑ کا نام
ہو راج پاٹ لوٹ کا تو لو علیؑ کا نام ۲۹ حاکم ہو شر کی جھوٹ کا تو لو علی کا نام
دہشت کی گرد اٹھاتا ہے جو گرد گرد ہو
نام علیؑ سے آتش نمرود سرد ہو

زوجہ علیؑ کی شان الٰہی ہے فاطمہؑ ختم الرسل کی ایک ہی بیٹی ہے فاطمہؑ
تبلیغ مصطفیٰ کی بھی پونجی ہے فاطمہؑ ۳۲ مثل علیؑ الہ کی مرضی ہے فاطمہؑ

لہجہ وحی کا ہے تو نفاذِ رسولؐ بھی
وہ عورتوں کی صف میں بجائے رسول بھی

ماوائے انقلابِ نبوت، حسنؑ حسینؑ ملجائے انقلابِ نبوت، حسنؑ حسینؑ
احیائے انقلاب نبوت، حسنؑ حسینؑ ۴۱ تحیائے انقلابِ نبوت حسنؑ حسینؑ
حق ساز انبیاء کا سہارا حسینؑ ہے
اللہ کا ہے قول ہمارا حسینؑ ہے

یہ مرثیہ ۸۲ بند پر مشتمل ہے۔ اللہ سے پنجتن تک اور پھر حسین تک ۴۱ بند ہیں جن میں سے اختصار کی احتیاج کے سبب تدوین (Editing) ضروری تھی مگر شہرت بلگرامی کے کلام میں ایک بند سے دوسرے بند کا ربط اتنا مضبوط ہے کہ تدوینِ امر دُشوار ہے۔ بہر حال کوشش کی گئی ہے۔ جیسا کہ بین کے معاملے میں عرض کیا گیا شہرت بلگرامی کلاسیکی روایت کے علمبردار ہیں۔ اس مرثیے میں بین کا انداز یوں ہے ۔

سینے پہ ہے حسینؑ کے مکّار ہائے ہائے وہ حلق پر ہے تیغ شرر بار ہائے ہائے
ماتم کناں میں حیدر کرّار ہائے ہائے ۷۸ سر دُھن رہے ہیں احمد مختار ہائے ہائے
سوئے مدینہ رُخ ہیں خدیجہؑ کئے ہوئے
سر گود میں ہے فاطمہ زہرا لئے ہوئے

ہے ہے درِ خیام پہ فضہؑ ہے مضطرب سکتہ میں ہے رُباب سکینہ ہے مضطرب
کلثوم نوحہ پڑھتی ہے لیلٰی ہے مضطرب خیمے میں اپنے ثانیٔ زہرا ہے مضطرب
نوحہ کوئی یہ پڑھتا ہے حق کی دہائی ہے
نرغے میں ظالمین کے زینبؑ کا بھائی ہے

☆☆☆☆☆

فضل فتح پوری:- (کراچی)

ولادت ۲/ جولائی ۱۹۳۰ء ـــــ وفات یکم جون ۲۰۰۳ء (۳۰-۲ بجے شب)

نام سید افضال حسین، تخلص فضل، نقوی سادات، وطن قصبہ ایرائیاں، ضلع فتح پور۔ والد کا اسم گرامی سید اقبال حسین نقوی۔ ہجرت ۱۹۴۷ء میں پاکستان آگئے اور کراچی میں بس گئے۔

تعلیم: کراچی یونیورسٹی سے ایم۔اے (اُردو) ایم۔اے (انگلش) ایل۔ایل۔بی کی سندات حاصل کیں۔ انگریزی اُردو، دونوں زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ دونوں زبانوں میں ادبی اور تنقیدی مقالات ملک کے بڑے اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں — میر انیسؔ پر قابل قدر کام کیا؟ ایک تحقیقی مضمون "مرثیہ اور انیسؔ" میں میر انیسؔ کی مرثیہ نگاری کا دیگر زبانوں کے مرثیہ نگاری سے تقابل کیا ہے بالخصوص برطانوی شاعر سپنسر کی Fairy Queene سے انیسؔ کی منظر نگاری کا موازنہ دلچسپ ہے۔

Now when the rosy-fingured morning faire

Weary of aged thickness Saffron Bed

Had spread her purple rob through dewy air

And the high hills Titan discovered.

سپنسر کے اس Stanza سے میر انیسؔ کے اس بند کا موازنہ انیسؔ کی عظمت کو دوبالا کرتا ہے۔

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح — گلزار شب خزاں ہوا، آئی بہار صبح
کرنے لگا فلک زر انجم، نثارِ صبح — سرگرم ذکرِ حق ہوئے طاعت گذارِ صبح
تھا چرخ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہو جیسے پھول چمن میں گلاب کا

صبح کا منظر کا ایک اور موازنہ سپنسر اور میر انیسؔ کی شاعری کے جواہر پاروں کی شکل میں۔

At last the golden oriental gate

Of greatest heaven gem to open faire

And phoebus flesh as bridge groom to his mate

Came dancing for the shaking his deawie heir,

And huris his glestring beams through gloomy air.

خورشید نے جو رخ سے اُٹھائی نقاب شب — درکھل گیا سحر کا ہوا بند باب شب
انجم کی فرد فرد سے لے کر حساب شب — دفتر کشائے صبح نے اُلٹی کتاب شب

گردوں پہ رنگ چہرۂ مہتاب فق ہوا
سلطان غرب و شوق کا نظم و نسق ہوا

یہ موازنہ جہاں انیسؔ کی عظمت کا قصیدہ ہے وہاں سیّد افضال حسین نقوی فضل فتح پوری کے کثیر المطالعہ ہونے کی شہادت اور انگریزی اور اُردو، دونوں زبانوں کے ادب پر اُن کی دسترس کا ثبوت ہے۔ فضل فتح پوری نے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی بعض نگارشات کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ راقم الحروف کی کتاب ''سخن گسترانہ بات'' پر سید افضال حسین نقوی نے انگریزی زبان میں تبصرہ کیا تھا جسے یورپ کے انگریزی داں طبقے اور انگریز مفکرین نے بہت سراہا تھا بالخصوص اُن کی انگریزی تحریر کو دانشوروں نے اعلیٰ درجے کی انگریزی تحریر قرار دیا تھا۔

فضل فتح پوری نے ہر صنف سخن میں شعر کہے ہیں مگر مرثیہ نگاری اُن کی شاعری کی پہچان بنی۔ اُنہوں نے ۱۹۷۰ء میں مرثیہ گو شعراء کا ایک حلقہ بنایا، مرثیہ گو شعراء کی حوصلہ افزائی کی اور ۱۹۷۵ء میں نئے مرثیوں کا ایک مجموعہ 'فکر و فغاں' ترتیب دیا جسے انجمن سفینۂ ادب کراچی نے شائع کیا۔ 'فکر و فغاں' میں اُن کے تین مرثیے شامل ہیں۔ مرثیہ گوئی میں فضل فتح پوری جدید مرثیے کی منزل کی طرف گامزن رہے۔ جدید مرثیے کے متعلق نے اُن کی رائے ہے کہ:

''جہاں ذاتی تعلّیوں کا زور دکھایا جاتا ہے اس سے احتراز برت کر چہرے میں ایسی باتیں جن کا دورِ حاضرہ کی فکری اور عملی باتوں سے تعلق ہو یا کوئی بھی نکتہ یا علمی حقیقت کو جو تدریجِ علم و فن میں معاون و مددگار ثابت ہو، بیان کیا جائے اور پھر اس موضوع کا روابط کربلا سے ربط دیا جائے اور سبطِ رسول کی شہادتِ عظمیٰ پر مزید روشنی ڈالی جائے''

(بیسوی صدی اور اُردو مرثیہ — ص ۳۸۷)

پاکستان میں موضوعاتی مرثیے کے کارواں میں ضیاء الحسن موسوی، آثر جلیلی، شاداںؔ، وحید الحسن ہاشمی، اُمید فاضلی، حسین اعظمی، فضل فتح پوری اور خلش پیراصحابی کے نام لئے جاتے ہیں۔ یہ کارواں جوشؔ، نجمؔ اور آلِ رضا کے بعد آنے والوں کا شمار کیا جاتا ہے۔ فضل فتح پوری نے موضوعاتی مرثیوں میں بھی جدت پیدا کرنے پر توجہ دی۔ ''فکر و فغاں'' کے نام سے جو مجموعہ مراثی 'انجمن سفینۂ ادب' کراچی نے شائع کیا اس میں فضل فتح پوری، کوثر الہ آبادی، نصیر بنارسی، ظل

صادق اور وقار سبزداری کے مراثی شامل کیے گئے تھے۔ فضل فتح پوری نے ان شعراء کی فکر کا دھارا جدید مرثیے کی طرف موڑنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ فضل فتح پوری کے اپنے مراثی 'آفرینش' حیات اور حسینؑ، انبساط و آلام، حصار وقت، عظمت کاملہ، تذکرۂ وفا، میں جدید فکر کی روشنی نمایاں ہے لیکن 'فکر وفغاں' کے دیباچے میں اُنہوں نے لکھا ہے کہ:

> "فکر وفغاں میں شامل مرثیے جوشؔ اور انیسؔ کے انداز سخن سے ہٹ کر لکھے گئے ہیں"

ڈاکٹر ہلال نقوی نے فضل فتح پوری کے اس دعوے کی تردید کی ہے۔ ہلال نقوی کی تردید کا سبب واضح ہے اور وہ یہ کہ انیسؔ، کلاسیکی مرثیہ کی عظمت اور جوشؔ جدید مرثیے کی سربلندی کی علامت ہیں اور مرثیہ نگار یا تو کلاسیکی انداز کو اپناتا ہے یا جدید مرثیہ کا علم اُٹھاتا ہے۔ ان دونوں مکاتیب فکر سے ہٹ کر مرثیہ نگار کیا لکھے گا؟ فضل فتح پوری خود ترقی پسند فکر رکھتے تھے۔ ان کی بصیرتِ علمی مسلمہ ہے۔ اُن کے اپنے مراثی میں بھی جدید مرثیے کی سوچ ہے اور "فکر وفغاں" میں شامل تمام مرثیوں کا دھارا اسی سمت بہہ رہا ہے۔

مرزا دبیر نے وہب کلبی کی شہادت کو ایک معرکتہ الآرا مرثیے میں نظم کیا تھا۔ ؎

مومنو! بے کس و بے یار ہے مظلوم حسینؑ" (دفتر ماتم۔ جلد پنجم)

اس موضوع پر میر اُنس، مشیر لکھنوی اور عشیر لکھنوی کے بھی لاجواب مرثیے موجود ہیں فضل فتح پوری نے بھی وہب کلبی کے احوال کا مرثیہ لکھ کر بیانیہ شاعری کا ایک خوبصورت اور ترقی پسندانہ رویہ پیش کیا ہے — ؎

آلام و انبساط کا عنواں ہے زندگی ہر لحظہ ہست و بود کا ساماں ہے زندگی
نوحہ کناں ہے گاہ غزل خواں ہے زندگی ہے خار زار، گاہ گلستاں ہے زندگی
ساز حیات، عربدۂ ہوش و گوش ہے
مایوسیوں کی لے ہے رجز کا خروش ہے

زندگی کی عکاسی کے بعد وہب کلبی کا ذکر ؎

اک نوجوان وہب بنو کلب جس کا نام اک نوعروس بیاہ کے لایا وہ شاد کام
تھی پھول سی دلہن بھی تو خود بھی تھا لالہ فام بے فکریوں میں کٹنے لگے اس کے صبح و شام

خوشیوں کی زندگی تھی، مسرت کا دور تھا
نازاں تھا بخت اور ہی جینے کا طور تھا

''فکر وفغاں'' میں فضل فتح پوری کا ایک مرثیہ 'تذکرۂ وفا' بھی ہے جس میں تاریخ انسانی کے وفاشعار لوگوں کا تذکرہ ہے۔ اس مرثیہ میں مغرب کے حوالے بھی ہیں۔

کمال مہر و مروّت ہیں پیکرانِ وفا رہِ ثبات پہ قائم ہیں رہروانِ وفا
اُٹھائے ہاتھوں پہ سر مثلِ ارمغانِ وفا رواں ہے آج بھی عالم میں کاروانِ وفا
کھلے ہیں دہر میں رایت وفا کی عظمت کے
وقار زیست کے، انسانیت کی رفعت کے

جہاں میں موسیٰ عمراں کا ایک بھائی تھا بڑا متیں، بڑا حامی و فدائی تھا
وحید اثر تھا، تصویرِ پارسائی تھا ۹ ہر اک مقام پہ تمثیلِ پارسائی تھا
اسی کا نام تو ہارون تھا زمانے میں
یہی تو فخر تھا عمران کے گھرانے میں

زمین ہند میں، گنگ و جمن کی وادی میں حسین پھولوں کی ارض وطن کی وادی میں
اودھ کی جان، غزالِ وطن کی وادی میں ۱۴ ہزار سیم تن و گلبدن کی وادی میں
سنا تھا بستے تھے دو بھائی رام اور لکھمن
نثار بھائی پہ کرتا تھا بھائی، جاں ہو کہ تن

ملا زباں سے جو دسرتھ کے رام کو پیغام کہ پوت راج محل میں ہوا قیام تمام
سدھارو جلد کہ بن باس میں ہو، جائے قیام ۱۵ بہ ذوق و شوق چلا سُن کے باپ کا یہ کلام
کیا یہ ماں سے کہ بن باس ہم سدھارتے ہیں
پلک جھپکتے ہی چودہ برس گذارتے ہیں

وفا کے زور سے پھر رام کو ملی شاہی جلو میں رام کے لچھمن تھا صدق کا راہی
لگن سے سیتا کے اک کیفِ وجدو جانکاہی ۱۷ وفا کے نام کا ڈنکا تھا مرغ تا ماہی
وفائے حضرت انساں کی سحر کاری تھی
زمیں سے تا بہ فلک موجِ نور جاری تھی

زمین ہند کی مانند ارض یورپ پر فلک کی آنکھ نے دیکھے شباب کے پیکر
وفا کے راج دلارے، دکھوں میں سینہ سپر ۱۸ ہلا سکا نہ قدم خوف مرگ بھی یکسر

وفا کی جوت سے انساں کا دل منوّر ہے
کسی جگہ کا ہو انساں وفا کا پیکر ہے

ہوا خروج جو اسپارٹا کے شیروں پر چہار سمت سے فوجیں بڑھی دلیروں پر
اندھیرے جیسے کہ حملہ کریں سویروں پر ۱۹ بسیرے یاس کے تھے شہر کے منڈیروں پر

گھرا تھا شہر پہاڑوں کے درمیاں سارا
بس ایک درّے کا رستہ تھا بے گماں سارا

رہا غنیم پٹختا دہانِ کوہ پہ سر ادھر جیالوں کا ہوتا رہا جہاں سے سفر
مجال ہے کہیں ملتی کسی کو راہِ مفر ۲۱ غرض کہ کھیت رہے سارے سورما یکسر

اُدھر غنیم یہ سمجھا کثیر لشکر ہے
ہے خیر اس میں کہ پسپائی ہی مقدر ہے

زمین گرم عرب پر وفا شناس تھا ایک چمکتی تیغوں کی چھاؤں میں بے ہراس تھا ایک
حواس جس سے معطّل، وہ باحواس تھا ایک ۲۴ خصومتوں کے مقابل وفا کی آس تھا ایک

اسی وفا کے شناور کا نام حیدر تھا
مقابلے میں ہزاروں کے ایک لشکر تھا

وفا کی نیند نے ہجرت کو آبرو بخشی نبی کے رنگ تمدّن کو رنگ و بو بخشی
حصول عظمت انساں کو آرزو بخشی ۲۷ شعورِ آدمِ خاکی کو نیک خُو بخشی

زمانہ لاکھ مخالف ہو، بے حقیقت ہے
وفا کی نظم دو عالم یہ حاکمیت ہے

ہوا کیا یونہی کونین میں وفا کا سفر شب دہم کو محرم کی تھا عجیب منظر
پڑا تھا شام کا ہر سمت بکراں لشکر ۲۸ یہ سوچ سوچ کے عباس سخت تھے مضطر

مٹا ہے حق کبھی طاغوت کے مٹانے سے
الٰہی مٹ گیا انصاف کیا زمانے سے

انہیں خیالوں میں غلطاں کھڑا تھا والا گہر　　حبیب آئے قریں، بولے اے علی کے پسر
بتاؤں راز تمہیں مرتضٰی کے لخت جگر۳۰　وہ بات کون تھی حیدر کے دل میں آٹھ پہر

وفاتِ فاطمہ زہرا کے بعد شاہ نجف
یہ چاہتے تھے کہ تم سا ملے علی کو خلف

اسی لئے تو بنو کلب میں تھی کی شادی　　تمہاری ماں کو بنالائے گھر کی شہزادی
پسر ہوں شیر تو پھیلے وفا کی آبادی۳۱　کٹھن گھڑی ہو تو رکھیں انا کی آزادی

وفائے شاہ دلاور کی آبرو تم ہو
یقین جانو کہ حیدر کی آرزو تم ہو

یہاں سے وفائے عباس کا بیان۔اُن کی شہادت، بعد شہادت سیدانیوں کی بیکسی سارا منظر نامہ نظم کیا ہے فضل فتحپوری نے—یہ مرثیہ تاریخ وفا ہے۔ذکر وفا ہے۔سرفرازیٔ وفا ہے۔ آخری بند، وفا کی سربلندی کا پرچم ہے جو ابد تک لہراتا رہیگا۔

وفا رہے گی سرفراز جان حیدر سے　　سدا کرم کی گھٹائیں اُٹھیں گی اس در سے
علم وفا کے نکلتے رہے گے گھر گھر سے　　ملے گا فضل، ابوالفضل کے مقدّر سے

ہمیشہ مشک و علم شامل وفا ہوں گے
ابد تلک کے لئے حاصل وفا ہوں گے

سید افضال حسین فضلؔ فتح پوری علمی ادبی دنیا میں شاعر، مرثیہ گو، ادیب، ناقد، محقق، مترجم۔کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔فضل فتح پوری اُردو صحافت میں بھی اپنا مقام رکھتے تھے حتیٰ کہ انگریزی صحافت میں بھی لوگ انہیں ایس۔ایچ۔تقوی کے نام سے جانتے ہیں وہ بیسویں صدی کی آخری چار دہائیوں سے لکھ رہے تھے۔اُن کے ۱۷ مراثی کا مجموعہ ''عالم آشوب'' ۱۹۹۶ء میں کراچی سے شائع ہوا ہے۔

☆☆☆☆☆

اسلم خیالؔ:-　　(کراچی)

ولادت ۱۹۴۲ء۔وفات ۲۰۰۳ء

نام سید محمد اسلم زیدی۔تخلص خیالؔ۔قلمی نام اسلم خیالؔ۔وطن مالوف حسین پور مشرقی

پنجاب۔ تعلیم بی۔کام، ایم۔اے (سیاسیات)۔ایل۔ایل۔بی۔ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۶ء تک وکالت کے پیشے سے منسلک رہے۔ ۱۹۷۷ء میں پاکستان سٹیل ملز کارپوریشن یں ملازمت کرلی اور ۲۰۰۱ء میں بحیثیت ڈپٹی جنرل منیجر (کارپوریٹ افیئرز) ریٹائرمنٹ لی اور پرورش لوح وقلم میں مصروف ہوگئے۔

اسلم خیال کو اُردو، سندھی اور پنجابی زبانوں پر دسترس حاصل تھی— تینوں زبانوں میں لکھتے پڑھتے تھے۔ان کی تصانیف اس کی دلیل ہیں۔

تراجم: (۱) امام الکلام، کلام الامام'' نہج البلاغہ'' بشمول خطبات، مکتوبات، فرمودات کا سندھی زبان میں ترجمہ۔

(۲) سندھی زبان کی فقہی کتاب '' تاریخ شیعت '' کا اُردو ترجمہ۔

(۳) رابندر ناتھ ٹیگور کی نوبیل انعام یافتہ شعری تخلیق '' گیتانجلی '' کا سندھی ترجمہ

رنگ تغزل: (۴) سرِ شاخ جان (غزلیات کا مجموعہ) (زیرِ اشاعت)

(۵) '' شمع ہر رنگ میں جلتی ہے'' (غزلیات) غالب کی زمینوں میں ۱۰۰ غزلیں) (زیرِ طبع)۔

اپنے مکتوب میں اسلم خیال نے لکھا ہے کہ ان کا عرصۂ شاعری ۴۰ برس پر محیط ہے۔ (گویا اُنہوں نے کم وبیش بیس برس کی عمر سے مشقِ سخن کا آغام کیا)۔'' سرِ شاخ جاں'' اور '' شمع ہر رنگ میں جلتی ہے'' کی موجودگی اس امر کا اعلان ہے کہ اُنہوں نے غزل گوئی کا حق بھی ادا کیا ہے۔غالب کی زمینوں میں ۱۰۰ غزلیں کہنا سہل نہیں ہے—

اپنے مکتوب میں اُنہوں نے یہ بھی تحریر فرمایا کہ گذشتہ (۸) آٹھ برسوں میں اُنہوں نے '' انجمن سفینہ ادب'' کراچی اور '' تنظیم محبان مرثیہ'' کے زیرِ ترغیب واثر آٹھ مرثیے کہے ہیں گویا وہ چالیس برس کی عمر کے بعد وہ مرثیہ گوئی اور رثائی ادب کی طرف مائل ہوئے ہیں—

اسلم خیاؔل نے اپنی عمر کے چالیس برس تک اپنی شاعری اور قدرتِ شعر گوئی کو منوایا۔ دو دیوان مرتب کئے اور جب اپنے پرائے یہ مان چکے کہ اسلم خیال قادرالکلام شاعر ہیں تو اسلم خیال نے اعلان کیا کہ اب وہ فانی محبوب کی تعریف چھوڑ کر اُن کی مدح وثنا اور اُن کے ذکر کی طرف جا رہے ہیں جنہیں زمانہ فنا نہیں کرسکتا۔اور اسلم خیاؔل نے محمد وآل محمد کی ثنا سے اور کربلا

والوں کی رثا سے رشتہ جوڑا۔ اور مرثیے کہنے لگے۔ اُنہوں نے جو مرثیے کہے وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) ''وقت'' ۔ وقت کیا ہے اک حقیقت آشکار اے دوستو

(۲) ''آب'' ۔ کس طرح صناعیِ قدرت کا ہو ہم سے بیاں

(۳) ''وفا'' ۔ ربِ قدیر مقتدر و قادر و قوی

(۴) ''موسمِ گریہ'' ۔ موسمِ گریہ و زاری جو محرم لایا

(۵) ''سفرِ حریت'' ۔ کس شان سے وطن سے چلا فاطمہ کا لال

(۶) ''معرکہ حق و باطل'' ۔ ہر دم ستیز و کار رہا حق سے یہ جہاں

(۷) ''دیں پناہی'' ہاں اے قلم تو مدحتِ عمراں بیان کر

(۸) ''بیمار کربلا'' کے (مطلع کا مصرعہ اولیٰ پڑھا نہیں جا سکا)

اسلم خیال کے پہلے مرثیے ''وقت'' کے چند بند نمونہ کلام کے طور پر درج ذیل کئے جا رہے ہیں جو اُنکے اسلوب اور رجحان کے نقیب ہیں۔ اُن کے دیگر مراثی نقش ثانی۔ نقش ثالث کے زمرے میں آتے ہیں جو یقیناً نقش اوّل سے قدم بہ قدم ارتقاء پذیر اور بہتر ہیں۔

وقت کے مدّ و جزر کی بات کیسے ہوں بیاں سسکیاں ہیں یاس ہے اور ہر طرف آہ و فغاں
اہل دل، اہل نظر ہوتے رہے ہیں نیم جاں وقت نے یوں تو سنائی ہے بہت سی داستاں
وقت کو عزم و عمل سے مات دینی ہے اگر
جاری رکھو تم بھی سوئے کربلا اپنا سفر

نینوا ہے در حقیقت معنیٔ ذبح عظیم اور حسینؑ اس دور بد کے تھے براہیم وکلیم
راہ حق میں جو دکھایا آپ نے عزم صمیم وقت تھا حیران اور لرزش میں افواج غنیم
محسنِ دینِ مبیں ہیں آپ اور نازِ رسولؐ
پارۂ قلبِ علیؑ اور راحتِ جانِ بتولؑ

چیرہ دستی وقت کی ہو یا زمانے کے ستم کجروی ہو عرش کی ڈھائیں عدو لاکھوں ستم
تندخُو حالات ہوں، ہوتے رہے سر بھی قلم ہم شہیدان وفا کے خوں کا رکھیں گے بھرم
جان دیں گے ہم عزائے حضرت شبیر میں
ایک نیا جذبہ بھریں گے نعرۂ تکبیر میں

سنت شبیر میں باطل سے ٹکرائیں گے ہم　　معرکہ کرب و بلا کا پھر سے دوہرائیں گے ہم
کذب وشر کی قوتوں کے سامنے آئیں گے ہم　　ہاں بنام پنجتن جاں دیں گے مٹ جائیں گے ہم

ہم تو رکھتے ہیں عنان وقت اپنے ہاتھ میں
اور اک کوہ گراں ہیں آپ اپنی ذات میں

۱۷ر جولائی ۲۰۰۳ء کو میں سفر سے واپس آیا تو محترم کوثر آلہ آبادی کا خط ملا، لکھا تھا:

"ایک بڑی خبر یہ ہے کہ ۳۰ جولائی کو اسلم خیال زیدی صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ میت خیر پور لے جائی گئی اور وہیں سوئم وغیرہ ہوا، حق مغفرت کرے بڑے صاف گو اور بے لوث انسان تھے، بہت پڑھے لکھے تھے مگر انکساری رکھتے تھے، اُن کی کتابوں اب کون چھاپے گا۔ کیا یہ سب حصہ پارینہ بن جائے گا۔ فقط　　(کوثر الہ آبادی)

اگست ۲۰۰۳ء سے جناب کوثر الہ آبادی کی آواز فضاؤں میں گونج رہی ہے۔" اب اُن کی کتابیں کون چھاپے گا۔ کیا یہ سب قصہ پارینہ بن جائے گا؟" ۔ کوثر الہ آبادی کی آواز ایک سوال بھی ہے اور ایک تمنا بھی۔ کیا یہ ہر اس دل کی آواز نہیں ہوسکتی جس دل میں اسلم خیال سے تعلق کا چراغ کبھی روشن ہوا ہو یا جس دل میں اسلم خیال کے ممدوحین کی محبت کا اُجالا بکھرا ہو؟

☆☆☆☆☆

سید واحد علی یکتا:-　　(کراچی)

ولادت ۱۹۱۶ء۔ وفات ۲۰۰۴

نام سید واحد علی۔ تخلص یکتا۔ وطن امروہہ۔ والد گرامی، سید واجد علی حقانی۔ مورث اعلیٰ سید حسین شرف الدین شاہ ولایت۔ تعلیم منشی فاضل۔ اس کے بعد دہلی آگئے، بچپن سے شعر وسخن سے وابستہ ہوگئے۔ نیشنل پبلک لائبریری میں ملازمت کی۔ کتابوں سے تعلق استوار ہوگیا، آل انڈیا ریڈیو سے کلام نشر ہونے لگا جس نے ذوق شعر گوئی کو جلا دی۔

تقسیم ہند کے بعد کراچی آگئے۔ دوسال کراچی میں گذارنے کے بعد ۱۹۴۹ء میں خیر پور میرس(Mirs) چلے گئے — ہز ہائی نس خیر پور کی نظر انتخاب یکتا صاحب پر پڑی تو جوہری نے ہیرے کی قدر کی اور انہیں اُردو کی تدریس پر مامور کرلیا۔ اور اس طرح یکتا ہز ہائی نس کے

اتالیق کی حیثیت سے والیِ خیر پور سے وابستہ ہو گئے۔ بحیثیت مصنف اُن کی تصانیف۔

(۱) شاہنامہ کربلا (مثنوی) (۲) سیرت اقبال

(۳) ابلیس کی خدائی (۴) انجمن در انجمن

(۵) حیات ونجات (۶) مصائب عروس

(۷) درود اُن پر (نعتوں کا مجموعہ) (۸) سلام اُن پر (سلاموں کا مجموعہ)

ان کی ایک تصنیف ''خونی ہے ہندوستان'' نے بہت زیادہ شہرت پائی حتیٰ کہ سروجنی نائیڈو اور جارج برناڈ شاہ نے بھی اس کتاب پر اظہار خیال کیا۔

اشتیاق اظہر نے لکھا ہے کہ بحیثیت مجموعی یکتا کی تصانیف ایک سو سے زیادہ ہیں جن میں بچوں کے لئے کتابوں سے لے کر افسانوی ادب، منظومات، مثنوی، لغت، منقبت، سلام، مراثی تک شامل ہیں۔

بحیثیت صحافی یکتا بچوں کے لئے رسالہ ''کہانی'' اور خواتین کے لئے رسالہ جمالیات بھی شائع کرتے رہے ہیں اور ''خاتون پاکستان'' کے شعبۂ ادارت سے بھی اُن کا تعلق رہا ہے۔

مرثیہ کے باب میں یکتا کا ذکر کرتے وقت اُن کی ہمہ جہت شخصیت اور مختلف اصناف سخن میں کامرانی اُن کے علم اور اُن کی تخلیقی صلاحیتوں کا اقرار ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ اتنے زرخیز ذہن کے مالک۔ پیشہ وارانہ زندگی میں قابل توجہ منصب پر فائز، تخلیقی دنیا میں ہمہ جہت تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال شاعر یکتا کے مرثیے کہیں میسّر کیوں نہیں ہیں۔؟ اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ کراچی میں تین شخصیات نے رثائی ادب اور مرثیوں پر بہت کام کیا ہے اور کر رہے ہیں لیکن اُن تینوں حضرات نے یکتا کا کہیں تذکرہ نہیں کیا ہے اس کے برعکس امروہہ میں بیٹھ کر عظیم امروہوی نے اپنی کتاب میں یکتا کے لئے ایک باب مختص کیا ہے۔ عظیم امروہوی یکتا کے مراثی کو تلاش نہیں کر سکے لیکن اُنہوں نے یکتا کے سلاموں کے جو اشعار نقل کئے ہیں وہ اُن کی شاعری کے معیار پر دلالت کرتے ہیں۔ جن ردیفوں کو یکتا نے کامیابی سے برتا ہے وہ عام سطح کی شاعری سے بلند مرحلہ ہے۔

ہے میری فکر رسا کی مدح حیدر تک پہنچ		اس وسیلے سے ہے اللہ و پیمبر تک پہنچ
گر شب ہجرت علی کو دیکھتا ہے محو خواب		چل سکے تیغوں کی دھاروں پر تو بستر تک پہنچ

یہ کرامت عرش سے آئی ہے لے کر ذوالفقار فرش پر ہے، پر ہوئی جبریل کے پر تک پہنچ
شہ کے غم میں آنسوؤں کو اب ضرورت ہے تیری خونِ دل، تو دل سے چل اور دیدۂ تر تک پہنچ

—سلام—

اے رحمت خدا، نہ جہانِ خطا میں ڈھونڈ مداحِ اہلبیت کو بزمِ ثنا میں ڈھونڈ
ان کو خدا میں، اور اُنہیں ذات خدا میں ڈھونڈ برحق نما کو آئینہ حق نما میں ڈھونڈ
یثرب میں کر تلاش، نہ بیت خدا میں ڈھونڈ عزم و عمل کو ساتھ، فقط کربلا میں ڈھونڈ
یا تو یہ مان لے کہ علی بے مثال ہے یا ان کا مثل، وسعت ارض و سما میں ڈھونڈ
پھیلی ہے آنسوؤں کے چراغوں کی روشنی آ، اپنی شاہراہِ نجات اس ضیاء میں ڈھونڈ

کسی شے کا میسّر نہ ہونا اس کے عدم وجود کو ثابت نہیں کرتا سید واحد علی یکتا کے مراثی تک ہماری رسائی نہ ہوسکی یہ ہماری کم مائیگی ہے۔اس سے حضرت یکتا کی مرثیہ گوئی پر فرق نہیں پڑتا۔

کراچی کے ایک ممتاز مرثیہ گو شاعر کا کہنا ہے کہ یکتا مرثیہ کے شاعر نہیں ہیں۔ناقدین مرثیہ یہ بھی نہیں کہتے۔ بلکہ یکتا کے معاملے میں تو کچھ بھی نہیں کہتے۔

☆☆☆☆☆

اسیر فیض آبادی:- (کراچی)

وفات، ۲۰۰۴ء

نام: مرزا علی حیدر، تخلص: اسیر، وطن: فیض آباد (یو۔پی) تقسیم ہند کے بعد ہجرت کی اور کراچی آگئے۔ڈاکٹر ہلال نقوی نے اسیر فیض آبادی کو مرثیہ کے سفر میں ۱۹۸۴ء سے شریک قرار دیا ہے۔ان کی ترتیب دی ہوئی یہ فہرست، شعرا کے پہلے مرثیہ کی تصنیف کی بنیاد پر بنائی گئی ہے۔اس حوالے سے اسیر فیض آبادی نے پہلا مرثیہ بعنوان ''زیادت کربلا'' تہذیب زندگی کا خلاصہ ہے کربلا'' ۱۹۸۴ء میں کہا لیکن اپنی اسی کتاب ''بیسویں صدی اور جدید مرثیہ'' میں اسیر فیض آبادی کے ایک اور مرثیے '' لحاظِ عظمت کردار آدمی رکھیے'' کا سنہ تصنیف ۱۹۸۳ء درج کیا ہے۔امکان اس بات کا ہے کہ غلطی کاتب کے کھاتے میں ڈالنی پڑے گی اس لئے کہ اسیر فیض آبادی کا پہلا مرثیہ'' زیارت کربلا'' ہی ہے——دوسرا مرثیہ بعنوان 'مجلسیں'' یارب میرے شعور کو

پرواز بخش دے'' ۱۹۸۵ء کی تخلیق ہے۔ تیسرا مرثیہ۔ پھر دل تڑپ رہا ہے نیا مرثیہ لکھوں'' کا سنہ تصنیف ۱۹۸۸ء بتایا گیا ہے۔ دوسرے اور تیسرے مرثیے کے درمیان غالباً انہوں نے کوئی مرثیہ نہیں کیا۔ تیسرے مرثیے کے مصرعِ اولیٰ میں جو تڑپ ہے وہ بتا رہی ہے۔ کہ بوجوہ مرثیہ نہیں کہہ پائے۔ اسیرؔ فیض آبادی نے عام طور پر ہر سال میں ایک مرثیہ ضرور کہا ہے۔ اس لحاظ سے ان کا مرثیہ'' لحاظِ عظمتِ کردارِ آدمی رکھیے'' کا سنہ تصنف ۱۹۸۳ء کی بجائے ۱۹۸۶/۸۷ء ہو سکتا ہے۔ اس ترتیب سے یہ ان کا تیسرا مرثیہ ہوا۔ چوتھا مرثیہ۔ ''پھر دل تڑپ رہا ہے نیا مرثیہ لکھوں''۔ (۱۹۸۸ء) پانچواں مرثیہ'' زینت گلزار ایماں ہیں مودت کے گلاب'' سنہ تصنیف ''۱۹۸۹ء۔ چھٹا مرثیہ'' مقتل ذات میں پاتے ہیں شہادت کچھ لوگ'' سنہ تصنیف ۱۹۹۰ء ہے۔ سنہ ۱۹۹۰ء کے بعد ان کا کوئی مرثیہ ہم یورپ میں آباد غریب الوطن شائقین مرثیہ تک نہیں پہنچا۔ اور جو حضرات مرثیہ پر کام کر رہے ہیں وہ اتنے مصروف ہیں کہ کسی سوال کا جواب ملنے کی امید نہیں کی جا سکتی۔

بہر حال جو مرثیہ ریکارڈ پر ہیں ان کی روشنی میں اسیرؔ فیض آبادی کو مستند مرثیہ نگار تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ ان کے مرثیے مجلسیں'' کے چند بند بطور نمونہ کلام درج ہیں۔

یارب میرے شعور کو پرواز بخش دے لفظوں کو سوز فکر کو اعجاز بخش دے
ایماں پسند طبع سخن ساز بخش دے ا جوشؔ و رضاؔ نجمؔ کا انداز بخش دے
تا زیست اشک و آہ رہے، مرثیہ رہے
ذکرِ غم حسینؑ مرا مشغلہ رہے

یہ مجلسیں یہ تذکرۂ آلِ مصطفےٰ تبلیغِ دین کا ہیں فضا ساز سلسلہ
ہوتی ہے ان سے آئینہ فکر پر جلا مربوط مجلسوں سے ہے ایماں کا راستہ
مظلوم کی حمایت و نصرت ہیں مجلسیں
بزمِ ادائے اجرِ رسالت ہیں مجلسیں

علم و عمل کے نور کا دریا ہیں مجلسیں اسلام کے فروغ کا جادو ہیں مجلسیں
باطل کی ظلمتوں میں اُجالا ہیں مجلسیں ہر ظلم کے خلاف صف آرا ہیں مجلسیں
جب بھی کہیں یزید اُبھرتا ہے دہر میں
ذکرِ حسینؑ اور نکھرتا ہے دہر میں

قدریں بھی ہیں اصول بھی کچھ مجلسوں کے ہیں ارباب بزم رکھتے ہیں پیشِ نظر جنہیں
یہ تو ہمارا فخر ہے آنسو اگر بہیں ۹ کیا خوب ہو جو دل بھی شریکِ فغاں رہیں
سچائیوں کے نور سے زینت ہوں بین کی
دل کا خلوص دیکھتی ہے ماں حسینؑ کی

دیکھو تو آ کے مجلسِ سبطِ نبی کا رنگ دھلتا ہے کیسا دل سے یہاں معصیت کا زنگ
ملتا ہے گفتگو کا سلیقہ وفا کا ڈھنگ ۲۲ بڑھتی ہے دل میں دین کی تفہیم کی اُمنگ
بٹتا ہے یاں شعور فروع و اصول کا
کردار جگمگاتا ہے آلِ رسولؐ کا

ان مجلسوں میں حرمت منبر میں بھی فرض ہے حمد و ثنائے خالقِ اکبر بھی فرض ہے
پھر اس کے بعد ذکر پیغمبرؐ بھی فرض ہے ۲۳ اعلان حق شناسی رہبر بھی فرض ہے
حمد خدا کے بعد نبیؐ کی ثنا کرو
پڑھ کر درود فرض مودّت ادا کرو

ہوتا ہے جب نصیب تصوّر علیؑ کا گھر بنتِ رسولؐ ذہن میں ہوتی ہے جلوہ گر
پائے ہیں جس نے شبرؑ و شبیرؑ سے پسر ۳۴ تعظیم جس کی کرتے تھے خود سید البشر
فیضان اس کا سورۂ کوثر سے پوچھ لو
کتنی عظیم ہے یہ پیغمبرؐ سے پوچھ لو

زینبؑ اسی کے خوں کی حرارت لئے ہوئے ہر رخ سے مُو بہ مُو ہے شباہت لئے ہوئے
ماں کی حیا پدر کی شجاعت لئے ہوئے ۳۷ آلِ نبیؐ کی شانِ قیادت لئے ہوئے
عصمت سے متصل ہے بتول احتشام ہے
یہ کربلا شناس مشیرِ امام ہے

کوفہ سے تابہ شام وہ خطباتِ پُر اثر سن کر جسے لرز گئے اشرار کے جگر
ضربیں براہِ راست جو تھیں قلب و ذہن پر ۵۲ تاریکیوں سے شب کی نمایاں ہوئی سحر
ان مجلسوں نے فکر بدل دی عوام کی
فی الاصل ابتدا تھی یہ ذکرِ امام کی

یہ مجلسیں اُسی کا تسلسل ہیں اے اسیر بیدار کر رہی ہیں جو سوئے ہوئے ضمیر
یہ بزم غم یہ ذکر شہِ آسماں سریر ۶۸ دراصل ہیں حسینؑ کے پیغام کے سفیر
آتے ہیں لوگ ذہن کا سادہ ورق لئے
جاتے ہیں عزم و علم و عمل کا سبق لئے

۶۸ بند کے اس مرثیہ کی اس سے زیادہ تدوین (editing) کی نہیں جاسکتی۔ اسیرؔ فیض آبادی نے اتنے مربوط بند کہے ہیں کہ بند کم کئے جائیں تو تاریخ کا تسلسل باقی نہیں رہتا۔ —— پھر بھی راقم السطور نے کوشش کی ہے کہ اسیرؔ فیض آبادی نے مجلسوں کی جو تاریخ بیان کی ہے اور مجلسوں کے مقاصد و اثرات کے سلسلے میں پر پیغام دیا ہے وہ باقی رہے۔

☆☆☆☆☆

یاور اعظمی:- (کراچی)

ولادت یکم مئی ۱۹۱۲ء (مزدوروں کا عالمی دن) وفات ۲۰۰۴ء

نام، سید یاور حسینؑ۔ تخلص یاور۔ وطن، موضع بہاؤالدین پور کندھیا، ضلع اعظم گڑھ۔ اعظم گڑھ کے حوالے سے اعظمی لکھتے ہیں۔

تعلیم، فیض آباد کالج سے ایف۔اے، عربی کالج سے منشی اور منشی کامل کی سندات حاصل کیں۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان آگئے، اکاونٹ جنرل پاکستان کے دفتر میں ملازمت کی۔ ۱۹۷۱ء میں ریٹائر ہو گئے۔ شاعری کا آغاز ۱۹۲۶ء (بعمر ۱۴ برس) ہوا۔ ابتدا غزل گوئی سے ہوئی۔ حکیم منے آغا آفتاب لکھنوی کے شاگرد ہوئے، علم عروض حاصل کیا۔ فکر کی لو تیز ہوئی اور دور تک دیکھنے کی توفیق ملی تو شاعری کا رُخ غزل سے سلام اور قصائد کی طرف مُڑ گیا۔ اب حسن لا فانی اور کمال بیکراں کی حمد و ثنا کرنے لگے تو محسوس ہوا کہ فکر کو منزل مل گئی۔ سوچ کی پرواز بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔ تفکّر کی راہوں پر اسلوب کا اُجالا پھیلا تو قصرِ مرثیہ نظر آیا۔ ۱۹۶۸ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ زیبا ردولوی نے نوک پلک درست کی اور یاور اعظمی کی زندگی میں مرثیے کا سورج طلوع ہو گیا۔ زیبا ردولوی کے انتقال کے بعد اس ماہ تفکّر نے سراج مرثیہ نگاری حضرت نسیمؔ امروہوی سے سلسلۂ تلمذ وابستہ کر لیا اور یاور اعظمی کے راستوں میں قدم قدم چراغ روشن ہو گئے۔

یاور اعظمی نے موضوعاتی مرثیے کہے ہیں۔ اُن کے مراثی میں دبستان نسیمؔ کے لوازمات

ملتے ہیں۔ وہ مرثیہ کی ابتدا کسی موضوع، کسی عنوان کے تحت کرتے ہیں اور عنوان کی وضاحت کے بعد کربلا کے کسی کردار یا واقعہ سے مربوط کر دیتے ہیں اس طرح ہر مرثیہ میں تسلسل کی فضا قائم ہوتی ہے اور واقعات ایک دوسرے سے مربوط کلائمکس کی طرف بڑھتے ہیں۔ اُن کے مراثی توحید ایمان، حسن، اطاعت، اخلاق، وغیرہ اس صفت کے عکاس ہیں۔ یاور اعظمی کے ایک مرثیے "اخلاق" کے کچھ بند درج ذیل ہیں جو اس صفت کے معیار کا پتہ دیتے ہیں۔ اس مرثیے "اخلاق کی وضاحت کے بعد۔ خُلق نبوی، خُلق حسنؑ، خُلق حسینؑ کے بعد حضرت قاسمؑ کے اخلاق کا تذکرہ اور پھر کربلا، اور قاسم کی شہادت۔

اخلاق ہے اک حق و صداقت کی کہانی — اخلاق ہے اک عظمت کردار کا بانی
اخلاق ہے اک اسوۂ عزت کی نشانی — اخلاق ہے اک عہد شرافت کی جوانی ۱
اک فصل مسلسل کی کڑی کہتے ہیں اس کو
تسبیح مودت کی لڑی کہتے ہیں اس کو

اخلاق کی خوشبو سے خجل مشک ختن ہے — اخلاق سے سرسبز مودت کا چمن ہے
اخلاق کی ضو غیرت پروین و پرن ہے — اخلاق ہے اک شمع کہ لو جس کی تخن ہے ۲
دنیا میں یہ انسان کی عظمت کا نشاں ہے
اخلاق ہے وصف اس کا جو خالق کی زباں ہے

فکر و نظر و علم و عمل جن کا خزانہ — اخلاق کی دنیا میں محمدؐ ہیں یگانہ
تسبیح میں خود جس کی ہے تسبیح کا دانہ — خم جن کی سلامی کے لئے سارا زمانہ ۳
آئینہ فطرت میں تواضع سے جلا ہے
اخلاق الٰہی صفت نور ملا ہے

اس کے بعد چند بند اخلاقِ نبوی اور اخلاقِ مرتضوی پر اور پھر۔

یہ صورتِ شبیرؑ ہیں ہمشکل پیمبرؐ — حیدرؑ کی طرح پیکر اخلاق ہیں شبرؑ
ہے لذت گفتار فدا جس کی زباں پر — اک پھول ہے اس باغ کا قاسم سا گل تر ۴
پُرنور جو اخلاق محمدؐ سے جبیں ہے
مانند حسنؑ ان کی ہر اک بات حسین ہے

یاور اعظمی کا ایک اور مرثیہ ''شجر گلشن ہستی کا گُل تر ہے پسر'' بھی موضوعاتی مرثیہ ہے جس کا عنوان پسر یا فرزند ہے، اس مرثیے میں بھی ارتباط کا وہی انداز ہے ۔

شجر گلشن ہستی کا گُل تر ہے پسر زندگی جس سے سنورتی ہے وہ زیور ہے پسر
میوۂ دل ثمر رحمتِ داور ہے پسر ۱ باپ کا نورِ نظر ماں کا مقدر ہے پسر
اس کے رخساروں پہ سبزہ جو عیاں ہوتا ہے
باپ کا عزم ضعیفی میں جواں ہوتا ہے

وہ مکاں قبر سے بدتر ہے یہ گُل جس میں نہیں ہاتھ مفلس کا ہے جس میں یہ نہیں وُہ نگیں
جان دیتا ہے جہاں جس پہ یہی ہے وہ حسین عام اور خاص کی تخصیص نہیں اس میں کہیں
اپنے اللہ سے سب نے یہ دعا مانگی ہے
اس کی ہر ایک پیمبر نے دعا مانگی ہے

مہرباں کب نہیں بندوں پہ ہوا ربّ علا ذکریاؑ اور ابراہیمؑ نے کی تھی یہ دعا
ان کی یحییٰؑ ملے اِن کو ہوئے اسحٰقؑ عطا ۱۰مرتبہ کم نہ تھا کچھ ان سے مرے مولا کا
کی دعا جس کے لئے دل سے وہ دل بند ملا
حق سے شبیرؑ کو سجادؑ سا فرزند ملا

ایسا فرزند جو سرتاج عبادت ٹھہرا عابد و زاہد و دلدادۂ طاعت ٹھہرا
اپنے بابا کی طرح جانِ رسالت ٹھہرا ۱۱ مثل حیدر ہوا مطلوب امامت ٹھہرا
عدل وانصاف بڑھے ہاتھوں میں کلیجے ہل جائیں
بولنے والوں کی ہونٹوں سے زبانیں سل جائیں

ہے جو آئینہ بکف سامنے خط تقدیر گود میں لے کے تڑپ جاتے ہیں ان کو شبیرؑ
چومتے ہیں کبھی ابرو کو تو چل جاتے ہیں تیر ۲۴ پیچ در پیچ نظر آتی ہیں زلفِ زنجیر
نیچے گردن کے جو ہنسلی پہ نظر جاتی ہے
طوق یاد آتا ہے اور روح تڑپ جاتی ہے

عصرِ عاشور دکھا دیتی ہے چہرہ اپنا صاف آتا ہے نظر جس میں یہ بیکس تنہا
ہاتھ جکڑے ہوئے ملبوسِ بدن خوں میں بھرا ۲۵ پا بہ زنجیر قبا چاک گریباں پھٹا

کوئی ہمدم ہے نہ مونس نہ شناسائی ہے
ظلم کی فوج ہے اور عالم تنہائی ہے

اور پھر یہ پسر کربلا میں ہے، علیل ہے، جنگ میں شرکت سے معذور ہے۔ بعد شہادت حسینؑ طوق و زنجیر میں اسیر ہے۔ بیبیوں کا قافلہ سالار ہے۔ کوفہ و شام کے بازاروں میں، یزید کے دربار میں ماں بہنوں کو ننگے سر دیکھتا ہے۔ یاور اعظمی کی چشم تصور تاریخ کے جھروکوں سے یہ سب کچھ دیکھتی ہے اور یاور اعظمی کا احساس اور محتاط قلم سب کچھ قلمبند کرتا ہے— اہل بیت کو قید کر دیا جاتا ہے۔ حادثۂ بلیک ہول، پرشور مچانے والے کہیں یہ ذکر نہیں کرتے کہ اہل بیت رسول کو جس قید خانے میں اسیر کیا گیا تھا اس میں کتنی گھٹن تھی۔ اس حبس اور گھٹن میں حسینؑ کی چار سالہ، بچی سکینہ مرگئی، یاور اعظمی کے قلم صداقت رقم کو ہمارا اسلام ہو کہ انہوں نے جو بین لکھے ہیں اس میں کہیں خاندان رسول کے صبر کے منافی کوئی لفظ نہیں ہے۔

پھر نہ باقی رہا جینے کا قرینہ افسوس
مرگئی قید میں رو رو کے سکینہ افسوس

لے کے آغوش میں میت کو جو چلائیں رُباب بی بیاں رُونے لگیں ہوگئیں زینبؑ بیتاب
نالہ و آہ سے ہر اک کا کلیجہ ہوا آب ۸۱ ہائے وہ وقت کہ جب غسل و کفن تھا نایاب

کھود کر چھوٹی سی اک قبر وہیں زنداں میں
دفن میت کو کیا اس کے پھٹے داماں میں

لاشِ ہمشیر کو جب گاڑ کے اُٹھے مولا کھینچی وہ آہ کہ ہر اک کا کلیجہ تڑپا
خاکِ تربت کی طرف دیکھ کے بولے آقا ۸۲ بحفاظت میرے بابا کی امانت رکھنا

جب سے بچھڑے شہِ دیں مضطر و دلگیر ہے یہ
گود میں رکھیو اسے دخترِ شبیرؑ ہے یہ

زخم آئے ہیں طمانچوں کے کہیں دُکھنے نہ پائیں آئیں شبیرؑ تو آہستہ سے گودی میں اٹھائیں
روتے روتے ابھی سوئی ہے فرشتے نہ جگائیں ۸۳ جاگ بھی جائے تو بہلا کے اسی طرح سُلائیں

عرش کانپے گا زمیں لرزے گی آفت ہوگی
یہ اگر چونک کے روئی تو قیامت ہوگی

☆☆☆☆☆

صفی حیدر دانشؔ :- (راولپنڈی)

ولادت ۱۴ر جون ۱۹۱۳ء۔ وفات ؟

نام سید صفی حیدر، تخلّص دانشؔ، وطن بریلی (یو۔ پی)، والد گرامی سید قاسم جان بریلی کے صاحب ثروت زمیندار تھے۔ دادا امیر عوض علی لکھنؤ سے بریلی آکر بس گئے تھے، اس طرح صفی حیدر دانش لکھنوی سے بریلوی ہو گئے۔: بریلی کالج سے بی۔ اے اور ایم۔ اے کیا اور اسی کالج میں لیکچرار مقرر ہو گئے۔ ۱۹۳۸ء میں ناگپور یونیورسٹی سے ایم۔ اے اُردو کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ ناگپور یونیورسٹی سے ہی ایم۔ اے (فارسی کی سند حاصل کی۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان آگئے اور گارڈن کالج راولپنڈی میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۷ء میں صدر شعبہ اُردو ہوئے اور ۱۹۷۷ء میں ریٹائر ہو گئے۔

پروفیسر صفی حیدر دانشؔ نے حیرت انگیز طور پر آٹھ برس کی عمر سے مصرع موزوں کرنے شروع کر دئے تھے۔ اور چودہ برس کی عمر سے باقاعدہ غزل کہنی شروع کر دی تھی، ابتدا میں ہادی علی رواںؔ کے شاگرد ہوئے اور ''غافلؔ''، تخلّص اختیار کیا، ۱۹۴۰ء تک اسی تخلّص کے ساتھ شعر کہتے رہے کہ حضرت ماہرؔ القادری کی نگاہِ دور بیں نے صفی حیدر کی ذہانت و دانش کو پہچان کر دانش تخلّص تجویز کیا اور حضرت ''غافلؔ'' ۱۹۴۰ء میں ''دانشؔ'' ہو گئے۔

صفی حیدر دانشؔ اُن گنے چنے شعراء میں سے ہیں جنہیں اُردو اور فارسی، دونوں زبانوں میں شعر کہنے پر قدرت حاصل رہی ہے۔ شاعری کی مختلف اصاف میں شعر کہے ہیں۔ غزل، نظم، سلام، منقبت، نوحہ ہر میدان میں صفی حیدر دانشؔ کامیاب شاعر ہیں۔ مرثیے کی منزل پر آئے تو دانشورانہ انداز اختیار کیا اور موضوعاتی مرثیے کہے۔ مرثیہ گوئی میں وہ تعداد (Quantity) پر Quality کو ترجیح دیتے ہیں اسی لئے زور گو شاعر ہونے کے باوجود زیادہ تعداد میں مرثیے نہیں کہے، مگر جو دو چار مرثیے کہے وہ تاریخ مرثیہ گوئی میں درج ہو گئے، ان کا پہلا مرثیہ ۔

''نگاہ شوق ہے پھر کامیاب کیا کہئے'' ہے۔ جس کی ابتدا ایک نظم ''اشک مسرت'' کی صورت میں ۱۹۴۶ء سے ہوئی لیکن اس میں باقاعدگی ۱۹۶۴ء میں آئی —— یہ مرثیہ اس اعتبار سے دیگر مراثی سے مختلف ہے کہ اس کی ابتدا امام حسینؑ کی ولادت باسعادت سے ضرور ہوئی ہے لیکن یہ ولادت محض ایک مسرتوں کے جشن کا سامان فراہم نہیں کرتی بلکہ ایک نئے دور کا آغاز کرتی ہے۔

امام حسینؑ کی ولادت کو صفی حیدر دانش نے ایک انقلاب کی طرف پہلا قدم قرار دیا ہے۔ ایک نئے نظریہ حیات کا آغاز کیا ہے جو زندگی کو حسینؑ نے دیا۔ ولادت امام حسینؑ سے کردار حسینؑ تک آتے آتے صفی حیدر دانش نے اس نظریہ حیات کی مختلف جہات کی نشاندہی کی ہے اور اس طرح یہ مرثیہ ایک درس بن گیا ہے۔ ایک نئے نظام حیات کی خوش خبری نظر آنے لگا ہے۔

شراب تلخ ہے ہستی مگر حرام نہیں جو ٹوٹے سنگِ حوادث سے یہ وہ جام نہیں
بہارِ حسنِ یقیں ہے خیالِ خام نہیں حیات ایک حقیقت ہے صرف نام نہیں
نظر کا نور دلوں کا وقار کہتے ہیں
اسے امانتِ پروردگار کہتے ہیں

کھلا کہ رازِ بقا عزم استوار میں ہے جو امرِ خیر ہے بندے کے اختیار میں ہے
تمام امن و سکوں قلبِ بے قرار میں ہے شہادتوں کا چمن تیغ شعلہ بار میں ہے
سپہر فضل پہ اک اخترِ سعید ہے یہ
بساطِ گل نہیں قربانیوں کی عید ہے یہ

اسی نظام حیات اور نظام فکر میں غم کو دلیل تولاّ اور پیام سعادت کہہ کر صفی حیدر دانش نے غم حسینؑ کی ابدیت کا اعلان کیا ہے۔

حقیقتوں سے جو پردہ اُٹھا دیا اُس نے نگاہِ دہر کو حیراں بنا دیا اُس نے
جہاں کچھ اپنا کرشمہ دکھا دیا اُس نے ہر ایک درد کو دل سے بُھلا دیا اس نے
کنارِ شوق نے نازوں سے اس کو پالا ہے
یہ کار سازِ خرد ہے خرد سے بالا ہے

یہ غم دلیلِ تولاّ یہ غم ثبوتِ وفا یہ غم پیامِ سعادت یہ غم نظامِ صفا
یہ غم ہے نورِ بصیرت یہ غم دلوں کی ضیا یہ غم عطائے خدا ہے یہ غم خدا کی رضا
دلوں کو بارِ گراں سے رہا کیا اس نے
کہ فرضِ اجرِ رسالت ادا کیا اس نے

یہ غم عمل کا نمونہ بھی ہے پیام بھی ہے زمین نواز بھی ہے آسماں مقام بھی ہے
اک ابتری ہے بظاہر مگر نظام بھی ہے غمِ امام ہے ہر غم کا یہ امام بھی ہے

نظیر اس کی نہیں کوئی بے نظیر ہے یہ
جوان و پیر کا مشکل میں دستگیر ہے یہ

غم اور بھی ہیں جہاں میں نہیں ہے جن کا شمار وہ رنگ لائیں تو ہوجائے زندگی دشوار
کچھ ایسے غم ہیں جو بنتے ہیں علت و آزار جو شر کو کرتے ہیں زار و معطّل و بیکار
غمِ حسینؑ مگر غم کچھ اور شان کا ہے
تمام غم ہیں زمیں کے یہ آسمان کا ہے

پروفیسر صفی حیدر دانش نے جو فکر اس مرثیے میں پیش کی ہے وہ ایسی نہیں کہ جسے پہلے کسی نے پیش نہ کیا ہو مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی بات کہنے کا ڈھنگ جانتے ہیں۔ اور اسلوب پر اختیار رکھتے ہیں۔ پروفیسر دانش مرثیوں میں اختصار کے قائل ہیں اور وحید الحسن ہاشمی کے ہمنوا ہیں یا وحید الحسن ہاشمی اس بات پر اُن کے ہم نوا ہیں کہ آج کی مصروف زندگی میں طویل مرثیے سننے کا وقت نہیں ہے لہٰذا صنف مرثیہ گوئی کی بقا کے لئے ضرور ہے کہ مراثی کو مختصر کیا جائے — (یہ اُن کی رائے ہے کلیہ نہیں)۔ وہ ایک مسلم ادیب بھی تھے۔ "تصوّف اور اُردو شاعری" اُن کے گراں قدر مقالوں پر مشتمل کتاب جو ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی تھی اُنہیں ادیب و نقاد ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ ادب میں اُن کی جہتیں دیکھ کر ماہر القادری کی فراست کا قائل ہونا پڑتا ہے جنہوں نے صفی حیدر کو دانش تخلص دیا۔ دانش کسی ایک دائرہ کار میں محدود نہیں ہوسکتی۔ صفی حیدر دانش بھی ادب کی کسی صنف میں محدود نہیں ہیں۔

☆☆☆☆☆

شبّیر کا غم دل کو جلا دیتا ہے
غم ہائے زمانہ سے چھڑا دیتا ہے
مولا ہے تیرے نام میں کتنی تاثیر
جو سُنتا ہے سر اپنا جھکا دیتا ہے

(سید عاشور کاظمی)

"دبستانِ کراچی" (آئینۂ امروز)

(ترتیب سنہ ولادت کے حوالے سے)

مقبول حسین خاں نیّر:- (کراچی)

ولادت ۱۹۰۵ء۔

نام مقبول حسین خاں، تخلّص نیّر۔ جائے ولادت بارہ بنکی (یوپی)۔ جنگ آزادی کے رہنما تجمل حسین کے پوتے۔ ریاست "بھنوامئو" کے رئیس تہور حسین خان کے فرزند — عربی فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ۱۹۳۱ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے B.A کیا — ابھی نتیجہ بھی نہیں آیا تھا کہ سرکاری ملازمت میں آگئے۔ ہردوئی میں تحصیلدار ہوکر چلے گئے۔ ۱۹۳۴ء میں لاہور سے منشی فاضل کی سند حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء میں حیدر آباد دکن میں الیکشن آفیسر بلدیہ مقرر ہوئے مگر حالات کی خرابی کے باعث ۱۹۴۸ء میں کراچی آگئے اور مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔

۱۹۲۰ء میں مقبول حسین خاں نیّر نے شاعری کی ابتدا کی، مہدی حسین ناصری کی شاگردی کی۔ کچھ غزلیں کہتے رہے۔ ۱۹۳۵ء میں ایک نظم "حسینؑ خدا کے حضور" کہی جو بہت مقبول ہوئی۔ ۱۹۵۹ء میں شدید لکھنوی کراچی آئے اور ڈاکٹر یاور عباس کے گھر پر ایک مرثیہ پیش کیا۔ نیّر بھی حامد لکھنوی کے ساتھ شدید لکھنوی صاحب سے ملنے گئے اور اپنی نظم سنائی تو حضرت شدید لکھنوی نے فرمایا کہ مرثیہ کہنا شروع کردو۔ لہٰذا ۱۹۵۹ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ "یثرب کے میکدے میں عجب صبح و شام ہے"۔ نیّر واقعات کربلا کو داستان کے طور پر بیان نہیں کرتے بلکہ اُس کے اسباب و علل پر بحث کرتے ہیں۔ ۶۱ ہجری میں کفر و نفاق اسلام کو برباد کرنے مدمقابل آگیا تھا۔ ایسے وقت میں امام نے جو کیا وہ نہ کرتے تو کیا کرتے؟ اُن کا اقدام وقت کی ضرورت تھا۔ توحید۔ قرآن اور ختمی مرتبت کی سچائی سے وقت کا بادشاہ یزید انکار کررہا تھا۔ امام حسینؑ نواسۂ رسولؐ کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔

دنیائے شام، دین سے آمادۂ ستیز — احکام حق سے نفس پرستوں کا وہ گریز
تبدیل فقہ میں وہ فقیہوں کی رست خیز — اس پر یزیدیت کی نگاہیں وہ تیز تیز
قرآن کے ساتھ ساتھ خزانوں کو کھول کے
بنتی تھی شرح نفس کی میزاں میں تول کے

ظلمت گری کی حق کے نگینوں پہ یورشیں بدعت گری کی حق کے قرینوں پہ یورشیں
غارت گری کی حق کے سفینوں پہ یورشیں دولت گری کی حق کے امینوں پہ یورشیں
ایماں پہ حرب، حاصلِ ایماں کے سامنے
قرآن پہ ضرب شاملِ قرآں کے سامنے

مقبول حسین نیّر نے بھی رخصت اور شہادت کے باب میں اہلِ حرم کی گریہ وزاری کو ناپسند کیا ہے، اُن کا بھی یہی کہنا ہے کہ وہ عظیم ہستیاں اتنی کمزور نہ تھیں کہ مصائب پر سر پیٹتی اور آہ وبکا کرتیں یا بین کرتیں ۔

ہو اُن کا نظم وضبط، قیامت کی وہ گھڑی زاری کہاں کی اور کہاں کی دھڑا دھڑی
اک اک نظر سیاستِ شبیر پر گڑی ایک ایک فرد عروۂ وثقیٰ کی اک کڑی
لٹنے کا غم، نہ خوف مزید امتحان کا
اک سلسلہ تھا عزمِ حسینی کی شان کا

مقبول حسین خان نیّر کا ایک اور مرثیہ ''برہمی دہر میں ہے عالم بالا میں سکوت'' ناموسِ رسولؐ کے صبر و برداشت کی منظر کشی بھی ہے اور غم کی وسعت بھی جو ارض وسما پہ محیط ہے، اس مرثیے میں، دربارِ یزید میں سیدہ زینب کی حاضری کو نظم کیا ہے ۔

برہمی دہر میں ہے، عالم بالا میں سکوت دیدۂ نم کی طرح نم ہے حجابِ جبروت
بزمِ ماتم سے ہم آہنگ ہے بزمِ ملکوت [۱] محبسِ شام میں لرزاں ہے چراغِ لاہوت
قید خانہ وہ سیاہ پوش باندازۂ غم
اور وہ ماتم کی صدا صورت خمیازۂ غم

دھندلا دھندلا ہے تخیل تو پریشاں ہے دماغ سایۂ ابر ہے یا دامن گیتی پہ ہے داغ
صاف بد رنگ نظر آتے ہیں انجم کے ایاغ [۱۱] شعلۂ شمع ہے تاریک بجھا کون چراغ
چادریں چھن گئیں کن سوختہ سامانوں کی
شرم سے آنکھیں نہیں اُٹھتی ہیں پروانوں کی

شمعیں جل جل کے بجھی جاتی ہیں اللہ رے غم بن گئی ہے شبِ مہتاب لباسِ ماتم
اک کھٹک ہوتی ہے ہر قلب میں مبہم مبہم [۱۰] سامعہ مسطِ غم، چشمِ تخیل پُر نم

نوحۂ غم کی کسک دہر کے ہر ساز میں ہے
گریۂ بنتِ علیؑ وقت کی آواز میں ہے

کون، وہ بنتِ علیؑ وارثِ افکارِ حسینؑ　　زینبؑ خستہ جگر فاطمہؑ کی روح کا چین
لب تو خاموش، نگاہوں سے اُبلتے ہوئے بین[۱۴]　　رسنِ ظلم کے گرداب میں روحِ ثقلین

وقتِ گفتار، کتابِ ازلی کی صورت
وقتِ کردار، حسینؑ ابن علیؑ کی صورت

ہائے وہ وقت بلاخیز، وہ دربارِ یزید　　ذہن مذہب میں سمائے ہوئے افکارِ یزید
فکر انساں سے نمودار وہ آثارِ یزید[۲۱]　　وہ بھری بزم میں قرآن سے انکارِ یزید

اس بھری بزم میں صدہا تھے مسلماں موجود
کچھ مسلماں ہی نہیں، حافظِ قرآں موجود

تھا خلیفہ کا یہ اعلان کہ مذہب ہے فضول　　وحی اک وہم ہے، اک ڈھونگ فرشتوں کا نزول
ذہنِ مفلوج کی باتیں ہیں خدا اور رسولؐ[۲۳]　　اپنے ہی دل سے محمدؐ نے گھڑے تھے یہ اصول

کفر پرور یہ کلام اور مسلماں سن لیں
کچھ مسلماں ہی نہیں حافظِ قرآں سن لیں

طاقت کے نشے میں سرشار یزید کہتا ہے عمر سعد کہاں ہے، اسے کہو آئے اور کربلا میں کیا کیا ہوا وہ بتائے کہ۔

کس طرح کشتیِ اسلام کے لنگر ٹوٹے　　بحرِ شمشیر کے پیراک تھے کیوں کر ڈوبے

دربار میں سناٹا چھا گیا۔ کرسی نشینوں کے گویا ہونٹ سل گئے تھے۔ سب خاموش تھے لیکن:

''رہ سکیں حضرت زینبؑ نہ زیادہ خاموش''

مقبول حسین خاں نیرؔ نے حق ادا کر دیا، جناب زینبؑ کی زبانی پورے منظوم واقعاتِ کربلا بیان کرائے مگر وقارِ زینبؑ عروج پر رہا۔ بنی ہاشم کی رخصت، جنگ، شہادت کا منظوم بیان پڑھنے یا سننے والا آنسوؤں پر قابو نہیں پا سکتا۔ کربلا کے واقعات کے بعد اہل حرم کی اسیری سے دربارِ یزید تک آنے کے سارے حالات اس مرثیے میں نظم کئے ہیں۔

یہ جو اک ننھی سی بچی ہے رسن بستہ گلو　　تین دن پانی کی ایک بوند کو ترسی لبِ جو

تکتی ہے دہلی ہوئی نظروں سے کیسا ہر سُو رنگ اُڑا جاتا ہے کانوں سے جو رستا ہے لہو
جرم بھی اس کا سنو جس کی سزا تھی اتنی
باپ کی لاش پہ روتی تھی خطا اتنی تھی

اور پھر اہل دربار کو مخاطب کر کے ارشاد فرماتی ہیں ۔

جانِ زہراؑ و علیؑ اور ہو گردن زدنی قلبِ تصویرِ پیمبرؐ میں ہو برچھی کی اَنی
سر کٹانے کی رہِ حق میں سزا بے کفنی[۷۳] خیمۂ صاحبِ لولاک لما سوختنی
کیا محمدؐ کے گھرانے سے محبت ہے یہی؟
شرم آتی نہیں؟ کیا اجرِ رسالت ہے یہی؟

اہلِ بیتِ نبوی اور رسن کے شایاں گردنِ عابدِ بیمار میں ہو طوقِ گراں
دیکھتے ہو میرے شانوں پہ یہ دُرّوں کے نشاں[۷۴] بزمِ میخار کہاں اور سرِ معصوم کہاں
تم پیمبرؐ کے بنائے سے بھی انساں نہ بنے
حفظ تو کرلیا قرآن، مسلماں نہ بنے

ہوش میں آؤ ذرا ہوش میں اہلِ دربار کلمہ گو بھی ہو محمدؐ کے، ہے یہ بھی اقرار
اور پھر فاسق و فاجر ہے تمہارا سردار[۷۵] لٹ گئی دیکھو تمہارے ہی نبیؐ کی سرکار
نائبِ احمدِ مختار کسے مان لیا
کیا کیا تم نے اولی الامر کسے مان لیا

☆☆☆☆☆

بیدار نجفی:- (کراچی)

ولادت ۱۷ اپریل ۱۹۱۱ء

نام، میر عباس علی۔ تخلص بیدارؔ۔ وطن حیدر آباد دکن۔ اِن کے والد گرامی میر امیر علی نجفی حیدر آباد کی ممتاز شخصیت تھے جو نظامِ حیدر آباد کے بھائی صلابت جاہ کے اتالیق تھے۔ بیدارؔ نجفی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد گرامی کے زیرِ تربیت ہوئی۔ بعد ازاں منشی کا امتحان پاس کیا اور حیدر آباد (دکن) میں محکمہ پولیس میں بھرتی ہو گئے۔ ۱۹۶۶ء میں پاکستان آ گئے۔

بیدارؔ نے ۱۶ برس کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔ آغاز غیر معمولی نہیں تھا۔ غزل گوئی

میں جلیل مانک پوری کے شاگرد ہوئے۔ بعدازاں اُن کے سلسلۂ تلمذ پر اختلاف رائے ہے۔ ایک رائے ہے کہ وہ نجم آفندی کے شاگرد ہوئے۔ دوسری اطلاع ہے کہ وہ انہوں نے میر محمد علی مسرور سے سلسلۂ تلمذ وابستہ کیا۔

"بیدار نے ۱۶ برس کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔ جلیل مانک پوری کی شاگردی اختیار کی اُن کے انتقال کے بعد نجم آفندی کے شاگرد ہو گئے"　(اُردو مرثیہ پاکستان میں۔ ص، ۴۱۲)

دوسری رائے دکن کے عصر حاضر کے ممتاز مرثیہ نگار باقر امانت خوانی کے حوالے سے ہے۔ اُنہوں نے (اپنے ایک مکتوب بنام بلال نقوی مرقومہ ۳ر فروری ۱۹۸۱ء میں) لکھا ہے جو وہ اپنے استاد میر محمد علی مسرور کے بارے میں لکھ رہے تھے:

مسرور کی مرثیہ نگاری معاصرین میں ممتاز درجے کی حاصل رہی ہے ...... اُنہوں نے تقریباً ۲۰ مرثیے تصنیف کئے ہیں .... ان کے شاگردوں میں راقم الحروف کے علاوہ فغاں مرحوم، حیدر علی ضیا۔ تقی عابدی، سرتاج مرحوم، بیدار نجفی، راز عابدی، خیرات حسین ناطق وغیرہ ہیں۔ خود مسرور صاحب میر اصغر حسین ناجی کے شاگرد تھے"

(بیسویں صدی اور جدید مرثیہ۔ ص ۳۲۱)

بیدار نجفی نے غزل کے علاوہ قصیدہ، سلام، منقبت، رباعی، ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن پہلا مرثیہ ۱۹۷۳ء میں کہا جس کا عنوان "حسینؑ یثرب سے کربلا تک" تھا اور موضوع مصرع اولیٰ سے ظاہر ہوتا ہے۔ "سنتا ر با بغور میں تاریخ کا بیاں" یہ مرثیہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جہاں سے کربلا کی تاریخ شروع ہوتی ہے یعنی امیر شام، یزید نے کوفے کے گورنر ولید کو خط لکھا کہ امام حسینؑ سے بیعت طلب کرو اور انکار کی صورت میں ان کا سر قلم کر دو۔ ولید نے امام کو یزید کا پیغام پہنچایا۔ حسینؑ نے انکار کیا۔ اور مدینہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ بس یہیں سے کربلا کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔

بیدار نجفی کے سامنے جو تاریخ تھی اور خانوادۂ رسالت کا کردار تھا، اور نمائندہ رسول مقبول وانبیاء کرام امام حسینؑ کی عظمت تھی۔ اُن تمام احساسات کے پیش نظر بیدار نجفی نے مرثیہ کہا۔

ممکن نہ تھا پیامِ یزیدی سے اتفاق شاہی تصوّرات تھے شاہانہ طمطراق
بنیاد جس کی بغض و حسد کینہ و نفاق روزوں کی تھی ہنسی تو نمازوں کا تھا مذاق
سبطِ نبیؐ کے دل پہ اسی کا ملال تھا
اسلام جاں بلب تھا بہت غیر حال تھا

پس امام حسینؑ نے بیعت سے انکار کر دیا۔ اور اس انکار کی وجہ بھی بتائی۔ امام حسینؑ نے ارشاد کیا تھا ''ہم جیسے اُس جیسوں کی بیعت نہیں کرتے'' اسکی وضاحت بیدار نجفی کے الفاظ میں یوں ہوتی ہے۔

طینت ہماری نور، وہ ہے تیرگی سرشت سیرت ہماری نیک ہے اعمال اُس کے زِشت
ہم دُرِ بے بہا ہیں، وہ ہے مثلِ سنگ وخشت دوزخ ٹھکانا اُس کا ہم آسودۂ بہشت
تخلیقِ کائنات ہمارے سبب ہوئی
ہم نے وہی کیا ہے جو مرضیٔ رب ہوئی

قائم کروں گا عدل و مساوات کا نظام انسان کیوں رہے کسی انسان کا غلام
کرتا نہیں یزید حقائق کا احترام میں خوب جانتا ہوں زمانے کا ہوں امام
کیسے پسند آئے گا میرے مزاج کو
ٹھکرا دیا تھا بھائی نے جس تخت و تاج کو

امام حسینؑ کو اس انکار کا انجام معلوم تھا۔ لیکن وہ مدینۃ الرسول میں خون بہانا نہیں چاہتے تھے۔ لہٰذا اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ مدینہ چھوڑ دیں—— بیدار نجفی کا ذہنِ بیدار تاریخ کے ساتھ ساتھ ہے۔ امام کی مدینے سے رخصت کا منظر بھی بیدار نے نظم کیا ہے ۔

ناز و نعم سے گود کے پالے بھی ساتھ ہیں آنکھوں کا نور دل کے اُجالے بھی ساتھ ہیں
مردانِ روز گار جیالے بھی ساتھ ہیں ان سب میں ایک ہنسلیوں والے بھی ساتھ ہیں
کلثومؑ اور حضرتِ زینبؑ سفر میں ہیں
اہلِ حرم بھی خدمتِ عالی گہر میں ہیں

اور اس طرح جو کچھ تاریخ بیدار نجفی کو سنائی گئی وہ اسے نظم کرتے چلے گئے۔ لہٰذا اس

مرثیے میں مدینے کے سفر سے کربلا تک کی تاریخ نظم ہوئی ہے۔ اُن کے دو مرثیوں کا مزید سراغ ملتا ہے۔ جن میں سے ایک ۱۹۷۷ء میں کہا گیا۔ یہ دوسرا مرثیہ ہوا جس کے مطلع کا مصرع اولیٰ ہے۔ ''وہ شب جو شام غریباں کی تیرگی سے اُٹھی'' اور تیسرا مرثیہ ''دور حاضر کی نگاہوں میں ہے سب کی تاریخ'' اس کے بعد شاید کوئی چراغ نہیں جلا۔

☆☆☆☆☆

شوق نونہروی:- (کراچی)

ولادت یکم جولائی ۱۹۱۱ء۔

خاندانی نام محمد طٰہٰ۔ اضافی نام، حاجی سید محمد طٰہٰ حسینی۔ قلمی نام ابن آدم شوقؔ نونہروی جائے پیدائش ووطن، قصبہ نونہرہ ضلع غازی پور۔ (یوپی)۔ والد کا اسم گرامی، سید محمد جوادؔ المتخلص جوادؔ نونہروی ــــ دادا کا نام نامی، حکیم سید محمد ہادی محشرؔ نونہروی، گویا شعروسخن شوقؔ نونہروی کو ورثے میں ملے ہیں۔ شوقؔ نونہروی کی ایک پہچان اُن کے والد گرامی کے ماموزاد بھائی ممتاز عالم دین اور خطیب بے مثال علامہ ابن حسن نونہروی صاحب قبلہ کا نام نامی ہے۔

اوائل عمری میں شوقؔ نونہروی نے مشق سخن شروع کی۔ سید علی محمد عرشؔ نونہروی سے اصلاح لی ــ اور پھر انقلاب زمانہ دیکھیئے کہ شاعر ابن شاعر نوجوان سید محمد طٰہٰ حسینی شوقؔ نونہروی ۱۹۴۲ء میں فوج میں بھرتی ہو گئے ــــ یہ فوج برطانوی فوج تھی جسے British India Army کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے ــــ اور جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان معرض وجود میں آیا تو ابن آدم شوقؔ نونہروی نے آزاد پاکستان کی فوج میں آنے کو ترجیح دی اور پاکستان منتقل ہو گئے جہاں ۱۹۸۰ء تک اپنے فرائض منصبی ادا کرتے رہے اور ۱۹۸۰ء میں باقاعدہ ریٹائر ہوئے۔ ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد مشق سخن کی طرف باقاعدہ توجہ دی اور خاندانی علم وآگہی کی پیروی کی۔ نوحہ، سلام، منقبت تو دوران ملازمت بھی کہتے رہے لیکن پہلا مرثیہ ''ماں'' ۱۹۸۳ء میں کہا۔ یہ ۵۱ بند کا مرثیہ ہے ابتدا 'ماں' کے اوصاف سے ہوتی ہے اور انتہا اس ماں کی عظمت کے بیان ہے۔ ''آنکھوں سے صاف کرتی ہے جو قتل گاہ کو'' اور یہ ماں سیدہ فاطمہ زہراؑ ہے۔

ماں بالیقین رحمتِ پروردگار ہے ماں اک عظیم دولتِ پروردگار ہے
ماں اک دلیلِ عظمتِ پروردگار ہے ماں، منتہائے حکمتِ پروردگار ہے

ماں اک شعور بندگیٔ عقل و ہوش ہے
موجِ صبا ہے، حسنِ شفق ہے، سروش ہے

ماں، درس گاہ حق کا حیات آفریں پیام ماں باپ زندگی کا مقدس ترین نام
خمخانۂ الست کا گویا لطیف جام[۲] تسبیح زندگی کے لئے مستند امام

شفقت ہے، مامتا ہے، محبت ہے، پیار ہے
فطرت کے ہر اصول کی آئینہ دار ہے

قدرت کا اک حسین نمونہ ہے ماں کی ذات یعنی کمالِ مریم و سارا ہے ماں کی ذات
ہر غم میں ہر خوشی میں سہارا ہے ماں کی ذات[۱۹] فطرت کا لازوال عطیہ ہے ماں کی ذات

کس ماں کی معرفت پہ بھلا گفتگو کریں
"دامن نچوڑ دے تو فرشتے وضو کریں"

ماں، عطر بیز موجِ نسیمِ بہار کی ماں اک لطیف رَو ہے سکون و قرار کی
ماں کا وجود خاص عطا کردگار کی[۲۱] سچ پوچھیے تو آخری منزل ہے پیار کی

ماں زندگی میں ایک نظامِ اصول ہے
مریم کہیں ہے اور کہیں بنتِ رسولؐ ہے

رویا جو نورِ عین تو ماں بلبلا اُٹھی جب مامتا پہ ضرب لگی تلملا اُٹھی
بیٹے پہ جان وارنے کو مامتا اُٹھی تڑپا جو دل، تو دل سے تڑپ کر دعا اُٹھی

نبضِ سلوک زیست کی رفتار بن گئی
بیٹے کے حق میں رحمتِ غفار بن گئی

ڈوبا ہوا ہے کرب میں کرب و بلا کا غم مائیں اُٹھائیں رہی ہیں جہاں مامتا کا غم
انصار کا کہیں، تو کہیں اقربا کا غم زہراؑ کے لال، سبطِ رسولِ خدا کا غم

یہ غم اگر محیط نہ ہو کائنات پر
پھر خاک اعتبار رہے گا حیات پر

"منج" ساخوش خصال تھا مولا کا اک ملنگ آقا سے کہہ کے ماں نے دلایا تھا اذنِ جنگ
چھلنی تھا تیغ و تیر سے غازی کا انگ انگ[۲۹] کھا کھا کے زخم اور بھی بڑھتی رہی اُمنگ

کونین کو حیات کے سانچے میں ڈھال کے
نصرت میں گویا رنگ بھرے تھے کمال کے

مسلم کے نونہال کے تیور کڑے کڑے ۔ پیچھے ہٹے ہیں جن سے لرز کر بڑے بڑے
تھراتے ہیں قبر میں مردے گڑے گڑے [۳۱] ۔ دیکھا یہ ماں نے خیمے کے در سے کھڑے کھڑے
بیٹا کہ سر سے پاؤں تلک خوں میں لال ہے
ماں کھل اُٹھی ہے، گویا خوشی سے نہال ہے

ماؤں میں ایک 'ابنِ جنادہؓ' کی ماں بھی ہے ۔ دکھیا کے پاس صرف یہی نقدِ جاں بھی ہے
نصرت کا ولولہ ہے تو ہمت جواں بھی ہے ۔ رقصاں ہے موت سامنے، دل شادماں بھی ہے
بیٹھی ہوئی ہے خاک پہ دامن کو جھاڑ کے
آباد اور ہوگئے بستی اُجاڑ کے

اس کے بعد وہب کلبی کی ماں، ابنِ سعید کی ماں، اور دیگر اصحاب حسینؑ کی ماؤں کے لئے ایک ایک بند کہنے کے بعد شوقؔ نوسہروی بنی ہاشم کی ماؤں کی طرف آتے ہیں۔ ؎

اک سمت ہے "سبابہ" بھی فدیہ لئے ہوئے ۔ بے چین ہے حیات کی دنیا لئے ہوئے
بیٹا بڑھو علیؑ کا سہارا لئے ہوئے [۳۶] ۔ جینے کے بعد مرگ تمنا لئے ہوئے
اسلام کی سپر ہو آقا کے سامنے
ماں سرخرو ہو فاطمہ زہراؑ کے سامنے

بیٹوں سے کہہ رہی تھی جگر گوشۂ بتولؑ ۔ ماں جائے کے ہیں خون کے پیاسے یہ سب جہول
یہ فوجِ اشقیا ہے تمہارے قدم کی دھول [۳۷] ۔ تم دونوں ہو نبیؐ و علیؑ کے چمن کے پھول
کل سب سے پہلے رن کو سدھارو تو خوب ہو
جاں اپنی ماموں جان پہ وارو تو خوب ہو

اور پھر مادرِ علی اکبر کے امتحانِ صبر کے ذکر کے بعد ؎

گودی سے ماں کی رن کو چلا ایک خورد سال ۔ مرنے کی ان اداؤں پہ عالم ہے پُر ملال
قربانیٔ حسینؑ کی ملتی نہیں مثال [۴۲] ۔ سوکھے لبوں سے جس نے کہی داستانِ حال

شمشیر سے بنائی لحد دیکھتے رہے
ایوبؑ، شہ کے صبر کی حد دیکھتے رہے

صد نازشِ حیات تھے ماؤں کے حوصلے رقصاں تھی موت اور چہکتے تھے منچلے
غلطاں تھے خاک و خوں میں جو آغوش میں پلے لرزاں تھی کائنات، یہ تھے دل میں ولولے
اس معرکے میں جان لڑانا ہی بات ہے
راہِ وفا میں موت بھی عین حیات ہے

وہ دشتِ کربلا، کہ تھا عنقا دلوں کا چین نرغے میں ظلم و جور کے ہیں مطمئن حسینؑ
گھوڑے سے گر رہا ہے محمدؐ کا نورِ عین[۴۹] میدان کربلا میں کوئی کر رہا ہے بین
تیروں پہ ہے نشیب میں میت تھمی ہوئی
ہیں ماں کی بیقرار نگاہیں جمی ہوئی

اس مامتا کی چاہ کی منزل نہیں کوئی اتنا متاعِ درد بھرا دل نہیں کوئی
اک بحرِ بے کنار کہ ساحل نہیں کوئی واللہ ماں کا مدِ مقابل نہیں کوئی
آنکھوں سے دل کی، دیکھیے اس ماں کی چاہ کو
بالوں سے صاف کرتی ہے جو قتل گاہ کو

شوقؔ نونہروی نے وقفے وقفے سے مزید چھ مرثیے کہے ہیں۔

(۲) ''روح بہارِ گلشن حیدر حسینؑ ہے''	۱۹۹۹ء	(احوال امام حسینؑ)
(۳) اے ابرِ طبع اپنی گہر باریاں دکھا	۲۰۰۰ء	(احوال حضرت قاسمؑ)
(۴) عزمِ جواں عروسِ سخن کو سنوار دے	۲۰۰۱ء	احوال حضرت حر
(۵) تبدیلیٔ مزاج کا لمحہ ہے انقلاب	۲۰۰۲ء	(انقلاب)
(۶) دلیلِ عظمتِ شبیرؑ ہے علی اصغر	۲۰۰۲ء	(احوال علی اصغر)
(۷) دل کی جو بات ہے آنکھوں سے عیاں ہوتی ہے	۲۰۰۳ء	(احوال حضرت حرؑ)

☆☆☆☆☆

جمیل نقوی:- (کراچی)

ولادت ۱۹۱۴ء۔

نام سید جمیل احمد۔ تخلص جمیلؔ۔ نقوی سید۔ وطن امروہہ۔ تعلیم۔ آگرہ یونیورسٹی سے ایم۔اے اُردو۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد کراچی آ گئے۔ حضرت نسیم امروہوی سے سلسلہ تلمذ وابستہ کیا۔ جمیل نقوی نے اپنا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔

دنیا میں عقائد کی ہمہ گیری ہے جو جس کا عقیدہ ہے وہ تقدیری ہے
اے اہلِ وطن میرے عقیدے پہ نہ جاؤ خلقت میری فاطمی ہے، شبیری ہے

سید ضمیر اختر نقوی نے لکھا ہے کہ:

"جمیل نقوی نے مرثیہ کہا ہے مگر وہ بحیثیت مرثیہ گو پہچانے نہیں گئے" (اُردو مرثیہ پاکستان میں ص ۴۲۴)

اس کے ایک سال بعد ممتاز نقاد ابوالخیر کشفی، جمیل نقوی کے متعلق رقم طراز ہیں:

"جمیل نقوی کی رثائی شاعری آنکھ سے ٹپکے ہوئے لہو کا دوسرا نام ہے، یہ اُن کا شرف ہے کہ اس لہو کو اُنہوں نے شاعری کا آہنگ عطا کیا ہے۔ جمیل نقوی کے مرثیے، کربلا سے متعلق اُن کی نظم، اور اُن کے سلام کسی مجلس کو گرمانے یا رونے رلانے کے لئے کہے گئے، اُنہوں نے تو اپنے لہو کی داستان رقم کی ہے اس لئے کربلا کی روداد "لہو رنگ" کے پس منظر کا پیش منظر خود اُن کی ذات ہے"

("روداد لہو رنگ" مطبوعہ ۱۹۸۳ء)

"روداد لہو رنگ" جمیلؔ نقوی کے مراثی کا مجموعہ ہے جسے ابوالخیر کشفی نے ترتیب دیا تھا اور ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۸۲ء میں شائع ہونے ولی کتاب "اُردو مرثیہ پاکستان میں" کے مصنف اور سید ابوالخیر کشفی کی آراء کا اختلاف دلچسپ ہے۔ جمیلؔ نقوی کی تصانیف وتالیف میں عظیم امروہوی نے آٹھ کتابوں کے نام لکھے ہیں جو "انتخاب اصغر"۔ "انتخاب میر" عمر خیام۔ انگریزی ناول کا ترجمہ۔ نعتوں کا مجموعہ۔ ذکر جمیل، قومی نظموں کا مجموعہ، پرچم کا ہلال جگمگایا، ہیں۔

جمیل نقوی کی مرثیہ گوئی کے متعلق اگر صرف یہ کہہ کر بات ختم کردی جائے کہ وہ نسیم

امروہوی کے شاگرد ہیں تو بھی وہ اچھے مرثیہ نگار ثابت ہو جاتے ہیں۔۔۔دوسرا ثبوت ان کے مرثیے کا ایک بند ہے۔

کربلا، شوقِ شہادت کو جلا دیتی ہے کربلا حوصلۂ صبر و رضا دیتی ہے
کربلا، صبر کو تلوار بنا دیتی ہے کربلا آج بھی رہ رہ کے صدا دیتی ہے
ظلم کے سائے میں پروان چڑھو گے کب تک
جور اغیار کے خاموش سہو گے کب تک

سید ضمیر اختر نقوی نے شاید Quantity کو دیکھا ہے۔ جمیل نقوی کے کہے ہوئے مرثیوں کی تعداد کو شمار کیا ہے جبکہ (Quality) یعنی معیار کو دیکھتے تو صرف ایک مصرع ''کربلا صبر کو تلوار بنا دیتی ہے'' ہی کسی شاعر کو مرثیہ گو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔۔۔

ڈاکٹر عظیم امروہوی نے ''مرثیہ نگاران امروہہ'' میں لکھا ہے کہ جمیل نقوی نے دو مرثیے کہے ہیں یہ ۱۹۸۴ء تک کی بات ہے ''مرثیہ نگاران امروہہ'' کا سن اشاعت ۱۹۸۴ء ہے۔ ڈاکٹر ہلال نقوی نے جمیل کے چار مرثیوں کا ذکر کیا ہے۔

(۱) مومنو شاہ شہیداں کا ثنا خواں ہوں میں ۱۹۲۶ء
(۲) ماسوا اس کے نہیں دہر میں کوئی معبود ۱۹۳۹ء
(۳) بندے سے تیری حمد خدایا محال ہے ۱۹۷۲ء
(۴) یہ چمکتے ہوئے تارے یہ فلک سیر نجوم ۱۹۷۳ء

جمیل نقوی کی ''روداد لہو رنگ'' مطبوعہ جنوری ۱۹۸۳ء میں جمیل کے دو مراثی شامل ہیں۔

(۱) بندے سے تیری حمد خدایا محال ہے
(۲) جلتے خیموں سے ہر اک سمت دھواں اُٹھتا ہے

ڈاکٹر ہلال نقوی نے دوسرے مرثیے کا ذکر نہیں کیا۔ گویا ''روداد لہو رنگ'' اُن کی نظر سے نہیں گذری تھی۔۔۔

جمیل نقوی کا مزاج بھی یہی ہے اور شاعری کی جہت بھی یہی کہ وہ ابتدا حمد سے کریں، اس کے بعد نعت رسول، پھر مدح آل رسول اور پھر کربلا۔ جمیل کے مراثی کی فہرست کے مطابق اُن کے تین مرثیوں کا آغاز حمد سے ہوتا ہے۔ اُن کا مزاج اور شاعری کی جہت بھی یہی ہے کہ

حمد۔ بارگاہِ رسالت میں نذرانۂ عقیدت، اور پھر آلِ رسول ـــــ

یہ چمکتے ہوئے تارے، یہ فلک سیر نجوم ابرِ باراں و سبک گام صبا، بادِ سموم
کرسی و لوح و قلم، حکمت و اسماء و علوم سازو آواز کے پردوں میں ہیں مقید مفہوم
عقل حیراں ہے کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
وجد ہے روح کو یہ نغمہ گری کس کی ہے

اور اب بارگاہِ رسول میں عقیدت کا انداز ـــ ولادتِ رسولؐ کو انقلاب کا لفظ دیکر شاعر کے جدّتِ فکری کا اظہار ـ

انسان پر جریدۂ فکر و نظر کھلا عزم و عمل کے قصرِ مرصع کا در کھلا
پھر دفترِ دبیرِ قضا و قدر کھلا رازِ نہانِ فطرتِ نوعِ بشر کھلا
چرچا تھا بت کدوں میں خدا کی کتاب کا
ہر ذرّہ پڑھ رہا تھا سبق انقلاب کا

نبی کے بعد آلِ رسول کا سلسلہ سیدہ فاطمہؑ سے شروع ہوتا ہے، حسینؑ بعدِ فاطمہؑ ہیں ـ

اللہ رے شان و شوکتِ سرکارِ فاطمہؑ حورانِ خلد حاشیہ بردارِ فاطمہؑ
روح الامین بلبلِ گلزارِ فاطمہؑ گیارہ امام زینتِ دربارِ فاطمہؑ
غیر از علیؑ نہیں کوئی ہمسر بتول کا
مربوط سلسلہ ہے یہ آلِ رسولؐ کا

جو منظرِ حیات کے رہبر ہیں، وہ حسینؑ سیرت میں جو مثیلِ پیمبر ہیں، وہ حسینؑ
صبر و رضا کی تیغ کا جوہر ہیں وہ حسینؑ روحِ جہاد و عزم کا پیکر ہیں وہ حسینؑ
منبر پہ ہوں تو نطقِ رسالت پناہ ہیں
میداں میں ہوں تو ہیبتِ شیرِ الٰہ ہیں

جمیلؔ نقوی کو فارسی زبان پر بھی دسترس تھی۔ فارسی میں اُن کی ایک رباعی ہے ـ

پرسند، کرا افضل و امجد ہستم عالی نسب و صاحبِ مسند ہستم
گفتم کہ زخاکِ پاکِ امروہہ منم لاریب کہ من آلِ محمدؐ ہستم

مرثیے کا تعلق رثا سے ہے، مرثیے کی تعریف میں کہیں یہ لازم نہیں ہے کہ مرثیہ مسدس

میں ہو یا کس ہیئت میں، کس (Form) میں ہو۔ مسدس میں مرثیہ کہنا ایک مروجہ انداز ہے لازمہ نہیں ـــــ ''روداد لہو رنگ'' میں جمیلؔ نقوی کی ایک طویل نظم شائع ہوئی ہے۔ اچھی نظموں کی تدوین نہیں کی جاسکتی، اُن میں سے اگر کچھ مصرعے حذف کیے جائیں تو نظم کا تاثر مجروح ہوتا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ۲۶۰ مصرعوں پر مشتمل اس آزاد نظم ''لہو'' کے چند مصرعے نقل کر کے یہ بیان کرسکوں کہ جمیلؔ نقوی یہ نظم سردار جعفری کی نظم ''اے کربلا۔ اے کربلا'' کی طرح ایک نظم بھی ہے، ایک پکار بھی اور ایک مرثیہ بھی۔ ۔

لہو۔۔۔ جو راہِ حق میں بہہ گیا
عرب کے ریگ زار پر
عجم کے ہر دیار پر
بساطِ شرق و غرب پر
لہو جو پیکرِ نبی کا نورِ شعلہ فام تھا
لہو، جو انتہائی پاک تھا، وہی لہو
حسین کے گلو سے نکلا حالتِ نماز میں
اور ارضِ کربلا میں جذب ہو گیا
لہو! وہی لہو جو ایک طفلِ شیر خوار کے گلو سے بہہ گیا
اسی لہو کی آنچ سے جو دشتِ کربلا کے چپہ چپہ پر بہا
ضمیرِ عصر آج بھی تپاں ہے، سوگوار ہے۔
شفق کی سوگوار سرخیاں اسی لہو کا عکس ہیں
جو ارضِ نینوا پہ بہہ گیا
جو سرزمین کربلا میں جذب ہے
یہ بولتا لہو یہ جاگتا لہو
یہ سبطِ مصطفیٰ کا خوں، یہ قلبِ فاطمہ کا خوں
یہ ابنِ مرتضیٰ کا خوں، یہ دینِ مجتبیٰ کا خوں
یہ خوں لازوال ہے

یہ خون رنگ لائے گا۔ یہ خون رنگ لائے گا

۲۶۰ مصرعوں پر مشتمل اس مرثیے سے ۲۱ مصرعوں کا انتخاب اس مرثیے کے مرکزی خیال کی طرف تو تھوڑی بہت نشاندہی کر سکتا ہے لیکن جو درد، جو کیفیت اور جو پیغام اس مرثیے کی جان ہے وہ پورا مرثیہ پڑھنے سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے ہیت (Form) کے فیتے سے مرثیے کی پیمائش کرنے والے اس مرثیے کو نظم کہہ کر گذر جائیں لیکن مجھے یقین ہے کہ "روداد لہو رنگ" میں پوری نظم کو مطالعہ کرنے والے اسے مرثیہ ہی کہیں گے۔

☆☆☆☆☆

شاهد نقوی:- (کراچی)

ولادت ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۶ء

نام، سید شاہد حسین، تخلّص شاہد۔ نقوی سید۔ جائے پیدائش شکار پور ضلع بلند شہر (یو۔ پی) ۱۹۴۷ء میں پاکستان آگئے۔ شعر و شاعری کی ابتدا ۱۳ برس کی عمر سے ہوئی۔۔۔غزل گوئی سے شروعات کی۔ بچپن سے ہی مزاج میں خوب سے خوب تر کی تلاش کی دھن تھی۔ غزل کی دنیا میں گئے تو وقت کی اہم پکار "ترقی پسند تحریک" کو لبیک کہا۔۔۔ پہلا مرثیہ ۱۹۵۸ء میں کہا۔ مرثیہ گوئی کی ترغیب انہیں ڈاکٹر یاور عباس سے ملی۔ پہلا مجموعہ مراثی "نفسِ مطمئن" اظہار سنز لاہور نے ۱۹۷۶ء میں شائع کیا۔ اس مجموعے میں آٹھ مرثیے شامل ہیں۔ ان مرثیوں کے مصرع ہائے اولیٰ سے ہی شاہد نقوی کی شاعری میں ترقی پسند سوچ نمایاں ہوتی ہے۔ (یہ سارے مرثیے موضوعاتی ہیں)۔۔۔ "نفس مطمئن" میں درج ذیل مرثیے شامل ہیں۔

پہلا مرثیہ	"کربلا کے بعد"	تحریک ارتقائے مسلسل ہے کربلا۔	۱۹۶۴ء
دوسرا مرثیہ	"ہلاکت و شہادت"	نقطۂ تکمیل کی جانب رواں ہے زندگی	۱۹۶۵ء
تیسرا مرثیہ	"قرآن و اہلبیت"	نقاشِ 'کُن' کا نقشِ مکمل ہے آدمی	۱۹۶۶ء
چوتھا مرثیہ	" "	آبادیوں کے شہر میں تنہا ہے آدمی	۱۹۶۶ء
پانچواں مرثیہ	"ظہور امام"	ذہنوں میں گونجتی ہے صدا انقلاب کی	۱۹۶۷ء

اسی طرح "امامت الٰہیہ" جادۂ تسلیم۔ اور 'ماں کا دل ' کے موضوعات پر مرثیے شامل ہیں۔ ان موضوعات کے ساتھ مصرع ہائے اولیٰ سے مرثیوں کی اُٹھان اس امر کی گواہی دے رہی

ہے کہ شاؔہد نقوی جدید مرثیے کی راہوں پر گامزن ہیں نیز قدرت نے انہیں شعر گوئی کی صلاحیت سے مالا مال کیا ہے مثلاً امامِ غائب، حقیقتِ منتظر کے ظہور کو عقیدت تو نوعِ انسانی کی خوش بختی کا مژدہ قرار دے گی، انسان کی نجات کی سرچشمہ کہے گی مگر شاہد نقوی بشریت پر قدرت کے اس احسانِ عظیم کو انقلاب کہہ رہے ہیں۔ ''ذہنوں میں گونجتی ہے صدا انقلاب کی'' اس ابتدائے فکر سے ظہورِ مہدی تک شعریت کا سفر اور اول سے آخر کا ربط، شاہد نقوی کی شاعرانہ عظمت کی دلیل ہی تو ہے۔

شاہد نقوی کے مراثی کا دوسرا مجموعہ ''والعصر'' ۱۹۸۶ء اور ''لہو لہو کہکشاں'' ۱۹۸۹ء میں کراچی سے شائع ہو چکے ہیں چوتھے مجموعے کے متعلق اطلاع تھی کہ زیرِ طبع ہے۔ شاہد نقوی غزل گوئی میں اُستاد قمر جلالوی، قصیدہ نگاری میں محشر لکھنوی کے شاگرد رہے ہیں۔ لیکن مرثیہ نگاری میں اگرچہ اُنہوں نے باقاعدہ کسی کے سامنے زانوئے ادب طے نہیں کیا مگر سید آل رضا سے بہت متاثر رہے ہیں اسی لئے شاؔہد نقوی کے مرثیوں میں سید آل رضا کی طرح غزل کا آہنگ ملتا ہے۔ شاہد نقوی عربی فارسی کے عالم ہیں اسی لئے زیادہ تر مرثیوں کی ابتدا، مرکزی خیال یا حوالہ جات آیات قرآنی کی تفسیر ہوتی ہے یا احادیث نبوی سے روشنی لیتے ہیں۔ اس کی پہلی مثال تو ان کے پہلے مجموعہ مراثی ''نفس مطمئن'' میں شامل اُن کے ابتدائی مرثیوں میں سے ایک مرثیہ ''امامت الہیہ'' ہے جو دانشوروں کی تجزیہ نگاری کے مطابق سورۂ بقر کی آیت ۱۲۶ سے آگہی کے حصول کی دلیل ہے۔ اس مرثیے کا آغاز حضرت اسماعیلؑ کی قربانی اور حضرت ابراہیمؑ کی اطاعت ربانی کیے واقعہ سے متعلق ہے جس میں شاعرانہ صلاحیتوں کا بھرپور اظہار ہے۔

ہے آزمائش آج ذبیحؑ و خلیلؑ کی طے ہو رہی ہے منزلِ تسلیم و بندگی
ہے حکمِ ربّ پسر کے گلے پر چلے چھری مخصوص ہو چکی ہے جزائے خلیلؑ بھی
لو وہ چھری پسر کے گلے کی طرف چلی
حق کی رضا ادھر سے امامت بکف چلی

ہے کوئی جواب ''حق کی رضا ادھر سے امامت بکف چلی'' کا۔

اسی مرثیے ''امامتِ الہیہ'' میں شاؔہد نقوی نے 'امامت' کے منصب کی وضاحت کی ہے اور امامت کے متعلق ملت کے مختلف نظریات کا تقابل کیا ہے جس میں کہیں طنز ہے، کہیں وضاحت ہے، کہیں بیانیہ ہے۔ ایک ہی مرثیے میں مختلف جہتوں کی شاعری کے ذریعے یہ ثابت

کرنے کی سعی مستحسن کی ہے کہ "امام" وہ ہوسکتا ہے جس کی ذات سے امکان خطا نہ ہو ۔

کیا لوگ چاہتے ہیں انھیں رہنما کریں جو لغزشوں سے حقِ قیادت ادا کریں
ایک اک قدم پہ لوگوں کے منہ کو تکا کریں ہر موڑ پر یہ ڈر ہو کہ شاید خطا کریں
ہر شخص کانپتا رہے خوفِ دوام سے
خالق پناہ میں رکھے ایسے امام سے

ہونے لگے خدا کی مشیت میں بھی دخیل اس قولِ کبریا میں بھی کرتے ہو قال وقیل
"پہنچے گا ظالموں کو مرا حق نہ اے خلیل" کیا عصمتِ امام پہ کچھ کم ہے یہ دلیل
عصمت ہر ایک زاویے سے ردِّ ظلم ہے
کس کو نہیں یہ علم کہ کیا حدِّ ظلم ہے

وہ جس کا انتخاب کریں سطح بیں عوام اوروں کا ہو تو ہو وہ ہمارا نہیں امام
ہے یہ تو خود ہی اپنی ہلاکت کا اہتمام ہر گام مشتبہ ہے جو رہبر ہو فکرِ خام
ایسا امام حق کی مشیت پہ طنز ہے
قرآں کا مضحکہ ہے رسالت پہ طنز ہے

اس کے بعد امام کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔

قرآں کو اعتماد ہو جس کی نگاہ پر
ایمان سر جھکا کے چلے جس کی راہ پر

ہے جادۂ حیات میں حدِّ نظر امام کونین چشمِ شوق ہیں، نورِ بصر امام
باطل کی ظلمتوں میں حقیقت نگر امام اک آفتاب ہے افقِ روح پر امام
جس کی ضیاء محیط ہے کُل کائنات پر
کرنیں ٹنکی ہوئی ہیں قبائے حیات پر

انساں کا منتہائے تفکر امام ہے ادراکِ جز و کُل کا تبحر امام ہے
اوصاف کاملہ کا تواتر امام ہے تکمیلِ آدمی کا تصور امام ہے
جس کو بنا کے اپنا قلم چومتا رہا
تا دیر نقش کارِ جہاں جھومتا رہا

اور جب قاری کا ذہن کمال اور عدم کمال کا توازن کر لے اور کمال کو اپنانے کا فیصلہ کرے تو شاہد نقوی مرثیے میں امام برحق کی ذات والا صفات کے اشارے کرتے ہیں

امروز میں ہدایت فردا لیے ہوئے قطرہ کنارِ فکر میں دریا لیے ہوئے
ذرہ نظر میں وسعتِ دریا لیے ہوئے جو کچھ ہے کائنات میں تنہا لیے ہوئے
ہر جنبشِ نگاہ میں دل تولتا ہوا
نفسِ نبیؐ خدا کی زباں بولتا ہوا

جس کی نگاہ وقت سے رفتار چھین لے باغی نظر سے جرأتِ پیکار چھین لے
منکر کے لب سے قدرتِ انکار چھین لے دستِ اجل مروڑ کے تلوار چھین لے
گردش زمیں کی روک دے جو اک نگاہ سے
چاہے تو آفتاب پلٹ آئے راہ سے

شاہد نقوی کی شاعری میں لفظوں کو برتنے کی بھر پور صلاحیت کا اظہار بھی ہے اور فکر کی وسعت بھی۔ امام کے لئے اوصاف کاملہ کا تواتر، تکمیلِ آدمی کا تصور رکھنا شاہد نقوی کی وسعت فکر کی دلیل ہی تو ہے۔ اور یہ رمزیت اور اشاریت کی منتہا ہے کہ لفظوں کا لوٹ پھیر صفحۂ ذہن پہ وہ نام لکھ دے جو شاعر لکھنا چاہتا ہے۔

''منکر کے لب سے قدرت انکار چھین لے'' یا'' چاہے تو آفتاب پلٹ آئے راہ سے'' جیسے مصرعے لفظوں میں حوالہ جات کی بازگشت ہے۔ اور حوالہ جات کی یہ اشاریت آخری بند میں ایک شخصیت کی تصویر بنا دیتی ہے۔

جس کے عمل سے چہرۂ ایماں نکھر سکے جو دین کی رگوں میں نیا خون بھر سکے
منبر پہ ادعائے سلونی جو کر سکے جس کی نگاہ کون و مکاں سے گذر سکے
جس کی زباں ملک کے لئے بھی دلیل ہو
کہہ دے جو اعتماد سے تم جبرئیل ہو

شاہد نقوی موضوعاتی مرثیوں کے حوالے سے ایک نمایاں نام ہے۔ جدید مرثیے کے سفر میں بھی شاہد نقوی پیش پیش نظر آتے ہیں۔ وہ جس موضوع کا انتخاب کرتے ہیں اس کے ساتھ انصاف کرتے ہیں اس لئے دور سے پہچانے جاتے ہیں — عصر حاضر کے عالم، محقق،

دانشور علامہ طالب جوہری کی رائے ہے کہ شاہد نقوی کے ابتدائی مرثیوں میں جوشؔ اور آل رضا کے اثرات اس حد تک گہرے تھے کہ ایک مرثیہ جوشؔ کے اثرات کے تحت ہے تو دوسرا آل رضا کے اسلوب کا نمائندہ نظر آتا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شاہد نقوی نے ان دو بڑے شعراء کے اسالیب سے جو آمیزہ تیار کیا ہے وہی شاہد نقوی کی انفرادیت اور پہچان ہے اور شاہد نقوی کو بلاخوف تردید صاحب طرز مرثیہ گو کہا جا سکتا ہے۔ اُن کی طرز نگارش میں نہ جوشؔ کی تری ہے نہ آل رضا کی خشکی بلکہ اُن کے مرثیوں کے پُرشور سمندر میں استدلال کی خشکی کے جزیرے اُبھرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ علامہ طالب جوہری نے شاہد نقوی کے مراثی ضرب مظلومیت، نالۂ جرس، علی کا شیر وغیرہم کے حوالے سے شاہد نقوی کے مراثی میں مختلف جہات کی نشاندہی کی ہے بالخصوص ''نفس مطمئن'' میں شامل ان کے ابتدائی مراثی کے حوالے سے اُن کی طرز نگاری پر بات کی ہے۔

کراچی میں جوشؔ، نجم نسیم، اور آل رضا کے بعد شاہد نقوی کا نام نامی مرثیہ نگاری میں ایک دبستان کی حیثیت رکھتا ہے۔

☆☆☆☆☆

میر رضی میر:- (کراچی)

ولادت ۱۶ راگست ۱۹۱۷ء

نام میر رضی۔ تخلص میرؔ۔ پیدائش قصبہ کبیر تل، ریاست الور، راجپوتانہ۔ اُن کے والد سید محمد تقی زیدی ایک ماہر سوز خوان تھے اور سوز خوانی کا سلسلہ اجداد سے چلا تھا۔ اعلیٰ زمیندار خاندان سے تعلق تھا اس لئے تعلیم قصبہ کے سکول سے آگے نہ بڑھی۔ اکلوتے بیٹے تھے۔ والدین تعلیم کے لئے بھی قصبے سے باہر بھیجنا نہیں چاہتے تھے۔ اس دور کے بہت سے جاگیرداروں، تعلقہ داروں اور زمینداروں کی اولاد اسی لئے تعلیم سے بے بہرہ رہ گئی کہ ماں باپ نے یہ کہہ کر بچوں کو تعلیم سے محروم رکھا کہ ہمیں کونسی نوکری کرانی ہے اور جب جاگیرداری اور زمینداری کا خاتمہ ہوا تو ان بچوں کے لئے مشکلات پیدا ہوئیں۔

''کبیر تل'' کا ماحول علمی ادبی تھا۔ میر رضی کے والد سوز خوان تھے۔ اُنہوں نے بیٹے کو بھی کم عمری سے تربیت دینی شروع کی۔ شعر کا آہنگ میر رضی کی سمجھ میں آنے لگا۔ اور میر انیس

کے مرثیوں کا فیض کہ میر رضی ۱۴ برس کی عمر میں مشق سخن کرنے لگے۔ ۱۹۳۴ء میں (بعمر ۱۷ برس) اسٹیٹ فرنٹ رجمنٹ میں بھرتی ہوگئے اور اپنی محنت اور لگن کے سبب چیف ڈرل انسپکٹر ہوگئے۔ شعر و سخن کا رجحان ابتدا میں مزاحیہ شاعری کی طرف گیا لیکن انیسؔ کے مرثیوں نے اور سوز خوانی نے مرثیوں کی لذت سے آشنا کیا اس لئے دھیان مرثیے سے نہ ہٹا اور دل میں حسینؑ کی محبت کا اُجالا رہا۔

۱۹۴۷ء میں جب (Transfer of Population) انتقال آبادی کی 'حکمت عملی' کے تحت لوگ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آرہے تھے، ایک افراتفری کا عالم تھا، قافلے لٹ رہے تھے، گلے کٹ رہے تھے، خون بہہ رہا تھا ان دنوں درسگاہ کربلا سے تربیت لینے والا ایک بشر جس کا نام میر رضی میرؔ تھا مہاجرین کی ریل گاڑیوں کی حفاظت کررہا تھا۔ ضمیر اختر نقوی نے میر رضی میرؔ کے احوال میں لکھا ہے کہ: ''صرف قصبہ نارنول ریاست پٹیالہ سے مہاجرین کی پانچ ریل گاڑیاں میر رضی کی کوششوں کے سبب قتل عام سے بچ کر پاکستان پہنچ گئیں'' ہوسکتا ہے یہ بات عام قاری کو مبالغہ لگے کہ فرد واحد منظم حملوں کو کیسے روک سکتا تھا لیکن جو کربلا اور درس کربلا سے آگاہ ہیں وہ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ کربلا کی درسگاہ سے سبق لینے والے ظلم سے نفرت کرتے ہیں۔ ظلم کسی پر ہو حسینؑ کے عزادار مظلوم کا ساتھ دیتے ہیں۔

میر رضی اکتوبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان آگئے اور حیدر آباد سندھ میں ''حُر پولیس'' میں بھرتی ہوگئے۔ ایک زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ نے جینا سیکھ لیا تھا۔

میر رضی میرؔ نے ۱۹۵۸ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ اب تک وہ پاکستان بھر میں مرثیہ خواں کی حیثیت سے متعارف ہوچکے تھے۔ ۱۹۶۰ء میں میر رضی میرؔ نے ڈاکٹر یاور عباس کے مکان پر ایک مجلس میں جب اپنا مرثیہ پڑھا تو سامعین کے لئے کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ تاریخ مرثیہ گوئی میں ایسے بہت سے نام ہیں جو ابتدا میں مرثیہ خواں تھے۔ دوسروں کے مرثیے پڑھا کرتے تھے اور بعد میں خود مرثیہ کہنے لگے تو صفِ اوّل کے مرثیہ نگاروں میں شمار ہونے لگے۔ میر رضی میرؔ نے رئیسؔ امروہوی کے کہنے پر نسیمؔ امروہوی کی شاگردی اختیار کی۔ حضرت نسیمؔ امروہوی نے میر رضی میرؔ کی شمشیر فکر کو اور تیز کردیا اور ۱۹۷۷ء میں میر رضی میرؔ نے ایک ایسا مرثیہ کہا جس نہج پر شدید لکھنوی اور منظور رائے پوری جیسے اساتذہ نے مرثیے کہے تھے۔ اس مرثیے کے چہرے میں فنِ مرثیہ نگاری کی تمہید ہے، اس کے علاوہ ہر بند میں ممتاز مرثیہ نگاروں کے نام احسن الفاظ کے ساتھ نظم کئے

تھے۔ حضرت شدید لکھنوی نے مرثیہ گو شعراء کے اسمائے گرامی نظم کیے تھے۔ میر رضی میرؔ نے مرثیہ نگار اور مرثیہ خواں حضرات کے نام نظم کیے ہیں۔ 'ادارہ تقدیس قلم کراچی' نے ایک مجموعہ مراثی ۱۹۸۹ء میں شائع کیا تھا جسے آغا سید قمر حسنین جعفری نے مرتب کیا تھا۔ اس مجموعے میں میر رضی میرؔ کا یہ مرثیہ ''جہد وفا'' بھی شریک اشاعت ہے۔

خامۂ سیف زباں، جوہر شمشیر دکھا نیک نامی سے سجا کر خط تقدیر دکھا
چوم لے عرصۂ تقریر وہ تحریر دکھا [۱] کربلا صاف نظر آئے وہ تصویر دکھا
غم تبرک کی طرح بانٹ دے غم خواروں میں
مرثیہ پڑھنا ہے مولا کے عزاداروں میں

زمرۂ اہل غزل سے ہے گذارش اتنی کیا صرف صنف غزل میں ہے صداقت نظری
دیکھ لیں اہل سخن، آئینۂ حق طلبی [۶] آج ہر فکر پہ غالب ہیں حسینؑ ابن علیؑ
حق شناسی ہے تو پھر خوف و خطر کس کا ہے
مرثیہ کیوں نہیں کہتے انہیں ڈر کس کا ہے

غور سے سوچئے یہ مسئلہ بنیادی ہے مرثیہ علم و ادب ہی کی تو آبادی ہے
مرثیہ عالم افکار کی آزادی ہے [۷] مرثیے نے تو جبیں ذہن کی چمکادی ہے
طالب علم کو ہر کام مدد دیتا ہے
مرثیہ ڈاکٹری کی بھی سند دیتا ہے

گیسوئے مدح کی زنجیر میں طبعاً ہوں اسیر جنتِ شعر و سخن ہے مری فطری جاگیر
میرے ممدوح کا مداح خداوند قدیر [۱۰] لائق مدح کی مدحت ہے تقاضائے ضمیر
مدح خواں خواب عدم سے یہ ضمیر اٹھا ہے
اور کیا طینت فاضل کا خمیر اٹھا ہے

نظم میں نثر کی صورت ہے زباں صاف و سلیس جھوم اٹھیں سن کے جسے بزم فصاحت کے جلیس
مرثیے میں جو رثائی ہیں وہ لفظیں ہیں نفیس [۱۱] ہر قدم پیش نظر پیرویٔ طرز انیسؔ
فکر و فن میں ہے وہی صاحب تقدیر رضی
میرؔ صاحب ہی کی تقلید میں ہے میر رضی

عیب سے یوں ہے منزہ یہ سخن پرُ تاثیر جیسے لغزش سے مبرا کسی مومن کا ضمیر
وہ بھی سن کر ہوئے دل شاد جو آئے دلگیر [۱۲] وہ مضامیں کا غلو جیسے سر چرخِ دبیر
بخدا ذوقِ قدیم اصلِ مونس ہے مرا
اس روش سے ہو جسے اُنس وہ مونس ہے مرا

ان مدارج پہ ہوں فائز جو ہیں مانوسِ نشاط سب سے فائق نہیں، کہتا ہوں بہ طرزِ محتاط
عارفِ حق بھی ہوں اتنا، مری جتنی ہے بساط [۱۳] یہ عروج ان کا ہے صدقہ جو ہیں میزان وصراط
یوں تعشق کا صلہ حق کے ولی نے بخشا
اوجِ منبر کا شرف عشقِ علی نے بخشا

پھر مجھے شہرِ وفا میں مری قسمت لائی ایک گم گشتہ کو اس شہر کی شہرت لائی
خونِ دل میں جو بسی ہے وہ عقیدت لائی [۱۴] درِ جنت پہ مجھے خواہشِ جنت لائی
میری آنکھوں میں وہ تصویر اتر آئی ہے
صورتِ بازوِ شبیرؑ نظر آئی ہے

بس رضی میر یہ تمہید سخن ہے مقبول کہہ چکے بات تو اب بات کی تفصیل فضول
فرشِ ماتم پہ ہے موجود یہاں روحِ بتولؑ [۱۷] پردۂ اشک پہ ابھرا علم سبطِ رسولؐ
دل میں لاؤ نہ کسی قسم کا وسواس لکھو
یا علیؑ کہہ کے بس اب آمدِ عباسؑ لکھو

آمدِ ثانیٔ حیدر کا جو منظر دیکھا با ادب حدِ نظر تک ہوئی ہر سمت فضا
دشت میں رعبِ علمدار سے لرزہ جو بڑھا [۱۸] تیز ہو ہو کے بڑھی دھوپ حرارت نے کہا
فخر آدم کو ہے جس پر وہ بشر آتا ہے
دیکھ سورج، بنی ہاشمؑ کا قمر آتا ہے

دستِ غازی نے وہ رایت کا پھریرا کھولا وہ فضا چمکی وہ آنے لگی طوبیٰ کی ہوا
وہ سرِ دشت دمکتا ہوا پنجہ ابھرا [۱۹] چشم گیتی کو ملا آئینۂ صلِ علیٰ
آنکھیں رستہ میں بچھاتے ہیں محبت والے
عرش سے فرش پہ آنے لگے جنت والے

اس کے بعد اس مرثیے میں حضرت عباس علمدار کا احوال ہے۔ مرثیے کا بہترواں (۷۲) بند بین کا بند ہے لیکن نہ حسینؑ سر پیٹتے دکھائے گئے ہیں نہ اہلبیت نبی گریہ و بکا میں مصروف بتائے گئے ہیں۔ اس کے برعکس آنے والے واقعات کی نشاندہی پر مرثیہ تمام کیا گیا ہے۔

کہہ کے یہ بھائی ہوا بھائی کے لاشے سے جدا سوؤ اب نہر پہ تا حشر، خدا کو سونپا
آئی آواز کہ کیا فکر ہے جاؤ بیٹا ہے یہاں لاشِ علمدار پہ گریاں زہرا
جا کے زینبؑ سے یہ کہدو کہ خبردار رہے
شام تک قید و رسن کے لئے تیار رہے

آخری مصرع میں ''شام تک'' کیا ضومعنی ہے۔ یہ شام، شام غریباں بھی ہے اور یہ شام، دربار شام بھی ہے۔ بعد شہادت حسینؑ، سیدہ زینب شامِ غریباں سے دربار شام تک رسن بستہ قیدی رہی ہیں۔

میر رضی میرؔ کو ماں باپ کی محبت نے سکول کالج سے سندات حاصل کرنے کے مواقع سے محروم رکھا مگر کیا کہنا مکتب حسینؑ کے درس کا جو ایک پرائمری تک پڑھے ہوئے انسان کو علم کی اتنی روشنی عطا کرتا ہے کہ وہ میر رضی میرؔ، ذاکرِ حسینؑ اور شاعر اہلبیت بن کر طلوع ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆

زائر امروھوی:- (کراچی)

ولادت ۱۹۲۱ء (امروہہ۔)

نام، آباد محمد۔ تخلص زائرؔ۔ سادات نقوی۔ ممتاز سوز خواں، وہ ہجرت نصیب شخصیت جسے دو مرتبہ ہجرت سے دوچار ہونا پڑا۔ پہلی بار وطن سے نکلے۔ ۱۹۶۲ء میں جب کراچی میں نسیم امروہوی کا مجموعہ ''مراثی نسیم'' شائع ہوا اور اس وقت کے مرثیہ نگاروں کو شمار کیا گیا تو کراچی سے نسیم امروہوی اور ان کے شاگردوں کے علاوہ، ڈاکٹر صفدر حسین، راولپنڈی سے صفی حیدر دانش، لاہور سے آفتاب سہارنپوری، ڈھاکہ سے عنبر امروہوی اور زائر امروھوی کے نام سامنے آئے۔ گویا ۱۹۶۲ء میں زائر امروہوی ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) میں تھے۔ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنا دیا گیا تو زائر امروہوی کراچی آ گئے۔ یہ اُن کی دوسری ہجرت تھی جس نے بے سروسامانی کی پوٹلی اُن کے سر پر رکھ کر انہیں کراچی کے ساحل پر اُتار دیا۔

زائرؔ امروہوی بحیثیت مرثیہ نگار، اُن مرثیہ نگاروں میں شامل ہیں جو سوز خوانی سے مرثیہ گوئی کی طرف آئے، یہ وہ حضرات تھے جو سوز خوانی میں نئی نئی جہتیں تلاش کرتے تھے۔ ہر سوز خواں کو اس کلام کی تلاش رہتی تھی جو کسی نے نہ پڑھا ہو، سوز و سلام اور مرثیے پڑھتے پڑھتے لاشعوری طور پر ایسے مرثیہ گو حضرات کے کہے ہوئے مرثیوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی تھی۔۔۔ زائرؔ امروہوی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مرثیہ گوئی میں بہت سنجیدہ تھے اور اُن کے پیش نظر اپنی سوز خوانی کے لئے مرثیہ کہنا نہیں تھا بلکہ وہ باقاعدگی سے مرثیے کہنا چاہتے تھے اس لئے اُنہوں نے حضرت نسیمؔ امروہوی کی شاگردی بھی کی تھی۔۔۔ لیکن ریکارڈ پر اُن کے صرف دو مرثیے ملتے ہیں، اُن کا پہلا مرثیہ۔

"جب سوئے نہر بازوئے شاہِ اُمم چلے"

ہے جو ۳۸ بند پر مشتمل ہے۔ ایک حوالے سے ۱۹۶۵ء میں کہا گیا، دوسرے حوالے سے ۱۹۷۲ء میں کہا گیا تھا۔ یہ مرثیہ حضرت عباس علیہ السلام کے احوال کا ہے۔ اس مرثیے کا ایک بند "عرفان نسیم" کے حوالے سے درج ذیل ہے۔

وہ شوکتِ علم، وہ علمدار ذی وقار دریا کی چاہ میں صفتِ موجِ بیقرار
عزمِ جہاد گو کہ نہ تھا دل میں زینہار آئے جو تیر، تن کے بڑھے بہرِ کارزار
رعب جری سے دم میں نگوں خیر سر ہوئے
تلوار کیا کھنچی کہ فنا اہل شر ہوئے

زائرؔ امروہوی کا دوسرا مرثیہ۔ "بہر نماز صبح جو مشکل کشا چلے" ہے جو ۱۹۷۳ء میں کہا گیا اور عجیب اتفاق ہے کہ یہ مرثیہ بھی ۳۸ بند پر مشتمل ہے۔ یہ مرثیہ حضرت علیؑ کی شہادت کے احوال کا مرثیہ ہے جو ۲۱ رمضان المبارک کو شہادتِ حضرت علیؑ کی مجالس میں پڑھا جاتا تھا۔

راقم الحروف ۱۹۷۶ء میں کراچی کو خیرباد کہہ کر لندن آ گیا تھا، اس وقت تک زائرؔ امروہوی کے دو مرثیے کہے اور سنے گئے تھے۔ حال ہی میں کراچی سے معلومات حاصل کیں لیکن کسی اور مرثیے کی اطلاع نہیں ملی جبکہ یہ ممکن نہیں کہ اس کے بعد زائر صاحب نے مرثیہ نہ کہا ہو۔۔۔ لیکن نہیں بھی کہا تو اُن کے دو مراثی اُنہیں مرثیہ گو شعرا کی صفوں میں اُن کا مقام دلانے کے لئے کافی ہیں۔

☆☆☆☆☆

امید فاضلی:- (کراچی)

ولادت ۱۷ر نومبر ۱۹۲۳ء

نام، ارشاد احمد فاضلی۔ تخلص، اُمید۔ جائے ولادت ڈبائی ضلع بند شہر۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے گریجوایشن (۱۹۴۰ء) میں کیا۔ ۱۹۵۲ء میں پاکستان آگئے اور کراچی میں مستقل قیام کیا۔ شاعری کی ابتدا ۱۵ برس کی عمر میں کی۔ نوح ناروی کے شاگرد ہوئے۔ بچپن سے مرثیہ خوانی کرتے تھے اس لئے ذہن میں اوزان و بحور رچ بس گئے تھے۔ سونے پر سہاگہ نوح ناروی کی رہنمائی۔ لہٰذا ۱۹۴۹ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ ؎

"یارب بحق خون شہیدان کربلا"

یہ مرثیہ مختصر تھا یعنی ۳۵ بند پر مشتمل تھا۔۔ اُمید فاضلی کی ابتدائی شہرت غزل سے ہوئی، اُنہوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی غزل، نظم، سلام، نوحہ، قصیدہ، حتی کہ گیت بھی لکھے۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۷۲ء تک وہ غزل کے شاعر کی حیثیت سے پہچانے گئے لیکن ۱۹۷۲ء میں جب اُنہوں نے دوسرا مرثیہ ؎

"زبان عجز کھلی ہے تو مدعا مانگوں"

کہا تو ایسا لگا کہ اُنہوں نے جو کچھ مانگا وہ انہیں مل گیا۔۔ اُنہوں نے شعور تذکرہ مصطفیٰ مانگا۔ اُنہوں نے دعا کی کہ" اُن کا لہو نوا بن جائے اور اُنہیں وہ حروف عطا ہوں جو مدحت آلِ محمد کا حق محمد کا ادا کر سکیں۔

زبان عجز کھلی ہے تو مدعا مانگوں یہ وقت ہے کہ طلب سے بھی کچھ سوا مانگوں
رسولؐ کا ہے یہ منبر یہاں دعا مانگوں شعورِ تذکرۂ سبطِ مصطفیٰ مانگوں
خدائے عشق، لہو کو مرے نوا کردے
وہ حرف دے کہ جو مدحت کا حق ادا کردے

اس مرثیے کا عنوان" شعور و عشق" تھا۔ مرثیے میں شعور عشق کی بات نہیں، شعور اور عشق کا تقابل تھا اور جب وجدان نے شعور و عشق کی وضاحتیں کیں تو نگاہ ایک مرکز پر ٹھہر گئی، وہ مرکز تھا صبرِ حسینؑ ۔

شعور کیا ہے، عطائے خدا برائے بشر تو عشق بندہ و خالق کے ربط کا مظہر

انا کی نغمہ گری ہے شعور کے لب پر تو عشق غیرِ انا کی طرف اَنا کا سفر
شعور آنکھ جو کھولے تو روشنی ٹھہرے
جو عشق جاگ اُٹھے تو پیمبری ٹھہرے

شعور غنچہ بہ غنچہ ہے رنگ و بو کی نوید شعور ساغرِ بینائی میں سحر کی کشید
شعور خنکیٔ مہتاب و گرمیٔ خورشید شعور دام بچھائے تو زد پہ ہے ناہید
شعور پیرہنِ یوسفی کی نکہت ہے
اسی سے دیدۂ یعقوبؑ میں بصیرت ہے

شعور علم، خرد، فکر، جستجو، عرفاں تو عشق سوزِ تمنا، یقیں وفا، وجداں
شعور دوشِ تفکّر پہ آگہی کی کماں تو عشق گونگے تخیّل کو بخشتا ہے زباں
نہ ہو شعور تو منزل ہو راستے سے جُدا
نہ ہو جو عشق تو نقطہ ہو دائرے سے جُدا

شعور تیشۂ فن سے تراشتا ہے سنگ تو عشق سوز و گداز و ترنم و آہنگ
شعور لفظ کے پیکر میں زندگی کی اُمنگ تو عشق ہستی و مستی، جمال و نکہت و رنگ
شعور زہر سے امرت نچوڑ لیتا ہے
تو عشق موت کے دھارے کو موڑ دیتا ہے

اور جب عشق موت کے دھارے کا رخ موڑ دے، حیات و موت کے معنی بدل دے، بے مقصد جینے والوں کو مردہ قرار دیدے اور مقصد کے لئے جان دینے کو حیات ابدی عطا کردے تو افق انسانیت پر حسینؑ طلوع ہوتا ہے۔

حسینؑ وہ کہ نہ جن پر چلا فسونِ اجل حسینؑ عشق کی تکبیر ہیں سرِ مقتل
حسینؑ کرب وبلا میں اذانِ صبحِ ازل تلاش حق ہو تجھے تو درِ حسینؑ پہ چل
یہی وہ در ہے جہاں سے حیات بٹتی ہے
انھیں کے در سے خرد کو زکوٰۃ بٹتی ہے

ایک غزل گو شاعر کو یہ تیور مل گئے کہ اُسے، حسینؑ عشق کی تکبیر' اذانِ صبحِ ازل، نظر آرہے ہیں۔ یہ صورتِ حال کیا اس حقیقت کا ادراک نہیں ہے کہ امید فاضلی جس در پہ پہنچ گئے ہیں۔

"انہیں کے در سے خرد کو زکوٰۃ بٹتی ہے"

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی — بلکہ یہ کہنا ہے زیادہ مناسب ہے کہ بات تو اب شروع ہوتی ہے ۔لطف وعطا کا سلسلہ تو اب شروع ہوا ہے،اس کی دلیل اس مرثیے کے کچھ اور بند ہیں ۔

حسینؑ گلشنِ حق میں صبا کی جاں کا پیام
حسینؑ خیر مکمل، حسینؑ صبر تمام
حسینؑ کلمۂ حق کے لیے بقائے دوام
حسینؑ بادۂ حُبِّ رسولؐ جام بہ جام
حسینؑ مصحفِ ناطق کا ایک پارہ ہے
یہ نام اسمِ محمدؐ کا استعارہ ہے

اللہ کسی کو شعر گوئی کی صلاحیت دیدے اور یہ صاحب صلاحیت ان کی مدح کی طرف متوجہ ہو جائے جن کی مدح کی حدود کا بشر احاطہ نہیں کر سکتا تو پھر شاعر کی فکر کی پرواز جہاں تک بھی ہو۔وہ مدح وثنا میں جو کچھ بھی کہہ دے غلو نہیں ہوگا — امید فاضلی ایک مستند شاعر تھے۔محبوب کے حسن کا مداح شاعر جب آفاقی حقیقتوں کی طرف رجوع ہوا تو ہر مصرح میں چاند سورج طلوع ہونے لگے۔

حسینؑ، نام لہو کو نوا بنانے کا
حسینؑ نام تہہ تیغ مسکرانے کا
حسینؑ نور ہے ہر دور، ہر زمانے کا
حسینؑ نام ہے معراجِ عشق پانے کا
زمیں سے عرش تک اس نام کی دہائی ہے
خدا اسی کا اسی کے لئے خدائی ہے

امید فاضلی نے اپنے مراثی میں کلاسیکی انداز کی پابندی نہیں کی لیکن کہیں یہ بھی اعلان نہیں کیا کہ وہ جدید مرثیے کے علمبردار ہیں۔ان کے نظریہ کے مطابق زبان ارتقاپذیر ہے،شاعری ارتقاپذیر ہے۔زندگی کا ہر پہلو ارتقاپذیر ہے۔شعر کے حوالے سے قدامت وجدت کی بحث ان کی نظر میں وقت کا زیاں ہے اس لئے کہ وہ گذری ہوئی کل کے نہیں ،آج کے اور آنے والی کل کے شاعر ہیں۔رہا سوال مرثیے کے آہنگ میں تبدیلیوں کا ،تو وہ وقت کے دھارے کے ساتھ ساتھ مرثیہ ہی کیا پوری شاعری کے تیور بدل رہے ہیں۔ترقی پسند تحریک نے وقت کے تقاضوں کی آواز کو سننا ہی تو سکھایا ہے بس امید فاضلی اس بحث نہیں پڑتے۔وہ محبت کے شاعر ہیں،فکر کے شاعر ہیں۔جب سے انھوں نے مظلوم کربلا کو اپنی محبت کا مرکز بنالیا ہے انھیں چلتی ہوئی تلواروں میں

سرمدی نغمے سنائی دیتے ہیں۔ ان کے مرثیوں کے، موضوعات کے ''عشق و شعور''۔ قرآن اور اہلبیت ''علم و عمل'' ''تہذیب نفس'' ''صبر اور سیدہ زینبؑ''۔ وغیرہم اس کی نشاندہی کررہے ہیں کہ امید فاضلی کو ''طلوع'' کا سراغ مل گیا ہے اور انہوں نے ''غروب'' سے یا غروب ہونیوالوں سے ناطہ توڑلیا ہے اسی لئے وہ کہہ سکتے ہے کہ۔

غم حسینؑ کو کہیئے متاع لوح و قلم   بلند ہے اسی غم سے حیات کا پرچم
یہ غم مژہ پہ کرن ہے تو پھول پر شبنم   ڈھلے جو اشک میں یہ غم تو ہے چراغ حرم
یہ غم ہزار دکھوں سے نجات دیتا ہے
حیات کو یہ چراغِ حیات دیتا ہے

اُمید فاضلی بزم شعروسخن میں ایک بڑا نام ہے۔ مرثیہ گوئی میں ایک مقبول مرثیہ نگار، فکر کے حوالے سے کربلائی اور ذکر کے رشتے سے منزل شعور و عشق کے راہی ہیں۔

☆☆☆☆☆

اثر سلطان پوری　　(کراچی)

ولادت یکم ستمبر ۱۹۲۵ء

نام: سید ابرار حسین نقوی، تخلص: اثرؔ، وطن مالوف: موضع نمولی ضلع فیض آباد، یو پی۔
دو برس کی عمر میں والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا۔ مرنے سے قبل انھوں نے اپنے معصوم بچے سید ابرار حسین نقوی کو اپنی ماں (بچے کی نانی) کے سپرد کیا جن کا مسکن قصبہ ایسولی ضلع سلطان پور تھا۔ ابرار کے والد نے دوسری شادی کرلی۔ بچے کا ددھیال سے رشتہ منقطع ہوگیا اور زندگی ننھیال کی گود میں سمٹ آئی۔ نانا عیوض علی اور ماموں محمد عباس ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ایڈوکیٹ جو ذاکر مجالس حسینؑ بھی تھے، انھوں نے ابرار کی تعلیم پر توجہ دی۔ ابرار حسین اثرؔ نے اپنے ماموں کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"انھوں نے میری تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دی اور علم کے حوالے سے جو کچھ میرے پاس ہے وہ انھیں کا دیا ہوا ہے۔"

(کتاب لہو لہو شفق، دیباچہ، ص۔۶)

ادبی ذوق کی تحریک اور پرورش میں ننھیال کے تعلیم یافتہ گھرانے کے ساتھ ساتھ "ایسولی" کی ادبی فضا کا بھی ساتھ تھا۔ ان دنوں "ایسولی" میں ماہانہ مشاعروں کا انعقاد ہوتا تھا جن میں استاد توکل حسین نیرؔ، اُستاد محمد عباس وفاؔ کے استاد عبدالحی خان نادمؔ، مجروحؔ سلطان پوری استاد سراج علی آبادی (شاگرد رشید حضرت آرزوؔ لکھنوی) جیسے باکمال اساتذہ فن شریک ہوتے تھے۔ سلطان پور اُس دور میں مشاعرہ گڑھ کہلاتا تھا۔ ایسولی ابرار حسین کا گھر تھا اور سلطان پور میں وہ تعلیم حاصل کررہے تھے کہ استاد توکل حسین نیرؔ ان کے اسکول میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے تو انھوں نے سید ابرار حسین نقوی کو اصلاح شعر کے ساتھ ساتھ ایک تخلص عطا کیا، اثرؔ۔ اس دن سے ابرار حسین اثرؔ سلطان پوری ہوگئے۔ اس تعلق کے اظہار میں اثرؔ سلطان پوری نے ایک رباعی کہی

جب شمع جلی ذوقِ نظر بھی چمکا
فنکار شعاعوں سے ہنر بھی چمکا
ذرے میں کہاں تاب کہ روشن ہوتا
نیرؔ کی کرن پاکے اثرؔ بھی چمکا

ایک مدت تک اثرؔ سلطان پوری غزل کہتے رہے اور اس منزل پر پہنچ گئے کہ استاد نے

کہا اب تمہیں اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔ تم بغیر اصلاح کے پڑھ سکتے ہو لیکن آثر ہمیشہ غزل کہہ کر استاد کی خدمت میں پیش کرتے رہے کہ ایک دن استاد نے فیصلہ سنا دیا۔

'' ابرار تمہاری زبان غزل کی نہیں مرثیے کی ہے؟ اب تک اس لئے نہیں کہا تھا۔ کہ حساس آدمی ہو کہیں دھکا نہ لگے۔ مگر اب تم راستے کے اس موڑ پر ہو کہ بغیر کہے چارہ بھی نہیں اور ابرار نے غزل گوئی ختم کر دی۔ غزلیں نذر آتش کر دیں۔ مشاعروں میں جانا بند کر دیا۔ ایک عرصہ تک مرثیہ نہ کہہ سکے مگر واہ رے استاد کہ اپنے ساتھ نعت منقبت اور قصائد کی محفلوں میں لے جاتے رہے۔ اور بقول آثر سلطان پوری کے، استاد نے انگلی پکڑ کر مرثیہ گوئی کے آستانے تک پہنچا دیا۔

آثر سلطان پوری نے وطن چھوڑ دیا۔ مجروحؔ سلطان پوری ممبئی چلے گئے۔ آثر پاکستان آگئے۔ تسبیح شعر و سخن کے دانے ہو گئے۔ آثر سلطان پوری مرثیہ گو شاعر بن گئے۔ ان کا شمار اساتذہ میں ہونے لگا مگر وہ یہ سب کچھ اپنے استاد توکل حسینؔ نیر کی رہنمائی کا نتیجہ سمجھتے رہے۔ مجروحؔ سلطان پوری کو یاد کرتے رہے۔ مرثیہ کہتے رہے حتیٰ کہ ان کا مجموعہ مراثی ''لہو لہو شفق'' شائع ہو گیا اس مجموعہ میں ایک جدت یہ ہے کہ بارہ مرثیوں پر افق علم و ادب کے بارہ روشن ستاروں نے روشنی بکھیری ہے یعنی ہر مرثیہ کسی ایک شخصیت کے تبصرے کے ساتھ شریک اشاعت کیا گیا ہے۔ پہلا مرثیہ 'انوار پنجتن'۔ 'یارب دیارِ علم کا جلوہ دکھا مجھے' ڈاکٹر حنیف اسعدی کے تبصرے سے شائع ہوا ہے دوسرا مرثیہ ''شریکۃ الحسین ''۔ دیباچہ 'صحیفۂ قدرت ہے زندگی'' ہے جو ذاکرہ کنیز بتول کے تبصرے اور آثر سلطان پوری کی نانی مرحومہ حکیم النساء بنت منظر حسینؔ کے انتساب کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ علیٰ ہذالقیاس۔

آثر سلطانپوری نے مرثیے کی روایت اور لوازم مرثیہ سے انکار بھی نہیں کیا ہے مگر پابندی کے ساتھ ان لوازم کے حصار میں اپنے مرثیہ کو مقید بھی نہیں کیا اور اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ عہد حاضر موضوعاتی مرثیوں کا دور ہے۔ ان کے مراثی میں واقعہ نگاری، منظر نگاری اور جذبات نگاری پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ ان محاسن کی وضاحت مندرجہ ذیل اقتباسات سے ہوتی ہے۔

مرثیہ شریکتہ الحسین ''

دیباچۂ صحیفۂ قدرت ہے زندگی ہیں انس و جن حروف تو ساکت ہے زندگی

حسن عمل ہے شرط عبادت ہے زندگی تہذیب مرد و زن سے عبارت ہے زندگی

تہذیب مرد، ذاتِ رسالتمآب ہے
زہراؑ شعارِ زن کی مکمل کتاب ہے

جاری ہوا ہدایت انسان کا سلسلہ بھیجے خدا نے کوئی سوا لاکھ انبیاء
دیکھیں ابوالبشر سے اگر تا بہ مصطفیٰ زن کوئی ہادیوں میں نہیں مرد کے سوا

سارے نبی شریعت نسواں لئے ہوئے
ہیں بضعة الرسول کا احسان لئے ہوئے

واقعات کے تسلسل کو واقعہ نگاری کے شاعرانہ انداز سے سجا کر پیش کرنا شاعر کی ہنر مندی کا ثبوت بنتا ہے۔ آدم سے خاتم تک کسی خاتون کا ہادی نہ ہونا واقعات عالم کی کڑی ہے۔ ختمی مرتبت کی نبوت کے بعد ہدایت کے سلسلے کو آگے بڑھانا تاریخی واقعات ہیں۔ ان واقعات کا رخ شریکۃ الحسینؑ، سیدہ زینب کی طرف کیسے موڑا گیا ہے۔ آثر سلطان پوری کی شعری ہنر مندی ہے کہ واقعات اصل شکل میں رہیں اور اُن کا بیان شعری حسن کے ساتھ ہو۔

تبلیغ امرِ رب میں کٹی عمر مصطفیٰؐ ہر حکم ہر عمل سببِ خیر بن گیا
لیکن منافقوں سے جو حکم جہاد تھا حضرت کو اس جہاد کا موقع نہ مل سکا

تھا حکم ربّ تو تکملۂ انصرام کو
نائب کیا رسولؐ نے بارہ امام کو

ایسے ہی امرِ خاص پہ مامور تھیں بتولؑ جاہل سماج کو دے کیا رہنما اصول
نسوانیت کو بخش دیا چہرۂ قبول ہر شعبۂ حیات محبت کا ہار پھول

ہاں بے اخی تعینِ خواہر نہ کر سکیں
بھائی بہن کا پیار اُجاگر نہ کر سکیں

اک آیہ جہاد کا باقی رہا جو کام سردار انبیاء نے چُنے دوازدہ امام
کیا منفرد نیابت زہراؑ کا ہے مقام آیا فقط زبان پہ زینبؑ کا ایک نام

مخدومۂ جہاں کی بصیرت عظیم ہے
زینبؑ عظیم ہے یہ نیابت عظیم ہے

واقعات کا تسلسل، شاعرانہ ہنرمندی کے ساتھ وفات سیدہ زہراؑ سے کربلا تک واقعہ نگاری کمال بیان کا مظہر نظر آتی ہے۔ اس کے بعد کربلا اور شام کی منظر نگاری اور جذبات نگاری اس مرثیے میں بھی قابل ستائش ہے۔

عاشور کو شہید ہوا فاطمہؑ کا لال شاہی سپاہ کرچکی لاشوں کا پائمال
لوٹی گئی اسیر ہوئی فاطمہؑ کی آل گیارہ کو دفن کرکے یزیدی سگ و شغال
آل عبا کو لے کے سپاہِ جفا چلی
طوق و رسن میں غیرتِ مشکلکشا چلی

عبرت کا انقلاب زمانہ سے ہے قیام تشہیرِ شاہزادی کوفہ کا انتظام
قیدی فصیل کوفہ پہ پہنچے قریبِ شام آرائشوں میں شہر کی شب ہوگئی تمام
تا صبح شہر، مصر کا بازار ہوگیا
شدّاد کی بہشت سا دربار ہوگیا

بازار سیرگاہِ خواص و عوام تھا تل دھرنے کی جگہ نہ تھی وہ اژدہام تھا
کوفہ کی عورتوں کا چھتوں پر قیام تھا ہر سو منادیوں کا یہ اعلان عام تھا
انجام باغیوں کا دکھانے کے واسطے
نکلو گھروں سے جشن منانے کے واسطے

قیدی بڑھے تو رونق بازار دب گئی بیڑی چلی تو باجوں کی جھنکار دب گئی
مظلومت سے ظلم کی تلوار دب گئی زینبؑ بڑھیں تو سطوت قہار دب گئی
آئینہ جبیں میں تھا جلوہ امام کا
تھا دبدبہ حسینؑ علیہ اسلام کا

انگلی اٹھائی سازوں کی آواز تھم گئی اونٹوں کی اور گھوڑوں کی آواز تھم گئی
فریاد کرنے والوں کی آواز تھم گئی نالے خموش، سانسوں کی آواز تھم گئی
سب چپ ہوئے تو بنت علیؑ بولنے لگی
زینبؑ حسینیت کی گرہ کھولنے لگی

بین کے معاملہ میں آثر سلطان پوری قدرے محتاط ہیں۔ ان کے مرثیوں میں زیادہ تر

شاعر بین کرتا ہے۔ وہ واقعہ نگاری، منظر نگاری اور جذبات نگاری میں بین کے تاثرات پیدا کر لیتے ہیں اور جہاں کہیں کربلا کے کردار بولتے ہیں وہاں بھی وقارِ خانوادۂ رسالت کا پاس رکھتے ہیں۔ مثلاً اس مرثیہ میں بازارِ کوفہ میں ایک ضعیفہ پیاسی سکینہ کو پانی پیش کرتی ہے اور عرض کرتی ہے ۔

بولی بجھے جو پیاس تو شکرِ خدا کرو
پھر اے یتیم کچھ میرے حق میں دعا کرو

سیدہ زینبؑ نے سکینہ سے کہا پہلے اس کے لئے دعا کرو۔ ضعیفہ نے کہا میرا شوہر باہر گیا ہوا ہے۔ اس کی سلامتی سے واپسی کی دعا کرو۔ سکینہ نے دعا کی ۔

خاوند کے لئے نہ یہ بی بی دو نیم ہوں
بچے نہ ان کے میری طرح سے یتیم ہوں

اب مکالمات کا انداز— ضعیفہ کہتی ہیں ۔

بولی خدا دکھائے مدینے کی صبح و شام — زینبؑ پکاریں کیا ہے مدینے سے تجھ کو کام
بولی وہیں تو جمع ہیں دو قبلۂ انام — بھائی امام اور بہن سایۂ امام
گھر بھر میں یوں تو یکدل و یک جاں سے ہیں حسینؑ
زینب مگر حسینؑ سے زینبؑ سے ہیں حسینؑ

فرمایا اب نہ رہ گیا زینبؑ کا وہ وقار — وہ بولی ایسی شام دکھائے نہ کردگار
فرمایا اب ہے آنکھ کی پہچان سے بھی عار — وہ بولی آنکھ کور نہ ہو ایسی دور پار
دیکھوں تو آنکھ اُن کے قدم سے ملوں گی میں
میں ہوں کنیز برسوں کی پہچان لوں گی میں

زینبؑ پکاریں گوشۂ رخ سے ہٹا کے بال — امِ حبیبہ دیکھ میں زینبؑ ہوں خستہ حال
عباس ساجری ہے نہ اکبر سا خوش جمال — عشرہ کو سب شہید ہوئے مصطفیٰ کے لال
ہنگامِ عصر کاٹا گیا سر حسینؑ کا
وہ ہے سناں پہ فرقِ مطہر حسینؑ کا

اس طرح آثر سلطان پوری نے تمام مراثی میں ان کے محاسن یکساں اُجاگر ہیں۔

☆☆☆☆☆

نصیؔر بنارسی:- (کراچی)

ولادت ۱۳؍اکتوبر ۱۹۳۶ء

نام سید نصیر الدین حیدر۔ تخلص نصیؔر، وطن بنارس، والد کا اسم گرامی سید فخر الدین حیدر مرحوم ریٹائرڈ انسپکٹر پولیس بہار۔۔۔ نصیؔر بنارسی نے ۱۹۴۳ء میں ہریش چندر انٹر کالج بنارس سے میٹرک اور کوئنز کالج بنارس سے ۱۹۴۵ء میں ایف۔اے کیا۔ اس کے بعد خرابی صحت کی بنا پر تعلیم جاری نہ رہ سکی۔ ہندوستان میں زمینداری کا خاتمہ ہوا تو ۱۹۵۶ء میں کراچی آ گئے۔

شاعری کا سلسلہ ہجرت کے بعد زیادہ پابندی سے قائم ہوا۔ انجمن سفینۂ ادب کراچی کی نشستوں میں مسلسل شرکت کی اور جناب فضل فتح پوری سے قرب بڑھا تو مرثیہ گوئی پر مائل ہوئے۔ ۱۹۷۳ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ انہوں نے پانچ مرثیے کہے۔ انجمن سفینۂ ادب کراچی کے شائع کردہ مجموعۂ مراثی ''ذاکرِ فغاں'' مطبوعہ ۱۹۷۵ء میں نصیر بنارسی کے تین مرثیے شائع ہوئے ہیں۔ اس مجموعے میں شامل مرثیے ''حسینؑ ذات وصفات'' کے چند بند ان کے ابتدائی دور کی مرثیہ گوئی کا نمونہ ہیں۔

ہر پھول نذر، رونق فصلِ بہار نذر گلزار نذر، رنگ شفق، لالہ زار نذر
اکبر کی خوش نوائی پہ صورت ہزار نذر جاں نذر، ایک بار نہیں بار بار نذر
یہ شاعری میری تیرے قدموں کی دھول ہے
لاؤں کہاں سے نذر کے لائق جو پھول ہے

پھولوں کا رس، صبا کی روانی، نفس کا رم خوشبوئے گل، حلاوتِ شہد وصفائے یم
رُخ پر گلوں کی اوس سے پیدا وضو کا نم رنگِ شفق نکھار فضاؤں کا صبحدم
سب تازگی سمیٹ کے فصلِ بہار کی
خدمت ہیں نذر دوں شہِ والا تبار کی

(مکتوب بنام عاشور کاظمی مارچ ۲۰۰۳ء)

نصیؔر بنارسی وسیع النظر شاعر ہیں۔ انہوں نے مرثیے کی کلاسیکی اقدار اور فریم ورک (frame Work) کی پاسداری کی ہے لیکن جدید فکری تقاضوں کو نظم کے قالب میں ڈھالنے کی مسلسل کوشش بھی ہے۔ دو مختلف عناصر کے یک جا ہونے کا اثر یہ ہوا کہ ان کے مراثی کہیں شکوہ

لفظی میں دبستانِ دبیر کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ اور کہیں انیسؔ کی فصاحت کا اُجالا پھیلاتے ہیں البتہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس منزل کی طرف بہر حال گامزن ہوئے جسے شادؔ جوشؔ اور نجمؔ جیسے شعراء نے تعمیر کیا تھا۔ نصیرؔ بنارسی کے مراثی میں منظر نگاری ایک نمایاں وصف ہے۔ سید ضمیر اختر نقوی نے نصیرؔ بنارسی کے متعلق لکھا ہے کہ:

> ''نصیر بنارسی نے کوشش کی ہے کہ صبحِ عاشور خالص عراق کی صبح معلوم ہو وہ کسی حد تک اس میں کامیاب ہوئے ہیں لیکن اردو شاعری میں جو مناظر صبح کے ملتے ہیں وہ آج بھی پسندیدہ نظر سے دیکھے جاتے ہیں اس لئے کہ وہ ہمارے دیس کی صبح کے مناظر ہیں ہم کو انہی سے قلبی لگاؤ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نصیرؔ بنارسی کے بند متاثر نہیں کرتے۔

(اردو مرثیہ پاکستان میں۔ ص ۴۰۶)

شہادتِ حسینؑ کربلا کے صحرا میں ہوئی۔ کربلا ملک عراق میں ہے۔ صبح عاشور اس دن کی صبح تھی جس دن خانوادر سالت کو تاراج کیا گیا تھا۔۔ اس صبح کی عکاسی اگر عراق کے موسم کے حوالے سے نہ کی جاتی تو کیا قطب شمالی کی برف باری کے حوالے سے کی جاتی یا واقعہ عراق میں ہوا اور منظر نگاری صبح بنارس کی ہوتی تو پھر چھنگا صاحب حسینؑ کے مرثیے میں کیا برائی ہے جنہوں نے کربلا میں برف باری کرادی اور پیاس کی شدت کے تصور کو ختم کر دیا۔ راقم الحروف کی نظر میں یہ تو نصیرؔ بنارسی کے کلام کا حسن ہے کہ انہوں نے عاشور کی صبح کو عراق کے موسم کے حوالے سے پیش کیا ہے۔

شفاف آسماں پہ نہ تھا ابر کا نشاں کیا قصر نیلگوں پہ تھا بے داغ سائباں
بے گرد و بے غبار فضا تھی جو بے گماں گویا نظر کے سامنے پھیلا تھا لا مکاں
سجدے سے جونہی اس نے اٹھایا جبین کو
حسرت سے آفتاب نے دیکھا زمین کو

وہ مرکزِ بہار، تجلی، وہ ریگ زار وہ نخل ہائے خرمہ، وہ اشجار خار دار
ریتی طلوعِ صبح سے اتنی تھی آبدار جیسے روپہلے فرش پہ زرتار کی بہار
یہ ریت پر نشاں تھے ہوا کے خرام کے
یا حرفِ آرزو تھے کسی کے پیام کے

مرثیہ جیسی عظیم صنف سخن کو کلاسیکی عہد کی اس سوچ نے نقصان پہنچایا ہے کہ ہر واقعہ کو اپنے ماحول کے مناظر میں دیکھا جائے۔ صبح کا ذکر ہے تو صبح بنارس کی منظر کشی کی جائے شام کا واقعہ ہو تو شام اودھ کی تصویر پیش کی جائے۔ بیٹوں کی لاشیں سامنے آئیں تو ماں وہ بین کرے جو ہمارے گھروں میں ہوتے ہیں اور اس بات کو فراموش کر دیا جائے کہ یہ ان ماؤں کا ذکر ہے جو اپنے بچوں کو سجا کر میدان میں بھیج رہی تھیں اور قسم دیکر رخصت کرتی تھیں کہ زندہ واپس نہ آنا۔ نبی کے لال پر اپنی جان کا فدیہ دے دینا۔

نصیر بناری کا یہ اقدام مستحسن ہے کہ وہ حقیقت نگاری کے قریب رہے۔ ان کے ایک اور مرثیہ ۔ اے کربلا بہار گلستاں حریت" میں انھوں نے ریگزار کربلا اور فرات کی ترائی کی منظر کشی کی ہے جو حقیقت کے دائرے میں ہے۔

کیکر، کھجور، ناگ پھنی، بیر اور ببول　　اشجار تھے ترائی میں پیدا نہ عرض و طول
دریا سے گر جو بیٹھے تو آفات کی نزول　　اک برگ سبز کا وہاں دشوار تھا حصول
اس دشتِ بے گیاہ میں مسکن تھا شاہ کا
ڈیرا ترائی میں تھا یزیدی سپاہ کا

یہ پورا مرثیہ نصیر بناری کی پختہ گوئی کی سند ہے۔

اے کربلا، بہارِ گلستان حریت　　فکر و عمل کے واسطے تو عرش منزلت
پھیلی ہوئی ہے چار طرف تیری سلطنت　۱　بیشک متاع زیست ہے تیری ہی معرفت
تیری نوا کی گونج ہمیشہ جواں رہے
روشن تیرے لہو سے یہ کون و مکاں رہے

اے کربلا گواہ ہے ساحل فرات کا　　اُترا تھا بیکسوں کا یہاں ایک قافلہ
سالار قافلہ بھی کوئی اور تو نہ تھا　۵　جانِ بتول، سبط نبی، شاہِ دوسرا
نرغے میں ظالموں کے ہمارا امام تھا
بدلی میں شامیوں کی وہ ماہِ تمام تھا

القصہ خیر و شر کے تصادم کا معرکہ　　روز دہم کو ماہ محرم میں جب ہوا
اکسٹھ تھا سن وہ ہجری کا اے وا مصیبتا　۶　ساحل فرات کا تھا وہ اور دشتِ کربلا

پرچم کشائے حق تھا نواسہ رسولؐ کا
ہمراہ تھا یزید کے مجمع جہول کا

یہ سانحہ عظیم ہے اور نیم جاں ہوں میں مولا مدد کا وقت ہے اور ناتواں ہوں میں
بس ایک آسرا ہے سگِ آستاں ہوں میں ۸ شیریں زباں ہوں اور نہ شیوہ بیاں ہوں میں
زورِ بیاں عطا ہو کہ کچھ واقعہ لکھوں
جو کربلا میں بیت گیا واقعہ لکھوں

شہادت علی اکبر کے بیان میں نصیرؔ بنارسی نے ایک بند کہا ہے۔

سر پہ اجل ہو، راہ میں ہو منظر قضا اکبر سے نوجواں کو ہو مقتل کا سامنا
اس پر بھی صبر و شکر کا سجدہ ہے مرحبا بیٹا جوان مرنے کو جاتا ہے آپ کا
یہ آپ ہی کا کام تھا اے مرحبا، حسینؑ
اے ضیغم زعیم، شہ لافتیٰ حسینؑ

یہ ہیں جدید مرثیے کے تیور— نصیرؔ بنارسی نے کہیں اہل بیت نبوت کی زبان سے بین نہیں کرائے بلکہ خود بین کیے ہیں۔

میں نے بپاس الفت سردار کربلا لکھا نصیرؔ اکبر مہ رو کا مرثیہ
کیا چیز اجر ہوتا ہے، کیا داد، کیا صلہ سودائی ہوں میں مجھ کو غرض اس سے کیا بھلا
مجھ کو فقط حسینؑ کی اُلفت سے کام ہے
کچھ نام ہے تو ذکرِ شہِ دیں میں نام ہے

نصیرؔ بنارسی نے حسینؑ اور سپاہ حسینؑ کو راہ فلاح و نجات کا راستہ قرار دیا ہے، اس راہ میں ان کی فکر میں تسلسل ہے۔

لطف و کرم سخی و عطا، رسم دلدہی صدق وصفا و صبر و رضا عزم و آگہی
کام و دہن ہیں جام شہادت کی چاشنی فاقوں پہ بھی ثبات قدم کی تو نگری
یہ ہیں سلاح جنگ، حسینی سپاہ کے
سر ہو گئے اُن کے معرکے جو بھی ہیں راہ کے

آفات دو جہاں کو تہِ دام کیجیے چرنوں میں اس حسینؑ کے بسرام کیجیے

قبضے میں گردشِ سحر و شام کیجئے منزل پہ جاکے شوق سے آرام کیجئے

عزت کی زندگی ہو جو مقصد حیات کا

رستہ حسینؑ کا ہے فلاح و نجات کا

☆☆☆☆☆

اقبالؔ کاظمی:- (کراچی)

تاریخ پیدائش (بموجب تعلیمی اسناد) ۷ مارچ ۱۹۳۰ء۔ (مطابق خودنوشت مکتوب نام عاشور کاظمی مرقومہ ۳۰ مئی ۲۰۰۲ء) ۱۵ر دسمبر ۱۹۲۹ء۔

نام، سید اقبال حسینؑ کاظمی، ادبی نام اقبال کاظمی، تعلیم بی اے کراچی یونیورسٹی۔ شیل کمپنی کے مختلف ملکی اور غیر ملکی ٹریننگ اور مینجمنٹ کورسز اس کے علاوہ۔

خانوادے کا تعارف: اقبال کاظمی کے والد سید تفضل حسین رئیس، معافی دار ریاست بھرت پور راجستھان۔ معروف عالم اور مرثیہ نگار مرزا غضنفر حسینؑ عروجؔ بھرتپوری ماموں زاد چھوٹے بھائی اور شعر سخن میں ان کے شاگرد تھے، نیز حضرت ظہیر دہلوی (مصنف خودنوشت سوانح حیات داستان غدر عرف طراز ظہیری و دیوان غزلیات'' گلستاں سخن''سنبلستان عبرت''اور دفتر خیال'') اقبال کاظمی کے والد حضرت تفضل حسینؑ رئیس کے نانا تھے— اقبال کاظمی کی والدہ محترمہ، ممتاز مرثیہ گو حضرت فیضؔ بھرتپوری کی (حقیقی تایازاد) بڑی بہن اور معروف شاعر، آرٹسٹ، سید ارشاد حسینؑ زیدی کی چھوٹی بہن تھیں، ان رشتوں سے شعروسخن اور مرثیہ گوئی اقبالؔ کاظمی کی وراثت ہے۔

اقبال کاظمی بھرتپور سے میٹرک پاس کر کے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں اپنے اہل خاندان کے ساتھ کراچی آئے۔ ۳ر نومبر ۱۹۴۷ء کو انہیں برما شیل (حالیہ شیل پاکستان) میں ملازمت مل گئی۔ جون ۱۹۹۴ء تک وہ شیل پاکستان سے وابستہ رہے۔ اس عرصہ میں انھوں نے گریجویشن کیا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۷ء تک مینجمنٹ کیڈر میں شامل ہونے سے پہلے وہ ٹریڈ یونین تحریک میں بہت فعال رہے۔ پاکستان پیٹرولیم ورکرز فیڈریشن (PPWF) کے سیکریٹری جنرل انٹرنیشنل فیڈریشن آف پیٹرولیم اینڈ کیمیکلز ورکر فیڈریشن (امریکہ) سے ملحق انڈسٹریل فیڈریشن کے فعال کارکن۔ پاکستان نیشنل فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز کے بانی رکن اور سیکریٹری جنرل رہے۔ ۱۹۶۷ء میں شیل کی انتظامیہ میں اہم عہدے پر پہنچ گئے۔ انھوں نے شیل سپورٹس کلب کے زیر اہتمام بین الاقوامی

مشاعروں کی بنیاد رکھی اور ۱۹۸۷ء سے ریٹائرمنٹ تک سالانہ مشاعرے کراتے رہے لیکن ان کا اہم ترین کام ۱۹۹۳ء میں مرثیہ فاؤنڈیشن کا قیام ہے۔ سیّد اقبال کاظمی کنویز مرثیہ فاؤنڈیشن کی رپورٹ کے مطابق باقرؔ زیدی (حال مقیم میری لینڈ۔ امریکہ) نیرؔ اسعدی۔ قمرؔ حسنین، ساجد رضوی اور ثمرؔ حسنین کے اسمائے گرامی بنیادی اراکین کی حیثیت سے شائع کئے گئے ہیں۔

مرثیہ فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام مرثیہ کی ترویج و توسیع کے ضمن میں سالانہ آٹھ مجالس نوتصنیف مرثیہ کا انعقاد باقاعدگی سے ہوتا ہے۔ مرثیہ فاؤنڈیشن کی سالانہ نوتصنیف مراثی کی مجالس کے اب تک بارہ پروگرام ہو چکے ہیں اور ہر سال آٹھ نوتصنیف مرثیوں کے حساب سے (جو مختلف شعرا کرام پڑھتے ہیں) اب تک ۹۶ نوتصنیف مراثی کہے جا چکے ہیں۔

(مکتوب بنام عاشور کاظمی مرقومہ ۳۰ رمئی ۲۰۰۳ء)

مرثیہ فاؤنڈیشن نے نایاب مراثی کی اشاعت کا کام بھی شروع کیا ہے۔ ظہیرؔ دہلوی کے مراثی کا مجموعہ ''اوراقِ کربلا'' مرزا غضنفر حسین عروجؔ (جنھیں اقبال کاظمی بڑے ابا کہتے ہیں) کا مجموعہ مراثی ''عروج المراثی'' شائع ہو چکے ہیں۔

اقبال کاظمی نے شاعری کا آغاز بہت پہلے کر دیا تھا۔ مگر مرثیہ کی طرف وہ ۱۹۹۰ء میں آئے۔ اب تک وہ دس موضوعاتی مرثیہ کہہ چکے ہیں۔ پہلا مرثیہ ''انسان'' تھا جو ۱۹۹۰ء کی تخلیق ہے۔ بعد ازاں (۲) آزادی'' ۱۹۹۱ء (۳) ''رنگ'' ۱۹۹۲ء (۴) ''ہجرت'' ۱۹۹۳ء (۵) انتظار ۱۹۹۴ء (۶) ''امتحان'' ۱۹۹۵ء ہیں۔ چھٹے مرثیہ امتحان میں اقبال کاظمی نے اپنی مرثیہ گوئی کو پہلے مرثیے سے مسلسل کیا ہے۔ مرثیے کا دوسرا بند ان کے پہلے مرثیے انسان سے پانچویں مرثیے ''انتظار'' تک کا تسلسل'' تیسرا بند چھٹے مرثیے کے موضوع کی جستجو اور چوتھا بند عنوان ''امتحان'' جسے انھوں نے اپنے لئے بھی امتحان قرار دیا ہے۔

''انسان'' پہ گفتگو تھی مقدم، سو ہم نے کی ''آزادی'' ایک مرکزِ حسنِ نظر نبی
''رنگ'' سخن نے اک نئی تصویر کھینچ دی ۲ ''ہجرت'' بھی راہ فکر سے تکمیل پا گئی

موضوع انتظار کی لذت ہی اور ہے
اس مرثیہ میں فکر کی صورت ہی اور ہے

اک ایسے مرثیہ کی ہے اب اور جستجو مصرعے رواں ہوں اس میں کہ بہتی ہو آبجو

الفاظ ہوں کہ باغ میں گلہائے رنگ و بو ۳ بزم عزا میں ہو سکے عاجز یہ سرخرو
اللہ میری فکر کو روحِ کمال دے
عنوان مرثیہ کے لئے بے مثال دے

حق نے عطا کیا ہے یہ عنوانِ مرثیہ اک اور طاقِ فن پہ جلاتا ہوں میں دیا
آئینۂ شعور کو جس کے ملے جلا ۴ بزم عزا میں سب کو نظر آئے کربلا
عنوان مرثیہ کا میرے امتحان ہے
یہ امتحان میرے لئے ''امتحان'' ہے

اقبالؔ کاظمی کا کہا ہوا ساتواں مرثیہ (۷) ''دل'' ۱۹۹۴ء (۸) ''برادر'' ۱۹۹۷ء (۹) ''عدل ۱۹۹۸ء اور مرثیہ نمبر (۱۰) ''محبت'' ۲۰۰۳ء ہے — ''انسان'' سے ''محبت'' تک کے سفر میں اقبالؔ کاظمی ماہرانہ انداز میں حقائق کے استعاراتی اور فنکارانہ برتاؤ کے جیتے جاگتے نمونے چھوڑ کے گذرے ہیں۔ مثلاً ان کے تیسرے مرثیہ ''رنگ'' کے چہرے کا ایک بند ''رنگ'' کے کئی (Shades) پرتو'' دکھاتا ہے۔

برگِ حنا سے ہاتھوں کو رنگِ حنا ملا چہروں کا رنگ کھل اُٹھا جب آئینہ ملا
نظریں کھلی تو آنکھوں کو رنگِ حنا ملا رنگوں میں رنگ غیض کا سب سے جدا ملا
غصے میں رُخ پہ کب کہیں دیکھا ہے ایک رنگ
آتا ہے ایک رنگ تو جاتا ہے ایک رنگ

اور یہی رنگ جب مرثیہ کے اختتام تک (مصائب کی منزل تک) پہنچتا ہے تو اقبال کاظمی کہتے نظر آتے ہیں۔

کرب و بلا میں دیکھئے تنہائی امام گھیرے ہوئے ہے شاہ کو فوجِ امیرِ شام
خنجر تلے ہوا ہے وہ سجدے کا اہتمام جو وقت عصر دے گیا اسلام کو دوام
کرب و بلا میں دین خدا کو بچالیا
گھر دے کے شہ نے خانۂ کعبہ بچالیا

کعبہ کہ جس سے زیست کو ملتی ہے روشنی جو امن کا نشان ہے اور جائے آشتی
مرکوز جس پہ سارے زمانوں کی بندگی کعبہ سیاہ رنگ میں ملبوس روشنی

شہ ہو گئے جُدا تو مسلسل عزا میں ہے
کعبہ سیاہ پوشِ غمِ کربلا میں ہے

چوتھے مرثیے ،ہجرت، میں اقبالؔ کاظمی نے ہجرت کو تاریخی سوالوں سے سجایا ہے۔ انہوں نے آدم کے زمین پر آنے کو پہلی ہجرت سے تعبیر کیا ہے ۔

ارتقائے بشریت کا سفر ہے ہجرت راہرو نوعِ بشر، راہ گذر ہے ہجرت
شب تاریک میں امید سحر ہے ہجرت اک نئے دور کے آغاز کا در ہے ہجرت
جانب فرش زمیں خُلد کا باسی نکلا
پہلی ہجرت کے لئے آدمِ خاکی نکلا

اور یہی ہجرت جب اقبالؔ کاظمی کربلا کے منظرنامے میں ڈھونڈتے ہیں تو انہیں ہجرت کا ایسا منظر آتا ہے جو ان کی ندرت خیال کا منظر بھی ہے اور ان کے مصائب لکھنے کا جداگانہ انداز بھی ہے

گردنِ اصغر معصوم سے جب کھینچا تیر اپنے چہرے پہ ملا شاہ نے خونِ بے شیر
بن گئے سبط نبی درد و الم کی تصویر ۶۳ لاش خیمے کی طرف لے کے چلے جب شبیرؑ
کشمکش ذہن میں مولا کے عجب جاری تھی
یہ گھڑی صبر کے خالق پہ بہت بھاری تھی

کشمکش یہ تھی کہ اب لاش کو لے جائیں کہاں یہ تو مقتل ہے یہاں کوئی نہیں جائے اماں
سوچ کر یہ سوئے خیمہ ہوئے شبیرؑ رواں ۶۴ منتظر ہوگی درِ خیمہ پہ بے شیر کی ماں
لاش بے شیر کی، کس طرح سے ماں دیکھے گی
اور اگر لاش نہ جائے گی تو کیا سوچے گی

اسی عالم میں سوئے خیمہ کبھی جاتے تھے اور کبھی لوٹ کے مقتل کی طرف آتے تھے
یہ عمل دشت میں شبیر جو دہراتے تھے فیصلہ کوئی تذبذب میں نہ کرپاتے تھے
چند قدموں کی مسافت میں قیامت دیکھو
باپ کے ہاتھوں پہ بے شیر کی ہجرت دیکھو

اقبال کاظمی کے مراثی، رثائی ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہیں نیز مرثیہ فاؤنڈیشن کے

زیرِ اہتمام وہ اور ان کے رفقائے کار ترویج مرثیہ پر جو کام کر رہے ہیں وہ گویا رثائی ادب کی تاریخ کے نئے باب لکھ رہے ہیں۔ ترویج مرثیہ اور ترغیب مرثیہ گوئی میں اس حد تک کامیاب ہیں کہ انھوں نے مستند مزاح نگار شاعر دلاور فگار کو مرثیہ کہنے پر آمادہ کرلیا اور دلاور فگار نے اپنا پہلا اور آخری مرثیہ "مرثیہ فاؤنڈیشن" کی سالانہ مجالس نو تصنیف مرثیہ میں پڑھا۔ ساری زندگی طنز بردار مزاح کے نشتر چلانے والے شاعر کو اقبال کاظمی نے زادِ آخرت کے طور پر مرثیے کی سوغات تجویز کی جسے دلاور فگار اپنی زندگی کے اعمال نامہ میں سجا کر حیات نصیب موت کے سائے میں چلے گئے۔ افسوس ہے کہ کوشش کے باوجود دلاور فگار کا وہ مرثیہ نہیں مل سکا۔ اقبال کاظمی بھی وہ مرثیہ نہ ڈھونڈھ سکے جس کے محرک بھی وہ خود تھے اور ثواب میں شریک بھی۔ جی چاہتا تھا کہ ہم اس کتاب میں وہ مرثیہ شائع کر کے ہم ایک دوست، ایک ہم عصر شاعر دلاور فگار کا قرضِ محبت ادا کر سکتے مگر اے بسا آرزو...... ؟

☆☆☆☆☆

کوثر الہ آبادی:- (کراچی)

ولادت یکم فروری ۱۹۳۱ء

نام سید ابرار حیدر۔ تخلص کوثر۔ سادات رضوی۔ وطن قصبہ کنڑا ضلع الہ آباد۔ قلمی نام کوثر الہ آبادی۔ والد کا اسم گرامی سید ابوالحسن رضوی۔ ہندوستان میں کانپور سے میٹرک پاس کیا جہاں ان کے والد گرامی سب انسپکٹر پولیس تھے۔ ۱۹۵۰ء میں ترک وطن کر کے پاکستان آگئے۔ اور پنجاب یونیورسٹی سے ادیب عالم اور ادیب فاضل کے امتحانات پاس کیے۔

ادبی زندگی: کانپور میں روحی الہ آبادی، قتیل الہ آبادی اور ادریس احمد ادیب ایسے استاد تھے جن کے فیض سے ادب کی طرف رجحان ہوا اور شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے۔ یہ ساحر، جوش اور فیض کا دور تھا جو اپنی اپنی جگہ پر دبستان تھے۔ کوثر الہ آبادی ان دبستانوں سے متاثر ہوئے۔ اصغر گونڈوی کو پڑھا تو ایک اور سرور سے آشنا ہوئے۔ انہیں دنوں بادشاہ مرزا ثمر لکھنوی کے مراثی کو تواتر اور انہماک سے سنا۔ جوش کے 'حسین اور انقلاب' نے اذہان میں انقلاب برپا کر رکھا تھا۔ ثمر لکھنوی کے مرثیوں نے بس طوفان کو بہاؤ کا راستہ دے دیا اور کوثر الہ آبادی مرثیہ گوئی کی راہوں پر چل نکلے۔ کوثر الہ آبادی کو حصولِ تعلیم کے زمانے میں مصوری کا شوق تھا۔ مناظر قدرت کو

برش اور رنگوں کے ذریعے کینوس پر منتقل کیا کرتے تھے۔ مرثیہ گوئی کی طرف آئے تو یہ شوق بھی برقرار رہا لیکن اب برش اور رنگوں کے ذریعے نہیں بلکہ جوشؔ کی شاعری کے مطالعہ نے لفظوں کو برتنے کا جو سلیقہ سکھایا تھا اسے بروئے کار لانے لگے اور لفظوں سے منظر کشی کرنے لگے۔ لفظوں سے کرداروں کی تصویریں بنانے لگے۔

کوثرؔ الہ آبادی اپنے ماموں، ممتاز مرثیہ گو حضرت فضل فتحپوری سے بھی بہت متاثر ہیں۔ انہیں کی تحریک پر کوثرؔ الہ آبادی نے ۱۹۷۰ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ انہوں نے بیس سے زیادہ مرثیے کہے ہیں جن میں سے ۲۰ مرثیے ''مسافت شب'' کے نام سے انجمن سفینہ ادب کراچی نے شائع کئے ہیں۔ اس کتاب پر سید سبط حسن رضوی اور اسد اریب نے تقاریز لکھی ہیں۔

کوثرؔ الہ آبادی نے موضوعاتی مرثیے کہے ہیں۔ اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے مراثی کے عنوانات بھی مقرر کئے ہیں اور موضوعات سے انصاف بھی کیا ہے لیکن موضوعات کی وضاحت میں کہیں مرثیہ کا تاثر مجروح نہیں ہونے دیا۔ تاریخی شعور اور واقعات کے تسلسل کو برقرار رکھا ہے نیز اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ مرثیے میں مفروضہ واقعات یا خلاف وقوعہ امور نظم نہ ہوں۔ ان کا مرثیہ علمدار حسینؑ ''جب افق پر ہوا خورشید کا زرتاج عیاں'' منظر نگاری (لفظی مصوری) کا نمونہ ہے ۔

ہر طرف پھول ہیں، تا حدِ نظر، پھول ہی پھول ۔۔۔ اک عجب شان سے بالائے شجر پھول ہی پھول
سبزہ تازہ پہ ہمرنگِ گہر پھول ہی پھول ۔۔۔ جس طرف بھی نظر اٹھ جائے ادھر پھول ہی پھول
شاق ہے ذکرِ خزاں، ہے یہ زمانہ گُل کا
لُٹ رہا ہے سرِ گلزار خزانہ گُل کا

وہ نظم جو رثا کے تقاضوں کو پورا کرے مرثیہ ہے۔ اس حوالے سے مرثیہ کا لفظ سنتے ہی ایک حزن ویاس اور رنج وغم کی فضا ذہن پہ چھا جاتی ہے۔ اس فضا میں یا اس فضا کو مرثیہ میں برقرار رکھتے ہوئے شگفتہ مناظر کی مصوری کرنا آسان نہیں ہوتا۔ کوثرؔ الہ آبادی ان مرثیہ گو شعراء میں شامل ہیں جو یہ فن جانتے ہیں۔

کوثرؔ الہ آبادی کا ایک مرثیہ ''غلامی اور اسلام'' کو بڑی ندرتوں کا حامل مرثیہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ مرثیہ تاریخ اسلام کے ان درخشندہ ناموں کے واقعات پر مبنی ہے جو غلام کہلائے مگر ان کی

غلامی کو شاہی نے رشک سے دیکھا۔ ان میں حضرت زیدؓ بن حارثہ، حضرت بلالؓ، حضرت قنبرؓ اور حضرت جونؓ بھی شامل ہیں اور خانوادۂ رسالت کی کنیز جناب فضہؑ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ مرثیے کا اختتام کربلا میں حضرت جونؓ کی شہادت کے بعد جناب فضہ کے بین پر ہوتا ہے۔

اے جونؓ غم نہ کرنا کہ تم بے کفن رہے   تم کیا جو یونہی لاشِ شہِ ذوالمنن رہے
ماموںِ جور جب نہ نبی کا چمن رہے   عزت یہ ہے کہ تم بھی شریک محن رہے

جب بھی کہیں حسینؑ کا پیغام جائے گا
اے جون ساتھ ساتھ تیرا نام جائے گا

مرثیہ کا یہ اختتام شاعر کی آسودگی فکر کی دلیل ہے۔ فضہ ملک حبش کی شہزادی نے وطن لوٹنے کے بجائے برضاو رغبت سیدہ فاطمہ زہراؑ کی کنیزی کو ترجیح دی۔ سیدہ فاطمہؑ نے فضہؑ کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا کہ ایک دن شہزادی کو نین فاطمہ زہراؑ چکی پیستی تھیں اور ایک دن فضہؑ کو یہ شرف ملتا تھا۔ جونؓ وہ خوش نصیب آزاد کردہ غلام جو کربلا میں زخمی ہو کر گھوڑے سے گرا تو مولا حسینؑ کو آواز دی اور جب جونؓ کی روح قفس عنصری سے پرواز کی تو جون کا سر امام حسینؑ کے زانو پر تھا۔ اس پس منظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے فضہؑ کا جونؓ کی شہادت کو عزت کہنا کیسی برمحل اور بے لاگ صداقت تھی جو شاعر نے فضہؑ اور جونؓ سے منسوب کی۔

کوثرؔ الہ آبادی کا ایک مرثیہ ملوکیت اور اہلبیت ہے۔ تخلیق کائنات سے شروع ہوتا ہے

جب لفظ کیا، ذہن کی بھی خلقت ہوئی نہ تھی   حاصل یہ حرف ''کن'' کو سعادت ہوئی نہ تھی
خود حرف کن کے خلق کی صورت ہوئی نہ تھی   ۲   عرفِ صفت کی حق کو ضرورت ہوئی نہ تھی

یہ قصہ یوں تو بارِ طبیعت ہے آپ کا
اب داد دیں تو حسنِ سماعت ہے آپ کا

مرثیہ میں اِس منزل سے تخلیق بشر تک، تخلیق سے فطرت بشر تک کی منظر کشی بڑی چابکدستی سے کی گئی ہے اور ادھر مرحلہ سودائے حکومت تک پہنچا۔

تھا ابتدا سے خلقتِ آدم کا اک قوام   ذہن بشر میں ملک کی خواہش رہی مدام
غاروں میں زندگی ہو کہ محلوں میں ہو قیام   ۱۸   در در کی ٹھوکریں ہوں کہ شاہی کا اختتام

سر میں جنونِ حاکمیت جاگزیں رہا
پرکار گھومتا رہا نقطہ وہیں رہا

قانون فلسفہ کی ہوئی ملک پر بنا　　۲۰　رطب الاساں علوم تھے شاہی کے جا بجا
آئینِ سلطنت ہو کہ علم معاشرہ　　سبِ ملک کے تحفظِ ذاتی کا ڈھونگ تھا
یوں ارتکازِ ملک کے قانون بن گئے
فرعون بن گیا کہیں قارون بن گئے

مدِ نظر خدا کے مگر تھا یہ اہتمام　　باقی رہے بشر کی جبلت نہ بے لگام
بھیجا زمیں پہ سلسلہ انبیاء تمام　　۲۱　آدمؑ خلیلؑ موسیٰؑ و عیسیٰؑ سے خوش کلام
سب نے یہی کہا کہ جہاں کو ممات ہے
نیکی کرو کہ اس کے صلے میں حیات ہے

ہے سن کے بادشاہوں کے ماتھے پہ بل پڑے　　ان کی انا کو ٹھیس جو پہنچی اُبل پڑے
آواز حق و عدل دبانے نکل پڑے　　۲۲　ان ہادیوں کے دشمن جاں بن کے چل پڑے
کشتی پہ دیں کی ایسے بھنور بن کے پڑ گئے
جن سے گڑے پہاڑوں کے پنجے اُکھڑ گئے

ناگاہ آفتابِ رسالت عیاں ہوا　　روشن ہوئی زمیں فلک ضوفشاں ہوا
ذرّوں کا عالم آج تک ایسا کہاں ہوا　　۳۰　خاک عرب پہ کاہکشاں کا گماں ہوا
انسانیت کے نور کی طغیانی ہو گئی
جلووں کی اوجِ طور کے ارزانی ہو گئی

اس کے بعد ملوکیت اور اہلبیت کا ٹکراؤ شروع ہوا۔ حضور نے اسلام پھیلایا۔ نہ ماننے والوں نے مزاحمتیں کیں۔ جنگیں ہوئیں۔ فتح مکہ کے بعد ابوسفیان کا اسلام لانا۔ آل ابی سفیان کا آلِ رسولؐ سے رویہ، یہاں تک کہ کربلا تک بات پہنچی۔ اس ساری تاریخ کو کوثر الہ آبادی نے اس مرثیے میں تسلسل اور احتیاط سے نظم کیا ہے۔ کربلا میں ملوکیت نے اہلبیت کی نشانیوں کو تہہ تیغ کیا۔ اور ناموس اہلبیت کو پابہ جولاں دربار یزید میں پیش کیا۔

کم لوگ ایستادہ ہیں دربارِ شام میں　　مشغول شاہِ وقت ہے مینا و جام میں

کم سن بھی ہیں مسن بھی ہیں اس ظلمِ عام ہیں ۵۲ نیہوڑائے سر ہیں عورتیں اس اژدہام میں
ایذا رسانیوں سے بدن چُور چُور ہیں
شکلیں بتارہی ہیں محمدؐ کے نُور ہیں

دربارِ یزید میں یزید کی ہرزہ سرائی اور اہلبیت رسولؐ کے صبر کی منظر کشی کے بعد مرثیہ منزل تکمیل پر پہنچتا ہے تو کوثؔر الہ آبادی کی شاعری کا رنگ بھی نمایاں ہوتا ہے اور عظمت حسینؑ کی روشنی بھی۔

کل سُن سکا نہ کچھ بھی غرورِ امیرِ شام اور آج ہے یزید نہ وہ اُس کا احتشام
ہاں ہے مگر لبوں پہ شہ تشنہ لب کا نام ۶۷ لہروں پہ درد کی ہے رواں صبر کا پیام
دنیائے دل میں شاہ شہیداں ہیں آج بھی
آنکھوں کے یہ چراغ فروزاں ہیں آج بھی

ہے آج بھی حسینؑ کا غم کائنات میں تازہ لہو اسی سے ہے شامل حیات میں
گو لاکھ اہرمن ہوں اب انساں کی گھات میں ۱ جنبش نہیں ہے پاؤں کو راہ ثبات میں
کوثر وہ اُڑ رہا ہے پھریرا حسینؑ کا
ظلمت کو کھا رہا ہے سویرا حسینؑ کا

اعتراف کہ مجھ ہیچمداں کے پاس تو وہ الفاظ نہیں ہیں جو ''ظلمت کو کھا رہا ہے سویرا حسینؑ کا'' سن کر یہ مصرعہ کہنے والے شاعر کو شایان شان فقروں میں داد دے سکوں، اسی لئے اہل نظر تک یہ بیت پہنچا رہا ہوں۔''

''کوثر وہ اُڑ رہا ہے پھریرا حسینؑ کا ظلمت کو کھا رہا ہے سویرا حسینؑ کا''
کیا رائے ہے آپ کی اس بارے میں۔؟

☆☆☆☆☆

شاداں دھلوی:- (کراچی)

ولادت ۲۶ اگست ۱۹۳۱ء

نام سید مظفر حسین۔ تخلص شاداںؔ۔ وطن دہلی۔ والد کا اسم گرامی حکیم محمد عسکری دہلوی۔
تقسیم ہند کے بعد شاداںؔ کراچی آگئے، اور سٹیٹ بنک آف پاکستان میں ملازمت کرلی۔
پہلا مرثیہ ۱۹۶۸ء میں کہا۔ ڈاکٹر یاور عباس کے گھر پر تو تصنیف مراثی پڑھنے کا سلسلہ

قائم ہوا تھا اس میں شاداں دہلوی نے اپنا پہلا مرثیہ پیش کیا اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ شاداں مرثیے میں جدید تقاضوں کے اظہار کے قائل ہیں اور اس کی تاریخی اہمیت کا اقرار کرتے ہیں۔

ایک منشورِ عزائے شہِ ابرار بھی ہے   یہ سپر بھی ہے ہمارے لئے تلوار بھی ہے
دشمنِ آل سے واقف بھی ہے ہشیار بھی ہے   عصرِ حاضر کے تقاضوں سے خبر دار بھی ہے
ایک کردار ہے تاریخ کا اور زندہ ہے
اپنے ماحول کا عکاس ہے، تابندہ ہے

اس ایک بند میں شاداں دہلوی نے مرثیے کی تاریخ، مرثیے کا عزائے حسینی میں کردار اور زندہ کردار کہہ کر جس خوبصورتی سے personification تجسیم کی ہے وہ ان کے شعری شعور اور فکری بالیدگی کی تفہیم ہے۔ تاریخ کربلا کو محفوظ کرنے میں مرثیہ نے ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا ہے۔ ایک جگہ اور شاداں دہلوی نے مرثیے کی تشریح کی ہے۔

آئینۂ مشیتِ یزداں ہے مرثیہ   اانسانیت کے درد کا درماں ہے مرثیہ
منجملۂ لوازمِ ایماں ہے مرثیہ   طرزِ بیانِ حالِ پریشاں ہے مرثیہ
ہر عقدۂ ملال کا حل مرثیے میں ہے
احساس کا جمالِ ازل مرثیے میں ہے

شاداں کی نظر میں مرثیہ محض رنج والم اور دکھ درد کے واقعات کو نظم کرنا ہی نہیں ہے بلکہ مرثیہ انسان کے درد کا درماں ہے، آئینۂ مشیتِ یزداں ہے، طرزِ بیانِ حالِ پریشاں ہے شاید اسی لئے شاداں دہلوی کے مراثی میں نامِ حسینؑ لکھنا، ذکرِ حسینؑ کرنا، غمِ حسینؑ منانا عظمتِ بشر کی دلیل ہے۔ ان کے اکثر مراثی کی ابتدا اسی فکر سے ہوتی ہے۔

'نامِ حسینؑ لکھنا'	؎ ہے یہ معراجِ نگارش کہ لکھے نامِ حسینؑ	۱۹۷۶ء
	؎ نامِ حسینؑ لکھ کے قلم سجدہ ریز ہے	۱۹۸۰
'ذکرِ حسینؑ'	؎ ذکرِ شبیرؑ سہارا ہے غریبوں کے لئے	۱۹۷۸ء
	؎ نعمت بخدا نامِ حسینؑ ابنِ علیؑ ہے	۱۹۸۱ء
'غمِ حسینؑ'	؎ غمِ حسینؑ سہارا ہے زندگی کے لئے	۱۹۸۳ء

اسی لئے وہ اپنے رب سے غمِ حسینؑ کی دولت مانگتے ہیں ؎

غمِ حسینؑ کی دولت نصیب ہو یارب اسی کے ذکر کی عزت نصیب ہو یارب
نفس نفس پہ سعادت نصیب ہو یارب ہمائے فکر کو رفعت نصیب ہو یارب
نظر کے سامنے سب کربلا کا حال رہے
نظر پہ تیرا کرم ربّ ذوالجلال رہے

اور غمِ حسینؑ سے ذکرِ حسینؑ کی طرف سفر کرتے وقت انہیں راہِ عرفان مل جاتی ہے یعنی ذکرِ حسینؑ راہِ عرفان کا پتہ دیتا ہے اور سببِ رحمتِ ذوالجلال بنتا ہے۔

بشر پہ جب کرم ذوالجلال ہوتا ہے خرد کا حُسنِ توازن بحال ہوتا ہے
شعور ذات کا اس کو خیال ہوتا ہے کہ ذکر وفکر میں اک اعتدال ہوتا ہے
ہے ذکر وفکر سے اک نور ذہن انساں میں
یہ وہ چراغ فروزاں میں راہِ عرفاں میں

اساسِ ذکرِ اطاعت ہے اور عجز و نیاز یہاں پہ سنتا ہے انسان روح کی آواز
یہیں سے ہوتی ہے حاصل متاعِ سوزوگداز یہی ہے معرفتِ حق کا نقطۂ آغاز
یہی اصول تقرّب کا ہے طریقہ بھی
ہے اس میں تزکیۂ نفس کا سلیقہ بھی

ہے ذکر ظلمتِ اوہام میں یقین کا نور ہے ذکرِ صبرِ مسلسل میں صبر کا مقدور
ہے ذکر، جہل کی تاریکیوں میں شمعِ نور ہے ذکر یورشِ غم میں وقارِ قلبِ غیور
کتاب عجز کا پہلا سبق ضروری ہے
ہر اک بشر کے لئے ذکرِ حق ضروری ہے

ذکرِ حسینؑ، ذکرِ حق ہے۔ اس صداقت کے سفر میں جو مقام آتے ہیں وہ منزل بہ منزل شاداںؔ دہلوی نے درج بالا چار بندوں میں نمایاں کردیے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ شاداںؔ کی مرثیہ گوئی کی بنیاد تفکر ہے، تدبّر ہے، سوچ ہے۔ وہ صرف کربلا کے واقعات کو نظم نہیں کرتے، صرف منقبت تک محدود نہیں رہتے بلکہ واقعات کو فکر کی آنچ دیتے ہیں۔ جبھی تو ان کی سمجھ میں آتا ہے کہ ذکرِ حسینؑ کتاب عجز کا پہلا سبق ہے۔ ذکرِ حسینؑ بشر کے لئے ذکرِ حق ہے۔

روایت سے انکار کا نام جدید مرثیہ نہیں ہے بلکہ روایت سے آگے بڑھ کر تفکر اور عصر

حاضر کے تقاضوں کو شاعری کا پیکر دینا جدید مرثیہ ہے اور شاداںؔ دہلوی نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ شاداںؔ کے بین میں بھی نئی فکر، نیا رخ، اور نئی روشنی ملتی ہے۔ مثلاً یہ واقعہ بار بار دہرایا جاتا ہے کہ دربار یزید میں یزید نے سکینہ سے کہا تھا کہ تمہارے بابا تم سے محبت کرتے ہے تو ان کا کٹا ہوا سر تمہاری گود میں آجائے تو مانیں۔ بچی نے تڑپ کر باپ کے سر کی طرف دیکھ کر فریاد کی" بابا اب یزید آپ کی محبت کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ یہ آپ کی سکینہ کی عزت کا سوال ہے بابا، اور تاریخ میں جگہ جگہ لکھا ہے کہ حسینؑ کا سر سکینہ کی گود میں آ گیا تھا۔ شاداںؔ دہلوی کے الفاظ میں اس منزل پر مصائب میں بھی عظمت اہلبیت نمایاں نظر آتی ہے۔

گھٹے ہوئے تھے جو مدت سے شمر کے ڈر سے لگایا باپ کے سر کو گلے سے بیٹی نے
سنایا حالِ زبوں اپنا خوب رو رو کے وہ بین آ گئے سکینہ کے لب پہ آہی گئے
یزیدیت کے ستم فاش کر گئی بچی
تڑپ تڑپ کے اسیری میں مر گئی بچی

یزید کے دربار میں سکینہ کے رونے سے قید خانے میں گریہ تک بلکہ سکینہ کی موت تک کا فاصلہ اور وقفہ شاداںؔ نے دو مصرعوں میں محیط کر دیا۔ یہی ایک شاعر کے شاعرانہ کمالی کی دلیل ہے۔ اور شاداں دہلوی بہر حال دبستان دہلی کے کے نمائندہ شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

عبدالرؤف عروج :- (کراچی)

ولادت ۱۹۳۱ء

نام مرزا عبدالرؤف۔ تخلص عروجؔ۔ جائے ولادت اورنگ آباد۔ ۱۹۷۰ء میں کراچی آ گئے۔ جدید مرثیے میں جن شاعروں نے ہیئت کے تجربات کئے ہیں ان میں جمیلؔ مظہری اور سردار جعفری کے فوراً بعد مرزا عبدالرؤف عروجؔ کا نام آتا ہے۔ مرثیے کے خدوخال میں رنگ بھرنے والوں میں سے جمیلؔ مظہری نے فکر و اسلوب میں تجربے کئے۔ انہوں نے مسدس کی پابندی کو اپنایا مگر تیسرے مصرع کو قافیہ کی پابندی سے آزاد کیا — اُن کے بعد مصطفیٰ زیدی نے 'اے کربلا، اے کربلا، میں مسدس کی پابندی کو ملحوظ خاطر رکھا مگر دیگر لوازم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے نئے اسلوب سے مرثیہ کہا۔ علی سردار جعفری نے بھی ایک نظم اے کربلا، اے کربلا، لکھی مگر نہ مسدس کی پابندی، نہ

مرثیے کے لوازم کا پاس۔ بس ایک نظم کہی اور وہ نظم رثائی ادب کی آبرو بن گئی—

حضرت عبدالرؤف عروج نے بھی سردار جعفری کے آہنگ میں نظم کہی۔ اور اگر رثائی ادب کے معیار پر رکھا جائے تو ایسی نظم کہی جو نہ صرف کربلا والوں کا مرثیہ ہے بلکہ پوری انسانیت اور تاریخ انسانیت کا مرثیہ بن گئی۔

مورّخوں سے کہو تم نے کچھ نہیں لکھا
لکھی تو صرف سلاطیں کی داستاں لکھی
ملوکیت کو قلم کا خراج پیش کیا
اصولِ دیں کے خلاف مزاج پیش کیا
پکارتے ہیں تمہارے حروف ہائے سیاہ
کشید کی ہیں دلوں کی سیاہیاں تم نے
جوازِ سلطنت ظلم وجور کیا ملتا
مُنافقوں سے دلائیں گواہیاں تم نے
تمہیں یزید کا جاہ و حشم نظر آیا
تمہیں حسینؑ کی عظمت نظر نہیں آئی
مورّخوں سے کہو تم نے کچھ نہیں لکھا

سوداؔ سے لیکر بیسویں صدی کے اختتام تک بلکہ اب اکیسویں صدی میں بھی مرثیہ مسدس میں لکھا جا رہا ہے۔ اور یہ روش اب اتنی مقبول ہوگئی ہے کہ مسدس سے ہٹ کر مرثیہ کہنے والوں کو مرثیہ گو ہی نہیں کہا جاتا جبکہ مرثیہ تو حزن و ملال کی رثائی شاعری کا نام ہے۔ اس میں مسدس شرط نہیں ہے۔ مسدس تو ہیئت ہے مقصد نہیں ہے، بنیاد نہیں ہے، حرفِ آخر نہیں ہے۔ پھر بھی سوداؔ سے تا حال ہزارہا مرثیے مسدس میں کہے گئے ہیں۔ اور بے شمار شاعروں نے اس صنفِ سخن مین شعر کہے ہیں لیکن ایسی امتیازی نظمیں جو رثائی ادب کے تقاضوں پر پوری اُترتی ہوں چند شاعروں نے کہی ہیں۔ ان میں علی سردار جعفری کے بعد عبدالرؤف عروج ہیں جنہوں نے رثائی ادب اور مرثیہ میں اختصار، ہیئت اور اسلوب میں جدّت کی۔

مرزا عبدالرؤف عروجؔ نے یہ نظم ۱۹۸۰ء میں کہی۔ مسدّس میں مرثیہ کہنے والے شعراء نے اس کی مخالفت کی۔ حسینؔ اعظمی نے اسکی حمایت کی اور نسیمؔ امروہوی کی طرف اس بحث کا رخ موڑ دیا۔ نسیم امروہوی کی رائے مندرجہ ذیل تھی۔۔۔

''زیرِ نظر مرثیہ جناب عروجؔ (عبدالرؤف) کی جدّت آفرینی کا حسینؔ شاہکار ہے جو دنیائے ادب کے مذکورہ بالا مطالبے کو پورا کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ دور حاضر کے مرثیہ گو نوجوان اگر اس اسلوب کو بھی اپنائیں۔ چاہے مجلس میں پڑھیں یا نہ پڑھیں تو وہ خیالات اور تاثرات کو نہ صرف یہ کہ مسدّس سے زیادہ پُر اثر بنا سکتے ہیں بلکہ اپنی تخیّل کے شاہین کیلئے بالا سے بالاتر اور بالا تر سے بالاترین فضائے وسیع پیدا کر سکتے ہیں۔ اگر چہ مسدّس میں اس نوع کی بیانیہ شاعری خوب پھیلتی پھولتی ہے لیکن شاید اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ ہماری طبیعتیں ان مضامین کو مسدّس کی شکل میں دیکھنے اور سننے کی عادی ہو چکی ہیں جبکہ پہلے یہ اور صورتوں میں بھی کہا گیا تھا اور لوگ اسے مرثیہ ہی کہتے اور سمجھتے تھے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مسدّس کی زنجیروں کے بارِ گراں نے اسے مشکل بنا دیا ہے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ غالبؔ نے صرف چند بند کہہ کر اعتراف عجز کے ساتھ قلم رکھ دیا تھا۔ نوجوان شعراء اگر عروجؔ صاحب کی طرح مرثیے کی ہیئت بدل کر تجربہ کریں تو میرے نزدیک یہ سفر زیادہ آسان اور سہل الحصول ہو جائے گا۔۔۔۔''

عبدالرؤف عروجؔ نے مسدّس میں بھی مرثیے کہے ہیں اور موضوعاتی مرثیے کہے ہیں۔ ان مرثیوں میں بھی عبدالرؤف عروجؔ کی ترقی پسند سوچ نمایاں ہے۔ ان کا ایک مرثیہ ''ولایت فقیہ'' ۱۹۸۹ء میں 'لہو لہو کہکشاں' (ناشر ادارہ تقدس قلم کراچی، مرتبہ سید قمر حسنین جعفری) میں شائع ہو چکا ہے اور ان شعرائے کرام کے لئے مبارز طلب بن چکا ہے جنہوں نے موزخوں سے کہو تم نے کچھ نہیں لکھا'' کی مخالفت کی تھی۔

نوعِ انساں کی ہدایت کا سفر جاری ہے ۔۔۔ فکر کا علم کا حکمت کا سفر جاری ہے
کارِ تبلیغِ رسالت کا سفر جاری ہے ۔۔۔ عہد در عہد ولایت کا سفر جاری ہے
بزم آرائی تکوینِ جہاں راہ میں ہے
وہ زماں ہو کہ مکاں اس کی گذرگاہ میں ہے
ہست کا بود کا موجود کا پہلا شاہد ۔۔۔ رشتۂ حامد و محمود کا پہلا شاہد

سجدۂ شوق کے مسجود کا پہلا شاہد ۲ علمِ یکتائیِ معبود کا پہلا شاہد
شارحِ کیفیتِ لم یزلی ہوتا ہے
علم جس رنگ میں ہوتا ہے ولی ہوتا ہے

رزم میں بزم میں اللہ کی برہان ولی عملِ خیر کی تاریخ کا عنوان ولی
وہ ازل ہو کہ ابد سب کا نگہبان ولی ۳ آدمی کے شرف و اصل کی پہچان ولی
زیرِ پا دبدبۂ قیصر و جم رکھتا ہے
ہاتھ میں تیغ تو کاندھے پر علم رکھتا ہے

یہ ولایت ہے شہادت گہہ ایماں کی بہار یہ بناتی ہے تمدّن کے اصول و معیار
یہ سکھاتی ہے مہ و مہر کو طرزِ رفتار ۵ اس کا کردار حسینؑ ابن علیؑ کا کردار
دانشِ عصر کا سرمایۂ جاں دیتا ہے
ابھی دنیا نے ولایت کو کہاں سمجھا ہے

اہلِ ایماں کے لئے برق تپاں ہے دنیا جبر کیا آگ فلاکت کا دھواں ہے دنیا
تیغ بے تیر ہے خنجر ہے سناں ہے دنیا ۱۱ ابن ملجم کے ارادوں کی زباں ہے دنیا
دوزخِ دہر میں گلزار کی ضامن ہو جائے
چوم لے پائے ولایت کو تو مومن ہو جائے

ہے ولایت ہی زمانے میں علیم اور خبیر ہے ولایت ہی شرافت کی سیادت کی نظیر
ہے ولایت ہی محمدؐ کی رسالتؐ کا ضمیر ۲۱ ثبت ہے سینۂ تاریخ پہ آوازِ غدیر
یہی منجملۂ معیار نسب ٹھہری ہے
یہی ہاشم کے گھرانے کا لقب ٹھہری ہے

مزرعۂ جاں پہ برستا ہوا بادل جیسے حوریانِ فلکِ فکر کا آنچل جیسے
نگہۂ نازِ خیالات کا کاجل جیسے ۲۵ یہی عباسؑ کے پرچم کی جھلاجھل جیسے
کبھی منت کشِ دربار نہیں ہو سکتی
یہ تجلی ہے گرفتار نہیں ہو سکتی

آگہی نے یہ کہا قوت یزداں ہے حسینؑ مرضیٔ رب کی بلندی سے رجز خواں ہے حسینؑ

غم سے پگلی ہوئی تاریخ کا درماں ہے حسینؑ ۴۴ ساری دنیا کے غریبوں کا نگہباں ہے حسینؑ

ایک تسبیح شب و روز حکایت اس کی
کار فرما ہے خدائی میں ولایت اس کی

۵۷ بند کے اس مرثیہ میں عبدالرؤف عروجؔ کے فکر کا دھارا۔ اس فکر کے دھارے میں رواں دواں مگر محتاط اور فکر کے ضوابط کا پابند قلم۔ حضرت عباسؑ کی شہادت، حسینؑ کی شہادت اور بھائی کی لاش پر بہن کی بھائی سے گفتگو سب کچھ نمایاں ہے۔

منکشف تجھ پہ ہیں تقدیر و مشیت کے امور منکشف تجھ پہ ہیں احوال سن و ماہ و شہور
منکشف تجھ پہ ہیں سب مرحلۂ غیب و حضور ۵۷ میرے بھائی یہ مگر تجھ سے کہوں گی میں ضرور

ہر منافق کے مقدر میں فنا لکھے گی
اب ولایت ورق کرب و بلا لکھے گی

ہم نے عبدالرؤف عروجؔ کے تعارف میں ان کی زندگی کے واقعات لکھے، نہ ان کے مراثی کی تعداد لکھی، نہ ان کے لئے کیے ہوئے کلمات تحسین کو قلم بند کیا۔ صرف اس لئے کہ ان کی پہچان یہ سب تکلفات نہیں۔ ان کی پہچان تو ایک صداقت ہے جسے انھوں نے ''کربلائی حوصلے'' سے کہدیا ہے۔

مورخوں سے کہو تم نے کچھ نہیں لکھا
لکھی تو صرف سلاطیں کی داستاں لکھی

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر خاور نگرامی:- (کراچی)

ولادت ۱۹۳۱ء۔

نام: سید خاور حسین رضوی، وطن: نگرام ضلع لکھنؤ۔ ان کے جداعلی سید تفضیل حسینؒ رضوی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد رائے بریلی سے نگرام آگئے تھے۔ پھر ان کے والد گرامی اور چچا نگرام سے میر محبوب علی خان نظام دکن کے عہد میں حیدر آباد منتقل ہو گئے تھے۔ گویا اس خاندان کی ابتداء رائے بریلی اور انتہا کراچی میں ہوئی جہاں خاور نگرامی ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے تھے۔

ڈاکٹر خاور نگرامی نے حیدر آباد (دکن) سے گریجویشن کیا۔ آگرہ میڈیکل کالج سے

ایل۔ ایم۔ ایف کی ڈگری حاصل کی۔ اس حوالے سے ان کے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا لاحقہ تھا۔ کسی شخص کی پہچان اس کے حلقہ احباب، اور ملنے جلنے والوں سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر خاور نگرامی رشتوں اور حوالوں کی طرف سے بہت امیر تھے۔ انہیں فانی بدایونی۔ مرزا یاس یگانہ چنگیزی اور نجم آفندی کی ہم نشینی کا امتیاز حاصل رہا ہے۔ شہید یار جنگ، تراب یار جنگ، علامہ رشید ترابی اور ضیاء الحسن موسوی کے ہاں بھی ان کی بے تکلفانہ آمد و رفت رہی ہے۔ لکھنؤ جاتے تھے تو صفی لکھنوی۔ جعفر علی خان اثر، ارم لکھنوی، سراج لکھنوی سے رشتے مضبوط تھے۔

اکابرینِ شعر و ادب نے ان کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس سے بھی ڈاکٹر خاور نظامی کے مرتبے کو متعین کرنے میں رہنمائی ملتی ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ جوش نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ "میں ان کے قلم کا لوہا مانتا ہوں" اور جوش کے مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات اجنبی اور غیر یقینی لگتی ہے بالخصوص جبکہ خاور صاحب کے متعلق یہ رائے بھی ہے کہ انہوں نے صرف ایک ہے مرثیہ کہا ہے مگر (اردو مرثیہ پاکستان میں۔ ص ۴۱۶) تحریری طور پر جوش کا یہ فقرہ نقل کیا گیا ہے۔

میدان شعر و سخن میں ڈاکٹر خاور نگرامی جانے پہچانے شاعر تھے جن کا احترام کیا جاتا تھا مگر مرثیہ گوئی میں ان کا شمار اکا دکا مرثیہ لکھنے والوں میں ہوتا ہے لہذا مرثیہ ان کی پہچان نہ بن سکا پھر بھی اگر انہوں نے ایک مرثیہ بھی کہا ہے تو یہ قدر نا شناسی ہوگی اگر اس ایک مرثیے کا بھی ذکر نہ کیا جائے۔ خاور نگرامی کے اس مرثیے کا عنوان "امن" ہے۔ مرثیہ کربلا میں حق و باطل کی جنگ، اس جنگ کے اسباب اور اس جنگ کے نتائج کی منظوم تاریخ ہوتی ہے۔ مرثیے میں "امن" کے موضوع کو سمجھانا سہل نہیں ہے لیکن خاور نگرامی نے اس کا حق ادا کیا ہے جو ان کی مہارت شعر گوئی کی دلیل ہے — مرثیے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

ملکِ خرد میں، رابطۂ جسم و جان ہے امن — آفاق میں محیط زمان و مکان ہے امن
اس عالم ضعیف میں اب تک جوان ہے امن — پیغمبروں کے منہ میں خدا کی زبان ہی امن
صبرِ حسینؑ و صلحِ حسنؑ کا دوام ہے
سچ پوچھیے تو امن، محمدؐ کا نام ہے

اس بند میں سرکارِ ختمی مرتبت رسول اکرمؐ کے ایک ارشاد کی طرف اشارہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ "اگر انسان اپنے لئے فرض کر لے کہ وہ جنگ میں ابتدا نہیں کرے گا تو دنیا میں کبھی

جنگ نہیں ہوسکتی۔" (حدیث رسول)

اس صداقت دائمی کے پیش نظر کتنی سچی بات ہے کہ " سچ پوچھیے تو "امن" محمدؐ کا نام ہے"۔ اسی مقام کے آگے بڑھاتے ہوئے ڈاکٹر خاور نگرامی۔ " انسانیت کو آج بھی نفرت ہے جنگ سے" کہتے نظر آتے ہیں اور کہیں بین الاقوامی جستجو کا حوالے دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ " دانشوروں کا اب "نسب العین" امن ہے۔ یہاں "نسب العین" ضرورت شعری ہی نہیں بلکہ نصب العین سے کہیں زیادہ معنی خیز نظر آتا ہے۔ خاور نگرامی یہیں بات ختم نہیں کرتے بلکہ کربلا کی منزل پر آکر پکار اُٹھتے ہیں کہ " کرتے ہیں آج امن کی خاطر حسینؑ جنگ"۔ یہ استدلال آسان نہیں تھا مگر ڈاکٹر خاور نگرامی نے اسے ممکن بنا دیا ہے۔ ان کا استدلال امن کے متعلق اسلامی اور انسانی نقطہ نظر کی بنیاد پر ہے۔

روزِ ازل سے جنگ ہے آمادۂ فساد ہے امن اور جنگ میں کتنا بڑا تضاد
مُثبت سمجھ رہے ہیں یہ منفی کو بدنہاد غارت گری و قتل میں شیطاں کا ہے مفاد
امن و اماں کا چاک گریبان ہوگیا
باغی ہوا فرشتہ تو شیطان ہوگیا

کربلا کی جنگ حسینؑ نے شروع نہیں کی تھی۔ حسینؑ تو قدم قدم پر امن کی بات کر رہے تھے۔ حرؑ کے لشکر نے امام کا راستہ روکا تو امام نے 'امن' کے تین متبادل راستے بتائے۔ حرؑ نے کسی بات کو تسلیم نہیں کیا۔ کربلا میں دریائے فرات کے کنارے سے امام کے خیموں کو ہٹانے کے احکامات ملے۔ حسینؑ نے امن کی خاطر دریا کی ترائی سے خیمے ہٹوا کر بیاباں میں نصب کرالئے۔ نویں محرم کی رات کو بغیر اعلانِ جنگ کے یزیدی لشکر نے حملہ کر دیا۔ عباسؑ کو جلال آگیا۔ حسینؑ نے رات بھر کے لئے جنگ کو ٹال دیا۔ حسینؑ نے اس وقت بھی امن کی بات کی جب حسینؑ کے فرزند، بھائی، بھتیجے، بھانجے، رشتہ دار دوست ۷۱ افراد شہید ہو چکے تھے اور صرف امام حسینؑ تنہا تھے۔ اس وقت بھی امام حسینؑ کہہ رہے تھے اب بھی تم حق کی طرف آجاؤ تو میں یہ سارے خون معاف کر دوں گا۔ لیکن یزید اور لشکر یزید کسی طرح امن پر آمادہ نہ تھا لہٰذا حسینؑ کو اس غرض سے تلوار اٹھانی پڑی کہ تاریخ انہیں کمزور یا کم حوصلہ نہ سمجھے۔ خاور نگرامی نے امام حسینؑ کی جنگ کو یوں پیش کیا ہے۔

"کرتے ہیں آج 'امن' کی خاطر حسینؑ 'جنگ'"

زنجیرِ غم میں درد کی جھنکار دیکھیے دستِ خرد میں عقل کی تلوار دیکھیے

چشمِ سحر میں صلح کے آثار دیکھئے　　پُر امن ہے حسینؑ کی پیکار : دیکھئے
پیشِ اجل بھی کوئی تردّد نہیں کیا
شبیرؑ نے کہیں بھی تشدّد نہیں کیا

اسی سلسلے سے دوسرا بند بھی قابلِ توجہ ہے:۔

انسان کا زوالِ نظر ہے زوالِ صبر　　ہے نظم اور ضبط کی حد میں کمالِ صبر
چمکا رُخِ حیات پہ دیکھو جمالِ صبر　　ہے جلوۂ نگارِ شہادت وصالِ صبر
روکے ہوئے تھے ہاتھ شجاعت کے باوجود
طاقت نہ صرف کرتے تھے طاقت کی باوجود

اس مرثیہ کو پڑھنے کے بعد جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ کہ کربلا سے امن کا رشتہ ہے اس کی وضاحت کے لئے خاور نگرامی نے کچھ ایسے مصرعے دئے ہیں جو قطروں میں قلزموں کو محیط کرنے کے مترادف ہیں مثلاً ۔

ے ہے سجدۂ حسینؑ میں مضمر قیامِ امن
یا ے ہے امن کی دعا تہہِ شمشیر دیکھیے

ڈاکٹر خاور نگرامی نے اور مرثیہ نہیں کہے مگر ان کا ایک مرثیہ بھی مرثیہ گوئی کی تاریخ میں اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ سید سجاد کی اسیری پر کتنی عظمت سے بات کی ہے خاور نگرامی نے ۔

سجادؑ تھے اسیر، نظر تو نہیں تھی قید　　تحریکِ انقلاب سحر تو نہیں تھی قید
آزادئ حیاتِ بشر تو نہیں تھی قید　　تھی ساتھ ساتھ، فتح و ظفر تو نہیں تھی قید
بڑھتا تھا کاروانِ سحر ، شام کی طرف
عازم تھی عقل، قوتِ ناکام کی طرف

☆☆☆☆☆

ہمدم فیض آبادی:- (کراچی)

ولادت ۱۹۳۱ء۔

نام: سید مصطفیٰ حسین، تخلص: ہمدمؔ۔ مرثیہ کی روایات کے علمبردار۔ کلاسیکی مرثیے کے لوازمات کو اپنے مرثیوں میں لازم سمجھتے ہیں مگر جدید و قدیم کی بحث سے دور رہتے ہیں۔ مرثیے

کہنے کا مقصد خوشنودی امام مظلوم اور سیدہ فاطمہ زہراؑ کو پرسہ دینا ہے، بین میں طرز نوحہ گری قدیم مرثیوں کی روایت کے مطابق ہے۔

تصانیف : (۱) ہندوستان میں: کلیات ہمدم'' کی تین جلدیں۔

(۲) پاکستان میں: قصائد چہاردہ معصومین کا مجموعہ'' جام ولا''

(۳) دس مرثیوں پر مشتمل مجموعہ مراثی' مطبوعہ ۱۹۶۸ء کراچی

ہمدم فیض آبادی کے مراثی کے بارے میں پروفیسر مجتبیٰ حسین کی رائے اہم ہے۔

'' ہمدم صاحب کو ادبی اور مذہبی دنیا کے لوگ بخوبی جانتے ہیں اب موصوف دس مرثیے چھپوا رہے ہیں۔ یہ مراثی بھی اپنے دامن میں سلاست، روانی، جدت، مضمون آفرینی کے گل ہائے تر لئے ہوئے ہیں دور جدید میں بھی آپ نے مرثیے کے قدیم طرز کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔''

(مراثی ہمدم۔ ص ۸۰)

ہمدم فیض آبادی کا شمار اُن مقدم اور کبیر (SENIOR) شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد مرثیے کی ترویج و ارتقا کو سہارا دیا۔ ان شعراء میں استاد قمر جلالوی۔ صفی حیدر دانش۔ زیبا ردولوی۔ محسن اعظم گڑھی اور ہمدم فیض آبادی کے علاوہ بھی کچھ نام ہیں۔ ہمدم فیض آبادی کا نام ان شعراء کی فہرست میں بھی شامل ہے جنہوں نے موضوعاتی مرثیے نہیں کہے۔ قدیم مرثیہ نگاری میں مرثیوں کے موضوعات کو قبل از وقت قائم نہیں کیا جاتا تھا صرف اس کا اظہار کیا جاتا تھا کہ مرثیہ کس کے احوال سے متعلق ہے۔ استاد قمر جلالوی اور ہمدم فیض آبادی ایسے شعراء اس رسّی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کبھی کبھی تو روایت کی پابندی میں شدت دیکھ کر گمان گذرتا ہے کہ اگر روایت پسند شعراء نے فکر و شعور کو ڈھیل دی تو انہیں خوف ہے کہ کہیں یہ دور اُن کے ہاتھ سے نکل نہ جائے۔

مراثی ہمدم'' میں ہمدم فیض آبادی کے دس مرثیے شامل ہیں۔

۱۔	دین احمدؐ کا چلن دل سے بھلایا ہم نے	درحال امام حسینؑ	بند ۴۳
۲۔	گلزار دیں میں پانچ کھلے بے مثال پھول	″ ″ ″	″ ۴۶
۳۔	عباسؑ سا جہان میں بھائی ہوا نہیں	″ حضرت عباسؑ	″ ۵۰

۴۔ خدا ہر ایک کا رازق ہے اور بڑا عالم //حضرت قاسم //بند ۳۷

۵۔ جہاں میں عون ومحمد تھے بے نظیر گہر حضرت عون ومحمد بند ۶۷

۶۔ چار عنصر جب ملے انساں کی صورت بن گئی //حضرت علی اکبر // ۴۱

۷۔ پیدا کسی کے گھر میں ہوا جب کوئی پسر //حضرت علی اصغر // ۴۴

۸۔ حُر نے اس عالم فانی میں بڑا نام کیا //جناب حُر // ۵۳

۹۔ جہاں میں حضرت زینبؑ کی ایسی خلقت تھی //اسیری ءاہلبیتؑ //۲۹

۱۰۔ مرد و زن دونوں ہوئے پیدا عبادت کیلئے //جناب سکینہؑ //۲۹

ہمدم فیض آبادی کے چھپے مرثیے کے چند بند بطور نمونہ کلام درج ذیل ہیں۔

چار عنصر جب ملے انساں کی صورت بن گئی تین فصلیں زندگی کی ایک محبت بن گئی
ہو عمل نیکی بدی کا یہ بھی طینت بن گئی اشرف مخلوق ہو کر اس کی قسمت بن گئی
بچپنے میں کچھ بھی دنیا کی نہیں رہتی خبر
کیا کیا ہے گھر کے لوگوں کو نہیں ملتی خبر

جب تلک معصوم ہے رکھتا ہے یہ شاہی مزاج ضد اگر کرتا ہے کوئی کچھ نہیں اس کا علاج
کھیلتا رہتا ہے ہر دم ہے نہ کوئی کام کاج راجدھانی گھر ہے اس کا اور یہ کرتا ہے راج
دل میں آیا ہنس دیا لیکن ہے روتا رات دن
پالنے والی کی گودی میں ہے سوتا رات دن

ختم جس دم ہوگئی معصومیت انسان کی جسم کی بالیدگی پر آنکھ بھی اس کی کھلی
تب سمجھنے لگ گیا دنیا میں کیا ہے زندگی کچھ پڑھا لکھا اگر فکر معیشت بھی ہوئی
رفتہ رفتہ آگئے فصلِ جوانی کے وہ دن
بھول جاتا ہے خدا کو زندگانی کے وہ دن

(اردو مرثیہ پاکستان میں)

ایک عرصے سے وطن سے جب کوئی صدا آئی تو گولیوں کی آواز آئی یا کسی بے گناہ کی چیخ سنائی دی۔ اس لئے عرصے سے معلومات مکمل نہیں ہیں کہ ادب کے محاذ پر کون کہاں پہنچ گیا۔ آگے بڑھ گیا یا وقت کی بھیڑ میں کچل دیا گیا۔ احباب خطوط کا جواب نہیں دیتے۔ جو لوگ مرثیہ

پر کام کر رہے ہیں وہ شاید علم و معلومات خرچ کر کے اپنے خزانے خالی کرنا نہیں چاہتے۔ ہمدم فیض آبادی کا شمار اُستاد شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کے دس مراثی کا مجموعہ موجود ہے لیکن مقام حیرت ہے کہ کراچی کے اس جیتے جاگتے شاعر کے حالات زندگی، کم از کم حالات مرثیہ گوئی کسی نے رقم کیوں نہیں کیے۔ کسی کے لئے کچھ لکھا جائے یا نہ لکھا جائے مگر ہر قابل ذکر شخصیت کی ابتداء اور انتہا کی تاریخوں کی نشاندہی ضرور کی جاتی ہے ہمدم فیض آبادی کے معاملے میں اہل نقد و نظر بھی خاموش ہیں۔ اور کراچی کے اہلِ قلم بھی نہیں بولتے۔

☆☆☆☆☆

عروج بجنوری:- (کراچی)

نام: عروج حیدر، تخلص: عروج۔ وطن، بجنور۔ کراچی کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ مشاعروں کی جان سمجھے جاتے ہیں۔ غزل، سلام، اور قصائد اور نوحے کہتے ہیں۔ جب تک ہندوستان میں تھے تو جگر مراد آبادی سے سلسلہ تلمذ استوار تھا۔ پاکستان آئے تو استاد قمر جلالوی سے اکتساب فیض کیا۔ صنف مرثیہ میں حضرت نسیم امروہوی نے اپنے جن شاگردوں کا ذکر کیا ہے ان میں عروج بجنوری کا نام بھی درج ہے۔ ''عرفان نسیم'' میں ان کے ایک مرثیہ کا ذکر ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک دو مرثیے کہے ہیں۔ سید ضمیر اختر نقوی نے ان کے مرثیے کا صرف ایک بند نقل کیا ہے، جو انہیں مرثیہ نگار شاعر ثابت کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ مرثیہ کا مصرع اولیٰ ہے ۔ ''ازل سے عشق کا پرچم اڑا رہی ہے وفا''

اسی مرثیے کا ایک بند یہ ہے:-

وفا بہار گلستانِ حق پرستی ہے　　　وفا ہی روح و روانِ نظامِ ہستی ہے
یہ نقدِ جاں کے عوض بھی ملے تو سستی ہے　　　بساتی ہے یہ اسے جسکے دل میں بستی ہے
مقربانِ خدا میں ہے کاروبار اس کا
وہ جنس ہے کہ خریدار کردگار اس کا

راقم الحروف نے ۱۹۷۶ء میں پاکستان چھوڑا تھا۔ اس وقت تک عروج بجنوری سلام، منقبت، قصائد اور نوحے لکھنے والے صفِ اوّل کے شاعروں میں شمار ہوتے تھے اور اب جب میں ۲۰۰۴ء میں کراچی گیا تو کوئی عروج بجنوری کا ٹیلیفون نمبر یا پتہ نہیں جانتا تھا اور مجھے وہ زمانہ یاد

آیا جب عروجؔ بجنوری کے گھر پر نوحوں کے طلبگار حاضر رہتے تھے کہ عروجؔ صاحب نیا نوحہ کسی دوسرے کو نہ دیدیں۔ آج بھی بہت سی انجمنیں عروجؔ کے نوحے پڑھتی ہیں۔ اہلِ کراچی عروجؔ بجنوری کو یاد رکھیں نہ رکھیں میرا ایمان ہے کی عزاداروں کے اشکوں کو رومال میں لینے والی شہزادی کے پاس عروجؔ بجنوری کا سارا کلام محفوظ ہوگا۔ ہے کسی کی مجال کہ اس عروج کو زوال میں بدل سکے؟

☆☆☆☆☆

آرزو اکبر آبادی:- (کراچی)

حضرت سیمابؔ اکبر آبادی کے شاگردوں میں ایک بڑا نام آرزوؔ اکبر آبادی ہے۔ ان کی شہرت کی بنیاد فلمی شاعری ہے لیکن وہ ہمہ جہت شاعر ہیں۔ کراچی میں جوشؔ ملیح آبادی، نسیمؔ امروہوی، سید آل رضاؔ، نجمؔ آفندی جیسے باکمال شاعروں نے مرثیے کی جو فضا بنائی اس میں بہت سے شعراء اکرام نے اکا دکا مرثیے کہے۔ ان اکا دکا مرثیے کہنے والوں کی فہرست میں آرزوؔ اکبر آبادی جیسے ممتاز شاعر کا نام نامی بھی شامل ہو گیا اس لئے کہ انہوں نے بھی مرثیے کہے ہیں۔ ان کی شاعرانہ کاوشوں پر تبصرہ اس کتاب کا موضوع نہیں ہے اور ان کی مرثیہ گوئی کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں ملتا کہ:

> ''آرزو اکبر آبادی نے ۱۹۷۳ء میں پہلا مرثیہ حضرت علی اکبرؑ کی شہادت سے متعلق کہا تھا جسے پاکستان گراموں فون کمپنی نے ریکارڈ بنا کر بدرؔ ہاشمی کی آواز میں پیش کیا تھا۔ انہوں نے دوسرا مرثیہ ،رحال شہادت امام حسینؑ ۱۹۷۴ء میں کہا تھا۔ یہ مرثیہ شائع ہو چکا ہے۔
>
> (اردو مرثیہ پاکستان میں ص ۴۲۴)

نمونۂ کلام کے طور پر اس مرثیہ سے تین بند تحریر کئے جارہے ہیں:-

تُو حرّیت کی تیغ کا پانی ہے اے حسینؑ　　تو دینِ حق کا بانیٔ ثانی ہے اے حسینؑ
تو سرورِؐ مدینہ کا جانی ہے اے حسینؑ　　تو آبروئے تشنہ دہانی ہے اے حسینؑ
تُو موت بن کے آیا تھا باطل کے واسطے
طوفاں تھا بحرِ کفر کے ساحل کے واسطے

تیرا وجود ذہنِ مشیت کو ہے پسند　　تیرا خلوص قلبِ محبت کو ہے پسند

تیری جبیں وقارِ عبادت کو ہے پسند تیرا لہو عروسِ شہادت کو ہے پسند
فطرت کو تیری خلق پہ ہے ناز بے شمار
انسانیت کی کیلئے تجھے زندہ یادگار

پرچم بلند تونے کیا حق کے نام کا تبدیل صبحِ نو سے کیا رنگ شام کا
ہے تیرے دم سے رتبہ یہ بیت الحرام کا پرتو ہے تُو علیِ علیہ السلام کا
تلوار تونے کھینچی جو باطل کے درمیاں
لرزے میں تھی زمیں تو سکتے میں آسماں

افسوس اس سے زیادہ اور کچھ نہ مل سکا حضرت آرزو اکبرآبادی کے بارے میں۔ کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں یہ قرض ادا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

☆☆☆☆☆

وزیر جعفری:- (کراچی)

نام، وزیر حیدر، تخلص، وزیر۔ کراچی کے ممتاز مرثیہ گو اطہر جعفری کے فرزندِ ارجمند۔ میراث پدر سے مالا مال— حضرت نسیم امروہوی کے شاگرد گویا سونے پر سہاگہ—ایک کامیاب اور مقبول مرثیہ نگار کا بیٹا جس کے گھر میں سحاب رحمت برستا ہے۔ جس کے کانوں میں بچپن سے یا حسینؑ کی صدائیں آتی رہیں۔ اس کا قبلۂ شعری کربلا کی طرف نہیں ہوگا تو کہاں ہوگا۔

وزیر جعفری نے ۱۹۷۲ء میں پہلا مرثیہ کہا جو مختصر مرثیہ، کے زیرِ عنوان شائع ہو چکا ہے۔ "یارب مرے سخن کو بہارِ شباب دے"

اس مختصر مرثیے کی وضاحت انہوں نے ایک بند میں اس طرح کی ہے:۔

گو رزم و بزم سب مری نظروں میں ہیں اہم موضوع بے شمار ہیں فرصت مگر ہے کم
ہے آدمی کو فکرِ معیشت قدم قدم پیشِ نگاہ وقت کی قیمت ہے دم بدم
اُکتائیں سامعین، مفصل اگر کہوں
بہتر یہ ہے کہ "مرثیۂ مختصر" کہوں

حضرت علی اکبرؑ کی مدح میں کہتے ہیں:۔

اکبرؑ بہار عزم و عمل کا شباب ہیں بزمِ جمالیات میں عالی جناب ہیں

یہ کیوں کہوں کہ معرکے میں بوتراب ہیں یہ کم ہے کچھ؟ شبیہہ رسالتمآب ہیں
ان کو جو رابطہ ہے پیمبرؐ کی ذات سے
شبیرؑ کی حیات ہے ان کی حیات سے

(اردو مرثیہ پاکستان میں'' ص،۴۲۸)

وزیر جعفری نے کل کتنے مرثیے کہے؟ وہ مراثی کہاں گئے؟ دبستان کراچی کے اہل نقد ونظر خاموش ہیں۔

☆☆☆☆☆

ساحر لکھنوی:- (کراچی)

ولادت ۶ ستمبر ۱۹۳۱ء

نام سید قائم مہدی نقوی، عرفیت جمشید نواب تخلص ابتدا میں جمشید، بعد میں ساحرؔ۔ والد گرامی نواب سید اختر حسین مصور لکھنوی، ابن مولوی سید انور حسین ابن نواب سید فاخر حسین فاخر لکھنوی جو میر نفیسؔ کے ہم عصر تھے اور غزل گوئی میں حضرت منیرؔ شکوہ آبادی اور مرثیہ گوئی میں حضرت ماہر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ ساحر لکھنوی کا سلسلۂ نسب حضرت مولانا غفراں مآب (بانی اجتہاد) تک پہنچتا ہے۔ ساحر کا وطن لکھنؤ ہے مگر ان کی ولادت سرائے رحمت اللہ، کھارادر کراچی میں اس وقت ہوئی جب اُن کے والدین زیارت مقدسہ کے سفر کے دوران کراچی رُکے ہوئے تھے۔ ساحرؔ کے نانا نواب سید محمد ذکی ہاتف لکھنوی تھے۔ اس طرح ساحرؔ کو ننھیال اور ددھیال دونوں طرف سے شاعری میراث میں ملی۔ شاعر لکھنوی اور فضل لکھنوی سے رہنمائی ملی۔ ۱۹۵۵ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے تو نسیم امروہوی کی رہنمائی نے سہ آتشہ کر دیا۔ ساحرؔ خاندانِ اجتہاد کے آخری شاعر ہیں۔

ساحر لکھنوی کی شاعری نہیں بلکہ ان کا تعلیمی پس منظر بھی علم کی روشنی سے منور ہے جو خانوادۂ اجتہاد کی خصوصیت ہے۔ انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی اور اردو ادب میں ایم۔ اے۔ کی سندات حاصل کیں۔ شعبۂ قانون کے امتحان میں وہ پاکستان بھر میں اول آئے۔

شعر گوئی کی ابتداء غزل سلام، نوحہ سے ہوئی۔ پاکستان آئے تو کراچی میں رثائی ادب کا ماحول پایا چنانچہ قصائد سے مرثیہ تک آئے اور ۱۹۷۵ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ مرثیہ کا عنوان تھا

''قطب شاہ سے ساحر تک'' یہ مرثیہ ۱۹۷۷ء میں کراچی سے شائع ہوا۔

ذوقِ سخن تجلیٔ عرفانِ زندگی شانہ کشِ عروسِ شبستانِ زندگی
زیبائش بہارِ خیابانِ زندگی عطرِ حیات روحِ نفس جانِ زندگی
سارا شرف کلام کی شائستگی سے ہے
انساں کائنات میں افضل اسی سے ہے

یہ مرثیہ ایک مرثیہ میں بھی ہے اور مرثیہ کی تاریخ بھی۔ اس مرثیہ میں اردو مرثیے کا آغاز، مرثیے کا ارتقائی سفر مختلف ادوار میں صاحب طرز اور معروف مرثیہ نگاروں کے نام اور ان کی شاعری پر منظوم تبصرہ شامل ہے۔ اس مرثیے میں فکری نوعیت یقیناً جدید ہے اور اسلوب قدیم ہے۔ مرثیے کی ابتداء مرثیہ کی تعریف سے کی گئی ہے۔

دریائے فکر وفن کی روانی ہے مرثیہ تیغ زبانِ شعر کا پانی ہے مرثیہ
لیلائے شاعری کی جوانی ہے مرثیہ ۸ تاریخ نے کہی وہ کہانی ہے مرثیہ
اک ضربِ عشق ہے دلِ بیدار کے لئے
اک سان ہے ضمیر کی تلوار کے لئے

مومن کے حق میں رحمت باری ہے مرثیہ گوشِ ستم پہ ضربت کاری ہے مرثیہ
دربارِ فن میں پنج ہزاری ہے مرثیہ ۷ ملکِ سخن میں لاکھ پہ بھاری ہے مرثیہ
ہے فردِ جرمِ فوجِ ضلالت شعار بھی
کردار اہلبیتؑ کا آئینہ دار بھی

مرثیے کی منظوم تاریخ گوئی میں بیسویں صدی کے حوالے سے ایک نام منظور رائے پوری کا ہے جنہوں نے ۱۹۶۲ء میں مرثیہ کی منظوم تاریخ لکھی جس میں شعراء کے نام نظم کیے ہیں۔ ان سے بھی پہلے شدید لکھنوی نے یہ کام کیا تھا مگر منظور رائے پوری کے مرثیے میں کراچی کے تعلق سے ان مرثیہ گو شعرا کے نام تھے جو شدید لکھنوی کے مرثیے میں نہیں تھے۔ منظور رائے پوری کا مرثیہ ۔ ہے واردات قلب کی تصویر مرثیہ'' (مراثی سجاد و منظور رائے پوری مطبوعہ جاوید پریس۔ کراچی) ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ حضرت شدید لکھنوی کا مرثیہ ۔ تاریخ مرثیہ سنیں اب صاحب نظر'' (ریاض شدید مطبوعہ نظامی پریس لکھنو ۱۹۶۷ء) شائع ہوا۔ شدید لکھنوی اور منظور رائے

پوری کے بعد ساحرؔ لکھنوی نے اپنے پہلے ہی مرثیہ میں مرثیہ کی تاریخ نظم کی ہے جو ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ کہا جاتا ہے نقشِ ثانی، نقشِ اوّل سے بہتر ہوتا ہے جب کہ شدیدؔ لکھنوی اور منظورؔ رائے پوری کے مرثیوں سے ظاہر ہے یہ کہاوت ساحرؔ لکھنوی کے مرثیے پر بھی صادق آتی ہے۔ جو شدیدؔ لکھنوی اور بالخصوص منظورؔ رائے پوری کے مرثیے کی اشاعت کے دس برس کے بعد کہا گیا۔ ساحرؔ لکھنوی جدید مرثیے کے حامی نہیں ہیں۔

> میں قدیم اور جدید میں دو بنیادی فرق سمجھتا ہوں اوّل تو یہ کہ جدید مرثیے میں کلاسیکل مرثیے کے رزمیہ انداز کو ترک کر دیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ جدید مرثیے میں چہرے میں موجودہ زمانے کے تقاضوں کے پیشِ نظر موضوع پر گفتگو کی جاتی ہے۔ یہ تبدیلی بجائے خود قدیم ہے۔ اس کی ابتداء مرزا اوجؔ نے کی تھی۔ جدید مرثیے نے مرثیے میں بحیثیتِ فن کوئی اضافہ نہیں کیا۔ (بیسویں صدی اور جدید مرثیہ ص ۲۹۸)

ساحرؔ لکھنوی نے اپنی کتاب ''خانوادۂ اجتہاد کے مرثیہ گو۔ ماہرؔ سے ساحرؔ تک'' میں ڈاکٹر ہلال نقوی کی کتاب ''بیسویں صدی اور جدید مرثیہ'' میں درج شدہ بہت سی باتوں کی تردید کی ہے حتیٰ کہ بعض مندرجات کو برملا غلط کہا ہے لیکن جدید مرثیے کے بارے میں اپنے اس درج بالا قول کی تردید نہیں کی لہٰذا اس پر گفتگو ہو سکتی ہے۔

مرزا اوجؔ نے مرثیے میں جو تبدیلی کی تھی اسے جدید مرثیہ کہا تھا۔ ناقدین ادب نے مرزا اوجؔ کی کاوشوں کو جدید مرثیے کے باب میں حرفِ اوّل قرار دیا ہے۔ ساحرؔ لکھنوی نے ان کی کاوشوں کو قدیم مرثیہ میں داخل کرنے کی کوشش کہا ہے جس پر، غیر محسوس طریقہ پر سہی، مگر اُن کی اہمیت کو ختم کرنے کی طرف پیش قدمی کا الزام لگایا جا سکتا ہے۔ ان کاوشوں کا نام اگر جدید مرثیہ نہ بھی ہو اور جدید مرثیے کے تقاضے مرثیے میں شامل ہو جائیں تو بھی مضائقہ نہیں لیکن بات وہاں بگڑتی ہے جہاں مرزا اوجؔ، علامہ جمیلؔ مظہری، جوشؔ ملیح آبادی اور نجمؔ آفندی کی ساری کاوشوں کو مسترد کر دیا جائے۔ ہو سکتا ہے ساحرؔ لکھنوی کا فیصلہ بھی نادانستہ ہو مگر اس کا یہ اثر تو لازمی ہوا کہ نسیمؔ امروہوی اور ان کے شاگردوں کے بارے میں جو رائے ہے اس کا اطلاق ساحرؔ لکھنوی پر بھی ہوا اور ان کے متعلق بھی کہا گیا کہ:

"نسیم امروہوی کے وہ شاگرد جنہوں نے زبان بیان کے پیمانوں کو نہیں توڑا اور ان کا جھکاؤ روایتی مرثیے کی طرف رہا، ساحرؔ لکھنوی اسی سلسلۂ سخن کے شاعر ہیں۔ شاید یہ ان کے خاندانی ادبی پس منظر کا تقاضہ ہے کہ وہ مرثیہ کی جدید روش کو پوری طرح قبول نہیں کر پائے۔"

ساحرؔ لکھنوی کا دوسرا مرثیہ "انسان اور حسینیت" ہے۔ "انسان شاہکار خدائے قدیر ہے" مرثیہ حضرت علی اصغر کے احوال پر ہے۔ اس کا سن تصنیف ۱۹۷۶ء ہے۔ ان کا تیسرا مرثیہ۔ جب آج کا یہ تمدن عروج پر آیا" ہے۔ ۱۰۹ بند کا یہ مرثیہ ۱۹۷۷ء میں کہا گیا ہے۔ ان کا ایک مقبول مرثیہ" ہاں اے قلم نگارش مدح قبول کر" ۱۹۸۱ء میں کہا گیا۔ ساحر کا دوسرا مجموعہ مراثی "علم اور علماء" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ساحرؔ لکھنوی موضوعاتی مرثیہ کہنے والوں کی فہرست میں صف اوّل کے شاعر ہیں۔ ان کے موضوعاتی مرثیوں کی فہرست خاصی طویل ہے، کم و بیش اُن کے سارے مرثیے اپنی اپنی جگہ قادرالکلامی کا مظہر ہیں لیکن درج ذیل مرثیے خواص و عوام میں بہت مقبول ہیں۔ "انسان اور حسینیت"۔۔۔ "کربلا اور عصر حاضر"۔۔۔ انسانیت اور مذہب۔ مقصد رسول اور حسینؑ۔ جناب سیدہ"، فقہ و شمشیر اور ان کا پہلا مرثیہ" قلی قطب شاہ سے ساحر تک" شامل ہیں۔

جدید مرثیہ اور عصری تقاضوں سے عدم مفاہمت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ساحرؔ لکھنوی کے شاعرانہ مقام کو تسلیم نہ کیا جائے۔۔۔ قدیم مرثیہ بہر حال مرثیہ ہے۔ اس کا ارتقاء بھی مرثیے کا ارتقاء ہے اور اس ارتقاء میں ساحرؔ لکھنوی جیسے با کمال شاعروں کا مقام اہم ہے۔ انہوں نے مرثیہ کی تاریخ کو آگے بڑھایا ہے اور خانوادۂ اجتہاد کے نام کو روشن رکھا ہے۔ ان کی اہم ترین کتاب" خانوادۂ اجتہاد کے مرثیہ گو۔ ماہر سے ساحر تک" کے علاوہ بھی ان کی تصانیف کی فہرست سے ان کی ہفت جہت تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

۱۔	مرثیہ قطب شاہ سے ساحر تک		۱۹۷۶ء
۲۔	علم اور علماء	(شخصی مرثیہ)	۱۹۹۰ء
۳۔	مرثیہ فقہ و شمشیر		۱۹۹۳ء
۴۔	آیات درد	مجموعۂ مراثی	۱۹۹۴ء
۵۔	صحیفۂ مدحت	مجموعۂ قصائد	۱۹۹۷ء

۶۔ احساسِ غم دوسرا مجموعۂ مراثی ۲۰۰۱ء

ان کے علاوہ فنِ تاریخ گوئی کا تنقیدی جائزہ، یقین کامل، ایمان پارے، باتیں ہماری رہ گئیں ان کی نثری کتابیں ہیں۔

☆☆☆☆☆

سعید حیدر سعید :- (کراچی)

پیدائش ۱۹۳۱ء بمقام الہ آباد

نام، سید سعید حیدر زیدی۔ تاریخی نام، خورشید نفیس زیدی۔ تخلّص سعید۔ والد کا اسم گرامی سید نفیس حیدر زیدی۔ وطن سادات باہرہ ضلع مظفر نگر (یو۔پی بھارت)۔ حصول تعلیم کے سلسلے میں علی گڑھ میں رہے۔ ۱۰ جون ۱۹۴۸ء کو علی گڑھ چھوڑا۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان آ گئے۔ پہلے پنجاب اور پھر سندھ میں رہے۔ ۱۹۸۶ء میں کراچی آئے اور یہیں بس گئے۔ شعر گوئی کا آغاز ۱۹۴۶ء کے لگ بھگ ہوا مگر باقاعدگی ۱۹۵۴ء سے آئی گویا پاکستان آنے کے بعد مشقِ سخن کی ابتدا کی۔ غزل ابتدا تھی مگر سادات گھرانے کے فرد ہونے کی حیثیت سے انیسؔ و دبیرؔ کو بچپن سے سنا تھا اس لئے طبیعت آسانی سے سلام اور منقبت کی طرف راغب ہوئی اور مرثیہ گوئی کی منزل تک پہنچے۔ اساتذہ میں سید مظہر علی جعفری اور ڈاکٹر صفدر حسین زیدی کے اسمائے گرامی بہت احترام سے لیتے ہیں۔ جناب نیرؔ اسعدی کے توسل سے سعید حیدر سعید کا ایک مرثیہ مل سکا ہے جس کے چند بند نمونہ کلام کے طور پر درج کئے جا رہے ہیں۔ مرثیہ امام زین العابدینؑ کے احوال کا مرثیہ ہے۔

یا مرتضیٰ علیؑ شہِ صفدر مدد کرو یا فاطمہؑ رسول کی دختر مدد کرو
اے وارثانِ سورۂ کوثر مدد کرو بہرِ خدا و بہرِ پیمبر مدد کرو
لکھنا ہے مرثیہ مجھے چوتھے امام کا
لختِ دلِ حسین علیہ السلام کا

وہ شب ڈھلی، وہ رات ہوئی وہ اذاں ہوئی ڈیرے اُٹھا کے شب سوئے مغرب رواں ہوئی
کرنوں کے تیر شمس کی ظاہر کماں ہوئی انگڑائی لے کے اٹھ گئی دنیا جواں ہوئی
جاگے ہوئے تھے رات کے تارے وہ سو گئے
جو تھے شبِ فراق کے تارے وہ سو گئے

آغاز مرثیہ علی ابن الحسین سید الساجدین کی ولادت سے ہوتا ہے۔ نصف سے زیادہ مرثیہ فرزند حسینؑ امام زین العابدین کی شجاعت کے ذکر پر مشتمل ہے۔

دو نام کربلا کے جیالوں میں فرد ہیں دونوں علی مثال بوقتِ نبرد ہیں
ان کی کوئی مثال نہیں ایسے مرد ہیں ہیبت سے انکی ناریوں کے چہرے زرد ہیں
دونوں، نظرے حشر کے آثار روک دیں
ایسے جری کہ وقت کی رفتار روک دیں

لیکن کربلا میں حسینؑ کا یہ شجاع فرزند علالت شدید کے سبب شمشیر کے جوہر نہ دکھا سکا۔

عباسؑ نامدار کو حسرت ہی رہ گئی بیماری نے بھتیجے کی ہر آس توڑ دی
لڑنے کی خود کو بھی تو اجازت نہیں ملی کس کو خبر جو غازی کے دل پر پڑ گذر گئی
غیظ و غضب سے کیسے نکالا حسینؑ نے
بھائی کو کس طرح سے سنبھالا حسینؑ نے

اور اس کے بعد مصائب ہی مصائب، ضبط ہی ضبط جو امام کی پہچان ہے۔

جب عصر کو حسینؑ نے سجدے میں سر رکھا اک زلزلے سے ہلنے لگا دشتِ کربلا
زینبؑ نے آکے سیّد سجاد سے کہا بیٹا اُٹھو، اُٹھو کہ قیامت ہوئی بپا
کیسی صدا فلک سے یہ اس آن آتی ہے
دیکھو تو کیا ہوا کہ میری جان جاتی ہے

بستر سے اٹھ کے خیمے کے در تک امام آئے منظر کسی پسر کو نہ ایسا فلک دکھائے
نیزے پہ سر ہو باپ کا، کچھ بیٹا کر نہ پائے غش کھا کے مولا گر پڑے اک بار کہہ کے ہائے
ہر بی بی سر کو پیٹتی تھی خاک اُڑاتی تھی
آواز فاطمہؑ کے بھی رونے کی آتی تھی

تاراجیٔ خیام ہوئی، لٹ چکے حرم بچوں کا مارے خوف کے آیا لبوں پہ دم
سر ننگے بیبیاں تھیں اور اٹھتے نہ تھے قدم خوف و حیا و شرم ہوئے آکے سب بہم
آنکھوں کو کھولا ابنِ شہِ تشنہ کام نے
سر ننگے ماؤں بہنوں کو دیکھا امام نے

قدموں کو چوما بیڑیوں نے تشنہ کام کے　　باہیں گلے میں طوق نے ڈالی امام کے
بیچارگی نے بوسے دئے ہاتھ تھام کے　　خاروں نے تلوے چوم لئے راہِ شام کے
ہمدرد جس قدر تھے وہ قدموں میں آ گئے
دُرّے نشانِ پشت کے زینت بنا گئے

اس منزل پر سعید حیدر کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کہاں تو مرثیوں کے بین، اہلِ حرم کی گریہ وزاری اور آہ و بکا کا منظر پیش کرتے ہیں کہاں یہ احتیاط کہ بیڑیاں اور طوق پہنائے جانے کو اس طرح نظم کیا ہے بیڑیاں اور طوق پہننے والے کو عظمتیں سلام کرتی نظر آتی ہیں۔ اس شعر کو بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؎

قدموں کو چوما بیڑیوں نے تشنہ کام کے
باہیں گلے میں طوق نے ڈالی امام کے

آفرین، صد آفرین سعید حیدر سعید۔ اللہ کرے آپ کے اشعار اور آپ کے لفظ و حرف ہی نہیں آپ کا جذبہ بھی قبولِ بارگاہِ سیدہ ہو۔ اس مرثیے میں مصائب کے اور بند بھی ہیں مگر اس سے آگے کچھ نقل کرنے کو جی نہیں چاہتا ؎

بے چارگی نے بوسے دئے ہاتھ تھام کے
خاروں نے تلوے چوم لئے راہِ شام کے

اس بند کو پڑھ کے آنکھ سے جتنے آنسو بہے وہ سعید حیدر کے نام۔ کاش وہ اپنے کچھ اور کوائف اور ایسے ہی کچھ اور اشعار بھیج دیتے۔

☆☆☆☆☆

رضوان سرسوی:- (کراچی)

ولادت یکم جون ۱۹۳۳ء

نام سید ابراہیم حسین نقوی۔ والد کا اسم گرامی سید حسین نقوی۔ آبائی وطن قصبہ، سرسی سادات، تحصیل سنبھل ضلع مراد آباد۔ تعلیمی مدارج انٹر کامرس (فیضِ عام کالج، میرٹھ) سے۔ بی۔ کام (میرٹھ کالج میرٹھ) سے پاس کی۔ ریلوے سروس کمیشن الہ آباد سے ریلوے گارڈ کا امتحان پاس کیا۔ ایم۔ کام (آگرہ یونیورسٹی) سے کیا۔ ۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۴ء ریلوے میں ملازمت کی اور

اسی دوران ایم۔ کام کی سند حاصل کی۔ ۱۹۶۴ء میں پاکستان آگئے۔ اسلامیہ کالج، سکھر (سندھ) میں لیکچرار (کامرس) کی حیثیت سے تقرر ہوگیا۔

شاعری کا آغاز ۱۹۵۶ء میں ہوا۔ سب سے پہلے سید الشہداء امام حسینؑ کا قصیدہ لکھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ قصیدہ طرحی تھا، مصرعِ طرح ـ ''دکھائے ہیں خوشی کے دور دو اک ماہِ شعباں نے'' تھا۔ رضوانؔ سرسوی اُن دنوں میرٹھ میں تھے جہاں قصیدہ، سلام اور منقبت گوئی کا ماحول تھا اور باقاعدگی سے محافل ہوا کرتی تھیں۔ پاکستان آئے تو کالج میں لیکچرر کی حیثیت سے قرطاس وقلم سے رشتہ برقرار رہا۔ ۱۱ جنوری ۱۹۹۴ء کو 'ریٹائرمنٹ' کے بعد کراچی آگئے جہاں مرثیہ کی فضا پہلے بن چکی تھی۔

تصانیف: (۱) جامِ ولا (۲) صحیفۂ عقیدت (۳) رموزِ غزل

کراچی آنے کے بعد ۱۹۹۴ء سے تا حال جو کلام کہا وہ قصائد وسلام کے علاوہ مراثی پر مشتمل ہے۔ ایک مرثیہ شائع ہو چکا ہے اور ایک مجموعہ ''بہارِ فکر'' زیرِ طبع ہے۔ اپنے مکتوب (بنام راقم الحروف) میں یہ تحریر نہیں فرمایا کہ اب تک کتنے مرثیے کہہ چکے ہیں یا 'بہارِ فکر' میں کتنے مراثی اشاعت کی منزل پر ہیں۔ رضوانؔ سرسوی صاحب نے اپنے مکتوب کے ساتھ ایک مرثیہ ہمیں ارسال فرمایا ہے جس کے کچھ بند درج ذیل ہیں، مرثیے کا عنوان ''فکر'' ہے۔

اے معرفتِ آلِ محمدؐ یہ کرم کر پڑھ نادِ علیؑ اور میرے ذہن پہ دم کر
ہے خواہشِ دل فکر کی پرواز رقم کر سر میرا درِ حضرتِ شبیرؑ پہ خم کر
ممکن ہی نہیں ہے نہ کھلے بابِ عطا کا
سائل ہوں درِ آلِ رسولؐ دوسرا کا

ہے فکر میں 'ف' فہم اور ادراک کی غماز اور 'ک' سے ہیں فہم کی کونین میں آواز
او 'ر' یہ بتاتی ہے کہ ہو راز کا ہمراز اس طرح سے ہے 'فکر' خموشی میں سخن ساز
ہے ذہن میں اس فکر کا تھوڑا سا تعلق
سچ پوچھیے تو حسنِ لطافت کا تعلق

ہاں فلسفہ والوں کی بھی اک فکر ہے کیا خوب ۸ یہ لائقِ عزت ہیں سا جوں کے ہیں مندوب
ہیں علم کو مطلوب شرافت کو ہیں مرغوب ہے یہ بھی حقیقت نظر آتے ہیں یہ مجذوب

منطق سے مسائل کی گرہ کھولتے ہیں یہ
تفہیم و دلائل کی گرہ کھولتے ہیں یہ

دامن میں ادب کے ہیں بڑے فکر کے شاعر ۱۳ یہ سب ہی دکھاتے ہیں تمدن کے مناظر
حالی ہوں کہ اکبر ہوں الہ آباد کے ماہر یا حضرت اقبال کا ہو فلسفہ ظاہر
اسلام کے مردانِ حجازی انہیں کہیے
یا فکر کی تلوار کے غازی انہیں کہیے

غالب بھی ہے اُستاد مگر فکر و بیاں کا ۱۴ مٹ سکتا نہیں اب بھی اثر اُس کی فغاں کا
بلبل ہے وہ اُردوئے معلّیٰ کے جہاں کا لازم ہے بہت تذکرہ اُس فخرِ زماں کا
گر ذکر ہو اس کا تو یہ اُلفت ہے، ادب سے
چھوڑے کوئی اس کو تو بغاوت ہے ادب سے

اب یاد مجھے آئے انیسِ ادب ایجاد ۱۵ وہ ذات کہ ہر لمحہ جسے فکر کرے یاد
گلزارِ ادب، دولت و انعامِ خدا داد زینت دہِ دنیائے سخن کے بدل اُستاد
ہر طرح سے ہے زینتِ فن مرثیہ جس کا
مجموعۂ اصناف سخن مرثیہ جس کا

میر انیس کے بعد مرزا دبیر، جوش، عشق و تعشق، میر مونس، قیصر، وحید، نسیم کی منازلِ فکر بیان کرنے کے بعد اس شعورِ فکر کو نظم کیا ہے کہ آج کا دور ایٹم کا دور ہے اور ''اس دور کے انساں کے تقاضے بھی ہیں کچھ اور'' اور یہ تقاضے وہی ہیں جو فرعون و نمرود کی فکر کے تقاضے تھے۔ یعنی ظلم کرنے کے تقاضے۔ اور پھر یوں ہوا کہ ''اس قسم کے لوگوں میں خلیلِ خدا آئے'' یہ بات ستائیسویں بند میں کہی گئی ہے۔ پھر نمرود کی فکر اور خلیل اللہ کی فکر کا تذکرہ، آتش نمرود کا گلزار ہونا، اور رضوان سرسوی کا یہ بند ''یوں فکرِ خلیلی نے کیا ظلم کو برباد''، اور دینِ ابراہیمؑ آگے بڑھا، فکرِ حق اور فکرِ باطل میں تضاد ہوتا رہا اور پھر مرثیے کا ۴۹واں بند ۔

یہ مسجد کوفہ ہے جہاں شور بپا ہے ۴۹ اک حاکمِ بے لوث کو اک زخم لگا ہے
رسّی میں بندھا سامنے قاتل بھی کھڑا ہے اس عادلِ بے مثل نے کیا حکم دیا ہے

اس طرح سے ملزم کو کبھی پیش نہ کرتا
توہینِ عدالت ہے یہ رسّی میں جکڑنا

مرثیہ حضرت علی مرتضیٰ کی شہادت پر ختم ہوتا ہے۔ رضواؔن سرسوی فکر کی جن منازل سے گذرے ہیں وہ اُن کے شعورِ مرثیہ گوئی اور تاریخ کے عمیق مطالعہ کا ثبوت ہے، اللہ اُن کی اس عبادت وریاضت کو قبول کرے۔

☆☆☆☆☆

رازبجنوری:- (کراچی)

ولادت ۴ / جولائی ۱۹۳۴ء

جائے ولادت موضع گوولی سادات، ضلع بجنور (یو۔ پی)۔ راؔز بجنوری کے دادا سید مسرورالحسن مسروؔر بھی مرثیہ گوشاعر تھے۔ تیس مرثیوں کے مصنف تھے۔ اُس دور میں مرثیوں کے تین تین سو بند ہوا کرتے تھے۔

اپنے تعلیمی سلسلے کے بارے میں راز بجنوری نے اپنے مکتوب بنام عاشور کاظمی میں لکھا ہے کہ ابتدائی تعلیم قصبہ چاندپور کے مسلم مفتاح العلوم سیکنڈری سکول میں حاصل کی۔ میٹرک سے گریجوایشن تک بہاول نگر، ایم۔ اے کراچی یونیورسٹی سے اور بی۔ ایڈ کی سند علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی (پاکستان) سے حاصل کی۔ اس تعلیمی سلسلے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقسیم ہند (۱۹۴۷ء) کے بعد اُن کے والدین بہاول نگر آئے اور بعد میں کراچی منتقل ہو گئے۔ چنانچہ راز بجنوری نے کراچی سے ایم۔ اے کیا۔ آغاز شعر گوئی کے متعلق وہ رقم طراز ہیں کہ ۱۹۳۴ء میں جب وہ چوتھی جماعت (پرائمری) کے طالب علم تھے انہوں نے پہلا شعر کہا تھا۔ ہندوستان میں تھے تو حضرت پرواؔنہ بجنوری (جو رازؔ بجنوری کے خالو تھے) سے اصلاح لی، پاکستان میں انیس عابدؔی اور حضرت یاور اعظمی سے سلسلۂ تلمذ وابستہ کیا۔

رازؔ بجنوری تادمِ تحریر ہذا چار مرثیے کہہ چکے ہیں۔ نمونۂ کلام کے طور پر انہوں نے اپنا ایک مرثیہ بعنوان ''اخلاق'' ارسال فرمایا ہے جس کے چند بند درج ذیل ہیں۔

اخلاق روشنی کی علامت کا نام ہے	۲ اخلاق شخصیت کی نفاست کا نام ہے
اخلاق آدمی کی شرافت کا نام ہے	اخلاق تو دلوں کی طہارت کا نام ہے

اخلاق نے زمانے کو درسِ وفا دیا
تانبے کو ایک آنچ نے کندن بنا دیا

اخلاق انبیاء کا ہمیشہ سے ہے چلن ۳ اخلاق اہلِ حق کا ہے ممتاز پیرہن
اخلاق آگہی کا مہکتا ہوا چمن ممتاز جس سے نبیوں میں ٹھہرے شہِ زمن
حضرت پہ یہ کرم ہوا ربّ کریم کا
قرآن گواہ بن گیا خُلقِ عظیم کا

پانچویں بند میں۔ ''مولا علی کا خُلق بھی خُلقِ عظیم ہے''
چھٹے بند میں ۔ ''لازم ہے خُلقِ فاطمہ زہراؑ کروں بیاں''
ساتویں بند میں۔ ''صلحِ حسنؑ ہے صلحِ محمدؐ کا آئینہ''
اور آٹھویں بند میں سلسلہ وار بات امام حسینؑ تک پہنچتی ہے۔

اخلاق میں ہیں چودہ کے چودہ بلند تر ۸ دشمن بھی حرف لا نہ سکا اُن کے خُلق پر
اسلام کے ستون ہیں گویا یہ سر بسر راہِ عمل میں بڑھ گیا زہراؑ کا اک پسر
وہ پیش رو حسین علیہ السلام ہیں
صبر و رضا کے آج بھی مولا امام ہیں

دینِ خدا کی عزّت و توقیر ہے حسینؑ ۱۳ خوابِ خلیلِ پاک کی تعبیر ہے حسینؑ
قرآن آفتاب تو تنویر ہے حسینؑ گویا مقطعات کی تفسیر ہے حسینؑ
ان کے لہو سے دینِ خدا سرخرو ہوا
نامِ حسینؑ نامِ خدا سُرخرو ہوا

اور اس منزل پر ساقی نامہ کے بند۔

ذکرِ امام آیا ہے ساقی شراب دے ۱۷ بیتاب ہو رہا ہوں خدا را شتاب دے
جام و سبو ہٹا دے مجھے بے حساب دے نامِ حسینؑ لے کے مجھے بے حساب دے
ایسی شراب جس سے مجھے آگہی ملے
قربِ رسولؐ، قربتِ مولا علیؑ ملے

ایسی شراب دے کہ جو کعبے میں پی سکوں ۱۹ ہر گھونٹ پر میں شکر کا سجدہ ادا کروں

نشہ بڑھے تو جھوم کے نادِ علی پڑھوں مدہوش ہو کے ذکر شہِ کربلا کروں
یہ آرزو ہے واقعۂ کرب و بلا لکھوں
ایسی پلا دے، ایک نیا مرثیہ لکھوں

کعبے میں جب سکون نہ پایا حسینؑ نے ۲۱ حُرمت کو بیتِ حق کی بچایا حسینؑ نے
پڑنے دیا نہ ظلم کا سایا حسینؑ نے اک زخم اور سینے پہ کھایا حسینؑ نے
عمرہ میں حج کو بدلا سوئے نینوا چلے
دار الاماں کو چھوڑ سوئے کربلا چلے

یہ فیصلہ کہ ظلم کے آگے جھکے نہ سر ۲۳ دینِ خدا کو پہنچے نہ ہرگز کوئی ضرر
جھکنے نہ پائے اہل وفا کی کبھی نظر آباد ہو زمانے میں اخلاق کا نگر
پھر سے کوئی یزید نہ اب سر اُٹھانے پائے
اب پھر سوالِ بیعتِ فاسق نہ آنے پائے

مصائب اور بین کے باب میں بھی رازؔ بجنوری ایک باشعور، پختہ گو شاعر نظر آتے ہیں، اس مرثیے میں جب امام کے خیام دریا کی ترائی سے ہٹانے کا مطالبہ ہوتا ہے تو حضرت عباسؑ کو جلال آجاتا ہے۔ امام مظلوم جنگ میں پہل نہ کرنے پر اصرار کرتے ہیں اور خیام ہٹانے کا حکم دیتے ہیں (شاید حضرت عباسؑ کی توجہ دوسری طرف مبذول کرانے کے لئے) پیش آنے والے واقعات بتاتے ہیں۔ یہی اس مرثیے میں مصائب ہیں۔ امام حسین فرماتے ہیں۔

منزل یہی ہے قافلۂ حق کی میری جاں ۴۵ ہوں گے دیارِ غیر میں اب سخت امتحاں
برچھی جگر پہ کھائے گا اکبرؑ سا نوجواں اصغر بھی تیر کھا کے یہیں ہوگا نیم جاں
دریا کو فتح کر کے، ترائی بساؤ گے
بالی سکینہ روئے گی پر تم نہ آؤ گے

ہم آپ کے کٹے ہوئے بازو اُٹھائیں گے اکبر سے نوجوان کا لاشہ اُٹھائیں گے
اصغر کی قبر تیغ سے ہم خود بنائیں گے قوتِ علیؑ کی ہم سرِ میداں دکھائیں گے
اے کاش تم بھی دیکھتے اس بے نوا کی جنگ
کفار یاد رکھیں گے کرب و بلا کی جنگ

مصائب کے باب میں ایسا بہت کم ہوا ہے بلکہ شاید ہوا ہی نہیں کہ کربلا کا کوئی کردار مصائب بیاں کرے اور اس میں گریہ وزاری اور بیکسی و بے بسی کا اظہار نہ ہو۔ راز بجنوری نے یہ بھی کر دکھایا ہے کہ مصائب کا ذکر امام کی زبان سے مگر عظمت وصبرِ خانوادۂ رسالت اپنی جگہ پر قائم ہے۔ آفرین راز بجنوری۔

☆☆☆☆☆

رفیق رضوی:- (کراچی)

ولادت ۱۹۳۶ء

نام سید رفیق علی۔ تخلص رفیقؔ۔ رضوی سادات۔ وطن موضع واری ضلع اعظم گڑھ والد کا اسم گرامی سید شوکت علی رضوی۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آ گئے۔ ۱۹۵۳ء میں شاعری شروع کی۔ حضرت محسن اعظم گڑھی کے شاگرد ہوئے۔ پہلا مرثیہ ۱۹۵۳ء میں کہا:

''بزمِ جہاں میں شمعِ فروزاں حسینؑ تھا''

بزم جہاں میں شمعِ فروزاں حسینؑ تھا تاریکیوں میں مہر درخشاں حسینؑ تھا
چرخِ وفا کا نیر تاباں حسینؑ تھا واللہ فخرِ موسیٰ و عمراں حسینؑ تھا
تھا وجہ فخر عالم امکاں کے واسطے
بحرِ کرم تھا دہر میں انساں کے واسطے

جو صاحبان علم کا رہبر تھا وہ حسینؑ جو ورثہ دارِ حیدرِ صفدر تھا وہ حسینؑ
جو جانشین حضرت شبرؑ تھا وہ حسینؑ اوصاف میں جو بعد پیمبرؐ تھا وہ حسینؑ
قصرِ جفا کو لرزہ براندام کر دیا
نمرودیت کو جس نے تہہِ دام کر دیا

اوصاف انبیاء کا جو حامل تھا وہ حسینؑ چرخ یقیں کا جو مہ کامل تھا وہ حسینؑ
جو بحرِ ضبط وصبر کا ساحل تھا وہ حسینؑ تنہا جو ظالموں کے مقابل تھا وہ حسینؑ
طاغوتیت کے کوہ گراں کو گرا دیا
ٹھوکر سے جس نے شرک کا ایوان ڈھا دیا

رفیقؔ رضوی کی شاعری میں بے ساختہ پن ہے۔ وہ مرثیے کے جدید تقاضوں سے آشنا

ہیں، دلورام کوثری، جوشؔ اور نجم سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں اس لئے جو موضوعاتی مرثیے کہے ہیں ان میں نجم اور جوشؔ کا آہنگ ہے۔ ان کا مرثیہ "قرآن اور اہلبیت" اس شعور کی نمائندگی کرتا ہے۔ اُن کے دو اور موضوعاتی مرثیے "تفسیر کربلا" اور "وفا و صبر" نئے ڈھنگ کی علامت ہیں۔

رفیق رضوی نے دوسرا مرثیہ "دل اور، جگر اور، نظر اور، زباں اور" ۱۹۶۳ء میں کہا۔ دوسرے ہی مرثیے میں غالبؔ کی طرز نوا سے ابتدا کرنا اس بات کی واضح نشان دہی ہے کہ وہ پختہ گو شاعر ہیں اور انہیں لفظوں کے برتنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ رفیق رضوی کم کہتے ہیں مگر سلیقے سے کہتے ہیں۔ "شبیر سے ننھا سا پسر اذن طلب ہے" علی اصغر کے احوال کا مرثیہ ہے جس میں شاعر نے بین کئے ہیں جس سے گریہ بھی پیدا ہوتا ہے مگر لفظوں کی ادائیگی کی ذمہ داری کربلا کے صابروں پر نہیں ہے۔

شبیر سے ننھا سا پسر اذن طلب ہے — جھولے میں یہ اصغر کے ہمکنے کا سبب ہے
خیموں میں خواتین کی حالت ہی عجب ہے — بسمل ہے کوئی اور کوئی جان بلب ہے
مائل بہ وغا قائلِ اللہ احد ہے
یاحیدرِ کرار، یہی وقتِ مدد ہے

دل والو سنو، طفل سے ہے ماں کی جدائی — اصغر کی جدائی ہے، دل و جاں کی جدائی
صد حیف کہ چولی سے ہے داماں کی جدائی — لاریب ہے تفسیر سے قرآن کی جدائی
تنہا ہیں حسینؑ ابن علی، دھوپ کڑی ہے
اولادِ پیمبرؐ پہ قیامت کی گھڑی ہے

اور پھر حسینؑ کا علی اصغر کو میدان میں لے جانا۔ علی اصغر کا سوکھی زبان ہونٹوں پر پھیرنا۔ فوج اعدا میں کہرام برپا ہونا۔ تاریخ کو رفیق رضوی نے شاعرانہ مہارت اور رثائی ادب کے حوالے سے نظم کیا ہے حتیٰ کہ اس مقام پر پہنچتے ہیں۔

تاریخ یہ کہتی ہے کہ اک حشر بپا تھا
اعدائے شہِ دیں میں کہرام مچا تھا
ایسے میں پکارا عمرِ سعد یہ بڑھ کر — اے حرملا تند نظر دیکھ یہ منظر
پا جائیں نگاہوں میں کہیں فتح نہ اصغر — چھا جائیں کہیں دیکھ نہ یہ ذہن و نظر پر

اس وقت تو کچھ کام لے تو تیرِ ستم سے
ہم جیت رہے ہیں ہمیں کیا کام ہے غم سے

کڑکی وہ کماں، تیر چلا شاہ کی جانب سارا تھا جہاں ظالم و گمراہ کی جانب
اور ان کی نگاہیں تھیں کہ اللہ کی جانب رخ جس کا کہ تھا اصغرِ ذی جاہ کی جانب
اس حق سے سبکدوش قلم ہو نہیں سکتے
عاشور کے حالات رقم ہو نہیں سکتے

رفیق رضوی ان معنی میں نئے مرثیے کی روش پر گامزن نظر آتے ہیں کہ وہ ضعیف روایتوں کو نظم نہیں کرتے۔ واقعات تک محدود رہتے ہیں اور اس اختصار میں فن شعر گوئی کا اظہار کر جاتے ہیں۔ ''شب عاشور'' ان کا ایسا مرثیہ ہے جسے منظوم تاریخ کہا جا سکتا ہے۔ اس تاریخ کو کیسے کیسے لفظ دیئے ہیں رفیق رضوی نے۔

بے رنگ ہے ہر پھول اُداسی ہے چمن پر
بھاری ہے بہت آج کی شب شاہِ زمن پر

یہ طرز کلام ایک دردمند دل کا کلام ہی ہو سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر نعیم تقوی:- (کراچی)

ولادت ۱۹۳۸ء

نام، سید محمد نعیم حیدر۔ تخلص نعیمؔ۔ تقوی سیّد۔ بحر العلوم حضرت سید ضیاء حسین تقوی ضیا اعتمادی کے فرزند۔ والد گرامی بلند پایہ عالم دین۔ ادیب اور شاعر تھے تعلیم ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ شعبہ درس و تدریس سے وابستہ ہوئے اور پروفیسر ہو گئے۔ شاعری ان کا ورثہ تھی۔ علم ان کے گھر کا ماحول تھا۔ نعیم تقوی اپنی خاندانی عظمت پر نازاں ہیں۔

مخزنِ علم وادب تھے مرے جدِّ امجد
جدِّ امجد سے اب و جد کو مرے فیض ملا
میں نے پایا ہے سدا والدِ مرحوم سے فیض
کیوں نہ ہو فخر کہ مشہور ہوں تلمیذِ ضیاء

مرثیے کے ناقدین نے ان کی علمی بصیرت اور ان کے کثیر المطالعہ ہونے کو تسلیم کیا ہے۔

"انہیں مختلف زبانوں پر دسترس ہے۔ ان کی تصنیفات کی تعداد اُن کے علمی تبحر پر دلالت کرتی ہیں۔ یہ تعداد بیس (۲۰) کے لگ بھگ ہے۔ اسلامیات اور انتقادیات ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ 'بصیرت'، 'کہکشاں' اور 'بادۂ عرفاں' اور 'مثنوی صبح یقین' کے مطالعہ سے ان کی فنی مہارت اور فکری عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح اُن کی نثری تخلیقات بھی نہایت وقیع و رفیع ہیں۔ (اردو مرثیہ پاکستان میں۔ ص ۲۱۸)

پروفیسر نعیم تقوی نے شاعری کب شروع کی اس کا ریکارڈ نہیں ملتا البتہ ان کا پہلا مرثیہ "وہ بھی کیا دن تھے کہ ظلمت سے تھا معمور جہاں" ۱۹۵۸ء میں کہا گیا تھا — ان کے مراثی میں فکر کی فضا، تعقل کی روشنی، جدید فکر اور قدیم اسلوب، علمی بصیرت اور فلسفیانہ شعور ملتا ہے۔ مرثیوں میں نعت کی جو فضاء پروفیسر نعیم تقوی پیدا کرتے ہیں اس کی مہک اُن کے تمام مراثی میں ملتی ہے۔

ایوانِ فکر مطلعِ انوارِ ذات ہے   تابندہ جس سے کعبۂ روحِ حیات ہے
اوہام کے جسد پہ لباسِ ممات ہے   نورِ یقیں نہیں ہے تو ہر سمت رات ہے
دنیا میں جس کو دولت بیدار چاہیے
لازم ہے حُبِّ احمدِ مختار چاہیے

ہوں گامزن جو سیدِ والا کی راہ پر   آلامِ روزگار کا مطلق نہ ہو خطر
ظلمت کے ساز سے ہو عیاں نغمۂ سحر   لمحات گنگ کی ہو زباں نطق معتبر
میزانِ علم میں جو عمل تولتے نہیں
بندِ قبائے زیست کبھی کھولتے نہیں

یہ مرثیہ انہوں نے ۱۹۸۰ء میں کہا تھا۔ ایک اور مرثیہ ۔ "اے صلِ علیٰ اسطرح دل زمزمہ خواں ہو" بھی اس فضا کا حامل ہے۔ اس مرثیہ میں رسالت سے امامت تک کا تذکرہ علیٰ قدر مراتب ہے ۔

اے صلِ علیٰ اس طرح دل زمزمہ خواں ہو   الفاظ کا ملبوس نہ ہو باغ جناں ہو

حوروں کی صباحت لئے اندازِ بیاں ہو | دوشیزگیٔ فکر، مضامیں سے عیاں ہو
اک لفظ پہ بھی حرف نہ آئے وہ سخن ہو
مہکا ہوا گلہائے عقیدت کا چمن ہو

ممدوح مرے سیّد و سردارِ دو عالم | شہکارِ مشیت ہیں وہی نورِ مجسّم
رحمت کے ہی سائے میں ہیں ضو پاشیاں پیہم | ہوسکتی نہیں روشنیٔ فکر مری کم
اے خامہ بصد عجز محمدؐ کی ثنا کر
سر سجدہ میں رکھ تذکرۂ نورِ خدا کر

وہ نور خدا جس سے کہ تزئینِ جہاں ہے | اس پیکرِ کونین میں جو روحِ رواں ہے
اس مصحفِ ناطق کا جو اندازِ بیاں ہے | قرآن و احادیث کی صورت میں عیاں ہے
اس نورِ خدا کا کوئی ہمسر نہیں دیکھا
اور عکس بجز حیدرِ صفدر نہیں دیکھا

آقا ہے مرا وہ جو شہِ جن و بشر ہے | وہ مصدرِ حکمت ہے وہی علم کا گھر ہے
جو علم کے خواہاں ہیں انہیں خوب خبر ہے | حیدر کے علاوہ نہ کوئی دوسرا در ہے
معراج اسی در سے تو ملتی ہے جبیں کو
کیا کیا نہ مراتب ملے اربابِ یقیں کو

اب لب پہ میرے فاطمہ زہراؑ کا بیاں ہے | جو لختِ دلِ بادشہِ کون و مکاں ہے
خاتونِ قیامت ہے یہ ہر اک پہ عیاں ہے | یہ اوج ہے وہ شبرؑ و شبیرؑ کی ماں ہے
یہ فاطمہؑ کا وصف خفی اور جلی تھا
ہمسر کوئی کب اس کا بجز ذاتِ علیؑ تھا

مخدومۂ کونین ہے شہزادیٔ عالم | جس کے درِ دولت پہ فرشتوں کے تھے سر خم
منسوب ہے جس ذات سے ہی عصمتِ محکم | تعظیم کیا کرتے تھے جس کی شہِ اکرم
فرمایا ہے خود بضعۃ منّی شہِ دیں نے
پائی ہے سرافرازی طہارت کی جبیں نے

اس کے بعد امام حسنؑ ذکر، اُن کے بعد امام حسینؑ کا ذکر، پھر کربلا، مصائب کربلا مقصد

کربلا، حسینؑ کا میدان میں جانا، حجت تمام کرنا، سب کچھ علی الترتیب نظم کیا ہے۔ امام کے رجز کا ایک بند مقصد حسینؑ اور مقصد کربلا کی وضاحت کرتا ہے۔

اسلام امانت ہے رسولؐ عربی کی — تبدیل کرے اس کو کب ہمت ہے کسی کی
ہے مجھ سے عیاں راہ، نجاتِ ابدی کی — بیعت نہیں کرسکتا کسی مردِ شقی کی
گونجے گا سدا نعرہ توحید فضا میں
پائندہ شہادت کی مہک ہوگی فضا میں

رسولؐ اکرم سے کربلا تک پروفیسر نعیم تقوی کی فکر بہت واضح اور برملا ہے۔ وہ کربلا کو ایسی درس گاہ سمجھتے ہیں جہاں زندگی کے ہر پیچ وخم سے نبرد آزما ہونے کا درس ملتا ہے۔ وہ کربلا کو زندگی اور زندگی کو کربلا کا نام دیتے ہیں۔

انعام حق ہے عشقِ پیمبر ہے زندگی — لاریب حُبِ حیدر و صفدر ہے زندگی
بدر و اُحد ہے خندق و خیبر ہے زندگی — کرب وبلا میں فدیۂ سرور ہے زندگی
رازِ حیات بالیقیں علم و عمل میں ہے
صدیوں کی کامرانی فقط ایک پل میں ہے

علم و عمل کا درس فروزاں ہے کربلا — تابانیٔ حیات کا ساماں ہے کربلا
تا روزِ حشر جادۂ عرفاں ہے کربلا — راہِ خدا میں شوقِ فراواں ہے کربلا
بے جان جسم میں بھی لہو دوڑنے لگے
عزمِ صمیم کفر کا سر توڑنے لگے

☆☆☆☆☆

علامہ طالب جوہری:- (کراچی)

ولادت ۳۱ راگست ۱۹۳۹ء

خاندانی نام ابوطالب۔ جائے ولادت گورکھپور (یو پی)۔ وطن مالوف حسین گنج ضلع سارن (بہار)۔ شاعر، ادیب، فکر، دانشور، خطیب اور عالم دین علامہ طالب جوہری، حجۃ الاسلام، عالم دین حضرت علامہ مصطفیٰ جوہر کے فرزند ارجمند ہیں۔ اس حوالے سے خود کو جوہری لکھتے ہیں۔ علامہ طالب جوہری نے ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی۔ نجف اشرف سے اجتہاد کی

سند حاصل کی۔ کراچی یونیورسٹی سے اسلامیات میں ایم۔اے کیا۔ انہیں یہ شرف حاصل ہوا کہ ان کے اساتذہ میں آیت اللہ آقا ابوالقاسم خوئی اعلی اللہ مقامہٗ، آیت اللہ سید علی خانی اعلیٰ اللہ و مقامہٗ۔ آیت اللہ سید باقر الصدر اعلی اللہ مقامہٗ اور آیت اللہ روح اللہ خمینی اعلی اللہ مقامہٗ جیسے جید علماء شامل ہیں ـــــ حصول تعلیم کے بعد علامہ طالبؔ جوہری نے اپنی حیات ذکرِ حسینؑ کے لئے وقف کردی اور اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر زندگی کا سفر شروع کردیا۔ اُس وقت تک اُن کے والد گرامی اور عالم اسلام کے منفرد عالم علامہ مصطفیٰ جوہرؔ کی حیات کا سورج غروب نہیں ہوا تھا لہٰذا علامہ طالبؔ جوہری اپنے والد گرامی کے ہدایت و سرپرستی کی روشنی میں سرگرم سفر ہوگئے۔ اور جب یہ روشنی نہ رہی تو طالبؔ جوہری نے اپنے بابا کے نقوش پا کے اجالوں کو رہنما بنالیا۔ حصول تعلیم کے دوران جن عظیم اور مقتدر علماء کی سرپرستی علامہ طالبؔ جوہری کو حاصل رہی انہوں نے علم و آگہی کے جو چراغ طالبؔ جوہری کے قلب میں روشن کردیئے تھے وہی چراغ آج بھی علامہ طالبؔ جوہری کی راہوں میں اجالے بکھیر رہے ہیں۔ اور آج طالبؔ جوہری عالم اسلام میں ایک جیدّ عالم دین، مفکر، فلسفی، خطیب کی حیثیت سے جانے مانے جاتے ہیں۔

علاّمہ طالبؔ جوہری ۱۹۴۹ء میں (بعمر دس برس) اپنے والد گرامی کے ساتھ پاکستان آئے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے لئے نجف اشرف چلے گئے۔ اور ۱۹۶۵ء میں تکمیل علومِ دینی کی سندات لیکر واپس کراچی آئے ـــــ راقم الحروف کو ایک سے زیادہ مرتبہ حجتہ الاسلام علامہ مصطفیٰ جوہرؔ صاحب قبلہ سے ملاقاتوں کا شرف حاصل ہوا ہے اور ۱۹۶۵ء سے تادم تحریر علامہ طالبؔ جوہری سے مراسم کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ راقم نے اس سورج کو طلوع ہوتے دیکھا ہے اور نصف النہار تک پہنچتے دیکھا ہے۔ شاعر طالبؔ جوہری، مرثیہ گو طالبؔ جوہری۔ خطیب طالبؔ جوہری، ذاکرِ حسینؑ طالبؔ جوہری اور بے مثال خطیب عالم اسلام علاّمہ طالبؔ جوہری ـــــ ان ساری منازل سے آگہی اور ذاتی تجربے کی بنیاد پر راقم الحروف عاشور کاظمی بلاخوف تردید کہہ سکتا ہے کہ علاّمہ طالبؔ جوہری کے علم کی بنیادیں ٹھوس ہیں اور شاعری ان کا اکتسابی جوہر نہیں بلکہ انہیں ودیعت ہوا ہے۔ انہوں نے آٹھ برس کی عمر سے مصرعے موزوں کرنے شروع کردئے تھے۔ ان کا پہلا شعر انہیں یاد ہے۔

امام زمانہ کریں گے ظہور
جو شیطان کرلے گا سارے قصور

عام طور پر شاعری کی ابتداء غزل سے ہوتی ہے بعد میں شعور کی پختگی کے بعد لوگ شعر و سخن میں راہیں تلاش کرتے ہیں۔ علامہ طالبؔ جوہری کے خانوادۂ علم و بصیرت کی تربیت کا اثر تھا کہ ان کا پہلا شعر "امام زمانہ" سے متعلق تھا۔۔۔۔ علامہ طالبؔ جوہری نے منقبت و سلام سے شعر گوئی کا آغاز کر دیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے مرثیہ بھی کہے اور غزلیات و منظومات بھی۔۔۔ انہیں کارگہ فکر و عمل میں نئی راہیں تراشنے کی صلاحیت عطا ہوئی ہے۔ جس طرح انہوں نے خطاب میں جداگانہ انداز بیان اپنایا ہے اسی طرح شاعری کے چمن میں بھی رنگ رنگ کے پھول کھلائے ہیں۔ ان کی تصانیف کی ترتیب ان کی ہم جہت قادر الکلامی کا ثبوت ہے۔

تصانیف (نثر) — احسن الحدیث (تفسیر قرآن حکیم دو جلدیں)

— علامات ظہور مہدی

— مجالس (دس جلدیں)

— غزلیات اور منظومات (دو مجموعے) 'حرف نمو' اور 'پسِ آفاق'

— مرثیہ ہدایت

اس وقت مختلف موضوعات پر (بشمول مراثی) ان کی سات کتابیں زیر ترتیب ہیں۔ یہ اس شخص کا تخلیقی سرمایہ ہے جس کے روز و شب مطالعہ، خطابت، اندرونی ملک اور بیرونِ ملک سفر، ملنے والوں اور چاہنے والوں کے دکھ درد بانٹنے، قومی مسائل کو سلجھانے میں گذرتے ہیں۔

علامہ طالبؔ جوہری نے پہلا مرثیہ ۱۹۶۲ء میں کیا۔ مرثیہ کا عنوان 'وجود باری' تھا۔ دوسرا مرثیہ 'جبر و اختیار' اور تیسرا مرثیہ 'تاریخ تدوین حدیث' ہے۔ ان خشک اور عین علمی موضوعات کو مرثیے کا چہرہ بنا کر شاعری کے قالب میں ڈھالنا سہل نہیں ہے لیکن علامہ طالبؔ جوہری جس طرح علمی نکات عالمانہ مگر خوشگوار لہجے میں بیان کرتے ہیں اسی طرح انہوں نے دقیق اور علمی موضوعات پر شاعری میں شعریت کو برقرار رکھا ہے۔ ان کے چوتھے مرثیہ سے کچھ بند نمونہ کلام کے طور پر یہاں نقل کئے جا رہے ہیں۔

اے فکر جواں صفحۂ دانش پہ رقم ہو اے فرقِ گماں علم کی دہلیز پہ خم ہو

اے خامۂ جاں، دشت معانی میں علم ہو اے طبعِ رواں، زیب دہ لوح و قلم ہو

تحریر کے قبضے میں ہو خشکی بھی تری بھی
ہو معترف زورِ قلم، دیدہ وری بھی

اے ذوقِ سخن، بامِ فصاحت سے عیاں ہو اے حرفِ حسین، شہرِ سماعت میں اذاں ہو
اے طرزِ کہن، کاوشِ جدت سے جواں ہو ۲ اے دجلۂ فن، کوہِ طلاقت سے رواں ہو
شعروں میں سمندر کی روانی نظر آئے
ہر لفظ میں دانش کی کہانی نظر آئے

کیا بزم کی خواہش ہے یہ پہچان رہا ہوں میں ذوقِ سماعت کی طلب جان رہا ہوں
دامانِ خیالات کو گردان رہا ہوں ۷ اس خاک سے دُرہائے نجف چھان رہا ہوں
کاغذ پہ ہویدا ہوں وہ نقشے چم وخم کے
ہوں ارض و سماوات بھی قبضے میں قلم کے

یہ ارض و سماوات کی ویران حویلی انساں اس ویران حویلی کی چنبلی
انسان کہ جسکا نہ کوئی یار نہ بیلی ۸ بوجھے نہ فرشتے بھی وہ دشوار پہیلی
اسماء و معانی کے گہر رول رہا تھا
آفاق تھے خاموش، بشر بول رہا تھا

تاریخ کا آغاز، وہ غاروں کے اندھیرے غاروں کے اندھیروں میں وہ انسانوں کے ڈیرے
ڈیروں پہ وہ فرسودہ روایات کے گھیرے ۱۰ گھیروں کی حسیں سطح پہ پنگھٹ کے سویرے
پنگھٹ کے سویروں میں فضا جھوم رہی تھی
اک محورِ تازہ پہ زمیں گھوم رہی تھی

بے رنگ ونکہت قبلِ تہذیب زندگی کی منظر کشی ایک ذاکر" عالم" اور شاعر کی جولانی فکر کی روشنی آگے بڑھی تو دلکشی کی چاندنی چٹکی نظر آئی ۔

آغوشِ خطابت میں پلی شعلہ بیانی جذبات کے سانچوں میں ڈھلی دل کی کہانی
کھیتوں کی منڈیروں پہ اُگی زمزمہ خوانی ۱۲ ادراک و تعقل پہ اُمنڈ آئی جوانی
یوں وہم وگماں جذب ہوئے علم و یقیں میں
تہذیب سنورنے لگی آغوشِ زمیں میں

پروان چڑھے علم بھی صنعت بھی، ہنر بھی پیدا ہوئے فنکار بھی، ارباب نظر بھی
تہذیب کی تدوین میں سپنے بھی تھے سر بھی ۱۴ لکھتی گئی تاریخ، حکایات سفر بھی
انسان نے صدیوں کی وراثت کو سمیٹا
بکھری ہوئی ہر ایک حکایت کو سمیٹا

آغاز سے اس قافلہ زیست کے ہمراہ کچھ لوگ تھے انساں کی سعادت کے بھی خواہ
حساس و خدا ترس، بشر فہم و خود آگاہ ۱۶ ان لوگوں میں ہر ایک تھا مخصوص من اللہ
پہرہ تھا مشیت کا ہر اک گام پہ ان کے
عصمت کی قبا چست تھی اجسام پہ ان کے

مرثیے کا سولھواں بند یعنی گریز کا بند زندگی کے سفر کو ان مخصوص من اللہ لوگوں تک لے آیا جو نہ صرف شاعر کے بلکہ تاریخ انسانیت کے ممدوح ہیں۔

یہ خاتم تقدیس نبوت کے نگینے سینوں میں لیے لطف الٰہی کے خزینے
کھیتے رہے خالق کی مشیت کے سفینے ۱۹ بستے رہے دنیا میں ہدایت کے مدینے
کھٹکا تھا نہ رہزن کا نہ بیداد گروں کا
ہر موڑ پہ پہرہ تھا انہی راہبروں کا

علامہ طالبؔ جوہری نے اپنی ندرتِ فکر، ندرتِ اسلوب، اور ندرتِ بصیرت کے باوجود مرثیہ کی روایت کو ماننے سے انکار کیا نہ لوازم مرثیہ سے اجتناب کا دعویٰ کیا مگر مصائب و بین کی منزل پر ان کا برتاؤ قدیم مرثیے سے مختلف نظر آتا ہے۔ ان کے مراثی میں مصائب کے بیان میں بے بسی بمعنی مجبوری و لاچاری نہیں مظلومیت کا بیان ہوتا ہے۔ اس طرح بین میں آہ و بکا شاعر کے بین کا ردِ عمل ہوتا ہے یا صبر کی منزل اعلیٰ پر فائز شخصیات کے آنسوؤں پر، جو تقاضائے فطرت ہوتے ہیں۔

اک سیدِ مظلوم ہے اور سینکڑوں بے پیر ایک شخص ہے اور سینکڑوں ہاتھوں میں ہے شمشیر
گر سنگ برستے ہیں تو آتے ہیں کبھی تیر ۸۰ لگتا ہے کبھی گرز تو جھک جاتے ہیں شبیرؑ
ایسے میں کسی غم زدہ بی بی کے یہ نالے
اے کل کے محافظ میرے بچے کو بچالے

گھوڑے سے سوئے فرش چلے سیدِ والا رہوار نے گھٹنوں کے بل آقا کو سنبھالا
جبریل نے قدموں سے رکابوں کو نکالا ۸۱ پہنچے جو زمیں پر تو زمیں تھی تہ و بالا
اک شور تھا گریہ کا بپا جن و ملک میں
سورج کو گہن تھا تو سیاہی تھی فلک میں

جب بیٹے کا سر کٹتا تھا آغوش میں ماں کی کیا حال تھا زہراؑ کا نہیں تاب بیاں کی
خوناب تھی آنکھیں بھی رسول دو جہاں کی ۸۳ ہر سانس تھی اک موج بقا شاہِ زماں کی
سجدے میں رکھا سر کہ یہی عینِ رضا تھی
کچھ لمحوں میں گردن سر اقدس سے جدا تھی

شبیر کی ماں کو تو زمانے نے نہ دیکھا لیکن تھا عیاں سب پہ جو عالم تھا بہن کا
سو بار اٹھا اٹھ کے گرا خیمے کا پردہ ۸۵ لیکن سرِ شبیرؑ جونہی نیزے پہ آیا
اس وقت نہ زینبؑ کو کسی طرح کل آئی
سر کھولے ہوئے خیمے سے باہر نکل آئی

بولی کہ میں ہوں احمد مختار کی بیٹی سن لو میں ہوں خیبر کے علمدار کی بیٹی
رک جاؤ کہ ہوں کل کے مددگار کی بیٹی ۸۶ ہٹ جاؤ کہ ہوں حیدر کرار کی بیٹی

مرثیہ کا آخری بند مرثیہ کی روایت کے مطابق دعا پر ختم نہیں ہوتا بلکہ سلام پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

نیزے کی بلندی پہ کٹے سر کو سلامی کانوں سے اتارے ہوئے گوہر کو سلامی
شہزادیٔ کونین کی چادر کو سلامی سجادؑ کے جلتے ہوئے بستر کو سلامی
اے صاحب عصر، آمرِ دوراں تجھے تسلیم
اے منتقمِ خونِ شہیداں تجھے تسلیم

مندرجہ بالا بند علامہ طالب جوہری کے ایک مرثیہ کے صرف چند بند ہیں جو اُن کے مراثی کے معیار کا احاطہ نہیں کر سکتے البتہ یہ چند کرنیں آفتاب کی روشنی اور حرارت دونوں کا پتہ ضرور دے رہی ہیں۔

☆☆☆☆☆

قمر نقوی:- (کراچی)

ولادت دسمبر ۱۹۴۰ء

نام سید قمر عباس نقوی۔ تخلص قمر۔ نقوی سید۔ آبائی وطن خورجہ ضلع بلند شہر۔ والد کا اسم گرامی سید خورشید علی نقوی مرحوم۔ تعلیم انٹرمیڈیایٹ۔ دس برس کی عمر تھی جب والدین کے ہمراہ پاکستان آگئے۔

شاعری کا آغاز غزل گوئی سے ہوا۔ حضرت عزم اکبرآبادی سے سلسلۂ تلمذ وابستہ ہوا اور پھر یوں ہوا کہ کراچی کے افق شعروادب پہ ستارے جھلملانے لگے۔ نسیم امروہوی، نجم آفندی، سید آل رضا، جمی کہ جوش بھی آگئے۔ شعراء کرام اور شائقین سخن کی نگاہیں اس کہکشاں پر جم گئیں اور کراچی میں شعروسخن کے ماحول میں تبدیلیاں آنے لگیں۔ قمر نقوی نے بھی ان اجالوں کو دیکھا، ان شعراء کے ساتھ محفلوں میں شرکت کی اور اُن کے ممدوح بھی بدل گئے۔ اُن کا شعری سفر بھی حیات ابدی کی طرف مڑ گیا۔ بچپن میں انیس و دبیر کے مراثی کی جو آوازیں کانوں میں پڑی تھیں وہ ساعتوں میں اُبھرنے لگیں اور قمر نقوی نے منقبت وسلام کہنے شروع کردئے۔ فکر کی لَے اور بڑھی تو مرثیے کہنے شروع کردئے۔ یاور اعظمی کی اصلاح نے چنگاری کو شعلہ بنادیا۔

قمر نقوی کے فرزند جاوید نقوی نے جناب نیر اسعدی کے توسل سے قمر نقوی کا ایک مرثیہ ہمیں ارسال کیا ہے۔ ''کیا بے خودی کا خواب حکومت کا ہے غرور''

باطل پرست ہاتھ میں تلوار ہے غرور بدعت نواز زعم حق آزار ہے غرور
بندہ خودی کا نفسِ خطا کار ہے غرور تعمیلِ حکم حق سے بھی انکار ہے غرور
جس نے خدا کی راہ سے بے راہ کر دیا
شیطاں کو اُس نے راندۂ درگاہ کر دیا

انساں کی عقل و ہوش کا دشمن غرور ہے فسق و فجور فکر کا مسکن غرور ہے
اربابِ ظلم و جور کا مامن غرور ہے سفیانیت تو روح ہے اور تن غرور ہے
ڈرتا نہیں ہے قہر خدا کے نزول سے
بیعت طلب یہ کرتا ہے سبطِ رسول سے

جسدم یزید شام کا فرمانروا ہوا دشمن نبی کی آل کا وہ پُر جفا ہوا

جاری نظام ظلم کا اک سلسلہ ہوا دنیا پرست، دشمنِ دینِ خدا ہوا
تبدیلیاں روا ہوئیں حق کے کلام میں
باقی رکھا نہ فرق، حلال و حرام میں

اسلام دے رہا تھا دہائی حسینؑ کی زہرا کے دلربا کی، شہِ مشرقین کی
سبطِ رسولؐ، حیدرِ صفدر کے چین کی بازوِ حسنؑ کے، جانِ شہِ بدر و حنین کی
وہ جو امامِ وقت ہے حق کی پناہ ہے

....

امام حسینؑ سے بیعت طلب کی جاتی ہے۔ امام انکار کرتے ہیں اور مدینہ چھوڑنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ مادرِ گرامی کی قبر پر جاتے ہیں۔ یہ واقعات اس مرثیے میں نظم کئے گئے ہیں۔

وقتِ سحر روانہ ہوا شہ کا قافلہ کعبے میں آیا پہلے دل و جانِ مصطفٰی
ہر سانس میں تھا عشقِ الٰہی بسا ہوا پر دلبرِ رسولِ خدا حج نہ کرسکا
جائے اماں نہ پائی جو واں بھی حسینؑ نے
لی کربلا کی راہ شہِ مشرقین نے

امام کربلا پہنچتے ہیں۔ فرات کے کنارے خیامِ حسینی نصب کردئے جاتے ہیں۔ سپاہ شام کی پہلی جفا کہ فرات کے کنارے سے خیمے ہٹائے جائیں اور دور صحرا میں لگائے جائیں۔ امام نے جنگ میں پہل نہیں کی۔ خیام ہٹالئے گئے۔ پانی بند ہوا۔ خیموں سے العطش کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

پہنچی جو حرؑ کے کانوں میں بچوں کی یہ صدا خوفِ خدا سے اس کا بدن کانپنے لگا
پیاسوں کی یاد آئی تو اک تیر سا چبھا بستر سے اپنے چوم کے تلوار لی اُٹھا
جوشِ تعب میں پہلو بدلنے لگا جری
بیٹھا نہ جب گیا تو ٹہلنے لگا جری

اور پھر حرؑ کی ندامت۔ خدمتِ امام میں حاضری کا ارادہ۔ بیٹے اور غلام کا حُر کی ہمنوائی کرنا۔ صبح صادق کے وقت امام کے خیام کی طرف روانگی۔ خیام کے قریب پہنچ کر حُر کا خود کو گھوڑے سے گرادینا اور خدمت امام میں حاضر ہونا۔

حُر دوڑ کر حسینؑ کے قدموں پہ گر پڑا روکر کہا کہ بخش دیں مولا میری خطا
میں نے لگام تھام کے روکا تھا راستا میں کربلا میں آپ کے غم کا سبب بنا
اے کاش میں نہ ہوتا یزیدی سپاہ میں
اے کاش میں نہ روکتا حضرت کو راہ میں

قمرؔ نقوی نے حُر کے واقعات کو تفصیل سے نظم کیا ہے اس مرثیے میں اور کسی جگہ گریہ و بکا کی خاطر غیر مصدقہ واقعات یا مفروضات کی آمیزش نہیں کی ہے۔ حُر میدان میں جانے کی اجازت مانگتے ہیں۔ بڑے تذبذب کے ساتھ امام اجازت دیتے ہیں۔ حُر میدانِ وغا میں جاتے ہیں قتال کرتے ہیں اور شہادت پر فائز ہوتے ہیں۔ مصائب اور بین کے معاملے میں قمرؔ نقوی نے طرزِ قدیم کی روایت کی پاسداری کی ہے۔

اہلِ حرم میں آہ و فغاں کا جو غُل ہوا سجادؑ غش سے چونکے تو شورِ فغاں سُنا
پوچھا پھوپی سے کیا ہوا بتلایئے ذرا وہ بولیں حُر حسینؑ پہ قربان ہو گیا
یہ لشکرِ حسینؑ کا پہلا شہید ہے
مرنے سے اس کے لشکرِ اعدا میں عید ہے

زینبؑ پکاریں آہ یہ کیسا غضب ہوا اے بیبیو ہراولِ شبیرؑ مر گیا
روؤ سروں کو پیٹ کے، ماتم کرو بپا آیا تھا وہ جو شہ کا مددگار چل بسا
اصحابِ شاہ دیکھ کے بے چین ہوتے ہیں
سبطِ نبی نڈھال ہیں، عباسؑ روتے ہیں

اس کے بعد مصائب کے چار بند اور ہیں جن میں اہلِ بیت اطہار کے گریہ و بکا کا ذکر ہے۔ قمرؔ نقوی نے اب تک کتنے مرثیے کہے اس کا علم تادمِ تحریر نہیں ہو سکا۔

☆☆☆☆☆

شکیل مچھلی شہری:- (کراچی)

تاریخ پیدائش ۳ر جولائی ۱۹۴۰ء

نام سید محمد علی رضوی۔ تخلص شکیلؔ۔ آبائی وطن مچھلی شہر ضلع جونپور۔

تعلیم انٹرمیڈی ایٹ، ادیب، ماہر۔ محلہ خانزادہ مچھلی شہر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں

پاکستان آگئے۔ شاعری کا شوق طالب علمی کے زمانے سے ہوا۔ ابتدا میں سروشؔ مچھلی شہری سے اصلاح لی۔ بعد میں خاورؔ نگرامی، یاورؔ اعظمی اور ان کے بعد انیسؔ عابدی کو کلام دکھاتے ہیں۔ جعفرِ طیار سوسائٹی، ملیر، کراچی میں رہتے ہیں۔ پیہم کوشش کے باوجود اس سے زیادہ کوائف نہ مل سکے۔ کراچی کے مرثیہ نگاروں مین ان کا شمار لازمی ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کی اب تک کل کتنے مرثیے کہے ہیں البتہ وہ مرثیہ جس کے چند بند بطور نمونۂ کلام درج ذیل ہیں وہ ان کا تیسرا مرثیہ ہے۔ یہ مرثیہ انہوں نے ۲۵ مارچ ۲۰۰۴ء کو حضرت انیسؔ عابدی کے ہاں مجلس میں پیش کیا تھا جس کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ابتک انہوں نے زیادہ سے زیادہ پانچ یا چھ مرثیے کہے ہوں گے۔ اللہ انہیں توفیق دے کہ وہ اس راہِ ہدایت پر تیز تر سفر کریں۔ جیسا کی عرض کیا یہ اُن کا تیسرا مرثیہ ہے۔

"مدحتِ سیدِ سجادؑ سے ہے شانِ سخن"

۱
مدحتِ سیدِ سجادؑ سے ہے شانِ سخن ذکر سے اُن کے سنورتا ہے دبستانِ سخن
نام اُن کا لکھا جاتا ہے بعنوانِ سخن اسی گل سے تو مہکتا ہے گلستانِ سخن
اس کی خاشبو جو سرِ عرشِ عُلا جاتی ہے
باغِ فردوس کے پھولوں سے مہک آتی ہے

۷
ساقیا پھر سے مجھے ساغر و مینا دیدے بحرِ عصیاں سے نکلنے کا سفینہ دیدے
آج کعبے میں مجھے بیٹھ کے پینا دیدے اپنے میکش کو بھی جینے کا قرینہ دیدے
پی لوں گر جامِ ولا، بھٹکوں نہ پھر راہوں میں
بڑھ کے رحمت بھی تیری لے لے مجھے بانہوں میں

۲۱
مجھ کو معلوم نہیں فکر کہاں تک پہنچے مدحِ ممدوح ہے، مقصود جہاں تک پہنچے
جو بھی سوچوں وہ قلمرو کے نشاں تک پہنچے دل کی ہر بات محبت کے نشاں تک پہنچے
اُن کی مدحت میں کبھی لب کو اگر کھولتا ہوں
پہلے میزانِ صداقت پہ اُسے تولتا ہوں

۲۸
ہاں اسی میکدۂ پاک کے ساقی ہیں علیؑ ان سے گر جام ملے سمجھو بلا سر سے ٹلی
ساقیِ کوثر کے بھی ہیں لکھا ہے باحرفِ جلی کہیں حیدرؑ تو کہیں ہیں یہی ’بجرگ بلی‘

ان کو قرآں کی زباں میں تو ولی کہتے ہیں
لوگ مشکل میں پکاریں تو علیؑ کہتے ہیں

یہ جو زندہ ہو تو باقی ہے صداقت کا وجود ۳۲ دادا پوتے کا تقابل نہیں کرنا مقصود
اس کا کردار و عمل عینِ رضائے معبود عمر بھر کرتا رہا ہے یہی رکوع اور سجود
فخر ہے زُہد پہ بھی جس کو یہ وہ زاہد ہے
ناز ہے جس پہ عبادت کو یہ وہ عابد ہے

اس کا دادا ہے علیؑ، فاتحِ خندق و حنین ۳۳ جدِ امجد کو جو پوچھو تو رسول الثقلین
اس کے عموّ ہیں حسنؑ، فاطمہؑ کے نورِ عین دادی خاتونِ جناں قلبِ نبی کا ہے جو چین
سب مورّخ یہی با حرفِ جلی لکھتے ہیں
اس کے بابا کو حسینؑ ابن علیؑ لکھتے ہیں

صبر کا جس کے نہیں ثانی زمانے میں کہیں ۳۶ اسی شبیرؑ کا بیٹا ہے یہ سجادِ حزیں
باپ کے بعد ہوا مہرِ رسالت کا نگیں حکم دیتا تو نگل جاتی لعینوں کو زمیں
شامی جلاّد یوں سوتے سے جگا دیتے تھے
کبھی زنجیر کبھی طوق ہلا دیتے تھے

بھائیوں اور عزیزوں کی شہادت دیکھی ۳۷ روزِ عاشور محرّم یہ قیامت دیکھی
زیرِ خنجر شہِ بیکس کی عبادت دیکھی ایک سے ایک مصیبت پہ مصیبت دیکھی
مال سب لُٹ گیا خیموں کو بھی جلتے دیکھا
چادرِ زینبؑ مضطر کو بھی چھنتے دیکھا

ہاتھ میں دی گئی سجادؑ کے اونٹوں کی مہار ۳۸ بے کجاوہ تھے شتر بیبیاں تھیں اُن پہ سوار
بیڑیوں کی یہی ہر ایک قدم پر تھی پُکار کہیں پتھر کہیں نالے کہیں ریتی کہیں خار
طوق و زنجیر میں جکڑا ہے بدن کیا کرتا
باپ کی لاش ہے بے گور و کفن، کیا کرتا

مرثیہ ۴۸ بند پر مشتمل ہے ۳۸ سے ۴۸ تک مصائب کے بند ہیں اور یہ مصائب شاعر کی طرف سے بیانیہ ہیں خاندانِ رسالت کے افرادِ محوِ گریہ وزاری نظر نہیں آتے۔

☆☆☆☆☆

پروفیسر سحر انصاری:- (کراچی)

تاریخ پیدائش: ۲۷ر دسمبر ۱۹۴۱ء

خاندانی نام: انور مقبول، تخلص سحرؔ۔ قلمی نام سحرؔ انصاری۔ جائے ولادت اورنگ آباد (دکن)۔ ددھیال کا تعلق مراد آباد سے اور ننھیال کا سلسلہ میرٹھ سے تھا۔ ان کے ننھیالی بزرگوں میں مولانا اسماعیل میرٹھی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

ابتدائی تعلیم اورنگ آباد۔ حیدر آباد، ناندیڑ، اور بمبئی ہوئی۔ ۱۹۵۰ء میں ہجرت کر کے والدین کے ساتھ پاکستان آگئے اور کراچی یونیورسٹی سے فزکس، کیمسٹری اور ریاضی میں بی۔ ایس۔ سی کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد انگریزی، اردو، اور لسانیات میں یکے بعد دیگرے ایم۔ اے۔ کی سندات حاصل کیں۔ اردو میں نمایاں کامیابی پر کراچی یونیورسٹی نے جگرؔ مراد آبادی طلائی تمغہ دیا۔

پروفیسر سحرؔ انصاری کے گھر کے ماحول اور خاندانی پس منظر نے ابتداء سے انہیں مطالعہ اور ادب سے وابستہ رکھا۔ اسکول کے زمانے سے لکھنے لکھانے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ عملی زندگی کی ابتداء برطانوی سفارتخانہ سے وابستگی کے بعد ہوئی۔ پھر ۱۹۷۳ء میں پروفیسر کرار حسینؒ اور پروفیسر مجتبیٰ حسینؒ کے بلانے پر بلوچستان یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں تدریس سے آغاز کیا۔ دو سال بلوچستان میں رہنے کے بعد کراچی یونیورسٹی میں تدریسی ذمہ داروں کو سنبھال لیا حتیٰ کہ پروفیسر اور صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ اب بھی کراچی یونیورسٹی اور جناح یونیورسٹی برائے خواتین میں ادبیات اور لسانیات کی تدریس کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

ادبی زندگی کی آغاز ابتدائی دنوں میں ہفت روزہ 'نئی جمہوریت' کراچی کی ادارت سے ہوا۔ بلوچستان سے واپس آنے کے بعد ماہنامہ 'افکار' کراچی' سہ ماہی جریدہ، غالبؔ'' کے شریک مدیر رہے۔ سہ ماہی '' تمثال'' کے مدیر اعلیٰ رہے۔ اردو ڈکشنری بورڈ میں دو سال مدیر اعلیٰ رہے اور برسوں کے رکے ہوئے تحقیقی اور طباعتی امور کو متحرک کیا۔ انہوں نے '' مقالات جوشؔ'' مرتب کر کے ایک اہم کام کیا ہے۔ ان کا اپنا شعری مجموعہ '' نمود'' ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا ہے۔ جن شعراء نے لاطینی امریکہ اور افریقہ کی شاعری کے ترجمے کیے ہیں ان میں پروفیسر سحرؔ انصاری کا نام اہم ہے۔ ان کے دو نثری تراجم فیض احمد فیض کے مجموعہ '' سر وادی سینا'' (موجودہ نسخہ ہائے وفا) میں شامل ہیں۔ نثری ادب میں ان کے ایک ہزار سے زیادہ مقالے مختلف جرائد و رسائل میں

شائع ہو چکے ہیں جو تا حال کتابی صورت میں یکجا نہیں ہوئے ہیں۔

سحرؔ انصاری نے کم و بیش شاعری کی تمام ہی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ شعر گوئی کے سفر کا آغاز غزل سے ہوا جو سلام نوحہ منقبت کی وادیوں سے گذرتا ہوا انہیں مرثیہ کی منزل تک لے آیا — انہوں نے اپنے مکتوب (بنام عاشور کاظمی مرقومہ ۸ ر اکتوبر ۲۰۰۳ء) میں لکھا ہے کہ انہوں نے پہلا مرثیہ ''شعوریت'' کلیم آل عبا شاہد نقوی۔ علامہ طالبؔ جوہری۔ ساحرؔ فیض آبادی، اسیرؔ فیض آبادی اور ثاقبؔ مظفر پوری کی انفرادی اور مشترکہ ترغیب پر لکھا۔ اس مرثیہ کا نمایاں وصف یہ ہے کہ انہوں نے خیر و شر کی ازلی جنگ کو سائنسی استعاروں اور علامتوں میں بیان کیا ہے۔ مرثیہ میں اس قسم کے مصرعے علوم جدید پر شاعر کی دسترس و آگہی کی دلالت کرتے ہیں۔

بجلی کی ایک رو کہ جو جوہر بھی فرد ہے — اک چیز اس میں گرم ہے، ایک چیز سرد ہے

کاغذ پہ دھڑکنیں ہوں اگر دل میں درد ہے — ....

پہلے ہی مرثیہ میں جدید سائنسی اور سماجی افکار کی اس حسین آمیزش نے سحرؔ انصاری کو مرثیہ نگار شاعر کی حیثیت سے منوالیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے بیسویں صدی کے اختتام تک ۱۲ مرثیہ کہے ہیں جن میں ایک شخصی مرثیہ میر انیسؔ کے حوالے سے بھی شامل ہے۔ — ان کے مراثی کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کربلا کا معرکہ اور تاریخ کربلا کے سارے ابواب انکی نگاہوں کے سامنے رہتے ہیں اور انہیں اندھیرے میں کربلا سے روشنی ملتی ہے۔ جاپان کے سفر میں ہیروشیما کی تباہی کا منظر دیکھ کر ان کی زبان بر بیساختہ آیا۔

میں سفر میں تھا، سفر کی ابتلا یاد آگئی
سر زمینِ مہر پر بھی کربلا یاد آگئی

اس ایک بیت نے ان سے پورا مرثیہ کہلوالیا۔ بہ الفاظ دگر ہیروشیما کی تباہی کا منظر اور طاقت کی درندگی کے ایک منظر نامے میں انہیں تاریخ انسانی میں بہیمیت اور درندگی کے سب سے بڑے مظاہرے کی تاریخ یاد دلادی۔ وہ تاریخ جو سیدہ زینبؑ کے خطبوں کے سہارے ابدیت آشنا ہوئی — جناب زینبؑ کے احوال کا مرثیہ سحرؔ انصاری کے اسی نقطہ نظر کی وضاحت کرتا ہے۔

طائرِ حرف کو پرواز میں زندہ رکھا
تم نے تاریخ کو آواز میں زندہ رکھا

سحؔر انصاری کے مراثی مدینے سے کربلا تک، کربلا سے شام تک، اور شام سے مدینہ تک کی اس تاریخ کے ابواب ہیں جسے سادات بنی ہاشم نے اپنے مقدس خون سے لکھا۔ سحؔر انصاری کے ایک مرثیے ''قاسم کی مہندی'' نے غیر معمولی شہرت پائی ہے اس مرثیے میں انہوں نے مروجہ روایات کو ترک کر کے چشم تصور سے اُن روایت کو دیکھا ہے۔ تاریخ کی کڑیوں کو مسلسل کرنا چاہا ہے۔

کربلا! تیرے بجائے جو مدینہ ہوتا اس تقریب کا کیا کیا نہ قرینہ ہوتا
شور اٹھتا کہ شب قدر سی رات آئی ہے
دھوم مچ جاتی کہ قاسم کی برات آئی ہے

لیکن جب ایسا نہ ہو سکا تو

یوں ادا فرض ہوا بے سر و سامانی میں
اک اضافہ سا لگا دشت کی ویرانی میں

سحر انصاری کے شعری مجموعہ ''نمونہ'' کی شاعری، فن شعر گوئی پر ان کی دسترس اور نادر الکلامی پر دلالت کرتی ہے۔ لیکن ان کے مرثیوں میں ایک اضافی 'روشنی' ایک 'اضافی اجالا' بھی نمایاں ہے۔ کربلا والوں کی مودت کا اُجالا، رسولؐ اور آل رسول سے تعلق کی روشنی۔ اور اسی روشنی، اسی اُجالے نے سحر انصاری کو سحؔر حسینی بنا دیا ہے۔ پروفیسر سحؔر انصاری کے مرثیہ ''لوح و قلم'' کے چند شعر ملاحظہ ہوں

قسم قلم کی جو تحریر کی علامت ہے ہر ایک قد سے سوا جس کا قد و قامت ہے
جو اپنی ذات میں خود علم کی اقامت ہے ازل سے جس کی کشش سر بسر قیامت ہے
کہ اعتبار خفی و جلی قلم سے ہے
وقارِ احمدؐ و شانِ علیؑ قلم سے ہے

قلم نے خلق کیے حرف مثلِ روح و جسد ہر ایک حد میں نہاں ہیں معانیٔ بے حد
قلم امین ازل ہے، قلم نقیب ابد وہ منتخبی ہو کہ ہو صرف واقفِ ابجد
کھلے کسی پہ کہاں رمز ہائے بسم اللہ
قلم ہے نکتہ ور رازِ ہائے بسم اللہ

جو طے ہوا ہے ازل میں فسانۂ تقدیر　　کیا ہے اس کو قلم نے کچھ اس طرح تحریر
ہوئی اک آن میں قرطاسِ قلب کی تسخیر　۴　یہ چاکِ دامنِ تقدیر و سوزنِ تدبیر
یہ کشمکش، یہ کشاکش قلم کے دم سے ہے
یہ جبر و قدر کا عالم اس قلم سے ہے

جو راہِ حق میں قلم سے جہاد کرتے ہیں　　گلِ مراد سے شاخوں کو شاد کرتے ہیں
وہ کب حمایتِ شر و فساد کرتے ہیں　۸　زمانے ان کو گذر کر بھی یاد کرتے ہیں
عجب بہار ہے الفاظ کی کرامت میں
خزاں نہیں ہے دمیدہ قلم کی قسمت میں

وقارِ لوح و قلم جن کے نام پر ہے فدا　　وہ لفظ اوّل و آخر وہ مہرِ حق کی ضیاء
وہ جن کے در پہ مساوی ہیں بادشاہ و گدا　۱۵　کریں اک آن میں طے منزلِ شبِ اسرا
انہی کو حامد و محمودِ کائنات لکھیں
متاعِ منزلِ مقصودِ کائنات لکھیں

وہ شہرِ علم علیؑ، بابِ علم، صلِّ علیٰ　　وہ بوتراب، وہ خیبر شکن، وہ شیرِ خدا
صفات میں کوئی ہمسر نہیں ہوا جس کا　۱۹　وہ ذوالفقار کی صورت، قلم بھی جس کو ملا
امینِ لوح و قلم ہی سے ہے امانتِ علم
چلی ہے سلسلہ در سلسلہ وراثتِ علم

صفت عمل میں عیاں ہو یہ ہے اصولِ حیات　　علیؑ کی ذات ہے دراصل ترجمانِ صفات
وہ رمزِ مرگ و فنا ہو کہ زندگی کے نکات　۲۰　علی کے علم نے سمجھا دیئے سبھی درجات
یہ وصف اُن کے ہر اک نورِ عین میں آئے
حسنؑ میں آئے شعورِ حسینؑ میں آئے

اسی شعور کی ضو میں ہم اپنے قول و عمل　　پرکھتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں ربِ عز و جل
اسی حوالے سے نکلے جو مشکلات کا حل　۲۲　تو شادکام ہوں مل جائے کارِ زیست کا پھل
جو منتہا ہے، اسی زیب و زین سے دیکھیں
حیاتِ نو کو نگاہِ حسینؑ سے دیکھیں

زمانہ اپنے ہی انداز سے تھا محوِ خرام دھوئیں میں ظلم کے گھٹنے لگے خواص و عوام
نہیں تھا دہر کو اندازہ حلال و حرام ۳۴ خلاف دینِ مبیں کٹ رہے تھے صبح و شام
کلاہ داری و سرداری و حکومت سے
عوام تنگ تھے کم ظرفیٔ سیاست سے

کتاب کی کوئی عزت نہ دین کی توقیر الگ الگ تھی حرام و حلال کی تعبیر
اذان و مسجد و منبر تھے وجہ دار و گیر ۳۶ زبانِ خار سے گل کی لکھی گئی تفسیر
یہ واقعات تھے قلبِ امام مضطر تھا
تھا اس کا فرض کہ وہ وارث پیمبر تھا

صدا رسولؐ کی کانوں میں اس طرح آئی کہ دین پر ہے گھٹا ظلمتوں کی اب چھائی
سنو سنو کوئی پیغام ہے قضا لائی ۳۷ بہت قریب ہے لوح و قلم کی رسوائی
ہدف کی سمت جو ذہنِ حسینؑ عازم تھا
اب ان پہ راہ خدا میں جہاد لازم تھا

حسینؑ قافلہ مختصر کے ساتھ چلے مدینہ چھوڑ دیا چشمِ تر کے ساتھ چلے
سبھی نشیب و فرازِ سفر کے ساتھ چلے ۳۹ جو بن رہی تھی اس رہگذر کے ساتھ چلے
نہ جان و مال، نہ آسائشِ سریر کی سمت
تھا ان کے نفس کا رخ لشکرِ کثیر کی سمت

حسینؑ کربلا پہنچے۔ یزیدی لشکر نے امام کو گھیر لیا۔ یزیدی لشکر جنگ چاہتا ہے۔ نورِ سنہ رسول امن کی شرائط پیش کرتا ہے۔ اشقیا امن نہیں چاہتے۔ امام بتاتے ہیں کہ وہ جنگ نہیں چاہتے۔

ستیز کرتے تو لشکر کو ساتھ لاتے ہم سنان و نیزہ و خنجر کو ساتھ لاتے ہم
جو حبِ لعل و جواہر کو ساتھ لاتے ہم ۴۴ تو کیا سکینہ و اصغر کو ساتھ لاتے ہم
نہ تخت و تاج نہ طبل و علم پہ ہیں مغرور
کہ ہم حفاظتِ لوح و قلم پہ ہیں مامور

اشقیا پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔ اتمامِ حجت ہو چکی۔ اب حسینؑ قربانیاں پیش کرتے

ہیں۔انصار شہید ہوئے۔اعزا شہید ہوئے۔حتیٰ کہ امام شہید ہو گئے۔سورج ڈوب گیا۔لشکر شام میں اُجالوں کی موت پر جشن منایا جانے لگا۔

صدا بلند ہوئی فتح کو مثال کریں غم حسینؑ کریں اور نہ فکرِ آل کریں
جو رسم ہے اسے وابستۂ قتال کریں ۵۱ بڑھائیں اسپ کہ لاشوں کو پائمال کریں
ہزار زخم تھے ہمراہ شاہ بیکس تھا
قدم اٹھا نہ سکا ذوالجناح بے کس تھا

خیامِ اہلِ بیت کو آگ لگا دی گئی۔آلِ نبی کو امت نے قیدی بنا لیا۔سحرؔ انصاری نے مرثیہ لوح وقلم سے شروع کیا تھا، کربلا کی جنگ کے بھرپور منظر نامے کے بعد مرثیہ ذکرِ لوح وقلم پر ہی تمام ہوتا ہے۔

رضا تھی رب کی کہ سجدے میں سر کٹائے حسینؑ خود اپنے خون کے گرداب میں نہائے حسینؑ
خدا کی راہ میں گھربار کو لٹائے حسینؑ ہمارے لب پہ ہمیشہ رہے کہ ہائے حسینؑ
غروب مہر ہوا کربلا میں شام ہوئی
سو یوں حفاظت لوح وقلم تمام ہوئی

اسی کو قادر الکلامی کہتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

خمار فاروقی :- (کراچی)

پیدائش: دسمبر ۱۹۴۳ء

نام مسرور عالم فاروقی، تخلص خمارؔ۔وطن امروہہ (یوپی)۔مسرور کے والدین ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔اس وقت مسرور کی عمر چار برس کی تھی۔پنجاب یونیورسٹی اور کراچی یونیورسٹی میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد حکومت پاکستان کے محکمہ شماریات میں گزٹڈ آفیسر کی حیثیت سے زندگی کی جدوجہد میں شامل ہو گئے۔

شاعری کی ابتداء غزل گوئی سے ہوئی۔حضرت تابش دہلوی سے سلسلۂ تلمذ وابستہ ہوا۔ایک عرصہ بھرپور انداز میں غزل کہتے رہے حتیٰ کہ صاحب دیوان شاعر بن گئے۔غزلوں کا مجموعہ ''ناکشیدہ'' شائع ہوا مگر خوب سے خوب تر کی جستجو انہیں وہاں لے آئی جہاں سخن گوئی ذہن

شاعر کا افلاک کی رفعتوں سے رشتہ جوڑ دیتی ہے۔ خمارؔ فاروقی بیدار ذہن شاعر تھے کراچی میں مرثیہ کی گونج کو سُنا۔ حضرت نسیمؔ امروہوی اور دیگر شعراء سے ربط ضبط بڑھا تو منقبت اور سلام کہنے کی طرف توجہ دی۔ مختلف مجالس و محافل میں سلام اور قصیدے پڑھے۔ حضرت نسیمؔ امروہوی نے خمارؔ کی شاعری میں فکر کی بلندی اور اسلوب کی پختگی کو پرکھ کر مرثیہ گوئی کا مشورہ دیا چنانچہ پہلا مرثیہ ''اجزاءِ حیات کون و مکاں کے ہزار ہیں'' ۱۹۷۸ کے لگ بھگ کہا جو آتش غم کے زیرِ عنوان کراچی سے شائع ہوا اس کے پیش لفظ'' اپنا تعارف اپنے قلم سے'' میں خمار فاروقی کہتے ہیں:

> اگرچہ میرے بزرگوں نے مشورہ دیا کہ آلِ محمدؐ (حضرت نسیم امروہوی) کی خدمت میں اپنا مرثیہ پیش کروں مگر میں نے آئین وضعداری کے پیش نظر استاد محترم جناب تابشؔ دہلوی کی طرف رجوع کرنا مناسب سمجھا اور مرثیہ اصلاح کے لئے ان کی خدمت میں پیش کیا لیکن موصوف کو کثرتِ مشاغل کے باعث تقریباً چھ ماہ مرثیہ کی اصلاح کا موقع نہ مل سکا۔ مجبوراً شاعر آلِ محمدؐ کی خدمت میں حاضر ہوا''

اور اس طرح خمارؔ فاروقی کا رشتۂ تلمذ شاعر آلِ محمد حضرت نسیم امروہوی سے وابستہ ہوگیا۔

مرثیہ 'آتش غم' ۸۰ بند پر مشتمل ہے جسکی ابتدا، حیات کے بنیادی عناصر آگ، پانی، ہوا، اور مٹی سے کی۔

اجزاء حیات کون و مکاں کے ہزار ہیں ان میں سے چند ہیں جو چمن کی بہار ہیں
آب و ہوا و آتش و گل، آشکار ہیں ۱ دنیا کے رنگ و بو کا یہ دارومدار ہیں
ان سے کتاب زیست کا خاکہ لکھا ہوا
انوار پنجتن کا ضمیمہ لکھا ہوا

نشو و نما حیات کی پانی کے دم سے ہے کیفِ نسیمِ صبح اس کے قدم سے ہے
پوچھو وہ ہم سے، اس کا تعلق جو ہم سے ہے ۲ ظاہر جو بے بتائے ہوئے چشمِ نم سے ہے
ہے امتیاز باطل و حق اس کی ذات سے
شک ہو تو جا کے پوچھ لو نہرِ فرات سے

پانی کے ساتھ ساتھ ہوا بھی ہے لاکلام موجود یہ نہ ہو تو ہو پھر زندگی حرام
اس کے سپرد جو حرکت کا ہے اہتمام ۴ چلتا ہے اس کی وجہ سے بھی زیست کا نظام

تحقیق ہے یہ شک نہیں وہم و گماں نہیں
آباد وہ جہان نہیں، یہ جہاں نہیں

ساکت ہے آب. آگ بھی، گل بھی خموش ہے لیکن ہوا محرکِ جوش و خروش ہے
اس کے سبب تمام عناصر کو ہوش ہے ۶ حاصل اسی کے فیض سے یہ خورد و نوش ہے
اس کا وجود دہر میں آخر کہاں نہیں
جانِ جہاں یہی ہے کہ بے اس کے جاں نہیں

دوڑے یہ بادلوں میں تو بجلی کا روپ ہے سورج سے چمن کے آئے تو نام اس کا دھوپ ہے
چمکے جو چاندنی میں تو روپ اور انوپ ہے ۲۰ بھونچال بھی دراصل اسی کا سروپ ہے
پتھر کے کوئلے بھی کرشمے ہیں آگ کے
کیا کیا چراغ جلتے ہیں اس کے سہاگ کے

دورِ یزید میں وہ بڑھی اس کی شعلگی آلِ نبی سے جلنے لگے شام میں سبھی
ادنیٰ نمود جور و جفا و ستم یہ تھی ۳۲ مرجھا گئی ریاضِ نبیؐ کی کلی کلی
بادِ سمومِ بغض جو چلتی تھی چارسُو
پیہم فضا میں آگ اگلتی تھی چارسُو

چھایا تھا جو دھواں دلِ دوزخ صفات کا تھا ہر ورق سیاہ کتابِ حیات کا
مفقود تھا دمشق میں جلوہ نجات کا ۳۴ دن دوپہر بھی شام میں منظر تھا رات کا
ظلمت میں دب رہا تھا جو خیر العمل کا دور
پھر آگیا تھا پھر کے وہ لات و ہبل کا دور

وہ تھی درندگی کہ درندے تھے شرمسار وہ فعلِ بد کہ جانوروں کو بھی جن سے عار
کردار وہ کہ جس پہ شقی مستحقِ دار ۳۶ لعنت کریں گناہ بھی ایسا گناہ گار
دشمن تھا آلِ سیدِ خیرالانام کا
تاریک تھا نصیب کہ والی تھا شام کا

باطل کا تھا یہ عزم کہ فن سرنگوں رہے عقل و شعور و فہم پہ غالب جنوں رہے
رائج ہو کفر، دین کی حالت زبوں رہے ۳۸ جیسے غلام رہتے ہیں اسلام یوں رہے

تائید چاہتا تھا امام ظہور سے
بیعت کی آرزو تھی اندھیرے کو نور سے

وہ نور جو کہ نور کا دریائے بیکراں جس نور کے سبب ہوئی تخلیق دو جہاں
وہ نور جس میں جلوۂ اسرار کن فکاں ۳۹ وہ نور جو بشکل محمدؐ ہوا عیاں
اس نور کا ہی اصل میں یہ نور عین ہے
گویا نبیؐ کا نور پیام حسینؑ ہے

حق و باطل کی یہ حد بندی، خمار کی روشنیٔ ضمیر اور آگہی کی علامت ہے۔ انہوں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور اس نکتے کو پالیا ہے کہ ''دشمن آل خیر الانام'' یزید تھا اور ''نبی کا نور بنام حسینؑ'' سید الشہدا کی ذاتِ گرامی تھی۔ یہ مرثیہ شہادت حسینؑ پر ختم ہوتا ہے

سرشار والائے محمدؐ و آل محمدؐ، سچ اور جھوٹ، حق و باطل کے پارکھ، خمار فاروقی کا دوسرا مرثیہ دعا سے شروع ہوتا ہے۔

یارب مجھے بھی حکمت و دانائی ہو عطا میرے بھی ذہن و فکر کو گہرائی ہو عطا
لفظوں کو حسن، حسن کو رعنائی ہو عطا گونجے صدا وہ قوتِ گویائی ہو عطا
حمد و ثنا لکھوں تو جہاں جھومنے لگے
گردوں بھی جھک کے میرے قدم چومنے لگے

کہتے ہیں جس کو گل وہ ستاروں سے ہے گراں ذرّوں کے روپ میں ہے خلاؤں کے درمیاں
چمکی فراز عرش پہ بن کر یہ کہکشاں ۷ بالا و پست اس نے بسائی ہیں بستیاں
آدم کے روپ میں بھی یہی جلوہ گر ہوئی
لیتی شبِ عدم کی نمایاں سحر ہوئی

آب و ہوا و گل بھی عناصر تو ہیں مگر آتش کا کچھ مقام ہے ان میں عجیب تر
ہے ظاہرا تو اس کے عمل میں نہاں ضرر ۱۹ رہ جائے جل کے جسم ہی چھو جائے یہ اگر
باطن میں سوچئے تو بڑا اس کا کام ہے
دراصل زندگی ہی حرارت کا نام ہے

اس رخ سے آگ سارے عناصر میں ہے عظیم گل میں بھی آب میں بھی ہوا میں بھی ہے مقیم

اس کا ہے فیض، دشت میں پھیلی ہوئی شمیم ۱۲ اس کے سبب ہے لطفِ صبا فرحتِ نسیم
ذرہ میں آفتاب میں انجم میں آگ ہے
ثابت ہے تجزیہ سے کہ قلزم میں آگ ہے

آتش بھی اس کو کہتے ہیں اگنی بھی نام ہے گر یہ نہ ہو تو آب و غذا ہی حرام ہے
اس کا وجود زندگی خاص و عام ہے ۱۳ سرگرمی عمل کو بھی گرمی سے کام ہے
جاتی ہے جس جگہ یہ تمازت لئے ہوئے
آتی ہے پھر یہ بارشِ رحمت لئے ہوئے

آتش ازل کے دن سے ہے مقسوم زندگی خادم ہے زندگی کی یہ مخدوم زندگی
اس نے بتائے معنی و مفہوم زندگی ۱۶ بے اس کے زندگی بھی، ہے محروم زندگی
جوشِ تپیدگی سے جو اس کا خمیر ہے
گویا یہ روحِ عزم و عمل کی سفیر ہے

توڑا ہے پتھروں کو تو پایا ہے آگ کو ہر آبشار ساتھ میں لایا ہے آگ کو
موجوں نے دامنوں میں چھپایا ہے آگ کو ۱۸ چھاتی سے بادلوں نے لگایا ہے آگ کو
کیا شے ہے یہ نگاہیں بتائیں گی آپ کی
چادر سی بچھ رہی ہے فضا میں جو بھاپ کی

اس مرثیہ کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے خمار فاروقی نے جو مانگا تھا وہ انہیں مل گیا ہے۔ وہ حکمت و دانائی، وہ فکر کی گہرائی اور لفظوں میں حسن کی رعنائی، جو اُن کی تمنا تھی وہ تمنا پوری ہوگئی ہے۔ ان کا تیسرا مرثیہ اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے جس میں عجز بندگی سے آغاز ہوتا ہے۔ گویا خمار فاروقی کو وہ راستہ مل گیا ہے جہاں پہنچ کر بالیدگیِ فکر ونظر کہہ اٹھتی ہے کہ ''جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی''۔۔۔ یہی نہ جاننے کی آگاہی سے خمار فاروقی اپنا تیسرا مرثیہ شروع کرتے ہیں۔

میں بندۂ عاجز ہوں کیا حمد و ثنا لکھوں کیا خالقِ اکبر کے اوصاف بھلا لکھوں
تاریک نگاری ہے گر اس کو ضیاء لکھوں اوجھل بھی عیاں بھی ہو لکھوں تو کیا لکھوں
ادراک کی منزل سے آگے ہے مکاں اس کا
ہر شے سے وہ بالاتر، ہر شے میں نشاں اس کا

اور یہ سلسلہ جاری ہے ــــ کہاں ہیں وہ ناقدینِ مرثیہ جنہوں نے مرثیے کو امام بارگاہوں میں مقید اور غمِ حسینؑ کو ایک فرقے کے نام لکھ کر اس کی آفاقیت کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ خمارؔ فاروقی ان اہلِ فکر و نظر شاعروں میں شامل میں جنہوں نے مرثیے کو ادب کی ایک صنف سمجھا، اور غمِ حسینؑ کو اسلام کی میراث اور انسانیت کا سرمایہ جانا۔ سلام ہو ایسے لوگوں پر جو اولادِ رسولؐ کے غم میں شریک ہوتے ہیں۔ مرحبا خمارؔ فاروقی غمِ حسینؑ اور ذکرِ حسینؑ مبارک۔

☆☆☆☆☆

عنبر نقوی:- (کراچی)

ولادت: ۱۹؍ دسمبر ۱۹۴۴ء

نام سید عنبر رضا نقوی، تخلص عنبرؔ۔ نقوی سید۔ جائے ولادت میرٹھ۔ (یوپی) ہندوستان، وطنِ مالوف: امروہہ۔ تعلیم: ایم۔ اے اکنامکس (ڈھاکہ یونیورسٹی)۔ انسان درس گاہ کے درو دیوار سے علم حاصل نہیں کرتا بلکہ اس درس گاہ کے نصاب اور اساتذہ پر حصولِ علم کا انحصار ہوتا ہے۔ عنبرؔ نقوی نے جن اساتذہ سے علم کی روشنی حاصل کی وہ سارے کے سارے علم و ادب کی کہکشاں کے درخشندہ ستارے تھے۔ ڈھاکہ کالج میں عنبرؔ نقوی کے استادوں میں پروفیسر اقبال عظیم، پروفیسر نظیر صدیقی ایسے اساتذۂ علم و فن سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ کہا جاتا ہے پارس سے چھو جانے والی ہر شے سونا بن جاتی ہے۔ یہ کسی نے نہیں بتایا کہ کوئی چیز پانچ پارسوں سے اتصال رکھے تو کیا بن جائے گی۔

عنبرؔ نقوی نے آٹھویں جماعت سے شعر گوئی کا آغاز کیا۔ جملہ اصنافِ شعر سے گذرتے ہوئے ۱۹۸۰ء میں مرثیہ گوئی تک پہنچے۔ پہلا ہی مرثیہ حضرت ختمی مرتبؐ کے محترم چچا حضرت حمزہ پر کہا۔ اس کے بعد فکر کے چراغ میں روشنی اور قلم کو روانی مل گئی جس کے نتیجے میں عنبرؔ نقوی تادمِ تحریر پچاس مرثیے کہہ چکے ہیں ــــ

عنبرؔ نقوی کا مجموعہ غزلیات ''رزقِ سخن'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ رثائی ادب میں پچاس مرثیے۔ کم و بیش ۲۰ روایتی قصائد اور ایک ہزار سے زیادہ منقبتیں کہہ چکے ہیں ــــ ان کی ذخیرۂ کلام اس دعوے کی روشن دلیل ہے کہ طلب کرنے والے کے دل میں خلوص اور دامن میں وسعت ہو تو عطا کرنے والے بے حساب عطا کرتے ہیں ــــ

عنبرؔ نقوی مرثیے کی روایت کو مانتے ہیں اور روایتوں سے رشتے استوار رکھتے ہیں مگر ان کی مراثی میں عصری حسیت اور موضوعات میں وقت کے تقاضوں کا ادراک ہوتا ہے جو انہیں جدید مرثیے کے معماروں کی صف میں لا کر کھڑا کرتا ہے۔ ان کا ذہنی سفر وقت کی رفتار کے مطابق جاری ہے۔ اکیسویں صدی کا آغاز ہوا تو عنبرؔ نقوی نے کھلی آنکھوں سے دنیاوی اقتدار کو جنون میں بدلتے دیکھا۔ اخلاقی اقتدار کو نیست و نابود ہوتے دیکھا۔ ریاکاری تو مصلحت کی پوشاک میں ملبوس دیکھا۔ بستیوں میں جنگل کا قانون نافذ ہوتے دیکھا۔ شہر اُجڑتے دیکھے۔ مظلومیت کے قافلے لٹتے دیکھے تو درس گاہ کربلا کے طالب علم عنبرؔ نقوی کا قلم حرکت میں آ گیا اور ان کے مرثیہ کا چہرہ اکیسویں صدی کے احوال کا آئینہ بن گیا۔

شرر فشاں ہوئے اکیسویں صدی کے چراغ　　بنام امن بھڑکتے ہیں سرکشی کے چراغ
ہیں دشمنی کی حمایت میں دوستی کے چراغ　　یہ رہزنی کے دیے ہیں کہ رہبری کے چراغ
یہ نارِ بخت جو بارُود سے فروزاں ہے
چراغ ہوتے ہوئے روشنی سے ترساں ہے

ہے ان چراغوں کے شعلوں میں عصرِ نو کا مزاج　　ہے ان چراغوں کا ایندھن جدیدیت کا خراج
ہے ان کی آگ سے روشن جو خواہشات کا تاج　　یہ جسم فکر سے روحانیت کا ہے اخراج
حسینیت کے مقابل یزید کے خواہاں
خدا قدیم ہے اور یہ جدید کے خواہاں

ہے ان چراغوں میں رخشاں جدیدیت کی کشید　　کہ عہد ناموں کے عنوان بھی ہیں عتیق و جدید
ہے بین مذہب و سائنس اختلاف شدید　　اور اس پہ غرۂ ایجاد و اختراع مزید
جدیدیت کا تقاضہ خود انحصاری ہے
خدا کو ماننا اک فعل اختیاری ہے

وقت کا فیصلہ ہے کہ ماضی سے رشتے توڑنے والوں کا حال گمراہی کے اندھیروں میں ڈوب جاتا ہے۔ پہچان کھو دیتا ہے۔ اور پھر ان کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا۔ تہذیب جدید انسانی رشتوں کو کاٹ رہی ہے انسان کو لاوارث و تنہا بنا رہی ہے اور اسے جدّت کا نام دیا جا رہا ہے۔ جب کہ ماضی

سے حال کا تسلسل مستقبل کے راستے متعین کرتا ہے۔ عنبر نقوی نے اس المیہ پر قلم اٹھایا ہے

جدید فکر کا عنوان ہی ہے بے بنیاد　　جدیدیت کو قدامت سے چاہیئے امداد
سند ہے گفتۂ حاضر پہ گفتۂ اجداد　　نیا جہاں ہے پرانے جہاں کا خانہ زاد
الگ ہے آج نہ اس میں جدا کوئی کل ہے
کتابِ وقت کا اک اک ورق مسلسل ہے

جدیدیت کی یہ میراث ہے بشر کا نصیب　　زمانہ کہتا ہے جس کو تصادمِ تہذیب
اس عہدِ عدل کے منشور کی ہے یہ ترغیب　　امیر تر ہو امارت، غریب تر ہو غریب
جدیدیت کا یہ منصوبۂ شعوری ہے
زمیں کے فیض پہ قبضہ بہت ضروری ہے

جدید فکرِ مشیت کی ہے یہ فرمائش　　طلب کی سطح سے کم ہو رسد کی افزائش
یہی ہے آج کے فنّی کے فن کی پیمائش　　برائے سود نہ بھر پائے ظرفِ پیدائش
بنے جو مال بھی منڈی کا کارخانوں میں
ہزار گھر ہوں تو پہنچے وہ سو مکانوں میں

پکارتا ہے نصیبِ سیاستِ دوراں　　نظامِ زر میں ہے محصور قسمتِ انساں
یہ اہلِ غرب کہ جمہوریت پہ ہیں نازاں　　یہی تو ہیں بشریت کا باعثِ حرماں
خود ان کے دل کو ٹٹولو تو بات کھلتی ہے
کہ ان کی رائے بھی میزانِ زر میں ملتی ہے

اور اب گریز کی منزل، مسئلے کے حل کی طرف

جدید فکر کی معراج ہے وہ آزادی　　مآل جس کا ہے تسکینِ شوقِ صیادی
جہاں کوئی نہ ہو مجروح چشم فریادی　　نہ سدِ راہ بنے کوئی رہبر و ہادی
کسی بھی خضر کا احسان کیوں لیا جائے
خود آگہی کا سفر خود ہی طے کیا جائے

حریم صبر میں جو شکر سے منوّر ہے　　خدا کے نور سے روشن یہ وہ پیمبرؐ ہے
خدا کا عشقِ مکمل خود اس کا دلبر ہے　　عظیم خلق کا مالک یہ خیرِ اکبر ہے

بشر کی حد تصوّر سے جو سوا ٹھہرا
یہ مصطفیٰ وہی معراجِ اصطفیٰ ٹھہرا

قدم نمائی کو اس کے زمیں بچھائے گی   بچھی زمیں کو پھر بزم جاں سجائے گی
سجی یہ بزم کو شمع ثنا جلائے گی   جلی یہ شمع تو حمد خدا سنائے گی
یہ نعت نعت کے پیکر کا امتیاز بنی
یہ نعت رتبۂ محبوبیت کا ناز بنی

عنبر نقوی کا شعری سفر منزل بہ منزل طے ہو رہا ہے۔

علی کی نہج بلاغہ کا ایک ایک جملہ   ہے اپنی وسعت معنی میں آگہی سے سوا
وہ آگہی جسے کہتے ہیں عقل کا ورثہ   ہے استوار اسی پر بشر کی حدِ بقا
میرے وجود کی گویا یہی سند ٹھہرا
درِ علی ہی بقائے بشر کی حد ٹھہرا

علی کے در سے حقیقت کی روشنی لے کر   ہر عہد و عصر میں پُر اعتماد ہوگا بشر
یہ دوستی ہی دکھاتی ہے ایسی راہ گذر   کہ جس پہ ہوتا ہے آدم کے ارتقا کا سفر
کمال منزلِ تسلیم میں جب آتا ہے
یہ نورِ حسینؑ کی صورت میں جگمگاتا ہے

درِ حسینؑ پہ آکر تو دیکھ فکرِ جدید   دکھائی دیں گے جو تجھ میں چھپے ہوئے ہیں یزید
ہے جن کے ساغر نخوت میں سرکشی کی کشید   یہی خمار ہے در پردہ منکرِ توحید
جو ایک راہِ یقیں سے تجھے ہٹاتا ہے
ہزار راستے بحرِ سفر بناتا ہے

ہے کربلا کی تجلی ضرورتِ آدم   ہے کربلا کی ضرورت مگر حسینؑ کا غم
یہ غم جو غم ہی نہیں ہے، یہ زندگی کا علم   بنائے معرفت حق ہے اس پہ مستحکم
یہاں وہ فکر کا سورج طلوع ہوتا ہے
جو روشنی کے سفر کا شروع ہوتا ہے

اکیسویں صدی کے حالات اور جس جدیدیت کا عنبر نقوی نے محاسبہ کیا ہے وہ ارتقائے فکر

کی عطا کردہ جدت نہیں بلکہ ابہام اور خودسری سے پیدا ہونے والی فکر ہے جسے جدیدیت کا نام دیا گیا تھا اور جو مغرب میں پھیلنے والی بیماری تھی۔ ادب میں جدیدیت کے نام پر ایک تحریک اُٹھی تھی جو دیکھتے ہی دیکھتے دم توڑ گئی یہاں تک کی اس کے نام لیوا اب خود ہی 'مابعد جدیدیت' پر آ گئے ہیں۔ جدیدیت نے انسان کو 'وسیع تر معاشرہ' (greater society) کے نام پر اپنے (Roots) اور اپنی بنیادوں سے بیگانہ کر دیا تھا۔ ابہام کا اسیر کر دیا تھا۔ عنبر نقوی نے اُس 'ادبی تحریکِ جدیدیت' کا ذکر نہیں کیا بلکہ اُس جدّت پر تنقید کی ہے جو جدّت کے نام پر بے راہ روی کی طرف لے جا رہی اور حق و باطل کی تمیز مٹا رہی ہے۔ انہوں نے جدّت فکر کی آماجگاہ کی نشاندہی کی ہے۔ ''درِ حسین پہ آکر تو دیکھ فکرِ جدید'' جہاں پہنچتے ہی حق و باطل کی تمیز ہو جاتی ہے اور نمایاں ہوں یا درپردہ، سارے یزید نظر آنے لگتے ہیں۔ عنبر نقوی کی تشخیص اور اس کا علاج دونوں حیات بشر کے لئے لازمی ہیں۔

☆☆☆☆☆

قسیم امروھوی:- (کراچی)

ولادت ۷؍اپریل ۱۹۴۴ء

نام سیّد قسیم حیدر نقوی خلف حضرت نسیم امروہوی۔ وطن مالوف امروہہ۔ تقسیم ہند کے بعد حضرت نسیم امروہوی مع اہل و عیال پاکستان آ گئے اور خیر پور میرس (Mirs) مین قیام کیا۔ قسیم ابھی کم سن تھے لہٰذا تعلیم کا آغاز خیر پور میرس سے ہوا اور گورنمنٹ ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ کراچی پولی ٹیکنیک سے الیکٹرک انجینئر کا ڈپلوما حاصل لیا۔ شاعری ورثہ بھی تھی اور گھر کا ماحول بھی۔ پشت در پشت بزرگوں کا شعار مرثیہ گوئی رہا تھا اس لئے قسیم نے بھی وہی راہ اختیار کی۔ ابتدا مرثیہ خوانی سے ہوئی۔ حضرت نسیم امروہوی کا رجحان مکتبۂ دبیر کی طرف تھا، قسیم نے بھی مرزا اوؔج کے مراثی تحت اللفظ میں پڑھنے شروع کئے۔ ان مراثی نے دل و دماغ پر اتنا اثر کیا کہ مرزا اوؔج کے رنگ میں ہی مرثیے کہنے شروع کئے۔ ۱۹۷۴ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ اس مرثیے کا عنوان ''منشورِ بندگی'' تھا۔ عزت سے گر بسر ہو تو نعمت ہے زندگی''۔ دوسرا مرثیہ ۱۹۷۵ء میں شروع کیا اور ۱۹۷۶ء میں ختم کیا۔ عنوان 'اتحادِ ملت' تھا۔ ''یا رب مجھے شمیم کے فن سے نواز دے'' اسی سال ایک اور مرثیہ کہا 'منشورِ حریت' جس میں مکتبۂ دبیر کی شکوہِ لفظی نمایاں نظر آتی ہے۔

حریت شان و شکوہِ زنِ زیبائے عمل حریت دلکشی و حسن سرا پائے عمل
حریت جس پہ عمل کرکے بقا پائے عمل حریت جس سے ہے تکمیلِ تمنائے عمل
لبِ تاریخ پہ کھِلتی ہوئی گفتار ہے یہ
امن کا درس جو دیتی ہے وہ تلوار ہے یہ

مرثیہ گوئی کی ابتدا قسیم نے دعا سے کی۔ پہلے مرثیے کے مطلع کا بند دعا کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھوں کی طرح تھا۔ اس کے بعد کے مراثی اس امر کے شاہد نظر آتے ہیں کہ دعاؤں کو شرف قبولیت عطا کرنے والے نے ان کی دعاؤں کو قبول فرمایا۔

یارب مجھے شمیم کے فن سے نواز دے فخرِ نسیم ہو سکوں، یہ امتیاز دے
فکر رسا کو راہِ طویل و دراز دے سوزِ بیاں میں سوز، تو دل کو گداز دے
یعنی خلوصِ قلب سے مدح و ثنا کروں
خود آگہی سے خدمتِ دینِ خدا کروں

قسیم امروہوی کے دو مرثیے "لہولہو کہکشاں" میں شائع ہو چکے ہیں جن میں سے ایک "قرطاس وقلم" ہے۔ یہ مرثیہ قسیم کی مرثیہ گوئی کا صحیح ادراک بخشتا ہے۔

شاعری کیا ہے فصاحت کی جوانی ہے قسیم ۱ یہ فصاحت کششِ فن کی کہانی ہے قسیم
کششِ فن کا اثر شعلہ بیانی ہے قسیم اسی شعلے میں تکلم کی کہانی ہے قسیم
شعلۂ نطق جو اشعار میں ڈھل جاتا ہے
جوہرِ اہلِ سخن صاف نظر آتا ہے

مرثیہ ہو کہ غزل ہو کہ قصیدے کا حشم ۲ ہو وہ تحقیق کی منزل کہ تخیل کا بھرم
کوئی اندازِ سخن ہو کوئی عنواں ہو رقم ان کا مسکن ہے فقط مسندِ قرطاس وقلم
جس کا سرمایہ ہی قرطاس و قلم ہوتا ہے
اس کی چوکھٹ پہ سرِ جہل بھی خم ہوتا ہے

ہر زمانے میں قلم کی جو یہ سرداری ہے یہ بھی اک علم کے رشتے سے وفاداری ہے
یہ جو تحریر کی راہوں میں قلم جاری ہے ۴ دستِ قرطاس میں اک مشعل بیداری ہے

فن کے جادے سے اندھیروں کو مٹا دیتی ہے
یہ وہ مشعل ہے جو صدیوں کو ضیا دیتی ہے

مجھ کو یہ ذوقِ سخن، ذوقِ ولا نے بخشا زینۂ منبر کا مجھے فکرِ رسا نے بخشا
کب کسی غیر کی تائید و عطا نے بخشا ۱۰ شاعرِ آلِ محمدؐ کی دعا نے بخشا
ایک مدت سے سفر خوش تختی ہے میرا
پانچ پشتوں سے قلم پنجتنی ہے میرا

نجمؔ کی طرح جمیلِ مہِ تاباں ہے قلم آل کی پائی رضا حاملِ عرفاں ہے قلم
جوشِؔ دریائے ولا عظمتِ انساں ہے قلم ۱۲ موجۂ فکرِ نسیمیؔ سے گل افشاں ہے قلم
آج بھی مرثیہ گویوں کو ہے درکار قلم
روشِ فکر انیسؔ کا طرح دار قلم

کہیں کم علم، کہیں علم کا معیار قلم کہیں خاموش ہے گویا، کہیں گفتار قلم
کہیں دلدوزی کا عنوان، کہیں دلدار قلم ۲۵ کہیں کاشف ہے قلم اور کہیں اسرار قلم
شہرِ تحریر سے پوچھو کہ وہ کیا کہتا ہے
علم کے در کو نصیری تو خدا کہتا ہے

حق کی تاریخ بھی قرطاس و قلم سے ابھری جس گھڑی معدنِ آیات بنا قلبِ نبیؐ
مل گئی گھر سے ہی تحریکِ اشاعت کی کڑی ۲۶ بن گیا طرۂ تحریر بھی خالق کا ولی
جو قلم کار بھی ہے ضیغم و جرار بھی ہے
بزم کی شمع بھی ہے رزم کی تلوار بھی ہے

کاتبِ وحی علیؑ، وحی کی تشکیل ورق درج جس پر کیا جاتا ہے پیغمبرؐ کا سبق
حق کی کاغذ پر نظر ہے تو علیؑ کا ہے یہ حق ۲۷ ابھری قرطاس پہ تحریرِ ولی کی جو شفق
اس شفق کے ہی تصدق سے یہ عنوان بنا
تیس پاروں کا اسی عکس سے قرآن بنا

یوں بھی قرطاس کی آغوش ہے عظمت کا نشاں جیسے آغوش ہے زہراؑ کی، تقدس کا جہاں
یہاں قرآں کا محافظ ہے۔ تو قرآن وہاں ۴۵ ایک تصویر کے دو رخ ہیں حسینؑ و قرآں

گود قرطاس کی تطہیر کا گنجینہ ہے
عصمتِ فاطمہ زہراؑ کا یہ آئینہ ہے

اک شرف اور یکا یک مرے لب پر آیا باعث فخر و مباہات سخن در آیا
دست مداح میں یہ مرثیہ بن کر آیا ۴۶ ہوئی معراج اسے، برسرِ منبر آیا
مرثیہ بن کے عجب دھوم مچی ہے اس کی
ذکر شبیرؑ سے آغوش سجی ہے اس کی

جس طرح قلم کی مملکت لامحدود اور قرطاس کا دامن وسیع ہے اسی طرح قسیم امروہوی نے اس مرثیہ میں قرطاس و قلم کے بہت سے باب کھولے ہیں۔ یہ مرثیہ ۷۳ بند پر مشتمل ہے۔ چھیالیسویں بند سے آخری بند تک جتنی جہتیں اور جتنی راہیں قسیم نے روشن کی ہیں وہ پختہ کار شاعرانہ صلاحیت کا اعجاز معلوم ہوتی ہیں۔ آخری بند بھی مرثیہ سے متعلق ہے اور مرثیے کو تمام کرتا ہے۔

بس قسیم آئی ہیں زہراؑ یہ ذرا دھیان رہے پیش قرطاس و قلم درد کا عنوان رہے
اشک آنکھوں سے بہیں حال پریشان رہے ۷۳ مقصدِ مرثیہ گوئی کا یہ عنوان رہے
ذکر اس طرز نسیمی کو جوانی بخشے
مرثیہ وہ ہے جو اشکوں کو روانی بخشے

دریں چہ شک۔ مرثیہ وہ ہے جو اشکوں کو روانی بخشے۔

☆☆☆☆☆

ید اللہ حیدر:- (کراچی)

ولادت، ۳۰ر مارچ ۱۹۴۵ء

نام: سید ید اللہ حیدر، تخلص: حیدر (مراثی میں کہیں کہیں ید اللہ)۔ والد کا اسم گرامی سید کرار حیدر کرار جونپوری۔ ابتدائی تعلیم سے G.D(Arch) تک کراچی میں تعلیم حاصل کی بعد ازاں انقرہ (ترکی) سے آرکی ٹیکچر میں گریجویشن B.Arch کیا۔ زندگی کے سفر میں صنعت تعمیر Archetecture کو پیشے کے طور پر اپنایا۔ ذہنی اور روحانی سفر میں میراث پدر کو رہنما بنایا۔ خاصی کم عمری میں شعر کہنے لگے۔ ابتداء میں اپنے والد گرامی حضرت کرار جونپوری سے اصلاح لیتے رہے۔ بعد ازاں حضرت حسان جونپوری (سید محمد محسن ذوالقدر) مرحوم سے سلسلہ وابستہ کیا۔

کلیم آل عبا حضرت شاہد نقوی سے بھی اصلاح و رہنمائی حاصل کی اور اس طرح نہ صرف دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ مرثیہ گو بن کر مطلع رثا پر ابھرے۔

ید اللہ حیدر نے پہلا مرثیہ ۱۹۹۲ء میں کہا۔۔ موضوعاتی مرثیہ کہنے والے شعراء میں ید اللہ حیدر کا نام لئے بغیر فہرست مکمل نہیں ہوتی۔۔۔ان کے پہلے ہی مرثیہ کا عنوان ''ارتقاء و علم'' تھا۔ گویا ابتداء علم اور ارتقاء سے کی۔۔۔ مروجہ مرثیہ کے فریم ورک (frame work) کو تسلیم کرتے ہیں۔ کلاسیکی مرثیے کی روشنی کو ناگزیر سمجھتے ہیں لیکن فکر جدید پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے مراثی میں کلاسیکی اجزائے مرثیہ کے حصار کی گرفت نہیں ہے بلکہ عروض و بحور۔ قوامی و ردیف اور مروجہ ہیئت مسدس کو لازم مانتے ہوئے جدید ذہن کا اُجالا نظر آتا ہے۔ مثلاً ان کا ایک مرثیہ ''عقل و شعور'' جو مئی ۱۹۹۶ء میں لکھا گیا تھا اس کے چند بند اس دعوے کی دلیل نظر آتے ہیں۔

اے اوجِ فکر دوشِ ولا پر سوار ہو بے آب دشتِ ظلم ہے پھر جوئے بار ہو
اک اک قدم نشاں حقیقت نگار ہو ۱ پھر جانماز عقل پہ سجدہ گذار ہو
سجدہ وہ ہو کہ روئے ادب پر نشان ملے
ذوقِ سخن کو زندگیٔ جاوداں ملے

اے فکر حق نگر، نگہٗ دور بیں رہے دنیا کے ساتھ ربطِ تقاضائے دیں رہے
رجسِ بتاں سے پاک تیری آستیں رہے ۳ تو تختِ شاعری پہ ہمیشہ مکیں رہے
تو خاتمِ سخن کا درخشاں نگین ہو
دانش کدے میں وقت کے، کرسی نشین ہو

عرفانِ عشق جو ہے ولا کی عطائے خاص جذبِ کمال، دستِ دعا کی عطائے خاص
ذوقِ عمل ہے ذہن رسا کی عطائے خاص ۵ فہم و خرد مگر ہے خدا کی عطائے خاص
یہ ارتقاء کا آج جو دنیا میں نور ہے
دست طلب پہ رنگِ حنا کے شعور ہے

جب عقل کے افق سے اُبھرتی ہے روشنی اس روشنی میں ڈھلتا ہے خود ذہنِ آدمی
پھر ذہن وضع کرتے ہیں اقدارِ زندگی ۹ اقدارِ زندگی میں شعاعیں شعور کی

اس کی ہر ایک شعاع صداقت کا نور ہے
یہ صرف شمعِ راہ نہیں برقِ طور ہے

خلّاقِ دو جہاں نے بصد عظمت و حشم بخشا سکوتِ خاک کو سانسوں کا زیر و بم
پھر زیست نے اُٹھا لیا احساس کا علم یہ خاک کا گھروندا بنا عقل کا حرم
پائے طلب کو سایۂ منزل عطا ہوا
لیلائے ہست و بود کو محمل عطا ہوا

برسا وہ آبِ خضرِ خرد، برسرِ خیال اٹھا صدف کی گود سے وہ گوہر خیال
کھولا جدارِ کعبۂ دل نے درِ خیال ۱۲ اُبھرا غدیرِ زیست پہ اک منبرِ خیال
جلوہ دکھایا کُھل کے تعقّل کے باب نے
"یا قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے"

ذہنِ بشر کو عقل کی سوغات مل گئی فہم و ذکا کو آگہیٔ ذات مل گئی
احساس کو تمازتِ جذبات مل گئی ۱۳ دستِ طلب کو نبضِ سماوات مل گئی
انساں ہر ایک جادۂ ممکن پہ چھا گیا
اُونچا اُڑا تو چاند کی دنیا تک آ گیا

اوجِ خرد سے قلبِ جنوں ڈولنے لگا گوشِ صدا میں لفظوں کا رس گھولنے لگا
زندانِ رازِ علم میں در کھولنے لگا ۲۱ آلات کی زباں میں ہنر بولنے لگا
کہسارِ شب کو سر کیا صبحِ یقین نے
دیکھا فرازِ عرش کو ہنس کر زمین نے

ہو باشعور ذہن، تو انساں ہے آدمی حاصل نہ ہو شعور تو حیواں ہے آدمی
حدِ شعور پر ہے تو قرآں ہے آدمی ۲۳ رازِ آشنائے مرضیٔ یزداں ہے آدمی
مغرب میں ڈوبتا ہوا سورج نکال دے
چاہے تو مردہ جسم میں پھر روح ڈال دے

لیکن اگر نہ پائے ہدایت کا پیرہن انساں ہے پھر ترقیٔ معکوس کی چبھن
ہوتی ہے عقل کاوشِ بے رخ پہ خندہ زن ۲۵ پھر جلوۂ حیات پہ پڑ جاتی ہے شکن

خالی جو آبِ رُشد سے ہستی کا جام ہے
عقلِ بشر فقط فرسِ بے لگام ہے

ایسی ہی عقل بن گئی فرعونیت مزاج دریائے شر میں غرق ہوئی آدمی کی لاج
رکھ کر جبیں پہ جہل زدہ گمرہی کا تاج ۳۰ معبودیت سے لینے لگی عبدیت خراج
اُبھری تو آبِ نیل میں مفقود ہوگئی
بھڑکی تو سوزِ آتشِ نمرود ہوگئی

جب بھی خرد سے دور کوئی کم نظر ہوا بگڑی فضا، نظامِ تمدن بکھر گیا
تاریخ کائنات نے دیکھا ہے بارہا ۳۳ ٹکراتی تھی شعور سے جب جہل کی ہوا
اس کشمکش کا مظہر کامل ہے کربلا
دونوں ضدوں کی آخری منزل ہے کربلا

اس کربلا میں ایک جفاکار، خود پسند راہ حیات کفر پہ بھڑکا ہوا سمند
کرکے نشانِ تیرگیٔ شام کو بلند ۳۴ اٹھا کہ ڈالے مہرِ خرد ساز پر کمند
واقف نہ تھا مشیتِ ربِّ کریم سے
ٹکرا گیا شعور کے بحرِ عظیم سے

وہ بحرِ بیکرانِ خرد وہ علیؑ کا لال خوش فکر وخوش شعار وخوش اعمال، خوش جمال
خوش طور وخوش مآل وخوش انداز وخوش مقال فردا کی وسعتوں کی ضمانت تھا جس کا حال
کتنی بلندیوں پہ وہ ماہ شعور تھا
وادیٔ فکر و فہم میں دریائے نور تھا

مرثیہ میں جانمازِ عقل پہ سجدہ گذاری، دستِ طلب پہ رنگِ حنائے شعور، آبِ خضرِ خرد، غدیرِ زیست، کہسارِ شب، صبحِ یقین، جہل زدہ گمرہی جیسی بندش وتراکیب یا، ''پھر زیست نے اٹھا لیا احساس کا علم'' اور'' آلات کی زباں میں ہنر بولنے لگا'' جیسے مصرعے جہاں یداللہ حیدر کے ترقی پسند اور زرخیز ذہن کی روشنی ہیں وہاں شعروادب کی دنیا میں خوشگوار جدتوں کا اضافہ بھی ہے۔ یداللہ حیدر کا کلام پڑھ کر یقیں اور پختہ ہوجاتا ہے کہ تربیت بھی بولتی ہے۔ اور خون بھی۔

قدیم مرثیے میں بین مرثیے کا جزو لازم تھے۔ یداللہ حیدر کے پیش نظر واقعات کی منظر

کشی اور درد و غم کے کیفیات کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ رونے رلانے کے لئے بین نہیں کراتے۔ اس مرثیے میں معصوم علی اصغر کی شہادت کا احوال ہے مگر فریاد کی شکل میں نہیں بلکہ عزم و ہمت کی شکل میں، جرأت و ایثار کی شکل میں ہے۔

جانکاہ ہے شہادتِ اصغر کی داستاں　　کتنا شدید باپ کے دل کا تھا امتحاں
یا رب کہاں جہاد، کہاں طفلِ بے زباں　　اس عمر میں شعور کی یہ شان، الاماں
وہ جبر اُدھر کہ رو دیا ظالم چلا کے تیر
یہ صبر اِدھر کہ ہنس دیا بے شیر کھا کے تیر

جاتا ہے رزم گہ کو مجاہد بہ کرّ و فر　　ماتھے کی سلوٹوں میں لئے عزم معتبر
واں سرکشی پہ باندھے ہے فوج لعین کمر ۵۲ شمشیر صبر تولتا ہے بے زباں ادھر
تلوار سے، تبر سے، نہ تیر و کماں سے
یہ حلقِ جبر، کاٹے گا سوکھی زباں سے

عزم و خرد میں مرگ تو اہم لئے ہوئے　　خاموشیوں میں جوشِ تکلم لئے ہوئے
گردش میں خوں کی زورِ تلاطم لئے ہوئے ۵۷ سوکھے لبوں پہ تیغ تبسم لئے ہوئے
مظلومیت کو تول کے تلوار کی طرح
جھپٹا بتوں پہ حیدرِ کرار کی طرح

ناوک چلا تو ننھی کلی مسکرا اٹھی　　تھرایا آسمان، زمیں کپکپا اٹھی
سینے ہوئے فگار، لبوں سے صدا اٹھی　　عرشِ بریں پہ صبر کی کالی گھٹا اٹھی
جاں دی پدر کے ہاتھوں پہ اس نورِ عین نے
تھرا کے آسماں کو دیکھا حسینؑ نے

جہاں تک رونے رلانے کا تعلق ہے تو دل اگر دردمند ہو تو ؎ تھرا کے آسمان کو دیکھا حسینؑ نے'' ہی اشکوں کا بند توڑ دینے کے لئے کافی ہے، اسی طرح مقطع کا بند بھی رقت طاری کرنے کے لئے کم نہیں ہے۔

اے کربلا کے ننھے مجاہد تجھے سلام　　بے شیر، بے زباں، ہدفِ تیرِ تشنہ کام
پانی پئیں گے پیاس میں جب بھی تیرے غلام ۶۲ بے ساختہ، زبانوں پہ آئے گا تیرا نام

امِ رباب اشکوں کا ہدیہ قبول کر
شہزادی ہم غلاموں کا ہدیہ قبول کر

یداللہ حیدر تادمِ تحریر بذا سات یا آٹھ مرثیہ کہہ چکے ہیں۔ اللہ کرے وہ اس عبادت کو تیز تر کردیں جس میں ان کے والد گرامی کا حق بھی ادا ہوتا ہے۔ اور مودّتِ آلِ محمدؐ کا قرض بھی۔

☆☆☆☆☆

رضوی جارچوی:- (کراچی)

تاریخ پیدائش، ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۵ء

نام: سید صغیر احمد رضوی۔ تخلص رضویؔ۔ وطن جارچہ۔، والد کا اسم گرامی: سید صمد علی رضوی۔ صغیر احمد رضوی کی ولادت دہلی میں ہوئی۔ دو برس کے تھے کہ ۱۹۴۷ء میں ان کے والدین ہجرت کرکے کراچی آگئے۔ صغیر احمد نے جیکب لائنز اسکول کراچی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ کراچی بورڈ سے میٹرک پاس کیا۔ طالب علمی کے زمانے میں شاعری شروع کردی۔

گھر کا ماحول شعروادب آشنا تھا۔ بڑے ماموں سید قائم علی فانیؔ اور چھوٹے ماموں سید سلیمان رضوی شاعر تھے۔ صغیر احمد رضوی کے برادر خورد جسیم اختر، بہنوئی ولیؔ جارچوی اور اُن کے صاحبزادگان اشرفؔ جارچوی اور گوہرؔ جارچوی آج بھی ممتاز شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ سب کے سب مرثیہ گوشعراء ہیں۔ رضویؔ جارچوی نے بھی غزل کے علاوہ منقبت، نوحہ، سلام اور آخر کار مرثیہ کہنا شروع کردیا اور اب تک سات آٹھ مرثیے کہہ چکے ہے۔

نمونۂ کلام کے طور پر ان کے چند بند درج ہیں۔ مرثیے کا عنوان ''مومن'' ہے۔

مومن ہے جس کی ذاتِ مقدس ہے حق مدار　　مومن ہے جس کی موت پہ ہو زندگی نثار
مومن ہے جس کے ہاتھ میں تجلی ہے ذوالفقار　　وہ ذوالفقار قہر الٰہی ہے جس کا وار
سجدے میں سرکٹا کے لہو سے وضو کرے
انداز بندگی کی بلند آبرو کرے

جس کو ہلا سکیں نہ حوادث کی آندھیاں　　جس سے شکست کھائے صعوبت میں خوفِ جاں
گاڑا ہو جس نے رفعتِ افلاک پر نشان　　جو ہو جہادِ زیست کی اک دائمی اذاں

ایمان کائنات محبت اسی کی ہے
کہتے ہیں سب شہید شہادت اسی کی ہے

مومن ہے وہ کہیں جسے بیمارِ کربلا کرتا رہا قبول جو ہر دردِ لادوا
لیکن کسی زبان سے شکوہ نہیں کیا جسکی حیات اب بھی ہے عنوانِ مرثیہ
اس کا خیال قلب پہ تنزیلِ درد ہے
قرآن اضطراب ہے تکمیلِ درد ہے

مومن ہے ظالموں نے جلایا ہے جس کا گھر کوفے سے تا بہ شام پھرایا ہے در بدر
ہمدرد جسکا کوئی بھی آتا نہ تھا نظر حالت پہ جس کی مومن اوّل ہے نوحہ گر
دل پر ہیں جس کے زخم بہتر لگے ہوئے
جاتا ہے ساتھ اہلِ حرم کو لئے ہوئے

مومن کی تھی زباں کہ شمشیر آبدار دربارِ ظلم کے رہ گیا تھرایا تاجدار
خاموش کرسکا نہ اسے ظلم کا حصار حق اہل حق ہی کرتے ہیں اس طرح آشکار
مومن کا اس جہان میں کردار اور ہے
فتح و شکست کے لئے معیار اور ہے

احساس کربِ زندگیٔ دل کا ہے امیں غم کا شعور وسعت انساں کا ہے یقیں
زخموں کا عکس ایک شہادت ہے دلنشیں منسوب ہے کسی سے تو ہر درد ہے حسیں
تم اپنی نسبتوں سے مکرّم ہے غم کرو
کردار ساز وجہِ الم ہے، الم کرو

کس کے لئے یہ صبر ہے ایثار ہے بتاؤ گر بے زباں گنگ تو اشکوں سے ہی سناؤ
رضوی غم حسینؑ کو اس طرح سے مناؤ سینے میں ان کی یاد میں اک زخم ہی سجاؤ
مومن کا غم تو دل کی امانت ہے مومنو
ایماں کی جان ذکر شہادت ہے مومنو

☆☆☆☆☆

نقوش نقوی:- (کراچی)

ولادت: ۱۹۳۶ء

نام سید معصوم حیدر۔ تخلص نقوشؔ۔ نقوی سید۔ وطن امروہہ۔ ابتدائی تعلیم امروہہ میں ہوئی۔ ۱۹۵۳ء میں والد کے ساتھ پاکستان ہجرت کی اور کراچی آ گئے۔ کراچی سے میٹرک پاس کیا۔ فکر معاش نے تعلیم کے دروازے بند کئے اور معصوم حیدر کو ملازمت کرنی پڑی۔ ۱۹۷۱ء میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔

شاعری کی ابتداء ۱۹۶۳ء سے ہوئی۔۔۔ حضرت احسانؔ امروہوی محفل شاہ خراسان کراچی میں ہر ماہ نو تصنیف سلام اور منقبت کی محافل کا انعقاد کیا کرتے تھے۔ اسکے علاوہ محفل شاہ خراسان میں ہی آئمہ کی ولادت و شہادت کی محفلیں منعقد کیا کرتے تھے۔ ان محفلوں میں نوجوان شعراء کو زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرتے تھے۔ اس طرح احسانؔ امروھوی اور محفل شاہ خراسان مل کر ایک چھوٹا سا دبستان بن گئے تھے۔ نقوشؔ نقوی نے پہلا قصیدہ جناب سیّدہ کی شان میں کہا۔ حضرت احسانؔ امروہوی نے اپنی شفقت اور رہنمائی سے راستہ دکھایا۔ اور نقوشؔ نقوی کی شاعری سلام، منقبت، غزل نظم اور قصائد سے آگے بڑھ کر مرثیہ تک پہنچ گئی۔ فنکار کا نقش اول اس کے فن کی یادگار ہوتا ہے۔ نقوشؔ نقوی کا پہلا مرثیہ۔ متاع لوحِ وقلم سے نواز دے یارب'' تھا۔ جس میں غم حسین کو متاع لوح وقلم اور حق کا علم کہہ کر ربّ ذوالجلال سے یہ غم مانگا ہے۔

متاعِ لوح قلم سے نواز دے یارب بلند حق کے علم سے نواز دے یارب
نہ جاہ سے نہ حشم سے نواز دے یارب فقط حسینؑ کے غم سے نواز دے یارب

یہ غم ہمارے لیے جان سے بھی پیارا ہے
ہر ایک غم میں بشر نے اسے پکارا ہے

یہ غم وہ ہے کہ جو کون ومکاں پہ طاری ہے یہ غم زمانے میں صدیوں سے اب بھی جاری
اسی کے سائے میں عمر رواں گزاری ہے یہ غم زمانے کی ہر اک خوشی پہ بھاری ہے

جہاں میں آج شہ مشرقین کا غم ہے
ہے جاوداں جو فقط وہ حسینؑ کا غم ہے

غموں میں ایک غمِ جاوداں حسینؑ کا غم دلوں کی راہ میں اک کہکشاں حسینؑ کا غم

یزید سمجھا تھا بس ہے دھواں حسینؑ کا غم — بشر کے ذہن پہ ہے ضوفشاں حسینؑ کا غم
یہ غم حسینؑ کا دنیا میں رنگ لا کے رہا
جو کائنات کے ہر خشک و تر پہ چھا کے رہا

حسینؑ کون؟ جو مظلومیت کا پیکر ہے — حسینؑ کون؟ جو وحدانیت کا مظہر ہے
حسینؑ کون؟ جو انسانیت کا رہبر ہے — حسینؑ کون؟ جو حقانیت کا لشکر ہے
رخِ حیاتِ بشر کو نکھارنے والا
ہے کائنات کی زلفیں سنوارنے والا

خدا کا دین بچانے کو آج آیا ہے — وہی حسینؑ محمدؐ کا جو نواسہ ہے
عدو کی فوج ہے چاروں طرف وہ تنہا ہے — یزیدیت کی گھٹاؤں نے اس کو گھیرا ہے
عطش میں دھوپ میں اُمت کی یہ نوازش ہے
کہ اس پہ تیروں کی چاروں طرف سے بارش ہے

نقوشؔ نقوی کا پہلا مرثیہ ہی انہیں ایک کامیاب مرثیہ گو ثابت کرتا ہے۔ نقوش نقوی ۱۹۷۱ء میں اپنے والد گرامی کی وفات کے بعد سعودی عرب بھی گئے تھے جہاں ریاض میں ایک کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہے ہیں۔ لیکن احسانؔ امروہوی اور کراچی کی ادبی اور رثائی فضاؤں سے ان کا رشتہ برقرار رہا۔ انہوں نے کراچی سے ایک بین الاقوامی نوعیت کا مجلّہ بھی شائع کیا جس کا موضوع 'حسینیت' تھا۔ یہ مجلّہ ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوتا تھا اور بغیر کسی زرسالانہ یا بدل اشتراک لوگوں کو ارسال کیا جاتا تھا۔ نقوشؔ نقوی کم و بیش سات برس یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ان کے قصائد و سلام کا مجموعہ منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ اور انہوں نے کچھ افسانے بھی لکھے ہیں۔ آج کل ماہنامہ 'سخنور' نکال رہے ہیں۔ اب تک چار پانچ مراثی کہہ چکے ہیں۔

☆☆☆☆☆

ظلِّ صادق:- (کراچی)

پیدائش ۱۸ر اپریل ۱۹۴۷ء

نام سید ظلِ صادق زیدی۔ جائے ولادت قصبہ جانسٹھ ضلع مظفرنگر، سادات بارہ۔ (یو۔پی)۔ والد کا اسم گرامی سید ظلِ باقر زیدی۔ ملک تقسیم ہوا تو ماں باپ چار ماہ کے بچے کو لے کر

پاکستان آ گئے۔ ظلّ صادق کا وطن اس اعتبار سے کراچی رہا کہ انہوں نے یہیں ہوش سنبھالا اور یہیں پروان چڑھے۔ کراچی کے ادبی ماحول نے نشو ونما پاتے ذہن پر اثر ڈالا۔ گھر میں انیس و دبیر کے مرثیے، مجلسوں میں نسیم امروہوی۔ سید آل رضا، جوش اور نجم آفندی کے مرثیے سنتے سنتے زرخیز زمین کو نمی ملی تو پھول کھل اٹھے۔ ۱۵ برس کی عمر میں ظلّ صادق نے شعر موزوں کرنے شروع کر دیے گویا ابھی تعلیم جاری تھی اور زندگی کی جدوجہد میں قدم نہیں رکھا تھا مگر شعروسخن کی وادیوں میں خیمہ زن ہو گئے۔ ظلّ صادق نے ۱۹۷۶ء میں کراچی یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کیا جبکہ ۱۹۶۲ء سے مشق سخن جاری ہو گئی تھی۔ حسب دستور شعر گوئی کی غزل اور نظم سے ابتداء ہوئی۔ اور ۱۹۷۳ء میں پہلا مرثیہ کہا۔ اخباری دنیا کو پیشے کے طور پر اپنایا۔

فضل فتح پوری نے جو ایک چھوٹی سی دنیا بنائی تھی جسے سمیٹ کر انہوں نے انجمن سفینۂ ادب کراچی کے زیر اہتمام 'فکر و فغاں' شائع کی تھی اس دنیا میں ظلّ صادق بھی تھے۔ فکر و فغاں میں ان کا کلام بھی شریک اشاعت تھا۔ اس دنیا میں کوشش کے نتیجے میں یہ قافلہ جدید مرثیے کی منزل تک تو نہ پہنچا مگر کلاسیکی شاعری میں اعلیٰ شاعری کے بہت سے نمونے سامنے ضرور آ گئے۔ اس اثر کے تحت نوجوانوں میں ہی شاعر ظلّ صادق نے موضوعاتی مرثیے بھی کہے ؎

؎ انساں زمیں پہ جلوۂ ماہِ تمام ہے (انسان اور حریت)

؎ جب اجالوں کے نگر میں ظلمتیں بسنے لگیں (اقدار و اقتدار)

؎ اے جبرئیلِ فکر مجھے سرفراز کر (گمان و یقین)

؎ بے نور زندگی کو سحر کی تلاش ہے (کردار و واقعات)

ان مراثی کے عنوانات اور مصرعِ اولیٰ جدید فکر او اسلوب کی تلاش کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان مرثیوں کے بعد میں آنے والے مرثیوں میں یہ تلاش اور شدت اختیار کر گئی ہے۔ گویا نئی نسل نئے تناظر کی طرف جا رہی ہے۔ وقت کے تقاضوں کو سمجھ رہی ہے۔ یہ سوچ ہی وہ روشنی ہے جو یقین دلاتی ہے کہ مرثیے کا کارواں صحیح سمت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ظلّ صادق کے ''گمان و یقین'' کے چند بند اس روشنی کے وجود کو یاد دلا رہے ہیں۔

اے جبرئیلِ فکر، مجھے سرفراز کر احساس کے دریچے کو کچھ اور باز کر

دل جس سے نغمہ بار ہو پیدا وہ ساز کر ۱ سب بے نوا ہوں مجھ کو ترنم نواز کر
بندِ قبائے لیلیٰ ادراک کھول دے
شہدِ یقیں کو نظم کے ساغر گھول دے

ایسا یقیں جو وقت کے دھارے کو موڑ دے ایسا یقیں جو رشتۂ انفاس جوڑ دے
ایسا یقیں جو موت کی گردن مروڑ دے ۷ ایسا یقیں جو وہم کے اصنام توڑ دے
ایسا یقیں جو رازِ مشیت شناس ہو
ایسا یقیں جو ذہنِ بشر کی اساس ہو

دنیا میں ہست و بود کا طرفہ نظام ہے سرمایہ دار رونق صد احترام ہے
مفلس کے واسطے نہ سحر ہے نہ شام ہے ۱۳ بزمِ طرب میں رقص ہے، نغمہ ہے، جام ہے
پلتا ہے ظلم، امن کی جھوٹی فضاؤں میں
مدت سے جنگ ناچ رہی ہے خلاؤں میں

ظلم و جفا و جور کا جاری ہے سلسلہ انسان کس قدر ہے مصائب میں مبتلا
سیلاب، بھوک، قحط، جہالت، الم، دغا ۱۴ ہر گام کربلا ہے ہر اک سانس کربلا
ہونے کو معرکہ ہے کوئی کائنات میں
کتنے یزید و شمر ہیں انساں کی گھات میں

مظلوم جمع ہونے لگے بہر انتقام بادِ صبا کے دوش پہ جانے لگے پیام
گونجا فضائے دہر میں حقانیت کا نام ۱۶ دیکھو ملوکیت کے لرزنے لگے وہ بام
پھر انقلاب نو کی صدائیں بلند ہیں
ہر سو فضا میں خونیں قبائیں بلند ہیں

اے دوستو! یقین کی منزل قریب ہے پتوار اور تیز! کہ منزل قریب ہے
دیکھو وہ چاند تاروں کی محفل قریب ہے ۲۱ ہاں لیلیٰ حیات کی محمل قریب ہے
ابھرے گا آفتاب نگاہیں جمی رہیں
اٹھنے کو ہے نقاب نگاہیں جمی رہیں

ایسا یقیں جو حضرت آدم کے پاس تھا ایسا یقیں جو شیثؑ کے دل کی اساس تھا

ایسا یقیں انوشؔ کے جو دل کی آس تھا ۲۴ اور یسؔ جس کے فیض سے انجم شناس تھا
طوفاں میں جس نے نوحؑ کو اک ولولہ دیا
شعلوں میں جس نے بسترِ گل کا مزا دیا

اسلام کا وقار و فضیلت یقین ہے لا ریب نقشِ پائے رسالت یقین ہے
اقلیم افتخار کی دولت یقین ہے ۲۵ انسان کی شدید ضرورت یقین ہے
اسرارِ کائنات کا بابِ جلی یقیں
احمدؐ یقیں، حسینؑ یقیں اور علیؑ یقیں

اس یقین کی روشنی میں پیغامِ رسالت، کردار مرتضوی، منصب و پیغام حسینؑ کو بیان کیا گیا ہے اور پھر اس یقین کے سہارے اس مرثیے میں کربلا کی پیاس، شہادت علی اصغر، اور بھرپور مصائب، کیا کچھ نظم نہیں کیا ظلِ صادق نے — یہ پورا مرثیہ جدید مرثیے کا آہنگ لئے ہوئے ہے اور جدید اور ترقی پسند قدروں سے نئی نسل کی آگہی کا استعارہ ہے۔ اس تفصیل کا خلاصہ انکا ایک بیت ہے۔

شبیرؑ حدِ فکر کا دارلسّلام ہے
شبیرؑ صرف نام نہیں اک نظام ہے

☆☆☆☆☆

مسرور شکوہ آباری:- (کراچی)

پیدائش: ۷ر مئی ۱۹۴۸ء

نام: سید محمد۔ تخلص مسرورؔ، سادات رضوی۔ وطن: شکوہ آباد (یوپی)۔ والد گرامی کا نام نامی حکیم سید حامد حسینؒ اور دادا حکیم سید ضیاء الحسن دونوں کا شمار ممتاز حکیموں میں ہوتا تھا۔

مسرورؔ شکوہ آبادی ۱۹۶۲ء میں پاکستان آئے۔ کراچی میں تجارت کو پیشہ کے طور پر اختیار کیا۔ شاعری کی شروعات ابتدائی عمر سے غزل کی صورت میں ہوئی۔ کراچی آنے کے بعد غزلوں کے سحر سے نکلے۔ اور خطابت اور ذاکری پر توجہ دی اور بہت جلد ان کا شمار اچھے خطیبوں میں ہونے لگا۔ اس ذکرِ حسینؑ نے فکرِ حسینؑ تک پہنچایا اور فکرِ حسینؑ کی روشنی ملی تو زبان پر عظمت حسینؑ کے نغمے اور غمِ حسینؑ کے مرثیے آگئے۔ پہلا مرثیہ ۱۹۶۷ء میں کہا— کہا جاتا ہے ماضی سے حال کا رشتہ ہو تو مستقبل کی راہوں کا تعین آسان ہو جاتا ہے۔ مرثیہ گوئی کا آغاز ہوا اور مسرور

شکوہ آبادی نے ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھا تو ماضی دیے کی روشنی کی طرح نظر آیا جبکہ حال ولائے اہلبیت کے نور میں لپٹا ہوا تھا۔ مسرور شکوہ آبادی نے ماضی کے کلام کو بھی اپنی غزلوں اور نظموں کو مجموعہ کی شکل میں شائع کر دیا۔ یہ مجموعہ ''زلف و زنجیر'' کے کام سے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ زلف و زنجیر کی قید سے نکلنے کے بعد مسرور شکوہ آبادی نے ولائے شبیر پر توجہ دی اور نہ صرف حال بلکہ مستقبل کی راہیں ان پر روشن ہوگئیں۔ نتیجہ ''متاع شعور'' تھا یعنی ان کا مجموعۂ مراثی۔ مطبوعہ 1995ء۔ ''متاع شعور'' میں انہوں نے 'مرثیہ' کی وضاحت کی ہے جسے انہوں نے دوسری اصناف سخن پر ترجیح دی ہے۔ انہوں نے ایک مرثیے کا چہرہ ہی مرثیہ رکھا ہے۔

زیر ہے ہر صنف شعری اور زبر ہے مرثیہ ۔۔۔ علم و دانش کے سمندر کا گہر ہے مرثیہ
حمد و نعت و منقبت کا ہم سفر ہے مرثیہ ۱ ۔۔۔ شاعری شاخ ہنر ہے اور ثمر ہے مرثیہ
فہم ہے ادراک ہے نطق و بیاں ہے مرثیہ
فکر کی پاکیزگی کا امتحاں ہے مرثیہ

مرثیہ نور سحر ہے ظلمتوں کی راہ میں ۔۔۔ مرثیہ درس محبت نفرتوں کی راہ میں
مرثیہ رحمت ہی رحمت زحمتوں کی راہ میں ۲ ۔۔۔ مرثیہ عز و شرف ہے ذلتوں کی راہ میں
بن گیا گوہر جو ٹپکا اس کے باعث آنکھ سے
یہ وہ سونا ہے ملا جو کربلا کی راکھ سے

یہ وہ لشکر ہے نہیں جس کی صفوں میں انتشار ۔۔۔ باطل ارزل پہ ضرب آہنی ہے اس کا وار
آدمی کے ظاہر و باطن کا ہے آئینہ دار ۵ ۔۔۔ ہر یزید وقت اس کی راہ کا گرد و غبار
توڑ دیتا ہے انا کے بت کو یکسر اس طرح
سانپ کے پھن کو کچل دیتے ہیں ہم سب جس طرح

یہ وہ میزان وفا ہے جس میں تلتے ہیں نصیب ۔۔۔ فکر مثبت ہو اگر کرتا ہے جنت سے قریب
ضامن لطف و کرم ہے دعوت حق کا مجیب ۸ ۔۔۔ منزل خیر العمل پر ہے یہ انساں کا حبیب
تیرگی میں جہل کی علم و عمل کا نور ہے
فکر کی معراج ہے ادراک کا دستور ہے

حضرت آدم کے اشکوں کی زباں مرثیہ ۔۔۔ قتل انسانی کا پہلا ترجماں ہے مرثیہ

حضرت یعقوبؑ کی آہ و فغاں ہے مرثیہ ۹ ہجر میں یوسفؑ کے اشکوں کا سماں ہے مرثیہ
وصل کی امید آنکھوں کی ضیاء ہے مرثیہ
کشتگان راہ حق کا رُونما ہے مرثیہ

بدرؔ کے اوّل شہید راہ حق مردِ خدا وہ جری، وہ صف شکن، حمزہؓ محمدؐ کے چچا
مرثیہ غربت پہ جن کی خود پیغمبرؐ نے پڑھا ۱۰ اور مدینے والوں نے سن کر جسے ماتم کیا
سنتِ ختمِ رُسل، فضل الٰہی مرثیہ
نطقِ پیغمبرؐ میں ہے حق کی گواہی مرثیہ

مرثیہ جس نے بھی لکھا کربلا والوں کے نام منفرد تاریخ انسانی میں ہے اس کا کلام
مرثیہ لکھیں فرزدقؔ اور سنیں جس دم امامؑ ۱ اس طرح بنتا ہے لوح دل پہ وہ نقشِ دوام
جو دل معصوم کی راحت کا ساماں ہوگیا
وہ یقیناً حشر میں جنت بداماں ہوگیا

سب سے پہلے خالق اکبر نے بھیجا مرثیہ شکل میں محضر کی تھا عنوان جس کا کربلا
لاکے جبرئیل امیں نے جو پیمبرؐ کو دیا جو کہ تھا مہر و وفا صبر و رضا کا آئینہ
ابتداء قتل حسینؑ ابن علی کا مرحلہ
انتہا، زینبؑ کی تھا بے چارگی کا مرحلہ

ذاکر اوّل بنے روداد کے روح الامیں سن کے ذکر کربلا روئے نہایت شاہ دیں
فاطمہؑ کا گھر عزاخانہ تھا بر روئے زمیں مجلسِ اندوہ خود پڑھتے تھے شاہ مرسلیں
اس طرح سے مرثیہ کار رسالت ہوگیا
ذکرِ حق، ذکرِ وفا، ذکرِ شہادت ہوگیا

مرثیہ تعریف اور توصیف شاہ کربلا مرثیہ شبیرؑ کی غربت پہ ہے آہ و بکا
اہل حق کی بے بدل قربانیوں کا ماجرا ۲۰ مرثیہ زنجیر وطوق و بیکسی کا مرحلہ
ذلتوں کے درمیاں عزت کا پرچم ہے یہی
درد سے دکھتے ہوئے زخموں کا مرہم ہے یہی

مرثیہ زہراؑ کی حسرت، مرثیہ آہ و فغاں مرثیہ حق کی وضاحت، مرثیہ اشک رواں

مرثیہ دربارِ باطل میں نوائے بیکساں ۳۰ اور شاہی کے لئے رسوائیوں کی داستاں
مرثیہ نے قصرِ سلطانی کو یوں لرزا دیا
ظالم و مظلوم کے معیار کو دکھلادیا

اس مرثیے میں ۵۱ بند ہیں۔ ۳۴ بند تک کا اقتباس مندرجہ بالا ہے۔ بقیہ بیس بندوں میں کربلا کے واقعات، شہادتِ امام حسینؑ اور بعدِ شہادت، سکینہ جنگل میں بابا کی لاش پر پہنچ کر بابا کے سینے پہ سو جاتی ہے۔ سیدہ زینبؑ سکینہ کو ڈھونڈتی بھائی کی لاش پر پہنچتی ہیں۔ سکینہ کو ساتھ لانا چاہتی ہیں۔ سکینہ باپ کا سینہ چھوڑ کر جانے پر آمادہ نہیں۔ اس منظر کو مسرور شکوہ آبادی نے ان الفاظ میں لکھا ہے۔ (لاش سے صدا آتی ہے۔)

جاؤ بی بی، امتحان کی جا کے تیاری کرو
اب یتیموں کی طرح تم نالہ و زاری کرو

''متاعِ شعور'' میں مسرور شکوہ آبادی کے ۹ مراثی شامل ہیں۔

پہلا مرثیہ : پھیلائے ہاتھ آپ کے در پر ہوں یا علیؑ
نواں مرثیہ: نبی کے روزے پہ محمل سے گر پڑی زینبؑ

اپنی شاعری کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ ''میرا مقصد شاعری دنیا طلبی نہیں عقبیٰ طلبی ہے کہ مجھے درباروں بازاروں سے نفرت ہے''۔۔۔ ایک خطیبِ مجالسِ حسینؑ اور کربلا والوں کا مرثیہ لکھنے اور پڑھنے والے فرد کا درباروں بازاروں سے اجتناب فکری کے علاوہ کوئی اور رشتہ ہو بھی نہیں سکتا۔ درس گاہ کربلا سے وابستہ اذہان نہ درباری ہو سکتے ہیں نہ بازاری بلکہ وہ کربلا کو نئے زاویوں سے دیکھتے ہیں۔ مسرور شکوہ آبادی نے بھی کربلا کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے۔

کربلا انسانیت کے واسطے عزّو وقار کربلا تکمیل دینِ انبیاء کا شاہکار
کربلا تعمیر حکمِ مرضئ پروردگار کربلا آئینہ صدق وصفا صبر و قرار
کربلا دینِ مبیں کی شان وعظمت کا بیاں
یعنی عصمت اور طہارت کی شہادت کا بیاں

سورۂ والعصر کی تفسیر ہے کرب وبلا خواب ابراہیمؑ کی تعبیر ہے کرب وبلا
صبر اسمٰعیلؑ کی تنویر ہے کرب وبلا ظالم و مظلوم کی تصویر ہے کرب و بلا

کربلا آیاتِ حق آگیں کا ذکرِ پاک ہے
اس کی ضد میں جو بھی کچھ ہے سب خس و خاشاک

بیسویں صدی کی آخری دہائی سے مسرور شکوہ آبادی نے مجالس حسینؑ میں ذاکری اور خطابت چھوڑ دی ہے۔ اس سلسلہ میں تفصیلات نہیں ملتی سوائے ان کی اپنی بیان کردہ وجوہات کے۔ اس سلسلے میں وہ رقم طراز ہیں۔

"ذاکری سے سبکدوش ہونے کا میرے دوستوں کو ہی نہیں مجھے بھی قلق ہے مگر میرے مخلصین ان عوامل سے باخبر ہیں جن کی وجہ سے میں نے خطابت سے سبکدوش ہونا مناسب جانا — میں کٹھ پتلی بن کر مداریوں کی جاگیر بننے کے لئے تیار نہیں تھا"۔

(پیش لفظ 'متاعِ شعور')

وہ اس بات پر اللہ کے شکرگزار ہیں کہ ذاکری سے سبکدوش ہونے کے بعد انہیں اور زیادہ مرثیہ گوئی کی توفیقات ملیں۔ اللہ مسرور شکوہ آبادی کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور وہ اسی طرح ذکرِ حسین کرتے رہیں۔ اس حیات فانی میں بھی اور اُس حیات ابدی میں بھی۔

☆☆☆☆☆

سید قمر زیدی :- (کراچی)

ولادت یکم جولائی ۱۹۴۹ء

جائے ولادت کراچی۔ عصر حاضر کے خوش فکر مرثیہ نگار قمر زیدی کراچی سے لندن تک اور لندن سے کنیڈا، امریکہ تک جانے پہچانے جاتے ہیں۔ لندن سے عاشور کاظمی کا بلاوا ہو یا حسینیہ ٹرٹ کا، قمر زیدی ضرور پہنچتے ہیں، ٹورنٹو کنیڈا سے عابد جعفری دعوت دیں تو قمر زیدی ٹورنٹو میں نظر آئیں گے۔ میری لینڈ واشنگٹن میں مرثیہ گو شاعر باقر زیدی سالانہ مرثیہ کی محافل کرتے ہیں ان میں ۱۹۹۶ء سے تاحال قمر زیدی پابندی کے ساتھ شرکت کرتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مرثیہ ان کی روح کی غذا ہو، وہ جب مرثیہ پڑھتے ہیں تو ان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے یوں چمکتے ہیں جیسے آکاش پہ کہکشاں جگمگا رہی ہو۔ ان کی آنکھوں میں برق لہراتی نظر آتی ہے۔ شاید اس تعلق کے بغیر مرثیہ کہا بھی نہیں جاسکتا ہے، پڑھا بھی نہیں جاسکتا ہے۔

قمر زیدی کی شاعری کی ابتداء غزل سے ہوئی تھی۔ ان کی غزلوں کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

(۱) نوادر — (۱۹۹۰ء) (۲) تجدید — (۱۹۹۲ء) (۳) باطن — (۱۹۹۳ء)
(۴) لمس — (۱۹۹۵ء) (۵) اصل زر — (۲۰۰۰ء)

اشاعت کے سال یہ بتا رہے ہیں کہ قمر زیدی روانی کے ساتھ شعر کہتے ہیں۔ قمر زیدی نے مختلف اصناف شاعری میں شعر کہے ہیں۔ ان کا حمد و نعت کا مجموعہ ''شفاعت'' ۱۹۹۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔ مرثیہ نگاری کی طرف آئے تو قمر زیدی اس روانی سے مرثیہ بھی کہہ رہے ہیں۔ ان کے مراثی کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ قمر زیدی موضوعاتی مرثیہ کہنے میں قدرت رکھتے ہیں۔ اُن کا پہلا مجموعہ 'میراث' ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں پانچ مراثی شامل ہیں۔ دوسرا مجموعۂ مراثی ''ولا'' ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا ہے۔ دو مرثیے 'بصیرت' دراحوالِ حضرت حرؔ اور 'دوستی' دراحوالِ حبیب ابنِ مظاہر غیر مطبوعہ ہیں۔

قمر زیدی کہتے ہیں کہ اس تیز رفتار زندگی میں اب لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ طویل مرثیہ پڑھیں یا سنیں اس لئے قمر زیدی مرثیوں میں غیر ضروری طولانی وضاحتیں نہیں کرتے۔ ان کے مرثیوں میں حمد و نعت کے لئے ایک ایک بند کے بعد موضوع کی طرف گریز ہوتا ہے۔ کم سے کم بندوں میں موضوع کی تشریح و وضاحت اور موضوعی صفات کو اُجاگر کرنے کے بعد ان صفات سے منطبق ہوتی ہوئی ایک شخصیت کو کربلا کے کرداروں میں سے چن کر اس شخصیت کے فضائل اور مصائب بیان کرتے ہیں اور مصائب پر مرثیہ کی تکمیل کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے ایک مرثیے ''ظرف اور اہل ظرف'' سے چند بند نقل کئے جا رہے ہیں۔

نام سے آغاز تیرے اے میرے پروردگار — بے نیاز و باوقار و عادل و رحمت شعار
مالک کل، قادرِ مطلق، معظّم، کردگار — ہے نظام دو جہاں کیا ایک دو حرفی پکار ۱
ہے تجھے لاریب استحقاق روح لاالہ
ہے تیری تخلیق اشرف اور تو میرا خدا

آئی ہے میری زباں پر مدحتِ آل عبا — ذکر اعلیٰ ظرف لوگوں کا سرِ بزمِ عزا
کر تخیل کو مرے وہ ظرف تابندہ عطا ۲ — مرثیے کا حق تمنا ہے کہ ہو جائے ادا

سوچ لے یہ ذکرِ سبطِ احمدؐ مختار ہے
سوز لہجے میں تکلّم میں اثر درکار ہے

شوق ایسا دے جو اوروں کا پریشانی نہ دے وہ سکوں مانگے اصولوں کی جو قربانی نہ دے
عقل جو سچائی کو کہتی ہو نادانی نہ دے ۳ چھین کر اک اور پیاسے سے مجھے پانی نہ دے
وہ سلیقہ دے کہ جو معیار ہو اسلوب کا
ظرف ایسا دے کہ جیسا تھا ترے محبوب کا

ظرف کی تعریف کیا ہے ہاشمی اقدار ہیں اس چمن میں کیسے کیسے سروِ خوش اطوار ہیں
وہ امام الانبیاء وہ احمدِ مختار ہیں ۴ اور وہ مولودِ کعبہ حیدرِ کرار ہیں
سیرتِ حسنینؑ اک زندہ کتابِ ظرف ہے
فاطمہؑ کی تربیت گویا نصابِ ظرف ہے

جیسا کہ عرض کیا گیا، حمد کا ایک بند، نعت کا ایک بند، گریز کا ایک بند۔ اس کے بعد موضوع کی تشریح و وضاحت بعد ازاں اس تشریح سے منطبق کردار اور ان کے فضائل۔

کر سکو تو دشمنوں سے بھی رواداری ہے ظرف ہو سکے تو ظلم سہہ کر بھی وفاداری ہے ظرف
بے بسی میں بردباری غم میں خودداری ہے ظرف ۵ آنکھ کی غفلت نہیں ہے۔ دل کی بیداری ہے ظرف
دل میں تکریم بشر تشبیہ و صولت سے نہیں
ظرف، اک دولت ہے لیکن ظرف دولت سے نہیں

ظرف نیکی ہر بشر کا مستقل ایقان ہے ظرف وہ میراث جو اجداد کی پہچان ہے
آدمی میں ظرف اعلیٰ ہو تو وہ انسان ہے ۶ ہو فرشتہ بھی اگر کم ظرف تو شیطان ہے
مرد ناداں کے لیے اک لفظ اس کے تین حرف
در حقیقت عظمتِ انساں کا پیمانہ ہے ظرف

لاکھ ہیں اس کی عنایت سے امیر و محترم غاصبوں کا ذکر کیا ہے منکروں پر بھی کرم
رزق جو حسب ضرورت سب کو پہنچائے بہم ۷ وہ جو رکھتا ہے زمانے میں غریبوں کا بھرم
ہے جہاں میں ظرف اعلیٰ کی مثالِ بہترین
اور پھر اس ضمن میں یکتا ہیں ختم المرسلین

ظرف وہ جو بھول اوروں کی بھلا دینے میں ہے ظرف وہ جو دشمنوں کو بھی دعا دینے میں ہے
ظرف وہ جو زخم کھا کر مسکرانے دینے میں ہے ۸ ظرف وہ جو فرق دولت کا مٹا دینے میں ہے

ایک مثال بے بدل اس کی امیرالمومنین
پیروی جاری ہے جن کی تا امامِ آخریں

نائب مرد قلندر صبر کا پرودگار وہ اصالت کا سمندر وہ حلیم و برد بار
مظہر ایمان کل، اسلام کا آئینہ دار ۹ فاطمہ کا تربیت دادہ خرد کا شہ سوار

وہ امام صاحبانِ عزم و ہمت وہ حسینؑ
جس سے آتا ہے سمجھ میں لفظِ عظمت حسینؑ

اصغر بے شیر ہوں یا ہوں شبیہِ مصطفٰے قاسم و عون و محمدؑ ہوں کہ ہوں شاہ وفا
سب کے سب آل علیؑ ہیں پیکر صبر و فا ۱۰ عابد بیمار ہوں یا خود شہِ کرب و بلا

بچہ بچہ اس گھرانے کا کثیرالشان ہے
اہل بیتِ مصطفٰے کا ظرف پر احسان ہے

اور بعدازاں مصائب کے بند پر مرثیہ تمام ہوتا ہے۔ قمر زیدی صرف شاعر ہی نہیں بلکہ بیک وقت شاعر۔ مرثیہ نگار، نثر نگار ہیں۔ ان کے مقالات کا مجموعہ ''کیا کیا جائے'' شائع ہو چکا ہے۔ انگریزی زبان میں مضامین کا مجموعہ شائع ہوا ہے۔ تعلیمی حوالے سے قمر زیدی انجینئر، پیشے کے اعتبار سے ایک تاجر ہیں، ان کی مختلف الجہات مصروفیات کو دیکھ کر مولانا حسرتؔ کا مصرع یاد آجاتا ہے۔ ؎

''اک طرفہ تماشہ ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی''۔ اللہ اُنہیں سلامت رکھے اور اُن کی توفیقات میں اضافہ کرے۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر ہلال نقوی:- (کراچی)

ولادت ۱۹۵۰ء

جائے ولادت راولپنڈی۔ آبائی وطن امروہہ۔ سکونت کراچی، تعلیم ایم۔ اے (اردو) ۱۹۷۳ء، پی۔ ایچ۔ ڈی ۱۹۸۵ء (کراچی یونیورسٹی)۔ پیشہ درس و تدریس۔ گورنمنٹ ڈگری کالج

گلشن اقبال کراچی میں شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔

رثائی ادب بالخصوص مرثیے کی دنیا میں ڈاکٹر ہلال نقوی مختلف حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کا تحقیقی مقالہ جو'بیسویں صدی اور جدید مرثیہ' کے نام سے کتابی صورت میں ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا ہے اردو مرثیے پر بہت اہم کام ہے۔ خود مرثیے بھی کہے ہیں۔ اور مرثیہ نگاری پر قابل ذکر کام کیا ہے۔ ان کا مجموعہ مراثی ''اذان مقتل'' بھی ۱۹۹۴ء میں ہی شائع ہوا ہے۔ اذان مقتل میں ان کے پانچ مرثیہ شامل ہیں۔ جن پر سنہ تصنیف درج ہے۔

☆ ''حر''	ہاں اے انیس فکرِ مقدم، قدم اٹھا	تصنیف اگست ۱۹۸۵ء
☆ ''طاقت''	انسان کے سفر کی کہانی عجب ہے	تصنیف اکتوبر ۱۹۸۵ء
☆ ''ہاتھ''	جس ہاتھ میں قلم ہے حشم اس کے ہاتھ ہیں	تصنیف ستمبر ۱۹۸۶ء
☆ ''چراغ''	روشن خطِ مسافت شب ہے چراغ سے	تصنیف ستمبر ۱۹۸۷ء
☆ ''آواز''	جب بستۂ خیال بہ دست قلم کھلا	تصنیف اگست ۱۹۸۸ء

''اذان مقتل'' میں ان کی مطبوعہ تصانیف و تالیفات کی فہرست میں دو مرثیے 'پس تاریخ' مطبوعہ ۱۹۸۴ء اور 'مقتل و مشعل' مطبوعہ ۱۹۷۶ء بھی شامل ہیں جو 'اذان مقتل' میں شریک اشاعت نہیں ہیں۔ ڈاکٹر ہلالؔ نقوی کی مرثیہ گوئی کا آغاز مقتل و مشعل (۱۹۷۶ء) سے ہوا ہے۔ 'اذان مقتل' میں شامل ریکارڈ کے مطابق ہلال نقوی کی مرثیہ گوئی کے بارے میں حضرت جوش ملیح آبادی کی رائے (مرقومہ ۲۱ر جولائی ۱۹۷۵ء) ''اذن مقتل'' میں شائع ہوئی ہے جس میں جوش صاحب نے کہا ہے کہ:

> ''وہ (یعنی ہلالؔ) صحیح معنوں میں انقلابی ہیں۔ اُن کی نس نس میں شاعری کا آہنگ ہے۔ وہ واقعی جینیس ہیں۔ پچیس سال کے نوجوان ذہن کی فکری پختگی کا ایک نیا عالم اُن کے وہبی شاعر ہونے کی دلیل ہے۔''

اُس وقت تک اُنہوں نے صرف ایک ہی مرثیہ 'مقتل و مشعل' (بعمر ۲۵ برس) کہا تھا جسے دیکھ کر حضرتِ جوشؔ نے ہلالؔ نقوی کو جو خراج محبت پیش کیا وہ ہلالؔ کی شاعری کے لیے ایک اہم سند ہے۔ حضرت جوش ملیح آبادی نے ایک اور بیان (مرقومہ جولائی ۱۹۸۱ء) میں ہلال نقوی کی زود گوئی کو سراہا ہے اور اس امر کی تصدیق کی ہے کہ ہلالؔ نقوی کو اُن سے سلسلۂ تلمذ وابستہ

رکھنے کا شرف بھی حاصل تھا۔" میرے کراچی کے زمانۂ قیام میں وہ (ہلال نقوی) تقریباً روز مجھ سے ملنے آتے اور میرے نواسے کو بلا معاوضہ اردو پڑھاتے۔ اس زمانے میں انکے دل ودماغ پر صحیفۂ شاعری نازل ہوا اور وہ مجھ سے اصلاح لینے لگے۔ میاں ہلال نقوی کی طبیعت میں زود گوئی کا بہت ملکہ ہے۔"

(حضرت جوشؔ ملیح آبادی جولائی ۱۹۸۱ء)

اس زود گوئی کا ثبوت بھی 'اذنِ مقتل' ہے جس میں شامل مراثی پر جو سنہ تصنیف درج ہے اُس کے مطابق انہوں نے ایک مرثیہ بعنوان " حُر" اگست ۱۹۸۵ء میں اور دوسرا مرثیہ " طاقت" اکتوبر ۱۹۸۵ء میں کہا۔

ڈاکٹر ہلال نقوی کے ایک اور مرثیہ "الحمد" پر تابش دہلوی نے تبصرہ کیا ہے۔ اذان مقتل میں یہ مرثیہ بھی شامل نہیں ہے مگر تابش دہلوی کا تبصرہ کتاب میں شامل ہے۔ تابش دہلوی رقم طراز ہیں کہ:

> " انیسؔ اور دبیرؔ نے مرثیہ کو جس درجہ کمال پر پہنچایا ہے اس کے بعد ارتقائی مدارج میں اضافہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن ڈاکٹر ہلالؔ نقوی نے یہ مرثیہ (یعنی سورۃ الحمد) کہہ کر یقیناً مرثیہ کے اسلوب میں خوشگوار اضافہ کیا ہے۔ ہلالؔ نقوی موجودہ دور کے مرثیہ نگاروں میں منفرد مقام رکھتے ہیں اور برصغیر پاک و ہند میں ان کا کوئی مدِ مقابل نہیں"
>
> (مرقومہ ۵؍ اکتوبر ۱۹۹۸ء)

تابش دہلوی کی اس رائے سے اُن آرا کی تردید ہوتی ہے جو انیسؔ و دبیرؔ کے بعد مرثیہ کے ارتقاء کو نہیں مانتے۔ اب اس جمود کو مرزا اوجؔ، جمیلؔ مظہری، جوشؔ، نجم آفندی جیسی شخصیتوں نے نہ سہی (تابش دہلوی کی رائے کے مطابق) ڈاکٹر ہلالؔ نقوی نے ہی سہی، کسی نے توڑا تو سہی۔ اب رہا سوال اس کا کہ " برصغیر پاک و ہند میں ان کا کوئی مدِ مقابل نہیں" تو اس کے فیصلے کا حق ان ناقدین مرثیہ کو ہے جو لکھتے کم اور پڑھتے زیادہ ہوں اور تخلیقات کے تقابلی مطالعہ کے بعد لکھتے ہوں ہمیں تو مسرت اس بات کی ہے کہ ہندوستان کے موجودہ مرثیہ نگاروں میں بشمول نظیرؔ باقری، پیامؔ اعظمی، عظیمؔ امروہوی، علی مہدیؔ بلرام پوری سے درگذر دبستانِ کراچی کے مرثیہ گو شعرا میں بھی کوئی ہمارے برادر مکرم ہلال نقوی کے مدمقابل نہیں ہے۔

"اذان مقتل" میں شامل ڈاکٹر ہلال نقوی کے پانچ مراثی یقیناً صف اول کے جدید

مرثیے ہیں۔ ایسا لگتا ہے۔ ہلال نقوی نہ صرف اچھے مرثیہ نگار ہیں بلکہ جوشؔ کے مزاج داں بھی ہیں اور اس فکر و اسلوب کے پیرو بھی جو اُن کے اُستاد جوش ملیح آبادی کا تراشیدہ ہے، دیکھئے ہلالؔ نقوی کا اسلوب، ذخیرۂ الفاظ اور لفظوں کو برتنے کا ہنر۔ یوں لگتا ہے جیسے ''کوسوں بڑھا ہوا ہو پیادہ سوار سے''۔

آہٹ، الاپ، بول، نفس، کھلبلی، کھنک
پتھراؤ، سائیں سائیں، گھٹا، چہچہے، چنک
جھنکار، مدّ و جزر، ادا، لحن، دُھن، خروش
تلوار، شور، گونج، روانی، سرک، دھمک
ہردم رواں بساطِ گمان و یقین پر
کتنے رُخوں سے بول رہی ہے زمین پر

قرنا کا شور، گرمیٔ مقتل، شکوہِ جنگ
بانگِ درا، ترنّمِ قلقل، نوائے چنگ
تیشے کی ضرب، فن کی نمو، حرف کی اُڑان
کوئل کی کوک، مور کی چھم، چوکسی ترنگ
اک سلسلہ ہے رشتۂ تارِ حیات کا
آواز بُن رہی ہے سفر کائنات کا

(مرثیہ آواز۔ بند ۱۵۔۱۷)

اے فکر! اب یہ ذکر بصد اہتمام لکھ
اے روشنی جبیں افق پر یہ نام لکھ
اے حرف اس شکوہ و شرف کو سلام کر
لکھ اے قلم، چراغِ علیہ السلام لکھ
قرآن میں تذکرے جو بصد آب و تاب ہیں
اس کی تجلیاں بھی بشارت مآب ہیں

(مرثیہ چراغ۔ بند ۲۵)

چراغ علیہ السلام کہنے کا حق جوشؔ کو ہے یا شاید اسے جسے جوشؔ اجازت دیں۔

ڈاکٹر ہلالؔ نقوی پر ایک اور اعتراض بھی بے محل ہے کہ ''انہوں نے مسدّس کے تیسرے مصرعے کو قافیہ کی قید سے آزاد کرایا ہے'' جبکہ اس کی ابتدا علامہ جمیل مظہری نے کی تھی اور تصویر فاطمہ اور دیگر نے اس کی پیروی کی۔ ہلالؔ نقوی کی یہ انکساری تعجب خیز ہے کہ وہ اس کی وضاحت نہیں کرتے بلکہ اس اجتہاد کی نیک نامی یا تنقیص اپنے شعری نامۂ اعلان میں لکھوا رہے ہیں۔

ڈاکٹر ہلالؔ نقوی کا مرثیہ 'ہاتھ' حضرت عباس کے احوال پر ہے۔ چند بند درج ذیل ہیں۔

جس ہاتھ میں قلم ہے، حشم اس کے ہاتھ ہے	جو ہاتھ خود قلم ہے، علم اس کے ہاتھ ہے
ہر عہد تشنگی کا تمدن لکھے جو ہاتھ	آثار و ارتقاء کا بھرم اس کے ہاتھ ہے
برہم کرے صفوں کو جو ترتیب کے لئے
وہ ہاتھ اک سبیل ہے تہذیب کے لئے

بے ربط سلسلوں کے کنارے ملا دیئے	بے راستہ زمین میں رستے بچھا دیئے
بے رنگ تھا یہ صفحۂ ہستی تو ہاتھ نے	کورے ورق پہ ذہن کے سوتے جگا دیئے
یعنی رقم شدہ، یہ جریدہ ہے ہاتھ کا
کارِ جہاں تمام قصیدہ ہے ہاتھ کا

ایک ہاتھ ہے یہ کتنے شمائل لئے ہوئے	ابلاغ کے ہزار وسائل لئے ہوئے
رکھے کفِ ورق پہ کتابوں کے آفتاب	برگِ قلم پہ کوہ رسائل لئے ہوئے
ہاں کاتبو! کلیدِ خزانہ لکھو اسے
تدوینِ علم و فن کا مدینہ لکھو اسے

ہر عہد کی بقا ہیں مشقت سپاس ہاتھ	دہقان کے یہ ہاتھ، زراعت شناس ہاتھ
محنت کو زر کے پاؤں کچلتے رہے مدام	لیکن یہ ہاتھ، ہاتھ تھے محنت اساس ہاتھ
پھر تذکرے نمو کے بصد آب و تاب ہیں
زخمی ہتھیلیوں پہ لہو کے گلاب ہیں

یہ لوگ جن کے ہاتھ اذیت رساں رہے	اپنی انا کے زعم میں نخوت نشاں رہے
نوعِ بشر پہ ان کا شکنجہ رہا محیط	ہر عہد میں یہ قاتلِ امن داماں رہے
اک مشغلہ جو مشقِ جفا و سزا کا ہے
چلّو میں ان کے خون یہ خلقِ خدا کا ہے

کب چھپ سکا یزید کا حرمت فگار ہاتھ	دستانۂ ریا میں رعونت حصار ہاتھ
بیمار ذہنیت سے ٹھٹھر کر جو رہ گئی	اس منجمد حیات کا فالج شکار ہاتھ
کب چھپ سکا یہ ہاتھ کہ تشہیر میں رہا
ہر احتسابِ وقت کی زنجیر میں رہا

دستِ حسینؑ ابنِ علیؑ زندگی کا ہاتھ   فریاد اسکا ہاتھ، عدالت اُسی کا ہاتھ
صبحِ یقیں کے لحۂ حدِ نمود پر ۴۷ کردار کے افق پہ شفق آدمی کا ہاتھ
یہ ہاتھ ہر عروج و شرف میں علم رہا
اس کے جلو میں گنبدِ آفاق خم رہا

لیکن بہ زعمِ نخوت و انکار داوری   وہ منکرانِ حق کا تکبرّ وہ خودسری
بن کر عتاب سرکشی و شورشِ عناد ۵۰ لے کر غرورِ اسلحہ گیری و لشکری
جب یوں ہرِ ملوکیت و شاہیت اُٹھا
ابنِ علی بہ ناز یداللّٰہیت اُٹھا

ہمراہ اہلِ حق کے جماعت وہ مختصر   ہر فرد جس میں حق کے حوالے سے معتبر
بڑھنے لگے جو حق کی طرف قاتلوں کے ہاتھ ۵۱ نکلے سروں کو لے کے یداللہ کے سپر
یکجا ہوئے تو اک صفِ جرّار بن گئے
ہاتھوں میں ہاتھ آہنی دیوار بن گئے

عباس کے یہ ہاتھ ہیں وہ سرفراز ہاتھ   جو تیغ کے لئے سبب فخر و ناز ہاتھ
اس ہاشمی جوان پہ نازاں ہے کربلا ۵۷ دوشِ بلند، قامتِ بالا، دراز ہاتھ
اور یہ دراز ہاتھ جو اُٹھے حشم کے ساتھ
چلنے لگی قیادت انساں علم کے ساتھ

مرثیہ کے بند نمبر ۵۸ سے ۸۰ تک حضرت عباس کے ہاتھ قلم ہونے کے احوال کے بعد۔

یہ ہاتھ کٹ گئے تو ردائیں بھی چھن گئیں   خیموں کی پردہ دار فضائیں بھی چھن گئیں
بچے تمام سہم گئے خوف شمر سے ۸۱ پھر وہ عطش، عطش کی صدائیں بھی چھن گئیں
بچوں کی آس کے وہ گھروندے بکھر گئے
کوزروں کو روندتے ہوئے ظالم گذر گئے

یہ ہاتھ کٹ گئے تو بڑھے تب رسن کے ہاتھ   بچوں کے وہ گلے، وہ حرم، وہ بہن کے ہاتھ
زنجیر بستہ ہاتھ کفن تک نہ دے سکے ۸۳ مجبور کس قدر تھے غریب الوطن کے ہاتھ

(مرثیہ ۸۶ بند پر اختتام پذیر ہوتا ہے)

ڈاکٹر ہلالؔ نقوی کی پانچ تصانیف (جن میں تین ان کے مرثیہ جو علیحدہ علیحدہ شائع ہوئے ہیں۔) اور ۱۳ تالیفات شائع ہو چکی ہے۔ حضرت جوشؔ ملیح آبادی کی ہلال نوازی جناب تابش دہلوی کی بلند و بالا تقریظ کے علاوہ ڈاکٹر احسن فاروقی، ڈاکٹر عقیل رضوی اور اس معیار کے کئی اکابرین نے، افراط و تفریط سے درگذر، محترم ہلالؔ نقوی کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ کیفی اعظمی نے تو انہیں شبلی تک کہہ دیا ہے جو ہلالؔ کے لئے ایک اور سند ہے۔

نہ جانے کیا ہوا کہ ۱۹۸۸ء کے بعد ہلال نقوی کا کوئی مرثیہ سامنے نہیں آیا۔ ایک سال میں ایک بلکہ دو مرثیہ کہنے والے ایک زود گو شاعر کے شعر گوئی کے سوتے یک لخت تو خشک تو نہیں ہو سکتے۔ پھر ایک شاعر کے لئے شعر و سخن سے زیادہ مقرب کیا مشغلہ ہو سکتا ہے۔ خدا کرے ہلالؔ نقوی کی یہ خاموشی عارضی ہو اور وہ دیگر مصروفیات سے فراغت حاصل کر کے مرثیہ گوئی کی طرف لوٹ آئیں۔ انہیں مرثیہ کہے ہوئے کم و بیش ۱۷ برس ہو گئے ہیں۔

☆☆☆☆☆

سمیع نقوی :- (کراچی)

پیدائش، ۱۵ر جنوری ۱۹۵۰ء

نام سید محمد سمیع الحسن نقوی۔ تخلص سمیعؔ۔ نقوی سید۔ وطن مالوف امروہہ۔ والد کا اسم گرامی سید محمد مستفیض الحسن نقوی (مرحوم)۔ سمیع نقوی کے والد گرامی ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے اور پاکستان نیوی (بحریہ) میں ملازمت اختیار کی اور بحریہ سے ہی ریٹائر ہوئے۔ سمیعؔ پاکستان (کراچی) میں پیدا ہوئے۔ کراچی میں تعلیم پائی۔ درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہو گئے اور گذشتہ ۳۲ برس سے ایک سیکینڈری اسکول میں استاد ہیں۔ شاعری کا آغاز ۱۹۶۶ء سے ہوا۔ اس سلسلے میں سمیعؔ نقوی کا اپنا بیان ہے کہ:

> "میرے استاد سید صغیر احمد رضوی جارچوی ہیں۔ محترم فہیم اختر جارچوی، محترم اشرفؔ جارچوی، اور محترم گوہرؔ جارچوی نے بہت پر خلوص انداز میں مری ہمت افزائی کی"

(مکتوب بنام عاشور کاظمی بتوسل کوثر الہ آبادی)

سمیع نقوی مرثیہ کی کلاسیکی روایات کو مانتے ہیں۔ مستند اور ممتاز مرثیہ گو شعراء کی رہنمائی نے اُنہیں اس منزل تک پہنچادیا ہے جہاں شاعری میں محاسن کا نور سرور حاصل ہو جاتا ہے۔ انہوں نے نمونہ کلام کے طور پر اپنے ایک مرثیہ کے ''ساقی نامے'' کے کچھ بند ارسال کئے۔ شاید اس لئے کہ کلاسیکی مرثیہ میں ''ساقی نامہ'' شاعر کی اٹھان اور شاعری پر گرفت کا مظہر ہوتا ہے۔

اے طائرِ خیال اُسی گلستاں میں چل　　　ہر سمت کھل رہے ہوں جہاں دین کے کنول
سازِ حیات پر کوئی چھیڑوں جو میں غزل　　　ہر مصرعہ بے مثال ہو ہر شعر بر محل
لفظوں کا انتخاب جو سچ بولنے لگے
سائے کو جبرائیل بھی پر کھولنے لگے

مجھ پر نزولِ رحمتِ پروردگار ہے　　　یعنی کہ اپنی ذات پہ اب اعتبار ہے
جو لفظ ہے وہ آئینہ دارِ بہار ہے　　　اب تو سخنوروں میں بھی میرا اشعار ہے
ایسے میں تیرگی سے اُلجھنا فضول ہے
سب جانتے ہیں شاعرِ آلِ رسولؐ ہے

رکھا قلم نے جھوم کے قرطاس پر قدم　　　حق کے ولی کا دوش پہ رکھے ہوئے علم
شیطانیت کے گرنے لگے ٹوٹ کے صنم　　　قصہ غدیر کا جونہی ہونے لگا رقم
رنگِ شفق غدیر کے رُخ پر بکھر گئے
کیسے منافقیں کے چہرے اتر گئے

میری زباں پہ نفسِ پیمبر کی مدح ہے　　　فخرِ رسولؐ ساقیٔ کوثر کی مدح ہے
حکمِ خدا سے فاتحِ خیبر کی مدح ہے　　　بنتِ اسد کے لال کی، حیدر کی مدح ہے
حیدر کی مدح جب میرے لب سے بیاں ہوئی
لفظوں کی فوج پیچھے قلم کے رواں ہوئی

ساقی مئے ولائے مودّت پلا مجھے　　　گونجا تھا جو غدیر میں نغمہ، سنا مجھے
جو بات مستند ہو۔ مکرّر سنا مجھے　　　کرنا ہے ایک سجدہ الفت ادا مجھے
ساقی پلا دے ساقیٔ کوثر کے نام پر
ہر بار لکھدے نام میرا ایک جام پر

ساقی تجھے قسم ہے جناب امیر کی خالی رہے نہ جھولی جہاں میں فقیر کی
میری زباں پہ بات ہو زندہ ضمیر کی مجھ کو عطا ہو فکر جناب دبیر کی
جوشِ ولا میں عرش بریں چومنے لگوں
پی کر شرابِ حُبِ علیؑ جھومنے لگوں

یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ آخری بند میں دبیر کا ذکر ضرورت شعری ہے یا مسیح نقوی مرزا دبیر کے مقلد ہیں۔ اس لئے کہ مسیح نقوی کے دو مراثی سامنے آئے ہیں جن میں دبستانِ دبیر سے زیادہ میر انیس کی پیروی کی جھلک ہے۔

☆☆☆☆☆

سرفراز ابدؔ اکبر آبادی:- (کراچی)

ولادت ۲۵ رفروری ۱۹۵۲ء۔

ممتاز شاعر حضرات سید شہنشاہ حسین شفق اکبر آبادی کے فرزند ارجمند سرفراز ابد کا آگرہ (اکبر آباد) کے ایک معزز علمی ادبی گھرانے سے تعلق ہے ـــــ سرفراز کراچی میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۷۴ء میں سندھ جام یونیورسٹی سندھ سے ایم۔ ایس۔ سی (آنرز) پاس کیا اور بینکار بن گئے۔ شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی۔ اور بات نعت، سلام، اور منقبت، تک پہنچی۔ سرفراز ابد نے ۱۹۸۰ء میں پہلا مرثیہ کہا جس کا عنوان ''ذوالفقار'' ہے۔ ''طرفِ قبلۂ مدحت جو ہوا طرزِ سخن''۔ سرفراز ابد نے حقائق کی روشنی میں اس مرثیے کا آغاز کیا۔ یعنی مدحت کی طرف طبع رواں راغب ہوئی تو پہلا مرثیہ وجود میں آیا۔ نفسِ مضمون 'ذوالفقار' کو بھی سرفراز ابد نے سطحی طور پر نہیں دیکھا بلکہ دور تک حقائق وصداقت کی تلاش کی ہے۔ قرآن حکیم کی سورۃ ''الحدید'' آیت ۲۵ میں ارشاد باری ہے۔

''ہم نے ہی لوہے کو نازل کیا جس کے ذریعہ سے سخت لڑائی ہے۔'' علماء کرام اور مفسرین نے ذوالفقار کو اس آیۂ مبارکہ سے منسوب کیا ہے۔ ذولفقار کے بارے میں یہ رائے بھی غیر متنازعہ ہے کہ ذوالفقار' آسمان سے اتری تھی۔ سرفراز ابد نے اپنے پہلے مرثیے میں اسی سورۃ الحدید کی آیت پچیس (۲۵) کا حوالہ دیا ہے۔

تذکرہ کرتا ہے اس تیغ کا قرآن مجید حق کے فرمان کی ہو ہی نہیں سکتی تردید

یعنی لازم ہے مسلمان پہ اس کی تائید صاف ہوتا ہے بیاں پڑھیے تو آیات حدید

ہے یہی حق نے زمیں پر جو اُتارا لوہا
جس کا ہر دور میں باطل نے بھی مانا لوہا

جس وقت سرفراز آبد نے یہ مرثیہ کہا اس وقت ان کی عمر صرف ۲۸ برس تھی۔ اٹھائیس برس کی عمر میں جستجو اور تلاش کی دانائی، آیات قرآنی کی فہم اور انہیں نظم کرنے کا شعور، سرفراز آبد کی خداداد صلاحیت اور خاندانی علمی پس منظر کا ثبوت ہے۔ ذوالفقار سے متعلق کوئی ایسا گوشہ نہیں جو سرفراز آبد کی نظر سے پوشیدہ رہا ہو۔ تلوار مرثیے کا اہم موضوع ہے۔ کلاسیکی مرثیے میں تلوار اور ذوالجناح کی تعریف کے لئے مرثیہ کا خاصا حصہ وقف ہوتا تھا۔ لیکن تلواروں میں تلوار، ذوالفقار کا ذکر مرثیوں میں حوالے کے طور پر تو آیا ہے لیکن بحیثیت موضوع نہ جانے کیوں احتیاط برتی گئی ہے۔ شاید یہ احتیاط اس لئے ہو کہ ذوالفقار تو ذولفقار حیدری کا نام ہے اور مرثیہ حسینؑ مظلوم اور کربلا کے واقعات کے لئے مختص ہو گیا ہے۔ پھر بھی ذولفقار کے موضوع پر چند ہی شاعروں نے بات کی ہے جن میں مرزا اوجؔ نے اس رُخ سے ذولفقار کو دیکھا کہ کربلا میں امام حسینؑ کے پاس "ذوالفقار تھی جو حضور نبی کریمؐ کے ذریعہ حضرت علی مرتضٰی کو عطائے خداوندی تھی۔ اس حوالے سے حضرت اوجؔ نے ذوالفقار کو personify کیا ہے، تشخص دیا ہے۔" جب ذوالفقار ماتم اصغر میں رو چکی"۔

جدید عہد میں شمیم کرہانی نے ذوالفقار کے موضوع پر مرثیہ کہا ہے۔ لیکن سرفراز آبد نے جس ڈھنگ سے مرثیہ کہا ہے وہ رثائی ادب میں ایک اضافہ ہے۔ کلام پاک کی آیۂ مبارکہ سے ابتداء کر کے مصائب کے بیان تک ذوالفقار، موضوع سخن رہی ہے۔ سرفراز آبد نے ذوالفقار سے متعلق ساری مصدقہ روایتوں کو نظم کیا ہے۔

گلشن کفر میں جو آگ لگا دیتی ہے جو بھڑکتے ہوئے شعلوں کو ہوا دیتی ہے
پھونک کے سارا چمن، خاک اُڑا دیتی ہے سرحدیں باغ کی صحرا سے ملا دیتی ہے

ہونے والی ہے عیاں اب وہ جلالی تلوار
آج کہتا ہے جہاں، جس کو خیالی تلوار

اس بند کے بیت میں "ہونے والی ہے عیاں اب وہ جلالی تلوار" اس روایت کی طرف

اشارہ ہے جس کی رو سے صاحب العصر حضرت امام مہدیؑ جب ظہور فرمائیں گے تو ان کے ہاتھ میں یہی ذوالفقار ہوگی ــــ مرثیہ کے حصۂ مصائب میں بھی سرفراز آبد نے موضوع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے جب امام حسینؑ کی گود میں علی اصغرؑ کی لاش تھی۔ بیٹے کے گلے سے خون بہہ رہا تھا۔ اور باپ یہ سوچ رہا تھا کہ چھ ماہ کے بچے کی لاش کو خیمے میں لے جائے تو ماں کا کیا حال ہوگا اور دفن کردے تو بچے کی ماں کو کیا جواب دے گا؟۔ خدائے سخن میر انیسؔ نے اس مرحلے کو ایک بیت میں بیان کیا ہے۔

ننھی سی قبر کھود کے، اصغر کو گاڑ کے
شبیرؑ اُٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے

سرفراز آبد اکبرآبادی نے بھی یہی بیان کیا ہے کہ وہ ننھی سی قبر ذوالفقار سے کھودی گئی تھی:-

پھر یوں شمشیر سے گویا ہوئے سلطانِ اُمم　　جانِ اصغرؑ کی گئی سہہ لئے ہم نے بھی ستم
لشکرِ شام سے باقی نہیں اُمیدِ کرم　　اب ترا کام ہے آ، سونپتے ہیں تجھ کو ہم
ایک چھوٹی سی لحد رن میں بنادے مجھ کو
ساتھ لے آیا تھا اس کام کی خاطر تجھ کو

سرفراز ابد کا ایک اور مرثیہ ـ ''جب بزم سجائی گئی توصیف وثنا کی'' بھی اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اس مرثیے کا عنوان ''سچائی'' ہے اور پورے مرثیہ میں سچائی مصرعوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

سرفراز آبد کی زود گوئی، خود سے زیادہ دوسروں کو سہارا دینے کی عادت اور مرثیہ گوئی میں فکر وشعور کی بالیدگی کی بابت سُن کر اور جان کر ہم نے چاہا تھا کہ سرفراز آبد ایسے پختہ گو شاعر کے کلام کے کچھ محاسن پر مزید معلومات حاصل کی جائیں اس سلسلے میں سرفراز ابد سے براہ راست رابطے کے علاوہ مرثیہ فاؤنڈیشن کراچی۔ سفینۂ ادب، ڈاکٹر ہلال نقوی اور دیگر احباب کے ذریعے ان سے بات کرنے کی کوشش بھی بے سود ثابت ہوئی ــــ شاید وہ یقین نہ کرسکے ہوں کہ مغرب میں رہنے والا حسینؑ مظلوم کا کوئی غلام، مرثیہ پر قلم اٹھانے کی ہمت کرے گا۔ زندگی نے ساتھ دیا تو دوسرے ایڈیشن میں اُن سے رابطہ کی پھر کوشش کی جائے گی۔

☆☆☆☆☆

کوثر نقوی:- (کراچی)

ولادت ۱۹۵۳ء

نام سید علی کوثر، تخلص کوثرؔ۔ نقوی سید۔ والد گرامی۔ قاضی سید تحی حسن نقوی عارف امروہوی۔ آبائی وطن امروہہ۔ (یو۔پی) جائے ولادت کراچی۔ پیشہ بنکاری۔

کوثر نقوی کا پہلا ادبی حوالہ ان کا مجموعہ غزلیات و منظومات 'دارِ عشق' ہے جو ۱۹۹۵ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ اس کتاب میں راغبؔ مرادآبادی، احمد ندیمؔ قاسمی۔ تابش دہلوی، پروفیسر کرار حسینؔ، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، قتیل شفائی، منیر نیازی۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی۔ جگن ناتھ آزاد، پروفیسر محسن احسان۔ ڈاکٹر اسلم فرخی۔ ڈاکٹر نعیم تقوی کی مثبت آرا یہ بتانے کے لئے صف آراء ہیں کہ کوثر نقوی نے اپنے آپ کو بحیثیت شاعر منوالیا ہے۔

''دارِ عشق'' میں غزلیات کے علاوہ چونکادینے والی شاعری کوثر نقوی کی نظمیں گلدستۂ عقیدت، پانی، موت، قلم اور آگ ہیں۔ یہ نظمیں مسدّس کی ہیئت میں ہیں۔ میرے لئے یہ بات تعجب خیز ہے کہ 'دارِ عشق' پر آسمان ادب کے جن چاند سورجوں نے اپنی آرا کی کرنیں بکھیری ہیں ان کی نظر اس طرف کیوں نہیں گئی کہ کوثر نقوی غزل سے مرثیے کی طرف جارہے تھے۔ پہلی نظم حمد باری تعالیٰ سے شروع ہوتی ہے اور ۱۵ بند پر مشتمل ہے۔ شاعر چاہے تو آج بھی یہ پندرہ بند کسی مرثیے کا چہرہ بنا کر مرثیہ آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ دوسری نظم ''پانی'' ہے جس میں حمد اور نعت کے ۹ بندوں کے بعد پانی کی بات چھڑتی ہے۔

۱۰

پانی کے دم سے ہوتے ہیں خوشیوں کے سب نزول
ممنون آب ہی تو ہے فطرت کا ہر اصول
گر ہو نہ یہ تو کوئی کلی بھی بنے نہ پھول
روئے چمن ہو زرد تو قلب چمن ملول
سو کروٹیں بدلتی ہے پانی کی گود میں
روحِ حیات پلتی ہے پانی کی گود میں

۱۶

پانی کا جو حشم ہے، کسی کا حشم نہیں
اس کی لغت میں بیش تو ہے، لفظ کم نہیں
کس کے سرِ حیات پہ اس کا علم نہیں
فرعونیت بھی مانع جود و کرم نہیں
موتی فیض کے نہیں دیتا یہ تول کے
ایسا سخی کہ رکھتا ہے مٹھی کو کھول کے

اور پچیسویں بند سے نظم کا رُخ کربلا کی طرف مڑ جاتا ہے۔

پانی اساسِ زیست ہے تسلیم ہے، مگر — کرب و بلا میں آیا ہے ایسا بھی اک بشر
پانی کی فکر جس کو نہیں دیں پہ ہے نظر — ۲۵ — افکار بے مثال ہیں، اقدام معتبر

دیں کے عوض فرات ملے تو فضول ہے
بچوں کی پیاس اپنا تیمم قبول ہے

لاکھوں سلام فہم شہ تشنہ کام کو — طعنے کی زد سے کیسے بچایا ہے نام کو
ساحل سے بھائی جلد ہٹا لو خیام کو — ۲۶ — کہنے نہ دوں گا میں یہ کسی بدکلام کو

حق کے لئے، نہ دیں کی جوانی کے واسطے
کرب و بلا کی جنگ تھی پانی کے واسطے

اور یہ نظم اپنے آخری بند پر پہنچ کر پوری طرح جادۂ رثا پہن کر مرثیہ بن جاتی ہے۔

پانی سے بے نیاز ہی رکھا حیات کو
پیاسے نے آنکھ بھر کے نہ دیکھا فرات کو

تیسری نظم ''موت'' میں فلسفہ حیات و موت پر گفتگو ہے۔

خوش دلانِ وقت کو رنجور کر دیتی ہے موت — آدمی کو کس قدر مجبور کر دیتی ہے موت
ہر گذارش جس کے نامنظور کر دیتی ہے موت — ۱ — شیشۂ ہستی کو چکنا چور کر دیتی ہے موت

جو بھی پیدا ہے اسے ناپید کر دیتی ہے موت
روح کو برزخ میں لا کر قید کر دیتی ہے موت

یہ نقاب اُلٹے تو ڈر جاتا ہے شدادِ لعیں — رو کے یہ کہتا ہے جب آتا ہے مرنے کا یقیں
دیکھ لوں جنت کہ خوش ہو جائے یہ قلبِ حزیں — ۸ — موت کہتی ہے نہیں، ہرگز نہیں، ہرگز نہیں

کبر و نخوت کی کلائی موڑنے لگتی ہے یہ
نشۂ زعمِ خدائی توڑنے لگتی ہے یہ

اور پھر تصویر کا دوسرا رخ۔ دیندار وں اور حق پرستوں کا موت کے متعلق نظریہ۔

سورۂ جمعہ میں حق نے دے دیا حکم اصول — جو یہودی پیش کرتے ہیں وہ دعویٰ ہے فضول
مطمئن ہے دل تو پھر مرنے سے ہوگا کیوں ملول — ۹ — ہے ولیٔ حق جو ہنس کر موت کو کر لے قبول

شیشہ دل اس کا ہرگز منجلی ہوتا نہیں
موت سے جو بھاگتا ہے وہ ولی ہوتا نہیں

نظم کا آخری اور پندرھواں بند۔

موت کیا ہے ضامن قرب خدائے کل صفات ایسی کشتی جس میں ہے مومن کی خوشبو کی برات
موت کیا ہے جسم کے زنداں سے پیغام نجات موت کیا ہے اصل میں تبدیلی رنگ حیات
لوٹ کر اہل چمن، اپنے چمن میں آگئے
سیر کی، گھومے، پھرے، واپس وطن میں آگئے

اس کتاب کے محترم قارئین فیصلہ کریں کہ کیا اس منزل پر کربلا میں امام حسینؑ اور علی اکبر کے درمیان موت کے موضوع پر گفتگو یاد نہیں آتی جہاں امام حسینؑ پوچھتے ہیں ''بیٹا موت تمہیں کیسی لگتی ہے'' اور علی اکبر جواب دیتے ہیں ''بابا، شہد سے زیادہ شیریں''۔

کوثر نقوی کی پانچویں نظم ''قلم'' ہے۔ جوش کے مسدس (مرثیہ) کے بعد قلم پر کچھ کہنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ کوثر نقوی اس پل صراط سے بہت خوش اسلوبی سے گذرے ہیں۔

اے قلم، تجھ سے یہ رونق بخدا ساری ہے ورنہ تقدیس میں تلوار سے تو بھاری ہے
بزمِ تحریر میں تیری ہی عملدار ہے ارض قرطاس پہ صدیوں سے سفر جاری ہے
تیری جنبش سے تو حالات رقم ہوتے ہیں
تُف ان ہاتھوں پہ جو محرومِ قلم ہوتے ہیں

اور ''دارِ عشق'' کی آخری نظم ''آگ'' ہے جس میں آگ کی ہولناکیوں کا بیان ہے۔

سازِ حدت سے جسے لوری سنا دیتی ہے آگ موت کی آغوش میں اسکو سُلا دیتی ہے آگ
ایک پل میں شمع ہستی کو جلا دیتی ہے آگ برق بن کر آشیانے کو جلا دیتی ہے آگ
ہنستی ہے یہ شکوۂ قلب تپاں سننے کے بعد
جھومنے لگتی ہے بلبل کی فغاں سننے کے بعد

اور آخری بند کربلا پر ختم ہوتا ہے۔

وہ محمدؐ کا نواسہ اس سے کیا مجبور تھا ہر قضائے رب ہو نافذ یہ اسے منظور تھا
ورنہ ہر عنصر جدار حکم میں محصور تھا آگ تھی قبضے سے باہر اور نہ پانی دور تھا

پیاس کی شدّت سے بچوں کو مچلنا چاہئے
مرضیٔ ربّ ہے تو پھر خیموں کو جلنا چاہئے

'دارِ عشق' کی ساری نظمیں کربلا سے مسلسل ہیں۔ غزلیات کے مجموعے میں شامل نہ ہوتیں اور رثائی ادب کے حوالے سے شائع ہوتیں تو مرثیہ کے زمرے میں شمار کی جاتیں۔

کوثر نقوی کا دوسرا مجموعۂ کلام ''لب کوثر'' ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا۔ جس میں ۱۹ مناقب، ۱۰ نوحے دو مسدس جن میں سے ایک کا عنوان '' آگ'' ہے اور دوسری '' رخصت عباس'' ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ '' دارِ عشق'' میں کوثر نقوی نے جو کچھ کہا تھا۔ اسے انہوں نے کافی نہیں سمجھا اور ان کے اندر جو آگ تھی اسے وہ باہر لانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک بار پھر انہوں نے '' آگ'' روشن کی اور '' دارِ عشق'' میں جو آگ تھی اس سے فکری طور پر مسلسل کیا۔

آگ کا ہو ذکر تو ہر دل کو تابانی ملے ۔۔۔ میرے لفظوں کو میرے مالک وہ تابانی ملے
تیغ حُسنِ آرزو کو آگ سے پانی ملے ۔۔۔ ۱ ۔۔۔ چشمۂ تخیّل کو کوثر کی جولانی ملے
عرش فن پر فکر چمکے ماہ تاباں کی طرح
لفظ مجھ کو پیار سے آواز دیں ماں کی طرح

وزن میں ہلکی بھی ہے اور کیف میں بھاری بھی ہے ۔۔۔ آگ وجہ کیف بھی ہے، کیف آزادی بھی ہے
آگ مٹی کی طرح نوری بھی ہے، ناری بھی ہے ۔۔۔ ۲ ۔۔۔ منبع آفات اس کی ایک چنگاری بھی ہے
شکل ابلیسی میں ڈھل جائے تو دوزخ ہے نصیب
شکل زعنصر میں بدل جائے تو جنت ہے قریب

موت سے ہوتا ہے طاری کیا امامت پر زوال ۔۔۔ یہ حقیقت ہے تو پھر پیدا یہ ہوتا ہے سوال
اچھا سنیے غور سے سُنیے میرا مثبت خیال ۔۔۔ ۵ ۔۔۔ جب جلے خیمے تو کیا بے بس تھے شاہِ ذوالجلال
آگ سے مولا میرا ہرگز نہیں مجبور تھا
مرضیٔ ربّ کی حدوں میں تھا وہ چونکہ نور تھا

اس کے بعد کوثر نقوی نے '' دارِ عشق'' کی آگ سے پورا بند اس آگ میں شامل کیا ہے۔

ہر قضائے ربّ ہو نافذ یہ اسے منظور تھا ۔۔۔ وہ رضا کہنے والا، اس لئے مجبور تھا
آگ تھی قبضے سے باہر اور نہ پانی دور تھا ۔۔۔ ۶ ۔۔۔ ورنہ ہر عنصر جدا بر حکم میں محصور تھا

پیاس کی شدت سے بچوں کو مچلنا چاہئے
مرضیٔ رب ہو تو پھر خیموں کو جلنا چاہئے

اور پھر اس کے بعد 'رتا ہی رتا'۔ 'آنسو ہی آنسو' آہیں ہی آہیں'۔

باب زہرا سے اٹھی تھی جب صدائے شور و شین آنسوؤں میں منقلب ہوتا تھا سب کے دل کا چین
چشم حیرت سے اُسے تکتے تھے شاہ مشرقین ۷ کہہ دیا تھا کاتب تقدیر نے اس دن حسینؑ
معرض ہر امتحان میں ہم تجھے لے آئیں گے
باب زہراؑ کے یہ شعلے کربلا تک جائیں گے

باب زہرا کے وہ شعلے کربلا تک آگئے ایک دکھیاری کے دل کو لاکھ صدمے کھا گئے
مر کے اٹھارہ بنو ہاشم اسے تڑپا گئے ۸ ہر طرف شام غریباں کے اندھیرے چھا گئے
صبر کی منزل میں یہ بالکل اخی بننے کو ہے
کربلا میں ثانیٔ زہرا علیؑ بننے کو ہے

اس کے بعد میں تین بند مصائب کے ہیں۔ سچ پوچھیئے تو کوثر نقوی نے ۱۵ بند میں پورا

مرثیہ کہہ دیا ہے۔

سن سکو گے تم بحدّ انتہا پہنچی ہے آگ
عمو! اب گہوارۂ اصغر تک آ پہنچی ہے آگ

اور لب کوثر میں ''رخصت عباسؑ'' کے نام سے جو مسدّس ہے وہ حضرت عباسؑ کے احوال کا مرثیہ ہے۔ اس کی ابتداء بہت ABRUPT اور بے سیاق و سباق ہے اور انتہا حضرت عباسؑ کے بعد اہل حرم کی اسیری اور قید خانے میں سکینہ کی وفات پر ہوتی ہے یہ دس بند مصائب کے ہیں لیکن مصائب صرف رونے رلانے کے لئے نہیں بلکہ فکر انگیزی کے ساتھ مصائب قلمبند کئے گئے ہیں۔

ہاں بہت دور تھا زنداں سے مقتل کوثر اور اس احساس سے بچی رہی پیہم مضطر
آرزو موت کی کرتی رہی وہ خستہ جگر کوچ تو کر گئی اک روز وہ دنیا سے مگر
جتنی دیواریں تھیں فرقت کی گرا دیں اُس نے
دوریاں مقتل و زنداں کی مٹا دیں اُس نے

کوثر نقوی نے مرثیہ کہے ہیں۔ مضمون کی طوالت مانع ہے کہ کسی اور مرثیہ پر تبصرہ

کیا جائے لیکن کیا یہ کافی نہیں کہ غزلیات کے مجموعے میں شامل نظمیں بھی مرثیہ کی تمہید ہیں تو مراثی معیار کی کس بلندی پر ہوں گے۔

☆☆☆☆☆

نیرؔ اسعدی:- (کراچی)

ولادت: ۱۵ر جولائی ۱۹۵۴ء

نام: آغا نیرؔ علی، تخلص: نیرؔ۔ غزل میں سلسلہ تلمذ جناب دردؔ اسعدی سے ہوا تو قلمی نام، نیرؔ اسعدی قرار پایا۔ والد کا اسم گرامی آغا محمد اصغر اور دادا کا اسم گرامی مولانا احمد حسینؒ۔ تعلیم میٹرک (۱۹۷۰ء) گورنمنٹ بوائز اسکول جہانگیر روڈ کراچی۔ ڈپلوما گورنمنٹ پولی ٹیکنیک کالج کراچی (۱۹۷۳ء)۔ بی۔ اے (۱۹۷۷ء) اور ایم۔ اے (۱۹۹۲ء) کراچی یونیورسٹی سے کیئے۔

نیرؔ اسعدی کے مورثِ اعلیٰ ہمایوں کی فوج کے ہمراہ ہندوستان آئے۔ اپنے وطن مالوف کے سلسلے میں نیرؔ اسعدی نے دو شہروں کے نام لکھے ہیں۔ بلند شہر (یو۔ پی) اور جے پور راجستھان۔ بلند شہر اور جے پور کا تعلق اس وقت سمجھ میں آجاتا ہے جب یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کے دادا جان کا ۱۹۲۹ء میں لسانیات کے استاد کی حیثیت سے نارمل اسکول جے پور میں تقرر ہوا اور وہ یو۔ پی سے جے پور آ گئے۔ اور اس طرح ان کے والد گرامی نے بھی مہاراجہ کالج، جے پور سے ۱۹۴۵ء میں بی۔ اے کیا۔ گویا یہ خاندان راجستھان میں آباد ہو گیا تھا اور تقسیم ہند کے بعد پاکستان (کراچی) آ گیا۔ نیرؔ اسعدی کے والد گرامی نے محکمہ تعلیم میں بحیثیت استاد ملازمت شروع کی۔ درجہ بدرجہ ہیڈ ماسٹر اور انسپکٹر آف سکولز کے منصب تک پہنچے۔ ۳۷ برس کی ملازمت کے بعد باعزت طور پر ریٹائر ہوئے اور تادم تحریر (الحمد اللہ) سعادت مند اولاد کے سروں پر سایہ فگن ہیں۔

نیرؔ اسعدی کے دادا جان علم عروض کے ماہر تھے اور شعر کہتے تھے۔ نیرؔ نے لکھا ہے کہ انہوں نے جے پور میں قصائد سلام اور نوحے کہے تھے اور میر انیسؔ کے کلام پر نظمیں بھی کہی تھیں لیکن ہجرت کے وقت سارا کلام ضائع ہو گیا۔ نیرؔ اسعدی کے چھوٹے بھائی آغا اکرام علی انجینئر بھی شاعر تھے۔ اپنی بیماری کے ایام میں آغا اکرم علی نے آخری شعر کہا تھا جو آج نیرؔ اسعدی کی یادوں کا سرمایہ ہے۔

جناں میں بھی سجے کی محفلِ مدح و ثنا اکرؔم
خدا کی سربراہی میں، محمدؐ کی صدارت میں

اور ۴ راگست ۲۰۰۱ء کو اکرؔم علی اس محفل حمد و ثنا، میں شرکت کے لئے باغ جناں سدھار گئے۔ اور نیرؔ ان کے والد اور دیگر اہل خانہ کو سوگوار چھوڑ گئے۔

نیرؔ اسعدی نے ۱۹۶۹ء میں (بعمر ۱۵ برس) شعر گوئی کی آغاز کیا۔ ۱۹۷۴ء میں حضرت دردؔ اسعدی سے سلسلۂ تلمذ وابستہ ہوا۔ جنہوں نے غزل گوئی میں نیرؔ اسعدی کی چھ برس تک رہنمائی کی۔ ۱۹۸۰ء میں دردؔ اسعدی کراچی سے حیدرآباد چلے گئے۔ لیکن چھ برس کی رہنمائی نے نیرؔ اسعدی کو خود اعتمادی کی جو روشنی دی وہ انہیں منزل کا راستہ دکھا گئی۔

نیرؔ اسعدی نے ۱۹۸۱ء میں مرثیہ گوئی کا آغاز کیا۔ ان کی شرافت نفسی کہ وہ اس وقت ایک کامیاب مرثیہ گو ہونے کے باوجود یہ مانتے ہیں کہ سب سے پہلے ممتاز مرثیہ نگار سرفراز ابدؔ نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ انہیں ڈاکٹر یاور عباس کے قائم کردہ نو تصنیف مراثی کی محفل میں مرثیہ پڑھنے کی دعوت دلائی اور سرفراز ابدؔ کے توسل سے ہی وہ عظیم مرثیہ گو فیض بھرپوری سے متعارف ہوئے۔ نیرؔ اسعدی کا پہلا مرثیہ "زندگی" تھا۔

زندگی میں ہم کسی شے کی کمی سمجھے نہیں زندگی پائی ہے راز زندگی سمجھے نہیں
نور کب آئے سمجھ میں تیرگی سمجھے نہیں جو سمجھنا چاہیئے تھا وہ ابھی سمجھے نہیں
کون بتلائے ہمیں راز و نیاز زندگی
کون سمجھائے ہمیں تفسیر ساز زندگی

نیرؔ اسعدی نے ۱۹۸۱ء سے ۲۰۰۰ء تک بیس برس میں بیس موضوعاتی مرثیہ کہے ہیں۔ اکیسویں صدی کے پہلے دو برس یعنی ۲۰۰۱ء میں نیر اسعدی مرثیہ نہیں کہہ سکے جس کی وجوہ کچھ ذاتی ہیں۔ ۲۰۰۳ء کا سال ابھی ختم نہیں ہوا کہ انہوں نے اکیسواں مرثیہ کہہ لیا ہے۔ ان کے مرثیوں کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔ (۱) زندگی ۱۹۸۱ء۔ (۲) غم ۱۹۸۲ء۔ (۳) مرثیہ ۱۹۸۳ء۔ (۴) پیاس ۱۹۸۴ء۔ (۵) دین اسلام ۱۹۸۵ء۔ (۶) یقین ۱۹۸۶ء۔ (۷) یاد اور بھول ۱۹۸۷ء۔ (۸) آزادی اور قلم ۱۹۸۸ء۔ (۹) ہوا ۱۹۸۹ء۔ (۱۰) سفینہ اور طوفان ۱۹۹۰ء، (۱۱) انتخاب ۱۹۹۱ء۔ (۱۲) زبان ۱۹۹۲ء۔ (۱۳) آنکھیں ۱۹۹۳ء۔ (۱۴) کشکول ۱۹۹۴ء۔

(۱۵)ظلم اور صبر ۱۹۹۵ء۔(۱۶)خواب ۱۹۹۶ء۔(۱۷)علم اور علمداری ۱۹۹۷ء(۱۸)تحریر ۱۹۹۸ء۔(۱۹)چاند ۱۹۹۹ء۔(۲۰)نعمت ۲۰۰۰ء۔ اور اکیسویں صدی کا پہلا مرثیہ ''سفر''۔ '' آج پھر راہِ سخن میں ہوا آغازِ سفر'' جو اس امر کی ولادت کرتا ہے کہ یہ مرثیہ ان کے اکیسویں صدی کے سفر کا آغاز ہے۔ خدا کرے اکیسویں صدی کا سفر بھی بیسوی صدی کی طرح وسیلۂ ظفر ہو۔

نمونۂ کلام کے طور پر ان کے پہلے مرثیہ کے چہرے کے چند بند:

تیغ کے سائے تلے ہے زیب بستر زندگی بڑھتی ہے خطبے کبھی بالائے منبر زندگی
دار پر معراج پا جاتی ہے اکثر زندگی ۳ ہے کبھی مشغول طاعت زیر خنجر زندگی
جو نہیں سمجھے ابھی تک ابتدائے زندگی
کس کو ہے معلوم کتنی عمر پائے زندگی

ہاں وہ احساسات جن میں زندگی کا راز ہے زندگی کے راستوں میں آگہی کا راز ہے
آگہی کی منزلوں میں بندگی کا راز ہے ۹ بندگی ظلمت کدے میں روشنی کا راز ہے
تیرگی جب روشنی کے سامنے گھبرائے گی
بندگی میں آدمی کی زندگی ڈھل جائے گی

دسویں بند کی بیت ؎

آدمیت جس میں ہو اُس کا حسیں کردار ہے
دامنِ انسانیت میں جذبہ و ایثار ہے

اور یہ ایثار ہے جن کی بقا کے واسطے ہے بقائے حق رضائے کبریا کے واسطے
اور رضائے حق ہے سبطِ مصطفیٰ کے واسطے ۱۱ اور سبطِ مصطفیٰ دین خدا کے واسطے
سیرت وکردار سبطِ مصطفیٰ کے پاس ہے
جذبہ ایثار، سبطِ مصطفیٰ کے پاس ہے

ذات سبطِ مصطفیٰ ہے آدمی میں انقلاب یا یہ کہہ لیجیے جہانِ سادگی میں انقلاب
روشنی خود ہے سراپا زندگی میں انقلاب آپ نے پیدا کیا ہے زندگی میں انقلاب
جب لہو سے شاہ دیں کے جگمگائی زندگی
کربلا نے اپنے سینے سے لگائی زندگی

نیرّ اسعدی اپنے مراثی کے عنوانات سے انصاف کرتے ہیں۔ ان عنوانات میں ایک مقصدیت ہے۔ وہ اپنے مقصد کو اختصار سے بیان کرتے ہیں۔ زیادہ تر چہرے کے ابتدائی بندوں میں ان کی مقصدیت جھلکتی نظر آتی ہے۔ اس کی ایک مثال ان کا بارہواں مرثیہ ''زبان'' ہے جس کے ابتدائی دو بند (یعنی دوسرا اور تیسرا بند) ہی مقصد کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔

زبان قول بھی، اقرار بھی، بیان بھی ہے　　زبان نطق بھی، گفتار بھی، لسان بھی ہے
زبان وعدہ بھی، وعدے کی پاسبان بھی ہے　۲　زبان بندۂ و خالق کے درمیان بھی ہے
ادا میں اپنی کڑکتی کمان رکھتا ہے
جو بے زبان ہے وہ بھی زبان رکھتا ہے

زبان اپنی ہمیشہ رہی اصول کے ساتھ　　زباں کے پھول کھلے ہیں ولا کے پھول کے ساتھ
زباں کا خاص تعلق رہا ہے رسولؐ کے ساتھ　۳　یہ ایک وعدہ محمدؐ کا ہے بتولؑ کے ساتھ
زبان احمدؐ مرسل کی پاسداری ہے
خدا کے فیض سے ذکرِ حسینؑ جاری ہے

مرثیہ نمبر ۱۸ ''تحریر'' آج تحریر کو عنوان سخن کرتا ہوں'' کے بھی صرف (۲) دو بند درج ذیل ہیں۔ ایک بند میں عصری حسیت اور دوسرے بند میں مقصدیت کی نشاندہی ہے۔

کام تحریر کا ناخن سے لیا جاتا تھا　　پر سے خامے کا بھی اک کام لیا جاتا تھا
شاخ کو بہر قلم کاٹ دیا جاتا تھا　۵　دامنِ فنِ انہیں خاموں سے سیا جاتا تھا
دور حاضر میں یہ خامے کا بدل ہونے لگا
اب شعاعوں سے کتابت کا عمل ہونے لگا

جب مورخ کا قلم ہوتا ہے کاغذ پہ رواں　　واقعہ ہوتا ہے الفاظ کے چہروں سے عیاں
حرف بن جاتے ہیں گذرے ہوئے لمحوں کی زباں　　چشمِ بینا کو نظر آتا ہے ماضی کا سماں
ایسے تاریخ کتابوں میں جو گھر کرتی ہے
ساتھ تحریر کے تاریخ سفر کرتی ہے

قدیم مرثیہ ہیں ذوالفقار کا ذکر ہوتا ہے اور یہ ذکر عام طور پر تلوار کی دھار، تلوار کی کاٹ تلوار کی توصیف و تعریف میں ہوتا ہے۔ نیر اسعدی کے ہاں بھی یہ روایت برقرار ہے لیکن اپنے

مرثیہ ''زبان'' میں تلوار کا ذکر مصائب میں کیا ہے۔ منظر نامہ یہ ہے کہ علی اصغر کا ننھا سا لاشہ حسینؑ کے ہاتھوں پر ہے۔ امام مظلوم تلوار سے ننھی سی قبر کھودنا چاہتے ہیں۔ تلوار فریاد کرتی ہے۔

علیؑ شہید ہوئے اور میں رہی خاموش — حسنؑ تڑپتے رہے اور میں رہی خاموش
خیام شاہ جلے، اور میں رہی خاموش — ستم کے تیر چلے اور میں رہی خاموش

ہے مجھ سے پھر بھی تقاضہ کہ حد صبر بنے
میری زباں سے اک بے زباں کی قبر بنے

مجھے مدینے سے اس دن کو لائے تھے آقا — کہ بے زباں کی تربت بنادوں وادیلا
مدینے جاؤں گی کس منہ سے اے شہِ والا — ہے منتظر وہاں اصغر کی فاطمہ صغراء

مجھے تو شرم بہت آئے گی مدینے میں
مجھے اُتار دیں اب حرملا کے سینے میں

مجال کیا کہ جو آقا سے میں کلام کروں — میں کربلا کے محمدؐ کا احترام کروں
مگر جو کام ہے میرا وہی میں کام کروں — کہ فوج شام کا میدان میں قتلِ عام کروں

لحد نہ مجھ سے بنائیں، یہ کام لیں مولا
کہ بے زبان کا اب انتقام لیں مولا

مرحبا نیر اسعدی مولا حسینؑ کی تلوار (ذوالفقار) کی تجسیم سے آپ نے جو کام لیا ہے وہ رثائی ادب کی آبرو بڑھاتا ہے۔

بین یا مصائب کے بیان میں بھی نیر اسعدی نے مظلوم بیبیوں کی عظمت وعصمت کی کو پیش نظر رکھا ہے۔ منظر نامہ یہ ہے کہ امام حسینؑ جو خیمے سے علی اصغر کو پانی پلانے کے لئے لے کر نکلے تھے۔ خون میں نہائے خالی ہاتھ واپس آتے ہیں۔ ماں اپنے بچّے کے بارے میں پوچھتی ہے۔

حسینؑ پہنچے، تو بولی، کدھر گئے اصغر'' — جھکا کے سر کہا شہ نے کہ ''مرگئے اصغر''
کہا یہ ماں نے کہ ''تم کیا گذر گئے اصغر'' — ہماری گود کو ویران کر گئے اصغر

تمہیں سکون سے مقتل میں نیند آئے گی
مگر یہ کوکھ جلی کیسے چین پائے گی

تمہاری یاد میں اب دھوپ میں رہے گی ماں — کہ ہوگا آنکھوں سے تا حشر سیلِ اشک رواں
کہاں تلک کروں نیّرؔ میں ان کے بین بیاں ۴۳ — ہے ایک حشر بپا، روک لے قلم کی زباں

قلم کو آہ و فغاں بے زباں نے بخشی ہے
یہ مرثیہ کی زباں بے زباں نے بخشی ہے

مرثیہ زبان سے شروع ہوا تھا۔اور زبان پر ختم ہوا ہے۔فضائل، تاریخ، اور مصائب میں کہیں مرثیہ موضوع سے دور نہیں ہوا ہے۔اس کو کہتے ہیں قدرت شعر گوئی، نیّر اسعدی جس سے مالا مال ہیں —

نیّرؔ اسعدی کا پہلا مجموعۂ کلام 'لغت ہی لغت'۔ ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا ہے۔ان کے مراثی کا مجموعہ ''کشکول نیّرؔ'' ہے۔

☆☆☆☆☆

جمیل ادیب:- (کراچی)

پیدائش ۱۹۵۴ء

نام سید جمیل احمد، آبائی وطن لکھنؤ۔ممتاز مرثیہ گو جناب کوثرؔ الہ آبادی نے جمیلؔ ادیب کا مختصر تعارف کرایا ہے۔جمیل احمد کے والد گرامی کا نام سید فضل احمد اور تخلص ادیبؔ بتایا گیا ہے۔جمیل احمد نے بھی ادیبؔ تخلص رکھا ہے۔ان کے بزرگوں میں علامہ ناطقؔ لکھنوی کا اسم گرامی جمیلؔ ادیب کا روشن ادبی حوالہ ہے۔جمیل ادیبؔ کے والد ۱۹۴۸ میں ہجرت کر کے پاکستان آگئے تھے۔ ۱۹۶۲ء میں ان کا کراچی میں انتقال ہوا۔

جمیل ادیبؔ حنفی العقیدہ بتائے گئے ہیں۔ ۱۹۸۰ء سے مرثیہ گوئی کر رہے ہیں۔ان کے کلام میں تولا کی روشنی اور غم حسینؑ کا اُجالا نظر آتا ہے۔جمیلؔ ادیب نے حضرت ناظرؔ بدایونی سے ابتدائی اصلاح لی۔شعر و ادب میں ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ترقی پسند شعراء کو انہوں نے بہت توجہ سے پڑھا ہے۔بالخصوص روسی اور فرانسیسی ترقی پسند ادب انگریزی کے زبان کے ذریعہ مطالعہ کیا ہے۔شاعری کی ہر صنف پر طبع آمائی کی ہے۔نثر میں افسانے خاکے اور مضامین لکھے ہیں۔کوثرؔ نقوی نے جمیلؔ ادیب کے آٹھ مرثیوں کا ذکر کیا ہے۔انہوں نے اپنے ایک مرثیے کا آغاز یوں کیا ہے ؎

''حسرت یہ ہے کہ میں بھی کوئی مرثیہ لکھوں''

مصرعہ بتا رہا ہے کہ یہ اُن کا پہلا مرثیہ ہوگا۔ اس لئے کہ اگر اس سے پہلے انہوں نے کوئی مرثیہ کہا ہوتا تو مرثیہ گوئی کی حسرت نہ ہوتی — اُن کے پہلے مرثیے کا مصرعِ اوّل جس حسرت کا اعلان کر رہا تھا وہ دعا بن گیا اور اس دعا کو شرف قبولیت عطا ہوا کہ جمیل ادیب نے کم سے کم آٹھ مرثیے کہے۔ اُن کے آٹھویں مرثیے کا آغاز شہادت حسینؑ کے بعد کے احوال سے ہوتا ہے۔ "جب ہو چکے شہید شہنشاہِ بحر و بر" اس مرثیے کے آٹھ بند جمیل ادیب کے نمونہ کلام کے طور پر درج ذیل ہیں جو دربار یزید میں یزید کی ہرزہ سرائی پر سیدہ زینبؑ کے ردِّ عمل کا منظر نامہ ہے۔ دربار میں امام حسینؑ کا سر لایا جاتا ہے ۔

اس واقعے کو دیکھیں سیاق و سباق میں　　لایا گیا حسینؑ کا سر اک طباق میں
وہ حسنؑ تھا کہ عکس رسالتمآب تھا
چہرہ تھا یا کہ طشت میں اک آفتاب تھا

درباریوں کی خیرہ ہوئی جاتی تھی نگاہ　　بیٹھے تھے سر جھکائے ہوئے سارے روسیاہ
تھا سامنے حسینؑ کے شرمندہ کجکلاہ　　تاریخ میں یہی تو ہے معراجِ لا الہ
اک نخلِ بے خزاں تھا سرِ رنگ و بو حسینؑ
بے آبرو یزید تھا اور سرخ رُو حسینؑ

چھو کر چھڑی کی نوک سے دنداں حسینؑ کے　　الفاظ یہ دریدہ دہن نے ادا کئے
رسوا ہوئے حسینؑ، ظفر مند ہم ہوئے　　آثار سارے آلِ نبی کے مٹا دیئے
اب میرے راستے میں کوئی مرحلہ نہیں
مجھ کو مخالفت کا بھی خطرہ ذرا نہیں

لوگو سنو، یہ سب بنی ہاشم کا ڈھونگ تھا　　اُترے نہ جبرئیل و وحی، نے ملائکہ
اجداد دیکھتے یہ میرا کاش معرکہ　　بدلہ یہ کیسا اب بنی ہاشم سے لے لیا
میں نے نشیمنِ بنی ہاشم جلادیا
گویا علیؑ کا نام بالآخر مٹا دیا

یہ سن کے بیٹی حیدر کرار کی اٹھی　　چہرے پہ اپنے چادر تطہیر تان لی
آواز تھی کہ روح ستمگر لرز گئی　　ایسا لگا زبان علیؑ بولنے لگی

بولیں زباں سنبھال ذرا اپنی نابکار
ایسا نہ ہو کہ غرق کرے تجھ کو کردگار

جو دین، دینِ حق ہے علامت اسی کی ہوں
شبیر کی بہن ہوں تو بیٹی علیؑ کی ہوں
بزمِ شبِ سیہ میں بقا روشنی کی ہوں
جو سرورِ اُمم ہیں، نواسی انہی کی ہوں
آگاہ جن وانس ہیں ان کے مقام سے
نام ان کا لے خبیث ذرا احترام سے

اس عارضی ظفر کو مقدر نہ جاننا
آلِ نبی سے اپنے کو بہتر نہ جاننا
سترّ دو تن کے خون کو کمتر نہ جاننا
قسمت کو اپنی بخت سکندر نہ جاننا
پروردگار ایک اشارہ اگر کرے
اس تخت سے پھسل کے گرے اور تو مرے

دینِ نبی کی راہ میں ہیں سرخرو حسینؑ
آنکھیں اٹھا کے دیکھ کہ ہیں کُو بہ کُو حسینؑ
جنت مکیں ہیں آج کٹا کر گلو حسینؑ
کیا کہہ رہے ہیں دیکھ تیرے روبرو حسینؑ
مانا ابھی ستم کا تسلسل رُکا نہیں
سر کٹ گیا حسینؑ کا لیکن جھکا نہیں

زینبؑ کی تھی زباں! یہ لہجہ علی کا تھا
کابیدہ چہرہ شرم سے ہر اک شقی کا تھا
کیا رعب اور جلال وہ بنتِ نبی کا تھا
گویا کہ اک دھماکہ کسی روشنی کا تھا
زینبؑ کے اس خطاب نے سکّے بٹھا دیے
دربار میں یزید کے چھکے چھڑا دیے

جمیل ادیب کی مرثیہ گوئی، ان کے دل میں محمدؐ وآلِ محمد کی محبت، اور تاریخِ کربلا کے باقاعدہ مطالعہ پر دلالت کرتی ہے۔ان کے مراثی ان لوگوں کے لئے ایک سوالیہ نشان ہیں جو مرثیہ گوئی کو فرقوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔آفرین جمیل ادیب، صد آفرین۔محمدؐ وآلِ محمدؐ کے احوال رقم کرنے کی سعادت مبارک ہو۔

☆☆☆☆☆

اشرف جارچوی:- (کراچی)

ولادت ۱۹۵۶ء

نام: سید سبط محمد، تخلص اشرفؔ، وطن مالوف جارچہ (یو پی)۔ اس حوالے سے جارچوی لکھتے ہیں۔ جائے ولادت کراچی، والد گرامی سید ولی محمدؒ۔ دبستان کراچی کے مرثیہ نگاروں میں اشرفؔ جارچوی کا نام ایک روشن اور معروف نام ہے۔ انہوں نے ۱۹۸۶ء میں شعر گوئی شروع کی اور بیس برس کے عرصے میں پختہ گو مرثیہ نگارں میں ان کا شمار ہونے لگا ہے۔ روز مرّہ انتہائی مصروف زندگی گذار رہے ہیں۔ اپریل ۲۰۰۳ اور جولائی ۲۰۰۳ کے درمیان ہمارے خطوط اور کئی بار ٹیلیفون پر وعدہ کرنے کے باوجود اپنے کوائف عنایت نہ کر سکے البتہ اتنا کرم ضرور کیا کہ ایک مرثیہ ارسال فرمایا شاید اس لئے کہ اشرفؔ جارچوی اور گوہرؔ جارچوی ان شعراء کرام میں شمار ہوتے ہیں جو پہلے ہی اتنے متعارف ہیں کہ مزید تعارف شاید ان کی نظر میں کار زیاں ہوتا۔ بہر حال اُن کی عنایے کے تشکّر کے ساتھ نمونہ کلام کے طور پر ان کے مرثیہ کے چند بند درج ذیل ہیں ۔

کلکِ تخلیق نے لکھا جونہی عنوانِ حیات　　لب کُن سے ہوا جاری وہیں دیوانِ حیات
خاک و آتش سے اُبھرنے لگا امکانِ حیات　۱　پھر تو بنتے رہے زنداں پس زندانِ حیات

مختلف رنگ بھرے وقت کے پیمانوں میں
زندگی ہے کہ سفر کرتی ہے زندانوں میں

خوبرو کتنی ہے یہ لیلیٰؑ زندانِ حیات　　جس کے آنچل پہ بسر کرتی ہے تاروں بھری رات
جس کی شادابی سے صبحوں کو ملی ہے خیرات　۲　جس کے معنی کے لئے تنگ ہے دامانِ لغات

خوشبوئے گُل بھی پریشان ہے آزادی پر
رات بھر روتی ہے شبنم اسی بربادی پر

قفسِ گُل سے رہا ہوگئی خوشبو جیسے　　دشت بے آب میں رم خوردہ ہو آہو جیسے
بال بکھرائے شبِ حسن لبِ جُو جیسے　۳　صدفِ چشم سے گرنے لگیں لُو لُو جیسے

اُف یہ ویرانی کا عالم، یہ رہائی توبہ
جس رہائی سے کرے ساری خدائی توبہ

مرثیہ میں جو غزل قید ہوئی ہے خود سے　　بلبلِ حُسن یہاں صید ہوئی ہے خود سے

چشم فن ساغر جمشید ہوئی ہے خود سے　۴　پید یہ خواہش ناپید ہوئی ہے خود سے
مرثیہ ہو کہ غزل، آپ ہی کی شان میں ہے
طائر فن بھی مقید اس زندان میں ہے

قید خانے تو بہت عالم امکان میں ہیں　　یعنی زندان بہت ایک ہی زندان میں ہیں
صرف زنجیریں ہی تخلیق کے سامان میں ہیں　۸　طوق خواہش کے ہر اک گردن ارمان میں ہیں
قیدِ افکار کا دیوان اٹھا لایا ہوں
کشتِ تخلیق سے زندان اُٹھا لایا ہوں

آؤ زندانِ موودت کے اسیروں سے ملیں　　زندہ دل، زندہ نظر، زندہ ضمیروں سے ملیں
یدِ قدرت کے تراشے ہوئے ہیروں سے ملیں　۹　فقر پر فخر جنہیں ایسے فقیروں سے ملیں
مطمئن قیدِ مشاکل میں نظر آتے ہیں
یہ تو آنکھوں میں نہیں دل میں نظر آتے ہیں

اے خوشا الفت شبیرؑ کا زندانی ہوں　　اپنے ہاتھوں میں لئے، پرچم ایمانی ہوں
موت دیتی ہے بقا جس کو میں وہ فانی ہوں　۱۱　روز عاشورہ سے میں چاک گریبانی ہوں
یہ وہ زنداں ہے جسے خلدِ بریں کہتے ہیں
یہ وہ زنداں ہے جہاں صرف حسیں رہتے ہے

اے حسینانِ عزا قیدِ بکا میں رہنا　　گلشن فاطمہ زہرا کی دعا میں رہنا
زندگی گذرے کہیں، کرب وبلا میں رہنا　۱۲　اسی زندانِ عقیدت کی فضا میں رہنا
قید ہستی ہیں عبادات کو کامل رکھنا
غم شبیرؑ کے قبلے کی طرف دل رکھنا

اشرؔف جارچوی نے اس مرثیہ میں قید'' اور''زندان'' سے تعلق ٹوٹنے نہیں دیا۔ کہیں یہ قید زحمت ہے اور کہیں نعمت خداوندی۔ کہیں زنداں قید خانہ ہے اور کہیں یہ زنداں رشکِ فردوسِ عبادت ہے۔

رشک فردوس عبادات یہی زنداں ہے　　عظمت و اوجِ کمالات یہی زنداں ہے
عالم کثرتِ آیات یہی زنداں ہے　۱۳　مرکزِ ارض د سماوات یہی زنداں ہے

صدف نصرتِ اسلام کا دُر کہتے ہیں
اس زندان کے قیدی کو تو حُر کہتے ہیں

ایسے آسان نہیں قید موّدت کے حصول اسی زندان میں بنتے ہیں شریعت کے اصول
اس زنداں کے نگہبان، خدا اور رسول ۲۴ رحمت حق کا اسی قید میں ہوتا ہے نزول
نور کی کڑیوں سے تشکیل ہے زنجیر یہاں
حریت رہتی ہے چُپ صورتِ تصویر یہاں

ہر چند کہ مرثیے کے بند ایک دوسرے سے اتنے مربوط ہیں کہ تدوین آسان نہیں ہے پھر بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ تدوین میں ربط مضمون مجروح نہ ہو۔ تیسرے بند میں قید موّدت کے اصولوں کی بات کی گئی ہے جو اصول نوری کی کڑیوں سے تشکیل زنجیر کرتے ہیں۔ اور جہاں حرّیت صورتِ تصویر چُپ رہتی ہے۔ اس کے فوراً ہی بعد گریز بعدِ گریز کے تحت موّدت کے اسیروں کا دنیاداری اور ہوس کے قیدیوں سے تقابل کیا جاتا ہے۔

شادمانی تو ہے زندان شہادت کی اسیر اسی زندان سے آتی ہے صدائے تکبیر
یعنی اس قید سے آزاد ہیں دنیا کے شریر ۲۵ ایسے آزاد جو پہنے ہوئے طوقِ تقصیر
ٹھوکریں کھاتے پھریں گے یہ تلافی کے لئے
وا نہیں ہوگا درِ توبہ معافی کے لئے

خود کو آزاد سمجھتے ہیں یہ ظالم غدّار بدعمل، اہلِ ہوس، کفر و ضلالت کے شکار
وہ خزاں دیدہ نسب جن سے رہی دور بہار ۲۶ پیشِ خاصان خدا ان کو ہے طاقت کا خمار
یہ نشہ ٹوٹ کے رہ جائے گا زندانوں میں
سلطنت روئے گی جب چیخ کے ایوانوں میں

کیا سمجھتے ہیں یہ زندان حکومت کے فقیر ہوس و حرص و ہلاکت سے بنا جن کا خمیر
یہ شیاطین کی اولادیں شریر ابن شریر ۲۸ کوئی ہے ابنِ زیاد اور کوئی ابنِ کثیر
کار کثرت پہ جو دیکھا یہ تفاخر نکلا
بدنسب لوگوں کے اس غول سے اب حُر نکلا

ماہرانہ تخلیقی صلاحیتوں کے سہارے اشرفؔ جارچوی اس مرثیہ کو حُر کی شہادت، ذکرِ عباسِ علمدار کی منازل سے گذرتے ہوئے شہادتِ حسینؑ اور بعد شہادتِ حسینؑ کی منزل تک لاتے ہیں۔

گُل ہوا دشت میں عاشور کے دن یہ بھی دیا　　از زمیں تابہ فلک گہرا اندھیرا چھایا
دشت میں خوشیاں منانے لگی فوج اعدا　۴۱　بے اماں ہوگئی پردیس میں بنتِ زہرا
آگ خیموں میں لگی، آلِ نبی قید ہوئی
چھن گئی سر سے ردا بنتِ علی قید ہوئی

شمر نے بالی سکینہ کو طمانچے مارے　　دُر اُتارے نہیں کانوں سے، گہر کھینچ لئے
پاس وحسرت سے سکینہ نے کہا عابدؑ سے　۴۳　چچا عباسؑ کو دریا سے کوئی بُلوادے
کیوں ستاتے ہیں ستمگار بتائے کوئی
میرے بابا میرے بھائی کو بلائے کوئی

اہل حرم قید ہوئے۔ سکینہ قید ہوئی۔ قید خانے میں سکینہ کا دم گھٹ گیا۔ عابد بیمار نے زندان میں سکینہ کی قبر بنائی اور بچی کو دفن کر دیا۔۔ یہ سارے واقعات اشرفؔ جارچوی نے نظم کئے ہیں۔ مرثیے کا اختتام جہاں دردناک ہے وہاں اشرفؔ جارچوی کے فن کی پختگی کا ثبوت بھی ہے کہ مرثیہ قید اور زندان پر ختم ہوتا ہے۔

جب رہائی ملی، ماں بولی سکینہ اٹھو　　دیکھو جاتی ہوں وطن، آج میرے ساتھ چلو
شمر لوٹاتا ہے گوہر اُٹھو گوہر پہنو　۵۴　یاد کرتی تھی بہن کو چلو صغرا سے ملو
قید میں چھوڑ کے تم کو جو میں گھر جاؤں گی
بِن تمہارے تو قدم رکھتے ہی مرجاؤں گی

سب رہا ہوگئے۔ زندان میں رہی وہ تنہا　　دل میں جس بچّی کے ارمان رہائی کا تھا
شام جانا ہو اگر آپ کا تو سنئے گا　　اب بھی زندان سے اشرفؔ یہی آتی ہے صدا
میرے بابا میرے عمّو میرے بھیا آؤ
قید میں تم کو بلاتی ہے سکینہ آؤ

☆☆☆☆☆

احمد نوید:-　　(کراچی)

ولادت اکتوبر ۱۹۵۸ء

کراچی میں پیدا ہوئے۔ کراچی میں پلے بڑھے۔ کراچی میں تعلیم پائی اور کراچی ہی میں مرثیہ کی فضا سے متاثر ہوئے۔ نئی نسل بالعموم جن راہوں پر جا رہی ہے احمد نوید نے ان راہوں کو پسند نہیں کیا اور فنا کے راستوں پر سرگرم سفر ہونے کی بجائے بقا کی راہوں کو اپنا لیا۔ شاعری کی تو ان کی مدح کی جو مدح کے قابل ہیں۔

پہلا مرثیہ ''وحدت الوجود'' ۱۹۹۰ء میں کہا۔ علامہ جمیل مظہری نے مرثیے کے بند میں تیسرے مصرع کو قافیہ کی پابندی سے آزاد کرنے کا تجربہ کیا تھا۔ اس تجربے کو سراہا گیا۔ لیکن اس کی پیروی چند شعراء نے کی جن میں پروفیسر مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر ہلال نقوی، تسنیم نقوی اور علامہ جمیل مظہری کی نواسی تصویر فاطمہ کے نام آتے ہیں۔ احمد نوید نے بھی مرثیہ گوئی میں اس روش کو اپنایا۔ ان کے پہلے مرثیے کا موضوع ''وحدت الوجود'' حیرت انگیز طور پر دشوار موضوع ہے جو ایک نئے شاعر کے لئے جو پہلا مرثیہ کہہ رہا ہو دشوار تر ہو جاتا ہے۔ لیکن احمد نوید کا مرثیہ اس موضوع کے ساتھ انصاف کرتا نظر آتا ہے۔ بہ الفاظِ دگر احمد نوید نے اس مشکل عنوان سے انصاف کیا ہے۔ یہ مرثیہ ''لہو لہو کہکشاں'' جلد اوّل زیر اہتمام ادارۂ تقدیسِ قلم کراچی ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا ہے۔

''میں'' سے آغاز ہوئی خلوتِ بزمِ امکاں　　''میں'' کے اس آئینہ خانے کا ہے ''میں'' ہی یزداں

''میں'' نے ظاہر کیا خود کو تو بنے ارض و سما　۱　''میں'' ہی آدم کی شروعات ہے ''میں'' ہی شیطاں

''میں'' نہ ہوتی تو نہ ہوتا کہیں اشیا کو دُرود

''میں'' کا آئین ہی ہے شرحِ عدم شرحِ وجود

عیب موجود جہاں ہے وہاں بے عیب ہے ''میں''　　دوسرا ''میں'' سا نہیں کوئی بھی لاریب ہے ''میں''

کیا کرشمہ ہے فسوں کاری و پُر کاری کا　۶　کہ نظر آتی ہے ہر شے میں مگر غیب ہے ''میں''

اتنے بکھراؤ میں موجود ہے ترتیب کا حُسن

دیکھ اے چشم یہ ہے غیب کی تہذیب کا حُسن

''میں'' کی خلوت میں گمِ آفاق کی تنہائی ہے　　''میں'' کی خلوت تو خود اک انجمن آرائی ہے

''میں'' کے ظاہر سے پہاڑوں کی سی ہیبت ہے عیاں　۸　''میں'' کے باطن میں سمندر کی سی گہرائی ہے

"میں" جب آفاق کے پیالے سے چھلک جاتی ہے
ذات کے آئینہ خانے سے چھلک جاتی ہے

دل اگر میں ہے تو دل رب ہے، کہ رب خود "میں" ہے "میں" مسبب ہی نہیں "میں" کا سبب خود "میں" ہے
"میں" ہے کیا عشق جو کرتے ہیں وہ سب جانتے ہیں ۱۳ کاسۂ عشق میں یاں میں کی طلب خود "میں" ہے
"میں" تو اک بحر ہے کاسے میں سمائے کیسے
آپ سے جائے کہاں آپ میں آئے کیسے

پردۂ خاک سے پیوند ہے پردا "میں" کا ذرّے ذرّے میں نظر آتا ہے چہرہ "میں" کا
"میں" کی حد کوئی نہیں حد سے یہ بالا ہے کہ ہے ۱۴ وسعت انفس و آفاق پہ سایہ "میں" کا
"میں" ہی وسعت کدۂ ذات میں "میں" کی حد ہے
موت کیا چیز کہ یہ موت تو "میں" کا رد ہے

شمع کے شعلۂ قائم تُو دلِ فردا ہے دست بستہ ترے دروازے پہ اک دنیا ہے
پوچھتی ہے سحر و شام بہ صد عجز و نیاز ۲۴ "میں" کا یہ فلسفۂ سرِ حقیقت کیا ہے
"میں" میں کیا رمز ہے نکتہ یہ ہمیں کر تعلیم
"میں" کی اس عہد میں کس طرح سے ہوگی تفہیم

آئی آواز کہ سن "میں" ہے خدا کا انعام "میں" ہے بندے کے لئے نعمت وحی و الہام
بندے بندے پہ ہے موقوف تقاضا "میں" کا ۲۵ گھٹتی بڑھتی ہے یہ "میں" ظرف سے تا قامتِ جام
"میں" جو ملتی ہے تو بندے کو خدا ملتا ہے
اس کے مرکز سے اسے اپنا پتا ملتا ہے

وہ سفر ہے کہ مسافت سے بہت دُور ہے "میں" ذات سے پھر بھی ابھی دُور بہت دُور ہے "میں"
قطرہ قطرہ یونہی صدیوں سے ٹپکتا ہے لہو ۴۰ گردشِ وقت تیرے سینے کا ناسور ہے "میں"
خوں کا دریا ہے کہ چڑھتا ہی چلا جاتا ہے
زخم کا دائرہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے

اور بند نمبر ۴۱ سے احمد نوید نے مرثیہ کو خوبصورت موڑ دیا ہے بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مرثیے کو رثا کی طرف موڑ دیا ہے۔

سُن کہ اس زخم کا بس دہر میں مرہم ہے علیؑ
'میں' ہے وہ راز کہ جس راز کا محرم ہے علیؑ

اور ذکرِ علیؑ کے بعد وہ حسینؑ پر گئے ہیں۔

حرفِ عریاں سے تجلّی تیغ کی عریانی ہے ۵۳ جس پہ صدقے ہو رجز یہ وہ رجز خوانی ہے
کس کو آواز دے اب دور تلک کوئی نہیں اب تو شبیرؑ ہے اور بے سر و سامانی ہے
ایک لشکر سے نبرد آزما تنہا ہے حسینؑ
دیکھ اے مقتل دل یہ مرا بیٹا ہے حسینؑ

یہاں احمد نوید نے "میں" کی تجسیم کر دی ہے اور ان کو براہِ راست سامنے لائے ہیں جو "میں" کے راز آشنا ہیں حتیٰ کہ مصائب کا بیان بھی "میں" کے حوالے سے کیا۔

"میں" نے ایک دن میں اٹھائے ہیں بہتر لاشے بے کفن لاشے شہیدوں کے وہ بے سر لاشے
آنکھ بے نور ہوئی۔ ہوگئی خم میری کمر ۶۳ ان سے لایا ہوں لاشوں پہ اٹھا کر لاشے
کیا کہوں پیاروں کا غم کس طرح جاں کھاتا ہے
اب تو اپنا بھی بدن لاش نظر آتا ہے

یہ مرثیہ ۶۷ بند پر مشتمل ہے اور پورا مرثیہ "میں" پر ہے۔

احمد نوید کا پہلا مرثیہ ان کے عزم، ان کی سوجھ بوجھ، ان کے مطالعہ اور شعر گوئی پر قدرت کا برملا اعلان ہے چہ جائیکہ اب تو وہ ایک مشاق مرثیہ گو بن چکے ہیں۔

☆☆☆☆☆

گوہر جارچوی:- (کراچی)

ولادت ۱۹۶۲ء

نام سید محمد علی۔ تخلص گوہرؔ۔ وطن مالوف جارچہ (یوپی) جائے ولادت کراچی۔ گوہر جارچوی اور ان کے بھائی اشرف جارچوی کے والدین تقسیم ہند کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آگئے تھے اس لئے دونوں بھائیوں کی ولادت کراچی میں ہوئی۔ چھولس اور جارچہ کی سرزمین مردم خیز بھی ہے اور گہوارۂ علم و ادب بھی جہاں خطیبِ آلِ محمدؐ علامہ ابنِ حسن جارچوی ہی نہیں، اس سرزمین سے رثائی ادب کے کئی روشن چاند سورج طلوع ہوئے ہیں۔

گوہر جارچوی نے ۱۹ برس کی عمر میں (۱۹۸۰ء) شعر کہنا شروع کئے۔ گھر کی تربیت اُفتادِ طبع اور پھر کراچی کا ادبی ماحول جس میں جوشؔ، نجمؔ، آل رضاؔ، اور نسیم امروہوی جیسے مرثیہ گو شعراء روشنی بکھیر رہے تھے گوہر جارچوی اس ماحول میں اپنی خداداد صلاحیت کو بروئے کار لائے اور ایک دھائی کے بعد ہی انہیں مرثیہ نگر تسلیم کرلیا گیا۔

ہماری مسلسل یاددہانیوں کے باوجود شاید ان کی مصروفیات مانع رہیں کہ وہ اپنے ایک مرثیے کے علاوہ ہمیں کچھ ارسال نہ کرسکے جس کے چند بند نمونہ کلام کے طور پر درج ذیل ہیں۔

نکلا حجابِ 'کُن' سے جو قلزم بیان کا ۔ خیمہ زمیں پہ نصب ہوا آسمان کا
قدرت کا شاہکار ہے کس آن بان کا ۱ اس خیمہ گاہ میں ہے مکاں لا مکاں کا
کیا تبصرہ کرے کوئی اس خیمہ گاہ پر
حیرت کی ہے نقاب خرد کی نگاہ پر

آمادہ سیر پر ہے مسافر نگاہ کا ۔ دم کررہا ہے اشہدان لاالہ کا
دیکھا جو انتظام خدائی سپاہ کا ۳ چشم یقیں میں شور ہوا واہ واہ کا
کلمہ پڑھا خدا کی بڑائی کا جھوم کر
نظاروں کی حسینؑ قناتوں کو چوم کر

لوگوں کا ایک ہجوم ہے اس خیمہ گاہ میں ۔ موجود ہیں یہاں پہ زمانے کی نعمتیں
سجتی ہیں دل نشیں نظاروں کی محفلیں ۷ جانے کو جی نہ چاہے جو کچھ دن یہاں رہیں
کب تک رہے گا کون بشر کائنات میں
یہ اختیار ہے میرے مولا کے ہاتھ میں

رہتا ہے عازمینِ عدم کا یہاں قیام ۔ آتے ہیں آنیوالے شب روز صبح وشام
کچھ بدقماش ہوتے ہیں کچھ لوگ نیک نام ۲۱ یہ قول مستند ہے کہ جس میں نہیں کلام
ایسے بھی دست گیر ہیں اس خیمہ گاہ میں
لوٹا جنہوں نے مال عقیدوں کی راہ میں

مالک بتا یہ خیمہ لگایا ہے کس لئے ۔ سورج کا یہ چراغ جلایا ہے کس لئے

فرشِ زمیں پہ سبزہ بچھایا ہے کس لیے ۲۴ یہ زیست کا نظام بنایا ہے کس لئے
آئی صدا یہ خیمہ فقط اک بہانہ تھا
دراصل پنجتن کا تعارف کرانا تھا

انوارِ پنجتن کا ہے کون ومکاں وطن دنیا وآخرت میں یہی نور ضو فگن
ان کے دہن سے بہتا ہے دریائے علم وفن ۲۵ سب ان کی ملکیت میں ہے صحرا ہو یا چمن
ہر اختیار آلِ محمدؐ کے نام ہے
ان بوریا نشینوں کی دنیا غلام ہے

اس در کی کاسہ لیس تو ساری خدائی ہے عرشِ بریں سے تحفے میں تلوار آئی ہے
خوشنودیٔ الہ کی دستار پائی ہے ۳۲ لہجہ کھرا ہے ان کا صدا حق نوائی ہے
ان کی زبان، صدق کی پہچان بن گئی
منہ سے جو بات نکلی وہ قرآن بن گئی

بنتِ رسولؐ فاطمہ زہراؑ کا یہ مقام زہراؑ کے گھر میں پلتے ہیں کونین کے امام
قرآن بھی یہیں ہے، یہیں دین کا قیام ۳۷ بٹتی ہیں روز نعمتیں اس در سے صبح وشام
آئے جسے خدا سے ملاقات چاہیئے
لے جائے جس کو جتنی بھی خیرات چاہیئے

اس خیمہ زن جہان کے مالک ہیں بوتراب شیرِ خدا، وقارِ اُمم ،دین کا شباب
ان کا اشارہ دیکھ کے چلتا ہے آفتاب ۳۸ قدموں کو چوم چوم کے اٹھتے ہیں انقلاب
یہ معجزہ علی نے جہاں کو دکھایا ہے
اک صرف قُم بہ اذنی سے مُردہ جلایا ہے

مولائے کائنات کا دلبند ہے حسنؑ چپ چاپ سی رہا تھا جو کفار کا کفن
خاموشیوں کی تیغ لئے وہ شہِ سخن ۴۲ قرطاس پر سجائے ہوئے ہے سپاہ فن
جام یقیں پلا کے خطِ اعتبار کو
کاٹا قلم کی نوک سے خنجر کی دھار کو

اب اک طرف یزید ہے اور اک طرف حسینؑ وہ دشمنِ حیات ہے، یہ زندگی کی چین

ہندہ کی وہ خطا ہے یہ زہراؑ کے نورعین ۴۵ وہ ذات کا بھکاری ہے یہ شاہ مشرقین
ظلمت چراغ پا ہے سحر کے نفاذ پر
اب جنگ ہوگی کرب و بلا کے محاذ پر

مصائب اور بین میں بھی گوہر جارچوی کا انداز درد سے لبریز مگر باوقار ہے۔

دسویں کو گھر حسینؑ کا ویران ہوگیا سب رونقیں اُجڑ گئیں سُنسان ہوگیا
کنبہ نبی کا بے سرو سامان ہوگیا ۵۱ خاموش ان میں بولتا قرآن ہوگیا
ہے ہے ستونِ خانۂ کعبہ گرادیا
سوکھے گلے پہ شمر نے خنجر چلادیا

رن میں لڑائی ہوچکی، رخصت ہوئے امام پیاسا شہید ہوگیا مقتل میں تشنہ کام
غم سے تباہ حال میں سیدانیاں تمام ۵۹ چھانے لگے اندھیرے قریب آرہی ہے شام
ماتم بپا ہے شہ کا حسینی خیام میں
بجتے ہیں شادیانے اُدھر فوجِ شام میں

ایک شور ہے کہ لوٹ لو آلِ نبی کا گھر کوئی ترس نہ کھائے محمدؐ کی آل پر
تطہیر جن سروں پہ ہے،عریاں کرو وہ سر ۶۰ ان کو اسیر کرکے پھرائیں گے دربدر
بے آسرا حرم ہیں شہ مشرقین کے
دشتِ بلا میں جل گئے خیمے حسینؑ کے

اور مرثیے کا آخری بند ہر دردمند دل کی پکار ہے،عزاداران مظلوم کے دلوں کی آواز ہے اور اللہ توفیق فکر دے تو اُمت رسول اکرمؐ کے ہر فرد کا فریضہ ہے کہ وہ گوہر جارچوی کے اس بند کو وظیفہ بنالے۔

اے تشنہ کام، کشتۂ شمشیر، الوداع بے کس، غریب، بے خطا شبیرؑ الوداع
بے گور، بے کفن شہِ دلگیر، الوداع ۶۱ زینبؑ کے بھائی صاحب توقیر الوداع
جب تک یہ زندگی ہے تیرا غم منائیں گے
آنسو تو کیا ہیں خون بھی اپنا بہائیں گے

☆☆☆☆☆

قمر حسنین:- (کراچی)

تاریخ پیدائش ۲۵ رجون ۱۹۶۹ء

نام: سید قمر حسنین نقوی، تخلص قمر، جائے ولادت حضرو، ضلع اٹک (پاکستان)۔ وطن مالوف شکار پور ضلع بلند شہر (یو پی)۔ والد کا اسمِ گرامی سید نجم الحسن نقوی ہیڈ ماسٹر اسلامیہ سکول۔ شکار پور (بلند شہر)۔ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔

قمر حسنین دورانِ تعلیم ہونہار طالب علم رہے ہیں۔ انہوں نے ۱۹۸۵ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول حضرو سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور ۹۲ فیصد نمبر حاصل کئے۔ کیڈٹ کالج حسن ابدال سے ۸۶ فیصد نمبر لے کر FSC کیا۔ راولپنڈی بورڈ میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۹۲ء میں NED یونیورسٹی کراچی سے ۹۰ فیصد نمبر حاصل کئے اور ۱۹۹۲ء میں قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد سے ۹۷ فیصد نمبر حاصل کر کے ایم۔ اے کیا اور پوری یونیورسٹی میں ان کی تیسری پوزیشن تھی۔۔۔ قمر حسنین کا علمی گھرانے سے تعلق ہے۔ والد گرامی درس و تدریس کے شعبہ سے وابستہ تھے۔ چچا سید عبدالحسین نقوی کلیم لکھنو کے جانے مانے شاعر تھے۔ خاندان کے کئی بزرگ ذاکرِ حسین تھے۔

قمر حسنین نے شاعری کا آغاز ۱۹۸۵ء سے کیا۔ ابتداء غزل، نعت، سلام سے ہوئی۔ ۱۹۸۸ء سے محافل میں پڑھنا شروع کیا۔ بارہ برس کے شعری ریاض کے بعد ۱۹۹۰ء میں پہلا مرثیہ کہا جس کا عنوان "زمین" تھا اور ڈاکٹر یاور عباس مرحوم کے قائم کردہ عشرہ مجالس (چہاردہ معصومین، انچولی، کراچی) میں پڑھا۔ پہلے ہی مرثیے کی جس طرح پذیرائی ہوئی اس سے حوصلے بلند ہوئے اور باقاعدہ مرثیہ نگار بن گئے۔۔۔ کراچی میں مرثیہ فاؤنڈیشن معرضِ وجود میں آئی تو اقبال کاظمی اور نیر اسعدی کے ساتھ قمر حسنین کو بھی فاؤنڈیشن کا بنیادی رُکن ہونے کا اعزاز حاصل ہوا جس سے ترویجِ مرثیہ اور خدمت امام مظلوم کے ثواب کے علاوہ ایک فائدہ یہ ہوا کہ قمر حسنین کو کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہیں کرنا پڑا۔ اپنے سلسلہ تلمذ کے بارے میں وہ لکھتے ہیں

"باقاعدہ طور پر شاعری میں کوئی استاد نہیں۔ جناب اقبال کاظمی اور جناب نیر اسعدی کو سناتا ہوں اور ان کے مشوروں پر عمل کرتا ہوں اس طرح second / third openion اصول سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔

(مکتوب بنام عاشور کاظمی، جنی ۲۰۰۳ء)

قمر حسنین نے ۱۹۹۰ء سے بیسویں صدی کا آخری سورج ڈوبنے تک ۸ مرثیے کہے ہیں۔

(۱) ''زمین'' ۱۹۹۰ء ۔ فکرِ ونظر کو چاہئے سامان مرثیہ
(۲) ''روشنی'' ۱۹۹۱ء ۔ روشن چراغ طور کی صورت ہے مرثیہ
(۳) ''وقت'' ۱۹۹۲ء ۔ کوہ سے لوٹ کے آجائے صدا ممکن ہے
(۴) ''عرفان خدا'' ۱۹۹۳ء ۔ کوئی تصویر نہیں کرب کی تصویر کے بعد
(۵) ''گھر'' ۱۹۹۴ء ۔ جس میں احساس تحفظ ہے وہ ایوان ہے گھر
(۶) ''ماں'' ۱۹۹۷ء ۔ عنوان سخن ماں ہے یہی وقت دعا ہے
(۷) ''علیؑ سے علیؑ تک ۱۹۹۸ء ۔ نام خدا، علیؑ سے ہے آغاز مرثیہ
(۸) ''جھولا '' ۲۰۰۰ء ۔ معصوم ارادوں کا نگہبان ہے جھولا

اپنے تعارفی کوائف میں قمر حسنین رقمطراز ہیں!

''خداوند کرم کے فضل و کرم اور چہاردہ معصومین کے صدقے میں میری چار جہتیں ہیں (۱) انجینر (الیکٹرانکس)۔ (۲) سائنسداں (پادر انجرنگ)۔ (۳) کمپیوٹر (ہارڈویر اور سافت ویر میں مہارت)۔ (۴) شاعری۔ اللہ تعلیٰ نے ان چاروں (FIELDS) میدانوں میں بہت نوازا ہے پھر بھی میں یہ سمجھتا ہوں کہ اللہ نے سب سے بڑی صلاحیت جو مجھے عطا کی ہے وہ شاعری ہے جس کے ذریعے میں غزل نعت سلام منقبت سے ہوتا ہوا مرثیہ تک پہنچ گیا ہوں''

(مکتوب بنام عاشور کاظمی۔ ایضا)

قمر حسنین عصر حاضر کے شاعر ہیں، نئی نسل کے شاعر ہیں۔ ممکن وہ عصر حاضر کی ہر جدت کا رشتہ قدیم اور کلاسیکی شاعری سے جوڑتے ہوں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

''خدائے سخن میر انیسؔ و مرزا دبیر مرثیہ گوئی کو ان سارے لوازمات کے ساتھ جس بلندی پر پہنچا گئے ہیں اُس تک پہنچنا ممکن نہیں۔ شاید جدید شعراء نے اس سے ایک قسم کا فرار اختیار کیا ہے لیکن کیا کیا جائے

ذکرِ حسینؑ مرثیوں میں باقی رہتا ہے کہ یہ دعائے سیدہ ہے۔ بس جدید مرثیے کا Formate ذرا سا بدل گیا ہے۔"

(مکتوب بنام عاشور کاظمی)

مرثیہ فاؤنڈیشن کراچی نے موضوعاتی مرثیوں کو فروغ دیا ہے۔ قمر حسنین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس کی ابتدا نسیم امروہوی، فیض بھرتپوری اور ان کی صف کے شعراء نے کی تھی۔ مرثیہ فاؤنڈیشن نے بزرگوں سے یہ شمع لے کر اس میں اپنی کاوشوں کا نور شامل کر کے قمر حسنین اور ان کی نسل کے شعراء کو دی ہے۔ پس جدید مرثیے کی ہیئت میں تبدیلی فرار نہیں، شعوری ہے۔ خود قمر حسنین کے مراثی میں عصرِ جدید کی جو روشنی ہے وہ ان کی شعوری کاوش اور ایک ایک مرثیے کے موضوع پر کئی کئی ماہ کی سوچ اور غور و فکر کا حاصل معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ وہ بھی جس موضوع سے چہرہ بناتے ہیں اختتام مرثیہ تک اس حوالے کو کم و بیش ہر بند میں زندہ رکھتے ہیں۔ اس لئے انہیں جدید مرثیے کے قافلے کا مسافر کہا جا سکتا ہے اور یہ رتبہ اُن کی کمائی ہے۔ اُن کی محنت ہے۔ اُن کی کاوشوں کا ثمر ہے — نمونۂ کلام کے طور پر ان کے پہلے مرثیے کے چند بند مندرجہ ذیل ہیں۔ مرثیہ کا عنوان "زمین" ہے ؎

فکر و نظر کو چاہیئے سامانِ مرثیہ کھلتا ہے اور اک درِ ایوانِ مرثیہ
پیشِ نظر "زمین" ہے عنوانِ مرثیہ ۱ ہے دور تک نگاہ میں میدانِ مرثیہ
سب کا انیسؔ ہے وہ قمر اس یقین پر
ہوں گامزن خدائے سخن کی زمین پر

لفظوں سے درد بن کے نکلتا ہے مرثیہ آغوش میں خیال کے پلتا ہے مرثیہ
احساس کی زمین پہ چلتا ہے مرثیہ ۲ کردار میں حسینؑ کے ڈھلتا ہے مرثیہ
سُن مرثیہ کہ اس کا تعلق ہے دین سے
انساں بنائے جاتے ہیں اس کی زمین سے

یارب زبانِ شعر کو حرف و بیان دے احساس بولنے لگے ایسی زبان دے
اک طائرِ سخن کے پروں میں وہ جان دے ۳ ہیم موّدتوں کی فضا میں اُڑان دے

افلاک میں اُڑان ہو، تیرے یقین پر
لیکن قدم جمے رہیں میرے زمین پر

ایک وہ زمین ہے جو سخن کی زمین ہے — ہر لفظ جس میں پھول کی صورت حسین ہے
پیکر میں جس کے بوئے معانی مکین ہے — ۷ اور یہ زمین لوح و قلم کی زمین ہے
شہرِ علومِ فکر و نظر اس زمیں پہ ہے
تاریخ کربلا کا سفر اس زمیں پہ ہے

انساں ہے مشت خاک مگر یہ کبھی کبھی — سچائیوں کی راہ پہ چل کر خوشی خوشی
گر اپنا خوں پلادے زمیں کو یہ آدمی — ۱۶ جامِ فنا میں اس کو ملے ایسی زندگی
مٹی میں یہ اثر ہو کہ لب کھولنے لگے
خاموش ہو لہو تو زمیں بولنے لگے

ہر دور میں زمین پہ ظلم و ستم ہوئے — کھولے گئے ہیں اس پہ شقاوت کے راستے
انسان کتنے اس پہ لہو بن کے بہہ گئے — ۲۱ یہ دیکھ کر زمین پہ آتے ہیں زلزلے
پہلو بدل رہی ہے جو یہ اضطراب سے
فریاد کہہ رہی ہے زمیں بوتراب سے

گھر میں خدا کے کرتے رہے تھے صنم جو راج — رکھے ہوئے تھے جھوٹی خدائی کے سر پہ تاج
کم ظرف بت پرستوں سے لیتے رہے خراج — ۳۲ اصنام خاک کے تھے مگر آسماں مزاج
چڑھ کر علیؑ نے دوشِ رسولِ امین پر
یہ آسمان توڑ کے پھینکے زمین پر

مرثیہ فاؤنڈیشن کے مرثیہ نگاروں نے بشمول قمر حسنین مرثیے کے مروّجہ مصائب و بین کا رخ بدلا ہے۔ مثلاً علی اصغر کی شہادت کا احوال بیان کرتے وقت مصائب کا جو انداز اختیار کیا ہے وہ کلاسیکی مرثیے کے مصائب اور بین سے مختلف ہے۔۔

پتھر کا دل لئے تھے جو ساحل پہ اہل کیں — شہ ظالموں سے بولے کہ مجھ پر کرو یقیں
میں تم سے اپنے واسطے کچھ مانگتا نہیں — کملا گیا ہے پیاس سے میرا یہ نازنیں

بچے کو میں لٹاتا ہوں پیاسا زمین پر
رکھتا ہوں آج اپنا کلیجہ زمین پر

اک بار گرم خاک پہ کروٹ جو اس نے لی محسوس کی زمیں نے بھی بچے کی تشنگی
فوجِ عدو یہ دیکھ کے حیران رہ گئی ۵۵ کرب و بلا کی خاک پہ ننھا سا یہ علی
انسانیت جھنجھوڑ رہا تھا زمین پر
زعمِ یزید توڑ رہا تھا زمین پر

مرثیہ کا زمین سے رابطہ مسلسل ہے۔اصغر کے گلے میں تیر لگا۔بچہ شہید ہو گیا۔مولا نے ننھی سی قبر بنا دی۔اس منظر کو قمر حسنین کیسے بیان کرتے ہیں۔

اصغر کی قبر سے اٹھے مولا بہ چشم تر پہلے سوئے خیام گئے سوختہ جگر
آئے وہاں سے رن میں شہنشاہِ بحر و بر ۶۱ لاشوں پہ لاشے گنج شہیداں میں دیکھ کر
میزانِ عدل، با دلِ ناچار کھینچ لی
پروردگارِ صبر نے تلوار کھینچ لی

ہاتھوں میں شہ کے چلتی تھی شمشیر لا جواب روکا اسے جو ڈھلتا نظر آیا آفتاب
زخموں سے چور چور تھے فرزند بوتراب تیر و تبر تھے جسم میں پیوستہ بے حساب
ٹھہرا گیا نہ اس لئے گھوڑے کی زین پر
آکر گرے ہیں تیر و تبر کی زمین پر

قمر حسنین کا مرثیہ کا سفر جاری ہے۔سالانہ کم از کم ایک مرثیہ لکھنے کی روش اب بھی قائم ہے اکیسویں صدی میں انہوں نے دو مرثیے کہہ لئے ہیں۔

(۹) ''تنہائی'' ۲۰۰۲ء دیدہ تر سے قمر اشک عزا لکھتا ہوں۔
(۱۰) ''ادب'' ۲۰۰۳ء خیال جس سے ہے روشن وہ روشنی ہے ادب

یہ دونوں مرثیے نقاشِ نقشِ ثانی بہتر کشد ز اول کی روایت پر پورے اترتے ہیں اور ان کی شاعرانہ ہنرمندی کی دلیل ہیں۔

☆☆☆☆☆

سید ماجد رضا عابدی:- (کراچی)

ولادت ۱۹۷۶ء

جائے ولادت کراچی۔ دبستان کراچی کے نوجوان مرثیہ نگاروں میں خط جلی سے لکھا ہوا ایک نام سید ماجد رضا عابدی کا نام ہے جنہوں نے ۲۰/۲۱ برس کی عمر میں (۱۹۹۶ء) پہلا مرثیہ ''نسل اشرف'' کہا اس مرثیے کو مرکز علوم اسلامیہ کراچی نے شائع کیا ہے۔ مرثیے کی مقبولیت کا احساس ہر کس و ناکس کو ہے حتی کہ خود سید ماجد رضا عابدی نے ابتدائیہ میں اظہارِ تشکر کے زیرِ عنوان مرثیے کی مقبولیت کے ادراک کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''سیدۂ عالم حضرت فاطمہ زہراؑ کی بارگاہ میں تا زندگی سجدہ ریز رہوں گا کہ اُن کنیزِ خاصِ خدا نے اپنے الطاف و کرم سے مجھ حقیر پرُ تقصیر گدائے جنابِ امیر کو ابتدائے مرثیہ نگاری میں اس زینہ پر پہنچایا جس کو تمام اہلیانِ فن، سخن کا آخری زینہ گردانتے ہیں''

پہلے ہی مرثیے کے بعد سخن کے آخری زینے تک پہنچنے کا ادراک کیوں نہ ہوتا جب کہ اس مرثیے کو اسید ابن حسن رضوی آل باقر العلوم، پروفیسر محمد رضا کاظمی، جناب ساحر لکھنوی اور سید ضمیر اختر نقوی ایسے مرثیے کے ناقدین نے سراہا ہے ——

سید ماجد رضا عابدی نے یہ بھی لکھا ہے کہ سید ضمیر اختر نقوی اُن کے ''روحانی استاد'' ہیں۔ سید ضمیر اختر نقوی نے بھی شاگرد کے خلوص بے پایاں کے جواب میں جو کچھ مرثیے کے بارے میں لکھا ہے وہ بھی بے مثال ہے۔ ''جز و مرثیہ نگاری کا شہ والا'' کے زیرِ عنوان تحریر فرماتے ہیں۔

ماجد رضا عابدی کی پہلا مرثیہ پیش نظر ہے مرثیہ کی کیا تعریف ہو سبحانؔ حیران ہے۔ فرزدقؔ پریشان ہے۔ محتشمؔ کا احتشام خاک ہوا۔ فضلؔ یہ فضلِ خدا دیکھ کر غم سے ہلاک ہوا۔ حسّانؔ کا تختِ شاعری دوش ہوا پہ چکر لگانے لگا۔ دعبلؔ، ماجد کا مرثیہ سن کر اترانے لگا۔ ماجد رضا کے انتظام نظم نے نظامیؔ کو نظم و نسق شاعری بھلایا۔ ناظمؔ کی مثنوی عشق، کو چاہ مذلت میں گرا دیا۔ نرگسی بچشم حیرت تکتا ہے۔ سوتیؔ گنگ کی طرح بول

نہیں سکتا۔ صائب کی رائے صائب میں فتور آ گیا۔ جامی غیرت سے ساغر ہلاہل چڑھا گیا، سعدی کی ساری عبادت پر اوس پڑ گئی گ۔ گلشنی کے دل میں نوکِ خارِ رشک گڑ گئی۔ بدر کا دل داغ غیرت سے غیرتِ گلستان ہوا۔ ہلالی شرم سے مثل مہ نو سر بگریباں ہوا۔ نوری اور انوری بسانِ دیدۂ بے نور آنکھوں سے گر گئے۔ یہ ذکر، مقدس مرثیے میں سن کر قدسی اور اقدسی سے لوگ پھر گئے۔ حافظ کو شیوۂ شیوا زبانی فراموش ہوگیا۔ کلیمی موسیٰ کی طرح بے ہوش ہوگیا۔ فردوسی کو آتشِ حسد نے نارِ جہنم یاد دلائی۔ اسدی کو رمِ آہو نہ یاد آئی۔ ناطقی کو ایسی چپ لگی کہ صامت بے قیل وقال ہوا۔ عنصری کے عناصر اربعہ میں اختلال ہوا۔ زلالی فن شاعری سے صاف مُکر گیا ـــــ غبار، بلالی، وردی کے آئینہ دل میں بھر گیا۔ واقف گویا بالکل ناواقف فن ہوا۔ فغانی صرف فغاں و آہ ہمہ تن ہوا۔ نظیری کا کلام نظری ہوگیا۔ سنائی آب وتابِ نظم روشنی کھو گیا۔ جلالی کا جگر آتش رشک سے جل گیا۔ وصالی فراقِ شاہدِ مضمون میں ہاتھ مل گیا۔ عرفی طفل دبستان معروف ہوا۔ ہاتفی کا الہامِ غیبی موقوف ہوا۔ رودکی، فاریابی، حزیں، ناصر، خسرو چھوٹی اُمت والوں کا تو کسی نے نام بھی نہیں لیا۔ ماجد رضا کے سلیس ونفیس مرثیہ پر شعرائے انصاف شعار نثار ہوئے۔ میر، نظیر، وزیر، اسیر، سب قائلِ سخنِ آبدار ہوئے۔ درد کے کلیجے میں ہوک اٹھی کاش میں بھی مدح خواں ہوتا۔ غزل میں عمر گنوائی ہے۔ سودا ماجد کے سودائی ہوئے۔ میر حسن، ماجد کے سحر البیان پر قربان ہوئے۔ مصحفی کے قرآن اٹھایا کہ یہ کلام لاجواب ہے۔ ناسخ نے نسخہ ''نسل، اشرف'' کو چوم لیا۔ آتش نے گل آتشیں لٹائے۔ قلق کو مرثیہ نہ لکھنے کا جو قلق ہوا بیان سے باہر ہے۔ مومن ماجد کا مرثیہ سن کر مداحِ اسلوب ہوئے، غالب اپنے مصرعے کی تضمین سن کر خود ہی مغلوب ہوئے۔

'حسبنا' کہہ کے بھی قرآن سنائے نہ بنے
''کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے''
(غالبؔ کا مصرعہ)

مزار ادبیرؔ، مرثیۂ ماجد پر لعل و گوہر صدقے اُتارتے ہیں۔
میر انیسؔ بزبانِ حال۔ ''ماہذا قول البشر'' پکارتے ہیں اور کہتے ہیں
''اللہ اللہ ماجدؔ میرے مصرع کا یہ احترام کیا۔ تم نے مجھے شادکام کیا۔
آگہی غیب کی بس اذن کی مرہونی ہے
''اس احاطے سے جو باہر ہے وہ بیرونی ہے''
.........الخ'' (دیباچہ نسل اشرف)

سید ماجد رضا عابدی نے سید ضمیر اختر نقوی کو اپنا روحانی اُستاد تسلیم کیا ہے۔ اُستاد شاگرد کے درمیان جو روحانی رشتہ ہے اس کے تحت اُستاد نے اپنے روحانی شاگرد کے مرثیے پر جو تقریظ لکھی ہے ایسی کسی نے انیسؔ پر نہ لکھی، وہ نثر جو اپنی جگہ مرثیہ مزاج قصیدہ ہے جسے پڑھنے والا یہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ مرثیہ افضل ہے کہ تقریظ؟ اور جس کے لئے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مرثیہ گوئی کی تاریخ میں کس اُستاد نے اپنے شاگرد کے پہلے مرثیے پر ایسی تقریظ نہیں لکھی حتیٰ کہ انیسؔ و دبیرؔ بھی اس سے محروم رہے۔ نہ صرف تاریخ مرثیہ نگاری بلکہ گنیز بک آف ریکارڈ میں بھی غالباً اس کی مثال نہیں ملے گی۔ اس ''لاثانی'' تحریر کے پس منظر میں بلاشبہ سید ماجد رضا عابدی کا شعری نقائص سے پاک کلام اور مولانا ضمیر اختر نقوی کی شعر فہمی اور فراخدلی ہے۔ نمونہ کلام کے طور پر ''نسل اشرف'' کے چند بند درج ذیل ہیں۔

داورا! میرے تسلّم کو اجاگر کردے قادرا حرف کی تاثیر منوّر کردے
اپنی تائید سے منصب بھی مقرر کردے ۱ مدحِ زہراؑ کے لئے لائقِ منبر کردے
نورِ الہام سے انوار کے منظر دکھلا
جلوۂ طور مجھے بر سرِ منبر دکھلا

عرض مقبول ہو خامہ ہو میرا اجرفشاں اس کی رفتار میں ہو تیزیٔ رفرف کا سماں
برشِ لفظ سے کٹ جائے سرِ وہم و گماں ۳ جدّتِ فن سے نمایاں رہے میدانِ بیان

میں ہوں ہم فکر ضمیر اب یہ بھرم رکھنا ہے
وادیٔ مدحتِ زہراؑ میں قدم رکھنا ہے
(ضمیر سے مراد میر ضمیر نہیں بلکہ سید ضمیر اختر نقوی، شاعر کے روحانی اُستاد ہیں)

سایۂ حق میں عجب کام قلم کرتا ہے فکر و فن کو سرِ قرطاس بہم کرتا ہے
حرف کو نصرتِ مولا میں علم کرتا ہے ۵ مرثیہ صبر کی تاریخ رقم کرتا ہے
ظلمت و جبر کی تاریخ تو سب نے لکھی
حق کی تاریخ فقط اہل نسب نے لکھی

اور جب مرثیہ منقبتِ سیدہ کی منزل پر آتا ہے تو سید ماجد رضا عابدی چمنستانِ مودّت کے در، وا کر دیتے ہیں اور مرثیے کی فضا مودّت کے پھولوں کی خوشبو سے مہک اٹھتی ہے۔

نقطۂ خطِ امامت ہوئی ذاتِ زہراؑ شارحِ صاحبِ قوسین حیاتِ زہراؑ
مظہرِ نورِ علی نورِ صفاتِ زہراؑ ۲۲ خلق پر رزقِ مسلسل ہے ذکاتِ زہراؑ
رونق کون و مکاں قحط کا صحرا ہو جائے
خلق پر بند اگر یہ درِ زہراؑ ہو جائے
موجبِ مہرِ مشیت ہے ثنائے زہراؑ معدنِ نورِ رسالت ہے کسائے زہراؑ
شرطِ تحصیلِ امامت ہے ولائے زہراؑ ۲۵ خیر کی خوبی و کثرت ہے برائے زہراؑ
اور اب اس کے سوا وصف اصولی کیا ہے
سب اسی نور کا قصہ ہے نزولی کیا ہے
عقلِ حوّا کی قسم عقل کا جوہر ہے بتولؑ حُسنِ سارہ کی قسم نُور کا محور ہے بتول
اُمِ موسیٰ کی قسم، صبر کا پیکر ہے بتول صدقِ مریم کی قسم، طاہر و اطہر ہے بتولؑ
انہی اوصافِ حمیدہ کا نتیجہ ہے یہی
روحِ تلخیص میں دیکھو تو خدیجہؑ ہے یہی
ان کے گھر میں کبھی فردوس کا حُلّہ اُترا پڑھ کے والنجم کبھی عرش کا تارا اُترا
شکر کے ساتھ کبھی 'دہر' کا سورہ اُترا ۲۸ ایک سورہ ہی نہیں پورا صحیفہ اُترا

غضبِ حق کا سبب غیر سے ناراضی ہے
اے خوشا! جس سے یہ خوش اس سے خدا راضی ہے

نسل اشرف کی جو حرمت ہے وہ کوثر زہراؑ اپنی وحدت میں جو کثرت ہے وہ دختر زہراؑ
شر پہ جس خیر کی ہیبت ہے وہ لشکر زہراؑ ۳۲ جو کہ مختار شفاعت ہے وہ محشر زہراؑ
ہاں کہو صلِّ علیٰ مصدرِ رحمت کو سلام
پردۂ "کن" میں نہاں رمزِ مشیت کو سلام

فاطمہؑ، نارِ جہنم سے بچانے والی فاطمہ، قید مصیبت سے چھڑانے والی
فاطمہؑ دہر میں عظمت کے گھرانے والی ۳۳ فاطمہ، قصرِ ستمگار کو ڈھانے والی
بنتِ عادل نے عدالت کا بھرم کھول دیا
ایک خطبے سے حکومت کا بھرم کھول دیا

بنت احمدؐ نے لعینوں کا ستم دیکھ لیا آگ سے جلتا ہوا بیت حرم دیکھ لیا
خود پہ گرتا ہوا اک باب الم دیکھ لیا ۳۸ پارۂ قلب کا گھٹتا ہوا دم دیکھ لیا
بولیں اس دور کی عنایات کا احساس نہیں
"کچھ بھی پیغام محمد کا تمہیں پاس نہیں" (اقبال)

اُٹھ گئیں دہر سے دکھ سہہ کے جنابِ زہراؑ زیرِ محراب ہوئے قتل علیؑ شیر خدا
کشتۂ زہر ہوئے پھر حسنِ سبز قبا ۴۱ ذبح آخر ہوئے شبیرؑ بھی بے جرم و خطا
حشر سے پہلے ہوا حشر بپا ہائے حسینؑ
کربلا میں ہوا ہر ظلم نیا ہائے حسینؑ

۴۹ بند کا یہ مرثیہ دعا پر ختم ہوتا ہے —— مجھے عزیز گرامی سید ماجد رضا عابدی سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ میں ۱۹۷۶ء میں جب کراچی سے لندن آیا تو ان کی عمر چار برس کی ہوگی۔ اُن کے چار مرثیے میری نظر سے گذرے ہیں۔ پہلا مرثیہ "نسل اشرف" جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں جو ۱۹۹۶ء میں کہا گیا۔ دوسرا مرثیہ "پرچم شعور" ظرفِ شعورِ خاک کا جب امتحان ہوا، ۱۹۹۷ء میں کہا گیا۔ تیسرا مرثیہ "ام الآئمہ فاطمہ بنت اسد، علم و تہذیب شرافت کا نشاں ہوتے ہیں" ۱۹۹۸ء میں کہا گیا۔ ان کے علاوہ دو مرثیے ہم تک پہنچے ہیں۔

جنگ خندق۔ "نقطۂ بائے دبستانِ دو عالم میں علیؑ اور ملکۃ العرب خدیجۃ الکبریٰ۔

"سرچشمۂ قرآن سیادت ہیں سیّدہؑ"

سید ماجد رضا عابدی کی رفتارِ مرثیہ گوئی کم از کم ایک مرثیہ سالانہ ہے۔ تو گویا جن دو مراثی کا ہم نے ذکر کیا ان کا سنہ تصنیف ۱۹۹۹ء اور ۲۰۰۰ء ہو سکتا ہے۔ مرثیے کی تعریف میں بخل کرنا میری نظر میں ذکرِ اہلِ بیت میں بخل کے منافی ہے اس لئے ایک بات برملا عرض کرتا چلوں کہ سید ماجد رضا کے سارے مرثیے انہیں مولا کی طرف سے عطا ہوئے ہیں۔ اور ان کے جملہ مراثی بشمول "نسلِ اشرف" صفِ اوّل کا کلام ہیں۔ البتہ میرے خیال میں نسلِ اشرف پر مولانا ضمیر اختر نقوی صاحب کی تقریظ 'افراط' کی زد میں آتی ہے جس نے مرثیے کو نقصان پہنچایا ہے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے جسے رد بھی کیا جا سکتا ہے۔ یاد رہے کہ کسی علمی ادبی نکتے پر رائے زنی کا ذاتیات سے تعلق نہیں ہوتا۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ سید ماجد رضا عابدی تیزی سے نہ صرف خود مرثیہ کہہ رہے ہیں بلکہ ترویجِ مرثیہ اور ترغیبِ مرثیہ گوئی میں بھی منہمک ہیں۔ یقیناً انہوں نے مزید مرثیے بھی کہے ہوں گے۔ اُن کے پہلے مرثیہ پر مولانا ضمیر اختر نقوی کے تعارف کے بعد سید ماجد رضا عابدی پر کچھ اور لکھا بھی نہیں جا سکتا اور اب غالباً اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ "مشک آنست کہ خود بگوید نہ کہ عطّار" جبکہ ان کے معاملے میں تو مُشک نے بھی کہا اور عطّار نے بھی 'خوب فرمایا' —— ہمارے چراغ میں تیل ختم ہو رہا ہے لیکن جب ماجد رضا جیسے نوجوانوں کو ہم مقصدِ شہادتِ حسینؑ کی ترویج میں منہمک دیکھتے ہیں تو یقین آ جاتا ہے کہ۔

"ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے"

اور اُن کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں کہ اللہ ان کی توفیقات میں اضافہ کرے اور انہیں دوست دشمن کی پہچان کے ہنر سے مالا مال کرے۔

☆☆☆☆☆

کمال حیدر رضوی:- (کراچی)

ولادت ۱۱ر فروری ۱۹۷۳ء

جائے ولادت کراچی۔ والد گرامی کا نام سید محمد مسلم رضوی۔ دادا سید وزارت حسینؒ رضوی۔ کمال حیدر رضوی نے ابتدائی تعلیم اپنے عالم فاضل دادا جان سید وزارت حسینؒ رضوی سے

حاصل کی۔ فقہ، اجتہاد، فلسفہ اور منطق کی تعلیم مدرسہ دار الحکمت کراچی سے اور کراچی یونیورسٹی سے اسلامی معاشیات پر ایم۔اے کی سندات حاصل کیں۔ سید کمال حیدر رضوی بنیادی طور پر خطیب ہیں، ذاکر اہلبیت ہیں۔ سید ضمیر اختر نقوی کے شاگرد ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ۱۴ برس کی عمر سے خطابت کا آغاز کر دیا تھا لیکن مشق سخن اس سے بھی پہلے گیارہ برس کی عمر میں شروع ہوگئی تھی۔ ظاہر ہے ایک خطیب اہلِ بیتؑ کی شعر گوئی کا رجحان اسی راہ پر ہوگا جس پر وہ عملی طور پر گامزن ہیں قصائد سلام اور منقبت سے آگے بڑھ کر سید کمال حیدر رضوی نے مرثیہ گوئی بھی شروع کر دی ہے۔ ان کا پہلا مرثیہ ''مصحف مدحتِ زہراؑ'' ہے۔ انہوں نے از راہ کرم یہ مرثیہ ہمیں ارسال کرتے وقت اس پر ایک نوٹ دیا ہے کہ یہ مرثیہ ۱۹۹۴ء میں (بعمر ۲۱ برس) کہا گیا ہے۔ مرثیے کا مطالعہ کیجئے تو اندازہ ہوتا کہ کسی پختہ گو شاعر کا کلام ہے۔

مصحفِ مدحتِ زہراؑ کے ورق کھلتے ہیں ‌ ‌ ‌ مرثیے میں یہ مضامینِ اَدق کھلتے ہیں
کشف طاری ہے درِ جملۂ حق کھلتے ہیں ۱ صفحۂ فکر پہ عرفان کے سبق کھلتے ہیں
رحلِ عرفان جو کھلی، فہم کا جزدان کھلا
مصحفِ مرثیہ پھر صورتِ قرآن کھلا

پارۂ مصحفِ ناطق کی تلاوت کے لئے ‌ ‌ ‌ لیلۃ القدر کی تفہیم حقیقت کے لئے
فرض چونکہ یہ ہے ایسی ہی عبادت کے لئے ۲ حکم باری سے اولی الامر کی بیعت کے لئے
بہرِ طوفِ حرمِ عصمتِ کبریٰ اُترا
درِ زہراؑ پہ تیری فکر کا تارا اُترا

راہِ ادراک مجھے نہجِ بلاغہ سے ملی ‌ ‌ ‌ قدر کی شب سحرِ مسجد کوفہ سے ملی
صبحِ عرفان اُترتے ہوئے زُہرہ سے ملی ۱۰ یہ سعادت کرمِ فاطمہ زہراؑ سے ملی
میرے سر پر بھی شب قدر کا اب سایہ ہے
صاحبِ امر سے یہ بختِ رسا پایا ہے

حق کا محبوب کو تحفہ، گُلِ نورِ زہراؑ ‌ ‌ ‌ چشمِ احمد کی تمنا، گُلِ نورِ زہراؑ
سیب کی رنگ میں مہکا گُلِ نورِ زہراؑ ۲۳ زینتِ قلبِ خدیجہ، گُلِ نورِ زہراؑ

رنگ اس پھول کے ہیں گلشنِ حیدر کے لئے
گل یہ کوثر ہے مبارک ہے پیغمبرؐ کے لئے

سبب اوّلِ امکان کا سبب ہیں زہراؑ اُمّ الاسما، ہے لقب، عالی لقب ہیں زہراؑ
کنزِ مخفی کی قسم کلمۂ ربّ ہیں زہراؑ ۳۰ روحِ زہراؑ ہیں علیؑ حق کی طلب ہیں زہراؑ
شجرۂ طیبہ کی شان بڑھی کیا کہنا
شاہزادی کی یہ اعلیٰ نسبی کیا کہنا

کلکِ طوبیٰ نے یہ لکھا کہ رفیعہ ہیں بتولؑ خود مودّت کے تحفّن ہیں کہ جلیلہ ہیں بتولؑ
شجرِ طور کے لب پر ہے 'حکیمہ' ہیں بتول ۳۴ ہم گناہگار یہ کہتے ہیں ''شفیعہ' ہیں بتولؑ
عدل کے روز کرم آپ یہ فرمائیں گی
نارِ دوزخ سے محبوں کو بچا لائیں گی

ذاتِ ذی القربا سے ثابت ہے انہیں کی جاگیر خُلدِ سبطین کی کوثر ہے علیؑ کی جاگیر
چھین لی گرچہ زمانے نے نبی کی جاگیر ۳۶ سات باغ اور بھی ہیں بنتِ نبی کی جاگیر
لوگ سمجھے تھے صرف باغِ فدک ہے اُن کا
شہرِ ہستی میں تو سب آب و نمک ہے اُن کا

آبروِ عدل کی ہے خطبۂ ذیشانِ بتولؑ کربلا تک ہے مسلسل وہی اعلانِ بتولؑ
صبحِ اسلام بنی شرحِ دبستانِ بتولؑ ۴۱ پھر سے زینبؑ نے سنایا یہی فرمانِ بتولؑ
دینِ اسلام تباہی سے بصد عید پھرا
شام ہونے کو تھی جاتا ہوا خورشید پھرا

اُن کے خطبے کا حشم قدرتِ تعلیم کی شان ان کے کردار سے ہے عصمتی اقلیم کی شان
ان کے بیٹوں سے بڑھی نسلِ براہیم کی شان ۴۲ اُن کی گھرداری سے ہے زیست میں تنظیم کی شان
ان کے ہر امر سے تنزیل کو ترغیب ملی
ان کی تہذیب سے اسلام کو تہذیب ملی

پھر بھی امت یہ نہ سمجھی کہ معظّم ہیں بتولؑ متبلائے غمِ ہجرِ شہِ عالم ہیں بتولؑ
تا ابد بادیۂ دینِ محرّم ہیں بتولؑ ناشرِ گریہ و پیغمبرِ ماتم ہیں بتولؑ

آج بھی قبر میں کب چین سے سوتی ہیں بتولؑ
عصرِ عاشور سے شبیرؑ پہ روتی ہیں بتولؑ

ایک کامیاب خطیب کی طرح فضائل سے مصائب کی طرف گریز کے بعد سید کمال حیدر رضوی نے بعدِ رحلتِ رسولِ اکرمؐ، نامسائد حالات کی بہتات اور اُمت کی قدر ناشناسی کا مرثیہ لکھا ہے۔ خوبی یہ ہے کہ ذکرِ مصائب اور بین تاریخی حالات کے بیان کے ذریعے گئے ہیں۔ سیدہ سے بین نہیں کرائے گئے —— مرثیے میں لوازمِ مرثیہ کی بھی پابندی نہیں کی گئی بلکہ چہرے اور مصائب کے درمیان کے لوازمات مرثیہ کی عدم موجودگی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ یہی ایک کامیاب مصوّر کی پہچان ہے کہ وہ جو بھی رنگ استعمال کرے وہی رنگ بولنے لگے۔ اسی طرح کامیاب شاعر اپنے سامع یا اپنے قاری کو جہاں لے جانا چاہے قاری یا سامع غیر محسوس انداز میں وہاں چلا جائے۔ کمال حیدر یہی کمال کرتے ہیں۔

ہمارے سامنے سید کمال حیدر کا ایک مرثیہ ہے۔ اس کی بنیاد پر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ نقشِ ثانی ہی نہیں آیندہ کے سارے نقوش میں ارتقا کا اُجالا نمایاں ہوگا۔ انشاءاللہ

☆☆☆☆☆

شاعر زیدی:- (کراچی)

تاریخ ولادت نہیں لکھی

نام سید شاعر حسین۔ تخلص شاعرؔ، زیدی سید۔ وطن مالوف ریاست الور۔ ذریعۂ معاش ملازمت سرکار۔ مروّجہ علم کے حوالے سے ایم، اے ہیں لیکن درسگاہ کربلا نے اُنہیں وہ علم بھی دیا ہے جو حق و باطل میں تمیز کر سکتا ہے۔ ظالم و مظلوم میں تفریق کر سکتا ہے۔ انسان کو تمیزِ بندہ و آقا سے بلند کرتا ہے۔ اس علم کا صدقہ ہے کی شاعر زیدی اپنی ذات میں ایک جماعت ہیں اور ہمہ وقت بندگانِ خدا اُن سے فیضیاب ہوتے ہیں۔

شاعر زیدی نے صغیر سنی میں مشقِ سخن شروع کر دی تھی۔ ابتدا غزل سے ہوئی لیکن جلد ہی مجاز کی حدود کو پار کر کے مودّت کی راہوں پر چل نکلے۔ اور ایک بار یہ چراغ جس دل مین روشن ہو جائے پھر کائنات کی چکا چوند اس کی نگاہوں کو خیرہ نہیں کر سکتی۔ شاعر زیدی کے ساتھ یہی ہوا۔ دل مین تولاّ کی روشنی ہوئی تو روشنی اور تاریکی کا فرق سمجھ میں آ گیا۔ شعر گوئی کی صلاحیت جس نے عطا کی

تھی اس کی مدح شروع ہوگئی۔ حمد، نعت، سلام، منقبت، نوحہ اور مرثیہ کی طرف سخنوری کا رُخ مُڑ گیا۔

شاعر زیدی منکسر المزاج انسان ہیں۔ اُنہوں نے تاخیر کا احساس کرتے ہوئے عجلت میں اپنا کلام ارسال کیا ہے۔ انکسار انسان کے کردار کا جوہر ہے لیکن ان کے کوائف کی عدم موجودگی بوجہ انکسار، ہمارے لئے دشواری کا سبب بن گئی۔ ایک بھلے آدمی پر، ایک اچھے شاعر پر، امام مظلوم کے ایک مرثیہ نگار پر ہم کیا لکھیں؟ کیا تعارف کرائیں؟ آخر کار یہ سوچ کر ذہن کو جھٹکا دیا کہ انسان کے لئے یہ بھی تو شرف کی بات ہے کہ عزاداران حسینؑ میں اس کا شمار ہو۔ اس کی شاعری محمدؐ و آلِ محمدؐ کے لئے ہو اور یہ شرف شاعر زیدی کو حاصل ہے۔ یہی اُن کا تعارف بھی ہے۔ شاعر محمدؐ و آلِ محمد شاعر زیدی۔

اُنہوں نے جو مرثیہ ارسال کیا ہے اُس کا عنوان ہے "سجدہ"

شاعر کمال سجدۂ آدم رقم کرو وصف جمالِ سجدۂ آدم رقم کرو
اصلِ خیالِ سجدۂ آدم رقم کرو کیا ہے مآلِ سجدۂ آدم رقم کرو
سجدہ ہے وہ جو کرتا ہے اظہار ابدیت
معبود کے حضور میں اقرار ابدیت

سجدے نے بندگی کے سلیقے سکھا دئے سجدے نے آگہی کے صحیفے پڑھا دئے
سجدہ نے بخششوں کے وسیلے بنا دئے سجدے نے زندگی کے قرینے بتا دئے
خلقِ خدا کے واسطے دستور سجدہ ہے
انسانیت کا دائمی منشور سجدہ ہے

سجدہ ہے وہ خیالوں کی تجدید جو کرے سجدہ ہے لا الہ کی تاکید جو کرے
خودساختہ خداؤں کی تردید جو کرے اللہ کے وجود کی تائید جو کرے
سجدہ عبادتوں کے تسلسل کا نام ہے
سجدہ سعادتوں کے تجمل کا نام ہے

سجدہ وہ ہے جو کرتا ہے تعمیر کربلا سجدہ وہ ہے جو کرتا ہے تحریر کربلا
سجدہ وہ خواب جسکی ہے تعبیر کربلا سجدہ وہ نور جسکی ہے تنویر کربلا
وہ کربلا جو دیتی ہے بندے کو آبرو
وہ کربلا جو دیتی ہے سجدے کو آبرو

وہ کربلا جو مکتبِ فکر و خیال ہے　　وہ کربلا جو سطوتِ جاہ و جلال ہے
وہ کربلا جو دین پرستوں کی ڈھال ہے　　وہ کربلا جو آج تلک بے مثال ہے
وہ کربلا جو کعبۂ عشاق بن گئی
بیمار دیں کے واسطے تریاق بن گئی

وہ کربلا جو پیاس سے دریا کو مات دے　　وہ کربلا جو عزم و عمل کو ثبات دے
تشنہ دہن ضمیر کو آبِ حیات دے　　بنجر زمینِ فکر کو موجِ فرات دے
وہ کربلا جو ظلم کو زیر و زبر کرے
ہر بے خبر کو دینِ مبیں کی خبر کرے

وہ کربلا جو ڈرتی نہیں سامراج سے　　وہ کربلا ہوئی جو رقم احتجاج سے
وہ کربلا جو زندہ ہے اپنے مزاج سے　　وہ کربلا جو لڑتی رہی تخت و تاج سے
اُس کربلا کے سارے ہی منظر نظر میں ہیں
رستے قیامتوں کے مسلسل سفر میں ہیں

ہاں کربلا طبیب ہے بیمار کے لئے　　زندہ خبر ہے فکر کے اخبار کے لئے
تمثیل بھی ہے ماضی کے ادوار کے لئے　　کردار ہے یہ مصحف کردار لے لئے
یہ کربلا ہے برقِ تجلی کہیں جسے
فرشِ زمیں پہ عرشِ معلیٰ کہیں جسے

یہ کربلا خطاب ہے خود ہی خطیب ہے　　یہ کربلا کمالِ بشر کی نقیب ہے
یہ کربلا ہے اس کا لہو بھی نجیب ہے　　دینِ خدا یہ کہتا ہے میرا نقیب ہے
دامن ہے اُس کے ہاتھ میں ہر احتیاط کا
دینِ خدا کو ڈر ہی نہیں انحطاط کا

اچھی نظم کی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں سے اشعار کم نہ کئے جاسکیں۔ شاعر زیدی کے اس مرثیے میں بھی یہ خوبی ہے کہ بند کم نہیں کئے جاسکتے۔ باوجود انتہائی احتیاط کی جو بند میں نے حذف کئے ہیں وہیں تسلسل اور روانی میں فرق محسوس ہوتا ہے۔ یہ شاعر زیدی کی خامی نہیں ہے میری مجبوری ہے۔ شاعر زیدی کا کلام تو جدید ترقی پسند فکر کی روشن مثال ہے۔ اللہ اُن کی توفیقات میں اضافہ کرے۔

☆☆☆☆☆

(دبستان پنجاب آئینۂ امروز)

ظہور جارچوی:- (لاہور)

ولادت ۱۹۱۵ء

نام سید ظہور حیدر۔ تخلص ظہور۔ وطن اور جائے ولادت جارچہ، ضلع بلند شہر، یو، پی۔ والد گرامی سید عیوض علی جوہر بھی شاعر تھے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور زندگی کی جدو جہد میں شریک ہو گئے۔ ۱۷ سال کی عمر میں محکمۂ ریلوے میں ملازم ہو گئے۔ گھر کا ماحول ادبی تھا۔ سوز خوانی، مرثیہ، نوحہ خوانی شروع کی تو ذہن میں اوزان و بحور نے جگہ بنائی اور ۱۲ برس کی عمر سے شاعری کا آغاز ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب ۱۲ برس کا بچہ اپنے والد یا کسی بزرگ کو غزل نہیں سنا سکتا تھا۔ والدین اور بچوں کے درمیان جتنا مضبوط محبت کا رشتہ ہوتا تھا اتنا ہی دبیز حجاب کا پردہ بھی ہوتا تھا۔ ظہور جارچوی نے تو ۱۹۲۵ کے لگ بھگ شاعری شروع کی تو اپنے والد گرامی کو اصلاح کے لئے غزل پیش نہ کر سکے اور حضرت اطہر لکھنوی سے سلسلۂ تلمذ وابستہ کیا۔ راقم الحروف کو تو بیسوی صدی کی پانچویں دھائی میں (جب زمانہ ظہور جارچوی کی غزل سے ربع صدی آگے بڑھ گیا تھا) یہ ہمت نہیں ہوئی تھی کہ اپنی پہلی غزل کی اطلاع والد محترم کو دے سکتا۔ وہ تو ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے یہ حجاب توڑا اور والد محترم اور علامہ نور لدھیانوی کو اس کی اطلاع دی۔ جملۂ معترضہ کی معذرت، بات ہو رہی تھی کہ ظہور جارچوی کے حضرت اطہر لکھنوی سے سلسلۂ تلمذ وابستہ کیا۔ بعد ازاں حضرت صفی لکھنوی سے اصلاح کی روشنی پائی۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آگئے اور لاہور میں آباد ہو گئے۔

لاہور آنے کے بعد شاعری نے ایک موڑ لیا اور سلام و قصائد کہنے لگے۔ خود سوز خواں تھے اس لئے ابتداء میں مرثیوں کے کچھ بند اپنی سوز خوانی کی ضرورت کے پیش نظر کہے۔ پہلا مرثیہ ۱۹۷۳ء میں کہا اور باقاعدہ مرثیہ گوئی کا آغاز ہو گیا۔ پہلے تین برس میں پانچ مرثیے کہے اور ۱۹۷۶ء میں اُن کا پہلا مجموعہ مراثی 'ظہور فکر' لاہور سے شائع ہوا جس میں پانچوں مرثیے شامل تھے۔

ظہور جارچوی نے بہت سے موضوعاتی مرثیے کہے ہیں جن میں "فقیہہ کربلا" (جو حضرت حبیب ابن مظاہر کے حال پر ہے) "سرکار امن" (در احوالِ امام حسنؑ) "سراج مودت" (زہیر قین کے حال پر) وغیرہ بہت اہم اور مقبول ہیں۔ ظہور جارچوی نے اپنے موضوعاتی

مرثیوں میں تاریخی حوالوں کا بھی خیال رکھا ہے اور استدلال بھی کیا ہے مثلاً ''سرکارِ امن'' میں امام حسنؑ کی امیر شام سے صلح کو ظہورؔ جارچوی نے تو امن کا بے مثال اقدام کہا ہے۔ صلحِ حسنؑ کے معاہدے کو دیکھیے تو پتہ چلتا ہے کہ امام حسنؑ کا یہ اقدام تاریخ انسانیت میں (صلح حدیبیہ کے بعد) بے مثال اور دُور رس ہے۔ ''فقیہہ کربلا'' میں ظہور جارچوی نے حبیب ابنِ مظاہر کی شخصیت کو اجاگر کیا ہے اور بتایا ہے کہ یزیدی فوج میں شامل زرخرید فقیہانِ کوفہ کے مقابل سب سے بزرگ، صادق اور بیباک مفتی اور فقیہہ حبیب ابن مظاہر تلوار اٹھاتے ہیں تو ان کا یہ عمل ایک عملی فتویٰ ہے کہ حسین مظلوم کی حمایت حق ہے، دین ہے اور رسول اکرمؐ سے نمک حلالی ہے اور حبیب ابن مظاہر جیسے بزرگ کو قتل کرنے والوں نے اپنے عہد کے مفتی اور فقیہہ کو قتل کر کے ایک فرد نہیں بلکہ دستور فقہ اور کتاب فتاویٰ کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مرثیے کے دو بند میں ظہورؔ جارچوی نے حبیب ابن مظاہر کا تعارف کرایا ہے۔

حبیب ابنِ مظاہر ملک صفات بشر نہ ڈالتے تھے جمالِ عروسِ زر پہ نظر
نہ قطب و غوث نہ ابدال تھے حبیب مگر تھے اپنے وقت کے سلمان و میثم و بوذر
اصول میں بہت آگے بڑھے ہوئے تھے حبیب
کتابِ اجرِ رسالت پڑھے ہوئے تھے حبیب

حبیب ابن مظاہر عظیم انساں تھے رفیق سبط پیمبر معین ایماں تھے
مرقعِ عمل و علم و زہد و عرفاں تھے امام حق کی نظر میں فقیہہِ دوراں تھے
وہ مقتدی کہ امامِ زماں سلام کریں
وہ اُمتی کہ نبی زادیاں سلام کریں

میدان کربلا میں نویں محرم کی رات کو حضرت قاسم کا نکاح کیا گیا یا نہیں؟ اس موضوع پر روایتوں میں اختلاف ہے اس روایت کے خلاف یہ دلیل دی جاتی ہے کہ تین دن کے بھوکے پیاسے گھرانے میں جہاں یہ فیصلہ ہو چکا ہو کہ کل صبح سب کو خدا کی راہ میں اپنی اپنی جان کی قربانی پیش کرنی ہے وہاں کسی کے نکاح یا شادی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس روایت کے حق میں جو علماء ہیں ان کی دلیل ہے کہ امام حسینؑ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بعد خانوادۂ رسالت کی جو خواتین قیدی بنائی جائیں ان میں کوئی لڑکی غیر شادی شدہ ہو۔ کربلا میں ایک ہی سیدانی غیر شادی شدہ تھی

جن کا نکاح قاسم ابن حسنؑ سے اس لئے کر دیا گیا کہ یہ شہزادی جب اسیر ہو تو بیوہ قاسم کہلائے اور ظالموں کی حریص اور بے عزت سوچ کی زد سے محفوظ رہے ۔ بہر حال اس اختلاف کا اثر مراثی پر بھی پڑا ۔ جیسے

داستانِ عقدِ قاسم جھوٹ ہے (محشر لکھنوی)

عقدِ قاسم جھوٹ کہہ کر چارہ گر جھوٹے ہوئے (ذاخر لکھنوی)

ظہور جارچوی نے اس عقد کی روایت کو معتبر تسلیم کیا ہے ۔

اس عقد کی خبر میں ہے ہر چند اختلاف لیکن جو غور کیجئے ہو جائے بات صاف
اس رمز کا ہوا ہے کچھ اس طرح انکشاف یوں کرتے اعتراض جو ہیں آج بھی خلاف
مانا کہ تھی عزیز نہ اولاد کی کمی
قربانیوں میں رہ گئی داماد کی کمی

ہوتا ہے اس مقام پر ایک اور بھی سوال تیرہ برس کی عمر تھی قاسمؑ تھے خورد سال
بچے کا عقد کرنے میں تھا کون سا کمال اس کا جواب دیتا ہے قرآنِ خوش مقال
قولِ حسینؑ کن فیکون کا نشان تھا
جب کہہ دیا جوان تو بچہ جوان تھا

اس عقد میں حسنؑ کی وصیت بھی تھی شریک مایوس اُمِ فروہؑ کی حسرت بھی تھی شریک
عزمِ حسینؑ کی اہمیت بھی تھی شریک یہ مصلحت بھی اور یہ غیرت بھی تھی شریک
بیوہ سمجھ کے ظلم سے باز آئیں گے لعین
قیدی بنا کے شام نہ لے جائیں گے لعین

ظہور جارچوی کا ایک مرثیہ حسینؑ اور آنسو ہے جسے وحید الحسن ھاشمی نے شائع کیا ہے ۔

کیوں نہ ہو پیشِ نظر جلوۂ تحریرِ دبیر کھینچنا چاہتا ہوں نظم میں تصویرِ دبیر
یا خدا دے مرے الفاظ کو تحریرِ دبیر مصرعۂ بیت میں ہو برش شمشیرِ دبیر
خیبر کے پاؤں میں تاجِ سرِ شر آجائے
رزم کا بزم کی آنکھوں میں سماں پھر جائے

اے دبیر اے چمنستان ادب کے بلبل ۳ ہم میں موجود ہے تو صورت خوشبوئے گل

نذر کرتے ہیں تجھے دل ترے شیدائی کل　　تل چکا شعر میں اب مدح کی میزان میں تُل

کل جو تھا بزمِ مودّت میں بہت وزن ترا

آج ہے محفلِ جنت میں بہت وزن تیرا

مدحتِ آلِ محمدؐ کا رہا تھا جو شغف　۴　بعد سو سال کے بھی کم نہ ہوا تیرا شرف

ایسے مسرور ہوئے تجھ سے شہنشاہ نجف　　لے گئے تجھ کو ملک عرشِ معلیٰ کی طرف

اوج قائم ترا، تا روزِ قیامت رکھے

اے سلامت تجھے، اللہ سلامت رکھے

اے دبیر آلِ پیمبرؐ کے ہوا خواہ دبیر　۵　بن گیا تو فلکِ چاردہ کا ماہ ، دبیر

طبع پائی تھی جو حق بین و حق آگاہ دبیر　　مرثیہ ہو گیا مقبول ترا، واہ، دبیر

دستخط کر دیئے مولا نے تری عرضی پر

فیصلہ چھوڑ دیا تیرا تری مرضی پر

تیری تقلید میں اب مرثیہ ہم لکھتے ہیں　٦　متوسط کبھی زائد کبھی کم لکھتے ہیں

حسبِ تفویضِ شہنشاہ امم لکھتے ہیں　　ہم تو کیا لکھتے حقیقت میں قلم لکھتے ہیں

وہ قلم لکھتے ہیں، مولا جو لکھا دیتے ہیں

ہم تو لکھا ہوا مجلس میں سنا دیتے ہیں

خامۂ صدق رقم کر وہ بیاں اشکوں کا　٧　سطحِ قرطاس پہ ہو سیل عیاں اشکوں کا

آج گلشن میں وہ بندھ جائے سماں اشکوں کا　　چشمِ نرگس میں بھی ہو آبِ رواں اشکوں کا

ابرِ غم چھائے برسنے لگیں فی الفور آنسو

مرثیہ لکھ دے بعنوان حسینؑ اور آنسو

اور ظہور جارچوی نے ''حسین اور آنسو'' مرثیہ لکھدیا اور یہ بھی بتایا کہ وہ ''دبستان دبیر'' کے پیروکار تھے۔ ظہور جارچوی نے پینتیس چالیس مرثیے کہے ہیں۔ ان کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ''ظہور فکر''۔ ''تحائف ظہور''۔ ''شعور و سوز مرثیہ''۔ ''جوشِ ظہور''۔ ''محروم گریہ'' ''سلام علی الحسین واصحابہ'' اور ارزاق ظہور شامل ہیں۔ تصانیف کی تعداد ۱۴ ہے

☆☆☆☆☆

محشر رسول نگری:- (کوئٹہ)

پیدائش،۱۹۱۶ء۔

پیشے کے اعتبار سے تاجر، شعر وسخن کے حوالے سے قادر الکلام شاعر۔ تصانیف کے حوالے سے ''نظامِ نو''۔ ''تیغ وقرآن''۔ ''مثنوی صحیفۂ فطرت'' اور ''فخر کونین'' کے مصنف، غزل اور نظم کے علاوہ نعت ومنقبت میں بھی مستند شاعر۔ مرثیے بھی کہے ہیں لیکن نہ جانے کیوں ان کے مراثی سامنے نہیں آئے جبکہ کوئٹہ ہی کے ایک شاعر آثر جلیلی کے مراثی سے شائقینِ مرثیہ واقف ہیں۔ بہر حال محشر رسول نگری کے ایک مرثیے کے چند بند بطور نمونۂ کلام نقل کئے جارہے ہیں۔

دنیا میں گھپ اندھیرا تھا ایسا کہ الاماں — ہر سو بھٹکتا پھرتا تھا ہستی کا کارواں
عالم تھا مرگ وزیست کے سنگم پہ نیم جاں — تاریکیاں عدم کی ڈراتی تھیں ہر زماں
اس پر یہ طرّہ کالی گھٹاؤں کا زور تھا
دل تھے مہیب مرگ اور طوفان کا شور تھا

ناگاہ بحرِ زیست کے طوفاں اُتر گئے — خالی تھے جو صدف دُرِ یکتا سے بھر گئے
لیلائے شب کے گیسوئے برہم سنور گئے — موجِ نسیمِ صبح سے چہرے نکھر گئے
ابرِ سیاہ مطلعِ عالم سے چھٹ گیا
ظلمت شکست کھا گئی پانسا پلٹ گیا

آیا ضمیرِ عالمِ امکاں میں انقلاب — جاگی بدن میں روح تو ٹوٹا طلسمِ خواب
کھولا کسی کے ہاتھ نے اک دورِ نو کا باب — ناگاہ نکلا مشرقِ بطحا سے آفتاب
ذرّے چمک کے منبعِ تنویر ہو گئے
انساں شکارِ حُسنِ جہاں گیر ہو گئے

یہ بند اور ان میں شاعرانہ تیور محشر رسول نگری کے معیارِ فن کا برملا اعلان ہی نہیں ہے بلکہ مرثیہ گوئی میں ان کی عظمت کے داعی بھی ہیں۔ سرزمین کوئٹہ بلوچستان سے تین مرثیہ گو شعراء کے نام وابستہ ہیں، آثر جلیلی، سردار نقوی اور محشر رسول نگری۔ اہل نقد ونظر اس بات پر متفق ہیں کہ ان تین مرثیہ گو شعراء نے تاریخ مرثیہ میں کوئٹہ بلوچستان کا نام روشن الفاظ میں لکھوایا ہے۔ پروفیسر

سردار نقوی اور آثر جلیلی پر، اختصار کے ساتھ ہی سہی، اس کتاب میں کچھ تو لکھا گیا ہے مگر یہ اعتراف تکلیف دہ ہے کہ محشر رسول نگری کا قرض ادا نہ ہو سکا۔

☆☆☆☆☆

خلش پیرا صحابی :- (بھکر ضلع میانوالی)

ولادت ۲۷ رنومبر ۱۹۲۱ء

جائے ولادت، قصبہ پیرا صحابی، بھکر، ضلع میانوالی (پاکستان)۔ ان کے والد محمد بخش خان بلوچ، اپنے علاقہ کے معزز زمیندار تھے۔

بھکر، میانوالی کے آس پاس بھی اردو نہیں ہے۔ کہیں یہ سراغ نہیں ملتا کہ خلش کا اردو زبان یا کسی اردو والے سے رابطہ قائم تھا حتیٰ کہ شاعری میں نجم آفندی کو استاد مانا تو ان سے بھی بذریعہ خط و کتابت کلام پر اصلاح لی۔ لیکن یہ نوبت تو اس وقت آئی ہوگی جب شعر گوئی اس منزل پر پہنچ گئی ہوگی جہاں اصلاح کی ضرورت پیش آئے۔ پھر وہ کیا محرکات تھے، کیا ترغیبات تھیں جنہوں نے خلش پیرا صحابی میں شعر گوئی کا ذوق اور جذبہ بیدار کیا؟ سوائے اس کے کہ "جسے اللہ نوازدے۔

خلش پیرا صحابی نے ۱۹۳۸ء میں شاعری شروع کی۔ ۱۹۴۶ء میں بذریعہ خط و کتابت حضرت نجم آفندی کو آمادہ کیا کہ وہ خلش پیرا صحابی کے کلام پر اصلاح دیں۔ اور یہ سلسلہ بذریعہ خط و کتابت ہی جاری رہا۔ ابتداءً غزلوں نظموں سے ہوئی۔ ابتدائی غزلوں کی اصلاح اسعد شاہجہاں پوری سے لیتے رہے۔ پھر حضرتِ نجم آفندی سے رشتہ استوار ہوا تو سلام، قصائد اور نوحوں کی طرف راغب ہوئے۔ راستہ نظر آیا تو قدم تیزی سے اُٹھنے لگے یہاں تک کہ مرثیہ گوئی کی فضا راس آ گئی۔ فکر میں انقلاب آ گیا۔ عظمتِ فکر و نظر پر فائز اُستاد نے راستے کی نشاندہی کی اور فکر کے دھارے کا رُخ مرکز فکر و نظر کی طرف موڑ دیا۔ خلش پیرا صحابی نے اس فکر کو پہلے مرثیے کا عنوان بنالیا اور پہلا مرثیہ ۱۹۶۶ء میں کہا جس کا عنوان تھا "انقلابِ فکر"۔ "طوفان، آندھی، زلزلہ، شر ہے ملوکیت"۔ مرثیے کی ۵۴ بند ہیں۔ وقت نے ثابت کیا کہ نجم آفندی اُن کے استاد ہی نہیں فکری رہنما بھی ہیں، ان کے کلام میں نجم آفندی کا رنگ جھلکتا ہے۔

ہر آنکھ کو ہے جلوۂ راحت کی آرزو ہر دل کو آستانِ محبت کی آرزو

دولت کی آرزو ہے نہ سطوت کی آرزو   اس دور کو ہے عہد مسرت کی آرزو
ہر سمت ظلم و خوف کی ظلمت ہے آج بھی
بہتر معاشرے کی ضرورت ہے آج بھی

چہروں پہ اعتماد کی ضو پھیلتی رہے   انساں کی طرح دہر میں ہر آدمی رہے
شاہی سے کم نہ مرتبۂ مفلسی رہے   نادار کی سماج میں عزت بنی رہے
جھومر ہو عظمتوں کا جبینِ حیات پر
انسان فخر کر سکے ذات و صفات پر

مجبوریوں کی دھوپ میں رہتے نہ ہو جواں   بھٹی میں درد و غم کی نہ جلتے ہوں اہل جاں
جذبات سے غریب کے کھیلے نہ حکمراں   خوف و ہراس کی نہ چلیں سُرخ آندھیاں
سوچوں کا رنگ روپ نکھرتا رہے سدا
ہر ذہن سے اُجالا اُبھرتا رہے سدا

خلش پیراصحابی ایک ہنرمند قادر الکلام اور وسیع المطالعہ شاعر ہیں۔ انہوں نے بہت سے موضوعاتی مرثیے کہے ہیں، کسی مرثیہ گو شاعر کی پرواز فکر کا اندازہ اس کے مرثیوں کے موضوعات سے بھی ہو جاتا ہے۔ خلش پیراصحابی نے جن موضوعات پر شعر گوئی کی ہے ان کا تعلق پرواز فکر سے یقیناً ہے۔ مثلاً انقلاب فکر' شعور زیست' مفکر اعظم' فلسفہ غم' معراج وفا' تہذیب کا ستارا' کربلا اور عصرِ حاضر' دھوپ اور کربلا' وغیرہ۔ ان مراثی میں ''دھوپ اور کربلا''۔ 'کربلا اور عصر حاضر' اور'' حسینؑ اور اسلام' ان کے شاہکار مرثیے ہیں۔ ''کربلا اور عصر حاضر'' پر ممتاز نقاد اسد اریب کی رائے ہے کہ:

''اس مرثیے کی نمایاں ادبی حیثیت یہ ہے کہ اسے جدید احساس کی نظم کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔''

خلش پیراصحابی کا دوسرا شاہکار مرثیہ ''حسینؑ اور اسلام'' ہے جو ۳۹۴ بند پر مشتمل ہے۔ اس مرثیے میں واقعۂ کربلا کا پس منظر اور اسباب سے ابتدا کر کے نہ صرف مقاصد کربلا، نتائج قربانیٔ حسینؑ بلکہ اس کے دور رس نتائج تک گفتگو کی گئی ہے۔ یہ مرثیہ ''جب سے ہوئی ہے خلقتِ دنیائے بے مدار'' ۱۹۷۱ء میں امامیہ کتب خانہ، لاہور نے شائع کیا تھا۔ مرتضیٰ حسینؑ

فاضل لکھنوی کے حقیقت آشکار قلم نے خلشؔ پیراصحابی کے اس طویل مرثیے میں تسلسل اور معنویت برقرار رکھنے پر انہیں سراہا ہے۔ اُن کے تیسرے اہم ترین مرثیے 'دھوپ اور کربلا' میں دھوپ، تپش، پیاس اور پیاسوں کے حوصلوں میں جو ربط پیش کیا گیا ہے وہ خلشؔ پیراصحابی کی اعلیٰ شاعری کا معیار نظر آتا ہے۔

عباسؑ مشک بھرنے کو دریا پہ جب چلے — تھے دھوپ میں علم کے پھریرے کھُلے ہوئے
خنجر جفا کے جور کے، ملتے رہے گلے — بولی فضائیں تم کو مبارک یہ حوصلے

دنیا کو راہ، صبر کی دکھلا گیا جری
پانی کی مشک بھر کے بھی پیاسا رہا جری

صدیوں کے بوجھ سے ہوئیں آزاد وسعتیں — شبّرؑ کا ماہ رو جو چلا راہِ شوق میں
زخموں کے لب پہ جم گئیں تھیں شکر کی تہیں — تن ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اللہ رے ہمتیں

قاسمؑ کی جنگ قوتِ کردار کی تھی جنگ
بادِستم سے پھول کی مہکار کی تھی جنگ

خلشؔ پیراصحابی صرف شاعر ہی نہیں ہیں، انہوں نے مرثیے پر تحقیق و جستجو بھی کی ہے۔ ان کا ایک مقالہ "سرائیکی مرثیہ نگاری کے چار سو سال" ۱۹۸۰ء میں میانوالی سے شائع ہوا تھا، اس کتابچے میں انہوں نے سکندر پنجابی کے سرائیکی زبان کے اشعار نقل کئے ہیں اور مرثیے پر اپنے معلوماتی اور تنقیدی مضامین بھی شاملِ اشاعت کئے ہیں۔ ان کا ایک مضمون "بیسوی صدی کا اردو عزائیہ ادب" معارف اسلام، لاہور میں شائع ہوا اور مرثیے کے اہل نقد و نظر نے اسے بہت سراہا ہے اس طرح خلشؔ پراصحابی مرثیہ گوئی کے ساتھ ساتھ مرثیہ کی مختلف جہتوں پر مصروف کار نظر آتے ہیں۔ خلشؔ پیراصحابی پنجاب میں مرثیہ نگاروں کی صفِ اوّل کے شاعر ہی نہیں پنجاب میں مرثیہ نگاری کے معماروں میں شامل ہیں، بھکر اور میانوالی کی سرزمین سے ابھرنے والے اردو زبان کے کسی شاعر کا یہ کہنا کہ ؂

"جھومر ہو عظمتوں کا جبینِ حیات پر
انسان فخر کر سکے ذات و صفات پر"

ایک ادبی معجزہ نہیں تو اور کیا ہے اور پھر خلشؔ پیراصحابی تو اردو کے علاوہ پنجابی اور سرائیکی میں بھی

مشقِ سخن کرتے ہیں۔ اردو زبان میں ان کی تصانیف حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) 'تہذیب ماتم' (۲) 'اسلام نامہ' (۳) شہرِ علم (۴) گلزارِ وفا' (۵) ابرِ غم (۶) چراغ فکر' (۷) حسینؑ اور اسلام (۸) عرفانِ غم (۹) دھوپ اور کربلا (۱۰) کربلا اور عصرِ حاضر (۱۱) کربل نگری (۱۲) سرائیکی مرثیہ گوئی کے چار سو سال (۱۳) ملتانی مرثیہ (۱۴) سرائیکی مرثیہ کے پانچ سو سال (۱۵) 'موج وحباب' (۱۶) بھکر کی تاریخ'' اور سید وحید الحسن ہاشمی کی تحقیق کے مطابق سات غیر مطبوعہ تصانیف خلش پیر اصحابی صاحب کی تحویل میں ہیں۔

☆☆☆☆☆

رضوان عزمی :- (اسلام آباد، پاکستان)

ولادت، سنہ ۱۹۲۱ء۔

نام سید رضوان حسن زیدی۔ تخلص عزمیؔ۔ آبائی وطن، امروہہ۔ ابتدائی تعلیم گھر میں ہوئی اس کے بعد ادیب ماہر اور انٹرمیڈیٹ کی اسناد حاصل کیں اور زندگی کی عملی جدوجہد میں شریک ہو گئے۔ ۱۹۴۰ سے ۱۹۴۸ء تک بسلسلۂ ملازمت میرٹھ میں رہے' انگریزی زبان میں ایک کہاوت ہے A man is known by the company he Keeps انسان کی پہچان اس کے احباب سے ہوتی ہیں جن میں وہ اٹھتا بیٹھتا ہے۔ رضوان عزمیؔ میرٹھ میں رہے تو مولانا قائم علی فانیؔ، شاہد نقوی قدرتؔ میرٹھی، سلیم احمد اور انتظار حسینؔ جیسی شخصیات سے قرب رہا۔ ۱۹۴۸ء میں الہ آباد تبادلہ ہو گیا تو عزمیؔ نے فراقؔ گورکھپوری، مجاز' جوشؔ اور مصطفیٰ زیدی (اس وقت کے تیغ الہ آبادی) سے ملاقاتوں کا سلسلہ استوار کر لیا۔ گویا بلند قامت ادبی شخصیات سے ملنا جلنا اس کا شعار رہا۔

رضوان عزمیؔ ۱۹۵۰ء میں کراچی آ گئے اور حکومت پاکستان کے ''انٹیلی جنس'' (محکمہ سراغ) رسانی سے وابستہ ہو گئے' کراچی میں اس وقت کی اردو شعر ادب کی بلند قامت شخصیات کے حلقہ میں رہے۔

۱۹۶۷ء میں عزمیؔ اسلام آباد چلے گئے جہاں ثمرؔ نظامی، نیساںؔ اکبر آبادی' مہرؔ اکبر آبادی' اور مرتضیٰ برلاس ایسے نامور شعرا سے میل جول رہا۔ رضواںؔ عزمی غزل گو شاعر تھے اور جہاں جہاں رہے اپنے عہد کے ممتاز شعراء کیساتھ ادبی محافل اور مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ ان کی

تصانیف حسب ذیل ہیں؛

(۱) دھوپ جلی شام (۲) اُس دن سے ڈرو

(۳) انمول جواہر (۴) ابوالفضل عباس

اردو نثر نگاری سے بھی ان کا تعلق رہا ہے۔ ان کے مضامین پاکستان کے اہم جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ پانچ برس سے نو برس کی عمر کے درمیان بچہ جو سنتا ہے وہ اس کے ذہن پر نقش ہو جاتا ہے۔ رضوان عزمی نے یہ عمر امروہہ کی مردم خیز سرزمین پر سادات کے ایک گھرانے میں ان بزرگوں کی زیر تربیت گزاری ہے جن کی صبح میر انیس کی مرثیے سے اور شام عزائے شبیر سے ہوتی تھی۔ پھر جوانی اور عمر کی پختگی کے دور میں جن شعراء کے ساتھ ان کا تعلق رہا ان میں سلیم احمد اور انتظار حسینؔ کے علاوہ بھی رثائی ادب کے شعراء ہیں پھر رضوان عزمی سوز و سلام اور مرثیہ کیوں نہ کہتے۔

رضوان عزمی امروہوی کا پہلا مرثیہ ''ذبح عظیم'' ہے جس کے کچھ بند نمونہ کلام کے طور پر درج ذیل ہیں ۔

آیا نظر ہلال محرم نصیب غم دیکھا ہے اس نے آل محمدؐ پہ ہر ستم

شبنم ہے اشکبار تو نرگس کی آنکھ نم تاروں کی انجمن میں چراغاں ہوا ہے کم

سنسار کا وہ روپ نہ حسن و جمال ہے

چہرے پہ آسمان کے حزن و ملال ہے

سنسان دشت، جاگتی راتیں، حدیث غم ۵ ہے صاعقہ مزاج فلک، خوگر الم

ہر دل میں ہے شراب حسینی کا کیف و کم عباسؑ ہیں اُٹھائے ہوئے حیدری علم

جاندادگان حق میں یہ جوش و خروش ہے

تیار جان دینے کو ہر جاں فروش ہے

عباس نے خیام حسینی لگا دئے ۱۲ ذرّات دشت کے مہ و اختر بنا دیے اوئے

راہ عمل سے خوف کے پتھر ہٹا دئے ہر قلب میں چراغ شہادت جلا دیے جلا دئے

صحرا کی تپتی ریت پہ سجدے ادا ہوئے
فہم و شعور و فکر کے در سب پہ وا ہوئے

حُر سر جھکا کے آئے ہیں فوج یزید سے　　اب لیں گے انتقام وہ دیں کے عنید سے
جنت کا در کھلے گا لہو کی کلید سے　　تبریک کی صدا ہے قریب و بعید سے
حُر کی خطا معاف کی آقا حسینؑ نے
سینے سے اپنے حُر کو لگایا حسینؑ نے

آنکھوں میں اشک، اشکوں میں طوفاں لئے ہوئے　۲۷　اکبر خموش ہیں دلِ سوزاں لئے ہوئے
قاسم ہیں اپنے ہاتھوں میں قرآں کئے ہوئے　　دونوں ہی کارزار کے ارماں لئے ہوئے
قربان جب حسینؑ کے انصار سب ہوئے
مولا سے پھر یہ دونوں اجازت طلب ہوئے

زہرا کا نورِ عین، دلِ بوتراب ہے　۳۴　باطل کے ہر سوال کا محکم جواب ہے
ہر منزلِ جہاد پہ یہ کامیاب ہے　　قتلِ حسینؑ، قتلِ رسالت مآب ہے
وجہ بقائے دیں ہے شہادت حسینؑ کی
واجب ہر اک بشر پہ ہے طاعت حسینؑ کی

زینب نے جبر و ظلم کا ایواں ہلا دیا　۳۷　کارِ حسینؑ اور بھی محکم بنا دیا
بے پردہ ہو کے ظلم سے پردہ اُٹھا دیا　　یوں مقصدِ شہادتِ عظمیٰ بتا دیا
بطلانِ حق کی اس نے کلائی مروڑ دی
ظلم و جفا کی آہنی دیوار توڑ دی

۴۸ بند کے اس مرثیے کی تکمیل ''ذبحِ عظیم'' کے حوالے سے ہوتی ہے۔ آخری بیت مرثیے کی روح ہے ۔

خونِ حسینؑ حق کے گہر رولتا رہا
نیزے پہ بھی حسینؑ کا سر بولتا رہا

(ہل من ناصراً ۔ وحید الحسن ہاشمی)

اور سرِ حسین آج بھی نیزے پر ہے اور آج بھی بول رہا ہے۔ جب تک انسانیت ظلم و

جبر کے تصرّف میں ہے۔ جب تک انسان، ظلم کی حکومت کو ماننے پر مجبور ہے اس وقت تک حسینؑ کا سر نیزے پر ہے اور حسینؑ کی آواز آرہی ہے

"ہے کوئی جو میری مدد کرے"

☆☆☆☆☆

اثر ترابی:- (لاہور)

ولادت ۱۹۲۶ء

مشہور سوز خواں اور ذاکر، فیروز علی کربلائی کے فرزند نے اپنے نام کے ساتھ ترابی لکھ کر اس راہ پر عزم سفر ہونے کی تصدیق کردی جس پر اُس کے مردِ مومن والد گامزن تھے۔ اثر ترابی نے اپنے والدِ گرامی کی آواز سے آواز ملا کر سوز خوانی سے ابتدا کی۔ میر انیس کے مرثیے مرثیہ خواں کے مزاج میں جو نغمگی اور صوتی آہنگ بھر دیتے ہیں اُس کا نتیجہ شعر گوئی کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہی کچھ اثر ترابی کے ساتھ ہوا۔ سوز خوانی کرتے کرتے شاعری شروع کردی۔ کربلا کی خاک پر نثار، فیروز کربلائی کو کیسے گوارا ہوتا کہ اُن کا فرزند، کامل بلکہ اکمل شخصیات کو نظر انداز کرکے ناکامل اور فانی حُسن کی تعریف کرے۔ باپ نے بیٹے کو سمجھایا، روشنی کی راہ دکھائی، درد کی سوغات دی اور غم کا اُجالا بیٹے کے لہو میں اُتار دیا۔

اثر ترابی نے غزل گوئی چھوڑ دی۔ رباعیات، سلام اور مرثیے کہنے لگے۔ ابتدا میں سوز خوانی کے لئے مرثیے کہے۔ یہ وہ دور تھا جب مرثیوں میں اختصار کی روش چلی تھی۔ اثر ترابی نے اس فکر سے بھی اثر لیا اور دوسری وجہ یہ کہ سوز خوانی میں سوز وسلام کے ساتھ پندرہ بیس بند سے زیادہ پڑھا نہیں جاسکتا لہٰذا اثر ترابی نے مرثیہ کو مختصر کیا۔ یہاں تک کہ ۱۵ سے ۲۱ بند کے درمیان سمیٹ لیا جب کہ یہ اختصار سوز خوانی کے مقصد کے تحت کہے گئے مرثیوں کے لئے تو ہوسکتا ہے کہ بہتر ہو لیکن عام قاری یا سامع کے لئے ایسے مرثیوں میں وہ تاثر پیدا نہیں ہوتا جس کی توقع لیکر مرثیے، پڑھے یا سُنے جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مرثیے کے صاحبان نقد ونظر نے اثر ترابی پر وہ کچھ نہیں لکھا جس کا وہ بہر حال استحقاق رکھتے ہیں۔ وہ صاحب دیوان مرثیہ گو ہیں۔ اُن کا مجموعہ مراثی 'تائید جبریل" کے نام سے شائع ہوگیا ہے۔ جسے امامیہ کتب خانہ، لاہور نے شائع کیا ہے۔ "تائید جبریل" میں اُن کے دس مراثی ہیں۔

آثر ترابی نے کم و بیش (۳۰) تیس مرثیے کہے ہیں جن میں سوز خوانی کے پیش نظر کہے ہوئے مختصر مرثیے بھی شامل ہیں اور مرثیے کی مروّجہ نہج پر کہے گئے طویل مرثیے بھی ہیں۔ جیسا کہ ذکر میں آیا، اہلِ نقد و نظر نے اُن کی تعلیم اور اُن کوالف کے متعلق زیادہ نہیں لکھا۔ یہ بھی امکان ہے کہ اہلِ زبان کے تفاخر نے فیصلہ دیا ہو کہ اُن کے مرثیوں میں الفاظ کا غیر مروّجہ تلفظ نظم کیا گیا ہے جبکہ "غیر مروّجہ" کی وضاحت یہ بھی ممکن ہے کہ پنجاب میں بعض الفاظ کا روز مرّہ بات چیت میں تلفظ بدل گیا ہے جو اثر ترابی نے جوں کا توں نظم کر دیا ہے۔ اہلِ علم کا اعتراض اس تناظر میں بجا ہے کہ پنجاب کے ممتاز اہلِ قلم نے اردو الفاظ کے ذخیرۂ الفاظ، تلفظ اور الفاظ کے استعاراتی اور حوالہ جاتی استعمال میں زبان کی جملہ نزاکتوں کی حفاظت کی ہے۔ آثر ترابی اگر زبان کے پہلو پر بھی توجہ دیتے تو ایسی غلطیاں نہ ہوتیں۔

اے صلِ علی منزلت سبط پیمبر — بچپن میں ہی آتے تھے نظر علم کے پیکر
سائل کے سوالوں کے جوابات تھے اکثر — "فقہائے زمانہ" بھی ذہانت پہ تھے ششدر

لیکن کیا کسی اہلِ زبان نے پنجاب کے اس شاعر کی زبان کی اصلاح کی کوشش کی؟ کبھی کوئی مشورہ دیا جسے آثر ترابی نے تسلیم نہ کیا ہو۔ راقم کی نگاہوں کے سامنے آثر ترابی کا عجز و انکسار ہے۔ تائید جبریل" میں کربلائی کے فرزند بوترابی نے اپنے عجز کا مظاہرہ کیا ہے جو ارضِ کربلا پر سجدہ گزاری کا انعام ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اردو میری اکتسابی زبان ہے۔ مادری زبان نہیں جہاں تک واقعات نگاری کا تعلق ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ صحیح روایات سے نہ ہٹوں۔" ("تائید جبریل، ص۔۲۱)

"آثر ترابی کا ایک مرثیہ حضرت ابوذر غفاری پر ہے۔ یہ وہ صحابیٔ رسول اکرم ہیں جن کے لئے ارشاد ہوا تھا کہ اُن سے زیادہ سچا انسان روئے زمین پر نہ تھا۔ اور پھر بعدِ رسولؐ اُن کے اور مسند خلافت کے درمیان جو فاصلہ پیدا ہوا اُس کی تفصیل رقم کرنے کا کس میں حوصلہ ہے۔ اثر ترابی نے اس نازک موضوع پر مرثیہ کہا ہے۔ اور حضرت ابوذر غفاری کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

اُن کا ایک مرثیہ حضرت بلالؓ پر ہے۔ بلالِ حبشی۔ اسلام کے پہلے موذّن، صحابیٔ رسول۔ جن کی حیاتِ بعدِ رسولؐ کے متعلق بہت سے سوالات ایسے ہیں جن کا جواب نہیں ملتا۔ علامہ ضمیر

اختر نقوی نے اثر ترابی کے مرثیے کے حوالے سے یہ سوالات دہرائے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''حضرت بلالؓ کا کردار تاریخ اسلام میں تحقیق طلب ہے۔ رسولِ اکرمؐ کی حیات تک اُن کے حالاتِ زندگی تاریخ کی تمام کتابوں میں ملتے ہیں لیکن رسولِ اکرمؐ کے وصال کے بعد اچانک بلالؓ تاریخ کے اوراق میں گُم ہو جاتے ہیں، مورخ انھیں نظر انداز کرتا ہے یہاں سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ انھوں نے مدینہ کیوں چھوڑا؟ دوبارہ مدینے آئے تو انھیں نکال دیا گیا یا انھوں نے مدینے میں رہنا پسند نہیں کیا؟ بلال کی قبر مدینے سے دور شام و لبنان کی سرحد پر کیوں بنی۔ انھیں رسولِ اکرمؐ کا پہلو کیوں نصیب نہ ہو سکا؟ رسولِ اکرمؐ کی وفات کے بعد بلالؓ نے خود اذان دینا پسند نہیں کیا یا انھیں منع کر دیا گیا کہ اب تمہاری ضرورت نہیں؟ یہ تمام سوالات انتہائی اہمیت کے حامل ہیں اور مورخ و محقق سے انصاف طلب ہیں۔ اثر ترابی نے بعض سوالات کے جواب تاریخی کڑیوں کو ملا کر دینے کی کوشش کی ہے لیکن اُنھوں نے اختصار سے کام لے کر ایک علمی کارنامے کو ادھورا چھوڑ دیا ہے۔''

مرثیے کے آغاز میں اثر ترابی نے حضرت بلالؓ کی مدح اس طرح کی ہے:

سرمایۂ شرافت و عزت بلالؓ ہیں　　سرتا بپا خلوص و مروت بلالؓ ہیں
قول و عمل سے قائلِ حجت بلالؓ ہیں　　دل سے نثارِ ختمِ نبوت بلالؓ ہیں
قرآں کی آیتوں سے سدا باخبر ہیں آپ
کیا شان ہے صحابیِ خیر البشر ہیں آپ

پروانۂ جمالِ رسولِؐ خدا بلالؓ　　دیوانۂ کمالِ رسولِؐ خدا بلالؓ
مستانۂ خصالِ رسولِؐ خدا بلالؓ　　وارفتۂ خیالِ رسولِؐ خدا بلالؓ
جن کی اذاں رسولِؐ خُدا کو پسند تھی
اُن کو پسند تھی تو خدا کو پسند تھی

رسولِ اکرمؐ کی وفات کے بعد اچانک حضرت بلال نے مدینہ چھوڑ دیا۔ بلال حضرت

علیؑ سے رخصت ہو رہے ہیں۔ اثر ترابی اس تاریخی منظر کو اس طرح پیش کرتے ہیں:-

باب علیؑ پہ آکے پکارے یہ پھر بلالؓ　　اے وارث زمین و زمن مصطفیٰؐ کی آلؑ
میں جا رہا ہوں آج مدینہ سے پُر ملال　　ہے آپ سے بچھڑنے کا صدمہ مجھے کمال
بارِ دگر شرف نہ یہ شاید حصول ہو
یہ آخری سلام ہے میرا، قبول ہو

شیرِ خدا نے رو کے گلے سے لگایا　　فرمایا اے بلالؓ ہمیں چھوڑ کر نہ جا
کی عرض اے ولیٔ خدا شاہِ لا فتا　　بدلا ہوا ہے رنگ دیارِ حبیبؐ کا
جو زیر دست تھے وہ زبر دست ہو گئے
دولت کا یہ نشہ ہے کہ بدمست ہو گئے

مرثیہ نہایت مختصر ہے لیکن چند تاریخی اشارے نہایت اہم ہیں۔ بلال حبشی کچھ دنوں کے بعد پھر مدینے واپس آتے ہیں۔ جب جناب فاطمہ زہراؑ کو ان کے آنے کی خبر معلوم ہوتی ہے تو آپ اپنے صاحبزادوں کے ذریعے بلالؓ سے اذان سننے کی خواہش کرتی ہیں:-

رونے لگے موذنِ سلطان انبیاء　　حسنینؑ نے بلالؓ کا دامن پکڑ لیا
بولے کمالِ درد سے زہراؑ کے دلربا　　بعد سلام آپ سے اماں نے ہے کہا
خلقِ خدا کو پھر وہی منظر دکھایئے
مسجد میں جاکے آج اذاں تو سنایئے

عام طور سے یہ روایت مشہور ہے کہ بلالؓ کو اذان کے درمیان روک دیا گیا کہ رسولؐ کی بیٹی کو غش آ گیا ہے لیکن یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے کہ اہلبیتؑ کی کسی فرد نے بلالؓ کو روکا تھا یا حکومت وقت نے روک دیا تھا کہ اب اگلا جملہ مت ادا کرو۔ اب مدینے میں تم "غدیرِ خم" والی اذان نہیں دے سکتے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ بلال اسی دن پھر مدینے سے چلے گئے اور پھر کبھی واپس نہیں آئے۔ اگر شاعر کی نظر میں پوری تاریخ ہوتی تو مرثیہ شاہکار ہوتا"

(اردو مرثیہ پاکستان میں۔ ص ۴۹۳۔۴۹۵)

علامہ ضمیر اختر نقوی کے خیال کے مطابق شاعر کی نظر میں حضرت بلالؓ سے متعلق پوری تاریخ نہیں تھی۔ اس کا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تاریخ شاعر کی نظر میں ہو بھی کیسے سکتی تھی

جو لکھی ہی نہیں گئی اور لکھی گئی تو سلاطین واہل منصب کی پیشانیاں شکن آلود ہوئیں لہٰذا امتادی گئی۔

کاش کوئی نقاد اثرؔ ترابی کے جذبوں کا قرض ادا کرے۔ فیروز علی کربلائی کے وارث، "ترابی" کو اس کا حق دے۔ اثر ترابی پر لکھے اور حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت بلالؓ کی وہ تاریخ لکھدے، جو قرطاسِ وقت پر تو لکھی ہوئی ہے مگر تاریخ کے صفحات پر نہیں ملتی۔

☆☆☆☆☆

نیساں اکبر آبادی:- (راولپنڈی)

پیدائش ۱۹۲۳ء

نام، سید علی عباد۔ تخلص، نیساںؔ۔ وطن، آگرہ (اکبرآباد)۔ ایک ایسے باعلم گھرانے کے فرد جس کے افق تاریخ پر کئی چاند سورج طلوع ہوئے۔ نیساںؔ کے والد گرامی سید اسماعیل حسین نیرؔ اکبرآبادی کا شمار عظیم شعراء میں ہوتا ہے۔ اُن کے نانا سید وقار علی عروجؔ اپنے عہد کے ممتاز شاعر تھے۔ اُن کے دادا، دادی، چچا، ماموں بھی شاعر تھے۔ نجم آفندی بھی نیساںؔ اکبرآبادی کے ماموں تھے۔ ایسے روشن گھرانے میں تربیت پاکر بھی نیساںؔ شعروسخن سے دور رہتے تو انہونی ہوتی۔ اُن کے نانا صرف شاعر ہی نہیں بلکہ مرثیہ گو شاعر اور فن تاریخ گوئی میں مہارت رکھتے تھے۔ راقم الحروف نے یہاں "شاعر ہی نہیں بلکہ" "مرثیہ گو" کہہ کر" شاعر اور مرثیہ گو شاعر میں تفاوت برتا ہے" جو کسی ذہن پر گراں گذرے تو معذرت لیکن مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ میری نظر میں مرثیہ نگاری عام شاعری کے مقابلے میں دشوار عمل ہے۔ اور یہی بات میں ایک سے زیادہ مرتبہ تحریر کرچکا ہوں۔

صاحبو! نیساںؔ اکبرآبادی نے مرثیہ گوئی اور تاریخ نگاری دونوں فن اپنے نانا سے براہ راست حاصل کیے۔ یوں بھی تاریخ گوئی سے رشتہ نہ ہو تو مرثیہ تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ مرثیے کا اہم حصہ تاریخی واقعات کو منظوم کرنا ہے۔ نیساںؔ اکبرآبادی بدیہہ گو شاعر ہیں۔ چاہیں تو گفتگو نظم میں کرسکتے ہیں، باتوں باتوں میں تاریخ نکال دیتے ہیں۔ دنیاوی طور پر بہت سے شعراء ادبا کے لئے قطعہ تاریخ کہہ ڈالے ہیں۔ انہیں یہ سعادت ملی کہ انہوں نے چہاردہ معصومین علیہ السلام کی ولادت وشہادت کی تاریخیں کہی ہیں۔

نیساںؔ اکبرآبادی استاد شاعر ہیں۔ حمد ونعت، سلام، قصائد، منقبت کے مستند شاعر ہیں

مرثیہ نگاری میں بھی اُن کا اہم مقام ہے۔ اُن کی درج ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو اُن کی عظمتِ شعر گوئی پر دلالت کرتی ہیں۔

(۱) "نہج البلاغہ" کا منظوم ترجمہ ۱۹۹۶ء

(۲) صحیفۂ کاملہ کا منظوم ترجمہ ۱۹۹۶ء

(۳) قرآن حکیم کے تین پاروں کا ترجمہ کر چکے ہیں۔

اُن کی مرثیہ گوئی کے شاہکاروں میں ایک شاہکار مرثیہ "حسینؑ" ہے۔ جس کے چند بند نمونے کے طور پہ نقل کرنے کی سعادت حاصل کی جارہی ہے۔

اے قلم قرطاس ابیض پہ روانی تو دکھا — اے طبیعت جوشِ مدحت کی جوانی تو دکھا
اے زباں اپنی ذرا معجز بیانی تو دکھا — مختصر لفظوں میں معراجِ معانی تو دکھا

یوں گل افشاں ہو کہ جھومے وجد میں آ کر بہار
شاہدِ مضموں کے چہرہ پر بھی آ جائے نکھار

لب سے پہلے حمدِ باری میں زبانِ عجز کھول — بات کچھ کرنے سے پہلے عقل کی میزان تول
گر سخن رکھنا ہے شیریں صدق کی مصری کو گھول — صاف اور سیدھے ہوں مضموں جن میں کچھ آئے نہ جھول

وہ روانی ہو کہ دریا کی روانی ماند ہو
یوں جواں ہو فکر پھولوں کی جوانی ماند ہو

حمد ہے مقصود اس کی جو ہے ربِّ کائنات — جس کا ثانی ہی نہیں کوئی ہے یکتا جس کی ذات
قبضۂ قدرت میں جس کے رشتۂ مرگ و حیات — دائرے میں عقل کے آتیں نہیں جس کی صفات

جب حدِ ادراک سے بھی دُور ہو ذاتِ خدا
پھر بھلا کیا آدمی کا ساتھ دے فکرِ رسا

ہاں مگر اس تک پہنچنے کے لئے ہے اک سبیل — جو زمانے میں خدا کے بعد ہے ذاتِ جلیل
صورتِ انساں ہی ہے قدرت کا اک عکسِ جمیل — لاجواب و بے مثال و بے نظیر و بے عدیل

جس کا معیارِ عمل تقدیرِ انساں بن گیا
وہ محمدؐ جس کا ایک اک لفظ قرآں بن گیا

مصطفیٰ کا دوست جو ہے وہ خدا کا دوست ہے — جو خدا کا دوست ہے وہ مصطفیٰ کا دوست ہے

مصطفیٰ اس کے ہیں جو مشکل کشاء کا دوست ہے　　ہیں علیؑ اس کے، جو شاہ کربلا کا دوست ہے

ان سے جو رکھے گا الفت اس کا بیڑا پار ہے
قول احمد ہے یہ کس کو جرات انکار ہے

وہ دکھا زور قلم لطف فصاحت بھی ملے　　گرمیٔ شعر و سخن سے اک حرارت بھی ملے
سوز شعلہ اور شبنم کی لطافت بھی ملے　　فکر انسانی کو غم فہمی کی دعوت بھی ملے

کونسا غم ہوگیا ہے جو محیط کائنات
جس کے بل بوتے پہ کر سکتے ہوں حاصل ہم نجات

ہاں اسی غم سے ہمیں ملتا ہے لطف زندگی　　دور ہو جاتی ہے اس غم سے دلوں کی بے کلی
ہاں اسی غم سے تو ملتی ہے ہمیں آسودگی　　ہاں اسی غم کی ضیاء سے قلب میں ہے روشنی

ہم نے پایا ہے اسی سے جو ہے شاہ مشرقین
جو ہے جان مصطفیٰ اسم گرامی ہے حسینؑ

منزل علم و عمل کا جو تھا راہی وہ حسینؑ　　جادۂ حق کا تھا جو بانکا سپاہی وہ حسینؑ
جس کی مظلومی نے ڈھایا قصر شاہی وہ حسینؑ　　جس کی ٹھوکر میں تھا ناز کج کلاہی وہ حسینؑ

فقر کے عالم میں بھی تھا جو امیروں کا امیر
جس کی ڈھونڈے سے زمانے میں نہیں ملتی نظیر

جیسا کہ عرض کیا ایک بند سے دوسرے بند کا ربط باہمی مضبوط ہے۔ جہاں سے ذکر حسین شروع ہوا وہاں سے ۷ بند حسینؑ کی عظمت کے پہلو نظم کرنے کے بعد یزید کا کردار۔ حق و باطل کے مزاجوں کا فرق۔ حالات جو حسینؑ کو کربلا میں لائے۔ امام حسینؑ کا اتمامِ حُجت کے بعد آخری حملہ جس میں کشتوں کے پشتے لگا دئے۔ ان بندوں کو edit نہیں کیا جا سکتا اور سارے بند نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے لہٰذا جنگ کا آخری منظر نامہ دیکھئے۔

آئی کانوں میں صدائے غیب اے پیارے حسینؑ　　راحت قلب و جگر اے آنکھ کے تارے حسینؑ
رنگ لاکر ہی رہیں اُ گے خون کے دھارے حسینؑ　　دل شکستہ غمزدہ اے درد کے مارے حسینؑ

جنگ سے اب ہاتھ اپنا کھینچ لے جانِ رسول
پیشِ داور ہو چکیں قربانیاں تیری قبول

یہ صدا سنتے ہی رکھ لی میان میں اپنی حسام ہاتھ کھینچا جنگ سے گھوڑے کی بھی روکی زمام
آگئے فرشِ زمیں پر پھر شہ عالی مقام حق پہ کٹ مرنے کا دنیا کو دیا انمٹ پیام

اس طرف تو بہر طاعت شاہِ دیں کا سر جھکا
اس طرف بہرِ ہلاکت شمر کا خنجر جھکا

حسینؑ شہید ہوگئے۔ کربلا میں شام ہوئی۔ شامِ غریباں آئی۔ زینب ایک ٹوٹی ہوئی تلوار ہاتھ میں لئے پہرہ دے رہی ہیں۔ یہاں عیسیٰؔ اکبرآبادی نے تاریخ کا ایک اور باب نظم کیا ہے۔ جناب زینب نے دیکھا کہ ایک سوار، لٹی ہوئی سیدانیوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ زینب اُسے للکارتی ہیں۔ سوار آگے بڑھتا جاتا ہے۔ شیرِ خدا کی بیٹی کو جلال آتا ہے۔ آگے بڑھ کے لگام پر ہاتھ ڈالتی ہیں۔ ''خبردار! جو تم آگے بڑھے۔ عباسؑ نہیں۔ علی اکبرؑ نہیں۔ بھائی حسینؑ نہیں مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کوئی تمہارا راستہ نہیں روک سکتا۔ اس کے بعد عیسیٰؔ اکبرآبادی کے دئے ہوئے الفاظ پڑھیئے۔

یہ صدا سن کر نقاب رخ الٹ دی دفعتاً حضرت زینبؑ نے دیکھا ہیں علیؑ خیبر شکن
دیکھ کر حیراں ہوئی وہ کشتۂ رنج و محن اس قدر حیراں کہ گویا سلب تھی تابِ سخن

کچھ نہ پوچھو چند لمحے کیا قیامت ڈھا گئے
ہائے بابا کہہ کے پھر آنکھوں میں آنسو آگئے

یہ مرثیہ تاریخِ کربلا کا ایک باب ہے جسے عیسیٰؔ اکبرآبادی باکمال شاعر اور تاریخ گوئی کے ماہر نے نظم کیا ہے۔ یہی آن بان عیسیٰؔ اکبرآبادی کی پہچان ہے۔

☆☆☆☆☆

شاد گیلانی :- (شورکوٹ۔ پنجاب)

پیدائش ۱۹۲۴ء

نام، غلام عباس۔ تخلص شادؔ۔ جائے ولادت، شورکوٹ (مغربی پنجاب)

طب یونانی اور ہومیوپیتھی سیکھی۔ نصف درجن سے زیادہ کتابیں لکھیں مگر آج گمنام ہیں؛

(۱) علیؑ علوم کی روشنی میں۔

(۲) خلافت اور خمِ غدیر

(۳) علی اور انبیاء

(۴) بشر اور نُور

(۵) ثانیٔ علی

(۶) قرآن اور اہلبیت۔

اتنی ڈھیر سی کتابوں کے مصنف اور مرثیہ گو شاعر کے کوائف میسر نہیں۔ اُنہیں بھی میسر نہیں جو پنجاب میں مرثیہ نگاری پر کام کر رہے ہیں۔ راقم السطور کو اُن کے مرثیے ''قرآن اور اہلبیت'' کی تلاش تھی۔ احباب کو خطوط لکھتے۔ جاننے والوں کے دروازوں پر دستک دی صرف سید حیدالحسن ہاشمی کی لکھی ہوئی ۶ سطریں اور مرثیے کا ایک بند مل سکا جو نقل کیا جا رہا ہے یہ مرثیہ حضرت علی اصغر کے احوال کا ہے۔

اصغر شجر طیبہ کی ایک کلی تھا
وہ غنچۂ نورستۂ گلزارِ علیؑ تھا
نادان نہ کہو وہ تو علیم ازلی تھا
معصوم علی ابن ولی، ابنِ ولی تھا
صحرا کی کڑی دھوپ میں گو جان سے گزرا
دیکھو تو مگر غور سے کس نشان سے گذرا

اس حوالے سے شاد گیلانی ایک مرثیے کے شاعر ہیں۔

☆☆☆☆☆

حیدر گردیزی:- (ملتان)

ولادت ۱۹۲۶ء

ملتان کے معروف گردیزی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ایف، اے تک تعلیم حاصل کی۔ ایک زمانہ تھا جب جاگیردار اور خوش حال گھرانوں میں اتنی تعلیم بھی کافی سمجھی جاتی تھی۔ حیدر گردیزی کو بچپن سے شاعری کا شوق بتایا گیا ہے۔ لیکن اُنہوں نے کسی کی شاگردی نہیں کی۔ اُن کے سر پر کسی ''اُستاد'' کی چھتر چھایا نہیں ہے شاید اسی لئے ''سیانوں'' کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ حیدر گردیزی کے کلام میں ناہمواری ہے جبکہ ان کی استطاعتِ شعر گوئی کی شاہد اُن کی چار کتابوں کے

نام نظر آتے ہیں۔

(۱) لا فتیٰ الا علی۔

(۲) لی خمسۃ

(۳) چاندنی کے ورق۔

(۴) مرثیہ حبیب ابن مظاہر

نمونہ کلام:

اے اشہب قلم ذرا جولانیاں دکھا　　نقطے کی سرزمیں پہ تو سلطانیاں دکھا
سطروں میں اپنی شوخ فراوانیاں دکھا　　کاغذ پہ حرف حرف کی تابانیاں دکھا
تحریر کے وجود کو ایسا جمال دے
ایک ایک لفظ نور کے سانچے میں ڈھال دے

صرف ایک بند سے اندازہ ہوتا ہے کی حیدر گردیزی، میدانِ غزل کے بھی شہسوار ہیں۔ نقطے کی سرزمیں پہ سلطانیاں، سطروں میں شوخ فراوانیاں قسم کے قوافی سے حیدر کی شاعری کا تغزل جھلکتا ہے۔ پنجاب کی جدید غزل میں اس رنگ کی قافیہ پیائی ہوتی ہے۔

ایک بار پھر احساس ندامت کی حیدر گردیزی کا کوئی مرثیہ نہ مل سکا۔

☆☆☆☆☆

عاصی کرنالی:- (ملتان)

ولادت ۱۹۲۷ء

نام، شریف احمد۔ تخلص عاصیؔ۔ وطن کرنال (ہریانہ) بھارت کی تقسیم کے وقت کرنال مشرقی پنجاب میں شامل تھا جہاں کی مسلم آبادی کو پاکستان منتقل کرنے کے احکامات صادر ہوئے تھے اور سیاستدانوں نے محفوظ کمروں میں بیٹھ کر انتقال آبادی کے جس فارمولے کو اپنایا اس کے تحت لاکھوں انسانوں کا ''انتقال'' ہوا۔ عاصیؔ کرنالی بھی انہیں قافلوں میں سے کسی ایک قافلے میں شامل تھے جن میں سے کچھ ناگفتہ بہ حالات میں پہنچے اور کچھ منزل پہ پہنچنے سے پہلے ہی کٹ گئے تھے۔ جو بچے کھچے لوگ پاکستان پہنچے اُن میں عاصیؔ کرنالی بھی تھے جو ملتان آئے اور وہیں بس گئے۔

دنیائے علم و ادب میں پروفیسر عاصیؔ کرنالی محتاج تعارف نہیں ہیں۔ اکے برعکس اگر

کوئی ادیب یا شاعر اُن کے نام سے یا اُن کے کام سے واقف نہیں تو اس کی اپنی حیثیت سوالیہ نشان کی مد میں آتی ہے۔ تعلیمی اعتبار سے ڈاکٹر عاصیؔ کرنالی ایم۔اے (اردو) ایم اے (فارسی) کر چکے ہیں اور اب ۱۹۹۸ء میں اُنہوں نے ''اُردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر'' کے زیر عنوان ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی ہے۔ اُن کی پی ایچ ڈی کی سند حاصل کرنے کا دن اور تاریخ ہمیں برطانیہ میں رہتے ہوئے بھی یاد ہے وہ اس لئے کہ ہم نے ۴را کتوبر ۱۹۹۸ء کو لندن میں جوش ملیح آبادی پر ایک سیمنار منعقد کیا تھا جس میں بیرونی ممالک سے چوبیس اکابرین اردو نے شرکت کی تھی۔ اس جشن میں حضرت عاصی کرنالی بھی مدعو تھے اور اُن کے ایک نیاز مند اور محبت کرنے والی شخصیت قمرؔ زیدی نے ذمہ داری قبول کی تھی کہ وہ عاصیؔ کرنالی کے ہم سفر ہوں گے اور انہیں لندن لائیں گے لیکن اس روز حضرت عاصیؔ کرنالی تشریف لائے نہ قمر زیدی اور بعد میں معلوم ہوا کہ جب ہم اُن کا لندن میں انتظار کر رہے تھے وہ اپنی پی ایچ ڈی کی سند وصول کر رہے تھے۔

پروفیسر عاصیؔ کرنالی راقم الحروف سے صرف پانچ برس بڑے ہیں لیکن علم و ادب میں ہزار سال بڑے ہیں۔ ہم دونوں نے ایک سرزمین کا پانی پیا ہے۔ ایک علاقے میں جنم لیا ہے لیکن، ذرہ ذرہ ہے اور آفتاب، آفتاب ہے۔ آفتاب علم و ادب پروفیسر عاصیؔ کرنالی پر گفتگو کی جائے تو وہ گفتگو کم از کم ایک کتاب کی متقضی ہے لہٰذا مختصر تعارف میں اُن شاعری یا انکی مرثیہ گوئی کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر عاصیؔ کرنالی کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

(غزلیات)

(۱) رگ جاں ۱۹۵۶ء　(۲) جشنِ خزاں ۱۹۶۸ء

(۳) چمن ۱۹۸۶ء　(۴) میں محبت ہوں ۱۹۹۳ء

(حمد و نعت منقبت)

(۵) مدحت ۱۹۷۶ء　(۶) نعتوں کے گلاب ۱۹۸۶ء

(۷) جادواں ۱۹۸۸ء　(۸) حرف شیریں ۱۹۹۳ء

(افسانہ)

(۹) چہرہ چہرہ کہانی ۱۹۸۱ء

(طنز و مزاح)	(۱۰) لب خنداں	۱۹۸۸ء
(سفر نامہ)	(۱۱) اپنی منزل کی طرف	۱۹۹۰ء
(نعت۔منقبت،مرثیہ)	(۱۲) خاصانِ خدا۔کربلا میں	۲۰۰۱ء
(تحقیق مقالہ)	(۱۳) اردو حمد و نعت پر فارسی روایت کا اثر	جون ۲۰۰۱ء

حضرت عاصی کرنالی نے اس مقالہ میں تحقیق کی بلندی کی حدوں کو چھوا ہے۔ یہ مقالہ اگر ڈی لٹ کے لئے لکھا جاتا تو آسانی سے اس کے معیار اور تحقیق کی بنا پر، ڈی لٹ کی ڈگری مل سکتی تھی۔ عاصی کرنالی نے عربی حمد و نعت، فارسی حمد و نعت۔ جنوبی ہند، شمالی ہند کے مرحوم شعرا کے علاوہ عصر حاضر کے شعرا تک کا احاطہ کیا ہے جو برسوں کی شب و روز محنت اور تحقیق شعور کی پختگی کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

ڈاکٹر ی عاصی کرنالی حمد نعت، منقبت، اور سلام کی منازل سے گذر کر مرثیہ کی دنیا میں آگئے ہیں۔ نقاد کی حیثیت سے انیس و دبیر کے مراثی پر اُن کی نظر ہے، قلزم مرثیہ میں جو قدیم و جدید کی گرم و سرد رو ہیں عاصی کرنالی اُن کے بھی مزاج داں ہیں۔ وہ لفظوں کی رنگ و نسل کو بھی پہچانتے ہیں اس لئے پہلے مرثیے سے ہی وہ اہم مرثیہ نگار تسلیم کر لئے گئے ہیں۔ وہ اب تک پانچ مرثیے کہہ چکے ہیں جن میں پہلا مرثیہ ''تکمیل'' حضرت امام حسینؑ کے احوال کا مرثیہ ہے، دوسرا مرثیہ ''تہذیب وفا'' حضرت عباسؑ کی وفا کے احوال کا مرثیہ ہے۔ تیسرا مرثیہ ''لہو لہو گلاب'' علی اکبر کے احوال کا۔ چوتھا مرثیہ ''ضربِ تبسم'' مختصر شہادت کے سب سے کم سن شہید علی اصغر کے اس تبسم کو خراج عقیدت ہے جس تبسم نے تلواروں کو کند اور پتھروں کو موم کر دیا۔ اور پانچواں مرثیہ حضرت حُر کے احوال کا مرثیہ ''اجر مودت'' ہے۔ ذیل میں اُن کے پہلے مرثیے ''تکمیل'' سے کچھ بند نقل کئے جا رہے ہیں جو اُن کی مرثیہ گوئی کی ابتدا تھی۔

اللہ ترے نام سے ہر سوچ کا آغاز ۱ اللہ ترے نام سے ہر بات کا در باز
کرتا ہوں فضائے چمن حمد میں پرواز ہوتا ہے مرا طوطیِ فن زمزمہ پرواز
دیکھوں تو، مرا خامہ دکھاتا ہے ہنر کیا؟
اچھا تو، میں لکھتا ہوں تری حمد، مگر کیا؟

تو رابطۂ فہم و خرد میں نہیں آتا تو ضابطۂ علم و سند میں نہیں آتا

تُو سلسلۂ حرف و عدد میں نہیں آتا تو دائرۂ فکر کی حد میں نہیں آتا
ادراک سے بالا، تیری ایک ایک صفت ہے
میں اور تیری حمد، کہاں مجھ میں سکت ہے

ہم مدح گزارِ شہِ لولاک لما ہیں ۵ اللہ کا وہ خاص کرم، خاص عطا ہیں
آئینۂ ہستی میں وہی جلوہ نما ہیں یہ بارہ امام ان کے ہی سورج کی ضیا ہیں
ہے سب کی نظر ان کی ہی رحمت لقبی پر
صلوٰۃ پڑھیں سب نبی و آل نبی پر

آلِ نبیٔ پاک، یہ اشراف، یہ اطہار ۱۱ یہ زُمرۂ اخیار، یہ ابرار، یہ احرار
اللہ کی یہ آیات، محمدؐ کے یہ انوار ان چاند ستاروں سے فضائل ہیں ضیا بار
پیکر ہیں تقدس کے، لطافت میں چھنے ہیں
مٹی سے نہیں نور فضیلت سے بنے ہیں

یہ وہ کہ خموشی ہو کہ گفتار، فضیلت ۱۲ یہ وہ کہ توقف ہو کہ رفتار، فضیلت
یہ وہ کہ تدبر ہو کہ کردار، فضیلت ان کے تو ہر اک وصف کا معیار، فضیلت
کیا لکھیے فضائل کہ خرد میں نہیں آتے
یہ ایسے سمندر ہیں کہ حد میں نہیں آتے

تھا نور خدا اپنے حجابات میں مستور ۱۷ پھر کشف حجاب اس کی رضا کو ہوا منظور
یہ سارے اولوالامر، یہ اللہ کے مامور نکلا ہے اسی نور سے یہ سلسلۂ نور
اس نور سے وابستہ ہے ہر نظم جہاں کا
شبیر ستارہ ہیں اسی کاہکشاں کا

آوازِ اذاں، نعرۂ تکبیر ہیں شبیرؑ ۱۹ ایوانِ حرم کی نئی تعمیر ہیں شبیرؑ
اسلام کی بنتی ہوئی تقدیر ہیں شبیرؑ تاریخ میں اللہ کی تدبیر ہیں شبیرؑ
جب دین کی اقدار تھیں خطرات فنا میں
مولا نظر آتے ہیں ہمیں کرب وبلا میں

کیا سجدۂ آخر تھا کہ معراج وفا ہے ۵۳ سر عبد کا معبود کے آگے ہی جھکا ہے

مولا نے شہادت سے یہ پیغام دیا ہے　　　ہر بُت کو ہمیشہ کے لئے دفن کیا ہے

سو ظلم ہوں، حق گوئی سے ہم رُک نہیں سکتے

ہم سر تو کٹا سکتے ہیں، ہم جھک نہیں سکتے

اور مرثیے کے آخر میں ذکر شہادت حسینؑ اور بعد شہادت حسینؑ کا منظر نامہ انتہائی اختیار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

وہ قتل ہوا جس کا دو عالم میں اُجالا　۵۴　وہ جس کو ملا، خطۂ جنت کا قبالہ

وہ شانِ علیؑ سیدہ کی گود کا پالا　　　بچپن میں سرِ دوشِ نبی بیٹھنے والا

پیغامبرِ امن و وفا قتل ہوا ہے

تاریخ کا یہ سب سے بڑا قتل ہوا ہے

اک کرب و بلا اور پسِ کرب و بلا ہے　　　آشوب، شہادت پہ کہاں ختم ہوا ہے

اک قافلہ کربل سے اسیروں کا چلا ہے　　　وہ دیکھئے سرِ شاہ کا نیزے پہ چڑھا ہے

یہ تازہ سفر اور بھی دشوار لگے گا

اک شہرِ ستم میں ابھی دربار لگے گا

اللہ حضرت عاصی کرنالی کی توفیقات میں اضافہ کرے تاکہ وہ مادہ پرستی کے اس دور میں انسانی فکر کی مشعل ہاتھ میں لئے ذہن ذہن اُجالے بکھیرتے رہیں۔ اور اُن کی یہ آواز تا قیامت گونجتی رہے۔

آگہی کے نور سے حرفِ ثنا روشن کریں

اس کرن سے محفلِ ارض و سما روشن کریں

حمدِ ربّ، نعت رسول پاک، ذکر اہلبیت

دوستوں آؤ یہ شمعیں جابجا روشن کریں

☆☆☆☆☆

نشاط واسطی:- (لاہور)

پیدائش ۱۹۲۷ء

نام سید علی نقی۔ تخلص، نشاط۔ واسطہ ایک قصبہ ہے جو تبریز اور تہران کے درمیان ہے

(اس کا جدید نام 'میانہ' ہے)۔ نشاط واسطی کے آباء و اجداد کا تعلق ''واسطہ'' سے تھا۔ نشاط کی جائے ولادت قصبہ ساڈھورا ضلع انبالہ ہے۔ اُن کے والد گرامی سید عزادار حسین شباب اور دادا، سید مراتب علی مراتب۔ دونوں شاعر، دونوں مرثیہ گو تھے۔ گویا نشاط واسطی کو شاعری ورثے میں ملی۔

نشاط واسطی دس برس کے تھے کہ اُن کے والد گرامی سید عزادار حسین شباب اے ایس آئی پولیس لدھیانہ، عالم شباب میں فوت ہوگئے اور نشاط واسطی یتیم ہوگئے۔ ماں نے بڑی محنت اور مشقت سے پالا۔ نشاط صرف میٹرک تک تعلیم حاصل کر سکے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا تو شفیق ماں اپنے بچے کو خوابوں کی سرزمین پاکستان لے آئیں۔ نشاط واسطی نے درس و تدریس کو پیشے کے طور پر اختیار کیا اور موضع علی پور چٹھہ ضلع گوجرانوالہ کے ایک سکول میں مدرس ہوگئے۔ اور ۳۲ برس اس سکول میں تدریس کے فرائض انجام دے کر ریٹائر ہوئے اور ۱۹۸۶ء میں لاہور آگئے اور مستقل سکونت اختیار کر لی۔

نشاط واسطی کی شاعری کا آغاز ۵۱/۱۹۵۰ کے لگ بھگ ہوا، ۱۹۵۱ء میں پاکستان کے اخبارات میں اُن کا کلام شائع ہونا شروع ہوگیا تھا۔ اور ۱۹۶۰ء تک وہ خاصے مشہور ہوگئے تھے۔ نشاط واسطی نے شاعرِ اہلبیت حضرت قیصر بارہوی اور کراچی کے استاد قمر جلالوی سے اصلاح لی ہے۔

اُن کا پہلا مجموعہ کلام ''نشاطِ سخن'' جو مناقب پر مشتمل ہے بیسوی صدی کی آخری دہائی میں شائع ہوا ہے۔ دوسرا مجموعہ ''نشاط مودت'' ہے۔ اُن کے بیس مرثیے ہفت روزہ ''اسد'' اور ''درسِ عمل'' کے محرم نمبروں میں شائع ہو چکے ہیں لیکن مجموعہ مراثی ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔ بتایا گیا کہ اُن کے تیس مرثیے اشاعت کے منتظر ہیں۔ نمونہ کلام کے طور پر اُن کے ایک مرثیے ''شاہکار حق'' کے چند بند نقل لئے جارہے ہیں۔

۱

شہکارِ حق ہے عظمتِ داور حسینؑ ہے
حُسنِ ریاضِ احمد و حیدر حسینؑ ہے
معراجِ بندگی کا پیمبر حسینؑ ہے
دریائے معرفت کا شناور حسینؑ ہے
سجدہ کیا ہے ایسا کہ سجدے کو ناز ہے
سچ تو یہ ہے حسینؑ بنائے نماز ہے

۲

جس کی شجاعتوں کا نہیں دہر میں جواب
جو آسمانِ عزم و عمل کا ہے آفتاب
جس کو کیا خدا نے خدائی میں انتخاب
جس کے کرم سے آج زمانہ ہے فیض یاب

ہر شاخ آشیانۂ باطل کی توڑ دی
وہ جس نے ظلم و جور کی گردن مروڑ دی

جو دینِ مصطفٰی کا ہے سرمایۂ حیات ۴ سر دیدیا قبول نہ کی ظالموں کی بات
جرأت پہ جس کی ہوگئی حیران کائنات جس کی ضیا سے ہوگئے پُر نور شش جہات
بیعت کا لفظ خاک میں جس نے ملا دیا
خوں سے نشانِ جبر حکومت مٹا دیا

جس کو نبی نے کاندھے پہ اپنے بٹھایا ہے ۵ پوشاک جس کی خلد سے جبریل لایا ہے
جسکو زباں چُسا کے نبیؐ نے پڑھایا ہے جس کا وجود رحمتِ باری کا سایا ہے
پُشت رسولؐ سجدے میں جس کا مقام ہے
جس کے لئے خدا کا درود و سلام ہے

جبریل جسکا جھولا جھلانے کو آتے ہیں ۶ فردوس والے لوری سنانے کو آتے ہیں
میوے طبق میں خلد سے کھانے کو آتے ہیں روٹھیں تو پھر رسول منانے کو آتے ہیں
راہب کو جس نے دی ہے خوشی نورِ عین کی
مرضیؐ کردگار ہے مرضی حسینؑ کی

نشاط واسطی کا یہ مرثیہ امام حسین علیہ السلام کے احوال اور اُن کی شہادت پر ہے۔ مرثیے میں نشاط واسطی نے عنوان کا حق ادا کیا ہے۔ اور امام حسین علیہ اسلام کو" شاہکار حق" یا شاہکار صنعتِ پروردگار" ثابت کیا ہے۔ اللہ اُن کی مدحت کو قبول فرمائے۔

☆☆☆☆☆

مولانا افسر دھلوی:- (لاہور)

ولادت فروری ۱۹۲۸ء

نام (مولانا) سید افسر زیدی۔ تخلص، افسرؔ۔ زیدی سید۔ جائے ولادت" دتی جو ایک شہر تھا (ہے) عالم میں یادگار"۔ مولانا افسر دھلوی کے والد گرامی مولانا سید اکبر عباس زیدی کا ملک کے مشہور علماء میں شمار ہوتا ہے۔ مولانا افسر کے جدِّ اعلیٰ (پردادا) سید اسد علی متینؔ اپنے عہد کے معروف نوحہ نگار رہے۔، جن کا سلسلۂ تلمذ مرزا دبیرؔ سے ملتا ہے، سید اسد علی متین کے نوحے آج

بھی پڑھے جاتے ہیں۔ افسرؔ دہلوی کا سلسلۂ نسب بہادر شاہ ظفرؔ کے وزیرِ اعظم سید حامد علی خان سے ملتا ہے۔ (سید کے ساتھ یہ "خان" بھی عطائے شاہی لگتا ہے)۔

مولانا افسرؔ دہلوی نے ابتدائی تعلیم عربک کالج دہلی سے حاصل کی۔ ۱۹۴۷ میں لاہور آ گئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے اور اورئنٹل کالج لاہور سے اردو ادبیات میں ایم۔ اے کیا۔ آغازِ شعر گوئی (۱۹۴۷ء میں) اُنیس برس کی عمر میں کیا۔ ابتدا میں عام روشن کے مطابق غزل کہی لیکن والدِ گرامی کے کہنے پر ذکرِ اہلبیت کو اپنی شاعری کا عنوان بنا لیا۔

مولانا افسر عباس افسرؔ دہلوی شاعری کے علاوہ ایک عالمِ دین اور ذاکرِ حسین کی حیثیت سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ شاعری کے حوالے سے افسر الشعراء کہلاتے ہیں۔

تصانیف

(۱) محرابِ حرم　(۲) قرطاس و قلم　(۳) محشرِ خاموش،

(۴) نقطۂ پرکارِ حق　(۵) اذانِ وجدان

مولانا افسرؔ دہلوی نے پہلا مرثیہ "ہدیۂ تبریک" ۱۹۵۵ء میں کہا جب اُن کی عمر ۲۷ سال تھی، "ہدیۂ تبریک" ۲۷ بند پر مشتمل مرثیہ ہے اور اُن کی مرثیہ گوئی کی پہچان مرثیہ ہے جس میں جوش و جذبے سے معمور اسلوبِ اظہار اور قدیم اور جدید کی ماہرانہ آمیزش اس امر کی دلالت کرتے ہیں کہ ۲۷ برس کی عمر میں افسرؔ دہلوی مستند شاعر بن چکے تھے۔ "ہدیۂ تبریک" اشاعت کی منزلوں سے گذرا تو موضوعِ گفتگو بنا اور اہلِ نظر نے ایک ہی مرثیے کے بعد مولانا افسرؔ دہلوی کو مرثیہ گو شاعر تسلیم کر لیا۔ مولانا سید ضمیر اختر نقوی نے اپنی کتب "اردو مرثیہ پاکستان میں" (مطبوعہ ۱۹۸۲ء) میں لاہور کے شعراء میں افسرؔ دہلوی کا مختصر تذکرہ کیا اور "ہدیۂ تبریک" کے تین بند نقل کیے۔

بہرہ ور ہے روح میری دین کی تعلیم سے　　دل ہے واقف عاشقِ معبود کی تعظیم سے
ہو سکے ممکن اگر کچھ شیوۂ تسلیم سے　　غسل دوں پہلے زباں کو کوثر و تسنیم سے
لا کے پھر لب پر حسینؑ ابنِ علی کے نام کو
صبح کی ضو سے بدل ڈالوں سوادِ شام کو

وہ حسینؑ ابنِ علی جو محسنِ اسلام ہے　　جسکا پاکیزہ تصور دافعِ اوہام ہے
تذکرہ جس کا علاجِ گردشِ ایام ہے　　جسکی غیرت کا فسانہ دو جہاں میں عام ہے

ثبت لب پر ظلم کے مہر خموشی کر گیا
منفرد انداز سے جو سر فروشی کر گیا

کر گیا محفوظ جو حق کی امانت وہ حسینؑ　　جس نے ہونے دی نہ کچھ دیں میں خیانت وہ حسینؑ
ذات جس کی ہے سراپائے دیانت وہ حسینؑ　　نام جس کا فتح حق کی ہے ضمانت وہ حسینؑ

جس کا حامی ظلم سے مرعوب ہوسکتا نہیں
پیرو غالب کبھی مغلوب ہوسکتا نہیں

"اردو مرثیہ پاکستان میں" کی اشاعت کے بعد سید سید وحید الحسن ہاشمی نے ڈاکٹر بلال نقوی کو ایک خط (مرقومہ ۱۷/اکتوبر ۱۹۸۲ء) بھیجا جس میں افسر دہلوی، ضیاء اللہ حیدر ضیاء اور زیبا ناروی کو مرثیہ گو شعراء میں شمار کرنے پر اختلاف کیا۔ ڈاکٹر بلال نقوی نے اس خط کو ہو بہو نقل کیا ہے جو حسب ذیل ہے۔

"مولانا افسر دہلوی مرثیہ گو نہیں ہیں۔ ہدیۂ تبریک" کی ترتیب بتاتی ہے کہ یہ مرثیہ نہیں بلکہ خوشی کی علامت ہے۔ اس طرح زیبا ناروی کے پاس، ۱۹ بند کی ایک نظم ہے جس میں "یم لطف و کرم کا دولہا" بھی لکھا ہے، اسے مرثیہ کہنا مرثیے کے فن کی تذلیل ہے۔ یہی حال دوسرے لاہوری شعراء کا ہے۔ ضیاء کے پاس چند نظمیں ہیں جنہیں وہ مرثیہ کہتے ہیں، پنجاب میں ذکر اہلبیت جس صنف میں ہو اُسے مرثیہ کہتے ہیں۔ خاکی صاحب نے ضمیر اختر کو صحیح رائے نہ دی ورنہ وہ اسی غلطی نہ کرتے" (بیسوی صدی اور جدید مرثیہ۔ ڈاکٹر ہلال نقوی ص ۷۳۲) ڈاکٹر ہلال نقوی نے سید وحید الحسن ہاشمی کا خط شائع کر کے، اپنی رائے بھی شائع کی ہے۔ جو ہاشمی صاحب کی رائے سے مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"افسر دہلوی اور ضیاء اللہ حیدر کے جو قلمی نسخے میرے پاس ہیں دو مرثیے کی تعریف پر پورا اُترتے ہیں۔　　(ایضاً۔ ص ۷۳۳)

سید وحید الحسن ہاشمی ۱۹۵۶ء کے بعد مرثیے کی دنیا میں آئے، ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۵ء تک اُن کے نوحے اور سلام شائع ہوئے تھے۔ لاہور میں رثائی ادب کی اشاعت کی ابتدا مصور

جذبات علاّمہ نور لدھیانوی کی تصانیف ''قندیل نور'' ''حدیث نور'' تیسری کتاب (''نغمات نور'' مطبوعہ ۱۹۵۲ء، ۱۹۵۳ء) اور عاشور کاظمی کی ''چراغ منزل'' مطبوعہ ۱۹۵۳ء میں ہوئی۔ یہ کتابیں مکتبہ شاہوار لاہور نے شائع کی تھیں۔ حضرت نور لدھیانوی اس عہد کے اُن اساتذہ میں شمار ہوتے تھے جنہیں رثائی ادب پر ''حرف آخر'' سمجھا جاتا ہے۔ راقم الحروف عینی شاہد ہے کہ ''ہدیۂ تبریک'' کو حضرت نور لدھیانوی نے دبستان مرثیہ گوئی میں ایک خوشگوار اضافہ قرار دیا تھا۔

بیسویں صدی کے اختتام تک کچھ مرثیہ گو شعراء کے بارے میں سید وحید الحسن ہاشمی کی رائے میں شدّت رہی ہے یہاں تک کہ سنہ ۲۰۰۰ء میں شائع ہونے والی ان کی کتاب ''ھل من ناصرا'' میں اُنہوں نے پنجاب کے ۲۷ مرثیہ نگاروں کا ذکر کیا ہے مگر اس فہرست میں مولانا افسر دہلوی نہیں ہیں البتہ ''ھل من ناصرا'' جلد دوئم مطبوعہ ۲۰۰۲ء میں مولانا افسر عباس دہلوی کے لئے ہاشمی صاحب نے کلمۂ خیر ادا کیا ہے اور ''ہدیۂ تبرک'' کا صرف ایک بند (مسدس کہہ کر) نقل کیا ہے۔

''ہدیۂ تبریک'' مولانا افسر عباس دہلوی کا پہلا مرثیہ ہی نہیں اُن کی مرثیہ گوئی کی پہچان مرثیہ ہے جو ۷۲ بند پر مشتمل ہے:

مولانا افسر عباس دہلوی کے مراثی میں بین کا حصہ قدیم مرثیے کی پیروی نہیں ہے۔ اُن کے مراثی میں ذکر مصائب بیانیہ ہے۔ قدیم مرثیے کی طرح کربلا میں موجود خانوادۂ رسالت کے کردار گریہ وزاری نہیں کرتے۔ ہوسکتا ہے مصائب اور بین میں مولانا افسر دہلوی کی متانت اُس طبقے کے لئے قابل قبول نہ ہو جو مرثیہ گوئی کا نصب العین رونا رُلانا سمجھتے ہیں، مولانا افسر دہلوی کے اسلوب کی وضاحت میں ان کے مرثیے کے چند بند درج ہیں۔

زلف افکار کو سلجھاتا ہے شانہ اپنا ۱ ہے درِ شہر معارف پہ ٹھکانہ اپنا
زور کتنا ہی لگالے یہ زمانہ اپنا ہم کو کہنا ہے بہر حال فسانہ اپنا
کیا ڈرائیں گی ہمیں چرخ کہن کی باتیں
ہم کو آتی ہیں بہت دار و رسن کی باتیں

خوب پہچانتے ہیں ہم کو زمانے والے ۲ ہم ہیں شبیرؑ کے پرچم کو اُٹھانے والے
مٹ گئے آپ جو تھے ہم کو مٹانے والے ہوگئے خاک اُمیّہ کے گھرانے والے

نہ وہ تیغیں ہیں نہ فوجیں ہیں نہ پرچم باقی
ہیں بصد عظمت حق آج مگر ہم باقی

رہے معمور سدا، رفعت احساس سے ہم ۳۸ ہوئے مایوس نہ فرطِ الم ویاس سے ہم
منزل خوف سے گذرے نہ کبھی پاس سے ہم ہوسکے ختم نہ جورِ بنی عباس سے ہم
چھوڑ کر شوق کے جملہ سرو سامان گئی
لے کے حسرت یہی آلِ ابو سفیان گئی

اہل تزویر کی رہتی ہے یہ کوشش پیہم ۳۹ کہ کسی طرح سے جھک جائے حسینی پرچم
سرنگوں حضرت عباس کا ہوجائے علم رہے باقی نہ کہیں سیدِ مظلوم کا غم
بادۂ میکدۂ عشق کا ساقی نہ رہے
نام شبیرؑ کہیں دہر میں باقی نہ رہے

لیکن اُن کی یہ تمنا کبھی پوری نہ ہوئی ۴۰ شان مظلوم کی مائل بہ ترقی ہی رہی
انقلابات کی پُرزور ہوا لاکھ چلی محفل نور کی یہ شمعِ فروزاں نہ بجھی
نور افشاں پسرِ صاحبِ معراج رہا
دہر کے سر کا چمکتا ہوا وہ تاج رہا

مصائب

آل احمد پہ ہوا ایسے مصائب کا نزول ۶۱ گوشہ قبر میں بے چین ہوئی روح بتول
کس لئے ہو نہ بھلا خاطر کونین ملول موت نے توڑ لئے گلشن تطہیر کے پھول
خوں کے دریا میں محمدؐ کا سفینہ ڈوبا
اور لہو میں پسر شاہ مدینہ ڈوبا

ہوئی تاریک فضا لگ گیا سورج کو گہن ۶۳ ہوگیا وقف خزاں فاطمہ زہرا کا چمن
ٹکڑے ٹکڑے ہوئے اولادِ محمد کے بدن لاشۂ سبط پیمبر رہا بے گور و کفن
دختر شاہ مدینہ نے طمانچے کھائے
یعنی معلوم سکینہ نے طمانچے کھائے

چھد گیا تیر سے ششماہے مجاہد کا گلا ۶۴ خون معصوم کا شبیرؑ نے چہرے پہ ملا

خنجر ظلم و ستم شاہ کی گردن پہ چلا
خیمہ ایک ایک مدینے کے مسافر کا جلا
لوٹنے کے لئے ابنائے زمانہ آئے
گھر میں زہراؑ کے عدو بے ادبانہ آئے

اُتری ہم شکل پیمبر کے کلیجے میں انی
صبح کو بیوہ ہوئی وہ جو تھی اک شب کی بنی
خاک میں مل گئی معصوموں کی گل پیرہنی
رہ گئی لاشوں پہ بس مرثیہ خواں بے کفنی
گھونٹ پانی کے لئے دین کے ناصر تڑپے
خاک اور خون میں یثرب کے مسافر تڑپے

ذبح پیاسا ہوا جنگل میں شہنشاہ اُمم
فوج اسلام کا ٹھنڈا ہوا دریا پہ علم
ہوگئے حضرت عباس کے بازو بھی قلم
اور بنائے گئے قیدی شہ بیکس کے حرم
در بدر ذریتِ احمد مختار پھری
اور بے مقنع و چادر سر بازار پھری

دست بیمار میں باندھی گئی زنجیر جفا
سر شاہ شہدا نیزۂ خولی پہ چڑھا
بازوئے خواہر شبیرؑ بھی رسّی میں بندھا
ظلم ایسا نہیں کوئی کہ جو،اُن پر نہ ہوا
بزم میخوار میں آلِ شہ ابرار گئی
بے روا دخترِ زہراؑ سرِ بازار گئی

مصائب کے سلسلے میں مولانا افسر دہلوی کا اسلوب رونے رلانے کی کوشش نہ سہی اس صداقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ تاریخ کے واقعات کو سلسلہ وار نظم کرتے ہیں اور اُن کا کلام حقائق کا اظہار اور مظلومیت کی ترویج ہے۔ پیغامِ حسین اور مقصد قربانی حسین کا ذریعہ ہے۔ یعنی عبادت ہے۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر خیال امروہوی:- (لیہ)

ولادت ۱۹۳۰ء (حیدرآباد)

نام، سید علی مہدی۔ تخلص خیالؔ، آبائی وطن امروہہ سادات۔ والد کا اسم گرامی سید حاجی حسن نقوی۔ حصول تعلیم کے باب میں اردو، فارسی اور عربی کے بنیادی علوم اپنے والدِ گرامی

سے پڑھے جو ان علوم کے عالم تھے۔ ۱۹۴۹ء میں ایم۔اے (فارسی) کیا۔ ۱۹۷۴ء میں ایران گئے اور پانچ سالہ کورس کر کے ڈاکٹر کی سند حاصل کی۔

بچپن سے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہاں ظلم کے خلاف، جبر کے خلاف، بیعتِ جابر سے مظلومیت کا انکار کے'' نغمے سنائی دیے، مکتب کربلا کا علم ہوا کو جوشؔ کی آواز سنائی دی

''کوئی کہہ دے یہ حکومت کے نگہبانوں سے
کربلا اک ابدی جنگ ہے سلطانوں سے''

بچپن کی وہ عمر جس میں ہر سبق پتھر کی لکیر بن کر ذہن میں ثبت ہو جاتا ہے اس عمر میں سبق ملا کہ حق کا ساتھ دو، ظلم سے نفرت کرو۔ جوان ہوئے تو اردو ادب میں ترقی پسند تحریک نعرہ زن تھی۔ گل و بلبل کے تذکرے ختم کرو۔ عصری تقاضوں کو دیکھو۔ غور کرو۔ ظلم کے خلاف آواز بلند کرو، غلامی کی زنجیریں توڑ دو، مظلوموں کا ساتھ دو، ظالم سے ٹکرا جاؤ، یہ ساری آوازیں خیالؔ امروہوی کو ترقی پسند تحریک کی طرف لے گئیں۔ اُنہوں نے شاعری شروع کی تو ان کی شاعری میں انقلاب کے نغمے سنائی دینے لگے۔ ۱۹۵۰ء کی دھائی میں اُن کی انقلابی نظمیں اور مضامین وقت کے اہم جریدوں میں شائع ہوتے تھے۔ ترقی پسند فکر رکھنے والے اکابرین ادب احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، عارف عبدالمتین اور اکبر کاظمی کے ساتھ اُن کا اُٹھنا بیٹھنا تھا۔

پاکستان میں ۱۹۵۴ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی لگی تو احمد ندیم قاسمی جیل بھیجے گئے۔ ادب میں براہ راست اظہار کی بجائے علامتی تحریریں شروع ہوگئیں، ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دھائیوں میں خیالؔ امروہوی لاہور کے مختلف کالجوں میں درس و تدریس کر رہے تھے لیکن ترقی پسند ادیبوں کے لئے دن بدن گھٹن بڑھ رہی تھی لاہور میں کشادگی اور کھلے پن کا احساس کم ہو رہا تھا۔

خیال امروہوی ۱۹۷۹ء میں گورنمنٹ کالج علی پور چلے گئے۔ 'پھرلیہ' میں اُن کی شادی ہوگئی۔ اور وہ وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ خیال اکادمی بھی وہیں قائم کی اور زندگی کے سارے پروگرام اس مرکز سے وابستہ کر لئے۔

خیالؔ امروہوی نے ادب میں تخلیق و تنقید کا بہت کام کیا ہے۔ اُن کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو نثری اور منظوم ادب پر مشتمل ہیں اور جن کی بنیاد پر خیالؔ امروہوی ایک فکر،

شاعر، دردمند انسان، ترقی پسند قلم کار کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔

(۱) غروبِ آفتاب　ناول ۱۹۵۶ء　(۲) مفتاح القلوب کا ترجمہ　۱۹۵۹ء

(۳) گنبدِ بے در　۱۹۷۳ء　(۴) عقائد مزدک (فارسی)　۱۹۷۴ء

(۵) سبز کتاب (ترجمہ)　۱۹۸۰ء　(۶) لمحوں کی آنچ　۱۹۸۱ء

(۷) عصرِ بے چہرہ　۱۹۵۲ء　(۸) نئے افق نئی کرنیں　۱۹۸۵ء

(۹) ایران کا انقلابی مزدک ۱۹۸۷ء　(۱۰) سوشلسٹ آگہی　۱۹۸۷ء

(۱۱) تلخاب　۱۹۸۸ء

خیام امروہوی کا پہلا مرثیہ "مدینے سے فرات تک"۔ "لفظوں کا دشت، بحرِ معانی سے نم کردوں" اُن کی قادر الکلامی کا ثبوت ہے۔ ایک ایک مصرع میں الفاظ کا چناؤ اُنہیں برتنے کا سلیقہ، اسلوب میں نئی نئی کروٹیں، اختصار سے بات کہنے کا ڈھنگ، اور واقعات کے اظہار میں ترقی پسند فکر کی روشنی یہ ساری خوبیاں خیالؔ امروہوی کے اس مرثیے میں نظر آتی ہیں۔ مرثیہ گوئی میں کم و بیش ہر شاعر نے اپنی ممدوح ہستیوں کو اُن کے مراتب کے اعتبار سے پکارا ہے۔ حمد کے بعد ذکر رسولؐ، ذکر علیؑ، ذکر حسینؑ، مقصدِ قربانیٔ حسینؑ اور کربلا۔ یہی ترتیب خیالؔ امروہوی نے بھی رکھی ہے مگر اپنے میارِ فکر و اسلوب اظہار کے مطابق۔

لفظوں کا دشت' بحرِ معانی سے نم کروں　صحرا کو کاٹ چھانٹ کے رشکِ ارم کروں
وجدان کے طویل' تعصب کو کم کروں　اس طنطنہ سے شرحِ معارف رقم کروں
آغاز اس طرح ہو سماعت تڑپ اُٹھے
افراد چیز کیا ہیں جماعت تڑپ اٹھے

حاضر کرو عقول کو قصرِ خطاب میں　روحِ امم بھی آئے خرد کی جناب میں
ادارک بھی شریک ہو نادر کتاب میں　آئیں حواسِ بزمِ بلاغت نصاب میں
الہام کے فلک پہ سفر کررہا ہوں میں
توصیفِ رہنمائے بشر کر رہا ہوں میں

اک وہ سحر کہ جس کا ابد ہمرکاب تھا　عہد الست روح کا صامت نصاب تھا
ذرہ ہو یا کہ مہر تصور تھا خواب تھا　ایہامِ کن میں نقطہ اُم الکتاب تھا

اس وقت اک چراغ مشیت سے جل گیا
نوری وجود قالب خاکی میں ڈھل گیا

وہ جو ہر احد بھی ہے اس سے جدا بھی ہے وہ حد بھی ہے حدود کی زد سے وراء بھی ہے
صافی بھی ہے مصفّی و روح صفا بھی ہے وہ تزکیے کے روپ میں حسنِ ذکا بھی ہے

وہ علم ہے، وہ حاکم روح الامین ہے
اجمال یہ کہ ضابطۂ عالمین ہے

پیدا ہوا جو علم تو آیا علیؑ کے پاس اقراء کا راز ڈھونڈ کے لایا علیؑ کے پاس
گنجینۂ وجود کمایا علیؑ کے پاس قلاش تھا ملی اسے مایا علیؑ کے پاس

حکم علیؑ سے علم طلاقت میں ڈھل گیا
عرفانِ نفس نہجِ بلاغت میں ڈھل گیا

معذور علم شیخ کے سرمے سے کور تھا اعراب تھے نہ لفظ و معانی میں زور تھا
ابلاغ میں کھنک نہ خطابت کا شور تھا صیہونیوں کلا دیر تھا صورت میں گور تھا

یہ شعلگی جو اب ہے بشر کے دماغ کی
ادنیٰ سی اک کرن ہے علیؑ کے چراغ کی

کوئی حجاب اس کی جلا کی نفی نہیں مخفی ہے یوں کہ اس سے کوئی شئے خفی نہیں
تفہیم حد صفت ہے، صفت مکتفی نہیں وہ دور بھی بہت ہے مگر دور بھی نہیں

یہ ہے علیؑ اب اس کے گھرانے کی بات کر
شط العرب کے قلب میں شامل فرات کر

صحرا کی دھوپ فوج یزیدی کا اژدھام بچوں کا ساتھ تشنہ لبی، جبرِ بے لگام
خیموں میں چند لخت جگر وہ بھی تشنہ کام بے رحم سلطنت کے مقابل خدا کا نام

تاریخ آگہی میں بڑا جس کا کام ہے
لاریب وہ حسین علیہ السلام ہے

مفتی بھی چپ تھے شارحِ دینِ حرم بھی چپ ابلیس محو رقص، وجود و عدم بھی چپ
اقدار چپ تھیں، عظمتِ نقدِ قلم بھی چپ بطحا بھی چپ، عراق بھی چپ اور عجم بھی چپ

سب چُپ رہے کہ جبر کا حربہ شدید تھا
میداں میں تھا حسینؑ مقابل یزید تھا

۲۶ بند کے اس مرثیے کا اختتام ڈاکٹر خیال امروہوی نے جس بند پر کیا ہے وہ ایک پیغام ہے جو پیغام کربلا بھی ہے، اور وقت کا پیغام بھی۔

یہ دورِ ظلم و جبر بھی اتنا نیا نہیں وہ کونسا ہے جبر جو حق نے سہا نہیں
پانی پہ نقشِ جور و ذلالت بنا نہیں وہ دین ہی نہیں ہے اگر کربلا نہیں
سمجھا ہے سب نے فرض محرم میں بین کو
دشمن نے بھی سلام کیا ہے حسینؑ کو

☆☆☆☆☆

وحید الحسن ہاشمی:- (لاہور)

ولادت ۱۵ ردسمبر ۱۹۳۰ء

جائے ولادت جونپور (یوپی) بھارت۔ والد گرامی سید شبیر حسین صفاؔ الہ آبادی۔ جدِ امجد میر درویش علی جو ۱۵۵۶ء میں ہمایوں کی ایرانی سپاہ کے ہمراہ واردِ ہند ہوئے۔ علم قرآن، علم حدیث، علم جفر کے عالم تھے۔ "میں کون ہوں، ہم نفساں" کے زیرِ عنوان وحید الحسن ہاشمی اپنا تعارف خود کراتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ پانچویں پشت میں اُن کے دادا میر انتظام علی پہلے شخص تھے جنہوں نے اردو میں خط اور ہندی میں نوحے لکھے۔ ممتاز عالم دین مولانا سبط حسن جونپوری انہیں بزرگ میر انتظام علی کے شاگرد تھے۔ وحید الحسن ہاشمی کے والد گرامی اردو، ہندی اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ جن کے دس ہزار سے زیادہ اشعار چودہ بیاضوں میں شائع ہوئے ہیں۔ غزل کہتے تھے تو صفاؔ تخلص نظم کرتے تھے، سلام اور نوحوں میں حیدر تخلص رکھتے تھے۔ وحید الحسن ہاشمی کے بڑے بھائی سید محبوب الحسن حبیبؔ جونپوری شاعر تھے اور آرزوؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ "کلیات حبیب" کے نام سے اُن کا مجموعہ کلام شائع ہو چکا ہے۔

ان حوالوں سے اندازہ ہوتا ہے شعر و ادب اُن کی میراث تھی۔ جو سرزمین اُن کا مولد و مسکن تھی اُس سرزمین سے علم و ادب کے کئی چاند سورج طلوع ہو چکے ہیں جن کا تابانی آج بھی جونپور کی خاک کے ذرّوں میں بسی ہے۔ جونپور کو شاہجہاں نے "شیراز ہند" کا خطاب دیا تھا

''شیراز ہند'' سے نسبت وحید الحسن ہاشمی کا تفاخر ہے۔ اور کیوں نہ ہو'' حبّ وطن از ملک سلیماں خوشتر''۔ اس زمین سے جو چاند سورج اُبھرے، وحید الحسن ہاشمی نے اُن کے نام لکھے ہیں۔ مخدوم آفتاب ہند سہروردی (۱۳۲۴۔۱۳۸۱ء)، مخدوم صدر الدین چراغ ہند (۱۳۲۴۔۱۴۰۱ء)، مخدوم قیام الدین سہروردی (متوفی ۸۱۷ھ، ۱۴۱۴ء)، مخدوم بندگی جلال الحق ناصحی متوفی ۹۴۴ھ (۱۵۳۷ء) وغیرہم۔

سید وحید الحسن ہاشم کی مرثیہ نگاری پر پاکستان کے صف اوّل کے ناقدین ادب نے لکھا ہے جن میں ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر شبیہ الحسن۔ ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر مظفر عباس، ڈاکٹر مسعود رضا خاکی (جو خود ایک بڑے مرثیہ نگار ہیں)۔ علی عباس سیدحتیٰ کہ انتظار حسین بھی ان میں شامل ہیں۔ اس فہرست میں انتظار حسین کا نام نامی اگرچہ راقم الحروف جیسے رثائی ادب کے طالب علموں کو چونکا رہا ہے لیکن انتظار حسین کی رائے اپنی جگہ پر صائب اور دلچسپ ہے۔ انتظار حسین لکھتے ہیں:

> '' وحید الحسن ہاشمی کو میرا پہلا خراج یہ ہے کہ وہ انیسؔ و دبیر کسی کے مقلد نہیں۔ جو بھی راستہ اُنہوں نے اپنایا ہے وہ ان کا اپنا ہے۔ اثرات قبول کئے ہیں تو جوشؔ اور آلِ رضاؔ سے مگر یہ دیکھئے کہ اُنہیں اپنے راستے میں مشکلیں کیا کیا پیش آئیں۔ ایک طریقے سے وہ بے سہارا مرثیہ نگار ہیں بس اپنے ہی زور پر لڑ رہے ہیں۔ بلاشبہ انیسؔ اور دبیر بڑے مرثیہ نگار تھے مگر ذرا سوچئے اُنہیں سہارے کتنے ملے ہوئے تھے۔ ایک پوری تہذیب اُن کی کمک پر تھی۔ آج کا مرثیہ نگار بد قسمت ہے مگر باہمت ہے کہ کسی سہارے کے بغیر مرثیہ لکھ رہا ہے۔ اس کے ارد گرد کوئی تہذیب ہے تو اس کی بنیاد منفی تہذیب پر ہے۔ ایسی تہذیب کے حوالے سے نئی شاعری تو ہو سکتی ہے مرثیہ نہیں لکھا جا سکتا''۔
>
> (کتاب وحید عصر۔ ص ۹۲۔۹۳)

مرثیہ اور رثائی ادب سید وحید الحسن ہاشمی کے مزاج میں رچا بسا ہوا ہے۔ اُن کی غزل میں بھی کربلا کا استعارہ نمایاں ہے۔

آوازۂ حق کہیں رُکا ہے نیزے پہ بھی چڑھ کے بولتا ہے

یہ ستارے قتیلِ رہِ عشق ہیں روشنی دیں گے نیزوں پہ سر دوستو

احساس کے زوال کی تاریخ کیا پڑھوں

انسان تشنہ لب ہے زمانہ فرات ہے

سید وحید الحسن ہاشمی کی (۲۵) کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ سلام اور نوحوں پر مشتمل ان کی چھ کتابیں ہیں جن کے نام الصراط (۱۹۴۸ء)۔ خون اور آنسو (۱۹۵۰ء)۔ بہتر پیاسے (۱۹۵۱ء) اجر رسالت (۱۹۵۲ء)۔ زبان مقتل (۱۹۵۵ء)۔ حیات غم (۲۹۵۶ء) ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ اس کے بعد وہ مرثیے کی دنیا میں آ گئے۔ العطش اوّل العطش دوئم اور العطش سوئم ان کے مراثی کے مجموعے ہیں۔ العطش اوّل و دوئم ۱۹۹۵ء اور سوئم ۱۹۹۸ میں شائع ہوئی ہیں۔ اوحید الحسن ہاشمی کی شخصیت اور فن پر ۱۹۹۸ء میں ایک کتاب ''وحید عصر'' شائع ہوئی ہے جسے عباس رضا نے ترتیب دیا ہے۔ اس کتاب میں وحید الحسن ہاشمی کی غزل گوئی، نظم، نعت، منقبت، سلام، نوحہ اور اُن کی نثر نگاری پر اکابرین ادب نے لکھا ہے۔ سید وحید الحسن ہاشمی کو جاننے اور پہچاننے کے لئے یقیناً یہ کتاب ایک تاریخی دستاویز ہے۔ ان کی ایک تحقیقی کاوش (''ھَل من ناصراً' ہے جس میں اُنہوں نے شعراء پنجاب کا تذکرہ لکھا ہے۔

وحید الحسن ہاشمی کی مرثیہ نگاری جس معیار کی تبصرہ نگاری کی متقضی ہے وہ ان چند صفحات میں نہیں کی جا سکتی۔ ہاشمی صاحب نے جن موضوعات پر مرثیے کہے ہیں اُن کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ تغزل پر اُن کی دسترس نے اُن کے مرثیوں میں جو فضا پیدا کی ہے وہ عام مرثیہ نگاری سے الگ ہے۔ مثلاً اُن کے مرثیے ''شب عاشور'' میں صرف ایک بیت پورے مرثیے کے فضا کے اظہار کے لئے کافی ہے۔

ٹوٹے دلوں کو آس کا مرہم نہ دے سکی یہ رات چند پھولوں کو شبنم نہ دے سکی

''زندگی'' کے زیر عنوان کہے گئے ایک مرثیے میں وحید الحسن ہاشمی نے زندگی کے سارے روپ پیش کئے ہیں اور آدم سے لیکر خاتم تک زندگی کو تا حد کمال پہنچا کر حسینؑ پر آئے ہیں اور اُس زندگی کی عکاسی کی ہے جو حسینؑ کو درپیش تھی اور اُس ماحول کی بھی منظر کشی کی ہے جہاں قربانی حسینِ ناگزیر تھی۔ گویا حسینؑ نے زندگی کی پکار کو سُن کر اپنی شہادت دی تھی۔ ملوکیت، جبر شاہی اور استعماریت کے خلاف وحید الحسن ہاشمی کا ترقی پسندانہ روّیہ، اُن کا (Progrressive attitude) جدید مرثیہ

نگاروں میں اُن کے مقام محمود کی کی بشارت ہے۔

اب پیکر یزید میں اُبھرا عزدر شام — اب ظلمتوں کے سنگ تھے اور زندگی کا جام
بولا غبار، چاہیئے سورج سے انتقام — اب کربلا کا دشت تھا اور وقت کا امام
مغلوب پا کے حوصلۂ مشرقین کو
اب زندگی پکار رہی تھی حسینؑ کو

۱۹۳۵ء میں لندن سے شروع ہونے والی ترقی پسند تحریک ۱۹۳۶ء تک برصغیر کے اہل قلم کے دلوں میں روشنی بن کر اتر گئی تھی۔ اس تحریک نے ادب کو ایک نیا موڑ دیا۔ رثائی ادب پر بھی ترقی پسند تحریک کے واضح اثرات ہوئے اور جوشؔ، جمیلؔ مظہری، نجم آفندی اور سید آل رضا نے صنف مرثیہ نگاری میں فکری انقلاب کی روش قائم کی۔ سید وحید الحسن ہاشمی اس فکری انقلاب کو مان کر آگے بڑھنے والوں میں نظر آتے ہیں۔ وہ شہادت حسین کو بکائیہ بیان کی محدود سرحدوں سے نکال کر فکر دشعور کی لامحدود وسعتوں تک لانے والوں میں شامل ہیں۔

حسین توڑ رہے تھے طلسم خوابِ یزید — کہ ہر زمانے کو آئے نظر سراب یزید
بلا کے دشت میں ایسا ہو احتساب یزید — نہ کھل سکے کبھی دنیا میں پھر کتاب یزید
جواب وہ دیا عرفانِ حق کے جذبے سے
یزید مٹ گیا صابر کے ایک سجدے سے

سید وحید الحسن ہاشمی نے اپنے مرثیوں میں رثائی ادب کی شان کو بھی برقرار رکھا ہے مگر اپنے مرثیوں کی مقصدیت رونے رلانے تک محدود نہیں کی۔ اُن کے مراثی میں تاریخ کربلا کا ہر واقعہ ایک درس ہے۔ مظلومیت، علامتِ عظمت ووقار ہے۔ شہادت منبعِ نور ہے۔ ان کے مرثیوں میں قدیم مراثی کی طرح خانوادۂ رسالت کی عظیم ہستیاں کربلا میں یا بعد کربلا، سر پیٹتی نظر نہیں آتیں۔ سیدہ زینب کا کردار وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں میں یوں ہے۔

شانے بندھے ہوئے تھے مگر حوصلہ وہی — سر پر ردا نہیں ہے، مگر دبدبہ وہی
کیا کیا رکاوٹیں ہیں، مگر راستہ وہی — بھائی نے جو کیا تھا بہن کی صدا وہی
یہ ارتباط فکر و نظر کا مقام ہے
زینب، حسینیت کی اشاعت کا نام ہے

زینبؑ کا نام، مقصدِ اسلام کا پیام زینبؑ کا نام، فکر کی تطہیر کا قیام
زینب کا نام، امن کی کوشش کا احترام زینبؑ کا نام ضامنِ آزادیٔ عوام
ٹوٹے ہوئے قلوب کی دمساز بن گئی
بنتِ علی رسولؐ کی آواز بن گئی

زندگی نے مہلت دی تو ''سید وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں میں سیدہ زینب'' کے زیر عنوان ایک پوری کتاب لکھنی چاہوں گا۔ سچ پوچھیے کو وحید الحسن ہاشمی نے اپنے مرثیوں میں جس جس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے ہر موضوع صرف اُن کے مرثیے کے حوالے سے ایک کتاب کا مقتضی ہے۔ اُن کے مرثیے ''حسینؑ اور قربانی'' سے ایک بند نقل کرتے ہوئے ہم ایک ایسے شخص پر گفتگو تمام کرتے ہیں جس کے متعلق کہنے کے لئے ہمارے پاس بہت کچھ ہے۔

قربانیٔ حیات کو اب ڈر نہیں رہا ذہنوں کو خوفِ ناوکِ خنجر نہیں رہا
عزمِ خلیل رہ گیا آزر نہیں رہا آئینہ حق ہے، دینِ سکندر نہیں رہا
ایثار کو کماں کے نئے تیر مل گئے
قربانیاں اُداس تھی شبیرؑ مل گئے

☆☆☆☆☆

مظفر نقوی:- (نارووال)

پیدائش ۱۹۳۰ء

نام۔سید مظفر حسین۔ تخلص مظفر۔نقوی سید۔ وطن نارووال (پاکستان)۔ والد کا اسم گرامی سید آزاد علی شاہ۔ مظفر نقوی برما شیل میں ملازمت کے بعد ۱۹۹۰ء میں پنشن لے چکے ہیں۔

مظفر نقوی کا تعلق جس گھرانے سے ہے، جس مکتبۂ فکر سے ہے اس مکتبۂ فکر کے پانچ اور چھ سال کے بچے مرثیے سنتے ہیں اور جب اُن کے ذہنوں کی تہیں کھلنے لگتی ہیں تو یہ پتہ چلتا کہ ان اذہان میں میر انیس کی فصاحت۔ مرزا دبیر کی بلاغت اور حسینؑ کی محبت بسی ہوئی ہے۔ بس یہی محبت، شاعری کا یہی دلوں میں اترنے الا رُخ بچپن سے ہی ان نوجوانوں کو شعر آشنا بنا دیتا ہے۔ میرا اپنا تعلق ایسے ہی گھرانے سے ہے اور میں نے بھی ۱۹۴۶ء (بعمر ۱۴ برس) مشق سخن شروع کی اور ۱۹۵۲ء میں پہلا مجموعہ کلام شائع ہو گیا تھا۔ مظفر نقوی نے بھی مکتبِ کربلا سے شعر گوئی سیکھی۔

انیس کے مرثیے اُن کے لئے محرّک اور محبت حسینؑ رہنما ہوئی، اس پر یہ امتیاز کہ وحید الحسن ہاشمی کے ملاقات ہوگئی۔ اُنہوں نے مرثیہ گوئی کی ترغیب دی۔ زمین ہموار تھی۔ مٹی نم تھی، ہر سال کم از کم محرم کے دس دن برسات دیکھتے تھے حالانکہ وہ تیروں کی برسات ہوتی تھی، ذرا سوچئے جس زمین کو میر انیس نے ہموار کیا ہو۔ مرزا دبیر کے اشک برساتے مرثیوں نے نم کیا ہوا، اگر وحید الحسن ہاشمی جیسا مرثیہ گو تخم ریزی کی ترغیب دے تو کون ذی شعور ہے جو اس موسم میں، ان حالات میں تراب فکر میں عقیدت کے بیج نہ بوئے، محبت کی (plantation) نہ کرے۔ مظفر نقوی نے یہی کیا۔ اور پہلا مرثیہ کہا جسے اہل فکر ونظر نے قبول کیا۔ مرثیہ کا عنوان ''موت'' ہے۔

کس قدر انسان اپنی فکر میں بے باک ہے زعم ہے دنیا میں وہ بس صاحب ادراک ہے
عقل سے عاری ہیں اہل ہوش وہ چالاک ہے یہ سمجھتا ہے زمیں اس کے قدم کی خاک ہے
بہر اہل فکر لیکن امتحاں ہے زندگی
موت منشائے خدا سوز نہاں ہے زندگی

حق نے بھیجے ہیں جہاں میں جانے کتنے پیشوا جو بیاں کرتے رہے اچھا ہے کیا اور کیا برا
نام سے کوئی غرض اس کو نہ اس کا مدعا ان میں ہیں کچھ مصطفیٰ کچھ مرتضیٰ کچھ مجتبیٰ
آدمی نے ان کے حکم عام کو مانا نہیں
ضد میں آکر ان خدا والوں کا پہچانا نہیں

اے بشر مٹ جائے گا تیرا یہ سب جاہ وجلال کرم خاکی تیری میت کو کریں گے پائمال
چھین لیں گے تجھ سے ساری حشمت ورعب وکمال تو میان قبر تڑپے گا بصد رنج و ملال
پھر خدا کی بزم میں تجھ کو بلایا جائے گا
فیصلہ اعمال کا تیرے سنایا جائے گا

حق نے اک دن موت سے پوچھا کہ تو مجھ کو بتا کیا کسی بندے پہ اب تک رحم بھی تو نے کیا
کھولے لب رک رک کے اس نے بعد حمد کبریا دل مرا خالی ہے ایسی کیفیت سے اے خدا
ہے مری اک بندۂ خوددار و صابر پر نظر
سامنے میرے کھڑا تھا اپنا سینہ تان کر

اور یہاں سے مظفر نقوی نے موت کو (personify) تجسیم کرکے موت کی کارفرمائیوں کا

ذکر کیا ہے۔ اور یہ بیان کیا کہ موت سے ہر ذی روح خائف ہوتا ہے۔

میں بجھا دیتی ہوں ہر انساں کی قندیل حیات ۔ رعب سے میرے لرزتی ہے یہ ساری کائنات
تیرے جس بندے نے دی ہے مجھ کو عبرت ناک مات ۔ وہ حسینؑ ابن علی کی اس زمانے میں ہے ذات
اس قدر بے بس کیا اس نے کہ میں گھبرا گئی
میرے وحشت ناک چہرے پر اُداسی چھا گئی

وہ بشر جو دین کو دیتا رہا تازہ لہو ۔ جس کی نظروں میں فقط تھی تیرے دیں کی آبرو
جس نے تیرے نام پر قربان کی ہر آرزو ۔ عشق میں تیرے جو اپنے خوں سے کرتا تھا وضو
جس نے سجدے میں رکھا سر عشق کی تلوار پر
دی اذاں مر کر بھی تیرے عرش کے مینار پر

پھر موت نے کربلا میں کس کس کی آخری ہچکی سنی۔ کس کس کی زندگی کے آخری لمحوں کو دیکھا۔ اس منظر نامے میں شہدائے کربلا کی تفصیل نظم کی گئی ہے اور آخری بات یہ کہی ہے کہ۔

کٹ گیا پھر جس گھڑی اس شیر کا سجدے میں سر ۔ وہ اندھیرا تھا کہ آتا ہی نہ تھا کچھ بھی نظر
فاطمہ زہرا، حسن، حیدر، رسولِ بحر و بر ۔ غمزدہ تھے اس جری کے لاشۂ بے گور پر
عرش سے اُترے ملک اس کی نظر کو چومنے
آسماں خود جھک کے آیا اس کے سر کو چومنے

مظفر نقوی کا سفر تاخیر سے شروع ہوا ہے۔ لیکن منزل واضح ہو اور راستے کی خبر ہو تو راہیں سمٹ جاتی ہیں۔ اہل نقد و نظر کو چاہیے کہ نئے لکھنے والوں پر توجہ دیں۔ ان کی حوصلہ افزائی کریں۔ اُن پر لکھیں۔ وہ جن پر بار بار لکھا گیا ہے اور لکھا جاتا رہے گا ان مرثیہ نگاروں اور مرثیوں پر قصائد لکھنا کم کریں اس سے پہلے کہ ان قصائد پر مرثیے لکھے جائیں۔

☆☆☆☆☆

حسن عسکری کاظمی:- (لاہور)

ولادت ۱۹۳۱ء

ہندوستان کا ایک شہر انبالہ ناصر کاظمی کا شہر بھی ہے اور پروفیسر حسن عسکری کاظمی کا شہر بھی۔ اس شہر کے ایک ممتاز علمی گھرانے میں سیّد محمد باقر کاظمی کے چشم و چراغ، حسن عسکری انبالہ

میں پیدا ہوئے۔ ان کے نانا سید واجد علی شہر کے معزز اور صاحب ثروت لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ حسن عسکری چھ برس کے تھے کہ ممتا کی آغوش سے محروم ہو گئے۔ نانا نے حسن عسکری کو اپنی مرحوم بیٹی کی نشانی کے طور پر اپنے دامن شفقت میں چھپالیا اور نہ صرف اپنی بیکراں محبت سے نوازا بلکہ زمینداروں اور جاگیرداروں کے عام دستور کے برعکس حسن عسکری کی تعلیم پر توجہ دی۔ ابھی حسن عسکری میٹرک پاس نہ کر پائے تھے کہ ملک میں آزادی کے چراغ جل اُٹھے۔ صدیوں کی غلامی کے اندھیروں میں ڈوبے اہل وطن کی آنکھیں جندھیا گئیں۔ حواس پر جنون طاری ہو گیا۔ انسانوں نے بھیڑیوں کا لباس پہن لیا۔ انبالہ سے لاہور تک خون کا ایک دریا رواں ہو گیا۔ اس دریائے خوں کو عبور کر کے حسن عسکری پاکستان آ گئے۔ زمیندار ہائی سکول سے میٹرک پاس کیا، زمیندار کالج گجرات سے بی، اے پاس کیا۔ بعد ازاں ۱۹۵۶ء میں ایم۔ اے اردو کرنے کے بعد عملی زندگی میں داخل ہو گئے۔

پہلی ملازمت محکمۂ ترقی دیہات میں بحیثیت افسر ترقیٔ دیہات ملی لیکن علم و ادب کا ایک دلدادہ، مکتبۂ کربلا کا درس یافتہ نوجوان کب تک دیہات کر ترقی میں مصروف رہتا۔ آخر جستجو نے منزل کا نشاں ڈھونڈ نکالا اور ۱۹۶۰ء میں حسن عسکری کالج میں لیکچرار ہو گئے۔ راقم الحروف پاکستان میں پہلا مارشل کے نفاذ پر (۱۹۵۸ء) میں لاہور سے کراچی چلا آیا۔ زمیندار کالج تک بھائی حسن عسکری سے رابطہ تھا۔ لیکن ۱۹۵۸ء کے بعد کئی برس اُن کا پتہ نہ ملا تا آنکہ ۱۹۸۵ء میں لندن میں ترقی پسند تحریک کی گولڈن جوبلی کے وقت حسن عسکری شدت سے یاد آئے اور حسن رضوی (مرحوم) کے توسل سے اُنہیں دعوت نامہ ارسال کیا گیا لیکن وہ نہیں آئے۔ ۱۹۹۱ء میں بارہ برس کی جلاوطنی کاٹنے کے بعد دور ضیائی ختم ہوا تو میں خود پاکستان گیا۔ اے۔ جی۔ جوش نے ایک تقریب کی۔ لاہور کے سارے اہل قلم تشریف لائے۔ صحیح معنوں میں تو ۱۹۵۸ء کے مارشل لا کے بعد لاہور میں یہ میرا پہلا دورہ پہلی entry تھی۔ بھائی حسن عسکری کاظمی ملے۔ مختصر باتیں ہوئیں۔ پتہ چلا ۱۸ برس جہلم میں تعلیم و تدریس کرتے رہے ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں لاہور تبادلہ ہوا اور اب گورنمنٹ کالج آف سائنس، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور میں ہیں اور ریٹائرمنٹ کی تیاری کر رہے ہیں۔

پھر ایک دو خطوط کی آمد و رفت ہوئی اور اب یہ بھی یاد نہیں کہ سلسلہ خط و کتابت کیسے منقطع ہوا۔ میں اپنی مصروفیات اور اپنی کوتاہیوں کے پیش نظر یہ الزام اپنے سر لیتا ہوں۔ پروفیسر

(بھائی) حسن عسکری جب یاد آتے ہیں تو بیساختہ یاد آتے ہیں۔ پروفیسر مشکور حسین یاد کے بعد پروفیسر حسن عسکری کاظمی وہ ادیب و شاعر ہیں جو مجھ سے امی، ابا، چچا، ماموں، خالہ اور دیگر عزیزوں سے متعلق نام بنام بات کرتے ہیں احوال پوچھتے ہیں۔ مجھے یہ اقرار کرنے دیجئے کہ اُن کی آنکھوں میں میرے لئے جو جذبہ ہے اسکی چمک مجھے زندگی میں خواجہ احمد عباس، مجروح سلطانپوری اور پروفیسر مشکور حسین یاد کے علاوہ کہیں نظر نہیں آئی۔ پروفیسر حسن عسکری کاظمی سے میرا رشتہ، کہنے کو تو ایک دھاگے کی طرح بظاہر کمزور نظر آتا ہے مگر اس دھاگے میں ماتمِ حسینؑ میں زنجیر زن عزاداروں کی زنجیروں کی طرح مضبوطی بھی ہے اور ابدیت بھی اور سچ پوچھئے تو اُن سے میرا رشتہ بھی وہی رشتہ ہے، جو عزاداروں کا زنجیر سے ہے۔

پروفیسر حسن عسکری کاظمی نے علمی ادبی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا ہے۔ ہر صنف ادب میں طبع آزمائی کی۔ تنقید نگاری، کالم نگاری، شاعری میں نام پیدا کیا۔ غزلیں کہیں۔ نغمے اور ملّی ترانے کہے۔ خود مسالے اور سیمنار کرائے۔ ریڈیو پر غزل سرائی کے علاوہ مرثیے پڑھے حتیٰ کہ کراچی کی مجالس میں مرثیہ خوانی کے لئے لاہور سے بُلائے جاتے رہے ہیں۔

پروفیسر حسن عسکری کاظمی اُن مرثیہ گو شعراء میں سے ہیں جنہوں نے اپنی انفرادیت سے خود کو منوایا ہے۔ انہوں نے مرثیے کے روایتی تسلسل کو باقی رکھا ہے، اس میں توڑ پھوڑ نہیں کی مگر مرثیے کے فریم میں نئے فکر و نظر اور عصری تقاضوں کی تصاویر آویزاں ہیں۔ اُن کے مرثیے "پرچم حرّیت"، احوال اسیریٔ اہلبیت (۱۹۸۰)، ابوذر غفاری (۱۹۸۱ء) میں عصر حاضر کی جو عکاسی حسن عسکری کاظمی نے کی ہے وہ رنگِ انفرادیت لئے ہوئے ہیں۔ اسکے بعد کے مرثیوں میں اُن کی فکرِ جدید جلا پاتی نظر آرہی ہے۔ اُن کے ہاں ارتقائے مسلسل ہے۔ پروفیسر حسن عسکری کا کلام، جس کا ہلکا سا خاکہ میرے ذہن میں ہے، اُن سے حاصل کر کے اس کتاب میں نقل کرنا چاہتا تھا مگر اُن کے فرزند کے پتے پر لکھا ہوا (۱۲ ستمبر ۲۰۰۱) کا خط بھی ان کی توجہ مبذول نہ کرا سکا۔ سید وحید الحسن ہاشمی سے اُن کا پتہ پوچھا جواب نہیں ملا۔ لیکن ہمارا باہمی ربطہ نہ ہونے کے باوجود اُن کا ذکر اس کتاب میں شامل ہو رہا ہے۔

قارئین سے معذرت کہ پروفیسر حسن عسکری کاظمی کے تذکرے میں میرے جذبات شامل ہوگئے۔ بات اُن کی مرثیہ نگاری پر ہو رہی ہے۔ اُن کا پہلا ہی مرثیہ اُن کی قدرتِ مرثیہ گوئی

کا نمائندہ مرثیہ ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں کہ اس نقاش نے جب نقشِ ثانی کشید کیا ہوگا تو وہ کتنا بہتر ہوگا اور ہر نقش کو نقشِ اوّل سمجھے والا شاعر جب نقش بعدِ نقش بناتا رہے گا تو اُن بلندیوں تک پہنچنا دشوار نہ ہوگا جنہیں دیکھنے کے لئے دستار سنبھالنی پڑتی ہے۔ اُن کے پہلے مرثیے ''پرچم حرّیت'' کے چند بند نمونہ کے طور پر نقل کئے جا رہے ہیں یہ مرثیہ بظاہر تو حضرت حرؔ کے احوال کا ہے مگر اس میں پروازِ فکر، عہد حاضر کے تقاضوں کا ادراک، ایک مضمون سے دوسرے مضمون پر گریز کا سلیقہ، بہت کچھ ملتا ہے ؎

اک منقلب مزاج کا شعلہ لہو میں ہے
دل کی طمانیت کا بھرم آبرو میں ہے
خنجرِ ضمیر آج رہِ جستجو میں ہے
توقیرِ حرّیت نگہٗ آرزو میں ہے
ثابت ہے جیسے حرؔ کا تصرّف ثبات پر
یوں مرثیہ محیط ہے آبِ حیات پر

میری سخن وری کا عقیدہ ہے آگہی!
ہر صاحب اصول سے رکھتا ہوں دوستی
انسانیت شناس ہوں میں پیروِ علیؑ
ہر سانس ردِ ظلم ہے مقصودِ زندگی
دعویٰ نہیں کہ مقصدِ حرؔ کے قریب ہوں
آزادیٔ ضمیر کا پھر بھی نقیب ہوں

اہل کلام سے ہے تقاضائے مرثیہ
مثبت خیال ہو چمن آرائے مرثیہ
ہر ذہن ہو معطرِ گلہائے مرثیہ
ایماں عروج پائے بہ ایمائے مرثیہ
ہر لفظ روشنی کی نئی کائنات ہو
کچھ بات ہو تو حرُ کے مقدّر کی بات ہو

اے اہل دل بلندیٔ کردار کی قسم
کردار سے سجی ہوئی گفتار کی قسم
سچائیوں کی راہ میں پیکار کی قسم
زخموں کے اضطراب میں ایثار کی قسم
اک صبحِ انقلاب کا اعلان کر گئی
حرؔ کی نگاہ سینۂ شب سے گزر گئی

☆☆☆☆☆

خادم رزمی:- احمد پور سیال (پنجاب)

ولادت ۱۹۳۲ء

خادم رزمی کے صرف اتنے کوائف میسّر ہیں کہ ۱۹۳۲ میں احمد پور سیال میں پیدا ہوئے۔ پیشے کی اعتبار سے مدرس ہیں۔ نمونۂ کلام کے طور پر ایک بند مل سکا ہے۔ اُن کا پتہ بھی نہ مل سکا۔ اندازہ ہوا کہ میڈیا اور تشہیر کی فرمانروائی کے دور میں بھی خادم رزمی P.R کے فن سے ناواقف ہیں جبھی تو کوئی انکا پتہ نہیں بتاتا جیسے انہیں کوئی جانتا ہی نہ ہو؛

نام حسینؑ، طالع بیدار عشق کا
عمران کا یہ لال ہے، غمخوار عشق کا
چمکا جو گرم ریت پہ گلزار عشق کا
تشکیل ہو گیا وہیں کردار عشق کا
گر دیکھنا ہے عشق کی ضو، کربلا میں آ
اک دشت بے گناہ کے دشت وفا میں آ

اتنی مختصر، نامکمل اور بے حوالہ معلومات پر کسی شاعر کو تذکرے میں شامل کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟۔ ذہن کہتا ہے نہیں۔ دل کا تقاضہ ہے، مرثیہ گوئی کی بات ہے جہاں ایک مصرع بھی قبول بارگاہ ہو جائے تو آسمان سے رحمتوں کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ گم کردۂ راہ شاعر کو فرزدقؔ بنادیا جاتا ہے۔ عقل کی بقراطیت ہار گئی۔ دل کی دلیل جیت گئی۔ سیانوں کا کہا مان لیا گیا۔

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

بہر حال ہمیں خادمؔ رزمی کو مرثیے کا شاعر ماننے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ رہا سوال اُن کے کوائف اور کلام کا تو عمر نے وفا کی تو کتاب کے آئندہ اڈیشن میں خادم رزمی کا قرض اُتارنے کی کوشش کی جائے گی۔

☆☆☆☆☆

وجاہت حسین :- (سونی پت) (لاہور)

پیدائش ۱۹۳۶ء

نام وجاہت حسین۔ تخلص وجاہتؔ۔ وطن، سونی پت ضلع کرنال۔ والد گرامی کا اسم گرامی حاجی محمد نقی جو اپنے دور کے ممتاز سوز خواں تھے۔ بڑے بھائی نزہت حسینؔ سوز خواں بھی تھے اور شاعر بھی۔ ان کا دیوان "باقیات نزہت" شائع ہو چکا ہے جو سوز و سلام اور منقبت پر مشتمل ہے۔ وجاہت حسین وجاہتؔ نے اس رثائی ماحول میں پرورش پائی۔ ابتدائی تعلیم ہندو ہائی سکول سونی پت میں حاصل کی۔ برصغیر کی تقسیم کے وقت ۱۹۴۷ء میں سونی پت" اُس علاقے کا ایک شہر تھا جس علاقے کیلئے " بڑوں" کے فیصلے کے مطابق " انتقال آبادی لازمی قرار دیدی گئی تھی لہٰذا وجاہتؔ کے خاندان کو ہجرت درپیش ہوئی اور وہ پاکستان آ گئے۔

پاکستان میں گورنمنٹ ہائی سکول خانیوال، ایف، سی۔ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی سے وجاہتؔ نے تعلیم مکمل کی۔ شاعری کا آغاز طالب علمی کے زمانے میں ہو چکا تھا اور جب وہ فارغ التحصیل ہوئے تو ملک کے کے اخبارات و رسائل میں نہ صرف اُن کی شاعری اشاعت کی منزل پر آ چکی تھی بلکہ اُن کے ایسے نفسیاتی مضامین بھی شائع ہو چکے تھے جو بعد میں قومی سطح پر تسلیم کیے گئے۔ اور اس طرح وجاہت حسین وجاہتؔ نہ صرف شاعر بلکہ نثر نگار کی حیثیت سے بھی متعارف ہوئے۔ ہفت روزہ قندیل " لاہور"، ہفت روزہ " لیل و نہار" لاہور، روزنامہ " امروز" لاہور، پاکستان ٹائمز اور روزنامہ " نوائے وقت" لاہور میں اُن کی تحریریں شائع ہوتی تھیں جو ملک کے معیاری اخبارات و رسائل میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وجاہتؔ کا پسندیدہ مضمون نفسیات تھا۔ اُنہوں نے نفسیات میں ایم، اے کیا اس کے بعد ایک عرصہ تک گنگارام ہسپتال میں ایک عرصہ تک ذہنی مریضوں کی ذہنی گتھیاں سلجھاتے رہے اور ڈاکٹروں کی مدد کرتے رہے حتی کہ وہ ڈاکٹر وجاہت حسین ہو گئے۔

ذہنی امراض کے شعبے سے متعلق کوئی شخص اگر شعر کہے تو چونکا دینے والی صورت حال ہوگی۔ ڈاکٹر وجاہت حسین کے متعلق یہ تو معلوم تھا کہ شعر کہتے ہیں لیکن چونکا دینے والی صورت حال ۱۹۷۲ء میں پیدا ہوئی جب اُنہوں نے پہلا مرثیہ کہا۔ اس مرثیے کا عنوان " معراج شہادت " تھا۔ اہل نظر نے پلٹ کر اُن کی طرف دیکھا۔ مرثیہ نگاروں نے انہیں توجہ سے دیکھا۔ یہ مرثیہ " المنتظر " کراچی میں شائع ہوا۔ نمونہ کلام پیش خدمت ہے۔

یوں زیب فکر حمد ہے ربّ کریم کی ا جیسے چمن میں موج بہشت نسیم کی
خوشبو ہے لفظ لفظ بہار نسیم کی کلمہ میں جیسے روح محمدؐ کے میم کی
غالب ہے یوں تجلّیٔ وحدت خیال پر،
سورج کا جیسے حکم چلے ماہ وسال پر ،

یہ روشنی کے پھول، یہ پھولوں کی روشنی ۲ فطرت کے زر نگار اصولوں کی روشنی
بے داغ آگہی کے رسولوں کی روشنی معصوم زندگی کے مقولوں کی روشنی
جو کچھ بھی ہے اسی کے لئے جلوہ بار ہے
ہر روشنی قصیدۂ پروردگار ہے

دوسرے بند میں بے داغ آگہی کے رسول ،فطرت کے اصولوں کی روشنی ، معقول زندگی کے مقولوں کی روشنی ایسی تراکیب منادی کررہی ہیں کہ ڈاکٹر وجاہت سونی پتی عام شاعروں میں نہیں بلکہ اُنہیں جلد ہی شعر گوئی کی پہلی صفوں میں پہنچنا تھا۔ روشنی کے متعلق اُن کا یہ فیصلہ کہ ''ہر روشنی عقیدۂ پروردگار ہے'' ایک آفاقی سچائی کی تائید بن کر سامنے آیا ہے۔

حکیم الامت ڈاکٹر اقبال نے ارشاد کیا تھا ۔

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
میرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

ڈاکٹر وجاہت بے خودی کے اُلجھے دھاگوں کو سلجھاتے سُلجھاتے خرد کی منزل میں آگئے ۔ اُلجھے ذہنوں کی سلجھانے کا جنوں اُنہیں خردمندی اور آگہی تک لے آیا۔ مرثیے نے اُنہیں درس گاہ کربلا تک پہنچایا۔ کربلا نے حق و باطل کا فرق دکھایا اور حق کی علامت ''حسینؑ'' سے متعارف کرایا اور وجاہت سونی پتی نے دوہری ذمہ درای سنبھال لی۔ ایک ذمہ داری اذہان کی گتھیاں سلجھانے کی اور دوسری ذمہ داری ''معصوم زندگی کے اصولوں کی روشنی'' کو اُن محروم فکر لوگوں تک پہنچانے کی ذمہ داری جو اندھیروں کو روشنی سمجھ کر جی رہے ہیں ۔ اُن کا انہاک دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ ہر لمحہ ایک آواز سُن رہے ہوں کہ:

''اے وجاہت حسین ہر فرد کو آگہی کے رسولوں کی روشنی پہنچا دے کہ یہی پیغام حسینؑ ہے اور یہی انسانیت کی ضرورت ہے''۔

وجاہت سونی پتی نے خدمت خلق کو اپنا شعار بنالیا۔ پیشہ ورارانہ سرگرمیوں میں بھی وہ اپنا نصب العین نہیں بھولے۔ گنگارام ہسپتال لاہور، جناح ہسپتال کراچی کے علاوہ دیگر ہسپتالوں میں ذہنی امراض کی تشخیص کے سلسلے میں ڈاکٹروں کی مدد کرتے رہے۔ ۱۹۹۶ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد کرشن نگر لاہور میں نوتصنیف مراثی کی مجالس کی بنا رکھی۔

وجاہت سونی پتی ڈیفنس سوسائٹی لاہور میں سکونت پذیر ہیں لیکن زیادہ وقت خانیوال میں گذارتے ہیں جہاں وہ پاکستان آنے کے بعد قیام پذیر ہوئے تھے۔ وجاہت دو کتابوں کے منصف ہیں۔

(۱) لاشعور سے شعور تک (نفسیاتی مضامین)

(۲) ذکر خاصانِ خدا

ڈاکٹر وجاہت سونی پتی کی شاعری میں عارفانہ عناصر نمایاں ہیں۔ مرثیے میں حمد و نعت کے اشعار اُن کے دل کی آواز محسوس ہوتے ہیں۔

یہ چاندنی، یہ پھول، یہ شبنم، یہ آفتاب یہ غنچے، یہ شگوفے، یہ مہکے ہوئے گلاب
یہ نغمہ زن طیور یہ خوشبوئے لاجواب ہر چیز اس کے حسن عطا سے ہے بہرہ یاب
چاروں طرف حسین اُذانوں کی گونج ہے
یہ معبدِ سحر میں اذانوں کی گونج ہے

آہنگ آبشار میں اس کی صدا سنو کیا کہہ رہی ہے جھوم کے موجِ صبا سنو
تاروں کے رنگ و نور سے شرحِ ضیاء سنو چاہو تو پتھروں سے بھی حمدِ خدا سنو
روداد ذاتِ حق ہے سرشتِ نگاہ میں
ہر آئینہ ملے گا اسی کی پناہ میں

اس نے جہاں کو نورِ محمد عطا کیا دنیا پہ بابِ رحمتِ کونین وا کیا
انسانیت کی آن کو جلوہ کشا کیا جو عارضی ضیاء تھی اسے دیر پا کیا
آمد رسولِ پاک کی صبحِ بہار تھی
نکلا جب آفتاب، فضا تابدار تھی

گم کشتہ کارواں کو شعور سفر ملا بھٹکی ہوئی حیات کو اک راہبر ملا
خلاقِ ہست و بُود کا پیغامبر ملا فکر و نظر کو قادرِ فکر و نظر ملا

تشنہ لبوں کو ساقیؑ کوثر ہوا نصیب
اہلِ خطا کو شافعِ محشر ہوا نصیب

سید وحید الحسن ہاشمی نے وجاہت سونی پتی کا تعارف بھی لکھا ہے اور اُن کا ایک مرثیہ بھی شائع کیا ہے۔ لیکن کہیں یہ نہیں لکھا کہ وجاہت سونی پتی نے کتنے مرثیے کہے ہیں جبکہ اُن کی شاعری میں جتنا جوشِ نمو کارفرما ہے اسکے تحت اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ اُن کا مرثیوں کا سفر جاری ہوگا۔

☆☆☆☆☆

علی ضیغم ہمدانی :- (لاہور)

ولادت ۱۹۳۶ء

نام سید علی ضیغم، تخلص ضیغم ۔ وطن تلہ گنگ ضلع چکوال (پاکستان) جو پنجاب کا وہ علاقہ ہے جسے عرف عام میں تعلیمی اعتبار سے پس ماندہ کہا جاتا ہے۔ اس علاقے کی سرزمین سے جگن ناتھ آزاد اور اُن کے والد گرامی آنجہانی ترلوک چند محروم، احمد ندیم قاسمی اور فتح محمد ملک جیسے ادب کے چاند سورج طلوع ہوئے ہیں۔ یہ علاقہ پاکستان کو عسکری قوت فراہم کرنے والا علاقہ ہے جہاں کے جیالے، فوج میں بھرتی ہونا پسند کرتے ہیں اور اپنے لہو سے چراغ جلانے پر ہر لحہ آمادہ رہتے ہیں۔ اس خطہ ارض سے جو لوگ ہاتھ میں قلم لے کر اُبھرے وہ بھی اپنے عہد کو روشنی دیتے نظر آتے ہیں۔

اس سرزمین پر ایک سادات گھرانے میں علی ضیغم ۱۹۳۶ء میں تلہ گنگ میں پیدا ہوئے۔ تلہ گنگ سے میٹرک اور ایف، اے پاس کیا، کیمبل پور میں بی۔اے کیا۔ ۱۹۵۶ء میں ادیب فاضل پاس کیا اور دیہی ترقی کے محکمہ سے وابستہ ہوگئے۔ زمین کی مٹی کا سرور بڑھا تو افلاک کی طرف نظر گئی اور ضیغم نے لاہور آکر پاکستان انٹرنیشنل ایرلائن میں نوکری کر لی اور اس طرح علی ضیغم کے قدم زمین پر اور نظر آسمان کی طرف رہی۔ اور یوں جب علی ضیغم کا سعودی عرب تبادلہ ہوا تو علی ضیغم کے اندر جو ایک سید تھا وہ بول اُٹھا۔

کعبہ و قبرِ نبی اپنی جگہ
میری منزل ہے مزارِ سیدہ

یہ ایک سید زادے کے دل کی پکار تھی جو شعر بن کر اسکی زبان پر آگئی تھی۔ علی ضیغم سعودی عرب چلے گئے۔ اس سرزمین تک اُن کی پہنچ ہوگئی جس کی خاک کے ذرّوں میں سورجوں کی تابانی

ہے۔علی ضیغم ہمدانی نے قبرِ رسول اکرم کی زیارت کی، جنت البقیع کی زیارت کی لیکن اُنہیں مزار سیدہ نہ ملا۔علی ضیغم تین برس سعودی عرب میں رہے اور ان تین برسوں میں سیدہ النساء العالمین کی بیکسی پر خون کے آنسو روتے رہے۔ انہیں سیدہ کی اولاد پر کئے گئے مظالم کا ادراک ہوا اور وہ نوحے۔ سلام اور قطعات لکھتے رہے۔ سعودی عرب میں قیام کے دوران محرم آیا تو تجربہ ہوا کہ وہاں آلِ رسول کی عزاداری نہیں کی جاسکتی۔ جذبوں نے اشعار کا روپ اختیار کرلیا اور علی ضیغم ہمدانی نے مرثیے کے پندرہ بند کہے۔علی ضیغم واپس لاہور آئے تو سید وحید الحسن ہاشمی نے اُنہیں راہ دکھائی اور علی ضیغم ہمدانی باقاعدہ مرثیہ کہنے لگے۔ذیل میں اُن کا پہلے مرثیے کے چند بند بطور نمونہ کلام درج کئے جارہے ہیں۔ یہ وہی مرثیہ ہے جس کے پندرہ بند اُنہوں نے سعودی عرب میں قیام کے دوران کہے تھے۔مرثیے کا عنوان ''خیر وشر'' ہے۔ایسا لگتا ہے کہ سعودی عرب میں زندگی کی گھٹن نے اُنہیں خیر وشر کا فرق عملی طور پر دکھا دیا ہے۔

۱

ہر بُنِ مو ہے نشانِ زندگی ۔ تیز رو ہے کاروانِ زندگی
سُن رہے ہیں سب اذانِ زندگی ۔ ہے مگر مخفی زبانِ زندگی
رطب و یابس کا اثر ہے پاؤں میں
خیر و شر پلتے ہیں اس کی چھاؤں میں

۲

یہ ازل سے جانتے ہیں اہلِ دل ۔ خیر و شر دو قوتیں ہیں مستقل
کار فرما ہیں یہ دونوں متصل ۔ جاں فزا ہے ایک، اور اک جاں گسل
فرق فطرت میں جو تھا دائم رہا
ساتھ رہ کر فاصلہ قائم رہا

۵

خیر ہے تحسین، شر دشنام ہے ۔ خیر ہے توصیف، شر الزام ہے
خیر حق کا بے بہا انعام ہے ۔ شر ہے باطل، خلق میں بدنام ہے
خیر و شر کا فیصلہ اس دل میں ہے
جو مشیت کے کفِ کامل میں ہے

۱۲

خیر، آئینِ شہِ لولاک ہے ۔ خیر پروازِ پرِ ادراک ہے
خیر، جذبِ مومنِ بیباک ہے ۔ خیر روحِ امر کی پوشاک ہے

خیر اور شر کا تصادم الاماں
امتحان، در امتحاں، در امتحاں

آیئے انعامِ دنیا دیکھیے ۱۷ شر کے مٹنے کا تماشا دیکھیے
آگ میں خلقت کو ہنستا دیکھیے　　اور دلِ نمرود اُلجھا دیکھیے
حق پرستی قاطعِ آفات ہے
یہ مکافاتِ عمل کی بات ہے

صاحبانِ صبر و تسلیم و رضا ۱۹ خیر و شر کا معرکہ لا منتہا
کٹ گئے اس جنگ میں کچھ باصفا　　مٹ گئے اس راہ میں اہلِ وفا
ہاں مگر نامِ وفا باقی رہا
جلوۂ شبیر آفاقی رہا

تھا اسی ماحول میں وہ نامور ۲۰ حضرت زہرا و حیدر کا پسر
سرورِ کونین کا نورِ نظر　　خیر کا حامی، حریفِ اہل شر
حق کو اپنی جان کی سوغات دی
عزم سے جس نے اجل کو مات دی

۵۱ بند کے اس مرثیے میں کربلا کی جنگ، آلِ رسول کی شہادت۔ امام حسین کی عظیم قربانی اور ناموسِ رسالت کی اسیری کا حوال ہے۔ مرثیہ اس بند پر مکمل ہوتا ہے۔

اے پیمبر زادیو، تم پر سلام ۵۶ تم سے ہے بیداریٔ ذہنِ عوام
کرکے مُردہ دہر میں دستورِ شام　　تم سے زندہ آج ہے حق کا نظام
خیر کا ہر بول بالا کر دیا
قید ہوکر شر کو رُسوا کر دیا

(ھل من ناصرا، ج۔ ۲ سے اقتباس)

مرحبا سید علی ضیغم ہمدانی کہ تم نے تلہ گنگ اور چکوال کی سرزمین پر جہاں دنیائے ادب کی اہم شخصیات کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں وہاں عباس کا علم لہرا دیا۔

☆☆☆☆☆

رئیس احمر :-　　(راولپنڈی)

ولادت ۱۹۳۹ء

نام، خواجہ رئیس حسین۔ تخلص احمر۔ آبائی وطن۔ لکھنؤ۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی۔ ۱۹۴۹ء میں پاکستان آگئے۔ کراچی یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ بی ایڈ اور ایم اے۔ ایل ایل بی کی سندات حاصل کیں۔ اور گورنمنٹ کالج، ناظم آباد کراچی میں لیکچرار ہوگئے۔ ۱۹۷۰ء میں پنجاب چلے گئے۔ ۱۹۷۵ء میں حکومت پاکستان کے محکمہ اطلات سے وابستہ ہوئے۔ اور ۱۹۹۸ء میں ریٹائر ہوگئے۔ ریٹائر ہونے کے بعد کچھ دنوں کراچی میں رہے آخر کار رولپنڈی میں آن بسے۔

اُن کا پہلا مجموعہ کلام، مراثی اور سلاموں پر مشتمل ہے جو ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔ اُن کا دوسرا مجموعہ، غزلیات اور منظومات پر مشتمل ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ شاعری کی ابتدا رثائی ادب سے ہوئی یا غزل گوئی کے مقابلے میں رثائی ادب کی طرف توجہ زیادہ رہی لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ مرثیے کے ناقدین نے رئیس احمر پر کچھ نہیں لکھا سوائے سیّد وحید الحسن ہاشمی کے جنہوں نے ۲۰۰۲ء میں شائع ہونے والی کتاب ھل من ناصرا'' جلد دوئم میں رئیس احمر کا مختصر تعارف اور ایک مرثیہ شائع کیا ہے۔ اس تعارف میں وہ رقم طراز ہیں۔

> ''تمیں سال قبل آپ کا (رئیس احمر کا) ایک مرثیہ ڈاکٹر سبط حسن مرحوم نے مجھے (وحید الحسن ہاشمی کو) ارسال کیا تھا۔ اس مرثیے کو جدید مرثیہ گوئی میں ایک مقام حاصل ہے اور نقادوں نے اسے بے حد سراہا ہے۔ میں نے (وحید الحسن ہاشمی نے) آپ سے (رئیس احمر سے) مسدس میں مرثیہ لکھنے کی فرمائش کی۔ مسدس کی ہیئت میں آپ نے (رئیس احمر نے) تین مرثیے کہے۔
>
> (ھل من ناصراً۔ ج۔ ۲۔ ص۔ ۱۰۳)

ہاشمی صاحب نے جس مرثیے کا حوالہ دیا ہے وہ غالباً'' داستان حرم'' ہے جس کا ذکر ڈاکٹر ہلال نقوی نے ایک جگہ ذیلی حاشیے میں کیا ہے۔ یہ مرثیہ'' اے کربلا۔ اے کربلا (مصطفیٰ زیدی)، اے کربلا۔ اے کربلا (سردار جعفری) اور'' مورخوں سے کہو تم نے کچھ نہیں لکھا'' (عبدالروف عروج) جیسی شاعری کی فضا میں کہا ہوا مرثیہ تھا جو مسدس کی ہیت میں نہیں تھا۔ اسی فضا کی شاعری

پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ہلال نقوی نے رئیس احمر کا نام اور اس نام کے حوالے سے ذیلی حاشیے میں ''داستان حرم'' تحریر کیا ہے اور اسے مرثیے کے ارتقائی سفر کی ایک علامت قرار دیا ہے۔ پورا حوالہ یوں ہے:

> ''مرثیے کے ارتقائی سفر میں مسدس سے ہٹ کر جن شعراء کی تخلیقات قابل ذکر ہیں اُن میں علی سردار جعفری، فارغ بخاری، عارف عبدالمتین، عبدالروف عروج اور عاشور کاظمی کے علاوہ رضی ترمذی، باقر مہدی، جمیل نقوی، رئیس احمر اور خلش پیر اصحابی کے نام لئے جاسکتے ہیں''
>
> (بیسویں صدی اور جدید مرثیہ۔ ص ۸۲۱)

مرثیے کے تناظر میں فکر کی یہ منزل یقیناً بہت اہم ہے جہاں اس کلام کو بھی مرثیہ تسلیم کیا جا رہا ہے جو مسدس کی ہیئت میں نہیں ہے مگر رثائی ادب یا عزائیہ ادب کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے چہ جائیکہ وہ دور بھی تھا جب جوشؔ کی مسدس کو مرثیے کی صنف سے خارج کر دیا گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وقت سے پہلے سوچنے والوں کے ساتھ دنیا نے اکثر ایسا ہی سلوک کیا ہے۔

رئیس احمر نے مسدس کی ہیئت میں جو مرثیے کہے ہیں اُن میں سب سے پہلا مرثیہ ''کربلا بعد کربلا'' ہے۔ اس مرثیے میں اظہار کا اسلوب اُسی ترقی پسند سوچ کا انداز لئے ہوئے ہے جس کا ذکر ڈاکٹر ہلال نقوی اور دیگر ناقدین نے کیا ہے۔

روز عاشورہ جو پھوٹی صبح کی پہلی کرن ۱ جگمگا اُٹھا قسیمِ باغ جنت کا چمن
اور پھر شہ نے سجائی دوستوں کی انجمن ہر شریک بزم تھا باندھے ہوئے سر سے کفن
وہ زمیں کا اوج تھا سارے فلک سجدے میں تھے
یا عروجِ آدمی پر سب ملک سجدے میں تھے

سارے فلک سجدے میں تھے'' کہنا علوم جدید اور خلائی وسعتوں سے آگاہی کا اعلان ہے:

وہ سَروں کی فصل اور وہ دل کے موسم کی نمو ۲ وہ فضائے درد میں بیدار انساں کا لہو
صبح آگاہی میں وہ مصروف حق سب نیک خو دل کی دھڑکن تھی کہ تھا تسبیح پر لا تقنطو
اور اذاں اللہ اکبر، اکبرِ دلگیر کی
ذرّے ذرّے کی زباں پر تھی صدا تکبیر کی

وہ نمازِ صبح جب گزری تو اُبھرا آفتاب ۳ نور کی کرنوں میں خیمے میں گئے گردوں جناب
اور جب واپس ہوئے خیمے سے ابنِ بوترابؑ یوں علم کو کر دیا عباسؑ نے بھی بار یاب
سبز پرچم ملتِ اسلام کا محور بنا
اور پنجہ سرورِ کونینؐ کا تیور بنا

وہ علم وہ پرچم اسلام روحِ کربلا ۲ کربلا میں بن گیا جو معجزہ در معجزہ
قاسمؑ و عونؑ و محمدؑ اکبرؑ و انصار شاہ الغرض یہ سن کے سارے منتخب اہلِ وفا
کٹ مرے اسلام پر سب نصرتِ شبیرؑ میں
کیا قوی جوہر تھا پھر شبیرؑ کی شمشیر میں

شاہِ دیں خیمہ سے لائے اصغرِ بے شیر کو ۷ اور اس جوہر نے کاٹا ہر ستم کے تیر کو
مل کے رخ پر خونِ دل دیکھا ہر اک بے پیر کو اور کہا ہاں روکنا تم حملۂ شبیرؑ کو
اب حسینی ہاتھ دکھلائے گی تیغِ بوترابؑ
اب زمیں کو خوں سے نہلائے گی تیغِ بوترابؑ

یہ رجز پڑھ کر حسینؑ ابنِ علیؑ نے جنگ کی ۸ یہ زمیں ہر اہلِ کیں کے واسطے پھر تنگ کی
شر نے کب دیکھی نبرد خیر ایسے ڈھنگ کی شہؑ نے یوں ہر داستانِ اہلِ دل خوش رنگ کی
بن گیا ضرب المثل حملہ شہِ دلگیر کا
ہر شجاعت میں ہے جوہر شاہؑ کی شمشیر کا

اُس طرف بے جان لہجے میں ہے مُردہ شاعری ۲۱ اس طرف نہج البلاغہ اور اقوالِ علیؑ
اُس طرف ہے مضمحل الفاظ کی جادو گری اس طرف نہج الفصاحت میں کلامِ احمدیؐ
اُس طرف ہے اک شرارِ بولہب بہکا ہوا
اس طرف ہے شعلہ شمعِ حرم لپکا ہوا

لو وہ آیا پھر ہوا میں اک شرارِ بولہب ۲۲ بدمذاقی جس کی فطرت عادتاً جو بے ادب
لو، ہوئی روشن وہ شمعِ ہاشمی زینبؑ لقب ہے مذاقِ زیست جس کا مظہرِ آیاتِ ربّ
لو، وہ شمعِ آگہی کی روشنی کھلنے لگی
لو، شرر کی بے ثباتی خاک میں ملنے لگی

اس طرف دل میں یقیں قدرت کی ہے باطل کو ڈھیل ۲۳ اس طرف یہ بدگمانی ہو چکا حق بھی ذلیل
اس طرف یوں مطمئن قدرت پہ اولادِ خلیل اس طرف ہیجان میں ہے ابرہی طاقت کا فیل

بد مذاقی علم سے از خود ہے جاہل کی شکست
زعم کثرت کا بذات خود ہے باطل کی شکست

جہل کی تاریکیوں میں علم کی روشن کتاب ۲۴ تھا سوال بیعت فاسق پہ زینبؑ کا جواب
شام وکوفہ کیا، دو عالم میں بپا تھا انقلاب اللہ اللہ وہ علی کے طرز میں اک اک خطاب

بے ردا زینب کے رُخ پر تھا وقار حیدریؑ
یا غلاف الٹے ہوئے تھی ذوالفقار حیدریؑ

فرق ہر ظالم کے تھی مظلوم کی ضربِ شدید ۴۱ درد کے لہجے میں وہ اک مضطرب دل کی نوید
اور مٹ جاتی یزیدیت نہ تھا یہ بھی بعید کرب کی شدت سے چلّا تا وہ دربارِ یزید

ذکر حق جب پتھروں کو بھی زباں دینے لگا
حد ہے یہ باطل بھی چکرا کر اذاں دینے لگا

یہ مرثیہ ۵۵ بند پر مشتمل ہے۔ رئیس احمر نے اس مرثیے میں قاری یا سامع کو رلانے کی کوشش کرنے کی بجائے پیغام کربلا اور واقعات کربلا سنانے کی سعی کی ہے جس میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ مسدس کی ہیئت میں اُن کے دیگر مراثی بھی اسی مقصدیت کے علمبردار ہیں۔

☆☆☆☆☆

نردوش ترابی:- (ملتان)

ولادت ۱۹۴۳ء

نام صفدر علی، تخلص نردوش۔ ابوتراب کی غلامی کے شرف کے حوالے سے ترابی۔ نقوی سید۔ ملتان میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی سید امیر علی نقوی تھا۔

تعلیم: مقامی سمیرا پبلک ہائی سکول سے میٹرک کیا۔ صادق ایجرٹن کالج بہاد پور سے بی۔ اے کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۶۵ء میں ایم۔ اے کی سند حاصل کی۔

پیشہ۔ تعلیم وتدریس۔ ابتدا خانپور کالج میں لیکچرار کی حیثیت سے کی، بعد ازاں ایف سی کالج لاہور میں تقرری ہوئی۔ شعر گوئی کی ابتدا ۱۹۶۰ء سے ہوئی۔ ہر چند کہ ابتدا غزل گوئی سے

ہوئی مگر نام کے ساتھ جو نسبت تھی ''ترابی'' کو وہ کوئے بوتراب کی طرف لے آئی اور آلِ ابوتراب کی مدح شروع کی۔ سلام، منقبت، اور نوحے لکھنے شروع کئے۔ روشنی اور بڑھی تو طبیعت مرثیہ گوئی کی طرف مائل ہوئی، اور ۱۹۸۰ء میں پہلا مرثیہ کہا جو عظمتِ حسین پر ہے۔

جب آسمانِ نور پہ ظلمت ہو پُر فشاں ۔۔۔ منبر پہ زر خرید عناصر کی ٹولیاں
گرگِ زباں دراز نے کھولا ہو جب دہاں ۔۔۔ ہو جائے ہاتھ بھر کی رذالت کی جب زباں
ایسے میں کھینچ لے جو زبانِ رذیل کو
وہ مرد ہے عزیز خدائے جلیل کو

مرثیے کی اُٹھان کہہ رہی ہے کہ مرثیہ جدید اقدار کی روشنی کا حامل ہوگا۔ ترقی پسند سوچ کا مظہر ہوگا۔ ''منبر پہ زر خرید عناصر کی ٹولیاں''۔ ''رذالت کی زباں'' قسم کی تراکیب لفظی پتہ دے رہی ہیں کہ نردوش ترابی نے ابوتراب کے در کی خاک چاٹی ہے اور زبان و قلم کو صیقل کیا ہے۔

نردوش ترابی کے کوائف اور کلام حاصل کرنے کے لئے لاہور میں پروفیسر مشکور حسین یاد۔ پروفیسر آغا سہیل، سید وحید الحسن ہاشمی اور دیگر احباب کو خطوط تحریر کئے، ٹیلیفون کئے کہ کوئی نردوش ترابی کا پتہ بتادے، یا اُن کا کوئی مرثیہ حاصل کر کے ہمیں بھیج دے مگر کہیں سے مثبت جواب نہ ملا۔ کوئی کوشش کامیاب ہوئی نہ ہی نردوش ترابی سے رابطہ ہوسکا۔ جو لوگ تحقیق و جستجو کے علمبردار ہیں وہ ایسے شعلہ بیاں شاعروں کو آگے کیوں نہیں بڑھاتے۔ صاحب ثروت لوگ ایسی انمول تخلیقات کی اشاعت میں معاونت کیوں نہیں کرتے۔

میں اس کتاب میں نردوش ترابی کا مزید کلام شریک اشاعت نہ کرسکا جس کا مجھے افسوس ہے لیکن وہ جو رثائی ادب اور مرثیہ گوئی کا صلہ دیتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ میں بھی ''نردوش'' ہوں۔ میں نے کوشش میں کمی نہ چھوڑی مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ زندگی نے مہلت دی تو آئندہ ایڈیشن میں یہ قرض ادا کرنے کی کوشش کی جائے گی (انشاءاللہ)

☆☆☆☆☆

حبیب محمد حبیب:- (ملتان)

رثائی ادب کی دنیا میں، بالخصوص مرثیہ گوئی میں اچانک ۱۹۷۴ء میں ایک نام در آیا جیسے ''چپکے سے بہار آجائے''۔ فیض کا پورا مصرع تو یوں ہے۔ ''جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار

اُجائے'' لیکن ہم پورے مصرع سے استفادہ نہیں کر سکتے کہ مرثیہ کی دنیا یا رثائی ادب کی دنیا ویرانہ کبھی نہیں رہی۔ یہ تو وہ دنیا ہے جس میں صحراؤں کا ذکر یوں ہوتا ہے جیسے گلزار ہوں۔

پس صاحبو! یہ جو ایک نیا نام رثائی دنیا میں آیا وہ ملتان کے افق کا ایک تارا حبیب محمد حبیب ہے جسے توفیق ملی کہ وہ اُن کا ذکر کرے جن کا ذکر عبادت ہے۔ اُن پر قلم اُٹھائے جن کا نام نامی اور جن کی قربانی لوح و قلم لکھ چکے ہیں۔

حبیب محمد حبیب کا پہلا مرثیہ ۱۹۷۴ء میں ''بیتِ سعادت'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ممتاز مرثیہ نگار آغا سکندر مہدی نے حبیب محمد حبیب کے متعلق کہا:

> '' حبیب نے ایک مرثیہ لکھ کر ملتان میں اردو مرثیے کی داغ بیل ڈالی اور ایسا چراغ روشن کیا جو دوسروں کو فکر کی روشنی دیتا ہے''

حبیب نے ملتان میں مرثیہ گوئی کی داغ بیل ڈالی۔ وِلا کا پہلا چراغ جلایا۔ ارشاد مصطفوی ہے کہ جس نے کسی کارِ خیر کی ابتدا کی اور اس کارِ خیر کا سلسلہ آگے بڑھا تو قیامت تک اس کارِ خیر کا ثواب جاریہ اُسے ملے گا۔ یہ اس ذاتِ گرامی کا ارشاد ہے جسے نہ ماننے والوں نے بھی صادق مانا۔ پس حبیب کے جلائے ہوئے چراغ سے جتنے چراغ جلیں گے اُن سب کا اُجالا حبیب محمد حبیب کی دینی اور دنیاوی زندگی کو روشن رکھے گا۔ 'بیتِ سعادت' کے لئے اسد اریب نے لکھا ہے:

> '' بیت سعادت'' ایک مختصر مرثیہ ہے۔ جہاں تک میری رسائی ہے۔ میں بڑے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُردو کے شائع شدہ مرثیوں میں اتنا جامع اور مختصر مرثیہ ابتک میری نظر سے نہیں گذرا۔ اُنتالیس بند اردو مرثیے کی تشکیل میں ایک کامیاب تجربہ ہیں۔ کوئی عنصر کہیں بھی کمزور نہیں۔''
>
> (بیت سعادت، ص۔ ۷)

حبیب محمد حبیب کا یہ مرثیہ حضرت عباسؑ کے احوال کا مرثیہ ہے۔

یارب نہالِ فکرِ ہرا بارور، رہے	ہر دور میں کلام مرا با اثر رہے
ہاتھوں میں جامِ حُبِّ علیؑ عمر بھر رہے	حق پر رہوں میں، مصحفِ حق پر نظر رہے

مجھ کو عطا ہو فیض درِ بوترابؑ سے
ذرّے کو جیسے نور ملے آفتاب سے

مرثیے کے ابتدائی بند" آلِ محمد کی عظمت و بزرگی" کو ظاہر کرتے ہیں۔ دسویں بند سے حضرت عباسؑ کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ تین بند نمونے کے طور پر درج ہیں۔

عباسؑ ہے کتابِ محبت کا سرورق — یاد آرہا ہے اس سے وفا کا سبق سبق
جلوہ فگن ہے ذہن کے مطلع پہ وہ شفق — جس سے مرے شعور کا روشن ہے ہر طبق
خدمت گزار خاص، یہ حق کے ولی کا ہے
اُم البنیں کا لال ہے بیٹا علیؑ کا ہے

مقصود ہے مجھے اسی کردار کا بیاں — نورِ نگاہ حیدرِ کرار کا بیاں
عباسِ باوفا کا علمدار کا بیاں — حق آشنا کا حق کے طرفدار کا بیاں
ممتاز و منفرد جو وفاداریوں میں ہے
ثابت قدم، جو حق کی طلب گاریوں میں ہے

ہے پیکرِ خلوص و وفا شہ کا جانثار — اس کے عمل عمل سے مودت ہے آشکار
شہ کا رفیق شہ کا محب شہ کا دوستدار — چھوٹوں کا حق شناس بڑوں کا ادب گزار
اک اک ادا میں اس کی قرینہ علیؑ کا ہے
لنگر ہے اس کے ہاتھ سفینہ علیؑ کا ہے

اس کے بعد حبیبؔ کا کوئی مرثیہ سامنے نہیں آیا۔ سید وحید الحسن ہاشمی نے پنجاب کے مرثیہ گو شعراء کا تعارف آٹھ آٹھ یا دس دس سطروں میں لکھا ہے اور اُن کے ایک ایک دو دو بند نمونہ کلام کے طور پر درج کیے ہیں لیکن حبیب محمد حبیب کے متعلق دو چار سطریں بھی نہیں ملتی جبکہ اسد اریب جیسے مرثیے کے نقاد حبیبؔ کے پہلے مرثیے کو اہم قرار دے چکے ہیں۔ ہم دور اُفتادہ لوگ، غریب الوطن لوگ تو کوئی دعویٰ اس لئے نہیں کر سکتے کہ ہم تک کتابیں دیر سے پہنچتی ہیں، اکثر پہنچتی ہی نہیں ہیں مگر وہ جو پنجاب میں رہتے ہیں، وہ جو مرثیہ کی دنیا میں آباد ہیں۔ اُن کی عدم توجہی یا درگذر کرنے کا کوئی سبب تو ہوگا۔

☆☆☆☆☆

علی کوثر زیدی:- (لاہور)

ولادت ۱۹۵۰ء

علی کوثر زیدی کے نام سے پہلے ایک نام قیصر بارہوی کا ہے جو ایک ایسا فانوس مرثیہ گوئی تھے جسکی حفاظت ہواؤں نے کی۔ بخت رسا علی کوثر زیدی کو قیصر بارہوی تک لے گیا یا قیصر بارہوی کی نگاہ دوربیں نے علی کوثر کو دیکھ لیا۔ پھر یوں ہوا کہ ۱۹۹۰ء میں علی کوثر نے قیصر بارھوی کے شاگرد ہونے کا شرف حاصل کیا۔

سنا ہے جس کے سر پر سے ہُما گذر جائے وہ بادشاہ بن جاتا ہے۔ لوگوں نے ہُما کو تو کبھی نہیں دیکھا البتہ ایسے بادشاہوں کی ضرور دیکھا ہے جو چشم زدن میں بادشاہ بنے۔ یقیناً ایسے بادشاہوں کے سروں پر ہُما سایہ فگن ہو گیا ہوگا۔ لیکن کوثر زیدی کے سر پر جس ہمائے مرثیہ نگاری نے سایہ نے کیا اُسے لوگوں نے دیکھا۔ اس کے کلام سے استفادہ کیا۔ اُسکے جلائے ہوئے چراغوں کی روشنی نے فکر وولا کی راہوں کو منوّر کیا۔ اسی ہمائے عصر کا سایہ سر پر ہوا تو علی کوثر زیدی ولائے محمدؐ وآل محمدؐ سے سرشار ہو گئے اور اُنہوں نے سلام، قصائد اور منقبت سے آگے بڑھ کر مرثیہ گوئی کی دشوار راہوں پر سفر شروع کر دیا۔ ۱۹۹۱ء میں پہلا مرثیہ کہا جس کا عنوان ''عشقِ شبیرؑ'' ہے۔

عشق شبیرؑ میں دنیا سے گذرنا سیکھو الفتِ آلِ محمدؐ میں اُبھرنا سیکھو
تیغ کی چھاؤں میں ہمت سے سنورنا سیکھو جذبۂ شوقِ شہادت ہے تو مرنا سیکھو

جب کوئی الفتِ شبیرؑ میں مرجاتا ہے
خلد میں بنتِ پیمبرؐ سے صلہ پاتا ہے

قیصر بارھوی ۱۹۹۶ء میں اپنے معبود حقیقی کی بارگاہ میں چلے گئے۔ اُنہوں نے جس ذات گرامی پر زندگی بھر سلام بھیجا، جس کے مصائب پر آنسو بہائے۔ جس کے ذکر کی ترویج کی اس ذات گرامی کو محسن انسانیت، وجہ تخلیق کائنات، پیغمبر آخرالزمان نے سردار جوانانِ جنت کہا ہے۔ قیصر بارہوی کی رسائی بارگاہِ امامت تک ضرور ہوئی ہوگی اور جب اُن کے روشن کیئے ہوئے چراغ علی کوثر زیدی کا مرثیہ اُن تک پہنچا ہوگا تو کتنے فخر سے ان کا سر بلند ہوا ہوگا اور اُنہوں نے کوثر کا مرثیہ ساقیٔ کوثر کی بارگاہ میں پیش کیا ہوگا۔

مرثیے کی راہوں پر علی کوثر زیدی کا سفر ۱۹۹۰ میں شروع ہوا۔ وہ خود سوز خوان ہیں اور

اسی مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے پہلا مرثیہ کہا مگر ہمیں یقین ہے کہاں کا سفر جاری رہے گا۔ اُن کے اُستاد، اُن کے رہنما، اُنہیں راستہ دکھانے والے وہاں پہنچے ہوئے ہیں جہاں سے فکر و شعور کی خیرات ملتی ہے۔ بقول مصورِ جذبات حضرت نور لدھیانوی (جو بیسویں صدی کے عظیم شاعرِ اہلبیت اور لاہور میں رثائی ادب کی ترویج کے باب کا حرفِ اوّل ہیں)۔

تصوّر سے ہے بالاتر، بڑائی میرے مولا کی میاں محتاج ہے ساری خدائی، میرے مولا کی
جہاں سے رزق بندوں کو خدا تقسیم کرتا ہے نظر آئی وہاں پر بھی کلائی میرے مولا کی

اور رزق سے مراد آٹا، دال چاول نہیں۔ رزقِ فکر و شعور بھی ہے۔

☆☆☆☆☆

حشمت علی قنبر:- (لاہور)

ولادت ۱۹۵۲ء

نام، شیخ حشمت علی۔ تخلص قنبر ۔ جائے ولادت لاہور۔ والد گرامی، شیخ دولت علی۔

نئی نسل پر الزام ہے کہ وہ اپنے مذہب۔ تہذیب اور اقدار سے دور ہوتی جارہی ہے۔ یہ بات کسی حد تک دوست بھی ہے لیکن تحقیق کیجئے تو پتہ چلے گا اس تلخ حقیقت کی ذمہ داری صرف نوجوان نسل پر ہی نہیں بلکہ ماں باپ پر بھی ہے۔ جہاں ماں باپ بچوں پر پوری توجہ دیتے ہیں وہاں نئی نسل میں علی کوثر زیدی جیسے نوجوان بھی سامنے آتے ہیں، جو والدین اپنے بچوں کو اوائل عمری میں "مکتب کربلا" کا طالب علم بنا دیتے ہیں وہ بڑے ہو کر کربلائی۔ کوثری، ترابی اور قنبر بنتے ہیں۔ ایسے ہی ایک نوجوان حشمت علی قنبر ہیں۔

شیخ حشمت علی قنبر، ۱۹۵۶ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ وہیں پلے بڑھے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ اوائل عمری سے شعر کہتے رہے مگر یہ نام اچانک اس وقت سامنے آیا جب ۱۹۹۶ء میں ایک مرثیہ "جرسِ فکر" کے نام سے شائع ہوا۔ دوسرا مرثیہ "اصالتِ زر" کے زیرِ عنوان سامنے آیا۔ یوں تو بخت رسا ساتھ نہ دے تو نعت، سلام، منقبت اور خصوصاً مرثیہ نگاری کی توفیق نہیں ملتی لیکن مرثیہ گوئی کے معاملے میں ایک کمی یہ بھی رہی ہے کہ اکثر مراثی، مرثیہ گو شعراء کے بستوں تک محدود رہ جاتے ہیں اور اُن کی (Promoition) یا تشہیر و اشاعت نہیں ہو پاتی۔ قنبر اس معاملے میں خوش نصیب ہیں کہ اُن کے مراثی ساتھ ساتھ اشاعت پذیر ہو رہے ہیں۔ اُن کے پہلے مرثیے کی

اصلاح قیصر بارہوی نے کی تھی۔

قنبر کا پہلا مرثیہ "جرسِ فکر" دراصل تشریحِ فکر ہے اور 'فکر' کو حشمت علی قنبر نے 'خوش بختی' سے تعبیر کیا ہے۔

جس شخص کے مزاج میں ہو جستجوئے فکر　　کرتا ہے غور و فکر سے وہ گفتگوئے فکر
رہتی ہے جسکے قلب میں بس آرزوئے فکر　　رگ رگ سے اُسکے پھوٹتی رہتی ہے بوئے فکر
مختص نہیں یہ نور، امیر و غریب سے
ملتی ہے آدمی کو یہ دولت نصیب سے

فکر نہ ہو تو آدمی اندھی تقلید کرتا ہے اسی لئے فکر کی سمت کا تعین ضروری ہے۔ اور فکر کی سمت کا تعین آقائے قنبر سے بہتر کون کر سکتا ہے جسے رحمت کونین کی شفقت و تربیت نے فکر و آگہی کا پیکر بنایا تھا۔

حشمت علی قنبر کا مرثیہ "اصالت زر" حضرت حُر کے احوال پر ہے، ابتدا دعا سے ہوتی ہے۔

روز و شب ذکر خداوند احد کرتا ہوں　۱　دم بدل ذکر عنایات صمد کرتا ہوں
دل سے مذموم خیالات کو ردّ کرتا ہوں　　اب طلب شیر الٰہی سے مدد کرتا ہوں
آج اس خادم قنبر پہ کرم ہو جائے
مرثیہ زر کی اصالت یہ رقم ہو جائے

مفلس و شاہ کو رہتی ہے ضرورت زر کی　۴　سب کو بے چین کئے رکھتی ہے حسرت زر کی
اک عجب راز کے پردے میں ہے چاہت زر کی　　عالم خوف میں لے جاتی ہے کثرت زر کی
ارتکاز اس کا خدا کو بھی بھلا دیتا ہے
اس کا احساس ہی انساں کو مزا دیتا ہے

خیر اور شر کی محافل میں ہے شہرت زر کی　۵　رونمائی سے بہت ہوتی ہے عزت زر کی
سلطنت زر کی ہے ہر سمت حکومت زر کی　　اسلئے رکھتا ہے ہر شخص ضرورت زر کی
مفلسی ہوش کو مجنوں بنا دیتی ہے
حرص، زردار کو قارون بنا دیتی ہے

اہل دنیا نے اسے جان سے بڑھ کر چاہا　۱۰　مال کی حرص میں انسان سے بڑھ کر چاہا

حامل جہل نے قرآن سے بڑھ کر چاہا دیں فروشوں نے تو ایمان سے بڑھ کر چاہا
جمع کرتے ہیں مفادات کو کم قیمت پر
بیچ دیتے ہیں یہ آیات کو کم قیمت پر

دوستو زر کو توانائی نہ قوت سمجھو ۱۲ زر کے پردے میں چھپی ہے جو حقیقت سمجھو
زر کے بارے میں ہے کیا حکم مشیت سمجھو مستحق زر کے جو ہیں ان کی ضرورت سمجھو
زر کی خلقت نہیں دامان تعیش کیلئے
زر کا سودا نہ ہو سامان تعیش کیلئے

لِلّلہِ الحمد کہ زر، دافع آفات بھی ہے ۱۷ مصلح عیب بھی ہے قاضی حاجات بھی ہے
باعث فخر بھی ہے وجہ مباہات بھی ہے قلب مومن کیلئے خلد کی سوغات بھی ہے
خیر اس میں نہیں شامل تو یہ ہے شر کی طرح
خیر کی راہ میں یہ زر ہے ابوذر کی طرح

پوچھا اک شخص نے مولا سے کہ ثروت کیا ہے ۳۱ یا حسینؑ ابن علی اصل میں غربت کیا ہے
یہ کہا سبط پیمبرؐ نے کہ حیرت کیا ہے ہم بتائیں گے ہر اک شے کی حقیقت کیا ہے
آرزوئیں ہیں اگر کم تو یہ ثروت ہوگی
تم جو لالچ میں پڑو گے تو یہ غربت ہوگی

زر کے مثبت و منفی پہلوؤں کو نظم کرنے کے بعد حشمت علی قنبر ثروت و غربت کی راہوں سے ہوتے ہوئے لالچ کے تذکرے پر آتے ہیں اور امام حسین علیہ السلام کے ارشاد کو نظم کرنے کے بعد کربلا تک آتے ہیں جہاں اُنہیں ایک صاحب منصب و ثروت کردار نظر آتا ہے جو امام حسین پر ہونے والے مظالم کے ذمہ دار خود کو سمجھتا ہے اور اپنا منصب اور اپنی حیثیت کو چھوڑ کر مظلوم امام کی طرف آتا ہے۔ مرثیے میں گریز دلنشیں ہے۔ مرثیہ حرؑ کی خدمت امام میں حاضری، اذنِ شہادت اور شہادت حُر پر ختم ہوتا ہے۔ ۱۹۹۵ء سے ۲۰۰۰ تک حشمت علی قنبر کے کم از کم تین مرثیے شائع ہوئے ہیں۔ گویا حشمت علی قنبر اس راہ پر چل نکلے ہیں۔ سنا ہے ذکرِ مظلوم کرنے والوں کو نصرتِ مظلوم کا ثواب ملتا ہے۔

☆☆☆☆☆

سیدؔ زاھد بخاری:- (لاہور)

ولادت ۱۹۵۵ء

نام، زاہد حسین، تخلص زاہدؔ۔ بخاری سید، جائے ولادت سیالکوٹ۔ والد کا اسم گرامی سید یوسف علی بخاری۔ ریڈیو پاکستان لاہور میں ملازمت کے سلسلے میں لاہور میں مقیم ہیں۔ تعلیم: ایم۔ اے اردو پنجاب یونیورسٹی ۱۹۹۴ء۔ عام شاعری یا مرثیہ گوئی میں کسی سے سلسلۂ تلمذ وابستہ ہے یا نہیں اسکی کہیں سے کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ ریڈیو پاکستان پر کام کرنے والے حضرات کے لئے تو زیڈ۔ اے۔ بخاری سے بڑا استاد اور رہنما کون ہوسکتا ہے جو ڈائرکٹر جنرل ہونے کے باوجود ایک ایک رفیق کار پر توجہ دیتے تھے۔ خود مرثیہ نہیں کہتے تھے مگر اس بلا کے مرثیہ خوان تھے کہ مرثیہ خوانی سے مرثیے کے معنی سمجھا دیا کرتے تھے۔ آج اُن کا تحت اللفظ میں پڑھا ہوا مرثیہ ۔ ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' ذہنوں میں گونج رہا ہے اور یہ زیڈ۔ اے۔ بخاری کی مرثیہ خوانی اور قدرت کی عطا کردہ آواز کی کرشمہ سازی ہے کہ بخاری صاحب اپنی ذات میں ایک دبستانِ سوز خوانی تھے اور یہ ماننے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ سید زاہدؔ بخاری اُنہیں کے پیروکار ہوسکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے بخاری ہونے کے ناطے اُن کا زید۔ اے۔ بخاری سے کوئی خونی رشتہ بھی ہو۔ اگر نہیں بھی تو نسبی اور فکری رشتہ تو ثابت ہے۔

زاہدؔ بخاری کا پہلا مرثیہ، ''سجدۂ شبیری'' کے عنوان کے تحت تھا جو ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ اُن کی دوسری تصنیف ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زاہدؔ بخاری نے حادثاتی طور پر یا کسی وقتی ترغیب کے تحت مرثیے نہیں کہے بلکہ وہ سنجیدگی سے اِس روش پر گامزن ہوئے ہیں۔ اللہ اُنہیں توفیق دے کہ وہ مظلوم کا ماتم کریں۔ مظلوم کی حمایت کریں۔ مظلوم کے ذکر کی ترویج کریں اور سرخرو ہوکر سفر تمام کریں۔ یہ چند جملے اُن کے حق اس گناہگار کی دعا بھی ہیں اور یہی جملے سید زاہد بخاری کا نصب العین بھی ہیں جیسا کہ ''سجدہ شبیری'' میں کہا گیا ہے۔

میں آرزوئے شوکت و شہرت نہیں رکھتا   اور شوق حصول زرو دولت نہیں رکھتا
کچھ مرتبہ وجاہ کی حاجت نہیں رکھتا   خوشنودیٔ اربابِ حکومت نہیں رکھتا
سرمایۂ مداحیٔ شبیرؑ بہت ہے
اقلیم سخن کی یہی جاگیر بہت ہے

سید زاہد بخاری کو اقلیمِ سخن کی حقیقی جاگیر مبارک۔ میں اپنی عمر کے اور اپنے سے بزرگ اہلِ قلم سے یہ التماس کروں گا کہ نئی نسل کو آگے بڑھنے کا راستہ دیں، اور ان نئے چراغوں کا اُٹھا کر اپنے سامنے رکھ لیں تاکہ زمانہ ان کی روشنی سے مانوس ہو جائے اور ساتھ ہی نئی نسل سے گذارش کروں گا کہ زندگی جدوجہد میں کوئی مقام خیرات میں نہیں ملتا۔ بلکہ اس کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے۔ ہم لوگوں نے نصف صدی، بسا اوقات صدی کا تین چوتھائی حصہ محنت میں گذارا ہے۔ آپ بھی محنت جاری رکھئے محنت اور خلوص فکر کبھی رائیگاں نہیں جاتے۔

حال میں سید زاہد بخاری کا ایک اور مرثیہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ''مفارقت'' ہے، یہ مرثیہ سیدۂ فاطمہ زہرا کے احوال سے شروع ہوتا ہے اور امام حسینؑ کی مدینے سے روانگی پر ختم ہوتا ہے۔

زہرا کا باغ پھولوں سے آباد تھا کبھی ۱ ہر پھول درد و رنج سے آزاد تھا کبھی
فرحاں ہر اک صنوبر و شمشاد تھا کبھی دور خزاں سے دور بہت شاد تھا کبھی
ہر سُو تھی چہل پہل گلوں میں شمیم کی
گلشن میں حکمرانی تھی بادِ نسیم کی

پھر اس چمن کو کسکی نہ جانے لگی نظر قائم کیا خزاں نے یہاں اپنا مُستقر
رخصت ہوئے جہان سے جب سیدّ البشر غم کی ہوا نے گھیرا لیا فاطمہؑ کا گھر
ہوتے ہی آنکھ بند رسالتمآبؐ کی
اُمت ہوئی تمام عدو بوترابؑ کی

زہراؑ کو اہلِ دہر نے رونے نہیں دیا دامن پدر کے غم میں بھگونے نہیں دیا
گھر کی فضا میں چین سے سونے نہیں دیا داغِ مفارقت کو بھی دھونے نہیں دیا
کہتے تھے مٹ گیا ہے سکوں آہِ سرد سے
ہم مضطرب ہیں گریۂ زہراؑ کے درد سے

مغموم ہو کے سیدۂ گزریں جہان سے اندوہ و غم ہے آپؑ کا باہر بیان سے
گزرے ابوترابؑ کڑے امتحان سے رہنے دیا نہ آپؑ کو دم بھر امان سے
امت نے ظلم جور کا طوفاں اُٹھا دیا
مسجد میں روزہ دار پہ خنجر چلا دیا

کیا خوب تھا یہ اجر رسالت کا اہتمام　　سبط نبیؐ کو زہر ستم کا پلایا جام
جب زہر نے حسنؑ کے جگر پر دکھایا کام　　آلِ نبیؐ پہ چھا گئی رنج و الم کی شام
دن بحرِ غم میں ڈوب گیا رات ہوگئی
تیروں کی جب جنازے پہ برسات ہوگئی

قابض ہوا یزید حکومت کے تخت پر　　نازاں ہوا لعین بہت اپنے بخت پر
بیعت کا زور و شور تھا نرم و کرخت پر　　ضد نے اُسے اُبھار دیا حکم سخت پر
اُس کو شعار دیں کے کچلنے کی فکر تھی
اسلام کا مزاج بدلنے کی فکر تھی

زاہد بخاری بہت احتیاط سے تاریخ کے ساتھ ساتھ چلے ہیں۔ یزید نے مدینے کے گورنر ولید کو خط لکھا کہ حسین سے بیعت طلب کرو ۔

پہنچا جو خط ولید کو ظالم یزید کا
آیا حضور شاہؑ سپاہی ولید کا

امام دربار میں گئے۔ ولید نے یزید کا پیغام امام کو دیا۔ امام حسینؑ نے بیعت سے انکار کیا۔ ـ

عصمت سرا میں آئے وہاں سے حسینؑ جب　　اہل حرم بڑھے پئے تعظیم سب کے سب
دربار میں بلانے کا پوچھا گیا سبب　　شہؑ نے کہا یزید کو بیعت کی ہے طلب
رہنے نہ دیں گے لوگ یہاں مجھ کو چین سے
چھوٹے گا اب نبیؐ کا مدینہ حسینؑ سے

حسینؑ سفر کی تیاری کرتے ہیں، فاطمہ صغرا کو ساتھ نہ لے جانے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اس منزل پر شعراء کرام اور مقررین نے صغرا کو فریاد و بکا کرتے دکھایا ہے۔ لیکن زاہد بخاری کی چشم تصور نے جو منظر دیکھا اور جو کچھ نظم کیا وہ خانوادۂ رسالت کے صبر و ضبط کی بے مثال عظمت کا اظہار ہے۔ صغرا کی زبان سے زاہد بخاری جو الفاظ ادا کرائے ہیں وہ پڑھ کہ صغرا صبر کی منزل پر حسینؑ کی بیٹی نظر آتی ہیں۔ قافلہ تیار ہے، بھائی علی اکبر افسردہ و نادم نظر آرہے ہیں۔ ایسے میں، بہن کا کردار دیکھئے۔

بھیا، وطن کو لوٹ کے آنا نصیب ہو　　چہرہ بہن کو اپنا دکھانا نصیب ہو
پردیس میں بہن کو بلانا نصیب ہو　　اک بار مجھ کو اپنا گھرانا نصیب ہو

ارسال خط جو ہو نہ سکے نامہ بر کے ساتھ
پیغام بھیج دینا نسیم سحر کے ہاتھ

آفرین! سید زاہد بخاری، تم نے آقازادی کے کردار کو جس بلندی پر دیکھا در حقیقت وہی اس گھرانے کا مقام ہے۔ حرمتِ آلِ رسول کی عظمت کا ادراک مبارک ہو۔

☆☆☆☆☆

طاہر ناصر علی:- (لاہور)

ولادت ۱۹۵۹ء

نام، طاہر علی، تخلص، طاہرؔ۔ جائے پیدائش لاہور۔ والد اسم گرامی سید رفاقت علی شاہ۔ دادا سید ناصر علی۔ نانا خان بہادر محمود حسین زیدی ناظم درگاہ پنجہ شریف۔ طاہرؔ کے والد گجرات کے معززین شہر میں شمار ہوتے تھے۔ گجرات میں عزاداری کی بناڈالنے والوں میں حکم سیّد رفاقت علی شاہ کا اسم گرامی نمایاں تھا۔ اس صاحب عزت گھرانے میں طاہرؔ نے دادا کے نام کو اپنی نسبت کے لئے چُنا اور طاہر ناصر علی لکھنا شروع کیا جبکہ وہ طاہر رفاقت علی شاہ بھی ہو سکتے تھے لیکن احترام کی منزل تھی۔ شفقت کے اثرات کا معاملہ تھا جسے موضوعِ گفتگو نہیں بنایا جا سکتا۔

طاہر ناصر علی کے گھرانے میں علمائے کرام کی آمدورفت تھی۔ باکمال شخصیات اور ممتاز اساتذہ کے رشتے اس گھرانے سے استوار تھے۔ چنانچہ طاہر ناصر علی کو بچپن سے اپنے چاروں طرف علم کا اُجالا ملا۔ فکر کی روشنی نظر آئی۔ بچپن میں طبیعت شاعری کی طرف مائل ہوئی تو والد گرامی رفاقت علی شاہ نے چاہا کہ بیٹے کو شاعری کی طرف نہ جانے دیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ راقم الحروف کا تعلق سید رفاقت علی شاہ سے رہا ہے۔ مجھے زمیندار کالج گجرات میں طالب علمی کے دور میں شعر کہنے کی لت لگ چکی تھی۔ سید رفاقت علی شاہ اُن بزرگوں میں تھے جو میری شاعری کو پسند کرتے تھے۔ لیکن شاید وہ اپنے بیٹے کو کسی صنعت یا انجینئرنگ کی طرف مائل کرنا چاہتے تھے مگر ان منازل پر بچے کا ذہنی رجحان جو فیصلہ کرتا ہے ماں باپ اور اعزاء کو بہر حال، ماننا پڑتا ہے۔ طاہرؔ ناصر علی ادب کی طرف چل پڑے۔ وحید الحسن ہاشم پروفیسر مشکور حسین یاد۔ افسر عباس زیدی۔ زیبا نادری۔ قیصرؔ بارہوی جیسے اکابرین ادب کو رہنما مانا اور ان کا سفر آسان ہو گیا۔

طاہر ناصر علی باقاعدہ مرثیے کہہ رہے ہیں۔ اُمید ہے آنے والے دور میں بھی وہ اس

منزل پر ثابت قدم نظر آئیں گے جہاں لوگ اُن سے راستہ پوچھیں گے۔ اُن کے پہلے مرثیے کی کچھ بند درج ذیل ہیں جو روشن مستقبل کا حوالہ ہیں۔ مرثیہ کا عنوان ''عظمت حسینؑ'' ہے۔

لبریز زندگی سے سبو ہے حسینؑ کا توقیرِ صد نمازؐ وضو ہے حسینؑ کا
کیا پراثر بریدہ گلو ہے حسینؑ کا اسلام کی رگوں میں لہو ہے حسینؑ کا
وہ خوش نصیب ہے کہ جسے اس سے پیار ہے
اس کا وجود نعمتِ پروردگار ہے

سجدہ ہے جس کا روح عبادات وہ حسینؑ جس کی ہیں شش جہت میں کرامات وہ حسینؑ
حدِ بشر کی جو ہے علامات وہ حسینؑ زندہ ہیں جس کی فکر سے سادات وہ حسینؑ
گردش کا خوف اب نہیں پائے ثبات کو
ایسا نظام دے گیا وہ کائنات کو

یہ گونجتی ہے چار طرف دہر میں صدا اے صاحبو سنو یہ تفکر کا فیصلہ
ہوتا بشر نہ درد کی لذّت سے آشنا انساں گنگ رہتا جو ہوتی نہ کربلا
اللہ کا دیا ہوا منصب غمِ حسینؑ
ہے مصطفیؐ کے دین کا مکتب غمِ حسینؑ

بارود کے دھوئیں سے ہے دنیا اٹی ہوئی آغوش ظلم وجور دستم میں پلی ہوئی
ذہنوں پہ گردِ جہل کی تہہ ہے جمی ہوئی گویا ہے بے ضمیروں کی بولی لگی ہوئی
آؤ کہ حق کی سمت بلاتی ہے کربلا
انساں کو آفتوں سے بچاتی ہے کربلا

کوفہ مزاج ذہن کے پالے ہوئے فقیر دست یزیدیت سے خریدے ہوئے ضمیر
لائے ہیں زہرِ کفر میں تر کرکے اپنے تیر سینہ سپر ہیں آج بھی مظلوم کے سفیر
اسلام کے علمؐ کو جھکایا نہ جائے
نام حسینؑ ان سے مٹایا نہ جائے

بیشک بنی اُمیہ اور بنی عباس کے چھ سو سالہ دور اقتدار میں حسینؑ کے نام لیواؤں کی دی ہوئی قربانیاں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں۔

"اسلام کے علم کو جھکایا نہ جاسکا
نام حسینؑ اُن سے مٹایا نہ جاسکا"

یہی حقیقت ابدی طاہر ناصر علی نے مکرر کہی ہے۔ اور یہی حقیقت تا قیامت دہرائی جاتی رہے گی۔ طاہر ناصر علی کی تا حال تصانیف حسب ذیل ہیں۔

(۱) خیراتِ نجات مطبوعہ ۱۹۹۰ء
(۲) مہکنے لگا پیکر اپنا مطبوعہ ۱۹۹۴ء
(۳) نسبتوں کے دکھ مطبوعہ ۱۹۹۶ء
(۴) تشنہ لبی مطبوعہ ۲۰۰۰ء

خدا کرے طاہر ناصر علی اسی استقلال سے کعبۂ مقصود کی طرف بڑھتے رہیں۔ فریضۂ ولا ادا کرتے رہیں۔ دنیائے سخن میں اُجالا بکھیرتے رہیں۔ آمین

☆☆☆☆☆

علی رضا کاظمی :- (لاہور)

پیدائش جولائی ۱۹۶۲ء

جائے ولادت لاہور۔ آبائی وطن انبالہ (ہریانہ)۔ تقسیم ہند کے بعد ان کا خاندان لاہور آ گیا۔ ان کے والد گرامی سید محمد رضا کاظمی لاہور کی رسومات عزاداری میں نصف صدی سے اپنا حصہ ادا کر رہے ہیں اور قومی خدمات کے سلسلے میں جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ علی رضا کے تایا سید عاشق حسین کاظمی لاہو کے معروف و ممتاز سوز خواں تھے۔ علی رضا نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کیا۔ طبعیت شاعری کی طرف مائل تھی۔ گھر میں ہر وقت مرثیہ خوانی کا ماحول تھا۔ مرثیہ خوانی سے دلچسپی ہو تو شاعری اساس فکر بن جاتی ہے۔ علی رضا کو گھر سے شعر و شاعری کا ماحول ملا۔ اس پر پروفیسر حسن عسکری کاظمی نے ترغیب دی کہ سلام، منقبت اور مرثیہ کہیں۔ چنانچہ ۱۹۸۲ء سے سلام منقبت اور نوحہ کہنے لگے۔ قیصر بارہوی مرحوم نے میر انیس کے مرثیوں کے سنجیدہ مطالعہ کی طرف راغب کیا۔ ڈاکٹر ظہیر منہاس سے رشتہ تلمذ استوار ہوا۔ مادر گرامی کا سایہ سر سے اُٹھا تو خود کو زندگی کی چلچلاتی دھوپ میں بے سائباں پایا۔ ایسے میں ڈاکٹر خاکی مرحوم کا مرثیہ "ماں" نظر سے گذرا، ماں کی جدائی کا زخم تازہ تھا۔ اس مرثیے نے اس زخم پر مرہم رکھا۔ ذرا چین ملا تو اپنا قلم حرکت

میں آگیا اور پہلا مرثیہ " ماں " کہا، لاہور میں " تازہ واردان بساطِ مرثیہ " کے سروں پر شفقت سے ہاتھ رکھنے والی شخصیت سید وحید الحسن ہاشمی نے سرپرستی کی اور سید علی رضا کے مرثیے کو شائع کر دیا۔

سید علی رضا کاظمی اس مرثیے سے قبل پچاس سے زیادہ سلام کہہ چکے ہیں۔ گویا ولا اور رثا کی دنیا میں نئے بھی نہیں ہیں بلکہ مداحِ اہلبیت شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اُن کا یہ پہلا مرثیہ اس عزم کا اعلان سنائی دیتا ہے کہ اب اس راہ پر سفر کا آغاز کر چکے ہیں۔ اللہ انہیں ثابت قدم رکھے۔

دنیا میں ماں کا لفظ ہے محبوب و معتبر تعظیم جس کی کرتے ہیں ہر دور کے بشر
عظمت پہ جسکی جھکتا ہے ہر آدمی کا سر اب تک ہوا جواب نہ ماں کا زمین پر
عظمت کو ماں کی خالقِ یزداں سے پوچھئے
جو بات پوچھنی ہو وہ قرآں سے پوچھئے

ماں کے خلوص کو کیا نبیوں نے بھی سلام ماں کو خدا کے بعد وہ بخشا گیا مقام
کچھ مائیں ہیں خدا سے جنہوں نے کیا کلام ماں کے سبب سے چلتا ہے دنیا کا انتظام
ان ماؤں کی مدد کو نبیؑ و رسولؐ تھے
زندہ انہی سے دیں کے فروع و اصول تھے

ماں کی عظمت کے بیان میں بہت سے بند کہنے کے بعد سید علی رضا کاظمی نے دنیا کی اعلیٰ نسبت ماؤں کا ذکر یوں شروع کیا ہے۔

اک ماں ہے وہ بھی جس کو ملا ہے بڑا مقام اس شخصیت کا ہاجرہؑ تاریخ میں ہے نام
جب شدتِ عطش سے ہوا لال تشنہ کام کرنے چلی تلاش وہ پانی کا ایک جام
پلٹیں تو ایڑیوں کا نبیؑ کے نشاں ملا
بچے کے پاس چشمۂ آبِ رواں ملا

مریمؑ سی ماں بھی گزری ہے اس کائنات میں اک رجس کا گزر نہیں جس کی حیات میں
خوشبو ہر اک صفت کی ملی جس کی ذات میں عیسیٰ نبی کی ماں وہ بنی شش جہات
عزت پہ ماں کی حرف جو آیا جہان میں
بچے نے دی گواہی پھر اپنی زبان میں

کیا آمنہؑ کی کوئی فضیلت کرے بیاں کہہ لیں انہیں زمیں پہ تقدس کا آسماں
کس کا پسر ہوا کبھی پیغمبرؐ زماں اتری ہے جس کے گھر میں عبادت کی کہکشاں
خالق نے ان کو رحمت بے حد بنا دیا
محمود خود تھا ان کو محمدؐ بنا دیا

بنت اسدؑ بھی ماں ہیں زمانے میں انتخاب حیدرؑ اسی کا لال ہے جس کا نہیں جواب
کعبہ ہوا ہے جس کے تولد سے فیض یاب جس کا تحفظ نبوی میں کٹا شباب
جس کو ہر اک محاذ پہ حاصل کمال تھا
جس کا علیؑ ہے نام ابو طالبؑ کا لال تھا

دنیا میں ہے خدیجہ کبریٰؑ بھی ایک ماں شوہر ملا ہے جس کو محمدؐ سا نکتہ داں
بیٹی ہے جس کی فاطمہؑ عصمت کی پاسباں کعبہ کی طرح جس کا معزز ہوا مکاں
جبریلؑ جس میں عرش سے پیغام لاتے تھے
جس کا دیا ہوا غربا مال کھاتے تھے

ہر ایک ماں کو کب ملی تقدیر فاطمہؑ ظاہر ہوئی حجاب میں تصویر فاطمہؑ
شمس و قمر ہیں روکش تنویر فاطمہؑ ہے کائنات خطۂ جاگیر فاطمہؑ
خالق نے ہر خطا سے انہیں دور کر دیا
عالم کو ان کے مہر میں محصور کر دیا

ان کا لقب نگاہِ جہاں میں بتولؑ ہے ماں جن کی ہے خدیجہؑ تو بابا رسولؐ ہے
شوہر علیؑ ہے جن کا کساء میں شمول ہے بیٹوں پہ جن کے حق کے کرم کا نزول ہے
دنیا کا رنج جن پہ اثر ڈالتا نہیں
یہ وہ ہیں جن کی بات خدا ٹالتا نہیں

زینبؑ بھی ایک ماں ہے زمانے میں بے مثال بھائی پہ جس نے وار دیئے اپنے دونوں لال
خیمہ میں لاش آئی جو بیٹوں کی خستہ حال شکر خدا میں جھک گئی وہ فاطمہؑ جمال
کہتی تھی آج حق کا فدائی تو بچ گیا
بیٹے گئے تو کیا ہوا بھائی تو بچ گیا

کیا کربلا میں ہو گیا مائیں بتائیں گی　　خیموں میں العطش کی صدائیں بتائیں
گزری ہیں دل پہ کیا کیا جفائیں بتائیں گی　　مقتل سے جو اٹھی ہیں ہوائیں بتائیں گی
ماؤں کی حسرتوں کا وہاں کیسا حال تھا
بے آب ننھے بچوں کا جینا محال تھا

لیلیٰ بھی ماں تھی چھٹ گیا جس سے جواں پسر　　جی بھر کے جو نہ رو سکی بیٹے کی لاش پر
بیٹے کی سمت کرتی تھی حسرت بھری نظر　　کہتی تھی کیا ملا مجھے الفت سے پال کر
گھر دے دیا کسی کو تو گھر کا چراغ دے
یا نو جواں پسر کا نہ مادر کو داغ دے

دل چاہتا ہے اب لکھوں میں ایسی ماں کا حال　　تھا جس کی گود میں علی اصغرؑ سا نونہال
اک بچی جس کی عمر تھی مشکل سے چار سال　　دونوں ہی بے نظیر تے دونوں ہی بے مثال
دونوں نظر میں تھے تو غم دہر دور تھا
دونوں سے ماں کے قلب و جگر میں سرور تھا

دونوں کو دیکھ دیکھ کر شاداں بہت تھی ماں　　سرمایہ حیات تھے دونوں ہی بے زباں
یہ فکر تھی ربابؑ کو اصغرؑ نہیں جواں　　کیسے فدا کرے گا یہ بابا پہ اپنی جاں
میداں میں کس طرح سے بھلا چل کے جائے گا
کس طرح اس کا نام شہیدوں میں آئے گا

اور پھر اس ماں کے ششماہے بچے علی اصغر کا نام بھی شہیدوں میں شامل ہو گیا۔

اے ماؤں کو ممتا کے جوہر سے نوازنے والے، علی رضا کی مرحومہ ماں کی دعاؤں کا واسطہ، ننھے علی اصغر کے خون ناحق نے کائنات میں جو روشنی پھیلائی ہے وہ روشنی علی رضا کے دل میں بھر دے۔ اس دل کو غم حسین کے علاوہ کوئی غم نہ ہو۔ یا اللہ علی رضا کی ابتدا کو کامیاب انتہا تک پہنچا دے۔

☆☆☆☆☆

فضلِ حسن عرفی :- (لاہور)

پیدائش ۱۹۷۵ء

نام سید فضل حسن۔ تخلّص، عرفیؔ۔ جائے ولادت لاہور۔ والد کا اسم گرامی، ممتاز مرثیہ نگار، نقاد سید وحید الحسن ہاشمی۔ دادا، حضرت صنعا الہ آبادی۔ تایا حضرت حبیب جونپوری سب کے سب مستند شاعر، اور صاحبان دیوان شاعر پھر بھلا فضل حسن عرفی شاعر کیوں نہ ہوتے۔ میراث پدر کون سنبھالتا۔ والد گرامی نے تولاّ کا جو سفر شروع کیا اور دوسروں کو ساتھ لیکر جو چلے ہیں انہیں منزل تک کون لے جاتا، اس روایت کو کون آگے بڑھاتا۔

عرفی کا جس گھرانے سے تعلق ہے، جس مکتبہ ''فکر'' سے تعلق ہے اس مکتبہ فکر والوں نے تو میرث اجداد کو باقی رکھنے کے لئے تلواریں بھی اُٹھائی ہیں اور سر بھی دئے ہیں۔ عرفیؔ نے تو قلم اُٹھایا ہے اور وہ اس لئے کہ عرفیؔ کی میراث ایک قلم اور حبِ محمدؐ و آل محمد ہے۔ سیّد فضلِ حسن عرفیؔ سے پہلے بھی ایک عرفی ہوا ہے جس نے کہا تھا ؎

''عرفی تو میندیش زغوغائے رقیباں
آوازِ سگاں کم نکند رزقِ گدا را''

یہ شعر اُن لوگوں کے لئے ایک نعرہ بن گیا جو مخالفتوں سے بے نیاز، منزل مراد کی طرف تیز قدمی سے سرگرمِ سفر ہیں۔ یہی شعر فضل حسن عرفی پر بھی صادق آتا ہے کہ وہ بھی کدورتوں اور نفاق کی آندھیوں سے گذرتے ہوئے حسینیت کی راہ پر گامزن ہیں۔ اس استقلال کا ایک ہی سبب معلوم ہوتا ہے جس کی وضاحت فضل حسن عرفی کا ایک شعر ہے ؎

؎ کٹ کے رہ جاتی ہے رستے میں کوئی مشکل ہو
ہاں مگر شرط ہے سینے میں حسینی دل ہو

حسینی دل تو سب کے پاس نہیں ہوتا۔ یہ تو اہلِ تولاّ کا سرمایہ ہوتا ہے۔ فضل حسن عرفی کے پاس غالباً یہ سرمایہ ہے۔

عرفیؔ قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے ایم بی۔ اے ہیں۔ مرثیہ گوئی میں اپنے گھر سے جو روشنی پھوٹ رہی ہے اس سے استفادہ کررہے ہیں۔ ادبی اور علمی پس منظر اس بات کا یقین دلا رہا ہے کہ وقتی جذبات کے تحت مرثیہ نگاری نہیں کی بلکہ ''متاعِ حبِ شہیداں'' کو سینے سے

لگائے ان راہوں پر کامزن ہوئے ہیں۔ اللہ اُنہیں نظر بد سے بچائے۔

ہم نے جو دو چار حروف ابجد سیکھے ہیں وہ بہت ٹھوکریں کھا کر سیکھے ہیں اسی لئے جی چاہتا ہے کہ ہر آنے والے کو راستہ دکھانے کی کوشش کی جائے۔ فضل حسن عرفی کو اللہ نے اس نعمت سے نوازا ہے۔ وحید الحسن ہاشمی جیسا مشفق اور فکر ونظر کی بلاغت کا حامل باپ سب کو نہیں ملتا ہے۔ اس لئے یقین ہے کہ یہ نوجوان، یہ آج کا ستارہ، آنیوالی کل کا آفتاب یا ماہتاب ہوگا۔

عرفی کے مرثیے کے چند بند نقل کئے جا رہے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدا خوش کن ہے۔ بنیاد مضبوط ہے۔ انشاءاللہ مضبوط عمارت تعمیر ہوگی۔ مرثیے کا عنوان ہے "سیاست تبسّم"۔

باغ افکار کے پھولوں کے مہک زخمی ہے ۱ آتش شوق کے شعلوں کی لپک زخمی ہے
قلب بیدار کے جذبوں کی چمک زخمی ہے حلقہ چشم میں خوابوں کی دھنک زخمی ہے
گردن ذہن رسا پنجہ طاغوت میں ہے
روح اک لاش ہے اور جسم کے تابوت میں ہے

خود غرض دل کی صدا ظلم پہ خاموش رہو ۴ نشہ مصلحت وقت میں مدہوش رہو
جس کے غم میں سحر و شام سیہ پوش رہو وہی مظلوم صدا دے تو گراں گوش رہو
ہم بھی انصاف سے گر آئینۂ دل دیکھیں
خود کو افکار یزیدی ہی کا حامل دیکھیں

سب ہیں مظلوم مگر ظلم سے نفرت ہی نہیں ۵ دل جو مردہ ہے تو اب عزم بغاوت ہی نہیں
ذہن مرعوب ہیں انکار کی عادت ہی نہیں کیا کریں نصرت حق جذبۂ نصرت ہی نہیں
کیا فقط اہل شقاوت کی جفائیں ہیں بہت
ہم میں بھی کوفی و شامی کی ادائیں ہیں بہت

کتنی مضحک یہ ادا ہے کہ حکومت نہ ہلے ان کی مرضی سے ہی ہر پھول گلستاں میں کھلے
ان کی حسرت ہے کبھی زخم تمنا نہ سلے اب یہ لازم ہے کہ منہ توڑ جواب ان کو ملے
اور دے کون شقاوت کی جوانی کو جواب
کربلا دے گی ہر اک ظلم کے بانی کو جواب

کربلا جانتی ہے دور ستم کاری ہے وحشت و دہشت و تخریب و دلازاری ہے

درد ہے زخم ہے افلاس ہے خونباری ہے پھر بھی اک قافلہ ہے جس کا سفر جاری ہے
یہ در فکر سجائیں گے کہ تعمیری ہیں
کربلا منتظر ان کی ہے جو شبیری ہیں

دل حسینی ہو تو ہے دل میں وہ جذبہ روشن جس سے احساس میں تطہیر کا شعلہ روشن
چشم و دل پر ہے یہ فطرت کا اشارہ روشن دل ہے کعبہ تو اسی جذبے سے ہوگا روشن
اسی جذبے کی تجلی سے سنور جاتی ہے قوم
اسی تنویر کی بارش سے نکھر جاتی ہے قوم

اسی جذبے سے نمو پاتا ہے ارمان جہاد کبھی دنیا تو کبھی خود سے ہے اعلان جہاد
کوئی دیکھے تو ذرا وسعت امکان جہاد باپ کی گود کا بستر بھی ہے میدان جہاد
تیرگی شام کی جب رُو بہ اثر ہوتی ہے
ایک بچے کے تبسم سے سحر ہوتی ہے

وہی اصغر کہ تھا باطل سے تصادم جس کا سورہ فتح تھا خاموش تکلم جس کا
اک تبسم سے بھی کچھ کم تھا تبسم جس کا اپنے ہی خوں سے ہوا پہلا تیمم جس کا
کیا خبر تھی یہ تبسم بھی بقا پالے گا
ایک بچہ اسے تحریک بنا ڈالے گا

یاد رہے کہ مرثیے کا عنوان 'سیاست تبسم' ہے۔اس عنوان کے نقطۂ عروج (کلائمکس) کا بند دیکھئے۔

کوئی دیکھے تو سیاست یہ علی اصغر کی کفر تک گریہ کو لے آئی ہنسی اصغر کی
موت کے سینے پہ تحریر ملی اصغر کی زندگی آج سے جاگیر ہوئی اصغر کی
جب شہادت لب معصوم میں ڈھل جاتی ہے
اک تبسم سے بھی تاریخ بدل جاتی ہے

☆☆☆☆☆

(دبستان ہند۔ آئینہ امروز)

قیصر امروہوی:- (علی گڑھ)

ولادت ۱۹۱۹ء

نام سید محمود حسین۔ تخلص، قیصر، سادات حسنی، وطن امروہہ۔ والد کا اسم گرامی، سید مقبول حسن قائل جو اپنے عہد کے ممتاز شاعر تھے۔ قیصر امروہوی نے طالب علمی کے دور سے ہی شاعری کا آغاز کیا، بہت سی غزلیں اور نظمیں کہیں۔ پہلا مرثیہ ۱۹۴۱ء میں کہا جب وہ مدرسہ ناظمیہ کے طالب علم تھے۔ ان کا پہلا مرثیہ شخصی مرثیہ تھا جو مولانا سید نجم الحسن صاحب مجتہد (امروہوی) کی وفات پر کہا تھا۔ قیصر نے اپنے کلام پر ابتدائی اصلاح اپنے والد گرامی سے لی۔ پھر لکھنو گئے تو مولانا صفی لکھنوی سے سلسلۂ تلمذ وابستہ کیا۔ قیصر پیشہ کے اعتبار سے "لائبریرین" ہیں۔ یعنی کتابوں کا قرب حاصل ہے۔ ذوق مطالعہ کی تسکین کے لئے کتابوں کا ذخیرہ ان کی دسترس میں رہتا ہے لہٰذا ادب، تاریخ، علم القرآن، علم حدیث اور تاریخ اسلام پر ان کی گہری نظر ہے۔ رامپور اور علی گڑھ میں کثرت مطالعہ نے انہیں کلاسکی مرثیے اور جدید مرثیے کے تفاوت کا ادارک دیا ہے اسی لئے ان کے مراثی میں وہ قدامت پرستی نہیں ہے جو جدّت وارتقاء کا راستہ روکے اور جدّت کی وہ افراتفری بھی نہیں ہے جو جدّت کے نام پر مرثیے کی حسین اقدار کو ترک کردے۔ فضلیت، اعتدال کا نام ہے، اور اعتدال قیصر کے کلام میں موجود ہے اور انہیں اس کا ادارک بھی ہے۔

تشبیہ میں ندرت رہے، تخئیل میں جدّت　　لفظوں میں فصاحت ہو معانی میں بلاغت
الفاظ میں لبریز ہو یوں رنگ حقیقت　　جس طرح چھلکتی ہو نگاہوں میں محبت
تخئیل میں جذبات کی دنیا نظر آئے
افکار کے ذرّات میں صحرا نظر آئے

ہونے کو ہے اب بارش الہام میں جل تھل　　ہے نظم کے جنگل میں رچانا مجھے منگل
آئے ہیں کہ دیکھیں میرے اشعار کا دنگل　　مہیار و رضیؔ، متقبلؔ و فردوسیؔ و دعبلؔ
افکار کی گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی ہے
دنیا میری تخئیل سے تھرّائی ہوئی ہے

قیصؔر کے مراثی میں جدید لب ولہجے کی آب وتاب اور گلشن فکر میں تازہ ہوا کے جھونکوں کی تازگی کا احساس ملتا ہے۔ وہ جمود سے زیادہ حرکت اور انجماد سے زیادہ انقلاب کے داعی نظر آتے ہیں۔ قیصؔر امروہوی کے مراثی کے کچھ بند درج ذیل ہیں۔

اے وقت چاہئے کوئی پھر تازہ انقلاب طاری ہے ذرّے ذرّے میں آشوب و اضطراب
ہے تیز نبض دہر عناصر میں پیچ و تاب برہم ہے طبعِ آتش وخاک و ہوا و آب
کرب الم سے زرد ہے چہرہ حیات کا
دھارا ہے تیز قہر کی خونیں فرات کا

لرزہ بدل ہے ساعتِ میدانِ گیر و دار نکلا ہے کون تیغ بکف بہر کا ر زار
رخت و زرہ، مشیتِ رب، تیغ ذوالفقار عزم علیؑ، ثباتِ نبیؐ، قصدِ کرد گار
ڈر ہے کہیں بساطِ زمانہ سمٹ نہ جائے
ساتھ آستیں کے تختۂ گیتی اُلٹ نہ جائے

جنگ کی منظر نگاری کا کمال ایک بند میں آجاتا ہے۔ (تلوار کی تعریف)۔

موجوں سے ذوالفقار کی تھا زلزلہ میں رن تھا میمنے سے میسرہ لشکر کا شانہ زن
تڑپی جو قلب پر تو پھڑکنے لگے بدن گر کے اٹھی تو مہر پہ کھینچا خطِ گہن
چمکی جو رزم گاہ کو لاشوں سے پاٹ کے
پہنچی فلک پہ عقد ثریا کو کاٹ کے

قیصؔر کے کلام میں بیانیہ (NARATION) بہت استعاراتی اور علامتی نہج پر ہوتا ہے۔ شب عاشور کرب کی رات تھی، بے چینی کی رات تھی، کہیں یہ بے چینی اس لئے تھی کہ صبح ہو تو جان کا نذرانہ پیش کیا جائے، کہیں یہ بے چینی اس لئے تھی کہ صبح ہو تو بچوں کو قربان کیا جائے، کہیں یہ بے چینی اس لئے تھی کہ سب سے پہلے کس کے بھائی، کس کے بچے، کس کے نور نظر شہادت کی منزل پر فائز ہوں لیکن اس رات جس طرح اصحاب حسینؑ نے عبادت کی اس عبادت نے اس رات کو نورانی رات بنادیا تھا، قیصؔر نے اس رات کو اس طرح سوچا ہے اور اس طرح بیان کیا ہے۔

وہ شب کہ پھیلی ہوئی تھی ضیائے ماہ منیر فروغ نور سے تھا بختِ تیر گی دلگیر
ہر ایک ذرّہ تھا صمت و سکوت کی تصویر فضا سے گرتی تھی چھن چھن کے ماہ کی تنویر

محیطِ دشت، تجلی تھی ریگ زاروں کی
ہجومِ نور میں گم تھی ضیا ستاروں کی

محمود حسینؔ قیصر امروہوی صاحب الرائے مرثیہ نگار ہیں، ناقدین نے قیصر کی آراء کو نقد و نظر کے باب میں اہمیت دی ہے۔ ڈاکٹر عظیم امروہوی کی کتاب "مرثیہ نگاران امروہہ" پر قیصر کا تبصرہ ان کی ادبی سوجھ بوجھ اور ادراک شعر کا مظہر ہے۔

"مجھے خوشی ہے کہ نسیم امروہوی کے بعد امروہہ میں مرثیہ نگاری کے فن کا احیاء عظیم سے ہو رہا ہے"

جدید مرثیے پر ان کی وضاحت اور اُن کی رائے کو ڈاکٹر ہلال نقوی نے نقل کیا ہے۔

"جدید مرثیے کا مفہوم یہ ہے کہ زبان، انداز بیان، مضامین، ہر اعتبار سے مرثیہ تجدّد کا حامل ہو۔ علم کی دنیا بہت وسیع ہے اس میں ہر قسم کے مسائل کو پیش کیا جا سکتا ہے خصوصاً اس وقت جو مسائل درپیش میں ان سے روگرانی نہیں کرنی چاہیئے۔ علم و فن کبھی بانجھ نہیں ہوتے"

(بیسوی صدی اور جدید مرثیہ، ص ۳۹۵)

سید محمود حسین قیصرؔ امروہوی کا شمار ان بزرگ شعراء میں ہوتا ہے جو آج بھی مرثیے کے سفر میں منہمک نظر آتے ہیں۔ (ڈاکٹر عظیم امروہوی کے شکریہ کے ساتھ)

☆☆☆☆☆

نقی احمد ارشاد:- (پٹنہ، بہار)

تاریخ ولادت ۵ر جولائی ۱۹۲۰ء

ارشادؔ صاحب کے فراہم کردہ کوائف کے مطابق والد گرامی کا نام سید حسین خاں۔ تعلیم ایم اے (تاریخ) پٹنہ کالج ۱۹۴۶ء۔ عملی زندگی میں پہلا قدم ۱۹۴۳ء میں صوبائی سول سروس سے وابستگی۔ ۱۹۷۰ء میں اسسٹنٹ کلکٹر بنائے گئے۔ یکم اگست ۱۹۷۸ تک سول سروس میں اہم عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ریٹائر ہوئے۔

اردو ادب میں نقی احمد ارشادؔ ایک شاعر، ادیب اور ناقد کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا خاندانی امتیاز یہ ہے کہ وہ شادؔ عظیم آبادی کے پوتے ہیں جو یقیناً ایک شرف ہے۔

تصانیف (مطبوعہ)

۱۔ ''شادؔ کا عہد و فن'' (جلد اوّل) ۱۹۸۲ء

۲۔ ''سرودِ سحر'' نظموں اور غزلیات کا مجموعہ ۱۹۸۴ء

۳۔ ''شعلۂ آزادی'' (ترجمہ) ۱۹۸۸ء

۴۔ ''زبورِ اخلاق'' (شعری مجموعہ جس میں چار مراثی شامل ہیں) ۱۹۹۶ء

ارشادؔ نے سید علی افسوسؔ (مطبوعہ ساقی جولائی ۱۹۶۳ء) اشرف علی خاں فغاںؔ (صحیفہ لاہور جولائی ۱۹۶۶ء) اور دیگر مختلف ادبی شخصیتوں پر مقالے بھی تحریر کیے ہیں جو اہم ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ نقی احمد ارشادؔ نے اپنی مرثیہ گوئی کے متعلق لکھا ہے۔

''مراثی کہنے کا شوق مجھ کو ۱۹۵۳ء میں ہوا جب میں شادؔ کے مراثی کو بوسیدہ اور مالیدہ اوراق سے صاف کر رہا تھا۔ میں نے ان کی روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی'' (زبورِ اخلاق)

نقی احمد ارشادؔ کا ایک مرثیہ ۔ ''آئینۂ دو رنگیٔ لیل و نہار ہوں'' اور دوسرا مرثیہ ۔ ''سالکِ راہ خدا رحمت دارد احمد'' دونوں مراثی بطور نذرِ عقیدت ''مراثی شادؔ'' مطبوعہ بہار اردو اکادمی ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئے ہیں۔ حضرتِ ارشادؔ نے بیسوی صدی کے اختتام تک نو (۹) مرثیے کہے ہیں جس میں سے درج ذیل پانچ ''زبورِ اخلاق'' میں شائع ہوئے ہیں۔

پہلے مرثیے ''کربلا'' کے مطلع کا بند ۔

کربلا تیرے شہیدوں تیری عظمت کو سلام ۔۔۔ تجھ میں جو سوئے ہیں اُن اہلِ شجاعت کو سلام
عاقبت بینوں کو، شیدائے اخوت کو سلام ۔۔۔ ان شہیدانِ رہِ حق کی شہادت کو سلام
تو ہے خاموش مگر حق کی صدا آتی ہے
ذرّے ذرّے سے تیرے بوئے وفا آتی ہے

دوسرا مرثیہ: احوالِ شہادت امام حسینؑ و جناب علی اصغر۔ مطلع کا بند ۔

ہادیٔ دینِ خدا، صفدرِ غازی ہے حسینؑ ۔۔۔ جس سے توقیرِ رسالت وہ حجازی ہے حسینؑ
مذہبِ حق کا خداوندِ مجازی ہے حسینؑ ۔۔۔ جسکی ہر ضرب عبادت، وہ نمازی ہے حسینؑ
یہ نہ ہوتا تو اجالے میں اندھیرا ہوتا
اس طرح دینِ محمدؐ کا نہ ۔۔ ا ہوتا

ایک سو چار (۱۰۴) بند کے اس مرثیے میں نقی احمد ارشاؔد نے سرکار ختمی مرتبت سے ابتدا کر کے کربلا میں شہادت حسینؑ کے بعد خیامِ حسینی کے جلنے تک، تاریخ اسلام کے اہم موڑ نظم کئے ہیں اور مختلف آیاتِ الٰہی کو نظم کیا ہے جس میں سورۂ احزاب کی آیت ۳۲ اور ۴۵، سورہ بروج کی آیت ۴ ،، سورہ بنی اسرائل کی آیت ۸۵ شامل ہیں۔

'زبور اخلاق، کے پیش لفظ میں حضرت نقی احمد ارشاؔد نے کہا ہے کہ ''میں نے مراثی کہنے سے پہلے تاریخ اسلام کا مطالعہ ضروری سمجھا اسی لئے مطالعہ تاریخ کے ساتھ میں نے چھ یا سات مراثی تصنیف کئے''۔ مذکورہ بالا مرثیہ ان چھ سات مراثی میں سے ایک معلوم ہوتا ہے جو یوں ختم ہوتا ہے۔

خیمے جلتے تھے پڑے عابد بے بس بے ہوش ۱۰۳ تھا سیاہ عرب و روم میں قرنا کا خروش
سر تھا نیزے پہ امام دوسرا کا خاموش گھوڑے دوڑ آتے تھے لاشوں پہ شقی، دین فروش
دل پہ کیا کیا نہیں زینبؑ نے جراحت دیکھی
آئی جب خیمے کے در پہ تو قیامت دیکھی

پڑھ کے تاریخ کو یہ مرثیہ ہم نے لکھا ۱۰۴ نہ تو ہے اس میں بہار اور نہ ساقی نامہ
نہ تو ہے رنگ تغزل، نہ تو فرضی قصہ وہی لکھا ہے جسے دل نے ہمارے مانا
نظم ارشاؔد مناسب ہوئے کوشش جب کی
ان کو احباب سرا ہیں تو نوازش سب کی

تیسرا مرثیہ احوال شہادت عبداللہ بن عمیر وہاب کلبی۔ اس مرثیہ پر بھی تاریخی حوالہ ہے (بہ حوالہ تاریخ طبری جلد۔ ۶، ص ۲۴۶۔ مناظر المصائب'' مولفہ مولانا سلیم جرولی اور'' شہید انسانیت'' مولفہ مولانا علی نقی صاحب)

دُرِ یک دانۂ دریائے شہادت تھا وہبؔ ثمرِ نخلِ گلستانِ شجاعت تھا وہب
منبعِ چشمۂ حق، مخزن الفت تھا وہب عاشقِ دینِ خدا، رہبرِ اُمت تھا وہب
دل سے اولاد محمدؐ کا وہ شیدائی تھا
رشکِ فردوس تھا، گو لالہ صحرائی تھا

چوتھا مرثیہ'' دراحوال شہادت و سفرِ امام حسینؑ'' ۸۹ بند پر مشتمل ہے۔

کیا مدح شاہ دیں کا کوئی حوصلہ کرے جب تک خدا نہ قوت فکری عطا کرے
یہ داستاں وہ ہے کہ پڑھا اور سنا کرے ہر بابِ غم سے درس نصیحت لیا کرے
کیوں کر نہ اس کی مدح میں قاصر کلیم ہو
جس کی طرف اشارۂ ذبحِ عظیم ہو

اس مرثیہ میں بھی سورۂ والصفات آیت ۱۰۷، پارہ عم سورۃ والعادیات، آل عمران آیت ۶۱ سورۃ الدہر، کے حوالے نظم کئے گئے ہیں اور تاریخ طبری سے متعلق باقیات کا حوالہ دیا گیا ہے۔

مرثیے کا اختتام بھی ''نقی علی ارشادانہ'' انداز میں کیا گیا ہے۔

سجدے میں سر جو قبلہ دیں کا جدا ہو تھا قبلہ رُو زمین پہ لاشہ پڑا ہوا
ابنِ زیاد فتح سے اپنی ڈرا ہوا صابر کا اس شکست پہ جھنڈا گڑا ہوا
سب کی نگاہ میں درِ تاویل بند تھا
دنیا میں حریت کا نشان سر بلند تھا

تاریخ دیکھ دیکھ کے ہم نے کیا یہ کام صد شکر مرثیہ شہ دیں کا ہوا تمام
حُسن کلام میں نہیں کچھ خاص التزام دیکھیں بغور نفس مطالب جو خاص و عام
صدق و صفا ہو جس میں وہی مرثیہ ہے یہ
ارشاؔد، غور و فکر سے ہم نے لکھا ہے یہ

اور پانچواں مرثیہ ''احوالِ سرورِ کائنات'' رجوع بہ حالاتِ اسیرانِ کربلا'' ہے جس میں نعتیہ بند سے شروع ہوتا ہے اور تاریخ اسلام کے پرت کھولتا، حضرت آدم، حضرت نوح، ابراہیم، یعقوب اوالعزم پیغمبروں کی شریعتوں کی حوالے دیتا، اہلِ ایران کے بابل پر تسلط سے گذرتا ہوا حضرت عیسیٰ کے واقعات تک پہنچتا ہے۔

تھا جو منظور کہ ہو دینِ خدا کی تکمیل ۲۱ یعنی وہ دین کہ ہادی ہوئے خود جس کے خلیل
تب وہ نور آیا، سرِعرش سے بے مثل و عدیل جس کی روشن ہوئی اس بزم جہاں میں قندیل
دور ظلمت جو ہوئی قلزم و احمر جاگا
یعنی اب وادیٔ بطحا کا مقدّر جاگا

اس کے بعد ارشاداتِ نبوی کو نظم کیا ہے۔ غزوات کے حوالوں کے ساتھ خیبر کے

مسلسل تصادم کو نظم کیا ہے۔ خیر و شر کی جنگ ابو سفیان اور محمد مصطفیٰ سے یزید اور حسینؑ تک پہنچی۔ نقی احمد ارشاد نے تاریخ طبری جلد ۶ کے حوالہ سے یزید کی ہرزہ سرائی کو نظم کیا ہے۔

کاش اجداد میں میرے کوئی ہوتا زندہ آج خزرج کے وہ نیزوں کی صدا کو سنتا
آلِ ہاشم سے لیا بدر کا بدلہ کیسا دل سے اس فتح پر مجھ کو وہ دعائیں دیتا
وحی آئی نہ کوئی حکم خدا آیا تھا
تم نے یہ کھیل حکومت کے لئے کھیلا تھا

اس قسم کی ہرزہ سرائی پر مبنی یزید کے آٹھ اشعار سن کر سیدہ زینبؑ کو جلال آتا ہے۔

بولی زینب کہ نہ تو بھول خدا کو ناداں قولِ خالق ہے کہ کرتے ہیں گناہ جو انساں
وقت و مہلت انہیں ملتے ہیں بہ حدامکاں تاکہ خود کر لیں جہنم کا مہیاّ ساماں
کافر اجداد سے اب داد کا تو طالب ہے
کفر دل پر تیرے اونگ جہاں غالب ہے

سیدہ زینبؑ کے خطبے پر مرثیہ کا اختتام ہوتا ہے۔

نقی احمد ارشاد کے مرثیہ کے مطالعہ سے ان کا یہ دعویٰ سرتا پا صداقت پر مبنی نظر آتا ہے کہ انہوں نے مرثیہ گوئی سے پہلے تاریخِ اسلام اور قرآن حکیم کا عمیق مطالعہ کیا ہے اس لئے انہیں ایک پختہ مرثیہ گو ہونے کے ساتھ ساتھ اور علمِ دین سے آگاہ ماننے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیئے۔

☆☆☆☆☆

سید علی مہدیؔ رضوی:- (بلرام پور)

ولادت جنوری ۱۹۳۳ء۔

نام۔ سید علیؑ مہدی۔ تخلص مہدیؔ۔ سادات رضوی۔ آبائی وطن۔ لکھنؤ، لیکن آباو اجداد بلرام پور کے مہاراجہ وجے سنگھ کی دعوت پر لکھنؤ سے بلرام پور منتقل ہو گئے تھے۔ سید مہدی رضوی نے لکھنؤ میں تعلیم پائی۔ لکھنؤ سے وکالت پاس کی اور بلرام پور میں ایک کامیاب ایڈوکیٹ کی حیثیت سے جانے پہچانے گئے۔ آج بھی بلرام پور میں ناجی منزل اور سید علی مہدی رضوی ایڈوکیٹ، عزت و بزرگی کے نشانات ہیں۔ ناجی منزل علی مہدی رضوی کے پردادا سید آقا حسن عرف میرن ناجیؔ نے تعمیر کرائی تھی جو بلرام پور کے مہاراجہ وجے سنگھ کے استاد تھے۔

''سید آقا حسن ناقیؔ نے ریاست بلرام پور کی تاریخ، احسن التواریخ''، لکھی تھی جو تاریخ اور ادب میں بیک وقت ایک اضافہ ہے۔
''اُن کی تصنیف کردہ بہت سی کتابیں اور دیوان ہیں انہوں نے مرزا غالب کے پاس اصلاح کے لئے کلام بھیجا تھا، کہیں قلم نہیں لگایا اور جواب خط میں لکھا کہ آپ مکمل استاد ہیں۔ اصلاح لینے کی آپ کو ضرورت نہیں، اصلاح دینے کی ضرورت ہے۔ خط دیمک کی نذر ہو گیا۔ یہ حقیقت اب افسانہ ہے، آپ اسے حقیقت ہی سمجھئے گا۔''

(مکتوب سید علی مہدی رضوی بنام عاشور کاظمی (۲۱ جون ۲۰۰۲)

علی مہدی رضوی جب لکھنؤ میں زیرِ تعلیم تھے اسی وقت وہاں کی علمی ادبی محافل کے زیرِ اثر شعر گوئی کی ابتدا کی جو جلد ہی مرثیہ گوئی تک لے آئی۔ انہوں نے جون ۱۹۴۷ء میں پہلا مرثیہ کہا جو حضرت علی اصغرؑ کے احوال کا مرثیہ ہے۔ ہر مرثیہ نگار کی زندگی میں پہلے مرثیہ کی اہمیت ہوتی ہے۔ کائنات نقد و نظر میں بھی منزلِ آغاز سے بات شروع ہوتی ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے ان کے پہلے مرثیہ کے چند بند درج ذیل ہیں۔ اس مرثیہ کی قدرت یہ ہے کہ علی اصغر کی عمر کے پیشِ نظر ''مفروضہ رجز'' کی بجائے شاعر نے مدح کے لحن میں رجز پڑھا ہے جو ایک دل کش تجربہ ہے۔

حرملا ہوش میں آ شیروں کا شیر آتا ہے　　شہسوار ایسا کہ آنکھوں میں کھپا جاتا ہے
بھوک اور پیاس میں تیروں کی ہوا کھاتا ہے　　نام ہے جس کا تبسم وہ کماں لاتا ہے
یہ نئی شان ہے طوفانوں کے رخ موڑے گا
جنبشِ لب سے تیرے تیر و کماں توڑے گا

تو گنہگاروں کا ساغر ہے، یہ معصوموں کا جام　　تو اگر صبح کا دشمن ہے تو یہ دشمن شام
تو پسر کاہل ناپاک کا یہ ابنِ امام　　لاکھوں کی فوج میں تو اس کا بستر میں ہے نام
موت سے ڈرتا ہے تُو، موت پہ یہ غالب ہے
یہ بھی ہم نام علیؑ ابنِ ابی طالب ہے

تو اگر ہے شب تاریک تو یہ نور سحر　　تو اگر کفر کی تلوار، یہ ایماں کی سپر
بزدلی جتنی تیرے پاس ہے یہ اتنا نڈر　　تو اگر مقصدِ عنتر تو یہ عزم حیدرؑ

یہ تیری سمت تیرے تیر کا رُخ موڑے گا
درِ خیبر کی طرح بابِ جفا توڑے گا

طالبِ کفر ہے تُو، حق کا طلب گار ہے یہ
خواب غفلت میں ہے تو، طالع بیدار ہے یہ
ہوسِ زیست تجھے، زیست سے بیزار ہے یہ
تجھ سے مرحب کے لئے حیدر کرّار ہے یہ

'تو یزیدی' تو محمدؐ کا سپاہی ہے یہ
خواب سے ہوش میں آ، قہرِ الٰہی ہے یہ

سید علی مہدی رضوی کا ایک مرثیہ ''مجاہد اعظم'' لکھنؤ سے شائع ہوا اور دوسرا مرثیہ ''رودادِ غم'' کے زیرِ عنوان بھی لکھنؤ سے ہی شائع ہوا جس پر ڈاکٹر فضل امام رضوی صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی کا نام نامی، بحیثیت مرتب شائع ہوا ہے۔ رودادِ غم کی ابتدا ملت بیضا کی زبوں حالی کے بیان سے ہوتی ہے۔ اور اختتام امام مظلوم کے احوال پر ہوتا ہے۔ شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہو کہ یہ مرثیہ امام حسینؑ کی پیروکار قوم کی زبوں حالی کا مرثیہ ہے جو درد میں ڈوب کر لکھا گیا ہے۔

۱
ہائے افسوس گناہوں میں گرفتار ہیں ہم
دین سے کہہ دو کہ دنیا کے پرستار ہیں ہم
بند آنکھیں ہیں مگر ناز، کہ بیدار ہیں ہم
مردنی چھائی ہوئی قوم کے بیمار ہیں ہم

درد بڑھ بڑھ گئے یہ کہتا ہے دوا کیا ہوگی
جان دینے کی تمنا ہے شفا کیا ہوگی

۳
دل میں کچھ شوق عبادت ہے نہ ذوق ایماں
صبح کے وقت ساعت پہ گذرتی ہے گراں
جن پہ بیداریاں نازاں ہوں وہ آنکھیں ہیں کہاں
خانۂ حق سے ابھرتی ہوئی آوازِ اذاں

جتنا کھویا ہے ہمیں اس سے سوا کھونے دے
اے موذّن نہ جگا اور ابھی سونے دے

۲۰
خود نہ اپنے کو مٹائیں تو سنور جائیں ہم
مسکراتے ہوئے منزل سے گزر جائیں ہم
اہلِ کردار کہیں لوگ جدھر جائیں ہم
حق پہ بات آئے تو حق بات پہ مرجائیں ہم

بات پستی کی نہ ہو، رفعتِ کردار کی ہو
دل ہو حیدر کا زباں میثم تمار کی ہو

۲۳
قوم وہ بھٹکے، نہ ہوں جس کے پیمبر، رہبر
اور پھر بعد نبی جس کے ہوں حیدر رہبر

جانشیں حیدرؑ کرار کے، شبرؑ، رہبر جس کے ہوں زندۂ جاوید بہترؑ رہبر
یا تو کردار کی پستی سے اُبھر جائے قوم
یا بھٹکنے سے تو بہتر ہے کہ مر جائے قوم

مستقل درس ہے کردارِ رسولؐ الثقلین ۲۲ اسی جادہ پہ چلے فاطمہ کے نور عین
غور کیجئے تو کوئی فرق نہیں ہے مابین ہے وہی صلح حسنؑ اور وہی جنگِ حسینؑ
صلح کی جان، کبھی جنگ کی تقدیر نہیں
کبھی شبرؑ، کبھی پیروِ شبیرؑ نہیں

وہ حسینؑ ابنِ علیؑ نام ہے جس کا مشہور ۲۶ فلک پیر نے دیکھا نہ کبھی ایسا غیور
سرخیٔ خون سے لکھا دین کا زرّیں دستور صبر سے توڑ دیا جبر و تشدّد کا غرور
جس کے انجام نے پھر دین کا آغاز کیا
اپنا سر دے کے رسولوں کو سرفراز کیا

اس کے بعد عظمت حسینؑ اور منقبتِ حسینؑ کے بند ہیں۔

سید علی مہدی رضوی کا ایک اور پُر سوز اور اثر انگیز مرثیہ سیّدہ زینبؑ کے احوال کا ہے۔ جو شاعر کی قدرت شعر گوئی اور رثا کے اوراک پر والادت کرتا ہے۔

ہو چکے سیراب جب کرب و بلا کے جام سے قافلے والے رسن بستہ چلے ناکام سے
شام کی تیاریاں تھی کہ کربلا میں شام سے منزلیں اُن کی کوئی پوچھے دلِ اسلام سے
پھول بن جائیں گے کانٹے راہ میں بونے تو دو
حضرت زینبؑ کو میر کارواں ہونے تو دو

آگ برساتی ہوئی لو میں نکل سکتا ہے کون کوہِ غم کو اپنے قدموں سے کچل سکتا ہے کون
ایسے ناہموار جادوں پر سنبھل سکتا ہے کون خون میں ڈوبی ہوئی راہوں پہ چل سکتا ہے کون
ثانی زہراؑ یہ تجھ سے راہبر کا کام تھا
تیرے سینے میں دلِ پیغمبرِ اسلام تھا

وہ ثباتِ پائے مرداں تیرا ہر مشکل میں ہے منزلیں خود بڑھ رہی ہیں تو ابھی منزل میں ہے
رہبری نوعِ بشر کی تیرے آب و گل میں ہے رہنمائے کربلا کا عزم تیرے دل میں ہے

تو نے میرِ کارواں ٹھکرا کے ہر آرام کو
منزلِ مقصود تک پہنچا دیا اسلام کو

یاد ہے تاریخ کو تقریر فرمانا تیرا　　شام کی تاریکیوں میں نور برسانا تیرا
درد میں ڈوبا ہوا لہجہ، دلیرانہ تیرا　　قوت مظلوم کو ظالم سے منوانا تیرا
سرنگوں سنتے رہے خطبوں کو، ایسا پاس تھا
جیتنے والوں کو اپنی ہار کا احساس تھا

کوفہ وشام کے بازاروں میں سیّدہ زینب کے خطبات اگر یزیدی عزائم کی تاریکی میں، انسانی ضمیروں کو جھنجھوڑ کر نصاب آل محمد کا اُجالا نہ پھیلاتے تو تاریخ کے اس موڑ کے بعد تاریکی کے علاوہ کچھ نہ ہوتا۔ سیّد علی مہدی رضوی نے اس صورتِ حال کی عکاسی کی ہے۔ اور ''جیتنے والوں کو اپنی ہار کا احساس تھا'' کہہ کر مظلومیت کی فتح کا اعلان کر دیا ہے۔

سید علی مہدی رضوی نے ۲۷ مسدس اور ۳۵ مرثیے کہے ہیں۔ اپنے مکتوب (بنام سید عاشور کاظمی ۲۰ رمئی ۲۰۰۲) میں انہوں نے اپنے مراثی اور مسدس کی تعداد الگ الگ بتائی ہے اور اپنے مکتوب میں وضاحت کی ہے کہ جس مسدس میں صرف فضائل ہی فضائل ہیں انہیں مسدس قرار دیا ہے اور جس مسدس میں مصائب کا بیان ہے اسے مرثیہ کہا ہے۔

سید علی مہدی رضوی اپنے مراثی کے حوالے سے ایک وسیع النظر شاعر ہیں۔ ان کے مراثی میں قدیم اقدار کی پاسداری کے باوجود کہیں قدیم وجدید دست بہ گریباں نہیں ہیں بلکہ روشنی روشنی سے ملتی نظر آتی ہے۔ ''شاعر آخر الزماں جوش ملیح آبادی'' کے مصنف ڈاکٹر فضل امام نے سید علی مہدی کی شاعری اور مرثیہ گوئی پر جو رائے دی ہے وہ مناسب ہے۔

> ''علی مہدی بلرام پور کی مرثیہ گوئی میں فکر ونظر کے جواہر پارے تشبیہاتی واستعاراتی نظام، اور تلمیحاتی ومحاکاتی عناصر کا بھرپور التزام ہے۔ مسدس کے فن کو بحیثیت صنف سخن برتنے اور موثر انداز سے پیش کرنے کا ہنر ہے، شدت جذبات کو بہتر انداز سے نظم کرتے ہیں۔ عصر حاضر کے مرثیہ نگاروں میں وہ اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔''
>
> (مکتوب ڈاکٹر فضل امام رضوی بنام عاشور کاظمی ۲۲ اپریل ۲۰۰۲ء)

اللہ سید علی مہدی رضوی کو عمر خضر عطا کرے اور اُن کی توفیقات میں اضافہ فرمائے تا کہ وہ عرصہ دراز تک آل محمد کے پیغام کی ترویج کا فریضہ ادا کرتے رہیں آمین۔

☆☆☆☆☆

راحت عزمی:- (حیدرآباد، دکن)

ولادت ۱۶ر اکتوبر ۱۹۲۲ء

نام راحت علی۔ تخلص عزمیؔ۔ آبائی وطن حیدرآباد دکن۔ تعلیم بی،اے۔ پیشہ درس و تدریس۔ راحت عزمیؔ شاعر ہیں، ادیب ہیں، مورخ ہیں۔ نثری ادب میں ان کی تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں جبکہ ابھی تک شعری مجموعہ شائع نہیں ہو سکا۔ مطبوعہ کتابوں کے نام درج ذیل ہیں

(۱) تاج محل (۲) علامہ ابن خلدون (۳) مہ لقا بائی چندا

ہر کتاب کا موضوع جداگانہ ہے جو اُن کے وسعتِ مطالعہ پر دلالت ہے۔ شاعری کا آغاز ۱۹۳۹ (بعمر ۱۷ برس) ہوا۔ جب تک حضرت نجم آفندی حیدرآباد میں رہے، حیدرآباد کے شعرا نے ان سے سلسلہ تلمذ وابستہ رکھا۔ راحت عزمیؔ بھی حضرت نجمؔ آفندی کے شاگرد رہے ہیں۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن مرثیہ اُن کی پہچان بن گیا ہے۔ ہر سال مجالس میں نو تصنیف مرثیہ پڑھتے ہیں۔ مراثی میں روایت کی پاسداری کرتے ہیں لیکن دور حاضر کی مسائل کا عکس بھی ان کی مرثیہ گوئی پر اثر انداز ہے۔ وسیع المطالعہ شخصیت ہیں اس لئے فکر کی گہرائی ان کے شعر و سخن میں نمایاں ہے۔ اب تک دس مرثیے کہہ چکے ہیں۔

ابھی تک مجموعہ مراثی شائع نہیں ہوا جب بھی شائع ہوا رثائی ادب میں خوش گوار اضافے کا سبب ہوگا۔

راحت عزمی بھی مرثیے کے چہرے میں کوئی موضوع اٹھاتے ہیں، اس کی ساری جہتوں کو نظم کرتے ہیں اور گریز کر کے اس عنوان کی طرف جاتے ہیں جو مرثیہ کا عنوان ہوتا ہے مثلاً: عنوان مرثیہ احوال سیدہ فاطمہ زہرا۔ چہرے کا موضوع سخن ''زبان''۔

نمونہ کلام:

ہر اہلِ علم، اہل قلم پر ہے یہ عیاں ہر موڑ پر حیات کے کام آتی ہے زباں
نثار ہو یا شاعرِ خوش فکر و خوش بیاں اُس کو ملا مقام ہوئی جس پہ مہرباں

ہر دور ہر زمانے کی محفل پسند ہے
دولت زباں کی جس کو ملی، وہ بلند ہے

دعبل ہوں، یا فرزدقؔ و حساںؔ لا کلام　　　باقی زبان ہی کی بدولت ہے ان کا نام
معصوم بارگاہوں میں ان کو ملا مقام　　　کرتی ہے احترام سے دنیا انہیں سلام
لفظ و بیاں کی خوبیاں سب ان کے پاس ہیں
یہ وہ ہیں جو زبان کے نکتہ شناس ہیں

فضائل کا بیان:

قرآن کی کھلی ہوئی تفسیر فاطمہؑ　　　سر تا قدم ہے دین کی تنویر فاطمہؑ
نسوانیت کی عزت و توقیر فاطمہؑ　　　اور پنجتن کی مرکز تطہیر فاطمہؑ
کتنی عظیم ذات کی حاجت روا ہے وہ
مشکلکشائے وقت کی حاجت روا ہے وہ

مصائب کا بیان　　　(سیّدہ فاطمہ زہراؑ کے وصال کا منظر)

زہرا کا حال غیر ہوا آدھی رات سے　　　مایوس ہوگئیں تھیں وہ اپنی حیات سے
سہلاتی تھیں خود اپنے ہی پہلو کو ہاتھ سے　　　بچوں سے بات کرتی تھیں صبر و ثبات سے
فضہؔ سے بولیں آخرِ شب نیند آتی ہے
شہزادی تیری بابا سے اب ملنے جاتی ہے

روایت ضعیف یا توانا ہونے سے قطع نظر، مولا علیؑ کو وصیت کا انداز بھی مصائب کا پہلو ہے۔

ایک بات اور عرض ہے یا شاہ ذوالفقار　　　میں نے کیا ہے بچوّں سے بے اختیار پیار
رونا کسی کا ان میں سے مجھ کو ہے ناگوار　　　بے چین ہوگی قبر میں زہرا جگر نگار
میری طرف سے آخری زحمت ہے یا علیؑ
ان کو نہ دُکھ ہو اتنی وصیت ہے یا علیؑ

نہ صرف اس پورے مرثیے میں بلکہ راحت عزمیؔ کے تمام مراثی میں زبان کلاسیکی مرثیے کی، ذخیرالفاظ قدیم مرثیے کے اور لوازم مرثیہ کی پاسداری ملتی ہے۔ زبان و بیان پر انہیں قدرت حاصل ہے۔

☆☆☆☆☆

قائم جعفری:- (حیدرآباد)

ولادت ۱۹۲۴ء

نام۔سید محمود علی۔ تخلص قائمؔ۔ادبی نام، قائمؔ جعفری۔وطن، حیدرآباد دکن۔شاعری کی ابتدا بارہ برس کی عمر میں کی۔گویا نصف صدی سے زیادہ عرصے سے شعر کہہ رہے ہیں۔حضرت نجمؔ آفندی سے شرف تلمذ پایا اور ان کے شاگردوں میں امتیازی مقام حاصل کیا۔ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔غزلوں قصیدوں منقبتوں اور رباعیات کے کئی مجموعے ترتیب دے چکے ہیں لیکن ابھی شائع نہیں کرا سکے۔البتہ دو مرثیوں کا مجموعہ "فردوس فکر" کے نام سے ۱۹۸۹ء میں ڈاکٹر صادقؔ نقوی نے باب العلم سوسائٹی، حیدرآباد (دکن) کے زیر اہتمام شائع کیا تھا۔اپنی مرثیہ گوئی کے متعلق لکھتے ہیں۔

> "میں نے شاعر اہلبیت علامہ نجمؔ آفندی کے آگے زانوئے ادب طے کیا۔میری فکر و فن کی ترتیب علامہ ہی کی دین ہے۔جب تک علامہ حیدرآباد میں رہے ان سے وابستہ رہا۔جب وہ پاکستان چلے گئے تو اس سفر میں میرے رفیق علامہ کے فرزند و جانشین علامہ سہیلؔ آفندی ہیں۔"
>
> (فردوسِ فکر)

حضرت نجمؔ آفندی کی شاگردی کے حوالہ سے قائمؔ کا شعری سلسلہ نسب مرزا دبیرؔ تک پہنچتا ہے۔لیکن حضرت نجمؔ آفندی کی رہنمائی کا اثر تو لازمی ہونا تھا چنانچہ قائم جعفری نے مرثیہ میں جدّت کی۔ایک تو یہ کہ اپنے مرثیوں میں اور مرثیے کے سارے لوازم و عناصر کا التزام نہیں رکھا بلکہ ایجاز و اختصار سے کام لیا اور دوسری جدت یہ کہ سختی سے حضرت نجم آفندی کی پیروی کرتے ہوئے عصری حسیت کو مرثیے میں داخل کیا۔

"فردوس فکر" میں ان کے دو مرثیے شامل ہیں جبکہ وہ گذشتہ دس بارہ برس سے ڈاکٹر صادقؔ نقوی کی قائم کردہ مجالس میں ہر سال مرثیہ پڑھتے ہیں وہ دس بارہ مرثیے ضرور کہہ چکے ہیں۔"فردوس فکر" میں شائع شدہ مرثیوں میں ایک "معیارِ وفا" ہے جو حضرت عباسؑ کے احوال کا مرثیہ ہے اور دوسرا مرثیہ "شباب و حسن و عشق" ہے جو شہزادہ علی اکبر کے احوال کا مرثیہ ہے۔وفا کی وضاحت انہوں نے یوں کی ہے۔

کب یہ افسانہ ہے اک زندہ حقیقت ہے وفا ۴ جوہر صبر ہے تصویر جلالت ہے وفا
اختیارات کی منزل میں قناعت ہے وفا صبر و ایثار کے قرآن کی آیت ہے وفا
ایک ہی جلوہ ہے یہ ساری فضا روشن ہے
قدرِ ایماں میں فقط شمعِ وفا روشن ہے

پنجۂ ظلم سے انسان کو چھڑاتی ہے وفا ۶ دل میں سوئے ہوئے جذبوں کو جگاتی ہے وفا
درسِ احساس و عمل یاد دلاتی ہے وفا حوصلہ اور مصائب میں بڑھاتی ہے وفا
وار سب ظلم و تعدی کے اُچٹ جاتے ہیں
تاج گر جاتے ہیں اور تخت اُلٹ جاتے ہیں

اور پھر مرکزِ وفا حضرت عباسؑ کے علمدار کی طرف مرثیے کا گریز۔

سن کے اعجاز وفا فکر نے پہلو بدلا ۸ نگہَ شوق نے میداں کی فضا کو دیکھا
خشک ہونٹوں پہ مچلنے لگی ساحل کی ہوا یادِ عباسؑ کی آئی جو ہوا ذکر وفا
دل کی آنکھوں نے کبھی نقش قدم کو دیکھا
کبھی قامت کو کبھی مشک و علم کو دیکھا

حیدری شان، شجاعت کا ہے جوہر عباسؑ صورت و سیرت حیدر کا ہے مظہر عباسؑ
مردِ میداں ہے وغا کا ہے غضنفر عباسؑ دلبر فاطمہ زہرا کا ہے دلبر عباسؑ
صبر کے سانچے میں تلوار کو ڈھالا جس نے
اک نیا ڈھنگ شجاعت کا نکالا جس نے

''فردوس فکر'' میں شامل قائم جعفری کا دوسرا مرثیہ ''شباب و حسن و عشق'' ہے۔ یہ مرثیہ شبیہ پیغمبر، شہزادہ علی اکبر کے احوال کا مرثیہ ہے۔ مرثیے کے چہرے کو شباب، حسن اور عشق کی توجیہات سے سجایا ہے۔ قائم کی مرثیہ گوئی میں غزل کا آہنگ ملتا ہے۔ لہٰذا شباب اور حسن شعر کی توجیہات میں مضمون آفرینی کے ساتھ ساتھ تغزل کی چاشنی حسن شعر کو دوبالا کر رہی ہے ملاحظہ کیجئے۔

شباب

جذبۂ دل کا ہے ممنون ریاضت کا شباب ۱ وجہ الہام ہوا فہم و فراست کا شباب
دلبری میں نظر آتا ہے قیامت کا شباب رُخِ ممدوح کا اک عکس ہے جنت کا شباب

کہاں لفظوں سے نمایاں ہوئی تصویرِ شباب
کیا مصوّر سے بنائی گئی تصویرِ شباب

افقِ زیست پہ جس وقت نکلتا ہے شباب ۳ حال و ماضی کی روایات بدلتا ہے شباب
زلزلے آتے ہیں جس راہ پہ چلتا ہے شباب کہیں طاقت کے سنبھالے سے سنبھلتا ہے شباب
انقلابات کے چہروں پہ بکھر جاتا ہے
حادثے آئیں تو کچھ اور نکھر جاتا ہے

ظلمتِ زیست نہ جاتی جو چمکتا نہ شباب ۴ چاندنی کھیت نہ بنتی جو چھلکتا نہ شباب
عارضِ گُل نہ دمکتے جو دہکتا نہ شباب صحنِ گلشن نہ مہکتا، جو مہکتا نہ شباب
جسمِ نازک میں جوانی کی حرارت لایا
اپنے ہمراہ عزائم کی قیامت لایا

حُسن

حُسن تخلیق کی منزل میں ہے قوتِ آثار ۷ حُسن احساس کے عالم میں ہے تنویرِ بہار
حُسن افکار کی منزل میں ہے پھولوں کا نکھار حُسنِ اذکار کے پردے میں ہے لفظوں کا وقار
حُسن جب چاہے گلستاں میں لطافت بھر دے
غنچگی کانٹوں، میں شبنم میں حرارت بھر دے

حسن کو نور کا بہتا ہوا دریا کہیے ۸ منظرِ چشمِ تمنّا کا سویرا کہیے
یا کسی پردہ نشیں کا رُخِ زیبا کہیے مطلعِ فکر پہ بھی برقِ تجلّی کہیے
حسن پاکیزگیٔ نفس کا اک نام بھی ہے
حسن قدرت کا بشر کے لئے انعام بھی ہے

عشق

عشق کی بات نے ذہنوں کو اُجالا بخشا ۱۰ دعوتِ فکر کا انداز نرالا بخشا
عزتِ نفس کو اک نور کا ہالا بخشا عزم و ہمّت کو جوانی کا قبالہ بخشا
حسنِ یوسف کی کہانی کو روانی دیدی
عشق نے ہنس کے زلیخا کو جوانی دیدی

عشقِ آدم کا شرف، نوح کے طوفاں سے پناہ ۱۲ عشقِ یعقوب کی تجدیدِ بصارت کا گواہ

عشق یوسف کا جمال اور زلیخا کی نگاہ عشق معبود کی معراج ہے، انا اللہ
عشق کا نقش جبیں تربتِ بے شیرؑ میں ہے
عشق کی آخری حد سجدۂ شبیرؑ میں ہے

اوراب گریز

حسن اور عشق و جوانی کا فسانہ سن کر ان پہ پڑنے لگی تاریخ ہدایت کی نظر
فیصلہ ہو نہ سکا کون ہے کس سے بہتر سرنگوں ہوگئے کچھ سوچ کے سب جن و بشر
آئی آواز کہ تم سب ہو برابر کے شریک
روزِ اوّل سے ہو انسان کے مقدر کے شریک

حُسن مبدا سے چلا جانبِ مرکز پہنچا لے کے انگڑائی اگر جاں سے شباب آنکلا
عشق قربانی و ایثار پہ تیار ہوا مل گئے سب تو سراپا علی اکبر کا بنا
حُسن نے اور جوانی نے سنوارا ان کو
جذبۂ عشق نے ہر طرح نکھارا ان کو

یہ مرثیہ شہادت علی اکبر پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ مقطع کا بند دعا بھی ہے اور شعری سلسلۂ نسب کا اقرار و اعادہ بھی ۔

مرثیے کی میرے تاثیر بڑھا دے یارب میر و مرزا کی زباں مجھ کو سکھا دے یارب
حضرت نظمؔ کا اندازِ ثنا دے یارب فکر کو نورِ تخیل کی ضیاء دے یارب
طبعِ قائمؔ کو ذرا اور روانی دیدے
تو سخن کو میرے اکبر کی جوانی دے

اور یوں لگتا ہے قائم جعفری کی دعا قبول ہوگئی ہے۔ آج کل وہ ہر سال ایک مرثیہ کہہ رہے ہیں اور نہ صرف حیدرآباد یا آندھرا پردیش بلکہ مرثیے کی دنیا میں ان کا نام عزت سے لیا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

سہیل آفندی:- (حیدرآباد)

حضرت نجم آفندی کے فرزند، حضرت بزمؔ آفندی کے پوتے، علاّمہ سہیلؔ آفندی، فرزند حیدرآباد ہیں۔ ان کا شمار حیدرآباد کے اُن علماء میں ہوتا ہے جنہوں نے علوم دینی کے ساتھ علوم

جدید کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور سائنسی اقدار و تجربات کو علم دین کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ شاعری اور مرثیہ گوئی علامہ سہیل آفندی کا ورثہ ہے، نثر نگاری اُن کی علم و آگہی کی دین ہے۔ اس لئے ان کی توجہ نثر نگاری کی طرف رہی۔ بیسوی صدی کے آخری دہائی میں حیدرآباد میں مرثیہ کا احیاء ہوا تو مرثیے کے شائقین سامعین کی آنکھیں علامہ سہیل آفندی کی طرف اٹھیں۔ ان کے والدگرامی نجم آفندی کے مراثی کی گونج آج بھی سنائی دیتی ہے۔ جدید مرثیہ کے سفر میں نجم آفندی کے مرثیے سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حیدرآباد کے شعراء ڈاکٹر صادق نقوی، ابراہیم حامی اور قائم جعفری کے اسرار پر حضرت سہیل آفندی نے مرثیہ گوئی کی ابتدا کی۔ ان کا پہلا مرثیہ ''راہ ایماں ہے شہیدوں کے لہو سے روشن'' ۲۷ بند پر مشتمل ہے

ساری تعریف ہے اس کی جو ہے رحمان و رحیم ۱ مالک روز جزا، صاحب احسان قدیم
خالق ارض و سماوات، عزیز اور حکیم واحد و فرد و احد، عادل و غفار و کریم

نام سے اس کے ہی آغاز کیا ہے میں نے
فکر کو مائل پرواز کیا ہے میں نے

ایک پوشیدہ خزانہ تھی یہ ذات واجب ۲ اسم اور جسم نہ ابعاد نہ شکل و قالب
کوئی مطلوب نہ تھا اور نہ تھا کوئی طالب عالم ہُو پہ تھی بس اس کی مشیت غالب

اس نے چاہا کہ کہ ہوں پہچاننے والے پیدا
اس کے احسان کے ہوں ماننے والے پیدا

آئی خالق کی یہ آواز کہ یہ بزم جہاں ۴ گرمیٔ انفس و آفاق، زماں اور مکاں
یہ شجر اور حجر جنّ و ملک اور انساں بوقبیس اور احد اور یہ طور و فاراں

سب کے سب خلق کئے ایک ہی مقصد کے لئے
میں نے یہ دنیا بنائی ہے محمدؐ کے لئے

خالق آدم و عالم نے فرشتوں سے کہا ۵ سانس لینے لگے جس دم یہ ترابی پتلا
اس کے سجدے میں گرو حکم ہے سب کو میرا بس اسی نقطہؐ سے تاریخ کا آغاز ہوا

ایک سرکش نے کہا آگ کا پیکر ہوں میں
کیسے سجدہ کروں کہ خاک سے بہتر ہوں میں

اجتہاد اپنا جو وہ نص کے مقابل لایا ۶ حق کے ماحول میں آوازۂ باطل لایا
بڑی مشکل سے جو آساں ہو وہ مشکل لایا ذہن انسان کے لئے اک سم قاتل لایا
برتری کے غلط احساس نے گمراہ کیا
اور مشیت نے اسے راندۂ درگاہ کیا

یہی اسلام کی تاریخ کا ہے پہلا ورق ۷ عقل والوں کو ملا جس سے اطاعت کا سبق
اور اسی روز جُدا حق سے ہوا تھا نا حق اسی مصدر سے ہیں نکلے ہوئے لاکھوں مشتق
ظلم و بدعت کے، معائد کا یہی ہے آغاز
نوع انسان کے مصائب کا یہی ہے آغاز

کاروانِ بشریت اسی منزل سے چلا ۸ جب بجھا کوئی چراغ ایک چراغ اور جلا
صبر و قربانی و ایثار کا سورج نہ ڈھلا قتل ہابیل سے تا معرکہ کرب و بلا
راہ ایماں ہے شہیدوں کے لہو سے روشن
بازوں سے، سرِ سینہ سے گلوں سے روشن

کربلا زیست کا پیغام ہے انساں کے لئے ۹ کربلا تیغ ہے ہر دشمنِ ایماں کے لئے
کربلا شمع ہے عقلوں کے شبستاں کے لئے کربلا خون ہے مومن کی رگِ جاں کے لئے
کتنے بیدردوں کو پیغامِ ولا دیتی ہے
دہریوں کو مئے توحید پلا دیتی ہے

ختم تمہید ہوئی، مرثیہ کرتا ہوں شروع ۱۰ آخری سجدۂ شبیرؑ ہے میرا موضوع
جب مکمل ہوئے مذہب کے اصول اور فروع یعنی انساں پہ ہوئی ایک نئی صبح طلوع
خُم کے میداں میں جو بر آئی تمنائے خلیل
مسکراتے ہوئے جنت میں نظر آئے خلیل

۲۷ بند کے اس مرثیے کی اساس، علم اور پیغام حق و باطل کی تمیز ہے۔ حق و باطل میں پہلا اختلاف حق و باطل کی پہچان، شیطان کا سجدہ کرنے سے انکار اور خالق کا اسے راندہ درگاہ قرار دینا ہے۔ اور بقول علامہ سہیل آفندی

ظلم و بدعت کے معائد کا یہی ہے آغاز
نوعِ انساں کے مصائب کا یہی ہے آغاز

اور حق و باطل کے اس معرکہ کی انتہا کربلا ہے

کھینچ کر تیغ بڑھے رن میں حسینؑ ابنِ علیؑ ۴۰ مدح کرنے لگیں مظلوم کی آیات جلی
شور اعدا میں ہوا بدر کی تلوار چلی کس میں ہمت جو لڑے یہ ہیں شجاعت ازلی
رن اُلٹ دینے پہ تیاّر نظر آتے ہیں
یوں کہو حیدرِ کرّار نظر آتے ہیں

نہروان و جمل و خندق و خیبرِ صفین ۴۱ ایک منزل پہ چلے آئے ہیں سب کو تھا یقین
آسمانوں کو تھی حیرت، متحیّر تھی زمین کیسے خطرے میں تھا عاشور کو اللہ کا دین
آج شبیرؑ نہ ہوتے تو قیامت ہوتی
اسی میدان میں اسلام کی تربت ہوتی

حضرت نجم آفندی کے مراثی اور نوحوں میں انقلاب کا نعرہ تھا، صداقت کی پکار تھی۔ سہیل آفندی کے مراثی میں علم ہے، تاریخ ہے، فلسفہ ہے اور قوموں کی حیات کے لئے دونوں رویّے ضروری ہیں۔ ہمیں یقین ہے علامہ سہیل آفندی نے اور مرثیہ بھی کہے ہوں گے اور کہیں گے۔ ان کے ہاتھوں میں علم کا پرچم ہے، وراثت کا قلم ہے، عباسؑ کا علم ہے۔ ان کے والد گرامی حضرت نجم آفندی نے اس علم کی منزل بھی بتائی تھی اور مقصد بھی۔ انہوں نے کہا تھا۔

عباسؑ نامور کا علم لے کے جائیں گے
ہم چاند پر حسینؑ کا غم لے کے جائیں گے

علامہ سہیل آفندی کے سامنے اکیسویں صدی کا سفر ہے۔ یہ صدی سائنسی تجربات کی صدی ہے۔ انہیں سائنس کی گھن گرج میں ذکرِ حسینؑ کی گونج کو باقی رکھنا ہے۔ مقصد قربانی حسینؑ کا اجالا پھیلانا ہے۔ انہیں بہت کام کرنا ہے۔

☆☆☆☆☆

عازم رضوی:- حیدرآباد(دکن)

ولادت۔ ۱۹۲۵ء حیدرآباد

نام۔ سید عباس حسین رضوی۔ تخلص عازم۔ آبائی وطن حیدرآباد دکن۔ تعلیم منشی فاضل۔ شاعری کا آغاز ۱۹۴۱ء (بعمر ۱۶ برس) کیا۔ ابتدا ہی سے حضرت نجم آفندی سے تلمذ رہا یعنی خشت اول ایک اُستاد کامل نے رکھی اور اس کے بعد اس کی تعمیر میں بھی مسلسل حصہ لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قلعہ سخنوری مضبوط بنیادوں پر تعمیر ہوا اور محراب شعر میں تولاّ کے چراغ جل اُٹھے۔ عازم رضوی نے یوں تو تقریباً سب اصنافِ سخن طبع آزمائی کی مگر وہ جس نے سر پر سایۂ علم و فضل کیا اسی نے راہِ صدق بھی دکھائی۔ اور عازم رضوی اپنے استادِ محترم کی تراشیدہ راہوں پر سرگرم سفر ہو گئے۔ رثائی شاعری کو اپنا لیا۔

تصانیف:

عازم رضوی کی ۱۶ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں چار مجموعہ مراثی ہیں۔

(۱) ''تاریخ شجاعت'' مطبوعہ ۱۹۶۳ء (۲) ''توحید و ثنا'' ۱۹۸۸ء

(۳) ''آیات مدح'' ۱۹۸۹ء (۴) ''پیاس کا سمندر'' ۱۹۹۲ء

ان مجموعوں کے علاوہ انہوں نے قرآن حکیم کے پہلے پانچ سیپاروں کا منظوم ترجمہ بھی شائع کیا ہے۔ ان کا ایک طویل مرثیہ'' کربلا'' ایک ہزار ایک سو اکیس (۱۱۲۱) بندوں پر مشتمل ہے۔ اس مرثیہ کے ۵۰ بند'' توحید و ثنا'' میں شامل کئے گئے ہیں۔ پورا مرثیہ ابھی تک اشاعت کی منزل سے نہیں گزرا ہے۔ اس مرثیے کے تعلق سے عازم رضوی خود رقم طراز ہیں کہ'' میرا یہ مرثیہ برسہا برس کی شعری اور فکری کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ یہ مرثیہ ایک ہزار ایک سو اکیس بند و پر مشتمل ہے اور میری پچاس سالہ مشقِ سخن کا حاصل ہے۔''

(توحید و ثنا۔ ص ۲۲)

'' توحید و ثنا'' پر آندھرا پردیش اردو اکیڈمی نے اور آیات مدح پر مغربی بنگال اکیڈمی نے عازم رضوی کو انعامات دیئے ہیں جو دنیاوی طور پر اہمیت کے حامل ہو سکتے ہیں لیکن اصل بات تو یہ کہ جہاں سے مرثیہ گوئی کی سعادت اور توانائی ملتی ہے وہیں سے مرثیہ گوئی کا صلہ (reward) بھی ملتا ہے اور عازم رضوی کو پہلا ایوارڈ ۱۱۲۱ بند کا مرثیہ'' کربلا'' کہنے کی استطاعت ہے۔

''توحید و ثناء'' اس اعتبار سے عازؔم رضوی کی اہم کتاب ہے کہ اس میں'' کربلا'' کے پچاس بند شامل ہیں۔ دیگر مرثیہ، اذانِ علی اکبر، ضیغم فرات، میرے حسین کا غم، سجدہ گذار و سر گذار اور خرّیت کی امام'' کے زیرِ عنوان شریک اشاعت ہیں۔ ان مراثی میں ہیئت (FORM) کی اس حد تک پابندی کی گئی ہے کہ یہ مراثی مسدّس میں ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں لوازم مرثیہ کی پاس داری نہیں کی گئی ہے حتیٰ کہ'' کربلا'' کے پچاس بندوں کے علاوہ کسی مرثیہ کا جزو لازم یعنی ''بین'' نہیں ہیں۔ عازؔم رضوی نے ان مراثی کو بجا طور پر'' جدید عصری مرثیے'' کہا ہے۔ البتہ حیرت اس بات پر ہے کہ جوشؔ کے'' حسین اور انقلاب'' پر مسدّس کی چھاپ لگا کر (جبکہ انیس و دبیر کے مراثی بھی مسدّس میں ہیں) انہیں اقلیم مرثیہ سے بے دخل کرنے والے ناقدین نے ابھی تک عازؔم رضوی پر اعتراضات کیوں نہیں کئے۔ کیا اس خاموشی سے یہ اخذ کر لیا جائے کہ اب دنیا کی سمجھ میں آ رہا ہے کہ عصری حسیّت اور وقت کے تقاضوں کے ادراک کے بغیر ماضی کی روشن اقدار کو بھی زندہ و تابندہ نہیں رکھا جا سکتا۔ اس مسئلے کا اطلاق جدید مرثیے پر بھی ہوتا ہے۔

عازؔم رضوی کے طویل مرثیے'' کربلا'' میں ہر شہادت پر مصائب بھی ہیں اور بین بھی، مگر یہ بین امام حسینؑ نے یا خاندانِ رسالت کے کسی فرد نے'' سر پیٹ کر، چلّا کر یا فریاد کی لے میں نہیں کئے ہیں۔ مثلاً حضرت عباس کی شہادت پر امام حسینؑ کا احساسِ درد بیان کرنے کے لئے عازؔم رضوی نے اس احتیاط سے بین کے الفاظ کا انتخاب کیا ہے کہ عظمت حسینؑ اور صبرِ حسینؑ پر حرف نہیں آ سکتا۔

مولا خود اپنے دل کو سنبھالے ہوئے چلے ۳۸ فرمایا ہم تو رہ گئے عباس چل بسے
اب زندگی میں زیست کے تیور نہیں رہے عباس، اب حسینؑ جیئے بھی تو کیوں جیئے
داغ شدید دل کو دیا اور مر گیا
عباس جیتے جی تیرا بھائی بھی مر گیا

عباسؑ آکے اپنی سکینہؑ کا حال دیکھ ۴۰ بکھرا دیئے اس نے تیرے غم میں بال دیکھ
بن تیرے جی سکے گی نہ یہ خورد سال دیکھ کس درجہ ہوگئی ہے بھتیجی نڈھال دیکھ
عباسؑ اب طمانچوں کی نوبت بھی آئے گی
شامِ غریباں کس کو بھتیجی بلائے گی

اے فاتح فرات سکینہ ہے تشنہ لب ۴۱ اب تو تمہارے غم میں نہیں پانی کی طلب
لیکن بہت قریب ہے ظلم و ستم کی شب اتنا بتاؤ بچی اٹھائے گی یہ تعب؟
پانی کی بوند بوند کو ترسایا جائے گا
بن آب اب سکینہ کو تڑپایا جائے گا

بچی تمہیں بلائے گی، آؤ گے یا نہیں ۴۲ تاریک شب میں شمع جلاؤ گے یا نہیں
اعدا کو پھر جلال دکھاؤ گے یا نہیں کھائے گی جب طمانچے بچاؤ گے یا نہیں
واقف ہو تم سکینہ کے نازک مزاج سے
وہ آشنا نہیں ہے ستم کے رواج سے

بے حال ہوگئی ہے بھتیجی، اٹھو چلو ۴۴ کہرام ہے قیام میں برپا سنو چلو
کلمات کچھ تسلی کے سب سے کہو، چلو تم کو پکارتی ہے سکینہ، چلو، چلو،
دو گے صدا اگر نہ صدا کے جواب میں
دریا پہ آ نہ جائے کہیں اضطراب میں

اس مرثیے میں حضرت عباسؑ کی شہادت پر دس بند ہیں۔ دل دردمند کے لئے یہ دس بند بھرپور ترغیب گریہ کر رہے ہیں۔ اس طرح کربلا میں ہر شہادت پر بین کا یہی انداز ہے۔

عازم رضوی بلاشبہ مستند مرثیہ نگار ہیں۔ ان کے جن مراثی میں بین نہیں ہیں وہ بھی رثائی تقاضے پورے کرتے ہیں وہ جو چہرے دکھاتے ہیں وہ آئینہ صفت ہوتے ہیں۔ ان میں کبھی ممدوح کا چہرہ اور کبھی مداح کا چہرہ نظر آتا ہے۔ ممدوح کے چہرے پر روایتی عظمتوں کی روشنی ہوتی ہے اور مداحوں کے چہروں پر عصری تقاضے تحریر ہوتے ہیں۔ بس اس ہنرمندانہ برتاؤ کا نام عازم رضوی ہے۔ وہ جس موضوع کا انتخاب کرتے ہیں اس کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔ مثلاً ''اذان'' سے اذان علی اکبر تک کا فکری سفر ملاحظہ کیجئے۔

ایماں کا سوز و ساز صدائے اذاں میں ہے ۱ صوت و صدا کا رنگ رُخِ کہکشاں میں ہے
لہجے کی دھوپ بکھری ہوئی صحنِ جاں میں ہے خوشبوئے لاالہ اسی گلستاں میں ہے
توحید فکر و ذکر کا معیار ہے اذاں
سمجھو تو پھول سوچو تو تلوار ہے اذاں

بیدارئ عمل کا اذاں سے نشاں ملا ۴ اس سے ثبوتِ عظمتِ عزم جواں ملا
یعنی شگفتہ پھول سے اک گلستاں ملا قطرے سے بحر ذرّے سے کوہ گراں ملا
اس راز کو بھی حُسنِ اطاعت بنا دیا
آواز کو خدا نے عبادت بنا دیا

جس نے ضمیر و ظرف جھنجھوڑے اذان ہے ۹ توحید، امامت اور نبوّت کی جان ہے
ایسا جمیل ذکر، حسین تر بیان ہے معبود سے یہ ربط کا واضح نشان ہے
بیداریوں کا نغمہ سنائی ہے ورستو
بندے کو اپنے رب سے ملاتی ہے ورستو

رحمت کے صبحدم وہ دریچے کھلے ہوئے ۱۲ وہ صبح کی ہوا سے شجر جھومتے ہوئے
ہونٹوں پہ حمدِ ربّ کے ترانے سجے ہوئے اذہان ذکرِ حق کے گہر رولتے ہوئے
دوش ہوا پہ لحنِ اذاں دُور دُور تک
پہنچائے آدمی کو عبادت کے طور تک

ختم الرسل نے کعبہ انور میں دی اذاں مشکل کشا نے صحنِ پیمبر میں دی اذاں
شبّر نے مرتضیٰ کے بھرے گھر میں دی اذاں شبیر نے تو دامنِ مادر میں دی اذاں
مسجد میں تو بلال نے فضہ نے گھر میں دی
قنبر نے حکمِ شاہ سے راہِ سفر میں دی

ایسی بھی اک اذان دی اک تشنہ کام نے ہونٹوں کو چوما لہجۂ خیرالانام نے
فرمایا فخرِ لحن یہ پیاسے امام نے چونکایا حُر کو خیرِ عمل کے پیام نے
اکبر کی تھی اذاں کہ صدا انقلاب کی
یا آخری تڑپ خلف بوتراب کی

عازم رضوی کی قادر الکلامی کو سلام کہ فضائل ہوں یا مصائب۔ انہیں اظہار کا ہنر آتا ہے۔ کہیں کہیں تو ایک ایک مصرعے میں وہ وقت کی طنابیں کھینچ کر ماضی سے حال کو اور حال سے مستقبل کو جوڑ دیتے ہیں۔

کرب و بلا میں نور کے پیکر ملے ہمیں تیرہ برس کے حضرتِ شبّر ملے ہمیں

جھولے میں کھیلتے ہوئے حیدر ملے ہمیں　　اٹھارہ سال والے پیمبر ملے ہمیں
یہ اجتماعِ نور ہے حق بیں نگاہ میں
چھپن برس کی فاطمہ ہے خیمہ گاہ میں

کربلا میں تیرہ برس کے قاسمؑ سے مدینے کے امام حسنؑ تک، شبیہ پیغمبر ۱۸ سال کے علی اکبر سے ختمی مرتبت رسول اکرم تک، چھ ماہ کے علی اصغر سے فاتح خیبر و خندق علی مرتضیٰ حیدر تک۔ کربلا میں چھپن برس کی زینب سے سیدہ فاطمہ زہرا تک ہر مصرعہ میں سمندِ خیال لمحوں میں برسوں کے فاصلے طے کرتا ہے؟

''آیاتِ مدح'' میں عازم رضوی نے اپنے ہم عصر شعراء کے اجتناب احتیاط اور سلیقہ مندی سے لاپرواہی کی شکایت کی ہے۔

شاعروں کو اب نہیں نقص روانی کا خیال　　انسلاک معنوی، ربط بیانی کا خیال
حشو کے عیب اور تشکیک بیانی کا خیال　　خوش بیانی، خوب فکری، تر بیانی کا خیال
نظم کاروں کو کوئی دھڑکا نہیں الہام کا
غیر ممکن ہے سویرا ان کی فکری شام کا

یہ دعویٰ وہی کر سکتا ہے جو الہام سے پاک، اسلوب کی ہنرمندی کے ساتھ لفظوں سے مصوری کر سکتا ہو۔ جیسے عازمؔ رضوی نے لفظوں سے جذبات و کیفیات کی تصویریں بنائی ہیں

چہرے پہ رعب، رعب میں غیضِ علی کی شان　　نظروں میں قہر، قہر میں خود آگہی کی شان
بازو میں زور، زور میں عزمِ ولی کی شان　　ہونٹوں پہ خشکی، خشکی میں دریا دلی کی شان
بولے عدو خیال تھا، احساس بن گیا
بیشک علیؑ کا غیض ہی عباسؑ بن گیا

☆☆☆☆☆

صابر آروی:- (موضع آرہ، پٹنہ)

ولادت ۱۹۲۸ء

نام، سید صابر حسین۔ تخلص، صابرؔ۔ قلمی نام، صابرؔ آروی۔ والد کا اسم گرامی، سید خادم حسین۔ پٹنہ سے ساٹھ کلو میٹر دور ''آرہ'' کے خاندانی رئیس سید نعمان حیدر وکیل، صابر آروی کے جدِ امجد

تھے۔ صابؔر آروی کی ولادت ''آرہ'' میں ہوئی۔ حضرت زارؔ عظیم آبادی کے شاگرد رہے ہیں۔

حکومت بہار کی ایڈمنسٹریٹو سروسز (administrative services) سے ریٹائر ہو کر اب پٹنہ میں مقیم ہیں۔ صابر آروی نے کم و بیش ہر صنف سخن میں شعر کہے ہیں، مرثیہ گوئی کا آغاز ۱۹۸۵ء میں ہوا۔

تصانیف

(۱) سرمایۂ احساس۔	شعری مجموعہ (اردو)	۱۹۹۳ء
(۲) متاعِ احساس	شعری مجموعہ (اردو)	۱۹۹۶ء
(۳) روپ اور دھوپ''	شعری انتخاب (ہندی)	۱۹۹۴ء
(۴) ''گنجینۂ عرفان''	مجموعہ مراثی	۱۹۹۶ء
(۵) ''سفینۂ عرفان''	مجموعہ مراثی	۱۹۹۷ء
(۶) ''آئینۂ عرفان''	مجموعہ مراثی	۱۹۹۸ء

بیسوی صدی کے اختتام تک درج بالا مجموعوں میں اُن کے گیارہ مراثی شائع ہو چکے تھے اور دو یا تین مراثی غیر مطبوعہ ہیں جو اکیسویں صدی کو ملے۔ ابھی مشق سخن جاری ہے اور اکیسویں صدی کی پہلی اور اُن کی تصانیف کے حوالے سے ساتویں کتاب کا انتظار ہے۔

صابؔر آروی کے کلام پر مشاہیر ادب نے تبصرے کئے ہیں جن میں غیر مبہم الفاظ میں صابؔر آروی کی قادر الکلامی کا اعتراف کیا گیا ہے؟ اُن کی غزلوں میں جو کیف اور سرشاری ہے اس کا ثبوت اُن کی ہندی زبان میں شائع ہونے والی کتاب ''روپ اور دھوپ'' ہے جو اُن کی اردو شاعری کا ہندی رسم الخط میں مجموعہ ہے۔ رباعی اور قصائد و سلام کے معاملے میں بہار کے شاعر اور ناقد سید افضل حسین کا کہنا ہے کہ:

> ''آپ کے قصائد کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ صنف جو بیسویں صدی میں گوشہ گمنامی میں پڑی تھی۔ آپ نے اپنی خوش عقیدگی، تفکر اور وجدان کے سرچشموں سے سیراب کیا''
>
> (پیش لفظ آئینۂ عرفان۔ ص ۹)

صنف قصیدہ بیسویں صدی میں گوشۂ گمنامی میں تھی یا نہیں، اس پر گفتگو بھی ہو سکتی ہے

اور اختلاف رائے کے پہلو بھی نکل سکتے ہیں لیکن صابر آروی کے قصائد کو پڑھ کر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے قصائد کو فکر کے رنگوں سے سنوارا ہے۔ صابر آروی کی مرثیہ نگاری میں بھی ایک بہت ہی اہم اور جداگانہ پہلو یہ ہے کہ بین کے حصے میں رونے رلانے کی فضا پیدا کرتے وقت انہوں نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ خاندان رسالت کی خواتین کا کردار مجروح نہ ہو۔ مثلاً درج ذیل مرثیے میں حضرت علی اکبر کی رخصت کا منظر اس احتیاط سے نظم کرتے ہیں کہ پڑھنے یا سننے والا اشکبار ہو جاتا ہے مگر بین میں کہیں سیدانیوں نے سرپیانہ میدان میں جانے سے علی اکبر کا راستہ روکا۔

ہمراہ تھا رفیق و اعزّا کا قافلہ ہر فرد کا بڑھاتے تھے عباسؑ حوصلہ
کہنی تک آستینوں کو اُلٹے تھے مہ لقا شکوہ نہ تھا زبان پر، بھوک اور پیاس کا
اکبر کے روئے پاک پہ جاہ و جلال تھا
رعب جری بھی اپنی جگہ بے مثال تھا

آئے برائے اذنِ وغا وہ قریب شاہ اکبر میں تھی شباہت احمد جو بے پناہ
چہرے پہ اس جری کہ ٹھہرتی نہ تھی نگاہ لپٹالیا کلیجے سے شہ نے بہ اشک و آہ
پڑھ کر درود، بیٹے کو رخصت جونہی کیا
شدّت سے غم کی منہ سے کلیجہ نکل پڑا

تم زینب حزیں کی امانت ہو میرے سے لال خیمے میں جا کے دیکھ تو لو کیا ہے اُس کا حال
الفت ہے اُس کو تم سے جو بے حد و بے مثال کیا قلب کو سنبھال سکے گی وہ خوش خصال
بیٹوں کی سمت دیکھا نہیں تم کو دیکھ کر
زندہ رہی ہے خود سے قریں تم کو دیکھ کر

خیمے میں آ کے دیکھا جو اکبرؑ نے حال زار بس گر پڑے وہ قدموں پہ زینب کے ایک بار
تھی کپکپی لبوں پہ تو آنکھیں تھیں اشکبار یعنی وفورِ غم سے نہ تھا ایک دم قرار
اُٹھے نہ تھے قدم سے کہ زینبؑ نے آہ کی
حسرت سے شاہزادے کے رخ پر نگاہ کی

فرمایا راس آیا نہ اٹھارواں یہ سال لو تھامو ہاتھ، قلب ہوا جاتا ہے نڈھال

واری، تمہارے بعد کہاں میری دیکھ بھال　　امّاں بھی ہیں تمہاری اِدھر غم سے پائمال
خالق سے لو لگائیں گے ہم سب تمہارے بعد
ٹوٹے گا کوہ رنج والم اب تمہارے بعد

رخصت جونہی ملی کہ اُٹھا شورِ الفراق　　فوج لعیں میں ہونے لگے پھر سے طمطراق
سر ننگے تھے رسول زماں، آہ بے بُراق　　جیسے حرم سرا کے گرے ہوں در و رواق
ایسے میں حال حضرت شبیر کیا لکھوں
کیسی صدائیں دیتے تھے بے پیر کیا لکھوں

دل پتھر نہ ہو تو درج بالا بند، آنکھوں کو اشکوں سے لبریز کر دیتے ہیں، جبکہ نہ ان اشعار میں سیدانیوں کی چیخ و پکار ہے، نہ کوئی اکبر کا راستہ روک کر کھڑا ہوا ہے، نہ کسی نے یہ کہا ہے کہ کوئی اکبر کو بچائے اس لئے کہ کربلا میں حسینؑ کے قافلے کا ہر فرد حسینؑ بن گیا تھا۔ ذمہ داریاں الگ الگ تھیں مگر مقصد ایک تھا۔

علی اصغر کی شہادت کے حوالے سے صابرآروی کے دو بند مکمل ''بین'' ہیں۔

بس اسی فکر میں تیورا گئے سرور اک بار　　سامنا ایسے میں بانو کا تھا امرِ دشوار
یا علی کہہ کے سنبھالے رہے دل کی رفتار　　لو لگاتے رہے خالق سے شہ عرش وقار
فدیۂ اصغر ناداں کو خدا کرے قبول
بخش دے اُمت عاصی کو بہ احسانِ رسولؐ

دیکھ لیں اہل زمیں صبر حسینِ مظلوم　　کیسی ہمت سے گوارا کیا قتل معصوم
کیوں نہ مچ جائے زمیں تا بہ فلک صبر کی دھوم　　کس کو آتا ہے تیرے صبر کی قوت معلوم
تا قیامت نہ بھلائیں گے غم شاہ اُمم
بھول پائیں گے نہ شہزادۂ شبیرؑ کا غم

اہل نظر جانتے ہیں کہ جوشؔ ملیح آبادی نے کربلا کو ایک درس گاہ بنا کر پیش کیا ہے۔ ایک مکتبہ فکر کا درجہ دیا ہے۔ بعد کے آنے والے شعراء نے نہ صرف اس فکر کو تسلیم کیا ہے بلکہ جوشؔ کی آواز میں آواز ملائی ہے۔ صابرآروی بھی کربلا کی عظمت کا پرچم اُٹھائے نظر آتے ہیں۔

کربلا صاحب ایماں کے لئے فکر جمیل　　کربلا کرتی ہے افسانۂ دل کی تکمیل

کربلا ذہن کی آسودہ مزاجی کی کفیل ہے اندھیرے کے لئے رحمت حق کی قندیل
اہل ایماں کو بصیرت کی ضیاء ملتی ہے
اس چمن زار میں خوشبوئے وفا ملتی ہے
کربلا! ظلم کی آواز دبا دیتی ہے حق کی آواز یہ دنیا کو سنا دیتی ہے
سر تکبر کا جو اُٹھتا ہے، جُھکا دیتی ہے بھوک اور پیاس کی شدّت کو بھلا دیتی ہے
دینِ اسلام کی اک دوسری معراج ہے یہ
شافع حشر کا بخشا ہوا اک تاج ہے یہ

صابرؔ آروی مرثیہ کہتے ہی نہیں مرثیہ پڑھتے بھی ہیں، شاید اس لئے اُنہوں نے اپنے مرثیوں میں اتنا اختصار برتا ہے۔ اُن کے مراثی زیادہ سے زیادہ پچیس تیس بندوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

ابراھیم حامی:- (حیدر آباد دکن)

پیدائش ۶ر فروری ۱۹۳۰ء

نام، میر ابراہیم علی۔ تخلص، حامیؔ۔ جائے ولادت حیدر آباد، دکن۔ تعلیم منشی فاضل لیکن اردو، فارسی، عربی، انگریزی زبانوں کے علاوہ ہندی۔ گجراتی اور مرہٹی زبانیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ اور مختلف زبانوں کے ادب کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ کثرت مطالعہ نے انہیں وسعت فکر و نظر دی ہے حتیٰ کہ اردو، فارسی اور ہندی میں شعر کہتے ہیں۔ زُود گو شاعر ہیں۔ مشکل زمینوں میں روانی سے شعر کہنا اُن کے لئے آسان ہے۔ کم و بیش ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی جس کے نتیجے میں اتنا کلام موجود ہے کہ مختلف اصناف سخن میں کئی مجموعے شائع ہو سکتے ہیں مگر ہائے رے مظلوم اردو زبان اور اس کے اہل قلم کہ زیادہ تر ان کی نگارشات معیار کی بجائے وسائل کی بنیاد پر اشاعت پذیر ہوتی ہیں۔ ابراہیم حامیؔ کسی مغربی زبان کے قلمکار ہوتے تو اب تک ان کی درجنوں کتابیں دنیا کی گوشے گوشے میں ہوتیں چہ جائیکہ ابراہیم حامیؔ کا ایک مجموعۂ غزلیات شائع ہو سکا ہے باقی کلام وسائل کے فقدان کی گرد میں دبا پڑا ہے۔

ابراہیم حامیؔ چودہ برس کی عمر سے شعر کہہ رہے ہیں۔ جب اُن سے سوال کیا گیا کہ مرثیہ گوئی کا آغاز کب اور کن عوامل کے تحت ہوا تو جواب ملا :

"شاعری کا آغاز ۱۹۴۴ء (چودہ برس کی عمر) میں ہوا۔
مرثیہ گوئی کا آغاز عزیزم ڈاکٹر صادق نقوی کے اصرار پر ہوا۔ پہلا مرثیہ ۱۴۰۷ھ (۱۹۸۶ء) میں کہا۔ اب تک سترہ (۱۷) مرثیے کہہ چکا ہوں۔
اٹھارواں مرثیہ در حال امام موسیٰ کاظم بن جعفر صادق کہہ رہا ہوں جو آخری مراحل میں ہے"

(مکتوب بنام عاشور کاظمی مرقومہ ۶ مئی ۲۰۰۳ء)

رثائی ادب میں ابراہیم حامی کے تین مراثی پر مشتمل کتاب "تہذیب منبر" ڈاکٹر صادق نقوی نے باب العلم سوسائٹی حیدر آباد دکن کے زیر اہتمام ۱۹۸۹ء میں شائع کی تھی۔ اس کے بعد اُن کے (کم از کم) پندرہ مرثیے طباعت کے منتظر ہیں۔

دکن میں مرثیہ نگاری کا سلسلہ قطب شاہی دور سے بیسویں صدی کے اختتام (بلکہ تا دمِ تحریر اکیسویں صدی کے آغاز تک) مسلسل ہے، ماضی بعید کے شاعر قلی قطب شاہ سے ماضی قریب کے تاجی، مسرور، بزم آفندی، نجم آفندی، ناصر زید پوری، اور باقر امانت خانی تک یہ امانت بزرگوں سے نئی نسلوں کو ملتی رہی ہے۔ آج کی نسل میں ابراہیم حامی، قائم جعفری، عازم رضوی، صادق نقوی، حسن عابدی وغیرہ اس فن کے امانت دار ہیں۔ نئی نسل کے مرثیہ نگار بالخصوص عازم رضوی، اور ابراہیم حامی کا شعری سلسلۂ نسب مرزا دبیر سے ملتا ہے۔ ابراہیم حامی نے "تہذیب منبر میں" میں اس کا اقرار بلکہ اعلان کیا ہے۔

نجم استاد میرے، ہند کے اُستاد شہیر	اُنکے کے اُستاد تھے بزم، انکے تھے استاد منیر
رشک استاد منیر، اہل سخن کی توقیر	اور پھر رشک کے اُستاد تھے سرکار دبیر

لطف شبیر سے میخوار عزیزی ہوں میں
پانچویں پشتِ تلمذ میں دبیری ہوں میں

دبیری ہونے کا مطلب یہ بھی ہے کہ مرثیے کے لوازم کی پابندی کی جائے اور روایت کے حصار کو برقرار رکھا جائے لیکن پرواز فکر کو کس دور میں بھی محدود نہیں کیا جا سکا۔ میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ لکھا ہے کہ انیس و دبیر جمود کے شاعر نہیں تھے بلکہ ارتقاء کی نوید تھے۔ اُن کے بعد مرثیے میں ارتقاء ہونا چاہیے تھا سو ہوا ہے۔ ابراہیم حامی نے بھی کچھ تجربے کئے ہیں۔ مثلاً انہوں نے مرثیوں کے

چہروں میں ایسے عنوانات پر طبع آزمائی کی جن پر اس سے پہلے کچھ نہیں لکھا گیا یا شاذ و نادر ہی لکھا گیا۔ وہ کٹھن مضامین کو بھی زبان و بیان کی نفاست کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ بعض مرثیوں میں ساقی نامہ اُن کے حُسنِ تغزل کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ ابراہیم حامؔی کا پہلا مرثیہ جو ''تہذیب منبر'' میں شامل ہے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے احوال کا مرثیہ ہے۔ چہرہ کا عنوان 'اخلاق' ہے۔

اخلاق بزم زیست میں آئینہ صفات ۳ اخلاق باغ دہر میں تزئین ممکنات
اخلاق دیکھنے میں حسیں چہرۂ حیات اخلاق ذکر و فکر میں اک حسن کائنات
اخلاق ہی صفات کا زرّیں باب ہے
اخلاق زندگی کی مکمل کتاب ہے

اخلاق، اک مسلمہ شوکت کا نام ہے ۱۰ اخلاق، اقتدارِ فضیلت کا نام ہے
اخلاق، تاجدار شجاعت کا نام ہے اخلاق، اک عظیم حکومت کا نام ہے
اخلاق کا بلند ہے رتبہ جہاں میں
اخلاق، جس کا چلتا ہے سکہ جہاں میں

مختلف زاویوں سے اخلاق کی توجیح میں دس بند کہنے کے بعد گریز کی منزل دیدنی ہے۔

اخلاق ایک جز ہے خدا کے پیام کا ۱۱ اخلاق، درس ہے شرف و احترام کا
اخلاق ہی ذریعہ ہے حُسنِ کلام کا اخلاق ہے بشر کو عطیہ امام کا
کردار ساز انفس و آفاق ہے امام
کونین میں معلّم اخلاق ہے امام

دنیا میں ربط جتنا بھی علم و ہنر سے ہے ۱۲ رفعت بشر کی، رفعت فکر و نظر سے ہے
یہ راز جانتا ہے جو اہلِ خبر سے ہے اس کی عطا آئمہؑ اثنا عشرؑ سے ہے
شکر خدا کہ فرض میرا یاد ہے مجھے
مقصود ذکرِ سیدِ سجادؑ ہے مجھے

ابراہیم حامؔی کا ایک اور مرثیہ جو تہذیب منبر'' میں شامل ہے شہزادہ قاسم بن حسنؑ کے احوال ہے، اس مرثیے میں اُنہوں نے چہرے میں حُسن کو عنوان سخن ہے۔

حُسن تخلیق کی منزل میں خدا کا مقصد ۲ حُسن: اوصاف و مناقب میں ہے اک طاق عدد

حُسن، کونین میں منجملۂ آیات صمد حُسن ہی جلوۂ تاباں ہے ازل تا بہ ابد
حُسن ہے صورتِ اعجازِ رضائے خالق
حُسن ہے صاحبِ عصمت کو عطائے خالق

حُسن بادل کی طرح منظرِ باراں میں عیاں ۶ حسن نیساں کے سحاب گوہرافشاں میں عیاں
حُسن ہے برق کے ہر شعلۂ عریاں میں عیاں حُسن آندھی میں عیاں، حسن ہے طوفاں میں عیاں
حُسن، تسکینِ نظر ماہ سے ماہی تک ہے
حُسن کا فیض اثر فقر سے شاہی تک ہے

اور پھر حُسنِ گفتار، حُسنِ رفتار، حُسنِ کردار، حُسنِ اخلاص، حُسنِ توفیق، حُسنِ ادراک، حسنِ جذبات، حُسنِ نیت پر روشنی ڈالتے ہوئے پندرھویں بند کے بعد گریز کی منزل آتی ہے جو ابراہیم حاؔمی کی قادرالکلامی پر دلالت کرتی ہے۔

حُسنِ توفیق سے ہے دل میں یمِ ضو جاری ۱۳ حسنِ ادراک سے ہے کشمکشِ نو جاری
حُسن جذبات سے ہے برق کی اک رَو جاری حسن نیت سے عمل کی ہے تگ و دَو جاری
حسنِ نیت میں ہے تنویرِ مودّت شامل
حسنِ اعمال میں ہے اجرِ رسالت شامل

حسنِ ظاہر نہ کہے کوئی زر وسیم سے ہے ۱۶ حسنِ باطن کی نمو جذبۂ تکریم سے ہے
حسنِ صورت کی تو تخصیص بھی تعمیم سے ہے حُسنِ انساں کا شرف احسنِ تقویم سے ہے
حُسنِ انساں کا ہے قرآں میں ہے تعارف دیکھو
حُسنِ یوسف کے لئے سورۂ یوسف دیکھو

نظرِ اہلِ تولا میں مہِ عید ہے حُسن عقلِ انساں کے لئے سجدہ گہ دید ہے حُسن
امرِ تخلیق میں سرمایہ تمجید ہے حُسن ذکر کس کا ہے یہ کس ذات کی تمہید ہے حُسن
حسن کا جس کے بیاں ہے اسے کیا کہتے ہیں
قاسمؑ، ابنِ حسنِ سبز قبا کہتے ہیں

تجمؔ کی شاگردی پر نازاں، دبیری ہونے پر فخر و مباہات کرنے والے شاعر حضرت ابراہیم حاؔمی نے مرثیے کی روایت کا بھی پاس کیا ہے اور ہیئت کا بھی، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ

اُنہوں نے اساتذہ کے قائم کردہ لوازم مرثیہ میں سب سے لازم جز و یعنی ''بین'' کی پاسداری اکثر و بیشتر نہیں کی۔ اُن کے مراثی میں زیادہ تر خانوادۂ رسالت کے افراد بین نہیں کرتے بلکہ شاعر بین کرتا ہے، مرثیے کا قاری بین کرتا ہے، عرش و فرش بین کرتے ہیں، شہادتِ امام حسین علیہ اسلام کے منظر نامے میں ابراہیم حامؔی کے بین کا انداز دگر ہے۔

کانپتا ہے فلک اور غم سے لرزتی ہے زمیں انس و جنِ غم زدہ ہیں، حور و ملک ہیں غمگیں
لئے شمشیر ستم ہاتھ میں آتا ہے لعیں سجدۂ خالقِ کونین میں ہیں سرورِ دیں
قاتل شوم کی شمشیر تلے رکھ دیں گے
شہ کے حلقوم پہ ہم اپنے گلے رکھ دیں گے

ہاتھ تھراتا ہے اور غم سے لرزتا ہے قلم اس تصور سے ہی ہو جاتی ہیں آنکھیں پُرنم
بوسہ گاہ نبوی پر جو ہوا ظلم و ستم واقعہ صفحۂ قرطاس پہ ہو کیسے رقم
تھے جو ایثار کے قرآن کا پارا عباسؑ
قتل ہوتے ہوئے سرور نے پکارا عباسؑ

شہ کے ماتم میں کئے زلف پریشاں آئی دیکھتے دیکھتے ہی شام غریباں آئی
نوحہ کرتی ہوئی با دیدۂ گریاں آئی دیکھنے بیٹیوں کا حال ادھر ماں آئی
پرسہ دینے کو میں آتی ہوں یہاں سب سے کہا
بیٹھ کر جلتی ہوئی ریت پہ زینب سے کہا

ظلمت شام میں اک نُور کا دھارا تم ہو میری بیٹی بس اب اس گھر کا سہارا تم ہو
جس کو شبیر نے حسرت سے پکارا تم ہو صبر و ایثار کے قرآن کا پارا تم ہو
پہلے اپنے دل محزوں کو سنبھالو زینب
پھر سکینہ کو کلیجے سے لگالو زینب

میرا یقین ہے کہ عطائے ربانی نہ ہو تو مرثیہ نہیں کہا جا سکتا۔ حضرت ابراہم حامؔی کو یہ سعادت عطا ہوئی ہے۔ اور ربِ کریم کی اس عطا پر ثابت قدمی عبادت ہے۔ اللہ حضرتِ ابراہیم حامؔی کو عمر خضر عطا کرے کہ وہ اس طرح مظلوم کا ذکر کرتے رہیں۔

☆☆☆☆☆

منظر نقوی:- (امروہہ)

تاریخ ولادت، ۲۴ راپریل ۱۹۳۲ء

نام منظر عباس۔ تخلص منظر۔ نقوی سید۔ وطن امروہہ۔ سلسلۂ نسب سید حسین شرف الدین شاہ ولایت سے ملتا ہے اور شاہ ولایت کا سلسلہ ۹ واسطوں سے امام علی نقی علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ والد گرامی سید حسن عسکری ریاست رامپور کے محکمہ صحت اور بعد ازاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہسپتال سے وابستہ رہے۔ ننہال میں میر سعادت علی سعادت امروہوی کا نام نامی شجرۂ نسب کی زینت ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۵۴ء میں بی اے، ۱۹۵۵ میں بی ایڈ، ۱۹۵۹ء ایم اے اور ۱۹۲۶ء میں پی ایچ ڈی کی اسناد حاصل کیں۔ پیشہ ورانہ زندگی میں بحیثیت استاد (Teacher) داخل ہوئے۔ ابتداءاے ایم ہائی اسکول میں اسسٹنٹ ٹیچر (نائب مدرس) کے طور پر مقرر کیے گئے۔ لیکن چھ برس بعد ۱۹۶۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لیکچرر بن گئے۔ ۱۹۷۵ء میں اس یونیورسٹی میں ریڈر Reader بنادیے گئے۔ ۱۹۸۲ء میں پروفیسر ہو گئے اور آخرکار ۱۹۹۰ء میں صدر شعبہ اردو کے منصب تک پہنچے اور ۱۹۹۳ء میں اس عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے۔

تصانیف:

(۱) وحید الدین سلیم حیات اور ادبی خدمات (تحقیقی مقالہ)

(۲) خطوط اقبال بنام عطیہ فیضی (ترجمہ)

(۳) نثر نظم اور شعر۔ تنقیدی مضامین کا مجموعہ

(۴) حسرت موہانی: اک تعارف اور انتخاب کلام

(۵) ثاقب لکھنوی: انتخاب کلام مع مقدمہ

(۶) تنظیم مدرسہ (بی۔ ایڈ اور معلم اردو کے طلبہ کے لیے)

(۷) اسلوبیاتی مطالعے (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)

(۸) مولانا آزاد کا اسلوب: ''غبار خاطر'' کی روشنی میں

(۹) اردو تنقید (تدوین)

(۱۰) سفرِ شوق: سفرنامہ زیارات حجاز، شام، عراق، اور ایران

موجودہ ادبی مصروفیات:

انگریزی شعراء کی تخلیقات کا اردو میں منظوم ترجمہ

اس سے قبل بیرسٹر نصیر الدین نصیر عظیم آبادی ۱۸۹۵ء میں لندن آئے تھے اور بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں تعلیم مکمل کر کے واپس ہندوستان چلے گئے تھے۔ انہوں نے لندن قیام کے دوران انگریز شاعروں کے کلام کا مطالعہ کیا اور ان شعراء کے کلام کے حوالے ان شعراء کا اردو مثنوی کی ہیئت میں منظوم تعارف کرایا تھا۔ یہ مثنوی ۱۹۱۱ء میں مکمل ہوئی ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی اور ناپید ہوگئی۔ ۱۹۸۷ء میں راقم الحروف (سید عاشور کاظمی) نے اس گمشدہ خزانے کو دریافت کر کے حقیقت شاعری'' کے نام سے شائع کیا''۔ ہر چند کہ یہ مثنوی ایک گراں قدر کاوش ہے لیکن شعراء کی تخلیقات کے حوالے اور تعارف پر مشتمل ہے کلام کا ترجمہ نہیں۔ ڈاکٹر منظر نقوی کے علمی ادبی پس منظر کے تحت یقین کے ساتھ کیا جاسکتا ہے کہ ان کی کاوش ادب کے طالب علموں کے لئے سودمند ہوگی۔

ڈاکٹر منظر نقوی ۱۹۹۳ء میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد امروہہ کی علمی ادبی فضاؤں میں آکر رہے تو اُن کے خون میں جو حرارت تھی اور اُن کے دل کے نہاں خانے میں جو چنگاری تھی وہ شعلہ بن گئی اور وہ نعت گوئی، منقبت گوئی اور مرثیہ گوئی کی طرف راغب ہو گئے، (اپنے مکتوب بنام سید عاشور کاظمی مرقومہ جون ۲۰۰۲ء) میں انہوں نے خود اس صداقت کو تسلیم کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اب تک تین مرثیے کہہ چکے ہیں۔

(۱) استغاثۂ حق (۲) تائیدِ لاالہ (۳) پنجۂ علم

مرثیہ ''پنجۂ علم''' حضرت عباس علمدار کے احوال کا مرثیہ ہے اور پورے مرثیے کا ''موضوع'' ''ہاتھ'' ہیں۔

کھودی زمین اناج اُگائے اس ہاتھ نے ۲ صحراؤں میں گلاب کھلائے اس ہاتھ نے
جنگل جہاں تھے شہر بسائے اس ہاتھ نے کیا کیا نہ معجزات دکھائے اس ہاتھ نے
انسان کو طیور کا ہمساز کردیا
بے بال و پر کو ماہر پرواز کر دیا

سر پر جو ہو یتیم کے شفقت، یہ ہاتھ ہے ۸ کمزور کو بچائے تو طاقت یہ ہاتھ ہے
کام آئے بیکسوں کے تو ہمت یہ ہاتھ ہے دے بے سوال اُگر تو سخاوت یہ ہاتھ ہے

بخشش کا لطف اس میں ہے واقف بشر نہ ہو
اک ہاتھ دے تو دوسرے کو کچھ خبر نہ ہو

چکّی چلائیں، روٹی پکائیں، کھلائیں ہاتھ ۱۱ کھانے کو کچھ نہ ہو تو تھپک کر سلائیں ہاتھ
بچے پڑھیں نماز تو لے لیں بلائیں ہاتھ دیتے رہیں نوافل شب میں دعائیں ہاتھ

اک دن خموش پا کے جو بچے مچل پڑیں
دو ہاتھ ماما کے کفن سے نکل پڑیں

اور وہ جو کربلا میں ہوا ایک سانحہ ۱۲ وہ بھی تو ہاتھ ہی کا تھا سارا معاملہ
یعنی بنا امیر جب ابن معاویہ بیعت کا تھا حسینؑ سے فوری مطالبہ

شہ بولے اس امیر کی بیعت روا نہیں
اللہ اور رسولؐ کو جو مانتا نہیں

وارث ہوں میں جہاں میں خدا کے رسولؐ کا ۱۴ فرزند ہوں علی کا، پسر ہوں بتول کا
میں جانشین ہوں حسنؑ دل ملول کا میں ہی تو پاسبان ہو دیں کے اصول کا

کس طرح ایک دین کے دشمن کا ساتھ دوں
ممکن نہیں کہ ہاتھ میں اس کے میں ہاتھ دوں

ہوں قتل میرے خویش واقارب تو غم نہیں ۱۷ کھائے سناں جو سینے پہ اکبر تو غم نہیں
تڑپے لہو میں، ہاتھوں پہ اصغر تو غم نہیں لاشے سبھوں کے دیکھوں زمین پر تو غم نہیں

منظور ہے جو نوکِ سناں پر یہ سر رہے
اسلام کا وقار سلامت مگر رہے

جو کچھ کہا حسینؑ نے، کرکے دکھا دیا میدان کربلا میں بھرا گھر لٹا دیا
مفہومِ لاالہ جہاں کو بتا دیا شاہی کو جان دے کے سبق یہ سکھا دیا

"ہٹتے نہیں ہیں ہم کبھی اپنے اصول سے
بیعت طلب نہ کیجو آلِ رسول سے"

باقی رہا نہ جب کوئی یاور حسینؑ کا ۲۱ تب اس جری نے بھائی سے اذن وغا لیا

شہ نے در قیام کا پردہ اٹھا دیا آئیں سکینہ دوڑ کے کہتی "چچا، چچا"
بولی خدا کے واسطے پانی پلا یئے
میں مشک لے کے آئی ہوں دریا پہ جایئے

لو سوئے نہر جاتے ہیں عباس ذی حشم ۲۲ مشک سکینہ دوش پہ ہے ہاتھ میں علم
باتیں ہوا سے کرتا ہے رہوارِ خوش قدم نعرہ ہے گھاٹ چھوڑ دو کہ اب آئے ہم
روکا اگر ہمیں تو اماں تم نہ پاؤ گے
ہم پانی لیں گے نہر سے تم منہ کی کھاؤ گے

آنکھیں لگیں تھیں شہ کی جدھر کو گیا علم ۲۵ نیچا ہوا کبھی، کبھی اونچا ہوا علم
دائیں ہٹا کبھی کبھی بائیں ہٹا علم مولا نے جب یہ دیکھا کہ جھکنے لگا علم
ہو کر سوار دوڑ پڑے نہر کی طرف
نعرہ زبان پر تھا "مدد یا شہ نجف"

اور مصائب کے اس بیان میں ڈاکٹر منظر عباس نے عجیب بیت کہہ دیا ہے ؎

عباس آ تو سکتے نہ تھے پیشوائی کو
بہر سلام ہاتھ کٹے نذر بھائی کو

تنہا تھا اب جہاں میں نواسہ رسول کا کوشش تو کی پہ بھائی کا لاشہ نہ اٹھ سکا
سوئے نجف حسینؑ نے تب اپنا رخ کیا ہاتھوں کو اپنے جوڑ کے پھر کی یہ التجا
بابا نہ دیر کیجیے، تشریف لایئے
عباس کو کلیجے سے اپنے لگایئے

آواز آئی غیب سے شبیرؑ صبر کر ہے فخرِ خاندانؑ شجاعت میں یہ پسر
تھی وقتِ ضرب ہاتھوں پہ اسکے میری نظر وہ جنگ کی کہ کر لیا قبضہ فرات پر
ہر چند ہاتھ ہو گئے میدان میں قلم
چمکا کریں گے بن کے یہی پنجۂ علم

☆☆☆☆☆

سلیم رضوی:- (حیدر آباد۔ دکن)

ولادت، ۱۰ر فروری ۱۹۳۳

نام، میر تقی حسین رضوی۔ تخلص سلیمؔ۔ آبائی وطن حیدر آباد دکن۔ والد کا اسم گرامی، مولوی میر کاظم حسین رضوی۔۔۔ سلیمؔ رضوی کو اردو فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں پر اس حد تک دسترس حاصل ہے کہ'' انھوں نے ۱۷ برس کی عمر میں (۱۹۵۰ء) میں شعر گوئی کی ابتدا کی جو فارسی زبان میں تھی۔ اس کے بعد اردو زبان میں شعر کہے۔

(۱)'' گلہائے فارسی با عطر مہدیؑ'' فارسی زبان کا شعری مجموعہ۔

(۲)'' فکر سلیم'' اردو شاعری۔

سلیم رضوی نے جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اپنی مرثیہ گوئی کے متعلق وہ رقم طراز ہیں:

> '' میں نے غزل اور نظم کے علاوہ رباعی، سلام، نوحے، اور منقبت وقصائد بھی کہے ہیں۔ نیز کئی مادہ ہائے تاریخ کا استخراج بھی کیا ہے، میں نے ڈاکٹر صادق نقوی کی تحریک و فرمائش پر اپنا پہلا مرثیہ ۱۹۹۲ء میں کہا اور موصوف کی بنا کردہ سالانہ مجلس میں پیش کیا۔ آج ۱۲ سال سے ہر سال نیا مرثیہ کہہ رہا ہوں۔
>
> (مکتوب بنام عاشور کاظمی مرقومہ ۵ مئی ۲۰۰۳ء)

سلیمؔ رضوی مرثیے میں روایت پسند ہیں۔ اُن کے مراثی میں کم و بیش سارے اجزائے مرثیہ ہوتے ہیں۔ مصائب اور بین کو روح مرثیہ سمجھتے ہیں اس کے لئے ان کے مرثیوں میں بین کے بند زیادہ ہوتے ہیں۔ نہ صرف مرثیہ نگاری بلکہ اپنی پوری شاعری میں سلیمؔ رضوی نے محنت اور لگن سے شعر کہے ہیں۔ وہ شعر گوئی کے کوچے سے رواردی میں نہیں گذرے بلکہ کھلی آنکھوں سے گزرے ہیں اس لئے کسی کونے سے کسی کمزوری کا امکان نہیں ہوتا۔

☆نمونۂ کلام (۱) مرثیہ در احوال حضرت قاسم۔ (ساقی نامے سے گریز کی طرف)

ساقی ثنا کے لفظ کہاں اختیار میں　　عاجز ہوں میں سخن ہے میرا کس شمار میں
جذبہ تو ہے ثنا کا دل بیقرار میں　　عزت خدا کیواسطے رکھ لے تو چار میں

صدقہ عطا ہو رند کو قدموں کی دھول کا
کرتا ہے تذکرہ، تیرے گلشن کے پھول کا

(۲) مرثیہ　در احوال حضرت عباس علیہ اسلام۔ (ساقی نامہ سے مدح کی طرف)

نام اس کا ہے عباس یہ ساقی کا پسر ہے　　یہ چاند ہی ساقی کی دعاؤں کا اثر ہے
اس چاند کے قدموں میں ہر اک رند کا سر ہے　　اس چاند کو دنیا کی نظر لگنے کا ڈر ہے
پیتے ہیں مئے عشق تصدق میں اسی کے
جو مر گئے میخوار وہ پھر اُٹھتے ہیں جی کے

یہ رفعت عباس کہ ممدوح علیؑ ہے　　صاف اس سے عیاں ہے کہ سعید ازلی ہے
آغوش امامت میں ہر اک سانس پلی ہے　　اس واسطے سانچے میں طہارت کے ڈھلی ہے
پہلے تو بڑھا خانہ حیدر میں اُجالا
اس چاند کا ہے آج ہر اک گھر میں اُجالا

(۳)　آغاز مرثیہ (کلاسیکی انداز)

یا رب تو میرے لفظ و معانی میں اثر دے　　ہر بند کو مفہوم کی تفسیر سے بھر دے
مدحت کے مضامین بعنوانِ دگر دے　　سامع کو بھی تو میرے تصوّر کی نظر دے
قطرے کا کروں ذکر، تو دریا نظر آئے
دریا پہ شہ دیں کا پھریرا نظر آئے

(۴)　مرثیہ در احوال ا، حسین علیہ السلام۔ (آغاز مرثیہ۔ حمد سے ابتدا)۔

اس کی عطا نے پھولوں کو خوشبو سے بھر دیا　　خوشبو کو اپنے لطف سے ذوقِ سفر دیا
بلبل کو اس نے پھول کا دیوانہ کر دیا　　اس نے بشر کو بھی دل الفت اثر دیا
کچھ وہ ہیں جن کو رفعت و عصمت عطا ہوئی
ہم عاشقوں کو اُن کی محبت عطا ہوئی

(۵)　مصائب اور بین:

کلاسیکی مرثیے ہیں مصائب اور بین کو اولیت حاصل ہے اس لئے سطور بالا میں ذکر کیا گیا ہے کہ سلیم رضوی کے مراثی میں بین کے بند مقابلتاً زیادہ ہوتے ہیں، نمونہ کلام کے لئے اس

وقت اُن کا ایک ''مرثیہ دراحوال شہزادگان'' ہمارے سامنے ہے۔ اس میں بین کا وہی انداز ہے جو قدیم مرثیے کی روایت ہے۔

سر ننگے پہنچے لاشوں پہ شبرِ خستہ تن ۲۶　چلائے، لُٹ گیا میری ہمشیر کا چمن
ہے ہے کھلے یہ زخم، یہ سوکھے ہوئے دہن　　یارب یہ حال دیکھے گی کیسے میری بہن

ہیں پسلیاں بھی چور بدن چاک چاک ہے
زلفیں لہو میں غرق ہیں، چہروں پہ خاک ہے

مرنے کا حال بیٹوں کے زینب نے جب سنا　　سجدے میں سر کو رکھ دیا اور رو کے یوں کہا
اے رب پاک ذات، کرم ہے یہ سب تیرا　　میرے چراغ بجھ گئے ہیں پر دل نہیں بجھا

گذرے میرے صغیر شہادت کی راہ سے
یہ حوصلہ ملا ہے تیری بارگاہ سے

بڑھ کر بہن کو شہ نے گلے سے لگا لیا　　پھر داڑھیں مار مار کے روئے شہ ہدیٰ
بولے یہ قتل ہوگئے، میں زندہ رہ گیا　　ہے ہے قضا نہ آئی ہمیں وا محمداً

صدمے جو دل پہ ہیں وہ کسے اب سناؤں گی
دو داغ لے کے کیسے مدینے کو جاؤں گی

بنتِ علی کو لاشوں پہ جب لائیں بیبیاں　　آل نبی میں شور قیامت ہوا عیاں
لپٹا کے اپنے سینے سے بچوں کو بولی ماں　　اے میرے گلعذارو تمہیں ڈھونڈوں اب کہاں

دونوں فدائے سیدِ ابرار ہوگئے
کنجِ لحد میں سونے کو تیار ہوگئے

قدیم مرثیے کی روایت اور قدیم مرثیے کا مقصدِ بکا اور ترغیبِ بکا ہے اس لئے شاعر اپنے ماحول کے مطابق بین کراتا ہے۔ سلیم رضوی نے مرثیے کی روایت کا حق ادا کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

ناصر لکھنوی:- (لکھنؤ)

ولادت ۱۹۳۰ء (تعلیمی اسناد پر ۱۹۳۷ء)

نام۔ سید ناصر حسین رضوی۔ تخلص ناصرؔ۔ وطن لکھنؤ۔ تعلیم ایم۔ اے سوشیالوجی۔ لکھنؤ

یونیورسٹی۔ ایم اے۔(اردو) کانپور یونیورسٹی۔ عالم (سلطان المدارس)۔ والدِ گرامی۔ سیّد خورشید حسین رضوی خلف سید احمد حسین مرحوم۔

لکھنؤ کی تہذیب کی آن بان اور شان والے مرثیہ نگار جناب ناصر لکھنوی، لکھنؤ اور مرثیے کی جملہ روایات کے محافظ ہیں۔ مرثیے میں چہرہ۔ سراپا۔ بہار، ساقی نامہ، رخصت، رجز، جنگ، گھوڑا۔ تلوار، شہادت اور بین نہ ہوں تو وہ اسے مرثیہ نہیں سمجھتے۔ انسانی اقدار کی اتھل پتھل کے اس دور میں اقدار کے محافظ کہاں ملتے ہیں۔ اس لئے حضرت ناصر لکھنوی ایسے بزرگوں کا دم غنیمت ہے کہ اُن کی حیات کے آنگن میں اودھ کی تہذیب کا سورج آج بھی طلوع ہوتا ہے۔ حضرتِ ناصر لکھنوی نے پندرہ برس کی عمر سے شعر کہنے شروع کر دیئے تھے، انہوں نے بیشمار نوحے۔ سلام اور قصائد کہے جو گھر گھر پڑھے جاتے ہیں۔ آغازِ مرثیہ گوئی کے سلسلے میں وہ رقم طراز ہیں:

> ''میں نے ۱۹۹۹ء میں شلّن نواب (روش لکھنوی) کے اصرار پر پہلا مرثیہ کہا۔ یہ مرثیہ ایک بار مجلس میں کیا پڑھ دیا کہ لکھنؤ، بمبئی، پٹنہ، گیا، الہ آباد، کانپور اور پتہ نہیں کہاں کہاں سے مومنین، مرثیہ پڑھوانے کے لئے چلے آرہے ہیں۔ ایک تو ضعیفی دوسرے بلڈ پریشر۔ کس کس سے معذرت کروں۔ مرثیہ پڑھنے میں بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ جسم میں جوانی ایسی طاقت کہاں سے لاؤں؟''
>
> (مکتوب بنام عاشورہ کاظمی مرقومہ ۳۰ جون ۲۰۰۳ء)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناصر لکھنوی مرثیہ نگار ہی نہیں مرثیہ خواں بھی ہیں، اور بہت مقبول ہیں۔ اُنہوں نے ۱۹۹۹ء سے اب تک چار مرثیے کہے ہیں، گویا ہر سال ایک مرثیہ کہہ رہے ہیں۔ اُن کا پہلا مرثیہ، ''پانی اور پیاس'' ہے۔ اس مرثیے کے چہرے میں اُنہوں نے '' میر انیس اور میر نفیس'' کی پیروی میں مرثیہ کہنے کی کوشش کی ہے۔

اے خدا اشکوں میں دریا کی روانی آجائے ۔۔۔ میری ہر بیت کی ندرت میں جوانی آجائے
اِس فصاحت بقلم، نطق بیانی آجائے ۔۔۔ میر انیسؔ ایسی مجھے مرثیہ خوانی آجائے

گوہر آب بنیں سبزے پہ شبنم کی طرح
غم شبیرؑ رہے فاطمہ کے غم کی طرح

پیاسے آتے ہیں بچانے کو شریعت تیری کوئی بھی وقت ہو، ہے سب کو ضرورت تیری
اے کہ ہر چار طرف چھائی ہے رحمت تیری کاش اس فکر پہ ہو جائے عنایت تیری
میرے اللہ گناہوں سے بچائے رکھنا
نیک راہوں پہ کرم اپنا بڑھائے رکھنا

خنکیٔ قلب ہے اشعار میں کوثر کی طرح حسن، الفاظ سے چھلکا تا ہوں ساغر کی طرح
میں نظر آتا ہوں ہر شعر میں جوہر کی طرح مدح کرتا ہوں شہِ دیں کی تونگر کی طرح
بچپنے سے جو میرے کام میں مداحی ہے
اس لئے میری طبیعت میں رچی شاہی ہے

انکساری سے طبیعت جو فقیرانہ ہے میں ہوں مداحِ علیؑ، شکل امیرانہ ہے
وہ بلاغت ہے کہ ہر حسن دبیرانہ ہے میری ہر فکر کا انداز خبیرانہ ہے
میں فصاحت کے لئے پڑھتا ہوں دیوانِ انیسؔ
بیت پانی سی بہے، نکہت گل ہو کہ نفیسؔ

ناصرؔ لکھنوی نے میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ۔ میر نفیسؔ کی عظمتوں کو تسلیم کیا ہے۔ حضرت خبیر لکھنوی سے اُن کا سلسلہ تلمذ وابستہ تھا جس کا اعلان اُنہوں نے واضح الفاظ میں کیا ہے۔

"میری ہر فکر کا انداز خبیرانہ ہے"

مرثیے کے موضوع "پانی اور پیاس" سے مسلسل رہتے ہوئے پانی پر فکرِ ناصرؔ دیکھیے۔

کروٹیں لیتا ہے، پہلو کو بدلتا پانی رو دیا پانی کے سوتوں سے اُبلتا پانی
تپش مہر سے دریا میں ہے جلتا پانی آبلہ پائی سے انگاروں میں ڈھلتا پانی
بھاپ اُڑاتا رہا آہوں سے قرینہ اس کا
یوم عاشور ہے اور پیاس سفینہ اس کا

آج اس پانی کی اعجاز بیانی کی قسم شور قلقل ہے نغاں ساز روانی کی قسم
تشنہ لب بچوں کے اظہار معانی کی قسم مسکراہٹ کے لب فلسفہ دانی کی قسم
شدّتِ ظلم سے ہے نہر میں جلتا پانی
کربلا کہتی ہے، "ہے خون سے مہنگا پانی"

کہیں عنقا ہے یہی بیچ سمندر پانی　　صورت اشک ہوا جاتا ہے گوہر پانی
یاد پیاسوں کی دلاتا ہے یہ اکثر پانی　　ہو عطا کاش وہی ساقیٔ کوثر پانی
نذر پانی کی دلانے کے لئے آیا ہوں
قصہ پیاسوں کا سنانے کے لئے آیا ہوں

مرثیے میں مصائب اور بین کے حصے سے مرثیہ نگار شاعر کا تشخص اور مرثیے کی سمت کا تعین ہو جاتا ہے۔ حضرت ناصر لکھنوی کے بین اور مصائب کا انداز اُن کی مرثیہ گوئی کا وضاحتی باب ہے۔ منظر نامہ یہ ہے کہ عباس شہید ہو گئے۔ امام حسین بھائی کا لاشہ اُٹھانے کے لئے میدان کارزار کی طرف بڑھتے ہیں۔ علی اکبر ساتھ ہیں۔

بین کرتے چلے شبیرؑ سوئے دشت قتال　　راستہ مجھ کو دکھاتے چلو اکبرؑ میرے لال
تیغ ہوتی جو کہیں ہاتھ میں ہوتا نہ یہ حال　　فوج کر دے نہ میرے بھائی کا لاشہ پامال
منقطع کر دیا پیاسوں کا سہارا لوگو
تم نے چھپ کر میرے بھائی کو ہے مارا لوگو

اور ادھر کھاتی تھیں خیمے میں پچھاڑیں زینب　　اُم کلثوم پکاری یہ ہوا کیسا غضب
بولیں بانو میں کہوں بھی تو یہ ہے سوئے ادب　　جھوٹ کو سچ نہ بتاتے ہوں کہیں اہل عرب
جا کے اکبر سے کہو" لال خبر تو لائیں"
آ کے شہزادیٔ زینب کو ذرا سمجھائیں

غش سے چونکی جو سکینہ نے یہ زینب سے کہا　　عمو آئے کہ نہیں بولئے بنت زہرا
پھر نقاہت سے جو بچی نے سوئے در دیکھا　　فکر عباسؑ نے تڑپایا تو کہرام ہوا
دوڑ کر شاہ زمن بولے یہ زینبؑ کے قریں
میں خبردار ہوں ہر خیمے سے گھبراؤ نہیں

اتنے ہیں مشک و علم خیمے میں لائے اکبر　　ایک آتی تھی صدا ہائے غضب لٹ گیا گھر
در پہ رہ رہ کے سسکتی تھی علیؑ کی دختر　　ناصر اس طرح سے خالق نہ دکھائے منظر
شاہ ڈیوڑھی پہ ٹہلتے تھے وہ سناٹا تھا
پاس آتا تھا نہ اب پاس کوئی جاتا تھا

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر پیام اعظمی:- (الہ آباد، لکھنؤ)

ولادت ۱۹۳۸ء

نام سید قنبر حسین رضوی، تخلص پیامؔ۔ جائے ولادت، اعظم گڑھ۔

ڈاکٹر پیامؔ اعظمی بیسوی صدی کے ممتاز اور مقبول شاعر ہیں جو کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ صاحبان نقد و نظر نے پیامؔ اعظمی کی شاعری پر بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن کسی قلمکار کا بہترین تعارف یا تو اسکی آپ بیتی ہوتی ہے، یا اس کے اپنے رشحات قلم جو قلم کار کی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں، اپنی شاعری کا دیباچہ حضرت پیامؔ اعظمی نے یوں لکھا ہے۔

میرا اسکول نہ دلّی نہ اودھ اور نہ دکن　　ہے درِ علم سے وابستہ میرا رشتۂ فن
لیتا ہوں سیرت معصوم سے اصلاحِ سخن　　سامنے رہتی ہیں کردار کی شمعیں روشن
سانس رکتی ہے تخیل کی نہ لے ٹوٹتی ہے
میرے لکھے ہوئے شعروں سے کرن پھوٹتی ہے

ڈاکٹر پیامؔ اعظمی کے مجموعہ مراثی ''والفجر'' کے دیباچے میں علامہ صفی حیدر سیکرٹری تنظیم المکاتب، لکھنؤ رقم طراز ہیں کہ ''شاعری اور مرثیہ نگاری کے ذریعے پیغام عمل دینے والے اور دینداری کی تحریک کو آگے بڑھانے والے شعراء میں اُن کا نام سرفہرست ہے''

''والفجر'' ڈاکٹر پیام اعظمی کے آٹھ (۸) مراثی پر مشتمل اُن کا مجموعہ مراثی ہے جسے تنظیم المکاتب لکھنو نے ۱۹۹۸ء میں شائع کیا ہے۔ اس سے پہلے ''داستان وفا'' کے نام سے بھی اُن کے مراثی شائع ہو چکے ہیں۔ ''حسین اور اسلام'' ڈاکٹر پیام اعظمی کا پہلا مرثیہ ہے۔ ''والفجر'' میں اس مرثیے کا سنہ تصنیف، ۱۹۶۵ء تحریر کیا گیا ہے۔ اس مرثیے کی چند بند نمونہ کلام کے طور پر درج ذیل ہیں۔

اے ہم نشیں فسانۂ دینِ خدا نہ پوچھ　۱　اسلام پر جو وقت مصیبت پڑا نہ پوچھ
کس طرح کاروانِ صداقت لُٹا نہ پوچھ　　بعد رسول دہر میں کیا کچھ ہوا نہ پوچھ
کہتی تھی شام غم یہ سحر کے چراغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

بیت کے مصرع ثانی پر ''واوین'' نہیں ہیں شاید یہ وجہ ہو کہ بیت کا پہلا مصرع،

دوسرے مصرعے پر تضمین نہیں ہے بلکہ قافیہ اور ردیف کے بدلنے سے غالباً اس شعر کے حسن میں اضافہ کیا گیا ہے، اصل شعر یہ تھا ؎

دل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

تاریخ نے وہ موڑ لیا تھا کہ الحذر ۲ ظالم یزید اور خلافت کے تخت پر
آذر کے بندوبست میں تھا کبریا کا گھر رہزن کو حادثوں نے بنایا تھا راہ بر

ابلیس ورثہ دارِ خلیلؑ و کلیمؑ تھا
شدّاد اور نائبِ خلقِ عظیم تھا

یثرب میں بک رہی تھی شریعت کی آبرو ۵ کوفے میں لٹ رہی تھی صداقت کی آبرو
کعبے سے جا چکی تھی عبادت کی آبرو عزت نہ فرد کی، نہ جماعت کی آبرو

رہزن نژاد راہ نما بن گئے تھے آج
صدیوں کے بت پرست خدا بن گئے تھے آج

حق کے اصول کفر کے سانچے میں ڈھل گئے ۶ دامن وفا کے ظلم کے شعلوں میں جل گئے
جذبے دلوں سے رحم و کرم کے نکل گئے خورشید آگہی کو اندھیرے نگل گئے

پہرے پڑے تھے فکر و نظر کے فرات پر
پانی اجل نے بند کیا تھا حیات پر

اخلاق بے وطن تھا، وفا بے دیار تھی ۱۳ سجدے تھے مضطرب تو نماز اشکبار تھی
کعبہ اُداس قبرِ نبی سوگوار تھی ہلتا تھا آسمان زمیں بیقرار تھی

آتی تھی ہر طرف سے صدا شور و شین کی
اسلام دے رہا تھا دہائی حسینؑ کی

تیرھویں بند میں ماہرانہ گریز کے بعد چودھواں بند براہِ راست منقبت پر لے آیا ہے۔

دین خدا ہے کشتۂ بیداد، یا حسینؑ محنت نبی کی ہوتی ہے برباد، یا حسینؑ
آواز دی رسول نے، فریاد یا حسینؑ مشکل کشا پکارے کہ امداد، یا حسینؑ

اے چارہ سازِ بیکس و دلگیر۔ المدد
زہرا نے دی صدا میرے شبیرؑ، المدد

اُٹھے حسینؑ، عزمِ شہادت لئے ہوئے　۱۵　نانا کی شان باپ کی عزت لئے ہوئے
ٹھوکر میں ہر غرورِ حکومت لئے ہوئے　　اسلام کا نوشتۂ قسمت لئے ہوئے
بولے کہ حق پہ آنچ بھی آئے محال ہے
سینہ سپر یہ فاتحِ اعظم کا لال ہے

اسلام میرے نانا کی عزت کا نام ہے　۱۷　اسلام میرے باپ کی سیرت کا نام ہے
اسلام میری ماں کی بضاعت کا نام ہے　　اسلام میرے بھائی کی دولت کا نام ہے
اسلام میرا دل، میری جاں، میرا چین ہے
اسلام ہی کا اسمِ گرامی حسینؑ ہے

اور مرثیہ جس بند پر مکمل ہوتا ہے وہ یہ ہے۔

زینب کھڑی تھیں اور کٹا سر حسینؑ کا　　کانپی زمیں، ہلنے لگا عرشِ کبریا
آئی تھی واحسینؑ کی ہر سمت سے صدا　　مقتل میں آکے بنتِ پیمبرؐ نے دی ندا
سجدے میں سر کٹا ہے عبادت کی آن دیکھ
اے ربِّ دو جہاں میرے بچے کی شان دیکھ

اب تک پیام اعظمی کے آٹھ مرثیے سامنے آئے ہیں۔ اُن کا دوسرا مرثیہ ''داستانِ وفا'' ہے جو انہوں نے ۱۹۶۷ء میں کہا ہے۔ یہ مرثیہ حضرت ابو طالب سے حضرت عباسؑ تک کے احوال کا مرثیہ ہے جو حضرت ابو طالب کی دفا سے شروع ہوتا ہے۔ جس میں شاعر نے افعال و کردارِ ابو طالب کی روشنی میں ان کے ایمان پر استدلال کیا ہے اور مخالفین کے ردّیوں پر طنز بھی ۔

کیا ضروری تھا کہ اک اک کو دکھاتا اسلام　　مشتہر سارے زمانے میں کراتا اسلام
راویوں کو جو بلا لیتا تو لاتا اسلام　　جا کے تاریخ کے دفتر میں لکھاتا اسلام
سندِ کلمۂ توحیدِ الٰہی دیدو
سب سے کہتا میرے ایماں کی گواہی دیدو

محسنِ حق دمِ آخر بھی نہ لایا ایماں　　یعنی کافر کا پیمبرؐ نے اٹھایا احساں

کاش مٹ جاتا یہ بے شرم مورخ کا بیاں ابوطالب پہ نہیں، ہے یہ نبی پر بہتان
جس نے پالا تھا اسے کفر کا الزام دیا
خوب اُمت نے پیمبرؐ کو یہ انعام دیا

اے ابوطالب ایمان سیَر، نیک فعال یوں تو پھیلائے ہیں دنیا نے روایات کے جال
پھر بھی چھپتا ہے کہیں تیری صداقت کا جمال تیرا کردار یہ کرتا ہے زمانے سے سوال
بولو ایمان سے، ایمان کسے کہتے ہیں
میں ہوں کافر تو مسلمان کسے کہتے ہیں

ڈاکٹر پیام اعظمی کا تیسرا مرثیہ،عورت، ہے جو ۱۹۶۹ء میں کیا گیا ہے۔ چوتھے مرثیے ''آنسو'' کا سنہ تصنیف ۱۹۷۲ء ہے۔ پانچواں ''اندھیرا اُجالا'' ۱۹۷۴ء کی تصنیف ہے۔ چھٹا مرثیہ ''آخری انقلاب'' ۱۹۷۹ ساتواں مرثیہ ''علی اور عباس'' ۱۹۸۰ء آٹھواں مرثیہ ''علم اور عباس'' ہے جس کا سنہ تصنیف ۱۹۸۸ء ہے۔ اس کے بعد پیام صاحب نے کوئی مرثیہ کہا کہ نہیں ،اس کی اطلاع نہ مل سکی۔ خیال اغلب ہے کہ نہیں کہا۔ پچھلے دنوں وہ لندن تشریف لائے تھے۔ راقم الحروف نے کوشش کی کہ اُن سے ملاقات ہو جائے، تاکہ ان کی مرثیہ گوئی کی تفصیلات کا احاطہ کیا جاسکے مگر بقول چھنو لال دلگیر ''جن کے رتبے میں سوا، اُن کو سوا مشکل ہے'' سبب تفاوت حفظ مراتب ہو یا ان کی مصروفیت، بہر حال ملاقات نہ ہو سکی۔ کچھ دنوں کے بعد علامہ صفی حیدر سے ملاقات کا شرف ملا تو راقم السطور نے پیام اعظمی سے متعلق کچھ سوالات کا جواب چاہا مگر علامہ موصوف نے ہر سوال کے جواب میں ''والفجر'' کہا اور نہ صرف یقین دلایا کہ ساری معلومات ''والفجر'' کے مطالعہ سے مل سکتی ہیں بلکہ ازرہ کرم ''والفجر'' کی ایک جلد مہیا بھی فرمادی جس میں ڈاکٹر پیام اعظمی کے آٹھ مرثی کے علاوہ ان کی اہم تحریر ''میں اور میری مرثیہ نگاری'' شامل ہے۔ اس میں انھوں نے بڑی بیباکی کے ساتھ جہاں اپنی مرثیہ نگاری پر بات کی ہے وہاں بہت سے ایسے موضوعات پر بھی رائے زنی کی ہے جو متنازعہ بھی ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر پیام اعظمی خطیب ہیں۔ ذاکر ہیں۔ مرثیہ خواں اور مرثیہ گو ہیں۔ نقد و نظر کے میدان میں بھی ان کے نقوشِ پا نظر آتے ہیں۔ اپنی مرثیہ گوئی کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں۔

''میرے مرثیے قدیم ہیں یا جدید، اس پر غور کرنے کا مجھے

وقت نہیں ملا ہے البتہ اتنا جانتا ہوں کہ مرثیے کے موضوعات وہ ابدی اور آفاقی حقائق ہیں جو نہ گرم وسرد زمانہ سے بدلتے ہیں نہ تاریخ کی رفتار ان میں تبدیلی کرسکتی ہے البتہ ہر آدمی اپنے عہد کی زبان بولتا ہے اور اپنے زمانے کے لب ولہجے میں گفتگو کرتا ہے۔'' (والفجر، ص۔۱۶)

مرثیے میں مصائب اور رونے رلانے کے متعلق ان کی رائے ہے کہ:

''رضائے الٰہی کے لئے پیش ہونے والی ان قربانیوں اور ان پر ہونے والے مظالم کا تذکرہ کر کے رونا رلانا شاعر کا مقصد ہے۔ یہی گریہ ہمارا مذہبی شعار، عبودیت کا قرآنی معیار اور مرثیہ کا بنیادی مقصد ہے۔

(والفجر، ص۱۶)

اس رونے رلانے کی روشنی میں ایک بات سامنے آئی کہ ''بین'' مرثیے کا اہم ترین جزو ہے، اور ''بین'' کے دو ہی انداز ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ شاعر بین کرے اور قاری یا سامع کو رُلائے اور دوسرا یہ کہ وہ جو ظلم سہہ رہے ہیں وہ بین کریں۔ جوشؔ ملیح آبادی سے پہلے (اور ان کے بعد بھی) کلاسیکی مرثیے میں خاندان رسالت کی شخصیات ''بین'' کرتی نظر آتی ہیں یہاں تک کہ حسینؑ کی زبان معجز بیان سے بھی جو کلمات شعرا نے ادا کرائے ہیں وہ (خاکم بدہن) امام نے رو کر، چلا کر، سر پیٹ کر، یا اپنی مجبوری اور بے کسی کے اعلان واقرار کے ساتھ ادا کئے ہیں۔ ڈاکٹر پیام اعظمی نے ان تفصیلات میں جائے بغیر صرف اتنا کہا ہے کہ ''مصائب کا حصہ مختصر ہونے کے باوجود مرثیے کا اہم ترین جزو ہے'' لیکن ان کے اپنے مراثی میں مذکورہ انداز کے ''بین'' نہیں ہیں۔ مصائب کا تذکرہ زیادہ تر شاعر کی زبان میں ہے۔ پیام صاحب نے ایک طرف میر انیس اور مرزا دبیر کو خراج عقیدت پیش کیا ہے اور فیصلہ دیا ہے کہ آج بھی مرثیے کے خدوخال انہی کے بتائے ہوئے خطوط پر طے ہوں گے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ایسے جملے بھی تحریر فرمائے ہیں جو عقیدت آثار کم اور طنز آثار زیادہ نظر آتے ہیں مثلاً:

''ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ اس دور کے شعرا کے لئے ''مسندیں نہیں مقتل سجائے جاتے تھے'' اُن پر گل پاشیاں نہیں سنگ باریاں ہوتی تھیں' عقیدت کے پھول نہیں، نیزوں کے زخم ملتے تھے۔ اس کی

خوانندگی کے لئے بے داغ لباسوں کی نہیں خونچکاں کفن کی ضرورت تھی۔
وہاں شاعر، سامعین کو فرشی سلام کرنے کے بجائے موت کو خوش آمدید کہتا
تھا۔ وہاں داد وتحسین کے نعروں سے چھتیں نہیں اڑتی تھیں، بلکہ شمشیرو
سناں کمیت اسدی کے مقدس جسم کے ٹکڑے اُڑا رہے تھے۔ وہاں کا شاعر
ایک پھول کو سو (100) رنگ میں پیش کرنے کے بجائے ہر رنگ کو اللہ
کے رنگ میں رنگ دینے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ وہ شاعری ''مضامین نو کا انبار''
نہیں بقول دعبلؔ خزاعی شاعر کے لئے تختہ دار تھی۔ وہ شاعری ''نمک
خوانِ تکلم'' نہیں بلکہ زمزمۂ عالمِ افکار تھی۔ (والفجر۔ ۲۰۔۲۱)

ڈاکٹر پیام اعظمی کا یہ مضمون مرثیہ نگاری پر ایک مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ لکھتے ہیں
''حقیقت یہ ہے کہ مرثیوں کے اشعار جو فن کو بلندی پہ پہنچ کر اظہار کا کمال نظر آتے ہیں روح کربلا
سے محروم ہیں، مثلاً:

یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسینؑ ہوں

اس شعر کو امام حسینؑ کے رجز اور سید سجادؑ کے خطبوں کے سیاق
وسباق میں رکھ کر دیکھئے کتنا اجنبی معلوم ہوتا ہے۔''

(والفجر، ص ۲۳)

جس سیاق وسباق میں میر انیسؔ نے یہ شعر کہا تھا وہاں عجز بہتر تھا یا رجز؟ اس اہم نکتے
پر انیس شناسی کے منصب دار کیوں چپ ہیں، ہم نہیں جانتے۔ اپنی کم مائیگی کا اعتراف کہ ہم تو یہ
بھی نہیں جانتے کہ یہ تحریر ''طنز ومزاح'' کے زُمرے میں آتی ہے یا ''طنز و مدح'' میں اس کا شمار
ہوگا۔ لہٰذا اپنی بے بضاعتی کی پردہ پوشی کے ضمن میں بہتر ہوگا کہ مرثیہ گوئی پر پیامؔ صاحب کی رائے
کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرائی جائے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ:

''ہمارے مرثیوں نے محبت حسینؑ کا تبرک بڑی فراخدلی سے
تقسیم کیا ہے یہ الگ بات ہے کہ معرفت حسینؑ کے چراغ جلانے میں
زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکے لیکن یہ بھی بڑا کارنامہ تھا کہ اُنہوں نے ماحول

تو بنا دیا تھا۔ اس کے بعد یہ ہونا چاہیے تھا کہ مرثیوں سے کردار سازی کا کام لیا جائے'' (والفجر، ص۔۲۵)

حضرت پیام اعظمی کی دردمندانہ تنقید اس مرثیہ نگاری کو تلاش کرتی نظر آتی ہے جو فکر انسانی کو امام باڑوں سے نکال کر کربلا کی امتحان گاہ عبودیت تک پہنچائے لیکن اس کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہ اس شاعر کو قبول نہیں کرتے جس نے یہ اہم کام سرانجام دیا یعنی جوشؔ ملیح آبادی جن کے بارے میں پیام صاحب کا ارشاد ہے کہ

'' اقبال کی بجائے جوشؔ دزرانہ بلکہ بے ادبانہ ہمارے عزا خانوں میں داخل ہو گئے اور وہ اُتھل پتھل مچائی کہ اللہ کی پناہ'' -----

ہمارے پیام اعظمی نے جوش ملیح آبادی پر جو اعتراضات کئے ہیں اُن میں سے ایک اہم اعتراض یہ ہے کہ:

'' کھلم کھلا اللہ کا انکار کرتے والا مذہبی شاعری کا قائد بن جائے اُس سے بڑی مصیبت کیا ہوگی۔'' (والفجر)

گویا ایک قباحت، قیادت کی ہے اور دوسری قباحت یہ کہ مرثیہ گوئی کے لئے مسلمان ہونا، شرعی اقدار کا پابند ہونا ضروری ہے۔ معلوم نہیں اس کلیے کے بعد اُن غیر مسلم شعراء کی شاعری کا کیا ہوگا جنہیں اہل محراب و منبر جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں۔ چھنو لال دلگیر کا ایک مقبول نوحہ '' گھبرائے گی زینب'' جو آج بھی روز عاشور کی مجالس میں پڑھا جاتا ہے۔ کیا اس مقبول نوحے پر اس لئے پابندی لگادی جائے گی کہ یہ نوحہ کہنے والا شاعر پابند صوم وصلوٰۃ نہیں تھا۔ چھنو لال دلگیر کے اس سوز کا کیا ہوگا؟

گذر منزل تسلیم رضا مشکل ہے وعدہ آسان ہے وعدے کی وفا مشکل ہے
سہل ہے عشقِ بشر عشق خدا مشکل ہے جن کے رتبے میں سوا اُن کو سوا مشکل ہے

اس سوز کے مصرع تو ضرب المثل بن گئے ہیں، دلوں میں اُتر گئے ہیں۔ کیا رگھبر سرن دواکر راہی کا یہ شعر بھلایا جا سکے گا ؟

وقارِ خونِ شہیدانِ کربلا کی قسم
یزید مورچہ جیتا ہے، جنگ ہارا ہے

دلورام کوثری کی مرثیہ نگاری کو کہاں جگہ دی جائے گی؟ اگر ؎

"اللہ　کو　قہار　سمجھنے　والو
اللہ تو رحمت کے سوا کچھ بھی نہیں"

کہنے والا شاعر جوشؔ ملحد ہے اور اس کے ہاتھ سے حسینی پرچم چھین لینا اسلام کی خدمت ہے تو دنیا کے ہر اس شخص کو حسینؑ حسینؑ کہنے سے روکنا ہوگا جو "اللہ ہو" اللہ ہو کے نعرے بلند نہیں کرتا۔ یہاں جوشؔ کی مخالفت کے اسباب پر گفتگو (یہ جاننے کے باوجود بھی) مقصود نہیں ہے کہ لوگوں نے جوشؔ کو بُرا کہہ کر اپنا قد بڑھایا ہے۔ حضرت پیام اعظمی کو اللہ نے توانا اور بیباک قلم عطا کیا ہے۔ اُنہوں نے "قلم" کے موضوع پر قلم اُٹھایا ہے جس کا مطالعہ کرتے ہوئے ذہن، (معتوب بارگاہ پیام اعظمی) حضرت جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیے کی طرف بھی جاتا ہے جو انہوں نے 'قلم' کے زیر عنوان لکھا ہے۔ بیشک اس موضوع پر پیام اعظمی کا مرثیہ بھی بہت اچھا ہے اور یہاں دونوں مرثیوں کا تفصیلی تقابل بھی مقصود نہیں مگر اس تفاوت کی طرف اشارہ مقصود ہے جو مومن اور (بقول پیام اعظمی صاحب) ایک ملحد کے کلام میں ہے۔ جوشؔ کے مرثیہ کا صرف ایک بیت، توجہ چاہتا ہے ؎

نام تیرا سببِ جنبشِ لب ہائے رسولؐ
اے قلم موت کے لمحے کی تمنائے رسولؐ

ہمیں یقین ہے کہ حضرت اعظمی ایسے صاحب نظر کو یہ لاثانی شعر ضرور پسند ہوگا۔ "قلم" پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن ہماری نظر میں "قلم" کا اس سے بہتر تعارف کہیں نظر نہیں آیا جس میں "قلم" کے حوالے سے تاریخ کے چہرے سے نقاب اُلٹ دیا گیا ہو۔ جسے آپ ملحد کہہ رہے ہیں اس ملحد نے آپ کے نبی آخرالزماں کے آخری لمحات کا منظرنامہ ایک شعر میں پیش کر دیا ہے۔ فیصلہ پیامؔ صاحب پر کہ یہ جرأت و بیباکی شیوۂ کفار ہے یا درسِ مکتب حسینی؟ ۔۔۔۔۔۔ جوشؔ کے مرثیے کا ایک اور بند توجہ چاہتا ہے۔

تاج نے آل محمد پہ جو روکا پانی　　پیاس کے ابر سے یوں ٹوٹ کے برسا پانی
بے دھڑک قصرِ حکومت میں در آیا پانی　　ہوگیا سر سے شہنشاہ کے اونچا پانی
تاج داری معہ اورنگ و نگیں ڈوب گئی
آسماں سے جو لڑی تھی وہ زمیں ڈوب گئی

اور پیغام کربلا وقتی نہیں ابد تک کے لئے ہے اس لئے جوشؔ کے اس شعر کا شاید یہ مفہوم بھی نکلتا ہو کہ ؎ "آسماں سے جو لڑے گی وہ زمیں ڈوبے گی"

☆☆☆☆☆

رضا امروہوی:- (امروہہ)

ولادت جون ۱۹۳۹ء

نام - سید علی رضا۔ تخلص ، رضاؔ۔ نقوی سید - وطن امروہہ۔ تعلیم : امروہہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ علی رضا کے تایا زخمیؔ امروہوی شاعر تھے۔ بچپن سے علی رضا اُن کا کلام پڑھتے رہے۔ امروہہ سادات میں شعری فضا اور انیسؔ و دبیرؔ کے مراثی ذہنوں کو شعر گوئی کی طرف راغب کرتے چلے آئے ہیں اسی ماحول کے پروردہ علی رضا نے بھی شعر کہنے شروع کئے اور جون ایلیا سے سلسلۂ تلمذ وابستہ کیا۔ جون ایلیا، پاکستان چلے گئے تو علی رضا نے شمیمؔ کرہانی کی شاگردی کی۔

سید علی رضا امروہوی خود کو غزل کا شاعر کہتے ہیں ، لیکن ساتھ ساتھ سلام، منقبت ، قصائد اور نوحے بھی کہتے ہیں، صاحب دیوان شاعر ہیں بلکہ اس سے سوا ہیں کہ اُن کے چار پانچ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

اُن کے شعری مجموعے "رقص نوا" کے متعلق حضرت عظیم امروہوی نے تحریر فرمایا ہے۔

> "رقص نوا" کا اجراء صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ کی کوٹھی پر "اُن کے دست مبارک" سے ہوا" (مراد گیانی جی کے "دست مبارک" سے ہے)"

رضاؔ کے معیار شاعری کو صدر مملکت ہند کی پذیرائی کے علاوہ "اندر کمار گجرال ، ڈاکٹر ذاکر حسین اور شمیم کرہانی جیسے اکابرین اردو نے بھی سراہا ہے۔

"مرثیے سے رضاؔ امروہوی کا خاندانی رشتہ ہے۔ اُن کا گھرانا کئی پشتوں سے مرثیہ خوانی کرتا رہا ہے۔ اُن کا پہلا مرثیہ "فرمائشی مرثیہ" ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آل انڈیا ریڈیو نے اُن سے فرمائش کی تھی کہ وہ "براڈ کاسٹ" کی ضروریات کے پیش نظر ایک مرثیہ کہیں۔ رضا امروہوی نے "خاک کربلا" کے زیر عنوان ایک مسدس کہی۔ میں ریڈیو سکرپٹ رائٹر اور براڈ کاسٹر کی حیثیت سے اس باریکی سے آگاہ ہوں کہ میڈیا، کے لئے جو نثر و نظم لکھی جاتی ہے اس میں وسعت

نظری'' وسیع کینوس' کو ملحوظِ خاطر رکھا جاتا ہے۔ اس لئے کہ مسجد و محراب و منبر کا بہترین وعظ ریڈیو یا ٹیلی وژن کا بہترین لیکچر نہیں ہوسکتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے رضا امروہوی کا مرثیہ '' خاک کربلا'' اُن کی شعری صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اُن کی بالغ نظری اور وسعت قلبی کا آئینہ دار ہے۔ اُنہوں نے اسی زبان میں پیغام دیا ہے۔ جس کا '' میڈیا'' متحمل ہوسکتا تھا۔

خاک کرب و بلا ، رفعت و آگہی
تیری عظمت میں کوئی نہیں ہے کمی
تیرے ذرات میں نور و تابندگی
خاک ہوتے ہوئے بھی ہے تو روشنی
دل کی راحت نظر کی بصارت ہے تُو
دہر میں قبلہ گاہ عقیدت ہے تو

ظہر سے عصر تک خاکِ کرب و بلا
فیصلہ حق و باطل کا بھی ہوگیا
ظلم و باطل کے منہ پر طمانچہ لگا
جبر اور بربریت کا پرچم جھکا
حق کے چہرے پہ رنگ شباب آگیا
تجھ سے تاریخ میں انقلاب آگیا

دلبر مصطفیٰ ہے تیری خاک پر
معنیٔ 'ہل اتیٰ' ہے تیری خاک پر
وارث 'انما' ہے تیری خاک پر
جان مشکل کشا ہے تیری خاک پر
گلشن فاطمہ تجھ پہ گلنار ہے
کل بیابان تھا جو آج گلزار ہے

تجھ میں فوج حسینی کے جرّار ہیں
خاندان عقیلی کے سردار ہیں
تجھ میں آل محمد کے کردار ہیں
تجھ میں پوشیدہ کتنے ہی اسرار
خون سے تجھ کو رنگین تر کردیا
خالی دامن تیرا نُور سے بھر دیا

اس مسدس کو مرثیہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ شاعر نے میڈیا کے ذریعہ ترویج پیغام حسینؑ کی ہے۔ ہمیں احساس ہے کی رضا امروہوی کو مرثیہ نگاروں کی صفوں میں شریک کرنے کے لئے اُن کے کسی باقاعدہ روایتی مرثیے کے کچھ بند نقل کر سکتے تو بہتر تھا لیکن ہمیں اُن کا ایسا کوئی مرثیہ نہ مل سکا۔ اس کے باوجود اس امر پر بھی توجہ ضروری ہے کہ رثائی ادب کو

اس نئے مقام کی بھی ضرورت ہے۔ اور نئے انداز کی بھی جو رضاؔ امروھوی نے تاجدار کربلا'' میں اپنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اتفاق کی بات ہے۔ رضاؔ امروھوی کا پہلا مرثیہ فرمائش کے تحت کہا گیا۔ اور دوسرا ضرورت کے تحت یعنی اُن کے استاد گرامی قدر حضرت شمیم کرہانی کی وفات حسرت آیات کے موقع پر کہا گیا۔

ابھی رضاؔ امروھوی کے اس مرثیے کا انتظار ہے جو اُن کے دل کی گہرائیوں سے اُبھرے اور اُن کی زبان پر اُن کی فکر کا مدعا بن کر بولے۔ فی الحال رضا امروہوی کی ایک شعر پر گفتگو تمام ہوتی ہے۔

کربلا، ایثار و قربانی کے چہرے کا سکوں
کربلا، نُورِ شہادت کا نیا پیغام ہے

☆☆☆☆☆

شوق لکھنوی:۔ (لکھنؤ)

تاریخ ولادت۔ ۱۵/اکتوبر ۱۹۴۱ء۔

نام۔ مرزا محمد اشفاق۔ تخلص شوقؔ۔ وطن و مسکن۔ لکھنؤ۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ سلطان المدارس لکھنؤ کے بعد حسین آباد گورنمنٹ سکول لکھنؤ سے میٹریکولیشن، شیعہ کالج لکھنؤ سے انٹر میڈیٹ اور لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ اے (آنرز) اور ایم۔ اے (فارسی) فرسٹ ڈویژن۔ فرسٹ پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔

آغاز شاعری: ۵۸/۱۹۵۷ء بعمر سولہ سترہ برس میں ہوا۔ دیگر اصناف سخن میں ایک مقام پر پہنچ کر رثائی شاعری کی طرف رجحان ہوا۔ پہلا مرثیہ ۱۹۸۱ء میں کہا۔ اودھ بالخصوص لکھنؤ میں مرثیہ نقطۂ کمال تک پہنچا ہوا ہے۔ میر انیسؔ، خانوادۂ انیسؔ، مرزا دبیرؔ اور خانوادۂ عشق و تعشق مرثیہ گوئی میں لکھنؤ کو اس بلندی تک لے گئے جسے دیکھنے کے لئے دستار سنبھالنی پڑتی تھی۔ لکھنؤ میں آج بھی مرثیہ کہا جا رہا ہے۔ محراب رثا میں آج جو چراغ روشن ہیں اُن میں پیام اعظمی، کاظم جرولی اور روش لکھنوی کے ساتھ ایک چراغ مرزا شوقؔ لکھنوی بھی ہیں۔ مرزا صاحب نے اپنے مکتوب (بنام عاشور کاظمی مرقومہ ۱۱/ جون ۲۰۰۳ء) کے ساتھ دو مراثی کے کچھ بند ارسال کئے ہیں جو اُن کی مرثیہ نگاری کا تعارف ہیں۔

پہلا مرثیہ۔(چہرے کے بند)

خدا کا شکر کہ ہے ذاکروں میں نام اپنا ۱ رہا پسندِ خلائق سدا کلام اپنا
ہے مدح آلِ نبی شغل صبح و شام اپنا مئے غدیر سے پُر ہے ہر ایک جام اپنا
ہزار رنج ہوئے دور، دل کو چین آیا
ہمارے لب پہ جب آیا تو یا حسینؑ آیا

تھا کم سنی سے ہمیں شوق مجلس و ماتم ولائے آل زیادہ تھی گو کہ عمر تھی کم
ہزار بار اُٹھایا ہے بچپنے میں علم عزیز تھا ہمیں ہر شے سے شاہ دین کا غم
ہمیشہ بیٹھ کے اشکوں سے منہ کو دھوتے تھے
اسی زمانے سے ہم مجلسوں میں روتے تھے

ہلال ماہ محرّم پہ دیدۂ نمناک نظر جو آیا گریباں کو کر دیا صد چاک
بہائے اشک کبھی ڈالی اپنے سر پر خاک خیال آیا کہ غمگین ہیں شہ لولاک
یہی وہ دن ہیں کہ جو تھا رہ خدا میں لُٹا
علیؑ و فاطمہؑ کا باغ کربلا میں لُٹا

وہ باغ جس کو دعا دی نبی کی دختر نے وہ باغ خون سے سینچا تھا جسکو حیدرؑ نے
وہ باغ جس کو لگایا رسولؐ داور نے وہ باغ جس کی ثنا کی ہے ربِّ اکبر نے
یہی وہ دن ہیں کہ اہلِ جفا نے لوٹ لیا
وہ باغ دشت بلا میں قضا نے لوٹ لیا

دوسرا مرثیہ (آمد کے بند)

آمادۂ جہاد تھا کونین کا امام مٹنے کو تھے جہان سے زور آوروں کے نام
محسوس ہو رہا تھا اب اُلٹا یہ سب نظام شرما رہا تھا مہر بین کو مہ تمام
اصغرؑ کے خون سے رُخِ پُر نور لال تھا
چہرے پہ شاہ دیں کے غضب کا جلال تھا

دشت وغا میں آمدِ سرورؑ کا شور ہے ہر سو جدالِ سبطِ پیمبر کا شور ہے
خندق کا ہمہمہ کہیں خیبر کا شور ہے پھر آج زور بازوئے حیدرؑ کا شور ہے

لرزہ غضب کا ہے فلک کج مدار کو
آتا ہے روح و جان علیؑ کارزار کو

نزدیک فوج آکے پکارے شہ امم کیوں بے خطا سے لڑتے ہو لوگو ہے کیا ستم
سب مرتبے ہمارے ہیں قرآن میں رقم کیا ورثہ دار احمد مرسل نہیں ہیں ہم
گھر لوٹنے کو آئے ہو کیوں دل ملول کا
کیا اور بھی کوئی ہے نواسہ رسولؐ کا

کیا ساری کائنات سے بہتر نہیں ہوں میں روح نبی و وارث حیدرؑ نہیں ہوں میں
نور نگاہ بنت پیمبرؑ نہیں ہوں میں قرآں سے پوچھو خاصہ داور نہیں ہوں میں
خادم ہیں کس کے جن و ملک جانتے نہیں
میں خلق کا امام ہوں پہچانتے نہیں

سرور کی گفتگو کا نہ کچھ ہو سکا جواب جاہل اُدھر تھے رن میں اِدھر وارث کتاب
وہ خامیوں کی بھیڑ یہ قدرت کا انتخاب کندے کجا سقر کے کجا ابن بو تراب
شیطاں کے سب مرید تھے شر کی سپاہ میں
باجے بجا رہے تھے لعیں رزم گاہ میں

بدخُلق بدنہاد بداطوار بدنگاہ کم بخت کم نصیب سیہ قلب روسیاہ
رُسوا بڑے ذلیل کمینے پُراز گناہ بھولے ہوئے ازل سے بہشت بریں کی راہ
کوسوں تھے دور رحمت پروردگار سے
جلتے تھے دشمنیٔ علیؑ کے بخار سے

حجت تمام کر کے چڑھائی جو آستیں کانپا وہ آسماں کہ لرزنے لگی زمیں
میداں سے بھاگتے ہوئے بولے یہ اہل کیں اب خیریت نہیں کہ ہیں شبیر خشم گیں
اٹھا یہ شور بند ہے رستہ نجات کا
ہوگا لہو میں غرق سفینہ حیات کا

گھبرا کے ابن سعد پکارا کدھر چلے رکھو خیال میری خوشی کا کدھر چلے
کیا اب نہیں عزیز یہ دنیا کدھر چلے لاکھوں ہو تم حسینؑ ہیں تنہا کدھر چلے

غربت میں تین روز کے پیاسے کو مار لو
ٹھہرو رکو نبیؐ کے نواسے کو مار لو

یہ ہیں کلاسیکی مرثیے کے پاسدار، روایت کے علمبردار حضرت مرزا شوق لکھنوی جو مرثیہ گوئی کی عبادت میں مصروف ہیں۔

☆☆☆☆☆

زاھد جعفری:- جلال پور ضلع امبیڈکر نگر (یو۔پی)

ولادت۔ ۱۹ر جنوری ۱۹۴۱ء

آبائی وطن۔ جلال پور ضلع امبیڈکر نگر، یو پی۔ تعلیم بی۔اے (گورکھپور یونیورسٹی) ایم۔اے (اودھ یونیورسٹی) ادیب۔ ادیب ماہر، ادیب کامل (علی گڑھ یونیورسٹی)۔ اپنے تعلیمی سلسلے کی وضاحت میں زاہد جعفری نے لکھا ہے:

> ''تعلیمی سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ میں نے تمام تعلیم پرائیویٹ حاصل کی ہے۔ کسی بھی کالج وغیرہ میں معاشی حالات کے سبب کبھی نہیں پڑھ سکا۔ (مکتوب بنام عاشور کاظمی ۱۰ فروری ۲۰۰۴)

حصول تعلیم کی راہوں میں زاہد جعفری نے محرومیاں دیکھیں اُن سے وہ مایوس نہیں ہوئے بلکہ شعوری اور لاشعوری طور پر اُنہوں نے اپنی زندگی درس وتدریس اور قرطاس وقلم سے متعلق رہ کر بسر کی۔ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۳ء تک ''مہذب اللغات'' لکھنؤ کے دفتر میں حضرت مہذب لکھنوی کے ساتھ رہے۔ جولائی ۱۹۷۲ء سے ۲۰۰۱ تک ایک علاقائی کالج میں لیکچرر کی حیثیت سے کام کیا اور اب پنشن پر آنے کے بعد قرطاس وقلم پھر اُن کا مشغلہ ہے۔

پندرہ برس کی عمر میں مشق سخن کی ابتدا ہوئی۔ گھر کا ماحول ادبی تھا۔ انیس و دبیر کے مراثی کی گونج گھر کے ماحول میں رچی بسی تھی۔ لہٰذا ابتدائے شعرگوئی غزل تک محدود نہ رہی بلکہ غزل کے ساتھ ساتھ سلام اور منقبت گوئی کی راہوں پر سفر جاری رہا اور پھر ایک منزل وہ بھی آئی جہاں مجاز کی سرحدیں حقیقت سے مل گئیں اور فانی محبوب یا ممدوح کی جگہ وہ ممدوح ہو گئے جن کی مدح سرائی میں بشر جو کچھ بھی کہے غلو نہیں ہوسکتا اسلئے کہ اُن کے صفات لامحدود اور بشر کی فکر محدود ہے۔

بات مرثیہ گوئی تک پہنچی۔ وہ منزل جہاں انسان فکر و شعور کی پختگی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ غزل سے مرثیہ کے سفر میں کچھ موڑ ایسے بھی آئے جہاں طبع رواں کی جولانی اور خوب سے خوب تر کی تلاش کے جذبہ نے افسانہ نگاری، ادیبوں کی خود نوشت، مادۂ تاریخ جیسی نثری اور وقتی تخلیقات کیں، لیکن فکر کا قافلہ اور آگے بڑھا تو ایک جگہ محسوس ہوا کہ یہی منزل ہے اور یہ منزل تھی درس گاہ کربلا جہاں ایک آواز گونج رہی تھی۔

"ہے کوئی جو میری مدد کرے"

یہ آواز زاہد جعفری کے دل میں اُتر گئی۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور ہونٹوں پر بے ساختہ آ گیا "میں حاضر ہوں مولا"۔ میں حاضر ہوں۔ اور اس دن سے زاہد جعفری کے فکر کی سمت کا تعین ہو گیا۔ حق کی حمایت، حق کی رفاقت۔ حق کی پیروی۔ ظلم سے نفرت۔ مظلوم کی حمایت۔ زاہد جعفری پر رموزِ کربلا کھلنے لگے۔ اور یوں لگا جیسے زندگی کے ہر موڑ پر کربلا اور کربلا والے اُن کی دستگیری کر رہے ہوں۔ بھوک اور پیاس درپیش ہوئی تو کربلا والوں کی یاد آ گئی اور اپنی بھوک اور پیاس بے حقیقت معلوم ہوئی۔ کسی نے حق تلفی کی اور زاہد جعفری کو صبر کے گھونٹ پینے پڑے تو کربلا میں خانوادۂ رسالت کی حق تلفی کا منظر نگاہوں کے سامنے آ گیا اور زاہد جعفری کے اپنے دکھ دور ہو گئے۔ صبر کی منزل آئی تو مظلوم کربلا ۷۱ لاشوں کے درمیاں کھڑے یہ کہتے ہوئے نظر آئے کہ "اے فوجِ اشقیاء تم اگر اب بھی حق کو پہچان لو تو حسینؑ تمہیں سارے خون معاف کر سکتا ہے اور زاہد جعفری کو صبر کی منازل کا ادراک ہو گیا۔ بہن بھائی کا رشتہ، ماں باپ اور اولاد کے رشتے، دوستی کے حقوق، خلقِ خدا سے حسن سلوک الغرض زندگی کے ہر قدم پر کربلا والے رہنما بن گئے حتیٰ کہ حُسن و عشق اور درد کے معیار بدل گئے اور زاہد جعفری پکار اُٹھے۔

روئیں گے شام و سحر دیدۂ نم جیتے جی مرثیہ لکھے گا زاہد کا قلم ، جیتے جی
ہٹ کے ہم حسن عقیدت سے بکھر جائیں گے
مشغلہ غم کا اگر چھوٹا تو مر جائیں گے

زاہد جعفری نے تا حال پندرہ مرثیے کہے ہیں۔ نمونۂ کلام کے طور پر اُن کے مرثیے "سیر گلشن تاریخ حسنؑ" کے چند بند درج ذیل ہیں۔ اس مرثیے کا عنوان بلکہ عنوانات بھی سنہ تخلیق

کے مطابق ہے۔ زاہد جعفری لکھتے ہیں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم + داستان حسن = ۱۴۲۰ ھجری

۷۸۶ + ۶۳۴ = ۱۴۲۰ ھ

سیر + گلشن + تاریخ + حسن = ۲۷۰ + ۴۰۰+ ۱۲۱۱ + ۱۱۸ = ۱۹۹۹ عیسوی

چاند سورج میں ضیاء، گل میں مہک باقی ہے ۱ حسن کے نُور سے تاروں میں چمک باقی ہے
آدمی زندہ ہے، پروازِ ملک باقی ہے یہ زمیں پانی پہ ٹھہری ہے، فلک باقی ہے
خوبصورت ہے، جواں ہے جو یہ پیاری دنیا
حسن نے لمحہ بہ لمحہ یہ سنواری دنیا

کون ہوں کیا ہوں، مجھے دیکھ کے سوچا جائے ۹ حسن خود سوچ رہا تھا مجھے دیکھا جائے
مان کر رمزِ حقیقت مجھے پوجا جائے دیکھ کے سوچ سمجھ کے مجھے مانا جائے
اولاً عرش پہ انوار کے منظر ڈھالے
اپنے ہی نور سے کچھ نور کے پیکر ڈھالے

صُلبِ آدم سے چلے کعبے کے اندر ٹھہرے ۹ مرکزِ حسن وہی نور کے پیکر ٹھہرے
چشمِ یوسفؑ میں حسین صرف پیمبر ٹھہرے از ازل تا بہ ابد دین کے رہبر ٹھہرے
"حسن یوسف، دمِ عیسیٰ، ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند، تو تنہا داری"

حُسن کی چھوٹ پڑی، طور کا دامن چمکا ۱۱ حسن کی ایک جھلک سے رُخِ ایمن چمکا
حسن نے رکھا قدم، مصر کا آنگن چمکا حسن سے نیل کی موجوں میں بھی روزن چمکا
خالقِ حُسن کو اس رُخ سے بھی پہچان لیا
دیکھ کر کچھ تو نصیری نے خدا مان لیا

حُسن ہی حسن نظر آتا ہے جنت والا ۱۵ کربلا خطہ ہے اک، حسن و عقیدت والا
حُسنِ اعجاز ہے یہ شمع شہادت والا حُسنِ شبیرؑ کا ہر ایک یہاں متوالا
آگے کیا کرب و بلا کے ہے بھلا طور کا نور
شمع گل کر کے نکھارا شبِ عاشور کا نور

دشت میں حُسنِ حسینی کا سمندر چھلکا ۱۶ بجھ گئی شمع مگر نور کا منظر چھلکا
دیدۂ حُر سے پشیمانی کا کوثر چھلکا بارشِ عشق سے دریائے مقدر چھلکا
حسن سے آگے ملا عشق پشیمانی میں
بہہ گئی ساری خطا پیار کی طغیانی میں

مرثیے میں زاہد جعفری کی قادر کلامی قدم قدم پر حسن بصیرت کی روشنی بکھیر رہی ہے۔ ایک بند سے دوسرا بند اس قدر مربوط ہے کہ کوئی بند نظر انداز کریں تو تسلسل ٹوٹتا ہے۔ بہر حال اختصار کے پیش نظر یہ کہہ کر، آگے بڑھتے ہیں کہ مرثیہ جناب علی اکبر کے احوال کا ہے۔ علی اکبر میدان کی طرف بڑھتے ہیں، رجز پڑھتے ہیں ؎

نیند آتی ہے اگر ہم کو تو شمشیروں میں ۳۴ حیدری شیر جکڑتے نہیں زنجیروں میں
اپنے ششماہے بہلتے ہیں یہاں تیروں میں فرق بچوں میں، جوانوں میں نہ کچھ پیروں میں
ہم ہیں عباس کے شاگرد، ترائی لے لیں
حکمِ شبیرؑ اگر ہو تو خدائی لے لیں

آؤ اس پیاسے کی دریا پہ چڑھائی دیکھو پھر دوبارہ یہاں خیبر کی لڑائی دیکھو
انگلیاں دیکھو، یہ بازو، یہ کلائی دیکھو حیدری ہاتھ دکھاتا ہوں، صفائی دیکھو
بوترابی کی ذرا بڑھ کے سواری روکو
روک سکتے ہو تو اب بادِ بہاری روکو

پچپن (۵۵) بند کا یہ مرثیہ حضرت اکبر کی شہادت پر ختم ہوتا، جس کے بعد مقطع کا بیت ہے۔

ہٹ کے ہم حسنِ عقیدت سے بکھر جائیں گے
مشغلہ غم کا اگر چھوٹا تو مر جائیں گے

☆☆☆☆☆

شمیم حیدر شمیمؔ :- (امروہہ)

ولادت ۱۴ ؍ مئی ۱۹۴۱ء

نام سید شمیم حیدر۔ تخلص شمیمؔ۔ وطن، امروہہ۔ سید خلیق حسن فہیم کے نواسے۔ والد کا اسم گرامی سید علی حسن۔ ابتدائی تعلیم امروہہ میں حاصل کی۔ رامپور سے بی۔ اے کی سند لی۔ حضرت محمد

عبادت کلیمؔ اور خیالؔ رام پوری سے سلسلۂ تلمذ وابستہ رہا۔ ۱۹۶۲ء میں (بعمر ۲۱ سال) مرثیہ نگاری کا آغاز ہوا اور پھر اس کوچے کی فضا ایسی بھائی کہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ سچ ہی تو ہے جسے ایسا ممدوح مل جائے جس میں کمی تو کجا، کسی کمی یا خطا کا امکان بھی نہ ہو تو پھر انسان غیر کامل کی مدح کیوں کرے۔

شمیمؔ نے پہلے مرثیے کا موضوع ''زندگی'' تھا جس کے چہرے میں زندگی کی وضاحتوں کے بعد حضرت علی کو زندگی کی علامت کے طور پر موضوع مدح بنایا تھا اور حضرت عباس علمدار کے احوال پر مرثیہ ختم کیا تھا۔ پہلے ہی مرثیے میں عنوان سے لیکر اختتام تک شاعرانہ اوصاف نمایاں تھے۔

شمیمؔ کا ایک اہم مرثیہ ''ذہن میں جب بھی کنیزی کا سوال آتا ہے'' ہے جو کنیزِ سیدہ، جناب فضہ کے احوال پر ہے۔ شعرائے امروہہ میں سید شمیم حیدر شمیم سے پہلے حضرت جوّاد حسین شمیمؔ امروھوی نے بھی جناب فضہ کے احوال پر مکمل مرثیہ کہا تھا۔ ان کے علاوہ کچھ شعراء نے مرثیے کے چند بندوں میں جناب فضہ کا حوالہ دیا ہے مگر شمیم حیدر شمیمؔ نے جناب فضہ کے حوالے سے کنیزی کو جو عظمت دی ہے۔ وہ قابل ستائش ہے۔

ذہن میں جب بھی کنیزی کا خیال آتا ہے — در حجاباتِ نظر، نقشِ کمال آتا ہے
پردۂ فکر میں خورشید جمال آتا ہے — دل میں بے ساختہ فضہ کا خیال آتا ہے
اس نے روشن کیا فانوس وفاداری کا
بول بالا ہوا تاریخ وفا داری کا

فضہ کی عظمت، فضہ کا صبر اور فضہ کی وفاداری کا مظہر ایک بند یوں ہے ۔

اپنی آنکھوں سے محمد کا گھرانا دیکھا — ہیبتِ عبد یداللہ کا چھانا دیکھا
باقر و عابد و سبطین کا آنا دیکھا — تو نے تو پانچ اماموں کا زمانہ دیکھا
پنجۂ صبر سے ہر ظلم کو توڑا تو نے
انقلاب آئے مگر ساتھ نہ چھوڑا تو نے

لاکھ چاہا پہ محمد کا نواسہ نہ رہا — خنجر ظلم چلا حق کا شناسا نہ رہا
دینے والا تھا جو گھر بھر کو دلاسہ نہ رہا — حوض کوثر پہ گیا ہائے وہ پیاسا نہ رہا
خیمہ گاہِ حرمِ پاک میں لشکر آیا
نوک نیزہ پہ سرِ سبطِ پیمبرؐ آیا

اختیاری ضبط و برداشت کا نام صبر ہے مجبوری میں چپ رہنے کا نام صبر نہیں ہے۔ فضہ کی ساری عظمتیں اگر صرف اس حوالے سے بیان کی جائیں کہ وہ ایک مجبور و بیکس کنیز تھیں تو ساری صفات فضہ بے معنی ہو جاتی ہیں، شمیم حیدر شمیم نے اس مرثیے میں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ فضہ نے سیدہ فاطمہ زہراؑ کی کنیزی کو خود پسند کیا تھا۔ فضہ مجبور نہیں تھیں۔ فضہ کو اس خود اختیاری کنیزی کے مقابل شہزادیوں کا مرتبہ ہیچ نظر آتا تھا۔ اسی بات کو واضح کرنے کے لئے شمیم حیدر شمیم نے بعد کربلا، دربار یزید میں رونما ہونے والے اس واقعہ کو نظم کیا ہے کہ یزید نے جب سیدہ زینب کے قتل کا حکم دیا تو جناب فضہ، سیدہ زینب کے سامنے کھڑی ہو گئیں اور بلند آواز میں کہا۔ ''کس کی مجال ہے جو اس کنیز کی موجودگی میں اسکی شہزادی کو قتل کرے، یزید پہلے تمہیں اس کنیز کو قتل کرنا ہوگا''۔ یزید نے کمالِ تمکنت سے کہا، ''پہلے اس کنیز کو قتل کردو''۔ یہ سنتے ہی جناب نے فضہ نے کرسی نشین افریقی ممالک کے نمائندوں اور سفیروں کو مخاطب کر کے کہا ''اے قوم حبش کے نمائندوں تمہاری غیرت کو کیا ہو گیا ہے کہ تمہاری قوم کی ایک بیٹی کے قتل کا حکم دے دیا گیا ہے اور تم کرسیوں پر بیٹھے ہو''

مقاتل میں لکھا ہے کہ یہ سنتے ہی کئی سو تلواروں نیام سے باہر آ گئیں۔ اور سب نے ایک زبان ہو کر کہا۔ یزید یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم بیٹھے رہیں اور ہماری قوم کی ایک خاتون کو تم قتل کردو۔ یزید لرز گیا۔ درباری کانپ اُٹھے۔

جذبۂ قوم پرستی میں تھے سرشار بہت ایک ادنیٰ سے اشارے کے طلبگار بہت
سر پہ موجود تھے، کھینچے ہوئے تلوار بہت نکلے دربار میں فضہ کے طرفدار بہت

کھلبلی پڑ گئی، ایوانِ یزیدی لرزا
شمر سا پلۂ میزان یزیدی لرزا

شمیم حیدر شمیم نے اس واقعہ کو نظم کر کے ثابت کیا ہے کہ فضہ کی کنیزی جبراً نہیں تھی بلکہ اختیاری تھی ورنہ جس خاتون کے ایک اعلان پر کئی سو تلواریں نیام سے باہر آ جائیں وہ اہلِ بیت اطہار کے ساتھ مصائب جھیلنے پر آمادہ کیوں رہتی۔ اس کی صرف ایک ہی وجہ تھی یعنی اہلبیتِ اطہار کی غلامی کے شرف کا ادراک۔ اس مرثیے میں کیسے کیسے بیت کہے ہیں شمیم امروہوی نے

جیتے جی، خدمتِ اولادِ پیمبر کر کے
یہ وہ فضہ ہے جو ہر دل میں رہی گھر کر کے

گھر میں حسنین کے ٹھہری تھی جو باندی کی طرح

آج ہے دامنِ قرآن میں وہ چاندی کی طرح

شمیؔم امروہوی کی بہت سی تصانیف سامنے آچکی ہیں۔ اُن کی شاعری پر انیسؔ امروہوی، جعفری علی خان اثرؔ، خواجہ حسن نظامیؔ ثانی، تاباںؔ نقوی، مولانا ظفر الحسن اور نقی الحسن ایسے اکابرین علم وادب اظہارِ خیال کر چکے ہیں۔ اُن کی شعر گوئی میں جو محاسن نمایاں ہیں وہ اُنہیں شعراء کی اگلی صفوں میں شمار کرنے کے لئے کافی ہیں۔ جناب فضہ کے مرثیے میں شعر کو "پلۂ میزان یزیدی" کہنا کربلا کی تاریخ میں سارے مظالم کو ایک نقطے میں سمیٹنے کے مترادف ہے۔ ایسی بندشیں شمیؔم کے کلام میں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ اُن کے مرثیے "آدمی" کا ایک بند (بحوالۂ مرثیہ نگارانِ امروہہ) ہے۔

کہنے کو یوں تو خاک کا پتلا ہے آدمی ۔۔۔ بادِ صبا ہے، برق ہے، پارہ ہے آدمی

کوہِ قرار، موجۂ دریا ہے آدمی ۔۔۔ کل کائنات جو ہے وہ تنہا ہے آدمی

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے شیشے کو توڑ دے

سورج دبا کے ہاتھ میں کرنیں نچوڑ دے

"سورج دبا کے ہاتھ میں کرنیں نچوڑ دے" کی بات اُنہیں حضرت جوشؔ کی دعاؤں کا مستحق ثابت کرتی ہے۔ اس لئے کہ صرف جوشؔ کے ہاں یہ تیور ملتے ہیں۔

قطرے کو فشار دوں تو قلزم برسے

تلوار کو دھار دوں تو مرہم برسے

الفاظ نے بخشا ہے وہ اعجاز مجھے

شعلے کو نچوڑ دوں تو شبنم برسے

الفاظ کا یہی اعجاز شمیم حیدر شمیؔم کی پہچان اور فکرِ جوشؔ کا قرب نظر آرہا ہے۔ حضرت شمیؔم نقوی کی دو نئی تصانیف "ریاضِ فکر" اور "شیرازۂ تعزیت" منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ وہ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ ملک کے مختلف مقامات پر ہونے والی منقبت کی محفلوں میں شرکت کرتے ہیں، نئی نسل کی راہنمائی کرتے ہیں اور تحسینِ حسینؑ کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر سیادت فہمی:- (امروہہ)

تاریخ ولادت ۲۴ر نومبر ۱۹۴۲ء

نام سید محمد سیادت نقوی۔ تخلص فہمی۔ وطن امروہہ۔ مولوی سیادت اولاد حسین سیتیم کے پوتے، مولوی عبادت حسین کلیم کے فرزند مولوی سیادت فہمی کو دو چیزیں ورثے ملی ہیں۔ شاعری اور'' مولویت''۔ مولویت سے مراد'' ملا ازم'' نہیں بلکہ پشتوں سے نماز کی امامت کرانے کا منصب جو پشتوں سے مولوی سیادت فہمی صاحب کے بزرگوں کے پاس تھا وہی منصب مولوی سید محمد سیادت فہمی کو بھی ملا۔

مولوی سیادت فہمی نے سید المدارس امروہہ سے کامل (فارسی)، الہ آباد بورڈ سے فاضلِ ادب، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔ اے اردو کی اسناد حاصل کیں۔ دینی علوم کا حصول گھر کے دینی ماحول سے کیا۔ تدریس کو پیشے کے طور پر اپنایا، شاید اس لئے کہ علم حاصل کرنے کی تشنگی شدید تھی اور یہی ہوا کہ ہندو ڈگری کالج امروہہ میں' شعبۂ اردو' میں رہتے ہوئے میر اور سودا کے عہد کے ایک گم نامہ شاعر علی نظر امروہوی کا کلام مرتب کیا گویا ایک گمشدہ خزانے کو دریافت کر کے اردو دنیا کے حوالے کر دیا۔ اور علی نظر امروہوی ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر روہل کھنڈ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔

شاعری کی ابتدا دس بارہ برس کی عمر میں ہوگئی تھی، ابتدا میں جون ایلیا سے مشورہ سخن کیا۔ جون پاکستان چلے گئے تو اپنے والد گرامی سید محمد عبادت کلیم سے اصلاح لینی شروع کی۔

مولوی سید محمد سیادت فہمی کا پہلا مجموعۂ کلام'' بیمار مسیحا'' منقبت اور سلاموں پر مشتمل ہے جسے عنبر امروہوی نے مرتب کیا ہے۔ مرثیہ کی دنیا میں ان کا پہلا قدم ۵۰ بند کا ایک مرثیہ ہے۔

دراصل مطلعِ انوارِ آگہی ہیں حسینؑ　　خدا بشر کو ملے جس سے وہ خودی ہیں حسینؑ
جو رشکِ نوعِ بشر ہو وہ آدمی ہیں حسینؑ　　نہیں ہے موت جسے ایسی زندگی ہیں حسینؑ
حسینؑ آئے زمانے میں حق نما بن کر
شعور و فکر و تعقل کی انتہا بن کر

حسینؑ ہی نے ضیا چشمِ التفات کو دی　　حسینؑ ہی نے حق آگاہی کائنات کو دی
حسینؑ ہی نے حیاتِ ابد، حیات کو دی　　حسینؑ ہی نے بصیرت شعورِ ذات کو دی

فضائے دہر میں کُن، کی صدا حسینؑ سے ہے
نبی حسینؑ سے نامِ خدا حسینؑ سے ہے

وہ فخرِ نوعِ بشر، شاہکارِ فطرت ہے		خلاصۂ دو جہاں، انتخابِ قدرت ہے
وہ رازدارِ رموزِ جہانِ خلقت ہے		ہے جس پہ نازِ مشیت کو ایسی صنعت ہے
اُسی کے نور سے شمعِ حیات روشن ہے
اُسی کی ضو سے یہ کل کائنات روشن ہے

حسینؑ نام ہے حقانیت کے محور کا		حسینؑ نام ہے عقل وخرد کے رہبر کا
حسینؑ نام ہے عزم و عمل کے لشکر کا		حسینؑ نام ہے انسانیت کے جوہر کا
حسینؑ، خاتمِ حق کے نگیں کو کہتے ہیں
حسین، عظمتِ کُن کے امیں کو کہتے ہیں

جسے کہ اہل نظر حاصلِ حیات کہیں		جسے کہ مطلعِ نورِ ترقیات کہیں
جسے کہ حدِ ترقیِ ممکنات کہیں		جسے کہ مقصدِ تخلیق کائنات کہیں
جہانِ فکر میں قدرت کا انتخاب ہے وہ
جو بابِ علم رسالت ہے اسکا باب ہے وہ

مولانا سعادت فہمی نے قصائد منقبت، سلام اور رباعیات بھی کہی ہیں۔ ان کے سلام بھی بعض اوقات مرثیے کے بند معلوم ہوتے ہیں۔ مصرعوں میں ربط باہمی کے علاوہ اشعار میں ربط مضمون ایسے اشعار کو مرثیہ کا بند بنا دیتے ہیں۔ ایک سلام کے تین بند شاید اس فکر کی وضاحت کر سکیں۔

غیرِ خدا کا ہو جو خوف دل سے اسے نکال دو		نعرۂ حیدری لگاؤ، آئی بلا کو ٹال دو
جاہ و جلالِ احمدی، حسن و جمالِ حیدری		عظمت کردگار ایک، مظہر بے مثال دو
جس کی ہے ذات بے مثال بعدِ رسولؐ ذوالجلال
اس کی کوئی مثال لاؤ، اس کی کوئی مثال دو

ایک اور مثال۔

امتحان عشق میں ایسی گھڑی آئی کہ بس		کربلا میں جب ندائے غیب یہ آئی کہ بس

باپ کی آغوش میں تیرستم کھانے کے بعد   اصغر بے شیر کو ایسی ہنسی آئی کہ بس

مولانا سیادت فہمی نے (جولائی ۲۰۰۲ء میں) مرثیے کے کچھ بند ارسال فرمائے جو یقیناً ان کے تازہ مرثیے کے بند ہوں گے۔

وحدت فکر و عمل کا آئینہ ہے کربلا   آدمیت کا حقیقی تجزیہ ہے کربلا
بہر حق، قربانیوں کا سلسلہ ہے کربلا   ابتدا جس کی نہیں وہ انتہا ہے کربلا
کربلا ہی نور ہے اہل نظر کے واسطے
نعمتِ عظمیٰ ہے یہ نوع بشر کے واسطے

علم و دانش، فکر حکمت کا قرینہ کربلا   یعنی عرفان حق و باطل کا زینہ کربلا
حق یہ مرنے اور جینے کا قرینہ کربلا   بحرِ ہستی میں ہے اک روشن سفینہ کربلا
تیرا ہر ذرہ نہ ہو کیوں روشنائی زندگی
موت کو تو نے ہی بخشا ہے لباسِ زندگی

اور دوسرے مرثیے کے تین بند

کربلا زیست کا پیغام ہے انساں کے لئے   کربلا جادۂ اسلام ہے انساں کے لئے
کربلا فیض ربِ عام ہے انساں کے لئے   کربلا حق کا اک انعام ہے انساں کے لئے
کربلا ہی نے زمانے کو دیا سوزِ حیات
کربلا ہی سے ہے تابندہ شب و روزِ حیات

کربلا مسلک ارباب یقیں کی ہے شناخت   کربلا ضابطۂ دانش و دیں کی ہے شناخت
کربلا اپنی جگہ صرف زمیں کی ہے شناخت   کربلا وہ ہے کہ جو خلد بریں کی ہے شناخت
ہر پیمبر کے لئے مرکز تنویر ہے تو
کربلا خوابِ براہیم کی تعبیر ہے تو

تو نے افکار میں پیدا کیا عظمت کا شعور   تو نے اذہان کو بخشا ہے طہارت کا شعور
تو نے انساں کو دیا ذوق عبادت کا شعور   ذہن شاعر کو ملا تجھ سے ہی مدحت کا شعور
کربلا تیرے سبب فکرِ رسا باقی ہے
یعنی تجھ سے ہی فقط ذکرِ خدا باقی ہے

مولانا سیادت فہمی مذہبی، تحقیقی اور تنقیدی مضامین بھی لکھتے ہیں جو اردو کے ممتاز رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سے ادبی موضوعات پر اُن کی تقاریر بھی نشر ہوتی ہیں۔ علم و ادب بالخصوص مرثیے کے فروغ کے لئے ہمہ تن معروف شخصیت ہیں۔ آجکل ہندو پوسٹ گریجوئیٹ کالج امروہہ میں ریڈر (Reader) ہیں۔ کئی سکالر اُن کے زیر نگرانی پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے لکھ رہے ہیں۔ کچھ سکالرز پی۔ ایچ۔ ڈی کر چکے ہیں۔ اُن کی تصانیف

(۱) بیمار مسیحا (۲) نسیم امروہوی، ایک تعارف، (۳) دیوان علی نظر امروہوی

(۴) غالب اور اسلام (۵) اشتراکت اور سرمایہ داری میں تصورِ ملکیت۔

(۶) اردو مرثیے کا ارتقائی سفر۔ (زیر تصنیف) ہیں۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر عظیم امروہوی:- (امروہہ)

تاریخ ولادت ۲۹ اپریل ۱۹۴۵ء

نام، سید عظیم حیدر۔ تخلص، عظیمؔ۔ وطن امروہہ۔ سلسلۂ نسب کے حوالے سے سید العارفین سید شرف الدین شاہ ولادت کے سلسلے سے اولاد حضرت امام نقی علیہ اسلام (نقوی سیّد) ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اولاد شاہ ولایت میں سید عبد المجید عرف میر مُجّا اپنے دور کی نامور شخصیت تھے جنہوں نے محلّہ 'مجاپوتہ' آباد کیا۔ ان کی اولاد میں میر دائم علی جن کے نام پر کوچہ دائم علی ہے، دائم علی کے تین نسلوں بعد حاجی سید معجز حسین (زائر کربلا) ڈاکٹر عظیم امروہوی کے دادا تھے جنہوں نے ایک امام بارگاہ اور مسجد تعمیر کرائی۔ سید معجز حسین کے فرزند سید محمد نور الحسن، عظیم کے والد گرامی تھے۔ اپنے تعارف میں ڈاکٹر عظیم امروہوی رقم طراز ہیں کہ :

> "وہ کوچہ جس میں امیر حسن امیرؔ، علامہ شفیق ایلیاء، رئیس حسن ہلالؔ، کمال امروہوی رئیس امروہوی، اور جون ایلیاؔ پل کر جوان ہوئے وہیں میں نے بھی اپنے شعور کے تانے بانے بُنے۔ اس کوچے کے قدیم دیوان خانے میں شاہ عبد الرسول نثارؔ (شاگرد میر) مصحفی۔ اصغر اور جگر کا بھی اپنے اپنے دور میں آنا جانا رہا ہے"

(مرثیہ نگاران امروہہ۔ ڈاکٹر عظیم امروہوی)

اُن کا یہ تفاخر بجا ہے کہ وہ رئیسؔ امروہوی، سید محمد تقی اور جون ایلیا کے بھانجے ہیں۔
ان کے علاوہ بھی جن چاند سورجوں کے نام انہوں نے گنوائے ہیں ان کی ایک تابندہ کرن عظیم امروہوی خود بھی ہیں جو آج کے بہت سے سورجوں سے تابندہ تر ہیں۔ بزرگوں کے کمالات عظیم امروہوی کا ورثہ ہیں۔ انہوں نے اپنے علمی، تحقیقی اور شاعرانہ تدبر سے ثابت کر دیا ہے کہ کرن میں بھی وہی نور ہوتا ہے جو آفتاب میں ہوتا ہے۔

عظیم امروہوی نے دس برس کی عمر میں شعر موزوں کرنے شروع کر دئے تھے۔ کیوں نہ ہوتا، شاعری تو اُن کے خون میں رچی بسی تھی۔ ایسے مواقع پر کہا جاتا ہے کہ" شاعری تو فلاں کی گھٹی میں پڑی تھی لیکن ڈاکٹر عظیم امروہوی کے لئے تو یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ ان کے لئے تو گھٹی سے پہلے شاعری کا وجود تھا۔ یہاں یہ بات واضح کرنی بھی ضروری ہے کہ ڈاکٹر عظیم امروہوی علم الابدان کے ڈاکٹر نہیں ہیں بلکہ پی۔ ایچ۔ ڈی ہونے کے ناطے علم و ادب کے ڈاکٹر ہیں گویا بدن کے نہیں روحوں کے معالج ہیں۔ ذہنوں کو اُجالا دیتے ہیں جس کے لئے ان کا ایک نسخہ (prescreption) اردو مرثیہ ہے، انہوں نے روح کے علاج کے لئے جو دوائیں تجویز کی ہیں وہ اُن کے لکھے ہوئے presccreption یعنی" مرثیہ عظیم" میں درج ہیں۔ اس نسخے کا نام "حسینؑ، اور قرآن" ہے۔ اپنے نسخے میں وہ ان دواؤں کا تعارف بھی کراتے ہیں جو صرف دوائیں ہی نہیں، امرت ہیں ۔

قرآن اور حسینؑ کا اعجاز ایک ہے قرآن اور حسینؑ کا اندازہ ایک ہے
ہے فرض ہم پہ دونوں کی تعظیم دوستو
دونوں سے ایک ملتی ہے تعلیم دوستو

وہ دوسروں ہی کو تعلیم کا درس نہیں دیتے بلکہ خود بھی بہت سے تعلیمی اعزازات کے حامل ہیں انہوں نے" امام المدارس انٹر کالج امروہہ سے میٹرک پاس کیا، لکھنو یونیورسٹی سے بی۔ اے آگرہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے، جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب کامل، الہ آباد سے دبیر فاضل، اور روہیلکھنڈ یونیورسٹی سے پی، ایچ، ڈی کی سندات حاصل کیں۔ شاعری کے سلسلے میں امروہہ میں قیام کے دوران مولانا سید محمد عبادت کلیم سے، لکھنو میں قیام کے دوران عاصی لکھنوی اور فضل لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ مرثیہ نگاری میں نعیم امروہوی کی شاگردی اختیار کی۔ غزل، نظم، نعت، قصیدہ،

سلام، رباعی، منقبت، نوحے مرثیے، حتیٰ کہ دوہے، ترائلے اور ہائیکو میں طبع آزمائی کی“

(مکتوب بنام عاشور کاظمی جون ۲۰۰۲ء)

تصانیف:

(۱)	حدیث غم	شاعری	مطبوعہ	لکھنؤ	۱۹۷۴ء
(۲)	تحریک نینوا	شاعری	مطبوعہ	امروہہ	۱۹۷۵ء
(۳)	حسین اور زندگی	جدید مرثیہ	مطبوعہ	رامپور	۱۹۷۶ء
(۴)	مرثیہ عظیم	جدید مرثیہ	مطبوعہ	کراچی	۱۹۸۰ء
(۵)	مرثیہ نگاران امروہہ		مطبوعہ	کراچی	۱۹۸۴ء

مرثیہ نگاران امروہہ میں انہوں نے اٹھارویں صدی سے بیسوی صدی عیسوی تک کے شعرا کا تزکرہ کیا ہے۔ ان کی ایک اہم کتاب ”قصیدہ نگاران امروہہ“ اور ایک کتاب ”اردو صحافت میں امروہہ کا حصہ“ ہے جو ان کے تحقیقی مزاج کا ثمر ہیں۔ شرح غمؔ (شاعری) حسینیت ایک آفاقی تحریک (شاعری و نثر) بین الاقوامی محرم نمبر ’یادیں“ بھی ان کی تخلیقات ہیں۔ ایک اور اہم کتاب ”فکر عظیم“ بھی زیر طبع ہے۔

اُن کے کوائف میں درج ہے کہ انجمن سادات امروہہ کراچی (پاکستان) نے ۱۹۸۲ء میں عالمی شاعرہ بیاد مصحفیؔ جیسے موقعہ پر انہیں تمغہ پیش کیا۔ حیات اکیڈمی دہلی نے میر تقی میر ایوارڈ دیا لیکن راقم السطور کی نظر میں ان کا سب سے بڑا ایوارڈ، اُنکی استعداد مرثیہ گوئی ہے اور یہ ایوارڈ انہیں سیدۂ کونین مادر حسنؑ و حسینؑ، خاتون جنت فاطمہ زہراؑ کی طرف سے عطا ہوا ہے اور اس استعداد مرثیہ گوئی نے ڈاکٹر عظیم امروہوی سے اب تک بیس مرثیے تخلیق کرائے ہیں جن میں ایک روشن مرثیہ ”قرآن اور حسین“ بھی ہے جو ’مرثیہ عظیم‘ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس مرثیے پر جوش ملیح آبادی، سید محمد تقی۔ اکبر حیدری ایسے ناقدین نے لکھا ہے۔ سید ہاشم رضا نے عظیم امروہوی کو سعادت امروہوی کا ورثہ دار قرار دیا ہے۔ حسینؑ اور قرآن‘ یا قرآن اور حسینؑ“ کے موضوع پر پہلے بھی مرثیے۔ کہے گئے ہیں لیکن ڈاکٹر عظیم امروہوی نے اس موضوع پر عصر جدید کے تقاضوں کے تحت سوچا ہے یہی وجہ ہے کہ آفاقی مذہبی سچائیوں کے تحفظ و بقا کے ساتھ ساتھ دور حاضر کے حوالوں سے مرثیے کو سجایا ہے۔ اس کے چند بند درج ذیل ہیں تا کہ قارئین کرام بھی راقم السطور کی

طرح عظیم امروہوی کی فکر کے ساتھ ساتھ چل سکیں ؂

آدم سے درس علم جب انسان کو ملا ۱ گو یا عروج ، منزل ایمان کو ملا
جادہ نیا شعور کا عرفان کو ملا نورِ یقینؔ عالم امکان کو ملا
ظلمت جہاں جہاں بھی تھی کافور ہوگئی
کل کائنات وادیٔ پُرنور ہو گئی

دریائے آگہی کا جو دھارا ذرا بڑھا ۲ سینوں سے چل کے علم، کتابوں میں آ گیا
میداں اسے جو صفحہ قرطاس کا ملا ہونے لگا زمانے میں عرفانِ ارتقاء
نازل ہوئے بہت سے صحیفے جہان میں
لیکن جُدا جُدا ہیں زبان و بیان میں

ایلیاڈ کا دیا جسے یونان نے خطاب ۳ اتنی قدیم تیس صدی کی ہے یہ کتاب
ہے اپنے وقت کا وہ صحیفہ بھی لاجواب اس دور کی حیات میں لایا جو انقلاب
اپنی جگہ کرشن کی گیتا بھی فرد ہے
مغرب کی خاک جس کے مقابل میں گرد ہے

توریت جس کا نام ہے حق کا پیام ہے ۵ بے شک زبور کا بہت اعلیٰ مقام ہے
انجیل عیسوی بھی خدا کا کلام ہے ان میں مگر پیام ازل، ناتمام ہے
لازم یہ تھا کتاب وہ اب معتبر ملے
دامن میں جس کے خلق کو ہر خشک و تر ملے

واجب ہوا کہ اب کوئی ایسی کتاب آئے ۶ جس کی کوئی مثال نہ کوئی جواب آئے
جو اس کے راستے پہ چلے کامیاب آئے جس سے حیات پست میں اک انقلاب آئے
تب ارتقائے فکر کا عنوان آ گیا
انسان کی فلاح کو قرآن آ گیا

پارے ہیں تیس سات منازل شمار میں ۹ اور ہیں رکوع پانچ سو چالیس دیکھ لیں
کل صورتیں میں ایک سو چودہ سُوا نہیں اور چھ ہزار دوسو چھیاسی ہیں آیتیں

تشدیدیں بارہ سو جو چونتر کے ساتھ ہیں
مدآت سترہ سو اکہتر کے ساتھ ہیں

جو وحی بن کے عرش سے آئی ہے وہ کتاب ۱۷ دنیا کو جو نبی نے پڑھائی ہے وہ کتاب
جو گود میں علی نے سنائی ہے وہ کتاب ہم نے جو اہلبیت سے پائی ہے وہ کتاب
زہراؑ کے گھر کتاب کی تفسیر ہوگئی
نوکِ سناں پہ خطبۂ شبیرؑ ہو گئی

ثقلین کی حدیث سے ثابت یہ باب ہے ۲۳ ترکہ نبی کا آل ہے اور یہ کتاب ہے
لاریب جیسے قولِ رسالت مآب ہے دونوں کے دم سے دین خدا کامیاب ہے
میزانِ حق میں فعلِ بشر تولتا ہوا
خاموش ہے جو ایک، تو اک بولتا ہوا

قرآں ہے راز معنی قرآں ہیں اہلبیت ۲۵ یعنی زبانِ فخر رسولاں ہیں اہلبیت
جان عمل میں پیکر ایماں ہیں اہلبیت نکتہ شناس مرضیٔ یزداں میں اہلبیت
یہ جس مقام پر بھی ہیں قرآں سمیت ہیں
قرآن جس جگہ ہے وہاں اہل بیت ہیں

بسم اللہ ہے کتاب کا نقطہ وہ مختصر ۲۷ جو زیر' با' ہے نجم کی مانند جلوہ گر
قرآں کا ہے یہ اس کے لئے نقطہ نظر وہ اہل بیتِ یعنی علیؑ ہیں پہ کرو فر
خندق کا ہو جہاد تو ایمانِ کُل علیؑ
نقطے میں آگئے تو ہیں قرآن کل علیؑ

یہ سو گئے تو مدح میں اک آیت آگئی ۲۸ جاگے تو یہ ادا بھی مشیت کو بھاگئی
آئینۂ رضائے الٰہی دکھا گئی ان کے ہراک عمل کو نمونہ بنا گئی
قرآں بھی، یہ بھی ہادیِ کل مشرقین ہیں
حیدر ہیں یا بتولؑ، حسنؑ یا حسینؑ ہیں

انگریزی کا ایک محاورہ ہے great people think alike بڑے لوگ ایک طرح سوچتے ہیں، یہ محاورہ اس صورت حال پہ صادق آتا ہے کہ یہاں پہنچ کر ڈاکٹر عظیم امروہوی کا

مرثیہ حسان الہند دلورام کوثری کے مشہور مرثیے 'قرآن اور حسینؑ' کے مقابل سربلند نظر آتا ہے جبکہ عظیم امروہوی کا بیان ہے کہ انہوں نے جس وقت یہ مرثیہ کہا اُس وقت تک انہوں نے دلورام کوثری کا مرثیہ نہیں پڑھا تھا۔

''میں یہ بات عرض کردوں کہ میں نے تقریباً ۳۰ سال کی عمر میں یہ مرثیہ کہا تھا جو کتابی شکل میں ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ اس وقت تک دلورام کوثری کا مرثیہ میری نظر سے نہیں گزرا تھا اور نسیم امروہوی کا وہ مرثیہ بھی جو قرآن کے موضوع پر ہے اور جس کا مطلع ہے۔'' جامع آیاتِ قرآن شہادت ہے حسینؑ'' نہیں پڑھا تھا۔ کوثری سے مماثلت اتفاق ہے''۔

(مکتوب عظیم امروہوی بنام سید عاشور کاظمی جون ۲۰۰۲ء)

عظیم امروہوی کا یہ مرثیہ انیسویں بند سے یوں آگے بڑھتا ہے ۔

قرآن اور حسینؑ کا ہر کام ایک ہے
قرآن اور حسینؑ کا پیغام ایک ہے
اعجاز ایک، دونوں کا اکرام ایک ہے
آغاز ایک، دونوں کا انجام ایک ہے
دونوں کمالِ علم کے پیکر ہیں دوستو
دونوں ہی بوسہ گاہِ پیمبرؐ ہیں دوستو

۳۰
قرآن اور حسینؑ ہیں مقصود مرسلیں
قرآن اور حسینؑ ہیں اک مرکز یقیں
قرآن اور حسینؑ میں کچھ فرق ہی نہیں
قرآن اور حسینؑ ہیں دونوں ہی روح دیں
رفتار ایک، دونوں کی گفتار ایک ہے
قرآن اور حسینؑ، کا معیار ایک ہے

جبکہ دلورم کوثری کے مرثیے کا مطلع اس طرح ہے کہ ۔

۱
دونوں کا رتبہ ایک ہے دونوں جہان میں
قرآن اور حسینؑ برابر ہیں شان میں
پیہم ندا یہ غیب سے آتی ہے کان میں
کیا وصف اسکا ہو، کہ ہے لکنت زبان میں
قرآن کلام پاک ہے شبیرؑ نور ہے
دونوں جہاں میں دونوں یکساں ظہور ہے

یہاں لسان الہند دلورام کوثری اور ڈاکٹر عظیم امروھوی کا تقابل مقصود نہیں بلکہ عظمت فکر

کی یکسانیت کا بیان مقصود ہے۔ دونوں مرثیوں کے اسلوب میں نمایاں فرق بھی ہے اور وہ یہ کہ دلورام کوثری نے مرثیے کی ابتدا۔ قرآن اور حسین" میں مماثلت سے کی ہے جبکہ عظیم امروھوی نے آدم کے درس علم سے بات شروع کی ہے۔ اور بشریت کے لئے "کتاب" کی ضرورت اور اہمیت کے ذکر کے راستے عالمانہ اور مفکرانے انداز میں حسینؑ اور قرآن تک پہنچے ہیں۔ گویا اُنھوں نے پہلے جوازِ مماثلت پر بات کی ہے پھر مماثلت پر، جو بات کہنے کا منطقی طریقہ ہے۔

عظیم امروہوی بلاشبہہ جدید مرثیہ نگار ہیں۔ اُن کی مرثیہ گوئی میں جمود نہیں ہے بلکہ ارتقاء کی روشنی نمایاں ہے۔ اُن کے مراثی کے مضامین میں تنوع ہے اور اُن کی ہنرمندی ہے کہ اس تنوع میں مقصدیت کی اکائی نمایاں رہتی۔ وہ ایک طرف مضامین نو کے انبار لگاتے ہیں لیکن ان ندرتوں سے موقف کی حمایت کا کام لیتے ہیں، انجمن وظیفہ سادات و مومنین، اورنگ آباد، (مجلہ ۹۸۔۱۹۹۷) میں عظیم امروہوی کے ایک مرثیے کے چند بند شائع ہوئے ہیں۔ پیش لفظ کے طور پر، مجلّہ کے مدیر معروف حسین نقوی نے ایک مختصر نوٹ میں لکھا ہے۔

"جدید دور میں دو ایسے مرثیہ نگار ہیں جن کے کلام کو فخر کے ساتھ انیس اور دبیر کے مقابل رکھ سکتے ہیں۔ ان میں ایک نام ڈاکٹر وحید اختر ہے اور دوسرا نام بلاشبہ عظیم امروہوی کا ہے"

جمع تفریق کے اس عہد میں اگر ایک لفظ بھی اس قول میں جمع نہیں کیا جاسکتا تو تفریق کیلئے بھی دلیل نہیں ملتی۔ جس مرثیے کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے۔ وہ "سفر" کے احوال کا مرثیہ ہے لیکن نقطۂ عروج (CLIMAX) فکر کی وہی اکائی ہے جو عظیم امروہوی کی پہچان ہے ۔

از روز ازل، ہستیٔ انساں ہے سفر میں ۔۔۔ خورشید سفر میں مہِ تاباں سے سفر میں
یہ ارض و سما، سیم بداماں ہے سفر میں ۔۔۔ القصہ یہ کل عالم امکاں ہے سفر میں
رُکتا ہے اگر ایک بھی، تھرائے گی دنیا
سب درہم و برہم وہیں ہوجائے گی دنیا

جینے کے لئے نقل مکانی ہے ضروری ۔۔۔ یہ گردش افلاک و زمانی ہے ضروری
ذی روح کو جس طرح سے پانی ہے ضروری ۔۔۔ پانی کو بھی ویسے ہی روانی ہے ضروری
کوئی نہ یہاں پر کسی عنوان ہے زندہ
جب خون سفر میں ہے تو انسان ہے زندہ

اس مرثیے کے نقطۂ عروج کی طرف سفر میں عظیم امروھوی نے جن مسافروں کا ذکر کیا ہے، جس قافلے کو عنوان بنایا ہے۔ اس کا بھر پور تعارف کرایا ہے۔

ہر چھوٹا بڑا صاحب کردار ہے یکساں منزل کے لئے جذبۂ بیدار ہے یکساں
کردار کی تلوار کا معیار ہے یکساں حورانِ شہادت کا طلبگار ہے یکساں
اب زیست سے منہ موڑ کے نکلے ہیں مسافر
اس طرح سے گھر چھوڑ کے نکلے ہیں مسافر

یہ لوگ تو اللہ کی مرضی میں ڈھلے ہیں اسلام کی آغوش میں پھولے ہیں، پھلے ہیں
شمشیروں کے مشتاق بھی ان سب کے گلے ہیں یہ جینے کے انداز سے مرنے کو چلے ہیں
بخشندۂ و تابندۂ و پائندہ رہیں گے
یہ مر کے بھی تا حشر یونہی زندہ رہیں گے

عظیم امروہوی کی معروف ترین کتاب "مرثیہ نگاران امروہہ" ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی تھی، ۱۹۸۴ء سے ۲۰۰۰ء تک اپنی تخلیقی، معاشی اور فکری مصروفیات کے باوجود اُنہوں نے مزید نو(۹) موضوعاتی مرثیے کہے ہیں جو اس امر کی دلیل ہیں کہ اُنہوں نے مرثیہ گوئی کو زندگی کے لائحہ عمل میں اولیت priority دی ہے۔ اُن کے تازہ تر مرثیوں کے عنوان حسب ذیل ہیں۔

(۱) حسینؑ اور امن" (۲) "حسینؑ اور صبر" (۳) قافلۂ حق
(۴) ہوا اور چراغ (۵) فاتح نفس (۶) ماں اور کربلا کی مائیں
(۷) حدیث دل (۸) فسادات اور اسلام (۹) عظمتِ علم

یہ سارے عنوانات اور ان عنوانات کے تحت مراثی فکر حسینی اور عصر حاضر کے تقاضوں سے متعلق ہیں جو ڈاکٹر عظیم امروہوی کو جدید مرثیہ نگار ثابت کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی مختصر تحریر میں عظیم امروہوی کی مرثیہ گوئی کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر موت وحیات پر قادر معبود نے مہلت حیات عطا کی تو جی چاہتا ہے کہ عظیم امروہوی پر ایک کتاب لکھی جائے فی الحال تو اس گذارش کے ساتھ گفتگو ختم کر رہا ہوں کہ عظیم امروہوی بحیثیت مرثیہ نگار۔ ماضی سے مسلسل، حال کے عکاس اور مستقبل کی اُمید ہیں۔

☆☆☆☆☆

خلّاق حیدر ندیم :- (امروہہ)

ولادت ۱۴ر مئی ۱۹۴۷ء

نام، سید خلّاق حیدر۔ تخلص، ندیمؔ۔ وطن، امروہہ۔ ندیمؔ کے والد گرامی کا نام طاہر حسن اور تخلص علیؔ تھا۔ وہ فرزدقِ ہند حضرت شمیم امروہوی کے نواسے اور مدینہ خاتون مدینہؔ کے فرزند تھے۔ گویا خلّاق حیدر ندیم کی دادی مدینہ خاتون مدینہؔ، والد گرامی سید سید طاہر حسن علیؔ اور پڑنانا شمیمؔ امروہوی تھے۔ پھر سونے پر سہاگہ کہ اُستاد کی حیثیت میں سید محمد عبادت کلیمؔ امروہوی ملے جنہوں نے اس ہیرے کو تراشا اور ندیمؔ بنا دیا۔ ندیمؔ نے اپنے سلسلۂ تلمذ پر فخر کیا ہے۔

فیض ہے یہ سب حکیمِ خوش بیاں کا اے ندیمؔ
پا رہا ہوں آج جو دادِ سخن اچھی طرح

تعلیمی میدان میں ندیمؔ نے امام المدارس انٹر کالج امروہہ سے ہائی اسکول پاس کیا۔ نو (۹) برس کی عمر میں والد گرامی کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ساتھ ہی ساتھ زمینداری کا خاتمہ ہو گیا اور ایک اعلیٰ نسب خاندان گردش نصیب ہو گیا۔ ہمت مرداں مدد خدا۔ ندیمؔ نے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کیا اور دارالعلوم سید المدارس میں مدرس ہو گئے۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ تعلیم جاری رکھی۔ منشی، منشی کامل، مولوی اور ایف، اے کے امتحانات پاس کئے۔

شاعری ندیمؔ کا ورثہ تھی۔ والدہ گرامی کی طرف سے حضرت شمیمؔ امروہوی کی وراثت ملی۔ والد کی طرف سے خود والد اور دادی مدینہ خاتون مدینہؔ کا ورثہ ملا تھا۔ بزرگوں نے ایک محاورہ ترتیب دیا تھا کہ 'خون بولتا ہے'۔ جن لوگوں نے ندیمؔ کو اوائل عمری میں سخنوری کرتے سنا ہے وہ اس کے قائل ہیں کہ ''خون بولتا ہے''۔ ندیم کی شاعری کو نکھارنے میں ان کے باکمال استاد حضرت کلیمؔ امروہوی کا عمل دخل ہے لیکن عہد نو کے تقاضوں کو ان کی شاعری میں سمونے کا ڈھنگ اور جدید رجحانات سے اقتباس کا سلیقہ حضرت کلیمؔ امروہوی کے فرزند ڈاکٹر شفاعت فہیمؔ اور عظیمؔ امروہوی کی مشاورت سے ملا ہے۔ خلّاق حیدر ندیمؔ کو مرثیے کی طرف عظیمؔ امروہوی ہی لائے ہیں۔

ندیم کے پہلے مرثیے کا موضوع ''انقلاب'' تھا۔ اس مرثیے میں وجود باری تعالیٰ سے مرثیے کی ابتدا کی گئی ہے اور 'انقلاب' کو ارارتقاء کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔

اللہ کے وجود کا مظہر ہے انقلاب جن و ملک کے سجدے میں مضمر ہے انقلاب

تخلیقِ کائنات کا مصدر ہے انقلاب کون و مکاں کا اصل میں جوہر ہے انقلاب
ہوتا نہ یہ تو کچھ بھی نہ ہوتا جہان میں
بجز اس کے کچھ نہیں ہے زمان و مکان میں

جوشؔ ملیح آبادی نے اس موضوع پر مرثیہ کہا تو شاعر کو شاعر انقلاب مان لئے گئے، انقلاب کے موضوع پر جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیے کے بعد کسی (کم عمر بمقابلۂ جوشؔ) شاعر کا اس موضوع پر طبع آزمائی کی جسارت کرنا ہی اس شاعر کی خود اعتمادی کا مظہر ہے۔ خلاق حیدر ندیمؔ نے اس موضوع پر امام حسینؑ کو انقلاب عظیم کا قائد اور بانی تسلیم کیا ہے ۔

شبیرؑ انقلابِ جہاں ساز دے گیا انسانیت کے نطق کو آواز دے گیا
ذہنِ بشر کو قوتِ پرواز دے گیا جاں دیکے گویا جینے کا انداز دے گیا
ہر ہر نفس تھا اس کا عبادت کے واسطے
وہ جی رہا تھا حق کی شہادت کے واسطے

وہ انقلابِ حق کا نگہباں کہیں جسے وہ انقلابِ جادۂ عرفاں کہیں جسے
وہ انقلاب زیست کا عنواں کہیں جسے وہ انقلابِ حاصل قرآں کہیں جسے
وہ انقلابِ جہل کی گردن پہ وار ہے
وہ انقلاب آیتِ پروردگار ہے

جسکی رگوں میں خوں کی روانی وہ انقلاب پیری کو بخشے عزم جوانی وہ انقلاب
اللہ و مصطفٰی کی نشانی وہ انقلاب باطل کا خون جس سے ہو پانی وہ انقلاب
وہ انقلاب دیں کا جسے ارتقا کہیں
وہ انقلاب لوگ جسے کربلا کہیں

شبیرؑ، روحِ دانش و عرفاں کا نام ہے شبیرؑ، گویا صورتِ قرآں کا نام ہے
شبیرؑ، دین و کفر کے فرقاں کا نام ہے شبیرؑ، عزمِ فخرِ رسولاں کا نام ہے
شبیرؑ، کربلا کے مجاہد کا نام ہے
شبیرؑ، دینِ حق کے قوائد کا نام ہے

خلاّق حیدر ندیم کی نظر عصر حاضر پر بھی ہے، وہ مرثیے میں اپنے عہد کے مسائل کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ یہی فکر اور یہی اسلوب جدید مرثیے کے سفر کی علامت ہے۔

چھایا ہوا ہے ذہنوں پہ شیطان آج بھی — انسان کا خوں بہاتا ہے انسان آج بھی
رائج ہے کفر و شرک کا فرمان آج بھی — ہے گرد میں اٹا ہوا قرآن آج بھی
فرعونیت زمانے پہ پھر چھا رہی ہے آج
تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے آج

یہ جو ندیم نے" تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے آج" کہا ہے یہ اکہری سوچ کی بات نہیں ہے بلکہ اس حقیقت کے رُخ سے پردہ اُٹھانے کی بات ہے کہ شاعر کی نظر حسینؑ و یزید، موسیٰ و فرعون، اور حق و باطل کی تاریخ پر بھی ہے۔ اس لئے شاعر کو ادراک ہے کہ۔

حق ہے برائے نام جہالت کا ہے ظہور — مالِ حرام پر ہے ہر اک فرد کو غرور
لب پر نبیؐ کا نام، نبیؐ کے چلن سے دُور — اندھا ہوا ہے پھر سے مساوات کا شعور
ظالم کے ہاتھ میں ابھی تلوار ہے وہی
اس دور میں بھی ظلم کی رفتار ہے وہی

ندیم کا سفر ابھی جاری ہے۔ اُن کی ابتدا، اُن کی انتہا کی نشاندہی کر رہی ہے، اور یہ نشاندہی بہت خوش آئند ہے۔

☆☆☆☆☆

حسن عابدی:۔ (حیدرآباد)

تاریخ پیدائش ۵ رجون ۱۹۴۷ء

نام۔ سید ابوالحسن عابدی۔ تخلص حسنؔ۔ وطن مالوف۔ نوگانواں سادات ضلع مراد آباد (یوپی)۔ والد کا اسم گرامی، سید تقی حسین عابدی۔ تعلیم، بی کام (عثمانیہ)۔ پیشہ ملازمت سرکار ہند (حکومت کی ٹکسال (Govt. Mint) میں ڈپٹی بُلین آفیسر ہیں۔ آغاز شاعری ۱۹۶۷ء۔ علامہ نجم آفندی۔ عادل نجمی، اور عازم رضوی سے علی الترتیب سلسلۂ تلمذ وابستہ رہا۔ اب الحمدللہ نہ صرف مکتفی ہیں بلکہ کئی نوجوان شعراء اُن کے حلقہ ارادات و تلمذ میں شامل ہیں۔ "آمد" کے شاعر ہیں۔ ہر صنفِ سخن میں شاعری کرتے ہیں لیکن رثائی ادب اور رثائی شاعری کو عبادت کا حصہ سمجھتے ہیں اور

زیادہ وقت رثائی شاعری پر صرف کرتے ہیں۔

تصانیف

(۱) ماتم حسینؑ: مجموعہ نوحہ جات، طبع اوّل ۱۹۸۷ء (اب تک ترمیم واضافے کے ساتھ اس کتاب کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں)

(۲) زبان مودّت: ''منقبت وقصائد۔ قطعات ورباعیات۔ (۱۹۹۷ء)

(۳) ''ذبحِ عظیم'' پہلا طویل مرثیہ دراحوال علی اکبرؑ ۱۹۹۸ء اور ۱۸ سلام)

(۴) ''دریائے عطش'' مجموعہ مراثی (۲۰۰۱ء)

حسنؔ عابدی۔ ''خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ'' کی زندہ و تابندہ مثال ہیں۔ وہ گروہ حسینی حیدر آباد کے رکن، مرثیہ گو شاعر اور مرثیہ خواں ہیں۔ اُنہوں نے پہلا مرثیہ ''ذبحِ عظیم'' ۱۹۹۸ء میں کہا جو اسی سال بارگاہ شیرز حیدر آباد کی سالانہ مجالس میں پڑھا اور اسی سال شائع ہوا۔ اس وقت سے تادم تحریر ہر سال نو تصنیف مرثیہ پیش کرتے ہیں۔ حسن عابدی نے اپنے تعارف کے سلسلے میں لکھا ہے۔

''مقصد زندگی عزاداری امام مظلوم اور انتظارِ امام عصرؑ''۔

آفرینِ اس مقصد حیات پر۔ سلام ہو اُن لوگوں پر جو عزائے حسینؑ کو مقصدِ زندگی بنا کر جی رہے ہیں کہ وہی لوگ حقیقت میں اجرِ رسالت ادا کر رہے ہیں۔ حسنؔ عابدی آمد کے شاعر ہیں آورد کے نہیں۔ شعر کہتے بھی ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تپتے صحرا پر موسلا دھار بارش ہو رہی ہو۔ میں نے پہلے بھی ایک سے زیادہ مرتبہ لکھا ہے کہ حمد۔ نعت۔ سلام۔ منقبت اور بالخصوص مرثیہ اس وقت تک نہیں لکھا جا سکتا جب تک عطائے خاص نہ ہو۔ تائید ایزدی نہ ہو۔ حسن عابدی جس بے ساختہ پن سے شعر کہتے ہیں وہ عطائے خاص پر دلالت کرتے ہیں۔ وہ واقعات وروایات کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں مرثیے کی طوالت واختصار کو اہمیت نہیں دیتے۔ مرثیے میں فکری پہلو پر توجہ دیتے ہیں۔ مرثیے کی تشبیب کے لئے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں۔ لوازم مرثیہ کی پاسداری کرتے ہیں لہٰذا مصاحب کے حصے میں 'بین' کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔

نمونہ کلام: مرثیہ کا موضوع ''امتحان''

موضوع میرے مرثیے کا امتحان ہے ا عنوان زندگی کا یہی ترجمان ہے

انسان کہہ رہا ہے عمل کی یہ جان ہے ناکام اس میں میں کوئی، کوئی کامران ہے
انجام امتحاں یہ ہے تعمیر زندگی
خیرِ عمل ہے حاصل تدبیر زندگی

وسعت میں کائنات معانی ہے امتحاں ۳ فکر و نظر کے حق میں جوانی ہے امتحاں
دریائے تشنگی کی روانی ہے امتحاں کرب و بلا کی راہ میں پانی ہے امتحاں
جو امتحاں کی منزلوں میں کامیاب ہے
اس کے لئے سجی ہوئی راہِ ثواب ہے

آوازِ کن سے پھوٹا ہے چشمہ حیات کا ۶ یہ مختصر فسانہ ہے کل کائنات کا
بجتا رہے گا ساز حیات و ممات کا اور امتحاں دکھائے گا رستہ نجات کا
سب کو ضمیر و ظرف کا لیتا ہے امتحاں
ہر اہل عقل و ہوش کو دیتا ہے امتحاں

ابلیس امتحان میں ناکام ہوگیا ۹ بولا خلاف حق تو بد انجام ہوگیا
نقص عمل سے خارج اسلام ہوگیا مشہور کائنات یہ پیغام ہوگیا
نازک سا فرقِ ناری و نوری ہے دوستو
نورِ خدا کو سجدہ ضروری ہے دوستو

نورِ خدا کی مدح و ثنا بھی ہے امتحان اس طرح فکر نقطۂ ''با'' کا کرے بیاں
جس بات میں رسولوں کے عاجز ہوئی زباں مولائے کائنات کہاں، اور ہم کہاں
مدح علی ہے نطق پیمبر کے واسطے
مخصوص ہے یہ خالق اکبر کے واسطے

ہے سخت مدح حیدر صفدر کا امتحاں راہِ ثنا میں ہے یہ ثناگر کا امتحاں
کیا شے ہے لطف رحمت حیدر کا امتحاں میثم سے پوچھو کیا ہے سخنور کا امتحاں
یہ ہے پلِ صراط کہ تلوار کی ہے دھار
ہر سمت یاں سجے ہوئے ہیں تختہ ہائے دار

درپیش ہے مجھے بھی مودت کا امتحان ہو آشکار حُسنِ عقیدت کا امتحاں

لے شوق سے تو جذبہ مدحت کا امتحاں　　　ساقی پلا کہ دینا ہے الفت کا امتحاں
لفظوں کو میرے موتیوں میں آج تول دے
ساغر میں میرے لہجۂ قرآن گھول دے

تشبیب کا رُخ ساقی نامے کی طرف ہوتا ہے، اس کے بعد رسولوں کے امتحان کا ذکر نام بہ نام۔ خلیل اللہ کا امتحان جو ذبح عظیم سے بدل دیا گیا اور پھر ذبح عظیم بشمول شہادتِ شہزادہ علی اکبر۔　　　(مرثیہ ذبحِ عظیم۔ درحال علی اکبر)

مولا علی کے پیش نظر تھی جو کربلا　　　دست دعا اُٹھا کے یہ معبود سے کہا
یارب مجھے اک ایسا تُو فرزند کر عطا　　　ہر لحہ سامنے ہے نیابت کا سلسلہ
کرب و بلا میں میری نیابت جو کر سکے
میری طرح حسینؑ کی نصرت جو کر سکے

نُصرت کا آسمان پکارا، قمر قمر　　　ظاہر ہوئی علیؑ کی تمنا، نگر نگر
عطر وفا کی خوشبو سے مہکی ڈگر ڈگر　　　بولی دعا یقین سے ہے یہ اثر اثر
انگڑائی لیکے روح وفا جھومنے لگی
عباسؑ نامور کے قدم چومنے لگی

عباس کربلا کی وجاہت کا نام ہے　　　بیداریوں کے عرش کی زینت کا نام ہے
پرچم کشائے ضبط و شجاعت کا نام ہے　　　عباس تشنگی کی علامت کا نام ہے
صاحب روایتوں کے مطالب کا نام ہے
عباس دوسرے ابو طالب کا نام ہے

(مرثیہ درحال حضرت عباس۔ کتاب دریائے عطش)

نمونہ کلام:　　　"بین"

جب اصغر بے شیر کی گردن پہ لگا تیر　　　فرمانے لگے پیٹ کے سر حضرت شبیرؑ
اصغر بھی یہیں چھوڑ چلے ہائے ری تقدیر　　　رقت کے سبب ہوگئی آواز گلو گیر
حسرت سے رُخ اصغرِ بے شیر کو دیکھا
گردن کو کبھی اور کبھی تیر کو دیکھا

اللہ نہ دکھلائے کسی کو بھی یہ منظر غربت یہ نبی زادے کی ہنستے تھے ستم گر
شہ کہتے تھے یہ لاشہ بے شیر سے رو کر جا کر تیری مادر سے کہوں کیا علی اصغر
کن آنکھوں سے مجروح گلا دیکھے گی بیٹا
مر جائے گی لاشہ جو تیرا دیکھے گی بیٹا

آئے عقب خیمہ یہ کہتے ہوئے شبیر آواز دی روتے ہوئے اے بانوئے دلگیر
پانی نہ دیا ظالموں نے مار دیا تیر ملنے کے لئے آئے ہیں میدان سے بے شیر
لپٹا کے کلیجے سے انہیں پیار تو کر لو
ششماہے کا اب آخری دیدار تو کر لو

قدیم مرثیے کے لوازم کی پاسداری میں مصائب اور بین کا طویل ہونا لازمی ہے۔اس مرثیے میں بین کے ۱۴ بند ہیں جن میں صبر کی منزلِ کمال پر فائز امام حسینؑ، بشری جذبوں کے تحت بین کرتے نظر آتے ہیں۔ (مرثیہ در احوال علی اصغر۔کتاب دریائے عطش)

☆☆☆☆☆

میر نظیر باقری:- (اکرونہ سادات)

تاریخ پیدائش، ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۸ء

نام۔سید نظیر عباس باقری۔تخلص۔نظیر۔قلمی نام میر نظیر باقری۔جائے ولادت، اکرونہ سادات، تحصیل سنبھل، مرادآباد۔(یوپی)

تعلیم: ایم۔اے عمرانیات۔ اپنی تعلیم کے متعلق نظیر باقری لکھتے ہیں:

"میری ابتدائی تعلیم گھر کے بعد نینی تال، پھر سنبھل، اور کچھ دن شہر مصحفی یعنی امروہہ میں۔اس کے بعد سب کچھ لکھنؤ میں حاصل کیا۔ میں لکھنؤ کو اپنا تعلیمی وطن کہتا ہوں" (مکتوب بنام سید عاشور کاظمی)

ذریعہ معاش: کاشت کاری، کچھ دنوں بمبئی کے ایک غیر سرکاری ادارے میں بحیثیت منیجر کام کیا لیکن مٹی کی خوشبو سے دُوری برداشت نہ ہوئی اور وطن آکر کاشتکاری سنبھال لی، اپنے ذریعہ معاش کی بابت وہ لکھتے ہیں۔

"میرا مستقل ذریعہ معاش اجداد کی چھوڑی ہوئی وہ خاک

ہے جس نے انہیں زمیندار بنایا اور سرکار نے اسے ضبط کر کے ہمیں کاشتکار
بنا دیا۔ خوشی اس بات کی ہے کہ علم کی جو دولت اجداد سے ورثے میں ملی
اُسے ضبط نہ ہونے دیا۔ تقریباً چار صدیوں پرانا اجداد کا علمی ورثہ کتابیں،
ہمارے پاس تبرک کی طرح آج بھی موجود ہیں۔"

(مکتوب بنام عاشور کاظمی)

نظیر باقری نے شاعری کا آغاز بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں کیا۔ پہلا کلام ایک نوحہ تھا۔ عام طور پر شعراء کرام غزل سے منقبت، سلام، اور مرثیے کی طرف آتے ہیں لیکن نظیر باقری نے شعری سفر کا آغاز کربلا سے کیا، اس کے بعد نعت، منقبت، سلام، نوحے، مرثیے کہے اور غزلیں بھی کہی مگر غزل کو اوّلیت نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف میں اُن کی غزلیات کا مجموعہ چھٹے نمبر پر ہے۔ اُن کی تصانیف کا سلسلہ یہ ہے۔

(۱)	"جلتی"	مرثیہ	مطبوعہ	۱۹۸۴ء
(۲)	"پیاسے دریا"	مناقب وسلام	مطبوعہ	۱۹۸۶ء
(۳)	"وقت کائنات"	مرثیہ	مطبوعہ	۱۹۸۶ء
(۴)	"فرازِ صبر"	نعت، قصائد اور مسدس،	مطبوعہ	۱۹۸۸ء
(۵)	"سوگوار"	نوحے	مطبوعہ	۱۹۹۱ء
(۶)	"اعتماد"	مجموعہ غزلیات	مطبوعہ	۱۹۹۷ء

شاعری میں میر نظیر باقری نے حضرت انور نواب انور لکھنوی سے سلسلۂ تلمذ وابستہ کیا، غزلیات میں بھی میر نظیر باقری نے زلف و رُخ کے افسانے نہیں تراشے بلکہ میر تقی میر کو رہنما مان کر غزل میں مقصدیت کو برقرار رکھا ہے اور اشارات واستعارات کے ذریعے اس نصب العین کو اُجاگر کیا جس سے اُن کی ابتدا ہوئی تھی۔

صدائے تشنہ لبی جس زمیں سے اُبھری تھی　　سدا بہار اسی میں شجر نکل آئے
نظر میں جتنے اُجالے ہیں سب یقین کے ہیں　　یہ چاند تارے فلک کے نہیں زمین کے ہیں
وہ زیرِ تیغ ہوں، تیروں میں ہوں کہ زنداں میں　　جہاں جہاں بھی ہیں سجدے اسی حسین کے ہیں

باقری کی غزل میں صرف کربلا کا استعارہ ہی نہیں تاریخ کے حوالے بھی ہیں۔

جو پہاڑی پہ کھڑا تھا وہ شجر ڈوب گیا   باپ کی بات نہ مانی تو پسر ڈوب گیا

اس سے پہلے حضرتِ نوحؑ، طوفانِ نوح اور ان کے نافرمان بیٹے کے واقعہ کا ایسا حوالہ نظر سے نہیں گزرا۔ اس طرح ایک اور تاریخی حوالہ ملاحظہ کیجئے جس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ اپنے قاتل کو خواب سے بیدار کرنے والا ایک ہی مرد، تاریخ میں گذرا ہے۔ جس کا نام نامی علیؑ مرتضیٰ تھا۔

جو اپنے قتل سے پہلے جگائے قاتل کو   بھرے جہان میں ایسا بھی کوئی مرد ملے

یا ایک اور خوبصورت شعر

ہمیں کسی کو بچانا تھا ایک شب سو کر   تمام عمر یہی سوچ کر تو جاگے تھے

غزل کی وضاحت اور تشریح نظیر باقری نے ایک غزل میں بھی کی ہے جو شاعر کے شفاف فکر کی آئنہ دار ہے۔

اس کے قدموں پہ قدم رکھ کے چلی ہیں غزلیں   میرؔ کی فکر کے ٹکڑوں پہ پلی ہیں غزلیں
تھیں عرب میں تو یہ جاہل بھی تھیں، گمراہ بھی تھیں   ہاں مگر ہند میں آئیں تو دلی ہیں غزلیں
نازکی پنکھڑی ایسی لبِ الفاظ میں ہے   کتنے لبھوں کے گلابوں کی کلی ہیں غزلیں
اس کی بوئی ہوئی فصلیں ہی سدا کٹتی ہیں   ارضِ اردو پہ جو یہ پھولی پھلی ہیں غزلیں
ہم ازل ہی رہے معتقدِ میرؔ نظیرؔ   اس وسیلے سے ہماری ازلی ہیں غزلیں

عقیدت ومحبت کی دنیا میں نظیر باقری کا ایک لافانی کام خطبۂ غدیر کا منظوم ترجمہ ہے۔ خطبۂ غدیر وہ امرِ ربانی جس کے ارشاد سے پہلے کارِ رسالت نامکمل قرار دیا گیا اور جس کے اعلان کے بعد تکمیل دیں کی سند ملی۔ جو دین آدمؑ سے شروع ہوا اور خاتمؐ پہ مکمل ہوا اُس کی تکمیل کا آخری خطبۂ غدیر تھا۔ اس اہم خطبے کو نظم کر کے نظیر باقری نے شاعری کے سارے مدارج عبور کر لئے، ساری منزلیں طے کر لیں۔

اُن کا پہلا مرثیہ ''ہنسی'' ایک ایسا مرثیہ ہے جسے سن کر یا پڑھ کر بھلایا نہیں جا سکتا۔ اس مرثیے کا تعارف نظیر باقری نے ان چار مصرعوں میں کر دیا ہے۔

خالی جھولے سے آتی ہوئی ہر صدا   زندگی کا عجب سلسلہ بن گئی
اے میرے بے زباں تیرے لب پر ہنسی   سوچتے سوچتے مرثیہ بن گئی

یہ مرثیہ امام حسینؑ کے ششماہے شیر خوار علی اصغرؑ کے احوال پر ہے۔

ہنسی لبوں کے لئے اک حسین زیور ہے ۷ کہیں یہ پھول سے نازک کہیں یہ پتھر ہے
کہیں پہ طنز کا چلتا ہوا یہ خنجر ہے یہ زندگی کا عجب دلفریب منظر ہے
جو مسکراتے ہوئے لب دکھائی دیتے ہیں
وہی حیات کا مطلب دکھائی دیتے ہیں

سکون دل کی بظاہر تو ترجماں ہے ہنسی ۸ مگر نگاہ حقیقت ہیں داستان ہے ہنسی
کہیں یہ صبر و تحمل کا امتحاں ہے ہنسی کسی کے دل کا سلگتا ہوا دھواں ہے ہنسی
جو دشمنوں کے مقابل ہنسے دلیر ہے وہ
خدا گواہ کہ بچہ نہیں ہے شیر ہے وہ

نہیں ہے کوئی جو اس طرح مسکرایا ہو ۹ جہاں سے جس نے ہر اک ظلم کو مٹایا ہو
ان آندھیوں کے مقابل دیا جلایا ہو خدا کے نام کو ہر حال میں بچایا ہو
بغور دیکھو جو ایسا کوئی گل تر ہے
وہ کائنات کا تنہا دلیر اصغر ہے

ہر اک رفیق کا سرتن سے جب جدا دیکھا ۱۵ نبی کے دین کو الجھن میں جتلا دیکھا
جہاں میں کفر پسندوں کا سر اُٹھا دیکھا مدد کے واسطے کوئی نہ دوسرا دیکھا
کیا حسینؑ سے اصغر نے، مجھ کو لے کے چلو
تم اپنی جیت کا اعلان رَن میں کرتے چلو

لبوں کو خشک جو دیکھا تو بے کسی نے کہا ۱۶ کبھی حسینؑ کی ناچار زندگی نے کہا
تمام جلتے چراغوں کی روشنی نے کہا لبِ فرات یہ اصغر سے تشنگی نے کہا
تیرے لبوں پہ تو کوثر مچل کے برسے گا
یزید پانی کی اک بوند کو بھی ترسے گا

صغیر بولا کہ مقتل میں مجھ کو جانے دو ۱۷ یزیدیت کے ارادوں کو سر اٹھانے دو
شہید ہونے کا میرے بھی وقت آنے دو کہ حرملا کو ذرا تیر تو چلانے دو
ہنسی کے لفظ کو غم کی کتاب کردوں گا
میں بچپنے کو علیؑ کا شباب کردوں گا

چلا ہے جنگ میں اصغر بھی تیر کھانے کو　　لہو سے قصرِ حسینی کے جگمگانے کو
ہنسی کی آگ سے بیعت کا گھر جلانے کو　　یہ بات یاد رہے گی سدا زمانے کو

ذرا سے بچے نے حق کی بقا کو جیت لیا
ہنسی سے معرکۂ کربلا کو جیت لیا

اس کے بعد یہ مرثیہ مقاتل کی روایات کے مطابق آگے بڑھتا ہے اور حضرت علی اصغر کی شہادت تک پہنچتا ہے۔نظیر باقری کا دوسرا مرثیہ دستِ کائنات ہے۔ابتدا جسد انسانی میں ہاتھ کی اہمیت سے ہوتی ہے، اور بات عباس علمدار کے بریدہ ہاتھوں تک پہنچتی ہے اور مرثیے کا اختتام شہادت عباسؑ پر ہوتا ہے۔

ہاتھوں کی داستان بتا اے بدن مجھے　۱　جتنے بھی ہیں نشان بتا اے بدن مجھے
ہو باخبر جہان ، بتا اے بدن مجھے　　سب اپنے امتحان بتا اے بدن مجھے

کچھ تو بیاں کرے تو کوئی سلسلہ چلے
ہاتھوں نے کیا کیا ہے یہ کچھ تو پتہ چلے

بیساختہ یہ سُن کے پکارے بدن کے ہاتھ　۲　مشہور ہے ہماری بدولت بشر کی ذات
معلوم ہے جہاں کو ہماری ہر ایک بات　　ہم نے دیئے جلائے تو روشن ہوئی ہے رات

تاریخ کائنات کا یہ راز فاش ہے
وہ جسم جس میں ہاتھ نہیں ایک لاش ہے

دنیا میں ہر دلیر کی پہچان ہیں یہ ہاتھ　۳　اُٹھ کر جو رک نہ پائے وہ طوفان ہیں یہ ہاتھ
رکھے جو سر بلند وہی جان ہیں یہ ہاتھ　　تاریخ انقلاب کا سامان ہیں یہ ہاتھ

ظالم جو حکمران تھے ناپید ہوگئے
ہاتھوں کے زد پہ آئے تو ناپید ہوگئے

اس مرثیے میں ایک بندے دوسرے بندے کا ربط اتنا مستحکم ہے کہ تدوین نہیں کی جاسکتی لہٰذا یہ کہہ کر بات کو اختصار کی منزل سے گزارا جارہا ہے کہ اس مرثیے میں اہل جفا کے ہاتھ، اہل وفا کے ہاتھ، محنت کشوں کے ہاتھ، مجرموں کے ہاتھ، فرعون کے ہاتھ، موسیٰ کے ہاتھ، حتیٰ کہ سیدہ زہرا کے ہاتھوں تک بات پہنچتی ہے۔

اس ماں کے ہاتھ جسنے چلائی ہوں چکیاں   فاقے میں جس نے بخشی فقیروں کو روٹیاں
جنت کہا ہے جس نے قدم کی زمین کو   طاقت ااسی کے ہاتھوں نے بخشی ہے دین کو

ہاتھ کا تذکرہ بنتِ رسول سے آگے بڑھا اور عباس تک پہنچا تو کٹے ہوئے ہاتھوں کے اثر تک بات پہنچی ۔

غیض وغضب کہیں تو کہیں پیار ہیں یہ ہاتھ   مقصد سے ہار جائیں تو بیکار ہیں یہ ہاتھ
بے تیغ لڑنے والوں کا کردار ہیں یہ ہاتھ   انکار کر دیا ہے تو انکار ہیں یہ ہاتھ
یہ ہاتھ قطع ہوکے بھی تختے اُلٹ گئے
بیعت کے طالبوں کے گلے آپ کٹ گئے

یہ جس کے ہاتھ تھے وہ انوکھا دلیر تھا ۳۱ غازی تھا اور شیر خدا کا وہ شیر تھا
پیاسا بھی وہ جو جام شہادت سے سیر تھا   ایسا زبَر کہ نام میں جسکے نہ زیر تھا
ہاتھوں میں جس کے اب بھی وفا کا نظام ہے
اس کربلا کے شیر کا عباسؑ نام ہے

اس کے بعد ۵۲ بند اور ہیں جن میں حضرت عباس کی شہادت کا احوال ہے۔

نظیؔر باقری نے غزل میں میر تقی میؔر کے سامنے سر جھکایا ہے اور مرثیے میں میر انیس کی تقلید کو اپنا شرف سمجھتے ہیں۔

ہم تو تقلید کر سکتے ہیں اُن کی اے نظیر
حق تو یہ ہے مرثیہ گوئی تو حق ہے میؔر کا

اور یہاں میؔر سے مراد میر انیس ہیں۔ ''ہلسی'' اور دست کائنات'' کے علاوہ نظیؔر باقری کے مزید تین مرثیے ''حسن'' ''چادر'' اور ''اسیر کربلا'' شائع ہو چکے ہیں۔، قصائد ومنقبت کے دو مجموعے'' زنجیرِ نور'' ۲۰۰۲ء اور'' نجوم دست'' ۲۰۰۳ء حال ہی میں سامنے آئے ہیں۔'' اور ان کا سفر ابھی جاری ہے۔ اللہ انہیں عمر خضر عطا کرے کہ وہ اسی طرح تولاّ کے چراغ روشن کرتے رہیں۔

☆☆☆☆☆

رضاؔ سرسوی:-　　(سرسی)

ولادت ۱۹۵۰ء (کے لگ بھگ)

نام سید نوشہ رضا، تخلص، رضاؔ۔ وطن سرسی ضلع مراد آباد۔ یو پی بھارت۔ والد کا اسم گرامی، سید رئیس الحسن (مرحوم)۔ سن ولادت نہیں لکھا۔ آغاز شاعری ۱۹۷۷ء میں ہوا جسکی مناسبت سے سنہ ولادت ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ درج کیا گیا۔ تعلیم، ہائی سکول سرسی تک۔ باقی تعلیم درس گاہِ مجالسِ حسینؑ سے حاصل کی۔ شاعری میں مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ افسانے بھی لکھے لیکن بیقرار روح اور طبع رواں کو منقبت، سلام، قصیدہ اور مرثیہ میں سکون و قرار ملا۔

تصانیف: (۱) ''ماں'' مناقب، سلام، نوحے مطبوعے ۲۰۰۱ء

(۲) ''مادر مہربان'' (فاطمہ بنت اسد) مطبوعہ ۲۰۰۱ء۔ مادر مہربان'' کا سرنامہ رضا سرسوی کا ایک شعر ہے ۔ بازوؤں میں حیدرو جعفر کے جس کا خون ہے

فاطمہ بنتِ اسد وہ شیر دل خاتون ہے

یہ کتاب حمد۔ نعت، منقبت، مناجات اور قصائد سے مزین ہے۔ دونوں کتابیں سلونی پبلی کیشن، دہلی نے شائع کی ہیں۔ ان کی مزید دو تصانیف (۳) ''عزاداری'' اور (۴) ماں باپ'' زیر طبع ہیں جو ہمارے اس تذکرے سے پہلے ہی سامنے آجائیں گی۔ اپنے خانوادے کے تعارف کے سلسلے میں اُنہوں نے لکھا ہے۔

''میرے خانودے کا تعارف یہ ہے کہ تیس سال پہلے ماں کا انتقال کے بعد ایک قطعہ لکھا تھا جو اس طرح ہے ۔

ماں کی فرقت، باپ کا غم اور جواں بیٹے کا داغ
نعمتیں اتنی میرے محبوب اک دم کے لئے
اشک تو جتنے بھی تھے سب کر چکا پیاسوں کے نام
اب تو آنسو بھی نہیں اپنے کسی غم کے لئے

اس قطعہ کے ایک سال بعد ایک مصرعہ غم کا اور اضافہ ہوا، یعنی شریک حیات بھی ساتھ چھوڑ گئیں۔ اس وقت ایک بٹیا اور ایک بیٹی خانوادے میں ہیں۔

(مکتوب بنام سید عاشورہ کاظمی مرقومہ ۱۶ را پریل ۲۰۰۳ء)

اللہ ان کے فرزند اور ان کی دختر کو عمر خضر عطا کرے۔

اپنے وطن کا تعارف کراتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں کہ سید جمال الدین المعروف مخدوم صاحب نے ۶۳۰ھ (۱۲۳۲ء) میں شیعہ سرائے کے نام سے یہ بستی بسائی تھی جو بعد میں سرسی ہوگئی۔ اس وقت سرسی کی آبادی تیس ہزار کے لگ بھگ ہے جس میں سے ۲۲ ہزار سادات ہیں۔ اس بستی کے متعلق رضا سرسوی نے ایک عجیب دلچسپ بات لکھی ہے اور وہ یہ کہ: ''اس بستی میں ۱۲۵ شعراء کرام ہیں''

اپنا منظور تعارف رضا سرسوی پہلے ہی کرا چکے ہیں

تمام عمر یہی سوچ کر میں روتا رہا — کہ ایک اشک تو ہو کم سے کم حسینؑ کے نام

میرا اثاثہ ہی کیا ہے کہ جسکی فکر کروں — بدن زمیں کی امانت ہے دم حسینؑ کے نام

خراج دیتا رہے گا شعورِ انسانی — سلام لکھتے رہیں گے قلم، حسینؑ کے نام

معلوم ہوا کہ رضا سرسوی نے اب تک دس (مراثی) کہے ہیں جن میں سے ایک ''نماز'' بھی ہے۔ کچھ کم نصیب نماز اور عزاداری کا تقابل کرتے ہیں۔ نماز کی فضیلت کے نام پر عزاداری کو ختم کرنے کی سازش کرنے والے بھی غیر ہیں اور عزاداری کو نماز پر فضیلت دینے والے بھی اپنوں میں سے نہیں ہو سکتے۔ حسینؑ نے نماز کو بچانے کے لئے ۷۲ سروں کی قربانی دی تھی۔ وہ اگر قربانی نہ دیتے تو نماز نہ بچتی اس لئے اس عظیم قربانی کی یاد اور نماز کی محافظ امام حسینؑ کی عزاداری بھی لازم ہے۔ رضا سرسوی نے مسئلے کے دونوں پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔

۱

نماز صاحب ایمان کی علالت ہے — نماز پنجتن پاک کی وصیت ہے

تمہیں نماز کی فرصت نہیں قیامت ہے — نماز سیّدِ مظلوم کی امانت ہے

سر حسینؑ جو خاک شفاء سے ہٹ جاتا

گلا نماز کا کرب و بلا میں کٹ جاتا

۲

بنا نماز کے کافی نہیں ہیں حج و زکوٰۃ — بنا نماز کے ملتی نہیں ہے راہ نجات

نماز دیتی ہے انساں کو باوقار حیات — نماز بخشتی ہے دل کو عزم و صبر و ثبات

پڑھی نماز تو مومن کے دل کو چین ملا

نماز ہی سے شعورِ غم حسینؑ ملا

شعورِ دیں ہے نماز اور دین ہیں شبیرؑ ۳ دلِ حسینؑ کی دھڑکن ہے نعرۂ تکبیر
نماز کرتی ہے فکر و خیال کی تطہیر رکھا جو خاک پہ سر اور بڑھ گئی توقیر
نماز پڑھ کے جو یادِ حسینؑ آتی ہے
تو آنکھ نذر کو اشکوں کے پھول لاتی ہے

کرے نہ سجدہ خدا کو وہ آدمی کیا ہے ۶ نظر جو حق ہی نہ آئے کو روشنی کیا ہے
خدا کو بھول کے گذرے تو زندگی کیا ہے نہ ہو حسینؑ سے الفت تو بندگی کیا ہے
زباں حسینؑ کے منہ میں رسولؐ دیتے تھے
ہے کچھ تو بات جو سجدے کو طول دیتے تھے

وضو ہے یعنی دلوں کو حسد سے پاک کرو ۷ قیام کہتا ہے قائم صراطِ حق پہ رہو
رکوع بولا کہ ماں اور پدر سے جھک کے ملو صدا یہ دیتا ہے سجدہ کہ خاکسار بنو
چھری کے نیچے جو جلتی زمیں پہ چین سے ہے
نماز باقی اسی سجدۂ حسینؑ سے ہے

نماز کیا ہے بتائیں گے کربلا والے ۸ پڑے ہوئے تھے جہاں لا الہ کے لالے
نماز روکنے نکلے تھے خنجر و بھالے بچایا سجدہ کو اپنے گلے کٹا ڈالے
وہ زیرِ تیغ شہِ مشرقین کا سجدہ
فرشتے دیکھنے آئے حسینؑ کا سجدہ

ملے نہ ایسے نمازی کہیں زمانے میں ۹ ملے ہیں جیسے کہ زہرا تیرے گھرانے میں
جو قتل ہوگئے اسلام کو بچانے میں نشان سجدوں کے چھوڑ آئے قید خانے میں
خدا کے گھر کا ہر اک احترام کرتا ہے
مگر حسینؑ کو کعبہ سلام کرتا ہے

بدن پہ زخم ہزاروں، زباں پہ شکرِ خدا ۱۰ وہ ضعف تھا کہ لرزتا تھا جسم کا سایہ
اجل کے سینے پہ یوں کی نمازِ عصر ادا گلہ کٹا تو کہا لا الہ اللہ
عبادتوں کا مقدر یہ ایک سجدہ ہے
ہلاک ہوگئے قاتل، نماز زندہ ہے

گلا نبی کے نواسے کا، کلمہ گو کی چھری ۱۲ کہاں کا پانی، بدن میں لہو کی بوند نہ تھی
نماز لینے ہی والی تھی آخری ہچکی کہ تازہ روح بدن میں حسینؑ نے پھونکی
حسینؑ سجدہ میں ہیں، جبرئیل جھومتے ہیں
جبیں کو کعبہ، لبوں کو رسولؐ چومتے ہیں

اُگے کا جو بھی زمیں سے وہ اب حسینؑ کا ہے ۱۴۱ خدائی ساری خدا کی ہے، ربّ حسینؑ کا ہے
جہاں بھی جو بھی ہے ربّ کا، وہ سب حسینؑ کا ہے یہ سوچ لیجیے، جو کچھ ہے سب حسینؑ کا
سفر فضول ہے ان کاغذی جہازوں میں
بنا حسینؑ کے، کیا پاؤ گے نمازوں میں

زمین پہ سب سے انوکھا حسینؑ کا سجدہ ۱۵۱ نبیؐ تھے دل کو سنبھالے، خموش تھا کعبہ
فرات نیزوں اچھلتی تھی خوں برستا تھا گلے پہ بیٹے کے ماں نے رکھا تھا اپنا گلا
مچا تھا شور یہ کرب و بلا کے جنگل میں
نماز بوئی گئی ہے لہو کے مقتل میں

زبان خشک تھی اور پپڑیاں تھیں ہونٹوں پر پڑے تھے لاشے بہتر ۷۲ زمیں پہ خون میں تر
جوان بیٹے کا ٹکڑے تھا برچھیوں سے جگر زمین میں دفن ابھی کی ہے میت اصغر
گلوئے شاہ پہ جو بیتنی تھی، بیت گئی
چھری کی ہار ہوئی اور نماز جیت گئی

بغرضِ اختصار بقیہ بند نقل نہ کرتے ہوئے، نماز اور سجود کے سلسلے میں رضا سرسوی کے ایک قطعہ پر اس گفتگو کو مکمل کیا جارہا ہے۔

جس ہتھیلی پہ یداللہ لکھا تھا اس کو
شاہ نے طالبِ بیعت کے حوالہ نہ کیا
اپنا سر سونپ دیا شمر کے خنجر کو مگر
اپنے سجدے کو حکومت کے حوالے نہ کیا

☆☆☆☆☆

احسن شکار پوری:- (دہلی)

تاریخ پیدائش، ۲۸ نومبر ۱۹۵۲ء

نام محمد احسن۔ ادبی نام احسن شکار پوری۔ وطن شکار پور ضلع بلند شہر (بھارت)، اس نسبت سے شکار پوری لکھتے ہیں۔ والد کا اسم گرامی انتظار حسین۔ احسنؔ نے اٹھارہ برس کی عمر میں (۱۹۷۰ء) میں ابتدائے شعر گوئی کی۔ اصناف شعر میں غزل، نظم، قصیدہ، نعت، منقبت، نوحہ، قطعہ، رباعی، میں طبع آزمائی کی مگر ابھی تک کسی صنف شاعری میں کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہو سکا۔ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں مرثیہ کہنا شروع کیا۔ پہلا مرثیہ حیدر آباد میں ڈاکٹر صادق نقوی کی قائم کردہ مجلس میں پڑھا۔ اہل فہم سے داد پائی تو ساری اصناف سخن کو چھوڑ کر مرثیہ گوئی پر آ گئے۔

اگلے برس دوسرا مرثیہ کہا۔ اہلِ مجلس نے سخن وری کی داد دی۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ مرثیہ، شاعر کو ایسے ممدوح دیتا ہے جن کی مدح میں جو کچھ بھی کہا جائے غلو نہیں ہوتا بلکہ مدح کا حق کبھی ادا نہیں ہوتا۔ احسنؔ شکار پوری اب اس نشۂ ولا سے سرشار ہیں اور مرثیہ گوئی کو افضلیت دیتے ہیں۔ ان کے مراثی روایت کی پابندی کے ساتھ ساتھ تاریخی حقائق و واقعات کی صداقت و صحت پر مشتمل ہوتے ہیں ان کا پہلا مرثیہ ''عرش'' امام حسینؑ علیہ السلام کے احوال پر ہیں۔

جب قصد مرثیہ کبھی اہلِ سخن کریں ۱ لازم یہ ہے کہ پیروئ اہلِ فن کریں
صحرا کو لفظ لفظ کی بُو سے چمن کریں اور فکر حق سے متصف اپنا چلن کریں
منسوب ان کا مرثیہ آلِ عبا سے ہو
آغاز اس کا تذکرۂ کبریا سے ہو

انسان، حقِ حمد الٰہی ادا کرے ۲ شایانِ شان تذکرۂ کبریا کرے
اس ذکرِ حق سے بندۂ کمتر وفا کرے اس کی مجال کیا کہ وہ ہونٹوں کو وا کرے
ہاں گر عطا ہو صاحب نہج و بیان کی
کھل جائے گی گرہ ابھی اُس کی زبان کی

حمد الہ لب پہ جو شاعر کے آگئی ۳ وارفتگی جہانِ مضامیں پہ چھا گئی
تخئیل تشنگئ قلم کو بڑھا گئی بالائے عرش خاک سے فکر رسا گئی

وہ عرش جبرائیل کا جس پر اثر نہیں
پہنچیں وہاں پہ اہلِ فلک یہ جگر نہیں

ارض و سما نہ کیسے ہوں حیران عرش پر ۵ سب سے سوا ہے قدرتِ یزدان عرش پر
لوح و قلم ہیں عرش پہ، قرآن عرش پر ہے سب سے پہلا چشمہ فرقان عرش پر
فکرِ بشر میں اوج، فضیلت کا نام ہے
ہاں عرش رفعتوں کی نہایت کا نام ہے

جس عرش پہ کوئی بھی پیمبر نہیں گیا ۷ اس عرش پر ہیں دیکھو یہ نعلین، مصطفیٰ
عاجز نہ کیوں بشر کے ہوں ادراک اور ذکا کونین میں ہے عارفِ سرکار بس خدا
جو مرتبہ نبی کا وہ آلِ عبا کا ہے
اعلان دو جہاں میں یہی "انما" کا ہے

قدرت سے اپنی رب نے ہے پیدا کیا انہیں ۱۱ پھر اختیار دے دیا کونین کا انہیں
بخشی ہر ایک وصف میں یوں انتہا اُنہیں اب تک بھی چھونے پائی نہ فکرِ رسا اُنہیں
اُن میں سے اک حسنؑ ہے جو از حد حسین ہے
مثلِ رسولؐ وہ بھی امین و متین ہے

کردار مصطفیٰ کا حسنؑ ورثہ دار ہے ۱۲ حق رو ہے حق پسند ہے اور حق شعار ہے
پہنے قبائے سبز یہ رشک بہار ہے نانا کو سب سے بڑھکے نواسے سے پیار ہے
جو بات مصطفیٰ میں، وہی مجتبیٰ میں ہے
جو بھی قدم ہے ان کا، رہِ کبریا میں ہے

اس کے بعد مرثیہ، ساقی نامہ، ذکرِ رسول، ذکرِ علی، ذکرِ اہلبیت، اذکار و حالات بعد رسول ﷺ، حضرت علی، خلافت، جنگِ صفین، ذوالجناح کی تعریف، تلوار کی تعریف، رجز، جنگ سے گزرتا ہوا، تاریخ کی منزلوں کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ حضرت علی کی شہادت کے بعد امام حسنؑ کو درپیش مسائل، صلح حسنؑ، شرائط صلح، شہادت امام حسن (زہر سے) کا بیان اور پھر بین۔ یعنی احسن شکار پوری نے مرثیہ کے لوازم کی پوری پابندی کی ہے اور یہی اُن کا مزاج اور ان کا اسلوب ہے۔

زینبؑ یہ بین کرتی تھی شمرؔ کی لاش پر ۸۰ اے میرے سبز پوش برادر اے خوش سیر
کس حال میں چلے ہو بھرے گھر سے روٹھ کر زہر دغا سے کٹ کے گرے قلب اور جگر
کل ماں کی اور بابا کی فرقت کا غم سہا
بہنا نے آج بھیا تمہارا الم سہا

نوحہ حسنؑ کی لاش پہ شبیرؑ نے کیا ۸۳ مرنا میں ساتھ آپ کے یہ تو نہیں ہوا
لیکن اجل کا آج سے مشتاق ہوگیا ایک ایک دن گنوں گا میں اب اپنی موت کا
بہنیں سروں کو پیٹ کے بھائی پہ روتی ہیں
زہراؑ سرہانے لال کے جاں اپنی کھوتی ہیں

مرثیے کے کل ۸۸ بند ہیں۔ مقطع کا بند روایات مرثیہ کے مطابق دعا پر ختم ہوتا ہے۔
احسنؔ شکارپوری بے شک کلاسیکی مرثیے کی اقدار کے پاسداروں میں شامل ہیں۔

☆☆☆☆☆

روشؔ لکھنوی (لکھنؤ)

تاریخِ ولادت ۱۱ر ستمبر ۱۹۵۲ء

نام نواب سید باقر علی عرف شلن نواب۔ تخلص روشؔ۔ وطن لکھنؤ۔ قلمی نام شلن نواب روشؔ لکھنوی۔ سلسلۂ نسب ان کے والد گرامی سید غلام عباس عرف نواب فریدوں مرزا کی طرف سے آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ اخترؔ تک پہنچتا ہے۔ والدہ محترمہ لکھنؤ کے ایک ذی علم گھرانے سے ہیں یعنی میر اکبر علی سوز خواں کی دختر نیک اختر ہیں۔ نواب باقر علی شلن صاحب نے علم و آسودگی سے مالا مال روشن گھرانے میں آنکھ کھولی لیکن ابھی چار سال کے ہوئے تھے کہ اس گھر کو روشنی دینے والا فانوس بجھ گیا۔ شلن نواب یتیم ہوگئے۔ یہ زمانہ وہ تھا جب اشراف کی جائیدادیں برباد ہورہی تھیں۔ جاگیریں ختم کی جارہی تھیں اور لکھنؤ کے رؤسا و شرفا آزمائشوں سے گذر رہے تھے۔ اس منظرنامہ کو نواب شلن کے حوالے سے ضابطہ تحریر میں بھی لایا گیا ہے۔

> ”ملک کے سیاسی منظرنامے بدل رہے تھے۔ ظاہری عزت اور سفید پوشی برقرار رکھنے کے لئے گھروں کے قیمتی اثاثے مہاجنوں کے سود خانوں میں منتقل ہورہے تھے۔ ایسے میں کون تھا جو فریدوں مرزا کے

اس یتیم کی نگہداشت کرتا؟ غرض ماں نے سخت جانفشانی کے ساتھ اپنے یتیم بیٹے کی پرورش کی۔ روشؔ کے لئے تربیت کدہ، مدرسہ، اسکول، کالج، سب کچھ ماں کی آغوش رہی۔ روشؔ نے ۶ برس تک اسی آفاقی مدرسے سے تہذیب، ادب، اخلاق، مروّت، متانت اور دین و مذہب کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسکول میں نام لکھایا اور حرف شناسی، تلاوت و عبادت اور قوت تحریر اسی اسکول سے حاصل کی۔ "

(روشؔ لکھنوی کی تصنیف "شہرِ عروض" کا دیباچہ۔ راقم غلام حسین صدف زیدی)

اندریں حالات شلّن نواب کا تعلیمی سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ حالات ناسازگار ہوتے گئے اور آخر کار لکھنؤ کے "فن زردوزی" کو جینے کا سہارا بنالیا۔ ابتدا محنت سے ہوئی تھی۔ محنت کبھی دھوکہ نہیں دیتی، محنت رائیگاں نہیں جاتی۔ شلّن نواب کی محنت بھی رنگ لائی حتیٰ کہ اس وقت زری کے ممتاز تاجروں میں "شلّن بھائی" کو شمار کیا جاتا ہے۔

ہر چند کہ شلّن نواب روشؔ نے اسکول چھوڑ دیا لیکن حصول علم کا جذبہ ان کے دل میں ہر وقت تازہ رہا۔ ابتدا میں حضرت مولانا مرزا محمد عالم سے عربی اور فارسی علوم کے درس لیتے رہے۔ بعد ازاں جہاں سے علم کی روشنی ملی روشؔ لکھنوی نے اسے دل کے نہاں خانوں میں اُتار لیا۔ ان کا ذوق مطالعہ دن بدن تیز ہوتا گیا۔ گھر میں کتابیں جمع ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ ایک ذخیرہ بن گیا جو ان کے ذاتی کتب خانے کی شکل میں موجود ہے۔

میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے شہر لکھنؤ میں شاہان اودھ کے دور سے مرثیہ خوانی اور مرثیہ گوئی کا عروج رہا ہے۔ نواب باقر علی روشؔ کے والد گرامی ایک ممتاز مرثیہ خواں بھی تھے اور مرثیہ گو شاعر بھی۔ یہی ذوق روشؔ کو ورثے میں ملا۔ انہوں نے مرثیہ خوانی کے ساتھ مرثیوں کا ذخیرہ بھی جمع کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ مرثیہ ان کی حیات کا اہم جزو بن گیا۔ محبت اہلبیت ان کے سانسوں میں بس گئی۔ اور درس گاہ کربلا کے ہمہ وقت (Full Time) طالب علم بن گئے۔ بس یہی وقت تھا جب روشؔ نے مرثیہ گوئی شروع کی اور میر انیس کے مراثی پڑھتے پڑھتے وہ خود مرثیہ کہنے لگے، روشؔ لکھنوی جن دشوار گذار راستوں سے گذر کر مرثیہ گوئی تک پہنچے تھے ان دشواریوں نے انہیں وقت کی قدر و قیمت سکھادی تھی اور انہیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ مرثیہ میں اختصار لازمی ہے۔ پھر وہ

مرثیہ کی روایتی اقدار کے قائل ہونے کے باوجود ان مشاہدات کو بھی یکسر فراموش نہیں کر سکتے تھے جو انہیں سفاک زندگی نے دیئے تھے۔ ان کے اندر جو ایک شاعر ہے وہ ان مشاہدات کا اعتبار جانتا تھا چنانچہ ان کا پہلا مرثیہ ''حالاتِ حاضرہ'' مرثیے کی کلاسیکی طرز ادا اور عصرِ حاضر کے مشاہدات کا مرکّب ہے یعنی روشؔ لکھنوی نے اختصار اور فکرِ جدید کی راہوں پر سفر اختیار کیا ہے۔

اپنوں کا خوف اور نہ غیروں کا ڈر مجھے مرعوب کر سکیں گے نہ زور و اثر مجھے
خوشنودیٔ حسینؑ ہے مدّنظر مجھے ''کافی ہے آستانۂ اثنا عشر مجھے

جب دشمنِ عزا نے یہ چھیڑی لڑائی ہے
سیفِ زبان تب میری جنبش میں آئی ہے

وہ ملّت میں پروان چڑھتے اختلافات کی نشاندہی کرتے ہیں جسے وہ حق و باطل کی لڑائی بھی کہتے ہیں۔

دشمن لباسِ زہد میں آئے ہیں دوستو خنجر نفاق کے بھی چھپائے ہیں دوستو
پرچم عبادتوں کے اٹھائے ہیں دوستو مصحف کو بھی سپر یہ بنائے ہیں دوستو

باندھے ہوئے نماز کی دستار آئے ہیں
دشمن عزا کے بن کے عزادار آئے ہیں

حکمت کا وقت ہے یہ خبر دار دوستو ہمت کا وقت ہے یہ خبردار دوستو
جرأت کا وقت ہے یہ خبر دار دوستو نفرت کا وقت ہے یہ خبردار دوستو

دشمن عزا کا آیا ہے مومن کے روپ میں
ایماں کا رنگ اُڑا ہے عداوت کی دھوپ میں

پھر سعد عصر آیا ہے لشکر کے سامنے پھر شمر وقت ساتھ ہے خنجر لئے ہوئے
تم بھی بڑھو بزرگوں کے تیوّر لئے ہوئے مختار کی طرح سے پھر د سر لئے ہوئے

کردار مثلِ میثم تمار چاہیے
اس دور کے لئے کوئی مختار چاہیے

ملّتِ حقّہ کو تقسیم کرنے کے لئے نماز اور عزاداری کے تقابل کا جو شاخسانہ تراشا گیا تھا اس میں عزاداریٔ حسینؑ کو نماز کے مدّمقابل کھڑا کرنے والوں کا استدلال ہے کہ عزائے حسینؑ ہی

نماز کی اہمیت کی تبلیغ ہے۔ حسین مظلوم نے نماز کی بقا کے لئے قربانی دی تھی لیکن جب نماز کو عزائے حسین کو نیست و نابود کرنے کے لئے استعمال کیا گیا تو روشؔ لکھنوی جیسے بہت سے دردمند دل تڑپ اُٹھے۔ نواب روشؔ کا پہلا مرثیہ اسی موضوع پر ہے وہ نماز کی فضیلت و اہمیت کا اقرار کرتے ہیں لیکن ؎

بے شک نماز کا بھی اک اپنا مقام ہے　　ساری عبادتوں کی یہ تنہا امام ہے
قائم جہاں میں مثلِ امام امام ہے　　روحِ نماز آلِ نبی پر سلام ہے
بے حبِ اہلبیت عبادت فضول ہے
بوئے لطیف جس میں نہیں ایسا پھول ہے

اس مرثیے میں مصائب کا حصہ مکالمے کے انداز میں نہیں بلکہ بیانیہ ہے یعنی جو مصائب بیان کئے ہیں وہ شاعر نے کئے ہیں اور اس بیان میں کہیں خانوادۂ رسالت کے افراد کو روتے پیٹتے نہیں دکھایا گیا ہے۔ علی اصغر کی شہادت پر شاعر نے جو منظرکشی کی ہے وہ اہل عزا کے دامن اشکوں سے تر کردیتی ہے۔

میت کو لے کے جبکہ بڑھے جانب خیام　　آگے بڑھے کبھی، کبھی پیچھے ہٹے امام
بچوں کا تھا ادھر درِ خیمہ پہ اژدہام　　شبیر کے لئے بڑا نازک تھا یہ مقام
آواز دی سبھوں نے کہ آقا وہ آئے ہیں
پانی پلا کے اصغر ناداں کو لائے ہیں

آواز سن کے دوڑی سکینہ جگر فگار　　بے شیر کا سبھی کو تھا خیمے میں انتظار
لینے کو آئے حسب مراتب وہ سوگوار　　خیمے میں آچکے تھے جو شبیر نامدار
سینے میں تھے چھپائے دلِ پاش پاش کو
اپنی عبا اُڑھائے تھے بچے کی لاش کو

حضرت روشؔ لکھنوی نے بیسوی صدی کے اختتام تک بارہ مرثیے کئے ہیں جو موضوعاتی مرثیے ہیں جن سے پانچ مرثیوں کا مجموعہ ''کائنات روشؔ'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ ان موضوعات میں حالاتِ حاضرہ کے بعد ''فدک'' اور ''غدیر'' ایسے موضوعات ہیں جن پر قلم اٹھانا بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز راہ پر سفر کرنا ہے۔ اُن کا تازہ ترین مرثیہ ''پانی'' ہے

اس موضوع پر ان سے پہلے بھی مرثیے کہے جا چکے ہیں مگر۔ ''ہر گُلے را رنگ و بوئے دیگر است''
کے مصداق روشؔ صاحب کا اپنا انداز ہے۔

اللہ کا مخلوق پر احسان ہے پانی ۱ سوکھے ہوئے پیڑوں کے لئے جان ہے پانی
صحرا میں جو برسے تو گلستاں ہے پانی باغوں کے لئے زیست کا سامان ہے پانی
گیتی پہ جواہر کو اگل دیتا ہے پانی
انسان کی صورت بھی بدل دیتا ہے پانی

کم ظرف کی باتوں سے چھلکتا ہے یہی آب ۶ مفلس کے مکانوں میں ٹپکتا ہے یہی آب
مزدور کے ماتھے پہ چمکتا ہے یہی آب ہو موت کا عالم تو چھلکتا ہے یہی آب
انداز جدا اس کے ہیں تاثیر عجب ہے
آنکھوں کا اگر مر گیا پانی تو غضب ہے

آنکھوں میں سمایا تو حیا بن گیا پانی ۸ اٹکا جو گلوں میں تو بلا بن گیا پانی
اترے جو گلے سے تو بقا بن گیا پانی اُونچا ہوا سر سے تو قضا بن گیا پانی
پیدا ہیں کمالات عجب آب رواں میں
کرتا ہے ہوا قید حبابوں کے مکاں میں

برسے نہ کہیں بوند، کہیں برسے چھما چھم ۲۱ پانی کہیں دُر ہے کہیں آنسو، کہیں شبنم
جم جائے تو ہے سنگ، پگھل جائے تو ہے یم جنت میں ہے تسنیم تو کعبے میں ہے زم زم
معراج سرِ عرش جو پاتا ہے یہ پانی
ہاتھوں کو محمد کے دُھلاتا ہے پانی

اور پانی کا ذکر جب مصائب کی منزل پر آتا ہے تو روشؔ لکھنوی کہتے ہیں۔

جس در سے کبھی بھی کوئی بھوکا نہیں جاتا ۲۶ اس گھر کا جو احوال ہے لکھا نہیں جاتا
بچوں کا وہ عالم ہے کہ دیکھا نہیں جاتا ہے خشک زباں پیاس سے بولا نہیں جاتا
ہنسنا تو کُجا، بات بھی کب کرتے ہیں بچے
پانی کو اشاروں سے طلب کرتے ہیں بچے

یہ مرثیہ چالیس بند پر مشتمل ہے حالاتِ حاضرہ سے ''پانی'' تک حضرت روشؔ لکھنوی

کے کلام میں ارتقا بہت نمایاں ہے جو مرثیہ گوئی میں ان کی انہماک پر دلادت کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

نقی عابدی:- (حیدرآباد)

تاریخ پیدائش ۱۰ر اکتوبر ۱۹۵۴ء

نام سید مصطفیٰ علی خان عابدی۔ تخلص نقیؔ۔ قلمی نام نقیؔ عابدی۔ اپنے تعارف کے سلسلے میں نے لکھا ہے۔

"میرے آباد و اجداد نیشاپور (ایران) سے ہجرت کر کے دہلی آئے تھے۔ جس زمانے میں دکن میں نظام اوّل کی حکومت تشکیل پا رہی تھی میرے جدِ اعلیٰ نواب میر مکرّم علی خان قیصر جنگ دہلی سے حیدر آباد تشریف لائے اور یہیں مقیم ہو گئے۔ میرے تمام بزرگ شعر کہتے تھے اور محافل میں شریک ہوا کرتے تھے۔ (مکتوب مرقومہ مئی ۲۰۰۳ء)

اسی اطلاع نامے میں مزید تحریر کیا ہے کہ اُن کے دادا نواب میر حسن علی خاں شعر کہتے تھے۔ اُن کے تین فرزند نواب میر دارے علی خان فوقؔ۔ نواب میر جمشید علی خان جمشیدؔ اور نقیؔ عابدی کے والد نواب شبیر علی خان شوقؔ شاعر تھے اور مدح حمد و آل محمد کرتے تھے۔ اس طرح نقیؔ عابدی کو شاعری ورثے میں ملی بلکہ بقولِ میر انیس وہ بھی کہہ سکتے ہیں ؎

"تیسری پشت ہے شبیر کی مداحی میں"

نقی عابدی نے پہلی منقبت ۱۹۹۳ء میں کہی جس کی پذیرائی نے انہیں حوصلہ بخشا۔ خاندانی روایت کی پاسداری اور سخن شناس کرم فرماؤں کی ہمت افزائی سے بات مرثیے تک پہنچی، اُنہوں نے پہلا مرثیہ دو برس قبل (شاید ۲۰۰۲ء میں) کہا۔ اس ایک سال بعد دوسرا مرثیہ کہا۔ پہلا مرثیہ امام مظلوم کے احوال کا مرثیہ ہے۔ نقیؔ عابدی نے یہ مرثیہ اہل نظر مرثیہ نگاروں کی موجودگی میں ایک مجلسِ حسینؑ میں پڑھا۔ جسے پسند کیا گیا۔

نقیؔ عابدی کا ارادہ ہے کہ وہ ہر سال نو تصنیف مرثیہ سالانہ مجالس مرثیہ میں پڑھیں گے۔

ان کا پہلا مرثیہ۔ "فکر رسا کہاں میری ربِّ ثنا کہاں" کا موضوع ہی مرثیہ ہے ؎

لیکر اسی کا نام اٹھاتا ہوں میں قلم ۲ کرتا ہے مرثیہ شہ مظلوم کا رقم

وہ شاہ کربلا جو ہے سلطان درد و غم میں اس کا ذکر کرنے لگا ہوں بہ چشم نم
ہادی ہے پیشوا ہے، شہ مشرقین ہے
وہ مصطفیٰ و فاطمہؑ کے دل کا چین ہے

تسکینِ قلب فاطمہ زہرا ہے مرثیہ ۵ میرے دل و دماغ پر چھایا ہے مرثیہ
چونکہ یہ اس حقیر کا پہلا ہے مرثیہ اس مرثیے کا اس لئے چہرہ ہے مرثیہ
داد سخن میں کرتا نہ تحقیف دوستو
اب مرثیے کی کرتا ہوں تعریف دوستو

فکر بشر کی کرتا ہے تعمیر مرثیہ ۷ پیشانی عزا پہ ہے تحریر مرثیہ
ہم شاعروں کی لکھتا ہے تقدیر مرثیہ قرآن کربلا ہے تو تفسیر مرثیہ
سمٹے ہوئے جو علم و ادب مرثیے میں ہیں
جتنے اصول دیں کے ہیں سب مرثیے میں ہیں

اصناف میں سخن کے ہے سرتاج مرثیہ ۸ دنیائے شاعری کی بھی ہے لاج مرثیہ
کرتا ہے ذہن و فکر پہ بھی راج مرثیہ شکر خدا کا کہ لکھتا ہوں میں آج مرثیہ
پھولوں میں مرثیے کے اضافہ کروں گا میں
تعداد مرثیوں کی زیادہ کروں گا میں

فن کی جو پوچھو فن کا ہے معیار مرثیہ اعلیٰ تخیلات کا شاہکار مرثیہ
ہے کاروان شعر کا سالار مرثیہ اصناف شاعری کا ہے سردار مرثیہ
اس کے بغیر پھیکی ہے سب گفتگوئے شعر
ہاں مرثیے کی وجہ سے ہے آبروئے شعر

تاریخ کربلا ہے، تو عنوان مرثیہ ۱۱ اسلام زندگی ہے تو ارمان مرثیہ
ہے حق پرست قوم کی پہچان مرثیہ ایمان کی جو پوچھو ہے ایمان مرثیہ
اہل دکن میں آج بھی یہ صنف عام ہے
اردو ادب میں اس کا بڑا احترام ہے

اہلِ نظر کے حق میں بصیرت ہے مرثیہ ۱۲ بزمِ عزا کی پہلی ضرورت ہے مرثیہ

تنویرِ غم ہے نور عقیدت ہے مرثیہ تفسیر دینِ حق ہے، شریعت ہے مرثیہ
ہر مجلس حسینؑ کا محور ہے مرثیہ
ہر صنف سے بلند ہے، برتر ہے مرثیہ

ہر بزم سے بلند ہے اس بزم کا وقار ۱۵ بزم عزا میں آج ہے ہر آنکھ اشکبار
ہم مرثیے کو سن کے جو روتے ہیں بار بار زہرا دعائیں دیتی ہیں ہم سب کو بیشمار
لیکر دعائیں فاطمہ کی شاد ہوگئے
صدقے میں مرثیے کے ہم آباد ہوگئے

ہے گلستان مدح پہ چھائی ہوئی بہار ۱۷ دیکھے تو کوئی مرثیہ گوئی کا افتخار
ہر مدح گو ہے مرثیہ لکھنے کو بیقرار ارضِ دکن میں مرثیہ گویوں کی ہے قطار
مسرور ہیں جناں میں انیسؔ و دبیرؔ آج
سامع بنے ہوئے ہیں صغیر و کبیر آج

سترہویں بند کے بعد ساقی نامہ کی طرف گریز۔ساقی نامہ کے چار بندوں کے بعد واقعات کربلا کی ابتدا۔

اُترا جو نینوا میں شہِ دیں کا قافلہ ۲۲ مل کر بنی اسد سے شہِ دیں نے یہ کہا
اے بھائی بیچ دو مجھے یہ ارض کربلا راضی ہوئے تو دے کے صلہ شہ نے یہ کہا
لکھو قبالہ اب علی اکبر کے نام پر
کرب و بلا بسے گی بہتر کے نام پر

نقی عابدی کلاسیکی مرثیے کی راہوں پر گامزن ہیں اپنے دونوں مرثیوں میں انہوں نے مرثیے کی روایت کی پابندی کی ہے اس پابندی میں بین بھی شامل ہیں۔

دشت بلا میں پہنچی جونہی بنتِ فاطمہ ۵۳ دیکھا بہن نے بھائی کو گھیرے ہیں اشقیاء
بیہوش فرشِ خاک پہ ہیں سبطِ مصطفیٰ عباس نامدار کو دینے لگی صدا
آکر بچالو فاطمہ کی اب کمائی کو
مقتل میں سوجھتا نہیں زہرا کی جائی کو

کہتی تھی ابنِ سعد سے یہ سر کو پیٹ کر ۵۴ غیرت کو تیری کیا ہوا کے اے سعد کے پسر

اے بانئ ستم تو ترس کھا حسینؑ پر یثرب کے شہزادے سے کیوں تو ہے بے خبر
کیا ابنِ بو تراب کو تو جانتا نہیں
اپنے رسولؐ زادے کو پہچانتا نہیں

مرثیہ کے کم وبیش سارے ہی لوازم کی پاسداری کی گئی ہے۔ بین میں سیدہ زینب کا ابنِ سعد سے امام حسین پر ترس کھانے کی التجا بھی روایتی بین کا انداز ہے۔ نقی عابدی نے اپنے مراثی میں دو دعائیں کی تھیں۔ پہلی دعا یہ تھی کہ ۔

ساقی تیری جناب میں اتنی ہے التجا وہ مئے پلا کے ہوش و خرد سے ہو رابطہ
وہ مئے کہ جس کو پی کے لکھوں میں بھی مرثیہ جام ولا میں خاک شفا گھول کے پلا
نشہ چڑھے تو واقعۂ کرب و بلا لکھوں
ہر سال اک شہید کا میں مرثیہ لکھوں

اپنے بندوں کی دعاؤں کو قبولیت دینے والے نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی کہ وہ ہر سال ایک مرثیہ لکھ رہے ہیں۔ ان کی دوسری دعا یہ تھی ۔

یارب اثر دے نوحہ و فریاد میں میری
قائم رہے یہ سلسلہ اولاد میں میری

اُن کی اس دعا پر بے ساختہ دل سے آمین نکلتی ہے۔

☆☆☆☆☆

کاظم جرولی :- (لکھنؤ)

ولادت، ۱۸ جون ۱۹۵۵ء

نام، سید کاظم علی رضوی۔ تخلص کاظم ۔ جائے ولادت قصبہ جرول ضلع بہرائچ، بھارت ابتدائی تعلیم جرول میں ہوئی۔ کسان انٹر کالج سے انٹر پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے لکھنؤ آگئے ۔ شیعہ ڈگری کالج سے ۱۹۷۵ء بی۔اے اور لکھنؤ یونیورسٹی سے ۱۹۷۷ء میں ایم۔اے میں امتیازی اسناد حاصل کیں۔ اپنے سلسلۂ نسب کے بارے میں کاظم جرولی رقم طراز ہیں۔

"میرے والد گرامی سید امتیاز علی رضوی قصبہ جرول کے مشہور ڈاکٹر ہیں۔ دادا ڈاکٹر ممتاز علی رضوی اور پردادا ڈاکٹر سید نیاز علی بھی اسی

پیشے سے منسلک تھے۔ میری دادی تعلقہ دار علی نگر سید حیدر مہدی نسیم جرولی کی بیٹی تھیں۔ اس رشتے سے میری والدہ بھی نسیم جرولی کی پوتی ہوئیں۔ میرے نانا سید خورشید حیدر کے بڑے بھائی جناب اکبر مہدی سلیم جرولی اور جناب فضل مہدی اثیم جرولی اپنے عہد کے مانے ہوئے شاعر تھے۔ اگر میں اپنی شاعری کو نسبتی اعتبار سے کسی سلسلہ سے منسلک کروں تو وہ میرا ننھیالی سلسلہ ہو سکتا ہے" (دیباچہ "کتاب سنگ" مطبوعہ ۱۹۹۳ء)

کاظم جرولی صاحب نے یہ بھی اعتراف کیا کہ لکھنؤ کے مشہور خانوادہ صاحب عبقات میں سرکار سعید الملت کی دختر سے شادی ہونے کے بعد کاظم جرولی کی شاعرانہ صلاحیت کو کافی تقویت ملی۔ خاص طور سے مولانا آغا روحی صاحب قبلہ (جو کاظم جرولی کی برادر نسبتی ہیں) سے استفادہ کرنے کا پورا پورا موقع ملا۔

کاظم جرولی ابتدا میں غزل کے شاعر تھے لیکن ان کی غزل پر کربلا کے استعارے کا رنگ غالب ہے۔

جو پیاسوں کی طرف بہتا نہیں ہے　　وہ کچھ بھی ہو مگر دریا نہیں ہے
تقرب تیرا میرے سر کے بدلے　　اگر مل جائے تو مہنگا نہیں ہے
ستم کی دھوپ میں ایسا وہ اک شجر تو ہے　　کہ جس کے سائے میں دنیا تمام بیٹھ گئی
میں کس نشیب میں تیرا لہو تلاش کروں　　تمام دشت پہ خاک خیام بیٹھ گئی
یہ سلسلہ ہے شہادت کا ختم کیا ہوگا　　ٹھہر بھی جائیں جو خنجر گلے نہیں رکتے

یہ ۵ر نومبر ۱۹۹۳ء کی بات ہے جب حضرت علامہ آغا روحی صاحب قبلہ لندن تشریف لائے تو انہوں نے کاظم جرولی کا مجموعۂ غزلیات "کتاب سنگ" مجھے انتساب کے ساتھ عنایت کیا۔ انتساب یہ تھا۔

"اپنے چھوٹے بہنوئی کاظم کا مجموعہ اپنے بڑے بھائی عاشور صاحب کی خدمت میں۔ شاید کہ لندن سے قابلِ اشاعت ہو"۔

آغا روحی صاحب قبلہ واپس لکھنؤ چلے گئے، میں نے یکے بعد دیگر چھ ماہ کے وقفے سے دو خطوط کاظم جرولی کو تحریر کیے...... جواب ندارد۔ پیغام بجھوائے، مگر ان سے رابطہ نہ ہو سکا اور

''کتاب سنگ'' لندن سے شائع نہ ہوسکی لیکن کتاب کے مندرجات نے مجھے کاظم جرولی کی شاعری کا شیدا بنادیا، مجھے نہیں معلوم انہوں نے شعر گوئی کا آغاز کب کیا۔ مجھے نہیں معلوم وہ غزل سے رثائی ادب اور لافانی شاعری کی طرف کب آئے۔ لیکن اتنا یقین ضرور ہے کہ ان کی غزل میں رثائی ادب کی آن بان ہے۔ رثائی ادب کے حوالہ سے ان کے صرف دو اشعار مجھ تک پہنچے۔ یہ اشعار پورے پورے مرثیے ہیں۔ ایک شعر حضرت عباس کا مرثیہ اور دوسرا سیدانیوں کے اسیر ہونے کا مرثیہ۔

پہلا شعر۔

جب ہواؤں میں نمی محسوس کی عباس نے
احتیاطاً سانس اپنی روک لی عباس نے

دوسرا شعر۔

جانے کیسے قیدی ہیں یہ، جانیں کیسے لوگ ہیں یہ
بازو پر تو پھول کھلے ہیں، نیل پڑے ہیں رَسّی میں

مجھے نہیں معلوم ناقدان شعر و سخن پر ان اشعار کا کیا اثر ہوتا ہوگا۔ میں تو اپنے متعلق بتا سکتا ہوں کہ پہلی بار جب میں نے یہ اشعار پڑھے تو کئی گھنٹے مجھ پر رقّت طاری رہی۔ اور آج بھی جب یہ اشعار لبوں پر آتے ہیں، میری آنکھوں کے صحرا سے اشک کا سیلاب اُمڈ آتا ہے۔ رونے رلانے کی کوشش میں غلط اور کمزور روایتوں کو نظم کرنے والے شعرا کے لئے کاظم جرولی کے دو اشعار قابل توجہ ہیں۔

کاظم جرولی کی تصانیف حسبِ ذیل ہیں۔

(۱)　''کاروانِ غم''

(۲)　''کوچے اور قندیلیں''

(۳)　''کتاب سنگ''

میں کاظم جرولی کا کوئی مرثیہ حاصل نہ کرسکا، یہ میری کوتاہی، وہ مرثیہ نہ بھیج سکے یہ ان کا تغافل۔ کم از کم میں بنت رسول سیدہ فاطمہ زہرا اور فاتح شام، خواہرِ حسینؑ سیدہ زینب کی بارگاہ میں یہ عرض تو کرسکتا ہوں کہ میں نے کوشش کی تھی اور میں اس کے لئے لکھنؤ تک گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

ناشر نقوی:- (پٹیالہ)

نام، سید ناشر حسین۔ تخلص، ناشرؔ۔ سادات نقوی، وطن امروہہ حال مقیم پٹیالہ۔

ناشر کے والد گرامی سید ناظر حسین ناظرؔ ممتاز شاعر تھے۔ ناشر کے دادا سید منور حسین منورؔ ممتاز شاعر تھے۔ اور نامور عالم دین تھے۔ ناشر کے ایک ماموں طہورؔ امروھوی (مرحوم) شاعر تھے اور دوسرے ماموں غیورؔ نقوی امروھوی ہیں جو کراچی میں آن بسے ہیں۔

تعلیم، روہلکھنڈ یونیورسٹی سے بی۔اے اور ایم۔اے کی سناد حاصل کیں۔ ذریعہ معاش، ابتدا میں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے وابستہ ہوئے۔ ساتھ ہی ساتھ جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی سے (Mass media) میں ڈپلوما حاصل کیا" اور آل انڈیا ریڈیو میں باقاعدہ اناؤنسر اور براڈ کاسٹر ہو گئے۔

شاعری کی ابتدا، ۱۷ سال کی عمر میں (۱۹۷۲ء) میں کی۔ ناشرؔ جیسے ادبی پس منظر والے نوجوانوں کے لئے یہ نئی بات نہ تھی۔ جس گھر کا ماضی اور حال ادبی فضاؤں میں رچا بسا ہو وہاں ۱۷ برس کی عمر میں شعر کہنا تعجب خیز نہیں ہے، البتہ یہ بات تعجب خیز ضرور ہے کہ سنہ ۱۹۷۸ء میں جب ناشرؔ نقوی نے پہلا مرثیہ ۔ "مقامِ بغض وحسد ہے نئے خیالوں میں" کہا تو یوں لگا جیسے کسی کہنہ مشق شاعر نے یہ مرثیہ کہا ہو۔ مرثیے کا عنوان 'ضمیر' تھا۔

ضمیر حاکم اعلیٰ ہے، دل کا افسر ہے ضمیر، اصل میں انسانیت کا جوہر ہے
ضمیر، عقل و شعور و خرد کا رہبر ہے ضمیر، خالق لیل و نہار کا گھر ہے
یہ زندگی کا ہمیشہ اصول ہوتا ہے
ضمیر یثربِ دل کا رسول ہوتا ہے

ناشرؔ نقوی لفظوں کو علامت (symabol) بنا کر صداقتوں، حقیقتوں اور جذبوں کی وضاحتوں پر قدرت رکھتے ہیں اور یہ کمال اُنہیں ۲۳ ر ۲۴ برس کی عمر میں بھی حاصل تھا جب انہوں نے پہلا مرثیہ کہا تھا۔ لفظ" ضمیر" کی وضاحت اور شاعر کا مافی الضمیر درج بالا ایک بند میں نمایاں ہے بالکل اسی طرح ذیل میں لفظ" امام" کو علامت بنا کر کیسی آفاقی سچائی کو پیش کیا ہے ناشرؔ نقوی نے۔

امام، علم و یقیں کی سحر کو کہتے ہیں امام، جلوۂ شمس و قمر کو کہتے ہیں
امام، منزلِ فکر و نظر کو کہتے ہیں امام، عظمت نوعِ بشر کو کہتے ہیں

امام، پیکرِ اخلاق کا شباب بھی ہے
نقیبِ حق بھی ہے، اللہ کی کتاب بھی ہے

جوشؔ نے دشت کربلا کو ایک درس گاہ قرار دیا ہے۔ ایک institutaion کے طور پر پیش کیا ہے۔ اُن کے بعد ممتاز شاعروں نے کربلا کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ نہ صرف رثائی ادب بلکہ غزلوں، نظموں اور دیگر اصنافِ سخن میں بھی کربلا کا استعارہ، کلام کی مقبولیت کی ضمانت بن گیا ہے۔ ناشرؔ نقوی نے بھی اس درس گاہ کو پیش کیا ہے۔۔

عصرِ رواں کی منزلیں آغاز کربلا　　فکرِ بشر کی قوتِ پرواز کربلا
آخری رسولؐ کی آواز کربلا　　ہے قرآن کا تسلسلِ اعجاز کربلا
کرب و بلا بشر کی رگِ دل ہے آج بھی
یہ خاک سجدہ گاہ میں شامل ہے آج بھی

کربلا کے متعلق ایک اور بند توجہ طلب ہے۔

ایسا سورج ہے عمل کا، کہ نہیں جس کو غروب　　ساری دنیا کی وفائیں ہوئیں اس سے منسوب
دے گیا وقت کو جو عزم و عمل کے اسلوب　　لکھ دیا موجوں کے سینے پہ وفا کا مکتوب
عمل زیست کی مہکی ہوئی ہریالی ہے
کربلا دشت نہیں مدرسۂ عالی ہے

ناشرؔ نقوی نے کربلا کو عمل کا ایک نہ غروب ہونے والا سورج قرار دیا ہے اور عمل میں جمود نہیں ہوتا۔ زندگی کی شرط یہی ہے کہ عمل جاری رہے۔ عمل میں تسلسل رہے۔ جہاں عمل رک جاتا ہے وہاں حیات کے رشتے ختم ہو جاتے ہیں اور موت کی حکمرانی، فنا کا اقتدار شروع ہو جاتا ہے۔ گویا ناشرؔ نقوی حیات کو کربلا کے سورج سے روشنی اور حرارت ملنے کا پیغام دے رہے ہیں۔ وہ باقاعدگی سے مرثیہ کہہ رہے ہیں اور مرثیہ میں کوئی نہ کوئی پیغام ضرور دیتے ہیں۔

ناشرؔ نقوی میڈیا پر ہیں۔ لحہ لحہ بدلتے حالات پر ان کی نظر ہے۔ اہلِ اقتدار کی نمرد دیت کے پرچموں تلے جو مظالم ہو رہے ہیں ان میں سے بہت سے عوام کے علم میں نہیں آتے ہیں لیکن میڈیا تک ضرور پہنچتے ہیں۔ ناشرؔ نقوی نے تلخیوں اور کڑواہٹوں کی یہ داستانیں اپنے مرثیوں میں بیان کی ہیں اور بڑے حوصلے سے اعلان کیا ہے کہ ان مظالم کا مقابلہ صرف ایک جذبہ ایک نعرہ

اور ایک صدا کر سکتی ہے۔ صدائے "یا حسینؑ"

مطلب پرستیوں میں ہے دنیائے رنگ و بو　　دامانِ دیں کو آج ہے پھر حاجتِ رفو
قرآں شکستہ جسم ہے ایماں لہو لہو　　خطرہ میں پھر ہے دینِ محمدؐ کی آبرو
اب سن بھی لے یہ درد میں ڈوبی صدا حسینؑ
پھر عصرِ نو پکار رہا ہے کہ " یا حسینؑ"

ابتدا میں ناشرؔ نقوی کا سلسلہ تلمذ حضرت فضل لکھنوی سے وابستہ رہا ہے مگر بعد میں جناب مہدیؔ نظمی سے اصلاح لینے لگے تھے۔ (مرثیہ نگارانِ امروہہ۔ عظیم امروہوی)

ناشرؔ نقوی نثر نگار بھی ہیں اُن کے فیچرز، ریڈیو رپورٹس، ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہوتی رہتی ہیں اور ان کے انشائیے اور مضامین اخبار میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مرثیے میں "بین" کے معاملے میں بھی ناشرؔ نقوی جدید مرثیے کے سفر میں شریک نظر آتے ہیں۔

اونٹوں پہ جب سوار ہوئے نیّرِ صفات　　بچوں کے بدلے گود میں ماؤں کی حادثات
زینبؑ تھیں میرِ قافلۂ جادۂ حیات　　حسرت سے دیکھا جانب سلطانِ کائنات
جب قافلے کے لوگ سوئے شام چل پڑے
دل پھٹ گیا فرات کے آنسو نکل پڑے

ناشرؔ نقوی آج کل پنجاب یونیورسٹی پٹیالہ میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر چکے ہیں۔ ان کی تازہ ترین تصانیف (۱) آفاقیت (مرثیہ) (۲) لالہ زارِ صبح (مجموعہ مراثی) (۳) تحریکِ آزادی میں اردو کا حصہ (۴) "مہدی نظمی فن اور شخصیت" ہیں۔ اور تین تازہ مرثیوں کے مطلع کے بند درج ذیل ہیں:

پہلا مرثیہ ۔

مطلع فکر پہ ہے ابر کرم، آج کی رات　　لفظ و معنی کے اُبھرنے لگے خم آج کی رات
مرثیہ لکھنا ہے اے میرے قلم، آج کی رات　　مجھ کو رکھنا ہے روانی کا بھرم، آج کی رات
سنسناتا ہوا ہر لفظ زباں سے نکلے
اس طرح جیسے کوئی تیر کماں سے نکلے

دوسرا مرثیہ۔

اے خدا قوم کو احساس کی نعمت دے دے روشنی دے دے دماغوں کو بصیرت دے دے
ذہن بخشا ہے تو افکار صداقت دے دے اپنے ہی حال پہ خود رونے کی طاقت دے دے
گرد سی ورنہ رُخِ قوم پہ رہ جائے گی
کربلا موجِ روایات میں بہہ جائے گی

تیسرا مرثیہ۔

اے بوتراب سارے زمانے کے اے امام اے بادشاہ لوح و قلم ، اے شہِ انام
اے سازِ کن کے پردے میں ایجاد کے امام لہجے میں تیرے کرتا ہے اللہ بھی کلام
معراج کی قسم، یہ سوالی نہ جائے گا
اب اٹھ کے تیرے در سے بھکاری نہ جائے گا

اللہ ان کے وسیع النظری، وسعت فکر، اور قلم کی روانی کو نظر بد سے بچائے اور انہیں توفیق دے کہ وہ مرثیہ کی جدید قدروں کا تحفظ کرتے رہیں خصوصاً بین کے معاملے میں خانوادۂ رسالت کے صبر کو پیشِ نظر رکھیں۔

☆☆☆☆☆

باقر محسن رضوی:- (حیدرآباد)

سنہ ولادت ۱۹۵۶ء

نام سید محمد باقر رضوی۔ تخلص محسنؔ۔ سادات رضوی۔ ادبی نام باقر محسنؔ رضوی۔ وطن حیدرآباد دکن۔ پیشہ صحافت۔ باقر محسنؔ اُن مرثیہ گو شعراء میں سے ہیں جن کی مراثی قدیم روایت اور جدید رجحانات کا سنگم ہوتے ہیں۔ روایت انہیں قدیم لوازم کی پاسداروں کے حصار میں رکھتی ہے اور صحافت انہیں لحہ بہ لحہ وقت کی بدلتی کروٹوں سے آگاہ اور حال کے دوش پر مستقبل کی سنگینیوں کے بارے میں نشان دہی کرتی رہتی ہے۔ عقائد اور مشاہدات کا یہی سنگم باقر محسنؔ کی شاعری، بالخصوص مرثیہ گوئی کی پہچان ہے۔ اُن کا ایک مرثیہ ''کربلائے تشنگی'' ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا ہے۔ دو مرثیے زیرِ اشاعت ہیں۔ باقر محسنؔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ غزل، نظم، سلام، منقبت، لیکن مرثیے کے علاوہ کسی صنف سخن میں بھی ان کا کلام شائع نہیں ہوا ہے۔ پیشہ وارانہ زندگی میں

صحافی کی حیثیت سے نثر سے بھی ان کا روزمرہ کا رشتہ ہے۔ اخبار کے نائب مدیر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے نثری مضامین بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارا موضوع ان کی مرثیہ نگاری ہے جس کا آغاز ۱۹۹۰ء میں ہوا اور تادم تحریر اس میں ارتقاء کا عمل جاری ہے۔

''کربلائے تشنگی'' اُن کا پہلا مرثیہ ضرور ہے مگر معیار شاعری پر اُسے نقشِ اوّل نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ ایک بالغ نظر مفکر اور ایک پختہ شاعر کا کلام ہے۔

تشنگی پہلے کبھی واجب تعظیم نہ تھی　　جزوِ فطرت تھی مگر لائقِ تکریم نہ تھی
مدح کے باب میں وہ قابلِ ترقیم نہ تھی　　تھی اک احساس مگر درد کی اقلیم نہ تھی
تشنگی کچھ بھی نہ تھی کرب و بلا سے پہلے
ربطِ لب ہائے شہیدانِ جفا سے پہلے

آئی شبیر کی خدمت میں تو عزت پائی　　ساتھ سرور کا ملا، دہر میں عزت پائی
رو کے سائے میں مطہر کے طہارت پائی　　ہو کے مربوط شہ دیں سے سعادت پائی
ظلم کی دھند میں روشن ہے اُجالوں کی طرح
جسم تاریخ میں لہراتی ہے سانسوں کی طرح

کس بلندی پہ نظر آتی ہے تقدیر عطش　　حوضِ کوثر کی فضاؤں میں ہے تنویر عطش
ضو فگن عرش طہارت پہ ہے تصویر عطش　　پوچھیے ہارے ہوئے ظلم سے تقدیر عطش
صبر کی تیغ کے جوہر کو عطش کہتے ہیں
معنیٔ مقصدِ سرور کو عطش کہتے ہیں

اور اب ذوالجناح، اور تلوار پر دو دو بند۔

سوئے میدان جو چلا اسپِ شہِ جن و بشر　　کہتا تھا سینۂ گیتی کو ٹھوکے دے کر
منزلت میں کوئی مرکب نہیں مجھ سے بہتر　　دہر میں کوئی سواری نہیں مجھ سے بہتر
پائے محبوب خدا میری رکابوں میں رہے
لاڈلے فاطمہ کے میرے سواروں میں رہے

بحرِ ظلمات میں دوڑوں تو اجالا ہو جائے　　رن میں دوڑوں تو ہر ایک صف تہ و بالا ہو جائے
تا فلک رنگ افق دھول سے کالا ہو جائے　　چادرِ گرد، ہواؤں کا دوشالا ہو جائے

میرا روندا ہوا دشمن کبھی جانبر نہ ہوا
ذکر کیا فرد کا، لشکر کبھی جانبر نہ ہوا

بولی ،اے شام کے لوہے کی بنی تلوارو ذوالفقار علوی نام ہے میرا سن لو
کہتے ہیں صبح شجاعت کی نشانی دیکھو ٹکڑے کردوں گی تمہیں مجھ کو سمجھتی کیا ہو

دست حیدر میں رہی ہوں یہ شرف میرا ہے
قبلۂ دین وغا باب نجف میرا ہے

میتھیو آرنلڈ (Mathew Arnold) نے کہا ہے کہ عجلت میں تخلیق کیا ہوا ادب صحافت کہلاتا ہے۔ باقر محسن اپنے صحافیانہ فرائض منصبی میں ہوسکتا ہے اس قول کا حوالہ ہوں لیکن اُن کی مرثیہ نگاری میں کوئی عجلت نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس وہ بہت ٹھہراؤ متانت اور تدبر کے ساتھ مرثیے کہتے ہیں۔ یوں بھی آرنلڈ نے کسی کو مرثیہ لکھتے کب دیکھا ہوگا، اسے کیا پتہ ہوگا کہ جب وہاں سے باب عطا کھل جاتا ہے تو اتنی عجلت سے شعروں کا نزول ہوتا ہے جیسے موسلا دھار بارش۔

☆☆☆☆☆

مولانا رئیس جار چوی:- (جارچہ)

ولادت ۱۳ دسمبر ۱۹۶۵ء

نام سید رئیس احمد۔ تخلص رئیس۔ اپنے وطن جارچہ کے حوالے سے جارچوی۔

عالم دین، خطیب اور شاعر مولانا رئیس جارچوی ایک مذہبی اور ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انیس و دبیر کے مراثی اور متین کے نوحوں کی دستک پر شعور نے آنکھ کھولی، اُن کے دادا سید فرصت حسین ممتاز مرثیہ خواں تھے، اُن کے والد اور چچا نے بھی یہی میراث پائی تھی۔

حضرت رئیس جارچوی کی ابتدائی تعلیم آبائی وطن جارچہ میں ہوئی۔ انہیں یاد ہے کہ ۲۲ مارچ ۱۹۷۲ کو وہ منصبیہ عربی کالج میرٹھ میں درجہ پنجم میں داخل ہوئے جہاں عصر حاضر کے ممتاز ذاکر اہلبیت مولانا غضنفر عباس طوسی ان کے ہم جماعت ہوئے۔ منصبیہ کالج کے بعد ناصریہ کالج جونپور میں تین برس حصول علم کے بعد جامعہ جوادیہ بنارس میں بی۔اے کے لئے داخلہ لیا اور وہیں سے فخر الافاضل کیا۔ اس کے بعد مدرسۃ الواعظین لکھنؤ اور بعد ازاں ''قم'' المقدسہ جا کر وہاں کے اساتذہ کرام سے استفادہ کیا۔

شعر گوئی کا رجحان بچپن سے تھا۔ ابتدا غزل سے ہوئی۔ دوسرا قدم سلام اور نوحہ کی وادی میں تھا۔ انہیں یہ بھی یاد ہے کہ اُنہوں نے پہلا نوحہ کہا تو اُن کی عمر سات آٹھ برس کی تھی۔ رئیسؔ جارچوی کو یہ نوحہ تو یاد نہیں البتہ اس کے مقطع کا ایک شعر یاد ہے۔

جا کر کہے گا حیدر کرار سے رئیسؔ
سقہ بنا ہوا ہے علم دار دیکھنا

مولانا رئیسؔ جارچوی مارچ ۲۰۰۳ء میں مجالس سے خطاب کرنے برطانیہ تشریف لائے تو ان سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنی مرثیہ گوئی کا احوال سنائیں۔ انہوں نے بہت انکساری کے ساتھ بتایا کہ انہوں نے پہلا مرثیہ ۱۹۹۰ء میں کہا تھا اور اب تک چھ مرثیے کہہ چکے ہیں ان مراثی کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

(۱)	''علم''	عزت قوم ہے، لشکر کی علامت ہے علم	۵۸ بند
(۲)	''کربلا''	انسانیت کا طرۂ دستار کربلا	۷۰ بند
(۳)	''اذان''	اذانِ جان شریعت، اذانِ روح نماز	۶۸ بند
(۴)	''رسول''	اُترا ہے آسمان ہدایت زمین پر	۶۵ بند
(۵)	''ذکرِ علی''	رئیسؔ ذکرِ علی زندگی کا حاصل ہے	۶۱ بند
(۶)	''آخری سورج''	اے اہلِ ہوس تم کیا جانو اک وقت وہ آنے والا ہے	۴۴ بند

مولانا رئیسؔ جارچوی کو بچپن سے خطابت کا شوق تھا۔ اسی جوہر کے حصول اور اس فن کی تربیت کے لئے انہوں نے درسگاہ ''قم'' سے استفادہ کیا۔ اور وہ آج ایک کامیاب مرثیہ گو ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جانے مانے خطیب بھی ہیں۔ مولانا رئیسؔ جارچوی سے برجستہ سوال کے تحت ان کے کوائف حاصل کئے گئے ہیں۔ ان کے مزاج میں جو انکسار ہے اس کے سبب ہم زیادہ معلومات حاصل نہ کر سکے۔ نمونہ کلام کے طور پر اُن کے مرثیہ ''کربلا'' کے چند بند نذر قارئین کئے جا رہے ہیں۔

انسانیت کا طرۂ دستار کربلا　　حق آشنا شعور کا معیار کربلا
شمع خیال کعبۂ افکار کربلا　　ایک مستقل ہے جرأتِ انکار کربلا
جادہ ہے حق اسی کا قرینہ خودی کا ہے
بحر الوہیت میں سفینہ خودی کا ہے

آئینۂ خودی کی جلا کربلا سے ہے　　احساسِ زندگی کی ضیاء کربلا سے ہے
انسان کو وقار ملا کربلا سے ہے　　جو ہے وقار دین وفا کربلا سے ہے
جب جب شعور و عقل پہ چھاتی ہے کربلا
سوئے ہوئے ضمیر جگاتی ہے کربلا

تھا مقصد یزید نہ دین خدا رہے　　مٹ جائے دین، دین کا فقط آسرا رہے
اور آسرا بھی ایسا نہ جس کا سرا رہے　　تب کربلا نے چاہا کہ دین خدا رہے
پہلے تو تختِ شام کو تختہ بنا دیا
پھر کربلا نے اپنا مصلّےٰ بچھا دیا

جب اُڑ رہی تھیں دین کے دامن کی دھجیاں　　دم گھٹ رہا تھا زیست کا لیتی تھی ہچکیاں
یعنی دیارِ دیں میں تھیں بیعت کی آندھیاں　　مڑنے کو تھی ضمیرِ بشر کی کلائیاں
کرب و بلا نے ظلم کو مبہوت کر دیا
تختِ ستم کو تختۂ تابوت کر دیا

ٹوٹے پڑے ہیں کام کے بھالے نہیں رہے　　جو تخت و تاج کو تھے سنبھالے نہیں رہے
انسانیت کے جسم کے چھالے نہیں رہے　　بیعت کی مکڑیوں کے بھی جالے نہیں رہے
رُو بہ زوال، کہتے ہیں ہر اک کمال ہے
لیکن کمالِ کرب و بلا لازوال ہے

ڈھونڈو ذرا یزید کی تربت، کہیں پہ ہے　　تربت نہیں تو کوئی علامت کہیں پہ ہے
ظالم کا ظلم، اُس کی نحوست کہیں پہ ہے　　بیعت کے طالبوں کی حکومت کہیں پہ ہے
بیعت کو قتل کر کے شہ مشرقین نے
بے شیر کو گواہ بنایا حسینؑ نے

وہ دھوپ اور تپتا ہوا دشتِ کربلا　　وہ دستِ حق پرست پہ اصغر سا لاڈلا
جوڑے اُدھر کمان میں اک تیر حرملا　　اور اس کی زد پہ اصغرِ معصوم کا گلا
کڑکی کمان، ہاتھوں پہ بچّا پلٹ گیا
خیمے میں شیر خوار کا جھولا اُلٹ گیا

بازو چھدا پدر کا، گلا شیر خوار کا تھرا گیا جگر شہِ دُلدل سوار کا
گھٹنے لگا نیام میں دل ذوالفقار کا اب سخت امتحاں ہے شہ نامدار کا
بازو بھی چھد گیا ہے اسی ایک تیر سے
کیوں کر نکالیں تیر گلوئے صغیر سے

کچھ سوچ کر حسینؑ نے بابا کو دی صدا بابا ادھر بھی دیکھئے اب وقت ہے کڑا
مشکل میں ہے حسینؑ، نہیں کوئی آسرا کیوں کر نکالوں تیر بتا دیجیے ذرا
بابا سنبھالئے میرا دل پاش پاش ہے
خیبر کا در نہیں ہے یہ اصغر کی لاش ہے

مرثیے میں مصائب کا سلسلہ علی اصغر کے گلے سے تیر نکالنے سے لے کر تدفین تک چلتا ہے۔ مولانا رئیس جارچوی اگر مرثیہ گوئی کی طرف کچھ اور توجہ فرمائیں تو یقیناً مراثی کے خزانے میں گراں قدر اضافہ ہو سکتا ہے مگر پھر ان کی خطابت کا کیا ہوگا، جس کے لئے وہ زیادہ وقت صرف کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

مولانا غضنفر عباس طوسی:- (مظفر نگر یوپی)

تاریخ ولادت ۶؍جنوری ۱۹۶۶

جائے ولادت اور وطن مالوف موضع جہال چتوڑہ ضلع مظفر نگر۔ یوپی۔ بھارت۔ والد کا اسم گرامی: حکیم صغیر احمد مرحوم۔ مورثِ اعلیٰ میر جواد علی اعلی اللہ ومقامہ ایران کے شہر طوس سے اپنے چار بیٹوں کے ہمراہ بدخشاں ہوتے ہوئے مغل دور میں ہندوستان آئے۔ اپنے زمانے کے بہترین سرجن تھے اس لئے شاہی فوج کے لئے منتخب کئے گئے۔ شجرۂ نسب تاریخ امیر میں رقم ہے۔ اپنے تعلیمی پس منظر کے بارے میں مولانا نے لکھا ہے۔

> "ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی۔ ۱۹۷۸ء میں عظیم دینی مرکز میرٹھ کے منصبیہ عربک کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۷۸ء کے اواخر میں نوگاواں سادات کے مدرسۂ جعفریہ میں داخل ہوا۔ ۱۹۸۰ میں لکھنؤ آ گیا اور یہاں کے چار بڑے مراکز علمی سلطان المدارس، جامعہ ناظمیہ،

مدرسۃ الواعظین، شیعہ عربک کالج میں اساتذۂ گرامی سے خوب خوب
استفادہ کیا۔" (مکتوب بنام عاشور کاظمی، مارچ ۲۰۰۳ء)

مولانا غضنفر عباس طوسؔی ایک عالم دین اور خطیب کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ جبکہ وہ عربی فارسی اور اردو زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ ایک دینی گھرانے کے چشم و چراغ کی حیثیت سے علمی مرتبہ ان کا ورثہ ہے۔ شعر گوئی کی صلاحیت اکتسابی نہیں بلکہ فطری ہے۔ "انہیں یاد نہیں کہ انہوں نے کب شعر کہنے شروع کیے۔ خطابت کے سلسلہ میں ان کا کہنا ہے کہ سن شعور کو پہنچنے سے پہلے ہی خطابت کا آغاز ہو گیا تھا۔ رثائی ادب سے تعلق اور مرثیہ گوئی اُن کی خطیبانہ سرگرمیوں سے متصل ہے۔ مرثیہ گوئی کی ابتدا کے بارے میں اُن کا کہنا ہے:

" پہلا مرثیہ خدائے سخن میر انیسؔ کی قبر مطہر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد سے ناظمیہ تک آتے آتے کہا تھا۔ اس مرثیے کے مطلع کا بند حسب ذیل ہے ۔

رب جلیل، دولت الہام دے مجھے　　علم و یقیں کا خوب سا انعام دے مجھے
اعزاز بے پناہ دے اکرام دے مجھے　　ایمان کل کا واسطہ اسلام دے مجھے
سلماں کے دستگیر کی ڈیوڑھی نصیب ہو
سارا جہاں کہے مجھے اچھے خطیب ہو

مولانا کو یہ یاد نہیں کہ جس دن انہوں نے یہ مرثیہ کہا اُس دن تاریخ کیا تھی سن کیا تھا۔ جس سے اندازہ ہوتا کہ عمر کی ابتدائی حصہ کی بات ہے۔ اس بند میں جو دعا کی گئی ہے اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ نوعمری کی بات ہے لیکن غضنفر عباس کو دولت الہام، علم و یقین، اور انعام و اکرام خداوندی کا اعزاز بھی ملا اور " سارا جہاں یہ کہہ اُٹھا اچھے خطیب ہیں"۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ وہ اچھے خطیب ہی نہیں اچھے شاعر بھی ہیں ایسے شاعر جنہیں وہ ممدوح ملے ہیں جن کی اوصاف لاثانی ہیں اور جن کی مدح و ثنا کی وسعتیں لامحدود ہیں۔ پہلے ہی مرثیہ کے بعد مولانا غضنفر عباس طوسی کی مرثیہ گوئی میں روانی آ گئی۔

اُن کا دوسرا مرثیہ حضرت عباس کے احوال کا مرثیہ ہے جو رثائی ادب میں ایک قادر الکلام شاعر کی تخلیق کی حیثیت رکھتا ہے اس کے چند بند درج ذیل ہیں۔

گلشن خواہش حیدر کا گلِ تر عباسؑ　۱　کربلا تیری شریعت کا پیمبر عباسؑ

پیاس میں بھی ہے وفاؤں کا سمندر عباسؑ   جو بلا تیغ لڑا ایسا غضنفر عباسؑ
فوج نظروں پہ اُٹھا کے درِ خیبر کی طرح
ہو بہو لگتا ہے میدان میں حیدر کی طرح

اس جری نے لقبِ ثانی حیدر پایا ۲ بیٹا زہرا نے کہا ایسا مقدر پایا
جس میں شبیر پلے اس نے وہی گھر پایا   تربیت کے لئے ماحول بھی اطہر پایا
بھائی کہہ کر اسے بچپن سے بلایا اکثر
اس کا گہوارہ بھی زینبؑ نے جھلایا اکثر

کون بتلاتا کہ شبیر کی عظمت کیا ہے ۳ فرما برداریٔ مظلوم کی قیمت کیا ہے
کون معصوم ہے معصوم کی طاعت کیا ہے   نفس انسان کے لئے رمز طہارت کیا ہے
باضمیروں کو ازل سے تھا یہی اک احساس
فکر نے بڑھ کے پکارا کہ مدد یا عباس

آئے عباس خیالوں میں تو تطہیر ملی ۷ زندگی خاک ہوئی جاتی تھی اکسیر ملی
خانۂ کعبہ کے ابہام کو تفسیر ملی   خوابِ خلقت نے کہا جھوم کے تعبیر ملی
قلب حیدر میں جو تھا آج وہ ارماں آیا
سجدہ کر، کرب و بلا تیرا نگہباں آیا

قدر انسان بنانے کے لئے کافی ہے   شمع ایمان جلانے کے لئے کافی ہے
راہ عرفان دکھانے کے لئے کافی ہے   ایک عباسؑ زمانے کے لئے کافی ہے
جب یہ پھیلے گا تو پھر ظلم سمٹ جائے گا
حاکم شام کا بستر بھی لپٹ جائے گا

وہی عباسؑ جو ورثے میں شرافت پائے ۱۰ وہی عباس جو ترکہ میں شجاعت پائے
جنگ جعفر کی سی، حمزہ کی سی ہمت پائے   جو اگر شاہ سے لڑنے کی اجازت پائے
پھر کہیں ظلم کا لشکر ہو نہ کینہ نکلے
خود قیامت کی جبیں سے بھی پسینہ نکلے

اس علمدار کی تا حشر علمداری ہے ۱۲ دونوں عالم میں شہ دیں کی عزاداری ہے

ذہن باطل یہی ضرب بڑی کاری ہے　　مشک عباسؑ سمندر سے کہیں بھاری ہے
ہاشمی خون جو یثرب میں ضیاء بار ہوا
کربلا میں وہی عباسؑ علمدار ہوا

مولانا غضنفر عباس طوسیؔ نے کئی مرثیے کہے ہیں۔ان کا ایک مرثیہ حضرت علی اصغر کے احوال پر ہے اس کے دو بند نذر قارئین ہیں ۔

اسے ضرورت تیر و تبر نہیں ہوگی　　جو رات اس سے لڑے پھر سحر نہیں ہوگی
بغیر اس کے تو حاصل ظفر نہیں ہوگی　　قتال کرب و بلا معتبر نہیں ہوگی
جب اس کے لب پہ ہنسی کی بہار آتی ہے
سلام کرنے سے اسے ذوالفقار آتی ہے

علیؑ مثال، محمدؐ جمال ہے اصغر　　زوال جس کو نہیں وہ کمال ہے اصغر
جناب فاطمہ زہرا کا لال ہے اصغر　　جواب جس کا نہیں وہ سوال ہے اصغر
جو اس کو تول لے، پیمانہ ایسا ڈھل نہ سکا
زمین و عرش سے اس کا لہو سنبھل نہ سکا

☆☆☆☆☆

جمشید امروہوی:- (امروہہ)

تاریخ ولادت یکم جنوری ۱۹۶۷ء

نام، جمشید کمال، تخلص، جمشیدؔ، وطن ۔امروہہ۔ والد کا اسم گرامی ۔سید علی رہبر نقوی۔ پیشہ درس و تدریس۔ تعلیم، ایم اے (انگریزی)۔ایم ۔اے (تاریخ)، ایم ۔اے (اردو)۔ایم ایڈ، پی ایچ ڈی۔ جوش ملیح آبادی پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔مقالے کا عنوان "مراثی جوشؔ کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ" تھا جو ہندوستان میں جوشؔ کے مراثی پر غالباً پہلی تحقیقی کاوش ہے، بلکہ اس سچائی کے پیش نظر کہ پاکستان میں بھی جوشؔ پر تحقیقی کام نہیں ہوا ہے، یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جوشؔ کے مراثی پر ڈاکٹر جمشید امروہوی نے جو کام کیا ہے وہ غالباً جوش شناسی کی طرف پہلا قدم ہے۔

جمشید امروہوی کی شعر گوئی کا آغاز بھی نوحے۔ سلام اور رثائی نظموں سے ہوا ہے اور اس کے اسباب تعلیمی سفر میں رثائی ادب پر تحقیق، امروہہ کا رثائی ادبی ماحول اور جمشید امروہوی کے ماموں ڈاکٹر عظیم امروہوی کا فیضانِ صحبت ہیں۔ جمشید امروہوی نے غزلیں بھی کہی ہیں اور خوب کہی ہیں لیکن اُن کے تغزل میں بھی کربلا کا استعاراتی اور حوالہ جاتی استعمال بکثرت پایا جاتا ہے ؎

"دیکھنا ہے کہ کون رُکتا ہے
اب دیے کو بجھا دیا جائے"

اور جمشید امروہوی کی نظموں میں یہ استعاراتی انداز براہ راست تخاطب بن کر سامنے آیا ہے۔ راقم السطور کی نظر سے اُن کی چند نظمیں گذاری ہیں جو مسدس کی ہیئت میں نہیں ہیں اور جمشید امروہوی نے اُنہیں مرثیہ کا نام بھی نہیں دیا مگر ان نظموں کو پڑھ کر رگوں میں خون کی گردش تیز ضرور ہو جاتی ہے۔ اُن کی نظم "ایک سوال" اس اسلوب کی ایک اچھی مثال ہے، "ایک سوال" دراصل برستے بادلوں سے ایک سوال ہے اس طویل نظم کے کچھ مصرعے درج ذیل ہیں جو مکمل نظم نہ ہونے کے باوجود شاعر کے اسلوب نظم گوئی کا پتہ دیتے ہیں ؎

چار سُو شور تھا، گریہ تھا، عجب منظر تھا
سامنے ظلم کا، دہشت کا، بڑا لشکر تھا
ہر طرف آگ برستی تھی سُلگتی تھی ہوا
ان برستے ہوئے شعلوں میں قبیلہ حق کا
بچّہ بچّہ جہاں پیاسا تھا، بہت پیاسا تھا

پیاسے بچّوں کی صدائیں نہیں پہنچیں تجھ تک
صبر کے خیموں میں شعلے نہیں دیکھے تو نے
چیخ کیا پیاس کی تجھ کو نہ سنائی دی تھی
سوکھے کوزوں کا نظارا نہیں دیکھا تو نے
پیاسے بچّوں کا بلکنا نہیں دیکھا تو نے

کیا تیرے پاؤں میں زنجیر پڑی تھی اُس دن
ظلم کا تو بھی طرفدار تھا شاید، ورنہ
پورے آکاش میں خیموں کا دھواں تھا اُس دن
اے برستے ہوئے بادل تُو کہاں تھا اُس دن

جمشید امروہوی نے ابھی تک دو مرثیے کہے ہیں۔ اُن کے مرثیوں میں جستجو کی آب و تاب ہے۔ نئے سورج کی تابانی کی جھلک ہے۔ وہ بڑے انہماک سے مرثیہ کہہ رہے ہیں۔ اُن کا پہلا مرثیہ ''فرض'' ہے۔ ''فرض انسان کو انسان بنا دیتا ہے'' اس مرثیے میں اُنہوں نے اپنی فکر کی روشنی میں فرض کی تشریح کی ہے اور اس تشریح کو کربلا میں فرائض کی ادائیگی کے منظرنامے میں حضرت عباسؑ کو ادائیگیٔ فرض کی اعلیٰ ترین منزل پر دیکھا ہے۔ اخبار 'نظارا' لکھنؤ نے اُن کے اس مرثیے کے کچھ بند ''وفاؤں کا پیمبر'' کے زیرِ عنوان شائع کیے ہیں۔ ڈاکٹر جمشید امروہوی کے اسلوب کی قدرت دیکھیے کہ اُنہوں نے کمال شائستگی سے اپنی عقیدت کو حضرت عباس علیہ السلام کا رجز بنا دیا ہے جو بہت بھلا لگتا ہے۔

گردنِ ظلم پہ چلتی ہوئی تلوار ہوں میں ہر وفادار کا ہر لمحہ مددگار ہوں میں
بے وفاؤں کے کلیجے پہ گراں وار ہوں میں ظلم کے سامنے فولاد کی دیوار ہوں میں
ایک ٹھوکر ہی میں صحرا کو سمندر کر دوں
چھو کے پتھر کو بھی چاہوں تو میں کوثر کر دوں

میرے قدموں کو یہ اللہ نے بخشا ہے ہنر یا علی کہہ کے لگاؤں میں جہاں بھی ٹھوکر
چشمہ آب وہیں پر تمہیں آئے گا نظر میں وہ سقہ ہوں کہ قربان ہوں جس پر کوثر
خود میری پیاس کو دریا کا سلام آتا ہے
کانپ اُٹھتی ہے زمیں جب میرا نام آتا ہے

دینِ الفت میں وفاؤں کا پیمبر ہوں میں ہو اگر ہاتھ میں تلوار تو حیدر ہوں میں
قلعہ صبر کی بنیاد کا پتھر ہوں میں تشنہ کاموں کیلئے ایک سمندر ہوں میں
حکمِ آقا کی میرے پاؤں میں زنجیریں ہیں
میری ہر سانس میں چلتی ہوئی شمشیریں ہیں

خوف آتا ہے میرے نام سے انسانوں کو
میں نگاہوں سے فقط جیت لوں میدانوں کو
میں جو چاہوں تو پلٹ سکتا ہوں طوفاں کو
کیونکہ شبیرؑ نے چوما ہے میرے شانوں کو
موت کو بعد میں آنے کی نہ زحمت ہوتی
جنگ کرنے کی اگر مجھ کو اجازت ہوتی

اس مرثیے میں، اس رجز میں جمشید امروہوی نے ایک ایسا بند بھی کہا ہے جسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ عباس کا رجز آج بھی فضاؤں میں گونج رہا ہے۔

میری دہشت سے لرزتا ہے یہ پانی اب تک
ہے میرا نام وفاؤں کی نشانی اب تک
میرا تاریخ میں مل پایا نہ ثانی اب تک
دین کے خون میں مجھ سے ہے روانی اب تک
پیاسے بچوں کے لئے سب بڑی آس ہوں میں
جس سے شبیرؑ کو ڈھارس تھی وہ عباسؑ ہوں میں

جمشید امروہوی کے دوسرے مرثیے کا عنوان ''آفتاب کربلا'' ہے۔ اس مرثیے کا ابتدائیہ مصرع ۔ ''روئے زمیں پہ وجہ حرارت ہے آفتاب'' مرثیے کی اُٹھان کی خبر دے رہا ہے۔ ڈاکٹر جمشید امروہوی کی لگن، تعلیمی پس منظر۔ خاندانی ورثہ اور عظیم امروھوی ایسے ماہرِ فن مرثیہ نگار کی رہنمائی کی موجودگی میں یقین ہے کہ جمشید امروھوی مرثیہ نگاری میں اہم مقام حاصل کریں گے۔ انشاءاللہ

☆☆☆☆☆

مغرب میں آباد اُردو مرثیہ گو شعراء

	اسم گرامی	موجودہ سکونت		ولادت	صفحہ
☆	امیر امام حُر	لندن	برطانیہ	۱۹۲۸ء	۱۰۸۸
☆	باقر زیدی	میری لینڈ	امریکہ	۱۹۳۶ء	۱۰۹۲
☆	شہاب کاظمی	نیو جرسی	امریکہ	۱۹۲۳ء	۱۰۹۸
☆	عابد جعفری	ٹورنٹو	کینڈا	۱۹۵۰ء	۱۱۰۴
☆	صفدر ہمدانی	لندن	برطانیہ	۱۹۵۰ء	۱۱۱۰
☆	عارف امام	لاس اینجلس	امریکہ	۱۹۵۶ء	۱۱۱۵

شاعرات

	اسم گرامی	موجودہ سکونت		ولادت	صفحہ
☆	عشرت آفرین	ہیوسٹن	امریکہ	۱۹۵۶ء	۱۱۱۹
☆	سلطانہ ذاکر ادا	کیلی فورنیا	امریکہ	۱۹۲۹ء	۱۱۲۰

☆☆☆☆☆

امیر امام حُر:- (لندن)

ولادت۔ ۱۴ جنوری ۱۹۲۸ء

نام۔ سید محمد امیر امام، تخلص حُر۔ جائے ولادت محلہ گولہ گنج لکھنؤ۔ سلسلۂ نسب: والد گرامی سید رضا امام، دادا سید علی امام، پردادا، ممتاز ادیب شاعر اور دانشور سید امداد امام اثر۔ ننھیال کی جانب سے مہاراجہ صاحب محمود آباد محمد علی محبّ کے نواسے ہیں اور راجہ صاحب محمود آباد محمد امیر احمد خاں محبوبؔ کے داماد ہیں۔

تعلیم:

اردو عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں حکیم سید مصطفیٰ حسین کیفی کے زیر نگرانی ہوئی اور تکمیل سید سبط الحسن فاضل ہنسوی کی نگرانی میں ہوئی۔ انگریزی کی ابتدائی تعلیم حضرت مآئی جائسی نے دی۔ لکھنؤ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد انگلستان کی کیمرج یونیورسٹی سے فلسفہ، نفسیات، اخلاقیات، اور منطق پڑھی۔ بعد ازاں عربی اسلامی تاریخ میں (spcialisation) تخصیص حاصل کی۔ لندن آنے سے قبل ۶۶/۱۹۶۵ء تک وہ کراچی میں راجہ صاحب محمد امیر احمد خاں محبوبؔ (راجہ محمود آباد) کے قائم کردہ سراج الدولہ کالج میں طلباء کو علم نفسیات پڑھاتے رہے۔

شاعری:

ددھیال میں شعر ادب کی روشنی، ننھیال میں ادب شعر کا اُجالا، استاتذہ شاعر۔ اتالیق شاعر، شعر و ادب کے اس ماحول میں پروان چڑھنے والا ہونہار طالب علم اگر ذوق شعر گوئی سے محروم ہو تو حیرانی ہوسکتی ہے لیکن سید امیر امام حُر نے ۱۴ برس کی عمر میں (۱۹۴۲ء) شاعری شروع کی تو حیرانی کی بات نہ تھی۔ اُنہوں نے غزل یا کسی اور صنف سخن کی بجائے ''سلام'' سے ابتدا کی اور پہلا سلام کہا تو اپنے ماموں راجہ صاحب محمود آباد کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کیا۔ اُنہوں نے اپنے استاد گرامی مرتبت مولانا ظفر مہدی صاحب گہرؔ جائسی کو پیش کیا۔ حضرت گہر جائسی نے امیر امام حرؔ کی حوصلہ افزائی کی اور کلام کی اصلاح کی ذمہ داری کو قبول فرمایا۔ کچھ کلام پر حضرت مآئی جائسی نے بھی اصلاح دی۔ پہلا مرثیہ ۱۹۴۹ء میں کہا۔

سید امیر امام حُر نے رباعیات اور مرثیہ گوئی کی ہے۔ مرثیے پر اُن کی نظر گہری ہے۔ اُنہوں نے مرثیے پر مضامین بھی لکھے ہیں اور مرثیے کی تجزیہ نگاری بھی کی ہے۔ نجم آفندی کی ہندی

شاعری پر اُن کا بصیرت افروز مضمون (مطبوعہ "النجم" فروری ۱۹۷۷ء) آج بھی علم و آگہی کا مشعل بردار ہے۔ راجہ صاحب محمود آباد کے کلام پر اُن کا تبصرہ "مرثیہ سرائی محبوبؔ" (مطبوعہ طلوعِ افکار، جلد ۷ شمارہ ۹) بھی تحقیق و تجزیہ نگاری کی قابلِ ستائش مثال ہے لیکن سید امیر امام حرؔ کی شناخت اُن کی مرثیہ نگاری ہے۔ اُن کا پہلا مرثیہ "دمُوغ و مھجٌ" "فکر و عمل" ہے۔ اس ایک مرثیہ کے تین باب ہیں۔ پہلا باب (جسے اُنہوں نے فصل اوّل کہا ہے) کی ابتدا حمد سے ہوتی ہے۔ (پہلے بند سے بند ۵۰ تک)

جہاں سحابِ مشیت میں تھی بہارِ وجود　۱　گواہ صنعتِ مانع ہے خار خار وجود
نوائے راز سناتا ہے تار تارِ وجود　　بھڑک رہی ہے خلائے عدم میں تار وجود
عجیب و باعث حیرت چمن ہے ہستی کا
علامتِ یدِ قدرت، چمن ہے ہستی کا

اس فصل میں امیر امام حر نے بنی اُمیہ کے رویّے کو اللہ کی ذات پر یقین سے انحراف کہا ہے۔

خدا سے پھر گئی دنیا عجیب طور ہوا　۹　زمین اور ہوئی آسمان اور ہوا
بنی اُمیہ کے ہاتھوں جو ظلم و جور ہوا　　جہاں میں پھر اسی رسمِ ستم کا دور ہوا
خدائے عادل و قہار کا یقیں نہ رہا
بدی و خوبیٔ کردار کا یقیں نہ رہا

اور اس رسمِ ستم کے دور میں جو کچھ ہوا اس کا ذکر کرتے ہوئے اس دور کو علیؑ، جناب سیدہ اور اولادِ علی پر مصائب کا دور قرار دیتے ہوئے فصل اوّل کا اختتام کیا ہے۔

کہاں ہے نور نگاہ نبی و بنتِ نبی　۵۰　کہاں ہے وارث عدلِ و سخائے مرتضوی
جہاں تو ظلم سے اب پُر ہے یا علیؑ ولی　　کہاں ہے حاملِ شمشیرِ برق زائے علی
"زمانہ بر سرِ جنگ است، یا علیؑ مددے"
مدد ز غیرِ تو ننگ است یا علیؑ مددے"

اس مرثیے میں فصل دوئم "اذکار خرد و خرد مندی سے شروع ہوتی ہے۔

فروغ صدق سے اے طبعِ ضوفشاں پھر ہو　۵۱　رموزِ فطرتِ عالم کی راز داں پھر ہو

مثالِ موجۂ تسنیم ہاں رواں پھر ہو کمالِ اوج میں ہم دوشِ کہکشاں پھر ہو
ورائے کا ہکشاں کچھ نہیں جو زد میں نہیں
کوئی جہان نہیں جو خودی کی حد میں نہیں

خرد ہمشہ نئی رہ تلاش کرتی ہے ۶۰ تمام مفرضوں کے راز فاش کرتی ہے
عوض اصول و طریق معاش کرتی ہے جہان کہنہ کو یہ پاش پاش کرتی ہے
سریر شاہوں کے زیر و زبر کیئے اس نے
ہزار بتکدے مسمار کردیئے اس نے

اور خرد سے علم، شک، تعصب تک خردومندانہ تبصرہ کرتے ہوئے شمع فکر کو دل تک لائے ہیں اور دلوں میں دل، علی کا دل جو سرشار عشقِ نبی تھا، یہی عشق منزل شہادت تک لے گیا شہادت کے باب میں شہیدوں کا ذکر، خون شہدا کی قیمت، وفا کی اہمیت، اور یہ سلسلہ ابوذر کی وفا پرستی تک پہنچتا ہے۔

کسے ہے شبہہ ابوذر کے عزم و ہمت میں مجال شک نہیں ضرغام دیں کی جرأت میں
بتا کے فرق چلی ظلم اور عدالت میں ۱۰۹ اُٹھا جہان سے وہ بیکسی و غربت میں
اس سے شور تھا برپا ہر ایک محفل میں
سما گئی تھی جو آواز پردۂ دل میں

فصل دوئم بند ۵۱ سے بند ۱۰۹ تک ہے۔ فصلِ سوئم کا آغاز عہد ابوتراب سے ہوتا ہے (بند۔ ۱۱۰ تا ۲۵۷)

جب انتقام کی موجوں میں پیچ و تاب آیا دبا نہ جور سے پھر وہ جو انقلاب آیا
جو نور عدل و کرم تھا وہ آفتاب آیا ۱۱۰ سوادِ ظلم مٹا، عہدِ آفتاب آیا
"ستارۂ بدرخشید و صدرِ مجلس شد
دل رمیدۂ مارا انیس و مونس شد"

اس فصل میں عہد بوتراب کے حوالے سے جنگ جمل وصفین ہی نہیں، خیبر وخندق کے حوالے بھی ہیں یعنی ماضی اور اس دور کی تاریخ کے ایک ایک موڑ کو نظم کیا ہے۔ مرثیے کا اختتام شہادت امیر المومنین علی ابن طالب پر ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ مرثیہ حمد باری تعالی سے شروع ہو کر

اُس کے عظیم بند ے علی مُرتضیٰ کی شہادت پر ختم ہوتا ہے۔ مرثیے کے ۲۵۷ بند ہیں، یہ مرثیہ ۱۹۵۴ء میں کہا گیا جسے سرفراز قومی پریس لکھنؤ نے ۱۹۵۵ء میں شائع کیا۔

دوسرا مرثیہ ''ہے پر کشائے خردِ عقدۂ وجود و عدم'' ۱۰۰ بند۔ (۱۹۵۸ء) جو پندرہ روزہ 'ارشاد' کراچی مدیر (مولانا جواد الاصغر) میں شائع ہوا۔

تیسرا مرثیہ ۔ ''دل ستم زدہ میزانِ عدل داور ہے'' عنوان (کرب و بلا) یہ مرثیہ انہوں نے ۱۹۵۹ء میں کہنا شروع کیا۔ سید ضمیر اختر نقوی (اردو مرثیہ اکستان میں) کے مطابق نے ۱۹۷۰ء تک امیر امام حرؔ اس مرثیے کے ۱۰۱۷ بند کہہ چلے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۸۰ء تک ۱۲۰۰ بند کیے جا چکے تھے، اس درمیان میں اُنہوں نے ایک مرثیہ ''عوامل'' کے زیر عنوان کہا۔

''حالات سے خیالوں میں آتا ہے انقلاب''

اس مرثیے کا سنہ تخلیق ۱۹۶۱ بتایا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک اور مرثیہ۔

''دل ہے پروانۂ انوار شبستانِ ازل'' کہا لیکن ساتھ ساتھ اس مرثیے میں بھی بند (بندوں) کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔۔ بالواسطہ معلوم ہوا ہے کہ لندن قیام کے دوران پچاس ساٹھ بند اور کہے گئے ہیں۔

اردو مرثیہ نگاری میں طویل مرثیے کہنے والوں میں سید امیر امام حُر کا نام پہلا نام نہیں ہے اس ضمن میں انیسویں صدی میں میر انیسؔ کے ایک شاگرد فارغؔ سیتاپوری اور بیسویں صدی میں حمید حسین پانی پتی کا ایک طویل مرثیہ مطبوعہ ۱۹۲۳ء ہے، البتہ سید امیر امام حرؔ کے طویل مرثیے کے خصوصیت یہ ہے کہ جن دو طویل مرثیوں کا ذکر کیا گیا وہ کلاسیکی مرثیے کی روایت کے حامل ہیں جبکہ سیّد امیر امام حرؔ کا یہ مرثیہ اُن کی عالمانہ، فلسفیانہ اور جُداگانہ طرزِ مرثیہ گوئی کا نمائندہ جدید مرثیہ ہے۔

سید امیر امام حرؔ عربی، فارسی، انگریزی اور اردو میں شعر کہتے ہیں اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان علوم پر اُن کی کتنی دسترس ہے کہ وہ اُن زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ تاریخی واقعات کے معاملے میں وہ بہت چھان بین کرتے ہیں اسی لئے سلاطین کے زیر جبر و اثر لکھی ہوئی تاریخ اور وقوع پذیر واقعات کی تاریخ میں فرق اُن پر عیاں ہے۔ اس لئے اُن کے مراثی میں علم، فلسفہ، تاریخ اور فکر و نظر کے اُجالے یک جا نظر آتے ہیں۔

مرثیہ گو شاعر اگر ظلم کے خلاف نہ ہو تو مرثیہ نہیں کہہ سکتا۔ سید امیر امام حرؔ کا تعلق اسی قبیلے

سے ہے جو ظالم کے خلاف ہے اور مظلوم کے ساتھ ہے۔ مغرب میں آباد اردو مرثیہ گو شعراء سے ہماری گفتگو بھی ہوئی ہے اور ان کے جدید مرثیے بھی ہمارے سامنے ہیں۔ ترقی پذیر قوموں کے ساتھ خود کو مہذب کہنے اور سمجھنے والی اقوام کی جارحانہ کارروائیوں سے بیزار اور ناخوش اہل قلم ایک گھٹن کا شکار ہیں۔ سید امیر امام حرؔ نے شاید اکیسویں صدی کے سیاسی اثرات کا زیادہ اثر قبول کیا ہے اور گوشہ نشینی کی زندگی کو اپنا لیا ہے جبکہ فرد کو، ملت کو، اقوام عالم کو امیر امام حرؔ ایسے دانشمندوں کی ضرورت آج بہت زیادہ ہے۔ خدا اُن کی توفیقات میں اضافہ کرے۔

☆☆☆☆☆

باقر زیدی:- (میری لینڈ امریکہ)

۲۶ر ستمبر ۱۹۳۶ء

نام، باقر حسن۔ تخلص، باقر۔ زیدی سید، جائے پیدائش و وطن مالوف بھرت پور۔

والد گرامی، ممتاز مرثیہ گو، سید فرزند حسن زیدی فیضؔ بھرتپوری تھے۔ دادا، سید اکرام حسین کلیمؔ بھرتپوری بھی ایک معروف و مستند شاعر تھے۔ خاندان کے دوسرے شعراء کے علاوہ خواتین بھی شعر کہتی تھیں جو تہذیب و تمدن کے زیر اثر، سلام، منقبت تک محدود رہتی تھیں، باقر زیدی نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہاں آسودگی ہی آسودگی تھی۔ خاندانی وجاہت تھی۔ نسبی نجابت تھی، اقتصادی استحکام کی طاقت تھی اور اس استحکام کے ساتھ علم و دانش کی حکمت بھی تھی۔ مزاجوں میں شرافت تھی، دلوں میں مودّت تھی۔ اس طرح غموں سے بے نیاز ماحول میں پلنے بڑھنے والے ۱۱ر برس کے بچے کو جب تقسیم ہند کے بعد بھرت پور میں اجداد کی اُس حویلی سے نکلنا پڑا جس کے صدر دروازے سے ہاتھی پر سوار گذر جا سکتا تھا اور کراچی آکر اُن گلی کوچوں میں رہنا پڑا جہاں آزادی کے بعد اُمید و بیم کے دھند لکے تھے۔ لوگ ماضی سے گذر کر مستقبل کی طرف جا رہے تھے اور حال کی بے چینیوں کو آنے والی کل کی اُمیدوں کے سہارے برداشت کر رہے تھے۔ گیارہ برس کے باقر حسن نے اپنے باپ کی پیشانی کی لکیروں کو پڑھا اور اپنے ننھے سے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ نئی دھرتی میں، آزاد وطن کی آزاد زمین میں، اپنی محنت بوئے گا اور مسرتوں کے سورج اُگائے گا۔ پس ارادہ کر لیا گیا۔ قدم آنیوالی کل کی خوشگوار وادیوں کی طرف بڑھنے لگے۔ باقر نے تعلیم مکمل کی اور بینکاری کے شعبے سے وابستہ ہو گئے۔ اس اثنا میں ان کے والد گرامی حضرت فیضؔ بھرتپوری کی شاعری کا

سورج نصف انہار پر چمکتا رہا اور باقر زیدی بینکاری میں ترقی کی منزلیں طے کرتے رہے۔

اپنی شاعری کے بارے میں وہ خود رقم طراز ہیں۔

''شعر گوئی کا ہنر ہمیں بھی گھٹی میں ملا، شعر کہنا کسی نے سکھایا نہیں اس لیے کوئی استاد بھی نہیں بنایا۔ ہجرتوں میں فکرِ تکمیل تعلیم اور معاشی ضروریات کے پیش نظر ایک بہت بڑی مدت یعنی نصف صدی تک ذوق شعر گوئی معرضِ التوا میں رہا شاید اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ والد گرامی قدر جناب فیضؔ بھرتپوری مرحوم نے اس خاندانی ورثہ کی نگہداشت کا کام اپنے ذمہ خوش اسلوبی سے لیا ہوا تھا اور ہم اپنی راہِ جواز اس میدان میں نہ پاتے ہوں لیکن جب مرحوم کی قوت گویائی فالج کی نذر ہو گئی تو ہمارے اندر موجود شاعر نے میدان عمل میں آکر اس خاندانی ورثہ کی ذمہ داری سنبھالنے کی حامی بھرلی۔ (پیش لفظ'' لذت گفتار'' مصنف باقر زیدی)

''لذت گفتار'' باقر زیدی کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے پیش لفظ میں باقر زیدی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ۱۹۸۷ء میں جب وہ نیشنل بینک آف پاکستان میں وائس پریزیڈنٹ کی حیثیت سے کوئٹہ بلوچستان میں تھے اس وقت خطیب عالم اسلام علامہ طالب جوہری کی ترغیب پر باقر زیدی نے شاعری کا آغاز کیا۔ شاعری تو دل میں موجزن ایک طوفان کی طرح ہوتی ہے جسے روکا نہیں جا سکتا، ''لذت گفتار'' کی شاعری پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ باقر زیدی born poet ہیں یعنی شاعری کی صلاحیت اُن کی سرشت میں ہے۔ پھر اُنہوں نے اپنے اس جذبے کو کیسے روکا؟ یہ بات صرف مکتب کربلا کے طالب علموں کی سمجھ میں آسکتی ہے جو یہ جانتے ہیں کہ کربلا میں دو مرتبہ عباس علمدار کے ہاتھ میں نیام سے باہر آئی ہوئی تلوار واپس نیام میں چلی گئی اس لئے کہ بھائی حسین کا حکم تھا۔ باقر زیدی اسی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے وہ شاعری کے طوفان کو اس وقت تک روکے رہے جب تک باقر کے والد گرامی کے قلم سے شاعری کے پھول برسنے بند نہ ہو گئے۔

باقر زیدی ''لذت گفتار'' کے شاعر ہی نہیں عظمت گفتار اور صداقت گفتار کے شاعر بھی ہیں۔ غزل کی شاعری عام طور پر لذت گفتار کی شاعری ہوتی ہے۔ چہ جائیکہ باقر زیدی نے غزل میں بھی جگہ جگہ جرأت گفتار کا مظاہرہ کیا ہے جیسے ۔

تن کے اُجلے، من کے میلے، پنڈت، ملاّ، پوپ گرو

مندر، مسجد اور کلیسا، جگ ہے سارا جال، لکھوں

اور صداقت گفتار کی منزل پر باقرؔ زیدی کہتے ہیں۔

ذکر خیر البشرؐ میں رہتا ہوں

مستقل رفع شر میں رہتا ہوں

مقابل یہ طاغوت کے ہے صف آرا

عجب شان ہے قوم گریہ کناں کی

اور شاعری کی عظمت گفتار ''مرثیہ'' ہے۔ باقرؔ زیدی نے اپنے والد گرامی کے انتقال کے فوراً بعد مرثیہ گوئی کو اپنا کر اپنے گھرانے کی مرثیہ گوئی کے ساتھ خود کو مسلسل کر لیا ہے۔ حضرت کلیم بھرتپوری اور فیض بھرت پوری کے حوالہ سے یہ کہنا تو سوئے ادب ہوگا کہ باقر زیدی ''پسر تمام کنند'' کی منزل پر گامزن ہوئے ہیں لیکن بڑے ادب سے یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ باقر نے اس کشتی کے پتوار سنبھال لئے ہیں جس میں کلیم بھرتپوری سفر پر نکلے تھے اور جب، ان کے توانا بازو نہ رہے تو فیض بھرت پوری نے اس نیا کو سنبھال لیا تھا اور اب اُن کے فرزند باقر زیدی نے تولا کی اس کشتی کے پتوار سنبھالے ہوئے ہیں۔ اس حقیقت کا اقرار انہوں نے اپنے پہلے مرثیے کے مطلع میں کیا ہے۔

سر بسر اپنے بزرگوں کا چلن رکھتا ہوں مدحتِ آلِ پیمبر کی لگن رکھتا ہوں

اک مہکتا ہوا سر سبز چمن رکھتا ہوں پھول برساتا رہے۔ ایسا دہن رکھتا ہوں

اور اک لعل و جواہر کی دُکاں کھلتی ہے

اک زباں بند ہوئی، ایک زباں کھلتی ہے

پہلے مرثیہ کا پہلا بند ''میراث پدر'' کا اعلان ہے، اقرار ہے کہ بیٹے نے ''علم پدر'' سیکھ لیا ہے۔ حضرت فیض بھرتپوری کا انتقال ۱۹۸۹ء میں ہوا اور اسی سال باقرؔ زیدی نے یہ مرثیہ کیا۔ گویا روایت کی تاریخ بھی مسلسل ہے۔ اور مودّت کی ترویج میں بھی تسلسل ہے۔

باقر زیدی ۱۹۹۰ء میں میری لینڈ امریکہ چلے گئے۔ اور اب وہیں آباد ہو گئے ہیں، وہ ہر سال مرثیے کے نام پر اجتماع کرتے ہیں اور اس اجتماع میں نو تصنیف مرثیہ'' پیش کرتے ہیں۔ جیسا کہ

عرض کیا گیا پہلا مرثیہ ۱۹۸۹ء میں کہا۔ امریکہ پہنچ کر ۱۹۹۱ء سے تا حال ہر سال نیا مرثیہ کہہ رہے ہیں۔ اس طرح اب تک دس مرثیے کہہ چکے ہیں جو اُن کے مجموعہ کلام ''فراتِ سخن'' میں شامل ہیں۔

(۱)	''مرثیہ'' ۔	سر بسر اپنے بزرگوں کا چلن رکھتا ہوں	۱۹۸۹ء	کراچی
(۲)	''رفتار'' ۔	رفتہ رفتہ میری رفتارِ سخن تیز ہوئی	۱۹۹۱ء	امریکہ
(۳)	''سخن'' ۔	اُسی کے نام سے کرتا ہوں ابتدائے سخن	۱۹۹۲ء	//
(۴)	''کربلا'' ۔	آج بھی سر چشمۂ فکر و عمل ہے کربلا	۱۹۹۳ء	//
(۵)	''طاقت'' ۔	پھر وہی زورِ سخن آج دکھانا ہے مجھے	۱۹۹۴ء	//
(۶)	''اردو'' ۔	جب ضیاء بار ہوا مہر جہانِ اردو	۱۹۹۶ء	//
(۷)	''گھر''	لائق شکر ہے ہر حال میں محنت گھر کی	۱۹۹۷ء	//
(۸)	''مصحف آیاتِ سخن''	پھر کوئی تازہ سخن اے میرے پندارِ سخن	۱۹۹۸ء	//
(۹)	''اسلام اور علی''	حرفِ سخن متاعِ ہنر کر رہا ہوں میں	۱۹۹۹ء	//
(۱۰)	''دعا'' ۔	حصارِ مرضیِ معبود میں رہو باقرؔ	۲۰۰۲ء	//

یہ سارے مراثی باقر زیدی کے مجموعہ مراثی ''فراتِ سخن'' میں شامل ہیں۔ باقر زیدی کے چھٹے مرثیے ''اردو'' سے چند بند درج ذیل ہیں۔

خط تحریر کو دیکھو تو بڑا نستعلیق ۲۲ دائرے حرفوں کے صورت گرِ افکار عمیق
ہر قلمکار کی تخلیق ہے حسب توفیق شوشے الفاظ میں ہیں جیسے تراشیدہ عقیق
حرف پینتیس ہیں کل، جن سے یہ گلکاری ہے
صادقین آج نہیں پھر بھی عمل داری ہے

الف، اردو میں ہے اللہ کا، ایماں کی طرح ۲۳ ''ب'' سے بارش ہے کسی رحمت یزداں کی طرح
''پ'' سے ہیں پنجتن پاک رگ جاں کی طرح ''ت'' سے تقدیس ہے تسبیح شماراں کی طرح
''ٹ'' سے ٹوٹے ہوئے الفاظ بھی نازاں اس کے
''ث'' سے ثابت ہے کہ سب ہی میں ثناخواں اس کے

'ج' سے جامۂ ہستی، جسد جاں کی طرح ۲۴ 'چ' سے ہے چاہ کسی چاہ زنخداں کی طرح
'ح' سے حوّا، نبی آدم کے لئے ماں کی طرح 'خ' سے خط ہائے عبارت خطِ ریحاں کی طرح

'ڈ' سے ڈرک ہو، خود لوگ دبستاں بن جائیں
'ڈ' سے ڈر کے نہ ہوں، ڈھنگ کی انساں بن جائیں

'ذ' سے ہے ذہن وذکا، قوتِ پنہاں کی طرح ۲۵ 'ر' سے رشحات قلم نظم بہاراں کی طرح
'ڑ' تو بس 'ڑ' ہے کسی بے سروساماں کی طرح 'ز' سے ہیں زیروزبر پیش زباں داں کی طرح
ژاژخا 'ژ' سے کہ ژولیدہ بیاں ہوتا ہے
'س' سے سانجھ سویرے کا سماں ہوتا ہے

اس طرح الف سے یائے مجہول تک سارے حروف تہجی کی منظوم بیان کے بعد اردو زبان وداب کے شکوہ کی منظر کشی کی ہے۔

خوب سے خوب ہے، ہر عیب سے عاری اردو ۲۹ صورت حسن بیاں رحمت باری اردو
ساری دنیا کی زبانوں پہ ہے بھاری اردو ہم ہیں اردو کے تو بے شک ہے ہماری اردو
بے خبر سب کو کہ ہیں اور ہی خُو بُو والے
فخر ہے ہم کو کہ کہلاتے ہیں اردو والے

مونس و ماہر و مجروح و محبّ، مہر و منیر ۳۲ محشر و محتشم و مضطر و ممنون و مشیر
نادم و نادر و نیرنگ و نظامی و نظیر ناصر و نظم و نوا، نصرتی و نوح و نصیر
فانی و فیض و فغاں فاخر و فرمان اس کے
یکتا، نیرنگ یقیں، یاور و یزداں اس کے

راسخ و راقم و رنگین و روش، رشک و رئیس ۳۵ سوز و سجاد و سلیمان و سخن سیف و سلیس
ناطق و ناظم و ناسخ نظر و نجم و نفیس آسی و افضل و انشا و ادب اُنس و انیس
خسرو کشور اردو تو انیس آج بھی ہیں
سب ہیں اُنیس (۱۹) مگر یہ ہیں کہ بیس آج بھی

قند شیریں دہناں جسکی سلامت، وہ سلیس ۳۸ سخن عرش مکاں جس کی ریاست وہ رئیس
مطلع لطف و بیاں جس کی نفاست، وہ نفیس مقطع حسن بیاں جس کی بلاغت وانیس
جس کے ہر لفظ میں حکمت ہے۔ حکیم ایسا ہے
حاجت طور نہیں جس کو کلیم ایسا ہے

اور ایک بار پھر اکابرین اردو سے زبانِ اردو کی طرف پلٹنے کا انداز دیکھئے۔

ہے انگوٹھی میں تمدن کی زبرجد کی طرح ۵۰ پس خیال اس کا رکھیں دہر میں معبد کی طرح
بعد ایمان کے کافر نہ ہو مرتد کی طرح یاد ابجد بھی رکھو اپنے اب و جد کی طرح
مستقل غیر کی بُو باس میں بس جاؤ گے
اس کو چھوڑا کو تشخص کو ترس جاؤ گے

اہلِ غیرت کی زباں ہے تو ہے غیرت اس میں شرم اس میں ہے۔ لحاظ اس میں، مروّت اس میں
بُردباری ہے متانت ہے، شرافت اس میں شدّت مہر و محبت کی حرارت اس میں
ترک واجب کی طرح اس کا بھی کفارا ہے
یہ زباں ہی نہیں تہذیب کا گہوار ہے

ہوسکتا ہے اس چہرے کو دیکھ کر باقر زیدی کے اس مرثیے کو بھی جوشؔ کے مرثیوں کی طرح اُن کے فن کو عدم توجہی کا ہدف بنانے کی کوشش کی جائے لیکن باقر زیدی کے سامنے جوشؔ بھی ہیں اور مرثیے میں جوشؔ کا مقام بھی اور رثائی ادب کے تقاضے بھی۔ اُنہوں نے مذکورہ بند کے بعد جو گریہ کیا ہے اور وہ کربلا والوں کی عظمت و منصب کے مطابق کیا ہے اور حسینؑ کی بارگاہ سے گذرتے ہوئے باب رثا کا دروازہ، کھٹکھٹایا ہے اور آنسوؤں کا نذرانہ پیش کیا ہے۔

کربلا میں جو بپا ہے وہ قیامت دیکھو ۷۹ سب سے کم عمر مجاہد کی وہ نصرت دیکھو
باپ کے ہاتھوں پہ بچے کی شہادت دیکھو ارضِ مقتل پہ وہ اک ننھی سی تربت دیکھو
صبر و ایثار کی اک آخری منزل ہے یہ قبر
جسمِ گیتی میں دھڑکتا ہوا اک دل ہے یہ قبر

اس نے جب راہِ شہادت میں شہادت پائی ۷۲ گھر میں شبیرؑ کے اک اور قیامت آئی
ماں کی تقدیر نے ہر منزل غم دکھلائی گود ویراں ہوئی جھولے میں اداسی چھائی
اپنے سینے سے تصور میں لگاتی ہے کبھی
اور خیالوں میں اسے جھولا جھلاتی ہے کبھی

کبھی جھولے پہ نظر کی، کبھی دیکھی آغوش کبھی چلائی، کبھی ہوگئی گم سم، خاموش
روتے روتے کبھی اصغر کو ہوئی ہے بے ہوش جاں ستاں بارِ غم اصغر ناداں بردوش

غش میں رہتی ہے کبھی ہوش میں آجاتی ہے
چین دن کو نہ اسے رات میں نیند آتی ہے

جب کوئی کہتا کہ کچھ دیر کو سائے میں رہو
سختیاں دھوپ کی اس جان حزیں پر نہ سہو
سیلِ اشکِ غم جانکاہ میں استانہ رہو
کب سے چپ بیٹھی ہو لب کھولو ذرا، کچھ تو کہو
وہ یہ کہتی تھی کہ اصغر بھی میرا دھوپ میں ہے
اور سکینہ کی بھی تربت بخدا دھوپ میں ہے

باقر زیدی صرف ایک مستند مرثیہ گو شاعر ہی نہیں بلکہ ایک خانوادۂ مرثیہ گوئی کے فرد اور رثائی ادب کے وارث ہیں۔ خدا کرے اس گھرانے میں یونہی چراغ سے چراغ جلتے رہیں۔ اس گھرانے پر ردائے سیدہؑ کا سایہ رہے۔ آمین

☆☆☆☆☆

شہاب کاظمی:- (نیویارک)

تاریخ پیدائش ۱۷ فروری ۱۹۲۳ء

جائے ولادت لکھنؤ، آبائی وطن جرول۔ بقول شہاب کاظمی "پیدا تو ہمیں جرول میں ہونا چاہیے تھا مگر والد صاحب قبلہ نے بسلسلہ ملازمت لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس لئے ہم لکھنؤ میں پیدا ہوئے"

والدین کا دیا ہوا نام سید سخاوت احمد کاظمی، قلمی نام شہاب کاظمی۔ علمی ادبی نامور گھرانے کے چشم و چراغ شہاب کاظمی کو علم و ادب کی روشنی ورثے میں ملی تھی، اُن کے والد گرامی سید سخاوت محمد شاعر تھے جن کا تخلص شباؔب اور قلمی نام شباؔب جرولی تھا۔ والدۂ گرامی سیدہ فاطمہ بانو ناز دختر سرکار علامہ ہندی بھی شعر کہا کرتی تھیں۔ ان کے دادا سید سخاوت عابد کلیم موسوی شاعر تھے اور رئیس جرول کہلاتے تھے اُن کی دادی صاحبہ جعفری بیگم افسر جہاں، معروف مرثیہ گو حضرت فرزند حسن جلیؔل کی صاحبزادی تھیں۔ فرزند حسن جلیؔل کے والد گرامی سید حسن خلیل ممتاز شاعر اور مرثیہ نگار میر مہر علی انسؔ کے فرزند تھے اور میر انسؔ کے والد گرامی میر خلیق فرزند میر حسن تھے۔ فرزند حسن جلیل کے متعلق لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ وہ لاولد تھے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے انہیں اولاد نرینہ سے محروم رکھا تھا۔ مگر وہ لاولد نہیں تھے ان کی بیٹی تھیں جو شہاؔب کاظمی کی دادی تھیں۔ یہ تفصیلات

شہاب کاظمی نے اپنی کتاب ''میری قلمرو سے'' میں تحریر کی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ددھیال اور ننھیال دونوں طرف سے شہاب کاظمی علم وادب کے وارث ہیں۔ بہ ایں ہمہ وہ خود کو جرولی کہلانا پسند کرتے ہیں۔

شباب ۱۹۴۷ء میں پاکستان آگئے۔ لاہور، سیال کوٹ سے ہوتے ہوئے ''واہ'' کینٹ آن بسے۔ واہ کی اہمیت آرڈیننس فیکٹری کی وجہ سے ہے جہاں شہاب کاظمی کو ٹریننگ کے لئے داخل کردیا گیا لیکن ایک شبنم مزاج شاعر کو یہ زندگی پسند نہ آئی اور جو کچھ کیا دھرا تھا وہ چھوڑ چھاڑ کر ۱۹۶۱ء میں کراچی آگئے اور میونسپل کارپریشن سے وابستہ ہوگئے۔ ۱۹۷۸ء میں سینٹرل بینک آف لیبیا تریپولی (لیبیا) میں چلے گئے۔ ۱۹۸۲ء میں پاکستان واپس آئے۔ اور ۱۹۸۷ء میں خود اپنے قول کے مطابق ۔ ''بہت مجبور ہوکر طائروں نے آشیاں بدلا'' گنگناتے ہوتے ہوئے امریکہ آگئے۔ اوردل میں آج بھی خواہش رکھتے ہیں کہ پاکستان میں Low & Order میں سدھار پیدا ہو تو ریٹائیرمنٹ کے بعد پاکستان جابسیں۔

شہاب کاظمی نے نویں جماعت سے شاعری شروع کردی تھی لیکن اس جوہر کی جلا کراچی میں ہوئی۔ یادش بخیر ۶۵ / ۱۹۶۴ء کا زمانہ تھا جب کراچی میونسپل کارپوریشن کے دفتر میں جعفری، سخاوت احمد کاظمی، عاشور کاظمی، فلسنار محمد علی کے برابر بزرگ بھیا اور ایک سوختہ ساماں شاعر اختر سکندروی کی محفل سجا کرتی تھی۔ سخاوت کاظمی شعر نہیں سناتے تھے۔ عاشور کاظمی نے بحیثیت شاعر رسوا ہونے کے باوجود ہمیشہ شعر سنانے سے احتراز کیا۔ سارا نزلہ برعضوِ ضعیف گرتا تھا اور ہرروز اختر سکندروی کو شعر سنانے پڑتے تھے۔ جن میں سے کچھ ابھی تک یاد ہیں ۔

حُسن اس شان سے چلتا ہے خدا ہو جیسے ۔۔۔ زیرِ پا چاند ستاروں کی ردا ہو جیسے
میرے چہرے پہ ترا نام لکھا ہو جیسے ۔۔۔ اس تعلق سے مجھے دیکھ رہی ہے دنیا

کراچی میں علامہ نصیر الاجتہادی کے دولت کدے پر بھی شہاب کاظمی سے ملاقاتیں رہیں علامہ نصیر الاجتہاد صاحب، شہاب کے ماموں تھے اور ناچیز کا اُن سے رشتۂ نیازمندی تھا جسے علامہ کی اعلیٰ ظرفی نے ہمیشہ دوستی کا نام دیا۔ اس دور میں شہاب کاظمی کی شعر گوئی کا تو علم تھا مگر یہ اندازہ نہ تھا کہ اس ہنستے کھیلتے نوجوان ساتھی کے قلب میں شعروسخن کا قلزم سمایا ہوا ہے اور قدم قدم پر تبسم کی خیرات بانٹنے والا کبھی آنسوؤں کو اپنی شاعری کا عنوان بنائے گا۔ ۱۹۸۲ء میں جب

شہابؔ کاظمی لیبیا سے واپس آئے تو راقم الحروف ترک وطن کر کے لندن آ چکا تھا۔ ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۷ء کے دوران حضرت ولی جارچوی۔ ثمر ہوشنگ آبادی۔ نفیس فتح پوری اور دبستان کراچی نے نامور مرثیہ گو شعرا کی ضیا پاشیوں کے درمیان سے عزائی ادب کا سورج طلوع ہوا اور ایک نام سامنے پر آگیا۔ شہابؔ کاظمی کا نام۔ اُنہوں نے حضرت نفیس فتح پوری کی ترغیب پر مرثیہ کہا جو ۱۹۸۵ء میں مکمل ہوا۔ مرثیے کا عنوان ''زمین کی زبانی'' تھا۔

دکھلائی روشنی کی کرن آفتاب نے	باندھا جو مرثیے کا ارادہ شہاب نے
مجھ سے کہا پھڑک کے رگِ انتخاب نے	سید ھا کیا قلم، کرم بوتراب نے

یہ کام کر سکو تو بڑا کام ہے یہی
دنیا میں باغِ خلدؔ کا آرام ہے یہی

دل مرثیہ نگاروں کے رستے پہ چل پڑا	پھر کیا تھا لے کے نام علی کا، نکل پڑا
نادعلی پڑھی جو بیاں میں خلل پڑا	لغزش ہوگی قلم میں نہ چتون میں بل پڑا

رستہ تھا اجنبی تو مددگار بھی تو تھے
ہمراہ عقل و ہوش سے انصار بھی تو تھے

اس مرثیے میں شاعر نے زمین کو گواہ بنایا ہے اور زمین نے جو کچھ بتایا ہے وہ صیغۂ واحد متکلم (direct speech) میں شاعر نے نظم کیا ہے۔ مرثیہ حضرت عباس کے احوال پر ختم ہوتا ہے۔ یہ مرثیہ ۹۶ بندوں پر مشتمل ہے۔ دیکھئے زمین اس منظرنامے کو کیسے بیان کرتی ہے۔

۹۱ دست بریدہ سے وہ علم تھامتے ہوئے	سینے پہ مشق تیر ستم تھامتے ہوئے
دانتوں میں مشک، آنکھوں میں نم تھامتے ہوئے	مشکیزہ و علم کو بہم تھامتے ہوئے

کہتا تھا اسپ سے کہ سوئے خیمہ گاہ چل
سرعت میں آج مثل خیال و نگاہ چل

۹۲ پر تھا نہ شمہ بھر بھی دلاور کو اضطراب	خوں بہہ رہا تھا جسم غضنفر سے بے حساب
دیکھی ہے میں نے پاؤں سے چھٹتے ہوئے رکاب	گھائل ہوئی جو تیروں سے ناگاہ مشکِ آب

زیں پر سنبھلنا شیر کو دشوار ہوگیا
حسرت اثر نوشتۂ دیوار ہوگیا

چھوٹی رکاب پاؤں سے جب شہسوار کے ۹۳ سمجھا کہ آج پورے ہوئے دن بہار کے
میں آج کام آیا شہِ کامگار کے گرنے لگا تو شہ کو صدا دی پکار کے
آقا سے اب غلام کی رخصت کا وقت ہے
مجبور پر یہ چشمِ عنایت کا وقت ہے

بیج القتال غم کا عجب بو گئی زمیں ۹۵ یارائے ضبط اہل عزا کھو گئی زمیں
اشکوں سے داغِ دامنِ دل دھو گئی زمیں یہ کہہ کے تھوڑی دیر کو چپ ہوگئی زمیں
ساماں ذرا سی دیر میں جل تھل کا ہوگیا
روکر غم حسینؑ میں دل دہکا ہوگیا

شہاب کاظمی نے دوسرا مرثیہ ''آشوب ہنر'' کہا جو ۱۹۹۰ء (قیام امریکہ) کی تخلیق ہے۔ اسوقت تک شہاب مرثیے کے سفر میں قدم بہ قدم منزل بہ منزل چلنے کا مزاج بنا چکے تھے۔ اس لئے ''زمین کی زبانی'' کے بعد ''آشوب ہنر'' کا آغاز ''زمین کی زبانی سے مسلسل تھا۔

جب مرثیہ زمیں کی زبانی سنا چکا جی بھر کے خود بھی رو چکا، سب کو رُلا چکا
اشکوں سے داغ دامن دل دھو دھلا چکا اک قسط قرض اجر رسالت چُکا چُکا
میلان دل سے پھر سے عبادات کے لئے
ہاتھ آگیا چراغ، خرابات کے لئے

اس مرثیے کے چہرے میں آشوب ہنر کے حوالے سے اہل ہنر کا ذکر کیا گیا ہے۔

عمر عزیز میرؔ کی روتے گذر گئی غالبؔ کی غم کو مے میں سموتے گذر گئی
سوداؔ کی فصل ہجو کے بوتے گذر گئی انشاء کی دل کے بوجھ کو ڈھوتے گذر گئی
کچھ حال مصحفیؔ کا بیان سے جدا نہ تھا
ان میں سے کون تھا جو ہنر آشنا نہ تھا

اسی طرح آتشؔ، جراتؔ، حسرتؔ، داغؔ، ناصرؔ، فراقؔ، فیضؔ، اور ساحرؔ کا تذکرہ ہے۔

بے مہری جہان کے سارے شکار اٹھے ناصرؔ، فراقؔ، فیضؔ، اُٹھے، جاںنثار اٹھے

مرثیہ حضرت امام حسینؑ کے احوال کا ہے اور امام حسینؑ کا ذکر زینبؑ کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتا لہٰذا شہابؔ کاظمی نے بھی دونوں کا ذکر ایک جگہ کیا ہے۔

جو عرش بندگی کا ستارہ تھا وہ حسینؑ سجدوں کا بوجھ جس کو گوارا تھا وہ حسینؑ
جس کو خدا کے دیں نے پکارا تھا وہ حسینؑ اُمت کا آخری جو سہارا ہے وہ حسینؑ
ظلمت کی آندھیوں میں جو تنہا چراغ تھا
شاداب جس کے دم سے شریعت کا باغ تھا

اور جب حسین میدانِ کربلا میں تنہا رہ گئے اور

کہنے کو دو حروف وصیت کے واسطے خیمے میں آیا آخری رخصت کے واسطے
پھر زینب حزیں سے یہ بولے کہ اے بہن
تم ہو شریک کارِ امامت بہ جان و تن

اشکوں کو اپنے روکنا بہنا ہمارے بعد ۸۴ گرمی میں اور دھوپ میں رہنا ہمارے بعد
ہر ظلم و جور صبر سے سہنا ہمارے بعد اک حروف بد دعا بھی نہ کہنا ہمارے بعد
ماتھے پہ اک شکن بھی نہ آئے ملال کی
تم کو قسم ہے فاطمہؑ زہرا کے لال کی

زینب یہ بولیں سن کے برادر کی گفتگو لگتا ہے سن رہی ہوں میں مادر کی گفتگو

دنیا نے ٹھیک سے ابھی جانا نہیں مجھے ۸۵ خوش اشقیا ہوں کر کے ملول و حزیں مجھے
حق پر ہیں آپ کافی ہے اتنا یقیں مجھے روکوں گی میں جلال نہ آئے کہیں مجھے
جنبش یقیں میں ہوگی نہ لغزش خرام میں
زینب کا عہد ہے یہ حضور امام میں

دربار شام میں میری تقدیر دیکھنا ۸۸ خطبات میں روانئ شمشیر دیکھنا
بے تیغ زور بازوئے شبیر دیکھنا حیدر کی بولتی ہوئی تصویر دیکھنا
کھینچوں گی تیغ اور نہ خنجر دکھاؤں گی
زورِ بیانِ نفسِ پیمبر دکھاؤں گی

یہ مرثیہ ۱۳۰ پر مشتمل ہے۔ شہابؔ کے مرثیوں میں تسلسل ہے دوسرے مرثیے (دراحوال امام حسین علیہ السلام) سے مسلسل تیسرا مرثیہ "سفر" ہے جس کا مطلع دوسرے مرثیے

سے تسلسل پیدا کرتا ہے۔

جب مرثیہ حسین کا لکھ کر قلم رُکا یعنی بیانِ شاہ حجاز و عجم رُکا
احوال دل گداز کا وہ زیر و بم رکا کچھ دیر سانس لیتے غزالِ حرم رُکا
اگلے سفر کے واسطے وقفہ ضرور تھا
دشوار منزلیں بھی تھیں جانا ضرور تھا

اس طرح چوتھے مرثیہ کو تیسرے مرثیے سے مربوط کیا ہے۔ چوتھے مرثیے کا عنوان "درس حیات" ہے ۱۹۹۴ء کی تخلیق ہے اور ۱۳۲ بند پر مشتمل ہے شہاب کاظمی کے مجموعہ مراثی "مہر کے پرتو سے" میں ۱۲ مرثیے ہیں جو اس طرح ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ ان کی مزید دو مرثیے "تکملۂ حق (۱۱۶ بند) اور "اذان حریت" (۱۳۷ بند) ہیں۔

شہاب کاظمی نثر بھی لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ ایک عرصہ تک ہفت روزہ "نیویارک عوام" کے لئے ہفتہ وار کالم "انشائیہ" کے زیر عنوان لکھتے رہے ہیں۔ لیکن ان ساری صلاحیتوں میں 'مرثیہ نگاری' ان کی ممتاز صلاحیت ہے۔ جدید مرثیے کے متعلق شہاب کاظمی کی رائے عام روش سے ہٹ کر ہے۔ اپنی کتاب "مہر کے پرتو سے" کے دیباچے میں انہوں نے جو بحث چھیڑی ہے وہ غور طلب بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ وہ جدید مرثیے سے متفق نہیں ہیں اور اپنی رائے کے لئے انہوں نے استدلال کیا ہے۔

> "بہت دنوں کی بات نہیں کہ جناب نسیم امروہوی" ہم میں موجود تھے نہ ان کی علمی قابلیت میں کسی کو شک نہ استعداد شعری میں۔ ان کے عطا کردہ مرثیوں سے لوگ مرثیہ نگار ہو گئے گو ان کے ساتھ ہی مر بھی گئے۔ آخر نسیم صاحب مرحوم نے کیوں جدید مرثیہ نہیں کہا.......
>
> جوش صاحب کا مسئلہ بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ انہوں نے اپنے کلام رثائی کو ہمیشہ مسدس کہا جس کو ہم لوگ مرثیہ کہتے ہیں.......وہ خود شاعری کے بے تاج بادشاہ تھے اور جانتے تھے کہ انیس و دبیر کے پہلو میں ان کی جگہ نہیں ہے۔ ان کا جو مقام تھا وہ کوئی نہیں لے سکتا تھا۔"

شہاب کاظمی میر انیس و مرزا دبیر سے اپنی عقیدت کے حصار

محبت میں کسی فکر کا داخلہ پسند نہیں کرتے بلکہ اس کا دفاع کرتے ہیں۔

جدید مرثیہ نگاروں میں سے کسی کو تو سوچنا چاہئے کہ کیا غالبؔ واقعی اتنا گیا گذرا شاعر تھا کہ وہ سوسوا سو بند کا مرثیہ بھی نہیں لکھ سکتا تھا.......

ہوسکتا ہے ہماری یہ بات قابل اعتماد نہ ہو مگر ہم اپنی جگہ غلط یا صحیح انیسؔ و دبیرؔ کے اسلوب مرثیہ کو ترک کر کے مرثیہ کہنے کو انیسؔ و دبیرؔ دشمنی تصور کرتے ہیں، دوستی نہیں۔"

ہماری زیر نظر کتاب اس بحث کی متحمل نہیں ہوسکتی لیکن شہابؔ کاظمی کی رائے پر بحث و تمحیث ہونی چاہئے۔ مرزا اوجؔ سے لے کر جوشؔ تک۔ اور جوشؔ سے آج تک جدید مرثیے سے متعلق مساعی کو بیک قلم منسوخ بھی نہیں کیا جاسکتا اور شہابؔ کاظمی کے ایوان عقیدت میں روشن چراغوں کو پھونکوں سے بجھایا بھی نہیں جاسکتا۔ اسی صورت حال میں dialogue یعنی مکالمہ ضروری ہے۔ دو نظریات اگر کسی ایسی منزل پر پہنچ جائیں جہاں تضاد فکر کی راہیں بظاہر مسدود نظر آئیں وہاں گفتگو ضروری ہوتی ہے یہاں تک کہ یزید کی فکر و اعمال سرتا پا باطل سمجھتے ہوئے بھی حق کے نمائندے حسینؑ نے یزید سے براہ راست گفتگو کی خواہش کا اظہار فرمایا تھا۔ بشرط حیات میں اس بحث کا آغاز کروں گا۔ اس وقت تو یہ نشاندہی کرتے ہوئے اپنے کلام کو ختم کرنا چاہتا ہوں کہ شہابؔ کاظمی بڑے مرثیہ گو شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ تاریخ مرثیہ پر ان کی تنقیدی نظر بھی ہے اور وہ دلائل کے ساتھ اپنی رائے بھی رکھتے ہیں جس پر گفتگو کے لئے تیار بھی ہیں۔

☆☆☆☆☆

عابد جعفری:- (ٹورنٹو)

ولادت ۱۹۵۰ء بمقام کراچی

نام سید عابد اصغر جعفری۔ قلمی نام عابد جعفری۔ والد گرامی سید باقر جعفری آبائی وطن آگرہ۔ تعلیم۔ علامہ اقبال کالج کراچی میں ایف ایس سی کا سال اوّل۔ لیاقت سائنس کالج کراچی FSC کی تکمیل۔ ایس ایم لاء کالج کراچی سے ۱۹۷۳ء میں بی ایس سی کی سند حاصل کی۔ دو برس بعد ۱۹۷۵ء میں ٹورنٹو آگئے اور جارج برائن ٹیکنیکل کالج ٹورنٹو سے پاور انجینئرنگ میں ڈپلوما کیا اور ٹورنٹو سٹی کارپوریشن میں پاور انجینئر کی حیثیت سے شمولیت کرلی۔

☆ عابد جعفری افسانہ نگار ہیں۔

گذشتہ ربع صدی میں عابد جعفری کے افسانے اردو دنیا کے ممتاز رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں، ۱۹۹۳ء میں عاشور کاظمی نے مغرب میں آباد اردو افسانہ نگاروں کا ایک تذکرہ ''فسانہ کہیں جسے'' لکھا جسے انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹس اینڈ لٹریچر نے شائع کیا تھا۔ مختصر افسانے کی اس تاریخ میں عابد جعفری کے دو افسانے شامل کئے گئے تھے۔ اس وقت عابد جعفری کے افسانوں کے دو مجموعے اشاعت کے لئے تیار ہیں مگر اللہ رے عابد جعفری کی لاپرواہی یا بے نیازی کہ وہ افسانے جو ممتاز اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں ابھی تک کتابی صورت میں اشاعت پذیر نہیں ہوئے۔

☆ عابد جعفری صحافی ہیں:

ٹورنٹو سے ۱۹۷۹ء میں ایک پندرہ روزہ اخبار ''امروز'' کی اشاعت شروع ہوئی تھی جسکے ناشر عابد رضوی اور مدیر عابد جعفری تھے، یہ اخبار ۱۹۹۷ء تک بڑی باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ تا آنکہ ۱۹۹۷ء میں ''امروز'' کو متحرک کرنے والی قوت عابد جعفری شدید علیل ہو گئے اور امروز کی اشاعت التوا میں پڑ گئی۔ اب معلوم ہوا ہے کہ عابد جعفری ''امروز'' کو دوبارہ جاری کرنا چاہتے ہیں۔

☆ عابد جعفری کینیڈا میں ترویج اردو کی پہچان ہیں۔

ٹورنٹو میں اردو زبان و ادب کی ترویج میں عابد جعفری کی خدمات بین الاقوامی طور پہ تسلیم کی جا چکی ہیں۔ کینیڈا میں بین الاقوامی ادبی اجتماعات کی ابتدا کینیڈین رائٹر فورم نے کی۔ عابد جعفری اس ادارہ کے صدر ہیں۔

☆ عابد جعفری شاعر ہیں۔

ان کی شاعری کا آغاز غزل و نظم سے ہوا۔ ۱۹۹۰ء میں انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹس اینڈ لٹریچر لندن نے ان کی غزلوں اور نظموں پر مشتمل مجموعۂ کلام ''سپنے جاگتی آنکھوں کے'' شائع کیا جو صاحبان نقد و نظر سے خراج محبت حاصل کر چکا ہے۔ اس کتاب پر اب تک چار بین الاقوامی ایوارڈ مل چکے ہیں۔

جن دنوں ''سپنے جاگتی آنکھوں کے'' زیر تدوین تھی عابد جعفری کی غزل کے ایک مطلع ہر نظر ٹھہر گئی۔

کون تھا جو دستِ قاتل کے لئے تیار تھا
ایک میں ہی بزم اہل خواب میں بیدار تھا

میں نے عابد جعفری سے کہا کہ وہ مرثیہ گوئی کیطرف آئیں۔ عابد جعفری نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

عاشور بھائی۔ مرثیہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، یہ تو" تا نہ بخشد خدائے بخشندہ والی منزل ہے۔

میں نے کہا۔ تو پھر اس سے مانگ لو اور یقین رکھو اسکی بارگاہ میں اس سے مانگنے والے زیادہ مقرب ہوتے ہیں۔

عابد نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا" طے ہوا، اس سے مانگیں گے۔"

عابد نے اپنے کچھ سلام سنائے اور مجھے اندازہ ہوا کہ عابد جعفری کا تولاّ کا سفر تو جاری تھا، صرف منزل تک پہنچنے کا مرحلہ باقی تھا۔" چند برس بعد اطلاع ملی کہ عابد نے وہ مرحلہ طے کرلیا ہے۔ مرثیہ گوئی کی وادی میں قدم رکھ دیا ہے۔ اُنہوں نے (........ ....) میں پہلا مرثیہ کہا۔

ٹورنٹو میں تحت اللفظ میں مرثیہ خوانی کی محفلوں میں عابد جعفری کا پہلا مرثیہ اتنا مقبول ہوا کہ اہل ذوق نے ان سے ہر سال نوتصنیف مرثیہ پڑھنے کا مطالبہ کیا۔ شمالی امریکہ کے مختلف شہروں تک عابد جعفری کے مراثی کی شہرت پہنچی تو ہر طرف سے مرثیہ خوانی کی فرمائشیں آنے لگیں۔ اور اس طرح عابد جعفری مرثیہ گو شاعر کے ساتھ ساتھ مقبول مرثیہ خواں بھی بن گئے۔ وہ اب تک آٹھ مرثیے کہہ چکے ہیں۔۔

(۱) خراج عقیدت (میر انیس) (۲) قلم (۳) سخن (۴) آنسو (۵) آگ
(۶) گریہ (۷) تولدّ (۸) علی ولی اللہ،

☆ عابد جعفری جدید مرثیے کے علمبردار ہیں۔

وہ مرثیے کی کلاسکی اقدار سے منحرف بھی نہیں ہیں لیکن تمام اجزائے مرثیہ کی پیروی بھی نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں مرثیے کے کچھ اجزاء ایسے ہیں جو اساتذہ نے زور بیان دکھانے کے لئے اپنائے تھے۔ آج کی میکانکی زندگی میں داستانوی موضوعات کو سننے کا وقت میسر نہیں ہے۔ اس لئے عابد مرثیے کے فریم ورک میں رہتے ہوئے بھی" تیز ترک گامزن" کو اپناتے ہیں۔ نمونہ

کلام کے طور پر ان کے مرثیے ''علی ولی اللہ'' سے چند بند نقل کئے جارہے ہیں۔ ہر چند کے عابد جعفری کے مرثیے میں تدوین آسان نہیں ہے جس کا سبب ان کے مراثی میں ایک بند سے دوسرے بند کا واقعاتی تعلق ہے پھر بھی کوشش کی جارہی ہے کہ ان کی مرثیہ گوئی کی نہج کو واضح کیا جاسکے جو حمد، نعت، منقبت، تاریخ اور مصائب پر مشتمل ہے۔

طبع خوابیدہ کو پھر لحظۂ بیدار ملا ۱ فکر آمادہ ہوئی ذہن طرفدار ملا
حرف احساس کو اظہار کا رہوار ملا مرثیہ گوئی کو ہر لفظ طرح دار ملا

خود بخود ہوگیا آراستہ آیینۂ دل
رفتہ رفتہ سجی پھر قصرِ سخن میں محفل

مجھ سے کمتر نے لکھی پھر اس برتر کی ثنا ۳ خالق جنّ و بشر، منصفِ محشر کی ثنا
مالک ارض و سماوات کی، داور کی ثنا یعنی اس عرش نشیں خالقِ اکبر کی ثنا

یہ ثنا اس کی ہے جس کو نہیں حاجت اس کی
ہم ہی لوگوں کو ہے ہر گام ضرورت اس کی

اس کو چھولے یہ تب و تاب سماعت میں کہاں ۲ دیکھئے تو وہ نہاں، سوچئے تو یہ سب یہ عیاں
بے نشاں ایسا کہ ہر شے میں اس کا ہے نشاں اُسکی تعریف سے قاصر ہیں میرے نطق و زباں

دل اسی بات پہ بس اس کو خدا مانتا ہے
میں اسے جانتا ہوں جو اسے پہچانتا ہے

کون وہ، خوب سجی جس پہ رسالت اس کی ۸ کون وہ، جس میں سمٹ آئی صداقت اس کی
کون وہ، جس نے سنبھالی ہے امانت اس کی کون وہ، ختم ہوئی جس پہ نبوت اس کی

کون وہ، جس نے ہدایت کا چلن عام کیا
کون وہ، جس نے درخشاں میرا انجام کیا

کون وہ، خالق اکبر کا زمانے میں سفیر ۹ کون وہ، آیۂ قرآں کی مکمل تفسیر
کون وہ، جس کی جہاں میں نہیں مل سکتی نظیر کون وہ جس کو ملا عرش سے حیدر سا وزیر

ایک ہی نور سے پیکر یہ بنائے ہوئے ہیں
ظلمت دہر پہ یہ اس لئے چھائے ہوئے ہیں

ایک پیغمبرِ حق، دوسرا پیغام شناس ۱۳ ایک ایماں کا سبب، دوسرا ایماں کی اساس
ایک ہے رحمتِ کُل، دوسرا ہے محو سپاس ایک کا جو ہے عدو، دوسرے سے اس کو ہراس
ایک فانوس محبت کے اُجالے دونوں
ایک آغوش محبت کے ہیں پالے دونوں

حمد۔ نعت اور منقبت کے بعد موضوع سخن تاریخ ہے۔ عذیر کی تاریخ، دین کے مکمل ہونیکی سند کے نزول کی تاریخ، حج آخر میں رسولکریم کے خطبۂ آخر کی تاریخ، ولایت علی کی تاریخ۔

دستِ قدرت سے عطا ہو گیا حق دار کو حق ۵۵ سونے والوں سے ملا صاحب بیدار کو حق
دے کے کہتے ہیں نبی حیدر کرار کو حق یوں دیا جاتا ہے دنیا میں وفادار کو حق
کیا کمی اس کے خزانے میں طلبگار تو ہو
کوئی حیدر کی طرح صاحب کردار تو ہو

بات اگر خطبہ عذیر پر ختم ہو جاتی تو یہ مرثیہ مسدس کہلاتا لیکن عابد جعفری ایک باشعور مرثیہ گو ہیں، اُنہیں رثا کی حدود کا ادراک ہے، وہ مرثیے میں مصائب پر آتے ہیں لیکن مصائب کا ذکر شاعر کی طرف سے ہوتا ہے۔ تاریخ اور فضائل سے مصائب کی طرف گریز بھی عابد جعفری کی مہارت شعر گوئی پر دلالت کرتا ہے۔

زندگی دی ہے نبی کو شب ہجرت کہ نہیں ۵۶ خاک میں مل گئی کفار کی طاقت کہ نہیں
ان کے دم سے ہوئی محفوظ شریعت کہ نہیں اُن کے بارے میں ہے قرآن میں آیت کہ نہیں
یا تو کہیے کہ یہ تاریخ کا افسانہ ہے
یا ولایت پہ جسے شک ہے وہ دیوانہ ہے

کوئی تاریخ سے ثابت تو کرے ایسی بات ۵۸ انبیا کی ہمیں جس ذات میں ملتی ہوں صفات
بس وہی جہد مسلسل، وہی قدموں میں ثبات نُصرتِ دین الٰہی میں گذارے دن رات
باب خیبر جو اٹھالے یہ جری ایسا ہے
منزل صبر میں آئے تو رسن بستہ ہے

دین بچانا ہوا تو آئے اسی گھر پہ عوام ۶۰ علم پانا ہوا تو آئے اسی در پہ عوام
ظلم ڈھانا ہوا تو آئے تو اسی گھر پہ عوام گھر جلانا ہوا تو آئے اسی در پہ عوام

ایسی امت نے محمد کی، روایت ڈالی
آج بھی ہے جو زمانے میں مسلسل جاری

دشت میں جلتے ہیں خیمے تو ہے کس کی تقلید　۶۱　کیوں ان آفت کی گھٹاؤں میں گھرا ہے خورشید
ہمشیں کیوں ہیں سوا، کس کی ہے حامل تائید　　انتہا کرب و بلا ہے، تو مدینہ تمہید
ہو بہو دادا کا جو تھا، وہی ہے ان کا چلن
طوق سے بدلیں نہ کیوں سید سجاد رسن

آگے بڑھتا ہے تو مقتل سے یہ آتی ہے صدا　۶۳　اے میرے لخت جگر جاؤ خدا کو سونپا
ہاں مگر اتنا تمہیں یاد رہے اے بیٹا　　بے کفن چھوڑ کے جاتے ہو پدر کا لاشہ
یہ بتاؤ کہ ہمیں دشت میں دفنائے گا کون
اس برے وقت میں شبیؑر کے آئے گا کون

پاؤں مجروح ہیں اور راہ سفر ناہموار　۶۴　ٹھوکریں کھاتا تھا وہ حق کا ولی سو سو بار
اس طرح کھینچ رہے ہیں اسے ییم اشرار　　جس طرح کھینچتا ہو کوئی ستم گر رہوار
جان جاتی ہے کبھی اور کبھی آتی ہے
دیکھ کر ظلم یہ زنجیر بھی تھراتی ہے

روک لیتا ہے قدم وہ جو بصد ناچاری　۶۵　پشت پر ہوتی ہے دروں کی سوا آزاری
غش پہ غش ہوتا ہے اس ظلم سے اس پر طاری　　خاک پر اس کا لہو کرتا ہے مینا کاری
طوق و زنجیر کا وہ بوجھ اُٹھائے کیونکر
پاؤں اٹھتے ہی نہیں ہیں تو بڑھائے کیونکر

ریت اُڑا کر اسے دیتی ہیں ہوائیں پرسہ　۶۷　منہ چھپا کر اسے دیتی ہیں گھٹائیں پرسہ
تن سے آ کر اسے دیتی ہیں ہوائیں پرسہ　　دور جا کر اسے دیتی ہیں
خون روتا ہے فلک، دشت و دمن روتے ہیں
سر بریدہ سر مقتل میں جو تن، روتے ہیں

عابد جعفری نے رُلانے کیلئے مصائب نہیں کئے بلکہ سید سجاد کا مرثیہ کہا ہے۔ ان پر ہونے والے مظالم کا مرثیہ کہا ہے۔ اس لئے اختتامی بند تخاطب پر ختم ہوتے ہیں۔

پڑھ رہی ہے تیری غربت پہ مسلسل نوحہ سر کو ساحل سے جو ٹکراتی ہے موج دریا
اور سیراب ہوا لشکر اعدا سارا تیرا کنبہ تو رہا دشت بلا میں پیاسا
اپنے اس جرم کی دریا یہ سزا پائے گا
حشر تک اب نہ کبھی اس کو قرار آئے گا

دل میں ولا کا چراغ روشن ہو تو یہ بند سبب گریہ بنتا ہے۔

زخمی کانوں سے تڑپتی ہوئی خواہر دیکھی بے ردا بلوے میں ناموس پیمبر دیکھی
یہ گھڑی کس طرح اے دلبر سرور دیکھی لاش شِشماہے کی میدان میں بے سر دیکھی
مل کے سب انبیاء نے اس سے بھی کم دیکھے ہیں
ایک دو پہر میں تو نے جو ستم دیکھے ہیں

مرثیہ نگاری کا یہی آہنگ اور اسلوب انہیں جدید مرثیہ نگاروں میں شمار کراتا ہے۔

☆☆☆☆☆

صفدر ہمدانی:- (لندن)

نام، صفدر علی۔ تخلص، صفدر، ولادت ۷ نومبر ۱۹۵۰ء

چودہ اگست ۱۹۴۷ء کو ریڈیو لاہور سے ایک آواز گونجی تھی '' یہ ریڈیو پاکستان لاہور ہے'' قیام پاکستان کا اعلان کرنے والی پہلی آواز اس دور کے ممتاز براڈ کاسٹر مصطفیٰ علی ہمدانی کی تھی۔ اس آواز اور اس اعلان کو تاریخ نے اپنی پیشانی کا جھومر بنالیا۔

صفدر ہمدانی کا یہ شرف ہے کہ یہ آواز صفدر ہمدانی کے والد گرامی کی تھی۔ جو نہ صرف براڈ کاسٹر بلکہ ماہر لسانیات بھی تھے۔ اردو، عربی، فارسی پر انہیں دسترس حاصل تھی حتیٰ کہ وہ اردو اور فارسی زبان میں شاعری کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے تین برس بعد ۱۹۵۰ء میں صفدر پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالا تو گھر میں شعر و ادب کا اجالا دیکھا۔ والد گرامی کے عہد ساز اور تاریخ ساز کارناموں کی وراثت ملی۔ صفدر ہمدانی نے ۱۹۷۱ء میں فارمین کرسچن کالج لاہور سے بی۔ اے اور ۱۹۷۳ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے (جرنلزم) کی سند حاصل کی۔

صفدر ہمدانی نے عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ ابتدا روزنامہ مساوات میں نائب مدیر (SUB EDITOR) کی حیثیت سے کی۔ اس کے ساتھ ساتھ ماہنامہ '' سورج کے مدیر بھی رہے''

جو ایک ادبی جریدہ تھا۔ نیز ماہنامہ ''دھنک'' کے پہلے مدیر کی حیثیت سے بھی اس میں کام کیا۔ ۱۹۷۳ء میں جرنلزم کی سند حاصل کرنے کے بعد پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن سے وابستہ ہو گئے۔ اور نشریات کے شعبے میں کام کیا۔ ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۲ء تک ورلڈ سروس ریڈیو جاپان، ٹوکیو چلے گئے جہاں ریڈیو جاپان پر اردو نشریات کی ابتدا کی۔ جاپان میں قیام کے دوران فارن آفس جاپان کے تربیتی مرکز (Training centre) میں سفارت کاروں کی تدریس کی ذمہ داریوں سے عہد برا ہوئے۔ جاپان ریڈیو پر اردو کے علاوہ انگریزی نشریات کی ذمہ داریوں کو بھی پورا کیا۔ دسمبر ۱۹۹۲ء میں بی بی سی ورلڈ سروس لندن آ گئے۔

صفدر ہمدانی نے عربی فارسی اور ہندی کی تعلیم اپنے والد گرامی اور گھر کے علمی ادبی ماحول سے حاصل کی۔ ۶۵ر ۱۹۶۴ء میں شعر کہنے شروع کئے اور ۱۹۷۲ء میں پہلا مرثیہ کہا۔

تصانیف:

(۱) کفن پر تحریریں (غزلیات نظمیں) مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء
(۲) میں + تم (ہالینڈ میں قیام کے دوران کہی ہوئی نظمیں، غزلیں) مطبوعہ ہالینڈ ۱۹۸۴ء
(۳) پیاسے لفظ (قیام جاپان کے دوران کا کلام) مطبوعہ جاپان ۱۹۹۰ء
(۴) سرمایہ حیات مجموعہ مراثی (قیام جاپان کے دوران کہے گئے مرثیے)

جاپان سے شائع ہونے والی مرثیے کی پہلی کتاب مطبوعہ جاپان ۱۹۹۰ء سرمایہ حیات میں صفدر ہمدانی کے پانچ مرثیے شامل ہیں۔

(۱) غم حسینؑ کا نور (۲) داستانِ اشک غم (۳) افتخار اعتبار (۴) اک معجزہ ہے لکھنا محرم میں مرثیہ (۵) زمین کرب و بلا

صفدر ہمدانی کے اکثر مراثی کی ابتدا حمد دعا سے ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جب وہ مرثیہ کہنے کا ارادہ کرتے ہیں تو لوح و قلم کے خالق سے توانائی مانگتے ہیں اور وہ توانائی انہیں مل جاتی ہے مثلاً ۔

اے رب دو جہاں مجھے اذن کلام دے		میرے قلم کو اذن ثنائے امام دے
صبح مدینہ دے مجھے کوفے کی شام دے		مولا کا نام لکھنے کا کچھ انتظام دے

یہ سوچ کے دعا کو اٹھائے جو میں نے ہاتھ
محسوس یوں ہوا کوئی بیٹھا ہے میرے ساتھ

(مرثیہ افتخار اعتبار۔ دعا سے ابتدا)

اے ربّ ذوالجلال، قلم کو جلال دے مصرعوں کو کربلا کی نشانی میں ڈھال دے
نورازل سے چہرہ قلم کا اجال دے اس کربلا میں کعبے کی تصویر ڈال دے
جبریل کو دے اِذن کہ میری مدد کرے
ہر اک خیال خام کو وہ خود ہی رد کرے

(مرثیہ داستان اشک غم: دعا سے ابتدا)

جن مرثیوں کی ابتدا دعا سے نہیں ہے ان کی شروعات حمد سے ہوتی ہے۔

خدائے جملہ شناسا، خدائے ہر دو زماں نہاں میں تو ہی عیاں ہے عیاں میں تو ہی نہاں ہے
ہر ایک ذرّے میں ظاہر تیرا ہر اک نشاں تیرے وجود کی پہلی دلیل کا بکشاں
تیرے ہی نام کی تسبیح سب زمانوں میں
گواہی تیری، ابد تک کی ہے اذانوں میں

(پہلا مرثیہ ''غم حسین کا نور'' حمد)

بے سمت راستوں پہ رواں کاروان ذات مطلوب ہر زماں میں ہوا امتحانِ ذات
سایہ کناں ہراک پہ مگر پاسبان ذات دولت ہیں کائنات کی یہ عاشقانِ ذات
ذات بشر میں ذات الٰہی کا نور ہے
ہر عہد گویا ذات خدا کا ظہور ہے

(مرثیہ اک معجزہ ہے لکھنا محرم میں مرثیہ: حمد سے ابتدا)

اور ''ذات بشر میں ذات الٰہی کا نور ہے'' صفدر ہمدانی کا یقین ہے کہ وہ عبد و معبود کے رشتے کو ہر حال میں استوار سمجھتے ہیں۔ اس لئے حمد باری کے بعد وہ اکثر و بیشتر خالق سے مخلوق کے رشتے کی بات کرتے ہیں۔

شعور و فکر و تخیل، سبھی کمال تیرا محیط عالم تخلیق پہ جمال تیرا
سکونِ قلب کی دولت ہوا خیال تیرا کسی جواب کا طالب نہیں سوال تیرا

بشر کے بس میں کہاں ہے جو تیرا دھیان کرے
زمین کو چاہے تو مولا تو آسمان کرے

یہ کیا عناصر تہذیب ہے وجود بشر　　ہر ایک کذب کی تکذیب ہے وجود بشر
وجود ہستی کی ترتیب ہے وجود بشر　　خدا کی ذات کی تشبیب ہے وجود بشر

اس وجود سے قائم وجود ہستی کا
یہی بلندی کا پیمانہ یہ ہی پستی کا

(مرثیہ: زمین کرب وبلا)

عبد و معبود کے اس لازمی رشتے کو صفدر ہمدانی ہمہ اوست کی فکر سے جدا مانتے ہیں۔ ان کی نظر میں یہ رشتہ ''خدا کی ذات کی تشبیب ہے وجود بشر'' کہہ کر واضح ہو جاتا ہے

صفدر ہمدانی اچھے شاعر ہی نہیں نثر نگار بھی ہیں۔ ان کی درج ذیل نثری تخلیقات شائع ہو چکی ہیں۔

(۱) شہری ماحول، بچے اور نشریات (مقالہ) مطبوعہ یونیسف (UNICEF)
(۲) ریڈیو اور بچوں کی نشریات
(۳) تاریخ نشریات جاپان اردو شعبہ کی نشریاتی تاریخ مطبوعہ جاپان
(۴) قانونی اصلاحات (ترجمہ) مطبوعہ جاپان

اس کے علاوہ ان کے تحقیقی مضامین صحافیانہ تجزیے۔ شائع ہوئے ہیں جو ہمارا موضوع نہیں ہے۔ صفدر ہمدانی بیس سے زیادہ مرثیے کہہ چکے ہیں۔ اُن کا دوسرا مجموعہ مراثی ''فرات کے آنسو'' زیر ترتیب ہے جو کم از کم پندرہ مرثیوں پر مشتمل ہوگا۔ اُن کا تازہ ترین مرثیہ ۱۰۶ بندوں پر مشتمل ہے۔ مرثیہ دعا سے شروع ہوتا ہے۔

پروردگار فکر کی بینائی دے مجھے　۱　حق آشنائی ذوق شناسائی دے مجھے
ادراک دے، شعور کی گہرائی دے مجھے　　یکتا ہے تیری ذات تو یکتائی دے مجھے

وسعت ملے کمال کی ہر اک خیال کو
ہو نذر مرثیہ یہ محمدؐ کی آل کو

ہو کاش لوح عرش پہ تحریر مرثیہ　۲　پھیلائے عالمین میں تنویر مرثیہ

بن جائے اس غلام کی تحریر مرثیہ ہر لفظ میں دکھائے وہ تاثیر میں مرثیہ
سن کر ہر ایک بیت شجر جھومنے لگیں
عشاق اہل بیت قلم چومنے لگیں

پڑھ کر درود لکھنے کو تیار ہے قلم ۴ نشہ وہ عجز کا ہے کہ سرشار ہے قلم
یوں لگ رہا ہے کعبے کی دیوار ہے قلم غرق ثنائے احمد مختار ہے قلم
آنے لگی جوانی قلم پر درود سے
اب شاہکار نکلے گا اس کے وجود سے

تاریکیوں میں بھی رہے روشن میرا ضمیر ۱۱ ہونے نہ پاؤں مصلحت وقت کا اسیر
پابند فکر عجز رکھے قادر و قدیر دولت ہی چاہیے نہ مجھے قربت امیر
تیری عطا جو ہو تو نجف کی گلی ملے
صدقہ نبی کا دولت عشق علیؑ ملے

دعا کے بعد حمد الٰہی کے بند ہیں، حمد کے بعد شانے رسالت کے اظہار میں ۴۷ بند کہے گئے ہیں جن میں تیس بند ''میرا نبی'' کی ردیف میں ہیں۔

قیوم گر خدا ہے تو قائم میرا نبی ۳۶ ذات خدا دوام ہے دائم میرا نبی
قلزم عنایتوں کا ہے ہر دم میرا نبی ہر معرکے میں فتح کا پرچم میرا نبی
ہیچ اس کے سامنے ہے ضیاء شمع طور کی
جنت تو ہے زکوٰۃ محمد کے نور کی

اور پھر رحمت رسول کا انداز اس انقلاب فکر کی طرف مڑ جاتا ہے جو نبی آخر الزماں اور ان کے خانوادے کی پہچان ہے۔

منسوب ہے رسول سے ہر فکر انقلاب ۶۷ بے شک ہے اہل بیت کا در فکر انقلاب
ہر رخ سے کربلا کا سفر فکر انقلاب کچھ کی نظر میں حاصل زر فکر انقلاب
مکہ تھا انقلاب، مدینہ تھا انقلاب
اس جہل کی فضا میں تو جینا تھا انقلاب

سچ پوچھیے تو حق کی علامت ہے انقلاب ۶۹ خنجر تلے کمال عبارت ہے انقلاب

اصغر کے مسکرانے کی عادت ہے انقلاب تاثیر کربلا کی صداقت ہے انقلاب

گر کربلا کی روشنی لے کر نکل پڑیں

سنگلاخ وادیوں میں بھی ہیرے نکل پڑیں

صفدر ہمدانی کے مراثی آج کے حالات کا احاطہ کرتے ہیں۔ان کے ہاں عصر حاضر بڑی شدت کے ساتھ نظر آتا ہے۔وہ کہتے ہیں ظلم کی حد آخر سے صبر کی حد آخر تک کربلا ہی کربلا ہے اور ظلم کی حد آخر یزید اور صبر کی حد آخر امام حسین ہیں۔صفدر کا نظریہ ہے کہ کربلا ۶۱ھ تک محدود نہیں بلکہ آج بھی ہے۔اس کا اظہار ان کے مراثی میں بھی ملتا ہے۔

مسند نشیں ہیں تخت پہ پھر آج کے یزید ۸۱ کرتے ہیں آدمی کی رگوں سے لہو کشید

عاشق علیؑ کا قتل اگر ہو، منائیں عید پروردگار صبر کی طاقت نہیں مزید

صدیوں کے بعد آج بھی ہم کربلا میں ہیں

لیکن خدا کا شکر حصار دعا میں ہیں

اس کے بعد مرثیہ ذکر تحسین، اور واقعات کربلا تک پہنچتا ہے۔اس مرثیے کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اوج، جوش، جمیل مظہری، نجم آفندی کی کوششیں بار آور ثابت ہو رہی ہیں اور جدید مرثیہ پروان چڑھ رہا ہے صفدر ہمدانی جدید مرثیے کے کارواں میں شامل ہیں۔اللہ انہیں توفیقات مزید نوازے۔

☆☆☆☆☆

عارف امام:- (لاس اینجلس)

ولادت ۱۹/اپریل ۱۹۵۶ء بمقام کراچی۔

نئی نسل کے بیدار شاعر ہیں جن سے یہ توقع وابستہ کی جاسکتی ہے کہ جو چراغ فکر مرزا اوجؔ۔شاد عظیم آبادی، جوش ملیح آبادی، نجم آفندی، نے جلائے ہیں وہ چراغ کبھی گُل نہیں ہوں گے بلکہ اُن چراغوں کی روشنی میں اپنی جواں اور تازہ فکر کا نور شامل کر کے آنے والی نسلوں کو دینے والے ترقی پسند فکر کے حامل مرثیہ گو شعرا میدان دار و گیر میں اُتر چکے ہیں اور ذکر حسینؑ کی مشعلیں اُٹھائے آگے بڑھ رہے ہیں۔عارف امام نئی نسل کے ان مشعل بردار ذاکرانِ حسینؑ کی اگلی صفوں کے شاعر نظر آتے ہیں۔

دبستانِ کراچی کے زیادہ تر مرثیہ گو شعراء کو راقم السطور نے قریب سے دیکھا ہے۔ جوش جیسے عظیم المرتبت شاعر کو مختلف کیفیات میں دیکھا ہے لہذا ان شعراء کا تعارف لکھتے وقت اُن کا سراپا اور ان کی شخصیت کے وہ پہلو جو "دیدہ" ہیں سامنے آتے ہیں۔ لیکن عارف امام ۱۹۸۹ء میں بحیثیت مرثیہ گو سامنے آئے ہیں اور راقم الحروف ۱۹۷۶ء سے کراچی چھوڑنے کے بعد عذاب دربدری کا شکار ہے لہٰذا نہ عارف امام کو دیکھا، نہ اُن سے رابطہ رہا۔ مگر اُن کا ایک مرثیہ "خون" سامنے آیا تو یوں محسوس ہوا جیسے میری روح عارف امام کی روح سے آشنا ہے۔ اس طرح میں خود عارف امام سے واقف ہوں، شاید یہ واقفیت، یہ قرب یگانگتِ خیال کے سبب ہے۔

عارف امام نے پہلا مرثیہ "زمین"۔ "دیدۂ خورشید سے ٹپکا ہوا آنسو زمیں" ۱۹۸۸ء میں کہا جسے آغا قمر حسین جعفری نے ادارۂ تقدیس قلم" کراچی کے زیرِ اہتمام ۱۹۸۹ء میں "لہو لہو کہکشاں" جلد اوّل میں شائع کیا اور اس طرح عارف امام ۱۹۸۹ء میں بحیثیت مرثیہ نگار سامنے آئے۔ اُنہوں نے دوسرا مرثیہ "خون"۔ "افق کن پہ شفق ریزیٔ تنویر ہے خوں" ۱۹۸۹ء میں کہا جو "لہو لہو کہکشاں" جلد دوم مطبوعہ ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ ان دو مرثیوں کی اشاعت کے بعد عارف امام مرثیہ گو تسلیم کر لئے گئے۔ اس کے بعد عارف امام نے کیا کہا وہ "سونے پر سہاگہ" ہو سکتا ہے جبکہ ان کا پہلا مرثیہ "سونا" اور وہ بھی کھرا سونا" ہر حال میں رہے گا۔ جی چاہتا ہے اس مرثیے کا ایک ایک بند نقل کیا جائے مگر تذکرے کے صفحات کو لامحدود نہیں کیا جا سکتا اس لئے تدوین لازم ہے۔ بہر حال جتنے بھی بند نقل کئے جا رہے ہیں وہ عارف امام کو مرثیہ نگار شاعر منوا لیتے ہیں۔

افقِ کن پہ شفق ریزیٔ تنویر ہے خوں	۱　پیشِ تصویر نہیں ہے بس تصویر ہے خوں
پائے انفاس سے لپٹی ہوئی زنجیر ہے خوں	آیۂ نطفۃ امشاج کی تفسیر ہے خون

وجہ تغیرِ جہاں اس کی ہی جولانی ہے
آئینہ خانہ ہے کیا خون کی حیرانی ہے

خون کی جلوہ نمائی کے ہیں انداز بہت	۲　خلیۂ خوں کی خموشی میں نہاں راز بہت
خوں بدن میں ہو تو پھر قوتِ پرواز بہت	باضمیروں کے لئے خون کی آواز بہت

ہو گراں گوش نہ انسان تو سب سنتا ہے
خوں کی آواز فقط عالی نسب سنتا ہے

شوقِ تزئینِ بیاباں میں مچلتا ہے لہو ۳ بے نمو، ریت کو کھیتی میں بدلتا ہے لہو
مل کی چمنی سے دھواں بن کے نکلتا ہے لہو جوش میں آئے تو پھر کس سے سنبھلتا ہے لہو
چاک کر دیتا ہے ہر خلعتِ سلطانی کو
آب دیتا ہے یہ مزدور کی پیشانی کو

بہتے دریا کی روانی ہے لہو کی گفتار ۱۱ روکنے سے کہیں رکتی ہے لہو کی گفتار
تیغ ہے شعلہ ہے بجلی ہے لہو کی گفتار سرِ دربار گرجتی ہے لہو کی گفتار
جبر کی مسند و دستار اُلٹ دیتی ہے
خوں کی گفتار تو دربار اُلٹ دیتی ہے

خوں شگافوں میں بہے یا کہ شعلہ میں بہے ۱۳ شاہراہوں پہ گرے یا کسی صحرا میں بہے
مسجد و معبد و دربار و کلیسا میں بہے بہہ چکا ہو یا کسی لمحۂ فردا میں بہے
کجکلاہوں کی تباہی کا سبب ہوتا ہے
خاک سے خون کا ملنا بھی غضب ہوتا ہے

گردنِ جہل پہ شمشیر ہے منصور کا خوں ۱۴ شیشۂ زر کیلئے زنگ ہے مزدور کا خوں
جبر کی راہ میں دیوار ہے مجبور کا خوں کیسے ممکن ہے بھلا خواہشِ جمہور کا خوں
جبر بے کس کو بظاہر تو کچل دیتا ہے
خون خاموشی سے تاریخ بدل دیتا ہے

یہ سپاہی کا رجز چیخ ہے دیوانے کی ۱۵ یہ علامت ہے محلات کے ڈھے جانے کی
یہ تمنا ہے نئی کھیتیاں لہرانے کی یہ لہو سرخی ہے ہر عہد کے افسانے کی
حق کی آواز مجسم ہے اسی سرخی سے
حرمتِ ماہِ محرّم ہے اسی سرخی سے

ہاں وہی خون جو اصنام شکن ہوتا ہے ۲۴ ظلمتِ شب میں اجالے کی کرن ہوتا ہے
کہیں شمشیر کہیں حرفِ سخن ہوتا ہے کبھی خیبر تو کبھی صلحِ حسنؑ ہوتا ہے
جس کے ورثہ میں ہے اورنگِ سلیمانی بھی
حفظِ اسلام بھی کعبہ کی نگہبانی بھی

ہے برا ہیمی تسلسل کا نشاں ہاشمی خوں ۲۶ فرقِ طاغوت پہ ہے ضرب گراں ہاشمی خوں
خطِ معتزوئی اربابِ گماں ہاشمی خوں جسدِ دینِ محمدؐ میں رواں ہاشمی خوں
جب کبھی بھی کوئی تردید نبیؐ کرتا ہے
ہاشمی خون مبارز طلبی کرتا ہے

ہے اسی خون کی للکار رجز حیدرؑ کا ۲۷ بیعتِ کفر سے انکار رجز حیدرؑ کا
موت بر مجمعِ کفار رجز حیدرؑ کا رن میں چلتی ہوئی تلوار رجز حیدرؑ کا
ہیبتِ حرف سے اغیار کا دل ہلتا ہے
وار سے پہلے لہو خاک سے جا ملتا ہے

وہ علیؑ جس کے فضائل کی کوئی حد نہ شمار ۳۶ افقِ کون و مکاں جس کے کفِ پا کا غبار
وہ علیؑ جس کے تصرف میں خدا کی سرکار جس کے آنگن میں ہے حسنین کے قدموں کی بہار
جس کے دربار میں بوذر بھی بنِ یاسرؓ بھی
ایک عباس دلاور کی تمنا پھر بھی

یہاں سے حضرت عباس کے فضائل اور مرثیے کا رخ میدان کارزار میں حضرت عباسؑ کی شہادت کی طرف موڑ دیا جاتا ہے۔

وارث جذبۂ ایمان سلف ابن علیؑ ۳۸ آئینہ خانۂ انوار نجف ابنِ علیؑ
اک طرف سارا جہاں، ایکطرف ابن علیؑ نہیں ہونے پہ بھی زہراؑ کا خلف ابن علیؑ
حرمت دیں کے محافظ رجل خاص کو دیکھ
دیکھ اے دیدۂ دل، حضرت عباسؑ کو دیکھ

بند ۳۹ سے ۶۳ تک حضرت عباس کا میدان میں جانا۔ نہر فرات تک پہنچنا۔ واپس لوٹنا۔ بازو قلم ہونا اور پھر منصب شہادت پر فائز ہونا۔ امام حسینؑ کا لاشۂ عباسؑ پہ جانا۔ ایک ایک واقعہ خون کے حوالے سے نظم کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ بین کے حصے میں بھی عارف امام کی ترقی پسند فکر اور جدید مرثیے کی اقدار نمایاں ہیں۔

آؤ عباس ذرا شام کا ڈھلنا دیکھو ریگِ مقتل سے اُدھر خیموں کا جلنا دیکھو
بے ردا خیمے سے زینبؑ کا نکلنا دیکھو لڑکھڑاتے ہوئے بیمار کا چلنا دیکھو

دیکھو بچی کے سسکتے ہوئے رخساروں کو
کان سے بہتے ہوئے خون کے فواروں کو

اور مرثیہ کا اختتام خون کی طاقت پر ہوتا ہے۔

موسم گریہ میں آنکھوں سے ٹپکتا ہے یہ خوں
سر تاریخ علم بن کے چمکتا ہے یہ خوں
وقت رک جاتا ہے جس وقت دہکتا ہے یہ خوں
اب بھی تہذیب کی سانسوں میں مہکتا ہے یہ خوں
رسم شبیر کی تاسیس ہوا کرتا ہے
ہاں یہی خون یزیدوں کو فنا کرتا ہے

اس مرثیے کے اقتباسات پیش کرنے کے بعد عارف امام کے متعلق کچھ کہنا نہ کہنا ایک ہے اسلئے کہ یہ مشک خود بول رہی ہے۔

عزادارِ حسینِ مظلوم، مرثیہ گو شاعر عارف امام کراچی سے اسلام آباد اور اب اسلام آباد سے لاس اینجلس (امریکہ) چلے گئے ہیں۔ خدا کرے مرثیہ گوئی کا یہ چراغ مغرب کی آندھیوں میں بھی روشن رہے۔

☆☆☆☆☆

عشرت آفرین:- ہیوسٹن (ٹیکساس)

تاریخ پیدائش ۲۵؍دسمبر ۱۹۵۶ (کراچی)

خاندانی نام عشرت جہاں، قلمی نام عشرت آفرین، تعلیم: ایم۔اے اردو کراچی یونیورسٹی (۱۹۸۲ء)۔ خوش قسمتی سے سادات کے ایک ایسے روشن خیال اور تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئیں جہاں بہو بیٹیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا جاتا ہے، جہاں بچے درسگاہ کربلا سے تہذیب سیکھتے ہیں۔ اور (بقول عشرت آفرین) سماعتوں کی تربیت انیس و دبیر کے مرثیوں سے ہوتی ہے۔

عشرت آفریں اردو کی جانی پہچانی شاعرہ ہیں۔ اردو دنیا کے معتبر ادبی جریدوں میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ اُن کا شعری مجموعہ ''کنج پیلے پھولوں کا'' مکتبۂ دانیال کراچی نے ۱۹۹۵ء میں اور مکتبۂ دین و ادب لکھنؤ نے ۱۹۹۶ء میں شائع کیا ہے۔ اُن کے کلام کے تراجم بھی شائع ہوئے ہیں۔ جاپانی پوئٹری میگزین ''ماڈرن پوئٹری'' کے ۱۹۸۸ء کے ایڈیشن میں بھی ان کے تراجم شائع ہوئے ہیں۔ عشرت آفرین کی شاعری پر ممتاز نثر نگار و اور نقاد اکرام بریلوی کا تحقیقی

مقالہ ۲۰۰۱ء میں کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے۔ اردو ادب کے دیگر اہل قلم نے عشرت آفریں کی شاعری پر مضامین لکھے ہیں۔ وہ ترقی پسند شاعرہ ہیں۔ انہیں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقدہ کراچی میں سجاد ظہیر ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ عشرت آفریں آج کل ہیوسٹن میں ریڈیو میگزین گفتگو کے زیر عنوان ایک مقامی ریڈیو سے ادبی پروگرام بھی نشر کر رہی ہیں، لیکن آج ہم ان کے رثائی ادب کے حوالے سے گفتگو کر رہے ہیں۔ یہ دیکھنا چاہ رہے ہیں کہ اُنہوں درس گاہ کربلا سے کون کون سی سندات حاصل کی ہیں۔

عشرت آفریں کے ارسال کردہ کوائف کے مطالعہ سے ایسا لگا جیسے انہوں نے غم کی عظمت کا ادراک حاصل کیا ہو۔ اس لئے جس عمر میں مشق سخن کرنے والے محبوب سے باتیں کرتے ہیں۔ غزل کہتے ہیں اس زمانے میں (جب وہ نویں جماعت کی طالبہ تھیں) اُنہوں نے پہلی نظم جو کہی وہ اُن کے والد گرامی کی وفات پر اُنکا مرثیہ تھا۔ یہ مرثیہ لوازم مرثیہ کی قیود سے آزاد تھا اور روزنامہ جنگ کراچی میں یہ مرثیہ شائع بھی ایک نظم کی حیثیت سے ہوا تھا۔ اس قسم کے ذاتی مرثیے پہلے بھی لکھے گئے ہیں۔

عشرت آفریں کی دوسری نظم، بلکہ دوسرا مرثیہ مسدس کی ہیت میں تھا اور اس کا عنوان ''سکینہ'' تھا۔ اپنے والد کی وفات کے بعد یتیمی کے احساس سے عشرت آفرین کے درد و کرب کو سمجھا۔ کربلا میں آل رسول پر ہونے والے مصائب کے تناظر میں سکینہ کو پہچانا، اور عشرت آفریں کے رشتے غم شبیر سے اور گہرے ہو گئے۔

سکینہ، فاطمہ کی آخری صورت کو کہتے ہیں سکینہ خواہر شبیر کی سیرت کو کہتے ہیں
سکینہ، امتحان قصر کی عظمت کو کہتے ہیں سکینہ عشق حق میں پیاس کی شدت کو کہتے ہیں
سکینہ، داستان کربلا کی ترجمانی ہے
سکینہ، جو کبھی بھولی نہ جائے وہ کہانی ہے

سکینہ، قلب عباسِ دلاور کی دعا بھی ہے سکینہؑ، قافلے کے کمسنوں کا حوصلہ بھی ہے
سکینہؑ، قیصر عظمت کے لئے اک زلزلہ بھی ہے سکینہ شام کے دربار میں اک معجزہ بھی ہے
سکینہ، ہر قدم پر جو سراپا مرضیٔ رب ہے
سکینہ، نالۂ کلثوم ہے اور صبر زینب ہے

سکینہ جس کے نالے عرش کا پایہ ہلاتے ہیں　　سکینہ جس کے آنسو حور و غلماں کو رلاتے ہیں
سکینہ یاد میں ہم جس کی مشکیزہ بناتے ہیں　　سکینہ جس کو ان اشکوں کے نذرانے بھی جاتے ہیں
سکینہ جو کہ ارمان رہائی لے گئی دل میں
سکینہ باپ کا داغ جدائی لے گئی دل میں

اس مرثیے کے بعد عشرت آفریںؔ کی نظر مقصد حسین پر رہی اور اُن کا قلم روشنی بکھیرتا رہا۔ اُنہوں نے بیشمار نوحے کہے۔ ہائی سکول سے کالج تک آئے ان کے ڈیڑھ دو سو نوحے مجالس عزائے حسینؑ کی زینت بن گئے اور ساتھی انجمنوں کا سرمایہ عزا سمجھے جانے لگے۔ مرثیے کی دنیا میں عشرت آفریں کا نقش ثانی یعنی اُن کا دوسرا مرثیہ ''کردار'' تھا۔ اس مرثیے میں عشرت آفریں نے کربلا کی جنگ کو حق و باطل کے نمائندہ کرداروں کی جنگ کے طور پر نظم کیا ہے جس کے بند مندرجہ ذیل ہیں۔

''کردار''

حق پرستوں سے وہ دنیا کے طلب گاروں کی جنگ
روشنی سے وہ اندھیروں کے پرستاروں کی جنگ
یہ نہ تھی تیر و کماں کی اور تلواروں کی جنگ
کربلا کی جنگ تھی در اصل کرداروں کی جنگ
کیوں یزید اس درجہ خائف تھا شہ ابرار سے
معرکہ در پیش تھا کردار کو کردار سے

ایک جانب عہدہ و جاہ و حشم مال و منال
ایک جانب بے سر و سامان پیغمبرؐ کی آل
ایک جانب جبر پھیلائے ہوئے دستِ سوال
اک طرف انسانیت دو دن کے فاقوں سے نڈھال
ہات رکھیں موت کے یا زندگی کے ہاتھ میں
فیصلہ تھا یہ حسینؑ ابنِ علیؑ کے ہاتھ میں

فرد جب کردار بن جائے تو کہلائے حسینؑ
جرأت اظہار بن جائے تو کہلائے حسینؑ

عشق جب اقرار بن جائے تو کہلائے حسینؑ
صبر گر تلوار بن جائے تو کہلائے حسینؑ

راحتِ دنیا سے گویا اپنا دامن جھاڑ کر
شکرِ رب کرتا ہوا اٹھے پسر کو گاڑ کر

مفتیانِ دین کی مہریں تو سیم و زر کی تھیں
ظلم کے کاغذ پہ تحریریں مگر پتھر کی تھیں
قیمتیں کتنی زیادہ ایک تنہا سر کی تھیں
روشنائی خون کی اور انگلیاں خنجر کی تھیں

فرق کیا ہے ابن مریم ہو کہ ابن فاطمہ
حق پرستوں کا ہوا کرتا ہے حق پر خاتمہ

ہو جہاں اس انتہا کی بدعت فکر و نظر
حرمتِ لوح و قلم سے کھیلتے ہوں اہل زر
جن صفوں میں گشت کرتا ہو فقط غوغائے شر
سوچ سکتا تھا کوئی تاریخ کے اس موڑ پر

جنگ سے پہلے صفِ دشمن الٹ جانے کو ہے
حر بشکلِ حرّیت حق کی طرف آنے کو ہے

حُر، نہ لشکر ہے نہ جاہ و حشمت و انعام ہے
یہ صداقت کی گواہی کا بس اک اقدام ہے
بات جب کردار کی آئی تو یہ وہ نام ہے
فیصلے پر جس کے سناٹے میں فوجِ شام ہے

عشق گر چاہے تو وہ دریا کو پیاسا مار دے
فرد لشکر سے نکل کر اس کو تنہا مار دے

حُر معہ فرزند آیا تھا کوئی تنہا نہ تھا
بات نسلوں کی تھی کچھ اک جان کا سودا نہ تھا

جنگ کے انجام سے واقف نہ ہو ایسا نہ تھا
ماسوائے موت کے باقی کوئی رستہ نہ تھا
وقت نے ثابت کیا حق کی گواہی کے لئے
حُر طمانچہ بن گیا رخسارِ شاہی کے لئے

عشرت آفریں نے اس مرثیے میں کلاسیکی لوازم مرثیہ کی پاسداری نہیں کی۔ نہ کہیں تلوار چمکی۔ نہ کہیں گھوڑے کی برق رفتاری کا ذکر آیا لیکن مرثیے کے چند بند حق و باطل کی جنگ کی وضاحت کر گئے۔ ایک ایسے مرثیہ میں جس میں ایک بند کے بعد دوسرا بند مسلسل ہو اور واقعات کا تسلسل مربوط ہو اختصار کرنا امر دشوار ہوتا ہے۔ عشرت آفریں کے مرثیہ ''کردار'' میں سے صرف چند بند منتخب کرنا وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ جو وہ کہنا چاہتی ہیں کہ حق و باطل کی جنگ میں حق کی فتح کا استدلال باقی رہے دشوار ترین امر ہے۔ پھر بھی کوشش کی گئی ہے کہ مرثیے کے کل سات بند منتخب کر کے نذر قارئین کئے جائیں اور اس احتیاط کے ساتھ نقل لئے جائیں کہ پیغام باقی رہے۔ عشرت آفریں کا اسلوب جدید مرثیے کے زمرے میں آتا ہے۔ لیکن اُن کی اپنی انفرادیت باقی رہتی ہے۔ وہ جوشؔ سے غیر ارادی طور پر متاثر نظر آتی ہے مگر جوشؔ سے فکر کی ہم آہنگی میں اُن کی انفرادیت اور اُنکا اپنا اسلوب برقرار رہا۔ ''سکینہ'' اور کردار کے چند بند نقل کرنے کے بعد خیال آیا کہ مرثیہ میں مصائب کے بند نہ ہوں تو قطرہ قطرہ کر کے نچوڑے ہوئے خونِ دل کو مفتیانِ مرثیہ مسدس کہہ کر مرثیے کے قبیلے سے باہر نکال دیتے ہیں ہر چند کہ ایسے فیصلے عارضی ہوتے ہیں دائمی نہیں اس کے باوجود عشرت آفریں کو ایک بار پھر زحمت دی گئی کہ وہ اپنے کسی مرثیے کے مصائب کے بند ارسال کریں اور اُنہوں نے حضرت علی اکبر کے احوال کے مرثیے کے بہت سے بند ارسال کئے جن میں سے مندرجہ ذیل درج ہیں۔

نورِ نگاہِ سبطِ پیمبر اذان دو
بالیں یہ بولی ماں میرے دلبر سے اذان دو
ماں پھر سے اپنے لال کی زلفیں سنوار دے اشکوں سے دھو کے چاندنی صورت نکھار دے
خوں میں بھرا ہوا یہ عمامہ اُتار دے آنکھیں تو کھولو تم پہ یہ ماں جان وار دے
دیکھو تو اُٹھ کے زیست کا نقشہ عجیب ہے
سر ننگے تیری لاش پہ ماں بدنصیب ہے

کل اس پہر جو دشت کا منظر تھا کیا کہوں کل آلِ مصطفیٰؐ کا بھرا گھر تھا کیا کہوں
تم سامنے تھے، گود میں اصغر تھا کیا کہوں گھر تھا، ردا تھی شاہ کا لشکر تھا کیا کہوں
کل روشنی تھی گھر میں میرے آفتاب سے
اب ہوگئے وہ چاند سے چہرے بھی خواب سے

گھر ہے نہ اب ردا ہے نہ وہ آن بان ہے بے وارثوں کے سر پہ کھلا آسمان ہے
بیٹھے ہیں فرشِ خاک پہ عظمت نہ شان ہے غربت میں آلِ پاک بہت بے امان ہے
کل زرد تھی جو آب وہ زمیں خوں سے لال ہے
بچے ڈرے ہوئے ہیں سکینہ نڈھال ہے

زینبؑ شکستہ دل ہے، قیامت کا ہے الم بچوں کا زخم، بھائی کا صدمہ، جواں کا غم
اور اس پہ بے ردائی کا ہے رنج دم بدم سر کو جھکائے خاک پہ بیٹھے ہیں سب حرم
پچھلے پہر سے ہوک برستی ہے دہشت میں
لاشیں ہیں اور موت کی بستی ہے دہشت میں

لگتا ہے جیسے دشت پہ آباد ہی نہ تھا آواز طبلِ جنگ نہ قرآن کی صدا
سہمی ہوئی ہوا ہے سسکتی ہوئی فضا جیسے اس انقلاب پہ حیراں ہے کربلا
کل شب تھا اضطراب بلا کا، غضب کا جوش
اور آج شام ہی سے ہے بَن کی فضا خموش

کیوں ڈوبتی ہے آج کی شب نبضِ کائنات کیوں سو رہی ہے موت کی آغوش میں حیات
طوفاں لئے ہے آنکھوں میں اپنی خموش رات تسبیح اور درود نہ تکبیر اور صلوات
حسنِ سحر پہ شامِ غریباں محیط ہے
زہراؑ کے گلستاں پہ بیاباں محیط ہے

عشرت آفرین نظمیں کہہ رہی ہیں، سلام اور نوحے کہہ رہی ہیں، مرثیہ گوئی میں جو روش اُنھوں نے اختیار کی ہے یا تولا کا جو راستہ اُنھیں روشن ضمیری اور درس گاہ کربلا نے دکھایا ہے اس پر سرگرم سفر ہیں۔ خدا کرے اُن کے سر پہ اسی طرح ردائے سید، زینبؑ کا سایہ ہے اور غمِ حسینؑ کے علاوہ اُنھیں کوئی غم نہ ہو۔

☆☆☆☆☆

خواتین مرثیہ نگار

بیسویں صدی میں اردو مرثیے پر تحقیق سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ مرثیہ نگاری میں خواتین نے بھی حصہ لیا ہے۔ لیکن مسلم خواتین اپنی پردہ داری کی وجہ سے اور غیر مسلم شاعرات سوسائٹی اور سماج کے قائم کردہ مرد اور عورت کے درمیان حجابات کے پردوں کے سبب سامنے نہ آسکیں۔ کچھ نام زمانے کی ستم ظریفی کا شکار ہوگئے اور کچھ نام تاریخ کی بے رحمی کی نذر ہوگئے کچھ نام سامنے آئے تو اُن کے کلام میسر نہیں ہے۔

ملکہ زمانی:-

بیگم نصیر الدین حیدر نواب اودھ (متوفی ۱۸۳۷ء) شاعرہ تھیں۔ مرزا دبیرؔ کی شاگرد تھیں۔ مرزا دبیرؔ کی شاگردی اس بات کی سند ہے کہ ملکہ زمانی مرثیہ نگار شاعرہ تھیں مگر آج اُن کا کلام نایاب ہے۔ برٹش میوزیم لائبریری (انڈیا آفس لائبریری) لندن میں بھی میسّر نہیں۔

☆☆☆☆☆

سلطان عالیہ:-

دختر نیک اختر بیگم ملکہ زمانی اور نواب نصیر الدین حیدر والیٔ اودھ۔ زوجہ نواب ممتاز الدولہ۔ سلام اور مرثیے کہتی تھیں اور اپنی مادر گرامی کی طرح مرزا دبیرؔ کی شاگرد تھیں۔ اُن کے پانچ سلام مخطوطات زاہد سہارنپوری سے دستیاب ہوئے ہیں جن کے مصرع ہائے اولیٰ قاصد سرسوی نے نقل کئے ہیں۔

(۱) مجرا اُسے مدام جور اور رضا میں تھا

(۲) مضمونِ عزا دل میں ہے پنہاں بی بی

(۳) مجرئی مصحف ماتم کی ہیں تصویر حسینؑ

(۴) زہے جمالِ حسینؑ وخوشا لقائے حسینؑ

(۵) اکبر کا رَن میں جب نہ سلامی نشاں ملا

اُن کے ایک سلام ''زہے جمالِ حسینؑ وخوشا لقائے حسینؑ'' کے تین اشعار پر مرزا دبیر کی تظمین سامنے آئی ہے۔ شاگرد کے کلام پر اُستاد (وہ بھی مرزا دبیرؔ) کی تظمین ایک نرالی بات ہے لیکن ایسا ہوا ہے۔

حیات حضرتِ شبیر ہے لقائے حسینؑ
کوئی بزرگ نہ سر پر تھا اب سوائے حسینؑ
حسینؑ روتے تھے خود کہہ کے ہائے ہائے حسینؑ

''فغان و آہ کر، اے مجرئی برائے حسینؑ
نہیں حسینؑ کے ماتم سے کم عزائے حسینؑ''

زمرّدی اثرِ سم سے ہے قبائے حسینؑ
قضا نے قطع کیا ہے کفن برائے حسینؑ
سیاہ کپڑے پہنتے ہیں اقربائے حسینؑ

''سلامی آج مدینے میں ہے قبائے حسینؑ
زمیں سے تا بہ فلک غل ہے ہائے ہائے حسینؑ''

دبیرؔ حق ہے تیرے سر پہ اُن کے احساں کا
دعا وہ مانگ کہ شہرہ ہو جس سے ایماں کا
یہ کہہ تُو واسطہ اب دیکھے شاہِ مرداں کا

''صلہ یہی ہے الٰہی سلامِ سلطاں کا
شتاب روضۂ اقدس مجھے دکھائے حسینؑ''

لیکن سلطان عالیہ کے مراثی کہیں نہیں ملتے یا ہماری رسائی وہاں تک نہ ہوسکی۔

(قاصد سرسوی کے مضمون'' مرثیہ وسلام نویسی میں خواتین کا حصّہ'' سے ماخوذ)

☆☆☆☆☆

تاجدار بھو:- (تاجدار لکھنوی)

مرثیہ گو شاعر تھیں۔ اُن کا ایک مرثیہ کتب خانۂ محمود آباد میں محفوظ بتایا جاتا ہے، جو اتنا محفوظ ہے کہ پورا مرثیہ کہیں نقل نہیں ہوا ہے۔ صرف ایک بند گا ہے بگاہے نقل کیا گیا ہے۔ تاجدار بھو

نے اس بند میں حضرت امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ کے ساتھ ہونے کو حضرت حمزہ اور حضرت علیؑ کے ساتھ ہونے سے تعبیر کیا ہے ۔

یہ جنگ بھی جہاں کے لئے یادگار ہے
یہ معرکہ بھی قدرت پروردگار ہے
حمزہؑ کی اور علیؑ کی بہم کا راز ہے
فوج عدو میں رعب سے اب انتشار ہے
لشکر میں ساتھ شہ کے علمدار آتے ہیں
ہمراہ علیؑ کے جعفرِ طیار آتے ہیں

☆☆☆☆☆

زیب النساء بیگم:- (حاجی لکھنوی)

محمد علی شاہ فرمانروائے اودھ کی صاحبزادی، نواب اقتدار الدولہ کو منسوب تھیں۔ مرزا دبیرؔ سے اصلاح لیتی تھیں۔ کلام میسر نہیں ہے۔ انیسؔ رضوی (کراچی) نے اپنے ایک مضمون میں اُن کے سلام کا ایک شعر نقل کیا ہے۔

''قبرِ اصغر کھودتے تھے اور فرماتے تھے شاہ
یہ بھی لکھا سیدِ مظلوم کی تقدیر کا''

اس کے علاوہ کچھ نہیں بچا۔ ظالموں نے اودھ کو تاجدار کیا تو کیا، علمی ادبی سرمائے کو بھی نابود کر دیا۔ راقم الطور نے برٹش میوزیم کے تہہ خانوں میں بھی تلاش کرنے کی کوشش کی مگر منفی جواب کے علاوہ کچھ نہ ملا۔

☆☆☆☆☆

سیدہ مدینہ خاتون مدینہؔ:-

ولادت ۱۸۶۸ء وفات ۱۹۴۸ء

سید حیدر حسین یکتاؔ کی پوتی۔ حضرت شمیمؔ امروہوی کی دختر۔ برجیسؔ اور فہیمؔ امروہوی کی بہن۔ نسیمؔ امروہوی کی پھوپھی سیدہ مدینہ خاتون مدینہؔ کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ مرثیہ گو ہونے کے علاوہ ذاکرہ بھی تھیں۔ اُن کی نسل میں اُن کے پوتے خلاّقؔ حیدر ندیمؔ اور سردار نقوی ہیں۔

سردار نقوی کی والدۂ گرامی سیدہ مدینہ خاتون مدینہ کی پوتی ہیں۔ سیدہ مدینہ خاتون کو اردو کے علاوہ فارسی زبان پر بھی دسترس تھی۔ مرثیہ کہنے کا انداز کلاسیکی تھا۔ اُن کے مراثی میں بین کا لہجہ بھی کلاسیکی مگر وردانگیز تھا ۔

حسین کہتے تھے اے میرے لال شکل دکھا کہاں پہ لے گیا اپنی برات اے بیٹا
کدھر ہے اے میرے کڑیل جواں میں تجھ پہ فدا کہاں ہے اے اعلیٰ اکبر مجھے بھی پاس بُلا
یہ کیا خبر تھی مقدر یہ دن دکھائے گا
شباب موت کا پیغام بن کے آئے گا

☆☆☆☆☆

عسکری خاتون عسکری:-

ولادت ۱۸۷۳ء۔ وفات ۱۹۵۳ء (بعمر ۸۰ برس)

وطن امروہہ۔ والد کا نام سید ظہور حسین شوہر کا اسم گرامی سید نادر حسین۔ اللہ نے دو فرزند، سید ماہر حسین اور سید عامر حسین، عطا کئے تھے جو ہندوستان سے ہجرت کر کے کراچی آگئے تھے۔

عسکری خاتون نے مختصر مرثیے کہے ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ ''سفینہ نجات'' ۱۹۸۱ء میں پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ عسکری کا ایک مرثیہ عظیم امروہوی نے نقل کیا ہے۔ اس میں بین کا انداز مختلف ہے۔ اس میں خانوادۂ رسالت کو روتے پیٹتے دکھانے کی بجائے شاعر نے بین کئے ہیں۔ مرثیہ میں یہ التزام ہے کہ ہر بند کے بعد ایک ہی بیت کو دہرایا گیا ہے ۔

کس طرح قائم رہا اپنی جگہ عرش بریں کیوں تنزل ہو گیا پیدا نہ بر روئے زمیں
اس طرح تنہا لڑے لاکھوں سے سلطان حزیں آخرش گھوڑے سے آہستہ اُتر آئے وہیں
کربلا میں زخم کھائے بھوکا پیاسا ہائے ہائے
زیرِ خنجر ہو پیمبر کا نواسا ہائے ہائے

آئی ہو تعریف جس کی جا بجا قرآن میں بے ادب اُمت ہوئی کس طرح اسکی شان میں
خویش و یاور اس کے سب مارے گئے میدان میں ظہر تک لاشے اٹھانا کس کے تھا امکان میں
کربلا میں زخم کھائے بھوکا پیاسا ہائے ہائے
زیرِ خنجر ہو پیمبر کا نواسا ہائے ہائے

جس کو کاندھے پر چڑھاتے تھے نبی توقیر سے　　پرورش پائی تھی جس نے فاطمہ کے شیر سے
اس کے ہاتھوں پر چھدا حلقوم اصغر تیر سے　　کیا کہا دل نے کوئی پوچھے ذرا شبیر سے
کربلا میں زخم کھائے بھوکا پیاسا ہائے ہائے
زیرِ خنجر ہو پیمبر کا نواسا ہائے ہائے

(مرثیہ نگاران امروہہ)

☆☆☆☆☆

حزیںؔ نیوتنوی:- ثم لکھنوی (حُسن جہاں بیگم)

ولادت ۱۹۰۹ء بمقام کانپور۔ وفات اکتوبر ۱۹۶۹ء لکھنؤ۔

حکیم سید اصغر حسینؔ کی دختر نیک اختر۔ ممتاز ادیب و محقق سید مسعود حسین رضوی سے ۱۹۲۶ء میں شادی ہوگئی۔ ۴۲ برس اُن کی رفاقت میں گزارے اور شوہر کی شریک زندگی ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی تحقیق میں بھی شریک کار رہیں۔ خود اچھی شاعرہ اور محقق تھیں ''اُردو امثال'' پر تحقیقی کام کیا مگر شائع نہ ہو سکا۔ اس کا سبب کون پوچھے؟ ہوگی کوئی خانگی رکاوٹ؟

اُن کا کلام بھی نہ جانے کیوں سامنے نہیں آیا جبکہ قدرت شعر گوئی یا اس کے معیار پر تو شائبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ نمونہ کے طور پر چار مصرعے میسر آئے ہیں۔

جانبِ میداں ہمکتے تھے جو اصغر بار بار
ماں لگا تھی سینے سے تڑپ کر بار بار
اک غمِ شہ کے سوا دنیا میں کوئی غم نہ ہو
یہ حزیںؔ تجھ سے دعا کرتی ہے داور بار بار

☆☆☆☆☆

تسنیم جونپوری:- (معصومہ تسنیم زیدی)

خان بہادر محمد مصطفیٰ کج گاؤں ضلع جونپور کی دختر۔ ممتاز ترقی پسند شاعر حضرت وامق جونپوری کی بہن۔ مرثیہ، قصیدہ اور سلام کہتی ہیں، مرثیے کا ایک بند نمونہ کلام کے طور پر نقل کیا جا رہا ہے۔

ہالے میں گیسوؤں کے ہے مہتاب سی جبیں　　خم دار ابروؤں پہ مہ نو کا ہے یقیں

سایہ ہے ذوالفقار کا، ہے چشم سرگیں باریک جلد عارضِ تاباں کی آتشیں
دو پھول میں بہار یہ سارے چمن کی ہے
رنگت گلاب کی ہے، مہک یاسمن کی ہے

(اودھ کی شاعرات، انیس رضوی رثائی ادب خواتین نمبر)

☆☆☆☆☆

گوہر آرا بیگم:- (لکھنوی)

نام گوہر آرا بیگم۔ تخلص گوہر، ممتاز محقق ڈاکٹر اکبر حیدری کی رائے میں میر خلیق (۱۲۶۰ھ) میاں دلگیر (م۔ ۱۲۶۴ھ) مرزا فصیح (م ۱۲۶۷ھ) اور میر ضمیر (م۔ ۱۲۷۲ھ مطابق (۱۸۵۱ء) کی ہم عصر شاعرہ تھیں۔ مرثیے کے طرز اسلوب سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً خانوادۂ میر حسن سے ہونگی۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری نے اُن کا ایک مرثیہ دریافت کیا ہے۔ جو بہت شگفتہ اور شریں وسادہ زبان میں ہے۔ یہ مرثیہ مہاراج کمار مرحوم والی محمود آباد کے کتب خانہ محمود آباد ہاؤس لکھنؤ میں محفوظ بتایا گیا ہے۔

برباد الٰہی نہ کوئی پردہ نشیں ہو ۱ بے مقصد و چادر نہ کوئی زار وحزیں ہو
پردیس میں ویراں نہ کوئی صاحب دیں ہو تر خونِ برادر سے کسی کی نہ جبیں ہو
زینب سی جو آوارہ وطن ہو وہی جانے
بازو میں بندھی جس کے رسن ہو وہی جانے

پیدا ہوئی جس روز سے زینب جگر افگار ہر وقت رہیں طرفہ مصیبت میں گرفتار
بڑھتے ہی گئے سن کی طرح رنج بھی ہر بار دن پر جو یہ صدمے ہوں تو بن جائیں شب تار
دنیا میں کسی نے نہ اُٹھائے الم ایسے
پانی ہو ابھی کوہ، سہے گر ستم ایسے

دنیا میں ہوئی ہیں کئی خاتون معظم ۳ حوّا و بتول اور ہوئیں حضرت مریم
سارا و خدیجہ ہوئیں مخدوم دو عالم زینب بھی بزرگی میں نہیں اان سے کہیں کم
تعریف کرے کیا کوئی عالی نسبی کی
بیٹی ہیں علی کی تو نواسی ہیں نبی کی

فارغ نہ ہوئیں تھیں ابھی زہراؑ کے الم سے　　بے جان ہوئے شیر خدا تیغ ستم سے
آنسو نہ کسی وقت تھما دیدۂ نم سے　　کہتی تھیں بچوں گی نہ غم شاہ اُمم سے
اماں بھی مُوئیں اور قضا کر گئے بابا
کوئی نہ بزرگوں میں رہا، مر گئے بابا
افزوں تھی حسین ابن علی سے جو محبت　　باقی تھی فقط ایک یہی زیست کی صورت
رونے سے بزرگوں کے ہوئی گر کبھی فرصت　　بہلا دل ناشاد جو کی بھائی کی خدمت
پیراہن سیدؑ لو لاک بدلنا
کنگھی کبھی کرنا کبھی پوشاک بدلنا
دسویں کو خزاں گلشنِ شبیر پہ آئی　　تا ظہر ہوئی شاہ کے پھولوں کی صفائی
مارا گیا عباس علمدار سا بھائی　　یاں تک کہ شہادت علی اکبر نے پائی
تنہا تھے حسینؑ ابن علیؑ دشتِ بلا تھا
بس شمر کی تلوار تھی، سیدؑ کا گلا تھا

۳۹ بند کا یہ مرثیہ سیدہ زینبؑ کے مصائب کا مرثیہ ہے جس میں نہ صرف کربلا کے مصائب ملکہ سیدہ زینب کی وفات حسرت آیات کا منظرنامہ بھی نظم کہا گیا ہے ۔

تیار ہوئی دخترِ زہرا کی جو تربت　۳۲　عابد نے کیا کوچ ہوئے قبر سے رخصت
جب واں سے مدینے کو چلے غیر تھی حالت　　فضہ کو نہ تھا ہوش یہ تھی کثرت رقت
ہر چند سبھی کہتے رہے منت و کدّ سے
فضہ نہ اُٹھی حضرتِ زینب کی لحد سے
وہ قبر وہ صحرا، وہیں رہنا وہیں سونا　۳۷　ہر شب کو بکا، صبح کو منہ اشکوں سے دھونا
طاعت کبھی قربت پہ تصدق کبھی ہونا　　کرنا کبھی جاروب کبھی بیٹھ کے رونا
کہتے ہیں اسے عشق کہ مرکر بھی وہیں ہے
فضہ کی لحد مرقد زینبؑ کے قریں ہے
خاموش ہو گو ہر کہ یہاں ہو نہیں سکتا　۳۸　زینب کی شہادت کا بیاں ہو نہیں سکتا
یہ حال غم اندوہ عیاں ہو نہیں سکتا　　اندوہ ہے خامہ بھی رواں ہو نہیں سکتا

شبیر کے کہہ شیفتۂ ربّ کا تصدق
تائید کرو حضرت زینب کا تصدق

(مضمون ڈاکٹر اکبر حیدری" گوہر آرا بیگم کا غیر مطبوعہ مرثیہ۔ رثائی ادب کراچی)

☆☆☆☆☆

دیوی روپ کماری:- (اکبر آبادی)

بیسویں صدی کے نصف اوّل میں جدید مرثیے کے حوالے سے خواتین مرثیہ نگاروں میں ایک نام دیوی روپ کماری کا سامنے آیا جن کا پہلا مرثیہ "بادۂ عرفان" ۱۹۳۲ء کی تصنیف ہے۔ یہ مرثیہ اتنا مقبول ہوا کہ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۷ء کے دوران پانچ مرتبہ شائع ہوا۔ لیکن خود دیوی روپ کماری متعلق چھان بین کرنے والوں کے قبیلے میں افراتفری پیدا ہوگئی۔ کہا جانے لگا کہ دیوی روپ کماری کسی جیتی جاگتی خاتون کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ، سر آرتھر کینین ڈائل Sir Arther Canan Doyle کے شرلک ہومز Sherlock Homes کی طرح ایک تصوّراتی شخصیت ہیں۔ اور جب یہ سوال سامنے آیا کہ پھر یہ اُن کے مرثیے کہاں سے آئے تو کہا گیا کہ حضرت فضل رسول پہر سری جو دیوی روپ کمار کے اُستاد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں یہ اُن کا کلام ہے جو اُنہوں نے اپنی تخیلاتی تخلیق دیوی روپ کماری کے نام سے پیش کیا ہے۔ قیاس آرائیوں کے ان دھندلکوں میں ہم نے ایک ایسے محقق سے رجوع کیا جو مرثیہ اور مرثیہ نگاروں کی تحقیق و جستجو میں ہمہ وقت مصروف ہیں اور ہماری اُن تک رسائی بھی سہل ہے۔ اُنہوں نے تین اہم آرا نقل کی ہیں۔ پہلی رائے حضرت نسیم امروہوی کی ہے۔

(۱) "دیوی روپ کماری کا وجود تخیلاتی ہے۔ یہ مرثیہ فضل رسول پہر سری نے کہا تھا جو دیوی روپ کماری کے اُستاد کی حیثیت سے مشہور تھے"

(۲) دوسری رائے ڈاکٹر صفدر حسین کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"رُوپ کماری کے دو تین مراثی میری نظر سے گزرے اور وہ سب روایت سے بچ کر تصنیف ہوئے ہیں۔ ہر چند کہ محترمہ کا وجود تخیلاتی ہے لیکن اُن کے اُستاد فضل رسول پہر سری کا وجود تو فرضی نہیں جو ان مراثی کے اصل خالق ہوں گے اگر ان مراثی کو آپ اُستاد کے کھاتے میں ڈال

دیں گے تو بھی جدید مرثیے کے ارتقائی تسلسل میں ان کو کو بھی مقام دینا ہوگا۔"　　(یہ تحریر ۱۹۷۷ء کی ہے)

ایک برس بعد ۱۹۷۸ء میں ڈاکٹر صفدر حسین لکھتے ہیں

"رُوپ کماری کو اگر آپ فرضی شخصیت ثابت کر دیں تب بھی ان کے نام سے منسوب مراثی (جن کی تعداد تین چار سے کم نہیں ہے) کے اصل خالق یعنی فضل رسول شاگرد میر انیسؔ کا جدید مرثیے میں مقام متعین کرنا ہوگا یہ بُزرگ یونسؔ نقوی (ریٹائرڈ ایم۔اے۔جی) کے خسر تھے اُن کا کلام محفوظ ہے آپ علی اصغر رضوی اصغر پہر سری شاگرد نسیمؔ امروہوی سے اس سلسلے میں مزید معلومات حاصل کر سکتے ہیں میں نے فضل رسول صاحب کا ایک پوسٹ کارڈ جو انہوں نے سُلطان صاحب فرید کو رُوپ کماری کے متعلق لکھا تھا ۱۹۴۱ء میں دیکھا تھا اس لئے میں رُوپ کماری کو فرضی شخصیت نہیں سمجھتا۔"

(۳)　تیسری رائے حضرت نجم آفندی کی ہے جو تشکیک و ابہام کے سارے پردے چاک کر دیتی ہے۔

"نجم آفندی صاحب کی زندگی کے بالکل آخری دور میں جبکہ وہ میرے مکان سے دو ڈھائی میل کے فاصلے پر (النور سوسائٹی فیڈرل بی ایریا کراچی میں) رہا کرتے تھے۔ میں نے بہت پہلے ایک ملاقات (اگست ۱۹۷۱ء) میں رُوپ کماری کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ بہت گراں گوش ہو گئے تھے۔ باتیں بھول بھی جایا کرتے تھے میرا سوال سُن کر وہ کچھ دیر خاموش رہے سوچتے رہے پھر انہوں نے کہا کہ "وہ مجھ سے اپنے مرثیے پر اصلاح لے چکی ہیں___"

(بیسویں صدی اور جدید مرثیہ ۸۰۸۔۸۰۹)

جگہ جگہ دیوی روپ کماری نے اپنا نام روپ کمار نظم کیا ہے۔اُن کے چار مراثی سامنے آئے ہیں ان کا پہلا مرثیہ" ثنائے حیدر" ہے۔ انہوں نے ثنائے حیدر کو پیمبر کی ثنا اور خدا کی

عبادت قرار دیا ہے۔

عروس نظم کی زینت ثنائے حیدر ہے بیاں کی حسن لطافت ثنائے حیدر ہے
گلِ ریاضِ فصاحت ثنائے حیدر ہے خدا کی عین عبادت ثنائے حیدر ہے
جو حق شناس میں ان کو ثنا یہ بھائی ہے
یہی ثنا تو بہشتِ بریں دکھائی دیتی ہے

اسی ثناء کا نتیجہ ہیں ساغر و کوثر ۲ اسی ثناء کی بدولت ملیں گے خلد میں گھر
اسی ثنا پہ تو نازاں ہے خود ثنا گستر جو ہے علیؑ کی وہی ہے ثنائے پیغمبر
حصول ہوتی ہے خوشنودی خدا جس سے
یہ وہ ثنا ہے کہ شاداں ہیں مصطفیٰ جس سے

ملائکہ ہوں کہ حوریں ہو یا کہ غلماں ہوں ۲۴ بشر ہوں دیو پری ہوں کہ حیواں ہوں
کوئی بھی جنس ہو حیواں ہوں یا کہ انساں ہوں سب اس میں آ گئے ہندو ہوں یا مسلماں ہوں
علیؑ کے چرنوں کا ہر ایک کو سہارا ہے
علیؑ جگت میں نرد پر ماتما کا پیارا ہے

ملا ہے پوت کب ایسا جگت میں ماؤں کو ۲۵ غلامی فخر رہی جس کی سورماؤں کو
خوشی سے جھیلا زمانہ کی سب بلاؤں کو پسند حق نے کیا آپ کی اداؤں کو
حضور راکب دوش نبیؐ جبھی تو ہوئے
کئے تھے کام جو اعلیٰ علیؑ جبھی تو ہوئے

کوئے ولائے آل محمد میں آنے کے بعد دیوی روپ کمار کو اپنی قوم نے ان سے نگاہیں پھیر لیں اور اُنہیں تکالیف دیں تو انہوں نے اس مرثیہ میں فریاد کی ہے۔

کہاں علیؑ کی ثنا اور کہاں ثنا میری ۵۰ دیا انہی کی ہے قسمت بھی یہ کہاں میری
مدد کریں گے وہی وقت امتحاں میری کہ قوم ہو گئی ناحق ہے بدگماں میری
وہ سختیاں ہیں کہ بس کچھ کہا نہیں جاتا
میرے وقار پہ حملے کئے گئے داتا

مثال اشک گرایا ہے سب کی نظروں میں ۵۱ حقیر کر کے ستایا ہے سب کی نظروں میں

گرا جو یوں مجھے پایا ہے سب کی نظروں میں بڑا ہی جی کو جلایا ہے سب کی نظروں میں

"زمانہ بر سرِ جنگ است یا علیؑ مدد دے

کمک بغیر تو تنگ است یا علیؑ مدد دے"

۵۳ کوئی یہ کہتا ہے کیا ہو گیا اسے اے رام کوئی یہ کہتا ہے اس نے ڈبویا قوم کا نام

کوئی یہ کہتا ہے اس کو پسند ہے اسلام کوئی یہ کہتا ہے کیا جانئے ہو کیا انجام

میں جاہلوں سے پریشاں ہوں نہ کلپتی ہوں

وہ میرے حال پہ روتے ہیں اور میں ہنستی ہوں

۵۵ علی کے عشق میں ہاں مبتلا ہے روپ کمار خطا یہ ہے کہ محض بے خطا ہے روپ کمار

میں اُن کی ہوں مجھے پرواہ کیا ہے روپ کمار زمانہ گر چہ مخالف ہوا ہے رُوپ کمار

کسی سے کیوں کہوں کشتی کو میری پار کرے

علی سا جس کا ہو کھیواوہ کیا بچار کرے

۱۰۱ ہیں ان کے بعد سری رام چندر جی مہاراج یہی ہیں جو کہ مہادیو کے بھی ہیں سرتاج

انہی سے خلق نے پایا ہے نیکیوں کا رواج انہی کا تابہ ابد ہے خدا کے ملک میں راج

انہی کے بھائی پہ قرآنِ پاک اُترا ہے

انہی کا راستہ دیکھا گیا تو سُتھرا ہے

۱۰۲ مکاں ہے عرشِ بریں ان کا اُن کا بندرابن کجا کرشن کا قصہ کجا امامِ زمن

تو ناز کرتی ہے میرے رشی پہ نہر لبن کرشن جی کا رہا جمنا جی پہ گر مسکن

وہ ہمرا ہی کرے جس کو نہ ہو خود اپنی سُدھ

منو جی ان کے برابر ہوئے نہ گوتم بُدھ

۱۱۳۳ نبیؑ کی طرح رہے مُرتضیٰ بھی اس پہ فدا خدا سے لائے خدائی میں جو رسولِ خدا

اسی کا نام ہے گلشن میں یونیورسل لاء یہی ہے دین یہی ہے یہی ہے شریعت بیضا

یہی مذاہب عالم میں سب سے اکمل ہے

علیؑ کی طرح سے پاکیزہ ہے مکمل ہے

۱۴۹ جو یہ نہ ہوتے ٹھکانہ نہ تھا کہیں میرا ولا سے اُن کے بھرا ہے دل حزیں میرا

عقیدہ پُوچھتے ہیں مجھ سے ہم نشیں میرا بتائے دیتی ہوں لو آج ہے یہ دیں میرا
"علیؑ امام من است و منم کنیز علیؑ
ہزار جان شود فدیہ بر عزیز علیؑ"

دیوی روپ کمار کا یہ مرثیہ ۱۸۶ بند پر مشتمل ہے۔ان کا یہی ایک مرثیہ انہیں مشّاق مرثیہ نگار، پختہ شاعر، جوشِ ولا سے سرشار مدّاحِ اہلبیت ثابت کرنے کے لئے کافی ہے بشرطیکہ ان کا وجود تخلاتی نہیں اصلی ہو جو بظاہر تو ہے۔

☆☆☆☆☆

اُمت الزھرا بیگم فطرتؔ:- (حیدر آباد دکن)

ولادت ۱۹۱۳ء ۔وفات ۱۹۸۹ء

نام، امت الزہرا بیگم تخلص، فطرتؔ ۔ وطن حیدر آباد۔ مرزا اشہر کی پوتی۔ مرزا علی یاور مرحوم کی دخترِ نیک اختر۔ شہرتؔ کی سگی بہن تھیں۔ اشہر کے خانوادے کے کئی خواتین نے رثائی ادب کو خاندان فریضہ سمجھ کر اپنایا۔ فطرتؔ اسی کہکشاں کا ایک روشن ستارہ تھیں۔ اپنی دوسری بہنوں (ریاضتؔ اور شہرتؔ) کی طرح شاعری کی ابتدا نوحے سے ہوئی۔ نوحوں کا مجموعہ ان کی حیات میں ہی شائع ہوا۔ نوحوں کے بعد اسلام و منقبت۔ اور اس کے بعد مرثیہ کہنا شروع کیا۔ فطرتؔ کے پانچ مراثی دستیاب ہیں۔ یہ مرثیے طویل نہیں ہیں اور ان میں مرثیے کے لوازم کی پاسداری بھی نہیں ملتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی خانوادی کی خواتین کا اوڑھنا بچھونا کربلا والوں کے مصائب سننا تھا۔ اس لئے ریاضتؔ اور شہرتؔ کی طرح فطرتؔ کے مرثیوں میں بھی حمد وثنا اور مصائب و بین ہوتے ہیں۔ فطرتؔ کے مراثی میں تو بین بھی کربلا میں خانوادۂ عصمت کی خواتین کے مفروضہ بین ہوتے ہیں، فطرتؔ نے خود عورت ہونے کے ناطے جس طرح جوان بیٹے۔ شش ماہے بچے، کڑیل جواں بھائی۔ عون و محمد کی عمر کے بچوں کی موت پر جس طرح سوچا، جو درد محسوس کیا وہی کربلا میں موجود بیبیوں کی طرف سے نظم کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ یہ مرثیے اور ان کے بین خواتین کے دلوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔

نمونہ کلام:

(۱) مرثیہ دراحوال شہزادہ علی اصغر حضرت زینب کے بین۔

روکے چلائی دخترِ زہراؑ کیا غضب کر رہے ہو اہلِ جفا
ہے نواسہ یہ اس پیمبر کا جس کا تم لوگ پڑھتے ہو کلمہ
ہو کے دیندار کیا یہ کرتے ہو
نہ نبی سے نہ حق سے ڈرتے ہو

تم نے خط لکھ کے گھر سے بلوایا چھوڑ کر جب مدینہ کو آیا
اس پہ بے وجہ یہ ستم ڈھایا پانی دو روز سے نہ پلوایا
ظالمو، مصطفیٰ کی جان ہے یہ
پیاسا دو دن کا مہمان ہے یہ

☆امام حسینؑ پر بین

آپ بچپن سے میرے ساتھ رہے کبھی تنہا نہ گھر سے جاتے تھے
کیوں جنان میں میرے بغیر گئے مجھکو بھی ساتھ لے چلو اپنے
دل پہ صدمہ کمال ہے بھائی
زندگی اب وبال ہے بھائی

☆مرثیہ دراحوال سیدہ فاطمہ زہراؑ۔ ماں کی موت پر بیٹی کے بین۔

میری ماں کو جگائیے بابا کیوں خفا ہیں بتائیے بابا
رُخ سے چادر ہٹائیے بابا مجھ کو صورت دکھائیے بابا
سوتی ہیں یا غش آگیا بابا
میری اماں کو کیا ہوا بابا

اب نہ رلوائیے ہمیں اماں اُٹھ کے سمجھائیے ہمیں اماں
پاس بلوائیے ہمیں اماں یہ تو بتلائیے ہمیں اماں
جان کیوں کر نہ اپنی کھوئیں ہم
رات کو کس کے پاس سوئیں ہم

فطرتؔ نے مرثیے کی ہیت یعنی مسدس کو تو اپنایا ہے مگر کم و بیش سارے مرثیے ہٹ کر ہیں، ایسا لگتا ہے کہ جن بحور کا لحن انہیں پسند خاطر تھا انہیں بحور میں بلکہ اسی بحر میں انہوں نے

مرثیے کہے۔ ریاضتؔ، شہرتؔ اور فطرتؔ کے مراثی جو حمد و، صائب تک محدود ہیں کلاسیکی مرثیے کی اقدار پر پورے نہیں اترتے لیکن رثا کے تناظر میں کوئی وجہ نہیں کہ ان مراثی کو مراثی نہ کہا جائے، کہنے والے تو شاید یہ بھی کہدیں کہ یہ بھی مرثیہ گوئی کا کوئی نیا رُخ ہے، یا جدت ہے۔ فطرت کے مجموعۂ مراثی کا نام ''آہ'' ہے جس میں اُن کے آٹھ مراثی شامل ہیں۔

☆☆☆☆☆

رضیہ بیگم ریاضت:۔

ولادت ۱۹۱۶ء۔ وفات ۱۹۷۹ء

نام، رضیہ بیگم۔ تخلص ریاضتؔ۔ وطن حیدر آباد۔ انیسویں صدی کے ایک ممتاز شاعر مرزا اشہرؔ تھے جن کا انتقال ۱۹۰۵ء میں ہوا تھا۔ ان کی وفات کے بعد نسل بعد نسل رثا کا چراغ روشن رہا۔ رضیہ بیگم ریاضیت انہیں چراغوں میں سے ایک چراغ ہیں جو اولادِ اشہرؔ نے قطار اندر قطار سجائے تھے۔ ریاضتؔ کے والد گرامی کا نام مرزا علی مقدرؔ تھا جو مرزا اشہرؔ کے فرزند تھے۔ گویا رضیہ بیگم ریاضتؔ کو مرزا اشہر کی پوتی ہونے کا شرف تھا اور مرثیہ نگاری اُن کی وراثت تھی۔ اُن کی شاعری رثائی ادب تک محدود رہی۔ نوحہ، سلام، منقبت کی منازل سے گذر کر مرثیہ گوئی تک پہنچیں۔ زندگی میں نوحوں کے دو مجموعے ''اشک غم'' جلد اوّل و دوئم کے نام سے شائع ہوئے۔ تیسرا مجموعہ شائع نہ ہوسکا۔ مرثیوں کا کوئی مجموعہ شائع نہ ہوسکا حتیٰ کہ کسی ایک جگہ اُن کے مرثیے محفوظ بھی نہیں ہیں۔ خانوادۂ اشہر کے مختلف افراد کے پاس اُن کے مرثیے مخطوطات کی حیثیت سے موجود ہیں۔ کون جانے وہ کبھی سامنے آئیں گے یا نہیں؟

ڈاکٹر صادق نقوی نے اُن کے تین مراثی کا حوالہ دیا ہے۔ ایک مرثیہ حضور نبی کریمؐ کی وفات پر ہے اور دوسرا شہزادہ علی اکبر کے احوال کا اور تیسرا عون و محمد کے احوال پر ہے۔ ان کے حوالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ رضیہ بیگم نے مختلف عنوانات پر مراثی کہے ہیں۔ اور تاریخ پر بھی ان کی نظر ہے۔ زبان میں سلامت و روانی۔ الفاظ کی بندش، تشبیہات و استعارات لکھنؤ اور حیدر آباد کی زبان کی آمیزش کا ثمر ہیں جو رضیہ بیگم ریاضتؔ کو بھی ملا ہے۔

(۱) مرثیہ در حال رسول اکرم ﷺ

اے مومنو وفات رسالت مآب ہے اب کوچ ہے نبی کا حزیں بوتراب ہے

غم سے حسنؑ حسینؑ کی حالت خراب ہے کیا ہو بیاں جو فاطمہ کو اضطراب ہے
کر کے وصی علی کو سبکسار ہو گئے
حضرت وطن میں آتے ہی بیمار ہو گئے

بیت الشرف میں آئے شہنشاہ دوسرا آتے ہی گھر میں ضعف سے غش شہ کو آ گیا
باہر گئے نہ گھر سے کبھی پھر شہ ہدا جانے کو قبر میں ہی اُٹھے واں سے مصطفیٰ
زہرا جو اپنے باپ کو بیہوش پاتی تھیں
صورت کو دیکھ دیکھ کے آنسو بہاتی تھیں

مرثیے کے دو بند ایک بار پھر ذہن کو اسی منزل پر لے جا رہے ہیں کہ رضیہ بیگم کی قرآنی حوالوں اور تاریخی حوالوں پر نظر تھی اور وہ صحت روایات کو پیش نظر رکھتی تھیں۔ ذیل کے دو بند حضرت اسماعیلؑ کی والدہ گرامی جناب حاجرہ کے اضطراب پر مشتمل ہیں جو تاریخ کے ابواب کا احاطہ بھی کرتے ہیں اور قرآن حکیم کے قصص کا حوالہ بھی ہیں۔

کرتے ہیں لوگ حاجرہ کا حال یہ بیاں جب ذبح سے ذبیح خدا کو ملی اماں
گردن پہ ایک بچے کے تھا رہ گیا نشاں ماں کی نظر جو پڑ گئی اس خط پہ ناگہاں
پوچھا نشاں گلے پہ یہ کیا پڑا ہوا
بچے کو اے خلیل خدا میرے کیا ہوا

اور پھر جو سانحہ وقوع پزیر نہیں ہوا اور ملتوی ہو گیا اس کے تصوّر سے بی بی حاجرہ بدحال ہو جاتی ہیں۔

کس طرح تجھ کو آہ، میرے ماہ دیکھتی یہ چاندسی شبیہ نہ اللہ دیکھتی
تا عمر میرے بچے کی میں راہ دیکھتی دنبہ اگر نہ آتا تو کیا آہ دیکھتی
داغ پسر کسی کو نہ ربّ الہ دے
اولاد کے الم سے الٰہی پناہ دے

(۳) مرثیہ دراحوال عون و محمدؑ پسران سیدہ زینب و عبداللہ

ہے صبر بنت فاطمہ زہرا کا یادگار جب قتل رن میں ہو گئے فرزند گلعذار
بچوں کی لاشیں لائے شہنشاہ نامدار زینب نے سر جھکا دیا سجدے میں ایک بار

پھر بولی بھائی صبر کی دولت نہ کھوؤں گی
دیں آپ اذن گر مجھے رونے کا، روؤنگی

جناب حاجرہ کی پریشانی اور یہ سوچ سوچ کر فریاد دینکا کرنا کہ میرا بچہ قتل ہو گیا ہوتا تو کیا ہوتا؟ قرآنی حوالہ ہے اور حاجرہ کی پریشانی سے سیّدہ زینبؑ کے صبر کا تقابل تاریخی صداقت ہے گویا فرمان الٰہی سے منشائے الٰہی تک رضیہ کی نظر میں سب کچھ تھا اور سونے پر سہاگہ وہ جذبۂ مرثیہ گوئی اور اسلوب بیان جو انہیں بزرگوں سے ملا تھا۔

☆☆☆☆☆

امت الحمدی شہرت:- (حیدرآباد)

ولادت ۱۹۲۲ء۔ وفات ۱۹۶۰ء

نام، اُمتہ الحمدی۔ تخلص شہرت، وطن حیدرآباد (دکن) مرزا اشہر کی پوتی۔ مرزا علی یاور کی صاحبزادی اور رضیہ بیگم ریاضت کی چچازاد بہن ہیں۔

برِّصغیر ہندوستان (موجودہ پاکستان ہندوستان) میں حیا کے آنچل کے زیر سایہ، روایتوں کے حصار میں پلنے والی رثائی ادب کے حوالے سے ممتاز خواتین نے شاعری کی ابتدا عام طور پر نوحے سے کی ہے۔ یہی کچھ شہرت کے ساتھ بھی ہوا کہ سیزدہ سالہ یادگارِ شہادتِ عظمیٰ کے موقع پر اُن کے نوحوں کا مجموعہ چھپا اور اسکو جو شہرت اور پزیرائی ملی اس نے شہرت کو حوصلہ بخشا کہ وہ رثائی ادب کی دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کریں اور اُنہوں نے ایسا ہی کیا۔ تہذیب اور حیا کی چاردیواری میں شہرت مرثیے کہتی رہیں اور خواتین کے مجالس میں پڑھتی رہیں۔ ان کی وفات کے ۱۹ برس بعد ۱۹۷۷ء میں پہلی مرتبہ اُن کے پانچ مرثیے شائع ہوئے۔ اس مجموعے کی اشاعت کے بعد شہرت کا نام سامنے آیا تو ان کے تین مرثیے اور دستیاب ہوئے اور ۱۹۹۰ء میں ان کے آٹھ مرثیوں کا مجموعہ باب العلم سوسائٹی حیدرآباد کے زیر اہتمام شائع ہوئے۔ یہاں یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ باب العلم سوسائٹی کی محرک قوت (Driving force) ممتاز مرثیہ گو شاعر اور مرثیے کے ناقد ڈاکٹر صادق نقوی ہیں جنہوں نے ایک مرحومہ شاعرہ کے مراثی کو تلاش کر کے شائع کیا چہ جائیکہ آجکل تو حاضر و موجود شعراء کے مراثی کی اشاعت کے لئے عام طور پر کوئی اشاعتی ادارہ تیار نہیں ہوتا۔ شہرت کے مراثی زبان و فن کے اظہار کے مقصد کے تحت نہیں کئے گئے تھے۔ نہ ہی ان کی

زندگی میں ایسی مجالس میں پڑھے جا سکے جہاں تقابلی جائزے کے مراحل آتے ہیں۔شہرت کے معاملے میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ان کی وراثت کا تقاضا اور اس درد کی تحریک تھی جو عزائے حسین نے انہیں عطا کیا تھا کہ وہ مرثیے لکھتی تھیں۔اس لئے اُن کے مراثی مختصر ہوتے تھے اور ان میں مدح اور مصائب پر زور ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود مرثیے کی روایات اور لفظیات کا اُنہیں پورا ادراک تھا۔اس ادراک کے تحت اُن کے مراثی کہیں دعا تھے۔کہیں مدح تھے۔اور کہیں گریہ تھے۔ سچ پوچھیے تو۔یہی کیفیات حقیقت میں قلبی وارات ہوتی ہیں باقی سب کچھ تو روایت ہے، رواج ہے، تقابل ہے، ادبی قامت کا مسئلہ ہے۔

نمونہ کلام: (۱) مدحِ علی مرتضیٰ جو مرثیے کا چہرہ ہی نہیں مناقب کا حصہ بھی ہے۔

شیعوں کی جان تجھ پہ ہو قربان یا علیؑ اسلام جسم اور تُو ہے جان یا علیؑ
تیری ولا کا نام ہے ایمان یا علیؑ واللہ تو ہے مفتیٔ قرآن یا علیؑ
تو عالمِ علومِ خدائے علیم ہے
تو جانشیں خاصِ رسولِ کریمؐ ہے

(۲) مرثیہ در حال سیدۂ کونین فاطمہ زہراؑ۔مرثیے کا ابتدائیہ بند

اے مومنو جہاں میں قیامت کا روز ہے سیدانیوں کے واسطے آفت کا روز ہے
زہرا کی بیٹیوں پہ مصیبت کا روز ہے خاتون دو جہاں کی شہادت کا روز ہے
راحت سے کوئی آن کو نہ گذری جہان میں
رونے نہ پائی باپ کو اپنے مکان میں

(مرثیہ کا مقطع کا بند)

شہرت بس اب خموش کہ کرتے ہیں سب بکا شکر خدا کہ مرثیہ مقبول ہو گیا
زہراؑ سے کر بہ بلا عجز و ادب اب یہ التجا محشر کے روز مجھ کو وسیلہ ہے آپ کا
آگے نہ سب کے لونڈی کو شرمندہ کیجئے
اپنی ردا سے میرے گنہ ڈھانپ دیجئے

(۳) امام حسین علیہ اسلام کے احوال کے مرثیے کا ایک بند۔

دل کو کسی بیکس کے دکھانا نہیں اچھا گھر کو کسی بیکس کے جلانا نہیں اچھا

دیکھو کسی غمگیں کو ستانا نہیں اچھا ہووے جو یتیم اس کو رُلانا نہیں اچھا
اب کس لئے تم لوگوں کا یہ ظلم وستم ہے
کیا باپ کا غم بیٹی کے دل کے لئے کم ہے

شہرتؔ کے مراثی کے بند پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُن کا تخاطب بنی نوع انسان یا کثیر تعداد میں مرثیے کے سامعین نہیں بلکہ وہ مخصوص مجمع خواتین ہے جو اُن کے سامنے بیٹھ کر اُن کا مرثیہ سن رہا ہے۔ یہ اثر ہے اس پردہ داری اور تہذیبی ماحول کا جو اشراف کے خاندانوں کی خواتین کی زندگی کا اہم جزو تھا مگر اللہ رے غم حسینؑ کی آفاقیت جو فرد سے اقوام تک۔ قطروں سے قلزم تک اور ذرّوں سے کہسار تک، سب پر محیط ہے۔

شہرتؔ کے مراثی کے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔

(۱) ''پنج مراثی'' (پانچ مرثیوں کا مجموعہ)

(۲) ''ہشت مراثی'' (آٹھ مرثیوں کا مجموعہ)

☆☆☆☆☆

بانو سید پوری:-

خواتین کے کوائف اکٹھے کئے بھی نہیں کئے جاتے۔ اس کا سبب وہ تذبذب ہے جو دو طرفہ ہے۔ اہل نقد ونظر بہت سے سوالات کر نہیں سکتے اور خواتین ادیبہ ہوں یا شاعرہ ہر سوال کا جواب نہیں دے سکتیں۔ اس تذبذب نے فریقین میں احتیاط کی فضا پیدا کی جو رفتہ رفتہ ایک روش میں بدل گئی کہ شاعرات اور خواتین قلمکاروں کے کوائف میں عمر کے ذکر سے اجتناب کیا جائے اس لئے کہ ہر خاتون تو قرۃ العین یا عصمت چغتائی تو نہیں ہو سکتی کہ ہر بات کھلی کھلی ہو۔ سچ پوچھیے تو یہ بھی شہرت کا حصہ ہے ورنہ تو بہت سے باتیں بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ جملۂ معترضہ کی معذرت، ذکر ہے سید پور کی خاتون، بیسویں صدی کی شاعرہ بانوؔ سید پوری کا جن کا رسائی کلام مذہبی رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے۔ وہ ایک اچھی شاعرہ ہیں۔ ''کربلا۔ آغاز سے انجام تک'' اُن کے تین مرثیوں کا مجموعہ ۱۹۷۲ء میں سرفراز قومی پریس سے طبع ہوا۔ اس مجموعہ میں درج ذیل تین مراثی شامل ہیں۔

(۱) ترکِ وطن تھا منظرِ آغازِ کربلا

(۲) عطرِ گلاب فطرتِ ایمانِ کربلا

(۳) پہنچا بہ حدِ عصر جو امکانِ کربلا

ان مراثی میں امام حسینؑ کے کربلا میں پہنچنے سے شبِ عاشور، صبحِ عاشور، اور امام کی آخری قربانی یعنی علی اصغر کی شہادت تک کے حالات نظم کیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے حضرت نجم آفندی کے تلامذہ میں شہزادہ معظم جاہ، وفا ملک پوری، رزم ردولوی، خاور نوری، زیبا ردولوی اور دیگر اہم شعراء کے ساتھ بانو سید پوری کا نام بھی لکھا ہے۔ بانو سید پوری حضرت نجم آفندی کی شاگردہ تھیں یا نہیں لیکن ان کے مراثی اُن کے کلام کی پختگی اور شعوری بالیدگی کا ثبوت ہیں۔ مذکورہ بالا مرثیوں کے علاوہ ان کا ایک مرثیہ ''اعجازِ کربلا'' ہے جو ۱۹۸۰ کے بعد کی تصنیف ہے۔ اس مرثیے میں اس وقت کا احوال ہے جب ۲۸ رجب کو مدینے کے گورنر ولید بن عتبہ نے امام حسین علیہ السلام سے یزید کی بیعت طلب کی تھی۔ جی چاہتا ہے یہ پورا مرثیہ نقل کر دیا جائے لیکن صفحات کی تنگدستی کے سبب ایسا ممکن نہیں ہے۔ بہرحال مُشت از خروارے کے مصداق چند بند نقل کیے جا رہے ہیں۔

تاریخ میں ہے اک سے سوا اک تعب کی رات　　تدفینِ فاطمہؑ کی، نمود سبب کی رات

ماہِ صیام کی شب ضربت غضب کی رات　　لیکن نظر میں آج ہے ماہِ رجب کی رات

بے جرم و بے خطا پہ جفا بے سبب ہوئی

جس رات میں حسینؑ سے بیعت طلب ہوئی

بیعت طلب ستم کا چلن، اتقا سے تھا　　بیعت طلب فریب، رضا و قضا سے تھا

بیعت طلب فساد، سکون بقا سے تھا　　بیعت طلب گمان، یقین خدا سے تھا

بیعت طلب تھا کذب صداقت شعار سے

بیعت طلب خزاں تھی نظامِ بہار سے

بیعت طلب تھی رات سحر کے پیام سے　　بیعت طلب تھا مکر خدا کے نظام سے

بیعت طلب تھا کفر، رسولِ انام سے　　بیعت طلب تھا جہل کا پیکر امامؑ سے

بیعت نہیں نظامِ رسولاں کی موت تھی

بیعت نہیں حکومتِ یزداں کی موت تھی

حق پر بنام حق و صداقت جفا ہوئی قرآں کی بات اک دہن بے صدا ہوئی
ایماں پہ یورشِ ستم ناروا ہوئی سفیانیت بطرزِ دگر رُونما ہوئی
اک دورِ خاص کفر کا آغاز بن گئی
بولہبیت ' یزید کی آواز بن گئی

آواز' یعنی کفر سے پیماں کریں حسینؑ آواز' یعنی دین کو قرباں کریں حسینؑ
آواز' یعنی طاعتِ شیطان کریں حسینؑ آواز' یعنی بیعتِ سلطاں کریں حسینؑ
دیں کا نظام دیکھ رہا ہے سوئے حسینؑ جذبِ تمام، دیکھ رہا ہے سوئے حسینؑ
حق کا پیام دیکھ رہا ہے سوئے حسینؑ ہر خاص وعام، دیکھ رہا ہے سوئے حسینؑ
اک عالمِ ہراس ہے طاری جہان پر
سکتہ زمین پر ہے سکوت آسمان پر

جاہ و جلالِ آدمِ دوراں ہے مضطرب نطق و بیانِ موسیٰ عمراں ہے مضطرب
عزمِ خلیلؑ و نوح و سلیمانؑ ہے مضطرب مستقبل حیاتِ رسولاں ہے مضطرب
صف انبیار کی سامنے ساکت کھڑی ہوئی
رُخ پر حسینؑ کے ہیں نگاہیں گڑی ہوئی

فرعونیت کا کبر وفسوں بن کے تھا یزید نمرودیت کا دورِ زبوں بن کے تھا یزید
بولہبیت کا مکرِ دروں بن کے تھا یزید سفیانیت کا عہد جنوں بن کے تھا یزید
کفرونفاق و جہل کا منظر یزید تھا
ہر عہد ظلم وجور کا پیکر یزید تھا

ہر حق پرست دیکھ رہا ہے سوئے حسینؑ ہر زیر دست دیکھ رہا ہے سوئے حسینؑ
ہر ہندو بست دیکھ رہا ہے سوئے حسینؑ عہدِ الست دیکھ رہا ہے سوئے حسینؑ
شبیرؑ کے جواب کا قرآں ہے منتظر
مستقبلِ شرافتِ انساں ہے منتظر

ظالم کے اقتدار کی وہ ہر طرف کمند وہ اہلِ حق پہ راہ اماں ہر طرف سے بند
سہمے ہوئے ہراس کے عالم میں حق پسند ناگاہ ایک گونج "نہیں" کی ہوئی بلند

دیکھا یہ فخر خود کو علیؑ و بتولؑ نے
پیشانی حسینؑ کو چوما رسولؐ نے

وہ حق پہ اعتماد کا اک معجزا "نہیں"　　تشبیر ہو کہ تیغ "نہیں" برملا "نہیں"
مکہ "نہیں" مدینہ "نہیں" کربلا "نہیں"　　نیزے پہ بھی کٹے ہوئے سر کی صدا "نہیں"

جو ابتدا کی بات وہی انتہا کی بات
اک بندۂ خدا نے رکھی ہے خدا کی بات

وہ اک "نہیں" جو پیکرِ تخلیل کربلا　　وہ اک "نہیں" جو منظرِ تکمیل کربلا
وہ اک "نہیں" کے ذیل میں تعمیل کربلا　　وہ ایک "نہیں" جو بن گئی تفصیلِ کربلا

وہ اک "نہیں" جو دینِ رسالت پناہ ہے
وہ اک "نہیں" جو اشہدان لاالہ ہے

سنبھلی بگڑ چلی تھی جو تقدیر دین کی　　آدم "نے" عظمتِ نبی آدم نے سانس لی
محسن کو اپنے ڈھونڈ رہی تھی کلی کلی　　صحنِ چمن نے یک بیک آواز جیسے دی

شبیرؑ اقتدارِ گلستاں تجھے سلام
شبیرؑ اعتبارِ بہاراں تجھے سلام

اور اس کے بعد حسینؑ کی "نہیں" کی وضاحتیں، مدینے سے روانگی کا فیصلہ، مزارِ مادرِ گرامی پر حاضری، نانا رسول اکرم کی بارگاہ میں حاضری، مدینے سے روانگی تک کے احوال کو نظم کرنے کے تیور یہی میں جواب تک درج کئے گئے بندوں میں ہیں۔ مرثیہ اس منزل پر ختم کیا گیا ہے۔

کس طرح لے کے قلب پہ خنجر گئے حسینؑ
ماں کا مزار چھوڑ کے کیوں کر گئے حسینؑ

اس مرثیے کو پڑھنے والے انساف سے بتائیں کہ اس مرثیے سے زیادہ کیا جاننا چاہے گا کوئی یا تو سید پوری کے متعلق؟ زیادہ سے زیادہ یہی کہ اُن کا تازہ ترین مرثیہ کس قیامت کا ہوگا؟

☆☆☆☆☆

تصویر فاطمہ:- (کراچی)

علامہ جمیل مظہری کی نواسی ہیں۔ مشرقی پاکستان میں پیدا ہوئیں۔ یہ خطہ ارض بنگلہ دیش بنا تو تصویر فاطمہ کراچی آگئیں۔ تصویر فاطمہ اپنے نانا علامہ جمیل مظہری کو کبھی نہیں دیکھا لیکن وہ اُن کی تحریروں سے بہت قریب رہیں۔

تصویر فاطمہ۔ شاعری کی ورثہ دار خاتون ہیں۔ اُن میں شعر گوئی کی صلاحیت اکتسابی نہیں فطری ہے۔ لیکن اُنہوں نے اس فکر اور جذبۂ شعر گوئی کو رثائی ادب تک محدود رکھا ہے۔ ۱۹۸۸ء میں جب غالبؔ کی زمینوں میں ان کے پچاس سلام ایک مجموعے کی صورت میں شائع ہوئے تو اہلِ نقد ونظر حیران رہ گئے۔ ایک تو غالبؔ کی زمینیں دوسرے ان زمینوں میں صرف سلام کہنا آسان نہ تھا لیکن ان سلاموں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ تصویر فاطمہ کو شعر گوئی پر عبور حاصل ہے۔ تصویر فاطمہ نے اپنے خاندانی شرف کو بھی نظم کیا ہے۔

تصویر آج مرثیہ پہلا ہوا رقم لکھا بیادِ فرقتِ والد بہ چشم نم
میرا شرف، بزرگ میرے ثاقبؔ وجمیلؔ یہ ربط شعر اپنے گھرانے سے ہے بہم
وابستگی مجھے چمن مظہری سے ہے
رشتہ سخن کا بھی سخن مظہری سے ہے

اور یہ پہلا مرثیہ ''بصیرت'' ۱۹۸۹ء میں رقم ہوا۔ اس مرثیے کو حلقۂ فکر ونظر کراچی نے اسی سال شائع کیا۔ ادیب سہیل نے اُنہیں دبستانِ مظہریؔ کی شاعرہ کہہ کر مرثیے پر تبصرہ کیا۔ پروفیسر رضاؔ کاظمی نے مرثیے کی جدید نسل کی شاعرہ کہہ کر اظہار فکر کیا۔ علی حیدر ملک نے بالیدہ شعور کی شاعرہ قرار دے کر مرثیے کا خیر معلوم کیا۔

جمیلؔ مظہری نے مرثیے کی ہیئت میں ایک تبدیلی کی تھی کہ بند کے تیسرے مصرع کو قافیہ کی پابندی سے غیر مقید کیا تھا۔ اُن کے بعد جن شعراء نے اس روش کو اپنایا اُن میں ہلالؔ نقوی کے علاوہ تصویر فاطمہ بھی ہیں۔ اُن کا پہلا مرثیہ' بصیرت'' انساں کو حق نے حق کا خزینہ عطا کیا''. مسدس کی اسی ہیئت میں ہے۔ اُن کا دوسرا مرثیہ'' ماں'' ورقِ دل پہ جو لکھی ہے وہ تحریر ہے ماں'' ۱۹۹۰ء میں سامنے آیا۔ ماں کے موضوع پر پہلے بھی مرثیے کہے گئے ہیں۔ ڈاکٹر مسعود رضا خاکی نے بھی'' ماں'' کے زیرِ عنوان مرثیہ کہا ہے۔ حال ہی میں لاہور کے ایک نئے مرثیہ نگار سید علی رضا

کاظمی نے بھی اس موضوع پر حسب توفیق سعی کی ہے۔ ہر مرثیہ اپنی جگہ مکمل مرثیہ ہوتا ہے۔ یہ ذکر، تقابل کے لئے نہیں بلکہ حوالے کے طور پر آ گیا ہے جبکہ کہنا یہ تھا کہ لقویر فاطمہ کے مرثیے ''ماں'' میں اسلوب کی جو مہارت ہے، فکر کی جو بصیرت ہے، لفظوں کو برتنے کی جو قوت ہے اسی ہنرمندی کا نام لقویر فاطمہ ہے۔ اُن کے اس مرثیے کے چند بند نمونے کے طور پر نقل کئے جا رہے ہیں ۔

۱
صبح آغاز سی انسان کی تقدیر ہے ماں
ورقِ دل پہ جو لکھی ہے وہ تحریر ہے ماں
سایۂ کن میں چمکتی ہوئی تنویر ہے ماں
کہہ رہا ہے یہ قلم عظمتِ حوا کی قسم
سر بسر عالمِ تخلیق کی بیداری ہے
اُس کا کردار ازل تا بہ ابد جاری ہے

۱۹
یعنی عالم ہو کہ عابد ہو کہ ہو کوئی خطیب
یہ جو ہے گلشن ہستی میں گلوں کی ترتیب
شاعر و فلسفی و ناقد و فنکار و ادیب
ہیں یہ اک حسن تخیل کا مرصع پرتو
فن سے نسبت ہے انہیں علم سے پیوستہ ہیں
ماں کی آغوش میں کھلتا ہوا گلدستہ ہیں

اس کی ممتا ہی کے دم سے ہے طبعیت میں سرور
اس کی ممتا سے ہے انسان میں جذبے کا ظہور
نوع انساں کو سکھا دیتی ہے جینے کا شعور
اپنے ہر قول و عمل سے یہ بہ حد امکاں
زندگی حسن سحر بن کے نکھر جاتی ہے
ورنہ احساس کی راہوں بکھر جاتی ہے

مومنؔ و ذوقؔ ہوں اصغرؔ ہوں کہ وہ حسرتؔ ہوں
میرؔ ہوں دردؔ ہوں آتشؔ ہوں کہ وہ جرأتؔ ہوں
شادؔ ہو جوشؔ ہوں یا مظہریؔ و وحشتؔ ہوں
یا سوئے منزل فن غالبؔ و اقبالؔ و انیسؔ
کیا کیا منظر ہیں جو ان سب نے سجائے ہیں یہاں
ماں کے گلشن نے یہ سب پھول کھلائے ہیں یہاں

۳۱
بعد اللہ کے واجب ہے محبت کرنا
ماں کا دیدار ہے کعبہ کی زیارت کرنا
مرضیٔ ربّ ہے یہی، ماں کی اطاعت کرنا
اس کی ممتا میں ہے اللہ کی رحمت ساری
جو کہ اللہ سے پھر جائے کب انساں ہوگا
منحرف ماں سے جو ہو جائے وہ شیطان ہوگا

مادرِ موسیٰ کو، اور بی بی خدیجہ کو سلام ۳۱ آسیہ، حاجرہ اور زینب کبریٰ کو سلام
مستحق داد کی ہیں مریم و سارا بیشک دخترِ شاہِ ہدا فاطمہ زہراؑ کو سلام
ایسی ماؤں پہ جو تاریخ سدا ناز کرے
حشر تک ان کو خدا اور سرافراز کرے

دیکھنے میں تو ہیں بس ایک ہی صورت کے بشر ۳۴ تربیت ماں کی جگاتی ہے لہو کے جوہر
اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہوسکتا ماں ہو جیسی اسی انداز کا ہوتا ہے پسر
خونِ ہندہ میں یزیدِ ازلی ہوتا ہے
فاطمہؑ ہو تو حسینؑ ابن علی ہوتا ہے

اور پھر کربلا میں ماؤں کی قربانیاں اور اُن کے صبر کے مناظر نظم کیے ہیں تصویرِ فاطمہ نے۔ وہب کلبی کی ماں، قاسم کی ماں، علی اکبر کی ماں، عون و محمد کی ماں۔ سلام ہو ان ماؤں پر جن کی قربانیاں بے مثال اور جن کا صبر لازوال تھا۔ سلام ہو ان ماؤں کی کنیز مرثیہ گو شاعرہ تصویرِ فاطمہ پر جس نے ان ماؤں کے صبر کی تصویر کشی الفاظ میں کی ہے۔

صبح عاشورہ نے ماؤں کی یہ جرأت دیکھی ۳۶ صبح عاشور نے ماؤں کی یہ ہمت دیکھی
اپنے بچوں کو سنوارا سوئے مقتل بھیجا صبح عاشور نے یہ صبر کی طاقت دیکھی
غم نہ تھا اس کا کہ آغوش بھی ویراں ہو جائے
تھی یہی فکر کہ اسلام درخشاں ہو جائے

مرثیہ معصوم علی اصغر کی شہادت پر ختم ہوتا ہے۔

تصویرِ فاطمہ کے مجموعہ مراثی ''ردائے صبر'' مطبوعہ ۱۹۹۶ء میں اُن پانچ مرثیے شامل ہیں (۱) ''بصیرت'' تصنیف ۱۹۸۸ء (۲) ''ماں'' تصنیف ۱۹۹۰ء (۳) ''ردا'' تصنیف ۱۹۹۱ء (۴) ''خواب'' تصنیف ۱۹۹۲ء (۵) ''حضرت سجادؑ'' تصنیف ۱۹۹۵ء۔ ان مراثی کے مطالعہ سے واضح نشاندہی ہوتی ہے کہ تصویرِ فاطمہ جدید مرثیہ نگاری میں خواتین کی طرف سے روشن مستقبل کا استعارہ ہیں۔ ہمارے سامنے ۱۹۹۵ء کے بعد کی اُن کی کوئی تخلیق نہیں ہے لیکن جو کچھ سامنے ہے وہ بھی اس دردوسوز کے مدوجزر سے آگاہ کرتا ہے جو تصویرِ فاطمہ کے دل میں بسا ہے۔

☆☆☆☆☆

بانو نقوی:- (میاں چنوں، پاکستان)

ولادت ۱۹۳۳ء بمقام جگراؤں ضلع لدھیانہ۔

نام شہر بانو۔ قلمی نام بانو۔ سادات نقوی۔ ولد گرامی سید محمد عسکری نقوی۔

جو بچے علم و ادب کے اُجالوں میں پیدا ہوتے ہیں اور علمی ماحول میں پروان چڑھتے ہیں وہ کم سنی میں شعر و ادب سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ شہر بانو نقوی بھی انہی خوش بخت لوگوں میں شمار کی جا سکتی ہیں جنہیں اپنے گھر ہی سے علم و ادب کی آگہی ملی۔ ان کے والد گرامی سید محمد عسکری نے گھر میں علمی ماحول رکھا اور ساری زندگی علوم محمد کی ترویج میں مصروف رہے۔ ان کی والدۂ گرامی جناب شریف العلماء کی پوتی ہیں۔ انہیں میر انیس کے بہت سے مرثیے زبانی یاد ہیں۔ شہر بانو نقوی نے دس برس کی عمر میں (۱۹۴۵ء) میں ایک نوحہ کہا جسے سُن کر سید ظہیر الدین حیدر اور آغا حسین ارسطو جاہی نے حوصلہ افزائی کی اور شہر بانو کے لئے شعر و ادب کے دروازے کھل گئے۔

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۷ء میں یہ گھرانا ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آ گیا اور میاں چنوں میں آباد ہو گیا۔ ہجرت کے اس سفر میں شہر بانو کی عمر ۱۲ برس کی تھی۔ لدھیانہ سے لاہور کا سفر چند گھنٹوں کا سفر ہے لیکن شہر بانو کو آج بھی یاد ہے کہ نفرتوں کے اس دور میں جب راستوں پر نفرتوں کے انگارے بکھرے ہوئے تھے۔ درندگی ہاتھوں میں خنجر لئے انسانیت کا گلا کاٹنے پر آمادہ تھی۔ گلی کوچوں میں حتیٰ کہ اپنے گھروں میں امان نہ تھی اس ماحول میں لدھیانے سے لاہور تک کا سفر کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے چند گھنٹوں کا یہ سفر صدیوں میں طے ہوا ہو۔ اس وقت کی شہر بانو، درس گاہ کربلا کی طالبہ علم شہر بانو کے ذہن میں ظلم اور مظلومیت کے خطوط واضح ہو گئے۔ بیکسی اور مظلومیت کے معنی سمجھ میں آ گئے اور شہر بانو قلب و ذہن سے کربلائی ہو گئی۔ اسے نفرتوں سے اجتناب ہو گیا۔ کربلا نے شہر بانو کو نفرتوں کی آندھیوں میں محبت کے چراغ جلانے کا سلیقہ دیا اور یہی سلیقہ اس وقت اُبھر کر سامنے آیا جب شہر بانو نقوی نے اپنا پہلا مرثیہ کہا۔ اس مرثیے کا عنوان "ماہ بنی ہاشم" تھا اور اس کی ابتدا "محبت" کے بیان سے شروع ہوئی۔

خالق نے عجب چیز بنائی ہے محبت ۱ انسان کو فطرت نے سکھائی ہے محبت
یوں روح میں ہر شے کی سمائی ہے محبت ہر عضو و بدن اُتر آئی ہے محبت

تصدیق بھی ہو جاتی ہے لولاک لما سے
ہے رابطہ بندے کا اسی طور خدا سے

کعبہ دل مومن کو جو خالق نے کہا ہے ۲ اس کعبۂ ایماں کی محبت سے بنا ہے
یہ سامنے قدرت کا جو گلزار کھلا ہے تیار قوام اس کا محبت سے ہوا ہے
تسلیم و رضا اس میں ہے اسلام ہے اس میں
اور سارے رسولوں کا ہے پیغام بھی اس میں

کی فرض سلمانوں پہ قربا کی مودت ۳ اور اُن کی محبت کو کہا اجر رسالت
اور اجر رسالت بھی تو ہے جز و عبادت اور جز وعبادت کو کہا عین سعادت
کیوں ہو نہ مسلمان کی پہچان، محبت
انسانوں پہ خالق کا ہے احسان، محبت

قائم ہے محبت سے ہی یہ معمورۂ عالم ۴ جذبات محبت کے اُبھر آتے ہیں پیہم
تاثیر محبت سے ہی آنکھیں ہوئیں پر نم اس طرح محبت میں ہی ہم کرتے ہیں ماتم
رونے ہی سے ہوتی ہے جلد قلب و نظر میں
رونے سے اضافہ ہوا اوصاف بشر میں

کرنا ہے علاج دل بیمار تو آؤ ۵ مظلوم قصۂ ہے زمانے کو سناؤ
پیغام حسین علی سب کو سناؤ روؤ غم شبیرؑ میں، دنیا کو رُلاؤ
بتاؤ کہ اس غم میں تو راحت ہے ہماری
یہ غم تو ہے وہ غم جو ضرورت ہے ہماری

شہر بانو نقوی کا یہ مرثیہ ۶۲ بندوں پر مشتمل ہے اور ایک بند سے دوسرے بند کا ایسا ربط ہے کہ مرثیے کی تدوین دشوار امر ہے۔ بالکل اس طرح جیسے درج بالا پانچ بندوں میں ابتدا محبت سے، محبت کا رابط مودّت سے، مودت کا ربط عبادت سے، عبادت کا انجام سعادت عبادت کو سعادت قرار دینے والی ذات خدائے قدّوس کی۔ اُس خداوند کریم کا انسانیت پر احسان، محبت، محبت کا تعلق جذبات سے، جذبات کا انعام آنسو۔ آنسو قلب و نظر کی جلا کا سبب۔ آنسوؤں کا خزانہ غم شبیر۔ محبت کا خزانہ پیغام حسینؑ، پیغام حسینؑ اور آنسو دل کی بیماری کا علاج۔ اسی ربط سے یہ

مرثیہ آگے بڑھتا ہے۔

آمد ہے محرم کی، بڑا دل کو قلق ہے — سینہ غم شبیر میں کونین کا شق ہے
رنگ رخ خورشید بھی اس صدمہ سے فق ہے — مظلوم پہ یوں روؤ کہ جو رونے کا حق ہے

احساں ہے بڑا دین پہ شاہ دو جہاں کا
سن لو کہ یہ ہے تذکرہ سردارِ جہاں کا

محرم۔غم حسین کا زمانہ۔کون حسینؑ؟ جو شاہ دو جہاں ہے۔سردار جناں ہے۔احمد مُرسل کا نورسہ ہے۔کربلا میں تین دن کا پیاسا ہے۔وہ شہر جسے حسینؑ کے نانا ختمی مرتبت رسولؐ اکرمؐ نے آماجگاہ خلق بنایا تھا، وہ شہر جہاں حسینؑ کے نانا کا روضہ تھا۔حسینؑ کو وہ روضہ چھوڑنا پڑا۔وہ شہر چھوڑنا پڑا اس لئے کہ یزید کی بیعت پر آمادہ نہیں ہوئے تھے۔شہر بانو نے ایک مصرعہ کو دوسرے مصرعہ سے مربوط کے مرثیے کو آگے بڑھایا ہے۔جیسے حسین نے مدینہ چھوڑنے کا سبب یوں بتایا ہے۔

سب اُس نے بدل ڈالے ہیں آئینِ شریعت — کسطرح میں کرسکتا ہوں اس شخص کی بیعت

حسین نے گھر چھوڑ دیا۔مکہ آئے۔اہل مکہ شاد ہیں کہ حسینؑ کے ساتھ فریضہ حج ادا کریں گے۔حسین کو کوئی اطلاع ملی، حسین مکّہ سے تشریف لے جاتے ہیں۔

رخ جانب کوفہ تھا، نظر سوئے خدا تھی — منزل پہ جو پہنچے، تو وہاں کرب و بلا تھی

کربلا میں امام مظلوم کی آمد سے حضرت عباس کی شہادت کے حوال تک اس مرثیے میں نظم کئے گئے ہیں۔اور مرثیہ دعا پر ختم کیا گیا ہے۔

بانو یہ بصد عجز دعا مانگ خدا سے — اس سال زیارت کروں حضرت کی دعا سے
اُمید بڑی ہے مجھے مولا کی عطا سے — سب کچھ ہمیں مل جائے درِ آل عبا سے

سب کام سر انجام ہوں، عباسؑ کا صدقہ
پورے میرے سب کام ہوں، عباسؑ کا صدقہ

اس منزل پر پہنچ کر مرثیے کے قاری کے منہ سے بیساختہ نکلتا ہے۔آمین، ثمہ آمین
اے رب کریم تیری مرثیہ گو کنیز شہر بانو کا نام شہزادہ علی اکبر کی مادر گرامی شہر بانو کے نام

پر ہے۔ مادر علی اکبر کا صدقہ اس مرثیہ گو شہر بانو کے سر پر شہزادی شہر بانو کے آنچل کا سایہ کردے۔ اور اس کے دل میں غم حسینؑ کی نعمت فزوں سے فزوں تر کردے۔

☆☆☆☆☆

نشاط مقبول رضوی:- (راولپنڈی)

ولادت ۱۹۴۰ء

کموڈور مقبول حسین کی دخترِ نیک اختر نشاط مقبول لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ اُن کا گھرانا فیض آباد کا رئیس گھرانا تھا۔ مرکز تہذیب اودھ کی سرزمین پر جنم لینے والی نشاط ۱۹۵۱ء میں صرف گیارہ برس کی تھیں جب اُن کے والد گرامی کموڈور مقبول حسین اور اُن کا گھرانا پاکستان آ گیا۔ ملازمت کے سلسلے میں اُنہیں راولپنڈی جانا پڑا اور وہ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی وہیں آباد ہو گئے۔

نشاط نے وہیں تعلیم مکمل کی اور ۱۹۶۲ء میں صحافت کو بطور پیشہ اپنایا۔ صحافت کے سلسلے میں ہی وہ دوسرے ممالک بھی گئیں۔ سب سے زیادہ اثر اُنہوں نے ترکی قیام کے دوران قبول کیا اور وطن واپس آکر اپنا سفرنامہ'' ترکی ایک نظر میں'' تحریر کیا۔ ایک عام مسافر یا سیاح اور ایک فنکار کے'' دیکھنے میں'' بہت فرق ہوتا ہے۔ لوگ آج کے ترکی میں کو دیکھتے ہیں وہ ترکی کا آج ہے لیکن جو لوگ ترکی میں سلطنت عثمانیہ کے دارالخلافے کو تلاش کرتے ہیں اُن کی نظر آج کی چکا چوند سے زیادہ اس بے ضمیری پر جاتی ہے جس نے تخت کے لئے ایک تہذیب کی بربادی میں کردار ادا کیا۔ یہ دیکھنے دیکھنے کی بات ہے۔ نشاط مقبول ایک صحافی ہیں یقیناً اُن کی نظر وقت کے چہرے سے تاریخ کے پردے اُٹھاتی ہوگی اور انہیں'' صیہونیت نواز، گدایانِ تخت و تاج'' حکمران بھی نظر آتے ہوں جنہیں بے ضمیری نے تخت و تاج دلایا ہے۔

نشاط مقبول نے شاعری شروع تو قصائد، سلام اور نوحے کہے۔ اور ۱۹۷۸ء میں اُنہوں نے پہلا مرثیہ کہا'' علم اُٹھا کے جو عباسؑ ذی وقار چلے'' کہا۔ یہ مرثیہ'' نذر علمدار'' کے زیرِ عنوان ۱۹۷۸ء ہی میں راولپنڈی سے شائع ہوا۔ یہی مرثیہ ۱۹۹۹ء میں سہ ماہی'' رثائی ادب'' کراچی نے شائع کیا۔

علم اُٹھا کے جو عباسؑ ذی وقار چلے ۱ جلو میں ساتھ لئے شان و افتخار چلے
فرشتے شوکت و اجلال پر نثار چلے مگر حسینؑ، چلے ساتھ سوگوار چلے

سکینہ بالی پھریرے سے لپٹی جاتی تھی
بلائیں لیتی بہن ساتھ ساتھ آتی تھی

علم نبیؐ کا لئے رن میں آ گئے عباسؑ　۹　جہان کفر میں حق بن کے چھائے عباسؑ
شجاعتوں کے وہ جوہر دکھا گئے عباسؑ　　علیؑ کے شیر ہیں سب کو بتا گئے عباسؑ
شکست دے کے عدو کو نجات پر پہنچے
وہ تھے فرات کے فاتح فرات پر پہنچے

بھری جو مشک تو اعدا میں پڑ گئی ہلچل　　وہ شور تھا کہ کہیں یہ جواں نہ جائے نکل
علیؑ کا لختِ جگر ہے لگاؤ برچھی کے پھل　　ستم ہو شیر پہ ایسا کہ پھر نہ پائے سنبھل
ادھر سے شیر بڑھا اس طرف سپاہ چلی　　علیؑ کے چاند کو گھیرے تھی ظلم کی بدلی
کہیں سے تیر چلے اور کہیں سے تیغ چلی　　چھدی جو مشک تو سقے کی آس ٹوٹ گئی
بہا جو خوں تو زمیں لالہ زار ہونے لگی
ترائی ابن علی پر نثار ہونے لگی

نشاط مقبول نے اب تک ۱۷ مرثیے کہے ہیں۔ اُن کا ایک اور مرثیہ (تعارف کے ساتھ) سید وحید الحسن ہاشمی نے شائع کیا ہے۔ مرثیہ شہزادہ علی اکبر کے احوال پر ہے۔

آج پھر حسن مضامیں کو گہر بار کروں　۱　عطر بیز آج فصاحت کا چمن زار کروں
پھول چُن چُن کے جو لڑیوں کو میں تیار کروں　　دل میں اُمڈے ہوئے جذبات کا اظہار کروں
آبِ تسنیم سے تر خشک زباں کرتی ہوں
شاہزادے علی اکبر کا بیاں کرتی ہوں

پائے گلزار محمدؐ نے سبھی گل نایاب　　حسن گل، خصلت گل، نکہت گل، کل نایاب
زینت گلشن عالم ہیں یہ بالکل نایاب　　پڑھ رہے ہیں یہ ترانے لب بلبل نایاب
گل بنے سیدِ لولاک کے جب دامن سے
ساری دنیا کو ملا فیض اسی گلشن سے

باغ پھیلا ہے یہ کس طرح قرینہ دیکھو　۲　کربلا دیکھو، نجف دیکھو مدینہ دیکھو
مشہد و سامرہ و قبر سکینہ دیکھو　　شام کی راہ میں ایک ایک نگینہ دیکھو

ساری خوشبو ہے گلستان پیمبر کے لئے
باغباں لایا تھا سب پھول نچھاور کے لئے

مرثیے میں ذکر امام حسین، ولادت علی اکبر، فضائل علی اکبر، سیدہ زینب کو تربیت اکبر کی ذمہ داری کا سونپا جانا، سب احوال نظم کرنے کے بعد نشاط مرثیے کو اس منزل پر لاتی ہیں

شام میں تخت نشیں جہل کے سلطان ہوئے　　روشنی حق کی بجھا دینے کو طوفان بڑھے
ظلم اور جبر کے ہونے لگے سامان نئے　　تب حسینؑ ابن علیؑ دین کے سلطان اُٹھے
بیعت ایمان کے قاتل کی نہ کی جائے گی
داستاں خون سے مقتل میں لکھی جائے گی

اور امام حسین کربلا کی طرف سفر اختیار کرتے ہیں۔ کربلا میں مصائب، جنگ اور علی اکبر کی شہادت کے بعد۔ لاشۂ اکبر کو امام خیمے میں لاتے ہیں۔ ماں بیساختہ بچے کی لاش کی طرف بڑھتی ہیں۔ اس موقع پر نشاط مقبول نے ایک بیت کہا ہے۔

آج رکھ لی ہے میری لاج، میں واری بیٹا
زیر احسان ہے اماں یہ تمہاری بیٹا،

اور پھر مادر علی اکبر صبر کی منزل پر نظر آتی ہیں۔

یا نبی نذر ہو یہ مادر بیکس کی قبول　　یا علی شیر خدا، ہو میری محنت بھی حصول
لال پروان چڑھا دیکھئے یا بنتؑ رسولؐ　　راہ معبود میں قربانی میری ہو مقبول
کربلا خیر سے گودی تیری آباد رہے
چھٹ گئی ہوں علی اکبر سے مگر یاد رہے

نشاط مقبول کے مراثی ابھی تک شائع نہیں ہوئے لیکن جس خانوادے سے اُن کا تعلق ہے۔ وہ علم دوست خانوادہ ہے۔ یقیناً وہ اس سرمائے کو ضائع نہیں ہونے دیں گے۔

☆☆☆☆☆

گل فروا امروھوی:- (لاہور)

ولادت ۱۹۷۱ء

گل فروا کا وطن مالوف امروہہ ہے لیکن تقسیم ہند کے بعد والدین ہجرت کر کے

پاکستان آ گئے تھے۔گل فردا لاہور میں پیدا ہوئیں۔تعلیم کے میدان میں اُن کے ذہانت نے اُنہیں برق آثار بنا دیا تھا۔کراچی یونیورسٹی میں وہ پوزیشن ہولڈر طالبہ تھیں۔انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے ۱۹۹۲ء میں (اسلامک سٹیڈیز)(Islamic Studies) میں ایم۔اے کیا۔

شاعری اوائل عمر میں شروع کر دی تھی۔۱۶ برس کی عمر سے اُن کی رثائی نظمیں سامنے آئی شروع ہو گئی تھیں۔اُنہوں نے ۱۹۹۰ء میں جب وہ صرف انیس برس کی تھیں پہلا مرثیہ کہا۔

انیس برس کی ایک لڑکی کا مرثیہ کہنا یوں بھی ایک غیر معمولی بات ہے۔مرثیہ گوئی کے لئے شعر گوئی پر قدرت ہونی ضروری ہے۔اسکے علاوہ تاریخ سے آگاہی، کربلا کا پس منظر، اور بعد شہادت حسین قربانی حسین کے اثرات پر نظر نہ ہوں تو مسدس میں نظم تو کہی جا سکتی ہے، مرثیہ نہیں۔گل فرؔدا نے پہلا مرثیہ جو کہا ہے۔اُسے بحیثیت مرثیہ تسلیم کیا گیا ہے۔گویا یہ جوہر اُنہیں ودیعت ہوا تھا اس لئے کہ ۱۹ برس کی عمر تک یہ ہُنر نہیں سیکھا جا سکتا۔ان کے مرثیے کے کچھ بند درج ذیل ہیں۔مرثیہ حضرت عباس کے احوال پر ہے جو ولادت عباسؑ سے شروع ہوتا ہے اور شہادت عباسؑ پر ختم ہوتا ہے۔

ایک عرصہ سے مرثیہ نگاروں کے سامنے یہ مسئلہ بھی ہے کہ طویل مرثیہ سننے کے لئے سامعین کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔زندگی کی دارو گیر میں مبتلا انسان کہیں جم کر بیٹھ نہیں سکتا اس لئے مرثیے کو مختصر ہونا چاہئے۔گل فرؔدا نے گویا اس آواز سے آواز ملائی اور مرثیوں میں اختصار کو پیش نظر رکھا۔ہمارا سلام ہو اُن والدین پر جنہوں نے اپنی تربیت اور گھر کے ماحول کی آسودگی سے ایک انیس برس کی لڑکی کو گل فرؔدا بنا دیا۔اور سلام ہو اس لڑکی پر جس نے ترغیبات عمر اور ترغیات دنیاوی سے منہ موڑ کر ولائے اہلبیت کو اپنا راستہ بنا لیا۔

گل فردا کے پہلے مرثیے کا عنوان ''تصویرِ وفا'' ہے۔

گلزار مصطفیٰ میں ہے ہر سو نئی مہک　۱　ہر برگ گل پکارتی ہے یہ لہک لہک
آمد چمن میں آج نئی اک کلی کی ہے　　شامل فضا میں سارے پرندوں کی ہے چہک
گھر میں علی کے خلد بریں کی جو ہے بہار
اک عید ہے ولادت عباسؑ نامدار

شبیرؑ خوش ہیں قوت بازو کو پا گئے　۲　شمر رُخ حسین پہ ہو ہو فدا گئے

کلثوم بولیں یہ میرے پردے کا آس ہے
زینبؑ کے دل میں کتنے تصور سما گئے
حیدرؑ نے گر کے سجدے میں شکر خدا کیا
پروردگار تو نے ہی وارث عطا کیا

حسنینؑ میرے پاس امانت رسول کی ۳
یہ دونوں میرے لعل دعا تھے بتول کی
میرے بھی دل میں آرزو ایسے پسر کی تھی
صد شکر کردگار دعا یہ قبول کی
بیٹا میرا یہ نعمت پروردگار ہے
اس شیر کی نظر میں وفا کا خمار ہے

رہتے تھے مثل سایۂ شبیر ہر گھڑی ۵
حاضر وہ تھے کہ جسکی ضرورت کبھی پڑی
ہردم خیال حضرت خیرالانام تھا
سایہ کیا حسینؑ پہ جو دھوپ تھی کڑی
عباسؑ کی نظر میں جو شہ کا مقام تھا
وہ خدمت امام میں مثلِ غلام تھا

کرب و بلا میں دسویں محرم جو آگئی ۷
غم کی اداسی خانہ زہرا میں چھا گئی
ایک ایک کر کے اقربا جنت کو چل دیئے
ویران کر کے مصطفیٰؐ کا گھر قضا گئی
شبیرؑ چپ تھے شیر سے بھائی کو دیکھ کر
عباسؑ مضطرب تھے ترائی کو دیکھ کر

عباسؑ نے سکینہ سے بڑھ کر کیا کلام ۸
مشکل کو میری حل کرو اے دختر امام
عموّ کے صبر کا نہ لو اب اور امتحاں
اتنا تو کر دو اپنے چچا کا یہ ایک کام
بیٹا نہ جاؤنگا میں کبھی بہر کارزار
پانی تو لانے دیں مجھے سرور تیرے نثار

گودی میں لے کے آئے سکینہ کو نامور
بس رہ گئے حسینؑ کلیجے کو تھام کر
پیشانی چوم چوم کے غازی سے تب کہا
بھیا تری جدائی سے پھٹنے لگا جگر
بس اب وہی کرو کہ جو زینب کی رائے ہو
میں جانتا ہوں بچی کو کیوں لے کے آئے ہو

خیمے کے در پہ حلقہ بنائے تھے نونہال
کملائے چہرے زرد تھے بکھرے ہوئے تھے بال

سب کو یقیں تھا آپ بچا لے کے آئیں گے — وردِ زباں یہی تھا کہ اے ربِ ذوالجلال
تیری اماں میں شیرِ دلاور رہے سدا
غازی تیرے حسینؑ سے ہرگز نہ ہو جدا

لو قصہ مختصر گئے عباسؑ نہر پر — مشکیزہ پہ دلیر کی ہر وقت تھی نظر
پیشِ نظر تھی شاہ کے بچوں کی تشنگی — نے کچھ عدو سے کام نہ اُن کی جفا کا ڈر
گرچہ گھرا تھا دشمنوں میں چودھویں کا ماہ
بس اک خیالِ مشک ہی تھا مرکزِ نگاہ

کہتے تھے شاہ میرے دلاور کی خیر ہو — غازی کے لوٹنے میں خدایا نہ دیر ہو
پروردگار دل کو نہیں ہے مرے قرار — تیری اماں میں فوجِ حسینی کا شیر ہو
اکبر سے یہ کہا میرے بازو کو تھام لو
بس لے چلو فرات پہ حیدر کا نام لو

گلِ فردا نے جس سلیقے سے قدم قدم صحیح روایات کا انتخاب کر کے مولا عباسؑ کی شہادت کو نظم کیا ہے وہ کسی کہنہ مشق مرثیہ نگار کا کام تھا۔ بین کی منزل پر بھی گلِ فردا نے اعتدال کا دامن نہیں چھوڑا اور اہلبیت اطہار سے ایسے بین منسوب کرنے سے حتی المقدر احتراز کیا ہے جو اُن کے صبر کے منافی ہوں، مگر بین کی روایت سے یکسر انحراف بھی تو آسان نہیں۔

اے زینبِ حزیں کے دلاور کہوں میں کیا — اے قوتِ حسینؑ برادر کہوں میں کیا
تیرے فراق میں نہیں شبیرؑ کو قرار — تم تو ہو سوئے بازو کٹا کر کہوں میں کیا
پوچھیں جو مجھ سے بہنیں تمہاری تو کیا کروں
روئے سکینہ راج دلاری تو کیا کروں

لو اب تمام ہوگیا مولا کا مرثیہ — کتنا ہے درد ناک یہ آقا کا مرثیہ
لکھا ہے سوزِ دل سے ہر اک مصرعۂ کلام — یارب قبول ہو گلِ فردا کا مرثیہ
جو لفظ بھی لکھوں وہ پیامِ ولا بنے
ہر بیت اس کلام کی بیتِ عزا بنے

(مرثیے کے بند" رثائی ادب" کراچی۔ بیسویں صدی کے آخری شمارہ سے)

☆☆☆☆☆

رونق جہاں رونق :-

بیسویں صدی کی شاعرہ رونق جہاں رونقؔ کا مجموعہ کلام ''غم پیہم'' سنہ ۱۹۷۰ء کی دھائی میں شائع ہوا تھا جو نوحہ۔ سلام، رباعیات اور چوالیس (۴۴) بند کے ایک مرثیے پر مشتمل تھا۔ ماہنامہ طلوع افکار'' کراچی کے مدیر ممتاز ادیب، ناقد اور مرثیہ نگار شاعر جناب حسین انجم نے'' غم پیہم'' پر پیش لفظ لکھا تھا۔ پیش لفظ کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

> '' رباعی، سلام اور مرثیہ میں تقریباً بیک وقت طبع آزمائی کر کے شاعرہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ مختلف اصناف سخن پر یکساں قدرت رکھتی ہیں اور ہر صنف سخن میں بے تکلف شعر گوئی پر قادر ہیں۔ اس کے علاوہ تیس سال بعد دفعتاً اقلیم سخن کی طرف مراجعت کر کے اور تین مختلف اصناف سخن کو انتہائی کامیابی سے اپنی شعر گوئی کا میدان بنا کر وہ یہ ثابت کر چکی ہیں کہ مشق و مزاولت کی عدم موجودگی کے باوصف محض مذاق سلیم کو رہنما بنا کر رطب و یابس سے پاک اور حشو و زائد سے مبرا شاعری کی جا سکتی ہے۔''

(مرثیہ نگاری میں خواتین کا کردار۔ جمال نقوی مطبوعہ'' رثائی ادب شمارہ ۲۶)

''اقلیم سخن مین تیس سال بعد مراجعت'' ایک طویل خاموشی یا مرثیہ گوئی کی طرف سے غفلت یا اجتناب کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے باوجود کسی شاعرہ کے کلام پر حسین انجمؔ کی مندرجہ بالا سند شاعری کا مقام متعین کرنے کے لئے کافی وشافی ہے۔ رونق جہاں رونقؔ کے مرثیے کے متعلق محترم حسین اعظمی نے یہ بھی لکھا ہے کہ

> '' رونق جہاں رونق کے اس مرثیے میں مصائب نویسی اور شعریت کا متوازن امتزاج بھی ہے اور مرثیہ نگاری کے قدیم طرز اسلوب کی پاسداری بھی''

راقم السطور کو احساس محرومی بھی ہے۔ اور افسوس بھی کہ رونق جہاں رونقؔ کا مرثیہ کوشش کے باوجود حاصل نہ کیا جا سکا۔ نمونہ کلام کے طور پر صرف ایک بند نقل کیا جا رہا ہے۔

دشت میں محو عبادت ہوئے سلطان حجاز
پڑھی صف باندھ کے سرور کے رفیقوں نے نماز
گئے سجدے میں، تو خالق سے ہوئے راز و نیاز
بخش دے امت عاصی کو تو، اے بندہ نواز

اپنے بندوں پہ سدا کرتا ہے احساں یارب
منزل صبر مسافر پہ ہو آساں یارب
☆☆☆☆☆

تسنیم نقوی:-　　(بورے والا ضلع دھاڑی)

پنجاب کے ایک قصبے ''بورے والا'' سے ۱۹۹۰ء میں ایک سحر طلوع ہوئی۔ یہ مرثیوں کا ایک مجموعہ تھا جسے بورے والا ہی کے ایک پبلشر نے شائع کیا تھا۔ اس کی مصنفہ خاندان سادات کی ایک لڑکی سیدہ تسنیم نقوی ہیں۔ مجموعے کا نام ''معصوم پیاسے کربل میں'' ہے جس میں تسنیم نقوی کے آٹھ مرثیے شامل ہیں۔

کچھ ناقدین نے اس مجموعے کو ناپختہ شعور کی شاعری قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ تسنیم نقوی اگر تھوڑی سی اور جلا پانے کے بعد کچھ اور مشق سخن کرنے کے بعد، یا کسی اُستاد سے سلسلۂ تلمذ وابستہ کرنے کے بعد یہ مجموعہ شائع کراتیں تو بہتر ہوتا۔ اس مجموعے کی حمایت کرنے والوں کا کہنا ہے کہ پہلے مجموعے کو کڑی تنقیدی نظر سے دیکھنا ایک مرثیہ نگار، وہ بھی خاتون مرثیہ نگار کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ بالخصوص کلیم شہزاد رقم طراز ہیں کہ؛

> '' ہمیں اس مجموعہ کو اُستاد مرثیہ نگار شعراء کے متعین کیے ہوئے معیار پر نہیں پرکھنا چاہئے۔ کیونکہ ابھی ابتدائی سفر ہے۔ جیسے جیسے آگے مسافتوں سے واسطہ پڑے گا۔ منزلوں کی نشاندہی ہوگی تو مزید آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی بڑھے گا۔ میں یہ کہنے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا ہوں کہ اس مجموعہ کی شاعرہ کے دل میں اہلِ بیت اور سانحۂ کربلا کے حوالے سے جو بھی جذبات پیدا ہوئے، جو اُن کے ذہن کے نقشے میں اُبھران سب کو انہوں نے اپنے سچے اور کھرے جذبوں کی خوشبو میں گوندھ کر لفظوں کی تسبیح میں پرو کر ہمارے دامن میں ڈال دیا ہے''۔

دونوں آراء نیک نیتی پر مبنی ہیں جس میں یہ مشورہ بھی شامل ہے کہ ابھی ان مرثیوں کا اشاعت قبل از وقت تھی۔ کہ کلیم شہزاد نے سیدہ تسنیم کے مرثیے کا جو ایک بند نمونۂ کلام اور تصدیقِ جملہ ہائے حمایت کے طور پر نقل کیا ہے وہ یہ ہیں ۔

کیسے تھے درد ظالموں دل پر ہے حسینؑ　　اصغر کی لاش گود میں لیکر چلے حسینؑ
خیموں میں لا کے لاش کو رکھا تھا سامنے　　جو پوچھتی تھی بیبیاں کیسے کہے حسینؑ

اصغر چلا گیا ہے جو بخت بتول تھا
مارا ہے اس کو تیر جو آل رسولؐ تھا

یہ رائے بھی غلط نہ تھی کہ تسنیم نقوی کا سارا کلام ذرا تاخیر سے شائع ہوتا تو بہتر ہوتا۔ یاد رہے کہ بات اشاعت کی ہو رہی ہے، تشہیر کی ہو رہی ہے مرثیہ گوئی کی نہیں۔ جہاں تک سیدہ تسنیم نقوی کی مرثیہ گوئی کا تعلق ہے انہیں مرثیے کی دنیا میں خوش آمدید کہنا بھی ضروری ہے اور ان کی حوصلہ افزائی بھی ضروری ہے۔ ہر وہ شخص جس کے دل میں محبت حسینؑ ہے اس کا فرض ہے کہ اس چراغ کو زمانے کی آندھیوں سے بچائے۔ مرثیہ محمد آلِ محمدؐ سے شاعر کے قلب و فکر کے رشتوں کی استواری کے بعد ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہ ولائے اہلبیت کی منزل ہے۔ یہ اطاعت رسول کی منزل ہے۔ یہاں توتلی زبان سے بھی آواز دی جائے اور کوئی اس توتلی زبان پر اعتراض کی گستاخی کرے تو ارشاد نبیؐ ہوتا ہے کہ "اللہ کو بلالؓ کی زبان پسند ہے" کون جانے سیدہ زہراؑ کی یہ کنیز سیدانی کن جذبوں کے چراغ لئے کربلا والوں کا ذکر کرنے چلی ہے۔ کون جانے اس کے اس ذکر سے کتنے دلوں کے اندھیرے دور ہوں گے۔ اور سیدہ تسنیم کو ہمارا یہ مشورہ ہے کہ بی بی تم ایک نیک مقصد کو لیکر سرگرم سفر ہوئی ہو۔ تم اپنی تعریف سے بالاتر ہو کر زہراؑ کے گھرانے کے قصیدے لکھو۔ اگر کوئی تمہارے قصیدے لکھے تو بالکل نہ سنو۔ تم برستے تیروں میں سر بسجود حسینؑ کا علم لے کر نکلی ہو تو عجز کو اپنی پیشانی کا جھومر بنالو، اس لئے کے اس راہ میں مٹنا ہی سربلندی ہے۔ فنا ہونا ہی بقا ہے۔

☆☆☆☆☆

سلطانہ ذاکر اداؔ:- (کیلی فورنیا)

تاریخ پیدائش یکم ستمبر ۱۹۲۹ء

نام مصطفیٰ سلطانہ۔ تخلص اداؔ۔ قلمی نام سلطانہ ذاکر اداؔ۔ جائے ولادت رامپور (یو۔ پی) والد کا اسم گرامی خورشید علی مرزا قمی کاظمی۔ قمی اس لئے لکھتے تھے کہ اجداد "قم" سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد سلطانہ کے پر دادا کو مٹیا برج میں قید کیا گیا تھا۔ دادا یوسف علی خان رام پور آ گئے تھے۔

سلطانہ کی شادی ۱۴ مئی ۱۹۴۴ء امروہہ کے نقوی خاندان میں کردی گئی تھی۔ شوہر کا نام سید ذاکر حسین نقوی تھا جو نواب رام پور کی فوج میں افسر تھے۔ قیام پاکستان کے بعد ذاکر حسین نقوی اور سلطانہ پاکستان آگئے اور ذاکر حسین نقوی پاک فوج میں اسی عہدے پر تعینات ہوگئے۔

سلطانہ کی شاعری کی ابتدا اس وقت ہوئی جب اُن کی عمر ۱۷ برس کی تھی۔ اپنی کتاب ''سفر کب تک'' میں سلطانہ ذاکر اداؔ نے خود اس کی وضاحت کی ہے کہ رامپور میں اُن کے گھر میں کام کرنے والی دو خادمائیں رامپوری ملازمہ ''بُوا'' اور نوگانواں سے درآمد شدہ ''بڑی بی'' میں ہر وقت جھگڑا رہتا تھا۔ ننھی سلطانہ نے شرارت بھرے انداز میں اُن دونوں کے جھگڑے پر چند مصرعے موضوع کیے۔ ۱۹۳۴ء کی یہ واردات سلطانہ ادا کی شاعری کی ابتدا کا حوالہ بن گئی۔ اپنے مکتوب بنام عاشور کاظمی مرقومہ ۲۶ جون ۲۰۰۲ء میں اُنہوں نے لکھا کہ

''اُن کی مرثیہ نگاری کی ابتدا جون ۱۹۹۴ء میں السوبرانتے، کیلی فورنیا (امریکہ) میں ہوئی''

سلطانہؔ نے اُن محرکات کا ذکر نہیں کیا جو انہیں غزل سے مرثیے کی طرف لے گئے۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۹۴ء تک سلطانہ نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ اُن کا یہ کلام ''نمودِ سحر'' میں شائع ہوا ہے جسے ''جاوداں'' کراچی نے ۱۹۹۹ء میں شائع کیا ہے۔ ''نمود سحر'' کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ سلطانہ ذاکر اداؔ کے خسر میجر امتیاز نواب تھے جو ہز ہائی نس رام پور کے معالج خصوصی تھے۔ سلطانہؔ کی پسندیدہ صنف سخن ''غزل'' ہے جس کا اظہار وہ برملا کر چکی ہیں لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اُن کا پہلا مجموعہ کلام ''معراج وفا'' ہے جو ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ کلام میں حمد، نعت، منقبت، سوز و سلام۔ نوحے اور مرثیے شامل ہیں اس کتاب میں سب سے پہلی مناجات کا سنہ تخلیق ۱۹۶۹ء، پہلی نعت ۱۹۷۳ء اور پہلا مرثیہ ۱۹۹۴ء درج ہے لیکن یہ کتاب غزلوں کے مجموعے ''نمود سحر'' سے پہلے شائع ہوئی ہے۔ سلطانہ ذاکر اداؔ کی تصانیف کی ترتیب و تعداد حسب ذیل ہے۔

(۱)	''معراج وفا''	حمد نعت، منقبت، سلام۔ مرثیہ مطبوعہ	۱۹۹۶ء
(۲)	''نمود سحر''	غزلیات، منظومات	۱۹۹۹ء
(۳)	''سفر کب تک''	نثر کی کتاب	

اپنے مکتوب میں اُنہوں نے لکھا ہے کہ اُن کا ایک مرثیہ اور ہے جو شائع ہوگیا ہے۔

اُن کے اپنے تحریر کردہ حالت زندگی کے علاوہ نقاش کاظمی نے اُن کی شاعری پر بڑی فراخدلی سے لکھا ہے مگر کہیں اس امر کی نشاندہی نہیں ہے کہ کس اُستاد سے سلطانہ اداؔ کا سلسلۂ تلمذ وابستہ ہوا۔ اُن کے کلام میں جو نشیب وفراز ہیں وہ بھی اس حقیقت کے غمّاز ہیں کہ شعروادب میں کسی نے ان کی رہنمائی نہیں کی اور ان کے دامن میں جو کچھ ہے وہ عطائے خداوندی ہے، ان کے چمنِ فکر میں جو گل بوٹے کھلے ہوئے ہیں کاش کسی ماہرفن میں ان کی تراش خراش کی ہوتی۔

مغربی دنیا میں باقر زیدی (میری لینڈ) شہاب کاظمی (نیو جرسی) عابد جعفری (ٹورنٹو) امیر امام حُر (لندن) صفدر ہمدانی (لندن) جیسے مستند مرثیے گو شعراء کرام کے ساتھ زیر نظر کتاب میں سلطانہ ذاکر اداؔ کا تعارف بھی شامل کیا جارہا ہے۔ حمد، نعت، منقبت، سلام اور مرثیہ نگاری میں قدرت شعر گوئی اور فن سے آگہی کے علاوہ جذبے اور نیت کی بہت اہمیت ہے۔ کون جانے شاعری کے اعلیٰ میار کی شاعری اس کی بارگاہ میں قبول ہے کہ نہیں جس کی توصیف ومدح میں یہ شاعری کی گئی ہے۔ اس طرح کوئی یہ بھی دعویٰ نہیں کرسکتا کہ ایسی مدح جو تکنیک یا اقدار شعر گوئی میں اس اساتذہ کے ہم پلّہ نہیں ہیں ممدوح کا بارگاہ میں پسندیدہ نہیں ہوسکتی اسی لئے راقم الحروف نے محبت، عقیدت اور مودت کی شاعری کو تنقید کی نظر سے کبھی نہیں دیکھا۔

سلطانہ ذاکر اداؔ کی مرثیہ گوئی نہ میر انیسؔ کی مرثیہ گوئی ہے۔ نہ ہی جمیلؔ مظہری، جوشؔ، نسیم یا آل رضا کی شاعری ہے لیکن ان کی مرثیہ گوئی فنی نشیب وفراز سے درگذر سلطانہ ذاکر اداؔ کی مرثیہ گوئی ہے۔ اس مرثیہ گوئی کے پس منظر میں جو جذبات ہیں ان کی قبولیت کا حق اس عصمت کامل کو ہے جو اپنے بچے کے غم میں بہنے والے ہر اشک کو اپنے رومال میں محفوظ کرلیتی ہے۔ اور سلطانہ ذاکر اداؔ کے مراثی میں محبت وعقیدت بہر حال نمایاں ہیں۔ ان کے پہلے مرثیہ کا آغاز کربلا میں امام حسین علیہ اسلام کے درود مسعود سے ہوتا ہے۔

وارد جو کربلا میں شہ کربلا ہوئے		اور جمع گردِ شاہ سبھی با وفا ہوئے
نزدِ فرات خیمے حرم کے بپا ہوئے		اہلِ ستم بھی جمع برائے جفا ہوئے
اکبر ہیں جو پھوپھی کی عماری کو لائے ہیں
عباس بھی جلو میں سواری کے آئے ہیں

تشریف لائیں خیمے میں جو زینبؑ حزیں		فرمایا شہ سے بھائی ہے یہ کونسی زمیں

اسی دشت بے گیا میں بستی بھی ہے کہیں؟ فرمایا شہ نے کرب و بلا ہے یہ سرزمیں
منزل یہ آگئے ہیں، یہیں پر قیام ہے
زینبؑ یہ نینوا ہے، یہی وہ مقام ہے

یہ وہ جگہ ہے جس کو بتاتے تھے نانا جاں یہ وہ جگہ ہے کھائیں گے اکبر جہاں سناں
ہاتھوں پہ تیر کھائے گا اصغر سا بے زباں پیاسوں کے سر کٹیں گے، لٹیں گے حرم یہاں
اک باوفا کے ہاتھ قلم ہوں گے اس جگہ
سجاد بھی اسیرِ ستم ہوں گے اس جگہ

'معراج وفا' میں سلطانہ ذاکرادا کا دوسرا مرثیہ ۔ عباس مشک لینے گئے جب خیام میں' ہے۔ اور''تکمیل وفا'' میں اُن کے مرثیہ کا عنوان ''چشم نم'' ہے ۔

لے کر اُنہیں کا نام اُٹھایا ہے جب قلم پردے اُٹھے حجاب کے نظروں سے ایک دم
ہے ذکرِ شاہِ دین، قلم بھی ہے چشم نم لفظوں میں کیا لکھے کوئی ایسے ہوئے ستم
توفیق دے خدا تو قلم سر کو خم کرے
صفحے پہ جھک کے مرثیہ شہ کا رقم کرے

دشوار ہے کہ شاہ کی الفت رقم کروں اس شاہ خوش خصال کی حکمت رقم کروں
یا اپنے کرد گار کی عظمت رقم کروں یا دشمنوں کے بخت کی ظلمت رقم کروں
لکھنے کے واسطے مجھے کچھ حوصلہ ملے
اُن کا اگر کرم ہو تو کچھ سلسلہ چلے

اور سلطانہ ذاکرادا جس کے کرم کی تمنا کر رہی ہیں اُسی کے کرم سے سلطانہ ذاکرادا کا شمار بیسویں صدی کی مرثیہ گو شاعرات میں ہوگیا ہے۔

☆☆☆☆☆

سیدہ اکبری بیگم:- (کراچی)

ولادت ۱۹۳۳ء

نام اکبری بیگم۔ والد کا اسم گرامی سید اصغر حسین عابدی مرحوم۔ شوہر سید ناصر علی عابدی، وطن مالوف قصبہ بہیرہ ضلع فتح پور۔

سیدہ اکبری بیگم کا کوئی تخلص نہیں ہے ان کا کوئی مجموعہ بھی شائع نہیں ہوا۔ ناقدین مرثیہ نے اُن پر مضامین بھی نہیں لکھے ہیں لیکن وہ مرثیہ کہتی ہیں۔ خود پڑھتی ہیں خود روتی ہیں اور دوسروں کو رُلاتی ہیں۔ اکبری بیگم ۱۹۴۷ء میں والدین کے ساتھ ہندوستان سے ہجرت کر کے کوئٹہ (پاکستان) آگئیں۔ وہیں ان کی شادی ہوگئی۔ اُن کے شوہر سید ناصر علی عابدی بعدازاں کراچی آگئے تو وہ کراچی کی ہوگئیں اور جعفرطیارؔ سوسائٹی کراچی میں اقامت پذیر ہوگئیں۔ محترم کوثر الہ آبادی نے ان کا ہم سے تعرف کرایا، ان کے ایک مرثیے کے کچھ بند ارسال فرمائے اور لکھا:

> ''یہ میری ایک عزیز ہیں۔ ان کے مختصر حالات زندگی درج ذیل ہیں اور ان کے ایک مرثیے کے چند اختتامی بند بھی ملفوف ہیں۔ آپ کے تھیسس میں کہیں گنجائش ہو تو رکھ لیجئے گا۔ ان کا نام بھی مرثیے کے طفیل رہ جائے گا''۔
>
> (مکتوب جناب کوثر الہ آبادی بنام عاشور کاظمی)

میں کیا اور میرا تھیسس کیا؟ میرا ایمان ہے کہ مرثیہ لکھنے والے کا نام تو باقی رہنا ہے۔ کون جانے خاتونِ جنت سیدہ فاطمہ زہراؑ کے فرزند کا مرثیہ کہنے والوں کے نام روشن ستارے بنا کر آسمان پر بکھیر دیئے جاتے ہوں۔ اکبری بیگم کا نام عصر حاضر کے ناقدین کی فہرست میں ہوتا ہو اس فہرست میں ضرور ہوگا جس میں ذکر اہلبیت پر بخشش کے پروانے ملتے ہیں۔

اکبری بیگم نے ایک سے زیادہ مرثیے کہے ہیں جو انہیں زبانی یاد ہیں۔ انہوں نے سوز وسلام بھی کہے ہیں جو وہ سوزخوانی کرتے وقت پڑھتی ہیں، وہ اپنے مرثیے بھی مجالس میں پڑھتی ہیں۔ نوحہ خوانی کرتی ہیں تو اپنے نوحے پڑھتی ہیں۔ محمدؐ وآلِ محمدؐ کی محبت میں سرشار سیدہ اکبری بیگم کا اوڑھنا بچھونا ذکر سید الشہدؑ ہے۔ انہوں نے رثائی شاعری کے علاوہ کسی صنف سخن میں شعر نہیں کہے۔ اُن کی فکر کا محور علیؑ اور اولاد علیؑ ہے۔ انہوں نے حضرت قاسمؑ کا ایک سہرا بھی کہا ہے جو خاندان کی شادیوں میں پڑھتی ہیں۔ ان کے مراثی پر قدیم یا جدید کا لیبل چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ وہ لوازم کی مرثیہ کی پابندی سے بھی مبرا ہیں۔ وہ تو یہ جانتی ہیں کہ مرثیہ اپنے ممدوحین کی مدح سے شروع کیا جائے اور ذکر مصائب پر ختم کر دیا جائے۔ محبت باریکیاں کہاں دیکھتی ہے۔ لگن راہوں کی ہمواری نہ ہمواری کو کب خاطر میں لائی ہے۔ عشق قائدے قوانین کا پابند کہاں ہوتا ہے۔ وہ تو بے ساختہ دیوانہ

پن جنوں فرمانروائی ہوتی ہے۔ سیدہ اکبری بیگم کی شاعری اسی بے ساختہ پن، اسی لگن اور اسی جنونِ تولاّ کی شاعری لگتی ہے۔ شہزادہ علی اکبر کے احوال کے مرثیے کے چند بند اُن کے جنونِ مودّت کا نمونہ ہیں۔ ہوسکتا ہے کچھ محتاط مزاج اہلِ ولا اکبری بیگم کے اس جنونِ عقیدت و مودّت کو افراط کی طرف جھکا ہوا محسوس کریں لیکن جیسا کی عرض کیا گیا محبت اور جنون میں یہی تو فرق ہوتا ہے۔

ناقدینِ رثائی ادب اکبری بیگم کے اشعار کو میزانِ نقد و نظر پر تولتے رہیں کہ یہ ان کا منصب ہے ہم کو اتنا عرض کرسکتے ہیں کہ سیدہ اکبری بیگم نے مرثیے میں مصائب کے جو بند کہے ہیں ان میں باوجودیکہ سارا بیان سیدہ زینبؑ کی طرف سے کیا گیا ہے لیکن اس گریہ و بکا میں زینب کا کردار مجروح ہوتا ہے نہ حسینؑ کا۔ سیدہ زینبؑ کی اُمنگوں کا منظر نامہ مرثیہ پڑھنے یا سننے والے کے لئے بھرپور بکا کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ مرثیے کو ایسے ہی صاف ستھرے مصائب کا حامل ہونا چاہئے۔

نمونۂ کلام ۔ زینب کے دل سے پوچھیے عظمت حسینؑ کی
دل سے لگا کے رکھی محبت حسینؑ کی

بی بی نے ایک روز کیا بھائی سے سوال　　بھیاّ کبھی نہ تم نے سُنا میرے دل کا حال
اکبر ہے میرا چودھویں کا چاند بے مثال　　بھیاّ ہمارے لال کا اٹھارواں ہے سال
دولہا بناؤں گی میں دلہن بیاہ کے لاؤں گی
اس سال سر پہ بیٹے کے سہرا سجاؤں گی

بھیاّ مدینے بھر میں چراغاں ہو ہر طرف　　خوشیوں کا حال سب پہ نمایاں ہو ہر طرف
ہر شخص اپنے شہر میں شاداں ہو ہر طرف　　ہر شخص میرے لال کا مہماں ہو ہر طرف
ہو شور دیکھو ہاتھوں میں کنگنا بندھا ہوا
زینب کا لال آیا ہے دولہا بنا ہوا

چچیوں سے یہ کہونگی کہ مسند ذرا بچھاؤ　　پھپھیوں سے یہ کہونگی کہ سُرمہ لگانے آؤ
بہنوں سے یہ کہونگی کہ مہندی لگانے آؤ　　سر پر ہمارے لال کے آنچل اُڑھانے آؤ
خوشیوں کا یہ سماں میری قسمت میں آیا ہے
خالق نے میرے لال کو دولہا بنایا ہے

عباسؑ میری لال کو دولہا بنائے گا　　مسلمؑ ہمارا ماتھے پہ سہرا سجائے گا

کنبہ تمام ساتھ میں خوش ہو کے آئے گا　　یاربّ ہمارے اب ہمیں خوشیاں دکھائے گا
قبرِ نبیؐ پہ پھر اسے میں لیکے جاؤنگی
جاکر وہاں یہ منتیں ساری بڑھاؤں گی

سہرے میں مسکرائے گا عرش خدا کا چاند　　خوشیاں ہزار لائے گا عرشِ خدا کا چاند
ہر سمت جگمگائے گا عرش خدا کا چاند　　گھر میں دلہن کو لائے گا عرش خدا کا چاند
روشن چراغ ہوگا علیؑ و بتولؑ کا
گھر میں نبی کے ہوگا اضافہ جو پھول کا

بھیا عمامہ پھولوں سے اسکا سجاؤں گی　　گھر میں دلہن کے ساتھ خوشی لیکے آؤنگی
چوکی پہ لا کے دولہا دلہن کو بٹھاؤنگی　　پیاری دلہن کا سہرا سبھوں کو دکھاؤنگی
لیلیٰ سے پھر کہونگی کہ دل کو سنبھالئے
دولہا دلہن کا آن کے صدقہ اُتاریئے

شاہِ حلب کو آج ہی پیغام دو میرا　　اٹھارویں برس میں میرا لال آگیا
شادی میں اسکی دیر کرو اب نہ مطلقاً　　تم سب سے ہے یہ زینب مضطر کی التجا
جوڑا شہانہ ہووے میرے نونہال کا
پھولوں کا سہرا لائیو یوسف جمال کا

زینبؑ کے اس بیان پہ تڑپے شہِ ہدا　　آنکھوں میں گویا اشک کا سیلاب آگیا
گھبرا کے پوچھنے لگی یہ بنتِ مصطفیٰ　　بھیا بتاؤ کیا ہوئی ماں جائی سے خطا
بھیا بتاؤ جلد میری جان جاتی ہے
اماں کے رونے کی مجھے آواز آتی ہے

بولے حسینؑ بہنا تمہیں کیا خبر نہیں　　اکبر کے حالِ زار پہ ہے ہے نظر نہیں
یہ فدیۂ حسینؑ ہے، تیرا پسر نہیں　　کیسے کہوں بچے گا یہ نورِ نظر نہیں
دولہا بنے گا اور نہ دلہن یہ لائے گا
اٹھارہ سال کا یہ زمانے سے جائے گا

☆☆☆☆☆

غیر مسلم مرثیہ نگار

جیسا کہ عرض کیا گیا مرثیہ ایک ادبی صنف سخن ہے، اس صنفِ سخن کو آگے بڑھانے میں صرف مسلم شعراء ہی نہیں بلکہ غیر مسلم شعراء بھی ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔ ذیل میں چند اہم غیر مسلم شعراء کا مختصر تذکرہ پیش کیا جارہا ہے۔ اس سلسلے کے شعراء کی فہرست طویل ہے لہٰذا جن شعراء کا تذکرہ اس اشاعت میں شامل نہیں کیا جاسکا اُنہیں آئندہ اشاعت میں پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

ایک اہم نام دلورام کوثری درجِ ذیل فہرست میں نہیں ہے مگر اُن کا تذکرہ اس کتاب میں موجود ہے۔ مرثیہ کے سفر میں جس موڑ پر اُن کا تذکرہ لازم تھا وہاں اُن کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

اس فہرست میں پہلا نام مہاراجہ بلوان سنگھ راجہ کا ہے اور آخری نام ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ کا ہے جو آج بھی اس صنف سخن کی آبیاری کررہے ہیں۔

مہا راجہ بلوان سنگھ راجہ:- (بنارس)

پیدائش ۱۷۹۹ء

نام بلوان سنگھ۔ تخلص، راجہؔ۔ راجہ چیت سنگھ والیٔ بنارس کے فرزند تھے۔ پروفیسر اکبر حیدری کاشمیری اہم حوالوں کی بنیاد پر رقم طراز ہیں کہ" راجہ اردو کے قادر الکلام شاعر تھے اور صاحب دیوان شاعر تھے لیکن اب ان کا دیوان عنقا کا حکم رکھتا ہے۔

(تاریخ بنارس جلد اوّل مولفہ سید مظہر حسن کاکوروی مطبوعہ سلیمانی پریس، بنارس ۱۹۱۶ء)

راجہؔ کو اردو اور فارسی زبانون میں قدرت حاصل تھی۔ غزل گو شاعر تھے مگر مرثیے بھی کہتے تھے۔ مشاعروں کے دلدادہ تھے۔ موصوف نے ۱۸۲۹ء میں آگرہ میں ایک مشاعرے کا سنگ بنیاد ڈالا تھا۔ اس میں شعراء اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔ (اودھ کیٹیلاگ مطبوعہ ۱۸۵۴ء) پروفیسر اکبر حیدری نے اُن کی بہت سی رباعیات اور ایک مرثیہ نقل کیا ہے جو ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۹ء کی تصنیف بتایا گیا ہے۔ یہ مرثیہ پہلی مرتبہ ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۷۰ء میں شائع ہوا تھا۔ باقر علی ادراکؔ نے تقریظ لکھی تھی جس میں وہ لکھتے ہیں کہ:

> " مہاراج راجہ بلوان سنگھ بہادر تخلص راجہؔ رام والیٔ شہر کاشی کہ شہرہ اُن کے کلام کا ماہ سے ماہی تک پہنچا ہے اس مرثیہ طرز نو کو اس لطافت اور فصاحت سے نظم فرمایا ہے کہ اکثر اہل زبان اور سخندانِ شہرِ آگرہ متفق اللفظ ہو کر اس مرثیے کی یکتائی کے مُقر ہوئے......... الخ

سچ بھی یہی ہے کہ یہ مرثیہ مہاراج بلوان سنگھ راجہؔ کی مرثیہ گوئی پر دسترس کا مظہر ہے۔

سیاہ پوش ہے ماتم میں چرخِ زنگاری ۱ رواں ہیں چشمِ زمیں سے سرشکِ گلناری
کہ آج رخصتِ عباسؑ کی ہے تیاری یہ بیت کیوں نہ ہو پیہم زبان سے جاری
دمے کہ لشکرِ غم صف کشد بہ خونخواری
دلم بنالہ دہد منصبِ عَلم داری

خیال تھا مرے دل کو یہ ہر گھڑی ہر دم　۳　کہ طرزِ مرثیۂ نو، کروں ضرور رقم
مگر یہ کہتی تھی طبع رسا ہے کارِ اہم　　کہ ناگہاں ہوئی تائیدِ خالقِ عالم

سپیدہ دم چو زدم آستیں بہ شمعِ شعور
شنیدم آیتِ استغفرو زعالمِ نور

حسب نسب سے مرے سب زمانہ ہے آگاہ　۴　گدا تو کیا کہ مرا رُتبہ جانتے ہیں شاہ
عیاں ہے ماہی سے گو شہرۂ سخن تا ماہ　　پر اُن کا بندۂ درگاہ ہوں خدا ہے گواہ

"علیؑ امامِ من است و منم غلامِ علیؑ
ہزار جانِ گرامی فدائے نامِ علیؑ"

مہاراجہ بلوان سنگھ راجہ کو یہ بصیرت، یہ آگہی کہاں سے ملی کہ انہیں آیۂ استغفرو سُنائی دی اور وہ پکار اٹھے" علی امام من است و منم غلام علی،، اور اس غلامی کو انہوں نے اپنا حسب نسب کہا۔ اس مرثیے میں ایک اور ندرت ہے کہ ہر چار مصرعوں کے بعد بیت فارسی زبان میں ہے گویا اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر راجہ کی گرفت واضح ہے۔ قادرالکلامی کی ثبوت یہ کہ چھٹے بند کے چار مصرعے اہل ایمان سے خطاب ہیں اور فارسی زبان میں بیت، صرف ایک 'بیت' گریز کی تکمیل کرتا ہے اور مرثیہ قاری اور سامع کو کربلا کے ماحول میں لے جاتا ہے۔

میں اُن سے دادِ سخن لوں کہ جو سخنداں ہیں　۶　مثالِ ابر وہ بزمِ عزا میں گریاں ہیں
وہ گوشِ دل سے سنیں جو کہ اہل ایماں ہیں　　کہ دشت ماریہ میں آج طرفہ ساماں ہیں

زمیں بہ خونِ شہیداں اگر بہ جوش آمد
فلک، ز آہِ یتیماں سیاہ پوش آمد

تمام ہو چکی ہے فوجِ شاہ تشنہ دہاں　۷　یہ عرض کرتے ہیں عباسؑ، اے شہِ ذیشاں
اب اپنے بیٹوں کو زینب بھی کر چکی قرباں　　پڑا ہے لاشۂ قاسمؑ بھی دشت میں بے جاں

نثارِ گردِ رہت بادِ پیکرِ عباسؑ
فدائی ناخنِ پایت شود سرِ عباسؑ

کٹے ہے تیغوں سے باغِ محمدی کا چمن　۱۱　یہ دھوپ گرم کہاں اور کہاں یہ گُل سے بدن
انہیں کے خون کی خوشبو سے ہے مہکتا رَن　　ملا نہ لاشوں کو تابوت اور نہ غسل و کفن

بہ صحنِ دشت ز بیداد ظالمانی چند
فتادہ اند تنے چند، نیم جانی چند

عباسؑ اذن جنگ مانگتے ہیں۔ حسینؑ آخر کار اجازت دیتے ہیں۔ میں بیان میں اختصار کر رہا ہوں۔ عباس کے ہاتھ میں علم ہے۔ کاندھے پر مشک سکینہ ہے۔ چہرے پر جلال ہے۔ عباسؑ کی رخصت کا منظر راجہ بلوان سنگھ یوں پیش کرتے ہیں۔

غرض کہ مشک سکینہ نے دی بصد غم و یاس ۱۹ قریب آ کے پکاری یہ زوجۂ عباسؑ
سکینہ جان نہ رکھو تم ان کے جینے کی آس یہ سر کٹائیں گے دریا پہ ہے یہ مجھ کو ہراس
بگو کہ کشتۂ تیغ جفا سلام علیک
شہیدِ ساحلِ بحر فنا سلام علیک

رواں ہوا فرسِ تیز گام صحرا میں ۲۶ جھجک کے رہ گئے آہو تمام صحرا میں
پکارے خضر علیہ السلام صحرا میں نہ تازیانے کا لے کوئی نام صحرا میں
بہ پیشِ سرعتِ گلگوں، شرار و برق کجا
رسید تا بہ ابد بعد شرق و غرب کجا

قضا یہ کہتی تھی جو اس نے کھینچ لی تلوار ۳۰ رجز یہ پڑھنے لگا شاہ کا علم بردار
کہ مجھ میں قہرِ خدائے جہاں کے ہیں آثار میں ہی ہوں خاص غلام امام عرش وقار
دلاورانِ جہاں تکیہ بر سپر نکنند
بوقت جنگ دلیراں خیال سر نکنند

غرض کی نہر پہ لڑتا ہوا جری پہنچا ۳۳ جب آیا نہر میں گھوڑا تو اُس نے فرمایا
تُو پانی پی لے تب اس نے کہا پیوں میں کیا ہوئے ہیں قتل سبھی پیاسے شاہ کے رفقا
شفق کہ سُرخ تر از جامہ شہیدانست
بگردنِ فلک ایں خونِ بیگناہانست

مرثیہ ایک سو تین (۱۰۳) بند پر مشتمل ہے۔ بعد شہادت عباسؑ، جناب علی اکبرؑ کی شہادت، معصوم علی اصغرؑ کی شہادت، امام مظلوم کی شہادت، شام غریبان کے احوال بیان کیے گئے ہیں۔ پورا مرثیہ مہاراجہ بلرام سنگھ راجہ کی عقیدت، قادر الکلامی اور وابستگی کی مظہر ہے۔

☆☆☆☆☆

راجہ الفت رائے الفت:- (لکھنؤ)

ولادت ۱۸۱۰ء۔ وفات جولائی ۱۸۴۵ء

واجد علی شاہ کے عہد میں اودھ کی شاہی فوجوں کے میر منشی تھے۔ راجہ لال جی کے فرزند۔ مولوی احسان اللہ ممتاز سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۳۳-۱۹۳۲ء میں اپنے والد کے ساتھ مرزا پور میں رہے۔

راجہ الفت رائے اردو فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ اُن کے فرزند کنور دھنپت رائے مُحب اُنہیں شیعان حیدر کرار اور محب محمدؐ و آل عبد میں شمار کرتے تھے۔ وہ مجلس عزا میں بہت گریہ کرتے تھے اور ماہ محرم میں ذاکرین کو دوشالے، رومال اور نقد نذرانے پیش کرتے تھے۔

راجہ الفت رائے نے محمدؐ و آل عبد سے اپنی عقیدت کا بار بار اقرار کیا ہے ؎

میرا گھر دل پنجتن ہوگیا سلامی جناں میں وطن ہوگیا
ہوئے کیا ہی الفت کے طالع رسا غلامِ حسینؑ و حسنؑ ہوگیا

الفت مجالس کا انعقاد کرتے تھے، درگاہ حضرت عباس کی زیارت کیا کرتے تھے۔ مرثیے کے نقاد پروفیسر اکبر حیدری نے الفت کے حالات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

> ''عہد نصیر الدین حیدر میں جب راجا لال وزیر اودھ روشن الدولہ کے بیٹے جرنیل محمد حسن خان بہادر کے نائب مقرر ہو کر لکھنؤ میں رہنے لگے تو الفت رائے بھی لکھنؤ میں آگئے۔ ۱۸۳۷ء میں نصیر الدین حیدر کی وفات کے بعد جب محمد علی شاہ بادشاہ ہوئے تو روشن الدولہ اور جرنیل صاحب خانہ نشیں ہو گئے۔ نئے وزیر منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں اور منور الدولہ احمد علی خان کے دور میں لال جی اور الفت رائے معتوب ہو کر قید ہو گئے۔ ایک لاکھ روپے دے کر دونوں نے مخلصی پائی۔ ۱۸۴۲ء میں امجد علی شاہ بادشاہ ہوئے ان کے وزیر امین الدولہ امداد حسین خان کی عنایت سے راجا لال جی کو بخشی گری کا عہد ملا۔ لیکن ڈھائی سال کے بعد سیاسی کروٹوں کے نتیجے میں اس عہدے پر فتح الدولہ برق لکھنوی کا تقرر ہو گیا۔ اور راجا لال جی پھر قید کر لئے گئے۔ اور کوئی تین سال تک مقید رہے۔

۱۸۴۷ء میں واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے اور انہوں نے امین الدولہ کے بعد نواب علی نقی خان کو اپنا وزیر بنایا۔ علی نقی خان نے سابقہ آشنائی کی بنا پر لال جی کو رہا کرا کے پھر سے بخشی کا عہدہ دیا۔ لال جی کی وفات کے بعد الفت رائے کو یہ عہدہ اور راجگی اور بہادری کا خطاب ملا۔ آخر کار ۷ رشوال ۱۲۷۰ھ (جولائی ۱۸۵۴) کی رات کو راجا الفت رائے کا اچانک انتقال ہوگیا۔ وفات کے وقت ان کی عمر پینتالیس سال چار ماہ کی تھی۔　(ہندو مرثیہ گو شعراء۔ اکبر حیدری ص ۱۲۵)

راجہ الفت رائے کے پانچ غیر مطبوعہ مرثیوں کا ریکارڈ ملتا ہے

(۱) جب رن میں ہوا نرغۂ اعدا شہ دیں پر　۲۶ بند

(۲) چلے مدینہ سے جب سوئے کربلا سرور　۴۱ بند

(۳) حکمِ شبیر سے میداں میں جو آئے عباس　۲۴ بند

(۴) کام آئے جو میدان میں شبیرؑ کے انصار　۴۷ بند

(۵) تشنۂ لب ذبح ہوئے جب شہِ والا رن میں　۳۴ بند

سید علی جواد زیدی نے ''العلم'' میں راجہ الفت رائے کا پانچواں مرثیہ شائع کیا ہے جو پروفیسر اکبر حیدری کا فراہم کردہ ہے

تشنہ لب ذبح ہوئے جب شہ بالا رن میں　۱　آب خنجر سے بہا خون کا دریا رن میں
خاک پر لاشۂ مجروح جو تڑپا رن میں　　پھٹ گئے زخم تن پاک سراپا رن میں
شور تھا خاتمۂ پنجتنِ پاک ہوا
آج مخدومۂ کونین کا گھر خاک ہوا

زلزلہ عرش کو تھا گاوِ زمیں تھی بیتاب　۲　تھرتھراتی تھی زمیں دشت میں مثل سیماب
فرط اندوہ سے حیوان بھی تھے بے دانہ و آب　　نہ کسی چشم کو آتی تھی نظر صورت خواب
خاک اُڑاتی تھی زمیں ساتوں فلک روتے تھے
حوریں سر پیٹتی تھی جن و ملک روتے تھے

خاک صحرا کی اُڑاتے تھے سروں پر آہو　۳　مچھلیاں ریت پہ بیتاب پڑی تھیں لب جو

ماتم شاہ میں گردوں سے برستا تھا لہو چشم مرغان ہوا سے بھی رواں تھے آنسو
خاک اور خوں میں بھرا تھا رُخِ زیبائے حسینؑ
ہر طرف سے یہی آتی تھی صدا ہائے حسینؑ

مالک چشمۂ کوثر کی یہ آتی تھی صدا لب دریا میرے فرزند کو پیاسا مارا
کوکھ پکڑے ہوئے کہتی تھی جناب زہرا شمر نے تیغ سے کاٹا ہے کلیجہ میرا
ہائے دنیا میں میری گود کا پالا نہ رہا
میری زینب کا کوئی پوچھنے والا نہ رہا

۳۱ بند کا یہ مرثیہ بین پر مشتمل ہے۔ مقطع کا بند دعائیں ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے اودھ کا مرثیہ بیسویں صدی کا ہو یا انیسویں صدی کا، بین کا ایک ہی انداز تھا۔ راجہ الفت رائے کے مرثیہ کا آخری بند (مقطع کا بند) یہ ہے

آگے اب حال کچھ الفتؔ نہ لکھا جائے گا نہ تو طاقت ہے قلم کو نہ زباں کو ہارا
حق سے روکر یہ دعا مانگ کہ صدقہ شہ کا بخشیٔ پرسش اعمال نہ ہو روز جزا
جام کوثر کا پلائے میرا آقا مجھ کو
لے کے فردوس میں جائے میرا آقا مجھ کو

(یہ مرثیہ پروفیسر اکبر حیدری کی نئی کتاب "ہندو مرثیہ گو شعراء" مطبوعہ ستمبر ۲۰۰۴ء میں غیر مطبوعہ مرثیے کی حیثیت سے شائع ہوا ہے۔ حالانکہ یہی مرثیہ "العلم" "ممبئی" شمارہ اگست ۱۹۹۲ء میں بھی شائع ہو چکا ہے)

☆☆☆☆☆

راجہ دھنپت رائے محبؔ:- (لکھنؤ)

ولادت انیسویں صدی کی دوسری چوتھائی۔ وفات انیسویں صدی کے آخر میں۔

راجہ اُلفتؔ رائے اُلفتؔ کے فرزند تھے۔ بچپن سے اپنے والد گرامی راجہ اُلفت کے ساتھ عزائے مظلوم کربلا میں شریک رہے۔ مرثیہ گو باپ کے مرثیہ گو فرزند راجہ دھنپت رائے محبؔ نے سلام، رباعیات، نوحے اور مرثیے کہے ہیں۔ پروفیسر اکبر حیدری نے ایک مخطوطہ کی نشاندہی کی ہے جس میں راجہ دھنپت کے ۸۱ سلام، ۸۴ رباعیات اور چالیس (۴۰) مرثیے شامل ہیں۔ مخطوطہ پر ایک ہندو شاعر لالہ دینا ناتھ واجبؔ کی اصلاح اور سلطان واجد علی شاہ کے مصاحب

خاص مظفر جنگ اسیر لکھنوی کی نظرِ ثانی کے حوالے درج ہیں۔ یہ مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود بتایا گیا ہے۔

راجہ دھنپت رائے محبؔ کی عزاداریٔ حسینؑ سے کتنی وابستگی تھی اس کا اندازہ اُن کی رباعیات اور مراثی کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔

ہر سمت نظر مجلسِ ماتم آئے پھر ہند میں سلطانِ دو عالم آئے
جی کھول کے روئیں غمِ آقا کا محبؔ پھر جلد کہیں ماہِ محرّم آئے

محبؔ کے ایک مرثیے کی چند بند نمونہ کلام کے طور پر درج ذیل ہیں۔

رن میں ہوا شہید جو لشکر حسینؑ کا ۱ کوئی رہا نہ مونس و یاور حسینؑ کا
مُرجھا گیا ہر ایک گلِ تر حسینؑ کا خالی کیا اجل نے بھرا گھر حسینؑ کا
زخموں سے چُور چُور وہ عالی وقار تھا
غیر از خدا رفیق نہ ہمدم نہ یار تھا

فرما رہے تھے یاس کے عالم میں بار بار ۲ مجھ سا نہ ہوگا بیکس و محروم زینہار
بھائی ہے نہ پسر ہے نہ ہمدم نہ کوئی یار اک جاں ہے اور تشنہ خُوں ہیں کئی ہزار
مونس نہیں رفیق نہیں آشنا نہیں
فریاد رس ہمارا کوئی جُز خدا نہیں

بعد اس کے آئے لاشۂ اکبر کے پاس شاہ ۷ صدمہ ہوا یہ دل پہ کہ حالت ہوئی تباہ
جس دم پسر کے زخمِ جگر پر پڑی نگاہ جان آئی لب پہ آنکھوں میں عالم ہوا سیاہ
فرمایا رو کے یہ تھا مقدّر ہزار حیف
یہ شکل تیری دیکھوں میں دلبر ہزار حیف

ہے ہے اجل نے کر دیا ویران میرا گھر ۸ ہے ہے کلیجہ پھٹ گیا ٹکڑے ہوا جگر
ہے ہے پدر کے سامنے تم مر گئے پسر ہے ہے ضعیف باپ پہ تم نے نہ کی نظر
میداں میں جا کے ہم بھی بس اب سر کٹاتے ہیں
لگ جاؤ اُٹھ کے سینے سے اے جان جاتے ہیں

محبؔ کلاسیکی مرثیے کے شاعر تھے۔ اُن کے مراثی میں بین کا انداز بھی قدیم مرثیہ گوئی

کا انداز ہے۔ ان کا سارا کلام غیر مطبوعہ رہ گیا۔ سلام ہو اُن صاحبان نقد و نظر پر جن کی کاوشوں کے سبب راجہ دھنپت رائے محبؔ جیسے خوش عقیدہ، مظلوم کی حمایت کرنے والے شعراء کے ذکر کا سلسلہ آگے بڑھا۔

☆☆☆☆☆

ذہین لکھنوی:- (لکھنؤ)

ولادت ۱۲۰۶ھ مطابق ۱۷۹۰ء

ذہینؔ لکھنوی اس عہد کے مرثیہ گو شاعر تھے جو عہد تاریخ مرثیہ گوئی میں میر خلیقؔ، مرزا فصیحؔ، دلگیرؔ، میر ضمیرؔ اور میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کا عہد کہلاتا ہے۔ اس روشن عہد کے ان چاند سورجوں کی موجودگی میں ذہینؔ لکھنوی کا نام اس حد تک سامنے نہ آ سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ ذہینؔ نقوی پر مصحفیؔ کے علاوہ شاید کسی تذکرہ نگار نے کچھ نہیں لکھا۔ ''ریاض الفصحا'' میں مصحفیؔ لکھتے ہیں:

> ''ذہینؔ تخلص، قوم کائستھ، طفل نو رسیدہ، شاگرد لالہ چھنو لال طربؔ، حال دلگیری کند۔ اردو مرثیہ وسلام می گوید و نامی در مرثیہ گوئی پیدا کردہ، عمرش تخمینا شانزہ سالہ خواہد بُود۔''

مصحفیؔ نے ذہینؔ کی غزل کے چند اشعار بھی نقل کیے ہیں لیکن پروفیسر اکبر حیدری کشمیری نے ذہینؔ پر باقاعدہ کام کیا ہے۔ وہ ذہینؔ کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''ذہینؔ بسیار نویس اور قادر الکلام مرثیہ گو شاعر تھے اور انہوں نے بیسیوں مرثیے کہے ہیں۔ راقم الحروف (اکبر حیدری) کی نظر سے اُن کا کوئی مطبوعہ مرثیہ نہیں گذرا۔ میں نے اُن کے بائیس (۲۲) غیر مطبوعہ مرثیے کتب خانوں میں دریافت کیے ہیں''

(ہندو مرثیہ گو شعراء۔ اکبر حیدری)

جناب اکبر حیدری نے ان مراثی کے مصرع ہائے اولی درج کیے ہیں۔ جن کتب خانوں کا انہوں نے حوالہ دیا ہے ان میں ایک ''کتب خانہ ادیب'' جو کتب خانہ مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کا حصہ بن چکا ہے اور دوسرا کتب خانہ ''سید محمد رشید کا'' ذخیرۂ مراثی'' جعفر منزل، امین آباد لکھنؤ ہے۔

نمونۂ کلام:

لڑتے لڑتے علی اکبرؑ نے جو برچھی کھائی　　دشت سے ''یا ابتا'' کی جونہی آواز آئی
خیمے میں مادرِ مجروح جگر گھبرائی　　آ کے در پر شہِ بیکس پہ وہ یوں چلّائی

ادھر آؤ قدم آگے نہ بڑھاؤ صاحب
لونڈی بے چین ہے خیمے تلک آؤ صاحب

مجھے کچھ پوچھنا ہے آپ سے شاہ دوسرا　　علی اکبر مرا میدان سے ابتک نہ پھرا
وحشت انگیز ابھی آئی جو کانوں میں صدا　　آگ اک سینے میں بھڑکی ہے بجھاؤ آقا

یاں عناں صبر کی آنکھوں سے چھٹی جاتی ہے
تم نہیں آتے تو بانو ہی چلی جاتی ہے

گوشِ زینبؑ میں جونہی بانو کی آواز آئی　　بولی گھبرا کے یہ ہمشیر حسینؑ ابن علیؑ
چھپتی مطلق نہیں واللہ صدا زخمی کی　　ہو نہ ہو سینۂ اکبر پہ لگی ہے برچھی

پاس سرور سے نہیں پاؤں بڑھاتی بانو
شہ والا کو ہے خیمے میں بلاتی بانو

دیکھا زینب کو تو وہ اور بھی یوں چلّائی　　بولی کیا عرض کروں موت یہاں تک لائی
تھی ابھی بیٹھی ہوئی خیمے میں، میں دکھ پائی　　کہ یکایک مجھے فرزند کی آواز آئی

یہ یقیں ہے وہ ابھی رن میں نہیں کام آیا
سُن کے آواز نہ مطلق مجھے آرام آیا

مرثیہ کی تکمیل دعائیہ بند پر ہوتی ہے:

سن کے یہ راہیٔ کوثر ہوئے اکبر تو اُدھر　　اور اِدھر بانوئے ناشاد گری غش کھا کر
کنبۂ شاہ میں برپا ہوا شورِ محشر　　اے حزیںؔ عرض کر اب شہ سے برائے اکبر

تھامئے ہاتھ مرا، مجھ پہ عنایت کیجئے
حامیٔ کون و مکاں میری حمایت کیجئے

پروفیسر اکبر حیدری نے ذہین لکھنوی کا ایک مکمل مرثیہ بھی نقل کیا ہے جو ۳۵ بند پر مشتمل ہے۔ مطلع کا بند ہے ؎

شبیر کو طلب کیا جب اہلِ شام نے	عزمِ سفر کیا شہ علی مقام نے
بیٹی کا حال غیر جو دیکھا امام نے	ذکر سفر نہ کچھ کیا صغرا کے سامنے
بس دھیان تھا یہی کہ وہ جی سے گذر نہ جائے
بیمار میرا عزمِ سفر سُن کے مر نہ جائے

امام عالی مقام اپنی بیٹی صغرا کی علالت کے سبب بیٹی کو سفر پر لے جانا نہیں چاہتے۔ بیٹی اصرار کرتی ہے۔ اس صورت حال پر باپ بیٹی کے مکالموں کو ذہین لکھنوی نے اس مرثیے میں نظم کیا ہے۔ ذیل کا بند اس صورت حال کی عکاسی کرتا ہے جب اہل حرم ناقوں پر سوار ہو جاتے ہیں اور صغرا تڑپ کر فریاد کرتی ہے۔

للہ صاحبو مجھے رخصت تو کرتے جاؤ	جاتے تو ہو اب آخری دیدار تو دکھاؤ
رخصت تو کر لوں تم کو نہ اتنا مجھے کڑھاؤ	دل بیقرار ہوتا ہے اصغر کو جلد لاؤ
اے صاحبو بتاؤ کہ صغرا بھی کوئی ہے
اصغر تمہارا پیارا ہے میرا بھی کوئی ہے

مرثیہ کا اختتام حسب دستور دعا پر ہوتا ہے مگر یہ دعا ملکہ زمانی کے لئے ہے جس سے ذہین لکھنوی کے دور کا اور بالخصوص اس مرثیے کے عہد کا پتہ ملتا ہے۔

کرتا دعا ذہین ہے حق سے یہ بار بار	ہے جو نواب ملکہ زمانیہ رستگار
اس کو جہاں میں رکھیو تو باعزت و وقار	پامال اس کے دشمنوں کو کر، اے کردگار
اس کو نہ خوف گردشِ افلاک کا رہے
سایہ ہمیشہ پنجتنِ پاک کا رہے

☆☆☆☆☆

فراقی دریابادی:- (دریاباد، ضلع بارہ بنکی)

ولادت ۱۸۸۲ء

رائے سدھ ناتھ بلی فراقی، دریابادی رئیس دریاباد کی وجہ شہرت ان کا رامائن تلسی داس کا منظوم اردو ترجمہ ہے جسے اُتر پردیش اردو اکادمی نے دو جلدوں میں (۱۹۸۳ء) میں شائع کیا ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ فراقی کے حالات زندگی تک اردو اکادمی کے ارباب بست وکشاد کی رسائی

بھی نہ ہوسکی۔ یہ مفروضہ اس بنیاد پر کیا جارہا ہے کہ اس اہم کتاب میں فرقتی دریابادی کے حالات زندگی اور کوائف شائع نہیں ہوئے ہیں۔ اردو اکادمی تو پھر ذرا دور کی بات ہے پروفیسر اکبر حیدری تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ:

"راقم (اکبر حیدری) کچھ سال پہلے اُن کے (فرقتی کے) صاحبزادے رائے ہردیو لعل سے بھی ملا۔ وہ ملکہ گیتی کے پھاٹک، لکھنؤ میں رہتے ہیں اور انکا شمار مشہور آرٹسٹوں میں ہوتا ہے۔ وہ کاروبار میں اتنے مصروف رہتے ہیں کہ انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ اُن کے والد بزرگوار کا انتقال کہاں، کیسے، اور کس سال ہوا۔ مجھے اُن کے طرزِ عمل سے مایوسی ہوئی"

(ہندو مرثیہ گو شعراء، ص ۳۱۵)

جس قلمکار کے ورثا اور اولاد کی بے رخی کا یہ حال ہو اس کے کوائف کون مہیا کرے۔ جس کی اولاد اپنے والدین سے اتنی لاتعلق ہو اُسکے کلام کی کون حفاظت کرے۔ فرقتی تو اولاد کی اس بے رخی اور لاتعلقی کے باوجود اس حد تک فراموش نہیں کئے گئے جس حد تک لاولد یا اولاد کی بے حسی کا شکار لوگ فراموش کردئے جاتے ہیں۔ اور یہ فیض ہے ان شخصیات کی مدح کا جو اپنے ماننے والوں کو بے نیاز کردیتے ہیں۔ اُن کے مراثی کو تلاش کیا جارہا ہے۔ جن شخصیات کو وہ اپنے مرثیے دے گئے تھے انہیں یکجا کیا جارہا ہے۔

فرقتی کی غزلوں کے دو (غیر مطبوعہ) دیوان دریافت ہوئے ہیں جو اُن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ اور کچھ مرثیے بھی۔ محترم اکبر حیدری نے اُن کے کچھ سلام اور مراثی نقل کئے ہیں۔ اُن کا ایک مرثیہ ۱۹۴۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔ فرقتی مرثیہ گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مقبول مرثیہ خوان بھی تھے۔ اُن کا ایک مرثیہ سُن کر علامہ سید علی نقی (نقن صاحب قبلہ) نے اُن پر تقریظ لکھی ہے جو انتہائی غیر معمولی بات ہے۔

فرقتی کا ایک مرثیہ "داغِ غمِ حسینؑ میں کیا آب و تاب ہے" ایک مقبول مرثیہ ہے۔ یہی مصرع مرزا دبیر کے ایک مرثیے کا مصرعۂ اولیٰ بھی ہے۔ ناقدین نے اسے شعوری کاوش قرار دینے کی کوشش کی ہے مجھ ہیچمداں کی رائے میں یہ "توارد" ہے، اس لئے کہ اس مصرعہ کے علاوہ بند کے بقیہ تین مصرعوں میں مضمون اور بندشیں جدا جدا ہیں۔ یوں بھی یہ مصرعہ اتنا ناگزیر نہیں کہ

ایک اچھا شاعر اس کا متبادل نہ کہہ سکے۔ بہر حال اس مرثیے کی کچھ بند بطور نمونہ کلام درج کئے جا رہے ہیں۔

داغِ غمِ حسینؑ میں کیا آب و تاب ہے ۱ روشن ضیاء سے اس کی دلِ آفتاب ہے
نور اس کا خضرِ منزلِ راہِ ثواب ہے منظور دیدۂ خلفِ بو تراب ہے
آٹھوں بہشت صدقے میں اس کے حصول ہیں
رتبہ شناس دونوں علیؑ و رسولؐ ہیں

سرمایۂ نجات دو عالم یہ داغ ہے ۲ یہ مومنوں کے خانۂ دل کا چراغ ہے
یہ گمرہاں جادۂ دیں کو سراغ ہے سبطِ رسولِ پاک کے ماتم کا باغ ہے
داغِ گناہ دھوتا ہے اشکوں کے آب سے
کرتا ہے دور فکرِ جہاں کے عذاب سے

ہے داخلِ ثواب عزاداریٔ حسینؑ ۳ اُمت کا ہے شفیع محمدؐ کا نورِ عین
شمعِ مزار حیدرِ کرار ہے حسینؑ جھوٹا نہیں ہے صادق الاقرار ہے حسینؑ
خالق سے بخشواتا ہے نانا کے سامنے
کوثر سے جام دیتا ہے بابا کے سامنے

عشرہ کے دن حسینؑ پہ کیا وقت تھا پڑا ۱۶ ڈالے یہ وقت آہ نہ دشمن پہ بھی خدا
کرتے تھے ایک ایک کو رخصت جُدا جُدا سب گود ہی کے پالے تھے کوئی نہ غیر تھا
قابو میں دل نہ تھا نہ شکیب و قرار تھا
نشترِ غم و الم کا کلیجے سے پار تھا

دولہا کے قتل ہونے کا تازہ تھا غم ابھی ۱۷ زینب کے دونوں بیٹوں نے جنت کی راہ لی
گر کر قدم پہ عرض علمدار نے یہ کی ہو حکم جنگ، تلخ ہے اب لطف زندگی
مولا پہ جاں نثار ہو مولا کا جاں نثار
یا قاتلِ دغا بنے آقا کا جاں نثار

عباس کو اذن ملا اور وہ شہید ہوئے، علی اکبر رن کو سدھارے اور شہید ہوئے، مولا حسینؑ نے علی اصغر کی قربانی پیش کی۔ اور پھر امام کی قربانی پیش کرنے کا منزل آگئی۔ امام میدان

جنگ میں آئے ۔

کھا کھا کے زخم شکرِ خدا کرتے تھے حسینؑ ۸۱ اُمت کی بہتری کی دعا کرتے تھے حسینؑ
حق پاک باطنی کا ادا کرتے تھے حسینؑ فریاد کرتے تھے نہ بکا کرتے تھے حسینؑ

حضرت کی تھی نگاہ رضائے قدیر پر
عقدہ کھلا ہوا تھا شہِ بے نظیر پر

☆☆☆☆☆

مہاراجہ کشن پرشاد شاد:-

ولادت ۲۸/فروری ۱۸۶۴ء۔وفات ۹/مئی ۱۹۴۰ء

مہاراجہ کشن پرشاد ایک ایسے کھتری خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس نے عہد مغلیہ میں 'راجہ ٹوڈرمل' اور عہد آصفیہ میں 'مہاراجہ چندولال' جیسی شخصیتیں پیدا کیں۔ چندولال کی ادب پروری، انسان دوستی اور داد و دہش کی چھاپ اتنی گہری تھی کہ ایک زمانے میں حیدرآباد، چھندولال کا حیدرآباد کہلاتا تھا۔ یہی چندولال، مہاراجہ کشن پرشاد کے جدِ اعلیٰ تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد، راجہ ہری کشن سررشتہ دار محکمہ تعلیم نظم جمیعت کے فرزند تھے اور مہاراجہ نریندر پرشاد کے حقیقی نواسے تھے نام پرشوتم داس رکھا گیا مگر نانا نے کشن پرشاد کہہ کر پکارا اور یہی نام چل نکلا۔ نانا نے انہیں اپنا جائز وارث قرار دیا تھا پس ۱۸۸۹ء میں جب نانا کا انتقال ہوا تو وراثت میں جو جائداد ملی اس کی سالانہ آمدنی کم و بیش سولہ لاکھ روپے تھی۔ دنیاوی مرتبے کے توا . ے حیدرآباد کے "صدر المہام فوج" اور وزیرفوج حتیٰ کہ حیدرآباد کی صدارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز رہے۔

(کتاب ہندو مرثیہ نگار۔ اکبر حیدری سے اقتباس)

اکبر حیدری لکھتے ہیں کہ انہوں نے کشن پرشاد شاد کی درجنوں چھوٹی بڑی کتابیں سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں دیکھی ہیں۔ مولوی محمد عبداللہ قریشی نے ان کتابوں کی تعداد ۷۴ لکھی ہے۔ (کتاب اقبال بنام شاد (مولوی محمد عبداللہ قریشی) ص۔ ۲۱)

واقعہ کربلا پر اُن کی تین کتابیں ہیں۔(۱) دین حسینؑ (۲) نوحۂ شاد (۳) ماتم حسینؑ ان میں "ماتم حسینؑ" ایک مرثیہ ہے جو مدینہ سے روانگی سے کربلا پہنچنے تک کے احوال پر مشتمل ہے۔ شاد کا شاہکار مرثیہ "پہلے مسلم کو کیا قتل مسلمانوں نے" قرار دیا گیا ہے ۔

پہلے مسلم کو کیا قتل مسلمانوں نے　　ہائے کیا ظلم کیا بے سر و سامانوں نے
گھر کو برباد کیا گھر کے نگہبانوں نے　　قافلہ لوٹ لیا مِل کے بُدی خوانوں نے
کمر اب ٹوٹ گئی شاہ کی طاقت نہ رہی
جب ہراول نہ رہا فوج کی شوکت نہ رہی

ہاشمی، مطلبی، لختِ دلِ شیرِ خدا　　ہائے پردیس میں کیا حال مسافر کا ہوا
تن ہوا سر سے تو سر تن سے جدا حیف ہوا　　مرتے دم آپ نے لوگوں سے یہ ارشاد کیا
کہنا بھائی سے کہ کوفے میں وہ للہ نہ آئیں
ساتھ سیدانیوں کہ لیکے ادھر شاہ نہ آئیں

مرثیہ حضرت مسلم بن عقیلؑ کے احوال پر ہے۔ یوں لگتا ہے کہ مہاراجہ کشن پرشاد نے کربلا کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ اُن کے مراثی میں واقعات کا تسلسل اس امر کی نشاندہی کر رہا ہے۔ حضرت مسلم بن عقیل کے احوال میں ان کے بچوں کے نام، بچوں کے جذبات، تاریخ کی کڑیوں کو جوڑتے ہوئے واقعات مہاراجہ کے سنجیدہ مطالعہ پر دلالت کرتے ہیں۔

مہاراجہ کشن پرشاد شآد نے بغیر کسی ابہام کے اپنے عقیدے اور طرزِ فکر کا اعلان مرثیہ میں کیا ہے۔

ہوں قوم کا سپاہی رہوں گا سپاہی میں　　توحید میرا دین ہے دوں گا گواہی میں
صوفی ہوں اور عارف ذات الٰہی میں　　اور ہوں طریق عشق میں اے شآد راہی میں
جیسا کہ اعتقاد مجھے انبیاء سے ہے
ویسا ہی اعتقاد مجھے اولیاء سے ہے

اس اعلان کے بعد انہوں نے اکثر ایک دعا بھی کی ہے

اپنے خدا سے دل سے دعا مانگ تُو یہ شآد　　بہر حسینؑ و شیرِ خدا دل کی دے مراد
کر ذوالفقارِ قہر سے اعدا کا انسداد　　اولاد شآد شاد رہے عمر ہو دراز
ایمان پر ہو خاتمہ دنیا میں آبرو
دل میں ہو عشق تیرا رہے تیری آرزو

ایمان کی آرزو کرنے والے مہاراجہ کشن پرشاد شآد زندگی کے آخری دنوں میں کس

روش پر گامزن تھے اس کا علم تو اُس پروردگار کو ہوگا جو سمیع و بصیر ہے، ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ ذکر امام مظلوم کا صلہ تو ہے جو ہر ذکر کرنے والے کو ملتا ہے۔

☆☆☆☆☆

نتھونی لال وحشی:۔

پیدائش ۱۹۰۴ء۔ وفات ۱۷/جولائی ۱۹۶۹ء

نام ڈاکٹر نتھونی لال دھون وحشی مظفر پوری۔ آبائی وطن پٹنہ، بہار

علامہ جمیل مظہری کے فرزند حسن شکیل مظہری نے جو مانچسٹر (برطانیہ) میں آباد ہیں، ہمیں وحشی مظفر پوری کے مختصر کوائف فراہم کیے ہیں۔

"ڈاکٹر نتھنی لال دھون وحشی مظہری مظفر پوری کا مکان شکار پور پٹنہ میں تھا اُن کے بزرگوں میں زمین جائیداد کے سلسلے میں آپس میں کچھ رنجش ہوگئی اور ڈاکٹر وحشی کے اہل خاندان پٹنہ سے مظفر پور آکر بس گئے۔ اُن کا سنہ پیدائش ۱۹۰۴ء یا ۱۹۰۵ء تھا"

(مکتوب بنام عاشور کاظمی مرقومہ ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۲ء)

نتھوی لال وحشی کو شعر و سخن کا شوق اوائل عمر سے تھا۔ ابتدا میں علامہ جمیل مظہری کی والد گرامی مولانا خورشید حسنین سے سلسلۂ تلمذ وابستہ رہا۔ بعد ازاں علامہ جمیل مظہری سے اُن کی قربت ہوگئی جو تا دم آخر رہی اور شعر و سخن کے معاملات حساب دوستاں، میں آگئے۔ ڈاکٹر شکیل مظہری رقم طراز ہیں کہ:

"میں نے جب شعور کی آنکھیں کھولی تو ڈاکٹر وحشی مظہری کو جنہیں ہم لوگ ڈاکٹر بابا کہتے تھے اپنے گھر کے ایک بزرگ کی حیثیت میں دیکھا۔ ابّا (یعنی) جمیل مظہری سے اُن کی دوستی بہت گہری تھی۔ وہ ہمارے گھریلو اور نجی معاملات میں دخیل تھے، شادی بیاہ تک اُن کی رائے سے طے پاتے تھے، وحشی مظفر پوری کی زندگی کا زیادہ تر حصہ مظفر پور اور کلکتہ میں گذرا۔ ہومیو پیتھک کے ڈاکٹر تھے مگر باضابطہ پیشے کے طور پر اختیار نہیں کیا۔ ۱۹۴۹ء میں سلسلہ ملازمت کلکتہ آگئے تھے، ایک سکول

میں ملازمت کرتے تھے"۔ (مکتوب بنام عاشور کاظمی ایضاً)

ڈاکٹر نتھونی لال دھون وحشی مظفر پوری نے غزل، نظم، قصیدہ، شعری، سلام اور مرثیہ غرض کہ کم وبیش جملہ اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے مگر اُن کی زندگی میں بھی اور اُن کی وفات کے بعد کچھ غزلیں اپنے جریدے "ترجمان" میں شائع کرکے پروفیسر جابر حسین نے اردو دنیا سے ڈاکٹر وحشی مظفر پوری کا تعارف کرایا۔ چند برس پہلے جابر حسین نے ہی نتھنی لال وحشی مظہری کے دو مراثی شائع کئے ہیں۔ ڈاکٹر شکیل مظہری نے یہ بھی لکھا ہے کہ موت سے چند برس قبل ڈاکٹر نتھونی لال نے اپنا نام بدل کر" نندلال" رکھ لیا تھا اسی لئے بعض جگہ اُن کا نام نتھونی لال وحشی کی جگہ نند لال وحشی مظہری بھی ملتا ہے۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ نے بھی اُن کے کچھ مرثیے شائع کئے ہیں۔ نمونہ کلام کے طور پر اُن کے ایک مرثیے "معراج عشق" کے چند بند درج ذیل ہیں۔

۱
دنیائے رنگ و بو میں بندھی ہے ہوا مری
معراج عقل و عشق ہے فکر رسا مری
جاتی ہے بتکدوں سے حرم تک صدا میری
موتی لٹا رہی ہے چمن میں گھٹا مری
کیونکر نہ ہو کہ شاعر رنگیں بیاں ہوں میں
مستی فروش بادۂ چشم بتاں ہوں میں

۲
متھرا کی کوئلوں سے سنو داستاں مری
گنگا کی اُٹھتی لہر ہے طبع رواں مری
ڈوبی ہوئی ہے بیت کی دھن میں فغاں میری
رادھا کی انکھڑیوں کا ہے جادو زباں مری
نغموں کے اضطراب میں جنبش ہے ساز کی
دل میرا بانسری ہے مرے لے نواز کی

۴
فطرت نے موتیوں سے بھرا ہے دہن مرا
گیسو طراز لیلیٰ معنی ہے فن مرا
دریائے معرفت کا ہے دھارا سخن مرا
ہے سیر گاہ بلبل سدرہ چمنِ مرا
مداح ہوں ولیِّ خدائے قدیر کا
کوثر کا رخ کئے ہے سفینہ فقیر کا

۱۱
ہندو اگر چہ وحشیؔ بادہ پرست ہے
کیا سمجھے وہ نظر کی بلندی جو پست ہے
"زنار عشق رشتۂ روز الست ہے"
لیکن مئے محبتِ ساقی سے مست ہے

اے عقل کیوں نگاہ ہے تیری لڑی ہوئی
سلجھے گی تجھ سے عشق کی گتھی پڑی ہوئی

سوئے نجف رواں ہوا نکلا حرم سے جب ۱۳ ساغر بدوش خامہ بگوش و ثنا بہ لب
درد زباں کہ یا شہہ دیں خسروِ عرب اسلام و کفر دونوں سے جی ہے اُچاٹ اب
نیت بندھی ہے دور سے احرام عشق کی
مٹی قبول وحشیؔ بدنام عشق کی

منطق غلط ہے واعظ خانہ خراب کی ۱۵ حد باندھتی نہیں ہے عطائیں جناب کی
آتی ہے ہر مکاں پہ کرن آفتاب کی بخشش یہ جب اُترتی ہے رحمت سحاب کی
یہ دیکھتی نہیں کہ یہ سبزہ یہ ریت ہے
ہندو کا کھیت ہے کہ مسلماں کا کھیت ہے

ہوں نشۂ کام معرفت عشق کبریا ۱۸ پینے سے مجھ کو کام ہے پنگھٹ ہیں جا بجا
بطحا وطوس وکاشی و پریاگ و بندھیا متھرا و کاظمین و جگر ناتھ و کربلا
اللہ رے تشنگی میرے ذوق صفات کی
گنگا سے ہم کنار ہیں موجیں فرات کی

عقیدت کی شمعیں روشن کرنے کے بعد ڈاکٹر وحشی مظفر پوری کربلا کے موضوع کی طرف آتے ہیں۔

اے طبع اب مرقع کرب وبلا دکھا ۲۱ تپتی ہوئی عراق و عرب کی فضا دکھا
صبر حسینؑ و شورش اہل وفا دکھا حق جس کا سوگوار ہے وہ سانحہ دکھا
وہ سانحہ کہ خون مشیت کا دل ہوا
اسلام جس سے کفر کے آگے خجل ہوا

ہندوستاں وہ خطۂ مینو سوادِ عشق ۲۲ ملتی تھی جس میں روح تجلی نژاد عشق
اس خاک کی خمیر میں دیکھو نہادِ عشق تھی جنگ زرگری میں بھی شان جہاد عشق
انسانیت عزیز تھی ایمان کی طرح
انسان سے لڑے بھی تو انسان کی طرح

جسدم کروکھشتر میں کھینچی تیغ انتقام ۲۴ گھر کی نزاع بن گئی بھارت کی جنگ عام
لیکن لڑائی ختم جو ہوتی قریب شام اس فوج کے جو لوگ تھے اس فوج میں تمام
جاتے تھے زخمیوں کی عیادت کے واسطے
تجدید رشتہ ہائے محبت کے واسطے

لیکن وہ کس طرح کے مسلمان تھے بدشعار ۲۵ جن کی شقاوتیں دل تاریخ پر ہیں بار
رکھا نبیؐ کی آل کو پیاسا خدا کی مار ریتی یہ زخم کھا کے گرا جب کوئی سوار
گھوڑے بھگائے اس کے تن پاش پاش پر
رونے دیا بہن کو نہ بھائی کی لاش پر

اس مرثیے میں وحشی مظفر پوری نے اس روایت کو نظم کیا ہے جس رو سے ایک ہندوستانی مسافر آٹھ محرم کی رات کو امام حسین کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل کرتا ہے اور دس محرم کو اپنی قربانی پیش کرتا ہے۔

سمجھایا اس کو شاہ نے ہر چند بار بار ۵۰ چھوڑا نہ اس نے پائے مبارک کو زینہار
اٹھا نہ آستانۂ حضرت سے جاں نثار عاشور کی سحر کو بہ میدان کارزار
آگے سپر کی طرح تھا خادم حضور کا
پروانہ تھا چراغ ہدایت کے نور کا

تھا گرز اُس کے ہاتھ میں یا بھیم کی گدا ۵۱ جس کو گھما رہا تھا صفوں میں وہ برملا
فوجوں کا دل بڑھا جو سوئے شاہ کربلا لیکر رضا جہاد کی نکلا وہ منچلا
کھینچی کماں جو معرکۂ گیر و دار میں
ارجن کے تیر چلنے لگے کارزار میں

نعرہ یہ تھا کہ تکتے ہو حیرت سے کیا ادھر ۵۲ راون کی نسل تم ہو تو میں رام کا پسر
برپا ہے آج پھر وہی پیکار خیر و شر مردان حق کو زندۂ باطل سے کیا ہے ڈر
آگ اتنی برق تیغ سے جا کر لگائیں گے
کوفہ تو کیا، دمشق کو لنکا بنائیں گے

گونجا جو شیر ہند تو رن بولنے لگا ۵۳ طائر اجل کا شوق سے پر تولنے لگا

مالک لیک کے باب سقر کھولنے لگا سورج کے ساتھ چرخ بریں ڈولنے لگا

کروٹ بدل رہی تھی قیامت خرام میں

ہلچل مچی تھی قافلہ صبح و شام میں

اس مسافر کی بے مثال قربانی کے ذکر کا اختتام وحشی نے اس طرح کیا ہے۔

پھینکا عمامہ سر سے امام غیور نے

خود آکے اسکی لاش اٹھائی حضور نے

وحشی کی اب ہے عرض کہ یا شاہ کربلا ۵۵ اے کاش ہم بھی آپ پہ ہوتے یونہی فدا

بھارت کے ہندوؤں پہ بڑا حق ہے آپ کا دل ان کے بیقرار ہیں سن کر یہ ماجرا

نرغہ کیا جو اُمتِ خانہ خراب نے

ہندوستان کو یاد کیا تھا جناب نے

مرثیے کا اختتام معراج عشق کی منزل ہے۔

ہے نصرتِ حسینؑ میں ہر دل کا ولولہ وحشی بس اب خموش کہ اک حشر ہے بپا

آنکھوں میں پھر رہا ہے سماں اس دیار کا

ہندو جواب دیتے ہیں آج اس پکار کا

دل اُن کے کہہ رہے ہیں کہ لبیک یا حسینؑ ۶۸ آتا جو اس طرف کو قدم آپ کا حسینؑ

بچے نہ ہوئے کشتۂ تیغ جفا حسینؑ سیدانیوں کے سر سے نہ چھنتی ردا حسینؑ

ہوتے نثار پائے امامِ اُمم پہ ہم

کعبہ بناتے آپ کے نقش قدم پہ ہم

سینے میں عاشقوں کے نہ کیوں ہو جگر کباب ۶۹ مولا یزیدیت ہوئی جاتی ہے بے نقاب

اُسکے اثر سے آپ کی اُمت کے شیخ و شاب بدعت سمجھ کے چھوڑ بھی دیں گر رہِ ثواب

ہم بت پرست آپ کی تربت بنائیں گے

ہر چوک پر دلوں کی جگہ دل جلائیں گے

گونجے گا مسجدوں میں فسانہ حسینؑ کا ۷۰ مندر بنیں گے تعزیہ خانہ حسینؑ کا

جب تک کہ ہو نہ جائے زمانہ حسینؑ کا ہم چھیڑتے رہیں گے ترانہ حسینؑ کا

دشمن ابھی بہت ہیں امام غیور کے
کس طرح سوگ اُتار دیں خادم حضور کے

کہنے کو نتھونی لال وحشی مظفر پوری کا سنہ ولادت ۱۹۰۴ء اور وفات ۱۷ر جولائی ۱۹۶۹ ہے مگر سچ یہ ہے کہ ان کی پیدائش کا دن وہ تھا جس دن انہوں نے ''معراجِ عشق'' شروع کیا تھا اور ان کی وفات کا دن ابھی نہیں آیا ہے۔ وہ جسم و جان کے حوالے سے انتقال کر گئے ہیں مگر انہیں موت نہیں آئی' وہ اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک معراجِ عشق زندہ رہے گا اور معراجِ عشق اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک نامِ حسینؑ زندہ رہے گا اور نامِ حسینؑ کی زندگی کی ضمانت دی جا چکی ہے۔

☆☆☆☆☆

بھگت لچھمن داس :- (مظفر گڑھ)

ولادت ۱۹۱۶ء

جائے ولادت علی پور ضلع مظفر گڑھ۔ والد کا اسم گرامی بھگت حکم چند۔ تعلیم منشی فاضل اور بی۔ اے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ بھگت لچھمن داس کو دیکھ کر یا اُن کا کلام پڑھ کر جوش کا ایک شعر یاد آ جاتا ہے ۔

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

بھگت لچھمن داس کے متعلق مشہور تھا کہ مذہباً کٹر آریہ سماجی ہندو تھے مگر کہیں دُور سے درِ حسینؑ نظر آ گیا اور اس در پر جبیں سائی نے سنگ کو عقیق بنا دیا۔ بھگت لچھمن داس نے شاعری کا آغاز کیا تو ''تبسم'' تخلص اختیار کیا لیکن کربلا کی آواز نے تبسم کو اشکوں کے انمول موتیوں میں بدل دیا۔ ۱۹۴۰ء میں جوش ملیح آبادی کا ''حسینؑ اور انقلاب'' پڑھتے ہی لچھمن داس کی کایا پلٹ گئی' انہوں نے جوشؔ سے رابطہ کیا اور درخواست کی کہ اُنہیں جوشؔ اپنا شاگرد بنا لیں۔ اس کے بعد بھگت لچھمن داس کی شاعری کی سمت بدل گئی۔

کہا جاتا ہے کہ ۱۳۶۱ ہجری میں یادگارِ حسینی کے اجلاس میں بھگت لچھمن داس بھی شریک تھے اور انہوں نے بھی بارگاہ سید الشہداء میں اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کیا تھا۔

دیکھے تو رفعتیں کوئی باب حسینؑ کی رنگیں ہے سطر سطر کتاب حسینؑ کی
تعبیر واہ خوب ہے خواب حسینؑ کی کتنی حسیں ہے موت جناب حسینؑ کی
ماہ مبیں میں مہر درخشاں میں دیکھئے
جلوہ حسینؑ کا رخ یزداں میں دیکھئے

جی چاہتا تھا اس نظم کے کچھ اور بند مل جائیں اور اُنہیں نقل کیا جائے لیکن صرف سید وحیدالحسن ہاشمی نے بھگت پچھمن کے لئے ساڑھے آٹھ سطریں لکھی ہیں اور ایک بند نقل کیا ہے۔ یہ بھی غنیمت ہے کسی اور نے تو اتنا بھی نہ کیا۔ کاش مرثیے پر کام کرنے والوں نے سوچا ہوتا کہ بھگت پچھمن داس ایک ایسے شخص کا نام ہے جو اپنے عقائد میں کٹر تھا لیکن چودہ سو برس پہلے امام حسینؑ جو انقلاب فکر ونظر لائے اس کی اطلاع چودہ سو برس بعد ہی سہی، جو نہی بھگت پچھمن داس تک پہنچی، انہوں نے اس انقلاب کو تسلیم کیا، درد کی عظمت کو مانا اور صبر کی قدرت کا اقرار کیا۔ ایسے انسان کا تو ایک ایک فقرہ، ایک ایک مصرعہ ریکارڈ پر آنا چاہیئے تھا۔ یہ بھی حسینؑ کی حقانیت کا ایک ثبوت جو ٹھہرا۔

☆☆☆☆☆

رگھبیر سرن دواکر راھی :- (امروہہ)

پیدائش ۲۷ مارچ ۱۹۱۴ء (امروہہ) وفات اپریل ۲۰۰۱ء (رامپور)

''موقوف کچھ نہیں ہے انیسؔ و دبیرؔ پر راہیؔ بھی لکھ رہا ہے تیرا مرثیہ حسینؑ''

جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کی روشنی اور حرارت امتیاز یا Discrimination نہیں کرتی بلکہ کائنات کے ذرہ ذرہ کو نوازتی ہے۔ صحت مند جسموں کو یہ حرارت اور روشنی تازگی بخشتی ہے لیکن کوئی جسم خارش زدہ ہو تو یہ کرنیں ناقابل قبول بن جاتی ہیں۔

بارش برستی ہے تو یہ نہیں دیکھتی کہ ابر باری کی رحمت غریب کے کاشانے پر برسے یا امیر کے محل پر۔ وہ تو کونے کونے کو پانی عطا کرتی ہے۔ لیکن اس پانی سے کہیں پھول کھلتے ہیں اور کہیں کیکر کے درخت اُگتے ہیں جن کے خار نوکیلے ہوتے ہیں۔

رگھبیر سرن دواکر راہی امروہہ کے ایک ہندو گھرانے کا چشم و چراغ ہیں۔ ابتدا میں ہندی ادب کی طرف راغب ہوئے۔ یہ رغبت فطری بھی تھی اور گھریلو تربیت کا اثر بھی۔ ہندی زبان میں اُن کی کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ ہندوستان چھوڑ دو تحریک میں ''انڈر گراؤنڈ'' (پس

پردہ) کام کرنے والوں میں دواکر راہی بھی شامل تھے۔ آزادی ملی تو ہندی صحافت کے ساتھ ساتھ حکومت ہند کے انفارمیشن ڈپارٹمنٹ میں انفارمیشن آفیسر ہوگئے۔ ہندی کی کئی کتابیں لکھیں۔ پھر نہ جانے من میں کیا آئی کہ ملازمت چھوڑ کر رامپور میں وکالت شروع کردی۔

۱۹۶۴ء میں اردو شاعری شروع کی اور دیکھتے دیکھتے ہی دیکھتے 'دل صد چاک'۔ 'نقوش راہ'۔ اور 'رگ تغزل' شعری مجموعے شائع ہوئے اور رگھبیر سرن دوارکا راہی اردو شعروادب کی محفلوں کی جان بن گئے۔ اور پھر کوئی ایسا لمحہ بھی آیا جب رحمت کی گھٹا برس رہی تھی کہ دواکر راہی دامن پھیلا کر کھڑے ہوگئے اور خود کو اس برکھا میں شرابور کرلیا۔ پہلے غزلوں میں عظمت رسول و آل رسول کی روشنی در آئی۔ سرور کچھ اور بڑھا۔ دل و نظر میں برق کوندی اور رگھبر سرن دواکر راہی ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۰ء کے درمیان مرثیے کی وادیوں میں نکل آئے۔ پہلا ہی مرثیہ ''مقصد شہادت حسینؑ'' کے زیر عنوان کہا جو کہیں ''پیام زندگی'' کے عنوان اور کہیں ''مقصد شہادت حسینؑ'' کے زیر عنوان شائع ہوا ہے۔

آپ کیوں تسلیم کرتے بیعت دستِ یزید　　　آپ کی نظروں میں تھی روزِ سیہ باطل کی عید
گفتگوئے صلح کی پاکر نہ گنجائش مزید　　　ہوگئے اہلِ ستم کے تیر و خنجر سے شہید
آپ نے اسلام کے پرچم کو اونچا کردیا
الغرض انسانیت کا بول بالا کردیا

مسلکِ تسلیم اور حق کی رضا پر آپ نے　　　کرکے کوفے کا سفر راہِ وفا پر آپ نے
رکھدیا سوکھا گلا تیغ جفا پر آپ نے　　　ظلم سے ٹکرا کے ارض کربلا پر آپ نے
گو بظاہر مسلک اسلام تابندہ کیا
اصل میں انسانیت کا نام تابندہ کیا

رگھبیر سرن دواکر راہی ہندوستان کی جنگ آزادی کا وہ سپاہی جو انگریز اقتدار سے ٹکرا چکا تھا لیکن دوارکا راہی نے جب کربلا کی جنگ کا ادارک حاصل کیا تو آنکھیں کھل گئیں۔ حق اور باطل مجسم نظر آگئے۔ ایک طرف یزید جو باطل کی مجسم علامت تھا اور ایک طرف حسینؑ جو حق کی علامت تھے، سچائی کی علامت تھے۔ ظلم کے سامنے نہ جھکنے کا درس دے رہے تھے۔ دواکر راہی کو راستہ نظر آگیا اور اس مرثیے میں پکار اٹھے ؎

اک طرف تھے ظلم کے تیر، اک طرف مظلوم تن　　اک طرف پانی پہ قبضہ اک طرف پیاسا دہن
اک طرف عیش و مسرت اک طرف رنج و محن　　تھا مقابل کفر کے ایمان کا جو بانکپن
راہِ عرفاں میں وہی تو بانکپن کام آگیا
زندۂ جاوید ہوجانے کا پیغام آگیا

آج بھی وہ سُرخ ذرّے ہیں نشانِ کربلا　　آج بھی سچ بولتے ہیں بے زبانِ کربلا
دے چکے جب سے بہترؔ امتحانِ کربلا　　حق و ایماں آج بھی ہیں ترجمانِ کربلا
آج دنیا کی ضرورت ہے حسینی آن کی
ورنہ پھر خطرے میں ہے اب زندگی ایمان کی

ان ستم گر رہبروں کی کج نگاہی کیلئے　　منتخب کرتے ہیں جو رستے تباہی کے لئے
پُر خطر تاریک راہوں اور راہی کے لئے　　آج پھر انسانیت کی خیر خواہی کے لئے
کاش پھر پیغامِ حق لے کر یہاں آئیں حسینؑ
زندگی کو اک نیا پیغام دے جائیں حسینؑ

عصرِ حاضر کی اقتدار پرستی میں جو لوگ یا جو قومیں ستمگروں سے نجات حاصل کرنا چاہیں اُن کے لئے راہیؔ نے ایک راستہ تجویز کیا ہے۔ نہ صرف تجویز کیا ہے بلکہ دعا مانگی ہے کہ:

آج پھر انسانیت کی خیر خواہی کے لئے
زندگی کو اک نیا پیغام دے جائیں حسینؑ

سچ پوچھیے تو ہر آزاد منش انسان کا آئیڈیل "حسینؑ" ہیں۔ ہر زندہ ضمیر کے لئے توانائی حسینؑ ہیں۔ ہر سوچنے والے کے لئے سرچشمہ حسینؑ ہیں۔ راہیؔ قدم قدم پر حسینؑ کو پکارتے نظر آتے ہیں اور اُن لوگوں پر رشک کرتے ہیں جنہیں سید الشہدا کی زیارت نصیب ہوتی ہے۔

وہ دید کے قابل تھا جس دور کے انساں نے　　باطل کے اندھیروں میں تنویر کو دیکھا تھا
اس دور کے لوگوں سے کیوں رشک نہ ہو راہیؔ　　جس دور کے لوگوں نے شبیرؑ کو دیکھا تھا

مقصد شہادت حسینؑ، کی سوجھ بوجھ نے راہیؔ کو حق پرستی کی راہوں کی نشاندہی بھی کردی جس کا وہ اقرار بھی کرتے ہیں۔

میں حق پرست مصر ہوں اس لئے شبیرؑ!　　تمہیں ہی فاتح عالم قرار دیتا ہوں

جو چاہتے ہیں اُجالا کہوں اندھیرے کو انھیں یہ علم نہیں ہے کہ میں تمہارا ہوں

اور ایک شعر تو رگھبر سرن دوا کر راہی نے ایسا کہہ دیا ہے کہ یہ شعر کہہ کر آدمی زندگی بھر چپ رہے تو بھی اُسے موت نہیں آئے گی۔ یہ شعر ہے۔

وقار خونِ شہیدان کربلا کی قسم
یزید مورچہ جیتا ہے، جنگ ہارا ہے

مرحبا۔ دوا کر راہی۔ مرحبا۔ تم نے تو اعلان نہیں کیا مگر تمہارے اشعار اعلان کر رہے ہیں کہ ذہنی طور پر تم نے ''حسینؑ کی غلامی قبول کر لی تھی ورنہ یہ ادراک کیسے ہوتا ہے کہ۔

وقار خونِ شہیدانِ کربلا کی قسم
یزید مورچہ جیتا ہے جنگ ہارا ہے

اور یہ قسم کوئی اپنا ہی کھا سکتا ہے۔ غیر نہیں۔ صاحبو! یہ منزل جہاں پہنچ کر راہی اعلان کر رہے ہیں کہ یزید'' جنگ ہارا ہے'' یہ دوا کر راہی کی ابتدا ہے۔ یہاں سے تو سفر شروع ہوتا ہے۔ اس راہ میں وہ کس کس منزل سے گذرے اور جو شاعری کی وہ ہمارے پاس نہیں پہنچی، ہم تو عظیم امروھوی کے ممنون ہیں کہ دوا کر راہیؔ کے کچھ شعر ہمیں مل گئے۔ ایک اطلاع کے مطابق دوا کر راہی کی دو تصانیف'' پنکھڑیاں'' اور'' کلیات راہی'' شائع ہوگئی ہیں''

☆☆☆☆☆

لالہ نانک چند کھتری:۔ (لکھنو)

پیدائش ۱۸۹۳ء۔ وفات بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی۔

والد کا اسم گرامی راجہ رام۔ وطن بارہ بنکی پھر لکھنؤ آگئے۔ لالہ نانک چند کھتری بیسوی صدی کا ایک ایسا شاعر جس کی زبان اردو نہیں تھی مگر وہ نہ صرف اُردو کا شاعر بلکہ مرثیہ گو شاعر بن کر اُبھرا۔ اور جسے آفتاب سخنوری پیارے صاحب رشید کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ ایک سے زیادہ اکابرین اردو زبان و داب نے لالہ نانک چند کھتری پر قلم اٹھایا ہے جو اہمیت کی بات ہے۔ لالہ نانک چند کھتری نے ۷ امرثیے کہے ہیں۔ اُن کی اردو زبان سے واقفیت کے متعلق ایک معتبر نقاد کی رائے ہے کہ:

'' لالہ نانک چند کھتری اردو زبان کی نشست و خواند سے

۱۹۳۸ء تک ناواقف تھے لیکن بعد میں اتنی مہارت حاصل کی کہ اس صنف سخن میں کئی یادگار نمونے چھوڑے۔

(اردو شاعری میں ہندو شعراء کا حصہ ''گنپت سہائے سری واستوا۔ مطبوعہ ۱۹۶۹ء)

اس تبصرے میں اگر یہ بھی شامل ہو جاتا کہ:

''بعد میں اتنی مہارت حاصل کرلی کہ پیارے صاحب رشید سے سلسلۂ تلمذ وابستہ ہو گیا اور دبستان تعشق کے نمائندہ شعرا میں شمار ہوئے''

تو لالہ نانک چند کی اردو سیکھنے کی مسائی کو خراج تحسین مل جاتا۔ لالہ نانک چند کی مرثیہ گوئی کے متعلق سید مسعود حسن رضوی نے تحریر کیا ہے کہ:

''لالہ نانک چند کھتری نے ۱۷ مرثیے کہے ہیں جن میں سے دو مرثیے مطبع سیدی دکن میں شائع ہوئے۔ ان دونوں مرثیوں کے لئے ناصر حسین صاحب قبلہ نے بُریر ہمدانی اور زہیر قین کے متعلق روایات سنائی تھیں جسے لالہ نانک چند نے نظم کیا ہے۔'' (نانک، مرثیہ گو ایک حیرت انگیز شخصیت، مسعود حسن رضوی مطبوعہ، نیا دور'' لکھنؤ جون ۴ ۱۹۷ء)

'' زہیر قین'' کے احوال کے جس مرثیے کا حوالہ مسعود حسن رضوی نے دیا ہے یعنی۔ '' طبع موزوں ہے میری موجۂ دریائے سخن'' وہ ۹۲ بندوں پر مشتمل ہے۔ زیر حوالہ مرثیے کے چند بند درج ذیل ہیں جنھیں پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے کسی اہل زبان شاعر کا کلام ہو۔

۱

طبع موزوں ہے میری موجۂ دریائے سخن　　ذہن غواص نے پایا دُرِ یکتائے سخن

ہوں وہ مجنوں کہ میرے سر میں ہے سودائے سخن　　رہتی ہے فکر کے آغوش میں لیلائے سخن

عشق میں مدح کی لیلیٰ سے ہے رشتہ میرا

تو سہی نجدِ سخن میں رہے قبضہ میرا

۲

نام اُستاد کا لیتا ہوں جو تھا میرِ سخن　　کردیا مجھکو غنی، دی مجھے اکسیرِ سخن

بڑھ کے مانی سے ہوں پائی ہے جو جاگیرِ سخن　　فکر سے رنگ بھروں کھینچ کے تصویرِ سخن

یہ میری طبع کے اعزاز کی تاثیریں ہیں

میرے مصرعے نہیں ہیں، مدح کی تصویریں ہیں

یا حسینؑ آپ کے کرتے ہیں یہ مشہور اعدا ۴ مرثیہ کیا کہے گا یہ ہے نہ لکھا نہ پڑھا
جو پڑھا اس نے کلام اسکے وہ استاد کا تھا اس طرح روکتے ہیں ولولہ سب عاشق کا
مدح خادم نے جو کچھ کی ہے صلاح دید یجیے
ان غلط گویوں کو یا شاہ سزا دید یجیے

ہاں یہ سچ بات ہے بیٹھا ہوں پئے جام رشیدؔ ۶ مدح میں گذری ہمیشہ سحر و شام رشیدؔ
مدح شہ ہے سبب رحمت و آرام رشید اُن کا خادم ہوں میں روشن کرونگا نام رشید
چتر کو حشر میں محشر کا سحاب اُن کو ملے
میں کہوں مرثیہ اور اسکا ثواب اُن کو ملے

مست تھا، کردیا نانکؔ مجھے اس نے ہشیار ۳۳ گو کہ ہندو ہوں ہوئی الفت آل اطہار
کہہ گیا جوش میں جب باغ پیمبر کی بہار آفریں بلبل سدرہ نے صدا دی اک بار
عمر بھر تجھ کو اسی فن میں بس اب رہنا ہے
پورا اُستاد کا انداز ہے کیا کہنا ہے

ایسا لگتا ہے جیسے لالہ نانک چند کھتری کی یہ دعا قبول ہوگئی۔ اُنہوں نے شعر اور اصناف سخن میں بھی کہے ہوں گے لیکن مرثیہ گوئی اُن کی پہچان بن گئی۔ دیکھئے اس مرثیے میں گریز کے بعد واقعات کا بیاں یوں شروع ہوتا ہے ۔

ہے قضا را کے قبیلے کی جماعت کا بیاں کھانا ہم کھاتے تھے، تھا بچھا ہوا دسترخواں
ناگہاں نزد زہیرؔ آگیا اک مرد جواں اور کہا تم کو بلاتے ہیں شہ انس و جاں
سن کے ہاتھوں سے نوالے چھٹے وہ حیرت تھی
سر پہ بیٹھے ہوں پرند جیسے، وہی حالت تھی

دے سکے جب نہ زہیر اُسکو کسی طرح جواب زوجہ بیٹھی ہوئی تھی آگیا بس اس کو عتاب
بولی سرور نے بلایا ہے بس اب جاؤ شتاب چپ ہو اللہ دنبی سے نہیں آتا ہے حجاب
تم سے کچھ کام شہ دیں کو ہے میں جان گئی
لال پر فاطمہؑ بی بی کے میں قربان گئی

سن کے زوجہ سے اُٹھا جوش دلا میں ضرغام اس کے خیمے سے تھے کچھ دور یہ سرور کے خیام

حکم حق سے گیا مانند وحی پیش امام کر کے تسلیم ادب کے کہا حاضر ہے غلام

واہ رے خلق شہ نیک اساس، اُٹھ بیٹھے

ساتھ تعظیم کو سب رتبہ شناس، اُٹھ بیٹھے

تاریخ شاہد ہے کہ مدینہ سے لیکر اس منزل تک، بلکہ کربلا تک جو لوگ امام کے ساتھ شریک سفر ہو جاتے تھے انہیں امام سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیتے تھے۔ لیکن دو خوش نصیب ایسے بھی ہیں جنہیں امام مظلوم نے دعوت دی اور منصب شہادت عطا کیا۔ ایک زہیر قین اور دوسرے بزرگ صحابی حبیب ابن مظاہر۔ زہیر قین خدمت امام میں حاضر ہوئے تو امام نے زہیر سے نصرت کا سوال کیا۔

یہ بتاؤ کہ دم الفت کا بھروگے کہ نہیں

دشت غربت میں مدد میری کروگے کہ نہیں

بولے یہ سن کے زہیر آنکھوں میں آنسو بھر کر ہوں غلام آپ کا ادنیٰ سا، شہ جن وبشر

ہوں گے خوش دیکھنے گا مجھ سے نبی وحیدر ہو گا یا شاہ فدا، آپ کے قدموں پہ یہ سر

کیسا گھربار، میں تیار ہوں نصرت کے لئے

ہے لہو جوش میں اب شوق شہادت کے لئے

زہیر اپنے خیمے میں آئے، زوجہ کی رائے معلوم کی۔

تم بھی راضی ہو تو ہوں سید ذیشاں راضی حیدر و فاطمہؑ مسرور ہوں یزداں راضی

تم سے پوچھوں کہ ہو راضی، کہو ہاں رضی بولی وہ مومنہ ہنس کر، بہ دل و جاں راضی

خدمت، شاہ ہے مقصد میرا آرام نہیں

شہ کی نصرت سے مجھے بڑھ کے کوئی کام نہیں

مرثیے میں پوری روایت کو تسلسل کے ساتھ نظم کیا گیا ہے یہاں تک کہ شہیدوں کی ترتیب شہادت کو بھی لالہ نانک چند نے ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ زہیر قین کے اجازت جنگ مانگنے کو بھی اسی ترتیب سے بیان کیا ہے اور مرثیہ زہیر قین کی شہادت پر اختتام کو پہنچا ہے۔

لالہ نانک چند کھتری کا یہ مرثیہ دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے کلام میں کتنی روانی اور فکر میں کتنی روشنی ہے۔ اُن کا خزانہ، اُن کی زندگی کی کمائی ۷ا مرثیے ہیں۔ اُنہوں نے اللہ کے برگزیدہ

بندے کا ماتم کیا۔ اُس کے پیغام کو آگے بڑھانے کی سعی کی۔ اُسکے غم میں آنسو بہائے اور ایسے اشعار کہے جو مدحت کے ساتھ ساتھ اشکوں کی روانی کا سبب بنے۔ سنا بھی ہے اور پڑھا بھی ہے کہ:

کوثر و خلد توشہ دیں گے بُکا کے بدلے
دیکھیں اللہ نے کیا اس کا صلہ رکھا ہے

اللہ اور اس کے عاصی بندے کے درمیان کیا ہوتا ہے اس کا علم تو اللہ کو ہوگا یا اس بندے کو۔ ہمارے سامنے تو نانک جی کے مرثیوں کے علاوہ اُن کا ایک شعر ہے۔

رند ہوں حرمت دل تیرے سہارے نکلے
ناؤ ڈوبے بھی تو کوثر کے کنارے نکلے

جسے پڑھ کر بیساختہ منہ سے آمین نکلا۔

☆☆☆☆☆

منی لال جوان:- سندیلہ (ہردوئی)

پیدائش ۱۸۹۰ء۔ وفات ۱۹۷۴ء

نام منی لال۔ تخلص جوان۔ وطن سندیلہ۔ (ہردوئی) ہندوستان۔ رثائی ادب کے حوالے سے بیسویں صدی کا ایک ہنرمند شاعر جس نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی مگر رثائی ادب اُس کی پہچان بن گیا۔ یہ تھے ایک متوسط گھرانے کے چشم و چراغ منی لال جوان جو ایک مرثیہ نگار کی حیثیت سے جانے مانے گئے۔

منی لال جوان حضرت آرزو لکھنوی کے شاگرد تھے۔ مرثیے کی کلاسیکی اقدار کے پیرو کار تھے۔ دبستانِ لکھنؤ کی تراشیدہ راہوں پر محو سفر رہے۔ اردو مرثیہ نگاروں میں دلّو رام کوثری سے دوا کر راہی تک جن غیر مسلم شعراء نے مرثیے کہے ہیں ان کی مرثیہ نگاری میں ایک اضافی خوبی اُن کی عقیدت ہے۔ منی لال جوان بھی اس انمول جذبے سے سرشار نظر آتے ہیں۔ آرزو لکھنوی کی رہنمائی میں وہ جس سفر پر نکلے تھے اس سفر کی راہوں میں وہ بھی اپنے اُستاد آرزو لکھنوی اور پورے دبستان اودھ کے شعراء کی طرح پھول کھلاتے رہے لیکن ان پھولوں میں محبت کی خوشبو، اور عقیدت کے رنگوں نے اُن کی شاعری کو ''تا حشر سلامت'' بنا دیا۔

نصیب ہو جو مجھے آبِ چشمۂ کوثر زبان دھو کے کروں مدحِ آلِ پیغمبر

یہ جانتا ہوں کہ یہ راہ سخت تر ہے مگر　　یہی دعا ہے خدا سے میری بہ دیدۂ تر
زباں کو زور ، روانی قلم کو مل جائے
دل حزیں کا کنول مسکرا کے کھل جائے

اپنے گرد و پیش، اپنے ماحول، اپنے مذہبی عقائد کے رُو سے گنگا کے پانی کو آبِ حیات سمجھنے والا ایک انسان آبِ چشمہ کوثر سے زبان دھونے کی تمنا کرتا نظر آئے تو اس کے علاوہ کیا کہا جاسکتا ہے کہ قلب و ذہن کے دروازے کھلے ہوں تو گھر کے دیے سے کہکشاں کے ستاروں تک سارے منظر صاف نظر آتے ہیں اور فکرِ انسانی خوب سے خوب تر کی طرف مائل پرواز رہتی ہے۔ ایسی ہی کسی پرواز کے دوران منی لال جوانؔ نے دعا کی ۔

زباں کو زور، روانی قلم کو مل جائے　　دل حزیں کا کنول مسکرا کے کھل جائے

اور ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ دعا قبول ہوگئی ہو۔ منی لال جوانؔ اس سفر میں آگے بڑھتے نظر آتے ہیں۔ جذبہ احساس کے ساتھ، دولتِ ادراک کے ساتھ ۔

یہ کس کے غم میں زبانِ قلم پہ تالے ہیں　　فضا اُداس ہے، بے چین سننے والے ہیں
دل نہاں کو مگر ہاتھ سے سنبھالے ہیں　　حروف ہیں کہ ورق پر ہزار چھالے ہیں
نگاہ جس گھڑی تحریرِ غم پہ جاتی ہے
تو سوزِ عشق کے لفظوں سے آنچ آتی ہے

شعور آگہی کی روشنی میں منی لال جوانؔ نے مرثیہ نگاری کے سارے لوازم کا پاس کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مراثی کا شمار اَودھ کے کلاسیکی مراثی میں ہوتا ہے۔ اور انیسؔ و دبیرؔ سے آرزوؔ لکھنوی تک مرثیے کی اقدار کی جو حفاظت کی گئی منی لال جوانؔ اس کاوش میں شریک نظر آتے ہیں۔ انہیں لفظوں سے سوزِ عشق کی آنچ آتی ہے تو پکار اُٹھتے ہیں ۔

فلک پہ مہر جو لئے ہوئے ہے رُخ سے نقاب　　تپاں ہے سینۂ میں دل مثل ماہیٔ بے آب
پرند گر کے سرِ خاک ہو رہے ہیں کباب　　پناہ موج کے دامن میں ڈھونڈتا ہے حباب
وہ تیز دھوپ اثر دشت میں دکھاتی ہے
زمیں پہ بیٹھنے سے گرد جی چراتی ہے

کلاسیکی مرثیے کے اجزاء میں رخصت، جنگ، تلوار کی تعریف، ساقی نامہ، نظم اور بین وغیرہ شامل ہیں۔ منی لال جواں نے ان کی پاسداری کی ہے۔

کہاں ہے ساقیٔ گلفام بھر کے دے ساغر ابھی دکھانا ہے گرمیٔ فکر کا جوہر
برائے ظلم و تعدی ہے جمع لشکرِ شر چلا ہے نہر کی جانب علیؑ کا نورِ نظر
نکل کے بزم سے آ، رزم گاہ میں ساقی
کوئی سماتا نہیں اب نگاہ میں ساقی

بتا رہی ہے یہ بڑھتے ہوئے سوار کی شان سفر سے پہلے کیا چاہتا ہے طے میداں
مگر یہ دیکھ کے ہر سُو ہے رزم کا طوفاں بغیر جنگ کئے راہ یہ نہیں آساں
چلے کی تیغ سرِ نہر اس کا دھیان نہیں
کہ سدّ راہ ستمگر ہیں یہ گمان نہیں

اُدھر لعینوں میں یہ دیکھ کر ہے شور بپا یہ کون آتا ہے دریا کی سمت بڑھتا ہوا
اُٹھا اُٹھا کے نظر تکتے ہیں سوئے صحرا اکیلے پر ہے سپاہ حسینؑ کا دھوکا
پسینہ موت کے ماتھے پہ آیا جاتا ہے
بغیر جنگ کے دل تھرتھرایا جاتا ہے

فرس کی تیز روی سے خجل ہے برق تپاں قدم کی راہ میں بنتا نہیں کہیں پہ نشاں
ہوا بھی جس کے طراروں پہ ہوتی ہے قرباں ہے دشت گرم میں اس طرح سوئے نہر رواں
نظر بھی دوڑ میں اس سے شکست کھاتی ہے
غرض کہ سر بہ گریباں پلٹ کے آتی ہے

سراغ وہم لگائے تو وہم کھوجائے کرے تلاش تصوّر، تو ٹھوکریں کھائے
مجال کیا ہے کہ پیکِ نظر پتہ پائے ہوا جو ساتھ چلے راہ سے پلٹ آئے
فرس کی تیز روی ذہن میں بھی آنہ سکے
چمکتی برق بھی آگے قدم بڑھا نہ سکے

ہوئی وہ جنگ کہ گلنار ہوگیا صحرا کچھ ایسا خون بہا جو فرات تک پہنچا
لہو کے ملتے ہی پانی ندی کا سرخ ہوا عمل تھا موت کا ہرسو۔ میانِ دشتِ وغا

پٹی پڑی تھی زمیں قتل ہونے والوں سے
بچا سکے نہ تھے خود کو لعین ڈھالوں سے

یہ تیغ وہ ہے جو تارِ نظر کو مات کرے　　جلا کے خاک ابھی جلوۂ حیات کرے
چلے عدو پہ تو آنکھوں میں دن کو رات کرے　　جو اس سے بات کرے کوئی اس سے بات کرے

چلے زمیں پہ تو طبقہ زمیں کا کٹ جائے
عجب نہیں پرِ جبریل بھی سمٹ جائے

اور آخر میں شہادت و بین پر مرثیے کا اختتام ہوتا ہے

لعیں کے فکر سے خود کو جری بچا نہ سکا
نکل کے فوج سے خیمہ کی سمت جا نہ سکا

یہ مختصر حوالے منی مدل جوان کی صنعت گری اور قادر الکلامی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

(مرثیے کے بند، اردو مرثیہ میر انیس کے بعد (ڈاکٹر طاہر حسین کاظمی) سے لئے گئے۔)

☆☆☆☆☆

گوپی ناتھ امن:- (لکھنوی)

پیدائش ۱۶ ستمبر ۱۸۹۸ء۔ وفات ۷ جولائی ۱۹۸۳ء

شاعر، ادیب صحافی، وکیل، مصلح، اور ایک محترم انسان گوپی ناتھ کا تخلص ہی امن نہیں تھا بلکہ وہ ایک دانشور اور صحافی کی حیثیت سے ساری زندگی امن کا پرچار کرتے رہے۔ اہل ہند پر ۱۹۴۷ء میں ایک ایسا وقت بھی آیا تھا جب انسان ٹکڑوں میں بٹ گیا تھا۔ درندگی اور وحشت کا بازاروں میں رقص ہوا تھا اور انسانیت منہ چھپائے اندھیروں میں ڈوب گئی تھی۔ اس دہشت کی فضا میں بھی گوپی ناتھ امن نے شمع انسانیت روشن رکھی اور ایک مہذب امن پسند انسان کا کردار ادا کیا اور اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر فرقہ وارانہ عناصر کا مقابلہ کیا۔ اس ہندو نے جانے کتنے مسلمانوں کی جان بچائی۔

گوپی ناتھ امن کا وطن لکھنؤ تھا مگر اُن کی نظریات کا وطن پوری دنیا تھی بالخصوص اردو دنیا میں اُن کا بول بالا تھا۔ پیشے کے حوالے سے وکیل تھے اور مزاجاً امن و دوستی کے پرچم بردار۔ انسانیت کے اصولوں کے وکیل تھے۔ گوپی ناتھ امن کو محمدؐ و آلِ محمدؐ سے بہت عقیدت تھی۔ ہوسکتا

ہے اُن کے مزاج میں جو شرافت، امن پسندی اور حق پرستی کا اُجالا تھا وہ اسی در سے ملا ہو۔

گوپی ناتھ نے اوائل عمری میں مشق سخن شروع کر دی تھی، لسان الہند حضرت عزیز لکھنوی سے اکتساب فیض کیا، قرآن کریم کو پڑھا اور پھر زندگی بھر بڑے احترام سے اس کتاب حکمت کا مطالعہ کرتے رہے۔ گل سرن لال ادیب نے لکھا ہے کہ:

> ''امن نے جب ہوش سنبھالا اسوقت آخری تاجدار اودھ سلطان واجد علی شاہ کی معزولی کو نصف صدی گزر چکی تھی، شاہان اودھ کی فیاضی۔ بے تعصبی، اور رعایا پروری کے تذکرے خواص و عوام کی زبانوں پر تھے۔ لکھنؤ میں اس زمانے میں مقاصدے، اور مرثیہ خوانی کی مجالس ہوا کرتی تھیں۔ پیارے صاحب رشید، مودب لکھنوی، عزیز لکھنوی، مرزا اوج اور دیگر نامور اساتذہ کا زمانہ تھا جو مراثی، سلام اور نوحے لکھتے تھے، والد محترم (مہادیو پرساد عاصی) بارگاہ آئمہ معصومین میں خراج عقیدت پیش کرنے جاتے تھے۔ برادر محترم گوپی ناتھ امن اور راقم الحروف (گل سرن لال ادیب) کبھی دادا صاحب اور والد صاحب کے ساتھ مجالس شعری و نثری میں شریک ہوتے تھے۔ امن صاحب کو قدرت نے ذہانت۔ فراست، اور صداقت کے جوہر عطا کئے تھے۔ ذکر مظلومین ہوتا تو آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ حضرت علی اور حضرت حسین کے کرداروں کے وہ شیدائی تھے، اور انہیں اپنی زندگی میں ڈھالنے کی کوشش کرتے تھے،،

(گل سرن لال ادیب کا خط۔ کتاب ''اردو مرثیہ انیس کے بعد'' ص ۱۶۸)

گویا گوپی ناتھ امن کی کردار سازی مکتبہ محمدؐ و آل محمدؐ تک رسائی کے طفیل ہوئی تھی لہذا شعر گوئی کا رخ حق والوں کی حمد و ثنا کی طرف مڑ گیا اور گوپی ناتھ امن پکار اُٹھے۔

ثنا خوانِ پیمبرؐ، ذاکرِ آلِ پیمبرؐ ہے
خدا ہی جانتا ہے امن مومن ہے کہ کافر ہے

مظلوم کربلا امام حسینؑ سے عقیدت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ۔

اک ذکر ہے وا دل کی کلی کرتا ہوں　　　اک ذکر سے عاقبت بھلی کرتا ہوں

دُنیا کی کشاکش سے جو تھراتا ہے دل　　میں یادِ حسینؑ ابن علیؑ کرتا ہوں

مرثیہ گوئی کے باب میں اُن کے دو مراثی سامنے آئے ہیں جو مکمل مراثی کی حیثیت سے تاحال غیر مطبوعہ ہیں۔ ان مراثی کے چیدہ چیدہ بند اہل فکر و نظر نے نقل کئے ہیں۔ ایک مرثیے کا عنوان ''پس منظر و ذکر رزم گاہ کربلا'' ہے اور دوسرا مرثیہ ''یادِ محسن علیؑ'' کے زیرِ عنوان لکھا گیا ہے۔ ''رزم گاہ کربلا'' کے چند بند درج ذیل ہیں جو گوپی ناتھ امنؔ کی انصاف پسندی، اسلاف کا احترام، مزاج کی انکساری اور حقیقت نگاری کے نمائندہ بند کہے جاسکتے ہیں ؎

اگلے جو اہلِ فن تھے، کمال اُن کا لازوال　　میں اُن کی ہمسری کروں میری یہ کیا مجال
وہ چست چست بندشیں لفظوں کا وہ جمال　　اک بند اُن کے پائے کا لکھنا بھی ہے محال
میداں نظم کوئی نہ وہ چھوڑ کر گئے
مضمون وہ لکھے کہ قلم توڑ کر گئے

پھر اُن کی نسل میں ہوئے وہ صاحبِ کمال　　تھا اپنی اپنی طرز میں ہر ایک بے مثال
اوجؔ و نفیسؔ دونوں کی شہرت ہے لازوال　　تھی عشقؔ کے کلام میں بھی قدرتِ خیال
عارفؔ بھی اپنے علم کے جوہر دکھا گئے
مرجھاتے ہی نہیں وہ شگوفے کھلا گئے

اپنے تعارف میں عجز و انکسار کی روشنی قابلِ دید ہے ؎

تجنیس کا ہے لطف، نہ ترسیل کا ہے لطف　　توجیہ کا ہے لطف، نہ تاویل کا ہے لطف
تشبیہ کا ہے لطف، نہ تمثیل کا ہے لطف　　لطف مبالغہ ہے نہ تخییل کا ہے لطف
زورِ قلم نہ لطفِ بیاں کی ہی بات ہے
مداحِ اہلبیت ہوں اتنی سی بات ہے

اور گوپی ناتھ امنؔ کو مداحِ اہلبیت ہونے کا شرف ملا۔ گنگا کنارے کھڑے ہو کر کوثر نظر آنے لگا۔ ذات کی نفی کی تو زبان پر ذکرِ ذاتِ حق آ گیا ؎

پہلے زبانِ خامہ پہ ہے ذکرِ ذاتِ حق　　جس کے رچے رچائے ہیں یہ چاردہ طبق
نورِ سحر، سیاہیِ شب، سرخیِ شفق　　ہر برگ سبز جس کی ہے قدرت کا اک ورق

انساں کو راہ راست دکھانے کے واسطے
بھیجے رسول جس نے زمانے کے واسطے

اوران اصولوں کی سرداری کا شرف رسول عربی کو ملا جو اسلام کا پیغام لائے۔ یہ پیغام خدا مقبول ہوا۔ اور پھر وہی ہوا جو ہر تحریک کے ساتھ ہوا ہے کہ مخلصین کے ساتھ منافقین اور مفاد پرست تحریکوں میں در آتے ہیں اور CLIMAX کے بعد ANTICLMAX، عروج کے بعد انحطاط اثر پذیر ہوتا ہے جسے دور کرنے کے لئے پھر مخلصین کو قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ گوپی ناتھ امن نے اس آفاقی سچائی کے تناظر میں اسلام کو دیکھا اور نظم کیا ہے۔

وحشت کا درد تھا وہ جہالت کا دور تھا
دور غرور کبر اور نخوت کا دور تھا
باہم عرب قبیلوں میں نفرت کا دور تھا
اہل ثواب کی وہ مصیبت کا دور تھا
کچھ نیک بندوں نے جو کی اللہ سے دعا
آخری نبی کا ملک عرب میں جنم ہوا

جب دین مصطفیٰ کا فزوں ہو گیا وقار
جھکنے لگے تھے مصر و عجم کے بھی تاجدار
اسلام کا شمول ہوا وجہ افتخار
تب مسلموں میں ہونے لگے وہ سبھی شمار
جن کو خدا سے کام، نہ احمد سے کام تھا
ہر ایک ان میں دولت و زر کا غلام تھا

فتنے نئے نئے جو اُٹھے ارض شام سے
کب تھا گریز مسلموں کے قتل عام سے
شب بھر تو دل بہلتے تھے مینا و جام سے
وقت سحر نکلتے تھے خنجر نیام سے
خنجر وہی جو حلق مسلماں پہ چلتے تھے
جو حق پرست تھے کف افسوس ملتے تھے

اب دشمنان دیں کی نظر تھی حسینؑ پر
خواہان جان خیر ہونے تھے تمام شر
کیا بات تھی نہ جس کی تھی شبیر کو خبر
وہ صبر سے گذارتے تھے روز و شب مگر
جوں جوں وہ بات کہتے تھے دین مجید کی
تشویش اور بڑھتی تھی اس سے یزید کی

اور بات یزید کے اصرار بیعت اور حسینؑ کے انکار تک پہنچی اور انجام تھا کربلا۔

آتی سحر پیام قیامت لئے ہوئے گرمئی روز حشر کی حدت لئے ہوئے
آل نبی، نبی کی محبت لئے ہوئے تھی جن کی جنگ شانِ ریاضت لئے ہوئے
ایک ایک کر کے جان وہ دیتے چلے گئے
اپنا مقام خُلد میں لیتے چلے گئے

گوپی ناتھ امن نے بھی اس روایت کا ساتھ دیا ہے جس کے رُو سے امام حسینؑ نے ہندوستان آنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

یہ بھی دیا حسینؑ نے اغیار کو پیام مانا کہ بیر ہے، نہ کرو تیغ بے نیام
راہیں جو کھول دو تو اُکھڑ جائیں سب خیام چھوڑیں عرب کو جا کے کریں ہند میں قیام
اے سرزمین گنگ و جمن وجہ ناز ہے
یعنی تیری طرف رُخ گیتی نواز ہے

گوپی چند امن نے ایک امن پسند، حقیقت نواز شاعر کی حیثیت سے اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا اور دیانت داری کے ساتھ اسے نظم کیا ہے یہی وجہ ہے کہ امام حسینؑ اُن کے آئیڈیل اور علی شجاعت، صداقت اور حقانیت کی علامت بن گئے ہیں۔

امام حسین علیہ السلام کی کربلا میں جنگ کی منظر کشی کے علاوہ وہ بھی اس آواز کا ذکر کرتے ہیں جس نے علی کے فرزند کو جنگ سے روکا تھا۔

حیدر کی یادگار تھی ہاتھوں میں ذوالفقار صف کی صفائی کرتا تھا جسکا ہر ایک وار
آئی صدا یہ غیب سے اسے فخر روزگار جوہر دکھائے آپ نے میداں میں بیشمار
ایفائے عہد، شافیٔ اُمت کا وقت ہے
تلوار چھوڑیے کہ شہادت کا وقت ہے

گوپی ناتھ امن، دین ظاہری کے حوالے سے ہندو دھرم کو ماننے والے تھے۔ باطن کی خبر خدا کو ہوگی۔ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ شیدائے اہل بیت رسول تھے۔ حسینؑ کے غم میں آنسو بہاتے تھے۔ اور ہم نے سنا ہے غم حسینؑ میں سچائی کے ساتھ آنکھوں سے نکلا ہوا ایک آنسو اگر پتھر پہ گر جائے تو پتھر کو پھول بنا دیتا ہے۔ گوپی ناتھ امن کے دل میں تولاّ کا جو سمندر موجزن نظر آیا ہے۔

"جانے اللہ نے کیا اس کا صلہ رکھا ہے"

گوپی چند امنؔ نے ایک سوال دنیا کے سامنے رکھ دیا۔ کوئی اس کا جواب دے تو جانیں۔

کافر کوئی کہے تو کہے امنؔ کو مگر
اس کے دل و جگر میں قیامِ حسینؑ ہے

کیا فرماتے ہیں اربابِ نظر اس مسئلہ پر؟

☆☆☆☆☆

کالی داس گپتا رضا:- (ممبئی)

ولادت ۲۵/اگست ۱۹۱۵۔ وفات ۳۱ مارچ ۲۰۰۱ء

نام کالی داس۔ تخلص رضاؔ۔ گوت متّل گپتا۔ والد کا اسم گرامی لالہ شنکر داس۔ جائے ولادت سکندر پور ضلع جالندھر۔ تعلیم ادیب فاضل منشی فاضل (پنجاب یونیورسٹی) سینیر کیمرج (لندن) بیرسٹر (لنکن ان)۔

ماہر غالب و غالبیات، شاعر، ادیب محقق کالی داس گپتا رضا کے والد لالہ شنکر داس ایک سرمایہ دار، ساہوکار اور اپنے علاقے کے معزز آدمی تھے۔ کالی داس نے بچپن سے لیکر جوانی تک باپ کی فراہم کردہ دولت دیکھی۔ حصول تعلیم کے بعد خود تجارت میں آ گئے۔ ۲۵ برس مشرقی افریقہ میں گزارے۔ مزاج میں شعر و ادب داخل تھا اس لئے اُنہوں نے مشرقی افریقہ میں شعر و ادب کی فضا بنائی، ۱۹۷۰ء میں وہ ممبئی چلے گئے لیکن مشرقی افریقہ کے لوگ آج تک اُن محفلوں کو یاد کرتے ہیں جو اُن کے زمانے میں بجھائی جاتی تھیں۔

کالی داس گپتا رضا اُن خوش لقیب اہل قلم میں سے ہیں جنہیں اُن کی زندگی میں ہی پہچانا گیا اور اُن کی پذیرائی کی گئی۔ اُن کی حیات میں اُن پر تحقیقی مقالے لکھ کر چھ سکالرز نے پی ایچ ڈی کی سندات حاصل کیں۔ اُن کی حیات اور فن پر جو مقالے لکھے گئے وہ شاید ہی زندگی میں کسی پر لکھے گئے ہوں۔

کالی داس گپتا رضاؔ ہمیں چھوڑ کر وہاں چلے گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا لیکن ابھی تک دل نہیں مانتا کہ وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اکتوبر ۲۰۰۱ء میں وہ لندن میں ایک کانفرنس کی شرکت سے آئے تھے۔ کافی دیر اُن سے ملاقات رہی۔ وہ مسکراتا شاداب چہرہ، وہ پیشانی پر

ذہانت کی لکیریں، وہ آنکھوں میں فکر و سوچ کی چمک۔ میں اردو مرثیے پر کام کر رہا تھا جب اُن سے بتایا تو گویا نہال ہو گئے۔

"عاشور صاحب ہم نے بھی مرثیے کہے ہیں۔ ہم رثائی ادب میں بھی صاحب دیوان ہیں۔" اُنہوں نے بہت خوشی کے ساتھ کہا۔ میں نے درخواست کی کہ وہ کم از کم اپنا ایک مرثیہ ارسال فرمادیں تاکہ میں کتاب میں اُن کی مرثیہ گوئی کے حوالے سے شائع کرسکوں۔ اُنہوں نے وعدہ کرلیا۔ فروری ۲۰۰۱ء میں یاددہانی کا ایک خط لکھا لیکن جواب نہ ملا۔ کچھ دنوں بعد جواب ملا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں اور میری زبان پر بیساختہ آیا۔

؎ خاموش ہوگیا ہے چمن بولتا ہوا

تصانیف:

شعری مجموعے: شورشِ پنہاں۔ شاخِ گل، اُجالے، شعاعِ جاوید، غزل گلاب، نظم سمندر اور شعورِ غم (رثائی کلام) شائع ہوئے ہیں۔ رضا نے انگریزی میں بھی شاعری کی ہے۔ اُن کی مشہور کتاب "اوڈ ٹو دی ایسٹ ونڈ" انگریزی شاعری پر مشتمل ہے۔ غالب اور غالبیات سے متعلق کم و بیش ایک درجن کتابیں ہیں۔ اقبال پر چار کتابیں ہیں۔

اُن کی ادبی خدمات کے سلسلے میں اُنہیں مختلف ایوارڈ ملے ہیں:

(۱) صف اوّل کا غالب ایوارڈ ۱۹۸۹ء، (۲) کل ہند بہادر شاہ ظفر ایواڈر ۱۹۸۶ء، (اردو اکیڈمی) (۳) سراج اورنگ آبادی ایوارڈ ۱۹۹۷ (مہاراشٹر اردو اکادمی) (۴) عالمی فروغ ادب ایوارڈ (دوحہ قطر) (۵) میکش اکبرآبادی ایوارڈ ۲۰۰۱ء (آگرہ) (۶) پنجاب شرومنی ایوارڈ ۲۰۰۱ء (۷) ہندوستان کا اہم ترین پدم شری ایوارڈ ۲۰۰۱ء۔

کالی داس گپتا رضا پر پندرہ ضخیم کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ ہمارا اس وقت موضوع اُن کی مرثیہ نگاری ہے۔ کالی داس رضا نے حمد و نعت، رباعیات اور مرثیے کہے ہیں، اُن کی نعتوں کا مجموعہ "اُجالے" رباعیات کا مجموعہ شعاعِ جاوید اور شعورِ غم" اس دعوے کے دلیل ہیں۔

بنیادی طور پر ایک مخلص آدمی تھے۔ یہ خلوص اُن کے ادب پر بھی محیط ہے یا بالخصوص عقیدت کی شاعری اور رثائی شاعری میں اُن کا خلوص میں سونے پر سہاگے کا کام کر رہا ہے۔

علی جواد زیدی نے اُن کے ایک مرثیے کے چند بند نقل کیے ہیں جو حسبِ ذیل ہیں۔

دشت کربل

ہر طرف فوج عدو کے دَل نظر آنے لگے
موت کے بادل سرورِ زیست پر چھانے لگے
سازِ ایمانی کے سارے تار تھرانے لگے
وہ حسینؑ ابن علی باطل سے ٹکرانے لگے
اک طرف چھوٹا سا کنبہ ہے مجسّم فکر و غور
اک طرف فوجوں کا پرچم انتہائے جبر و جور

دیکھئے اٹھنے لگیں جور و جفا کی آندھیاں
ہر طرف ہونے لگا ہے رات کا دن پر گماں
دیکھئے بڑھنے لگا افواج کا سیل رواں
چند خیموں کی طرف جو اک یہاں ہے اک ہاں
جابر و قہار پیاسے خون کے ہونے لگے
ابن حیدر تخم ایمان و عمل بونے لگے

چند انسانوں کا دستہ رنج و غم سہنے لگا
بے زبانی میں کہانی ظلم کی کہنے لگا
جو نہ بہنا چاہیے تھا خون وہ بہنے لگا
ہر کوئی اپنی اجل کا منتظر رہنے لگا
ان گنت فوج یزیدی تیر برسانے لگی
دشت کربل نے شہادت کی صدا آنے لگی

تن گئے نیزے دم شمشیر لب پر آ گیا
بڑھ چلے گھوڑے درِ ایماں پہ لشکر آ گیا
شاہ کا دستہ بھی خیموں سے نکل کر آ گیا
باری باری کٹ مرد یہ حکم داور آ گیا
حفظ ایماں کے لئے پیر و جواں سب کٹ گئے
اس شہادت پر فرشتوں تک کے سینے پھٹ گئے

چشم حیرت سے نہ دیکھو یہ نہیں قصہ قدیم
آج تک زندہ ہیں، ٹکڑے کر گیا جن کے غنیم
آج تک زندہ ہیں وہ عباس با عزم صمیم
آج تک زندہ ہیں اکبر، اصغر و ذبح عظیم
کون تھے وہ لوگ جن کا خون ناحق بہہ گیا
عاشقِ حق وہ تھے اُن کا کام زندہ رہ گیا

کالی داس گپتا رضا نے ۵ بند میں کربلا کی صورت حال کی وضاحت کر دی۔ آخری بند میں عباس۔ اکبر اور اصغر کے نام آتے ہیں اس سے قبل پوری جنگ کے منظر نامہ علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ گپتا رضا شاعری میں الفاظ کا انتخاب بہت احتیاط سے کرتے ہیں۔ یہی احتیاط

مرثیے کے ان بندوں میں بھی ہیں۔ اُنہوں نے اس جنگ کو دو لشکروں کی جنگ نہیں کہا بلکہ رفقائے حسین کو" چند انسانوں کا دستہ" کہہ کر قلت کی وضاحت کی ہے اور" ان گنت فوج یزیدی" کہہ کر ظلم و ظالم کی کثرت کا اظہار کیا ہے۔ آخر میں ایک بند میں کالی داس گپتا رضا کی عقیدت کا اظہار ہے ۔

السلام اے شاہِ دوراں، السلام اے شاہِ دیں　　السلام ابن پیمبر اے امامت کے نگیں
السلام اے دشمنی سے دُور اُلفت کے قریں　　السلام اے مرکزِ علم و عمل۔ صد آفریں
واقعی شبیر نے اپنے لہو سے اے رضا
عظمت انسان کے جامے کو رنگیں کردیا

☆☆☆☆☆

جگن ناتھ آزاد:- (جموں کشمیر)

ولادت ۵/دسمبر ۱۹۱۸ء۔ وفات ۲۴/جولائی ۲۰۰۴ء

ترلوک چند محرومؔ کے فرزند ارجمند جگن ناتھ آزاد کی جائے ولادت اور وطن مالوف عیسیٰ خیل (پاکستان) ہے۔ ابتدائی تعلیم عیسیٰ خیل، کلورکوٹ (ضلع میانوالی) میں ہوئی۔ میانوالی سے میٹرک پاس کیا۔ ڈی۔ اے۔ وی کالج راولپنڈی سے انٹرمیڈیٹ، گارڈن کالج راولپنڈی سے بی۔ اے۔ اور پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم۔ اے کی سندات حاصل کیں۔ زندگی کی عملی جدو جہد میں داخل ہوئے تو درس تدرس کو اپنایا اور آج (۲۰۰۳ء میں) جب اُن سے بالمشافہ گفتگو میں اُن کے کوائف حاصل کئے جارہے ہیں تو وہ جموں کشمیر یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ آزاد صاحب بتارہے ہیں کہ اُنہوں نے اپنے والد، ممتاز شاعر، ادیب ترلوک چند محروم کی خواہش کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا ہے۔ ترلوک چند محروم نے اپنی ساری زندگی درس و تدریس میں گذاری اور بحیثیت ہیڈ ماسٹر اپنے منصب سے سبکدوش ہوئے۔ اُنہوں نے اپنے فرزند کو جو علمی ادبی ماحول دیا اس کا نتیجہ تھا جگن ناتھ آزادؔ نے اوائل عمر میں شعر موزوں کرنے شروع کردئے تھے، جگن ناتھ آزاد کا حافظہ بہت اچھا ہے، اُنہیں یاد ہے کہ اُنہوں نے پہلی بار ۱۹۲۶ء میں شعر کہے۔ والد گرامی مرتبت نے اُن کی اصلاح کی۔ اس دور میں بچوں کا ایک رسالہ" گلدستہ" شائع ہوا کرتا تھا جس کے مدیر رائے صاحب لالہ رگھوناتھ سہائے ہوا کرتے تھے۔ جگن ناتھ آزاد کی پہلی نظم" گلدستہ" میں شائع ہوئی

تھی۔ اس دور کا ایک جریدہ ''پریم'' تھا جس کے مدیر علامہ تاجور نجیب آبادی تھے، ''پریم'' سے جگن ناتھ آزاد کی ذہنی وابستگی اس حد تک بڑھی کہ آخر کار علامہ جور نجیب آبادی سے سلسلہ تلمذ وابستہ ہوگیا۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی شاعری کا ایک شاہکار وہ ترانہ ہے جو ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کی صبح آزاد پاکستان کی پرچم کشائی کے موقعہ پر پڑھا گیا۔

ذرّے ہیں تیرے چاند ستاروں سے تابناک
اے سرزمینِ پاک

یہ ترانہ جگن ناتھ آزاد کا لکھا ہوا ہے جسے آزاد پاکستان کی تاریخ کا حرف اوّل بھی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس حرف اوّل، اس ترانے کا کہیں ذکر نہیں ملتا اور جگن ناتھ آزاد کی عالی ظرفی کہ وہ اس کی شکایت بھی نہیں کرتے بلکہ اس کا ذکر بھی نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ اپنے پاکستانی اہل قلم دوستوں سے ملنے پاکستان جانا چاہتے ہیں تو پاکستانی سفارت خانہ دہلی میں ویزا لینے کے لئے قطار میں کھڑے رہتے ہیں اس وقت بھی تاریخ کے اس باب کا حوالہ نہیں دیتے۔ پاکستان آتے ہیں تو تو شاید اس دعا کی تعبیر کے متلاشی رہتے ہیں۔

وطن میں، ایک غریب الدیار آیا ہے
خدا کرے اسے کوئی یہاں نہ پہچانے

ابھی وہ لوگ زندہ ہیں جنہوں نے ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کا سورج طلوع ہوتے دیکھا تھا اور آزاد پاکستان کی آزاد فضاؤں میں یہ نغمہ سُنا تھا۔ کل تک یہ نغمہ کہنے والا شاعر بھی زندہ تھا لیکن کتنے لوگوں کو یاد ہے کہ اس ترانے کے خالق کا نام جگن ناتھ آزاد ہے۔ لوح آزادی پر لکھی ہوئی اس اہم تحریر کو مٹانے کا ذمہ دار کون ہے؟ وہ کونسا جذبہ ہے جس نے یہ چراغ بجھانے کی کوشش کی؟ اس موقعہ پر عروج کی نظم یاد آتی ہے۔

مورخوں سے کہو تم نے کچھ نہیں لکھا
لکھا تو صرف سلاطیں کی داستاں لکھی

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی تصانیف　(شاعری)

(۱) بیکراں، (۲) ستاروں سے ذرّوں تک (۳) وطن میں اجنبی، (۴) نوائے پریشاں (۵) بوئے رمیدہ، (۶) نسیم حجاز (۷) ولادت باسعادت، (ایک طویل نعت جس کا

فرانسیسی زبان میں ترجمہ ڈاکٹر حمید اللہ نے کیا)(۸) اجنتا (طویل نظم)(۹) دہلی کی جامع مسجد (کتابچہ)(۱۰) محسن کی راکھ (کتابچہ)

(نثری ادب) (قبالیات)

(۱) اقبال اور اس کا عہد (۲) اقبال اور مغربی مفکرین، (۳) اقبال اور کشمیر (۴) بچوں کا اقبال، (۵) اقبال کی کہانی (۶) اقبال زندگی، شخصیت اور شاعری (۷) اقبال، ادبی سوانح حیات، (۸) IQBAL MIND & ART (انگریزی میں) (۹) IQBAL & FINE ARTS (انگریزی میں)

(۹) اقبال، زندگی، شخصیت اور شاعری

(۱۰) آنکھیں ترستیاں ہیں (خاکے) (۱۱) نشانِ منزل (تنقیدی مقالات)

رثائی ادب

حضرت ترلوک چند محرومؔ کے رثائی کلام نے جگن ناتھ آزاد کو رثائی ادب سے مانوس کیا۔ بچپن میں میر انیسؔ کے مراثی کا مطالعہ کیا۔ انیس کی شاعری دل میں اُتر گئی اور جگن ناتھ آزاد پکار اُٹھے ۔

"لہو کے دیوں کو سلام کر"

کیسا سفر تھا وہ کہ وہ جس سے نکلے نہیں　وہ باخبر تھے بے خبری میں چلے نہیں
ہر گام پر حیات نے روکا انہیں مگر　جو پاؤں قتل گہ کو اُٹھے وہ رُکے نہیں
اُن کو خبر تھی معرکہ زار حیات میں　سر کٹ گئے ہیں اہل وفا کے جھکے نہیں
عشق اس طرف، اُدھر خردِ شعبدہ طراز　ہیں اہل عشق آج بھی زندہ مرے نہیں
سوکھی ہوئی ہے پیاس کی شدت سے ہر زباں　لیکن کسی زبان پہ شکوے گلے نہیں

آزادؔ اُن لہو کے دیوں کو سلام کر
جو آندھیوں میں اور بھی چمکے، بجھے نہیں

پروفیسر جگن ناتھ آزاد ماہر اقبالیات کہلاتے ہیں، اُنہوں نے نظم و نثر میں اقبالؔ پر بہت کام کیا ہے۔ رثائی ادب کے سفر میں بھی انہوں نے اقبال کو فراموش یا نظر انداز نہیں کیا۔ اقبال نے بارگاہِ محمد وآل محمد سے روشنی حاصل کی۔ جگن ناتھ آزاد نے اس روشنی کو پرچم بنایا اور سفر پر چل

نکلے۔ اقبال کے کلام پر اُن کی تظمینیں اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ اُنہوں نے اقبال کی شاعری کے ہر پہلو سے استفادہ کیا ہے۔ نیز اُن کے والد گرامی نے اُن کے دل میں رثا کا جو چراغ روشن کیا تھا وہ بجھا نہیں ہے۔ نمونۂ کلام کے طور پر آزاد صاحب کی چند تظمینیں درج ذیل ہیں۔ واوین میں جو مصرعے ہیں وہ اقبالؔ کے ہیں۔

وہ جو ہیں انتظار میں، مقتدی ہیں کہ ہیں امام
مرکزِ احترام ہیں یا ہیں کمالِ احتشام
خواہ زمیں کا ذرّہ ہے، یا ہے وہ آسماں مقام
" ریگِ حجاز منتظر، کشتِ حجاز تشنہ کام"
"خونِ حسینؑ بازدہ کوفہ و شامِ خویش را"

اس ایک نکتے میں پنہاں ہے کل بیانِ حرم اسی کے نور سے روشن ہے آسمانِ حرم
عجب ہے گفتۂ اقبال، ترجمانِ حرم "غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم"
"نہایت اس کی حسینؑ، ابتدا ہے اسماعیلؑ"

اس کے پیروں سے کبھی اُٹھی جو دھول وہ مہکت اُٹھی کہ جیسے ہو وہ پھول
خاک پر افلاک کا جیسے نزول "آں امامِ عاشقاں، پورِ بتولؑ"
"سروِ آزادے ز بستانِ رسولؐ"

اُو کہ اسرارِ نہاں را دیدہ است از گلستانِ نبیؐ گل چیدہ است
رازہائے خیر و شر فہمیدہ است "بہرِ حق در خاک و خوں غلطیدہ است"
"پس بنائے لاالہ گر دیدہ است"

میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا تذکرہ مرثیہ گو شعراء میں کر رہا ہوں، نہ جانے رثائی ادب کے ناقدین میری اس جسارت پر کیا فیصلہ صادر فرمائیں گے اس لئے کہ اس دائرہ اختیار میں کبھی "آوازہ حق" (تصنیف ۱۹۱۸ء) اور "حسینؑ اور انقلاب" (تصنیف ۱۹۴۱ء) کو مسدس کہہ کر ایوانہائے مرثیہ گوئی سے نکال دیا جاتا ہے اور کبھی مصطفیٰ زیدی کی نامکمل مسدس کو مرثیہ کا تاج پہنا کر اُسے سندِ تسلیم عطا کی جاتی ہے۔ یاد رہے کہ میں بذاتِ خود مصطفیٰ زیدی کی اس مسدس کو مرثیہ سمجھتا ہوں۔ جگن ناتھ آزاد کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ اُن یا اُن کے والد بزرگوار جناب ترلوک

چندمحروم کی رثائی شاعری کا خصوصی تذکرہ کہیں بھی نہیں کیا گیا ہے اور میں خصوصی طور پر جگن ناتھ آزاد کا تذکرہ مرثیہ گو شعرا میں کر رہا ہوں۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی اس سلسلے کی پہلی نظم، پہلی مسدس، یا پہلا مرثیہ "اصل عبادت" ہے۔

میری نوا میں سوز کہیں رونما ہے آج — درپیش نغمگی کو عجب مرحلہ ہے آج
دنیائے دل میں ایک قیامت بپا ہے آج — میری زباں پہ تذکرۂ کربلا ہے آج
چھیڑا ہے آج دل نے شہادت کا تذکرہ
بے مثل و بے عدیل عبادت کا تذکرہ

گردوں سے بھی بلندتر اے کربلائی خاک — میری نگاہ میں تو حرم کی طرح ہے پاک
کیسے کہوں کہ ذکر نہایت ہے دردناک — دامن میں تیرے پھول کا سینہ ہے چاک چاک
"اے کربلا کی خاک اس احسان کو نہ بھول
تڑپی ہے تجھ پہ نعشِ جگر گوشۂ بتول"

لُو چل رہی ہے نام کو سایہ کہیں نہیں — حدت وہ ہے کہ وقت کی سانسیں ہیں آتشیں
آنکھیں اُٹھا کے دیکھ ذرا اے دلِ حزیں — گردوں تنور ہے، کرۂ نار ہے زمیں
اک شعلہ زار ہے کہ ہے میدان کربلا
اک آگ ہے کہ ریگ بیابان کربلا

طوفاں بپا ہے گرم ہے میدان کارزار — ہے قاتلوں سے محوِ وغا ایک شہسوار
اہلبیت اُدھر، اِدھر انسان کا وقار — تنہا حسینؑ اور یزیدی کئی ہزار
اے گردشِ زمانہ ٹھہر جا ذرا یہیں
ایسی مثال پھر نہ ملے گی تجھے کہیں

وہ سامنے غنیم کی فوجیں ہیں دجلہ بار — ہیں اس طرف اکیلے حسینؑ، اسپ پر سوار
دامن پہ ہے غبار، گریباں ہے تار تار — کانٹوں میں جیسے پھول ہو، یوں ہے وہ تاجدار
آزاد نوک خار کی زد پر ہے پھول، دیکھ
ہاں دیکھ انقلاب جہاں کا اصول، دیکھ

اوپر تلے تپے ہوئے ذروں کا انتشار — ہتھیار جس قدر ہیں بدن پر ہیں شعلہ زار

اور اس کے ساتھ ساتھ ہیں چاروں طرف سے وار سر تیغ سے شکستہ، جگر تیر سے فگار
دو دن ہوئے ہیں پینے کو پانی ملا نہیں
لیکن نماز ظہر یہاں بھی قضا نہیں

اب ہیں نماز عصر کی ساعات بھی قریب ہیں کوئی دم میں شام کے لمحات بھی قریب
اے دوپہر کی دھوپ، ہے اب رات بھی قریب جس بات کا ہے ذکر، وہ ہے بات بھی قریب
گھوڑے سے گر چکے ہیں شہ مشرقین اب
سجدے میں سر جھکائے ہوئے ہیں حسینؑ اب

دیکھ اے نگاہ دیکھ یہ منظر جگر خراش تاب نظر کہاں کہ کلیجہ ہے پاش پاش
فریاد سے فضاؤں میں پیدا ہے ارتعاش کیا اے فلک تجھے تھی اسی وقت کی تلاش
دست قضا کو صبر ذرا بھی نہ ہوسکے
اور عصر کا فریضہ ادا بھی نہ ہوسکے

وہ ہاتھ اُٹھا لعین کا، شمشیر تول کر بھرپور وار، جسم ادھر، اور سر اُدھر
اے کم نگاہ راہِ حقیقت سے بے خبر سجدہ یہی ہے سجدہ جو باطن یہ ہو نظر
روح حیات بروح شہادت یہی تو ہے
کہتے ہیں جس کو اصل عبادت یہی تو ہے

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر دھرمندر ناتھ:- (دہلی)

ولادت ۲۴ر اپریل ۱۹۳۴ء

گوپی ناتھ امن لکھنوی کے فرزند۔ گرسرن لال ادیبؔ لکھنوی کے بھتیجے دھرم منبر ناتھ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جامعہ ملیہ میں حاصل کی۔ اور زینہ بہ زینہ ایم۔اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی اسناد حاصل کیں۔ گھر میں اردو کا ماحول تھا۔ ہندی زبان پُرکھوں کی زبان تھی۔ چانچہ اردو ہندی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد فرانسیسی، فارسی اور روسی زبان پڑھی۔

ان کے والد گرامی حضرت گوپی ناتھ امنؔ آزادی کی جدوجہد کے سرگرم کارکن، سماجی سیوک اور ممتاز صحافی تھے۔ دھرمندر ناتھ نے اپنے ورثے کو سینے سے لگایا، دہلی یونیورسٹی کے شعبہ

سیاسیات میں ریڈر کی حیثیت سے ذمہ داریاں نبھانے کے ساتھ تحریک آزادی ہند میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔ فنون لطیفہ میں انہماک کے ساتھ ساتھ سماجی سرگرمیوں میں فعال رہے۔ صحافت سے وابستگی رکھی۔ حکومت ہند نے اُن کی علمی، سماجی سرگرمیوں اور آزادی کی تحریک میں اُن کی کارکردگی پر اُنہیں پدم بھوشن کے انعام سے نوازا۔

مدح اہلبیت دھرمیندر ناتھ کو اپنے دادا مہادیو پرساد عاصی لکھنوی۔ والد گوپی ناتھ امن لکھنوی اور چچا شری سرن لال ادیب سے ورثے میں ملی تھی۔ لہٰذا دھرمندر ناتھ نے شاعری شروع کی تو اس کا آغاز نعت، منقبت، سلام اور قصائد سے ہوا۔ اپنی اس عقیدت پر دھرمندر ناتھ نے فخر کیا ہے ۔

میں ہوں اک بندۂ احقر مگر یہ ناز ہے مجھ کو　　عقیدت ہے محمدؐ سے، علی سے، آلِ حیدر سے
میری فکر و نظر کو مل رہی ہے روشنی پیہم　　مدینے سے نجف سے، کربلا کی خاک اطہر سے

ڈاکٹر دھرمندر ناتھ نے پہلا مرثیہ جولائی ۱۹۹۶ء میں کہا۔ اس مرثیے کا عنوان ''جہاد فی سبیل اللہ'' ہے اور ۸۴ بند پر مشتمل ہے۔ مرثیہ حمد سے شروع ہوتا ہے۔ ''خلاق کائنات وہ ذاتِ عظیم ہے'' اور لفظ ''کن'' سے تخلیق کائنات کے بعد تخلیق آدم، وعدۂ الست، سلسلۂ ہدایت، کتاب کا نزول۔ ختمی مرتبت کی نبوت، جہاد، سیّدہ کا جہاد، علی مرتضیٰ کا جہاد، امام حسنؑ کا جہاد، اور پھر امام حسینؑ کا جہاد، اُن کی شہادت۔ اہل حرم کی بیکسی اور مظلومیت، ان سارے موضوعات پر اپنے مرثیے ''جہاد فی سبیل اللہ'' میں عالمانہ انداز میں استدلال کیا ہے۔ نمونۂ کلام کے طور پر چند بند نذر قارئین ہیں ۔

اک لفظ ''کن'' سے ہو گیا آغاز کائنات　　دو حرف کی ہے گونج یہ آواز کائنات
یعنی عیاں بھی اور نہاں راز کائنات　　در پردہ حمد نغمگیٔ ساز کائنات
تخلیق کائنات ہوئی اس کے نور سے
ہر ذرہ آفتاب ہے جس کے ظہور سے

حضرت آدم کو خلیفہ اور اشرف المخلوقات قرار دینے پر استدلال،

کچھ کیجئے خیال یہ رتبہ ملا ہے کیوں　　مخلوق میں شرف کا یہ درجہ ملا ہے کیوں
خالق سے بندگی کا یہ رشتہ ملا ہے کیوں　　دنیا میں زندگی کا سلیقہ ملا ہے کیوں

دی عقل تا کہ فرق کریں نیک و بد میں ہم
تمیز دی ہمیشہ رہیں اپنی حد میں ہم

☆ کتاب و رسالت کا نزول اور اس کا جواز۔

تکمیل دیں کے واسطے نازل ہوئی کتاب
دنیا و آخرت کے لئے ہے جو لا جواب
مرضی خدا کی ہوگئی اُمت پہ بے نقاب
ہر لفظ جس کا معرفت حق کا ایک باب
آغاز جس کا "با" سے ہے انجام "سین" ہے
مطلب یہ تھا کہ بس یہی اللہ کا دین ہے

☆ فلسفۂ جہاد

جوش و جنون جنگ نہیں معنیٔ جہاد
مطلب نہیں ہے یہ کہ بپا شر ہو یا فساد
مقصد نہیں گروہ کا، یا فرد کا مفاد
یعنی نہ اقتدار، نہ شہرت، نہ جائیداد
اصلاح قوم و فرد کی بہبود کے لئے
یہ معرکہ ہے خدمت معبود کے لئے

اسلام کے ہے نام سے ظاہر یہ مدعا
سب کی سلامتی کے لئے ہے یہ راستہ
انداز جارحانہ نہیں دین میں روا
لیکن بقائے دیں کا اگر ہو معاملہ
بزدل ہیں وہ جو ایسے میں رن چھوڑ جاتے ہیں
ہو امتحان وفا کا تو منہ موڑ جاتے ہیں

ڈاکٹر دھرمندر ناتھ کے اشعار پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے کوئی اسلام آشنا یا اسلام کے اصولوں سے آگاہ اور اُن پر پیروکار مصلح بات کر رہا ہے۔ کتنا عمیق مطالعہ کیا ہے ڈاکٹر دھرمندر ناتھ نے اسلام کا؟ خانوادہ رسالت کی شخصیات نے جہاد کا جداگانہ انداز سے مظاہرہ کیا ہے۔ جیسے دھرمندر ناتھ بیان کرتے ہیں۔

☆ سیدہ فاطمہ زہرا کا جہاد

شرم و حیا کی پیکر خود دار تھیں بتولؑ
فقر و غنیٰ، عبادت و جود و سخا اصول
گفتار میں تھا اُن کی، لب و لہجۂ رسولؐ
تھا کذب نا پسند، صداقت انہیں قبول

اُن سے ملا سبق جو ہمیشہ رہے گا یاد
خاموش احتجاج بھی گویا ہے اک جہاد

☆ علی مرتضیٰ نے ذوالفقار کے علاوہ جہاد کا ایک اور اہم فریضہ سرانجام دیا تھا جسے دھرمندر ناتھ نے سمجھا اور سمجھایا ہے اور ہجرت کی شب بستر رسولؐ پر علیؑ کی نیند کو جہاد کہا ہے۔

جب جان پر نبی ہو تو آتی نہیں ہے نیند　　جب مخمصہ ہو کوئی تو آتی نہیں ہے نیند
آرام ایسے وقت دلاتی نہیں ہے نیند　　پر اہل حق سے آنکھ چراتی نہیں ہے نیند
بے خوف سو رہا ہے یقیں بوتراب کا
ہے سر بسر جہاد ہر اک لمحہ خواب کا

☆ عباسؑ ابن علیؑ کا جہاد

اک نابکار نے کیا چھپ کر جواں پہ وار　　سر پر لگا جو گرز، گرا یہ وفا شعار
شبیرؑ سے کہا کہ سنبھالیں علم کا بار　　رخصت ہوئے جہان سے عباسؑ نامدار
ہوکر شہید راہیٔ ملک بقا ہوئے
بازو کٹے تو خلد میں شہپر عطا ہوئے

☆ علی اصغر کا جہاد

تھا یوں تو اشقیا میں ہر اک شخص بے ضمیر　　ان میں سے حرملہ تھا بہت نفس کا شریر
اصغر کے حلق میں جو لگا آ کے اس کا تیر　　تھی وقت نزع لب پہ تبسم کی اک لکیر
یہ جہد شیرخوار بہت کامیاب تھا
ظالم کے ہر ستم کا تبسم جواب تھا

☆ اور آخر میں امام حسینؑ کی جنگ، شہادت اور سیدانیوں کی مظلومیت۔

اتنے میں آئی غیب سے غم ناک یہ صدا　　چلیے حضور آپ کا اب وقت آ گیا
جنت میں بیقرار ہیں ملنے کو مصطفیٰؐ　　ہیں چشم انتظار علیؑ اور فاطمہؑ
سجدے میں سر جھکایا یہ سن کر حسینؑ نے
راہ خدا میں دیدیا یوں سر حسینؑ نے

خیموں میں غل تھا دیکھو سکینہ کدھر گئی　　سب ڈھونڈتے تھے جس کی جہاں تک نظر گئی

بابا کو یاد کرتی وہ جان پدر گئی میدان کربلا میں وہ با چشم تر گئی

میداں میں کہہ رہی تھی کہ بابا بُلا ئیے
نیند آرہی ہے۔ ہم کو تھپک کر سلائیے

مصدقہ اطلاعات کے مطابق ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ نے کم از کم دو مرثیے کہے ہیں جو انہیں مرثیہ گوشعرا کی صف میں جگہ دلانے کے لئے کافی ہے۔ نہ جانے کیوں آج اُن کی مرثیہ گوئی پر لکھتے وقت مجھے لکھنؤ کے ایک اور برہمن شاعر حضرت مخمور لکھنوی کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔

جب زمانہ بدعتیں کہہ کر الگ ہو جائے گا
ہو کے ہندو ہم اُٹھائیں گے علم عباس کا

☆☆☆☆☆

عقل و دانش نے حیاتِ جانفزا کو چُن لیا
عشق نے ایثار کی آب و ہوا کو چُن لیا

خاک پر سجدہ کرو، فرمان تھا مسجود کا
بوترابی تھی جبیں خاکِ شفا کو چُن لیا

حق نے کعبے کو چُنا اعلانِ حق کے واسطے
کعبۂ حق نے علیِؑ مرتضٰی کو چُن لیا

اک نوائے زندگی تھی کربلا، اک تختِ شام
ہم فقیروں نے نوائے کربلا کو چُن لیا

مصطفیٰؐ کے دین پر قربان کرنے کے لئے
زینب و کلثوم نے سر کی ردا کو چُن لیا

حُبِّ آلِ مصطفیٰ میں جان دی عاشور نے
ہے فنا کی زد سے باہر اُس قضا کو چُن لیا

(سید عاشور کاظمی)

کتابیات

کتابیات

۱	راجستھان میں اردو مرثیہ	سید یاد علی جعفری
۲	اردو مرثیے کا ارتقاء، بیجاپور اور گولکنڈہ میں	ڈاکٹر محمد چراغ
۳	موجودہ اور نمائندہ شعرائے اجمیر	فضل متین
۴	دکن میں مرثیہ گوئی	حامد حسن قادری
۵	تاریخ مرثیہ گوئی	حامد حسن قادری
۶	اردو مرثیے کا ارتقاء	ڈاکٹر مسیح الزمان
۷	اردو مرثیہ اور انیس	ڈاکٹر حسن فاروقی
۸	اردو مرثیہ بعد انیس	سید طاہر حسین کاظمی
۹	مرثیہ نظم کی اصناف میں	سید عاشور کاظمی
۱۰	مطالعہ انیس	زیبا ردولوی
۱۱	اردو مرثیہ پاکستان میں	مولانا ضمیر اختر نقوی
۱۲	بیسویں صدی اور جدید مرثیہ	ڈاکٹر ہلال نقوی
۱۳	خاندان انیس کے نامور شعراء	مولانا ضمیر اختر نقوی
۱۴	تذکرہ شعرائے اردو جے پور	مولوی مشاغل
۱۵	مختصر تاریخ مرثیہ گوئی	حامد حسن قادری
۱۶	نوسرہار	نصیر الدین ہاشمی
۱۷	''چھیڑ خوباں سے''	سید عاشور کاظمی
۱۸	لکھنو کا رثائی ادب	اکبر حیدری
۱۹	ہفت تماشا	مرزا محمد حسین قتیل

۲۰ معراج الکلام (مجموعہ مراثی اوج) مرتب: خبیر لکھنوی

۲۱ گلستان خبیر تبصرہ نیاز فتح پوری

۲۲ بدر کامل (اوّل و دوئم) خبیر لکھنوی

۲۳ یادوں کی بارات جوش ملیح آبادی

۲۴ فاتح کربلا نمبر اخبار سرفراز

۲۵ اظہار حق (فرید لکھنوی) مرتب: ڈاکٹر تقی عابدی

۲۶ تجزیہ یادگار انیس تقی عابدی

۲۷ بہمنی سلطنت عبدالمجید صدیقی

۲۸ آب حیات محمد حسین آزاد

۲۹ ادبی مطالعہ راج بہادر گوڑ ھ

۳۰ دکن میں رسم عزاداری راج بہادر گوڑ ھ

۳۱ شاعر آخر الزماں جوش ڈاکٹر فضل امام

۳۲ فسانہ عجائب رجب علی بیگ سرور

۳۳ مرقع دہلی درگاہ قلی خان — ترجمہ: ڈاکٹر خلیق انجم

۳۴ سرائیکی شاعری کیفی جام پوری

۳۵ گل کرسٹ اور اس کا عہد عتیق صدیقی

۳۶ تذکرہ گلشن ہند مولوی لطف علی

۳۷ معاصرین مرزا دبیر تقابلی مطالعہ سید طاہر حسین کاظمی

۳۸ گلزار ابراہیم علی ابراہیم خلیل

۳۹ طبقات شعراء ہند کریم الدین

۴۰ حیدری مرثیہ گو مسعود حسن رضوی ادیب

۴۱ سرائیکی مرثیے کے چار سو سال خلش پیر اصحابی

۴۲ "العلم" مرثیہ نمبر اگست ۱۹۹۲ء مضمون علی جواد زیدی

۴۳ جدید مرثیے کے بانی میر ضمیر لکھنوی علی جواد زیدی

۴۴	معراج نفس رسول	شفیق حسن ایلیا
۴۵	کوہ ندا	مصطفیٰ زیدی
۴۶	اردو مرثیہ	علی عباس حسینی
۴۷	آندھرا پردیش میں مرثیے کا ارتقاء	ڈاکٹر صادق نقوی
۴۸	عادل شاہی مرثیے (۱۹۵۹ء)	میر سعادت علی خاں
۴۹	دہلوی مرثیہ گو	علی جواد زیدی
۵۰	رزم نگاران کربلا	ڈاکٹر صفدر حسین
۵۱	واجد علی شاہ ان کی شاعری اور مرثیے۔	منظور حسین کاظمی
۵۲	رسالہ اردو اپریل ۱۹۴۷ء	مولوی عبدالحق
۵۳	ہندو نعت	خواجہ حسن نظامی
۵۴	سلسبیل ہدایت	سودا
۵۵	دربار حسین (شاگردان دبیر)	مرتب: ثاقب لکھنوی
۵۶	حیات دبیر	ثابت لکھنوی
۵۷	عکس لطیف	اپریل ۱۹۷۰ء
۵۸	مسلم شعرائے بہار	احمد اللہ ندوی
۵۹	اس گھر کو تو آگ لگ گئی	سید عاشور کاظمی
۶۰	مرثیہ نگاران امروہیہ	ڈاکٹر عظیم امروہوی
۶۱	انیس شخصیت اور فن	ڈاکٹر فضل امام
۶۲	آیات وفا (ظہیر الدین حیدر)	دیباچہ قیصر بہاروی
۶۳	پتھروں کا مغنّی	ڈاکٹر وحید اختر
۶۴	کربلا تا کربلا	ڈاکٹر وحید اختر
۶۵	اوراق کربلا (ظہیر دہلوی)	مرتب: اقبال کاظمی
۶۶	عروج المراثی (غضنفر حسین عروج)	مرتب: اقبال کاظمی
۶۷	خانوادۂ اجتہاد کے مرثیہ گو	ساحر لکھنوی

۶۸	مادرِ مہربان	رضا سرسوی
۶۹	۱۹۶۲ء کے چند جدید مرثیے	(مطبوعہ کراچی ۱۹۶۲ء)
۷۰	چراغِ منزل	سید عاشور کاظمی
۷۱	صلّ من ناصرا	سید وحید الحسن ہاشمی
۷۲	رموزِ کلامِ انیس	ڈاکٹر رضوان حیدر
۷۳	''والفجر''	پیام اعظمی
۷۴	انتخاب کلیاتِ جوشؔ	ڈاکٹر فضل امام
۷۵	فراتِ سخن	باقر زیدی
۷۶	''مہر کے پرتو سے''	شہاب کاظمی
۷۷	''میری قلم رو سے''	شہاب کاظمی
۷۸	جدید اردو مرثیہ	محمد رضا کاظمی
۷۹	اردو مرثیہ اور مرثیہ نگار	ڈاکٹر سید شبیہ الحسن
۸۰	ارمغانِ جمیل	مرتب: سید محمد رضا کاظمی اور رشید منظر
۸۱	معرکہ انیس و دبیر	ڈاکٹر نیر مسعود
۸۲	اذانِ مقتل	ڈاکٹر ہلال نقوی
۸۳	(ا) لب کوثر — دارِ عشق	کوثر نقوی
۸۴	تشنہ لب ہے حسینؑ	ڈاکٹر شبیہ الحسن
۸۵	انیس سوانح	ڈاکٹر نیر مسعود
۸۶	گوپی ناتھ امن۔ حیات و شخصیات	ڈاکٹر دھرمندر ناتھ
۸۷	معجزہ قلم	صفدر ہمدانی
۸۸	سیلِ عقیدت	گوپی ناتھ امن
۸۹	زبورِ اخلاق	نقی احمد ارشاد
۹۰	معجزۂ خیال	صفدر ہمدانی
۹۱	اردو مرثیہ اور پاکستان میں اس کی روایت	پروفیسر ایس۔ جی۔ عباس

۹۲	میر انیس۔ حیات اور شاعری	ڈاکٹر فرمان فتح پوری
۹۳	سوز کربلا (جلد اوّل و دوم)	مرتب: سید حسن عباس زیدی
۹۴	روائے میر	مراثی تصویر فاطمہ
۹۵	برج نور	جوہر نظامی
۹۶	لہو لہو شفق	اثر سلطان پوری
۹۷	روداد لہو رنگ	جمیل نقوی
۹۸	احساس غم	ساحر لکھنوی
۹۹	عالم آشوب	فضل فتح پوری
۱۰۰	جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ	مجلّہ نیا سفر
۱۰۱	متاع شعور	مسرور شکوہ آبادی
۱۰۲	توحید ثنا	عازم رضوی
۱۰۳	نوائے سکوت (مرتضٰی اظہر رضوی)	مرتب: جابر حسین۔ پٹنہ
۱۰۴	جرس فکر	حشمت علی قیصر
۱۰۵	دریائے عطش	حسن عابدی — حیدر آباد دکن
۱۰۶	فکر و فغاں	ناشر سفینۂ ادب کراچی، مطبوعہ جون ۱۹۷۵ء
۱۰۷	آئینۂ عقیدت	آصف رودلوی
۱۰۸	مطالعۂ انیس	زیبا رودلوی
۱۰۹	شاد کی کہانی شاد کی زبانی	مرتب: مسلم عظیم آبادی
۱۱۰	حیات دبیر	ثابت لکھنوی
۱۱۱	مطلعِ حیات (احسن رضوی داناپوری)	دیباچہ محمود سرورش

☆☆☆☆☆

مصنّف کی دوسری کتابیں

۱۔ ''بربطِ احساس'' (شعری مجموعہ ۱۹۵۲ء)
پبلشرز، مکتبہ شاہوار، لاہور (پاکستان)

۲۔ ''چراغِ منزل'' (حمد، نعت، سلام ۱۹۵۳ء)
پبلشرز مکتبہ شاہوار، لاہور (پاکستان)

۳۔ ''راہوں کے خم'' (افسانے، ۱۹۵۷ء)
پبلشرز، مکتبہ شاہوار، لاہور (پاکستان)

۴۔ ''ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر'' (۱۹۸۶ء)
مرتبین: پروفیسر قمر رئیس، سیّد عاشور کاظمی
(گذشتہ پچاس سال میں تخلیق ہونے والے ترقی پسند ادب کا جائزہ اس کتاب کے اب تک چار اڈیشن شائع ہو چکے ہیں)

۵۔ ''صراطِ منزل'' (نعت، منقبت، سلام ۱۹۸۷ء)
ایک اڈیشن لندن سے، ایک ہندوستان سے شائع ہو چکا ہے۔

۶۔ ''سخن گسترانہ بات'' (مضامین، طنز و مزاح، انشائیے، خاکے ۱۹۹۰ء)
کتاب کا ایک اڈیشن لندن سے، دوسرا اڈیشن ہندوستان سے ایک اڈیشن روسی زبان میں ماسکو سے شائع ہو چکا ہے۔

۷۔ ''فسانہ کہیں جسے'' (افسانے پر تحقیق۔ ۱۹۹۳ء)
(دو ہزار قبل مسیح سے حال تک یورپی ممالک بشمول جنوبی امریکہ، اور روس کے عہد ساز افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے حوالے سے افسانے کے عروج و زوال پر بحث نیز اُردو افسانے کی دونوں روایتوں کے تناظر میں مغرب میں آباد اُنتالیس افسانہ نگاروں کا

تعارف اور ایک ایک افسانہ کتاب میں شامل ہے)

۸۔ ''اُس گھر کو آگ لگ گئی'' (۱۹۹۳ء)

(جدوجہدِ آزادی کے تناظر میں غداروں کے خطوط پر مشتمل دستاویز) محقق سلیم قریشی نے ان خطوط کے حصول اور ترجمے کا کام کیا اور عاشور کاظمی نے ہندوستان میں انگریزوں کی آمد (سترہویں صدی سے) ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور پوری تحریک آزادی کو اُجاگر کیا ہے۔ سلیم قریشی اور عاشور کاظمی کے اشتراکِ عمل نے ایک لافانی کتاب پیش کی ہے۔

۹۔ ''مرثیہ نظم کے اصناف میں......'' (۱۹۹۶ء)

جدید مرثیے کی تاریخ پر تحقیقی کتاب۔

۱۰۔ ''حرف حرف جنوں'' شعری مجموعہ (۱۹۹۶ء)

۱۱۔ ''چھیڑ خوباں سے......'' (۲۰۰۰ء)

(طنز و مزاح، انشائیے، خاکے، مضامین) (۲۰۰۰ء)

۱۲۔ (انگریزی) تالیف THE COMMITMENT

لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کو گولڈن جوبلی کے موقع پر پیش کیے گئے انگریزی زبان میں مقالے اور کچھ اہم اُردو مقالوں کا انگریزی میں بازیافت۔

۱۳۔ ''غداروں کے خطوط'' (۲۰۰۱ء)

غلامی کے خلاف جدوجہد کی داستان۔ غداروں کے خطوط کے آئینے میں۔

پبلشرز انجمن ترقی اُردو۔ دہلی

۱۴۔ ''بیسویں صدی کے اُردو اخبارات و رسائل (مغربی دنیا میں)''

پہلا ایڈیشن (۲۰۰۲ء)

۱۵۔ ''بیسویں صدی کے اُردو نثر نگار، مغربی دنیا میں''

پہلا ایڈیشن ۲۰۰۱ء۔ دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۳ء

۱۶۔ ''نکاتِ فن'' ۱۹۸۳ء (مصنف: آغا صادق)

اُردو کے ممتاز دانشور، محقق اور شاعر آغا صادق مرحوم کی تین انمول کتابیں

(۱) ''جوہرعروض'' جو علم عروض پر مستند کتاب ہے۔

(۲) ''جائزہ'' جس میں اُردو زبان کے قواعد، اعراب، املا، تصرفات، تلفظ، لغات و مرکبات پر محققانہ نظر ڈالی گئی ہے۔

(۳) ''راگ رنگ'' موسیقی کی تاریخ اور فنی تجزیات، لغت موسیقی اور اوزان موسیقی پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔　(ترتیب و تالیف: سید عاشور کاظمی)

۱۷۔ ''حقیقتِ شاعری''　پہلا ایڈیشن　(۱۹۳۱ء)

(مصنف: بیرسٹر نصیرالدین نصیر عظیم آبادی)

''حقیقتِ شاعری''　دوسرا ایڈیشن　(۱۹۸۷ء)

ترتیب و تالیف: سید عاشور کاظمی (لندن)

☆☆☆☆☆